

تفسیر قرطبی

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمہ اللہ

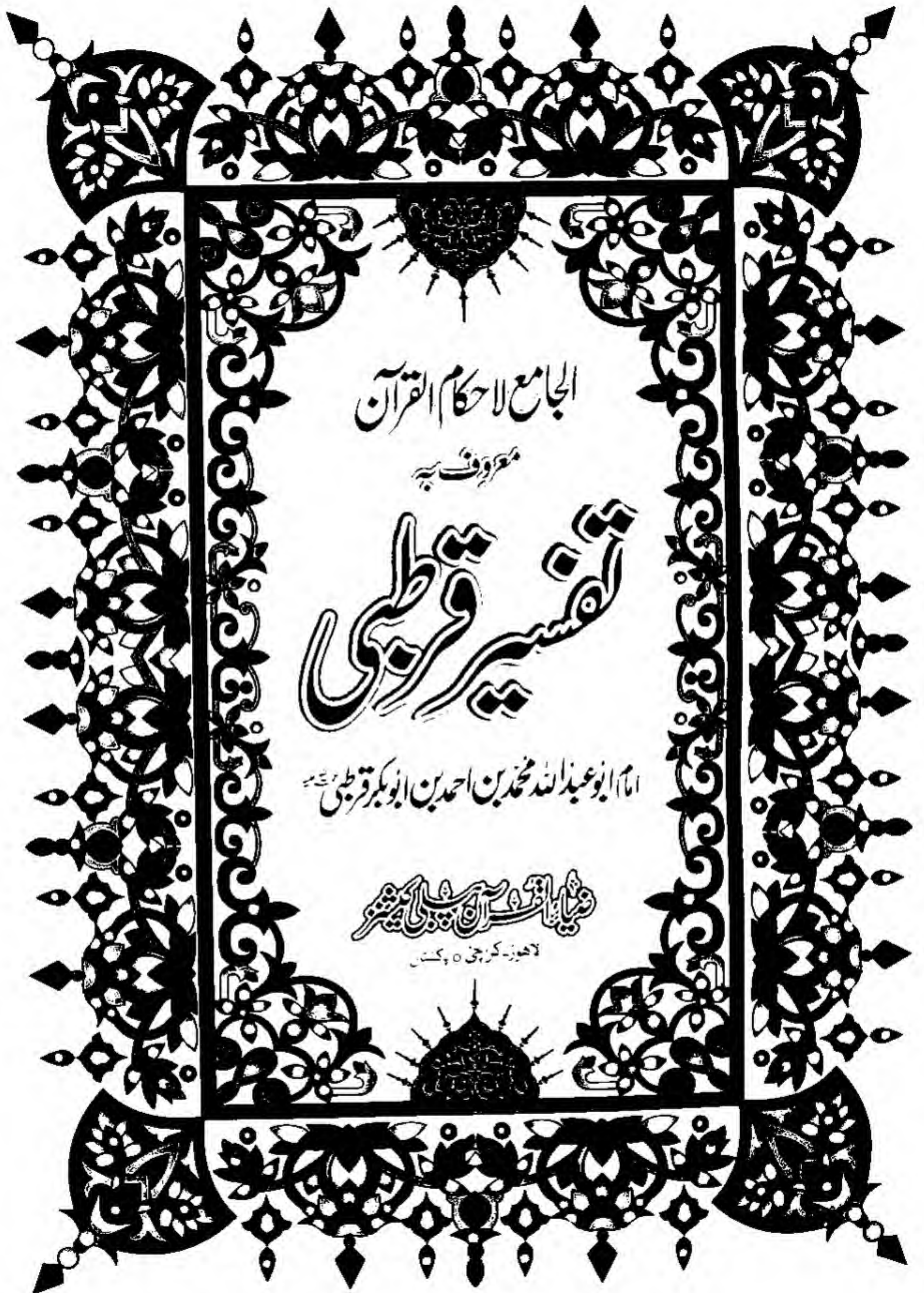
ترجمہ قرآن

نصیر الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ

تالیف فائز

ادارہ خدیجیہ المصنفین بصرہ شریف

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیّ العزیز
لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیّ العزیز



الجامع لاحکام القرآن
معروف بہ

تفسیر قرطبی جلد دوم

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمہ اللہ

متن قرآن کا ترجمہ: جنس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ
مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی
مولانا محمد انور مگھالوی مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد دوم)	نام کتاب
امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ	مفسر
حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ	متن قرآن کا ترجمہ
مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی	مترجمین
مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی	
من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف	
ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف	زیر اہتمام
محمد حفیظ البرکات شاہ	ناشر
ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور	
اکتوبر 2012ء، باراول	سال اشاعت
QT54	کمپیوٹر کوڈ

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس: 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350 فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32212011-32630411 فیکس: 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

21	وَإِذْ كَرَّوَاللَّهُ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ..... آیت 203
21	اس کے متعلق احکام اور اس میں چھ مسائل ہیں
25	فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمٍ مَّيْنٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ
25	اس کے متعلق احکام کا بیان اور اس میں اکیس مسائل ہیں
36	وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا..... آیت 204
36	اس میں تین مسائل ہیں
39	وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا..... آیت 205
41	وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ..... آیت 206
43	وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ..... آیت 207
43	اس کے سبب نزول کے بارے اقوال علماء
46	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً..... آیت 208
48	فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ..... آیت 209
49	هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ..... آیت 210
49	اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے ظلل میں آنے کے معنی میں اختلاف کا بیان
51	سَلِّ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا آتَيْنَهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ..... آیت 211
53	رُبُّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا..... آیت 212
53	اس کے مراد بھا کا بیان
55	كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً..... آیت 213
59	أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ..... آیت 214
60	اس کے سبب نزول کا بیان
63	يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا أُنْفِقُ..... آیت 215
63	اس کے سبب نزول کا بیان، اس میں چار مسائل ہیں
64	كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَكُمْ..... آیت 216
64	اس میں تین مسائل ہیں

- 67 یَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ..... آیت 217-218
مرتد کے بارے بحث کیا اس کی توبہ قبول کی جائے گی یا نہیں، اور کیا اس کے اعمال نفس ردت کے ساتھ ہی ضائع ہو جاتے ہیں اور کیا اسے وارث بنایا جاسکتا ہے؟ اس میں بارہ مسائل ہیں۔
- 68
- 80 یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَيْرِ وَالْبَيْسِ..... آیت 219
لفظ خمر اور بیس کے اشتقاق اور ان سے متعلقہ مسائل کا بیان
- 80
- 90 وَیَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ
اس میں تین مسائل ہیں
- 90
- 92 وَیَسْأَلُونَكَ عَنِ الْیَتَامَى..... آیت 220
یتامی سے متعلقہ معاملات کا بیان اور اس میں آٹھ مسائل ہیں
- 92
- 96 وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَةَ حَتَّىٰ تُؤْمِنَ..... آیت 221
اس آیت کی تاویل میں علماء کے اختلاف کا بیان اور کتابیات وغیرہ سے نکاح کا بیان کہ کیا وہ جائز ہے یا ممنوع؟ اور اس میں سات مسائل ہیں
- 96
- 103 بغیر ولی کے نکاح کرنے میں علماء کے اختلاف کا بیان، اولیاء کون ہیں، اس نکاح کا بیان جو بغیر ولی کے واقع ہو اور پھر دخول سے پہلے والی اس کی اجازت دے دے، اور اولیاء کے مراتب اور ترتیب کا بیان
- 103
- 113 وَیَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحْضِ قُلْ هُوَ أَذًیٰ فَاعْتِزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحْضِ..... آیت 222
حیض کے معنی، مادہ اشتقاق، اس کی مقدار میں علماء کا اختلاف اور مباشرہ الحائض اور جو اس سے مباح سمجھا جاتا ہے اس کا بیان نیز اس کا بیان جو حالت حیض میں اپنی بیوی کے پاس آتا ہے اس آیت میں چودہ مسائل ہیں
- 113
- 125 نِسَاءٌ وَكُم حَرْثٌ لَّكُمْ فَاَتُوا حَرْثَكُمْ اَلْیَ شِئْتُمْ وَقَدْ مَوْلَا نَفْسَكُمْ..... آیت 223
اس میں چھ مسائل ہیں
- 125
- 131 وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عَرْضَةً لَا يَمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ..... آیت 224
کس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی؟ اور اس میں چار مسائل ہیں
- 131
- 134 لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ اِنْ اَمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ..... آیت 225
جس قسم سے ایلا، واقع ہوتا ہے اس میں علماء کے اختلاف کا ذکر، چار مہینے سے زیادہ عرصہ بیوی سے وطی نہ کرنے کا حلف اٹھانے والے کے بارے میں علماء کا اختلاف اور حالت غضب کے بغیر ایلا اور لٹی (رجوع) کے معنی کا بیان۔ اس میں چوبیس مسائل ہیں
- 138
- 138 لِّلَّذِيْنَ يُؤْتُونَ مِنْ نِّسَاءٍ بِهِنَّ تَرْبِیۡۃً اَشْهُرٌ قٰنَ فَاَعُوْا قٰنَ..... آیت 226-227

- 149 آیت 228 وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ
149 قُرُوءٍ میں علماء کے اختلاف کا بیان، اس میں پانچ مسائل ہیں
158 وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ
اس بارے میں اختلاف کا بیان جس کے ساتھ آدمی عدت میں رجوع کرنے والا ہوتا ہے اور ان کا بیان جو رجوع
158 سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں گیارہ مسائل ہیں
163 وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
164 اس درجہ کے معنی کا بیان جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے
165 الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَإِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيَةٍ بِإِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ
تحدید طلاق میں سبب اور ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع ہونے کے بارے میں علماء کے اختلاف کا بیان اس
166 میں سات مسائل ہیں
168 وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ
طلاق پر فدیہ لینے کے جواز کا بیان، مہر کی مقدار سے زیادہ مال کے عوض خلع کے جواز میں علماء کا اختلاف، اور اس
بارے میں اختلاف کیا خلع طلاق ہے یا نسخ، خلع والی کی عدت کا بیان، اور اس کا بیان جس نے بغیر عوض کے ایقاع
خلع کا قصد کیا۔ اس میں پندرہ مسائل ہیں
178 فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ أَنْ يَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهَا فَإِنْ طَلَّقَهَا آیت 230
190 خلع کے بعد عدت میں طلاق ہونے کے بارے میں علماء کا اختلاف اور اس بارے میں جس میں نکاح کافی ہوتا ہے اور
جو حلالہ کو مباح کر دیتی ہے کیا محلل کا نکاح جائز ہے یا نہیں اور اس میں گیارہ مسائل ہیں
190 فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا
196 اس میں چار مسائل ہیں
196 وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ آیت 231
199 اس میں چھ مسائل ہیں
200 وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ آیت 232
203 ان کے نکاح سے عضل ازواج کے معنی کا بیان جو ارادہ رکھتی ہیں اور اس میں چار مسائل ہیں
203 وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُنَتِّمَ آیت 233
205 رضاع میں علماء کے اختلاف کا بیان، کیا وہ ماں کا حق ہے یا اس پر حق ہے رضاعت محرمہ قائم مقام نسب کے ہے،
خصانہ کے معنی اور اس کے حق دار کا بیان اور اس وارث کا بیان جس پر اس کی مثل ہے جو باپ پر ہے اس میں اٹھارہ

- 206 مسائل ہیں
- 221 وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ آیت 234
- متوفی عنہا زوجہا کی عدت کا بیان، عورت کے انتظار کرنے اور جو کچھ اس دوران اس پر واجب ہوتا ہے اس کا بیان، اس میں پچیس مسائل ہیں
- 221 وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا عَرَّضْتُمْ بِهِ آیت 235
- 237 دوران عدت عورت کو نکاح کے بارے تعریض کے معنی اور اس کے جواز وغیرہ کا بیان، اس میں نو مسائل ہیں
- 237 وَلَا تَعْرِضُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى آیت 236
- 242 اس کا بیان جو کچھ زوجین کے درمیان ہوتا ہے، جب عقد انتہاء عدت سے پہلے حاصل ہو، اس میں نو مسائل ہیں
- 243 لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ آیت 236
- 247 طلاق کے حالات اور جو مہر خاوند پر واجب ہوتا ہے اس کا بیان، متعہ کی بحث اور اس میں علماء کا اختلاف اس میں گیارہ مسائل ہیں
- 248 وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ آیت 237
- اس آیت کے نسخ میں علماء کا اختلاف اور اس آدمی کے بارے میں اختلاف کا بیان جو عورت سے خلوت اختیار کرے اور جماع نہ کرے یہاں تک کہ اس سے الگ ہو جائے اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں
- 255 حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى آیت 238
- 261 صلوٰۃ وسطیٰ کی تعیین میں علماء کا اختلاف، قنوت کا معنی اور اس کا بیان جس نے دوران نماز عہد یا سہواً گفتگو کی اور حدیث ذی الیدین کا ذکر اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں
- 261 فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا آیت 239
- 278 اس خوف کے بارے علماء کے اختلاف کا بیان جس میں پیدل چلنے اور سوار ہونے کی حالت میں نماز جائز ہوتی ہے اس میں نو مسائل ہیں
- 278 وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا آیت 240
- 281 اس کا بیان کہ ابتدائے اسلام میں عدۃ الوفاۃ ایک سال تھی، اس میں چار مسائل ہیں
- 281 وَلِلْمُطَلَّقاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آیت 241-242
- 284 اس اختلاف کا بیان کہ کیا یہ آیت محکم ہے یا منسوخ؟
- 284 أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ آیت 243-244
- 285 ان کا واقعہ جو دبا سے فرار ہو کر نکلے، ان کی تعداد کتنی تھی؟ اور طاعون پر مہر کی فضیلت کا بیان، اس میں چھ مسائل ہیں
- 286

- 293 مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا آیت 245
- 293 ابوالدحداح کی حدیث کا ذکر، قرض کا معنی اور اس کی فضیلت اس میں گیارہ مسائل ہیں
- 300 اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَا مِنْ بَنِي إِسْرَآءِ يَلْ مِنْ بَعْدِ مُوسَى آیت 246-247
- 305 وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ آیت 248
- 305 تابوت کا معنی، اس کے بارے بنو اسرائیل کی صنعت و کاریگری اور سکینہ اور بقیہ کے معنی کا بیان
- 308 فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ آیت 249
- 309 اس میں گیارہ مسائل ہیں
- 316 فَهَذَا مَوْعِدُ اللَّهِ آیت 251
- 316 حضرت داؤد علیہ السلام کا جالوت کو قتل کرنے کا ذکر اور ان لوگوں کے بارے علماء کے اختلاف کا بیان جن کے ساتھ فساد کا دفاع کیا گیا وہ کون تھے؟
- 322 تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ آیت 253
- 322 بعض انبیاء علیہم السلام کو بعض پر فضیلت دینے اور ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کرامت و افضلیت کا بیان
- 327 يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا مَنَارَ قُنُكُمْ آیت 254
- 330 اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيُّ الْقَيُّومُ آیت 255
- 330 اس آیت کی فضیلت، شفاعت اور معنی الکرسی کا بیان اور اس میں اختلاف کا ذکر
- 343 لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ لَقَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ آیت 256
- 343 شان نزول اور طاغوت کے معنی کا بیان
- 348 اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِي حَاجَّ اِبْرٰهٖمَ فِى رَبِّهِۦ اَنْ اَتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكُ آیت 258
- 348 حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ، حجت بازی کرنے والے کا ذکر اور اس کے نسب کا بیان
- 353 اَوْ كَالَّذِى مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ اَنِّىْ يٰحٰى هٰذَا اللّٰهُ آیت 259
- 364 وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اٰمِىْنِ كَيْفَ تُنۡجِى الْمَوْتٰى آیت 260
- 364 سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے رب سے احیاء موتی کی کیفیت کے بارے سوال کرنے اور سبب سوال کا بیان
- 364 مَثَلُ الَّذِىۦنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمْوَالَهُمۡ آیت 261
- 370 اس کا بیان جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں پانچ مسائل ہیں
- 370 مَثَاوَلَا اَذٰى کے معنی کا بیان، اس میں تین مسائل ہیں
- 374

- 377 قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ آیت 263
- 377 قول معروف کا بیان، اس میں تین مسائل ہیں
- 379 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ آیت 264
- 379 اور اس میں تین مسائل ہیں
- 383 وَمِثْلَ الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ آیت 265
- 387 أَيَوَّدُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ آیت 266
- 389 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا آیت 267
- 390 رکاز کے معنی کا بیان اور جب یہ پایا جائے تو اس کے حکم میں علماء کا اختلاف اور زمین سے ظاہر ہونے والے معادن کا بیان، اس میں گیارہ مسائل ہیں
- 400 يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ آیت 269
- 400 حکمت کے معنی اور اس میں اختلاف کا بیان
- 402 إِنَّ تَبْدُ وَالصَّدَقَاتِ فَنِعْمًا هِيَ ؕ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُوتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ آیت 271
- 407 لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا آیت 272
- 407 اس کے سبب نزول کا بیان
- 410 لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي آیت 273
- 410 ان فقراء کا بیان، سوال اور اس کی کراہیت کے بارے جو منقول ہے اس کا بیان اور اس میں اہل ورع کا مذہب، اس میں دس مسائل ہیں۔
- 418 الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْئِيلِ آیت 274
- 418 اس کا بیان کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں بندھے ہوئے گھوڑوں کے چارے کے بارے میں نازل ہوئی
- 419 الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الزُّبُولَ لَا يَقُومُونَ آیت 275 تا 279
- 420 یہ آیات جن احکام ربا کو متضمن ہیں ان کا بیان اور عقود مباحات کے جواز اور اس کے لیے وعید کا بیان جس نے ربا کو حلال سمجھا اور اس کے فعل پر اصرار کیا۔ اس میں اڑتیس مسائل ہیں
- 444 وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ آیت 280
- 445 اس کا بیان کہ یہ آیت اس کے لیے ناسخ ہے جو زمانہ جاہلیت میں تنگدستی کی بیع تھی اور اس کی حالت کا بیان جس کے قرض زیادہ ہوں اور اس کے قرض خواہ اپنے مال کا مطالبہ کریں اور مفلس کو جس میں رکھنے کے بارے میں علماء کا اختلاف اس میں نو مسائل ہیں

- 449 وَاتَّقُوا يَوْمًا تُزْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ..... آیت 281
- 449 اس کا بیان کہ یہ آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی
- 450 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ..... آیت 282
- 451 اس کا بیان کہ یہ آیت تیس احکام کو متضمن ہے اور اس میں باون مسائل ہیں
- 483 وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا..... آیت 283
- 483 رہن کے معنی کا بیان اور اس میں اقوال علماء اس میں چوبیس مسائل ہیں
- 500 لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ..... آیت 284
- 500 محاسبہ نفس کے معنی یا اسے مخفی رکھنے کا بیان، اور اس کا کہ وہ خاص ہے یا عام اور کیا یہ منسوخ ہے یا نہیں
- 504 اَمَّا الرُّسُلُ بِهَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ..... آیت 285-286
- ان کے سبب نزول کا بیان، اور تکلیف مالا یطاق کے جواز میں علماء کے اختلاف کا بیان، اس میں گیارہ مسائل ہیں
- 505 اور طبعہ اولیٰ میں اس آیت کی تفسیر میں دو صفحے کم ہیں
- 516 سورۃ آل عمران
- 516 اَلَمْ يَلَمْ اِنَّ اللَّهَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۱ آیت 1-2
- اس میں پانچ مسائل ہیں، جن کا تعلق الم کی میم کی اباحت سے ہے۔ سورۃ آل عمران کی فضیلت کا بیان سورۃ البقرہ
- 516 اور آل عمران کا نام الزہراوین ہے اور حدیث وفد نجران کا بیان
- 519 نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرَةَ..... آیت 3-4
- 520 تورات، انجیل اور ان کا مادہ اشتقاق کا بیان
- 521 اِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَاءِ ۝۵ آیت 5
- 522 هُوَ الَّذِى يُصَوِّرُكُمْ فِى الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۶ آیت 6
- 522 اس میں دو مسئلے ہیں: رحم میں تصویر کی کیفیت اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل
- 523 هُوَ الَّذِى اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ..... آیت 7
- اور اس میں نو مسائل ہیں: محکم و متشابہ کے بارے علماء کے اقوال، ”آخر“ پر کلام، زلیغ کا معنی، متشابہ کی اتباع کرنے
- 524 والوں کی اقسام اور ان کے احکام کا بیان اور قولہ تعالیٰ: والراسخون فی العلم، میں علماء کے اقوال
- 535 رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ..... آیت 8
- اس میں دو مسئلے ہیں: معتزلہ کے قول ان اللہ لایضل العباد کا رد اور اس کا رد جس نے یہ کہا ہے کہ علم وہ ہے جو اللہ
- 535 تعالیٰ نے ابتداء بغیر کسب کے عطا فرمادیا

- 537 رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۖ آیت 9
- 537 إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَنْ تَغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ آیت 10
- 538 كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَآخَذَهُمْ ۖ آیت 11
- 539 قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْيُهُمْ وَهُمْ يُخْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْوَهَادُ ۖ آیت 12
- 539 یہود کے لیے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا ذکر جس وقت آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے
- 540 قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ آیت 13
- 541 روایت کے معنی میں اختلاف
- 544 زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ ۖ آیت 14
- اس میں گیارہ مسائل ہیں۔ ان کے بارے میں اختلاف جن کے لیے وہ شہوات کو آراستہ کرتا ہے، عورتوں کے فتنہ کا بیان قنطار کی مقدار میں اختلاف کا ذکر، ذہب اور فضہ کے اشتقاق کا بیان، گھوڑوں اور ان کی فضیلت کا بیان، السائم، الانعام اور الحرث کے معنی کا ذکر، دنیوی زندگی میں متاع انسان
- 544 قُلْ أَوْفُوا بِعَهْدِكُمْ ۖ آیت 15
- 554 أَلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا أَمْنَا غَفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۖ آیت 16-17
- 555 وَالْمُتَغَفِّرِينَ بِآلِ سَحَابٍ، کے معنی میں اختلاف کا ذکر اور استغفار پر بحث
- 558 شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَالْمَلَكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ۖ آیت 18
- 559 اس میں چار مسائل ہیں، کعبہ معظمہ کے ارد گرد بت ہونے کا بیان، علم کی فضیلت اور شرف علماء اور شہادۃ اللہ کا معنی
- 562 إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ ۖ آیت 19
- اس آیت میں دین اور اسلام کے معنی مراد بہ کا بیان اور اس کا بیان کہ اہل کتاب کا علم بالحقائق کے بارے میں اختلاف ہے۔
- 562
- 563 فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلْتُ وَجْهِي لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۖ وَقُلْ لِلَّذِينَ
- 564 الوجه کے معنی کا بیان
- 565 إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۖ آیت 21-22
- اس میں چھ مسائل ہیں: بنی اسرائیل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اور صالحین کو کیسے قتل کرتے تھے، اس پر وجہ استدلال کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر رسالت سے قبل واجب ہے نا ہی کی شرائط اور تغیر منکر کی بحث
- 565 أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا نَصِيبًا ۖ آیت 23
- 569 اس میں تین مسائل ہیں: سبب نزول کا بیان مدعو کو حاکم کے پاس پیش کرنے کے وجوب کا بیان، کیا ہم سے پہلی

- 569 شرائع ہمارے لیے شریعت ہیں؟
- 571 ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ آیت 24
- 571 قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ آیت 26
- 572 اس کی فضیلت کا بیان اور اللہم میں علمائے نحو کا اختلاف
- 576 تَوَلَّجَ الْبَيْلَ فِي النَّهَارِ وَتَوَلَّجَ النَّهَارُ فِي الْبَيْلِ آیت 27
- 577 لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ آیت 28
- 577 اس میں دو مسئلے ہیں: کفار کو دوست بنانے سے مؤمنین کے لیے نفی، تقیہ کا بیان اور وہ کسب حلال ہوتا ہے
- 578 قُلْ إِنْ تُحِبُّوْا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْذَرُوْهُ آیت 29
- 580 قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ آیت 31
- 580 حب کا معنی اور محبۃ اللہ کا بیان
- 582 قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ آیت 32
- 582 إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ آیت 33
- آل ابراہیم اور آل عمران کا بیان، عمران کے نسب کا ذکر اور اس کا بیان جو اللہ تعالیٰ نے ہر نبی علیہ السلام کے لیے پسند فرمایا
- 583 دُرِّيَّةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَبِيحٌ عَلَيْهِمُ آیت 34
- 585 إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ آیت 35-36
- ان میں آٹھ مسائل ہیں۔ عمران کی بیوی کا نام ونسب، اس کی نذر کا سبب، بچے کی نذر پر بحث، قول باری تعالیٰ: وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ میں وجوہ قرأت کا ذکر اور کیا یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، یا عمران کی بیوی کا قول ہے، اس کا بیان کہ ذریعہ کا اطلاق خاص طور پر ولد پر ہوتا ہے اور یہ کہ شیطان جمیع اولاد آدم کو کچھ کالتا ہے
- 586 فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي آیت 37-38
- 588 فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا آیت 39
- تقبیل اور انبات کا معنی، حضرت زکریا علیہ السلام کا زوجہ عمران کی کفالت کرنا زکریا میں لغات کا بیان، زوجہ عمران کے حمل کی خبر کا تذکرہ، آیت میں طلب ولد پر دلیل ہے اور جاہل متصوفہ کا رد ہے ان کا بیان جو انسان کے لیے ضروری ہے مثلاً اس اولاد اور اس کی بیوی کا ہونا وغیرہ
- 590 فَكَذَّبَتْهُ الْمَلِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ آیت 39
- 596 اس میں وجوہ قرأت کا بیان اور الکلمہ، السید اور المحصور کے معانی کا بیان

- 601 قَالَ رَبِّ اَتَى يَكُونُ لِي عُلْمٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَاَمْرًا قِي عَاقِرٌ ۚ قَالَ كَذَلِكِ آیت 40
- 601 یہاں لفظ رب کے مراد بہ کا بیان اور عقر و غلام کے معنی کا بیان
- 602 قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۚ قَالَ اَيُّكَ اَلَا تُكَلِّمُ النَّاسَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ آیت 41
- 602 اس میں تین مسائل ہیں: اس آیت کا بیان جس کا مطالبہ حضرت زکریا علیہ السلام نے کیا، الرمز کا معنی، اور اس کا بیان کہ اشارہ کلام کے قائم مقام ہوتا ہے۔
- 604 وَاِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ لَيُزَيِّمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰی آیت 42
- 605 خیر نساء العالم کا بیان اور اس کا بیان جو حضرت مریم کی نبوت کے بارے میں ہے
- 607 لَيُزَيِّمُ اَقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاَسْجُدِيْ وَاَمَّا كَعِيْ مَعَ التَّرْكِعَيْنِ ۝ آیت 43
- 608 اس میں چار مسائل ہیں۔ یحییٰ کا معنی، اس آیت سے قرعہ کے اثبات پر علماء کا استدلال اور یہ کہ دادی (جدہ) کے سوا تمام قرابتداروں عورتوں کی نسبت خالہ پرورش کا حق زیادہ رکھتی ہے۔
- 611 اِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ لَيُزَيِّمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اَسْمُهُ الْمَسِيْحُ آیت 45-46
- 611 مسیح کے معنی اور اس کے اشتقاق میں علماء کے اختلاف کا بیان، الکھل کا معنی اور جھولے میں بات کرنے والوں کی تعداد کا بیان
- 615 قَالَتْ رَبِّ اَتَى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۚ قَالَ كَذَلِكِ آیت 47
- 616 سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خلقت کی کیفیت کا بیان
- 616 وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْحِيْدَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَرَاسُوْلًا اِلٰى بَنِيْ آیت 48-49
- 617 الاکمہ اور الابرص کے معنی کا بیان اور ان معجزات کا بیان جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے
- 619 وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيِّ مِنَ التَّوْحٰیدِ وَلَا جَلَّ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ هُوَ آیت 50-51
- 620 فَلَمَّا اَحْسَ عِيْسٰی مِنْهُمْ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْ اِلٰی اللّٰهِ ۚ قَالَ الْخَوَارِیُّوْنَ آیت 52
- 621 حواریین اور ان کی وجہ تسمیہ کا بیان
- 623 وَمَكْرُوْا وَمَكْرًا لِّلّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرٌ الْمَكْرُوْنِ ۝ آیت 54
- 623 سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر یہودیوں کے اتفاق کرنے پر بحث
- 624 اِذْ قَالَ اللّٰهُ لِيَّعِيْسٰی اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلٰی وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ آیت 55
- 624 حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور انہیں اٹھالیے جانے کے بارے میں علماء کے اختلاف کا بیان اور اس کا بیان کہ مصاب وہ ہے جس پر شہہ ڈال دیا گیا
- 627 فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاَعْلٰی عَنْهُمْ آیت 56-58

- 67 آیت 59-60 إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ
- اس کا بیان کہ یہ آیت وفد نجران کے بارے اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس
- 628 ارشاد کا انکار کیا: ان عیسیٰ عبد اللہ و کلمۃ (کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کا کلمہ ہیں)
- 629 آیت 61 فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ
- اس میں تین مسائل ہیں اس پر دلیل کہ بیٹیوں کے بیٹوں کو ابناء کا نام دیا جاسکتا ہے اور مباہلہ کا معنی
- 629 آیت 62-63 إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ
- 630 آیت 64 قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى
- 631 اس میں تین مسائل ہیں۔ اس آیت میں اختلاف ہے کیا یہ خطاب اہل نجران کو ہے یا تمام یہود و نصاریٰ کو اور حضور
- 631 نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شاہ روم ہرقل کو خطاب
- 633 آیت 65 يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ
- یہود و نصاریٰ میں سے ہر فریق کے اس دعویٰ کے سبب کا بیان کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے دین پر تھے
- 633 آیت 66 هَآئِنتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجُّكُمْ فِيمَا لَكُمْ
- 634 اس میں دو مسئلے ہیں: ہا اتم اور ہؤ لاء کی بحث، وجدال سے منع کا بیان جس کا علم نہ ہو
- 634 آیت 67 مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانًا
- 635 آیت 69 وَذَتْ قَائِمَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ
- 636 اس کا بیان کہ یہ آیت حضرات معاذ بن جبل، حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کے بارے میں اس
- 636 وقت نازل ہوئی جب یہودیوں نے انہیں اپنے دین کی طرف دعوت دی۔
- 637 آیت 70 يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ
- 637 آیت 72 وَقَالَتْ قَائِمَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا
- یہ آیت کعب بن اشرف اور مالک بن صفیہ کے بارے ان کے اپنی قوم کے خلاف تبلیغ یا مسلمانوں میں تشکیک
- 637 پیدا کرنے کے سبب نازل ہوئی
- 638 آیت 73 وَلَا تَتُومُوا إِلَّا لِمَنْ تَدْعُونَ دِينَكُمْ
- اس سے متعلقہ مباحث اور وجوہ اعراب کا بیان
- 638 آیت 75 وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَّهُ
- 642 اس میں آٹھ مسائل ہیں۔ اس کے سبب نزول میں علماء کا اختلاف، اس سے ملازمۂ غریم پر استدلال، امانت کی
- 643 فضیلت اور اس پر دلیل کہ کافر اس اہل نہیں کہ اس کی شہادت قبول ہو

- 646 بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ آیت 76
- 646 إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ آیت 77
- اس میں دو مسئلے ہیں، اس کے سبب نزول کا بیان، حاکم کا حکم مال حلال نہیں کر سکتا جب محکوم لہ کو اس کے بطلان کا علم ہو
- 647
- 649 مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ آیت 79
- 649 یہاں بشر کے مراد بہ کا بیان، اور ربانین کے معنی کا بیان
- 651 وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا آیت 80
- 652 وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَّا آیت 81
- 652 اس سے متعلقہ وجوہ اعراب کا بیان اور ميثاق لینے کے معنی کا بیان
- 655 أَفَغَيْرِ دِينِ اللَّهِ يَبْتَغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ آیت 83-84
- 655 کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں کا نصاریٰ کے ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جھگڑا کرنا
- 656 وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ آیت 85
- 657 یہ حارث ابن سويد کے ارتداد کے بارے نازل ہوئی
- 657 كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا آیت 86
- 657 جو اسلام سے مرتد ہوا اس کے حکم کا بیان
- 658 أُولَٰئِكَ جَزَاءُ ۖهُمْ أَنْ عَلَيَهُمْ آیت 87 تا 89
- 659 جس کے بارے نازل ہوئی اس میں اختلاف کا بیان
- 658 إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ آیت 90
- 661 لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ آیت 92
- اس میں دو مسئلے ہیں اس آیت میں ظاہر خطاب اور اس کے عموم کے استعمال پر دلیل ہے اور ”البر“ کی تاویل میں اختلاف کا بیان
- 661
- 663 كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِلْبَنِيِّ إِسْرَآءِيلَ آیت 93-94
- اس میں چار مسائل ہیں۔ اس شے کا بیان جو یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کی۔ تحریم میں اختلاف کیا یہ اجتہاد کے ساتھ ہوئی یا اللہ تعالیٰ کے اذن سے۔ عرق النساء سے شفا کا بیان
- 666 إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ آیت 96-97
- 666 ان میں پانچ مسائل ہیں مسجد حرام کے بارے بحث، اس کا بیان جس کے بارے میں یہ آیات ہیں اور من دخلہ کا

- حکم
- 666
- 672
- وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ
اس میں نو مسائل ہیں۔ اس کا بیان کہ حج عمر میں ایک بار فرض ہے اور یہ کہ وہ علی التراخی ہے علی الفور نہیں، صغیر اور غلام کے خطاب کا عموم سے خارج ہونا، استطاعت کے معنی میں علماء کے اقوال، اس کا حکم جو حج پر قادر ہو اور پھر ترک کر دے
- 672
- 685
- قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ آیت 98-99
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا آیت 100
اس کا بیان جو کچھ اس و خزر ج کے درمیان زمانہ جاہلیت میں ہوا اور الاعتصام کا معنی
- 687
- 688
- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ آیت 102
اس میں ایک مسئلہ ہے
- 690
- 690
- وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا آیت 103
اس میں دو مسئلے ہیں، جبل کے مراد بہ کا بیان اور فرق اسلامیہ کے منقسم ہونے کا بیان
- 691
- 699
- وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ آیت 104
وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا آیت 105
يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ آیت 106-107
اس میں تین مسائل ہیں
- 700
- 700
- 701
- 704
- تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوَهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ آیت 109
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ آیت 110
اس میں تین مسائل ہیں
- 704
- 705
- لَنْ يَضُرُّكُمْ إِلَّا أَدَىٰ ۖ وَإِنْ يُقَاتِلُوا آیت 111
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثَقِفُوا إِلَّا بِحَبْلِ آیت 112 تا 115
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ آیت 116
مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا آیت 117
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آیت 118
اس میں چھ مسائل ہیں کفار کی طرف مائل ہونے سے تاکید زجر و توخ کا بیان اور یہ کہ دشمن کی شہادت دشمن کے خلاف جائز نہیں
- 713
- 713
- 714
- 715

- 718 هَآأَنْتُمْ أَوْلَآءُ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ آیت 119
- 720 إِنْ تَسْأَلُكُمْ حَسَنَةُ تَسْأَلُهُمْ آیت 120
- 722 وَإِذْ عَدُوَّتٌ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ آیت 121
- 722 اس کے سبب نزول میں اختلاف کا بیان، کیا وہ غزوہ احد ہے یا غزوہ خندق ہے یا یوم بدر ہے
- 723 إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَيْنِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا آیت 122
- 724 طائفتین سے کیا مراد ہے، غزوہ احد سے متعلقہ حدیث کا کچھ بیان، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مرثیہ، توکل کا بیان اور اس کی حقیقت میں اختلاف
- 729 وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ آیت 123 125
- 729 اس میں چھ مسائل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تعداد کا بیان، غزوہ بدر پر بحث، ملائکہ کے ذریعہ مسلمانوں کی امداد کرنے کا بیان اور جنگ کے وقت قبائل اور کتاب کے لیے علامت بنانے پر دلیل کا بیان
- 737 وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَى لَكُمْ آیت 126-127
- 739 لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ آیت 128-129
- 739 اس میں تین مسائل ہیں۔ ان کے سبب نزول کا بیان اور نماز فجر میں قنوت پڑھنے کے بارے علماء کے اختلاف کا بیان
- 742 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا آیت 130 132
- 743 ربا کی ان انواع کا بیان جو وہ زمانہ جاہلیت میں اپناتے تھے
- 743 وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ لَكُمْ وَجَنَّةٍ آیت 133
- 744 اس میں دو مسئلے ہیں جنت، اس کے عرض اور اس کی تخلیق کے بارے علماء کے اقوال کا بیان
- 746 الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالصَّرَّاءِ آیت 134
- 747 اس میں چار مسائل ہیں: کظم الغیظ، عفو اور احسان کے بارے بحث
- 750 وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا آیت 135
- 751 اس میں سات مسائل ہیں: فاحشہ اور اس سے استغفار کرنے کی بحث، گناہ کی طرف لوٹ کر توبہ توڑنے کے بعد توبہ کے صحیح ہونے پر دلیل، ان گناہوں کا بیان جن سے توبہ کی جاسکتی ہے اور کیا یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے یا کسی غیر کا؟
- 758 أُولَٰئِكَ جَزَاءُ مَا كَفَرُوا آیت 136
- 760 وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ آیت 139
- غزوہ احد میں مسلمانوں کو اپنے شہداء اور زخمی افراد کے سبب جوازیت اور تکلیف پہنچی اس پر انہیں تسلی دینے کا بیان

- 760 اور انہیں دشمن کے قتال پر ابھارنے کا بیان
- 760 إِنَّ يَمْسَسْكُمْ قَرْمٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ آیت 140
- 761 لوگوں کے درمیان ایام کے پھرنے کا بیان اور شہید پر تفصیلی بحث
- 763 وَلِيُخَصَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا آیت 141
- 765 وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ آیت 144
- اس میں پانچ مسائل ہیں۔ احد کے دن مسلمانوں کو جو تکلیف پہنچی اس وقت جب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید ہونے کی خبر پہنچی اس کا بیان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن میں تاخیر ان کے بیعت خلافت میں مشغول ہونے کی وجہ سے تھی، آپ پر نماز پڑھنے میں اختلاف، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حالات کی تبدیلی کا بیان
- 766 وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ آیت 145
- 772 اس میں جہاد پر براہیختہ کرنے اور اس کی خبر دینے کا بیان ہے کہ موت ضروری ہے اور یہ کہ مقتول اپنی مدت مقررہ پر مقتول ہوتا ہے اور معتزلہ کا رد کہ موت کے وقت میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے
- 772 وَكَاتِبِينَ مَنِ تَبَى قَتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ آیت 146
- 773 کائن کی بحث اور ربیبین کے معنی میں اختلاف کا بیان
- 773 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يُؤْذُواكُمْ آیت 149-150
- 778 اس میں کافروں کی اطاعت سے تحذیر اور ڈرانے کا بیان ہے
- 778 سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا آیت 151
- احد سے واپس پلٹنے کے بعد مشرکین کے دلوں میں رعب ڈال دینے کا بیان، مخافت کے سبب سے مومنین کی مدد
- 778 (فتح) اور شکست (پسپائی) مکمل نہیں ہوئی
- 780 وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ آیت 152
- 780 غزوہ احد کی خبر کا بیان
- 786 إِذْ تَصْعَدُونَ وَلَا تَلُون عَلَى آیت 153
- 786 صعود اور اصعاد کے درمیان فرق
- 788 لَمْ أَنْزَلْ عَلَيْكُم مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ آیت 154
- 791 إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ آیت 155
- 791 اس سے مراد وہ ہیں جنہوں نے احد کے دن پیٹھ پھیری
- 794 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَلُونُوا كَالَّذِينَ آیت 156

- 794 غزی پر بحث
- 795 وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ آیت 157-158
- 796 فِيمَا رَحِمَهُ مِنَ اللَّهِ لَنْتَ لَهُمْ آیت 159
- 796 اس میں آٹھ مسائل ہیں۔ استشارہ کے معنی کا بیان، شوری قواعد شریعہ میں سے ہے، اس معنی میں علماء کا اختلاف جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اس میں اپنے اصحاب سے مشاورت کریں، اس کا بیان جو مستشار میں شرط ہے اور معنی عزم کا بیان
- 802 إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ آیت 160
- 803 وَمَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغُلَّ آیت 161
- 803 اس میں گیارہ مسائل ہیں، اس آیت کا سبب نزول، غلول کا معنی اور یہ کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور اس کا بیان جو قیامت کے دن غال سے کیا جائے گا۔
- 812 أَفَمِنْ أَتَّبَعَ رِضْوَانُ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ آیت 162-163
- 813 لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ آیت 164
- 813 المنة کے معنی کا بیان
- 814 أَوْلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَهَا آیت 165
- 814 اس کا بیان کہ مسلمانوں کو جو نا کامی ہوئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کے سبب ہوئی
- 815 وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّتَى الْجَعْن آیت 166-167
- 816 أَوَادْفَعُوا کے معنی میں لوگوں کا اختلاف
- 817 الَّذِينَ قَالُوا لِلْإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا أَلَا طَاعُوا مَا قُتِلُوا آیت 168
- 818 وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا آیت 169-170
- 818 اس میں آٹھ مسائل ہیں۔ اس کا بیان جو شہداء اور اس حیات سے متعلق ہے جو شہداء کو حاصل ہوتی ہے، شہداء کو غسل دینے اور ان پر نماز جنازہ پڑھنے میں علماء کا اختلاف اور اس کے بارے علماء کا اختلاف جو ظلماً قتل کیا جائے، یہ آیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونے پر ثواب عظیم پر دلالت کرتی ہے
- 818 يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ آیت 171
- 826 شہداء کی فضیلت کا بیان
- 827 الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ آیت 172
- 828 غزوة حراء الاسد کی خبر

- 831 آیت 173 الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ
الناس سے مراد میں اختلاف اور ایمان میں زیادتی اور کمی ہونے میں اختلاف کا بیان
- 831 آیت 175 إِنَّمَا ذُكِّرْتُكُمْ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ
خوف کے معنی پر تفصیلی بیان
- 834 آیت 176 وَلَا يَحْزَنُكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ
یہ اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام لانے کے بعد پھر مشرکین کے خوف سے مرتد ہو گئے تو حضور نبی کریم
سلی علیہ وسلم غمزدہ ہوئے اور اس کا بیان کہ کافر کے کفر پر غمزدہ ہونا طاعت ہے
- 836 آیت 177 إِنَّ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَصُرُوا لِلَّهِ شَيْئًا
وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُسَلِّي لَهُمْ
اس میں وجوہ اعراب کا بیان
- 838 آیت 179 مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى
اس آیت کے مخاطب میں اختلاف کا بیان
- 839 آیت 180 وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَتَاهُمْ اللَّهُ
اس میں چار مسائل ہیں۔ اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف۔ بخل کے معنی اور اس کے ثمرہ کا بیان اور بخل اور
شیخ کے درمیان فرق
- 843 آیت 181-182 لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ
یہود کا اپنے میں سے اور مومنین میں سے کمزوروں کو شک میں مبتلا کرنے کا بیان
- 847 آیت 183-184 الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَا
ان کے سبب نزول کا بیان
- 848 آیت 185 كُلُّ نَفْسٍ ذَا أَلْفَاظٍ الْمَوْتِ
اس میں سات مسائل ہیں: موت اور اس کی علامات کے اسباب، میت کے غسل اور اس کی تکفین کا بیان، اس کے
ساتھ چلنے اس پر نماز جنازہ پڑھنے اور اسے دفن کرنے کے حکم کا بیان
- 849 آیت 186 لَتُبْلَوْنَ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ
اس کا بیان کہ یہ خطاب حضور نبی کریم سلی علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے آپ سلی علیہ وسلم کے یہود کے ساتھ صلح کرنے اور
ان کے ساتھ معاملات کرنے کا بیان
- 851 آیت 187 وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا

- 859 اس میں دو مسئلے ہیں۔ آیت میں خطاب یہود کو ہے پھر یہ ہر اس کے لیے عام ہے جس نے علم چھپایا
- 861 لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِهَذَا آیت 188
- 861 اس کا بیان جو بعض منافقین غزوؤں سے پیچھے رہنے کا فعل کرتے رہے
- 864 وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ آیت 189
- 864 إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ آیت 190-200
- اس میں پچیس مسائل ہیں: اللہ تعالیٰ کی آیات میں نظر و فکر کرنے اور استدلال کا حکم، اللہ تعالیٰ کا ذکر، مریض اور قاعد (بیٹھنے والا) کی نماز کی کیفیت اور اس کی ہیئت میں علماء کا اختلاف، صحیح سونے والے کی نماز، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں غور و فکر کرنا، اس بارے میں علماء کا اختلاف کہ دو عملوں میں سے کون سا افضل ہے غور و فکر کرنا یا نماز، اس پر دلیل کہ کفار دنیا میں انعام یافتہ نہیں، نجاشی پر نماز پڑھنے کا بیان رباط اور اس کی فضیلت کا بیان اور اس کا بیان کہ رابط کون ہے۔
- 866

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَإِذْ كُرُوا لِلَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۖ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۚ وَآتَقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٣٧﴾

”اور (خوب) یاد کرو لو اللہ تعالیٰ کو ان دنوں میں جو معدودے چند ہیں اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیروہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ ڈرتا رہتا ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اس کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا۔“

قولہ تعالیٰ: وَإِذْ كُرُوا لِلَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ کو فیوں نے کہا ہے کہ معدودات میں الف اور تا عدد کی قلت کو بیان کرنے کے لئے ہیں اور بصریوں کا موقف ہے کہ یہ دونوں قلیل و کثیر کے لئے آتے ہیں اور اس پر دلیل رب العالمین کا یہ ارشاد ہے وَهُمْ فِي الْغُرَفَاتِ اٰصْنُوْنَ ﴿٣٧﴾ (سبا: 37) اور غُرَفَات کثیر ہیں۔ (یعنی غُرَفَات میں الف اور تا کثرت کے بیان کے لئے ہیں اور مَّعْدُودَات میں قلت کو بیان کرنے کے لئے۔ معلوم ہوا یہ دونوں قلیل و کثیر کے لئے آتے ہیں۔)

اور علماء کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس آیت میں أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ سے مراد ایام منیٰ ہیں اور یہی ایام تشریق ہیں، اور یہ تینوں اسماء انہی پر واقع ہوتے ہیں، اور یہی رمی جمار کے ایام ہیں، اور ان کا اطلاق ان تینوں دنوں پر ہوتا ہے جن میں حاجی یوم نحر کے بعد دو دنوں میں جلدی کر کے کوچ کر سکتا ہے۔ پس تو اس پر واقف رہ۔

ثعلبی اور ابراہیم نے کہا ہے کہ أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ دس دن ہیں اور ایام معلومات ایام نحر ہیں۔ اسی طرح مکی اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ سے مراد دس دن ہیں۔ ابو عمر بن عبد البر وغیرہ کے نقل کرنے کی بنا پر جو ہم نے اس بارے میں اجماع ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ (اجماع) یا تو کتابت کی غلطی کی بنا پر ہے یا پھر وہ دس دن مراد ہیں جو یوم نحر کے بعد ہیں اور یہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ میں اپنے بندوں کو اپنے ذکر کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور یہ یوم نحر کے بعد والے تین دن ہیں، یوم نحر ان میں شامل نہیں۔ کیونکہ اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یوم النفر کو کوئی بھی (وہاں سے) کوچ نہیں کر سکتا اور یوم النفر سے مراد یوم النحر کا دوسرا دن ہے (یعنی گیارہویں ذوالحجہ کا دن)۔ اگر یوم نحر أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ میں شامل ہوتا تو پھر یہ جائز ہوتا کہ جو کوئی یوم نحر کو جلدی (وہاں سے) کوچ کرنا چاہتا وہ کر سکتا کیونکہ اس طرح وہ أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ میں سے دو دن وہاں ٹھہر چکا ہوتا۔ (لیکن ایسا کرنا درست نہیں لہذا معلوم ہوا کہ یوم نحر أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ میں شامل نہیں۔)

دارقطنی اور ترمذی وغیرہما نے عبد الرحمن بن عمر الدلیلی سے روایت بیان کی ہے کہ اہل نجد میں سے کچھ لوگ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے جبکہ آپ عرفات میں تھے۔ تو انہوں نے (اس کے بارے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منادی کو حکم ارشاد فرمایا۔ پس اس نے یہ اعلان کیا ”حج تو عرفات میں ہے۔ پس جو کوئی مزدلفہ کی رات طلوع فجر سے پہلے پہلے یہاں آ گیا اس نے حج کو پالیا۔ ایام منیٰ تین ہیں پس جو کوئی جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔“ (۱) یعنی حاجیوں میں سے جو کوئی ایام منیٰ میں سے دو دنوں میں ہی جلدی کر کے چلا گیا تو اس کا قیام بھی منیٰ میں یوم نحر سمیت تین دن ہو گیا۔ اور اس کی مجموعی رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی اور تیسرے دن کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی اور جس کسی نے تیسرے دن کے آخر میں وہاں سے کوچ کیا تو یوم نحر کے سبب اس کے لئے چار دن منیٰ میں قیام ہو گیا اور اس نے رمی کی تعداد پوری کر لی۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایام منیٰ تین دن ہیں اس کے بارے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک دلیل عربی کا یہ قول بھی ہے۔

ما نلتقی الا ثلاث منیٰ حتی یفرق بیننا النفس

ہم منیٰ کے تین دن مل کر اکٹھے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ وہاں سے کوچ ہمیں متفرق کر دیتی ہے۔

پس ایام رمی مَعْدُوذَاتِ کہلاتے ہیں اور ایام نحر معلومات کہلاتے ہیں۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اَیَّام مَعْدُوذَاتِ اور ایام معلومات مجموعی طور پر چار دن ہیں۔ ایک یوم نحر اور تین اس کے بعد۔ ان میں سے یوم نحر (دسویں ذی الحجہ کا دن) یوم معلوم ہے معدود نہیں۔ اور بعد والے دو دن (یعنی گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کا دن) معلوم بھی ہیں اور معدود بھی اور چوتھا دن (یعنی تیرہویں ذوالحجہ کا دن) فقط یوم معدود ہے معلوم نہیں۔ اور یہی حضرت امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کا مذہب ہے۔

اور بلاشبہ اسی طرح ہے کیونکہ پہلا دن ان دنوں میں سے نہیں ہے جو اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق منیٰ کے ساتھ خاص ہیں وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ اور نہ ہی یہ ان میں سے ہے جنہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں معین فرمایا ہے کہ ایام منیٰ ثلاثۃ کہ ایام منیٰ تین ہیں (پس اس سے معلوم ہوا کہ) پہلا دن معلوم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَيَذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (الحج: ۲۸)

(اور وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپایوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے مراد قربانی ہے اور قربانی پہلے دن ہوتی ہے اور یہی یوم الاضحیٰ ہے اور پھر دوسرے اور تیسرے دن ہوتی ہے۔ (یعنی گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کے دن) اور چوتھے دن قربانی نہیں ہوتی اس پر ہمارے علماء کا اجماع ہے۔ (پس اس سے معلوم ہوا کہ) ارشاد باری تعالیٰ: فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ میں چوتھا دن مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں قربانی نہیں کی جاتی اور چونکہ اس میں رمی کی جاتی ہے پس وہ رمی کے سبب ایام معدودات میں سے ہے۔ اور قربانی نہ ہونے کے سبب وہ یوم معلوم نہیں ہے۔

حضرت ابن عربی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس میں حقیقت یہ ہے کہ یوم نحر رمی کے سبب یوم معدود ہے اور ذبح (قربانی) کے سبب وہ یوم معلوم ہے۔ لیکن ہمارے علماء کے نزدیک قول باری تعالیٰ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ میں یہ مراد نہیں ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ آیاتِ مَعْلُومَاتٍ سے مراد دس دن ہیں ان میں سے پہلا دن ذوالحجہ کا پہلا دن ہے اور آخری دن یوم نحر ہے۔ اس بارے میں ان دونوں کا قول مختلف نہیں اور دونوں نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے یہ روایت کیا ہے کہ آیاتِ مَعْلُومَاتٍ سے مراد ایام نحر ہیں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا: حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ اور یہی میرا موقف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَيَذْكُرُوا السَّمِ اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةٍ إِلَّا نَعَامٍ اور امام کرخی نے امام محمد بن حسن رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے کہ آیاتِ مَعْلُومَاتٍ سے مراد تین ایام نحر (قربانی کے دن) ہیں۔ یعنی ایک یوم الاضحیٰ اور دو دن اس کے بعد۔

الکلیا طبری نے کہا ہے (1): کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق مَعْلُومَاتٍ اور مَعْدُودَاتٍ کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں مذکور آیاتِ مَعْدُودَاتٍ سے مراد بلا اختلاف ایام تشریق ہیں۔ اور اس بارے میں کوئی شک نہیں کرتا کہ مَعْدُودَاتٍ ایام عشر کو شامل نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ اور ایام عشر میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے جو دو دنوں (گیارہویں، بارہویں) سے تو تعلق رکھتا ہو اور تیسرے سے نہ رکھتا ہو۔ تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ معلومات دس ہیں اور معدودات ایام تشریق ہیں اور یہی جمہور کا قول ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ابن زید نے کہا ہے: ایام معلومات ذوالحجہ کے دس دن اور ایام تشریق ہیں اور اس میں بہت بعد ہے، ایک تو اس بنا پر جو کچھ ہم نے ذکر کر دیا ہے اور (دوسرا) آیت کا ظاہر بھی اس کا دفاع کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیاتِ مَعْدُودَاتٍ اور مَعْلُومَاتٍ میں ذکر کا بیان کیا ہے وہ بھی اس قول کے خلاف پر دلالت کرتا ہے لہذا اس سے مشغول ہونے کا کوئی معنی نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ (آیت میں) اس ذکر کا مخاطب حج کرنے والا (حاجی) ہے اسے ہی رمی جمار کے وقت تکبیر کہنے کے بارے خطاب کیا گیا ہے (اور یہ کہ وہ تکبیر کہیں) مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپایوں پر (ذبح کے وقت) اور نمازوں کے بعد (تکبیر کہیں) نہ کہ تلبیہ۔ (اب سوال یہ ہے) کیا غیر حاجی بھی اس میں داخل ہے یا نہیں؟ تو وہ نظریہ جو فقہاء امصار اور مشاہیر صحابہ کرام اور تابعین نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ تکبیر کے حکم میں مراد ہر کوئی ہے (چاہے وہ حج کر رہا ہو یا نہیں) خصوصاً اوقات نماز میں، پس وہ ہر نماز کو ادا کرنے کے بعد تکبیر کہے۔ چاہے نمازی اکیلا ہو یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والا ہو۔ ان ایام میں یہ تکبیر ظاہر اور بلند آواز سے کہی جائے گی اور یہی اسلاف رضی اللہ عنہم کی اقتدا ہے۔ اور

مختصر میں ہے: عورتیں نمازوں کے بعد تکبیر نہ کہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے کیونکہ احرام کا حکم مردوں کی طرح انہیں بھی لازم ہے، ”مدونہ“ میں اسی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ جو کوئی نماز کے پیچھے تکبیر کہنا بھول گیا تو وہ تکبیر کہے لے اگر وہ قریب ہو اور اگر دور چلا جائے تو اس پر کوئی شے (کفارہ وغیرہ) لازم نہیں ہوگی۔ ابن الجلاب نے یہی کہا ہے اور حضرت امام مالک نے ”المختصر“ میں کہا ہے: وہ تکبیر کہے جب تک اسی مجلس میں رہے اور جب اپنی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا، تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں اور مدونہ میں امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول ہے: اگر امام تکبیر بھول جائے تو اگر وہ قریب ہی ہو تو وہ بیٹھ جائے اور تکبیر کہے اور اگر دور ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے نہیں اور اگر وہ چلا گیا اور اس نے تکبیر نہ کہی در آنحالیکہ لوگ بیٹھے ہوئے ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ تکبیر کہہ لیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ مدت تکبیر کی دونوں طرفوں میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب، حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ (آدمی) نویں ذی الحجہ کی صبح کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کا دن) کی عصر تک تکبیر کہے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کی صبح سے لے کر یوم نحر کی نماز عصر تک (ہر نماز کے بعد) تکبیر کہے گا۔

صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمہ اللہ علیہما) نے ان دونوں سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے پہلا قول یعنی حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہی لیا ہے۔ پس انہوں نے ابتدائے مدت میں تو اتفاق کیا ہے لیکن انتہا میں نہیں۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ (آدمی) یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن کی نماز صبح تک تکبیر کہے گا۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی قول ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ وہ یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق کے آخر تک تکبیر کہے۔

ابن عربی نے کہا ہے کہ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کو تکبیر کا آغاز کرے گا اور یوم نحر کی عصر کے وقت ختم کر دے گا، تو ان کا یہ قول ظاہر کلام سے خارج ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ** اور یہ ایام تین ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ دونوں میں تکبیر کہے گا تو اس طرح انہوں نے ظاہر کلام کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا کہ (تکبیر کہنے کے ایام) یوم عرفہ اور ایام تشریق ہیں تو انہوں نے کہا: بلاشبہ رب کریم نے ارشاد فرمایا **فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ** (بقرہ: 198) تو اس میں عرفات کا ذکر ایام کے ذکر میں داخل ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہو سکتا تھا اگر وہ یہ کہتے کہ وہ عرفہ کے دن مغرب کی نماز سے تکبیر کہے گا کیونکہ عرفات سے واپس لوٹنے کا وقت تو وہی (مغرب کا وقت) ہے اور جو وقت اس سے پہلے ہے ظاہر لفظ اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ آٹھویں ذی الحجہ (یوم ترویہ) میں سے ہو جو کہ منیٰ میں اترنے کا وقت ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ تکبیر کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے بعد

تین بار تکبیر کہے گا۔ اسے زیاد بن زیاد نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ اور ایک مذہب میں ایک روایت یہ ہے کہ تین بار تکبیر کہنے کے بعد یہ کہا جائے گا: لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر واللہ الحمد اور المختصر میں امام مالک سے یہ الفاظ مروی ہیں۔ اللہ اکبر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، اللہ اکبر واللہ الحمد۔

قول باری تعالیٰ: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ فِي الْأَكْسِيسِ مَسْأَلٌ هِيَ۔

مسئلہ نمبر 1۔ اس مقام پر تعجیل (جلدی کرنا) ہمیشہ دن کے آخری حصہ میں ہوگی اور اسی طرح یہ تیسرے دن ہوگی، کیونکہ ان ایام میں رمی جمار کا وقت زوال کے بعد ہے اور اس پر اجماع ہے کہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ کے سوا کسی پر رمی نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کو اس کے سوا کسی جمرہ پر رمی نہیں کی۔ اور اس کا وقت طلوع شمس سے لے کر زوال تک ہے۔ اور اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ ایام تشریق میں جمرات پر رمی کرنے کا وقت زوال کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ البتہ اس کے بارے اختلاف ہے جس نے جمرہ عقبہ پر رمی طلوع فجر سے پہلے کی یا طلوع فجر کے بعد سورج طرغ ہونے سے پہلے کی۔

حضرت امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد اور اسحاق رحمہم نے کہا ہے: فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے جمرہ عقبہ کی رمی جائز ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم تک ایسی کوئی خبر نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر طلوع ہونے سے پہلے کسی کو رمی کرنے کی رخصت عطا فرمائی ہو۔ لہذا فجر سے پہلے اس کی رمی جائز نہیں اور اگر کسی نے فجر سے پہلے وہاں رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ جمرہ عقبہ کی رمی (طلوع فجر سے پہلے) جائز نہ ہوگی اور اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور ایک گروہ نے طلوع فجر سے پہلے رمی کرنے کی رخصت دی ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی کرتی تھیں اور یہ کہتی تھیں: بلاشبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایسا کرتی تھیں۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے (1)۔ اور یہی قول حضرت عطاء، ابن ابی ملیکہ اور عکرمہ بن خالد سے مروی ہے۔ اور اسی طرح حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے بشرطیکہ رمی نصف رات کے بعد ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی نہیں کی جائے گی۔ مجاہد، نخعی اور ثوری نے یہی کہا ہے۔ اور ابو ثور نے کہا ہے: اگر کسی نے طلوع شمس سے پہلے رمی کی تو اگر (علماء نے) اس میں اختلاف کیا، تو پھر یہ جائز نہیں ہوگی۔ اور اگر انہوں نے اتفاق کر لیا یا اس میں کوئی سنت موجود ہو تو پھر یہ جائز ہوگی۔ ابو عمر نے کہا ہے: جہاں تک ثوری اور ان کی اتباع کرنے والوں کا قول ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب کے بعد جمرہ کی رمی کی اور فرمایا: خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ (احکام حج مجھ سے سیکھ لو) اور ابن منذر نے کہا ہے: سنت یہ ہے کہ رمی جائز نہ ہوگی۔ اگر کسی نے رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جمیع، حدیث نمبر 1659، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ اس طرح کرنے والا اس طریقہ اور سنت کے خلاف کرنے والا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے مقرر فرمایا۔ اور جس کسی نے طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی کی، تو اس پر اعادہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں کسی کے بارے میں نہیں جانتا کہ اس نے کہا ہو ”یہ جائز نہیں ہے۔“

مسئلہ نمبر 2۔ معمر نے بیان کیا ہے کہ مجھے ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ یوم نحر کو مکہ مکرمہ میں صبح کرے اور یہی اس کا دن تھا۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ اس حدیث کے بارے میں ہشام پر اختلاف کیا گیا ہے، پس ایک گروہ نے اسے ہشام عن ابیہ سے مرسل روایت کیا ہے جیسا کہ اسے معمر نے روایت کیا ہے اور دوسروں نے اسے ہشام عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مسند روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اسی طرح حکم ارشاد فرمایا تھا۔ اور بعض دوسروں نے اسے عن ہشام عن ابیہ عن زینب بنت ابی سلمہ عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بھی مسند روایت کیا ہے۔ اور تمام راوی ثقہ ہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے منیٰ میں فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یوم نحر کی صبح مکہ میں کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا اور یہ نہیں ہو سکتا مگر تبھی جبکہ رات کے وقت منیٰ میں فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی ہو۔ واللہ اعلم۔

اور اسے ابو داؤد نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہارون بن عبد اللہ نے ہمیں بیان کیا کہ ابن ابی فدیک ضحاک بن عثمان نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کی رات حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف حکم بھیجا، پس انہوں نے فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی، پھر چلی گئیں اور طواف افاضہ کیا۔ اور یہ دن وہی دن تھا جس میں رسول اللہ ﷺ انہی کے پاس ہوتے تھے (1)۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر جس کسی نے رات کے وقت رمی کی وہ جائز ہے، اور سورج طلوع ہونے سے لے کر زوال تک اختیار ہے۔ ابو عمرو نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بارے پسندیدہ وقت سورج طلوع ہونے سے لے کر اس کے زوال تک ہے۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر کسی نے نحر کے دن سورج غروب ہونے سے پہلے اس پر رمی کی، تو وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی۔

مگر حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ اگر اس نے جمرہ عقبہ کی رمی چھوڑ دی یہاں تک کہ شام ہو گئی تو وہ خون بہائے (یعنی ایک جانور قربانی کرے) اور اسے وہ مقام حل سے لے کر آئے۔ اور ایسے آدمی کے بارے اختلاف ہے کہ جس نے جمرہ پر رمی نہ کی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، پھر اس نے رات کے وقت یا دوسرے دن رمی کی تو اس کے بارے حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس پر دم واجب ہے، اور اس طرح استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمی زمار کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا ہے، اور وہ یوم نحر ہے (2) پس جس نے غروب شمس کے بعد رمی کی، تو اس نے

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جہنم، حدیث نمبر 1658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء من یوم النحر، حدیث 818، ابن ماجہ، باب رمی الجہاد ابام التشریق، حدیث 3043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رمی کا وقت نکلنے کے بعد رجم کی۔ اور جو کوئی بھی حج کے دوران کوئی عمل اس کے وقت کے بعد کرے تو اس پر دم واجب ہوتا ہے۔ حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے: اس پر دم لازم نہیں ہوگا، یہی قول حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ سے بھی ہے۔ اور اسی طرح ابو ثور نے بھی کہا ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کو فرمایا: جب اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے شام ہونے کے بعد رمی کی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا حرج کوئی حرج نہیں ہے۔ (1)

حضرت امام مالک نے فرمایا: جو رمی جمار بھول گیا یہاں تک کہ شام ہو گئی تو پھر رات یا دن کے وقت جس ساعت میں اسے یاد آ جائے وہ رمی کر لے جیسا کہ (بھولنے والا) نماز پڑھ لے جب اسے یاد آ جائے، اور وہ رمی نہ کرے مگر صرف وہی جو فوت ہوئی (یعنی جو رمی اپنے وقت پر نہ ہو سکی) اور اگر وہ ایک جمرہ ہو تو اس پر رمی کرے پھر اس رمی کے بعد جن جمرہوں پر رمی کرنی ہے وہ رمی کرے گا، کیونکہ رمی جمار میں ترتیب واجب ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ وہ پہلے جمرہ کی رمی مکمل کرنے سے پہلے دوسرے جمرہ کی رمی میں شروع ہو جائے جیسا کہ نماز کی رکعتوں میں ایسا کرنا جائز نہیں ہوتا۔ یہی مشہور مذہب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رمی کے صحیح ہونے کے لئے ترتیب واجب نہیں ہے بلکہ جب مکمل رمی ادائیگی کے وقت کے دوران ہو تو وہ جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب رمی کے ایام گزر جائیں تو پھر کوئی رمی نہیں ہے۔ پس اس کے بعد اگر وہ اسے یاد آ جائے جو اس سے صادر ہو رہا ہے درآنحالیکہ ابھی وہ مکہ میں ہی ہو یا مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد، تو اس پر ہدی (قربانی) واجب ہوگی چاہے اس نے مکمل رمی جمار چھوڑ دیا ہو، یا ان میں سے ایک جمرہ کی رمی ترک کر دی ہو، یا ایک جمرہ کی کنکری چھوڑ دی ہو، یہاں تک کہ ایام منیٰ (یعنی ایام رمی) گزر گئے تو اس پر دم واجب ہوگا۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: اگر اس نے مکمل رمی جمار ترک کر دیا تو اس پر دم واجب ہوگا اور اگر ایک جمرہ چھوڑ دیا تو اس پر جمرہ کی ہر کنکری کے بدلے مسکین کو نصف صاع کھانا دینا ہوگا یہاں تک کہ وہ دم کو پہنچ جائے، پھر وہ جو چاہے کھلا دے۔ مگر جمرہ عقبہ کی رمی چھوڑنے کے عوض اس پر دم واجب ہوگا۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ صدقہ کرے گا اگر اس نے کنکری چھوڑ دی۔ اور امام ثوری نے کہا ہے: وہ ایک، دو اور تین کنکریوں کے عوض تو کھانا کھلائے گا اور اگر اس نے چار یا اس سے زیادہ کنکریاں چھوڑ دیں، تو پھر اس پر دم واجب ہوگا، اور فقہ الیث نے کہا ہے: ایک کنکری چھوڑ دینے میں دم واجب ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ اور ان کا دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ ایک کنکری میں ایک مد (2) طعام واجب ہے، دو کنکریوں میں دو مد اور تین کنکریوں میں دم واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ رمی جمار میں سے جو ایام تشریق کے دوران رہ جائے یہاں تک کہ آخری یوم تشریق کا سورج غروب ہو جائے تو تمام کے نزدیک رمی کرنے کا کوئی ذریعہ اور جواز نہیں۔ (آخری یوم تشریق سے مراد) یوم نحر سے لے کر چوتھا دن ہے اور یہ ایام تشریق میں سے تیسرا دن ہے (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کا دن) البتہ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق دم یا کھانا کھانا

1۔ صحیح بخاری، باب الذبح قبل الحلق، حدیث نمبر 1608، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایک پیمانہ جس کی مقدار اہل حجاز کے نزدیک 1.33 رطل اور اہل عراق کے نزدیک 2 رطل ہے

اس کی طرف سے جائز ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ ایام تشریق کی راتیں منیٰ کے علاوہ مکہ مکرمہ یا کہیں اور گزارنا جائز نہیں ہے کیونکہ تمام کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں ہے سوائے چرواہوں کے اور آل عباس کے ان افراد کے جنہیں پانی پلانے کی ولایت حاصل ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منیٰ کی راتیں (حاجیوں کو) پانی پلانے کے لئے مکہ مکرمہ میں گزارنے کی اجازت طلب کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی (1)۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پانی پلانے بارے نگرانی کرتے تھے اور اس کے معاملے کا اہتمام کرتے تھے اور پھر ایام حج میں حاجیوں کو اس کا پانی پلاتے تھے۔ سو اسی لئے آپ کو منیٰ کی بجائے مکہ مکرمہ میں رات گزارنے کی رخصت دی گئی، جیسا کہ اونٹ چرانے والوں کو ان کی حاجت کے پیش نظر رخصت دی گئی، کیونکہ انہیں اونٹ چرانے کے لئے چراگاہ کی طرف نکلنے کی ضرورت ہوتی تھی جو کہ منیٰ سے دور تھی۔

منیٰ کا نام منیٰ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں خون بہایا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ اس کا نام منیٰ رکھا گیا ہے کیونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو کہا: آپ تمنا اور آرزو کیجئے۔ تو آپ نے کہا: "میں جنت کی تمنا کرتا ہوں۔" پس اس کا نام منیٰ رکھ دیا گیا۔ اور فرمایا: اس کا نام جمع بھی رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں حضرت حوا اور حضرت آدم علیہما السلام جمع اور اکٹھے ہوئے ہیں (یعنی ان دونوں کی آپس میں ملاقات ہوئی ہے)۔ اور جمع مزدلفہ کا بھی نام ہے۔ اور یہ المشعر الحرام بھی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ فقہاء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جنہیں رخصت دی گئی ہے حاجیوں کے لئے منیٰ کی راتیں منیٰ میں گزارنا حج کے شعائر اور اس کے احکام میں سے ہے۔ حج اور اس کے تمام احکام پر قیاس کرتے ہوئے عقل (نظر و فکر) حج کے احکام میں سے کسی حکم کو ساقط کرنے والے پر دم واجب کرتی ہے۔ اور مؤطا میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حاجیوں میں سے کوئی بھی منیٰ کی راتیں عقبہ کے پیچھے نہیں گزارے گا۔ اور وہ عقبہ جس کے پیچھے رات گزارنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا ہے یہ وہی عقبہ ہے جو اس جمرہ کے پاس ہے جس پر لوگ یوم نحر کو کنکریاں مارتے ہیں، ان میں سے جو مکہ کے قریب ہیں۔ ابن نافع نے حضرت مالک رحمہ اللہ سے "المبسوط" میں اسے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت مالک نے فرمایا: اور جس نے منیٰ کی راتوں میں سے کوئی رات اس کے پیچھے بسر کی، تو اس پر فدیہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے منیٰ کی راتیں منیٰ کے سوا (دوسری جگہ) بسر کی ہیں۔ اور حج میں ایسا کرنا مشروع ہے لیکن اسے ترک کرنے کے سبب اس پر دم لازم ہوگا، جیسا کہ مزدلفہ کی رات کا حکم ہے۔ اور یہاں امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک فدیہ سے مراد ہدی (قربانی کا جانور) ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ ہدی ہے جسے حل سے حرم کی طرف ہانک کر لایا جائے گا (۲)۔

1۔ سند امام احمد، حدیث نمبر 4731

2۔ امام احناف کے نزدیک یہ راتیں وہاں گزارنا ہی جہار کی سہولت کے لیے ہے وہاں ہی گزارے لیکن اگر کوئی وہاں نہیں رہتا تو اس پر دم واجب نہیں، ہدایہ

مسئلہ نمبر 7۔ حضرت مالک رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کے واسطہ سے ان کے باپ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ابو الہداح بن عاصم بن عدی نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ چرانے والوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی رخصت عطا فرمائی۔ وہ یوم نحر کوری کرتے تھے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ اور بارہویں دونوں کی رمی کرتے تھے، اور پھر یوم النفر (یعنی تیرہویں ذی الحجہ) کو بھی رمی کرتے تھے۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے: حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے اس حدیث کے مقتضا کے مطابق قول نہیں کیا۔ اور وہ کہتے تھے: وہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ پر رمی کرتے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ کوری نہ کرتے تھے اور جب بارہویں ذی الحجہ کا دن آتا، اور یہ ایام تشریق میں سے دوسرا دن ہے، اور یہی وہ دن ہے جس میں وہ لوگ جلدی کوچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو تعجیل (جلدی چلے جانے) کا ارادہ رکھتے ہیں، یا جن کے لئے تعجیل جائز ہوتی ہے، تو وہ اس دن گیارہویں اور بارہویں دونوں کی رمی اکٹھی کرتے تھے، کیونکہ اس طرح وہ اسے ادا کرتے تھے جو ان پر لازم تھا۔ اور آپ کے نزدیک کوئی بھی کسی شے کو ادا نہیں کرتا مگر اس کے بعد کہ وہ اس کے ذمہ واجب ہوتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں اس حدیث کی جو تفسیر بیان کی ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔ اور آپ کے سوا کوئی اور کہتا ہے: جو کچھ امام مالک رحمہ اللہ کی حدیث میں ہے اس کی بناء پر اس تمام میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ تمام کے تمام رمی کے ایام ہیں۔ البتہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک چرواہوں کے لئے رمی کو مقدم کرنا جائز نہیں کیونکہ جو چرواہے نہیں ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایام تشریق میں زوال سے پہلے رمی جمار کریں۔ پس اگر کسی نے زوال سے پہلے رمی کی، تو وہ اس کا اعادہ کرے، ان کے لئے تقدیم جائز نہیں۔ بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوسرے اور تیسرے دن (یعنی بارہویں اور تیرہویں) کی رمی کے بارے میں رخصت عطا فرمائی۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ جو کچھ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں کہا ہے وہ ابن جریج کی روایت میں موجود ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ مجھے محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ کے واسطہ سے خبر دی ہے کہ ابو الہداح بن عاصم بن عدی نے بیان کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت عطا فرمائی کہ وہ واپس چلے جائیں۔ پس وہ یوم نحر کوری کرتے، پھر ایک دن اور ایک رات چھوڑ دیتے، پھر دوسرے دن رمی کرتے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور تیسرے جمرہ کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی جس نے چلے جانے میں جلدی کی۔

ابن ابی زئین نے کہا ہے: جب کوئی جلدی چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو وہ نفاول کے دن (یعنی بارہویں ذی الحجہ) اس پر رمی کرے گا۔ ابن المواز نے کہا ہے: جلدی کوچ کا ارادہ کرنے والا دونوں میں اکیس کنکریاں مارے گا، ہر جمرہ پر سات کنکریاں، تو اس طرح اس کی مجموعی رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی، کیونکہ اس نے دسویں ذی الحجہ کے دن جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں پھینکیں ہیں۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور تیسرے دن کی رمی ساقط ہو جائے گی۔

مسئلہ نمبر 8۔ مالک نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے حضرت عطاء بن ابی رباح بن ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت دی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی جمار کر لیں۔ وہ کہتے

ہیں: ”زمانہ اول میں“ باجی نے کہا ہے کہ قولہ فی الزمن الاول حضور نبی مکرم ﷺ کے زمانہ پر اپنے اطلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ وہی اس شریعت کا زمانہ اول ہے۔ پس اس بنا پر یہ روایت مرسل ہے اور وہ قول یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلا زمانہ ہے جسے حضرت عطاء نے پایا ہو تو پھر یہ روایت موقوف مسند ہوگی۔ واللہ اعلم۔

میں (مصنف) کہتا ہوں کہ یہ روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ کی حدیث سے مسند ہے، اسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اور ہم نے اسے المقتبس فی شرح مؤطا مالک بن انس میں ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ ان (چرواہوں) کے لئے رات کے وقت رمی جمار کو مباح کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ انتہائی نرم رویہ ہے، اور اس میں ان کے لئے انتہائی زیادہ احتیاط ہے جو وہ اونٹ چرانے کا قصد کرتے تھے۔ کیونکہ رات کے وقت نہ وہ چرتے ہیں اور نہ وہ منتشر ہوتے ہیں، پس وہ اس وقت میں رمی کر لیں۔

تحقیق ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جس کی رمی رہ گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، تو اس بارے میں حضرت عطاء رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے: اونٹ چرانے والوں کے سواری کے وقت کسی کے لئے رمی جائز نہیں۔ رہے تجارت، تو ان کے لئے بھی جائز نہیں۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جس کی رمی فوت ہو گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے، تو پھر اسے چاہیے کہ وہ رمی نہ کرے یہاں تک کہ دوسرے دن کا سورج طلوع ہو جائے۔ اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت امام مالک نے فرمایا ہے کہ جب کوئی دن کے وقت رمی چھوڑ دے تو وہ رات کے وقت رمی کر لے اور اس پر ابن القاسم کی روایت کے مطابق دم لازم ہوگا۔ اور آپ نے مؤطا میں یہ ذکر نہیں کیا کہ اس پر دم ہوگا۔ امام شافعی، ابو ثور، یعقوب اور امام محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے: جب کوئی رمی بھول جائے یہاں تک کہ شام ہو جائے، تو وہ رمی کرے گا اور اس پر دم نہیں ہوگا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ رات کے وقت رمی جمار کرنے کی رخصت دیتے تھے۔ امام اعظم ابو حنیفہ نے فرمایا ہے: وہ رمی کرے گا اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی، اور اگر اسے رات کے وقت بھی رمی یاد نہ آئی، یہاں تک کہ دوسرا دن آگیا، تو اس پر لازم ہے کہ وہ رمی کر لے اور اس پر دم لازم ہوگا، اور امام ثوری نے کہا ہے: جب کسی نے بھول کر یا بلا ارادہ رمی کو رات تک مؤخر کر دیا، تو وہ خون بہائے (یعنی جانور قربانی کرے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: چرواہوں میں سے یا پانی پلانے والوں میں سے کسی نے رات کے وقت رمی کی، تو اس پر دم واجب نہ ہوگا۔ (یہ حکم حدیث کے مطابق ہے۔) اور اگر ان کے علاوہ کسی اور نے ایسا کیا، تو عقل و نظر دم واجب کرے گی جبکہ یہ بلا ارادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نحر کو اپنی سواری پر جمرہ عقبہ پر رمی کی۔ اور امام مالک

وغیرہ نے مستحب قرار دیا ہے کہ اس پر رمی کرنے والا سوار ہو، حالانکہ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر اور حضرت سالم بن عبد اللہؓ پیدل حالت میں رمی کرتے تھے اور چاہیے کہ ہر روز تینوں جمروں پر اکیس کنکریاں رمی کرے، اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہے، اور رمی کرتے وقت اس کا چہرہ قبلہ شریف کی طرف ہو، اور جمرات ترتیب کے ساتھ رکھے، نہ انہیں اکٹھا کرے اور نہ ہی انہیں متفرق کرے اور نہ انہیں اوندھا رکھے، وہ جمرہ اولیٰ سے ابتدا کرے اور اس پر سات کنکریاں مارے، وہ انہیں اس کے پاس رکھ نہیں دے گا۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب رائے نے کہا ہے۔ پس اگر اس نے انہیں پھینک دیا تو یہ اصحاب رائے کے نزدیک جائز ہے۔

ابن قاسم نے کہا ہے: دونوں صورتوں میں تمام کنکریاں پھینک دینا جائز نہیں ہے۔ یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ کنکریاں مارتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک ہی بار دو یا دو سے زیادہ کنکریاں نہیں پھینکنی چاہئے۔ پس اگر اس نے ایسا کیا، تو وہ اسے ایک کنکری شمار کرے۔ اور جب وہ ایک جمرہ سے فارغ ہو جائے تو وہ اس کے سامنے کی طرف آگے بڑھے اور طویل وقت تک دعا کے لئے کھڑا رہے اور جو میسر آئے (وہی مانگے) بعد ازاں دوسرے جمرہ پر رمی کرے اور یہ جمرہ وسطیٰ ہے اور وہ اس سے وادی کے بطن میں شمال کی طرف پھر جائے اور اس کے پاس بھی دعا کے لئے طویل وقت تک وقوف کرے۔ پھر تیسرے جمرہ پر کنکریاں مارے اور یہ جمرہ عقبہ ہے، اس پر بھی سات کنکریاں مارے گا اور اس کے نیچے کی جانب سے اس پر کنکریاں پھینکے گا اور اس کے پاس کھڑا نہیں ہوگا۔ اگر کسی نے اس پر اس کی اوپر کی جانب سے رمی کی تو وہ بھی اس کی طرف سے جائز ہے اور وہ رمی کے دوران ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہے گا۔ رمی جمار کے دوران سنت ذکر تکبیر ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور ذکر اور وہ پیدل رمی کرے گا بخلاف یوم نحر کے جمرہ کے۔ یہ سب کا سب (حکم) توقیفی ہے۔ نسائی اور دارقطنی نے اسے حضرت زہری سے مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اس جمرہ پر رمی کرتے تھے جو مسجد منیٰ کے ساتھ متصل ہے تو آپ اس پر سات کنکریاں مارتے تھے اور جب بھی ایک کنکری پھینکتے تو ساتھ تکبیر (اللہ اکبر) کہتے تھے۔ پھر اس سے آگے بڑھتے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے اور آپ طویل وقت تک کھڑے رہتے تھے۔ پھر آپ ﷺ دوسرے جمرہ کے پاس آتے تھے اور اسے سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ پھر آپ بائیں جانب اس جگہ کی طرف نیچے اترتے جو وادی کے ساتھ متصل ہے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے۔ پھر آپ ﷺ اس جمرہ کے پاس آتے جو عقبہ کے پاس ہے اور اس پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے، پھر واپس پھر جاتے اور اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔ زہری نے کہا ہے: میں نے حضرت سالم بن عبد اللہ کو اپنے باپ سے اور انہیں حضور نبی رحمت ﷺ سے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 10۔ کنکریوں کا حکم یہ ہے کہ وہ پاک ہوں، ناپاک نہ ہوں اور نہ ہی ان میں سے ہوں جو پہلے ماری جا چکی

1۔ بخاری شریف، باب رفع الیدین عند الجمرة، حدیث نمبر 1634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں، سواگر کسی نے ایسی کنکری ماری جو پہلے ماری جا چکی ہو تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک وہ جائز نہیں۔ تحقیق ان سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے: اگر ایسا ایک کنکری میں ہو تو آپ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور میں ابن قاسم کے پاس آیا تو انہوں نے اس کے بارے فتویٰ دیا۔

مسئلہ نمبر 11۔ اہل علم نے مستحب قرار دیا ہے کہ وہ کنکریاں مزدلفہ سے اٹھائے نہ کہ وہ جو مسجد میں پڑی ہیں اور اگر کسی نے ضرورت سے زیادہ کنکریاں اٹھالیں اور رمی کرنے کے بعد وہ اس کے پاس باقی بچ رہیں تو وہ انہیں دفن کر دے، انہیں پھینکے نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ جمہور کے نزدیک کنکریوں کو دھویا نہیں جائے گا۔ طاؤس نے اس میں اختلاف کیا ہے حالانکہ یہ روایت موجود ہے کہ اگر اس نے ناپاک کنکریوں کو نہ دھویا یا ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی جو پہلے ماری جا چکی تھیں تو اس نے گناہ کیا اور آپ نے اس کی طرف سے رمی کو جائز قرار دیا۔

ابن منذر نے بیان کیا ہے: یہ مکروہ ہے کہ وہ ان کنکریوں کے ساتھ رمی کرے جن کے ساتھ پہلے رمی کی جا چکی ہو۔ اگر ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی گئی تو وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی، کیونکہ میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا جس نے ایسا کرنے والے پر رمی کا اعادہ واجب قرار دیا ہو اور نہ ہی ہم اخبار میں سے کوئی ایسی خبر جانتے ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکری کو دھویا ہو اور نہ ہی آپ نے اسے دھونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ تحقیق ہم نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ وہ کنکریاں دھوتے تھے۔

مسئلہ نمبر 13۔ رمی جمار میں مٹی کا ڈھیلا پھینکنا جائز نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی ایسی شی جو پتھر نہ ہو۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خشک مٹی کا ڈھیلا جائز ہوگا۔ اسی طرح ہر وہ شے جو اس نے پھینکی اور اس کا تعلق زمین سے ہو، تو وہ جائز ہوگی۔

امام ثوری نے کہا ہے: جس نے مٹی کے ڈھیلے اور ٹھیکری کے ساتھ رمی کی تو وہ رمی کا اعادہ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے: سنگریزوں کے سوا رمی جائز نہیں ہوگی۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر انگلیوں سے کنکریاں پھینکنا لازم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رمی کنکریوں کے ساتھ تھی۔

مسئلہ نمبر 14۔ کنکری کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: وہ طولاً اور عرضاً پورے سے چھوٹی ہوگی۔ اور ابو ثور اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: ٹھیکری کی کنکری کی مثل ہوگی۔ اور ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ بکری کی میٹنی کے برابر کنکری کے ساتھ رمی کرتے تھے۔ اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے اس قول کا کوئی معنی نہیں ہے: اس سے بڑی میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؛ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیکری کی کنکری کی مثل کے ساتھ رمی کی سنت قائم فرمائی ہے۔ البتہ جس پر حصاة کا نام واقع ہو سکے اس کے ساتھ رمی کرنا جائز ہے اور سنت کی اتباع کرنا افضل ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ صحیح قول (یا عمل) جس کا خلاف کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوتا جو ہدایت یافتہ ہو اور اقتدا کرے (وہ یہ ہے کہ) امام نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح ارشاد فرمایا: در آنحالیکہ آپ اپنی سواری پر تھے: میرے لئے کنکریاں چن کر لاؤ۔ چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کنکریاں چنیں، وہ ٹھیکری کی کنکریوں کی مثل تھیں۔ پس جب میں نے انہیں آپ کے دست مبارک میں دیا تو فرمایا: ہاں انہی کی مثل (یعنی رمی کے لئے اتنی مقدار ہی مناسب اور موزوں ہے۔) اور تم دین میں غلو کرنے سے بچو۔ بلاشبہ جو تم سے پہلے تھے انہیں دین میں غلو کرنے نے ہلاک کر دیا (1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد و آیاتکم والغلو فی الذین بڑی کنکریوں کے ساتھ رمی کرنے کی کراہت پر دلیل ہے۔ بلاشبہ یہ غلو میں سے ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 15۔ وہ آدمی جس کے ہاتھ میں کنکری باقی ہو، وہ نہ جانتا ہو یہ کون سی کنکریوں میں سے ہے تو وہ اسے پہلی میں سے بنائے (یعنی اسے جمرہ اولیٰ پر مارے) اور اس کے بعد پھر وسطیٰ اور آخری پر رمی کرے۔ اور اگر زیادہ وقت گزر جائے تو پھر مکمل رمی نئے سرے سے کرے۔

مسئلہ نمبر 16۔ امام مالک، امام شافعی، عبد الملک، ابو ثور اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ نے اس کے بارے کہا ہے جس نے ایک جمرہ پر دوسرے جمرہ کو مقدم کر دیا: وہ رمی اس کی طرف سے جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ پے در پے اور لگاتار رمی کرے۔ حسن، عطا اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور بعض لوگوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا ہے کہ ”جس کسی نے ایک حکم کو دوسرے حکم پر (جو کہ متصل اس کے بعد ہو) مقدم کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں“۔ اور فرمایا: یہ اس آدمی سے زیادہ نہیں ہوگا جس پر کئی نمازیں اور روزے جمع ہو گئے اور اس نے بعض کو بعض سے پہلے قضا کر لیا۔ پہلے قول میں احتیاط زیادہ ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 17۔ مریض کے رمی کرنے اور اس کی طرف سے رمی کیے جانے کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ایسے مریض اور بچے کی جانب سے رمی کی جائے گی جو رمی کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور مریض ان کی رمی کے وقت کوشش کرے کہ وہ ہر جمرہ کے لئے سات تکبیریں کہے اور اس پر ہدی (قربانی) ہو گی، اور جب مریض رمی کے ایام میں تندرست ہو جائے اور وہ خود اپنی طرف سے رمی کر لے، اس کے باوجود اس پر امام مالک کے نزدیک دم واجب ہوگا۔

امام حسن، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مریض کی طرف سے رمی کی جائے گی اور انہوں نے ہدی کا ذکر نہیں کیا۔ اور وہ بچہ جو رمی پر قدرت نہیں رکھتا اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کی طرف سے رمی کی جائے گی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 18۔ دارقطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض

کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ کنکریاں جو یہاں ہر سال پھینکی جاتی ہیں تو ہم گمان کرتے ہیں کہ یہ کم ہو جاتی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ ان میں سے جو قبول کر لی جاتیں ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں، اور اگر اس طرح نہ ہو تو تو انہیں پہاڑوں کی مثل دیکھے (1)۔

مسئلہ نمبر 19۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ حاجیوں میں سے جو منیٰ سے نفراول کے دن اپنے شہر کی طرف واپس جانے کے لئے نکلنے کا ارادہ کرے، درآنحالیکہ وہ (شہر) حرم سے باہر ہو اور وہ مکہ مکرمہ میں مقیم نہ ہو، تو اسے چاہئے وہ زوال شمس کے بعد کوچ کرے، بشرطیکہ وہ یوم نحر سے متصل دن میں شام سے پہلے پہلے رمی کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ترجمہ ”اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں“ پس جو وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ کوچ کرے جب تک کہ ابھی دن موجود ہو۔ تحقیق ہم نے حضرت نخعی اور حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں نے کہا: ایام تشریق کے دوسرے دن جسے عصر کی نماز کا وقت منیٰ میں ہو گیا، تو وہ آنے والے دن کی صبح تک وہاں سے کوچ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ دونوں نے یہ قول بطور استحباب کیا ہے اور پہلا قول جو ہم کہتے ہیں وہ ظاہر کتاب و سنت کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ اہل مکہ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ کیا نفراول کے دن (منیٰ سے) جاسکتے ہیں؟ تو ہم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تمام لوگوں میں سے جو چاہے نفراول کے دن وہ وہاں سے جاسکتا ہے سوائے آل خزیمہ کے وہ صرف نفر ثانی کے دن ہی وہاں سے کوچ کر سکتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے اس آدمی پر کوئی تعجب نہیں جس نے کوچ کے پہلے دن وہاں سے کوچ کیا تا کہ وہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہو جائے۔ مزید فرمایا: اہل مکہ تو نسبتاً زیادہ جلدی کرتے ہیں۔

امام احمد اور اسحاق نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول الا آل خزیمہ کا معنی یہ بیان کیا ہے کیونکہ وہ اہل حرم ہیں۔ اور حضرت امام مالک اہل مکہ کے بارے میں فرماتے ہیں: جس کے لئے کوئی عذر ہو اس کے لئے تو جلدی کر کے دو دنوں میں وہاں سے چلے جانا جائز ہے۔ اور اگر کوئی امور حج میں سے کسی کے بارے میں محض اپنے لئے تخفیف کا ارادہ کرے تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ تو گویا آپ نے تعجیل کا حکم ان کے لئے قرار دیا جن کا علاقہ دور ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت اپنے عموم پر ہے، رخصت تمام لوگوں کے لئے ہے، چاہے وہ اہل مکہ ہوں یا دوسرے، کوئی منیٰ سے نکل کر مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کا ارادہ کرے یا اپنے شہر کی طرف جانے کا قصد کرے۔ حضرت عطاء نے کہا ہے: یہ آیت عام لوگوں کے لئے ہے۔ ابن منذر کا قول حضرت امام شافعی کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور نخعی رحمہم اللہ نے ارشاد فرمایا ہے: ایام معدودات میں سے دوسرے دن جس نے منیٰ سے کوچ کیا تو اس پر کوئی حرج (گناہ) نہیں اور جو تیسرے دن تک وہاں ٹھہر گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ پس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ سب مباح ہے۔ اور اس کی اس تقسیم کو اہتمام اور تاکید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ

عربوں میں سے کچھ تھے جو جلدی کر کے وہاں سے چلے جانے والے کی مذمت کرتے تھے اور اس کا برعکس (یعنی کچھ ایسے تھے جو تاخیر کرنے والے کی مذمت کرتے تھے) تو ان تمام سے گناہ کو اٹھانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ (یعنی جس نے جو طریقہ بھی کیا چاہے جلدی کی یا تاخیر کی کسی کے لئے بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔)

حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہم نے بھی کہا ہے: مَنْ تَعَجَّلَ کا معنی ہے جس نے جلدی کی تحقیق اسے بخش دیا گیا اور جس نے تاخیر کی تحقیق اسے بھی بخش دیا گیا، اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: ”جس نے اس بیت اللہ شریف کا حج کیا اور اس نے رقت و فسق کا ارتکاب نہ کیا تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا جیسا کہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا۔“ (1)

اور ارشاد باری ہے: فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ یہ بھی نفی عام ہے اور براءت مطلقہ ہے۔

اور مجاہد نے بھی کہا ہے: آیت کا معنی ہے جس نے جلدی کی یا جس نے تاخیر کی تو اس پر آنے والے سال تک کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اس قول میں اثر کو بیان کیا گیا ہے۔

ابو العالیہ نے آیت کے بارے میں کہا ہے: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنی بقیہ عمر متقی بن کر رہا اور حج کرنے والے کے لئے یقینی مغفرت ہے، یعنی اس کے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں اگر وہ اپنی بقیہ عمر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا۔

ابو صالح وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے ”اس پر کوئی گناہ نہیں ہے جو شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا اور ہر اس شے سے جس سے اجتناب کرنا حج کے دوران اس پر واجب ہوتا ہے اور یہ بھی کہا: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنے حج میں بچتا رہا اور اسے مکمل: ادا کر دیا یہاں تک کہ وہ ہر قسم کے شبہ اور خیانت سے پاک تھا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قول باری تعالیٰ فَمَنْ تَعَجَّلَ میں، مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ خبر ہے۔ اور قرآن کے علاوہ اسے فلا اثم علیہم پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ مَنْ جمع کے معنی کے لئے ہے، جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ (یونس: 42) میں مَنْ جمع کے لئے ہے۔ اور وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ میں بھی اسی طرح ہے اور لِمَنِ اتَّقَى میں لام غفران سے متعلق ہے۔ اور تقدیر کلام اسی طرح ہے السَّغْفَرَةُ لِمَنِ اتَّقَى یعنی مغفرت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ مغفرت اس کے لئے رکھی گئی ہے جو حج سے واپس لوٹنے کے بعد تمام گناہوں سے بچتا رہا۔

اور خفش نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے ذَلِكَ لِمَنِ اتَّقَى وہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کے لئے (مغفرت ہے) جو حالت احرام اور حرم میں شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ہے الا باحة لِمَنِ اتَّقَى اباحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولا فسوق ولا جدال فی الحج، حدیث نمبر 1691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ قول بھی ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے: السلا مة لمن اتقى سلامتی اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وَاذْكُرُوا کے متعلق ہے۔ یعنی الذکر لمن اتقى یعنی نصیحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ اور سالم بن عبد اللہ نے فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ میں تخفیف الف کو ملا کر پڑھا ہے۔ اور عرب اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

ان لم اقاتل فالبسوانی برقعاً

اگر میں نے قتال نہ کیا تو تم مجھے برقعہ پہنا دینا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور حشر و وقوف کو یاد رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ ۖ وَهُوَ
الْذَّالِخِصَامِ ۝۲۰

”اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی زندگی کے بارے میں اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ (حق کا) سخت ترین دشمن ہے۔“
اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ جب ان لوگوں کا ذکر کیا جن کی ہمتیں اور توانائیاں دنیا پر ہی محدود و محصور ہو گئیں (یعنی ان کی صلاحیتیں اور کوششیں فقط دنیا کے لیے ہی صرف ہوئیں) (یعنی) اس ارشاد گرامی میں فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا (بقرہ: 200) اور ان مومنین کا ذکر کیا جنہوں نے دونوں جہان کی خیر اور منفعت کا سوال کیا، تو اب منافقین کا ذکر کیا، کیونکہ انہوں نے ایمان کو ظاہر کیا اور کفر کو چھپا کر رکھا۔

سدی وغیرہ مفسرین نے کہا ہے: یہ آیت اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا نام ابی تھا اور اخنس اس کا لقب تھا۔ اس کا یہ لقب اس لئے تھا کیونکہ وہ غزوہ بدر کے دن اپنے حلفاء میں سے بنی زہرہ کے تین سوا افراد کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کرنے سے پیچھے ہٹ گیا تھا (اور لشکر کفار سے واپس چلا گیا تھا) جیسا کہ اس کی تفصیل سورہ آل عمران میں آئے گی۔ وہ انتہائی شیریں بیان اور حسین المنظر آدمی تھا۔ سو اس کے بعد وہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور اپنا اسلام ظاہر کیا اور یہ کہا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے میں اپنے قول میں سچا ہوں، پھر اس کے بعد بھاگ گیا۔ اس کا گزر مسلمانوں میں سے ایک قوم کی کھیتی کے پاس سے ہوا اور وہاں ساتھ گدھے بھی تھے، تو اس نے کھیتی کو جلا دیا اور گدھوں کی کونچیں کاٹ دیں۔ مہدوی نے کہا ہے: اسی کے بارے میں یہ آیات بھی نازل ہوئیں وَلَا تُطْعَمُوا كُلَّ حَلَّافٍ مَّهْمًا ۖ هَٰذَا مَثَلٌ ۖ هَٰذَا مَثَلٌ ۖ (قلم) (اور نہ بات مانے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی جو بہت نکتہ چین، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے) اور وَبِئْسَ لِكُلِّ هُمْزَةٍ لُّمَزَةً ۖ (ہمزہ) (اور ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لئے جو (رو برو) طعنے دیتا ہے) (پیچھے پیچھے) (عیب جوئی کرتا ہے۔) (ابن عطیہ نے کہا ہے: کبھی بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ اخنس نے اسلام قبول کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منافقین کی ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں باتیں کیں جو غزوہ رجب میں شہید کر دیے گئے یعنی حضرت عاصم بن ثابت اور حضرت خبیب وغیرہ رضی اللہ عنہم، منافقین نے کہا: ان لوگوں پر افسوس ہے کہ نہ یہ اپنے گھروں میں بیٹھے اور نہ ہی یہ اپنے صاحب (مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) کا پیغام پہنچا سکے۔ پس یہ آیت منافقین کی صفات کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر غزوہ رجب میں جام شہادت نوش کرنے والوں کا ذکر اس طرح فرمایا: **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِى نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ** (بقرہ: 207) (اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے۔)

حضرت قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس (بندے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے باطن میں کفر، نفاق، کذب یا اضرار (کسی کو نقصان اور ضرر پہنچانا) چھپا ہو اور وہ اپنی زبان سے اس کے خلاف اظہار کرتا ہو۔ پس یہ آیت عام ہے اور یہ اس حدیث سے مشابہت رکھتی ہے جو ترمذی میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب میں ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک قوم ہوگی جن کی زبانیں شہد سے زیادہ شیریں ہوں گی اور ان کے دل مبصر سے زیادہ کڑوے ہوں گے۔ وہ نرمی سے بھیڑوں کے چمڑے لوگوں کو پہنائیں گے اور وہ دین کے عوض دنیا خریدیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: کیا وہ مجھے دھوکہ دیتے ہیں اور وہ مجھ پر جرات کرتے ہیں؟ مجھے قسم ہے میں ضرور بضروران پر ایسا فتنہ مسلط کر دوں گا جو ان میں سے حلیم کو حیران و ششدر کر چھوڑے گا (1)۔

ارشاد باری تعالیٰ **وَيُشْهِدُ اللَّهُ** کا معنی یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ جانتا ہے بلاشبہ میں حق کہہ رہا ہوں۔ ابن محیسن نے اسے **وَيُشْهِدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ** یعنی یشہد میں یا اور ہا کو مفتوح اور لفظ اللہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے ”اس کی بات تجھے پسند آئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے قول کے خلاف کو جانتا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ** (المنافقون) (لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعاً جھوٹے ہیں۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت **وَاللَّهُ يَشْهَدُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ** اور جماعت کی قراءت مذمت میں زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس پر اچھا کلام لازم کرنے کی قوت رکھی اور پھر اس کے باطن سے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔ اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے **وَيُشْهِدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ** پڑھا ہے۔ اور یہ جمہور کی قراءت کی دلیل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان امور کے بارے میں انتہائی احتیاط برتنے پر دلیل اور تنبیہ ہے جو دین اور دنیوی امور سے متعلق ہیں اور گواہوں اور قاضیوں کے احوال کے بارے میں طلب براءت پر دلیل ہے، بلاشبہ حاکم لوگوں کے ظاہر احوال پر اور جو کچھ ان کے ایمان اور مصالح میں سے ظاہر ہو اس پر عمل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ ان کے باطن کے بارے میں بحث کر لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے احوال بیان فرما دیے ہیں۔ اور بلاشبہ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو بظاہر انتہائی خوبصورت اور حسین بات کرتے ہیں حالانکہ وہ نیت قبیح کرتے ہیں (یعنی ان کی نیت میں فتور اور برائی ہوتی ہے۔)

پس اگر کہا جائے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی اس کے معارض آتا ہے: ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہیں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، الحدیث۔ (1)

اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس کے خلاف ہے: ”پس میں اس کے لئے اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں جو میں سنتا ہوں“ (2)۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح ابتدائے اسلام میں تھا، جہاں ان کا اسلام ہی ان کی سلامتی کا باعث تھا لیکن جب فساد عام ہو گیا تو پھر یہ حکم نہ رہا۔ حضرت ابن عربی رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح بات یہ ہے کہ ظاہر کے مطابق عمل کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کا خلاف ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: صحیح بخاری میں ہے: اے لوگو! بلاشبہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، بلاشبہ اب ہم تمہیں تمہارے ان اعمال سے پکڑیں گے جو ہمارے لئے ظاہر ہوں گے۔ پس جس نے ہمارے لئے خیر اور بھلائی کو ظاہر کیا تو ہم اسے امن عطا کریں گے اور ہم اسے قرب عطا کریں گے۔ اس کے اسرار اور پوشیدہ چیزوں میں سے کوئی شے ہمارے لئے (باعث تشویش) نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی پوشیدہ چیزوں کے بارے میں اس کا محاسبہ فرمائے گا اور جس نے ہمارے لئے برائی کو ظاہر کیا، تو ہم نہ اسے امان دیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے، اگرچہ وہ کہے کہ اس کے دل اور ارادہ میں نیکی اور اچھائی ہے۔ (3)

مسئلہ نمبر 3۔ ارشاد باری تعالیٰ وَهُوَ الَّذِي الْخَصَامِ اس میں الَّذ سے مراد سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: هُوَ رَجُلٌ أَلْدَا وَأَمْرًا لَدَاءً (وہ سخت جھگڑالو مرد اور وہ سخت جھگڑالو عورت ہے۔) وہم اهل لَدَا اور وہ سخت جھگڑا کرنے والے ہیں۔ وَقَدْ لَدِدْتُ اس میں دال مکسور ہے (تو نے جھگڑا کیا) تَلَدْتُ یہ عین کلمہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ لَدَا (یعنی یہ باب سَبَعٌ يَسْمَعُ ہے۔) یعنی تو سخت جھگڑالو ہو گیا۔ اور لَدَدْتُ اَلْدَا یعنی پہلے میں دال مفتوح ہے اور دوسرے میں مرفوع ہے۔ یہ تب کہا جائے گا جب تو کسی سے جھگڑا کرے اور تو اس پر غالب آجائے۔ اور اَلْدَا یہ التَّيْدِيدِین سے مشتق ہے۔ اس سے مراد گردن کی دونوں سطیہیں ہیں یعنی جھگڑا میں جس جانب سے بھی پکڑ لیا جائے غلبہ پالیا جاتا ہے۔

شاعر کا قول ہے:

وَالَّذِي حَنْقٍ عَلَيَّ كَأَنَّمَا تَغْلِي عِدَاوَةٌ صَدْرَةً فِي مَرَجَلٍ
وہ بڑی شدت اور سختی کے ساتھ میرے گلے کو دبانے والا ہے، گویا کہ اس کے سینے کی عداوت ہنڈیا میں کھول رہی ہے۔
ایک دوسرے شاعر نے کہا:

ان تحت التراب عزماً و حزماً و خصيماً ألد ذامغلاق

1۔ بخاری شریف، باب قتل من ابى قبول الفرائض الخ، حدیث نمبر 6413، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

2۔ بخاری شریف، باب اذا نصب جارية الخ، حدیث نمبر 6452، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

3۔ بخاری شریف، باب الشهداء العدول، حدیث نمبر 2447، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

اس میں بھی خصیہ الدّٰخِیۃ جھگڑالو کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

آیت میں الخصام خاصم کا مصدر ہے۔ امام ظلیل نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خصم کی جمع ہے۔ یہ قول زجاج کا ہے، جیسا کہ کلب کی جمع کلاب، صعب کی جمع صعاب اور ضخم کی جمع ضخام ہے۔ اور اس کا معنی ہے جھگڑا کرنے والوں میں سے سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا، یعنی سخت جھگڑالو، جب وہ تجھ سے بات کرے اور تجھ پر بات دہرائے اور تو اس کے کلام کو خوبصورت اور حسین دیکھے درآنحالیکہ اس کے باطن میں باطل ہو۔ یہ (معنی) اس پر دلالت کرتا ہے کہ جھگڑا کرنا جائز نہیں ہوتا مگر ایسے سبب سے جس کا ظاہر اور باطن برابر ہو۔ اور صحیح مسلم (1) میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے مبغوض ترین آدمی سخت جھگڑا کرنے والا ہے۔“

وَ اِذَا تَوَلَّى سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثُ وَ النَّسْلُ ۗ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفُسَادَ ۝

”اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دے اور تباہ کر دے کھیتوں کو اور نسل انسانی کو۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔“

ارشاد باری تعالیٰ: وَ اِذَا تَوَلَّى سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا کے تحت کہا گیا ہے کہ تَوَلَّى اور سَعٰی فعل قلب میں سے ہیں۔ پس تَوَلَّى، ضَلَّ وَ غَضِبَ وَ اِنْفَیْ نَفْسِہ کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی وہ گمراہ ہو گیا، غصے ہو گیا اور اس نے اپنے دل میں اسے ناپسند کیا۔ اور سَعٰی کا معنی ہے اس نے اپنے حیلہ اور ارادہ کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام پر مصائب لانے کی کوشش کی۔ یہ ابن جریج وغیرہ سے منقول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ دونوں آدمی کے فعل ہیں۔ پس تَوَلَّى بمعنی ادبر (پیٹھ پھیرنا) آتا ہے، یعنی اے محمد! ﷺ اس نے پیٹھ پھیری اور وہ آپ سے چلا گیا اور سَعٰی کا معنی ہے: اور وہ اپنے قدموں کے ساتھ چلا اور اس نے راستہ طے کیا اور اسے پامال کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے: دونوں کوششیں فساد ہیں۔ کہا جاتا ہے: سَعٰی الرجل یسعی سعیا۔ یعنی آدمی نے دوڑ لگائی۔ اور اسی طرح جب وہ کام کرے اور کچھ کمائے تو یہ کہا جاتا ہے: فلاں یسعی علی عیالہ یعنی فلاں اپنے گھروالوں کے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ وَ یُهْلِكَ یہ لِیُفْسِدَ پر معطوف ہے۔ اور حضرت ابی بنی شہر کی قراءت میں وَ یُهْلِكَ ہے۔ حسن اور قتادہ نے اسے وَ یُهْلِكَ رَفَع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کے رفع کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ اس کا عطف یُعْجِبُکَ پر ہے (اس لئے مرفوع ہے) اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ سَعٰی پر معطوف ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے ”وہ سر توڑ کوشش کرتا ہے اور

1۔ بخاری شریف، قول اللہ تعالیٰ وَ هُوَ الَّذِیْ یُخْصِمُ مَدِیْنَتَہُمْ 2277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تباہ کرتا ہے۔“ اور ابواسحاق نے کہا ہے: یہ اصل عبارت دھو یُہْلِكُ ہے یعنی وہ تباہ کرتا ہے۔ اور ابن کثیر سے ویُہْلِكُ یعنی یاء کے فتح اور کاف کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔

اور الْحَرْثُ وَالنَّسْلُ، یُہْلِكُ کے سبب دونوں مرفوع ہیں۔ اور یہی حسن، ابن ابی اسحاق، ابو حیوہ اور ابن محیسن کی قراءت ہے۔ اور عبدالوارث نے اسے ابو عمرو سے روایت کیا ہے۔

اور ایک قوم نے اسے ویُہْلِكُ یعنی یا اور لام کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور الحرث کو رفع دیا ہے۔ اور لغوی طور پر هَلَكَ یُهْلِكُ یہ رَكَنٌ یَزْکُنُ، اَبی یأبی، سَلٰی یسلی، قَلٰی یقلی اور ان کے مشابہ افعال کی مثل ہے۔ اور آیت میں مراد اخص کا کھیتی کو جلانا اور گدھوں کو قتل کرنا ہے۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے مفسرین نے کہا: لیکن اب یہ آیت تمام لوگوں کے لئے عام ہو گئی ہے۔ پس جو بھی اس کے عمل کی طرح عمل کرے گا وہی اس لعنت اور سزا کا مستحق ہوگا۔

بعض علماء نے کہا ہے: بے شک جو گدھے کو قتل کرتا ہے یا اناج کے ڈھیر کو جلاتا ہے وہ مستوجب ملامت ہے اور یوم قیامت تک اسے یہ عیب لاحق رہے گا۔

مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ ظالم زمین میں فساد برپا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارش کو روک لیتا ہے اور وہ کھیتی اور نسل (انسانی) کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحرث (کھیتی) سے مراد عورتیں ہیں اور النسل سے مراد اولاد ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کیونکہ نفاق متفرق اور متضاد گفتگو اور قتال کے وقوع تک پہنچاتا ہے اور اسی میں مخلوق کی ہلاکت ہے۔

زجاج نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ السعی فی الارض کا معنی ہے سرعت اور تیزی کے ساتھ چلنا۔ اور یہ لوگوں کے درمیان (فساد کی) انگینت اور فتنہ برپا کرنے سے عبارت ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ”بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ تمام کو اپنی جانب سے دی جانے والی سزا میں شامل کر لے۔“ عنقریب اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: الْحَرْثُ وَالنَّسْلُ لَغَةٌ الْحَرْثُ کا معنی شق کرنا اور پھاڑنا ہے۔ اور اسی سے المحراث ہے یعنی وہ آلہ (ہل) جس کے ساتھ زمین کو پھاڑا جاتا ہے۔ اور الحرث سے مراد مال کمانا اور اسے جمع کرنا ہے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: احراث لدنیاں کأنک تعیش ابدًا تو اپنی دنیوی زندگی کے لئے مال کما اور جمع کر گویا تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (یعنی ایسا نہ ہو کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور پھر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے یا پھر حالات کی تلخیوں کے پیش نظر زندگی کی بازی ہار دے۔ واللہ اعلم۔

اور الحرث کا معنی کھیتی ہے اور المحراث کھیتی کا شت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ تحقیق حرث و احراث یہ زراعت اور ازدرع کی مثل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: أَخْرَجَ الْقُرْآنُ، اِیْ اُدْرُسُهْ یعنی قرآن پڑھانا۔ اور حَرَّثْتُ النَّاقَةَ وَآخَرَتُهَا، یعنی میں اس پر سفر کرتا رہا یہاں تک کہ وہ کمزور ہو گئی۔ اور حَرَّثْتُ النَّارَ اِیْ حَرَّكْتُهَا میں نے آگ کو حرکت دی اور المحراث اس

لکڑی کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ نور کی آگ کو ہلایا اور حرکت دی جاتی ہے۔ جوہری سے مروی ہے۔ کہ النسل سے مراد وہ اولاد ہے جو کسی بھی مؤنث سے پیدا ہو۔ اس کا اصل معنی الخروج (نکلنا) اور السقوط (گرنا) ہے۔ اور اسی سے ہے: نسل الشعر و ریش الطائر۔ یعنی بال اور پرندے کے پر گر گئے۔ اس سے مستقبل کا صیغہ یَنْسِلُ آتا ہے۔ اسی کے مطابق رب کریم کا ارشاد ہے: اِلٰی مَا يَهْمُ يَنْسِلُوْنَ ⑤ (یسین) (اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جانے لگیں گے) اسی طرح یہ ارشاد بھی ہے: قَدْ كَلَّ حَذَبٌ يَنْسِلُوْنَ ⑥ (الانبیاء) (اور وہ ہر بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے) اور امرؤ القیس کا قول ہے:

فستل ثيابی من ثيابك تنسل

(پس تو میرے کپڑے اپنے کپڑوں سے نکال دے تو وہ نکل جائیں گے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت زمین میں ہل چلانے اور اس میں فصل کاشت کرنے پر دلالت کرتی ہے اور زمین میں درخت لگانے پر۔ یہ زراعت اور کھیتی باڑی پر ابھارنے کے لئے ہے اور طلب النسل سے مراد حیوانوں اور جانداروں کی نشوونما اور ان کا بڑھنا ہے اور اسی سے انسان کی قوت و طاقت مکمل ہوتی ہے۔ اور یہ ان کا رد ہے جنہوں نے ترک اسباب کا قول کیا ہے۔ عنقریب اسی کتاب میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ⑦ عباس بن فضل نے کہا ہے کہ فساد کا معنی خرابی اور بربادی ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قطع الدراهم من الفساد فی الارض (اس نے زمین میں فساد اور خرابی کے سبب دراہم ختم کر دیے۔)

اور حضرت عطاء نے کہا ہے: ایک آدمی تھا جسے عطاء بن منبہ کہا جاتا تھا۔ اس نے جبہ میں احرام باندھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے اتار دے۔ حضرت قتادہ نے کہا: میں نے حضرت عطاء سے کہا: بے شک ہم تو سنتے تھے کہ وہ اسے پھاڑ دے، تو حضرت عطاء نے کہا: ان الله لا يحب الفساد۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت اپنے عموم کے سبب ہر فساد اور بربادی کو شامل ہے، چاہے وہ زمین میں ہو یا مال میں یا دین میں اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہی صحیح ہے (1)۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ کا معنی ہے وہ اسے اہل اصلاح (اصلاح کرنے والوں) سے پسند نہیں کرتا یا وہ اسے دین کے اعتبار سے پسند نہیں کرتا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ معنی یہ ہو کہ وہ اس کا حکم نہیں دیتا۔ واللہ اعلم

وَ اِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ⑧ وَلَيْسَ الْبِرَّ بِمَا يَبَازُ ⑨

”اور جب کہا جائے اسے کہ (میاں) خدا سے تو ڈرو، تو اور اس کا سنا ہے اسے غرور گناہ پر جس اس کے لئے جہنم

کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔“

یہ کافر اور منافق کی صفت ہے جو اپنے بارے میں خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مومن کے لئے یہ ناپسندیدہ اور مکروہ ہے کہ گناہ اسے ان میں سے کسی میں واقع کر دے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: کسی آدمی کے لئے بطور گناہ اتنا کافی ہے کہ اسے کوئی دوسرا بھائی کہے: ”تم اللہ سے ڈرو“ تو وہ آگے سے یہ کہہ دے: تجھ پر اپنے نفس کے بارے میں وہی لازم ہے جس کی نصیحت تو مجھے کر رہا ہے (1)۔ اور الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور غلبہ ہے۔ یہ عِزَّةٌ یُعْزِّدُ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: وہ اس پر غالب آ گیا۔ اور اسی سے وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ (ص) ہے، یعنی وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی حمیت ہے۔ اسی کے مطابق شاعر کا قول بھی ہے:

اخذته عزة من جهله فتوتى مغضبا فعل الضجر

اسے اس کی دور جاہلیت کی حمیت نے آلیا، پس اس نے حالت غضب میں تنگی اور نقصان کے فعل کا ارتکاب کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور شدت نفس ہے۔ یعنی اس نے اپنی ذات میں قوت و طاقت حاصل کی اور ادھر ہی جھک گیا، پس اسی قوت نے اسے گناہ میں واقع کر دیا جبکہ اس نے اسے آلیا اور گناہ کو اس پر لازم کر دیا۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب اسے کہا جائے رک جا، ٹھہر جا، تو وہ گناہ کا ارتکاب زیادہ کرتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ قوت و طاقت نے اسے گناہ پر ابھارا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے: قوت و طاقت نے اسے ایسی شے سے پکڑ لیا جو اسے گناہ میں مبتلا کر دے گی۔ یعنی اس نے قوت و طاقت اور زمانہ جاہلیت کی حمیت کے سبب کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے۔ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ (ص) (لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں (اندھے ہو گئے) ہیں۔)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِالْإِثْمِ میں با بمعنی لام ہے۔ یعنی عزت و حمیت نے اسے وعظ و نصیحت قبول کرنے سے پکڑ لیا، اس گناہ کے سبب جو اس کے دل میں تھا۔ اور وہ نفاق ہے۔ اسی کے مطابق عشرہ کا قول ہے جس میں وہ ناقہ کے پسینے کی صفت بیان کرتا ہے:

وَكَأَن زُبًّا أَوْ كَحَيْلًا مُعْقَدًا حَسَّ الْوَقُودُ بِهِ جَوَانِبَ قُتْمٍ

تو یہ بمعنی حش الوقود لہ ہے۔ یعنی با بمعنی لام ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ با بمعنی مع ہے۔ یعنی حمیت نے اسے گناہ کے ساتھ پکڑ لیا۔ پس با کا معنی تاویلات کے مطابق مختلف ہوتا رہتا ہے۔

یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کسی یہودی کا ہارون الرشید کے پاس کچھ کام تھا، وہ اس کے دروازے پر سال بھر آتا رہا لیکن وہ اپنا نہ کر سکا، پس ایک دن وہ دروازے پر کھڑا تھا، جب ہارون الرشید نکلا تو وہ دوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ تو ہارون الرشید اپنی سواری سے نیچے اتر اور سجدے میں گر گیا، پس جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو اس کے کام کے بارے حکم دیا سو وہ کر دیا گیا۔ جب وہ لوٹ کر آیا تو اسے کہا گیا: اے امیر المؤمنین! تو ایک یہودی کے کہنے پر اپنی سواری سے اتر رہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ بلکہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آیا: وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَيْسَ الْإِهَادُ ۝

حَسْبُهُ کا معنی ہے کہ اے بطور سزا اور عذاب جہنم کافی ہے۔ جیسا کہ تو کسی آدمی کو کہتا ہے کفایت ماحل بت تجھے وہی کافی ہے جو تجھے پیش آیا ہے۔ اور انت تستعظم و تعظم علیہ ماحل تو عظمت طلب کرتا ہے اور تجھے اس پر عظمت دی جائے گی جو تجھے پیش آیا۔ اور المہاد، المہد کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جو سونے کے لئے تیار کی جائے۔ اور اسی سے مہد الصبی (بچے کا جھولا) بھی ہے۔ اور جہنم کو مہاد کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ کفار کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس لئے کہ ان کے لیے مہاد کے بدلے جہنم ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ (آل عمران) اور اسی کی مثل عرب کلام میں ان کا یہ قول ہے: تحية بينهم ضرب وجيع (ان کے درمیان تحیہ دردناک ضرب لگانا ہے۔)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

”اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے

اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔“

اس آیت میں ابْتِغَاءَ مفعول لاجلہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ جب منافقین کی کارکردگی کا ذکر کیا، تو پھر بعد میں مومنین کی کارکردگی کا ذکر فرمایا۔

کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کر کے آئے تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کا پیچھا اور تعاقب کیا۔ تو وہ اپنی سواری سے نیچے اتر پڑے اور ترکش میں موجود تمام تیر نکال لئے، اور اپنی قوس (تیر کمان) پکڑ لی اور فرمایا: تم جانتے ہو میں تم سے زیادہ تیر چلانے میں ماہر ہوں، اللہ تعالیٰ کی قسم! تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے یہاں تک کہ میں اپنے ترکش کے سارے تیر پھینک دوں۔ بعد ازاں میں اپنی تلوار سے لڑوں گا جب تک اس کی کوئی شے میرے ہاتھ میں باقی رہی پھر اس کے بعد تم جو چاہو کرو۔ تو انہوں نے کہا: ہم تجھے نہیں چھوڑ سکتے کہ تم غنا اور خوشحالی کی حالت میں ہم سے چلے جاؤ حالانکہ تم ہمارے پاس محتاج بن کر افلاس کی حالت میں آئے تھے۔ لیکن اگر تم مکہ مکرمہ میں موجود اپنے مال پر ہماری راہنمائی کرو تو ہم تمہارا راستہ چھوڑ دیں گے۔ انہوں نے اسی (مال کی) شرط پر آپ سے معاہدہ کیا، تو آپ نے اسے پورا کر دیا۔ پس جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ الْآیہ۔ اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: اے ابویخی! نفع بخش سودا کیا ہے اور ان پر یہ (مذکورہ) آیت تلاوت فرمائی۔ اسے رزین نے روایت کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب

ﷺ نے اسے بیان کیا ہے (1)۔

اور مفسرین نے کہا ہے: مشرکین نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور انہوں نے آپ کو بہت ستایا اور اذیت دی، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: بلاشبہ میں بوڑھا آدمی ہوں، تمہیں کوئی نقصان اور ضرر نہ پہنچے گا، میں تمہارے ساتھ رہوں یا تمہارے سوا کسی اور کے ساتھ۔ کیا تمہارے لئے (یہ بہتر نہیں) کہ تم میرا مال لے لو اور مجھے اور میرے دین کو چھوڑ دو؟ تو انہوں نے اس طرح کر لیا اور آپ نے ان پر سواری اور نفقہ کی شرط لگائی تھی (یعنی میں سواری اور اپنے روزمرہ اخراجات کے لئے مناسب اپنے مال سے لے لوں گا) پس وہ مدینہ طیبہ کی طرف نکل پڑے۔ تو حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور کچھ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے ملے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اے ابوبکی! تیری بیع نفع بخش ہوئی، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ”آپ کی بیع میں تو کبھی خسارہ نہیں ہوتا، سو یہ کیسی کلام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے بارے میں اس طرح (آیت) نازل فرمائی ہے، پھر آپ نے ان پر یہ آیت پڑھی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ یہ ایک مسلمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو ایک کافر سے ملا اور اسے کہا: تو کہہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، پس جب تو نے اسے کہہ لیا، تو تو نے اپنے مال اور اپنی جان کو بچا لیا، لیکن اس نے یہ کلمہ کہنے سے انکار کر دیا، تو مسلمان نے اسے کہا: قسم بخدا! میں ضرور بضرور اپنی جان اللہ تعالیٰ کے لئے بیچ دوں گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا اور اس کے ساتھ قتال کرنے لگا، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے نیکی کا حکم دیا اور منکر سے روکا۔ اسی کے مطابق حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تاویل کی ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ دو آدمی باہم ایک دوسرے سے لڑے۔ یعنی مغیر (تبدیلی لانے والے) نے مفسد (فساد برپا کرنے والے) کو کہا: تو اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ مفسد نے انکار کر دیا اور اسے حمیت نے آلیا تو مغیر نے اپنی جان اللہ تعالیٰ سے بیچ ڈالی اور اس کے ساتھ لڑنے لگا، پس دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا۔

اور ابو خلیل نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کسی انسان کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پڑھا: إِنْ شَاءَ اللَّهُ وَ إِنْ آتَانَا اللَّهُ لَمُحْضُونَ۔ وہ آدمی اٹھا اور نیکی کا حکم دینے لگا اور برائی سے منع کرنے لگا اور خود شہید ہو گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ دو آدمیوں نے قاری کی اس آیت کی قراءت کے وقت ایک دوسرے کو قتل کر دیا، پس آپ نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے اس کی یہی تفسیر بیان کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اے ابن عباس! تیرا مال اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت اس کے بارے میں نازل ہوئی جو جنگ میں گھس جاتا ہے، ہشام بن عامر قسطنطنیہ میں لشکر میں داخل ہوئے اور خوب قتال کیا، یہاں تک کہ شہید کر دیے گئے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ مِنْ

الثَّالِثُ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ اور حضرت ابوالیوب سے بھی اسی طرح مروی ہے (1)۔
اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت غزوہ رجب کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: وہ مہاجرین و انصار ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس رات (ہجرت کی رات) اپنے بستر پر آرام کرنے کے لئے فرمایا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار (ثور) کی طرف تشریف لے گئے تھے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ براءت میں آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہر جہاد کرنے والے کو شامل ہے یا اپنی ذات کے بارے میں شہادت کی تمنا کرنے والے کو یا برائی کو تبدیل کرنے والے کو۔ اور اس کا حکم پہلے آچکا ہے جو لشکر پر حملہ آور ہو اور منکر کو تبدیل کرنے والے کا، اس کی شرائط اور اس کے احکام کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ آل عمران میں آئے گا۔

اور یَشْرِي کا معنی یبیم (بیچ ڈالنا) ہے۔ اسی معنی میں یہ ارشاد بھی ہے: وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخِيسٍ (یوسف: 20) یعنی انہوں نے آپ کو کھوئے ثمن کے عوض بیچ ڈالا۔ اور اس کا اصل معنی الاستبدال (بدلہ میں لینا) ہے۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ (توبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہے ایمانداروں سے ان کی جان اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

وَانْكَانَ رَيْبُ الدَّهْرِ امْضَاكَ فِي الْأَلَى
شَرَاؤُا هَذِهِ الدُّنْيَا بِجَنَاتِهِ الْخُلْدِ
اور ایک دوسرے شاعر کا قول:

و شَرِيتُ بُرْدًا لِيَتَنِي
مِنْ بَعْدِ بُرْدٍ كُنْتُ هَامَهُ
یہاں برد غلام کا نام ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

يُعْطَى بِهَا ثَنًا فَيَسْنَعُهَا
و يَقُولُ صَاحِبُهَا أَلَا فَاشِرُ
یہاں بیع النفس سے مراد اسے اللہ تعالیٰ کے اوامر (کی اطاعت) کے لئے خرچ کرنا ہے۔ اور ابتغاء مفعول من أجلہ ہے۔ کسائی نے مرضات تاء پر وقف کیا ہے، اور باقیوں نے ہاء کے ساتھ وقف کیا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: کسائی نے تاء کے ساتھ یا تو ان کی لغت پر وقف کیا ہے جو کہتے ہیں طلحت اور علقمت۔ اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

بَلْ جَوَزَ تَيْهَاءَ كَظْهَرِ الْحَجَفَتِ

یا پھر اس لئے کہ جب ہی مضاف الیہ کلمہ کے ضمن میں ہے تو پھر تاء کو ثابت رکھنا ضروری ہے جیسا کہ وہ حالت وصل میں ثابت رہتی ہے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ مضاف الیہ مراد ہے (2)۔ اور مرضاة سے مراد رضا ہے۔ کہا جاتا ہے: رَضِيَ يَرْضَى

رِضًا وَمَرْضَاةً۔

ایک قوم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ کہا جائے: شری بمعنی اشتویٰ ہے اور اس صورت میں آیت کو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرف پھیرنے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو اپنے مال کے عوض خریدا تھا، نہ کہ اسے بیچا تھا، مگر یہ کہا جاسکتا ہے: بلاشبہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جانا یہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے بیچنا ہے۔ پس لفظ باع (بیچنے) کے معنی پر ہی صحیح اور درست ہوگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ

عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٠﴾

”اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے اور نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے مومن، کافر اور منافق ہونے کے بارے میں بیان کر چکا تو فرمایا: تم ایک دین پر ہو جاؤ اور اسلام پر جمع ہو جاؤ اور اسی پر ثابت قدم ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں السِّلْم بمعنی اسلام ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے، اور اسے ابو مالک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق کندی شاعر کا قول بھی ہے:

دَعْوَتِ عَشِيْقٍ لِلْسَّلْمِ لَتَا رَأَيْتَهُمْ تَوَلَّوْا مُدْبِرِيْنَا

میں نے اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دی جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ پٹھیں پھیر کر واپس چلے گئے۔

یعنی میں نے انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جبکہ اہل کندہ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد اشعث بن قیس کندی کے ساتھ مرتد ہو گئے، کیونکہ مومنین کو کبھی بھی مسالمہ میں داخل ہونے کا حکم نہیں دیا گیا اور مسالمہ سے مراد صلح ہے۔ اور بلاشبہ حضور نبی کریم ﷺ کو کہا گیا کہ آپ صلح کے لئے مائل ہوں جبکہ وہ اس کی طرف مائل ہوں۔ اور رہا یہ کہ آپ صلح کی ابتدا کریں تو اس طرح نہیں۔ یہ قول علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں حکم دیا گیا ہے جو اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے کہ وہ اپنے دلوں کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں۔ طاؤس اور مجاہد نے کہا ہے کہ تم امر دین میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا: تم نیکی کی تمام اقسام میں داخل ہو جاؤ۔ اور یہ لفظ سین کے کسرہ کے ساتھ السِّلْم پڑھا گیا ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ السِّلْم اور السِّلْم دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور اسی طرح یہ اکثر بصریوں کے نزدیک بھی ہے۔ اور یہ دونوں لفظ اکٹھے اسلام اور صلح کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ابو عمرو بن العلاء نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور یہاں اسے ادخلوا فی السِّلْم پڑھا ہے اور کہا ہے: اس سے مراد اسلام ہے۔ اور وہ لفظ جو سورہ انفال اور سورہ محمد (ﷺ) میں ہے۔ اسے السِّلْم سین کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فرمایا: فتح کے ساتھ اس کا معنی مسالمہ (صلح) ہے۔

اور مبرد نے اس تفریق کا انکار کیا ہے اور عاصم، محمد بن یزید نے ان تفریقات (الگ الگ تعبیروں) کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: لغت معنی الاستسلام (تابعہ ہونا) ہے۔ محمد بن یزید نے ان تفریقات (الگ الگ تعبیروں) کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: لغت اس طرح نہیں لی جاتی بلکہ یہ تو سماع کے ساتھ لی جاتی ہے نہ کہ قیاس کے ساتھ۔ اور جس نے (معانی میں) تفریق کی اسے دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اور بصریوں نے بیان کیا ہے: بنو فلان سَلِمَ وَسَلَّمَتْ وَ سَلَّمَ وَ سَلَّمَ تمام کا معنی ایک ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: السِّلْمُ کا معنی صلح ہے چاہے فتح کے ساتھ ہو یا کسرہ کے ساتھ اور مذکر ہو یا مؤنث۔ اور اس کا اصل معنی الاستسلام اور الانقیاد (تابعہ داری کرنا) سے لیا گیا ہے۔ اسی لئے صلح کے لئے سَلَّمَ کہا گیا ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

وَقَدْ قَلْتُمَا إِنَّ نُدْرِكَ السِّلْمِ وَاسْعَا بِسَالٍ وَ مَعْرُوفٍ مِنَ الْأَمْرِ نَسَلَمَ

تحقیق تم دونوں نے کہا: اگر ہم نے صلح کو مال اور امر بالمعروف کے بدلے زیادہ نفع بخش پالیا تو ہم صلح کر لیں گے۔

علامہ طبری نے اس کلمہ کو اسلام کے معنی پر محمول کرنے کو ترجیح دی ہے اس وضاحت کے مطابق جو پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ضمن میں بیان فرمایا ہے: اسلام کے آٹھ حصص ہیں، ایک حصہ نماز ہے، ایک حصہ زکوٰۃ ہے، ایک حصہ روزہ ہے، ایک حصہ حج ہے، ایک حصہ عمرہ ہے، ایک حصہ جہاد ہے، ایک حصہ امر بالمعروف ہے اور ایک حصہ نہی عن المنکر ہے۔ تحقیق وہ غائب و خاسر ہوا جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی اور معنی یہ ہے: اے وہ لوگو جو ایمان لائے! حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ! تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لا کر مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ (1)۔

اور صحیح مسلم میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اس امت میں سے کوئی یہودی اور عیسائی میرے بارے میں نہ سنے پھر وہ مر جائے اور وہ اس دین پر ایمان نہ لائے جس کے ساتھ مجھے مبعوث فرمایا گیا تو وہ اصحاب نار میں سے ہوگا۔“

كَافَّةً کا معنی ہے مکمل طور پر، ترکیب کلام میں یہ السِّلْمِ سے یا مومنین کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ ان کے اس قول سے مشتق ہے: كَفَفْتُ اِيْ مَنْعَتٍ، یعنی تم میں سے کوئی بھی اسلام میں داخل ہونے سے باز نہ رہے۔ اور الكَفُّ کا معنی ہے المنع (روکنا) اور اسی سے كُفَّةُ الْقَيْصِ ہے (کرتے کے دامن کے ارد گرد کی گوٹ) کیونکہ یہ کپڑے کو پھیلنے اور منتشر ہونے سے روکتی ہے۔ اور اسی سے كُفَّةُ الْمِيزَانِ ہے (ترازو کا پلڑا) جو کہ موزون کو جمع رکھتا ہے اور اسے بکھرنے سے روکتا ہے، اور اسی سے کف الانسان ہے (انسان کی ہتھیلی) جو کہ اس کے منافع اور نقصانات کو جمع کرتی ہے۔ اور ہر گول شے کُفَّةً کہلاتی ہے، اور ہر لمبی شے کُفَّةً کہلاتی ہے۔ اور آدمی مکفوف البصر ہے یعنی اسے دیکھنے سے روک دیا

گیا ہے۔ اور جماعۃ کو کافہ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ متفرق اور تقسیم ہونے سے محفوظ ہوتے ہیں۔

وَلَا تَتَّبِعُوا يَه فعل نہیں ہے اور حُطُوتِ الشَّيْطَانِ یہ مفعول ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حضرت مقاتل نے کہا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے نماز میں تورات پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ نیز یہ کہ وہ ان بعض احکام پر عمل کریں گے جو تورات میں ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَتَّبِعُوا حُطُوتِ الشَّيْطَانِ کیونکہ بلاشبہ سنت کی اتباع کرنا حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد شیطان کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے بہتر اور اولیٰ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس کا معنی ہے) تم اس راستے پر نہ چلو جس کی طرف تمہیں شیطان دعوت دیتا ہے کیونکہ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ بلاشبہ تمہارے لئے اس کی عداوت بالکل ظاہر ہے۔

فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ①

”اور اگر تم پھسلنے لگو اس کے بعد کہ آچکی ہیں تمہارے پاس روشن دلیلیں، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔“

ارشاد باری تعالیٰ فَإِنْ زَلَلْتُمْ کا معنی ہے اگر تم صراط مستقیم سے دور ہونے لگو۔ دراصل زلل یعنی پھسلاہٹ قدم میں ہوتی ہے، بعد ازاں یہ لفظ اعتقادات، آراء اور دیگر چیزوں میں (سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے لئے) استعمال کیا جانے لگا ہے۔ کہا جاتا ہے: زَلَّ يَزِلُّ زَلًّا وَزَلَّوْا، یعنی اس کا پاؤں پھسل گیا۔

ابو السمال العدوی نے زَلَلْتُمْ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حرف کی اصل الزلق سے ہے اور معنی ہے: ”تم حق سے بھٹک گئے اور بہک گئے۔“

ارشاد خداوندی مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ میں الْبَيِّنَاتُ سے مراد معجزات اور آیات قرآن ہیں۔ اگر آیت میں خطاب مومنین کو ہے اور اگر خطاب اہل کتاب کو ہے تو پھر بینات سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور آپ کے بارے وہ علامات ہیں جو ان کی شریعت میں وارد ہوئی ہیں۔

آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ گناہ کے بارے جاننے والے کی سزا اس کی سزا کی نسبت بہت زیادہ اور شدید ہوگی جو اس سے ناواقف اور جاہل ہو اور جس تک دعوت اسلام نہ پہنچی وہ احکام شرع کو ترک کرنے کے سبب کافر نہ ہوگا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو وہ قرآن کریم پڑھ رہے تھے، تو انہیں جو قرآن پڑھا رہا تھا۔ اس نے پڑھا یا فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ تو حضرت کعب نے کہا: بلاشبہ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ اس طرح ہو، پھر ان دونوں کے پاس سے ایک آدمی گزرا، تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تم یہ آیت کس طرح پڑھتے ہو؟ تو اس آدمی نے کہا: فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ② (بقرہ) تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اسی طرح ہونا چاہئے (1)۔ اور عَزِيزٌ

کا معنی ہے (وہ زبردست ہے) یعنی جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے اس سے اسے روکا نہیں جاسکتا۔ اور حَکِيمٌ کا مفہوم ہے کہ وہ جو فعل بھی کرتا ہے اس میں حکمت کا فرما ہوتی ہے (اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔)

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ
وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٥٨﴾

”کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں اور فرشتے اور (ان کا) فیصلہ ہی کر دیا جائے۔ اور (آخر کار) اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات۔“

ارشاد باری تعالیٰ هَلْ يَنْظُرُونَ یعنی اسلام میں داخل نہ ہونے والے، اور هَلْ یہاں اس سے مراد انکار ہے۔ یعنی وہ انتظار نہیں کر رہے ہیں إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ، نظرتہ اور انتظارتہ ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور النظر اور الانتظار بھی ہم معنی ہیں۔

حضرت قتادہ، ابو جعفر یزید بن قعقاع اور ضحاک نے فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ پڑھا ہے۔ اور ابو جعفر نے وَالْمَلَائِكَةُ کو الغمام پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ اور اس کی تقدیر عبارت ہے مع الملائكة یعنی ملائکہ کے ساتھ۔ عرب کہتے ہیں: أَقْبَلَ الْأَمِيرُ فِي الْعَسْكَرِ۔ امیر آیا لشکر کے ساتھ۔ یعنی اس میں فی بمعنى مع ہے۔ ظُلَلٍ یہ ظُلَّة کی جمع مکسر ہے، جیسا کہ ظلمت کی جمع ظلم ہے اور اس کی جمع سالم ظُلَلَات ہے۔ سیبویہ نے یہ شعر کہا ہے:

اِذَا الْوَحْشَ ضَمَّ الْوَحْشَ فِي ظُلَلَاتِهَا
سَوَاقِطٌ مِنْ حَيٍّ وَ قَدْ كَانَ أَظْهَرَ
اس میں ظُلَلَات ظُلَّة کی جمع سالم ذکر کی گئی ہے۔

اور ظُلَلَات اور ظلال یہ ظل کی جمع کثرت ہے اور اس کی جمع قلت اظلال ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ظلال ظُلَّة کی جمع ہے جیسا کہ قُلْتُ لِي جَمْعٌ قِلَال ہے۔ جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

مِزْدُوجَةٌ بِبَاءِ الْقِلَالِ (گھڑوں کے پانی میں ملائی گئی ہے)

انخفش سعید نے کہا ہے کہ وَالْمَلَائِكَةُ مجرور ہے۔ یہ وَفِي الْمَلَائِكَةِ کے معنی میں ہے۔ فرمایا: اس میں رفع عمدہ ہے، جیسا کہ ان آیات میں ہے: هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ (الانعام: 158) اور وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (الفجر) فراء نے کہا ہے: حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ وَالْمَلَائِكَةُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ملائکہ ان کے پاس ان کی ارواح قبض کرنے کے لئے آئیں گے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن (وہ آئیں گے) اور یہی زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔

ابو العالیہ اور ربیع نے کہا ہے کہ ملائکہ ان کے پاس چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے

پاس آئے گا جس حالت میں چاہے گا۔

اور زجاج نے کہا ہے: تقدیر کلام اس طرح ہے فی ظلل من الغمام ومن الملائكة اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حق میں کلام اپنے ظاہر پر نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کا حکم ان کے پاس آجائے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حساب و عذاب میں سے جس کا ان کے ساتھ وعدہ فرما رکھا ہے اس کے ساتھ چھائے ہوئے بادلوں میں ان کے پاس آجائے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: فَأَتَتْهُمْ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا (الحشر: 2) (پس آیا ان پر اللہ (کا قہر) اس جگہ سے جس کا انہیں خیال بھی نہ آیا تھا۔) یعنی اللہ نے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا۔ یہ زجاج کا قول ہے اور پہلا خفش سعید کا قول ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ الاتیان (یعنی آنے) کا معنی راجعاً الی الجزاء (جزا کی طرف رجوع کرتے ہوئے) ہو۔ اور جزا کو اسی طرح الاتیان کا نام دیا گیا ہو جیسا کہ نمرود کے قصہ میں تخويف اور تعذيب کو الاتیان کا نام دیا گیا ہے اور فرمایا ہے: فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 26)

(پس اللہ تعالیٰ نے ان کے (فریب) کی عمارت جڑوں سے اکھڑ کر رکھ دی۔ پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے۔) اور بنی نضیر کے قصہ میں فرمایا: فَأَتَتْهُمْ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (الحشر: 2)

اور اسی طرح فرمایا: وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا (الانبیاء: 47)

(اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے۔)

بلاشبہ الاتیان ان معانی کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ اہل لغت کے نزدیک الاتیان کا اصل معنی ”کسی شے کی طرف قصد کرنا“ ہے۔ پس آیت کا معنی یہ ہے: کیا وہ انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جزا اور بدلہ دینے کے ارادہ سے اپنی مخلوق میں سے کسی مخلوق کے ساتھ افعال میں سے کوئی فعل ظاہر فرمائے اور ان کے امور کے بارے میں فیصلہ فرمائے جو وہ فیصلہ فرما دے؟ اور جس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کوئی فعل کیا اور اسے نزول اور استوا کا نام دیا۔ اسی طرح وہ کوئی فعل کرتا ہے اور اسے الاتیان کا نام دیتا ہے اور اس کے افعال بغیر آلہ اور علت کے ہوتے ہیں کیونکہ اس کی ذات اس سے پاک ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو صالح کی روایت میں کہا ہے: یہ ان پوشیدہ اور مخفی چیزوں میں سے ہے جس کی تفسیر بیان نہیں کی جاسکتی۔ بعض ان کی تاویل سے خاموش رہے ہیں اور بعض نے تاویل کی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فاعل معنی با ہے یعنی یاتیہم بظلل (یعنی وہ ان کے پاس آئے چھائے ہوئے بادلوں کے ساتھ) اور اسی کے مطابق حدیث طیبہ ہے: يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي صُورَةٍ أَوْ بِصُورَةٍ أَمْتَحَانًا لَهُمْ (1) (اللہ تعالیٰ ان کے پاس آئے گا ایک صورت میں، یعنی ایک صورت کے ساتھ ان کا امتحان لینے کے لئے)۔

یہ جائز نہیں کہ اسے اور جو کچھ اس کے مشابہ قرآن و حدیث میں مذکور ہے اسے وجہ انتقال، حرکت اور زوال پر محمول کیا جائے، کیونکہ یہ اجرام و اجسام کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے انتہائی بلند و برتر ہے۔ وہ ذوالجلال

والا کرام ہے اور اجسام کی مماثلت سے بلند و بالا اور برتر ہے۔

الغَمَامِ اس سے مراد ہے سفید باریک بادل، اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ ڈھانپ لیتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قُضِيَ الْأَمْرُ کو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے وَقَضَاءُ الْأَمْرِ پڑھا ہے۔ اور یحییٰ بن عمر نے وَقُضِيَ الْأُمُورُ جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے وَقُضِيَ الْأَمْرُ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جزا واقع ہو اور گناہ کرنے والوں کو عذاب دیا جائے۔

ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے تَرْجَعُ الْأُمُورُ صیغہ معروف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی دلیل آيَ إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ ۝ (الشوری) اور إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ (المائدہ: 48) ہے۔ اور باقیوں نے تَرْجَعُ صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور یہ بھی قرآنہ حسنہ ہے۔ اور اس کی دلیل ثُمَّ تَرْدُّونَ (التوبہ: 94) اور ثُمَّ رُدُّوْا إِلَى اللَّهِ (الانعام: 62) اور وَلَئِنْ تَرَدُّدْتُمْ إِلَىٰ رَبِّي (الکہف: 36) ارشادات باری تعالیٰ ہیں۔ دونوں قراءتیں معنی کے اعتبار سے حسن اور اچھی ہیں لیکن اصل پہلی قرأت ہے۔ اور اسے مجہول پڑھنے میں توسع ہے اور یہ فرع ہے۔ اور تمام کے تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹیں گے، پہلے بھی اور بعد والے بھی۔ اور قیامت کے دن میں اس کے ذکر کے سبب اس پر تنبیہ اور آگاہ کرنا ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ملوک کے پاس ہے وہ زوال پذیر ہے۔

سَلِّ بَنِي إِسْرَآءِيلَ كَمَا اتَيْنَهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ۖ وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

”آپ پوچھئے بنی اسرائیل سے کہ ہم نے انہیں کتنی روشن دلیلیں عنایت فرمائیں۔ اور جو (قوم) بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو اس کے مل جانے کے بعد تو یقیناً اللہ تعالیٰ (اس قوم کو) سخت عذاب دینے والا ہے۔“

ارشاد باری تعالیٰ: سَلِّ بَنِي إِسْرَآءِيلَ كَمَا اتَيْنَهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ اس میں سَلِّ السَّوَال سے ماخوذ ہے۔ تخفیف ہمزہ کے تحت ہمزہ کی حرکت سین کو دے کر اسے حذف کر دیا، اور جب سین متحرک ہو گئی تو پھر ہمزہ وصل کی ضرورت نہ رہی (یعنی سل دراصل اسٹل تھا۔ تخفیف ہمزہ کے مذکورہ قاعدہ کے تحت یہ سل ہو گیا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام عرب میں سَلِّ میں ہمزہ وصل کے ساقط ہونے اور اسٹل میں اس کے ثابت رہنے کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک میں ہمزے کو حذف کرنا اور دوسرے میں اسے ثابت رکھنا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ دونوں مذکور ہیں۔ پس تو ہمزے کو ثابت رکھنے اور اسے گرانے میں خط مصحف کی اتباع کر۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے کلام کے اختلاف کے ساتھ اسے ثابت رکھنا اور اسے ساقط کرنا بھی مختلف ہوتا ہے۔ لہذا ابتدائے کلام میں ہمزہ حذف ہو جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَلِّ بَنِي إِسْرَآءِيلَ اور سَلُّهُمْ أَيْتُهُمْ بِذَلِكَ رَعَيْنَهُ ۝ (القلم) اور حالت عطف (مراد درمیان کلام) میں ثابت رہتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسَّالِ الْقَرْيَةَ (يوسف: 82) اور وَسَّالُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ (النساء: 32) علی بن عیسیٰ نے یہی کہا ہے۔ اور ابو عمرو نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں اسأل اصل کے مطابق پڑھا ہے۔ اور ایک قوم نے اسل ہمزہ کی حرکت کو سین کی طرف نقل کر کے اور ہمزہ وصل کو باقی رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ ان کی لغت کے مطابق جنہوں نے کہا ہے ألاخضر اور کم یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اتَّبِعْتُمْ کا دوسرا مفعول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے کم آتَيْنَا آتَيْنَاهُمْ اور فعل کو اس سے مقدم لانا جائز نہیں کیونکہ اس کے لئے صدر کلام ضروری ہے۔ اور قِنْ اِيْلَيْهِ تقدیر اول کے مطابق تمیز ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور تقدیر ثانی کی بنا پر یہ اتَّبِعْتُمْ کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کم مبتدا ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہو، اور اس کی خبر اتَّبِعْتُمْ ہو۔ اس میں کم کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہوگی اور تقدیر کلام یہ ہوگی کم آتينا هههه اور یہ (یعنی کم) معرب نہیں، بلکہ یہ اسم ہے کیونکہ یہ حروف کے قائم مقام ہے جب کہ اس میں استفہام کے معنی پائے جائیں۔

اور جب تو فرق کرنے لگے کم اور اسم کے درمیان، تو اختیار ہے کہ تو اسے مِنْ کے ساتھ لائے، جیسا کہ اس آیت میں ہے اور اگر تو اسے (من کو) حذف کرے تو پھر تو اسے نصب دے، چاہے کم استفہامیہ ہو یا کم خبریہ۔ اور خبریہ کی صورت میں جر بھی جائز ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

كَمْ بِجُودٍ مُّقْرِفٍ نَالِ الْعُلَا وَ كَرِيمٍ بُخْلُهُ قَدْ وَضَعَهُ

اس میں کم خبریہ کی تمیز حرف جر با کے سبب مجرور ہے۔

اور آیت سے مراد یہ ہے کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں ان کے پاس کتنی آیات و علامات آئیں جو آپ ﷺ کی پہچان کراتی ہیں اور آپ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت مجاہد اور حسن وغیرہا نے کہا ہے: یعنی وہ آیات و معجزات جنہیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے جیسا سمندر کا پھٹ جانا (اور اس میں راستوں کا بن جانا) بادلوں کا سایہ، عصا مبارک اور ید موسیٰ وغیر ذلک۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو ان کے سوال کے بارے حکم ارشاد فرمایا یہ زجر و توبخ کی بنا پر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ يَهُ يَلْفِظُ عَامٌ هُوَ جَوْتَامٌ عَوَامٌ كَوْشَاثِلٌ هُوَ، اگرچہ اس کا مشارالیه بنی اسرائیل ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے تبدیل کیا جو ان کی کتابوں میں تھا اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو تھا اس کا انکار کیا۔ لیکن لفظ کا اطلاق تو اس پر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے۔

علامہ طبری نے کہا: یہاں نعمت سے مراد اسلام ہے اور یہ پہلے (معنی) کے زیادہ قریب ہے اور لفظ میں کفار قریش بھی داخل ہیں۔ کیونکہ حضور نبی رحمت ﷺ ان پر بطور احسان و نعمت ان میں مبعوث فرمائے گئے۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قبولیت اور اس پر شکر کرنے کو کفر کے ساتھ بدل دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ: فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ یہ جملہ خبریہ ہے جو کہ وعید کو متضمن ہے۔ اور الْعِقَابِ عِقْب سے ماخوذ ہے۔ گویا کہ تعاقب کرنے والا بدلہ اور جزا دینے کے لئے اس کے نشانات قدم پر چلتا ہے۔ اسی سے عِقْبَةُ الرَّاكِبِ (وہ جگہ جہاں

سے سوار ہوا جاتا ہے) اور عقبة القدر (شور بے کاباتی حصہ جو ہانڈی والے کے لئے چھوڑا جائے) عقاب اور عقوبۃ دونوں گناہ کے بعد ہوتی ہیں۔ وقد عاقبه بذنبہ ”تحقیق اس نے اسے اس کے گناہ کی سزا دی۔“

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا
فَوَقَّهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَاللَّهُ يُرْزِقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

”آراستہ کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی (فانی) زندگی اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا حالانکہ

پرہیزگاروں کی شان بلند ہوگی ان سے قیامت کے دن اور اللہ تعالیٰ روزی تو جسے چاہے بے حساب دے دیتا ہے۔“

ارشاد باری تعالیٰ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا میں الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مفعول مالم يُسَمَّ فاعلہ ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور اس سے مراد سرداران قریش ہیں (زُيِّنَ فعل مجہول ذکر کیا گیا ہے)۔ مجاہد اور حمید بن قیس نے فعل کو معروف یعنی علی بناء الفاعل پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت سے شاذ ہے، کیونکہ فاعل کا پہلے ذکر موجود نہیں۔ ابن ابی عمبلہ نے زُيِّنَتْ یعنی علامت تانیث کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کیونکہ تانیث غیر حقیقی ہے۔

اور مزین کرنے والا ہی اس کا خالق اور اس کا موجد ہے اور وہی خالق الکفر بھی ہے اور اسے شیطان بھی اپنے وسوسہ اور اپنے دھوکہ کے ساتھ آراستہ کرتا ہے۔ اور یہاں خاص طور پر کافروں کا ذکر اس لئے کیا ہے کیونکہ انہوں نے تزئین (زیب و آرائش) کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے اور وہ دنیا کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور اسی سبب سے انہوں نے آخرت سے اعراض کر لیا ہے۔ جو کچھ زمین پر ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لئے زینت بنا دیا ہے تاکہ وہ مخلوق کو آزمائے کہ ان میں سے عمل کے اعتبار سے زیادہ حسین کون ہے؟

اور مومن وہ ہیں جو شریعت کے طریقوں پر گامزن ہیں زینت ان کے لئے باعث فتنہ نہیں۔ اور رہے کفار تو زینت ان کی مالک بن جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے سوا کسی کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جب مال لایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اے اللہ! بلاشبہ ہم استطاعت نہیں رکھتے مگر یہ کہ ہم اس سے خوش ہوں جسے تو نے ہمارے لئے زینت بنایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا۔ یہ کفار قریش کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ دنیوی اعتبار سے اپنی حالت کو عظیم قرار دیتے ہیں اور وہ اس پر رشک اور اظہار مسرت کرتے تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔

ابن جریج نے کہا ہے: وہ اہل ایمان کے آخرت کو طلب کرنے کے سبب ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبب مذاق ان کا فقر اور ان کی تنگدستی تھی (یعنی ان کے فقر و فاقہ کی وجہ سے کفار ان کا مذاق اڑاتے تھے)۔ جب کہ حضرت بلال، حضرت صہیب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور انہیں کی مثل دیگر جاٹار ان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کے قبیح اور برا ہونے کے سبب ان کے رتبہ اور درجہ کی پستی پر آگاہ کیا اور فرمایا: وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوَقَّهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ (یعنی وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کی شان اور رتبہ قیامت کے دن ان سے بلند ہوگا۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی نے کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو ذلیل سمجھایا اسے اس کے فقر و افلاس اور قلت مال کی وجہ سے حقیر جانا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے مشہور کرے گا، پھر اسے رسوا کر دے گا اور جس نے کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان لگایا یا اس کے بارے وہ کچھ کہا جو اس میں نہیں تھا، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کرے گا، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائے جو اس نے اس کے بارے میں کہا (یعنی بندہ مومن سے اپنے قول کی معذرت کر لے اور معافی مانگ لے۔) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندہ مومن کی عظمت اور عزت و اکرام مقرب فرشتے سے بھی زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے والے مومن مرد اور توبہ کرنے والی مومنہ عورت سے زیادہ محبوب اور کوئی شے نہیں اور بلاشبہ مومن آدمی کی پہچان آسمان میں اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ایک آدمی کی پہچان اس کے گھر والوں اور اس کی اولاد میں ہوتی ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ وَالَّذِينَ اتَّفَقُوا فِيهِمُ الْيَوْمَ الْقِيَمَةِ کا معنی یہ ہے کہ وہ درجہ میں ان سے بلند ہوں گے۔ کیونکہ وہ جنت میں ہوں گے اور کفار جہنم میں ہوں گے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بلند مکان ہو۔ اس اعتبار سے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم اسفل السافلین میں ہے (یعنی پرہیزگار لوگ بلند مکان یعنی جنت میں ہوں گے۔) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ فضیلت اس پر ہو جو کچھ کافران کے بارے میں گمان کر رہے ہیں (یعنی قطعاً ایسا نہ ہوگا جیسا کافر گمان کرتے ہیں بلکہ ان کی شان اس سے کہیں بلند ہوگی۔)

کیونکہ کفار تو کہتے ہیں: اگر آخرت ہوئی تو اس میں ہمارے لئے حصہ (خیر و فضل) تمہاری نسبت کہیں زیادہ ہوگا۔ اسی معنی میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ جو واقعہ انہیں عاص بن وائل کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرا عاص بن وائل پر کچھ قرض تھا، میں اس کے پاس آیا تا کہ اس سے قرض کا مطالبہ کروں، تو اس نے مجھے کہا: میں تجھے ہرگز قرض ادا نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر اختیار کرے۔ میں نے اسے جواب دیا: بلاشبہ میں ہرگز ان سے کفر اختیار نہ کروں گا، یہاں تک کہ تو مر جائے اور پھر تجھے اٹھایا جائے۔ تو اس نے کہا: کیا مجھے موت کے بعد (دوبارہ) اٹھایا جائے گا؟ تو پھر میں تجھے قرض ادا کر دوں گا جب میں مال و اولاد کی طرف لوٹ کر گیا۔ الحدیث، عنقریب یہ مکمل حدیث بھی آئے گی۔ (1) اور کہا جاتا ہے: سَخِرَتْ مِنْهُ و سَخِرَتْ بِهِ، ضَحَكَ مِنْهُ و ضَحَكَ بِهِ، وَ هَزَّتْ مِنْهُ وَ بِهِ۔ یہ سب الفاظ ایک معنی میں کہے جاتے ہیں۔ اسے انخس نے بیان کیا ہے اور اسم السخریة، و السُخْرِيُّ اور السِخْرِيُّ ہے۔ اور ان دونوں قراءتوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزحرف: 32) اور فَاتَّخِذُوا مِنْهُمْ سُخْرِيًّا (المومنون: 110) اور رَجُلٌ سُخْرِيٌّ (کا معنی ہے) وہ آدمی جس سے تمسخر کیا جاتا ہو۔ اور اگر یہی لفظ خاء کے فتح کے ساتھ ہو یعنی رَجُلٌ سُخْرِيٌّ۔ تو مراد وہ آدمی ہے جو لوگوں سے تمسخر کرتا ہو۔ اور فلان سُخْرِيٌّ فلاں کام میں تمسخر کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: خَادِمُهُ سُخْرِيٌّ

وَسَحْرَةً تَنْسَخِيرًا، یعنی فلاں نے اسے بغیر اجرت کے کام کا مکلف اور پابند بنایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ** ①

ضحاک نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں بغیر کسی تاوان کے عطا فرمائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کمزور لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بلند رتبہ عطا فرمائے گا۔ پس یہ آیت متنبہ کر رہی ہے کہ ان پر عظیم انعام ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق کو بغیر حساب قرار دیا ہے اس حیثیت سے کہ وہ دائمی ہے اور لامتناہی ہے، پس وہ شمار نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **بِغَيْرِ حِسَابٍ** یہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی صفت ہے۔ وہ کیسے تصرف کرتا ہے، جبکہ اس کی قدرت اتنی عظیم ہے تو وہ کسی حد و شمار کے ساتھ خرچ نہیں کرتا۔ پس اس کا سارے کا سارا فضل ہی بغیر حساب ہے۔ اور وہ جو حساب کے ساتھ ہے وہ آدمی کے اس عمل کے مطابق ہے جو آدمی نے آگے بھیجا ہوگا (یعنی ہر عمل کی جزا تو اس کے مطابق ہوگی مگر اس کا فضل اور عطا بلا حساب ہوگی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **جَزَاءُ مِمَّنْ رَّبَّنَا عَلَّاهُ حِسَابًا** ② (النبا) (یہ بدلہ ہے آپ کے رب کی طرف سے بڑا کافی انعام) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جنہیں عطا کیا جاتا ہے (یعنی مرزوقین) وہ ان کے وہم و گمان کے بغیر ہو۔ جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا: **وَيَرْزُقُهُ مِمَّنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ** (الطلاق: 3) (اور اسے) وہاں سے (رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا)۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ③ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ④ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ⑤ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ⑥ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ⑦ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ⑧

”(ابتدا میں) سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا) تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد ازاں کہ آگنی تھیں ان کے پاس روشن دلیلیں (اس کی وجہ) ایک دوسرے سے حسد تھا، پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف“۔

ارشاد باری تعالیٰ **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** کا معنی ہے سب لوگ ایک دین پر تھے۔

حضرت ابی بن کعب اور ابن زید نے کہا ہے کہ **النَّاسُ** سے مراد بنی آدم (اولاد آدم) ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں روحوں کی صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: النَّاسُ سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں، (پھر اس پر یہ سوال ہوتا ہے) کہ واحد کو لفظ جمع کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ (تو جواب یہ ہے کہ اس لئے) کیونکہ آپ ہی ساری نسل کی اصل اور بنیاد ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ النَّاسُ سے مراد حضرت آدم اور حضرت مائی حوا علیہما السلام ہیں۔

حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ النَّاسُ سے مراد اس زمانے کے لوگ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تھا اور یہ دس صدیاں ہیں (ان میں) وہ لوگ حق پر تھے یہاں تک کہ ان میں اختلاف ہو گیا، تب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد والوں کو مبعوث فرمایا (1)۔

اور ابن ابی خثیمہ نے کہا ہے: جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اس وقت سے لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک پانچ ہزار آٹھ سو سال کا عرصہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے زیادہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین بارہ سو برس کی مدت ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نو سو ساٹھ برس تک زندہ رہے اور آپ کے زمانے میں لوگ ایک ہی دین پر تھے، وہ دین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور ملائکہ ان کے ساتھ مصافحہ کرتے تھے اور وہ اسی حال پر رہے یہاں تک کہ حضرت ادریس علیہ السلام (آسمانوں پر) اٹھائے گئے۔ پھر ان میں اختلاف پڑ گیا۔ یہ بات محل نظر ہے۔ کیونکہ صحیح روایت کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں۔ کلبی اور واقدی وغیرہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی میں سوار ہونے والے لوگ ہیں، وہ مسلمان تھے پھر حضرت نوح علیہ السلام کے وصال کے بعد ان میں اختلاف ہو گیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کفر پر ایک امت تھے اور اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کا وہ زمانہ ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔

اور آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تمام لوگ ایک امت تھے اور وہ تمام کے تمام کافر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت دور جاہلیت میں ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔

پس ان اقوال کی بنا پر گان اپنے باب پر ہے یعنی زمانہ ماضی کے لئے جو کہ گزر چکا ہے اور وہ تمام جنہوں نے آیت میں النَّاسُ سے مراد مومنین لئے ہیں، انہوں نے کلام میں فَاخْتَلَفُوا فَبَعَثَ مَقْدَرُ مَا نَاہے۔ اور اس حذف پر دلیل یہ بیان کی ہے: وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ یعنی تمام لوگ دین حق پر تھے، پھر ان میں اختلاف ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات مبعوث فرمائے، جو انہیں بشارت دینے والے ہیں جنہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کی اور انہیں ڈرانے والے ہیں جنہوں نے نافرمانی کی۔ اور جنہوں نے النَّاسُ سے مراد کفار لئے ہیں، تو پھر انہیں کی طرف انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ گان ثبوت کے لئے ہو (یعنی تادمہ ہو) اور مراد ان لوگوں کے بارے خبر دینا ہو جو تمام کے تمام ایک جنس ہیں کہ وہ شرائع سے خالی ہونے میں اور حقائق سے جاہل اور ناواقف ہونے میں ایک امت ہوتے اگر اللہ تعالیٰ ان پر احسان نہ فرماتا اور ان کی طرف اپنے رسول بھیج کر ان پر مہربانی نہ فرماتا۔ پس اس تاویل پر گان صرف ماضی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ اس کا معنی وہی ہے جو اس ارشاد میں ہے وَ كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (النساء) اور اُمَّةً كَالْفِطْرِ (عربوں) کے اس قول سے ماخوذ ہے: امت کذا یعنی میں نے اس کا قصد کیا۔ پس اُمَّةً واحدةً کا معنی یہ ہوا کہ ان کا مقصد ایک تھا۔ اور واحد کے لئے اُمَّةً بولا جاتا ہے یعنی مقصدہ غیر مقصد الناس اس کا مقصد لوگوں کے مقصد کے سوا ہے۔ اسی کے مطابق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت قس بن ساعدہ کے بارے میں ارشاد گرامی بھی ہے يُخْشَى يَوْمَ الْقِيَامَةِ اُمَّةً واحدةً (قیامت کے دن اسے ایک امت (مقصد) پر اٹھایا جائے گا اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل کے بارے فرمایا والامّة القامة (سیدھا اور صحیح مقصد) گویا کہ تمام بدن کا مقصد یہی ہے۔

اور الامّة اگر کسرہ کے ساتھ ہو، تو اس کا معنی نعمت ہے کیونکہ لوگ اسی (نعمت) کا ہی قصد کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی امام ہے کیونکہ لوگ اسی کو کرنے کا قصد کرتے ہیں جو وہ کرتا ہے۔ نحاس سے روایت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کان البشر امة واحدة پڑھا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کان الناس امة واحدة فاختلفوا فبعث قراءت کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ، حضرات انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، اور ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں اور قرآن کریم میں جن کے اسمائے گرامی مذکور ہیں وہ اٹھارہ ہیں۔ اور سب سے پہلے رسول حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے، اسے آجری اور ابو حاتم البستی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث شفاعت کے مطابق اول الرسل حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ لوگ انہیں کہیں گے انت اول الرسل آپ پہلے رسول ہیں (1)۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے رسول حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ اس کا بیان سورہ اعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ارشاد باری تعالیٰ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور وَ أُنْزِلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ میں کتاب سے مراد اسم جنس بمعنی کتب ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: الْكِتَابَ پر الف لام عہد کے لئے ہے اور اس سے مراد تورات ہے۔ اور لِيَحْكُمَ جمہور کے قول کے مطابق الْكِتَابَ کی طرف مسند ہے، اور یہ اَنْ مضمرة کے ساتھ منصوب ہے یعنی لِأَنْ يَحْكُمَ اور یہ نسبت مجازی ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ هَذَا كِتَابُنَا يُنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ: ۲۹) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ) اور

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولقد ارسلنا نوحا ال قومه، حدیث نمبر 3092، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بخاری شریف، باب قول اللہ وعلم آدم الاسماء کلھا، حدیث نمبر 4116، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تاکہ ہر نبی اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کرے۔ اور جب اس نے کتاب کے مطابق فیصلہ کیا تو گویا کتاب نے ہی فیصلہ کیا۔

عاصم جدری کی قراءت میں لِيُحْكَمَ بَيْنَ النَّاسِ ہے یعنی فعل مجہول پڑھا گیا ہے۔ اور یہ قراءت شاذ ہے، کیونکہ کتاب کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے۔ اور پہلے فیہ کی ضمیر فیتا میں صا کی طرف لوٹ رہی ہے اور دوسرے فیہ کی ضمیر الکتاب کی طرف لوٹنے کا احتمال رکھتی ہے۔ یعنی کتاب میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی لوگوں نے جنہیں وہ عطا کی گئی تھی۔ الذین فعل کے سبب محل رفع میں ہے اور اُوْتُوْهُ بمعنی اعطوہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر منزل علیہ کی طرف لوٹی ہے اور وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ قول زجاج کا ہے، یعنی نبی علیہ السلام کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا بجز ان لوگوں کے جنہیں اس کے بارے میں علم عطا فرمایا گیا۔

بَغْيًا بَيْنَهُمْ یہ مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی ہم یختلفوا الا للبغی انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر باہمی حسد کے سبب۔ اس کا معنی و مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس میں ان کے فعل کی سفاہت اور اس قباحت پر تنبیہ ہے جس میں وہ واقع ہوئے۔

اور ہدی کا معنی ارشاد راہنمائی کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی حق کی طرف راہنمائی فرمادی، اس طرح کہ ان کے لئے وہ کچھ بیان کر دیا جس میں ان سے پہلے لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں سے بعض نے بعض کی کتابوں کی تکذیب کی، تو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ان تمام کی تصدیق کے لئے راہنمائی فرمادی۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی ان امور میں جن میں اہل کتابین (یہود و نصاریٰ) نے اختلاف کیا۔ ان کے قول میں سے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا یہودی تھے یا عیسائی۔ (یعنی یہودیوں نے کہا: وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا: وہ عیسائی تھے۔)

ابن زید اور زید بن اسلم نے کہا ہے: ان کا قبلہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے بیت المقدس کی طرف اور نصاریٰ نے مشرق کی طرف (منہ کیا) اور یوم جمعہ کے بارے میں ان کا اختلاف ہوا۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں ہماری راہنمائی فرمادی، پس یہودیوں کے لئے ہفتے کا دن ہے اور عیسائیوں کے لئے اتوار کا (1)۔ اور ان کے روزوں کے بارے میں جو اختلاف ہے۔ المختصر وہ تمام امور جن میں انہوں نے اختلاف کیا (ان میں اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی فرمادی)۔

ابن زید نے کہا ہے: انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس یہودیوں نے انہیں فریہ

(حیرت انگیز شخصیت) قرار دیا اور عیسائیوں نے انہیں رب بنالیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی راہنمائی فرمائی تو انہوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیا۔

فراء نے کہا ہے: اس عبارت میں قلب کیا گیا ہے۔ علامہ طبری نے اسے پسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا: تقدیر عبارت یہ ہے فہدی اللہ الذین آمنوا للحق لما اختلفوا فیہ (پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تقدیر عبارت کی طرف انہیں اس خوف نے دعوت دی ہے کہ لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے حق کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنین کی اس بعض کے بارے میں راہنمائی فرمائی جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور اسی (خوف) نے فراء کو فی نفسہ غیر حق (کے مفہوم) کے قریب کر دیا۔ علامہ طبری نے بھی فراء سے اسے بیان کرنے میں اسی کا قصد کیا ہے۔ اور رہا کتاب اللہ کے لفظ پر بغیر ضرورت کے قلب کا دعویٰ کرنا، تو اس کی طرف دھکیلنے والی شے عجز اور کوتاہ نظری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام اپنی ذات اور وصف پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فہدی تقاضا کرتا ہے کہ بلاشبہ وہ حق تک پہنچ گئے اور فیہ کے کلمہ میں معنی مکمل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول مِنَ الْحَقِّ سے اس جنس کی وضاحت کی ہے جس میں اختلاف واقع ہوا۔

مہدوی نے کہا ہے: لفظ اختلاف کو اہتماماً لفظ حق پر مقدم ذکر کیا گیا ہے جبکہ مقصود صرف اختلاف کا ذکر کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ قوی نہیں ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے لما اختلفوا عنہ من الحق، ای عن الاسلام۔ یعنی اسلام سے اختلاف کیا۔ اور بِإِذْنِهِ کے بارے میں زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے بعلمہ۔ یعنی اس کے علم کے ساتھ۔

نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے۔ اور اس کا معنی ہے بامرہ یعنی اس کے حکم کے ساتھ۔ اور جب تو نے کسی شے کے بارے میں اجازت دی (تو اس کا مفہوم ہے) تحقیق تو نے اس کے بارے میں حکم دے دیا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہنمائی فرمائی کہ انہیں ایسی چیزوں کے بارے میں حکم فرمایا جن کے مطابق ان کے لئے عمل کرنا واجب ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ① میں معتزلہ کے اس قول کا رد ہے کہ بندہ اپنی ذات کی ہدایت و راہنمائی کا اہتمام خود کرتا ہے (یعنی یہ بندے کے اپنے اختیار میں ہے۔)

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهْتُمُ
الْبَاسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ
اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ②

”کیا تم خیال کر رہے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ انہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہوئے ہیں پہنچی انہیں سختی اور مصیبت اور وہ لرز اٹھے یہاں تک کہ کہہ اٹھا (اس زمانہ کا)

رسول اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو! یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔“

ارشاد باری تعالیٰ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ مِمَّنْ حَسِبْتُمْ بِمَعْنٰی ظَنَنْتُمْ (تم نے گمان کیا) ہے۔ حضرت قتادہ، سدی اور اکثر مفسرین نے کہا: یہ آیت غزوہ خندق کے دوران نازل ہوئی جب کہ مسلمانوں کو مشقت، شدت، گرمی، سردی، تلخ اور تکلیف دہ زندگی اور طرح طرح کی تکالیف اور مصائب آپہنچے اور ان کی کیفیت یہ ہو گئی جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب: ۱۰) (اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔)

اور بعض نے کہا ہے: یہ آیت جنگ احد کے دوران نازل ہوئی۔ اس کی مثل آل عمران میں بھی ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ (آل عمران: ۱۶۲) (کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے۔)

اور ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت مہاجرین کو تسلی اور حوصلہ دینے کے لئے نازل ہوئی جبکہ انہوں نے اپنے گھر اور اپنے اموال مشرکین کے ہاتھوں چھوڑ دیئے اور اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کو انہوں نے ترجیح دی اور یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت کا اظہار کیا اور اغنیاء اور مالدار لوگوں میں سے بعض نے اپنے باطن میں نفاق پیدا کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پاک کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس آیت میں اَمْ منقطعہ بمعنی بل ہے۔ اور بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کبھی اَمْ الف استفہام کے بدلے بھی آتا ہے تاکہ اس سے کلام کی ابتدا کی جائے اور حَسِبْتُمْ دو مفعولوں کو چاہتا ہے، لہذا علمائے نحو نے کہا ہے: اَنْ تَدْخُلُوا قَائِمٌ مَّقَامِ دو مفعولوں کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفعول ثانی محذوف ہے: یعنی اَحْسَبْتُمْ دَخُولَكُمْ الْجَنَّةَ وَاَقْعَا اور لَمَّا بمعنی لم ہے اور مَثَلٌ بمعنی شبہ ہے۔ یعنی اس طرح کے امتحان میں تمہیں نہیں ڈالا گیا جس طرح انہیں آزمایا گیا جو تم سے پہلے تھے۔ پس تم صبر کرو جیسا کہ انہوں نے صبر کیا۔

نضر بن شمیل نے بیان کیا ہے کہ مَثَلٌ بمعنی صفة ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو: اور ابھی تک تمہیں اس طرح کی مصیبت اور شدت نہیں پہنچی، جس طرح کی آزمائش ان لوگوں پر آئی جو تم سے پہلے تھے۔

وہب نے کہا ہے: مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ستر انبیاء علیہم السلام مردہ حالت میں پائے گئے اور ان کی موت کا سبب بھوک اور چمچڑیاں تھیں۔ اسی آیت کی مثل یہ بھی ہے: اَلَمْ يَنْصَرِكُوا اَنْ يُّتَوَكَّلُوْا اَمَّا وَاَنْ يُّفْتَنُوْنَ ۚ وَ لَقَدْ فْتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (العنکبوت) (الف - لام - میم - کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔ اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے انہیں صبر کی دعوت دی اور اس پر ان سے نصرت و مدد کا وعدہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۙ اور الزلزلۃ سے مراد سخت حرکت دینا ہے۔ یہ اشخاص میں بھی ہوتی ہے اور احوال میں بھی۔ کہا جاتا ہے: زلزل اللہ

الارض زلزلة و زلزالا یعنی یا لکسر - فتزلزلت۔ جب وہ حرکت کرے اور کانپنے لگے اور زُلْزِلُوا کا معنی ہے وہ خوفزدہ کیے گئے اور حرکت دیے گئے۔ اور الزلزال۔ فتح کے ساتھ اسم ہے۔ اور الزلزل کا معنی شدا اند اور سختیاں ہیں۔

زجاج نے کہا ہے: زلزله کا اصل معنی کسی چیز کا اپنی جگہ سے پھسل جانا، ہٹ جانا ہے اور جب تو کہے زلزلتہ تو اس کا معنی ہے: تو نے بار بار اپنی جگہ سے ہٹایا اور پھسلایا۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ زلزل دحرج کی طرح فعل رباعی ہے۔

نافع نے حتی یقول رفع کے ساتھ، جبکہ دوسروں نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ حتی کے مابعد کلمہ پر دو اعتبار سے فتح اور دو اعتبار سے رفع آ سکتا ہے۔ مثلاً تو کہتا ہے: سرت حتی أدخل المدينة یہ منصوب ہے۔ اس شرط پر کہ سیر اور دخول دونوں اکٹھے ایک ساتھ گزر چکے ہوں۔ یعنی میں اس میں داخل ہونے تک چلتا رہا۔ ای سرت الی ان ادخلها اور یہ غایت ہے اور اسی کے مطابق ان کی قراءت ہے جنہوں نے منصوب پڑھا ہے۔

اور آیت کے سوا میں نصب کی دوسری وجہ یہ ہے سرت حتی ادخلها۔ ای کی ادخلها (یعنی میں چلاتا کہ میں اس میں داخل ہو جاؤں۔)

اور رفع کی بھی دو وجہیں ہیں سرت حتی ادخلها، ای سرت فأدخلها یعنی میں چلا اور اس میں داخل ہو گیا۔ تحقیق یہ دونوں سیر اور دخول اکٹھے گزر چکے ہیں۔ ای کنت سرت فدخلت۔ اور یہاں (آیت میں) حتی ان مضمرة کے ساتھ عمل نہیں کرتا، کیونکہ اس کے بعد جملہ ہے۔ جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے: فَيَا عَجَباً حَتَّى كَلَيْبٌ تَسْبُنِي (پس کتنی تعجب کی بات ہے کہ بنی کلب مجھے گالیاں دیتے ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: اس بنا پر رفع کی قراءت زیادہ واضح اور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ ای و زلزلوا حتی الرسول یقول اور وہ لرزائے یہاں تک کہ (اس زمانہ کا) رسول کہہ اٹھا۔ یعنی یہاں تک کہ یہ اس کا حال تھا۔ کیونکہ قول زلزله سے منقطع نہیں ہوا اور نصب معنی غایت کی بنا پر ہے اور اس میں وہ معنی نہیں ہے۔

مقاتل کے قول کے مطابق یہاں رسول سے مراد شعیا ہیں۔ اور وہی حضرت یسع علیہ السلام ہیں۔

اور کلبی نے کہا ہے: یہ ہر رسول کے بارے میں ہے جسے اپنی امت کی طرف مبعوث کیا گیا اور اس نے خوب محنت اور مشقت اٹھائی، یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھا: اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کب آئے گی؟ اور ضحاک سے مروی ہے انہوں نے کہا: مراد حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی پر آیت کا نزول دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت کے سوا میں رفع کی دوسری صورت یہ ہے سرت حتی ادخلها یہ اس بنا پر ہے کہ چلنا ماضی میں ہوا اور دخول اب (یعنی زمانہ حال میں) ہو۔

اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: مریض حتی لا یرجونہ، ای هو الآن لا یرجى۔ یعنی وہ بیمار ہوا اور اب اس کے بارے کوئی

امید نہیں ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے سہرے حق اداخلھا لا امنم یعنی میں چلا اور اب میں داخل ہوں گا، اس سے باز نہ رہوں گا۔

مجاہد، اعرج، ابن محیصن اور شیبہ نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن، ابو جعفر، ابن ابی اسحاق اور شبیل وغیرہ نے نصب کے ساتھ قراءت کی ہے۔

مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے کیونکہ قراء کی ایک جماعت اسی نظریہ پر ہے۔

اور اعمش نے وزلزوا و یقول الرسول حتی کی بجائے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے وزلزوا ثم وزلزوا و یقول۔

اور تاویل کرنے والوں میں سے اکثر نے کہا ہے کہ آیت کے آخر تک کلام رسول اور مومنین کے قول میں سے ہے۔ یعنی انہیں مشقت پہنچی یہاں تک کہ وہ مدد و نصرت کو موخر اور دور سمجھنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ اور وہ رسول کے قول میں سے ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر کہ انہوں نے مدد و نصرت کے جلدی آنے کا مطالبہ کیا، نہ کہ کسی شک اور ارتیاب کی بنا پر اور الرسول اسم جنس ہے۔

اور ایک گروہ کا کہنا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، اور تقدیر کلام یہ ہے: حتی یقول الذین آمنوا متی نصر اللہ (یعنی یہاں تک کہ ایمان والے کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی؟) تو اللہ کا رسول کہتا ہے: اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ، پس رسول علیہ السلام کو رتبہ میں بلندی اور حیثیت کی بنا پر مقدم ذکر کیا گیا ہے اور پھر مومنین کے قول کو مقدم لایا گیا ہے، کیونکہ وہ زمانے کے اعتبار سے متقدم ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تو تحکم ہے۔ اور کلام کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا معذور نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہو اور یہ قول کے ذکر کے مکمل ہونے کے بعد بطور استیناف ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: متی نصر اللہ۔ سیبویہ کے قول کے مطابق نصر اللہ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور ابو العباس کے قول کے مطابق یہ فعل کے سبب مرفوع ہے۔ یعنی حتی یقع نصر اللہ۔ اور قریب۔ ان کی خبر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں قریباً پڑھنا بھی جائز ہے یعنی مَكَاناً قَرِیْباً اور قریب کا عرب نہ تشبیہ لاتے ہیں، نہ جمع اور نہ ہی اس معنی میں مونث۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ رَاحَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (الاعراف) اور شاعر نے کہا:

لہ الویل ان اُملی ولا اُثم ہاشم قریب ولا بسباسة بنت یسکرا

شعر میں تشبیہ مونث کے لئے قریب لایا گیا ہے۔

اور اگر تو کہے: فلان قریب لی فلاں میرے قریب ہے، تو اس کی تشبیہ اور جمع بنانا چاہے تو پھر تو کہے گا: قریبون و اقرباء

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَى
وَالسَّائِكِينَ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ①

”آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمائیے: جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔“

ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَسْأَلُونَكَ اس آیت کریمہ میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس میں اگر ہمزہ کو مخفف کر دیا جائے تو اس کی حرکت سین کو دے کر اسے مفتوح پڑھا جائے اور ہمزہ کو حذف کر دیا جائے تو اسے پڑھے گا: يَسْأَلُونَكَ۔

یہ آیت حضرت عمرو بن جموح بنثوذ کے بارے میں نازل ہوئی۔ آپ شیخ کبیر (بہت زیادہ بوڑھے) تھے۔ تو عرض کی: یا رسول اللہ! سائلین یہم بلاشبہ میرا مال کثیر اور بہت زیادہ ہے، تو میں اسے کیونکر صدقہ کروں اور کس پر خرچ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، (1)

مسئلہ نمبر 2۔ ارشاد باری تعالیٰ: مَاذَا يُنْفِقُونَ میں مابعد ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ذاک خبر ہے اور یہ بمعنی الذی ہے۔ اور اسم کی طوالت کے سبب اس سے ہا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے: مَا الَّذِي يُنْفِقُونَهُ اور اگر تو چاہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَا يُنْفِقُونَ کے سبب محل نصب میں ہو۔ اور ذاک، ما کے ساتھ مل کر ایک شے کے قائم مقام ہو۔ تو (اس صورت میں) ضمیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جب یہ اسم مرکب ہے تو پھر یہ محل نصب میں ہوگا۔ بخلاف شاعر کے اس قول کے:

وما ذا عسى الواشون ان يتحدثوا
سوى ان يقولوا اننى لك عاشق

(چغلی کھانے والوں کے پاس بات کرنے کے لئے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کہیں: میں تیرا عاشق ہوں۔)
کیونکہ عسى اس میں عمل نہیں کر رہا۔ پس مَاذَا مرکب کلمہ ہے اور محل رفع میں ہے، کیونکہ ذاک کا کوئی صلہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ کہا گیا ہے کہ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ اور معنی یہ ہے: ”وہ آپ سے پوچھتے ہیں کوئی وہ وجوہ (اور اسباب) ہیں جن میں وہ مال خرچ کر سکتے ہیں اور جو مال خرچ کرنا لازم ہو وہ اسے کہاں رکھیں؟“
سہی نے کہا ہے: یہ آیت زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی، پھر فرض زکوٰۃ نے اسے منسوخ کر دیا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: مہدوی کو سہی کے بارے میں اس مسئلہ میں وہم ہوا ہے، لہذا ان کی طرف یہ قول منسوب کر دیا کہ انہوں نے کہا: یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہے اس سے والدین کا حکم منسوخ ہو گیا۔

ابن جریج وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت مستحب صدقہ کے بارے میں ہے اور زکوٰۃ اس انفاق کے سوا ہے۔

پس اس قول کی بنا پر اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور یہ نفلی صدقہ کے مصارف کو بیان کر رہی ہے۔ پس خوشحال اور غنی آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے محتاج اور فقیر والدین پر اتنا مال خرچ کرے جو ان دونوں کی ان کی حالت کے مطابق اصلاح کر سکے (اور ان کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔) مثلاً کھانا، لباس اور دیگر ضروریات حیات۔

حضرت امام مالک نے کہا ہے: بیٹے پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کی شادی کرائے۔ البتہ یہ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیوی کو خرچہ مہیا کرے چاہے وہ اس کی اپنی ماں ہو یا اجنبی عورت ہو۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس پر اپنے باپ کی شادی کرنا لازم نہیں کیونکہ آپ کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ (باپ) اغلباً شادی سے مستغنی ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسے اس کی شدید حاجت ہو تو پھر اس کی شادی کرنا بھی اس پر واجب ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو پھر اس پر یہ واجب نہ کیا جاتا کہ وہ دونوں (یعنی باپ اور اس کی بیوی) پر خرچ کرے۔ اور عبادات میں سے وہ جو اموال سے تعلق رکھتی ہیں تو (بیٹے پر) لازم نہیں ہے کہ وہ اسے اتنا مال دے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو، یا جہاد پر جاسکتا ہو۔ البتہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ باپ کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے، کیونکہ صدقہ فطر فقہ اور اسلام کی شرط کے ساتھ ضروری ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ۔ اس میں أَنْفَقْتُمْ کی وجہ سے مَا محل نصب میں ہے۔ اور اسی طرح وَمَا يُنْفِقُوا میں بھی ہے۔ اور یہ شرط ہے اور جواب شرط فَلِلْوَالِدَيْنِ ہے۔ اسی طرح وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ شرط ہے اور اس کا جواب فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝ ہے۔ یتیم، مسکین اور ابن سبیل کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: قَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ (الروم: 38)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یَفْعَلُوا یاء کے ساتھ صیغہ غائب کی صورت میں پڑھا ہے۔ آیت کا ظاہر تو خبر ہے، حالانکہ یہ جزا کے وعدہ کو متضمن ہے (1)۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

وَعَسَىٰ أَنْ تَحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

”فرض کیا گیا ہے تم پر جہاد اور وہ ناپسند ہے تمہیں اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ كُتِبَ اس کا معنی ہے: ”فرض کیا گیا ہے۔“ اس کی مثل پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قوم نے اس

کی قراءت کتب علیکم القتال کی ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

كُتِبَ الْقِتَالُ وَالْقِتَالُ عَلَيْنَا وَ عَلَى الْغَانِيَاتِ جُؤُ الدُّيُولِ

ہمارے اوپر جنگ و قتال فرض کیا گیا ہے اور حسن و جمال والیوں پر (فقط کپڑوں کے) دامنوں کو کھینچنا۔
یہ جہاد کی فرضیت کا ذکر ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: یہ وہی ہے جس کے ساتھ انہیں آزمایا گیا ہے اور اسے جنت تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس میں قتال سے مراد کفار دشمنوں کے ساتھ لڑنا اور جنگ کرنا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کا علم انہیں قرآن احوال سے ہوا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ جتنی مدت مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔ آپ ﷺ کو جہاد کی اجازت نہ دی گئی اور جب آپ ہجرت فرما ہوئے تو پھر آپ کو اجازت فرمادی گئی کہ مشرکین میں سے جو کوئی آپ کے خلاف جنگ کرے۔ آپ اس کے ساتھ مقابلہ کریں اور جنگ لڑیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلِمُوا (الحج: ۳۹) (اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا) پھر آپ کو عام مشرکین کے ساتھ جنگ لڑنے کی اجازت عطا فرمادی گئی (۱)۔ اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں مراد کون ہیں۔

تو ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس میں مراد صرف حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں۔ پس ان پر حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں جنگ کرنا فرض عین تھا۔ پھر جب شریعت مضبوط ہو گئی اور قرار پکڑ گئی تو جہاد فرض کفایہ ہو گیا۔ حضرت عطا اور امام اوزاعی نے یہی کہا ہے۔

ابن جریج نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت عطا کو کہا: کیا اس آیت کے مطابق لوگوں پر جہاد کرنا واجب (فرض عین) ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں، بلاشبہ یہ ان (صحابہ کرام) پر فرض کیا گیا تھا۔ اور امت میں سے جمہور نے کہا ہے کہ جہاد کی پہلی فرضیت ہی فرض کفایہ تھی نہ کہ فرض عین، مگر یہ کہ حضور نبی کریم ﷺ جب انہیں جہاد کے لئے نکلنے کی دعوت دیتے تھے تو ان پر اس کے لئے نکلنا لازم ہو جاتا، کیونکہ آپ ﷺ کی اطاعت و پیروی واجب (فرض عین) ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جس پر مسلسل اجماع رہا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی امت کے ہر فرد پر جہاد فرض کفایہ ہے۔ جب مسلمانوں میں سے کچھ افراد یہ فریضہ ادا کر دیں تو باقیوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر دشمن (حملہ آور ہو کر) دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس وقت جہاد فرض عین ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ البراءۃ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور مہدوی وغیرہ نے حضرت ثوری سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جہاد تطوع ہے (یعنی نفلی عبادت ہے اس میں رضا کارانہ طور پر شامل ہونا ہوتا ہے)۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ عبارت کسی سائل کے سوال کے جواب میں کہی گئی ہے۔ تحقیق اس نے جہاد کی تعیین کے بارے سوال کیا تو اسے کہا گیا: ذلک تطوع (کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جس میں جتکلف اطاعت کی جاتی ہے)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ كُرَّةٌ تَلْكُمُ يَهْدِيكُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (اور معنی ہے) اور وہ مزاجوں میں ناپسند ہے۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: الكُرَّةُ کا معنی مشقت ہے۔ اور الكُرَّةُ فحشہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی وہ عمل ہے جس پر تجھے مجبور کیا

جائے۔ یہی پسندیدہ مفہوم ہے۔ اور یہ بھی جائز کہ بالضم (الکُراہ) کا معنی بالفتح (الکُراہ) کی مثل ہو۔ پس یہ دونوں لغتیں ہو سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: کرہت الشيء كُرْهًا و كُرْهًا و كُرَاهَةً و كُرَاهِيَةً (میں نے شے کو ناپسند کیا) اور اکرہتہ علیہ اکرہاً (میں نے اسے اس پر مجبور کیا)۔

بلاشبہ جہاد ایک مشقت ہے۔ کیونکہ اس میں مال خرچ کرنا ہوتا ہے، وطن اور اہل و عیال کو چھوڑنا ہوتا ہے اور اپنے جسم کو زخم کھانے، اعضائے بدن کو کٹوانے اور اپنی جان کو قربان کرنے کے لئے پیش کرنا ہوتا ہے۔ سو ان کی ناپسندیدگی کا سبب یہی ہے نہ کہ یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرض کو ناپسند کیا۔

حضرت عکرمہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک (پہلے) انہوں نے اسے ناپسند کیا اور پھر اسے پسند کرنے لگے اور کہا: سبعتنا و اطعنا، ہم نے حکم سنا اور اطاعت و پیروی کے لئے سر تسلیم خم کر لیا (1)۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ حکم کی پیروی مشقت کو متضمن ہوتی ہے۔ لیکن جب ثواب معلوم ہو جائے تو اس کے ضمن میں مشقتوں کو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: دنیا میں اس کی مثال اس شے کو زائل کرنا ہے جو انسان کو تکلیف دیتی ہے، درد پہنچاتی ہے، اور وہ اس سے ڈرتا ہے جیسا کہ کسی عضو کو کاٹنا، داڑھ کو نکالنا اور فصد کروانا اور پچھ لگوانا تاکہ درد اور تکلیف سے چھٹکارا حاصل ہو جائے اور صحت قائم رہ سکے۔ اور دارالخلد (جنت) میں دائمی حیات سے اور مقعد صدق میں عزت و کرامت سے افضل و اعلیٰ کوئی نعمت نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قول باری تعالیٰ ہے: وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا كَرِهَ اللَّهُ عَمَّا يُصْنَعُونَ۔ الا صم نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے واجبة (یعنی ضروری اور لازم ہونا) اور پورے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے لفظ عَسَىٰ واجبة کے معنی میں ہے (یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے تو پھر اس میں شک کا معنی نہیں ہوتا، بلکہ بالیقین ثابت ہونے کا معنی ہوتا ہے)۔ سوائے اس ارشاد گرامی کے: عَسَىٰ رَأْيُكَ أَنْ تُلْقِيَهُ (التحریم: 5) (کچھ بعید نہیں کہ اگر نبی کریم تم سب کو طلاق دے دیں تو آپ کا رب تمہارے عوض آپ کو ایسی بیبیاں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں)۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے: عَسَىٰ کا لفظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایجاب کے لئے ہے اور معنی یہ ہے: ہو سکتا ہے کہ تم جہاد میں پائی جانے والی مشقت کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو، اس اعتبار سے کہ اس میں تمہیں غلبہ دے دیا جائے، تم کامیابی سے ہمکنار ہو، تم مال غنیمت حاصل کرو اور تمہیں اجر و ثواب بھی دیا جائے گا۔ اور اس دوران جو فوت ہو اوہ شہادت کی موت فوت ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم جہاد چھوڑنے اور ترک کر دینے کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں برا ہو اس اعتبار سے کہ تم پر غلبہ پالیا جائے، تمہیں ذلت و رسوائی پر مجبور کر دیا جائے اور تمہارے اختیارات اور حکومت ختم کر دی جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح اور درست ہے، اس پر کوئی غبار اور شک و شبہ نہیں۔ جیسا کہ بلا دانلس میں اتفاق ہوا ہے،

ان لوگوں نے جہاد چھوڑ دیا، انہوں نے جنگ سے بزدلی کا مظاہرہ کیا، اور اکثر اوقات میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کی تو نتیجتاً دشمن وہاں کے شہروں پر قابض ہو گئے، پھر وہاں کے باسیوں کے ساتھ کیا ہوا؟ انہیں قیدی بنایا گیا، قتل کیا گیا، جلاوطن کیا گیا، اور غلام بنالیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاتھوں کا کیا ہوا تھا اور ان کی کمائی تھی۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے تم پیش آنے والی سختیوں اور مصیبتوں کو ناپسند نہ کرو کیونکہ بسا اوقات جس امر کو تو ناپسند کر رہا ہوتا ہے اسی میں تیری نجات ہوتی ہے اور بسا اوقات جس امر کو تو پسند کرتا ہے اس میں تیری ہلاکت اور بربادی ہوتی ہے۔ ابو سعید الخدری نے کہا ہے

رُبَّ اَمْرِ تَتَّقِیْہِ جَزَ اَمْرًا تَرْتَضِیْہِ خفی المحبوب منه و بدا البکر وہ فیہ
کئی امور ہیں جن سے تو اجتناب کرتا ہے اور بچتا ہے وہ ایسے امور کو کھینچ لاتے ہیں جن سے تو راضی ہوتا ہے۔ پسندیدہ امر
ان میں مخفی ہوتا ہے اور ناپسندیدہ امر ان میں ظاہر ہوتا ہے۔

یَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّہْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْہِ ۚ قُلْ قِتَالٌ فِیْہِ کَبِیْرٌ ۚ وَصَدُّ عَنْ سَبِیْلِ
اللّٰہِ وَکُفْرٍ بِہِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَ اِخْرَاجُ اَہْلِہِ مِنْہُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ ۚ وَالْفِتْنَةُ
اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا یَزَالُونَ یُقَاتِلُوْکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنْ
اَسْتَطَاعُوْا ۚ وَ مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہِ فِیْمَتْ وَ هُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ
اَعْمَالُہُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ اِنَّ
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جَہَدُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَاحَتًا
اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۸۲﴾

”وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے۔ آپ فرمائیے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور (روک دینا) مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں اللہ کے نزدیک اور فتنہ (فساد) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور وہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے۔ اور جو پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جائے حالت کفر پر یہی وہ (بد نصیب) ہیں کہ ضائع ہو گئے ان کے عمل دنیا و آخرت میں اور یہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔“

اس میں بارہ مسئلے ہیں:-

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **يَسْأَلُونَكَ** اس لفظ کے بارے گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ جریر بن عبد الحمید اور محمد بن فضیل نے عطاء بن سائب سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اصحاب سے زیادہ بہتر قوم کوئی نہیں دیکھی۔ انہوں نے آپ ﷺ سے صرف تیرہ مسائل کے بارے سوال کیا اور وہ تمام کے تمام قرآن کریم میں موجود ہیں۔

مثلاً **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ**، **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ** اور **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ** اور وہ سوال نہ کرتے تھے مگر ایسی شے سے متعلق جو ان کے لئے نفع بخش ہوتی تھی۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: تیرہ مسئلوں میں سے سوائے تین کے حدیث طیبہ میں کوئی نہیں ہے۔

ابو الیسار نے جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ایک جتھہ بھیجا اور ان پر ابو عبیدہ بن حارث یا عبیدہ بن حارث کو امیر مقرر کیا۔ پس جب وہ روانہ ہونے کے لئے آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، تو وہ رسول اللہ ﷺ کی فرط محبت سے فریفتہ ہو کر رونے لگے۔ تو آپ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو (امیر بنا کر) بھیج دیا اور انہیں ایک خط لکھ کر عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس خط کو کھول کر نہ پڑھیں یہاں تک کہ وہ فلاں فلاں جگہ تک پہنچ جائیں اور ارشاد فرمایا: اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو سفر پر مجبور نہ کرنا۔ پس جب وہ اس مقررہ جگہ پر پہنچے تو خط پڑھا اور **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ** پڑھا اور کہا: **هَذَا طَاعَةٌ لِلّٰهِ وَرَسُولِهِ** (کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کی رضا اور خوشنودی کے لئے علم کی تعمیل میں دل و جان حاضر ہے۔)

راوی کا بیان ہے: دو آدمی واپس لوٹ آئے اور باقی افراد ان کے ساتھ آگے چلے گئے۔ چنانچہ ان کی ملاقات ابن حضری سے ہوئی، تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور انہیں اس کا علم نہ تھا کہ آج رجب کا پہلا دن ہے، تو اس پر مشرکین نے کہا: تم نے شہر حرام میں قتل کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ** (1)۔

اس آیت کے سبب نزول میں یہ روایت بھی ہے کہ بنی کلابہ کے دو آدمی عمرو بن امیہ ضمری سے ملے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ دونوں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس تھے اور وہ دن رجب کا پہلا دن تھا۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ تب قریش نے کہا: اس نے ان دونوں کو شہر حرام (حرام مہینے) میں قتل کیا ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

لیکن اس آیت کے سبب نزول میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا واقعہ اکثر اور زیادہ مشہور ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں نو افراد کے گروہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آٹھ افراد کے ساتھ غزوہ بدر سے دو ماہ پہلے جمادی الآخر میں بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجب میں بھیجا تھا۔

ابو عمر نے کتاب الدرر میں اس کے بارے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کرز بن جابر کی تلاش سے واپس لوٹ کر آئے۔ اس خروج کو بدر اولیٰ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ ﷺ جمادی الثانی کے بقیہ ایام اور رجب کا مہینہ مدینہ طیبہ میں قیام فرما

رہے اور رجب میں آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش بن رباب الاسدی کو بھیجا اور ان کے ساتھ مہاجرین میں سے آٹھ افراد اور بھی تھے۔ اور وہ تھے ابو حذیفہ بن عتبہ، عکاشہ بن محسن، عتبہ بن غزوہ، سہیل بن بیضاء فہری، سعد بن ابی وقاص، عامر بن ربیعہ، واقد بن عبداللہ تمیمی اور خالد بن بکیر لیشی۔ اور آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے لئے ایک خط تحریر فرمایا اور انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھیں یہاں تک کہ وہ دودن سفر کر لیں، پھر اسے کھول کر پڑھیں۔ پس آپ نے وہی کچھ کیا جس طرح کرنے کا آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا۔ اور آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کو مجبور نہ کریں اور آپ ان کے امیر ہیں۔ پس حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی کیا جیسے آپ نے حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پس جب آپ نے خط کھولا اور اسے پڑھا، تو اس میں پایا کہ جب تو میرے اس خط میں دیکھے تو پھر اس پر عمل کرنا یہاں تک کہ تو مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ پر اترنا اور وہاں قریش کی تاک میں رہنا اور ہمیں ان کی خبروں کے بارے آگاہ کرنا۔ اذنا نظرت فی کتابی هذا فامض حتى تنزل نخلة بين مكة والطائف فتصد بها قریشا، و تعلم لنا من اخبارهم۔

پس جب آپ نے تحریر پڑھی تو کہا: سمعاً و طاعة (دل و جان سے تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہیں) پھر اپنے ساتھیوں کو بھی اس کے بارے آگاہ کیا اور اس کے بارے بھی کہ وہ ان میں سے کسی کو مجبور نہ کریں گے اور یہ کہ وہ آپ کی خوشنودی کے لئے انہیں کو ساتھ لے کر انہیں گے جنہوں نے آپ کی اطاعت کی اور یہ کہ اگر کسی نے بھی آپ کی اطاعت نہ کی تو پھر وہ اکیلے ہی آگے بڑھیں گے۔ پس جو کوئی شہادت کو پسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ (آگے بڑھنے کے لئے) اٹھے، اور جو کوئی موت کو ناپسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ تو ساتھیوں نے جواب دیا: ہم تمام کے تمام اس (کام) میں رغبت رکھتے ہیں جس میں آپ رغبت رکھتے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک یقیناً رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کے لئے دل و جان سے حاضر ہے۔ اور وہ سارے آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور حجاز کی طرف چل پڑے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوہ ان کا اونٹ بھاگ گیا، وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے اور اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے۔ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت آگے چلے گئے یہاں تک کہ مقام نخلہ پر جا کر اترے، تو وہاں سے قریش کا ایک قافلہ گزرا، جو کشمش اور دیگر سامان تجارت اٹھائے ہوئے تھا اور اس میں عمرو بن حضری تھا۔ حضری کا نام عبداللہ بن عباد ہے جو صدف سے تعلق رکھتا تھا اور صدف حضرموت کا ایک قبیلہ ہے اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور حکم بن کیسان مولیٰ بنی مغیرہ بھی شامل تھے۔ پس مسلمانوں نے باہمی مشاورت کی اور کہا: ہم شہر حرام رجب کے آخری دن میں ہیں، پس اگر ہم ان سے قتال کرتے ہیں تو ہم شہر حرام کی حرمت کو پامال کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور اگر ہم انہیں آج رات چھوڑ دیتے ہیں تو پھر وہ حرم پاک میں داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ان کے ساتھ لڑنے پر اتفاق کر لیا اور واقد بن عبداللہ تمیمی نے تیر مارا اور عمرو بن حضری کو قتل کر دیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنا لیا اور نوفل بن عبداللہ بھاگ گیا۔ پھر سامان سے لدے ہوئے اونٹ اور دو قیدیوں کو ساتھ لے آئے اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: جو مال غنیمت ہم نے حاصل کیا ہے اس سے رسول اللہ ﷺ کے لئے خمس علیحدہ کر دو۔ پس انہوں نے ایسا ہی کر دیا۔ اسلام میں پہلا خمس

یہی تھا۔ پھر قرآن کریم نازل ہوا: **وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ الْآيَةُ** (اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لئے ہے اس کا پانچواں حصہ الخ) (الانفال: ۴۱)

پس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے فعل کو برقرار رکھا اور اسے پسند کیا اور یوم قیات تک اسے امت کے لئے سنت قرار دیا۔ یہی پہلی غنیمت ہے جو اسلام میں حاصل ہوئی اور (حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ) پہلے امیر ہیں اور عمرو بن حضری پہلا مقتول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر حرام میں ابن حضری کے قتل کو ناپسند کیا اور اس معاملہ کو قوم پر چھوڑ دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ تَقُولُ هُمْ فِيهَا خُلِيدُونَ** (۱۰) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قیدیوں کا فدیہ قبول کر لیا۔

پھر عثمان بن عبداللہ حالت کفر میں ہی مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اور حکم بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہی رہے یہاں تک کہ انہوں نے بزم معونہ میں جام شہادت نوش کیا اور حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما صحیح سالم مدینہ طیبہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

اور کہا گیا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما کا اپنے اونٹ کی تلاش میں جانا حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی اجازت سے تھا۔ اور عمرو بن حضری اور اس کے ساتھیوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا، تو وہ ان سے خوفزدہ ہو گئے، تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک یہ قوم تم سے خوفزدہ ہو کر گھبرا گئی ہے، پس تم اپنے میں سے ایک آدمی کا سرمونڈ دو اور پھر اسے چاہئے کہ وہ ان کے پاس چلا جائے۔ پس جب انہوں نے اسے دیکھا جس کا سرمونڈا ہوا تھا، تو وہ امن میں ہو گئے اور کہنے لگے: یہ قوم عمار ہے تم پر کوئی حرج اور خطرہ نہیں ہے اور پھر انہوں نے ان کے قتال کے بارے میں باہمی مشاورت کی۔ الحدیث۔

یہودیوں نے فال نکالی اور کہا: واقعہ سے مراد و قتال الحرب ہے یعنی جنگ بھڑک اٹھی اور عمرو سے مراد عورت الحرب ہے یعنی جنگ قائم ہو گئی اور حضری سے مراد حضرت الحرب ہے جنگ شروع ہو گئی۔

اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم ان دونوں کا فدیہ قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما آجائیں اور اگر وہ دونوں نہ آئے تو ہم ان دونوں کو ان کے بدلے قتل کر دیں گے۔ پس جب وہ دونوں آگئے تو ان دونوں نے فدیہ ادا کر دیا۔ پھر حکم نے تو اسلام قبول کر لیا اور مدینہ طیبہ میں ہی مقیم ہو گیا یہاں تک کہ غزوہ بزم معونہ میں شہید کر دیا گیا۔ رہا عثمان! تو وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ گیا اور وہیں حالت کفر میں مر گیا اور رہا نوفل! تو اس غزوہ احزاب کے دن اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی تاکہ وہ خندق کو عبور کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکے، تو وہ اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور دونوں کے اعضاء بدن ٹوٹ گئے۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے مار ڈالا۔ مشرکین نے اس کا مردہ جسم شمن کے عوض طلب کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تم اسے اٹھا لو کیونکہ اس کا مردہ بدن بھی ناپاک ہے اور اس کی دیت بھی ناپاک ہے“ **خُذُوهُ فَانْهَابِثَ الْجِيْفَةِ حَبِثَ الدِّيَةِ** پس یہی اس ارشاد باری تعالیٰ کے

نزول کا سبب ہے: **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الْآيَةِ۔**

ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ عمرو بن حضری کا قتل رجب کے آخری دن میں ہوا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور طبری نے سدی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ وہ جمادی الثانی کے آخری دن قتل ہوا، لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے، اس بنا پر کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ رجب کی پہلی رات میں ہوا اور مسلمان اسے جمادی الثانی میں سے گمان کرتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ صاحب بن عباد نے اپنے رسالہ المعروفہ بالاسدیہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو اس وقت امیر المومنین کا نام دیا گیا اس لئے کہ انہیں مومنین کی ایک جماعت پر امیر مقرر کیا گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا اس آیت کے نسخ کے بارے اختلاف ہے، پس جمہور اس کے نسخ کے قائل ہیں اور یہ کہ اشہر حرام میں مشرکین کے ساتھ قتال کرنا مباح ہے۔ البتہ اس کے نسخ کے بارے میں ان کا اختلاف ہے۔ زہری نے کہا ہے: اسے ارشاد باری تعالیٰ **وَقَاتِلُوا الشُّرُكِيْنَ كَآفَّةً** (التوبہ: ۳۶) (اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے) نے منسوخ کر دیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر حرام میں بنی ثقیف کے ساتھ جنگ کرنے نے منسوخ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر کو شہر حرام میں او طاس کی طرف جنگ کے لئے بھیجا تھا (لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس حکم کے لئے نسخ ہے۔) اور ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذوالقعدہ کے مہینہ میں جنگ پر بیعت رضوان لینے نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب مکہ مکرمہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیئے جانے کی خبر پہنچی اور یہ کہ وہ (اہل مکہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے ان کے دفاع پر بیعت لی (کہ وہ ان کا مقابلہ پوری جرأت کے ساتھ کریں گے۔) نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیعت ان سے جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے لی۔

اور امام بیہقی نے عروہ بن زبیر سے محمد بن اسحاق کی حدیث کے علاوہ حضری کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ الْآيَةِ۔** بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ شہر حرام میں قتال اسی طرح حرام ہے جیسے پہلے تھا اور جس سبب سے مومنین اسے حلال سمجھتے ہیں تو وہ اس (قتال) سے بڑا جرم ہے۔ وہ یہ کہ (کفار) انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے جائیں، وہ انہیں بیڑیاں پہنا دیتے ہیں، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور ستاتے ہیں اور انہیں مجبوس کر لیتے ہیں۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور مسلمانوں کو حج و عمرہ اور نماز کے لئے مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ مسجد حرام کے باسیوں کو باہر نکالتے ہیں حالانکہ اس کے مکین مسلمان ہیں اور دین کے بارے میں انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا رکھتے ہیں اور ہم تک یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن حضری کے قتل کی دیت ادا فرمائی اور شہر حرام کو اسی طرح حرام قرار دیا جس طرح وہ انہیں حرام قرار دیتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ** (التوبہ: 1) (یہ قطع تعلق) (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) (1)

حضرت عطا کہتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے اور اشہر حرام میں قتال جائز نہ ہوگا اور اسی پر حلف اٹھایا جاسکتا ہے، کیونکہ اس کے بعد وارد ہونے والی آیات زمانہ کے اعتبار سے عام ہیں اور یہ خاص ہے اور بالاتفاق عام خاص کے لئے ناسخ نہیں ہو سکتا۔

اور ابوالزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر حرام میں جنگ نہ کرتے تھے مگر یہ کہ آپ کے ساتھ جنگ کی جاتی۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قِتَالِ فِیْہِ۔ اس میں قِتَالِ سیبویہ کے نزدیک بدل اشتمال ہے، کیونکہ سوال مہینے اور قتال دونوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کفار مہینے کی حرمت کو توڑنے پر تعجب کرتے ہوئے آپ سے سوال کر رہے ہیں۔ پس ان کا سوال شہر (مہینے) کے متعلق ہوا، صرف اس لئے کہ اس میں قتال پایا گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کے بارے سوال کرتے ہیں۔

اور قتبی نے کہا: وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کرنے کے بارے پوچھتے ہیں: کیا یہ جائز ہے؟ پس اسی وجہ سے انہوں نے قتال کو شہر سے بدل قرار دیا ہے اور سیبویہ نے ایک شعر بھی بیان کیا ہے:

فَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُنْكَ وَاحِدٍ وَ لَكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهْدَمَا
قیس کا ہلاک ہو جانا ایک آدمی کا ہلاک ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا ہلاک ہونا تو پوری قوم کے محل کے گر جانے کے مترادف
ہے۔ (تو اس میں ہلکے قیس سے بدل ہے۔)
عکرمہ نے اس طرح قراءت کی ہے: يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قَتْلٍ فِيهِ قُلٌ قَتْلٌ یعنی دونوں مقامات پر
(قتال کو) بغیر الف کے پڑھا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے میں اور اس میں جنگ کرنے کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یعنی یسألونک عن الشہر الحرام وعن قتال فیہ) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح قراءت کی ہے۔ پس اس صورت میں قتال، عن، مکررہ کی وجہ سے مجرور ہوگا۔ کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ قتال مجرور ہے کیونکہ اس سے پہلے عن۔ نیت موجود ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ قتال جوار کی بنا پر مجرور ہے۔ (یعنی چونکہ یہ مجرور کے پڑوس میں ہے جو کہ الشہر الحرام ہے، اس لئے اس کا اعراب اسے بھی دے دیا گیا ہے۔)

پروں میں ہے، جو کہ اس سبب اس کتاب میں ہے کہ کتاب اللہ میں کسی لفظ کو حق جوار کی بنا پر کوئی اعراب دے دیا جائے اور نہ ہی کسی اور نحاس نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ کتاب اللہ میں کسی لفظ کو حق جوار کی بنا پر کوئی اعراب دے دیا جائے اور نہ ہی کسی اور کلام میں ایسا کرنا جائز ہے۔ کیونکہ محض جوار کا اعتبار غلط ہے اور جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہ شاذ ہے۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے: **هَذَا جُحْرٌ ضَبٌّ خَرِبٌ** اور اس کے غلط ہونے پر دلیل تشبیہ میں عربوں کا یہ قول ہے: **هَذَا جُحْرٌ ضَبٌّ خَرِبٌ** جہاں ضب خربان بلاشبہ یہ اقواء (شعر کے قافیہ کو مختلف کرنا یعنی کسی کو رفع دینا اور کسی کو جر دینا) کے قائم مقام ہے۔ لہذا یہ جائز نہیں ہوگا کہ کتاب اللہ میں سے کسی شے کو اس پر محمول کیا جائے اور اصح اور اصح لغات کے سوا اس طرح نہیں ہو سکتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ حق جوار کی بنا پر مجرور ہے، ان کا یہ قول خطا ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ عن کو مضمحل کرنا جائز نہیں ہے اور اس بارے میں یہ قول کرنا کہ یہ بدل ہے (بھی جائز نہیں) اعرج نے قتال کو مرفوع پڑھا ہے یعنی یَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ

نحاس نے کہا ہے: یہ عربی میں ابہام اور پیچیدگی ہے اور اس میں معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے سوال کر رہے ہیں، کیا اس میں قتال جائز ہے؟ اور ارشاد باری تعالیٰ یَسْأَلُونَكَ اسْتِفْهَامٍ بِرَدِّ لَاتٍ كَرْتَا ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

أَصَاحِ تَرَى بَرِّقًا أُرِيكَ وَ مِیْضَهُ كَلْبِیْعِ الْیَدِیْنِ فِی حَبِیِّ مُكَمَّلِ

اے میرے ساتھی! کیا تو اس بجلی کو دیکھ رہا ہے جس کی چمک تجھے دکھائی گئی اونچے بادلوں کی چمک میں دونوں ہاتھوں کی چمک (حرکت) کی طرح۔

تو اس میں تری سے پہلے الف استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اصاح کا الف اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ حرف ندا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا ہے:

تَرَوْحُ مِنَ الْحَيِّ امْرُتُ بَتِّكَرِ

کیا تو قبیلے سے شام کے وقت جائے گا یا صبح کے وقت۔

تو اس میں بھی اصل عبارت اُتروح ہے، ہمزہ استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ امر اس پر دلالت کر رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كِبٰیْرٌ۔ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی اس میں قتال کرنا انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ کا عمل ہے۔ کیونکہ شہر حرام میں قتال کو حرام قرار دینا اس وقت ثابت ہے جبکہ ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہو۔ آیت میں لفظ الشَّہْر اسم جنس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے لئے شہر حرام کو قوام بنادیا تھا، وہ اس دوران اعتدال برتتے تھے، وہ خون نہیں بہاتے تھے اور نہ ہی اشہر حرام میں غارتگری کرتے تھے۔ اشہر حرام سے مراد رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہیں۔ ان میں تین مسلسل اور لگاتار ہیں اور ایک منفرد ہے۔ اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المائدہ میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قول باری تعالیٰ: وَ صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مُبْتَدِیٌّ اَوْ وَ كُفْرٌ بِہٖ، صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا سبیل اللہ پر عطف کیا گیا ہے۔ وَ اخْرَاجُ اَهْلِہٖ مِنْہُ بھی صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور مبتدا کی خبر اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ یعنی مذکورہ اعمال کرنا شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑھ کر گناہ ہیں۔ یہ قول مبرد وغیرہ نے کیا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اس میں لوگوں کو طویل عرصہ تک کعبہ معظمہ کا طواف کرنے سے روکنا ہے۔ اور وَ كُفْرٌ بِہٖ میں ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو سکتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد ہے بالحج والمسجد الحرام۔ یعنی حج اور مسجد حرام میں کفر کا ارتکاب کرنا۔ اور وَ اخْرَاجُ اَهْلِہٖ مِنْہُ اَکْبَرُ یعنی وہاں سے باسیوں کو نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑا جرم اور گناہ ہے (اور اس کی سزا زیادہ ہے۔)

فراء نے کہا ہے: صَدٌّ کا عطف گہیڑ پر کیا گیا ہے اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف بہ کی ہا ضمیر پر کیا گیا ہے۔ پس یہ کلام عطف نسق اور متصل ہے منقطع نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ غلطی ہے کیونکہ معنی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ او کفر بہ۔ ای باللہ کا عطف بھی گہیڑ پر کر دیا جائے۔ اور اس سے یہ معنی ظاہر ہوگا کہ اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفر سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور اس معنی کا فاسد ہونا بالکل ظاہر اور بین ہے۔

جمہور کے قول کے مطابق آیت کا معنی یہ ہے: اے کفار قریش! بلاشبہ تم ہمارے بارے میں شہر حرام میں جنگ کرنے کو بہت بڑا جرم سمجھ رہے ہو، حالانکہ جو کچھ تم کر رہے ہو یعنی جو کوئی اسلام قبول کرنے کا ارادہ کرے اسے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا، تمہارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور تمہارا اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا، جیسا کہ تم نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب علیہم الرضوان کے ساتھ کیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ اور بڑا جرم ہے (1)۔

حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

تَعْدُونَ قَتْلًا فِي الْحَرَامِ عَظِيمَةً
واعظمُ منه لَوِيْرَى الرُّشْدِ رَاشِدُ
تم ماہ حرام میں قتل کو بڑا گناہ شمار کر رہے ہو حالانکہ اگر کوئی ہدایت یافتہ راہ ہدایت کو دیکھے تو اس سے بھی بڑے گناہ یہ ہیں:
صُدُّوْكُمْ عَمَّا يَقُوْلُ مُحْتَدٌ
وَكُفْرٌ بِهٖ وَاللّٰهُ رَآئِيْ وَ شَٰهَدُ
محمد (ﷺ) کے ارشادات سے تمہاری مخالفت اور آپ سے کفر، اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور اس کا گواہ ہے۔

واخْرَاجَكُمْ مِنْ مَسْجِدِ اللّٰهِ اَهْلَهُ
لئلا يُرى الله في البيت ساجد
اور تمہارا اللہ کی مسجد سے اس میں بسنے والوں کو نکال دینا تاکہ بیت اللہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی سجدہ کرنے والا نظر نہ آئے۔
فَاَنَّا وَاِنْ عَيَّرْتُمُوْنَا بِقَتْلِهِ
وَأَرْجَفَ بِالْإِسْلَامِ بَاغٌ وَ حَاسِدٌ
اگرچہ تم نے ہمیں قتل کی عار دلائی اور سرکش اور حسد کرنے والوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔

سَقَيْنَا مِنْ ابْنِ الْحَضْرَمِيِّ رَمَاحَنَا
بِنَخْلَةٍ لَّنَا أَوْقَدَ الْحَرْبَ وَاقْدُ
لیکن ہم نے وادی نخلہ میں ابن حضرمی کے خون سے اپنے نیزوں کو سیراب کیا جب واقعہ نے جنگ کی آگ بھڑکائی
دَمًا وَابْنُ عَبْدِ اللَّهِ عَشْمَانُ بَيْنَنَا
يُنَازِعُهُ غُلٌّ مِنْ الْقِدِّ عَانِدُ
عثمان بن عبد اللہ ہمارے پاس ہے، تیسے کے خون آلود طوق نے اسے جکڑ رکھا ہے۔

زہری اور مجاہد وغیرہا نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ قُلْ قَاتِلْ فِيْهِ كُفْرًا منسوخ ہے اور اس کا نسخہ یہ ارشاد ہیں وَقَاتِلُوا
النَّاسَ كَيْفَ كَافَّةً اور فَاَقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (توبہ: 5)۔

حضرت عطاء نے کہا ہے: یہ منسوخ نہیں ہے اور اشہر حرام میں قتال نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔
مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد کفر ہے۔ یعنی تمہارا کفر کرنا ہمارے انہیں قتل کرنے سے بڑا جرم ہے۔

جمہور نے کہا ہے: یہاں فتنہ سے مراد ان (کفار) کا مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کرنا ہے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے، یعنی تمہارا یہ رویہ اختیار کرنا اشر حرام میں تمہیں قتل کرنے سے زیادہ شدید اور سخت جرم ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَزَالُؤُنَ۔ یہ ابتداء اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے، اور اس کے ذریعہ مؤمنین کو کافروں کے شر سے ڈرانا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں اور یَزِدُوْكُمْ حَتَّىٰ کے سبب منصوب ہے، کیونکہ یہ خلاصہ غایت ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يُّزِدْهُ اور جو کوئی اسلام سے کفر کی جانب لوٹ جائے۔ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ تَوَان کے عمل باطل ہو گئے اور فاسد ہو گئے۔ اسی سے الحَبْطُ بھی ہے۔ مراد وہ بیماری ہے جو جانوروں کے پیٹوں میں بہت زیادہ گھاس اور چارہ وغیرہ کھا جانے سے لگ جاتی ہے۔ اس کے سبب ان کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور بسا اوقات اسی سبب سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کے لئے بطور تہدید ہے تاکہ وہ دین اسلام پر ثابت قدم رہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ علماء کے مابین مرتد کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی یا نہیں؟ کیا نفس ردت کے ساتھ ہی اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ مگر یہ کہ اس کی موت کفر پر واقع ہو؟ کیا اسے وارث بنایا جائے گا یا نہیں؟ یہ تین مسائل ہیں۔

(1) ایک گروہ نے کہا ہے: اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی، پس اگر وہ توبہ کر لے تو فہما، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے: ایک ساعت ترغیب دی جائے گی اور دوسروں نے کہا ہے: ایک مہینہ تک اسے توبہ کی رغبت دلائی جائے گی اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اسے تین (بار) توبہ کے لئے کہا جائے گا۔ اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی قول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا ہے جسے آپ سے ابن قاسم نے روایت کیا ہے۔

حسن نے کہا ہے: اسے سو بار توبہ کی ترغیب دلائی جائے گی اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے توبہ کی رغبت دلائے بغیر ہی قتل کر دیا جائے گا۔ امام شافعی نے بھی اپنے ایک قول میں یہی کہا ہے اور یہی طاؤس اور عبید بن عمیر کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

سخنوں نے ذکر کیا ہے کہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ ماجشون کہا کرتے تھے: مرتد کو قتل کیا جائے گا اور اسے توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی اور انہوں نے حضرت معاذ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان کے پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: تشریف رکھیے اور ان کے لئے تکیہ وغیرہ رکھا۔ تو اس وقت ان کے پاس ایک آدمی تھا جسے بیڑیاں پہنائی گئی تھیں، تو آپ نے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ یہودی تھا، اس نے اسلام قبول کیا، اس نے پھر اپنے دین کو برے دین کی طرف لوٹا دیا ہے اور یہ یہودی ہو گیا ہے، تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ

بیٹھ جائے۔ انہوں نے کہا: (ہاں) میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تین بار آپ نے یہی کہا۔ چنانچہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ روایت امام مسلم وغیرہ نے بیان کی ہے۔ (1)

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ مرتد پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو فیہما، ورنہ اسی جگہ اسے قتل کر دیا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ مہلت کا مطالبہ کرے۔ پس اگر اس نے مہلت کا مطالبہ کیا، تو اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی، لیکن آپ سے اور آپ کے اصحاب سے مشہور قول یہ ہے کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے توبہ کی ترغیب دی جائے، ان کے نزدیک زندیق اور مرتد برابر ہیں۔ اور امام مالک نے کہا ہے کہ زنادقہ کو قتل کیا جائے گا اور انہیں توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی۔ یہ پہلے سورۃ البقرہ (ج: 1، ص: 198) میں گزر چکا ہے۔ جو کوئی کفر کی ایک نوع سے نکل کر کفر کی ہی دوسری نوع میں داخل ہوا، تو اس کے بارے علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور جمہور فقہاء نے کہا ہے: اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، کیونکہ اس طرح وہ اسی کفر کی طرف ہی منتقل ہوا ہے جس پر وہ ابتدا میں تھا، لہذا اسے اسی پر برقرار رکھا جائے گا۔ ابن عبدالحکم نے حضرت امام شافعی سے بیان کیا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من بدل دینہ فاقتلوه جو کوئی اپنا دین بدل دے تم اسے قتل کر دو (2)۔ اور آپ نے کسی مسلمان کو کافر سے خاص نہیں کیا۔

امام مالک نے فرمایا ہے: حدیث کا معنی یہ ہے جو کوئی اسلام سے نکل کر کفر کی طرف جائے اور رہا وہ جو کفر سے کفر کی طرف نکلا تو وہ اس حدیث سے مراد نہیں۔ یہی فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ امام شافعی سے مشہور قول وہ ہے جو مزی اور ربیع نے ذکر کیا ہے کہ اہل ذمہ میں سے اپنا دین بدلنے والے کو امام وقت دار الحرب بھیج دے گا اور اسے اپنے شہر (ملک) سے نکال دے گا اور حربیوں کے اموال کے ساتھ اس کا مال بھی حلال ہو جائے گا اور دار الحرب پر غلبہ پالیا گیا۔ کیونکہ امام وقت نے اسے اس دین کی بنا پر ذمی بنایا تھا جس پر وہ عقد ذمہ کے وقت تھا۔ مرتدہ عورت کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے:

امام مالک، امام اوزاعی، امام شافعی اور لیث بن سعد رحمہ اللہ نے کہا ہے: مرتدہ ہونے والی عورت کو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ مرتد آدمی کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں برابر ہیں۔ اور ان کی دلیل ظاہر حدیث ہے من بدل دینہ فاقتلوه اور اس میں لفظ من مذکور مونث دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔

امام ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی ابن شبرمہ کا قول ہے، اسی کو ابن علیہ نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت عطاء اور حسن کا قول ہے اور انہوں نے استدلال اس سے کیا ہے کہ

1۔ بخاری شریف، باب حکم المرتد والمرتدة الخ، حدیث نمبر 6412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب لا یعذب بعذاب اللہ، حدیث نمبر 2794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من بدل دینہ فاقتلوا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا اور جو حدیث روایت کرتا ہے وہ اس کی تاویل اور مفہوم بہتر جانتا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور پہلے فریق نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ”کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے ایک کے ساتھ (یعنی) ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا..... الحدیث۔“ پس یہ حکم ہر اس آدمی کو شامل ہوگا جس نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا (چاہے وہ مرد ہو یا عورت) اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام شافعی نے کہا ہے: بے شک وہ آدمی جو مرتد ہوا (نعوذ باللہ) پھر اسلام کی طرف واپس آ گیا تو نہ اس کے اعمال ضائع ہوں گے اور نہ ہی اس کا وہ حج ضائع ہوگا جس سے وہ فارغ ہو چکا۔ بلکہ اگر وہ حالت ردت پر ہی فوت ہو گیا تب اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

امام مالک نے فرمایا ہے: مرتد ہوتے ہی اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، اختلاف کا اظہار مسلمان میں ہوگا کہ جب وہ حج کرے، پھر مرتد ہو جائے اور پھر اسلام قبول کر لے۔ پس امام مالک نے فرمایا کہ اس پر حج کرنا لازم ہوگا، کیونکہ اس کا پہلا حج ردت کے سبب ضائع ہو چکا ہے۔ اور امام شافعی نے فرمایا: اس پر حج کا اعادہ لازم نہیں ہوگا، کیونکہ ابھی اس کے عمل باقی ہیں۔ ہمارے علماء نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: لَیْسَ اَشْرَکُتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ (الزمر: 65) (کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے)

انہوں نے کہا: یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرعاً ردت کا پایا جانا محال ہے۔

اور امام شافعی کے اصحاب نے کہا ہے: بلکہ امت پر بطریق تغلیظ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شرف مرتبہ کے باوجود اگر شرک کا ارتکاب کریں تو ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، تو پھر تمہارا کیا حال ہوگا؟ لیکن آپ اپنے مرتبہ کے فضل و شرف کے سبب شرک نہیں کریں گے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: یُنْسَاۗءُ النَّبِیَّ مَنْ یَّاتِ مِنْکُمْ بِفَاحِشَةٍ مُّبِیِّنَةٍ یُضَعَّفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ (الاحزاب: 30) (اے نبی کریم کی بیویاں! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لئے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا۔) اور یہ ان کے شرف مرتبہ کے سبب ہے۔ ورنہ ان سے اس قسم کے فعل کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ان کے زوج مکرم و معظم کی حفاظت و صیانت کی خاطر، یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی دونوں شرطوں کو پورا کرنے کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر خلود فی النار کی جزا کو معلق کیا ہے۔ پس جو کوئی کفر پر قائم رہا اللہ تعالیٰ اس آیت کے مطابق اسے ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دے گا اور

جس کسی نے شرک کا ارتکاب کیا دوسری آیت کے مطابق اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ پس یہ دونوں آیتیں دو معنوں اور دو مختلف حکموں کے لئے مفید ہیں اور جو خطاب آپ ﷺ کو کیا گیا ہے تو وہی آپ کی امت کے لئے ہے تاکہ آپ کا اختصاص ثابت ہو جائے اور جو آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کے بارے میں وارد ہے، تو بلاشبہ ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے تاکہ وہ یہ واضح کر دے کہ اگر ایسا تصور بھی کیا جائے تو یقیناً اس میں دو بے عزتیاں ہیں۔ اس میں ایک حرمت دین کی ہتک ہے اور دوسری حرمت نبی ﷺ کی ہتک ہے اور ہر حرمت کی ہتک پر عقاب اور سزا ہے۔ اور یہ اس کے قائم مقام ہو جائے گا جس نے شہر حرام میں، یا بلد حرام میں، یا مسجد حرام میں گناہ اور نافرمانی کا ارتکاب کیا اور جتنی حرمتوں کو اس نے پامال کیا ان کی تعداد کے مطابق اس پر عذاب دو چند کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11۔ مرتد کی میراث میں علماء کا اختلاف ہے:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حسن، شعی، حکم، لیث، ابو حنیفہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ نے کہا ہے: مرتد کی میراث اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہے۔

امام مالک، ربیعہ، ابن ابی لیلیٰ، شافعی اور ابو ثور رحمہم اللہ نے کہا ہے: اس کی میراث بیت المال میں جائے گی۔ ابن شبرمہ، ابو یوسف، محمد اور اوزاعی رحمہم اللہ نے دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے کہ مرتد نے ردت کے بعد جو کچھ کمایا وہ اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہوگا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: مرتد نے حالت ردت میں جو کچھ کمایا وہ مال فہ ہے، اور حالت اسلام میں جو کچھ اس نے کمایا پھر مرتد ہو گیا تو اس کے وارث اس کے مسلمان ورثاء ہوں گے۔

لیکن ابن شبرمہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ دونوں امروں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور حضور نبی مکرم ﷺ کا مطلق ارشاد گرامی لا وراثۃ بین اہل ملتین (دو دین رکھنے والوں کے درمیان کوئی وراثت نہیں) ان کے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ اس کے کافر ورثاء اس کے وارث نہیں بنیں گے۔ لیکن آپ نے کہا ہے کہ وہ اس کے وارث بن سکتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 12۔ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا اِلَیَّہِ۔ جندب بن عبد اللہ اور عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا ہے کہ جب واقعہ بن عبد اللہ تمیمی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن حضری کو شہر حرام میں قتل کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس مال کا خمس لینے سے توقف فرمایا جو آپ کے لئے مال اور دو قیدیوں کی صورت میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو عطا کیا گیا تھا، تو مسلمانوں نے حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا یہاں تک کہ وہ ان پر شاق گزرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے شہر حرام میں اس آیت کے ساتھ ان کی تلافی فرمائی اور ان سے غم اور پریشانی کو دور فرما دیا۔ اور یہ خبر دی کہ ان کے لئے ہجرت کرنے والے اور جہاد کرنے والے کا ثواب ہے۔ انہی کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا پھر یہ آیت ہر اس کے حق میں باقی رہی جس نے وہ عمل کیا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگرچہ انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب تو نہیں کیا لیکن ان کے لئے کوئی اجر بھی نہیں ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل

فرمائی: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا اِلٰی اٰخِرِ الْاٰیَةِ۔

اور ہجرت کا معنی ہے الانتقال من موضع الی موضع ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا اور دوسری جگہ کے لئے ایثار کرتے ہوئے پہلی کو ترک کرنے کا قصد کرنا۔ ہجر وصل کی ضد ہے۔ (کہا جاتا ہے) هَجْرَةٌ هَجْرًا و هَجْرَانًا (فلاں نے اسے چھوڑ دیا) اور اس کا اسم الہجرة ہے۔ اور المهاجرة من ارض الی ارض کا معنی ہے دوسری جگہ کے لئے پہلی کو چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ اور التهاجر کا معنی التقاطع (باہمی مقاطعہ کرنا، تعلق توڑ دینا) ہے۔

اور جس نے المهاجرة کی تعریف یہ کی ہے الانتقال من البادية الی الحاضرة یعنی دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہونا، تو اس نے اس سبب سے یہ وہم دلایا ہے کیوں کہ عرب میں اغلباً ایسا ہی ہوا ہے اور اس قول کے مطابق اہل مکہ مہاجرین نہیں ہیں۔ اور راہو جاہد تو یہ جہد سے باب مفاعلہ ہے، جب کوئی پوری کوشش اور محنت صرف کر دے (اس کا مصدر) مجاہدة و جہاد ہے۔ اور اجتہاد اور تجاہد کا معنی ہے بذل الوسع و المجهود پوری طاقت، صلاحیت اور محنت کو صرف کر دینا۔ اور الجہاد بالفتح کا معنی ہے: سخت اور مضبوط زمین۔ اور دَیْرُ جُون کا معنی ہے وہ طمع اور حرص رکھتے ہیں اور حصول قرب کے متمنی ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے یَرْجُونَ کا کلمہ ان کی مدح اور تعریف میں بیان فرمایا ہے کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ جنت کی طرف جائے گا اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں آخری حد کو پہنچا ہوا ہو، اس کے دو سبب ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کون سے عمل پر ہوگا اور دوسرا یہ ہے: تاکہ وہ اپنے عمل پر توکل اور بھروسہ نہ کر لے۔

اور رجا (امید) عام ہوتی ہے اور رجا کے ساتھ ہمیشہ خوف بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے، جیسا کہ خوف کے ساتھ رجا (امید) ہوتی ہے۔ گویا رجا ایک طویل اور دافرا امید کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے: رجوت فلانا رجوا و رجاء و رجاءة (میں فلاں سے امید باندھے ہوئے ہوں) کہا جاتا ہے: ما أتیتک الا رجاءة الخیر (میں تیرے پاس فقط خیر اور بھلائی کی امید لے کر آیا) اور ترجیته و ارتجیته اور رجیته یہ سب رجوتہ کے معنی میں ہیں۔ بشر نے اپنی بیٹی کو مخاطب ہو کر کہا ہے:

فَرَجِیْ خَیْرَ وَاسْتَظْرِیْ اِیَّایْ اِذَا مَا الْقَارِظُ الْعَنْزِیُّ اَبَا

اس میں ترجی امید کے معنی میں ہی مذکور ہے، یعنی تو خیر اور بھلائی کی امید رکھ اور میرے لوٹنے کا انتظار کر۔

و مالی فی فلان رجیة۔ اسی ما ارجو، یعنی میں فلاں کے بارے میں کوئی امید نہیں رکھتا۔ اور کبھی الرجوا اور الرجاء خوف کے معنی میں ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَا لَکُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰہِ وَقَارًا ① (سورہ نوح) یعنی کیا ہے تمہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے بارے میں ڈرتے نہیں۔

ابوذؤیب نے کہا ہے:

اِذَا لَسَعَتْهُ النَّحْلُ لَمْ یَرْجُ لَسْعَہَا وَ خَالَفَہَا فِیْ بَیْتِ ثَوْبٍ عَوَامِلُ

اس میں لم یرج خوف اور ڈر کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی جب شہد کی مکھی نے اسے ڈسا تو اسے اس کے ڈسنے کا کوئی خوف اور پرواہ نہ ہوئی۔

اور الرجا الف مقصورہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے کنوئیں کی طرف اور اس کے دونوں کنارے اور ہر طرف اور کنارہ رجا کہلاتا ہے (1)۔ لوگوں میں سے عوام اس قول میں خطا کر جاتے ہیں: یا عظیم الرجا، کہ وہ اسے الف مقصورہ کے ساتھ پڑھتے ہیں نہ کہ الف مدودہ کے ساتھ۔ (یعنی اسے مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔)

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَيْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْفَعَةٌ لِلنَّاسِ ۚ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ
مِنْ نَّفْعِهِمَا ۚ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١١﴾

”وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کی بابت۔ آپ فرمائیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔ اور پوچھتے ہیں آپ سے: کیا خرچ کریں؟ فرمائیے: جو ضرورت سے زیادہ ہو، اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے حکموں کو تاکہ تم غور و فکر کرو۔“

ارشاد باری تعالیٰ: يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَيْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْفَعَةٌ لِلنَّاسِ ۚ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا
میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ يَسْأَلُونَكَ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور الخمر خمر سے ماخوذ ہے جبکہ وہ ڈھانپ لے، چھپا لے۔ اور اسی سے خمار المرأة عورت کی اوڑھنی اور دوپٹہ ہے۔ اور ہر وہ شے جو کسی شے کو ڈھانپ لے تو کہا جاتا ہے: فقد خمرہ اور اسی سے خمر و انیتکم ہے (2) (تم اپنے برتن ڈھانپ لو) اور خمر (شراب) عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور ماؤف کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے گھنے درخت کو الخمر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے نیچے والی شے کو ڈھانپ لیتا ہے اور اسے چھپا لیتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اخمرت الأرض کثر خمرها (زمین نے ڈھانپ لیا اس کے درخت زیادہ ہو گئے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أَلَا يَا زَيْدُ وَالضُّحَاكَ سَيِّدَا فَقَدْ جَاوَزْتَا خَمْرَ الطَّرِيقِ

خبردار! اے زید اور ضحاک! دونوں چلو (خوب تیز چلو) تحقیق تم راستے کے درختوں سے گزر چکے ہو۔

یعنی تم ہمت اور جرأت کے ساتھ چلو، تحقیق تم نے اس نشیبی زمین کو عبور کر لیا ہے جہاں بھیڑیے وغیرہ چھپے رہتے ہیں۔ عجاج ایک لشکر کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے جو جھنڈوں اور لشکروں کے ساتھ بغیر کسی کمزوری کے چل رہا ہے:

فِي لَامِعِ الْعِقْبَانِ لَا يَشَى الْخَمْرَ يُوجِهَ الْأَرْضَ وَيَسْتَأْقِي الشَّجَرَ

اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: دخل في غمار الناس و خمارهم وہ لوگوں کی جماعت اور ان کی بھیڑ میں داخل ہوا۔ یعنی وہ خوفناک جگہ میں داخل ہو گیا۔ چونکہ شراب (خمر) عقل کو چھپا لیتی ہے اور اسے ڈھانپ لیتی ہے اس وجہ سے اسے خمر کا نام دیا جاتا

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خمر کو خمر کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اسے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس نے پالیا جیسا کہ کہا جاتا ہے: **اختمر العجین** یعنی وہ اپنے ادراک کو پہنچ گیا۔ **وخمر الرأی**، یعنی رائے چھوڑ دی گئی یہاں تک کہ اس میں وجہ ظاہر ہو گئی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ خمر کو خمر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ عقل کو خلط ملط کر دیتی ہے۔ یہ البخامرہ سے ہے اس کا معنی ہے **المخالطة** (باہم خلط ملط ہو جانا) اسی سے ان کا یہ قول ہے: **دخلت في خسار الناس** یعنی میں لوگوں کے ساتھ مل جل گیا۔ نتیجتاً تینوں معانی بالکل قریب قریب ہیں۔ پس خمر کو پہلے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس نے (نشہ کو) پالیا، پھر اس نے عقل کو خلط ملط کر دیا، پھر اسے ڈھانپ دیا تو گویا اس میں اصل معنی **الستد** (ڈھانپنا) ہوا۔

اور **الخمر**: یہ انگور کا وہ پانی ہے جو ابل جائے یا اسے پکایا جائے اور اس کے علاوہ جو شے بھی عقل کو ماؤف کر دے گی تو وہ اسی کے حکم میں ہوگی، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ہر قسم کا جو احرام ہے۔ اور بلاشبہ ان میں سے ذکر صرف میسر کا کیا گیا ہے۔ تو حکماً تمام اقسام کو میسر پر ہی قیاس کیا گیا ہے۔ حالانکہ میسر صرف وہ جو ہوتا ہے جو جزر (ذبح شدہ ارث) میں ہو۔ تو اسی طرح ہر وہ شے جو خمر کی طرح ہوگی تو وہ اسی کے قائم مقام ہوگی (یعنی حکم تمام کا ایک ہوگا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور امت کا نظریہ یہ ہے کہ انگور کی شراب کے علاوہ ہر وہ مشروب جس کی کثیر مقدار نشہ میں مبتلا کر دے تو وہ حرام ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر ہو۔ اور اسے پینے کی صورت میں حد واجب ہوگی۔

امام اعظم ابو حنیفہ، ثوری، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ رحمہ اللہ ہم اور فقہاء کوفہ کی ایک جماعت نے کہا ہے: انگور کی شراب کے علاوہ جس مشروب کی کثیر مقدار نشہ میں مبتلا کر دے تو وہ حلال ہے، لہذا اس کے سبب جو کوئی نشہ میں مبتلا ہو گیا جبکہ نشہ کی حد تک پہنچنے کا اس نے قصد اور ارادہ نہ کیا تو اس پر حد شرب نہ ہوگی۔ یہ قول ضعیف ہے۔ عقل و خبر (نقل) اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ المائدہ اور النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 3۔ بعض مفسرین نے کہا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے عزت و کرامت اور برو احسان میں سے کوئی شے نہیں چھوڑی مگر وہ اس امت کو عطا فرمائی ہے، اس کے احسان اور کرامت میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ان پر تمام احکام شرعیہ کو یکبارگی واجب نہیں کیا بلکہ ان پر تدریجاً اور یکے بعد دیگرے احکام نازل فرمائے، پس شراب کے حرام ہونے کا حکم بھی اسی طرح نازل ہوا۔ اور یہی پہلی آیت ہے جو شراب کے بارے میں سب سے پہلے نازل ہوئی، پھر اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔ **لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ (النساء: 42)** (تم نماز کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم نشہ میں ہو) پھر فرمایا **إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيُصَدِّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝ (المائدہ)** (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ اور روک دے تمہیں یاد الہی سے اور نماز سے تو کیا تم باز آنے والے ہو؟) پھر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رَجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ (المائدہ: ۹۰)** (یہ شراب اور جو اور بت اور جوئے کے تیر سب ناپاک ہیں شیطان کی کارستانی ہیں سو ان سے بچو)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَالْيَتِيمَ اس سے مراد عرب کا جوا ہے جو تیروں کے ساتھ کھیلا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے اپنی بیوی اور ماں کی شرط لگا دیتا تھا پھر جو کوئی جوئے میں اپنے ساتھی پر غالب آ جاتا وہ اس کا مال اور اس کی بیوی لے جاتا تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرات مجاہد، محمد بن سیرین، حسن، ابن مسیب، عطاء، قتادہ، معاویہ ابن صالح، طاؤس، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی بیان کیا ہے: ہر وہ کھیل جس میں قمار (جوا) ہو چاہے چوسر ہو یا شطرنج وغیرہ سو وہ جوا (میسر) ہی ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹ اور نرد کے مہروں کے ساتھ کھیلنا بھی۔ سوائے ان کے جن میں اس کو مباح قرار دیا گیا ہے مثلاً گھوڑ دوڑ میں مقابلہ اور حقوق کی تقسیم اور علیحدگی کے لئے قرعہ اندازی کرنا وغیرہ..... تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شطرنج عجم کا جوا ہے اور ہر وہ کھیل جس کے ساتھ شرط لگائی جائے وہ امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر علماء کے نزدیک میسر (جوا) ہے (1)۔ اس کا بیان کچھ اضافے کے ساتھ سورہ یونس میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

المیسر یسر سے مانوڑ ہے۔ اس کا معنی ہے: کسی شے کا اپنے صاحب (جو اکیلے والے) کے لئے واجب اور لازم ہو جانا۔ کہا جاتا ہے: یسر لی کذا جب کوئی شے کسی کے لئے واجب اور ثابت ہو جائے تب وہ یہ کہہ سکتا ہے یسر لی کذا (میرے لئے اتنی شے ثابت ہو گئی) اس کا باب اس طرح چلتا ہے یسر، یسر، یسر، یسر، یسر، یسر اور یسر سے مراد تیروں کے ساتھ کھیلنے والا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَاعْنَهُمْ وَائِسْ بِمَا يَسْرُوا بِهِ وَإِذَا هُمْ نَزَلُوا بِضَنْكِ فَاَنْزِلْ

اور از ہری نے کہا ہے کہ المیسر سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر وہ جوا میں شرط لگاتے تھے۔ ان کا نام میسر اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں اجزاء کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جاتا ہے، گویا کہ یہ محل تقسیم ہے اور ہر وہ شے جسے تو تقسیم کر دے (اس کے لئے تو کہہ سکتا ہے) یسر تہ۔ اور الیاس کے معنی میں اصل یہی ہے۔ پھر تیروں کے ساتھ کھیلنے والوں اور اونٹوں پر شرط لگا کر جوا کھیلنے والوں کو یاس و ن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہی تقسیم کرنے والے ہیں جبکہ وہ اس تقسیم کا سبب ہیں اور الصحاح میں ہے: یسر القوم الجزور۔ یعنی قوم نے اونٹوں کو ذبح کیا اور ان کے اعضاء کو تقسیم کیا۔ حمیم بن وثیل یربوئی نے کہا ہے:

اقولُ لهم بالشعب اذ يَنسِرُونَنِي ألم تَنَاسُوا أَن ابْنَ مَفَارِسٍ زَهْدَمِ

میں نے انہیں گھائی میں جا کر کہا جبکہ وہ مجھے قیدی بنا کر لے جا رہے تھے کیا تم جانتے نہیں میں زہدم گھوڑے کے شہسوار کا بیٹا ہوں۔

اسے قیدی بنایا گیا تھا اور اسے تیر مارے گئے تھے اور جب کوئی قوم باہم شرط اور بازی لگانے لگ جائے تو کہا جاتا ہے یسر القوم اور رَجُلٌ يَسِرُ وَيَاسِرُ دونوں کا ایک ہی معنی ہے (یعنی شرط اور بازی لگانے والا آدمی جو باز) اور اس کی جمع ایسار

ہے۔ جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

انی اُتَمُّ اَیْسَارٍ وَاَمْنُھُمْ مَثْنِ الْاَیَادِی وَاکْثَرُ الْجَفْنَةِ الْاَدَمَا
اور طرفہ نے کہا ہے:

و ھم اَیْسَارٌ لِّقَبَانٍ اِذَا اَغْلَتِ الشَّوْقُ اَبْدَاءَ الْجَزْرِ
جوانوں کے ذبح کرنے کو مباح قرار دیتا وہ ان کے نزدیک قابل تعریف ہوتا تھا، شاعر نے کہا ہے:

و نَاجِیۃٌ نَحَرْتُ لِقَوْمٍ صَدِیْقٍ و مَا نَادِیْتُ اَیْسَارَ الْجَزُورِ

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں داؤد بن حصین سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اہل جاہلیت کا جوایہ تھا کہ وہ گوشت کی بیع ایک یا دو بکریوں کے عوض کرتے تھے، امام مالک رحمہ اللہ اور آپ کے جمہور اصحاب کے نزدیک اس کا اطلاق جنس واحد میں ہوتا ہے، (یعنی) ایک حیوان کی اس کے گوشت کے عوض بیع ہو اور یہ ان کے نزدیک بیع مزانہ (☆)، غرر (☆☆) اور قمار کے باب سے ہے، کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کیا حیوان میں اس گوشت کے برابر گوشت ہے جو اس نے بدلے میں دیا ہے یا اس سے کم ہے یا اس سے زیادہ ہے اور گوشت کی بیع گوشت کے عوض متفاضلاً جائز نہیں ہوتی (یعنی جب مقدار برابر نہ ہو تو بیع جائز نہیں ہوتی۔)

پس حیوان کی بیع گوشت کے عوض کرنا اس گوشت کی بیع کی طرح ہے جو اس کی جلد میں چھپا ہوا ہے۔ بشرطیکہ یہ دونوں ایک جنس سے ہوں اور آپ کے نزدیک جنس واحد اونٹ، گائیں، ریوڑ (بھیڑ بکریاں) بھرن، پہاڑی بکرے اور تمام وحشی جانور اور وہ تمام چار ٹانگوں والے جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے وہ آپ کے نزدیک ایک جنس ہیں۔ لہذا ان تمام اصناف و اجناس میں سے کسی حیوان کی بیع اس کے گوشت میں سے کسی شے کے ساتھ کسی بھی وجہ سے جائز نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ آپ کے نزدیک بیع مزانہ کے باب سے ہے، جیسا کہ کشمش کی بیع کرنا انگور کے ساتھ، زیتون کی بیع کرنا اس کے تیل کے ساتھ اور تلوں کے تیل کی بیع کرنا تلوں کے ساتھ اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔

اور آپ کے نزدیک تمام پرندے ایک جنس ہیں اور اسی طرح تمام مچھلیاں ایک ہی جنس سے ہیں اور آپ سے یہ مروی ہے کہ اکیلے مکڑی ایک صنف (قسم) ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب، حضرت لیث اور ابن سعد نے کہا ہے: گوشت کی بیع کرنا حیوان کے عوض کسی حال

☆ المزانہ: بیع مزانہ سے مراد درخت پر لگی ہوئی کچی کھجوروں کی کچی کھجوروں کے عوض اندازے سے بیع کرنا ہے۔ امام مالک کے نزدیک ہر وہ اندازہ جس کا کیل، عدد اور وزن معلوم نہ ہو اس کی بیع کی جائے کسی معینہ کیلی، وزنی اور عددی شے کے ساتھ یا ایک ہی جنس میں سے معلوم شے کی مجہول کے ساتھ بیع کرنا یا مجہول کی بیع مجہول کے عوض کرنا جبکہ جنس ایک ہو۔

☆☆ الغرر: مچھلی ابھی پانی میں ہو اور پرندہ ابھی ہوا میں ہو اس کی بیع کرنا بیع الغرر ہے۔ المختصر بروہ بیع جس میں مشتری کے لئے دھوکے کا احتمال ہو وہ اسی زمرہ میں داخل ہوگی۔

میں جائز نہیں ہے، چاہے وہ ایک جنس سے ہوں یا دو مختلف جنسوں سے۔ کیونکہ حدیث طیبہ عام ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اونٹ ذبح کیے گئے اور انہیں دس اجزاء میں تقسیم کر دیا گیا تو ایک آدمی نے کہا: تم ان میں سے ایک جز ایک بکری کے عوض مجھے دے دو تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا (یعنی یہ درست نہیں ہے)۔ امام شافعی نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں صحابہ کرام کی رائے کے خلاف عمل کیا ہو۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے گوشت کے عوض بکری کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ روایت قوی نہیں ہے۔

عبدالرزاق نے ثوری عن یحییٰ بن سعید کی سند سے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ آپ اسے مکروہ سمجھتے تھے کہ کسی زندہ کی بیع مردہ کے عوض کی جائے، یعنی ذبح کی ہوئی بکری کی بیع زندہ کھڑی بکری کے عوض کی جائے۔

حضرت سفیان نے کہا ہے: ہم اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے۔ مزنی نے کہا ہے: اگر گوشت کے عوض حیوان کی بیع کے بارے میں حدیث طیبہ صحیح نہیں ہے تو پھر قیاس یہ ہے کہ وہ جائز ہے اور اگر حدیث صحیح ہے تو پھر قیاس باطل ہے اور حدیث کی اتباع کی جائے گی۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ کوفیوں کے پاس اس بارے میں قیاس اور اعتبار کی جہت سے کثیر دلائل موجود ہیں کہ حیوان کے عوض گوشت کی بیع کرنا جائز ہے، مگر یہ کہ جب حدیث صحیح ہوگی تو قیاس و نظر باطل ہوگا۔

اور مالک نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کے عوض حیوان کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ اس کا اتصال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اور اس کی اسانید میں سے احسن حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی مرسل ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی مؤطا میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے اور اصل یہ ہے کہ آپ مرسل روایات کو قبول ہی نہیں کرتے، مگر گمان یہ ہے کہ آپ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی مراسیل کو تلاش کیا اور انہیں پالیا یا ان میں سے اکثر کو صحیح قرار دیا۔ پس ظاہر حدیث اور عموم حدیث کی بنا پر انواع حیوان کی گوشت کی انواع کے ساتھ بیع کرنا مکروہ ہے کیونکہ کوئی ایسی حدیث نہیں جو اسے خاص کر رہی ہو اور نہ ہی اجماع ہے۔ اور آپ کے نزدیک نص کی تخصیص قیاس کے ساتھ کرنا جائز نہیں۔ اور ان کے نزدیک حیوان ہر اس جانور کا نام ہے جو خشکی یا پانی میں زندگی گزار رہا ہو اگرچہ اس کی اجناس مختلف ہیں، جیسا کہ طعام ہر اس شے کا نام ہے جو کھائی جاتی ہو یا پی جاتی ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فِيْهِمَاۤ اٰیٰتٌ لِّمَنۡ يَّعْقِلُ یعنی خمر اور جوئے میں اٰیٰتٌ گہیڑ بہت بڑا گناہ ہے۔ شراب کا گناہ وہ ہے جو پینے والے سے صادر ہوتا ہے مثلاً باہم ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا، گالی گلوچ دینا، نخش گوئی اور جھوٹا قول اور اس کی عقل کا زائل ہو جانا جس کے ساتھ وہ ان امور کو پہچانتا ہے جن کی ادائیگی اپنے خالق کے لئے واجب ہوتی ہے، نمازوں کو چھوڑ دینا اور اللہ

تعالیٰ کے ذکر سے رک جانا وغیرہ۔

امام نسائی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: شراب سے اجتناب کرو کیونکہ یہ ام النجاست ہے، تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی تھا جو بڑا عبادت گزار تھا۔ پس ایک گمراہ عورت اس سے حاملہ ہو گئی۔ اس نے اس آدمی کی طرف اپنی لونڈی کو بھیجا اور اس نے اسے کہا: بے شک ہم تجھے شہادت کے لئے بلا رہے ہیں تو وہ اس لونڈی کے ساتھ چل پڑا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ جونہی وہ دروازے کے اندر داخل ہوا، تو اس نے دروازہ بند کر لیا، یہاں تک کہ وہ ایک خوبرو عورت کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پاس ایک بچہ تھا اور ساتھ ہی شیشہ کے برتن میں شراب پڑی تھی۔ تو اس عورت نے کہا: قسم بخدا! میں نے تجھے شہادت کے لئے نہیں بلایا، بلکہ میں نے تجھے اس لئے دعوت دی ہے تاکہ تو میرے ساتھ بدکاری کرے، یا شراب کا یہ جام پیے یا پھر اس بچے کو قتل کر دے۔ اس آدمی نے کہا: تو مجھے شراب کا یہ جام پلا دے۔ چنانچہ اس نے وہ جام اسے پلا دیا۔ اس نے کہا: مجھے اور پلاؤ۔ پس وہ پیتار ہا یہاں تک کہ اس نے اس کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب بھی کر لیا اور اس بچے کو بھی قتل کر دیا۔ پس تم شراب سے بچو۔ کیونکہ قسم بخدا! ایمان اور شراب پر دوام یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ قریب ہی ان میں سے ایک دوسرے کو نکال دیتا ہے، ابو عمر نے اسے الاستیعاب میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ ائشی جب اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ طیبہ کی طرف جانے لگا تو کچھ مشرک لوگ اسے راستے میں ملے۔ انہوں نے اسے کہا: تو کہاں جا رہا ہے؟ تو اس نے انہیں بتایا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، تو انہوں نے کہا: تو ان سے نمل، کیونکہ وہ تجھے نماز کے بارے حکم ارشاد فرمائیں گے۔ اس نے جواب دیا: بلاشبہ رب تعالیٰ کی عبادت کرنا واجب ہے۔ تو انہوں نے پھر کہا: بلاشبہ وہ تجھے فقراء کو مال دینے کا حکم دیں گے۔ تو اس نے جواب دیا: نیکی کا عمل کرنا واجب ہے۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو زنا سے منع کرتے ہیں۔ تو اس نے کہا: یہ عمل عقلاً انتہائی فحش اور قبیح ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں، مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو شراب پینے سے منع کرتے ہیں۔ تب اس نے کہا: کیا ایسا بھی ہے؟ میں تو اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ پس وہ واپس لوٹ گیا اور کہا: میں ایک سال تک شراب پیوں گا پھر آپ کی طرف لوٹ جاؤں گا، لیکن وہ اپنے گھر تک نہ پہنچ سکا یہاں تک کہ وہ اونٹ سے گرا، اس کی گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا (1)۔

قیس بن عاصم منقری دور جاہلیت میں بہت زیادہ شراب پیتا تھا پھر اس نے اپنے اوپر اسے حرام کر دیا اور اس کا سبب یہ بنا کہ اس نے نشے کی حالت میں اپنی بیٹی کے پیٹ کی سلوٹوں کو ٹولا اور اپنے والدین کو گالیاں دیں، اس نے چاند کو دیکھا تو اس کے بارے میں بھی کچھ (نازیبا) کلمات کہے اور شراب بنانے والے کو اپنا بہت سا مال دے دیا، جب اس کا نشہ اتر ا اور اسے اس کے بارے خبر ہوئی تو اس نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دیا اور اس کے بارے وہ کہتا ہے:

رایت الخمر صالحة و فیہا خصائل تفسد الرجل الحلیما

میں نے شراب کو اچھا دیکھا تھا حالانکہ اس میں ایسی خصال بھی ہیں جو حلیم آدمی کو خراب کر دیتی ہیں۔

فلا والله اشرُّ بها صحیحا ولا اشفیٰ بها أبدا سقیما
قسم بخدا! میں اسے حالت صحت میں نہیں پیوں گا اور نہ ہی کبھی بیماری کی حالت میں اس سے علاج کروں گا۔

ولا أعطیٰ بها ثمنا حیاتی ولا أدعو لها أبدا ندیا
میں اس کے عوض اپنی حیات بطور ثمن ادا نہیں کروں گا اور نہ میں اس کے لئے کبھی شراب پینے والے ساتھی کو بلاؤں گا۔

فإن الخمر تفسد شاربها و تجنیهم بها الأمر العظیما
کیونکہ شراب اپنے پینے والے کو ذلیل و رسوا کر دیتی ہے اور انہیں بہت بڑے گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔
ابو عمر نے کہا ہے: اور ابن عربی نے المفصل الفی سے روایت کیا ہے کہ یہ اشعار ابو محجن ثقفی کے ہیں اس نے شراب چھوڑنے کے وقت یہ کہے تھے اور آپ ﷺ یہ کہہ رہے ہیں:

إذا مُتُّ فادفنی إلى جنب کرمۃ
جب میں فوت ہو جاؤں تو مجھے انگوڑی کی نیل کے پہلو میں دفن کرنا اس کی جڑیں میری موت کے بعد میری ہڈیوں کو تراوت دیں گی۔

ولا تدفنی بالقلۃ فانی أخاف إذا ما مت أن لا أذوقها
اور تم مجھے صحرا میں دفن نہ کرنا کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ جب میں مر جاؤں تو اسے نہ چکھ سکوں گا۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں کئی بار حد شراب کے کوڑے لگائے اور انہیں سمندر میں ایک جزیرہ کی طرف جلا وطن کر دیا، پس وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا ملے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف انہیں قید کرنے کا حکم نامہ لکھا۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں قید کر لیا اور یہ انتہائی بہادر شہسواروں میں سے ایک تھے، جب یہ جنگ قادسیہ میں آپ کے حکم سے شریک ہوئے تو معروف یہی ہے کہ آپ نے ان کی بیڑیاں کھول دیں اور فرمایا: ہم کبھی بھی تمہیں شراب پینے پر کوڑے نہیں لگائیں گے۔ تو ابو محجن نے کہا: قسم بخدا! میں کبھی بھی شراب نہیں پیوں گا، پھر اس کے بعد کبھی بھی شراب نہیں پی۔ اور ایک روایت میں ہے: میں شراب پیتا تھا جب مجھ پر حد قائم کی جاتی تو میں اس سے پاک ہو جاتا تھا اور جب تم نے مجھ سے حد ساقط کر کے مجھے ہدر چھوڑ دیا ہے تو قسم بخدا! میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ یثیم بن عدی نے بیان کیا ہے کہ اسے اس نے خبر دی ہے جس نے آذر بیجان میں ابو محجن کی قبر دیکھی ہے یا کہا: جرجان کے نواح میں اس حال میں کہ اس پر نیل کی تین جڑیں اگی ہوئی ہیں۔ وہ خوب بڑھی ہوئی ہیں اور وہ پھل بھی دیتی ہیں اور وہ ان کی قبر پر بھی ہوئی ہیں اور ان کی قبر پر یہ لکھا ہوا ہے ہذا قبر ابی محجن (یہ ابو محجن کی قبر ہے)۔ اس نے کہا کہ میں نے اس پر خوب تعجب کیا اور مجھے ان کا یہ قول یاد آ گیا اذا مت فادفنی الی جنب کرمۃ۔

بلاشبہ شراب پینے والا اہل عقل کے لئے تمسخر بن جاتا ہے اور وہ اپنے پیشاب اور نجاست کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے اور بسا

اوقات وہ اپنے چہرے پر ملنے لگتا ہے حتیٰ کہ بعض کو اس حالت میں دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے چہرے کو پیشاب سے دھو رہا ہوتا ہے اور یہ کہہ رہا ہوتا ہے: اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ اور بعض کو اس حال میں دیکھا گیا ہے کہ کتا اس کے چہرے کو چاٹ رہا ہوتا ہے اور وہ اسے کہہ رہا ہوتا ہے: اکر ملک اللہ۔ اور رہا جوا! تو یہ تو عداوت اور بغض کا وارث بناتا ہے کیونکہ یہ کسی غیر کا مال باطل طریقے سے کھانے کا نام ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ شراب میں تاجروں کے لئے نفع ہے کیونکہ وہ اسے شام سے سیتے داموں خرید کر لاتے تھے اور حجاز میں منافع کے ساتھ اسے فروخت کرتے تھے اور وہ اس میں کوئی تنگی نہیں دیکھتے تھے کیونکہ شراب کا طالب اسے مہنگے داموں خرید لیتا ہے۔ شراب کے منافع کے بارے جو کچھ کہا گیا ہے یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ اور اس کے منافع کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ شراب کھانے کو ہضم کرنے میں معاون ہوتی ہے، ضعف اور کمزوری کو قوت دیتی ہے، قوت مردانگی میں معاون ہوتی ہے، بخیل کو سخی بناتی ہے، بزدل کو بہادر اور دلیر بناتی ہے اور رنگ کو صاف کرتی ہے، علاوہ ازیں لذت کا کام بھی دیتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

و نَشْرَبُهَا فَتَتَرَكُنَا مَلُوكًا دُؤْلًا مَا يُنْهِنُنَا الْلِقَاءُ

اور ہم اسے پیتے ہیں اور یہ ہمیں ایسا بادشاہ اور شیر بنا کر چھوڑتی ہے کہ حملہ آور لشکریوں کو ہم سے روک دیتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اس کی کئی راحتیں اور خوشیاں ہیں۔ ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

فَإِذَا شَرَبْتُ فَنَانِي رَبُّ الْخَوَزْنِقِ وَالسَّدِيرِ
جب میں شراب پیتا ہوں تو میں خورنق اور سدیر (نعمان اکبر بن امرؤ القیس کا محل جو عراق میں تھا) کا مالک ہوتا ہوں۔

وَإِذَا صَحَوْتُ فَنَانِي رَبُّ الشُّوْهَةِ وَالْبَعِيرِ

اور جب میں نشے میں افاقہ پالیتا ہوں تو میں بکریوں اور اونٹوں کا مالک ہوتا ہوں۔

اور جوئے کے منافع میں سے یہ ہے کہ اس میں بغیر کسی کدو کاوش اور محنت کے ایک چیز انسان کی طرف لوٹ آتی ہے، پس وہ اونٹ خریدتے ہیں اور اپنے تیر ڈالتے ہیں، جس کا تیر نکل آئے گوشت سے اس کا حصہ لے لیا جاتا ہے اور اس پر کوئی ٹمن وغیرہ نہیں ہوتے اور جس کا تیر آخر میں باقی رہ جائے اس پر تمام اونٹوں کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے اور اس کے لئے گوشت میں سے کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جوئے کی منفعت محتاج لوگوں پر وسعت و خوشحالی کا آنا ہے کیونکہ لوگوں میں سے جو جو اکیلے تھا وہ اونٹوں کا گوشت نہیں کھاتا تھا بلکہ اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

جوئے کے تیر گیارہ تیر ہوتے، ان میں سے سات کے لئے حصص ہوتے اور ان میں حصوں کی تعداد کے مطابق مقررہ چیز لازم ہوتی اور وہ یہ ہیں: الغذاء اس میں ایک علامت ہوتی اور اس کے لئے ایک حصہ ہوتا اور ناکامی کی صورت میں اس پر ایک حصہ لازم ہوتا۔ دوسرا التواء ہے۔ اس میں دو علامتیں ہوتی اور اس کے لئے دو حصے ہوتے اور اس پر دو حصے لازم ہوتے، تیسرا

الرقیب ہے۔ اس میں تین علامات ہوتیں اسی ترتیب پر جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہیں۔ چوتھا الحلس ہے۔ اس کے لئے چار علامات ہوتیں۔ پانچواں النافذ ہے۔ اس کا نام النافس بھی ہے۔ اس کے لئے پانچ علامات ہوتیں۔ چھٹا المسبل ہے۔ اس کے لئے چھ علامات ہوتیں اور ساتواں المعنی ہے۔ اس کے لئے سات علامات ہوتیں۔ اس طرح یہ اٹھائیس حصص ہوتے اور اصمعی کے قول کے مطابق اونٹوں کے حصص بھی اسی طرح ہوتے اور تیروں میں سے ابھی چار باقی ہیں۔ ان پر کوئی علامت نہ ہوتی اور نہ ہی فروض اور انصبا میں سے کوئی ان کے لئے ہوتا اور وہ یہ ہیں: المصدّر، المضغف، المنیح اور السفیح۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: باقی تین تیر بغیر علامت کے ہیں وہ یہ ہیں السفیح، المنیح اور الوغد۔ اس پر تیروں کی کثرت کی وجہ سے ان تینوں کا اضافہ کیا جاتا جو انہیں حرکت دیتا اور کسی کی طرف میلان کا وہ کوئی راستہ نہ پاتا۔ اور تیروں کو حرکت دینے والے کو المفیض الضارب اور الضریب کا نام دیا جاتا۔ اور جمع الضرباء آتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرکت دینے والے کے پیچھے ایک تاکنے والا بھی رکھا جاتا تاکہ وہ کسی کی طرف داری نہ کرے، پھر ضریب اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا اور کپڑے کے ساتھ مکمل طور پر لپٹ جاتا اور اپنا سر باہر نکالتا اور اپنا ہاتھ ربابہ (ترکش کی مانند تیر جمع کرنے کا برتن) میں داخل کرتا اور تیر نکالتا۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ وہ موسم سرما میں وقت کے تنگ ہونے اور فقراء پر سردی اور حالات کے سخت ہونے کی حالت میں انہی تیروں کے ساتھ اونٹوں کو تقسیم کرتے تھے۔ اونٹ خریدے جاتے تھے اور خوشحال اور امیر لوگ ان کی قیمت کے ضامن ہوتے تھے اور ان کا مالک اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا اور وہ اس کے ساتھ فخر کرتے تھے اور جوان میں سے اس طرح نہ کرتا وہ اس کی مذمت کرتے تھے اور وہ اسے البرم کا نام دیتے تھے۔ متم بن نویرہ نے کہا ہے:

ولا بَرَمًا تُهْدِي النِّسَاءَ لِعَرْسِهِ إِذَا الْقَشْمُ مِنْ بَرْدِ الشِّتَاءِ تَقَفَّقَعَا

پھر اونٹ ذبح کیے جاتے اور انہیں دس اقسام پر تقسیم کر دیا جاتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اونٹوں کی تقسیم میں اصمعی نے خطا کی ہے۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ تیروں کے حصص کی مقدار کے مطابق ان کے بھی اٹھائیس حصے کیے جاتے، حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے۔ پھر وہ دس پر تقسیم کرتا۔ پس جو کوئی ربابہ سے پہلے اپنا تیر نکالنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اپنے حصص لے لیتا اور فقراء کو عطا کر دیتا۔ اور ربابہ سے مراد ترکش کے مشابہ (برتن) ہے جس میں جوئے کے تیر جمع کیے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات انہوں نے تمام تیروں کو ربابہ کا نام دیا ہے۔ ابو ذؤیب نے گدھے اور گدھیوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وكانهن ربابة و كانه يسمي يفيض على القدام و يصدع

اور ربابہ کا معنی عہد اور میثاق بھی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

وكنث امرأ أفضت إليك ربابتي و قبلك ربثني فصعت رُبُوبُ

اور بعض قبائل میں وہ بسا اوقات اپنی ذاتوں کے لئے جو اکھلتے پھر ثمن کی چٹی اسی پر ہوتی جو اپنے تیر میں کامیاب نہ ہوتا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اسی طریقے پر قبیلے کے فقراء زندگی گزارتے تھے۔ اسی کے مطابق اعشیٰ کا قول ہے:

المَطْعَمُ الضَّيْفُ إِذَا مَاشَتُوا وَالْجَاعِلُو الْقَوْتُ عَلَى الْيَأْسِ
اور ایک دوسرے کا قول ہے:

بَايَدِيهِمْ مَقْرُومَةٌ وَ مَغَالِقُ يَعُودُ بِأَرْزَاقِ الْعُقَاةِ مَنِحُهَا
اس شعر میں المنیح سے مراد المستنح (عطیہ) ہے کیونکہ وہ لوگ وہ تیر غارینے لے لیتے تھے جو باعث نجات ہوتا اور
اس کی کامیابی وافر ہوتی۔ اس لئے یہ قابل تعریف اور پسندیدہ منیح ہے۔ اور رہا وہ منیح جو بے علامت تیروں میں سے ایک ہے تو
ایسے بالکل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور اخطل نے اپنے اس شعر میں اسی کا ارادہ کیا ہے:

و لَقَدْ عَظَفْنَ عَلَى فِزَارَةِ عِظْفَةٍ كَرَّ الْمَنِيحِ وَ جُدْنَ ثُمَّ مَجَالًا
اور الصحاح میں ہے: المنیح جوئے کے ان تیروں میں سے ہے جس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے مالک کو
کوئی شے عطا کر دی جائے۔ اور جوئے سے متعلق لبید کا قول ہے:

إِذَا يَسَرُّوا لَمْ يُورِثِ الْيُسْرُ بَيْنَهُمْ فَوَاحِشٌ يُنْغَى ذِكْرُهَا بِالْمَصَافِ
یہ سب کا سب جوئے کا نفع ہے مگر یہ کہ یہ باطل طریقے سے مال کھانا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا ہے کہ ان کا گناہ نفع سے کہیں زیادہ
اور بڑا ہے اور آخرت میں ضرر اور نقصان کی طرف زیادہ لوٹانے والے ہیں۔ پس گناہ کبیران کی تحریم کے بعد ہے اور منافع
تحریم سے پہلے کے ہیں۔

حمزہ اور کسائی نے کشید ثناء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پر لعنت کی ہے
اور اس کے ساتھ مزید دس پر لعنت کی ہے: اسے فروخت کرنے والے پر، اسے خریدنے والے پر اور اس پر جس کے لئے
خریدی جائے اور اس پر جس نے اسے کشید کیا اور اس پر جس کے لئے کشید کیا گیا، اسے پلانے والے پر، اسے پینے والے پر،
اسے اٹھانے والے پر، اس پر جس کے لئے شراب اٹھائی جائے اور اس کے ثمن کھانے والے پر (1) اور یہ بھی کہ منافع کو جمع
ذکر کرنے کے ساتھ جمع الآثام ہی زیادہ حسین اور مناسب ہے اور لفظ کثیر یہ معنی ادا کر سکتا ہے۔

باقی قراء اور لوگوں میں سے جمہور نے کبیڑ پڑھا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جوئے اور شراب پینے میں جو گناہ ہے وہ
کبار میں سے ہے اور اسے کبیر کے ساتھ ہی بیان کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اور یہ بھی کہ ان کا اکبر پر اتفاق کرنا کبیر کے لئے دلیل اور حجت ہے۔ اور لفظ اکثر کے چھوڑنے پر تمام نے اجماع کیا ہے
سوائے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کے، کیونکہ اس میں ہے: قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَثِيرٌ۔ وَإِثْمُهُمَا أَكْثَرُ دُونِ مَقَامَاتِ
پر باکی جگہ ٹا ہے۔

1۔ ابن ماجہ، باب لعنت الخمر علی عشرة اوجہ، حدیث نمبر 3370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً ابوداؤد، باب العنب یعصر للخمر، حدیث نمبر 3189، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 9۔ اہل نظر میں سے ایک جماعت نے کہا ہے: شراب اس آیت کے ساتھ حرام کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَالْإِثْمَ** (الاعراف: ۳۳)

(آپ فرمائیے: بے شک حرام کر دیا ہے میرے رب نے سب بے حیائیوں کو جو ظاہر ہیں ان سے اور جو پوشیدہ ہیں اور (حرام کر دیا) گناہ کو۔)

اور اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ اس میں گناہ ہے اور وہ حرام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ نظر و فکر عمدہ نہیں ہے کیونکہ اس میں جو گناہ ہے وہ حرام ہے نہ کہ یہ بعینہا حرام ہے۔ یہ نظر و فکر اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور بعض نے کہا ہے: اس آیت میں شراب کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اثم کا نام دیا ہے اور اثم کو ایک دوسری آیت میں حرام قرار دیا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَالْإِثْمَ** اور بعض نے کہا ہے: اثم سے مراد خمر (شراب) ہی ہے۔ اس پر دلیل شاعر کا یہ قول ہے:

شربت الإثم حتى ضلّ عقلي كذاك الإثم يذهب بالعقول

میں نے شراب پی یہاں تک کہ میری عقل گمراہ ہو گئی جس طرح کہ گناہ عقلوں کو ضائع کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول بھی عمدہ اور جید نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خمر کو اثم کا نام نہیں دیا ہے۔ بلاشبہ اس نے کہا ہے: **قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ** (یعنی آپ فرمائیے: ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے) یہ نہیں فرمایا **قُلْ هُمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ** (کہ یہ دونوں بہت بڑا گناہ ہیں)

اور رہی سورۃ الاعراف کی آیت اور شعر تو ان دونوں کے بارے میں تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ اس آیت میں شراب کی مذمت ہے اور رہی اس کی تحریم تو وہ دوسری آیت سے معلوم ہوتی ہے اور وہ سورۃ المائدہ کی آیت ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝۱۱۱** **الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ** اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **قُلِ الْعَفْوَ** جمہور کی قراءت نصب کے ساتھ ہے اور صرف ابو عمرو نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور حسن، قتادہ اور ابن ابی اسحاق کی قراءت رفع کے ساتھ ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا ہے: اگر ذہبی الذی بنایا جائے تو پھر پسندیدہ رفع ہے، اس معنی کی بنا پر کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں وہ عفو ہے اور غصب بھی جائز ہے اور اگر ما اور ذکو ایک ہی شے قرار دیا جائے تو پھر پسندیدہ نصب ہے، اس معنی کی بنا پر کہ آپ فرما دیجئے: وہ عفو خرچ کریں۔ اور رفع بھی جائز ہے۔

اور علماء نحو نے بیان کیا ہے: **مَاذَا تَعَلَّمْتَ: أَنَحُوا** ام شعرا یعنی نصب اور رفع دونوں کے ساتھ۔ اس بنا پر کہ اس میں

دونوں اعراب جید اور حسن ہیں، مگر آیت میں تفسیر نصب کی بناء پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے کہا ہے: جب سابقہ آیت ارشاد باری تعالیٰ وَیَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ میں سوال نفقہ کے بارے ہے کہ وہ کس پر خرچ کیا جائے؟ جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور جواب بھی اس پر دال ہے اور جواب بھی سوال کے موافق ہی ظاہر ہوا ہے۔ اس آیت میں دوسرا سوال خرچ کرنے کی مقدار کے بارے ہے اور یہ حضرت عمرو بن جموح بنیشی کی شان میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ (البقرہ: 215) انہوں نے کہا: میں کتنا خرچ کروں؟ تب یہ حکم نازل ہوا قُلِ الْعَفْوَ اور عفوا کا معنی یہ ہے: ما سهل و تيسر و فضل و لم یشتق عد القلب اخراجہ، یعنی وہ شے جو آسان ہو، میسر ہو، اور فالتو ہو اور اس کا نکالنا دل پر شاق نہ ہو۔ اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

خُذِي الْعَفْوَ مِنْ تَسْتَدِي مَوْقِي لَا تَنْطِقِي فِي سَوَاقِ حِينَ اغْضَبُ

تو عفولے لے میری محبت کو ہمیشہ برقرار رکھ اور جب میں غصے میں ہوں تو میرے غصے کی حالت میں تو بات نہ کر۔

پس معنی یہ ہے کہ تم اپنی حاجات سے فالتو مال خرچ کر دو اور تم اس میں اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا نہ کرو کہ تم محتاج اور فقیر ہو جاؤ۔ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں یہی معنی زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ اور حضرات حسن، قتادہ، عطاء، سدی، محمد بن کعب قرظی اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ انہوں نے کہا ہے: العفو ما فضل من العیال کہ عفو سے مراد وہ مال ہے جو اہل و عیال سے فالتو ہو۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: صدقہ وہ ہے جو اس مال سے ہو جس کی حاجت نہ ہو۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ”بہترین صدقہ وہ ہے جو تو نے ضرورت سے زائد مال سے خرچ کیا اور دوسری حدیث میں ہے: ”بہترین صدقہ اس مال کا ہے جو ضرورت سے زائد ہو۔“ (1)

قیس بن سعد نے کہا ہے (2): اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے: نہیں بلکہ یہ نفلی صدقات ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب کسی آدمی کے پاس سونا، چاندی یا اناج یا دودھ دینے والے جانور وغیرہ ہوتے تو وہ غور و فکر کرتا کہ ان میں سے کتنا مال اس کی اپنی ذات اور اس کے اہل و عیال کے خرچے کے لئے سال بھر کے لئے کافی ہوگا۔ وہ اسے اپنے پاس روک لیتا اور بقیہ تمام ساز و سامان صدقہ کر دیتا اور اگر وہ ان لوگوں میں سے ہوتا جو اپنے ہاتھ کے ساتھ کام کرتے ہیں تو وہ اپنی اور گھروالوں کی ایک دن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے مال اپنے پاس روک لیتا اور باقی ماندہ صدقہ کر دیتا حتیٰ کہ پھر آیت زکوٰۃ نازل ہوئی اور یہ آیت منسوخ ہو گئی اور ہر وہ صدقہ منسوخ ہو گیا جس کے بارے انہیں حکم دیا گیا تھا۔

1۔ بخاری شریف، باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی الخ، حدیث نمبر 1337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، بخاری شریف، باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی الخ، حدیث نمبر 1338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 694

ایک قوم نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے اور مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے اور ظاہر حال قول اول پر ہی دلالت کرتا ہے۔
مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ الْاٰيٰتِ۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: مراد نفقہ کے احکام ہیں (یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ نفقہ کے بارے میں اپنے احکام تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے) لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔ پس تم اپنے مالوں میں سے اتنے روک لو جو تمہارے لئے دنیوی معاملات میں نفع بخش اور ضروری ہوں اور باقی ماندہ ان امور میں خرچ کرو جو آخرت میں تمہارے لئے باعث نفع ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا اور آخرت کے امور کے بارے میں اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا، اس کے زوال اور اس کی فنا کے بارے میں غور و فکر کرو اور تم اس میں زہد اختیار کرو اور آخرت کے آنے اور اس کے باقی رہنے کے بارے میں غور و فکر کرو اور اس میں تم رغبت رکھو۔

فِي الدُّنْيَا وَالْآٰخِرَةِ ۚ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۖ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۚ وَاِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَاعْنٰتُكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٠﴾

”دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں اور پوچھتے ہیں آپ سے یتیموں کے بارے میں، فرمائیے: (ان سے الگ تھلگ رہنے سے) ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملاؤ تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اگر چاہتا اللہ تو مشکل میں ڈال دیتا تمہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا حکمت والا ہے۔“

اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَقْرُبُوا مَالَ الْيَتٰمٰى اِلَّا بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ (الانعام: ۱۵۲) (اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔) اور اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِلٰيْهِ (النساء: ۱۰) (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے۔) تو وہ آدمی جس کے پاس کوئی یتیم تھا اس نے اس کا کھانا اپنے کھانے سے اور اس کا مشروب اپنے مشروب سے الگ کر دیا۔ پس وہ اپنے کھانے میں سے جو کچھ بچاتا تھا وہ اسے اس کے لئے روک کر رکھ لیتا تھا یہاں تک کہ وہ اسے کھا لیتا یا وہ فاسد اور خراب ہو جاتا۔ پس یہ چیز ان پر انتہائی شاق اور تکلیف دہ ثابت ہوئی، تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کا ذکر کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۖ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ (الآیہ۔ پس انہوں نے ان کے کھانے پینے کی اشیاء کو اپنے کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ملا دیا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں (۱)۔ اور یہ آیت ماقبل کے ساتھ متصل ہے کیونکہ اموال کے ذکر کے ساتھ یتیموں کے مالوں کی حفاظت کا امر مقرر ہے۔ اور کہا گیا

1۔ من ابی داؤد، باب مغالطة الیتیم فی الطعام، حدیث نمبر 2487، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس میں سائل حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ عرب اپنے کھانے پینے کی اشیاء میں یتیموں کے مالوں کو ملانے سے بدشگونی لیتے تھے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی دیکھ بھال کے لئے خیر و بھلائی کے ارادہ سے ان کا مال اپنے مال میں ملانے کی اجازت عطا فرمادی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں تصرف کرنا جائز ہے اور بیع اور تقسیم وغیرہ میں وصی کا تصرف بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ یہ آیت مطلق ہے۔ جب ایک آدمی یتیم کا کفیل بن گیا اور اس نے اسے مخصوص کر لیا اور وہ اس کی زیر نگرانی رہ لگا تو اس کے بارے میں اس کا عمل جائز ہوگا اگرچہ والی نے اسے اس پر مقدم نہ بھی کیا ہو کیونکہ آیت مطلق ہے اور کفالت ولایت عامہ ہے اور خلفاء میں سے کسی سے مروی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے ہوتے ہوئے کسی کو یتیم پر مقدم کیا ہو۔ بلاشبہ وہ ان کے اپنے پاس ہونے پر ہی اقتصار کرتے تھے (یعنی ان کی جملہ ذمہ داری خود ادا کرتے تھے)۔

مسئلہ نمبر 3۔ یتیم کا مال مضاربہ اور تجارت کی غرض سے دینے کے بارے میں اور اس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے کے بارے میں روایات تو اتر کے ساتھ موجود ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں بیع و شرا کے اعتبار سے تصرف کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ خیر و بھلائی کا موجب ہو اور اسی طرح مضاربہ وغیرہ کے لئے بھی دینا جائز ہے۔ ہم عنقریب تفصیل سے بیان کریں گے۔

البتہ قرض کے طور پر دینے میں اختلاف ہے۔ اشہب نے اس سے منع کیا ہے اور اسی منع پر اسے بھی قیاس کیا ہے کہ وہ ان کے لئے اپنی طرف سے کوئی شے بیچے یا کوئی خریدے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: جب وہ قرض لے نفع کی خاص مقدار کے عوض جو کہ قرض کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو تو اسے دے دیا جائے گا، جیسا کہ وہ یتیم کے لئے پوری جانچ پڑتال کے ساتھ کوئی شے خرید لے تو یہ یتیم کے لئے بہت زیادہ اچھا اور بہتر ہوگا۔ محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے: آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم کے لئے قرض کے عوض (ادھار) بیع کرے اگر وہ اس میں بہتری اور نفع دیکھے۔

ابن کنانہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ یتیم کی شادی کے لئے اتنا مال خرچ کرے جو اس کی ضروریات اور پاکیزگی کے لئے مفید اور نفع بخش ہو اور اس کا نفع اس کے اپنے حال اور اس کے حال جس کے ساتھ وہ اس کی شادی کر رہا ہے، کے مطابق اور اس کے مال کی کثرت کی مقدار کے برابر ہو۔ مزید فرمایا: اسی طرح وہ اس کے ختنے وغیرہ میں اس کا مال خرچ کر سکتا ہے، اگر اسے یہ خوف ہو کہ اسے سلطان کے پاس پیش کرنے کا اہتمام کیا جائے گا اور وہ اسے بالقصد اس کا حکم دے گا اور ہر وہ عمل جو اس نے گہری نظر و فکر کے ساتھ کیا تو وہ جائز ہے اور جو اس نے بطور محاباة (کسی دوسرے شخص کی سہولت کو پیش نظر رکھنا) اور کوتاہ نظری کی بنا پر کیا تو وہ عمل جائز نہ ہوگا۔ آیت کا ظاہر اس پر دلیل ہے کہ یتیم کا ولی اسے دنیا اور آخرت کے امور کی تعلیم دے گا اور اس کے لئے ایسا معلم اجرت پر رکھے گا جو اسے کاروبار کی تعلیم دے گا۔ اور جب یتیم کو کوئی شے بہہ کی جائے تو وصی کے لئے اس پر

قبضہ کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں اصلاح اور بھلائی ہے۔ اس کا مزید بیان سورہ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4۔ جن چیزوں کے لئے وصی اور کفیل یتیم کا مال خرچ کر سکتے ہیں ان کی دو حالتیں ہیں: ایک وہ حالت ہے جس پر گواہ بنانا ممکن ہوتا ہے اور اس میں بینہ کے بغیر اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا اور ایک وہ حالت ہے جس پر شاہد بنانا ممکن نہیں ہوتا، تو اس پر بغیر بینہ کے اس کا قول قبول ہوگا، پس جب کسی نے زمین خریدی اور وہ جس میں توثیق کی عادت جاری ہو تو بغیر بینہ کے اس میں اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔

ابن خويز منداد نے کہا ہے: اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے ان کے درمیان یہ فرق بیان کیا ہے کہ یتیم وصی کے گھر میں ہو تو وہ اس پر خرچ کر سکتا ہے اور اسے اس کے نفقہ اور اس کے لباس وغیرہ مہیا کرنے پر شاہد بنانے کا پابند نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کے لئے ہر وقت اس پر گواہ بنانا معتذر ہوگا جو اسے کھلائے اور اسے پہنائے، بلکہ جب اس نے یہ کہا: میں نے سال بھر کے لئے یہ خرچ کیا ہے تو یہ اس سے قبول کر لیا جائے گا۔ اور اس کے درمیان کہ وہ اپنی ماں یا اپنی دایہ (پرورش کرنے والی) کے پاس ہو اور وصی یہ دعویٰ کر رہا ہو کہ وہ اس پر خرچ کر رہا ہے یا وہ اس کی ماں یا دایہ کو نفقہ اور کسوة دیتا ہے تو بینہ کے بغیر ماں یا دایہ کے خلاف اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ اس کے لئے بطور مشاہرہ یا خاطر مدارت اس پر قبضہ کرتی رہی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جو اپنی زیر نگرانی یتیم بچی سے اپنا نکاح کر لیتا ہے کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش یتیم بچے یا بچی کے مال سے اپنے لئے خرید سکتا ہے؟

پس حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: کفالت اور حضانت کے سبب نکاح کی ولایت قرابت کی نسبت زیادہ قوی ہے، حتیٰ کہ ان اعراب کے بارے میں کہا جو قحط کے دنوں میں اپنے بچوں کو دوسروں کے حوالے کر دیتے تھے: بے شک وہ انہیں ان کا نکاح کرنے کا اختیار دے دیتے تھے اور رہا کفیل اور پرورش کرنے والے کا اپنے ساتھ نکاح کرنا تو اس کا تفصیلی بیان سورہ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور رہا اس سے خریدنا تو حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: مشہور اقوال کے مطابق وہ اس سے خرید سکتا ہے اسی طرح حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم بچے کا مال مثلی قیمت سے زیادہ کے عوض اپنے لئے خرید لے، کیونکہ یہ اصلاح اور خیر ہے جس پر ظاہر قرآن دلالت کرتا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: نکاح اور بیع میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ آیت میں تصرف کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے: **إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ** (ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے) اس میں اس کا ذکر نہیں جس کے لئے دیکھ بھال جائز ہوتی ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں: جب بھلائی کرنا بہتر ہے تو پھر اس کی شادی کرنا بھی جائز ہوگا اور یہ بھی جائز ہوگا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ اور امام شافعی شادی کرانے میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتے سوائے اس جہت کے کہ اس سے حاجت دور ہو جاتی ہے اور بالغ ہونے سے پہلے کوئی حاجت نہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وصی کے لئے شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ بھلائی ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ دادا

کے لئے جائز ہے کہ وہ بھی وصی کے ساتھ ساتھ شادی کرادے اور باپ کے لئے بھی ایسے بچے کے حق میں (یہ اختیار ہے) جس کی ماں فوت ہو چکی ہو نہ کہ اس آیت کے حکم سے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قاضی کے لئے ظاہر قرآن کے مطابق یتیم کی شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ سب مذاہب اسی آیت سے ظاہر ہوئے ہیں۔ پس اگر تزویج کا اصلاح (اور نفع بخش ہونا) ثابت ہو جائے تو پھر آیت کا ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ کا یہ معنی ہونا بھی جائز ہے کہ آپ سے یتیموں کے ذمہ دار، ان کی کفالت کرنے والے سوال کرتے ہیں اور یہ مجمل ہے اس سے معین کا فل (کفالت کرنے والا) اور قیم (ذمہ دار) معلوم نہیں ہو سکتا اور جو اس میں اوصاف شرط ہوتے ہیں (وہ بھی معلوم نہیں ہو سکتے۔) اور اگر کہا جائے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جب آدمی کو اپنے یتیم سے مال خریدنے کی اجازت دے دی ہے تو اس سے تو ان کا تہمت اور ذرائع میں اصل کو ترک کرنا لازم آتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ لازم نہیں آتا۔ بلاشبہ یہ ان میں ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے جو ممنوع افعال سے ایسے ممنوع تک پہنچانے والے ہوں جن کے بارے نص بیان کر دی گئی ہو، لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ نے مال باہم ملانے کی صورت میں اجازت عطا فرمادی ہے اور اس میں پرورش کرنے والوں کو ان کی امانتوں کے حوالے کر دیا ہے جیسا کہ فرمایا: **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ** اور ہر وہ امر جس کے بارے خوف ہو اللہ تعالیٰ نے مکلف کو اس کی امانت کے حوالے کر دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ممنوع تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، لہذا اس سے منع کر دیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنی شرمگاہوں پر امین بنایا ہے، اگرچہ ان کا جھوٹ بولنا ممکن ہے۔

حضرت طاؤس سے جب یتیموں کے بارے میں کسی شے سے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ یہ پڑھتے: **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ** (اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے)

ابن سیرین کے نزدیک یتیم کے مال کے بارے میں پسندیدہ عمل یہ تھا کہ وہ اس کے خیر خواہ لوگوں کو جمع کرے اور وہ اس کے بارے غور و فکر کریں جو اس کے لئے مفید اور بہتر ہو۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ اپنے لئے یتیم کے مال سے خریدنا جائز ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ولی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس مال میں سے کوئی شے خریدے جو اس کے اپنے زیر نگرانی ہو، کیونکہ اس میں اسے تہمت لگ سکتی ہے مگر یہ کہ اس میں لوگوں کی ایک جماعت میں بیع سلطان کی جانب سے ہو (یعنی نیلام عام ہو)۔

محمد بن عبدالحکیم نے کہا ہے: وہ ترکہ میں سے نہیں خرید سکتا اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ایسے آدمی کو وسیلہ بنائے جو اس میں سے اس کے لئے خریدے، بشرطیکہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس کی طرف سے ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: **وَإِنْ تَخَاطَبُوهُمُ فَأَخْوَاكُمْ** یہ اختلاط اور میل جول دو ہم مثل چیزوں کے ملنے کی طرح ہے جیسا کہ کھجور کا کھجور کے ساتھ مل جانا وغیرہ۔

ابو عبید نے کہا ہے: یتیموں کو ساتھ ملانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے کسی کا مال ہو اور اس کے کفیل کے لئے یہ امر باعث مشقت ہو کہ وہ اپنے سے اس کا کھانا وغیرہ علیحدہ کرے۔ اور وہ اسے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ملائے بغیر کوئی چارہ نہ پائے تو وہ

یتیم کے مال سے اتنا لے لے جسے وہ غور و فکر کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کے لئے کافی ہوگا اور اسے اپنے اہل خانہ کے خرچہ کے ساتھ ملا لے اور اس میں کبھی کمی بیشی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اور یہ آیت ناسخہ اس میں رخصت کے لئے نازل ہوئی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: میرے نزدیک یہی اس کی اصل ہے جو دوران سفر دوست احباب کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی جانب سے برابر برابر خرچہ نکالتے ہیں۔ حالانکہ کھانے کی قلت و کثرت میں وہ باہم متفاوت ہوتے ہیں اور ان میں سے جس کا کھانا کم ہو وہ اپنے ساتھی کے خلاف فضل (اضافی کھانے) کا دعویٰ نہیں کرتا۔ تو جب یتیموں کے مال میں یہ وسعت موجود ہے تو ان کے علاوہ میں بدرجہ اولیٰ وسعت ہوگی۔ اگر اس طرح نہ ہو تو مجھے خوف ہے کہ لوگوں پر اس بارے میں امر انتہائی شدید اور شاق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: **فَاٰخُوا نَكُمْ**۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی فہم اخوانکم ہے۔ اور فاجواب شرط کے لئے ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: **وَ اَللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ** یہ تحذیر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یتیموں کا مال خراب کرنے والے کو اسے سنوارنے والے سے خوب جانتا ہے، پس وہ ہر ایک کو اس کے سنوارنے اور اس کے بگاڑنے کے بدلے جزا دے گا۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: **وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَا عُنْتَكُمْ**۔ حکم نے مقسم سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے **وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَا عُنْتَكُمْ** فرمایا: اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا امر کر دیتا کہ تم یتیموں کے مال کے سبب ہلاک ہونے تک پہنچ جاتے۔ اور کہا گیا ہے کہ **لَا عُنْتَكُمْ** کا معنی ہے **لَا هَلَكُوكُمْ** (کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمہیں ہلاک کر دیتا۔) یہ زجاج اور ابو عبید کا بیان ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: (معنی یہ ہے) کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تم پر معاملہ تنگ اور سخت کر دیتا، لیکن اس نے تم پر سہولت اور آسانی کے سوا کچھ نہیں چاہا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ تمہیں ایسے امر کا مکلف اور پابند بنا دیتا جس کو ادا کرنا تم پر انتہائی شدید اور سخت ہوتا اور ان کا اختلاط تمہیں گنہگار کر دیتا، جیسا کہ اس نے ان کے ساتھ کیا جو تم سے پہلے تھے، لیکن اس نے تم سے تخفیف کی ہے۔

اور العنت کا معنی مشقت ہے، **وَقَدْ عَنَتْ** و **أَعْنَتْ** غیڑہ۔ وہ مشقت میں پڑا اور غیر نے اسے مشقت میں ڈالا۔ اور جب ہڈی کو کوئی شے لگے اور وہ اسے توڑ دے تو ایسی جڑی ہوئی ہڈی کے لئے کہا جاتا ہے: **قَدْ أَعْنَتْ**، تحقیق اس نے اسے مشقت میں اور درد میں مبتلا کیا **فَهُوَ عَنِتٌ وَ مُعْنِتٌ**۔ اور **عَنِتَتِ الدَّابَّةُ تَعْنَتُ عَنَتًا**: جب چوپائے کا پاؤں جڑنے کے بعد پھر ٹوٹ جائے اور اس کے لئے چلنا ممکن نہ ہو۔ اور **أَكْبَتُ عَنُوتًا** ایسا ٹیلہ جس پر چڑھنا انتہائی دشوار ہو۔ ابن الانباری نے کہا ہے: العنت کا اصل معنی تشدید (سختی) ہے۔ جب عرب یہ کہتے ہیں: **فَلَانٌ يَتَعْنَتُ فُلَانًا وَيُعْنِتُهُ** تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس پر انتہائی شدت اور سختی کرتا ہے اور اسے ایسے کام کا پابند بناتا ہے جسے کرنا اس پر انتہائی مشکل اور دشوار ہوتا ہے، پھر اسے ہلاکت کے معنی کی طرف منقول کیا گیا ہے۔ اور اصل معنی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: **إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ** یعنی اس پر کوئی شے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ **حَكِيمٌ** وہ اپنی ملک میں اس کے مطابق تصرف کرتا ہے جو وہ ارادہ کرتا ہے اس پر کوئی پابندی اور رکاوٹ نہیں، وہ انتہائی عظمت و شان والا اور بزرگ و برتر ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَا مَٰمَہٗ مُؤْمِنَةٌ حَتَّىٰ مَشْرُكَةٌ وَلَا تُؤْمِنُوا

أَعَجَبْتُكُمْ ۖ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ
وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۚ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۚ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ
وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٦٦﴾

”اور نہ نکاح کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور بے شک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ بہت پسند آئے تمہیں اور نہ نکاح کر دیا کرو (اپنی عورتوں کا) مشرکوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔ اور بے شک مومن غلام بہتر ہے (آزاد) مشرک سے اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں، وہ لوگ تو بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف اپنی توفیق سے اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے حکم لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔“
اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُنْكِحُوا اس میں جمہور کی قراءت تاء کے فتح کے ساتھ ہے۔ البتہ شاذ قراءت میں ضمہ (پیش) کے ساتھ بھی اسے پڑھا گیا ہے۔ گویا معنی یہ ہے کہ اس کی شادی کرنے والے نے اپنے سے اس کا نکاح کر دیا۔ اور نکح کا اصل معنی جماع ہے اور شادی کرنے کے معنی میں مجازاً اور وسعۃ استعمال ہوتا ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔
مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے اور (اہل کتاب کے ساتھ) نکاح کا میل جول رکھنے کی اجازت عطا فرمادی تو یہ واضح کر دیا کہ مشرکین کے ساتھ باہم نکاح کرنا صحیح نہیں ہے۔

مقاتل نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرثد بن ابی مرثد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا نام کناز بن حصین غنوی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خفیہ طور پر مکہ مکرمہ بھیجا، تاکہ وہ آپ کے اصحاب میں سے جو لوگ وہاں ہیں انہیں نکال لائے، تو مکہ مکرمہ میں ایک عورت تھی جو زمانہ جاہلیت میں ان کے ساتھ محبت کرتی تھی۔ اسے عناق کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس آگئی، تو آپ نے اسے فرمایا: بے شک اسلام نے اسے حرام کر دیا ہے جو کچھ عہد جاہلیت میں تھا، تو اس نے کہا: پھر تم مجھ سے شادی کر لو، تو آپ نے فرمایا: یہاں تک کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لوں، چنانچہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اجازت طلب کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے شادی کرنے سے منع فرمادیا، کیونکہ آپ مسلمان تھے اور وہ مشرک تھی (1)۔ اس کا بیان سورہ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے، پھر ان تمام سے اہل کتاب عورتوں کو نکال دیا ہے اور انہیں سورہ

ماندہ میں حلال قرار دیا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور مالک بن انس، سفیان بن سعید ثوری اور عبد الرحمن بن عمرو ازاعی رضی اللہ عنہم نے بھی یہی کہا ہے۔

اور حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: آیت کا لفظ تمام کافر عورتوں کو شامل ہے اور اس سے مراد خاص طور پر اہل کتاب ہیں اور اس خصوص کو سورۃ المائدہ کی آیت نے بیان کیا ہے۔ اور یہ عموم کبھی بھی اہل کتاب عورتوں کو شامل نہیں ہوا۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اور پہلے قول کے مطابق عموم ان کو بھی شامل ہے پھر سورۃ المائدہ کی آیت نے بعض عموم کو ختم کر دیا ہے۔ اور یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے، اسے ابن حبیب نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہودیہ اور نصرانیہ کا نکاح مذموم اور ثقیل ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے۔

اسحاق بن ابراہیم حربی نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت ناسخ ہے اور سورۃ المائدہ کی آیت منسوخ ہے، لہذا انہوں نے ہر مشرک عورت کے نکاح کو حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ کتابیہ ہو یا غیر کتابیہ ہو۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کرنے والے کی دلیل وہ حدیث ہے جس کی سند صحیح ہے اور ہمیں محمد بن ریان نے وہ بیان کی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن رحم نے بیان کیا کہ لیث نے حضرت نافع سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب کسی آدمی کے یہودی یا نصرانی عورت سے شادی کرنے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر مشرک عورتیں حرام قرار دی ہیں اور میں اس سے بڑا شرک کوئی نہیں جانتا کہ ایک عورت کہتی ہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ یہ کہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول اس جماعت کے قول سے خارج ہے جو اپنے ساتھ حجت قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے اہل کتاب کی عورتوں کے حلال ہونے کے بارے قول کیا ہے، ان میں سے حضرات عثمان، طلحہ، ابن عباس، جابر اور حذیفہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور تابعین میں سے حضرات سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد، طاؤس، عکرمہ، شعبی اور ضحاک ہیں اور فقہائے امصار بھی اسی قول پر ہیں۔ اور یہ بھی کہ سورۃ البقرہ کی اس آیت کا سورۃ المائدہ کی اس آیت کے لئے ناسخ ہونا ممتنع ہے۔ کیونکہ سورۃ البقرہ ان سورتوں میں سے ہے جو پہلے پہلے مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں اور سورۃ المائدہ آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ اور بلاشبہ آخر میں نازل ہونے والی پہلے والی کو منسوخ کرتی ہے۔ رہی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما! تو اس میں بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما توقف کرنے والے آدمی تھے، جب آپ نے دونوں آیتیں سنیں کہ ایک میں حلت کا ذکر ہے اور دوسری میں حرمت کا اور نسخ کی دلیل بھی آپ پر واضح نہ ہوئی، تو آپ نے توقف فرمایا، پس آپ سے نسخ کا ذکر مروی نہیں، بلکہ صرف نسخ کی تاویل کی گئی ہے اور ناسخ و منسوخ تاویل کے ساتھ حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان بعض روایات میں کہا ہے جو ان سے مروی ہیں کہ یہ آیت بت

پرست، آتش پرست اور کتابی عورتوں کے بارے میں عام ہے اور ہر وہ عورت جو دین اسلام پر نہیں وہ حرام ہے۔ اسی بنا پر یہ سورۃ المائدہ کی آیت کے لئے ناسخ ہے اور مؤطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول اسی کی تائید کرتا ہے کہ میں اس سے بڑھ کر شرک کرنے والا کسی کو نہیں جانتا کہ ایک عورت کہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما اور دو کتابی عورتوں کے درمیان تفریق کی اور ان دونوں نے کہا: اے امیر المومنین! آپ طلاق دلوادیں اور آپ غصے میں نہ ہوں، تو آپ نے فرمایا: اگر تم دونوں کی طلاق جائز ہے تو یقیناً تمہارا نکاح بھی جائز ہے۔ لیکن میں تم دونوں کے درمیان انتہائی ذلت و حقارت کی تفریق کر رہا ہوں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سند کے اعتبار سے جید اور عمدہ نہیں ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کا ارادہ کیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ یہ حرام ہے تو میں اس کا راستہ چھوڑ دیتا ہوں یا امیر المومنین؟ (یعنی میں اسے فارغ کر دیتا ہوں) تو آپ نے فرمایا: میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ حرام ہے، البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ تم ان میں سے بدکار عورتوں میں مشغول ہو جاؤ (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ابن منذر نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کتابی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان صحابہ کرام اور تابعین سے بھی جن کا ذکر نحاس کے قول میں ہوا ہے (نکاح کا جواز ذکر کیا ہے) اور اپنے کلام کے آخر میں کہا ہے: اوائل میں سے کسی سے بھی یہ قول صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے اسے حرام قرار دیا ہو۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جہاں تک دونوں آیتوں کا تعلق ہے ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ ظاہر اللفظ شرک اہل کتاب کو شامل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوْذُو الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ (البقرہ: 105) (نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے۔) اور فرمایا: لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ (البینہ: 1) (جن لوگوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا (وہ) اور مشرکین)

پس لفظ میں ان کے درمیان فرق کیا ہے اور ظاہر عطف، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بھی کہ اسم شرک عام ہے اور یہ نص نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ کے بعد یہ ارشاد گرامی: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ (المائدہ: 5) (اور (حلال ہیں) پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب) یہ نص ہے، پس جس میں احتمال ہے اور جس میں کوئی احتمال نہیں ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔ اور اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے یہ ارادہ کیا ہے

کہ وہ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور وہ اسلام لے آئے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: **وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْآيَةِ (آل عمران: 199)** (اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر۔) اور یہ ارشاد ہے: **مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ (آل عمران: 113)** (اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے۔)

تو اسے کہا جائے گا: یہ اس ارشاد میں آیت کی نص کے خلاف ہے: **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ** اور اس نظریہ کے خلاف ہے جو جمہور نے بیان کیا ہے کیونکہ ان میں سے جو اسلام لے آیا اس کی شادی کے جائز ہونے پر تو کسی کو کوئی اشکال نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہو گیا ہے۔

اور اگر وہ کہیں: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **أُولَئِكَ يَدْعُونَ إِلَى التَّائِبِ** اور ان کے نکاح کے حرام ہونے میں آگ کی طرف بلانے کو علت قرار دیا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی علت ہے: **وَلَا مَآئِمَةً مُؤْمِنَةً حَيٍّ مِّنْ مُّشْرِكٍ** کیوں کہ مشرک آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ علت تمام کفار میں جاری ساری ہے، نتیجتاً مسلمان مطلقاً کافر سے بہتر اور اچھا ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہا اہل کتاب کا نکاح جب وہ حالت جنگ میں ہوں تو نکاح حلال نہیں ہوگا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ حلال نہیں، اور رب العالمین کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا: **قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ٥ (التوبة)** (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں)

محدث نے کہا: میں نے اس کا ذکر حضرت ابراہیم نخعی سے کیا تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اور امام مالک نے اہل حرب کی شادی کو مکروہ قرار دیا ہے اور اس کی علت دار الحرب میں بچے کو چھوڑنا ہے اور اس وجہ سے کہ عورت وہاں شراب اور خنزیر میں تصرف کرے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: **وَلَا مَآئِمَةً مُّؤْمِنَةً حَيٍّ مِّنْ مُّشْرِكٍ** یہ اس کی خبر دی جا رہی ہے کہ مومنہ لونڈی مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ وہ صاحب حسب اور صاحب مال ہو۔ **وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ** اگرچہ وہ تمہیں حسن و جمال وغیرہ میں بہت پسند آئے۔ یہی علامہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

یہ آیت حضرت خنساء بنت شہاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی سیاہ رنگ کی لونڈی تھی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: اے خنساء! تحقیق اس کے باوجود کہ تو سیاہ ہے اور تو بد صورت ہے تیرا ذکر ملاء اعلیٰ میں کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تیرا ذکر اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ پس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کر لی۔ اور حضرت سدی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کی ایک سیاہ رنگ کی

کنیز تھی۔ انہوں نے غصے میں اسے طمانچہ دے مارا۔ پھر نام نہ ہوئے اور حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو صورتحال سے آگاہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبد اللہ! وہ کیسی ہے؟ آپ نے عرض کی: وہ نماز پڑھتی ہے، روزے رکھتی ہے، اچھے طریقے سے وضو کرتی ہے اور شہادتین کی شہادت دیتی ہے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ تو مومنہ ہے۔“ تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بالضرور اسے آزاد کروں گا اور پھر اس سے شادی کروں گا، پھر انہوں نے ایسا ہی کیا، تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے ان پر طعن کیا اور کہا: انہوں نے لونڈی سے نکاح کیا ہے؟ اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ وہ مشرکین سے نکاح کریں اور وہ ان کے حسب و نسب میں رغبت رکھتے ہوئے ان سے نکاح کرتے رہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ اہل کتاب کی لونڈیوں کے نکاح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: کتابیہ لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے اور اشہب نے کتاب محمد میں کہا ہے: وہ آدمی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کے تحت کتابیہ لونڈی ہو تو ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیوں کا نکاح جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ہمیں شیخ ابوبکر الشاشی نے مدینۃ السلام کے بارے میں درس دیا اور کہا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب نے کتابیہ لونڈی کے نکاح کے جائز ہونے پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: **وَلَا مَہْمُؤْمِنَةٌ حَتَّىٰ مَشْرُکَةٌ** اور آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مومنہ لونڈی اور مشرک کے نکاح کے درمیان اختیار دیا ہے، پس اگر مشرک لونڈی کا نکاح جائز نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان اختیار نہ دیتا، کیونکہ بلاشبہ اختیار دو جائز چیزوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ جائز اور ممتنع کے درمیان اور نہ ہی دو ضدوں کے درمیان۔ جواب یہ ہے کہ دو ضدوں کے درمیان اختیار لغت بھی اور قرآن کی رو سے بھی جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا** (الفرقان) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہو گا اور دو پہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہو گی۔) اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے خط میں لکھا: حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں سرکشی اختیار کرنے سے بہتر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد **وَلَا مَہْمُؤْمِنَةٌ** سے مراد وہ غلامی نہیں جو کسی کی ملکیت ہو بلکہ اس سے مراد آدمیت ہے اور عورتیں اور مرد سب کے سب اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی باندیاں ہیں، قاضی بصرہ ابو العباس جر جانی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مجوسی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔ پس امام مالک، شافعی، ابو حنیفہ، اوزاعی اور اسحاق رحمہم نے اس سے منع کیا ہے۔ اور ابن حنبل نے کہا ہے: مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ روایت ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ایک مجوسیہ عورت سے شادی کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اس کو طلاق دے دو۔ ابن القصار نے کہا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: دو قولوں میں سے ایک کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی کتاب ہے۔ لہذا ان کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔

ابن وہب نے حضرت مالک سے روایت کیا ہے کہ مجوسیہ لونڈی ہو تو ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرنا جائز

نہیں اور اسی طرح بت پرست عورتوں اور دیگر کافر عورتوں کا حکم ہے۔ یہی موقف علماء کی ایک جماعت کا ہے، مگر ایک روایت ہے جسے یحییٰ بن ایوب نے ابن جریج سے اور انہوں نے حضرت عطاء اور عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں سے مجوسی لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بارے پوچھا گیا، تو ان دونوں نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور ان دونوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ کی تاویل کی ہے۔ وہ یہ کہ ان دونوں کے نزدیک اس کا اطلاق عقد نکاح پر ہے نہ کہ خریدی ہوئی لونڈی پر اور ان دونوں نے اوطاس کے قیدیوں سے استدلال کیا ہے۔ وہ یہ کہ صحابہ کرام نے ان میں سے لونڈیوں کے ساتھ ملک یمین کی حیثیت سے وطی کی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے، رہے اوطاس کے قیدی! تو ان میں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی لونڈیوں نے اسلام قبول کر لیا ہو تو پھر ان کے ساتھ نکاح جائز ہے اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰی يُؤْمِنُوْا سے استدلال کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے، کیونکہ انہوں نے لفظ نکاح کو عقد کے معنی پر محمول کیا ہے، حالانکہ لغت میں نکاح کا اطلاق عقد اور وطی دونوں پر ہوتا ہے۔ پس جب فرمایا: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰی يُؤْمِنُوْا تو ہر اس نکاح کو حرام کر دیا جو مشرکات پر واقع ہوتا ہے چاہے وہ عقد نکاح ہو یا وطی ہو۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے کہ امام اوزاعی نے بیان کیا: میں نے زہری سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جو مجوسیہ لونڈی خریدتا ہے، کیا وہ اس سے وٹلی کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب وہ یہ شہادت دے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تو وہ اس سے وٹلی کر سکتا ہے۔

یونس نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ ابن شہاب کا قول ہے کہ اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے اور ابن شہاب مغازی اور سیر کے بارے لوگوں سے بڑھ کر عالم ہیں۔ آپ کا یہ قول اس کے قول کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جس نے یہ گمان کیا ہے کہ او طاس کے قیدیوں سے وطی کی گئی اور ان عورتوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہ قول ایک جماعت سے مروی ہے۔ ان میں سے حضرت عطاء اور عمرو بن دینار بھی ہیں۔ ان دونوں نے کہا ہے: مجوسیہ کے ساتھ وطی کرے میں کوئی حرج نہیں اور فقہاء امصار میں سے کوئی ایک بھی اس قول کی طرف متوجہ نہیں ہوا (یعنی کسی نے اسے اہمیت نہیں دی) حالانکہ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

اور وہ ان میں سے ہیں جن کی فارس اور پھر خراسان کے سوانہ اپنی جنگ ہوئی اور نہ ان کے اطراف والوں کی جنگ ہوئی اور ان میں سے کوئی بھی اہل کتاب نہیں جو تیرے لئے یہ بیان کرے کہ ان کی عورتوں کی سیرت اور کردار کیا ہوتا جب وہ قیدی بنالی جاتیں۔ فرمایا: ہمیں عبد اللہ بن محمد بن اسد نے خبر دی ہے، اس نے کہا: ہمیں ابراہیم بن احمد بن فراس نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں علی بن عبد العزیز نے بیان کیا ہے، اس نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں ہشام نے یونس سے اور انہوں نے حسن سے ہمیں بیان کیا ہے، اس نے کہا: ایک آدمی نے اسے کہا: اے ابو سعید! تم کیا طریقہ کرتے ہو جب تم

عورتوں کو قیدی بناتے ہو؟ تو انہوں نے کہا: ہم انہیں قبلہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ہم انہیں حکم دیتے ہیں کہ اسلام قبول کر لو اور یہ شہادت دو لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ، پھر ہم انہیں حکم دیتے ہیں کہ وہ غسل کریں۔

اور جب اس کا مالک اس سے وطی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے قریب نہیں جاتا یہاں تک کہ وہ اسے استبراء (☆) کرا لے۔ اس ارشاد باری تعالیٰ میں وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِ حَتَّىٰ يُوْثِقَ عِلْمًا کی ایک جماعت کی تاویل اسی کے مطابق ہے کہ بلاشبہ ان سے مراد بت پرست اور مجوسی عورتیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتابی عورتیں اپنے اس ارشاد کے ساتھ حلال قرار دی ہیں۔ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی پاکدامن عورتیں، نہ کہ وہ مسلمان عورتیں جن کا زنا مشہور ہے۔ اور علماء میں سے بعض نے ان کے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے اور اسے کہ وہ ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرے جب تک کہ ان کی جانب سے توبہ نہ ہو۔ کیونکہ اس میں نسب کو فاسد کرنا لازم آتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُوْثِقُوا ۖ وَلِعَبْدٌ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۚ لَّسْ گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُنْكِحُوا کا معنی ہے تم کسی مسلمان عورت کا کسی مشرک آدمی سے نکاح نہ کرو۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ مشرک کسی بھی وجہ سے مومنہ عورت کے ساتھ وطی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں اسلام کی ذلت و رسوائی ہے۔ اور فرعاء نے تنکحوا میں تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں نص کے ساتھ اس پر دلیل موجود ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

محمد بن علی بن حسین نے کہا ہے: کتاب اللہ میں ہے کہ نکاح ولی (کی اجازت) کے ساتھ ہوتا ہے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا نکاح الا بولی (1) یعنی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ۔

اہل علم نے بغیر ولی کے نکاح کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بہت سے اہل علم نے کہا ہے: نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کے ساتھ، یہ حدیث حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت جابر بن زید، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلیٰ، حضرت ابن شبرمہ، حضرت ابن مبارک، حضرت امام شافعی، حضرت عبید اللہ بن حسن، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم نے بھی کہا ہے۔

نکاح کو مادہ منویہ سے پاک کرنے کا اہتمام کرنا اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اسے حیض آجائے۔

1۔ ابو داؤد، باب الولی، حدیث نمبر 1785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب ما جاء لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی قول حضرت امام مالک، حضرت ابو ثور اور حضرت طبری رحمہ اللہ علیہم کا بھی ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ”ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا“ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا نکاح الا بولی۔

اس حدیث کو حضرت شعبہ اور ثوری نے ابو اسحاق سے، انہوں نے ابو بردہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل روایت کیا ہے۔ پس جو مرسل روایات قبول کرتے ہیں اس کو قبول کرنا ان پر لازم ہوگا اور رہے وہ جو مرسل روایات قبول نہیں کرتے تو ان پر بھی اسے قبول کرنا لازم ہوگا، کیونکہ وہ جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے وہ اہل حفظ اور ثقہ رواۃ میں سے ہیں اور جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے ان میں سے اسرائیل اور ابو عوانہ دونوں راوی ابو اسحاق سے، وہ ابو بردہ سے، وہ ابو موسیٰ بنی نضیم سے اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں (1)۔ اور اسرائیل اور جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے وہ سب حفاظ ہیں اور حافظ کی زیادتی قبول کی جاتی ہے اور اس زیادتی کو اصول تقویت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ (البقرہ: 232) (تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے) یہ آیت حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنی بہن کو اپنے خاوند کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا۔ اسے امام بخاری نے بیان کیا ہے اور اگر ان کے لئے نکاح کرنے میں کوئی حق نہ ہوتا تو انہیں رجوع سے روکنے سے منع نہ کیا جاتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتاب اللہ میں سے بھی جو آیات اس پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہیں: فَأَنْكِحُوا هُنَّ بِأَذْنِ أَهْلِهِنَّ (النساء: 25) (تو نکاح کر لو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے) اور یہ ارشاد وَآتِكُمُ الْيَاكُمِيَّ مِّنْكُمْ (النور: 32) (اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے) پس اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بارے خطاب مردوں کے سوا کسی کو نہیں کیا۔ اگر یہ خطاب عورتوں کو ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرماتا۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے بطور حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے کہا ہے: ”بے شک میں ارادہ رکھتا ہوں کہ میں تجھے نکاح کر دوں“ اس کی وضاحت سورۃ القصص میں آئے گی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَلْزَجَالُ قَوْمُؤْنَ عَلَى النَّسَاءِ (النساء: 34) (مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر) پس کتاب و سنت نے اس پر قوت اور تائید فراہم کی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے جس وقت وہ غیر شادی شدہ تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا عقد نکاح کیا (2) اور انہوں نے خود نکاح نہ کیا۔ یہ اس کے قول کا بطلان ہے جس نے کہا ہے کہ بالغہ عورت اپنے نفس کی مالک ہوتی ہے اپنے ولی کے بغیر وہ اپنی شادی کر سکتی ہے اور عقد نکاح کر سکتی ہے اور اگر یہ اختیار اسے ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء لانکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب لانکاح الا بولی، حدیث نمبر 1870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب شہود الملائکۃ ہدرا، حدیث نمبر 3704، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت حفصہ بنتیہ کوان کی لمبئی ذات کے بارے میں پیغام نکاح بھیجنا ترک نہ کرتے جبکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں اپنے باپ کی نسبت زیادہ قریب تھیں اور آپ نے پیغام نکاح اس کی طرف بھیجا جو ان کے معاملے کا مالک نہیں اور نہ ان کا عقد کرنے کا مالک ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی وضاحت بھی ہے الایم احق بنفسہا من ولیہا (1) (بیوہ عورت اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے۔) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے میں اس زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اس کی رضامندی کے بغیر اس پر عقد نہیں کر سکتا، یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے بارے میں یہ زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کر لے۔ اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی عورت کسی عورت کی شادی نہیں کرے گی اور نہ کوئی عورت اپنی شادی کرے گی کیونکہ زانیہ وہی ہوتی ہے جو اپنی شادی خود کر لیتی ہے۔“ فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے۔ (2)

اور ابو داؤد نے سفیان عن الزہری عن عروۃ کی سند سے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ بنتیہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس کسی عورت کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر کر دیا گیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ آپ نے یہ جملہ تین بار فرمایا۔ پس اگر اس کے ساتھ دخول کر لیا گیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اس عمل کے عوض جو اس نے اس کے ساتھ کیا اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان اس کا ولی ہوگا جس کا کوئی ولی نہ ہو (3)۔“ یہ حدیث صحیح ہے۔

اور ابن علیہ نے جو قول ابن جریج سے نقل کیا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے اس کے بارے میں حضرت زہری سے پوچھا تو انہیں اس کی پہچان نہ تھی۔ اور ابن علیہ کے سوا کس ایک نے بھی ابن جریج سے یہ قول نقل نہیں کیا، حالانکہ ایک جماعت نے حضرت زہری سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اگر زہری سے یہ ثابت ہو جائے تو بھی اس میں دلیل موجود نہیں کیونکہ آپ سے اسے ثقہ راویوں نے نقل کیا ہے، ان میں سے سلیمان بن موسیٰ ہیں اور وہ ثقہ امام ہیں اور جعفر بن ربیعہ ہیں (4) اور اگر زہری اسے بھول گئے تب بھی یہ آپ کے لئے نقصان دہ نہیں، کیونکہ نسیان سے کوئی آدمی محفوظ نہیں، حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”آدم علیہ السلام بھول گئے تو آپ کی ساری اولاد بھول گئی (5)“ اور آپ ﷺ کو بھی نسیان لاحق ہو جاتا تھا، تو پھر آپ کے سوا کون ہے جو نسیان سے زیادہ محفوظ ہو اور جس نے یاد رکھا تو وہ اس پر بھت ہے جو بھول گیا، پس جب ثقہ راوی خبر کو روایت کرے تو جو بھول گیا اس کا نسیان اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا۔ یہ تب ہے جبکہ وہ صحیح ہو جو ابن علیہ نے ابن جریج سے بیان کیا ہے، تو کیا حال ہوگا جبکہ اہل علم نے اس حکایت کا انکار کیا ہے اور انہوں نے اس پر اعتماد نہیں کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابو حاتم محمد بن حبان تمیمی البستی نے المسند الصحیح میں تقایم و انواع پر اس کی سند میں

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1888

2۔ ابن ماجہ، باب لانکاح الاہول، حدیث نمبر 1871، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

3۔ ابو داؤد، باب فی الولی، حدیث نمبر 1784، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3002، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

انقطاع کے پائے جانے کے بغیر نقل کیا ہے اور اس کے ناقل میں کوئی جرح بھی ثابت نہیں یہ حفص بن غیاث عن ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزہری عن عروہ عن عائشہ صدیقہ بنی شہاب کی سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور دو عادل شاہدوں کی شہادت کے ساتھ اور جو نکاح اس کے بغیر ہو وہ باطل ہے اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان وقت اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔“

ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزہری کی روایت میں سوائے تین آدمیوں کے کسی نے بھی یہ الفاظ نہیں کہے و شَهِدَیْ عَدْلٍ (وہ تین افراد یہ ہیں) سوید بن یحییٰ اموی، حفص بن غیاث سے، عبد اللہ بن عبد الوہاب جمعی، خالد بن حارث سے اور عبد الرحمن بن یونس الرقی، عیسیٰ بن یونس سے، شاہدین کے بارے میں اس خبر کے سوا کوئی صحیح نہیں ہے۔ اور جب یہ خبر ثابت ہو گئی تو کتاب و سنت نے اس بارے تصریح کر دی کہ ولی کی اجازت کے بغیر کوئی نکاح نہیں۔ اور جوان دونوں کے خلاف ہو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

حضرت زہری اور شعبی کہتے ہیں کہ جب کسی عورت نے دو شاہدوں کی موجودگی میں اپنی شادی کفو میں کر لی تو وہ نکاح جائز ہے۔ اسی طرح حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں کہ جب کسی عورت نے دو شاہدوں کی موجودگی میں اپنا نکاح کفو میں کیا تو وہ نکاح جائز ہے، یہی امام زفر کا قول ہے۔ اور اگر کسی نے اپنا نکاح غیر کفو میں کیا، تو وہ نکاح جائز ہوگا، لیکن اولیاء کو ان کے درمیان تفریق کا اختیار ہوگا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جو کچھ حضرت نعمان نے کہا ہے وہ سنت کے مخالف ہے اور اکثر اہل علم کے قول سے باہر ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق ہم کہہ رہے ہیں۔

اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: نکاح جائز نہیں ہوگا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور اگر ولی تسلیم کر لے تو پھر جائز ہے اور اگر وہ انکار کر دے اور اسے حوالے نہ کرے اور زوج عورت کا کفو ہو تو قاضی اس کی اجازت دے دے۔ اور بلاشبہ جب قاضی اس کی اجازت دے دے گا تو وہ نکاح مکمل ہو جائے گا، یہی قول امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کا ہے۔ اور امام محمد بن حسن رحمہ اللہ فرماتے تھے: قاضی ولی کو نکاح کی اجازت دینے کا حکم دے گا اور اگر وہ نہ دے تو (قاضی) نئے سرے سے عقد کر دے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب کے درمیان اس صورت میں کوئی اختلاف نہیں جب عورت کا ولی اسے اجازت دے دے، پس اس نے اپنا نکاح خود کر لیا تو وہ جائز ہوگا۔

امام اوزاعی نے کہا ہے: جب عورت اپنے معاملے کا کسی آدمی کو ولی بنائے اور وہ اس کا نکاح کفو میں کر دے تو وہ نکاح جائز ہے، اب ولی کے لئے ان کے درمیان تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ عورت عربیہ ہو اور شادی کسی مولیٰ (غلام) سے کر لے، یہ امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کی طرح ہے جو کہ آگے آئے گا۔

اور امام زہری، امام ابو حنیفہ اور شعبی رحمہم اللہ کے مذہب کے قائلین نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: لا نکاح الا بولیٰ کو معنی کمال پر محمول کیا ہے نہ کہ وجوب پر، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لا صلوة لجار المسجد الا لی المسجد (کہ

مسجد کے پڑوس میں رہنے والے کی نماز مسجد کے بغیر نہیں ہوتی۔) اور لا حَظَّ فِي الْإِسْلَامِ لِمَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ (1) کہ جس نے نماز چھوڑ دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں) (ان ارشادات میں کمال کی نفی ہے اسی طرح اس حدیث میں بھی کمال کی نفی ہے یعنی نکاح کامل نہیں ہوگا۔) اور انہوں نے اس پر ان ارشادات سے استدلال کیا ہے: فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ اور فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ: 234) (تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔) اور اس روایت سے جو دارقطنی نے سماک بن حرب سے روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: ایک عورت ہے میں اس کا ولی ہوں اس نے میری اجازت کے بغیر شادی کر لی ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو کچھ اس نے کیا ہے اس میں غور و فکر کی جائے گی اور دیکھا جائے گا، سوا اگر اس نے کفو میں شادی کی ہے تو ہم اسے اس کی اجازت دے دیں گے اور اگر اس نے ایسے آدمی سے شادی کی جو اس کا ہم کفو نہیں تو ہم اسے تیرے حوالے کر دیں گے (2)۔

اور موطا میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمن کی بیٹی کی شادی کی اور وہ غائب تھے۔ الحدیث۔

اور ابن جریج نے اسے عبدالرحمن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ انہوں نے ایک آدمی منذر بن زبیر رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنے بھائی کی اولاد میں سے ایک عورت کے ساتھ کیا۔ آپ نے ان کے درمیان پردہ لٹکا دیا، پھر گفتگو فرمائی۔ یہاں تک کہ جب عقد کے سوا کچھ باقی نہ بچا تو آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا اور اس نے نکاح کر دیا، پھر آپ نے فرمایا: عورتوں کے پاس نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے (یعنی عورتوں کو ولایت انکاح حاصل نہیں) اور امام مالک کی حدیث میں وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مہر اور احوال نکاح کو پختہ کیا اور اس (عورت) کے عصبہ میں سے ایک عقد کا والی بنا اور عقد کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف کی گئی کیونکہ اسے پختہ کرنے کی نسبت آپ کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویزمنداد نے ذکر کیا ہے: اولیاء کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ سے مختلف روایات ہیں کہ وہ کون ہیں؟ پس آپ نے ایک بار فرمایا: ہر وہ آدمی جس نے عورت کو اچھے اور حسین منصب میں رکھا وہی اس کا ولی ہے، چاہے وہ عصبہ ہو یا ذوی الارحام میں سے ہو یا اجنبی ہو یا امام ہو یا وصی ہو۔ اور ایک بار فرمایا: اولیاء عصبات میں سے ہوتے ہیں، پس ان میں سے جس نے عورت کو اچھے منصب میں رکھا وہ اس کا ولی ہوگا۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام مالک نے اس بیان میں کہا ہے جو ان سے ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ جب کسی عورت کی شادی ولی کے علاوہ کوئی اور اس عورت کی اجازت سے کر دے تو پھر اگر وہ عورت شریف ہو اور لوگوں میں اس کا کوئی مقام ہو تو اس کے نکاح کو فسخ کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں اس کے ولی کو اختیار ہوگا اور اگر وہ عورت رذیل اور کمینہ ہو جیسا کہ آزاد شدہ

لونڈی، سوداء یعنی قبیلہ قوم سے تعلق رکھنے والی، زنا کار اور مسلمانیہ اور وہ عورت جس کا کوئی مقام و مرتبہ نہ ہو تو اس کا نکاح جائز ہوگا اور اس کے ولی کو اختیار نہ ہوگا کیونکہ ہر کوئی اس کا کفو ہے۔

اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عورت شریف ہو یا رذیل ولی یا سلطان کے علاوہ کوئی اس کی شادی نہیں کر سکتا۔ اس قول کو ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کی طرف سے مسکین عورت اور وہ جو ذی مرتبہ اور ذی قدر ہو کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے بارے میں ان کے احکام کے درمیان مساوات اختیار کی ہے۔ اور فرمایا ہے: ”تمام مسلمانوں کا خون مساوی اور برابر ہوتا ہے“ (1)۔ اور جب وہ خون میں برابر ہوئے تو وہ اس کے علاوہ دیگر احکام میں بھی ایک شے ہوں گے۔

اور اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے نکاح کے بارے حکم ارشاد فرمایا تو اس نے بعض مومنین کو بعض کا ولی بنادیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں) اور فی الجملہ مومنین اسی طرح بعض بعض کے وارث بنتے ہیں، پس اگر ایک آدمی مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی میراث تمام مسلمانوں کے لئے ہوگی اور اگر وہ کسی جنایت (جرم) کا ارتکاب کرے تو اس کی جانب سے مسلمان ہی دیت ادا کریں گے، پھر ایک ولایت دوسری ولایت سے زیادہ قریب ہوتی ہے اور ایک قرابت دوسری قرابت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اور جب عورت ایسی جگہ میں ہو جہاں نہ سلطان ہو اور نہ اس کا ولی ہو تو وہ اپنا معاملہ پڑوسیوں میں سے اس کے حوالے کر دے گی جو قابل اعتماد ہوگا اور وہ اس کی شادی کر سکے گا اور اس حال میں وہی اس کا ولی ہوگا، کیونکہ لوگوں کے لئے شادی کرنے سے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور بلاشبہ اس بارے میں جتنا ممکن ہو سکے وہ اچھا عمل کرتے ہیں، اسی بنا پر امام مالک نے کمزور حالت والی عورت کے بارے میں کہا ہے کہ بلاشبہ اس کی شادی وہ کر سکتا ہے جس کی طرف وہ اپنے معاملے کو منسوب کرے گی، کیونکہ وہ عورت ان میں سے ہے جو سلطان کے پاس پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ پس اسے اس کے مشابہ قرار دیا گیا ہے جس کی موجودگی میں سلطان نہ ہو، پس فی الجملہ وہ اس طرف راجع ہوئی کہ مسلمان اس کے اولیاء ہیں۔ پس جب اس نے اپنا معاملہ ایک آدمی کے حوالے کر دیا اور اپنے اولیاء کو چھوڑ دیا تو بلاشبہ اس نے بلا وجہ ایک امر کو اختیار کیا ہے اور اس نے وہ کام کیا ہے جس کے بارے حاکم اور مسلمان اس کا انکار کرتے ہیں تو وہ نکاح فسخ کر دیا جائے گا یہ معلوم کیے بغیر کہ اس کی حقیقت حرام ہے۔

جب ہم نے یہ بیان کر دیا ہے کہ مومنین بعض بعض کے اولیاء ہیں اور یہ بھی کہ اس میں اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود نکاح فسخ کر دیا جائے گا کیونکہ یہ کام بلا وجہ ہوا ہے اور اس لئے بھی کہ فروج کے بارے زیادہ احتیاط ہے اور اس لئے بھی کہ ان کی حفاظت (ضروری ہے) اور جب دخول ہو جائے اور معاملہ طویل ہو جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے تو پھر صحیح یہی ہے کہ فسخ

1۔ ابوداؤد، باب السریۃ تردد علی اہل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المسلمون تتکافؤ ماہم، حدیث نمبر 2672-2674، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں، کیونکہ امور جب متفاوت ہو جائیں تو پھر ان سے اس حرام کے سوا کسی کا ارادہ نہیں کیا جاتا جس میں کوئی شک نہ ہو۔ اور یہ اس کے مشابہ ہو جاتا ہے جو حاکم کے حکم سے فوت ہو جائے جب کہ وہ حکماً یہ فیصلہ دے کہ اسے فسخ نہ کیا جائے مگر یہ کہ وہ ایسی خطا اور غلطی ہو جس میں کوئی شک نہ ہو (تو اس صوت میں حاکم کا فیصلہ نافذ العمل نہ ہوگا۔)

اور رہے امام شافعی اور آپ کے اصحاب! تو ان کے نزدیک بغیر ولی کے کیا ہوا نکاح ہمیشہ فسخ کیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے اگر ان میں سے کوئی ایک مر جائے۔ اور ان کے نزدیک ولی نکاح کے فرائض میں سے ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک اس پر کتاب و سنت سے دلیل قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَانْكِحُوا الْاَيَامِي مِنْكُمْ** اسی طرح فرمایا: **فَاَنْكِحُوْهُنَّ** باذن اہلہن اور اولیاء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ** اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: لا نکاح الا بولی اور انہوں نے رذیل اور شریف عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ان دونوں کے درمیان خون کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: **الْمُسْلِمُونَ تَتَكَفُّوْهُمْ** اور تمام احکام اسی طرح ہیں۔ اور ان میں سے کسی میں کتاب و سنت میں بلند مرتبہ اور گھنیا کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس نکاح کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے جو بغیر ولی کی اجازت کے واقع ہو اور پھر ولی قبل از دخول اس کی اجازت دے دے، تو حضرت امام مالک اور عبد الملک کے سوا ان کے اصحاب نے کہا ہے: وہ نکاح جائز ہے، کیونکہ اس کے لئے اس کی اجازت قرب کے سبب ہے، چاہے دخول ہوا ہو یا دخول نہ ہوا ہو۔ یہ تب ہے جب عقد نکاح بغیر ولی نے کیا ہو اور عورت نے بذات خود عقد نکاح نہ کیا ہو اور اگر عورت نے اپنی شادی خود کی اور اس نے مسلمانوں میں سے کسی قریبی یا بعیدی ولی کے بغیر عقد نکاح خود کیا ہو تو یہ نکاح کسی حال میں ہمیشہ کے لئے برقرار نہیں رکھا جائے گا اگرچہ وقت زیادہ گزر جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے۔ البتہ دخول کی صورت میں بچے کو اسی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا اور حد ساقط ہو جائے گی اور ہر حال میں اس نکاح کو فسخ کرنا ضروری ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس صورت میں فسخ بغیر طلاق کے ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اولیاء کے مراتب اور ان کی ترتیب میں علماء نے اختلاف کیا ہے:

حضرت امام مالک فرماتے ہیں: اولیاء میں سے سب سے اول بیٹے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی نیچے کی طرف ہوں، پھر باپ، پھر وہ بھائی جو باپ اور ماں دونوں جانب سے سگے ہوں، پھر وہ جو صرف باپ کی طرف سے ہوں (علاقہ بھائی) پھر حقیقی بھائیوں کے بیٹے پھر علاقہ بھائیوں کے بیٹے، پھر باپ کی جانب سے اجداد (دادے) اگرچہ وہ کتنے ہی اوپر ہوں، پھر چچے بھائیوں کی ترتیب پر، پھر ان کے بیٹے بھائیوں کے بیٹوں کی ترتیب پر اگرچہ وہ کتنے نیچے ہوں، پھر آقا پھر سلطان یا قاضی۔ اور وصی یتیموں کا نکاح کرنے میں اولیاء پر مقدم ہوتا ہے اور وہی باپ کا خلیفہ اور اس کا وکیل ہوتا ہے اور یہ اس حال کے مشابہ ہوتا ہے اگر باپ زندہ ہوتا۔

اور حضرت امام شافعی نے کہا ہے: باپ کے ساتھ کسی کی کوئی ولایت نہیں ہے اور اگر باپ فوت ہو جائے تو پھر دادا، پھر دادے کے باپ کا باپ، کیونکہ یہ سب کے سب آباء ہیں۔ اور دادا کے بعد ولایت بھائیوں کی ہوتی ہے، پھر اس کے لئے جو

ان کے بعد زیادہ قریبی ہو۔

مزنی نے قول جدید میں کہا ہے: وہ جو ماں کی طرف سے منفرد ہو وہ نکاح میں زیادہ اولیٰ ہوتا ہے جیسا کہ میراث میں۔ اور قدیم قول میں انہوں نے کہا ہے کہ دونوں برابر ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ اہل مدینہ نے امام مالک سے امام شافعی کے قول کی مثل روایت کیا ہے اور یہ کہ باپ بیٹے سے زیادہ اولیٰ اور قریب ہے اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اسے الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: دادا بھائیوں سے زیادہ اولیٰ ہے اور مشہور مذہب وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

امام احمد نے کہا ہے: عورت کی شادی کرنے کے لئے ان میں سے زیادہ حقدار اس کا باپ ہے، پھر بیٹا، پھر بھائی، پھر اس کا بیٹا، پھر چچا۔ اور اسحاق نے کہا ہے: بیٹا باپ سے زیادہ اولیٰ ہے: جیسا کہ حضرت امام مالک نے کہا ہے اور ابن منذر نے اسے ہی اختیار کیا ہے کیوں کہ عمرو بن ام سلمہ نے ان کی اجازت کے ساتھ ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے نسائی نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے اور عنوان یہ ہے انکاح الابن امہ۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کثرت کے ساتھ اس سے استدلال کیا ہے اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو صحاح میں ثابت ہے کہ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں بچہ تھا اور میرا ہاتھ پلیٹ میں ادھر ادھر گھومتا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے بچے! تو اللہ تعالیٰ کا نام لے اور دائیں ہاتھ سے کھا اور اس سے کھا جو تیرے سامنے ہے (1)۔“

اور ابو عمر نے کتاب الاستیعاب میں کہا ہے: عمر بن ابی سلمہ کی کنیت ابو حفص ہے، وہ سرزمین حبشہ میں ۲ھ میں پیدا ہوئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس وقت ان کی عمر نو برس تھی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس کی عمر اتنی ہو وہ ولی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن ابو عمر نے ذکر کیا ہے کہ ابو سلمہ کا ام سلمہ سے ایک دوسرا بیٹا تھا۔ اس کا نام سلمہ تھا اور یہی وہ ہے جس نے اپنی ماں ام سلمہ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور سلمہ کی عمر اپنے بھائی عمر بن ابی سلمہ سے زیادہ تھی اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کے اعتبار سے زیادہ حافظ نہ تھے اور ان کے بھائی عمر نے ان سے روایت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آدمی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جو دور کے اولیاء میں سے ہو اور وہ کسی عورت کی شادی کرے۔ اسی طرح واقع ہوا ہے اور اقرب عبارت ہے کہ کہا جائے: ایسی عورت کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس کی شادی اس کے اولیاء میں سے بعیدی ولی کرتا ہے درآنحالیکہ قریبی ولی حاضر ہو۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: اگر قریبی ولی نے اس میں سے کسی شے کا انکار نہ کیا اور نہ ہی اس نے اسے رد کیا تو وہ نکاح نافذ ہو

جائے گا اور اگر اس نے اس کلا نکار کیا اور وہ شبیہ ہو یا باکرہ بالغہ ہو، یتیم ہو اور اس کا کوئی وصی نہ ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور اہل مدینہ کی جماعت کا قول اس بارے میں مختلف ہے۔ سوان میں سے کہنے والوں نے کہا ہے کہ اسے رد نہیں کیا جائے گا اور وہ نافذ ہو جائے گا، کیونکہ وہ ایسا نکاح ہے جو اصول اور خاندان میں سے ولی کی اجازت کے ساتھ منعقد ہوا ہے اور ان میں سے جنہوں نے کہا ہے کہ نافذ نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ اولیاء میں افضل اور اولیٰ رتبہ کا ولی موجود ہے اور وہ مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اکثر اصحاب کے نزدیک ان کے مذہب کا ماحصل یہی ہے اور اسے ہی اسماعیل بن اسحاق اور ان کے قبعین نے اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سلطان اس میں غور و فکر کرے گا اور وہ ولی اقرب سے اس شے کے بارے میں پوچھے گا جسے وہ ناپسند کر رہا ہے پھر اگر وہ اسے نافذ کرنا مناسب سمجھے تو اسے نافذ کر دے اور اگر اسے رد کرنا مناسب سمجھے تو اسے رد کر دے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ قریبی ولی ہر حال میں اسے رد کر دے گا، کیونکہ وہ اس کا حق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے رد کرنے اور اس کی اجازت دینے کا اختیار ہے جب تک کہ عرصہ طویل نہ ہو اور وہ بچوں کو جنم نہ دے۔ یہ تمام اقوال اہل مدینہ کے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر ولی اقرب محبوس یا سفیہ ہو تو پھر اس کے بعد اولیاء میں سے جن کا مرتبہ ہو وہ اس کی شادی کر دے اور اسے ان میں میت کی طرح شمار کیا جائے۔ اسی طرح جب ولی اقرب غیبت بعیدہ پر غائب ہو یا اس طرح غائب ہو کہ جلدی اس کے واپس لوٹنے کی امید نہ ہو تو پھر بھی اس کے بعد والا ولی اس کی شادی کر سکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اقرب ولی غائب ہو اور اس کے پیچھے اس کی شادی کرنے والا کوئی نہ ہو، تو حاکم اس کی شادی کر سکتا ہے۔ پہلا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ جب دو ولی قرب میں واقع ہوں اور ان میں سے ایک غائب ہو اور عورت اپنے عقد نکاح کی ذمہ داری حاضر ولی کے سپرد کر دے تو جب غائب ولی واپس آئے تو اس کے لئے انکار کی اجازت نہیں۔ اور اگر دونوں حاضر ہوں اور عورت اپنا معاملہ ان میں سے ایک کے حوالے کرے تو وہ دوسرے ولی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا اور اگر دونوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر حاکم اس میں غور و فکر کرے اور ان دونوں میں سے جس کو عورت کے حق میں اچھا سمجھے اس کی رائے کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اسے ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ رہی نکاح میں شہادت! تو یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک رکن نہیں ہے اور اس بارے میں اس کی شہرت اور اعلان ہی کافی ہوگا اور یہ کہ وہ نکاح خفیہ اور سری ہونے سے نکل جائے۔

ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اگر کسی نے بینہ کے ساتھ نکاح کیا اور گواہوں کو حکم دیا کہ وہ اسے چھپا کر رکھیں تو نکاح جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ نکاح سر ہے اور اگر اس نے بغیر گواہوں کے غیر سری انداز میں نکاح کیا تو وہ جائز ہے اور وہ دونوں اس میں گواہ بنالیں جس سے وہ دو چار ہوں گے۔

ابن وہب نے امام مالک سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ ایک عورت سے دو آدمیوں کی شہادت کے ساتھ شادی کرتا ہے اور ان دونوں کو چھپانے کے لئے کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ان دونوں کے درمیان طلاق کے ساتھ تفریق کر دی جائے گی اور نکاح جائز نہ ہوگا اور اگر آدمی نے اس کے ساتھ دخول کیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اور دونوں گواہوں کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی رحمہ اللہ علیہما اور ان دونوں کے اصحاب نے کہا ہے: جب کسی نے دو شاہدوں کی موجودگی میں کسی عورت سے شادی کی اور اس نے ان دونوں کو کہا: تم اسے خفیہ رکھنا تو نکاح جائز ہوگا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ ہمارے ساتھی یحییٰ بن یحییٰ لیشی اندلسی کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: ہر وہ نکاح جس پر دو آدمی گواہ ہوں تحقیق وہ سر (خفیہ) کی حد سے نکل گیا اور میرا گمان ہے کہ اسے لیث سے ابن سعد نے بیان کیا ہے۔ امام شافعی، اہل کوفہ اور ان کے قبیعین کے نزدیک سر سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ نکاح جس پر دو یا دو سے زیادہ آدمی گواہ نہ ہوں اور اسے ہر حال میں فسخ کر دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام شافعی کا قول اس حدیث کے مطابق زیادہ صحیح ہے جسے ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: دو عادل شاہدوں اور ولی مرشد کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہے اور اس بارے میں جو کچھ میں نے جانا ہے، صحابہ کرام میں سے کسی نے آپ کی مخالفت نہیں کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مذہب کے لئے اس سے استدلال کیا ہے کہ بیوع جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ان میں عقد کے وقت گواہ بنانا ہے اور اس پر دلیل قائم ہے کہ گواہ بنانا بیوع کے فرائض میں سے نہیں ہے اور وہ نکاح جس میں اللہ تعالیٰ نے گواہ بنانے کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کے لئے زیادہ لائق اور مناسب ہے کہ گواہ بنانا اس کی شروط اور فرائض میں سے نہ ہو، بلاشبہ مقصود انساب کی حفاظت کے لئے اعلان اور ظہور ہے۔ اور اشہاد کی ضرورت عقد کے بعد تب ہوتی ہے جب دو نکاح کرنے والوں کے درمیان کوئی اختلاف یا ایک دوسرے کے خلاف کوئی دعویٰ منعقد ہو اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: اعلنوا النکاح (1) تم نکاح کا اعلان کرو۔ امام مالک کا یہ قول ابن شہاب اور اکثر اہل مدینہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ اور مومن غلام خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ مشرک حسب والے سے بہتر ہے۔ وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ اگرچہ اس کا حسب اور اس کا مال تمہیں اچھا لگے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: مومن آدمی اور اسی طرح لَامَةٌ مُّؤْمِنَةٌ سے مراد مومنہ عورت ہے، جیسا کہ ہم نے اسے بیان کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارے تمام مرد اللہ تعالیٰ کے غلام اور تمہاری تمام عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں۔“ مزید فرمایا: ”تم اللہ تعالیٰ کی باندیوں کو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے نہ روکو (2)۔“ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نِعَمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ (ص) (بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ) یہی وہ اچھا اور حسین قول ہے جس پر اس آیت کو محمول کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ نزاع ختم ہو جاتا ہے اور اختلاف زائل ہو جاتا ہے۔ واللہ الموفق

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: اُولَٰئِكَ فِيْ اَشْرَارٍ مُّشْرِكٍ مردوں اور مشرک عورتوں کی طرف ہے۔ يَدْخُلُوْنَ اِلَى النَّارِ یعنی وہ ایسے اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں جو آتش جہنم کا موجب ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی صحبت اور ان کا طرز معاشرت نسل کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشات میں سے کثیر میں انحطاط اور تنزل کا سبب بنتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ اور اللہ تعالیٰ اہل جنت کے عمل کی طرف بلاتا ہے۔ بِاِذْنِهٖ اپنے امر سے۔ زجاج نے یہی کہا ہے۔

وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۚ قُلْ هُوَ اَذْيٌ فَاَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۚ وَلَا تَقْرُبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهَرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝

”اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق۔ فرمائیے: وہ تکلیف دہ ہے، پس الگ رہا کرو عورتوں سے حیض کی حالت میں اور نہ نزدیک جایا کرو ان کے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جیسے حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے، بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو۔“

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيضِ۔ طبری نے سدی سے ذکر کیا ہے کہ سائل حضرت ثابت بن دحداح ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر بنی نہج ہیں اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے اور سوال کے سبب کے بارے میں حضرت قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے عرب لوگ حیض والی عورتوں کے ساتھ کھانے پینے اور ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنے سے اجتناب کرنے میں بنی اسرائیل کے طریقے پر چلتے تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ حالت حیض میں عورتوں سے دور رہتے تھے اور وہ زمانہ حیض کی مدت ان کی دبروں میں دھکی کر دیتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودیوں میں جب کوئی عورت حائضہ ہوتی تھی تو وہ گھروں میں نہ اس کے ساتھ مل کر کھاتے تھے اور نہ ان کے ساتھ مجامعت کرتے تھے۔ پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے پوچھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۚ قُلْ هُوَ اَذْيٌ فَاَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ اِلٰى اٰخِرِ الْآيَةِ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اصنعوا كل شي الا النكاح (تم ان کے ساتھ دھکی کے سوا ہر معاملہ کرو) یہ خبر یہودیوں کے پاس پہنچی، تو انہوں نے کہا: یہ آدمی ہمارے امور میں سے کسی شے کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا مگر اس نے ہر معاملے میں ہماری مخالفت کی ہے۔ پس حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر بنی نہج دونوں آئے اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ یہودی اس طرح کہہ رہے ہیں، کیا ہم ان (عورتوں) سے جماع نہ کیا کریں؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا، یہاں تک کہ ہمیں یہ گمان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں پر غصے اور ناراض ہوں گے،

پس وہ دونوں نکل گئے اور پھر ان دونوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے پاس دودھ کا ہدیہ آیا، تو آپ ﷺ نے وہ ان کے پیچھے بھیج دیا اور ان دونوں نے خوب سیر ہو کر پیا اور انہیں پہچان ہو گئی کہ آپ ﷺ ان پر ناراض نہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: یہودی اور مجوسی حیض والی عورتوں سے دور رہتے تھے اور عیسائی حیض والی عورتوں سے مجامعت کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان کا قصد کرتے ہوئے یہ حکم ارشاد فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **عَنِ الْمَحِيضِ**۔ **الْمَحِيضُ** سے مراد حیض ہے اور یہ مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأة حیضاً و محاضاً و محيضاً فہی حائض اور یہ حائضہ بھی ہے۔ فراء نے ایک شعر میں کہا ہے:

كحائضة يُزني بها غير طاهر (جیسا کہ حیض والی عورت اس سے ناپاک حالت میں زنا کیا جاتا ہے)

اور (کہا جاتا ہے) نساء حیض و حوائض اور الحیضۃ کا معنی ہے: ایک بار۔ اور الحیضۃ کسرہ کے ساتھ اسم ہے اور جمع الحیض ہے۔ اور الحیضۃ کا معنی وہ کپڑے کا ٹکڑا بھی ہے جس کے ساتھ عورت اپنی فرج کو (حیض آنے کے وقت) باندھتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: لیتنی كنت حیضۃ مُلقاة (1) (اے کاش! میں وہ کپڑے کا ٹکڑا ہوتی جسے پھینک دیا جاتا ہے۔) اسی طرح المحیضۃ ہے اور اس کی جمع المحائض ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ المحیض زمان و مکان سے عبارت ہے اور نفس حیض کو بھی محیض کہا جاتا ہے، یہ زمان و مکان میں اصل ہے اور حیض کے معنی میں مجاز ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: المحیض حیض کا اسم (نام) ہے اور اسی کی مثل رؤبہ کا عیش کے بارے قول ہے۔

اليك أشكو شدة النعیش و مزا أعوام تتفن ریشی

میں زندگی کی تلخی اور شدت کی تیرے پاس شکایت کر رہا ہوں اور سال ہا سال گزر گئے، انہوں نے میرے بال و پرا کھڑ دیے۔ اور کلمہ کی اصل سیلان (بہہ پڑنا) اور انفجار (پھوٹ پڑنا) سے ہے۔ کہا جاتا ہے: حاض السیل و فاض سیلاب پھوٹ پڑا اور بہہ گیا اور حاضت الشجرۃ یعنی درخت کی رطوبت ظاہر ہو گئی بہہ گئی۔

اور اسی طرح الحیض بمعنی الحوض ہے، کیوں کہ پانی اس کی طرف بہتا ہے اور عرب یاء کی جگہ واؤ اور واؤ کی جگہ یاء داخل کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی چیز سے ہیں۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: المحیض اور الحیض کا معنی اس کے محل کی طرف خون کا جمع ہونا ہے اور اسی سبب سے حوض کو بھی یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأة و تحیضت، و درست و عرکت، و طشت، تحیض حیضاً و محاضاً و محيضاً جبکہ معلوم اوقات میں عورت کا خون بہہ پڑے۔ اور جب وہ غیر معلوم ایام میں جاری ہو اور حیض کی رگ کے سوا کہیں اور سے آئے تو پھر تو کہے گا: أستحیضت فہی مستحاضۃ کہ عورت مستحاضہ ہو گئی۔ (یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ اور اس کے آٹھ اسماء ہیں (1) حائض (2) عارک (3) فارک (4) طامس (5) دارس (6) کابر (7) ضاحک (8) طامث۔

حضرت مجاہد نے ارشاد باری تعالیٰ: فَصَحَّكَتْ کا معنی بیان کیا ہے: حاضت۔ پس وہ حائضہ ہو گئی۔ اور قول باری تعالیٰ: فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ یعنی حُضْن (پس جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ حائضہ ہو گئیں۔) اس کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے لئے اپنی فرج سے ظاہر بہنے والا خون دیکھنے کی حالت میں تین احکام ہیں۔ پس ان میں سے حیض معروف ہے اور خون حیض سیاہ گاڑھا ہو اس پر سرخی غالب ہو اور یہ کہ عورت اس کی وجہ سے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا ترک کر دے گی۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور کبھی یہ خون متصل (مسل) آتا ہے اور کبھی منقطع ہوتا ہے (یعنی ایک دو دن کے وقفے سے آتا ہے) پس اگر یہ متصل جاری رہے تو اس کے لئے حکم ثابت ہوگا اور اگر منقطع ہو اور عورت ایک دن خون دیکھے اور ایک دن طہر یا وہ دو دن خون دیکھے اور دو دن یا ایک دن طہر تو بلاشبہ وہ خون کے دنوں میں نماز چھوڑ دے گی اور اس کے انقطاع کے وقت غسل کرے گی اور نماز پڑھے گی، پھر وہ خون کے ایام کو اکٹھا کر لے گی اور درمیان میں آنے والے ایام طہر کو لغو چھوڑ دے گی اور وہ انہیں عدت اور استبرا کی صورت میں طہر شمار نہیں کرے گی۔ حیض عورتوں کی فطرت میں ہے اور ان کی معروف طبعی عادت ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (1) نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے دن عید گاہ کی طرف تشریف لائے اور آپ عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ کرو کیونکہ اہل نار میں سے اکثر تم مجھے دکھائی گئی ہو۔ تو انہوں نے عرض کی: کیوں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوندوں کی نافرمانی کرتی ہو۔ میں نے تم سے بڑھ کر ناقصات عقل و دین کسی کو نہیں دیکھا جو ایک محتاط آدمی کی عقل و فہم کو ختم کر دے۔ تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم عقل و دین کے اعتبار سے ہم میں کون سی کمی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا عورت کی شہادت آدمی کی شہادت کے نصف کے برابر نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، کیوں نہیں، پھر آپ نے فرمایا: یہ ان کی عقل کی کمی کی وجہ سے ہے اور کہا: جب وہ حائضہ ہو جائے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے، کیا اسی طرح نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ان کے دین کی کمی کی وجہ سے ہے۔“

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حائضہ عورت روزے کی قضا کرے گی اور نماز کی قضا نہیں کرے گی۔

حضرت معاذہ کی حدیث ہے انہوں نے کہا: میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا اور کہا: حیض والی عورت کو کیا ہے کہ وہ روزے کی قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا نہیں کرتی؟ تو انہوں نے فرمایا: کیا تو حروریہ (☆) ہے؟ میں نے

1۔ بخاری شریف، باب ترک الحائض الصوم، حدیث نمبر 293، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ حروریہ خوارج کا ایک گروہ ہے اور یہ کوفہ کے قریب ایک گاؤں حروراء کی طرف منسوب ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ ان کے نزدیک دین میں انتہائی شدت اور سختی ہے جیسا کہ معروف ہے۔

کہا: میں حرور یہ تو نہیں، البتہ میں پوچھ رہی ہوں۔ تو پھر انہوں نے فرمایا: چونکہ وہ ہمیں لاحق ہوتا رہتا ہے اس لئے ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا گیا ہے اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا گیا، اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1) اور جب عورت کا خون ختم ہو جائے تو اس کے لئے اس سے پاکیزگی اور طہارت غسل ہے اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے حیض کی مقدار میں اختلاف کیا ہے:

فقہائے مدینہ نے کہا ہے: بلاشبہ حیض پندرہ دنوں سے زیادہ نہیں ہوتا اور یہ جائز ہے کہ وہ پندرہ دن اور اس سے کچھ کم ہو اور جو پندرہ دنوں سے زیادہ ہوگا وہ حیض نہ ہوگا بلکہ وہ استحاضہ ہے۔ یہ مذہب امام مالک رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب کا ہے۔ اور امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ حیض کے قلیل ہونے اور کثیر ہونے کا کوئی وقت نہیں مگر وہی جو عورتوں میں پایا جاتا ہے (یعنی ان کی عادت ہوتی ہے)۔ گویا آپ نے اپنا پہلا قول چھوڑ دیا ہے اور عورتوں کی عادت کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

محمد بن مسلمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: کم سے کم طہر پندرہ دن ہے، بغداد کے رہنے والے اکثر اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہی اختیار کیا ہے اور یہی امام شافعی، امام اعظم ابوحنیفہ، ان دونوں کے اصحاب اور امام ثوری رحمہ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور اس باب میں صحیح قول یہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت تین حیض مقرر کی ہے اور جنہیں بڑھاپے یا صغریٰ کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو ان کی عدت تین ماہ مقرر کی ہے، گویا کہ ہر حیض ایک مہینے کا عوض ہے اور مہینہ طہر اور حیض دونوں کو جامع ہوتا ہے۔ پس جب حیض کم ہوگا تو طہر زیادہ ہوگا اور جب حیض کے دن زیادہ ہوں گے تو طہر کے دن کم ہوں گے۔ پس جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہو تو واجب ہے کہ اس کے مقابلے میں کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہو۔ تاکہ ایک مہینے میں حیض اور طہر دونوں مکمل ہو جائیں اور قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ عورتوں کی خلقت اور ان کی فطرت میں اغلباً یہی متعارف ہے۔

اور امام شافعی نے فرمایا ہے: کم سے کم حیض کی مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی اکثر مدت پندرہ دن ہے اور ان سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل بھی مروی ہے کہ اسے عورتوں کے عرف اور عادت کی طرف لوٹا دیا گیا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ حیض کی کم از کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک جو خون تین دنوں سے کم ہوگا وہ استحاضہ ہوگا، یہ نماز کے مانع نہیں ہوتا مگر جب کہ یہ پہلی بار ظاہر ہو، کیونکہ اس کی انتہائی مدت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر عورت پر ان اوقات کی نماز قضا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح وہ خون جو دس دنوں سے زیادہ ہو (وہ بھی) اہل کوفہ کے نزدیک استحاضہ ہے۔ اور اہل حجاز کے نزدیک جو پندرہ دنوں سے زائد ہوگا وہ دم استحاضہ ہوگا اور جو ایک دن اور ایک رات سے کم ہوگا امام شافعی کے نزدیک وہ استحاضہ ہوگا اور یہی قول امام اوزاعی اور طبری کا ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے ان میں سے حضرت عطاء بن ابی رباح، حضرت ابو ثور اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہم ہیں۔

1۔ بخاری شریف، باب لا تقض الحائض المصلوۃ، حدیث نمبر 310، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امام اوزاعی نے کہا ہے: ہمارے پاس ایک عورت صبح کے وقت حائضہ ہوتی ہے اور شام کے وقت پاک ہو جاتی ہے۔ حیض کی اکثر اور اقل مدت، طہر کی اقل مدت، احتیاط اور اس کی حجت کے بارے میں ہم نے اس باب میں وہی کچھ ذکر کیا ہے جسے علماء نے اپنایا ہے۔

پس المقتبس فی شرح مؤطا مالک بن انس میں ہے کہ اگر کسی عورت کو پہلی بار حیض آئے تو امام شافعی کے قول کے مطابق جو خون وہ پہلی بار دیکھے گی وہ پندرہ دن تک بیٹھی رہے گی پھر وہ غسل کرے گی اور چودہ دن کی نماز لوٹائے گی۔ اور امام مالک نے کہا ہے: وہ نماز قضا نہیں کرے گی اور اس کے خاوند کو اس سے روکا جائے گا۔ علی بن زیاد نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی مقدار بیٹھی رہے گی اور یہی قول حضرت عطا اور ثوری وغیرہ کا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ ایک دن اور ایک رات بیٹھی رہے گی، پھر وہ غسل کرے گی اور نماز پڑھے گی اور اس کا خاوند اس کے پاس نہ آئے گا۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما نے کہا ہے: وہ دس دن نماز چھوڑے رکھے گی۔ پھر غسل کرے گی اور بیس دن تک نماز پڑھتی رہے گی، پھر بیس دنوں کے بعد دس دن کے لئے نماز چھوڑ دے گی، پس اس کی یہی حالت جاری رہے گی یہاں تک کہ اس سے خون ختم ہو جائے۔ رہی وہ عورت جس کے دن معلوم ہوں تو وہ ایام معلومہ کے مطابق تین دنوں تک احتیاط کرے گی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: جب تک وہ پندرہ دنوں سے تجاوز نہ کرے۔ امام شافعی نے کہا ہے: جب اس کے دن گزر جائیں تو بغیر کسی احتیاط کے وہ غسل کرے گی۔

خون میں سے دوسرا دم نفاس ہے جو ولادت کے وقت ظاہر ہوتا ہے: علماء کے نزدیک اس کے لئے بھی معلوم حد ہے اور اس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ وہ دو مہینے ہیں۔ یہی امام مالک کا قول ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ چالیس دن ہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں۔

اور اس سے طہارت اس کے ختم ہونے کے وقت حاصل ہوتی ہے اور اس کا غسل غسل جنابت کی طرح ہے۔ قاضی ابو محمد عبد الوہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے: حیض اور نفاس کا خون گیارہ چیزوں سے روکتا ہے اور وہ نماز کا واجب ہونا، اسے پڑھنا، صحیح ہونا، روزہ رکھنا نہ کہ اس کا واجب ہونا (یعنی روزے کا وجوب برقرار رہتا ہے لیکن اسے عمل رکھنا مؤخر ہو جاتا ہے) اور فرق کا فائدہ یہ ہے کہ روزے کی قضا لازم ہے اور نماز کی قضا لازم نہیں۔ فرج اور اس کے سوا میں جماع کرنا، عدت، طلاق، طواف، قرآن کریم کو مس کرنا، مسجد میں داخل ہونا، اس میں اعتکاف کرنا اور قرآن کی قراءت میں دو روایتیں ہیں۔

اور تیسری قسم کا خون وہ ہے جو نہ عورتوں کی عادت ہے اور نہ ان کی طبع اور خلقت میں داخل ہے۔ بلاشبہ یہ ایک رگ ہے جو کٹ جاتی ہے اور اس سے سرخ رنگ کا خون بہتا ہے اور یہ خون منقطع نہیں ہوتا مگر تبھی جبکہ وہ تندرست اور مندمل ہو جائے اور اس کا حکم یہ ہے کہ عورت اس کی موجودگی میں بھی پاک ہوتی ہے اور یہ اس کے لئے نماز، روزے سے مانع نہیں ہوتا۔ اس پر

علماء کا اجماع ہے اور آثار مرفوعہ کا اتفاق ہے بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ یہ رگ کا خون ہے، خون حیض نہیں ہے۔

امام مالک (1) نے ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: فاطمہ بنت ابی حبیش نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں پاک نہیں ہوتی! کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلاشبہ وہ رگ (کا خون) ہے، حیض نہیں ہے۔ جب تجھے حیض آئے تو نماز چھوڑ دے اور جب اس کی مقدار (دن) گزر جائے تو تو اپنے آپ سے خون دھو ڈال اور نماز پڑھ لے۔“ یہ حدیث اپنے صحیح ہونے اور اپنے الفاظ قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ حائضہ اور مستحاضہ کے احکام تفصیل سے بیان کرتی ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں یہ حدیث ان سے زیادہ صحیح ہے اور یہ حدیث اس کا رد کرتی ہے جو عقبہ بن عامر اور مکحول سے مروی ہے کہ حیض والی عورت ہر نماز کے وقت غسل کرے گی اور وضو کرے گی اور بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوگی۔ اور اس میں ہے کہ حائضہ عورت نماز نہیں پڑھے گی اور اس پر تمام علماء کا اجماع ہے سوائے خوارج کے ایک گروہ کے کہ وہ کہتے ہیں: حیض والی عورت پر نماز ہے۔ اور اس حدیث میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ مستحاضہ عورت پر سوائے اس غسل کے جو وہ انقطاع حیض کے وقت کرتی ہے اور کوئی غسل لازم نہیں، اگر اس کے علاوہ بھی غسل اس پر لازم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے اسے حکم ارشاد فرمادیتے اور اس میں ان کے قول کا بھی رد ہے جن کا خیال ہے کہ اس پر ہر نماز کے لئے غسل لازم ہے اور ان کے قول کا بھی جن کا خیال یہ ہے کہ وہ دن کی دو نمازوں کو ایک غسل کے ساتھ جمع کر لے اور رات کی دو نمازوں کے لئے ایک غسل کر لے اور وہ صبح کی نماز کے لئے علیحدہ غسل کرے اور ان کے قول کا جنہوں نے کہا: وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے کسی شے کا حکم اسے ارشاد نہیں فرمایا۔ اور اس میں اس کے قول کا بھی رد ہے جس نے انتظار و احتیاط کی بات کی ہے۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (فاطمہ کو) یہ حکم دیا کہ جب تجھے یقین ہو جائے کہ حیض ختم ہو چکا ہے تو تو غسل کر لے اور نماز پڑھ لے، آپ نے اسے یہ حکم نہیں دیا کہ وہ حیض آنے یا نہ آنے کے انتظار میں تین دن تک نماز چھوڑے رکھے اور احتیاط نماز پڑھنے میں ہوتی ہے نہ کہ اسے چھوڑنے میں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قول تعالیٰ: قُلْ هُوَ أَذًى، یعنی یہ وہ شے ہے جس کے سبب عورت اور اس کے سوا مرد کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے یعنی خون حیض کی بدبو کے سبب۔ اور الأذى قذر اور نجاست سے کنایہ ہے۔ اور اس کا اطلاق قول مکروہ پر بھی ہوتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَا تَبْغُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذًى (البقرہ: 264) (مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر) یعنی اس مکروہ اور ناپسندیدہ قول کے ساتھ جو تم اسے سناتے ہو اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَادْعُ أَزْوَاجَهُمْ (الاحزاب: 48) (اور پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی۔) یعنی آپ منافقین کی اذیت رسانی کی پرواہ

نہ کریں آپ انہیں جزانہ دیں مگر یہ کہ ان میں امیر بنادیں۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: وَأَمِيطُوا عَنْهُ الْأَذَى (1) اور اس سے اذیت کو دور کرو۔ اس میں الاذی سے مراد وہ بال ہیں جو پیدائش کے وقت بچے کے سر پر ہوتے ہیں اور ساتویں دن اس سے مونڈ دیے جاتے ہیں اور یہی عقیقہ ہے اور حدیث ایمان میں ہے: وَادْنَاهَا بِامَاطَةِ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دو۔ یعنی کانٹے، پتھر اور ان کی طرح کی دیگر چیزیں جن سے گزرنے والا کسی تکلیف میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور رب کریم کا ارشاد: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَقَطِرٍ (النساء: 102) اس کا ذکر آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ دم استحاضہ بہنے کے سبب جنہوں نے مستحاضہ عورت سے وطی کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے استدلال کیا اور کہا: ہر خون تکلیف دہ (نجس) ہے، اسے کپڑے اور بدن سے دھونا واجب ہوتا ہے، پس دم حیض اور استحاضہ کے درمیان مباشرت کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ مکمل طور پر ناپاکی اور نجاست ہے۔ اور رہی نماز تو اس کی رخصت کے بارے حدیث طیبہ موجود ہے جیسا کہ سلس البول کی بیماری کی حالت میں نماز پڑھی جاسکتی ہے، یہ قول ابراہیم نخعی، سلیمان بن یسار، حکم بن عیینہ، عامر شعبی، ابن سیرین اور زہری کا ہے اور حسن کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اور یہی حضرت عائشہ صدیقہ بنتیہ کا قول ہے کہ مستحاضہ کا خاوند اس کے ساتھ صحبت نہیں کرے گا اور اسی طرح ابن علیہ اور مغیرہ بن عبد الرحمن نے کہا ہے اور یہ اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ میں سے اعلیٰ ترین افراد میں سے ہیں اور ابو مصعب نے بھی یہی کہا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جاتا ہے۔

اور جمہور علماء نے کہا ہے: مستحاضہ عورت روزہ رکھ سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے، طواف کعبہ کر سکتی ہے اور قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے اور اس کا خاوند بھی اس کے ساتھ مباشرت کر سکتا ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: اہل فقہ و علم نے اسی کا حکم دیا ہے، اگرچہ اس کا خون بہت زیادہ بھی ہو اور آپ سے اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے۔

اور امام احمد فرماتے ہیں: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ خاوند اس سے وطی نہ کرے، البتہ اگر عرصہ طویل ہو جائے تو پھر وطی کر سکتا ہے۔

اور مستحاضہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کا خاوند اس کے ساتھ جماع کرے اگرچہ اس کا خون اس کی ایڑیوں پر بہہ رہا ہو۔

اور امام مالک نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ وہ رگ کا خون ہے وہ حیض نہیں ہے۔“ پس جب وہ حیض نہیں ہے تو پھر کون سی شے ہے جو خاوند کو اس کے پاس جانے سے روک سکتی ہے حالانکہ وہ نماز بھی پڑھ رہی ہے۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مستحاضہ کے خون کے بارے میں یہ حکم فرمادیا ہے کہ وہ نماز کے مانع نہیں ہے اور وہ عورت اس حالت میں حائضہ کی عبادت کے سوا بھی عبادت کر سکتی ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس کے لئے حیض کے

1۔ بخاری شریف، باب اماطة الاذی عن الصبی فی العقیقة، حدیث نمبر 5049، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

احکام میں سے کسی شے کا حکم نہ لگایا جائے مگر وہی جس پر اجماع ہے (یعنی) تمام خونوں کی طرح اسے بھی دھونا لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: **فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ** یعنی تم زمانہ حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو، یہ تب ہے جبکہ حیض کو مصدر بنایا جائے یا معنی یہ ہے کہ تم عورتوں سے علیحدہ رہو محل حیض میں جبکہ حیض کو اسم بنایا جائے اور اس نہی کا مقصود مجامعت ترک کرنا ہے۔

حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت کے بارے میں اور جو کچھ اس سے مباح سمجھا جاتا ہے اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عبیدہ السلمانی سے مروی ہے کہ یہ واجب ہے کہ آدمی اپنی بیوی کے بستر سے علیحدہ رہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو۔ یہ قول شاذ ہے اور علماء کے قول سے خارج ہے۔ اگرچہ عموم آیت اس کا تقاضا کرتی ہے لیکن سنت ثابتہ اس کے خلاف ہے اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ حضرت ام میمونہ رضی اللہ عنہا اس پر آگاہ ہوئیں تو آپ نے فرمایا: کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کر رہے ہو۔

اور امام مالک، شافعی، اوزاعی، ابو حنیفہ، ابو یوسف اور علماء کی ایک بہت بڑی جماعت رحمہم نے کہا ہے: مرد کے لئے عورت کے اس حصے سے استمتاع جائز ہے جو ازار کے اوپر ہے، کیونکہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا تو آپ نے اسے ارشاد فرمایا: (سائل نے کہا) کیا حالت حیض میں میری بیوی میرے لئے حلال ہوتی ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: چاہیے کہ وہ اپنی ازار (چادر) مضبوطی کے ساتھ باندھ لے تو پھر اس کے اوپر سے وہ تیرے لئے مباح ہے۔ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حالت حیض میں تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا: اپنی چادر کو مضبوط باندھ لے پھر اپنے بستر کی طرف لوٹ آ۔ (1)

اور امام ثوری، محمد بن حسن اور بعض اصحاب شافعی نے کہا ہے کہ وہ محل خون سے اجتناب کرے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ”تم ہر عمل کرو سوائے وطی کے۔“ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور یہی داؤد کا قول ہے اور امام شافعی کے قول سے یہی صحیح ہے۔

ابو معشر نے ابراہیم کے واسطے سے مسروق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا میری زوجہ میرے لئے حلال ہوتی ہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو؟ تو انہوں نے فرمایا: سوائے فرج کے ہر شے حلال ہے۔ علماء نے کہا ہے: حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت (کا مباح ہونا) اس حال میں کہ وہ چادر باندھے ہوئے ہو احتیاط اور کوریجہ و سبب کو ختم کرنے کے لئے ہے، کیونکہ اگر اس کی رانوں سے استمتاع مباح ہو تو یہ محل خون (فرج) تک پہنچنے کا ذریعہ اور سبب ہے جو کہ بالاجماع حرام ہے، پس احتیاطاً اس کا حکم دیا گیا ہے اور فی نفسہ محل دم کو حرام قرار دیا گیا اور آثار کے معانی اس کے ساتھ متفق ہیں، کوئی تضاد نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 8۔ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو حالت حیض میں عورت کے ساتھ مجامعت کرتا ہے کہ اس پر

کیا ہوگا؟

حضرت امام مالک، شافعی اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور مزید اس پر کوئی شے لازم نہیں، یہی قول ربیعہ اور یحییٰ بن سعید کا ہے اور اسی طرح داؤد نے بھی کہا ہے اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ نصف دینار صدقہ کرے گا۔ (1)

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عبد الحمید کی حدیث کتنی اچھی ہے کہ وہ مقسم کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے گا۔ اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: اسی طرح صحیح روایت ہے۔ فرمایا: دینار یا نصف دینار۔ علامہ طبری نے اسے مستحب قرار دیا ہے، پس اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی اور بغداد میں امام شافعی کا یہی قول ہے۔

اور محدثین میں سے ایک جماعت نے کہا ہے: اگر اس نے خون کی حالت میں وطمی کی تو اس پر دینار ہوگا اور اگر اس نے خون کے انقطاع کی حالت میں وطمی کی تو اس کے لئے نصف دینار ہوگا۔ اور امام اوزاعی نے کہا ہے: جس نے اپنی بیوی کے ساتھ حالت حیض میں وطمی کی تو وہ ایک دینار کے دو خمس صدقہ کرے۔ ان تمام کی اسناد سنن ابی داؤد اور دارقطنی وغیرہ میں ہیں۔

اور کتاب ترمذی (2) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: ”جب خون سرخ ہو تو ایک دینار ہوگا اور خون کارنگ زرد ہو تو نصف دینار ہوگا۔“

ابو عمر نے کہا ہے: ان کی دلیل جنہوں نے استغفار اور توبہ کے سوا ایسے آدمی پر کوئی کفارہ واجب نہیں کیا اس حدیث کا مضطرب ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی مثل حدیث حجت نہیں بن سکتی، کیونکہ فی الاصل ہر کوئی ذمہ داری سے بری ہے اور یہ واجب نہیں کہ اس میں کسی مسکین اور کسی دوسرے کے لئے کوئی شے ثابت ہو مگر کسی دلیل کے ساتھ جس میں نہ کوئی رد ہو اور نہ اس پر طعن ہو اور یہ اس مسئلہ میں معدوم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرُبُوا هُنَّ حَتَّى يَظْهَرَنَّ۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: میں نے علامہ الشاشی سے مجلس النظر میں سنا ہے وہ فرماتے ہیں: جب کہا جائے لَا تَقْرُبْ یعنی راء کے فتح کے ساتھ تو اس کا معنی ہے تو کام میں مشغول نہ ہو اور اگر راء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے تو اس کے قریب نہ ہو۔

نافع، ابو عمرو، ابن کثیر، ابن عامر اور حضرت عاصم رحمہ اللہ علیہم نے اس روایت میں جو حفص نے ان سے نقل کی ہے يَظْهَرَنَّ طا کے سکون اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور حمزہ، کسائی اور حضرت عاصم رحمہ اللہ علیہم نے ابو بکر اور مفضل کی روایت میں يَظْهَرَنَّ یعنی طا اور ہا دونوں کو شد اور فتح کے

1۔ ابو داؤد، باب فی کفارة من اتى حائضا، حدیث نمبر 1853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی الکفارة فی ذالک، حدیث نمبر 127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما کے مصحف میں يَتَطَهَّرْنَ ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وَلَا تَقْرَبُوا النِّسَاءَ فِي مَحِيضِهِنَّ وَاعْتَزِلُوهُنَّ حَتَّى يَتَطَهَّرْنَ ہے۔ اور علامہ طبری نے طا کی تشدید والی قراءت کو ترجیح دی ہے۔ اور کہا ہے: یہ بمعنی یغتسلن ہے، کیونکہ اس پر تمام کا اجماع ہے کہ آدمی پر حرام ہے کہ وہ اپنی زوجہ کا خون ختم ہونے کے بعد اس کے پاک ہونے سے پہلے اس کے قبیح جائے۔ انہوں نے کہا: بلاشبہ طہر میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے، تو ایک گروہ نے کہا ہے کہ طہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: کہ اس سے مراد نماز کے وضو کی طرح وضو کرنا ہے اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سے مراد شرمگاہ کو دھونا ہے۔ اور یہ اسے اپنے خاوند کے لئے حلال کر دے گا اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا۔

اور ابوعلی فارسی نے طا کی تخفیف والی قراءت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ثلاثی ہے اور طمٹ کی ضد ہے اور یہ بھی ثلاثی ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَإِذَا تَطَهَّرْنَ، یعنی جب وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کر لیں، یہی موقف امام مالک اور جمہور علماء کا ہے اور بلاشبہ وہ طہارت جس کے سبب حائضہ عورت سے جماع حلال ہو جاتا ہے جب اس کا خون ختم ہو جائے وہ اس کا پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرنا ہے جیسا کہ جنبی کی طہارت (پانی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے) اور تیمم یا کوئی اور اس کی جانب سے جائز نہ ہوگا، یہی امام مالک، امام شافعی، طبری، محمد بن مسلمہ، اہل مدینہ اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی کہا ہے۔ اور یحییٰ بن بکیر اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: جب حیض والی عورت پاک ہو جائے (یعنی اس کا خون ختم ہو جائے) اور اس نے ایسی جگہ تیمم کر لیا جہاں پانی نہ ہو تو وہ اپنے خاوند کے لئے حلال ہو گئی اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا ہو۔

حضرت مجاہد، عکرمہ اور طاؤس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: خون کا منقطع ہونا ہی اسے زوج کے لئے حلال کر دیتا ہے، لیکن اسے وضو کر لینا چاہئے۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اگر اس کا خون دس دن گزرنے کے بعد ختم ہوا تو آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ غسل سے پہلے اس سے وطی کر لے اور اگر خون کا انقطاع دس دنوں سے پہلے ہو گیا تو پھر جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے یا اس پر نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کی کوئی وجہ اور علت نہیں، تحقیق انہوں نے حائضہ عورت کے لئے اس کا خون منقطع ہونے کے بعد اس طرح فیصلہ کیا ہے جو عدت میں محبوس ہو۔ اور انہوں نے اس کے خاوند کو کہا: عورت کی طرف رجوع کرنا جائز ہے جب تک وہ تیسرے حیض سے غسل نہ کر لے، پس ان کے اس قول کے قیاس کی بنا پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے وطی کی جائے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے یہ اہل مدینہ کے ساتھ موافقت ہے۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس میں حکم کو دو شرطوں پر معلق کیا ہے: ان میں سے ایک خون کا منقطع ہونا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتَّى يَطْهُرْنَ اور دوسرا پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَإِذَا تَطَهَّرْنَ یعنی جب وہ پانی کے ساتھ غسل کر لیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَاهْتَكُوا الْيُسْبَى حَتَّى إِذَا هَلَكُوا لِلنَّكَاحِ الْآيَةِ (النساء: 6) (اور آزماتے رہو تیسیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح کی عمر کو)۔ اس میں بھی حکم دو شرطوں پر معلق ہے اور حکم

مال دینے کا جواز ہے۔ دو شرطوں میں سے ایک مکلف کا نکاح کی عمر کو پہنچنا ہے اور دوسرا دانائی کا محسوس کرنا ہے، اسی طرح مطلقہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ (البقرہ: 230) (تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) پھر عسیدہ کی شرط (مراد جماع ہے) کے بارے حدیث پاک موجود ہے۔ پس حلالہ بھی مجموعی طور پر دو امور پر موقوف ہوا اور وہ نکاح کا انعقاد اور وطی کا پایا جانا ہے۔ (1)

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: بے شک آیت کا معنی ہے: شرط میں غایت وہی ہے جو اس سے پہلی غایت میں مذکور ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتَّى يَظْهَرَنَّ لَكَ بِعَيْنِكَ يَظْهَرَنَّ مَشْدَدُكَ مَعْنَى فِيهِ لَيْكِنْ اللہ تعالیٰ نے آیت میں دو لغتوں کو جمع کر دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فِيهِ رَجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّطَفَّرُوا مِنَ اللَّهِ يُحِبُّ الْمُظْهِرِينَ (التوبہ) (اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے۔) کمیت نے کہا ہے:

وَمَا كَانَتْ الْإِنصَارُ فِيهَا أَذْلَةً وَلَا غُيْبًا فِيهَا إِذَا النَّاسُ غُيِبُوا

اور یہ بھی کہ دو قرأتیں دو آیتوں کی طرح ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان دونوں کے مطابق عمل کیا جائے۔ اور ہم ان دونوں میں سے ہر ایک کو علیحدہ معنی پر محمول کرتے ہیں۔ پس ہم مخفف کو اس معنی پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون دس دنوں سے کم میں ختم ہو جائے، تو ہم اس کے ساتھ وطی کی اجازت نہیں دیتے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے، کیونکہ آدمی خون کے دوبارہ لوٹ آنے سے محفوظ اور امن میں نہیں ہوتا اور ہم دوسری قراءت کو اس معنی پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون اکثر مدت پر جا کر ختم ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ وطی جائز ہوتی ہے اگرچہ وہ غسل نہ بھی کرے۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: ان کے دلائل میں سے یہ قوی ترین ہے۔ پس پہلے (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ وہ فصحاء کے کلام میں سے نہیں ہے اور نہ ہی بلغاء کی زبان ہے، کیونکہ وہ تعداد میں تکرار کا تقاضا کرتا ہے اور جب لفظ کو ایک الگ فائدہ پر محمول کرنا ممکن ہو تو اسے لوگوں کے کلام میں تکرار پر محمول نہیں کیا جاتا، تو پھر علیم حکیم رب کریم کے کلام میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور دوسرے (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ معنی پر محمول ہے، تو پھر ان پر لازم ہے کہ جب خون منقطع ہو جائے تو وہ اس کے لئے غسل سے پہلے رجعت کی صورت میں حیض کا حکم نہ لگائیں اور وہ اس طرح نہیں کہتے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور یہ عورت جب حائضہ ہے تو حیض والی عورت کے ساتھ وطی کرنا بالاتفاق جائز نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی جو انہوں نے کہا ہے وہ اکثر مدت پر انقطاع دم اباحت وطی کا تقاضا کرتا ہے اور جو ہم نے کہا ہے وہ ممنوع ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور جب ایسی دو دلیلوں کے درمیان تعارض آجائے جن میں سے ایک نہی کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری اباحت کا تو ان دونوں کے باعث اور سب کو غلبہ دیا جائے گا (پس) نہی کے سبب کو غلبہ دیا جائے گا، جیسا کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے ملک یمین کی حیثیت سے دو بہنوں کو جمع کرنے کے بارے میں کہا ہے۔ ایک آیت نے دونوں کو حلال قرار دیا ہے

1۔ بخاری شریف، باب من اجاز طلاق الثلاث لقول الله تعالى الطلاق مرتان فامسك به معروف أو تسريح، حدیث نمبر 4856، ضیاء القرآن

اور دوسری نے ذنوں کو حرام قرار دیا ہے اور تحریم اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علماء نے کتابیہ عورت کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا اسے غسل کرنے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں، تو حضرت امام مالک نے ابن قاسم کی روایت میں کیا ہے: ہاں، تاکہ خاوند کے لئے اس کے ساتھ وطی حلال ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ ۖ فَأَنتُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ (البقرہ: 228) اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر) اور وہ حیض اور حمل ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب صرف مومنہ عورتوں کو کیا ہے اور فرمایا ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ: 252) (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) اور اسی طرح محمود بن عبدالحکم بھی کہتے ہیں۔

اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اسے حیض کے سبب غسل پر مجبور نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کا اعتقاد ہی نہیں رکھتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَجِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ ۚ إِنَّ كُنَّ يَوْمَئِذٍ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (البقرہ: 228) (اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر) اور وہ حیض اور حمل ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب صرف مومنہ عورتوں کو کیا ہے اور فرمایا ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ: 252) (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) اور اسی طرح محمود بن عبدالحکم بھی کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 12۔ حائضہ عورت کے غسل کا طریقہ وہی ہے جو اس کے غسل جنابت کا طریقہ ہے، اس پر اس میں اپنے بالوں کو کھولنا لازم نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! سنی سنائیہم میں اپنے سر کی مینڈھیاں باندھے ہوئے ہوں کیا میں غسل جنابت کے لئے انہیں کھول دوں گی؟ آپ سنی سنائیہم نے فرمایا: نہیں بلکہ تیرے لئے اپنے سر پر تین بار پانی بہانا کافی ہوگا پھر تو اپنے سارے بدن پر پانی بہائے گی تو تو پاک ہو جائے گی۔ اور ایک روایت میں ہے: کیا میں (1) انہیں حیض اور جنابت (کے غسل) کے لئے کھولوں گی؟ تو آپ سنی سنائیہم نے فرمایا: ”نہیں“۔ ابو داؤد نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے: ”اور تو ہر چلو ڈالتے وقت اپنے سر کو خوب ملے گی۔“

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: فَأَتَوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَ كُمْ اللَّهُ، یعنی اور تم ان سے جماع کرو۔ یہ امر اباحت کے لئے ہے اور اتیان وطی سے کنایہ ہے اور یہ امر اسے مزید مضبوط اور قوی کرتا ہے جو کچھ ہم نے کہا ہے کہ تطہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صیغہ امر یقیناً اکمل وجہ پر ہی واقع ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور مِنْ بَعْضِ نِي ہے، یعنی تم اس محل میں جماع کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے اور وہ قبل (فرج) ہے اور اس کی تلیہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ (فاطر: 40) یعنی فی الارض (مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے) اور یہ ارشاد بھی ہے: إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ (الجمعة: 9) یعنی فی الجمعة (جب تمہیں) بلایا جائے نماز کی طرف جمعہ کے دن)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے یعنی اس وجہ سے جس میں تمہیں اجازت دی گئی ہے، یعنی جب تم روزے، احرام اور

اعتکاف کی حالت میں نہ ہو۔ اصرم نے یہی کہا ہے۔ اور ابن عباس اور ابو رزین نے کہا ہے: (معنی ہے) طہر کی جانب سے نہ کہ حیض کی جانب سے اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور محمد بن حنفیہ نے کہا ہے: معنی ہے من قبل الحلال لا من قبل النبی یعنی حلال طریقے سے نہ کہ زنا کے طریقے سے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ اس میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ مراد ہے گناہوں اور شرک سے توبہ کرنے والے اور المتطہرون یعنی جنابت اور حدث کے لاحق ہونے کے وقت پانی سے طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنے والے۔ حضرت عطاء وغیرہ نے یہی کہا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا: التوابین سے مراد گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کرنے سے توبہ کرنے والے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف دیکھا ہے جو لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں بطور حکایت ہے: اَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ (الاعراف) (باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ توبہ کرنے والے ہیں۔)

اور یہ بھی قول ہے: المتطہرون وہ ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیے اور اگر کہا جائے کہ جس نے گناہ کیے ہیں اس کا ذکر اس پر مقدم کیسے ہو سکتا ہے جس نے گناہ نہیں کیے، تو جواب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر پہلے کیا تاکہ توبہ کرنے والا رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہو جائے اور متطہرا اپنی ذات کے بارے میں عجب اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو جائے، جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر کیا ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ (فاطر: 32) اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نِسَاؤُكُمْ حَرْثُكُمْ ۖ فَاَتُوا حَرْثَكُمْ اَنۡتُمْ اَنۡتُمْ ۚ وَتَقُوا اللّٰهَ ۚ
اَعْلَمُوۡا اَنَّكُمْ مَّلٰٓئِكَةٌ ۚ وَبَشَرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

”تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں تو تم آؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو اور پہلے پہلے کر لو اپنی بھلائی کے کام اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ تم ملنے والے ہو اس سے اور (اے حبیب) خوشخبری دو مومنوں کو۔“
اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: نِسَاؤُكُمْ حَرْثُكُمْ ۚ اَتُوا حَرْثَكُمْ اَنۡتُمْ اَنۡتُمْ ۚ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (1) اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ فرمایا: یہودی کہتے تھے جب کوئی آدمی اپنی عورت کے ساتھ اس کی دبر کی جانب سے اس کی قبل (فرج) میں وطی کرتا ہے تو بچہ بھینکا ہوتا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: نِسَاؤُكُمْ حَرْثُكُمْ ۚ فَاَتُوا حَرْثَكُمْ اَنۡتُمْ اَنۡتُمْ اور زہری سے ایک روایت میں یہ زائد ہے: اگر چاہے تو اسے اوندھا لٹائے اور اگر چاہے تو سیدھا لٹائے مگر وطی ایک سوراخ میں ہو اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صمام کا لفظ صمام سین کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ترمذی نے یہی کہا ہے۔ (1)

اور امام بخاری نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے (2) کہ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب قرآن کریم پڑھتے تھے تو گفتگو نہ کرتے تھے یہاں تک کہ قراءت سے فارغ ہو جاتے۔ پس ایک دن میں قرآن کریم اٹھائے ہوئے تھا اور انہوں نے سورۃ البقرہ پڑھی یہاں تک کہ اس مقام (اس آیت) پر پہنچ کر رک گئے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کیونکر یہ آیت نازل کی گئی ہے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا: یہ اس میں نازل ہوئی ہے، پھر آپ آگے پڑھنے لگے۔

اور عبدالصمد نے بیان کیا ہے کہ میرے باپ نے مجھے بتایا کہ مجھے ایوب نے نافع کے واسطے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے: فَأَتُوا حَرْثَكُمْ أَلْفِي شَيْئَكُمْ کے بارے انہوں نے کہا: یا تیہانی۔ یعنی اس میں مجرور مخذوف ہے۔ حمیدی نے کہا ہے: وہ الفرج ہے (3) یعنی وہ اس کے ساتھ فرج میں جماع کرے۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو وہم ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، بلاشبہ یہ انصار کا ایک قبیلہ تھا، وہ بت پرست تھے اور اس قبیلے کے ساتھ یہودی بھی تھے اور وہ اہل کتاب ہیں۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر علم میں فضیلت دیتے تھے اور وہ بہت سے افعال میں ان کی اقتدا کرتے تھے اور اہل کتاب کے امور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ عورتوں کے ساتھ ایک طرف پر جماع کرتے تھے اور یہ عورت کے لئے زیادہ باعث ستر ہوتا تھا۔ پس انصار کے اس قبیلے نے ان کے افعال میں سے اس فعل کو بھی اختیار کر لیا اور یہ قبیلہ قریش میں سے تھا جو عورتوں کو گدی کے بل لٹا کر ان سے وطی کرتے تھے اور ان سے لذت حاصل کرتے تھے، کبھی سامنے کی جانب سے، کبھی پیچھے کی جانب سے اور کبھی چپ لٹا کر، پس جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی نے انصار کی ایک عورت سے شادی کی اور وہ اس کے ساتھ وہی کچھ کرنے لگا، تو اس نے اسے ناپسند کیا اور ایسا کرنے سے روکا اور کہا: ہمارے ہاں عورت کے ساتھ ایک طرف سے جماع کیا جاتا ہے پس تو بھی اسی طرح کرو ورنہ مجھ سے دور ہو جا، یہاں تک کہ ان دونوں کا معاملہ بڑھ گیا اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَأَتُوا حَرْثَكُمْ أَلْفِي شَيْئَكُمْ یعنی سامنے کی جانب سے، پیچھے کی جانب سے اور چپ لٹنے کی حالت میں (محل حرث میں جماع کرو۔) اور یہی محل ولد ہے۔ (4)

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: کس شے نے تمہیں ہلاک کیا ہے؟ عرض کی: آج رات میں نے اپنے پالان (مراد بیوی ہے) کو الٹا کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ راوی نے بیان کیا: پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ آیت وحی فرمائی:

1۔ سنن ترمذی، باب سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2904، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4163، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی جامع النکاح، حدیث نمبر 1849، ایضاً

نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَاتُوا حَرْثَكُمْ أَلْفِي شَيْئُكُمْ، اقبل و ادبر و اتق الدبر و الحیضة (تو سامنے کی جانب سے اور پیچھے کی جانب سے وطی کر اور دبر اور حالت حیض میں وطی کرنے سے بچ۔) فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (1)

اور نسائی نے ابوالنضر سے بیان کیا ہے کہ اس نے نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: تمہارے بارے میں اکثر قول ہے کہ تم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کرتے ہو کہ انہوں نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کیا جا سکتا ہے۔ تو حضرت نافع نے فرمایا: تحقیق انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا: البتہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ معاملہ کیسے تھا۔ ایک دن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن کریم مجھے دیا اور میں ان کے پاس تھا یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچے۔ نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ۔ فرمایا: نافع! کیا تو جانتا ہے اس آیت کا حکم کیا ہے؟ بے شک ہم گروہ قریش عورتوں کو منہ کے بل اوندھا لٹاتے تھے، جب ہم مدینہ منورہ میں آئے اور ہم نے انصار کی عورتوں سے نکاح کیے تو ہم نے ان سے وہی کرنا چاہا جو ہم اپنی عورتوں سے کرتے تھے تو ان عورتوں نے اسے ناپسند کیا اور اسے بڑا معاملہ قرار دیا، کیونکہ انصار کی عورتوں کے ساتھ ان کے پہلوؤں کے بل جماع کیا جاتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَاتُوا حَرْثَكُمْ أَلْفِي شَيْئُكُمْ

مسئلہ نمبر 2۔ یہ احادیث تمام کیفیات اور حالت کی اباحت میں نص ہیں بشرطیکہ وطی محل حرث میں ہو، یعنی جس کیفیت میں تم چاہو پیچھے کی جانب سے اور آگے کی جانب سے وہ سینے کے بل لیٹی ہوئی ہو یا چپت یا پہلو کے بل۔ اور رہا محل حرث کے سوا کسی جگہ میں وطی کرنا تو یہ نہ مباح رہا ہے اور نہ اسے مباح کیا جائے گا اور حرث کا ذکر اس پر دلالت کرتا ہے کہ محل حرث کے سوا میں وطی کرنا حرام ہے۔ اور حرث یہ تشبیہ ہے، کیونکہ ان میں بھی بیج بویا جاتا ہے اور لفظ حرث واضح کرتا ہے کہ اباحت صرف اور صرف فرج میں واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ وہی بیج ڈالنے کا محل ہے اور ثعلب نے کہا ہے:

انما الارحام ارض دن لنا محترثات

بے شک ارحام زمینیں ہیں ہمارے لئے کھیتیاں بنائی گئی ہیں۔

فعلینا الزرع فیہا و علی اللہ النبات

پس ہمارے اوپر ان میں بیج ڈالنا ہے اور اگانا (یعنی اولاد عطا کرنا) اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔

پس عورت کی فرج زمین کی طرح ہے اور نطفہ بیج کی مانند ہے اور بچہ نباتات کی طرح ہے۔ پس الحرث بمعنی المحترث ہے اور الحرث کو واحد لایا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ صَوْمٌ، وَقَوْمٌ صَوْمٌ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: أَلْفِي شَيْئُكُمْ جمہور صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ فتویٰ کے نزدیک اس کا معنی ہے: جس طرح تم چاہو سامنے کی جانب سے اور پشت کی جانب سے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور آئی سوال کے لئے اور کسی کام کی خبر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی کئی جہتیں ہیں اور یہ لغوی اعتبار سے کیف، این اور متی سے عام ہے۔ یہی انی میں عربی استعمال ہے اور لوگوں نے اس آیت میں انہی الفاظ کے ساتھ انی کی تفسیر بیان کی ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب من سورة البقرة، حدیث نمبر 2906، ایضاً

اور سیہویہ نے کیف اور این دونوں کے ساتھ اکٹھی اس کی تفسیر بیان کی ہے۔

اور ایک فرقہ نے این کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے اور یہ موقف اپنایا ہے کہ در میں وطی مباح ہے اور جن کی طرف یہ قول منسوب ہے وہ حضرت سعید بن مسیب، حضرت نافع، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت محمد بن کعب قرظی اور عبد الملک بن ماجشون رحمہ اللہ ہیں اور اسے امام مالک سے ان کی جس کتاب سے بیان کیا گیا ہے اس کا نام کتاب السہ ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ماہر اصحاب اور ان کے مشائخ اس کتاب کا انکار کرتے ہیں اور امام مالک کا مقام و مرتبہ اس سے کہیں بلند اور اعلیٰ ہے کہ ان کے لئے کتاب السہ ہو اور یہ قول العتبیہ میں ہے۔

اور علامہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ ابن شعبان نے اس قول کے جواز کو صحابہ کرام اور تابعین میں سے بہت بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بہت سی روایات کتاب جماع النسوان و احکام القرآن میں منسوب کی ہیں اور الکلیا الطبری نے کہا ہے: محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے کہ وہ اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے اور وہ اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے تھے: **اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعُلَمٰیْنَ** ﴿۱۰﴾ **وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ** (الشعراء) (کیا تم بدفعلی کے لئے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں۔) اور فرمایا: تقدیر کلام یہ ہے **تَتْرُکُوْنَ مِثْلَ ذَلِكَ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ** یعنی تم اس کی مثل اپنی بیویاں چھوڑ دیتے ہو، اگر اس کی مثل بیویوں سے مباح نہ ہوتا تو یہ صحیح نہ ہوتا اور اس کی مثل کسی دوسرے محل میں مباح نہیں، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے: تم وہ کرتے ہو اور اس کی مثل مباح کو چھوڑ دیتے ہو۔

الکلیانے کہا: یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: اور تم چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں جن میں تمہاری شہوت کی تسکین ہے اور جماع کی لذت ہے۔ یہ دونوں ایک ساتھ حاصل ہو جاتی ہیں، پس اس معنی پر زجر و تنبیہ جائز ہے، قول باری تعالیٰ: **فَاِذَا تَطَهَّرْتَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰهُ** اس ارشاد گرامی کے ساتھ: **فَاْتُوْا حَزْزَکُمْ** اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ محل جس میں واقع ہونا ہے وہ خاص ہے اور وہ اسی میں مقصور ہے جو محل ولد ہے (یعنی جس محل میں وطی کرنے سے اولاد کا ہونا ممکن ہے وہی محل حرث ہے اور اسی میں جماع جائز ہے تو چونکہ در میں یہ عمل کرنے سے اولاد کا امکان نہیں اس لئے نہ وہ محل حرث ہے اور نہ ہی اس میں وطی مباح ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس مسئلہ میں یہی حق اور صحیح ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے رتقاء میں اختلاف نہیں کیا۔ یہ ایسی عورت ہے جس سے وطی نہیں کی جاسکتی، یہ عیب ہے اس کے سبب اسے رد کیا جاسکتا ہے، مگر وہ روایت جو حضرت عمر بن عبد العزیز سے کئی طرق سے مروی ہے وہ قوی نہیں ہے وہ یہ کہ رتقاء کو نہیں لوٹایا جائے گا اور نہ کسی اور کو، تمام کے تمام فقہاء اس کے خلاف ہیں کیونکہ مسیس (وطی) ہی نکاح کا مقصود ہے اور اس پر ان کے اجماع میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ در محل وطی نہیں ہے اور اگر یہ وطی کا محل ہوتی تو پھر اسے رد نہ کیا جاتا جس کی فرج میں وطی نہ کی جاسکتی ہو۔

اور ان کے اجماع میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ ایسی بانجھ عورت جو بچے نہیں جنتی اسے رد نہیں کیا جائے گا۔ اور اس مسئلہ میں صحیح وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے اور وہ جو امام مالک اور ان کے اصحاب کی طرف منسوب ہے وہ باطل ہے اور وہ اس سے بری الذمہ ہیں، کیونکہ وطی کی اباحت محل حرث کے ساتھ مختص ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **فَاتُوا حَرْثَكُمْ** اور اس لئے بھی کہ بیویوں کو پیدا کرنے میں حکمت نسل کو پھیلانا ہے اور جو اس کا محل نہیں ملک نکاح اسے شامل ہی نہیں ہوتی۔ یہی بات حق ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب نے کہا ہے: ہمارے نزدیک وہ (یعنی دبر میں وطی کرنا) اور ذکر کو ساتھ مس کرنا حکم میں برابر ہیں۔ کیونکہ محل نجاست میں قدر (گندگی) اور اذیت دم حیض کی نسبت زیادہ ہے، پس وہ زیادہ شنیع اور برا ہے اور رہی بول کی تکلیف تو یہ رحم کی تکلیف کے سوا ہے۔

علامہ ابن عربی نے قبس میں کہا ہے کہ ہمیں الشیخ الامام فخر الاسلام ابو بکر محمد بن احمد بن حسین فقیہ وقت اور امام وقت نے کہا: فرج پینتیس چیزوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے اور انہوں نے اپنے ہاتھ پر گن کر بتایا اور کہا: بول کا راستہ تیس کے ماتحت ہے اور ذکر اور فرج کا راستہ وہ ہے جس پر پانچ مشتمل ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرج کو حالت حیض میں عارضی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے تو پھر دبر کو لازمی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا جانا بدرجہ اولیٰ ہے۔

اور امام مالک نے ابن وہب اور علی بن زیاد کو اس وقت کہا جب ان دونوں نے انہیں یہ خبر دی کہ مصر میں لوگ آپ کے بارے میں یہ باتیں کرتے ہیں کہ وہ اسے (دبر میں وطی کو) جائز قرار دیتے ہیں تو آپ نے اس سے نفرت کی (اسے انتہائی ناپسند کیا) اور ناقل کی تکذیب بالفور کی اور فرمایا: انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا ہے، انہوں نے میری تکذیب کی ہے، انہوں نے میری طرف جھوٹی نسبت کی ہے۔ (کذبوا علی تین بار کہا) پھر فرمایا: کیا تم عرب قوم نہیں ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: **نِسَاءُ كُمْ حَرْثُكُمْ** تو کیا اگانے والے محل کے سوا کوئی کھیت ہو سکتا ہے (اور وہ محل فرج ہی ہے)۔

اور جس سے مخالف نے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **آلِیْ شِئْكُمْ** یہ اپنی عمومیت کے اعتبار سے تمام راستوں کو شامل ہے (یعنی قبل اور دبر دونوں کو) تو اس میں ان کے لئے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے کیونکہ جو ہم نے اس کے بارے ذکر کیا ہے اس کے سبب یہ خاص ہو چکا ہے اور ان احادیث کے سبب جو صحیح، حسن اور مشہور ہیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ صحابہ کرام نے مختلف متنوں کے ساتھ روایت کیا ہے وہ تمام کی تمام عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کے حرام ہونے پر دال ہیں۔

انہیں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں، ابو داؤد، نسائی اور ترمذی رحمہم وغیرہم نے روایت کیا ہے اور انہیں ابو الفرج بن جوزی نے ان کی سندوں سمیت ایک جزی میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے **تحريم المحل المكروه** اور ہمارے شیخ ابو العباس نے بھی ایک جزی میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا **اظہار ادبار من اجاز الوطی فی الادبار**۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی وہ حق ہے جس کی اتباع کی گئی ہے اور اس مسئلہ میں صحیح (نظریہ) ہے اور اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھنے والے کو نہیں چاہئے کہ وہ اس مصیبت میں پڑے کیونکہ یہ عالم کی خطا اور لغزش ہے اس کے بعد کہ اس کے بارے میں صحیح روایات موجود ہیں اور ہمیں عالم کی غلطی سے ڈرایا اور محفوظ رکھا گیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف مروی ہے اور جس نے ایسا کیا اس کی تکفیر مروی ہے اور یہی آپ رضی اللہ عنہ کے لائق اور شایان شان ہے۔ اسی طرح حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے جس نے آپ کی طرف سے اس بارے میں بیان کیا، جیسا کہ امام نسائی نے ذکر کیا ہے اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور امام مالک نے اس کا انکار کیا اور اسے بہت بڑا قدم قرار دیا اور جس نے اسے آپ کی طرف منسوب کیا اسے جھوٹا قرار دیا۔ اور الدارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں سعید ابن یسار ابی الحباب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: آپ ان عورتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جن کے ساتھ تمحیض کی جائے؟ آپ نے فرمایا: تمحیض کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا: ”دبر“ تو آپ نے فرمایا: کیا مسلمانوں میں سے بھی کوئی ایسا کرتا ہے۔

اور حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مسند روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ”اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ حق سے حیاء نہیں کرتا تم عورتوں کی دبروں میں وطی نہ کرو۔“ اور اسی کی مثل حضرت علی بن طلحہ سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر (کرم) نہیں فرمائے گا۔“

اور ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت قتادہ سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حمزہ بنی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ لواطت صغریٰ ہے“ (1)۔ یعنی عورت کی دبر میں وطی کرنا۔

اور حضرت طاؤس سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کرنے سے ہی قوم لوط کا عمل شروع ہوا تھا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب کوئی شے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو پھر جو بھی اس کے سوا ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔ **مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَقَدْ مَوَالَا نَفْسِكُمْ، یعنی پہلے پہلے وہ عمل کر لو جو کل (یعنی آخرت میں) تمہارے لئے باعث نفع ہوں، اس میں مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی تصریح اس ارشاد باری تعالیٰ میں کی گئی ہے: وَمَا تَقْتَدُوا لَآ نَفْسِكُمْ قِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللّٰهِ (البقرہ: 110) (اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں) پس معنی یہ ہوا تم اپنے لئے طاعت اور عمل صالح آگے بھیجو (یعنی پہلے پہلے کر لو)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اولاد اور نسل کی چاہت ہے کیونکہ اولاد دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ تحقیق بیٹا شفیع بھی ہوتا ہے اور ڈھال بھی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد پاک دامن عورتوں سے شادی کرنا ہے تاکہ اولاد صالح اور طاہر ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد افراط کو آگے بھیجنا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”جس نے تین بچے آگے بھیجے جو سن

بلوغت کو نہ پہنچے ہوں تو آگ اسے مس نہ کرے گی مگر کفارہ قسم کے طور پر“ الحدیث (1)۔ اس کا بیان سورہ مریم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس اور حضرت عطاء بن ینبہ نے کہا ہے: جماع کے وقت پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ”اگر تم میں سے کوئی جب اپنی بیوی کے پاس مجامعت کے لئے آیا اور اس نے یہ پڑھا بسم اللہ اللہم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان ما رزقنا (اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ اے اللہ! تو ہمیں شیطان سے دور رکھ اور شیطان کو اس سے دور رکھ جو تو نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔) تو اگر ان دونوں کے مابین بچہ مقدر ہوا تو شیطان کبھی بھی اسے ضرر نہ پہنچائے گا۔“ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللَّهَ يَهْدِيْكُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ واعلموا انکم مملوؤا یہ خبر ہے جو تحذیر میں مبالغہ کا تقاضا کرتی ہے، یعنی وہ تمہیں نیکی اور گناہ پر جزا دے گا۔ ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے اور کہا ہے: میں نے سعید بن جبیر کو سنا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے فرمایا: میں نے سعید بن جبیر کو سنا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوران خطبہ یہ فرماتے ہوئے سنا: ”بلاشبہ تم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرو گے اس حال میں کہ تم سر اور پاؤں سے ننگے ہو گے، پیدل ہو گے اور غیر مختون ہو گے۔“ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا انکم مملوؤا۔ مسلم نے اسے اسی معنی میں روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ یہ نیکی کرنے والے اور ہدایت کے طریقے تلاش کرنے والے کے لئے تائیس ہے۔ (2)

وَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَبِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

”اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو رکاوٹ اس کی قسم کھا کر کہ نیکی نہ کرو گے اور پرہیزگاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے فرمایا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے اور قیموں کے ساتھ زندگی گزارنے اور عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم فرمایا تو فرمایا: تم مکارم اخلاق میں سے کسی شے سے انکار نہ کرو اس علت کی بنا پر کہ ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہم اس طرح نہ کریں گے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابراہیم نخعی، مجاہد اور ربیع بن جعد رضی اللہ عنہم اور ان کے سوا کئی دوسروں نے بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واقسموا باللہ جہد ایمانہم، حدیث نمبر 6164، ایضاً

2۔ صحیح بخاری، باب کیف العشر، حدیث نمبر 6043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: مراد ایسا آدمی ہے جو قسم کھا لیتا ہے کہ وہ نیکی نہ کرے گا اور صلہ رحمی نہ کرے گا اور نہ لوگوں کے درمیان صلح کرائے گا، پس اسے کہا جاتا ہے: تو نیکی کر، تو وہ کہتا ہے: میں نے تو (نیکی نہ کرنے کی) قسم کھا رکھی ہے۔ اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے قسمیں نہ کھاؤ جب تم نیکی، پرہیزگاری اور اصلاح (صلح کرانے) کا ارادہ کرو، پس ان کے بعد لا کو مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کثرت سے قسمیں نہ کھاؤ کیونکہ یہ دلوں کو خوفزدہ کر دیتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ** (اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو) اور کثرت سے قسمیں کھانے والے کی مذمت بیان فرمائی۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَلَا تُطْعَمُ كُلُّ حَلَاَفٍ مَّهِينٍ** ① (القلم) (اور نہ بات مانے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی۔) اور عرب کم قسمیں کھانے کے سبب تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا:

قليل الألياء حافظ ليمينه وان صدرت منه الألية برت

کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی حفاظت کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہو جائے تو وہ سچی ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر **أَنْ تَكْبُرُوا** کا معنی ہے تم قسمیں کم کھاؤ کیونکہ اس میں نیکی اور پرہیزگاری ہے، کیونکہ کثیر قسموں کے ساتھ جنت (قسم توڑنا) بھی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت اور پاسداری میں کمی واقع ہوتی ہے، یہ تاویل حسن اور اچھی ہے۔ حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ علیہا نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم ہر شے میں رائج ہے اور کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ تم ہر حق اور باطل میں تصرف کے لئے قسم نہ کھاؤ۔

اور زجاج وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے کہ ایک آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جب اس سے فعل خیر کا مطالبہ کیا جائے تو اللہ کے ساتھ عذر پیش کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے: مجھ پر قسم ہے، حالانکہ اس نے قسم نہیں کھائی ہوتی۔ قسمی نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب تم یہ قسم کھاؤ کہ تم صلہ رحمی نہ کرو گے، صدقہ نہ کرو گے اور صلح نہیں کراؤ گے اور انہی کے مشابہ نیکی اور خیر کے کاموں سے متعلقہ قسمیں تو تم قسم کا کفارہ ادا کر دو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ (تاویل) حسن ہے اس کے لئے جو ہم نے بیان کیا ہے اور اسی پر سب نزول بھی دلالت کرتا ہے، ہم اس کے بعد والے مسئلہ میں اسے بیان کریں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وجہ سے نازل ہوئی، جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ سطح پر (مال) خرچ نہ کریں گے جس وقت اس نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے باتیں کیں (اور آپ پر تہمت لگائی) جیسا کہ حدیث الافک میں ہے، اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔ (1) اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ

مہمانوں کے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ بشر بن نعمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کلام نہیں کریں گے اور وہ آپ کی بہن کی نسبت سے آپ کے داماد تھے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: عُرْضَةٌ لِّاِيْمَانِكُمْ یعنی کھڑی کی ہوئی علامت۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔

اور فلان عرضۃ ذالک یعنی فلاں اس کے لئے علامت (رکاوٹ) ہے، یعنی وہ اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور وہ اس پر قوی اور غالب ہے اور عرضۃ کا معنی الہتۃ بھی ہے۔ کسی نے کہا:

ہم الانصار عرضتها اللقاء

وہ انصار ہیں ان کا ارادہ لشکر سے ملاقات ہے۔

اور فلان عرضۃ للناس اور فلاں لوگوں کا ٹارگٹ ہے: وہ مسلسل اس میں واقع ہوتے رہتے ہیں۔ و جعلت فلانا عرضۃ لکذا یعنی میں نے فلاں کو اس کے لئے علامت قرار دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرضۃ یہ شدت اور قوت سے ہے اور اسی سے عورت کے لئے ان کا قول ہے: عرضۃ للنکاح، جب وہ نکاح کی صلاحیت رکھے اور اس کے لئے قوی ہو جائے۔

اور لفلان عرضۃ: یعنی فلاں کے لئے سفر اور جنگ کی قوت و طاقت ہے۔ کعب بن زہیر نے کہا ہے:

من کل نضاحۃ الذفری اذا عرقت

عُرْضَتُهَا طامسُ الاعلامِ مجهول

اور حضرت عبداللہ بن زہیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

فہذی لأیام الحروب و ہذہ

لِلْهَوٰی و ہذی عرضۃ لارتحالنا

پس یہ جنگ کے دنوں کے لئے ہے اور لہو و لعب کے لئے ہے اور یہ ہمارے سفر کے لئے قوت و طاقت ہے۔ یعنی تیاری ہے۔ اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

فَلَا تجعلنی عرضۃ للوائم

اور اس بن حجر نے کہا ہے:

وأدماء مثل الفحل يوماً عرضتها

لرجلی و فیہا ہزؤ و تقاذف

اور معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم کھانے کو اپنے لئے قوت نہ بناؤ اور نیکی سے رکنے کے لئے بہانہ نہ بناؤ۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: أَنْ تَبْزُوا وَتَتَّقُوا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی البر والتقویٰ والاصلاح

اولیٰ و امثل: یعنی نیکی کرنا، تقویٰ اختیار کرنا اور صلح کرنا زیادہ بہتر اور زیادہ اچھا ہے۔

جیسا کہ یہ قول ہے طاعة و قول معروف یہ زجاج اور نحاس سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا محل نصب ہے،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر 5675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم نیکی، تقویٰ اور صلح کرانے سے باز نہ رکھے، یہ بھی زجاج سے منقول ہے۔
 اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول من اجلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی اَلَا تَبْدُوا اور لَا کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا۔ اِی لئلا تضلوا (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) طبری اور نحاس نے اسی طرح کہا ہے اور وجوہ نصب میں سے چوتھی وجہ یہ ہے: کراهة ان تبدوا، (کہ نیکی کو ناپسند کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں نہ کھاؤ۔) پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے، اسے نحاس اور مہدوی نے ذکر کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ محل جر میں ہے۔ یہ قول خلیل اور کسائی کا ہے اور تقدیر کلام ہے: اَنْ تَبْدُوا اور فی مضمَر کر دیا گیا اور اس کے ساتھ اسے جردی گئی۔
 اور سَبَّيْكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ عَلَیْكُمْ اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْسَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٣٥﴾

”نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ تعالیٰ تمہاری لایعنی قسموں پر لیکن پکڑے گا تمہیں ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔“
 اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بِاللَّغْوِ۔ اللغو: یہ مصدر ہے لَغَا يَلْغُو وَيَلْغَى، وَلَغَى يَلْغَى لَغَاً جب کلام میں کوئی ایسی شے ذکر کی جائے جس کی حاجت اور ضرورت نہ ہو یا ایسی شے کو لانا جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو یا ایسی شے جس کا گناہ لغو ہو جائے اور حدیث میں ہے: ”جب تو اپنے ساتھی کو کہے ”خاموش ہو جا“ اس حال میں کہ امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغو عمل کیا“ (1) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی لغت میں۔ لَغْوٌ کی بجائے لغیت ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

و دُبُّ اسْرَابٍ حَبِيبٍ كُطِّمَ عَنْ اللِّغَا وَرَفِثَ الشَّكِّمُ
 اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

و لَسْتُ بِمَأْخُوذٍ بَلْغُوْهُ تَقْوُلُهُ اِذَا لَمْ تَعْتَدِ عَاقِدَاتِ الْعِزَائِمِ

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا یمین لغو کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کسی آدمی کا وہ قول جو اس کے کلام کے درمیان میں ہو اور محاورہ میں اس کی عجلت پسندی کے سبب ہو: لَا وَاللّٰہِ اور بلی وَاللّٰہِ، یہ (الفاظ) قسم کے ارادے سے نہ ہوں۔
 مروزی نے کہا ہے: وہ یمین لغو جس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ لغو ہے وہ آدمی کا یہ قول ہے: لَا وَاللّٰہِ اور بلی وَاللّٰہِ۔ جبکہ یہ اس کی نفلت اور کلام میں واقع ہوں نہ ان سے قسم کا اعتقاد ہو اور نہ ہی قسم کا ارادہ ہو۔

اور ابن وہب نے یونس سے اور انہوں نے ابن شہاب سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ ام

المؤمنین زوج النبی ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ بنی شیبہ نے فرمایا: یحییٰ لغوہ ہے جو (محض) دکھاوا، تمسخر اور مزاح میں ہو اور وہ بات جس پر دل کا اعتقاد نہ ہو۔

اور بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ بنی شیبہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان لَا يُؤْخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْثَانِكُمْ ایک آدمی کے اس قول کے بارے میں نازل ہوا: (یعنی) لا والله اور بلی والله۔

اور کہا گیا ہے: لغوہ ہے جس کے بارے میں کوئی ظن کی بنا پر قسم کھاتا ہے اور وہ امر قسم کے خلاف ہوتا ہے، امام مالک نے یہی کہا ہے آپ سے اسے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور اسلاف میں سے ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آدمی کسی شے کی قسم کھائے اور اس کا ظن یہی ہو کہ وہ اسی طرح ہے جبکہ (فی الحقیقت) وہ اس طرح نہ ہو تو وہ قسم لغو ہوگی اور اس میں کفارہ نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور روایت ہے کہ ایک قوم نے رسول اللہ ﷺ کے پاس گفتگو کا تبادلہ کیا اور وہ آپ ﷺ کی موجودگی میں تہمت مائد کرنے لگے تو ان میں سے ایک نے قسم کھائی کہ میں نے درست کہا اور اے فلاں! تو نے غلط بیانی کی ہے، جبکہ معاملہ اس کے خلاف نکلا، تو اس آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ وہ حانث ہو گیا ہے، تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: أَيْمَانُ الرُّمَاتِ لَغْوٌ لَا حَنْثَ فِيهَا وَلَا كَفَّارَةَ (1) (گفتگو میں زیادتی کی قسم لغو ہے، اس میں نہ حانث ہونا ہے اور نہ کوئی کفارہ ہے۔)

اور مؤطا میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس بارے میں جو سب سے اچھا میں نے سنا ہے (وہ یہ ہے) کہ اللغو سے مراد انسان کا کسی شے کے بارے میں قسم کھانا ہے جس کے بارے میں یقین رکھتا ہو کہ وہ اسی طرح ہے پھر وہ اس کے برعکس پائی جاتی ہے، اس میں کفارہ نہیں ہے اور وہ جو کسی شے کے بارے میں قسم کھاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ اس میں گنہگار ہے، جھوٹا ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ کسی کو راضی کرے یا مخلوق کے لئے معذرت کرے یا وہ اس کے ذریعہ مال ہتھیا لے تو یہ اس سے بڑھ کر ہے کہ اس میں کفارہ ہو۔

اور کفارہ اس پر ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا حالانکہ اس کے لیے اس کا کرنا مباح ہے پھر وہ اسے کر گزرتا ہے یا (یہ قسم کھائے) کہ وہ اس طرح کرے گا پھر وہ ایسا نہ کرے، مثلاً اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنا کپڑا اس درہم کے عوض نہیں بیچے گا پھر وہ اتنے کے عوض ہی فروخت کر دیتا ہے یا کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنے غلام کو ضرور مارے گا پھر وہ اسے نہ مارے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اگر آپ سے یہ روایت صحیح ہے..... آپ نے فرمایا: یحییٰ لغو یہ ہے کہ تو قسم کھائے در آنحالیکہ تو غصے میں ہو اور طاؤس نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا يَمِينُ فِي غَضَبٍ (2) (حالت غضب میں قسم نہیں ہوتی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ (اللغو سے مراد) حلال کو حرام قرار دینا ہے، پس وہ کہتا ہے: میرا مال مجھ پر حرام

ہے اگر میں نے اس طرح کیا اور حلال مجھ پر حرام ہے، مکحول دمشقی نے اسی طرح کہا ہے۔ اور امام مالک نے بھی یہی کہا ہے، سوائے بیوی کے کیونکہ اس نے اس میں تحریم لازم کر دی ہے مگر یہ کہ قسم کھانے والا اپنے دل کے ساتھ اسے خارج کر دے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لغو سے مراد معصیت کی قسم ہے، حضرت سعید بن مسیب، ابوبکر بن عبد الرحمن اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹوں حضرت عروہ اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے جیسا کہ کوئی یہ قسم کھاتا ہے: ”وہ شراب ضرور پیے گا یا وہ قطع رحمی ضرور کرے گا۔“

پس اس کی نیکی اس فعل کو ترک کرنا ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے اور ان کی دلیل حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا دیکھا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ دے اور بے شک اس کا ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے (1)۔“ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر بھی ”المائدۃ“ میں آئے گا۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یمین لغویہ ہے کہ آدمی اپنے بارے میں بددعا کرے: (مثلاً) اللہ تعالیٰ اس کی بصارت کو اندھا کر دے، اللہ تعالیٰ اس کا مال ضائع کر دے، وہ یہودی ہے، وہ مشرک ہے، وہ ولد الزنا ہے اگر اس نے اس طرح کیا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دو آدمی خرید و فروخت کرتے ہیں، پس ان میں سے ایک کہتا ہے: قسم بخدا! میں تجھے اتنے کے عوض نہیں بیچوں گا اور دوسرا کہتا ہے: قسم بخدا! میں اتنے کے عوض اسے نہیں خریدوں گا۔

حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: وہ آدمی جو قسم کھاتا ہے کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا پھر وہ بھول جاتا ہے اور اسے گزر رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بے شک یمین لغو وہ ہے جس کا کفارہ ادا کیا جائے، یعنی جب قسم کا کفارہ ادا کر دیا جائے تو وہ ساقط ہو جاتی ہے اور لغو ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا کفارہ ادا کرنے کے سبب اور اس سے بہتر کی طرف لوٹنے کے سبب مواخذہ نہیں فرمائے گا۔ ابن عبد البر نے ایک قول بیان کیا ہے کہ لغو سے مراد مکہ کی قسم ہے۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قسم جو نسیان اور بھول کے ساتھ ہو اس کے لغو ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ وہ اس کے قصد اور ارادہ کے خلاف واقع ہوئی ہے، پس وہ محض لغو ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: مکہ کی قسم اپنے انجام سمیت، جس نے بالاکراہ قسم کھائی اس کا حکم ”النحل“ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: رہا وہ جس نے کہا کہ لغو سے مراد یمین المعصیۃ ہے تو یہ باطل ہے، کیونکہ ترک معصیت پر قسم کھانے والے کی قسم عبادت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہو جاتی ہے اور معصیت کا ارتکاب کرنے پر قسم کھانے والے کی قسم معصیت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہو جائے گی اور اسے کہا جائے گا: تو معصیت کا ارتکاب نہ کر اور کفارہ ادا کر دے اور

اگر اس نے اقدام فعل کیا تو وہ اپنے اقدام میں گنہگار ہوگا اور اپنی قسم سے بری ہو جائے گا۔

اور رہا وہ جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد انسان کا اپنے خلاف دعا کرنا ہے اگر اس طرح نہ ہو تو اس کے عوض اس طرح آفات نازل ہوں، تو یہ قول لغو ہے کفارہ کے طریق میں، لیکن فی القصد یہ قول منعقد ہو جائے گا اور مکروہ ہے اور بسا اوقات اس کے سبب مؤاخذہ بھی کیا جاتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی اپنے بارے میں بددعا نہ کرے بسا اوقات اتفاقہ ایسی ساعت ہوتی ہے کہ جو کوئی اس میں اللہ تعالیٰ سے کسی شے کے بارے سوال کرتا ہے تو وہ اسے ضرور عطا فرمادیتا ہے۔“ اور رہا وہ جس نے کہا اس سے مراد یمنین الغضب ہے تو حضور نبی کریم ﷺ کا حالت غضب میں قسم کھانا اس کی تردید کرتا ہے کہ وہ اشعرین کی بوجھ اٹھانے میں مدد میں کریں گے اور پھر آپ نے ان کی مدد کی اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس کا ذکر ”سورہ براءۃ“ میں آئے گا۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: رہا وہ جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد وہ قسم ہے جس کا کفارہ ادا کر دیا گیا ہو تو یہ اس کے متعلق نہیں جو بیان کیا جا رہا ہے اور اسے ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ضعیف اور کمزور قرار دیا ہے اور کہا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے مطلقاً لغو سے مؤاخذہ اٹھالیا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ ہی کفارہ ہے اور قسم میں مؤاخذہ یمنین غموس میں جو کہ حالف نے اپنے ذمہ لازم کر رکھی ہو اور اس میں جس کا کفارہ ادا کرنا ترک کر دیا گیا ہو حالانکہ وہ اس میں سے ہو جن میں کفارہ ہوتا ہے آخرت کی سزا ہے اور لازم کرنے میں دنیا کی سزا ہے، پس یہ قول ضعیف ہو جاتا ہے اس سبب سے کہ یہ یمنین الکفرہ ہے، کیونکہ اس میں مؤاخذہ واقع ہوا ہے اور مؤاخذہ کو فقط آخرت کے ساتھ خاص کرنا یہ مرضی کا فیصلہ ہے (جس کی کوئی حقیقت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **فِيْ اَيْمَانِكُمْ**۔ الايمان یمنین کی جمع ہے اور الیسین کا معنی قسم ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ عرب لوگ جب آپس میں قسم اٹھاتے تھے یا باہم عقد کرتے تھے تو ایک آدمی اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے ساتھی کا دایاں ہاتھ پکڑتا پھر یہ رواج بہت زیادہ بڑھ گیا یہاں تک کہ نفس قسم اور عہد کا نام ہی یمنین پڑ گیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یمنین فعیل کے وزن پر یمنین سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی برکت ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے یہ نام اس لئے دیا ہے کیونکہ یہ حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور یمنین کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اس کی جمع ایمان اور ایمن ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

فتجیم ائمن منا و منکم

(پس ہماری طرف سے اور تمہاری طرف سے بہت سی قسمیں جمع ہو رہی ہیں۔)

(۴) قولہ تعالیٰ: **وَلٰكِنْ يُّؤٰخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ** یہ اس قول کی مثل ہے: **وَلٰكِنْ يُّؤٰخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْاَيْمَانَ** (المائدہ: 89) اس کے تحت اس کے بارے مکمل بحث آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا: قولہ تعالیٰ: **وَلٰكِنْ يُّؤٰخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ** یہ ایسے آدمی کے بارے میں ہے

جو یہ کہتا ہے: وہ شرک ہے اگر وہ ایسا کرے، یعنی یہ لغو ہے مگر یہ کہ وہ اپنے دل سے شرک کرنے کا اعتقاد اور اس کا ارادہ کرے اور عَفُوًّا حَلِيمٌ یہ دونوں صفتیں ہیں جو اس کے مناسب ہیں جو مؤاخذہ چھوڑنے کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ نرمی اور وسعت کے باب سے ہے۔ (1)

لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَاءِهِمْ تَرْبُصُ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ ۖ فَإِنْ فَأَوْفَ فَإِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ
رَحِيمٌ ۝۳۱ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝۳۲

”ان کے لئے جو قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے مہلت ہے چار ماہ کی پھر اگر رجوع کر لیں (اس مدت میں) تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ اور اگر پکا ارادہ کر لیں طلاق دینے کا تو بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔“

اس میں چوبیس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ۔ يُؤْلُونَ کا معنی ہے وہ قسم اٹھاتے ہیں (2) اور مصدر ایلاء، أَلَيْتُ، أَلَوْتُ اور أَلَوْتُ ہیں۔ حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ یَقْسِمُونَ (3) قراءت کی ہے اور یہ بات جانی پہچانی ہے کہ یَقْسِمُونَ، يُؤْلُونَ کی تفسیر ہے۔ اور لِّلَّذِينَ أَلَوْتُ بھی پڑھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: آلی يُؤْلِي إِيْلَاءً اور تَأَلَّى تَأَلَّى اور اِئْتَلَى اِئْتَلَى یعنی اس نے قسم کھائی۔ اور اسی میں سے ہے: وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ (نور: 22) (اور تم میں سے صاحب فضل قسم نہ کھائیں)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

فَأَلَيْتُ لَا أَنْفَكَ أَخْذُ وَ قَصِيدَةٌ تَكُونُ وَ إِيَاهَا بَهَا مَثَلًا بَعْدِي
اور دوسرے نے کہا:

قَلِيلَ الْأَلْيَا حَافِظٌ لِّسِينِهِ وَانْ سَبَقَتْ مِنْهُ الْأَلْيَةُ بَرَّتْ (4)
کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی پاسداری کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہو جائے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔
اور ابن درید نے کہا ہے:

أَلْيَةُ بِالْيَعْمَلَاتِ يَزْرَعِي بَهَا النَّجَاءُ بَيْنَ أَجْوَاظِ الْفَلَاحِ

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ دور جاہلیت کا ایلاء ایک سال، دو سال اور اس سے زیادہ عرصہ کا تھا۔ وہ اس سے رات کے وقت عورت کو اذیت پہنچانے کا قصد کرتے تھے، پس ان کے لئے چار ماہ رکھے گئے اور جس نے اس سے کم عرصہ کے لئے ایلاء کیا تو وہ حکماً ایلاء نہ ہوگا (5)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلاء کیا اور طلاق دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء کا سبب آپ سے ازواج مطہرات کا ایسے نفقہ کا سوال تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ تھا، اسی طرح صحیح مسلم میں ہے اور کہا گیا ہے کیونکہ حضرت زینب بنت جحش نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدیہ آپ پر واپس لوٹا دیا تھا، پس اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے ہو گئے اور ان سے ایلاء کر لیا (1)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ایلاء ہر اس کے لئے ثابت ہوتا ہے جس کے لئے طلاق ثابت ہے، پس آزاد، غلام اور سکران (نشہ والا) ہر ایک کو ایلاء لازم ہوتا ہے اور اسی طرح سفیہ (احق) اور جس پر ایلاء کیا جائے بشرطیکہ وہ بالغ اور غیر مجنون ہو اور اسی طرح خصی ہے جبکہ وہ مقطوع الذکر نہ ہو اور بوڑھا آدمی جبکہ اس میں رمتی اور نشاط باقی ہوں۔

مقطوع الذکر آدمی جب ایلاء کرے تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے۔ ایک قول میں ہے کہ اس کے لئے کوئی ایلاء نہیں ہے اور ایک قول میں ہے: اس کا ایلاء صحیح ہوتا ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح اور کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ رجوع وہ ہے جو قسم کو ساقط کر دیتا ہے اور رجوع بالقول اسے ساقط نہیں کرتا تو جب حنث سے مانع قسم باقی ہے تو پھر ایلاء کا حکم بھی باقی ہوگا اور گونگے آدمی کا ایلاء ایسی تحریر یا اشارہ کے ساتھ ہوتا ہے جو سمجھا جاسکتا ہو اور وہ اس کو لازم ہو۔ اسی طرح عجمیوں کا حکم ہے جب وہ اپنی عورتوں سے ایلاء کر لیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس بارے اختلاف ہے جس کے ساتھ قسم میں سے ایلاء واقع ہوتا ہے۔ پس ایک قوم نے کہا ہے: ایلاء واقع نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی قسم کھانے کے ساتھ (2)، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: من کان حالفا فلیحلف باللہ اویحصت (3) یعنی جو کوئی قسم اٹھانے والا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائے یا پھر وہ خاموش رہے۔

امام شافعی نے بھی اپنے جدید قول میں یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ”ہر وہ قسم جو جماع سے روکے تو وہی ایلاء ہے (4) اور اسی کے مطابق شعبی، نخعی، مالک، اہل حجاز، سفیان ثوری، اہل عراق، امام شافعی نے اپنے دوسرے قول میں، ابو ثور، ابو عبید، ابن منذر اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: ہر وہ قسم جس کے سبب حالف اپنی بیوی کے ساتھ جماع کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ وہ حانث ہو جائے گا تو وہ اس کے سبب ایلاء کرنے والا ہوگا، بشرطیکہ اس کی قسم چار مہینوں سے زیادہ کی ہو، پس ہر وہ جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات اور اس کی کفالت، اس کا عہد اور اس کا ذمہ ہے کہا تو اس پر ایلاء لازم ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے کہا: اقسام یا اعزم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1، صفحہ 148، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 177، دار احیاء التراث العربیہ

3۔ بخاری شریف، کتاب الایمان، باب لا تحلفوا بانہانکم، جلد 2، صفحہ 983، وزارت تعلیم

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 356، دار الکتب العربیہ

ایضاً، کتاب الشہادات، حدیث نمبر 2482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور ساتھ باللہ کا ذکر نہ کیا تو کہا گیا ہے: اس پر ایلاء واقع نہ ہوگا، مگر یہ کہ وہ باللہ کا ارادہ کرے اور اس کی نیت کرے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ قسم ہے تو اس پر ایلاء واقع ہو جائے گا۔ اس کا تفصیلی بیان ”سورۃ المائدہ“ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اگر کسی نے روزوں کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اپنے بیوی سے وطی نہ کرے گا اور کہا: اگر میں تجھ سے وطی کروں تو مجھ پر ایک ماہ یا ایک سال کے روزے تو وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا۔ اور اسی طرح ہر وہ جو حج، طلاق، عتق، نماز یا صدقہ میں سے اپنے ذمہ لازم کرتا ہے (تو وہ مولیٰ ہو جائے گا) اور ان تمام میں بنیاد اور اصل قول باری تعالیٰ کی عمومیت ہے: لَئِنْ بَيْنَیْتُ لَوْ نَوْنٍ اور کوئی فرق نہیں ہے جب اس نے صدقہ یا معین غلام کی آزادی یا غیر معین غلام کی آزادی کے ساتھ ایلاء کیا تو ایلاء ثابت ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر کسی نے قسم کھائی قسم بخدا! وہ وطی نہ کرے گا اور استثنا کر دی اور کہا: ان شاء اللہ تعالیٰ، تو بلاشبہ وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا اور اگر اس نے اس سے وطی کی تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا، یہ امام مالک سے ابن قاسم کی روایت میں ہے اور ابن ماجہ شون نے المبسوط میں کہا ہے: وہ مولیٰ نہیں ہوگا، یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ استثناء (ان شاء اللہ کہنا) قسم کو کھول دیتا ہے۔ اور حالف کو اس طرح کر دیتا ہے گویا کہ اس نے قسم کھائی ہی نہیں اور یہی فقہائے امصار کا مذہب ہے، کیونکہ ان شاء اللہ کہہ کر اس نے وضاحت کر دی ہے کہ وہ فعل کا قصد کرنے والا نہیں (1) اور اس کی وجہ جسے ابن القاسم نے روایت کیا ہے اس کی بنا اس پر ہے کہ استثنا قسم کو نہیں کھولتا، البتہ وہ کفارہ کو ساقط کرنے میں مؤثر ہوتا ہے، اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ پس جب اس کی قسم باقی ہے، منعقد ہو چکی ہے تو پھر ایلاء کا حکم اسے لازم ہوگا، اگرچہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اگر کسی نے نبی علیہ السلام، ملائکہ یا کعبہ معظمہ کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اس سے وطی نہ کرے گا یا اس نے کہا: وہ یہودی یا نصرانی یا زانی اگر وہ اس سے وطی کرے، تو اس صورت میں وہ ایلاء کرنے والا نہ ہوگا (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے کہ وہ اسے قسم کے طریقہ کے بغیر لایا ہے اور اگر وہ اسے اس ارادہ پر لایا کہ ان میں سے یا کوئی اور جو الفاظ اس نے اسے کہے ہیں وہ اس کے ساتھ ایلاء کرنے والا ہے، تو المبسوط میں ہے کہ ابن القاسم سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: لا موحبا اور اس سے وہ ایلاء کا ارادہ کرتا ہے وہ مولیٰ ہو جائے گا، تو انہوں نے ذکر کیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہر وہ کلام جس سے اس نے طلاق کی نیت کی تو وہ طلاق ہو جاتی ہے اور یہ (ایلاء) اور طلاق دونوں برابر ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قرآن کریم میں مذکور ایلاء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کوئی ایلاء کرنے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ قسم کھائے کہ وہ ہمیشہ عورت کو مس نہیں کرے گا۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب کسی نے قسم کھائی کہ وہ ایک دن یا کچھ کم یا کچھ زیادہ اپنی بیوی کے قریب نہیں آئے گا پھر اس نے چار مہینے تک وطی نہ کی تو وہ عورت ایلاء کے سبب اس سے جدا ہو جائے گی۔

1۔ احکام القرآن ابن العربی، جلد 1، صفحہ 178، دار احیاء التراث العربیہ

2۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الایلاء واللعان باب لمن قال علی نذر، جلد 6، صفحہ 86، المسعودۃ بجوارح النظار مصر

یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، نخعی، ابن ابی لیلیٰ، حکم، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی اسحاق نے بھی کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: کثیر اہل علم نے اس قول کا انکار کیا ہے۔ (1)

اور جمہور نے کہا ہے: ایلاء یہ ہے کہ آدمی قسم کھائے کہ وہ چار مہینے سے زیادہ (عرصہ) وطی نہ کرے گا۔ پس اگر اس نے چار ماہ اور ان سے کم کی قسم کھائی تو وہ مولیٰ نہ ہوگا اور ان کے نزدیک وہ صرف قسم ہے۔ اگر اس نے اس مدت کے دوران وطی کی تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی جیسا کہ تمام قسموں میں ہوتا ہے یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔

اور ثوری اور علماء کوفہ نے کہا ہے کہ ایلاء یہ ہے کہ آدمی چار مہینے اور کچھ زائد کی قسم کھائے اور یہی حضرت عطاء بن یشیہ کا قول ہے (2)۔ اہل کوفہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایلاء میں چار مہینے مہلت مقرر کی ہے جیسا کہ اس نے عدت و فوات کے لئے چار ماہ و دس دن اور عدت میں تین حیض مقرر کیے ہیں اور اس کے بعد کوئی مہلت اور انتظار نہیں۔ انہوں نے کہا: مدت کے بعد ایلاء کا ساقط ہونا واجب ہو جاتا ہے اور وہ ساقط نہیں ہوتا مگر فیئ (رجوع) کے ساتھ اور اس سے مراد مدت کے اندر جماع کرنا ہے (ورنہ) چار مہینے گزرنے کے بعد طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے استدلال کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایلاء کرنے والے کے لئے چار ماہ مدت مقرر کی ہے۔ پس یہی اس کی کامل مدت ہے، اس دوران اس کی بیوی کو اس پر کوئی اعتراض (کا حق) نہیں۔ جیسا کہ دین مؤجل کا مالک مدت مکمل ہونے کے بعد ہی اس کے بارے مطالبے کا استحقاق رکھتا ہے۔

اور حضرت اسحاق کے قول کی وجہ مدت کم ہونے کے بارے میں (یعنی چار ماہ سے کم) کہ اس کے ساتھ بھی قسم کھانے والا مولیٰ ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ وطی نہ کرے۔ اس کا قیاس چار مہینے سے زیادہ کی قسم کھانے والے پر ہے کیونکہ وہ مولیٰ ہو جاتا ہے، کیونکہ قسم سے مقصود ضرر اور اذیت پہنچانا ہے اور یہ معنی قلیل مدت میں بھی موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس بارے اختلاف ہے کہ جس نے چار مہینے سے زیادہ مدت اپنی بیوی سے وطی نہ کرنے کی قسم کھائی اور چار ماہ گزر گئے اور عورت نے اس سے مطالبہ نہ کیا اور اسے نہ سلطان وقت کے پاس پیش کیا تا کہ وہ اسے مطلع کرے (3)، تو امام مالک، آپ کے اصحاب اور اکثر اہل مدینہ کے نزدیک اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض کہتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے کے ساتھ ایک طلاق رجعیہ اس پر لازم ہو جائے گی اور ان سے بعض اور کچھ دوسرے علماء کہتے ہیں: چار مہینے گزرنے کے ساتھ اسے ایک طلاق بائنہ لازم ہوگی اور صحیح قول یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ مولیٰ کو طلاق لازم نہیں ہوتی یہاں تک کہ حاکم وقت اسے ان کی بیوی کے مطالبہ کے بارے میں آگاہ کرے تا کہ وہ رجوع کر لے تو وہ اپنی بیوی کی طرف وطی کے ساتھ رجوع کر لے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے یا وہ طلاق دے دے اور (حاکم) اسے نہ چھوڑے یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے یا طلاق دے دے۔

اور فیئ (رجوع) سے مراد جماع کرنا ہے جس صورت میں اس کے ساتھ مجامعت ممکن ہو۔ سلیمان بن یسار نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں نو (یا انیس) آدمی تھے جو ایلاء میں توقف کرتے تھے۔ امام مالک نے کہا: یہ حکم ہمارے نزدیک ہے اور اسی طرح لیث، شافعی، احمد، اسحاق، ابو ثور رحمہ اللہ نے کہا ہے اور اسے ابن منذر نے پسند کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور ایلاء کرنے والے کی مدت قسم کھانے کے دن سے شروع ہوگی نہ کہ اس دن سے جس دن اس کی زوجہ اس سے جھگڑے اور اسے حاکم کے پاس پیش کرے اور اگر عورت نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا اور وہ اس کے مباشرت نہ کرنے کے ساتھ راضی نہ ہوئی تو حاکم قسم کے دن سے اس کے لئے چار مہینے کی مدت مقرر کر دے، پس اگر اس نے مباشرت کی تو اس نے زوجہ کے حق کی طرف رجوع کر لیا اور وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے اور اگر اس نے رجوع نہ کیا تو وہ اس پر طلاق رجعیہ ڈال دے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر اس نے رجوع کر لیا تو اس کا رجوع کرنا صحیح نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ عدت میں مقاربت اختیار کرے۔ ابہری نے کہا ہے: اس میں طلاق کا واقع ہونا دفع ضرر کے لئے ہے تو جب اس نے مقاربت نہ کی تو ضرر باقی رہا، تو اس صورت میں رجعت کا کوئی معنی نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو جو اسے مقاربت سے روکتا ہو تو پھر اس کا رجوع صحیح ہو گا، کیونکہ ضرر زائل ہو جائے گا اور وظی سے اس کا باز رہنا ضرر پہنچانے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ تو عذر کی وجہ سے ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ حالت غضب کے سوا ایلاء کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حالت غضب کے سوا ایلاء نہیں ہوتا (1) اور اس کے بارے میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حدیث مشہور میں یہی مروی ہے اور اسی طرح لیث، شعبی، حسن اور عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے، یہ سب کہتے ہیں: ایلاء نہیں ہوتا مگر اس وجہ سے کہ وہ باہم ایک دوسرے پر غصے ہوں، آپس میں جھگڑ رہے ہوں، تنگ ہوں اور تکلیف دینا مقصود ہو کہ وہ اسے ضرر پہنچانے اور اذیت دینے کے لئے اس کے ساتھ مجامعت نہیں کرے گا، چاہے اس کے ضمن میں بچے کی اصلاح مقصود ہو یا نہ ہو اور اگر یہ غضب کی وجہ سے نہ ہو تو پھر ایلاء نہیں ہوگا (2)۔

اور ابن سیرین نے کہا ہے: چاہے قسم حالت غضب میں ہو یا بغیر غضب کے ہو وہ ایلاء ہے۔ یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ثوری، مالک اور اہل عراق، امام شافعی اور آپ کے اصحاب اور امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر امام مالک نے کہا ہے: جب اس نے بچے کی اصلاح کا ارادہ نہ کیا ہو (3)۔ ابن منذر نے کہا ہے: یہی اصح ہے کیونکہ انہوں نے جب اس پر اجماع کیا ہے کہ ظہار، طلاق اور تمام قسمیں حکم میں برابر ہیں، چاہے حالت غضب میں ہوں یا حالت رضا میں تو پھر ایلاء بھی انہیں کی طرح ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں اور اس پر قرآن کریم کا عام حکم دلالت کرتا ہے اور حالت غضب کی تخصیص دلیل کی محتاج ہے اور ایسی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی جو اسے لازم قرار دے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: وہ آدمی جو بغیر ایسی قسم کے اپنی بیوی کی مقاربت سے رکا رہا جو اس نے بیوی کو ستانے کے لئے قسم کھائی ہو۔ تو اسے اس کے ساتھ مباشرت کا حکم دیا جائے اور اگر وہ انکار کر دے اور اسے ضرر پہنچانے

کے لئے امتناع وطی پر قائم رہے تو بغیر مدت مقرر کیے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دی جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے مدت ایلاء مقرر کی جائے گی اور یہ قول بھی ہے کہ آدمی کا اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں اس پر ایلاء داخل نہ ہوگا، اگرچہ وہ کئی سال تک اس سے مقاربت نہ کرنے پر قائم رہے، لیکن اسے نصیحت کی جائے گی اور اسے اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا جائے گا کہ وہ اسے ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے نہ روکے رکھے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اور اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی سے مجامعت نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اپنے بچے کو دودھ نہ چھڑالے، تاکہ حاملہ اپنے بچے کو دودھ نہ پلائے اور وہ اسے ضرر پہنچانے کا ارادہ نہ کرے یہاں تک کہ مدت رضاع گزر گئی تو امام مالک کے نزدیک بچے کی اصلاح کا ارادہ ہونے کی بنا پر اس کی بیوی کو مطالبے کا حق حاصل نہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اسے ایلاء نہ قرار دیا (1)۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں یہی کہا ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ مولیٰ ہو جائے گا اور بچے کو دودھ پلانے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور یہی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ آدمی ایلاء کرنے والا نہ ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی زوجہ سے اس کمرے میں یا اس گھر میں دخول نہ کرے گا کیونکہ وہ مقاربت کے لئے اس کے سوا اور جگہ بھی پاسکتا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ اور اسحاق نے کہا ہے: اگر اس نے اسے چار ماہ تک چھوڑے رکھا تو وہ ایلاء کے ساتھ جدا ہو جائے گی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ اس سے چار ماہ تک رکا رہا ہے اور اگر اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اس سے اس مصر یا اس شہر میں وطی نہ کرے گا تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک وہ مولیٰ ہو جائے گا۔ اور ایسا بلاشبہ سفر میں ہوتا ہے کہ وہ مشقت اور کلفت برداشت کرتا ہے نہ کہ اپنے باغ یا اپنے قریبی کھیتوں میں۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: **مِنْ نِّسَاءِ يَهْمُ** اس میں آزاد عورتیں، ذمیہ عورتیں اور لونڈیاں سبھی داخل ہیں جب وہ شادی کر لیں اور غلام کا ایلاء بھی اپنی بیوی سے ثابت ہو جاتا ہے۔

امام شافعی، احمد اور ابو ثور رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غلام کا ایلاء بھی آزاد آدمی کے ایلاء کی مثل ہے (2)۔ ان کی دلیل اس قول باری تعالیٰ کا ظاہر ہے: **لَا تَنْكِحُوا نِسَاءَ يَهْمُ** کیونکہ یہ تمام ازواج کے لئے ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

امام مالک، زہری، عطاء بن ابی رباح اور اسحاق نے کہا ہے: اس (غلام) کی مدت دو مہینے ہے۔ اور حسن اور نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر غلام کی بیوی کسی کی لونڈی ہو تو اس کے ایلاء کی مدت دو مہینے ہے اور اگر وہ آزاد ہو تو اس کے ایلاء کی مدت چار مہینے ہے اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے، اور حضرت شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: لونڈی کے ایلاء کی مدت آزاد

1۔ خط امام مالک، کتاب الطلاق، باب الايلاء، جلد 1، صفحہ 515، وزارت تعلیم

2۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

عورت کے ایلاء کا نصف ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ امام مالک اور ان کے اصحاب، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور نخعی وغیرہم نے کہا ہے کہ ایلاء کے لازم ہونے میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں برابر ہیں۔ اور زہری، عطاء اور ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایلاء نہیں ہوتا مگر مدخول کے بعد۔

اور امام مالک نے کہا ہے: صغیرہ عورت میں ایلاء نہیں ہوتا جب تک وہ بالغ نہ ہو اور اگر اس نے اس سے ایلاء کیا اور وہ بالغ ہو گئی تو اس کے بالغ ہونے کے دن سے ایلاء لازم ہو جائے گا (1)۔

مسئلہ نمبر 15۔ اور رہا زمی تو اس کا ایلاء صحیح نہیں ہوتا، جس طرح کہ اس کی جانب سے ظہار اور طلاق درست نہیں ہوتے اور وہ اس لئے کہ ہمارے نزدیک اہل شرک کا نکاح صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ان کے لئے نعمت اور احسان کے مشابہ ہے اور اس لئے بھی کہ وہ شریعت کے مکلف نہیں کہ ان پر قسموں کے کفارات لازم ہوں اور اگر وہ ہمارے پاس ایلاء کا مقدمہ پیش بھی کریں تو ہمارے حاکم کو نہیں چاہئے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے اور وہ اپنے حکام کی طرف جائیں گے اور اگر ان کے درمیان ایک دوسرے پر ظلم ہونے لگے تو پھر یہ حکم اسلام کے مطابق فیصلہ کرے، جیسا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو ضرر پہنچانے کے لئے بغیر قسم کے اس سے وطی چھوڑ دے۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: تَرْتَبُّسُ اَرْبَعَةِ اشْهُرٍ، التربص کا معنی ہے: مہلت دینا اور تاخیر کرنا۔ یہ تصبر (مصنوعی صبر) کا الٹ (مقلوب) ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

تَرْتَبُّسُ بَهَا رَبِّبَ الْمَنُونِ لَعَلَّهَا تَطْلُقَ يَوْمًا اَوْ يَوْمًا حَلِيلُهَا

تو اس کے ساتھ حوادث زمانہ کا انتظار کر شاید کسی دن اسے طلاق ہو جائے گی یا اس کا خاوند فوت ہو جائے گا اور رہا چار مہینے وقت مقرر کرنے کا فائدہ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس بارے میں اہل جاہلیت سے جو ذکر کیا ہے وہ پہلے گزر چکا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس (ایلاء) سے منع فرما دیا اور دوری اور علیحدگی کے ساتھ عورت کو ادب سکھانے کے لئے خاوند کے لئے چار مہینے مدت مقرر کر دی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (النساء: 34) (اور تم انہیں بستروں میں چھوڑ دو) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ انہیں ادب سکھانے کے لئے ایک ماہ تک ایلاء کیا اور کہا گیا ہے کہ چار مہینے وہ ہیں جن سے زیادہ کوئی خاوند صبر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کسی رات مدینہ طیبہ میں گشت کر رہے تھے تو آپ نے ایک عورت کی آواز سنی، وہ یہ اشعار کہہ رہی تھی:

الاطال هذا الليل و اسود جانبہ
وازقني ان لاصيب الايبه
فو الله لو لا الله لا شيء غيره
لزعزعم من هذا السامر جوانبه

مَخَافَةَ رَبِّ وَالْحَيَاءِ يَكْفِي وَكَرَامَ بَعْلِ أَنْ تُنَالِ مَرَكَبَهُ

جب صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو طلب کیا اور اس سے پوچھا: تیرا خاوند کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا: آپ نے اسے عراق بھیجا ہوا ہے پھر آپ نے عورتوں کو بلایا اور ان سے پوچھا: ایک عورت کتنی دیر تک اپنے خاوند کے بغیر صبر کر سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا: دو مہینے اور تیسرے ماہ اس کا صبر کم ہو جاتا ہے اور چوتھے ماہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کے جہاد کی مدت چار مہینے مقرر کر دی، جب چار ماہ گزر جاتے تو آپ جہاد کرنے والے لشکر کو واپس بلا لیتے اور ان کی جگہ دوسرا لشکر بھیج دیتے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے یہ بابت بھی مدت ایلاء کے چار مہینوں کے ساتھ اختصاص کو قوی کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَإِنْ قَاءَ ذَاكَ اس کا معنی ہے: پھر اگر انہوں نے رجوع کر لیا اور اس سے یہ بھی ہے (1) حَتَّى تَغِي إِلَى أَمْرِ اللَّهِ اور اس معنی میں زوال کے بعد والے سایہ کوئی عکس کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مشرق کی جانب سے مغرب کی جانب لوٹ آتا ہے، کہا جاتا ہے: قَاءَ يَفِيءُ فَيُؤْءَا - وانه لسريع الفیئة یعنی وہ رجوع میں تیز رفتار ہے۔ شاعر نے کہا:

فَقَاءَتْ وَ لَمْ تَقْضِ الذی اقبلت له و مِنْ حَاجَةِ الْاِنْسَانِ مَا لَيْسَ قَاضِيَا

پس وہ لوٹ آئی اور اس نے اسے پورا نہ کیا جس کے لئے آئی اور انسان کی حاجت پوری ہونے والی نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ سب کے سب جن سے کچھ محفوظ اور یاد کیا جاتا ہے وہ اس پر ہیں کہ فیء سے مراد اس آدمی کا جماع کرنا ہے جس کا کوئی عذر نہ ہو اور اگر اس کا کوئی عذر ہو (مثلاً) وہ بیمار ہو جائے، قید ہو جائے یا اس کے مشابہ کوئی اور عذر ہو تو بلاشبہ اس کا رجوع صحیح ہوگا اور یہ اس کی بیوی ہوگی اور جب سفر سے آنے کے سبب یا مرض سے افاتہ پانے کے سبب عذر زائل ہو جائے یا قید سے رہائی پانے کے سبب (عذر ختم ہو جائے) اور وہ وطی سے انکار کر دے تو ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی، بشرطیکہ مدت ایلاء گزر چکی ہو۔ امام مالک نے المدونہ میں اور المبسوط میں یہی کہا ہے۔

اور عبد الملک نے کہا ہے: وہ عورت مولیٰ سے اس دن سے جدا ہوگی جس دن مدت ختم ہوئی، پس اگر رجوع کے ساتھ اس کا عذر سچا ہوا جبکہ عورت نے اسے قدرت دی تو گزرے ہوئے ایام میں بھی اس کے سچا ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور اگر عورت پر قدرت حاصل ہونے کے وقت (وطی سے) انکار کے ساتھ جس رجوع کا دعویٰ کیا تھا اس کی تکذیب کر دی، تو اس کے معاملہ کو جھوٹ اور جھگڑے پر محمول کیا جائے گا اور اس وقت میں جو کچھ احکام واجب ہوتے ہیں وہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب عذر کی حالت میں گواہوں نے اس کے رجوع کے بارے شہادت دی ہے تو وہ اس کے لئے کافی ہوگی۔ حسن، عکرمہ اور نخعی نے یہی کہا ہے اور امام اوزاعی نے بھی یہی کہا ہے۔

اور نخعی نے بھی کہا ہے: صرف قول اور شہادت کے ساتھ رجوع صحیح ہوتا ہے اور ایلاء کا حکم ساقط ہو جاتا ہے، تیرا کیا خیال ہے اگر اسے وطی کے مواقع میسر نہ ہوں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اگر اس نے مباشرت نہ کی تو اس قول کو باب ضرر کی طرف لوٹایا جائے گا (1)۔

اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر وہ جماع پر قادر نہ ہو تو وہ یہ کہے: میں نے اس (بیوی) کی طرف رجوع کر لیا۔
الکلیا الطبری نے کہا ہے: امام ابو حنیفہ ایسے آدمی کے بارے فرماتے ہیں جس نے ایلاء کیا در آنحالیکہ وہ مریض تھا اور اس کے
اور اس کی بیوی کے مابین چار ماہ کی مسافت تھی یا یہ رتقاء تھی یا صغیرہ تھی یا آدمی مقطوع الذکر تھا تو جب اس نے اس کی طرف
زبان سے رجوع کیا اور مدت گزر گئی اور عذرا بھی تک موجود تھا تو وہ رجوع صحیح ہے۔ امام شافعی اپنے دو قولوں میں سے ایک
میں ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جماع کے بغیر رجوع نہیں ہو سکتا، چاہے حالت عذر ہو یا غیر عذر اور اسی طرح حضرت سعید بن
جبیر نے بھی کہا ہے، فرمایا: اور اسی طرح حکم ہے اگر وہ سفر میں ہو یا قید میں۔

مسئلہ نمبر 19۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور جمہور علماء رحمہم نے مولیٰ پر کفارہ
واجب کیا ہے جب وہ اپنی بیوی کی طرف جماع کے ساتھ رجوع کر لے۔ اور حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس پر کفارہ نہیں ہے (2)
اسی طرح نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ حضرت نخعی نے بیان کیا ہے وہ کہا کرتے تھے: جب مولیٰ رجوع کر لے تو اس پر کفارہ نہیں ہو
گا اور اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَاَنْزَلْنَا فِيْهِمْ لَآءٍ میں بعض اہل تاویل نے کہا ہے: یعنی اس قسم کے لئے جس
میں وہ حائض ہوئے (اگر انہوں نے رجوع کر لیا)، قسم میں بعض تابعین کا ان کے بارے میں یہی مذہب ہے جنہوں نے نیکی،
تقویٰ یا کسی بھی بھلائی اور خیر کے خلاف یہ قسم کھائی کہ وہ اسے نہیں کرے گا، پھر وہ اسے کرے اس پر کوئی کفارہ نہ ہوگا اور اس
کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَنْزَلْنَا فِيْهِمْ لَآءٍ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا اس میں کفارہ کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہ یہ اس معنی پر
مترتب ہوتا ہے کہ یمین لغو وہ ہے جو کسی معصیت پر قسم کھائی جائے اور زوجہ کے ساتھ وطی ترک کرنا معصیت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کبھی اس قول کے لئے سنت سے استدلال کیا جاتا ہے، حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے
واط سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی
کام پر قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے ترک کر دے کیونکہ اسے ترک کرنا ہی اس
(قسم) کا کفارہ ہے (3)۔

اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان آیۃ الایمان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور جمہور کی
دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: من حلف علی یمن فرأی غیرہا خیرا منها فلیأت الذی ہو خیر و لیکفر
عن یمینہ (4) کہ جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ کرے جو بہتر اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 511، دار احیاء التراث العربیہ

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من قال کفار تھا ترکھا، جلد 1، صفحہ 154، وزارت تعلیم

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من حلف علی یمین، جلد 1، صفحہ 153، وزارت تعلیم

اچھا ہوا اور اپنی قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دے)

مسئلہ نمبر 20۔ جب اس نے قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا تو اس سے ایلاء ساقط ہو گیا، ہمارے علماء نے یہی کہا ہے۔ اس میں ایک مذہب کے مطابق حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے پر دلیل ہے، ایلاء کے مسئلہ میں یہی اجماع ہے اور ایمان کے مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف دلیل ہے کیونکہ آپ حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز کے قائل نہیں (1)۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 21۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے حنث ہونے سے پہلے کفارہ جائز نہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مولیٰ کے لئے دو فیصلوں میں سے ایک کے بارے حکم دیا ہے یعنی رجوع یا طلاق کا ارادہ، پس اگر حنث ہونے پر کفارہ کی تقدیم جائز ہو تو یقیناً رجوع یا طلاق کے ارادہ کے بغیر ہی ایلاء باطل ہو گیا، کیونکہ اگر وہ حنث ہوا تو حنث کے سبب کوئی شے اس پر لازم نہ ہوگی اور جب حنث پر قسم توڑنے کے سبب کوئی شے لازم نہیں تو وہ مولیٰ نہ ہوا۔ اور کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز میں ایلاء کے حکم کو اس کے بغیر ساقط کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَبِيحٌ عَلَيْهِمُ** ① اس میں العزيمة کا معنی ہے: کسی شے پر عقد کو مکمل کرنا، کہا جاتا ہے: **عَزَمَ عَلَيْهِ يَغْزِمُ عَزْمًا وَعَزِيمَةً وَعَزِيمًا وَعَزْمَانًا**، واعتزم اعتزاماً، وعزمت عليك لتفعلن، یعنی میں نے تجھ پر قسم کھائی کہ تو ضرور ایسا کرے گا۔

شمر نے کہا ہے: العزيمة والعزم اس سے مراد تیرا کسی کام پر اپنے آپ کو پختہ اور مضبوط کرنا ہے کہ تو اسے کرے گا۔ اور الطلاق من طلقت المرأة تطلق (یہ نصرینصر کے وزن پر ہے) طلاقاً، (میں نے عورت کو طلاق دی وہ طلاق والی ہو گئی) فہی طالق و طالقة۔ (یعنی صفت کا صیغہ مذکر اور مونث دونوں طرح آتا ہے۔) ائشی نے کہا ہے:

أيا جارتا بيني فانك طالقة

اے میری زوجہ! تو مجھ سے علیحدہ ہو جا کیونکہ تو طلاق والی ہے۔

اور طلقت میں (لام کو مضموم پڑھنا بھی) جائز ہے مثلاً عظم يعظم اور اخفش نے اس کا انکار کیا ہے اور طلاق سے مراد ہے نکاح کی گرہ کو کھولنا اور اس کی اصل الانطلاق (جانا) ہے اور المطلقات سے مراد المخليات ہے (یعنی وہ عورتیں جنہیں آزاد چھوڑ دیا گیا) اور الطلاق کا معنی ہے: تخلية (فارغ چھوڑ دینا) کہا جاتا ہے: نعمة طالق و ناقة طالق: یعنی وہ بھیڑ یا اونٹنی جسے کھیت میں مہمل چھوڑ دیا جائے، اس پر کوئی رکاوٹ (قید) نہ ہو اور نہ ہی کوئی چرواہا ہو۔ اور بعید طلق (طاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی وہ اونٹ جو بندھے ہوئے نہ ہوں۔ اور اس کی جمع اطلاق ہے۔ اور حبس فلان في السجن طلقاً ای بغیر قید یعنی فلاں کو قید خانہ میں بغیر بیڑی اور قید کے بند کیا گیا ہے اور الطالق من الابل: یعنی وہ اونٹنی جسے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 182، دار الفکر

اور مدت گزر گئی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ اِس پر دلیل ہے کہ لونڈی ملک یمین کے ساتھ ہوتی ہے اس میں ایلاء نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس پر طلاق واقع نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۖ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣١﴾

”اور طلاق دی ہوئی عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر۔ اور ان کے خاوندز یادہ حقدار ہیں ان کو لوٹانے کے اس مدت میں اگر وہ ارادہ کر لیں اصلاح کا۔ اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق، البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقَاتُ جب اللہ تعالیٰ نے ایلاء کا ذکر فرمایا اور بلاشبہ اس میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے طلاق ہو جانے کے بعد عورت کے حکم کو بیان فرمایا۔

ابو داؤد اور نسائی کی کتاب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ الآیہ کے بارے میں فرمایا کہ آدمی جب اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے اور اگر وہ اسے تین طلاقیں دے تو پس یہ منسوخ ہے (1) اور فرمایا: الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ الآیہ۔

اور الْمُطَلَّقَاتُ لفظ عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے اور وہ ہے مدخول بہا عورتیں اور دخول سے پہلے جس عورت کو طلاق دے دی گئی وہ سورۃ الاحزاب کی آیت کے تحت اس سے خارج ہو گئی۔ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عَدَاةٍ تَعْتَدُوْنَهَا (الاحزاب: ۴۹) (پس تمہارے لئے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو) اس کا بیان آگے آئے گا اور اسی طرح حاملہ عورت اس ارشاد کے ساتھ اس سے خارج ہو گئی: وَأُولَاتُ الْأَحْصَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 4) (اور حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچے جننے تک ہے۔)

اور اقراء سے مقصود استبراء ہے، بخلاف عدت وفات کے کہ وہ عبادت ہے (2) اور وہ صغیرہ جسے ابھی تک حیض نہ آئے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی نسخ الرہجۃ، جلد 1، صفحہ 297، وزارت تعلیم
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ
ایضاً، حدیث نمبر 1876، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ کبیرہ جو ناامیدی کی عمر کو پہنچ جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی عدت مہینے مقرر کی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: بلاشبہ المطلقات میں عموم ان تمام کو شامل ہے پھر انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے، یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ یہ آیت صرف ان عورتوں کے بارے ہے جو حائضہ ہیں اور یہی عورتوں کا عرف ہے اور اسی پر ان کا بڑا حصہ ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **يَتَرَبَّصْنَ**۔ الترتبص کا معنی انتظار کرنا ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ یہ (بظاہر) خبر ہے لیکن اس سے مراد امر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ** (بقرہ: 233) اور جمع رجل علیہ ثیابہ، (اور آدمی اپنے اوپر اپنے کپڑے لے) اور حسبہ درہم یعنی تو ایک درہم پر اکتفا کر۔ یہ اہل زبان کا قول ہے۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اس میں جو ابن الشرحی نے ذکر کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: یہ باطل ہے اور بلاشبہ یہ حکم شریعت کے بارے خبر ہے، پس تو کسی مطلقہ کو پائے کہ وہ انتظار نہیں کرتی تو یہ حکم شریعت کے مطابق نہیں ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی خبر کا مخبر کے خلاف واقع ہونا لازم نہیں آئے گا (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی لیتربصن (یعنی چاہئے کہ وہ انتظار کریں) اور پھر لام کو حذف کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جمہور لوگوں نے قُرْءٌ۔ فُعُول کے وزن پر قراءت کی ہے، اس میں لام کلمہ ہمزہ ہے اور حضرت نافع بن عیث سے قُرْءٌ روایت کیا گیا ہے یعنی واو کے کسرہ اور شد کے ساتھ بغیر ہمزہ کے۔ اور حسن نے قُرْءٌ قاف کے فتح، را کے سکون اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے (3)۔

اور قُرْءٌ، اقْرَءْ اور اقْرَءِ کی جمع ہے (4) اور واحد قُرْءٌ قاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اصمعی نے یہی کہا ہے۔ اور ابو زید نے کہا ہے: قُرْءٌ قاف کے فتح کے ساتھ ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: اقْرَأْتُ الْمَرْأَةَ جب عورت حائضہ ہو جائے۔ فہی مُقْرِء۔ اور اقْرَأْتُ کا معنی طہرت بھی ہے جب وہ پاک ہو جائے۔

اور انخفش نے کہا ہے: اقْرَأْتُ الْمَرْأَةَ (یہ کہا جاتا ہے) جب عورت حیض والی ہو جائے اور جب اسے حیض آئے تو تو کہے گا: قُرَأْتُ، بغیر الف کے۔ کہا جاتا ہے: اقْرَأْتُ الْمَرْأَةَ حَيْضَةً أَوْ حَيْضَتَيْنِ (عورت کو ایک حیض آیا یا دو) اور القراء کا معنی حیض کا ختم ہونا بھی ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ ایام ہیں جو دو حیضوں کے درمیان ہوتے ہیں (یعنی طہر) اور اقْرَأْتُ حاجتک: تیری حاجت قریب آگئی۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔ اور ابو عمرو ابن العلاء نے بیان کیا ہے کہ عربوں میں سے بعض حیض کو قرء کا نام دیتے ہیں، بعض طہر کو قرء کہتے ہیں اور ان میں سے بعض دونوں کو ایک ساتھ قرء کہتے ہیں۔ پس طہر کو حیض کے ساتھ قرء کہا جاتا ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اقراء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے: اہل کوفہ نے کہا ہے: اقراء سے مراد حیض ہیں، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت سدی

2۔ احکام القرآن للماوردی، جلد 1، صفحہ 186، دار الفکر

4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 302، دار الفکر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ

بنی بنیہم نے یہی کہا ہے (1)۔

اور اہل حجاز نے کہا ہے: اقراء سے مراد اطہار ہیں، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت زہری، حضرت ابان بن عثمان اور حضرت امام شافعی بنی بنیہم کا یہی قول ہے۔ پس جنہوں نے حیض کو قرء کا نام دیا ہے تو انہوں نے رحم میں خون جمع ہونے کی وجہ سے یہ نام رکھا ہے اور جنہوں نے اسے طہر کا اسم قرار دیا ہے تو وہ بدن میں خون جمع ہونے کی وجہ سے ہے اور وہ جو القرء میں اس اصل کو تیرے لئے ثابت کر رہا ہے وہ وقت ہے، کہا جاتا ہے: ہبت الريح لقارئھا وقارئھا ای لوقتھا (یعنی ہوا چلی اپنے وقت کے سبب)۔ شاعر نے کہا ہے:

كِرِهْتُ الْعَقْرَ عَقْرًا بَنِي شَلِيلٍ إِذَا هَبَّتْ لِقَارِئِهَا الرِّيحُ (2)

میں نے بنی شلیل کی بستی العقر کو ناپسند کیا جب کہ ہوا میں چلیں اپنے وقت پر۔

اور کہا گیا ہے کہ حیض کے لئے ایک وقت ہے اور طہر کے لئے بھی ایک وقت ہے، کیونکہ یہ دونوں ایک معین وقت کی طرف راجع ہوتے ہیں اور اعشیٰ نے الاطہار کے بارے میں کہا ہے:

أَنِي كُلَّ عَامٍ أَنْتَ جَاشِمٌ غَزْوَةً تَشْدُ لِأَقْصَا عَزِيمٍ عَزَائِكَ

موزثۃ عزا و فی الحق رفعة لِمَا ضَاعَ فِيهَا مِنْ قُرْءٍ نَسَائِكَ (3)

اور ایک دوسرے نے حیض کے بارے میں کہا ہے:

يَا رَبِّ ذِي ضِغْنٍ عَلَى فَارِضٍ لَهُ قُرْءٌ كَقُرْءِ الْحَائِضِ (4)

یعنی اس نے اسے نیزہ مارا تو اس کا خون حیض والی عورت کے خون کی طرح تھا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: یہ قرء الماء فی الحوض سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد حوض میں پانی کا جمع ہونا ہے (5) اور اسی سے القرآن ہے کیونکہ یہ معانی کو مجتمع ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اجتماع حروف کی وجہ سے قرآن کہا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ما قرأت الناقة سَلَى قَطُّ، یعنی کبھی اس کے پیٹ میں جلی جمع نہیں ہوئی اور عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

ذِرَاعِي عَيْطَلٍ أَدْمَاءُ بَكِيٍّ هِجَانُ اللَّوْنِ لَمْ تَقْرَأْ جَنِينًا (6)

تو گو یا رحم حیض کے وقت خون کو جمع کرتا ہے اور جسم طہر کے وقت اسے جمع کرتا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: اس کا قول جس نے یہ کہا کہ القرءان کے اس قول سے ماخوذ ہے: قریت الماء فی الحوض (میں نے حوض میں پانی جمع کیا) یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ القرء مہموز ہے اور یہ غیر مہموز ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

2۔ الملک والعیون للمادودی، جلد 1، صفحہ 292، مؤسسۃ الکتب الثقافتیہ بیروت

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 303، دار الفکر

5۔ ایضاً

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

6۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 365، دار الکتب العربیہ بیروت

میں (مفسر) کہتا ہوں: اہل لغت کی نقل کے مطابق یہ صحیح ہے، یعنی جوہری وغیرہ نے یہ کہا ہے اور اس پانی کا نام قترہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ القراء کا معنی ہے الخروج (نکلنا) یا طہر سے حیض کی طرف یا حیض سے طہر کی طرف، اسی بنا پر امام شافعی نے ایک قول میں کہا ہے: القراء الانتقال من الطهر الى الحيض، یعنی القراء کا معنی طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا ہے اور وہ حیض سے طہر کی طرف نکلنے کو قراء نہیں کہتے۔ اور اشتقاق کے حکم کے مطابق تو لازم آتا ہے کہ وہ بھی قراء ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ کا معنی ہوگا تین ادوار یا تین انتقالات اور مطلقہ عورت صرف دو حالتوں سے متصف ہوتی ہے، پس کبھی وہ طہر سے حیض کی طرف منتقل ہوتی ہے اور کبھی حیض سے طہر کی طرف اس کلام کا معنی صحیح ہو جائے گا اور اس کی دلالت طہر اور حیض دونوں پر ہوگی اور یہ اسم مشترک ہوگا۔

اور کہا جاتا ہے: جب یہ ثابت ہو گیا کہ القراء سے مراد انتقال (تبدیل ہونا) ہے تو عورت کا طہر سے حیض کی طرف نکلنا آیت میں بالکل مراد نہیں اور اسی لئے حالت حیض میں طلاق کا ہونا طلاق سنی (سنت والی) نہیں ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ عدت کے لئے وہ طلاق ہے، کیونکہ عدت کے لئے طلاق وہ ہے جو حالت طہر میں ہو اور یہ القراء کے انتقال سے ماخوذ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور جب حالت طہر میں طلاق سنی ہے تو پھر تقدیر کلام یہ ہوگی: فعدتھن ثلاثة انتقالات، (پس ان کی عدت تین انتقالات ہیں۔) ان میں سے پہلا اس طہر سے انتقال ہے جس میں طلاق واقع ہوئی اور وہ انتقال جو حیض سے طہر کی طرف ہے اسے قراء نہیں بنایا گیا، کیونکہ لغت اس پر دلالت نہیں کرتی، لیکن ہمیں دوسری دلیل سے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ نہیں کیا ہے اور جب ان دو میں سے ایک معنی مراد بہ ہونے سے خارج ہو گیا تو دوسرا مراد بہ باقی رہ گیا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا، پس اس بنا پر اس کی عدت تین انتقالات ہے، ان میں سے پہلا طہر ہے اور اس معنی کی بنا پر کامل تین اقراء کو پورا کرنا ممکن ہوتا ہے بشرطیکہ طلاق حالت طہر میں ہو اور کسی اعتبار سے اسے مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

الکلیا طہری نے کہا ہے: امام شافعی کے مذہب کی انتہائی توجیہ کے لئے یہ گہری نظر ہے اور ممکن ہے کہ ہم اس میں وہ راز ذکر کریں جسے شریعت کی حکمتوں کی باریکیوں میں سے سمجھنا بعید نہ ہوگا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا۔ اسے قراء کہا گیا ہے کیونکہ یہ براءت رحم پر دلالت کرتا ہے تو چونکہ حاملہ عورت کو اغلباً حیض نہیں آتا پس اسے حیض آنا اس کے لئے براءت رحم کی علامت ہے اور حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونا اس کے خلاف ہے اور حیض والی عورت کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے حیض کے بعد حاملہ ہو جائے اور جب حمل برقرار رہے اور بچہ قوی ہو جائے تو اس کا خون منقطع ہو جاتا ہے اسی وجہ سے عرب حالت طہر میں اپنی عورتوں کے حمل کے سبب تعریف کرتے ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیؐ نے رسول اللہ ﷺ کی مدح بیان کی۔ شاعر کہتا ہے:

و مُبْنِئٌ مِنْ كُلِّ غُبْرٍ حَيْضَةٌ وَ فُسَادٌ مُرْضِعَةٌ وَ دَاءٌ مُغْفِلٌ

یعنی یہ کہ اس کی ماں اپنے حیض کے باقی ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ حاملہ نہیں ہوئی۔

پس یہ وہ ہے جو علماء اور اہل زبان نے القراء کی تاویل میں کہا ہے۔ اور انہوں نے کہا: قرأت المرأة قراءاً جب وہ

(عورت) حائضہ ہو یا پاک ہو۔ اور قرأت تب بھی بولا جاتا ہے جب وہ حاملہ ہو اور اس پر انہوں نے اتفاق کیا ہے کہ القراء سے مراد الوقت ہے اور جب تو کہے: **وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ أَقَاتٍ**، تو آیت عدد میں مفسر ہو جائے گی در آنحالیکہ معدود میں احتمال ہوگا۔ اور پھر معدود کے لئے بیان کی تلاش کسی دوسری آیت میں ضروری ہوگی، پس ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَطَلِّقُوهُنَّ لِحَدِّتِهِنَّ** اور انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسے طہر کے وقت طلاق دینے کے بارے حکم دیا جائے گا پس ضروری ہے کہ وہی (طہر) عدت میں بھی معتبر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **فَطَلِّقُوهُنَّ** یعنی تم انہیں ایسے وقت میں طلاق دو جس کے ساتھ عدت گزاری جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ** (اور تم عدت کو شمار کرو) اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ مطلقہ عدت گزاری جاتی ہے اور وہ وہ طہر ہے جس میں طلاق دی جاتی ہے۔

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا: ”اے (یعنی اپنے بیٹے کو) حکم دو کہ وہ اس کی طرف رجوع کر لے پھر اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ (حیض سے) پاک ہو جائے۔ پھر وہ حائضہ ہو پھر وہ پاک ہو پس یہی وہ عدت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو اس وقت طلاق دی جائے (1)۔“ اسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور یہ اس بیان میں نص ہے کہ طہر کا زمانہ ہی وہ ہے جسے عدت کا نام دیا جاتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عورتوں کو طلاق دی جائے گی۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے حالت حیض میں طلاق دی تو وہ اس حیض کو شمار نہ کرے گی اور جس نے حالت طہر میں طلاق دی تو جمہور کے نزدیک وہ اس طہر کو عدت میں شمار کرے گی۔ پس یہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابو بکر بن عبد الرحمن نے کہا ہے: ہم اپنے فقہاء میں سے کسی کو نہیں جانتے مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کے مطابق وہ یہ کہتا ہے کہ اقراء سے مراد اطہار ہیں۔ پس جب آدمی ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس نے وطی نہ کی تو عورت مابقی طہر کو شمار کر لے گی اگرچہ وہ ایک ساعت اور ایک لحظہ ہو، پھر وہ حیض کے بعد دوسرے طہر کی طرف متوجہ ہوگی، پھر دوسرے حیض کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوگی۔ پس جب اس نے تیسرے حیض کا خون دیکھ لیا تو وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی (یعنی وہ نئی شادی کر سکتی ہے) اور عدت سے نکل گئی۔

اور اگر طلاق دینے والے نے ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے مباشرت کی تھی تو طلاق ثابت ہو جائے گی اور وہ گنہگار ہوگا اور وہ اس طہر میں سے مابقی کے ساتھ عدت گزارے (3)۔ اور زہری نے ایسی عورت کے بارے میں کہا ہے جسے طہر کے دوران طلاق دی گئی کہ وہ اس طہر کے مابقی دنوں کے سوا تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی (☆)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب تحريم طلاق الحائض، جلد 1، صفحہ 476، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ بیروت

☆ عورت کی عدت حیض کے اعتبار سے یا طہر کے اعتبار، ائمہ فقہ کا اس میں اختلاف ہے ائمہ احناف کے نزدیک حیض کے اعتبار سے ہے احناف کے دلائل قوی ہیں تفصیل ”ہدایہ“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے یہ کہا ہو کہ الاقراء سے مراد اطہار ہیں۔ یہ ابن شہاب زہری کے علاوہ کوئی کہتا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے وہ طہر جس میں طلاق دی گئی وہ لغو ہو جائے گا پھر وہ عورت تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ثَلَاثَةٌ قُرْءٍ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول کی بنا پر مطلقہ عورت حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ چوتھے حیض میں داخل ہو جائے اور ابن القاسم اور امام مالک اور آپ کے جمہور اصحاب، امام شافعی اور علمائے مدینہ رحمہ اللہ علیہم کا قول ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض کا پہلا نقطہ دیکھے گی تو وہ عصمت (پابندی) سے نکل جائے گی (1)، یہی حضرت زید بن ثابت، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے اور اسی کی طرف داؤد بن علی اور ان کے اصحاب گئے ہیں۔

اور زہری کے خلاف دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاہر کی طلاق میں بغیر جماع کے اجازت عطا فرمائی اور اول طہر اور آخر طہر کا ذکر نہ فرمایا۔

اور اشہب نے کہا ہے: عصمت اور میراث منقطع نہیں ہوتیں یہاں تک کہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دم حیض ہے، تاکہ ایک دفعہ خون کا آنا دم حیض کے سوا کوئی اور نہ ہو (2)۔

علمائے کوفہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت ابی حبیش کو اس وقت فرمایا جب اس نے آپ کے پاس خون کی شکایت کی: ”بے شک وہ ایک رگ ہے پس تو ابھی دیکھ اور جب تجھے دم حیض آئے تو تو نماز نہ پڑھ اور جب حیض کے ایام گزر جائیں تو تو طہارت حاصل کر (غسل کر لے) پھر ایک حیض سے دوسرے حیض تک نمازیں پڑھتی رہ (3)۔“

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالَّتِي يَمْسُكُ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَاءِ بِلْكُمْ اِنْ اُرْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ اَشْهُرٍ (الطلاق: 4) (اور تمہاری (مطلقہ) عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔) پس جس سے اسے ناامید اور مایوس قرار دیا گیا ہے وہ حیض ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہی عدت ہے اور جو اس کا عوض بنایا گیا ہے وہ مہینے ہیں جبکہ وہ معدوم ہو (یعنی حیض نہ آنے کی صورت میں عدت مہینوں کے ساتھ ہوگی۔) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں کہا کہ لونڈی کی عدت دو حیض ہے (یعنی) آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے۔ اور اگر میں اس پر قدرت رکھتا کہ میں اس کی عدت ایک کامل اور ایک نصف حیض مقرر کر سکوں تو میں کر دیتا اور کسی صحابی نے بھی آپ کی بات کا انکار نہ کیا۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ ان کی طرف سے اجماع ہے اور یہی دس صحابہ کرام کا قول ہے انہیں میں سے خلفائے اربعہ بھی ہیں اور تیسرے لئے وہی کافی ہے جو انہوں نے کہا ہے! اور قول باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرْءٍ اس پر

1۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

3۔ منن نسائی، کتاب الطہارۃ، باب ماء الرجل وماء المرأة، جلد 1، صفحہ 45، وزارت تعلیم

دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا معنی یتربصن ثلاثۃ اقراء ہے اور اس سے مراد کامل تین حیض ہیں اور یہ ممکن نہیں ہو سکتا مگر ہمارے قول کے مطابق کہ اقراء سے مراد حیض ہیں کیونکہ جو کہتے ہیں کہ مراد طہر ہیں وہ جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ دو طہر اور تیسرے کے بعض ایام عدت گزارے، کیونکہ جب اس نے حالت طہر میں طلاق دی تو وہ ان کے نزدیک اس طہر کا بقیہ حصہ عدت گزارے، یہی ایک قرء ہے اور ہمارے نزدیک وہ شروع حیض سے آغاز کرے گی تاکہ اسم (قرء) صادق آجائے اور جب آدمی نے عورت کو ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے وطی نہ کی تو وہ متوجہ ہوگی حیض کی طرف پھر حیض کی طرف پھر حیض کی طرف (یعنی وہ تین حیض عدت گزارے گی) اور جب وہ تیسرے حیض سے غسل کر لے تو وہ عدت سے نکل جائے گی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رکرتا ہے: سَخَّرَہَا عَلَیْہُمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَثَمَنِیَّةَ اَیَّامٍ (الحاقۃ: 7) (اللہ نے مسلط کر دیا اسے ان پر) (مسلل) سات رات اور آٹھ دن تک) اور ثمانیۃ ایام میں ہاء کو ثابت رکھا ہے، کیونکہ الیوم مذکور ہے اور اہل طہر القراء ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہی مراد ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ہمارے ساتھ اس میں موافقت کی ہے کہ عورت کو جب حالت حیض میں طلاق دی جائے کہ وہ اس حیض کو عدت میں شمار نہ کرے گی جس میں اسے طلاق دی گئی اور نہ ہی اس طہر کو جو اس حیض کے بعد ہوگا، بلکہ وہ عدت کا آغاز اس حیض سے کرے گی جو طہر کے بعد ہوگا اور ہمارے نزدیک وہ طہر سے عدت شروع کرے گی، جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور اہل لغت نے جائز قرار دیا ہے کہ وہ بعض کو کل کے نام سے تعبیر کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْحَبُّ اَشْہَرُ مَعْلُوْمٌ اور اس سے مراد شہران (دو مہینے) اور تیسرے کے بعض ایام ہیں (1) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ثَلَاثَہٗ قُرُوْءٍ ہے۔ واللہ اعلم

اور جو یہ کہتے ہیں کہ قرء سے مراد حیض ہیں ان میں سے بعض نے کہا ہے جب وہ تیسرے حیض سے پاک ہو جائے تو غسل کے بعد اس کی عدت گزر گئی اور رجعت کا حق باطل ہو گیا (2)۔ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابن شبرمہ اور امام اوزاعی رحمہم نے یہی کہا ہے۔

اور شریک نے کہا ہے: جب عورت غسل میں بیس برس تک کو تاہی کرے گی تو اس کے خاوند کو اس پر رجعت کا حق حاصل رہے گا جب تک وہ غسل نہ کر لے۔

اور اسحاق بن راہویہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب تیسرے حیض میں عورت میں عیب پڑ گیا تو وہ جدا ہو جائے گی اور خاوند کے لئے رجوع کا حق منقطع ہو جائے گا، مگر یہ کہ عورت کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے حیض سے غسل کر لے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ قول ضعیف ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْہِمَا فَعَلْنَ فِیْ اَنْفُسِهِنَّ بِاَلْمَعْرُوْفِ (البقرہ: 234) (اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس)

مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے) اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور رہا وہ جو امام شافعی نے ذکر کیا ہے کہ طہر سے حیض کی طرف نفس انتقال کو قرء کا نام دیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ عورت پر عدت کو کم کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ جب وہ عورت کو اس کے طہر کی آخری ساعت میں طلاق دے پھر وہ حیض میں داخل ہو جائے تو وہ اسے ایک قرء شمار کر لے گی اور تیسرے طہر سے منتقل ہوتے ہی عصمت منقطع ہو گئی اور وہ حلال ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ وہ لونڈی جسے حیض آتا ہے جب اس کا خاوند اسے طلاق دے تو اس کی عدت دو حیض ہوگی۔ اور ابن سیرین سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں لونڈی کی عدت کو آزاد عورت کی عدت کی طرح ہی دیکھتا ہوں مگر یہ کہ اس میں کوئی سنت جاری ہو چکی ہو، کیونکہ سنت زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

اور الاصح عبد الرحمن بن کیسان، داؤد بن علی اور اہل ظاہر کی ایک جماعت نے کہا ہے: بے شک طلاق اور وفات کی عدت مہینوں اور حیضوں کے ساتھ ہے اس سے متعلقہ آیات لونڈی اور آزاد عورت کے حق میں عام ہیں، پس آزاد اور لونڈی کی مدت برابر ہے۔

اور جمہور نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: طلاق الأمة تطليقتان و عدتها حیضتان (1) (لونڈی کی طلاق دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں) اسے ابن جریج نے عطاء بن مظاہر بن اسلم عن ابیہ عن القاسم بن محمد عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بیان کیا ہے۔ قالت: قال رسول اللہ ﷺ: طلاق الأمة تطليقتان و قرءاها حیضتان (2) آپ نے طلاق اور عدت دونوں کی اکٹھی نسبت اس کی طرف کی ہے مگر مظاہر بن اسلم اس حدیث کے ساتھ منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ان دونوں میں سے جو بھی غلام ہوا اس کی طلاق کم ہوگی۔ اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

قوله تعالى: وَلَا يَحِلُّ لَهِنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَنْفُسِهِنَّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قوله تعالى: وَلَا يَحِلُّ لَهِنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَنْفُسِهِنَّ یعنی حیض میں سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اسے چھپانا ان کے لئے جائز نہیں۔ حضرت عکرمہ، زہری اور نخعی رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حمل ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے (3)۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد حیض اور حمل دونوں ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ حاملہ عورت حائضہ ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطليقتان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب لی سنة طلاق العبد، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم

جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطليقتان، حدیث نمبر 1102، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2069، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ

آیت سے معنی مقصود یہ ہے کہ جب عدت کا دار و مدار حیض اور اطہار پر ہے اور دونوں پر اطلاع فقط عورتوں کی جانب سے ہو سکتی ہے تو پھر اس میں قول عورت کا ہی تسلیم کیا جائے گا جب وہ عدت کے گزرنے یا نہ گزرنے کا دعویٰ کرے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر امین بنادیا ہے اور یہی اس ارشاد کا مقتضی ہے: **وَلَا يَحِلُّ لَكُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَنْفُسِهِنَّ**۔ (1)

اور سلیمان بن یسار نے کہا ہے: ہمیں حکم نہیں دیا گیا ہے کہ ہم عورتوں کو کھولیں اور ان کی شرمگاہوں کی طرف دیکھیں، بلکہ اسے ان کے سپرد کیا گیا ہے کیونکہ انہیں اپنے آپ پر امین بنایا گیا ہے۔

اور چھپانے سے منع کرنے کے معنی مرد کو نقصان پہنچانے اور اس کا حق ضائع کرنے سے منع کرنا ہے، پس جب مطلقہ نے کہا: میں حیض سے ہوں، حالانکہ وہ حیض سے نہ ہو تو اس نے مرد کے رجوع کا حق ضائع کر دیا اور جب اس نے کہا: میں حیض سے نہیں ہوں، حالانکہ وہ حالت حیض میں ہو تو اس نے مرد پر وہ نفقہ لازم کر دیا جو اس پر لازم نہیں تو اس طرح اس نے مرد کو ضرر اور نقصان پہنچایا یا وہ حیض کی نفی کے بارے اپنے جھوٹ سے یہ قصد کرتی ہے کہ اسے واپس نہ لوٹایا جاسکے یہاں تک کہ عدت گزر جائے اور شریعت اس کے حق کو ختم کر دے اور اسی طرح حاملہ عورت حمل کو چھپاتی ہے تاکہ وہ مرد رجوع کے حق کو ختم کر دے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: دور جاہلیت میں ان کی عادت تھی کہ وہ حمل کو چھپاتی تھیں تاکہ وہ بچے کو نئے خاوند کے ساتھ ملا دیں، پس اس بارے میں آیت نازل ہوئی (2)۔

اور بیان کیا گیا ہے کہ اشجع کا ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور وہ حاملہ ہے اور مجھے اس کے شادی کرنے سے امن نہیں ہے اور میرا بیٹا دوسرے کے پاس چلا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اشجعی کی عورت اس کے پاس لوٹا دی گئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن منذر نے بیان کیا ہے: اہل علم میں سے ہر اس نے کہا جس سے میں نے حفظ کیا: جب عورت نے دس دنوں میں کہا: میں نے تین حیض گزار لئے ہیں اور میری عدت گزر چکی ہے۔ بلاشبہ اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور اس سے وہ قول قبول نہیں کیا جائے گا، مگر وہ یہ کہے: میں نے کچا بچہ (سقط) گرا دیا ہے تحقیق اس کی خلقت ظاہر ہو چکی تھی (تب اس کا قول قبول کر لیا جائے گا)۔

اور اس مدت میں علماء کا اختلاف ہے جس میں عورت کے قول کی تصدیق کی جائے گی، تو حضرت امام مالک نے کہا ہے: جب اس نے کہا ”میری عدت گزر چکی ہے“ یہ اتنی مدت میں کہا جس کی مثل میں عدت گزر سکتی ہے تو اس کا قول قبول کیا جائے گا (3) اور اگر اس نے اتنی مدت میں عدت گزرنے کی خبر دی جس میں شاذ و نادر ایسا ہو سکتا ہے تو اس کے بارے دو قول ہیں۔ آپ نے المدونہ میں فرمایا: جب عورت نے کہا میں نے ایک مہینے میں تین حیض گزار لئے ہیں اس کی تصدیق کر لی جائے بشرطیکہ عورتیں اس کی تصدیق کر دیں (4)، اسی طرح شریح نے کہا ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا قانون!

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دارالکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 12

3۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب ارخاء السور، باب دعوی المرأة القضاء عدتها، جلد 5، صفحہ 10، السعادة بجوار الحافظ مصر

یعنی تو نے درست کہا اور اچھا کہا۔

اور کتاب محمد میں فرمایا: اس کی تصدیق نہ کی جائے گی مگر ڈیڑھ ماہ میں۔ اور اسی طرح ابو ثور کا قول ہے۔ ابو ثور نے کہا ہے: کم سے کم اس کے قول کی تصدیق سینتالیس دنوں میں ہو سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہے اور کم سے کم حیض کی مدت ایک دن ہے۔ اور حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ساٹھ دنوں سے کم مدت میں عورت کے قول کی تصدیق نہیں کی جائے گی، اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔

قوله تعالى: **إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ**، رحم میں موجود شے کو چھپانے کی حرمت کی تاکید کے لئے یہ انتہائی شدید اور عظیم وعید ہے اور فی الحقیقت رحم میں جو کچھ ہے اس کے بارے خبر دینے کی امانت کی ادائیگی کے لئے واجب ہونے کا اظہار ہے۔ یعنی مومن عورتوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، **إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَنَّ بِاللَّهِ** کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو ایمان نہیں رکھتا اس کے لئے چھپانا مباح ہے، کیونکہ ایسا کرنا اس کے لئے بھی حلال نہیں جو ایمان نہیں رکھتا، بلاشبہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: ان كنت اخي فلا تظلمني (اگر تو میرا بھائی ہے تو تو مجھ پر ظلم نہ کر)، (بلکہ مقصود یہ ہے) کہ چاہئے ایمان تجھے ایسا کرنے سے روکے، کیونکہ ایسا کرنا اہل ایمان کے فعل میں سے نہیں ہے (یعنی ان کے شایان شان نہیں ہے)۔

قوله تعالى: **وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ** اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قوله تعالى: **وَبُعُولَتُهُنَّ**۔ البعولة: البعل کی جمع ہے اور اس کا معنی زوج (خاوند) ہے (1) اور اسے بعل اس لئے نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ زوجہ پر ان چیزوں کے بارے میں غالب اور بلند ہوتا ہے جن کا وہ اس کی زوجیت کے اعتبار سے مالک ہوتا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **أَتَذْكُرُونَ بَعْلًا** (الصافات: 125) اسی ربنا۔ کیا تم رب کو پکارتے ہو۔ تو اسے ربوبیت میں بلند ہونے کی وجہ سے بعل کہا گیا ہے، کہا جاتا ہے: **بُعُولَةٌ**۔ جیسا کہ ذکر کی جمع میں کہا جاتا ہے **ذَكَرٌ** و **ذُكُورٌ** اور **فَحْلٌ** و **فُحُولَةٌ**، اس کے آخر میں یہ ہازائدہ ہے اور جمع مؤنث کی تاکید کے لئے ہے (2) اور یہ شاذ ہے، اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جاسکتا اور اس میں سماع معتبر ہوتا ہے، پس **لُعْبٌ** میں **لُعُوبَةٌ** نہیں کہا جاسکتا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ ہاتانیت ہے جو **فُعُولٌ** پر داخل کی گئی ہے (3)۔

اور **الْبُعُولَةُ** البعل کا مصدر بھی ہے اور **بَعَلَ** الرجل **يَبْعَلُ** (مثل **مَنْعَ يَنْعُ**) **بُعُولَةٌ**، یعنی آدمی بعل ہو گیا اور **المباعدة** اور **البعال** کا معنی جماع ہے۔ اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایام تشریق کے بارے ارشاد گرامی ہے: **انها أيام أكل وشرب وبعال** (4) (کہ وہ کھانے، پینے اور جماع کرنے کے دن ہیں)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس آدمی عورت کے لئے بعل ہوتا ہے اور عورت مرد کے لئے **بعلة** ہوتی ہے اور **بَاعِلٌ** **مُباعدة** کہا جاتا ہے جب وہ اس سے مباشرت کرے اور **فلان بعلة** هذا، یعنی فلاں اس کا مالک اور مربی ہے۔ اس کے کثیر محامل ہیں وہ آگے آئیں گے۔ ان شاء اللہ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ وَهْنٌ وہ انہیں واپس لوٹانے کا زیادہ حق رکھتا ہے: پس مراجعت کی دو صورتیں ہیں: ایک مراجعت عدت کے دوران اس کی بنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث پر ہے اور دوسری مراجعت عدت کے بعد اس کی بنا حضرت معقل کی حدیث پر ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر آیت میں اس کی تخصیص پر دلیل ہوگی جسے مسمیات کا عموم شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ عام ہے ان کے بارے میں بھی جنہیں تین طلاقیں دی گئی ہوں اور ان کے بارے میں بھی جنہیں تین سے کم دی گئی ہوں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَبُعُو لَتِهِنَّ أَحَقُّ یہ اس کے بارے میں خاص حکم ہے جس کی طلاقیں تین سے کم ہوں۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی آزاد بیوی کو طلاق دے ایک طلاق یا دو طلاقیں اور وہ مدخول بھا بھی ہو تو وہ اس کی طرف رجوع کا زیادہ حق رکھتا ہے جب تک اس کی عدت نہ گزرے اگرچہ عورت ناپسند بھی کرے اور اگر طلاق دینے والے نے اس کی طرف رجوع نہ کیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی تو پھر وہ عورت اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے اور وہ اس سے اجنبیہ ہو جائے گی اور وہ اس کے لئے ولی کی اجازت اور شاہدوں کی شہادت کے ساتھ نیا نکاح کیے بغیر حلال نہیں ہوگی نہ کہ مراجعت کے طریقہ پر، اس پر علماء کا اجماع ہے۔

مہلب نے کہا ہے: ہر وہ جس نے عدت کے دوران رجوع کر لیا صرف رجوع پر گواہ بنائے بغیر احکام نکاح میں سے کوئی شے اس پر لازم نہ ہوگی۔ اس پر بھی علماء کا اجماع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَى عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق: 2) (تو جب پہنچنے لگیں اپنی میعاد کو تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور گواہ مقرر کر لو دو معتبر آدمی اپنے میں سے) پس رجعت میں تو گواہ بنانے کا ذکر کیا ہے اور نکاح اور طلاق میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہم نے کتاب اللہ میں جو مسائل اہل علم کے اجماع کے ساتھ ذکر کر دیے ہیں وہ کافی ہیں ان کے ذکر کی حاجت نہیں جو اس باب میں متقدمین سے مروی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے جس کے ساتھ ایک آدمی عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: جب آدمی عدت کے دوران عورت سے وطی کرے اور وہ رجعت کا ارادہ رکھتا ہو اور وہ شاہد بنانے سے جاہل ہو اور ناواقف ہو تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کو مباشرت سے روکے، یہاں تک کہ وہ گواہ بنالے۔ اسی طرح اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: انما الاعمال بالنیات وانما لكل امرئ ما نوى (1) (اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔)

اور اگر اس نے عدت میں وطی کی لیکن وہ رجعت کی نیت نہیں کرتا تو امام مالک نے فرمایا ہے: وہ عدت میں رجوع کر سکتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان باب کیف کان ہدء الوحی، جلد 1، صفحہ 2، وزارت تعلیم

ہے اور وہ اس سے وطی نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اسے فاسد پانی سے استبرا کرالے (1) (یعنی یہ یقین کر لے کہ پہلی وطی سے استقرا حمل نہیں ہوا)۔

ابن قاسم نے کہا ہے: اگر اس کی عدت گزر جائے تو وہ اور کوئی غیر بقیہ مدت استبرا میں اس کے ساتھ نکاح نہ کرے، اگر اس نے کیا تو اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا اور عورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام نہیں ہوگی کیونکہ وہ پانی بھی تو اسی کا پانی ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب مرد نے عورت کے ساتھ مجامعت کر لی تو اس نے اس کی طرف رجوع کر لیا: اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حسن بصری، ابن سیرین، زہری، عطاء، طاؤس اور ثوری رحمہم نے کہا ہے۔ مزید کہا: اور وہ شاہد بنا لے گا، اسی طرح اصحاب الرائے، امام اوزاعی اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم نے کہا ہے، اسے ابن منذر نے بیان کیا ہے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: تحقیق کہا گیا ہے: اس کی وطی ہر حال میں رجوع ہوگی، چاہے وہ رجعت کی نیت کرے یا نہ کرے اور امام مالک رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے ایک فریق سے اسی طرح روایت کیا جاتا ہے اور یہی موقف لیث نے اپنایا ہے۔ اور انہوں (علماء) نے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی لونڈی خیار کے ساتھ فروخت کی کہ اس کے لئے مدت خیار میں اس کے ساتھ وطی کرنا مباح ہے اور یہ کہ وہ اس کے ساتھ اسے اپنی ملکیت کی طرف واپس لوٹا لائے اور اسے اپنے اس فعل کے ساتھ بیع توڑنے کا اختیار ہے اور یہ حکم مطلقہ رجعیہ کے لئے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس نے بوسہ لیا یا مباشرت کی اور اس سے وہ رجعت کی نیت کرتا ہے تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور اگر اس نے بوسہ اور مباشرت سے رجعت کی نیت نہ کی تو وہ گنہگار ہوگا اور رجوع کرنے والا نہ ہوگا اور سنت یہ ہے کہ وہ وطی کرنے سے پہلے یا بوسہ لینے یا مباشرت سے پہلے گواہ بنا لے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے وطی کی یا شہوت کے ساتھ اسے مس کیا یا شہوت کے ساتھ اس کی فرج کی طرف دیکھا تو اس کی رجعت ثابت ہو جائے گی، یہی امام ثوری کا قول ہے اور اسے چاہیے کہ وہ گواہ بنا لے اور امام مالک، امام شافعی، اسحاق، ابو عبید اور ابو ثور رحمہم کے قول کے مطابق رجعت ثابت نہ ہوگی۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے اور المنتقی میں کہا ہے بالقول رجوع کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور رہا بالفعل جیسا کہ جماع اور بوسہ وغیرہ تو قاضی ابو محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے: ان کے ساتھ اور ان تمام افعال کے ساتھ جو حصول لذت کے لئے کیے جاتے ہیں رجوع صحیح ہوتا ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: لذت کے لئے جسم کو چھونا یا اس کی فرج کی طرف دیکھنا یا اس کے محاسن میں سے جو اس کے قریب ہیں انہیں دیکھنا جبکہ وہ اس سے رجعت کا ارادہ کرے بخلاف امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول کے کہ رجعت صحیح نہیں ہوتی مگر بالقول، اسے ابن منذر نے ابو ثور، جابر بن زید اور ابو قلابہ رحمہم سے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے جماع کیا وہ رجعت کی نیت کرے یا اس کی نیت

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العداۃ و طلاق السنۃ، باب ما جاء من عدة المطلقة، جلد 5، صفحہ 122، السعادة بکوار محالفة مصر

نہ کرے تو اس طرح رجعت ثابت نہ ہوگی اور اس کے لئے مرد پر مہر مثل ہوگا۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی، کیونکہ اگر وہ اسے لوٹا لیتا تو اس پر کوئی مہر نہ تھا اور بغیر رجعت کے وطی مہر کے عوض رجعت سے اولی نہیں ہوگی۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا سوائے امام شافعی کے کہ جس نے اس پر مہر مثل واجب کیا ہو اور ان کا قول قوی نہیں ہے، کیونکہ یہ عورت زوجات کے حکم میں ہے اور یہ اس مرد کی وارث بنتی ہے اور وہ اس کا وارث بنتا ہے تو کس طرح اس عورت کے ساتھ وطی کرنے میں مہر مثل واجب ہوگا جس کا حکم اپنے اکثر احکام میں زوجہ کے حکم کی مثل ہے، مگر یہ کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے قول میں شبہ قوی ہے، کیونکہ بغیر رجعت کے اس عورت کو اس مرد پر حرام قرار دیا گیا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے کہ وہ عورت جس کے ساتھ شبہ کے سبب وطی کی جائے اس کے لئے مہر واجب ہوتا ہے اور تجھے یہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا آدمی عورت کی طرف رجوع کرنے سے پہلے اس کے ساتھ سفر کر سکتا ہے؟ تو امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ رجوع کر لے (1)۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ اور امام زفر کے سوا آپ کے دیگر اصحاب رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ کیونکہ امام زفر سے حسن بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ آدمی کے لئے رجعت سے پہلے اس کے ساتھ سفر کرنا جائز ہے اور ان سے عمرو بن خالد نے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے کہ کیا آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کے پاس داخل ہو اور اس کے محاسن میں سے کوئی شے دیکھے اور کیا وہ عورت اس کے لئے بناؤ سنگھار کرے گی اور پھر اس پر ظاہر ہوگی؟ تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ اس کے ساتھ خلوت اختیار نہیں کر سکتا اور نہ ہی بغیر اجازت کے وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف وہ دیکھ سکتا ہے مگر یہ کہ اس پر کپڑے ہوں اور نہ ہی وہ اس کے بالوں کی طرف دیکھ سکتا ہے اور کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھائے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ان کے سوا کوئی اور بھی ہو اور نہ وہ ایک کمرے میں اس کے ساتھ رات بسر کر سکتا ہے بلکہ وہ اس سے (دوسرے کمرے میں) منتقل ہو جائے گا۔

ابن قاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمہ اللہ نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور کہا ہے: نہ وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بال دیکھ سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے بناؤ سنگھار کر سکتی ہے، خوشبو لگا سکتی ہے، زیور پہن سکتی ہے اور اس کے سامنے بھی آ سکتی ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے فرمایا: جب آدمی اپنی عورت کو ایک طلاق دے دے تو وہ اس کے پاس اجازت لے کر آ سکتا ہے اور وہ لباس اور زیور میں سے جو چاہے پہن سکتی ہے اور اگر ان دونوں کے لئے ایک کمرے کے سوا اور کوئی نہ ہو تو

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدة و طلاق السنة، جلد 5، صفحہ 146، المساعدة بخوارم حافظہ مصر

وہ اپنے درمیان پردہ ڈال لیں اور آدمی اس کے پاس داخل ہوتے وقت سلام کہے۔ اسی طرح حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے اور وہ اسے کنکھارنے یا کھانسنے وغیرہ کے ساتھ اپنے آنے کا احساس دلائے جب وہ داخل ہو۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ عورت جسے ایک طلاق دی گئی ہو آدمی اس کی طرف رجوع کا مالک ہوتا ہے اور وہ طلاق دینے والے پر طلاق بائنہ والی کی طرح حرام کی گئی ہے یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے اور وہ رجوع نہیں کرے گا مگر قول کے ساتھ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ طلاق دینے والے نے جب عدت گزرنے کے بعد کہا: بلاشبہ میں نے عدت میں تیری طرف رجوع کر لیا تھا اور اس نے انکار کر دیا، تو اس میں عورت کا قول اس کی قسم کے ساتھ قبول کر لیا جائے گا اور آدمی کو اس پر کوئی اختیار نہ رہے گا، مگر حضرت نعمان (امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ) نکاح اور رجعت میں قسم کا نظریہ نہیں رکھتے اور صاحبین نے اس میں ان کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور ان دونوں نے دیگر تمام اہل علم کے قول کی مثل ہی کہا ہے۔ اور اسی طرح جب بیوی لونڈی ہو اور آقا اور لونڈی کا اختلاف ہو جائے اور خاوند عدت گزرنے کے بعد عدت میں رجوع کا دعویٰ کرتا ہو اور اس (لونڈی) نے انکار کیا ہو تو اس میں قول زوجہ لونڈی کا معتبر ہوگا اگرچہ اس کا آقا اسے جھوٹا قرار دے، یہی امام شافعی، ابو ثور اور نعمان رحمہ اللہ کا قول ہے اور یعقوب اور محمد نے کہا ہے: قول آقا کا معتبر ہوگا کیونکہ وہی اس کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ لفظ رد عصمت کے زوال کا تقاضا کرتا ہے مگر ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک طلاق رجعی وطی کو حرام کر دیتی ہے اور رجوع اسے حلت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

اور لیث بن سعد، ابو حنیفہ اور جنہوں نے ان دونوں کے قول کے مطابق کہا ہے، **۱۰** کا بیان ہے کہ رجعت وطی کو حلال کر دیتی ہے، طلاق کا فائدہ اس عدد کو کم کرنا ہے جو صرف اس کے لئے رکھا گیا ہے اور احکام زوجیت باقی ہیں ان میں سے کوئی شے نہیں کھلی۔ انہوں نے کہا: احکام زوجیت اگرچہ باقی ہیں، لیکن جب تک عدت میں ہے وہ عدت گزرنے کے ساتھ زوال کے راستے پر چل رہی ہے۔ پس رجعت اس راستے سے واپس لوٹانے کا نام ہے جسے عورت نے اپنے چلنے کے لئے اختیار کر رکھا ہے۔ اور یہ رد مجازی ہے اور وہ رد جس کے ساتھ ہم نے حکم لگایا وہ رد حقیقی ہے کیونکہ وہاں زوال رو پڑ رہا ہے اور وہ وطی کو حرام قرار دینا ہے، پس اس سے حقیقۃً رد (رجوع) واقع ہوا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 10۔ لفظ اَحَقُّ کا اطلاق دو حقوں کے درمیان تعارض کے وقت ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حق ترجیح پا جاتا ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ انتظار کی مدت (عدت) میں خاوند کا حق عورت کے بارے میں اس کے اپنے حق سے زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ عورت عدت گزرنے کے بعد اپنے نفس کی مالک بنتی ہے اور اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے: **الایم احق بنفسها من ولیها (1)** (بیوہ عورت اپنے بارے میں اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق رکھتی ہے۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ آدمی کے لئے رجوع مستحب ہے لیکن جب عورت کے لئے اپنے احوال کی اصلاح کے سبب

اصلاح کا قصد کرے اور آپس میں وحشت کو زائل کرنے کا قصد کرے اور اگر عورت کو ضرر پہنچانے، عدت کو طویل کرنے اور اس کے ساتھ نکاح کے پٹے سے خلاصی پانے کو قطع کرنے کا قصد اور ارادہ کرے تو پھر اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے: وَلَا تُسَيِّئُوا مِمَّا رَزَاكُمَا (البقرہ: 231) (اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو) پھر جس نے ایسا کیا تو رجعت صحیح ہوگی۔ اگرچہ اس نے نہی کا ارتکاب کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا اور اگر ہم نے اس مقصد کو جان لیا تو ہم اسی پر چھوڑ دیں گے۔

قوله تعالى: وَلَكِنَّ مِثْلَ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ، اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قوله تعالى: وَلَكِنَّ مِثْلَ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ، اس میں تین مسائل ہیں: اس کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ میں اپنی بیوی کے لئے زیب و زینت کا انتظار کرتا ہوں جس طرح وہ میرے لئے بناؤ سنگھار کرتی ہے اور میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ یہی ہے کہ میں اپنے وہ تمام حقوق اچھی طرح حاصل کروں جو میرے اس پر ہیں اور وہ اپنے وہ حقوق حاصل کرے جو اس کے مجھ پر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَكِنَّ مِثْلَ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ (اور ان کے بھی حقوق ہیں) (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق) یعنی ایسی زینت جس میں گناہ نہ ہو۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے: یعنی ان کے لئے حسن صحت اور حسن سلوک ان کے خاوندوں پر اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے لئے ان پر ہر اس کام میں اطاعت واجب ہے جو وہ ان پر لازم قرار دیں۔

اور کہا گیا ہے: بے شک ان کے لئے ان کے خاوندوں پر انہیں اذیت نہ دینا اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے لئے مضرت کو ترک کرنا ان پر لازم ہے۔ علامہ طبری رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: تم ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح کہ ان پر لازم ہے کہ وہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں (1)۔ تمام معانی باہم قریب قریب ہیں اور یہ آیت حقوق زوجیت سے متعلقہ تمام حقوق کو شامل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ”بلاشبہ میں اپنی زوجہ کے لئے زیب و زینت کرتا ہوں“۔ (2)

علماء نے کہا ہے: رہی مردوں کی زینت تو اس کا انحصار ان کے مختلف احوال پر ہوتا ہے۔ بے شک وہ اس کے اعمال نرم مزاجی، خوش اخلاقی اور اتفاق کی بنا پر کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک طرح کی زینت ایک وقت میں مناسب ہوتی ہے اور ایک وقت میں وہی مناسب نہیں ہوتی، کبھی ایک طرح کی زینت جوانوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور ایک زینت بوڑھوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور وہ جوانی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ شیخ اور بوڑھا آدمی جب اپنی لمبیں مونڈ دے تو یہ اس کے لئے موزوں ہے اور اس کے لئے باعث زینت ہے اور جوان جب ایسا فعل کرے تو وہ بد صورت ہو جاتا ہے اور اسے ناپسند کیا جاتا ہے، کیونکہ داڑھی ابھی بڑھی نہیں اور جب وہ اپنی لمبیں مونڈ دے جو نہی وہ پہلی بار ظاہر ہوں تو

اس کا چہرہ قبیح ہو جاتا ہے اور جب اس کی داڑھی بڑھ جائے اور وہ اپنی لبوں کو مونڈ دے تو یہی اس کے لئے زینت بن جاتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے رب نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں داڑھی مبارک کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دوں اور اپنی لبوں کو کاٹوں (1)۔“ اسی طرح لباس کی کیفیت اور حالت بھی ہے۔ اور ان تمام میں حقوق کی طلب اور چاہت ہے۔ بلاشبہ وہ نرم مزاجی اور خوش اسلوبی سے کام کرتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کے نزدیک اتنا حسین اور خوبصورت ہو جائے کہ اسے خوش کر دے۔ اور وہ اسے کسی بھی غیر مرد سے پاکدامن کر دے۔ اسی طرح سرمہ ہے مردوں میں سے بعض کے ساتھ وہ مناسبت رکھتا ہے اور بعض کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ اور جہاں تک خوشبو لگانا، مسواک کرنا، دانتوں کا خلال کرنا، میل کچیل اور فالتو بالوں کو دور کرنے، پاکیزگی و طہارت حاصل کرنے اور ناخن تراشنے کا تعلق ہے تو یہ اعمال بالکل ظاہر اور تمام کے موافق ہیں اور خضاب بوڑھوں کے لئے اور انگوٹھی جوانوں اور بوڑھوں تمام کے لئے زینت ہے اور یہ مردوں کا زیور ہے۔ اس کا بیان سورہ النحل میں آئے گا۔ پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس کی حاجت کے اوقات مقرر کرے اور اسے پاکدامن بنائے اور اسے کسی غیر کی طرف دیکھنے سے بے نیاز کر دے اور اگر آدمی اپنے آپ میں بستر پر عورت کے حقوق ادا کرنے سے عجز اور کمزوری دیکھے تو وہ ایسی ادویہ استعمال کرے جو اس کی قوت باہ میں اضافہ کریں اور اس کی شہوت کو تقویت پہنچائیں یہاں تک کہ وہ اسے پاکدامن بنا دے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی مردوں کے لئے عورتوں پر درجہ اور رتبہ ہے۔ اور مَذَرَجَةُ الطَّرِيقِ: اس کا معنی ہے راستے کا بلند اور بڑا حصہ۔ اس میں اصل معنی الطریق لپیٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: دَرَجُوا، یعنی طَوَّأَعِہُمْ انہوں نے اپنی اپنی عمریں لپیٹ لیں اور اسی سے وہ درجہ ہے جس پر وہ ترقی کرتا ہے اور کہا جاتا ہے: رَجُلٌ بَيْنَ الرَّجُلَةِ، یعنی ایسا آدمی جس کی قوت ظاہر ہو۔ وهو أَرَجَلُ الرَّجُلَيْنِ اور وہ ان دو میں سے زیادہ قوی ہے اور فرس رجیل یعنی طاقتور گھوڑا اور اسی سے الرِّجُل ہے کیونکہ اس میں چلنے کی قوت ہوتی ہے۔ پس آدمی کے مرتبہ کی زیادتی اس کی عقل اور اس کے خرچ کرنے کی قوت کے سبب اور دیت، میراث اور جہاد کے سبب ہے۔

حمید نے کہا ہے: الدرَجہ کا معنی داڑھی ہے۔ یہ اگر ان کی طرف سے صحیح بھی ہے تو بھی ضعیف ہے۔ اس کا تقاضا نہ آیت کا لفظ کرتا ہے اور نہ اس کا معنی (2)۔

ابن عربی نے کہا ہے: بندے کے لئے اچھا اور خوبصورت یہ ہے کہ اس سے باز رہے جو وہ نہیں جانتا اور خصوصاً کتاب اللہ کے بارے میں اور مردوں کی عورتوں پر فضیلت کسی ذی عقل پر مخفی نہیں ہے اور اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی عورت مرد سے تخلیق کی گئی ہے۔ پس مرد اس کی اصل ہے (3) اور مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے بغیر اجازت کے تصرف کرنے سے روکے اور وہ روزہ نہیں رکھ سکتی مگر مرد کی اجازت کے ساتھ اور وہ حج نہیں کر سکتی مگر مرد کے ساتھ۔ اور کہا گیا ہے کہ الدرَجَةُ کا معنی الصداق

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 656، موسسۃ الرسالہ بیروت۔ بخاری شریف، باب تعلیم الأطفال، حدیث نمبر 5442، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 188-189، دار الفکر

(دوستی) بھی ہے۔ شعی خے یہی کہا ہے اور کہا گیا ہے اس کا معنی جواز الادب (ادب کا لحاظ رکھنا) ہے۔ جملہ معانی کے اعتبار سے الدر جہ کا لفظ تفضیل کا تقاضا کرتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ خاوند کا حق زوجہ پر اس سے زیادہ ہے جو بیوی کا حق خاوند پر ہے۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ولو امرت احدا بالسجود لغير الله لأمرت المرأة ان تسجد لزوجها (1) (اگر میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ الدر جہ کا لفظ مردوں کو حسن معاشرت پر ابھارنے اور عورتوں کے لئے مال اور اخلاق میں وسعت ظرفی اپنانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بلاشبہ افضل کو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر بوجھ برداشت کرے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول حسین اور عمدہ ہے۔ (2)

ماوردی نے کہا ہے: احتمال ہے کہ یہ حقوق نکاح میں ہو۔ اس کے لئے ان کے سوا کو عقد نے اٹھا دیا ہے اور عورت پر لازم ہوتا ہے کہ مرد کے بلانے پر اس کے بستر پر جائے اور مرد پر اس کی دعوت کو قبول کرنا لازم نہیں ہوتا۔ میں (مفسر) کہتا ہوں اسی کے بارے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: ”جس عورت کو اس کے خاوند نے اپنے بستر کی جانب بلایا اور اس نے اس سے انکار کر دیا تو ملائکہ صبح ہونے تک اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں“ (3)۔ واللہ عزیز یعنی وہ مضبوط سلطان ہے، اس پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں۔ حکیم یعنی وہ جاننے والا ہے اور جو وہ کرتا ہے وہی درست اور صحیح کرتا ہے۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ ۚ اَوْ تَسْرِيَةٌ بِإِحْسَانٍ ۖ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا
مِمَّا اَنْتُمْ بِهٖۤ اَشْيَآءٌ اِلَّا اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۚ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ
مَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ﴿۳۹﴾

”طلاق دوبار ہے پھر یا تو روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ اور جائز نہیں تمہارے لئے کہ لو تم اس سے جو تم نے دیا ہے انہیں کچھ بھی بجز اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو تو کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑالے۔ یہ حدیں ہیں اللہ کی سوان سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔“

قوله تعالى: الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ ۚ اَوْ تَسْرِيَةٌ بِإِحْسَانٍ ۚ اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة، جلد 1، صفحہ 134، وزارت تعلیم

جامع ترمذی، باب جاتی حق الزوج علی المرأة، حدیث نمبر 1079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ

3۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر 4794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ**۔ یہ بات ثابت ہے کہ اہل جاہلیت کے نزدیک طلاق کے لئے کوئی عدد معین نہ تھا۔ البتہ ان کے نزدیک عدت (کی مدت) معین اور مقرر تھی اور ابتدائے اسلام میں بھی کچھ عرصہ یہی رہا۔ ایک آدمی اپنی عورت کو جو چاہتا تھا طلاق دے دیتا تھا اور جب وہ اس کی طلاق سے حلال ہونے کے قریب ہوتی تو وہ اس سے رجوع کر لیتا جب تک چاہتا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے اپنی عورت کو کہا: نہ میں تجھے گھر میں رکھوں گا اور نہ تجھے چھوڑوں گا کہ تو (کسی کے لئے) حلال ہو جائے۔ اس نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: میں تجھے طلاق دوں گا اور جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہوگی تو میں تجھ سے رجوع کر لوں گا (1)۔ تو اس عورت نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کی شکایت کی اور آپ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کا ذکر کیا، سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو آدمی کے لئے طلاق کی اس تعداد کو بیان کرتی ہے جس میں وہ بغیر مہر اور ولی کے رجوع کر سکتا ہے اور جو طریقہ ان میں رائج تھا اسے منسوخ کر دیا۔ اس کا یہ معنی حضرت عروہ بن زبیر، حضرت قتادہ اور حضرت ابن زید وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ (2)

اور حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے: اس آیت سے مقصود سنت طلاق کی پہچان ہے، یعنی جو دو طلاقیں دے تو اسے تیسری کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، پس یا تو اس کے حقوق میں سے کسی شے کا ظلم کیے بغیر اسے چھوڑ دے یا پھر اسے حسن معاشرت کے ساتھ اپنے پاس روک لے اور آیت ان دونوں معنوں کو متضمن ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ طلاق سے مراد اس بندھن اور عصمت کو کھولنا ہے جو مخصوص الفاظ کے ساتھ زوجین کے درمیان منعقد اور قائم ہوئی۔ اس آیت اور اس کے علاوہ دیگر آیات کے ساتھ ثابت ہے کہ طلاق مباح ہے اور حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے: فان شاء امسك وان شاء طلق (4) (پھر اگر وہ چاہے تو اسے روک لے اور اگر چاہے تو طلاق دے دے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی اور پھر ان کی طرف رجوع کر لیا (5)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔ (6)

اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے اپنی عورت کو ایسے طہر کے دوران طلاق دی جس میں اس نے اس سے مقاربت نہ کی ہو تو وہ سنت کے مطابق طلاق دینے والا ہے اور اس کے لئے وہ عدت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جب عورت مدخول بہا ہو تو مرد کے لئے اس کی عدت گزرنے سے پہلے پہلے رجعت کا حق حاصل ہوگا اور جب عدت

1۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق والخدم والایلاء، جلد 4، صفحہ 10، دار الحما سن قاہرہ

بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 146، وزارت تعلیم

6۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گئی تو وہ بھی خطاب میں سے ایک مخاطب (پیغام نکاح بھیجنے والا) ہے۔ کتاب اللہ، سنت اور اجماع امت اس پر دلالت ہے کہ طلاق مباح ہے ممنوع نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اس سے منع کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے جو ثابت ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے ”مجھے ابوالعباس محمد بن موسیٰ بن الدولابی اور یعقوب بن ابراہیم دونوں نے حدیث بیان کی ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: ہمیں حسن بن عرفہ، اسماعیل بن عیاش بن حمید ابن مالک اللخمی نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ذکر کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے معاذ! روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک عتاق (آزاد کرنے) سے زیادہ پسندیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی شے تخلیق نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہو۔ پس جب کوئی آدمی اپنے غلام کو کہے انت حراً ان شاء اللہ تعالیٰ تو آزاد ہے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، تو وہ آزاد ہے اور اس کے لئے استثنا نہیں ہے اور اگر کوئی اپنی بیوی کو کہے انت طالق ان شاء اللہ تعالیٰ تو اس کے لئے استثنا ہے اور اسے طلاق واقع نہ ہوگی۔“

محمد بن موسیٰ بن علی، حمید بن ربیع، یزید بن ہارون نے ہمیں بیان کیا کہ اسماعیل بن عیاش نے اپنی اسناد کے ساتھ اسی طرح ہمیں خبر دی ہے۔

حمید نے کہا ہے کہ مجھے یزید بن ہارون نے کہا ہے: کون سی حدیث ہے اگر حمید ابن مالک اللخمی معروف ہوتا! میں نے کہا: وہ میرے دادا ہیں! تو یزید نے کہا: تو نے مجھے خوش کر دیا ہے، اب یہ حدیث ہوئی ہے!“ (1)

ابن منذر نے بیان کیا ہے: جنہوں نے طلاق میں استثنا یعنی ان شاء اللہ کو مؤخر قرار دیا ہے ان میں سے طاؤس، حماد، امام شافعی ابوثور اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ ہیں۔

امام مالک اور امام اوزاعی کے قول کے مطابق طلاق میں استثنا جائز نہیں ہے اور حسن اور قتادہ کا صرف طلاق کے بارے میں یہی قول ہے۔ فرمایا: وبالقول الاول اقول۔ میں تو پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: قَامَسَاكُ بِمَعْرُوفٍ یہ مبتدا ہے اور خبر امثل یا احسن ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو، یعنی فعلیکم امساك بمعروف، یا فالواجب علیکم امساك بما یعرف أنه الحق (2) (یعنی تم پر واجب ہے روک لینا ایسے طریقہ سے جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ یہ حق اور درست ہے) اور قرآن کے علاوہ اسے مصدر ہونے کی بنا پر قَامَسَاكَا پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور یا حَسَانَ کا معنی یہ ہے کہ وہ بیوی کے حقوق میں سے کسی بھی شے میں اس پر ظلم نہ کرے اور نہ قول میں زیادتی اور حد سے تجاوز کرے۔ اور الامساك، الاطلاق کے خلاف ہے (یعنی امساك کا معنی روکنا اور اطلاق کا معنی چھوڑنا ہے۔) اور التسبیح کا معنی ہے کسی شے کو چھوڑ دینا اور اسی سے تسبیح الشعر (یعنی بالوں کو چھوڑ دینا ہے، تاکہ وہ بعض کو بعض سے علیحدہ

کر لے اور مَتَّحَ الْمَاشِيَةِ: اس نے مویشی کو چھوڑ دیا اور تَسَرَّحَ کا لفظ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ دوسری طلاق کی عدت مکمل ہو جائے اور وہ اپنے نفس کی زیادہ مالک ہو جائے۔ یہ سدی اور ضحاک کا قول ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اسے تیسری طلاق دے اور اسے چھوڑ دے یہ حضرت عطا اور حضرت مجاہد وغیرہما کا قول ہے (1) اور تین وجوہ کی بناء پر یہ زیادہ صحیح ہے۔

(1) وہ حدیث جسے دارقطنی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ (طلاق دوبار ہے) تو یہ تین کیونکر ہوئیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: فَاَمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيَتْ بِاِحْسَانٍ۔ ایک روایت میں ہے: یہ تیسری طلاق ہے (2)۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

(2) تَسْرِيَتْ الفاعل طلاق میں سے ہے، کیا تو جانتا نہیں کہ ان عزموا التمساح بھی پڑھا گیا ہے۔

(3) بے شک فعل تفعیلاً یعنی باب تفعیل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نے دوسری طلاق پر فعل کو مکرر کیا ہے اور ترک میں فعل کو نئے سرے سے کرنا نہیں ہے جسے تفعیل سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ (3)

ابو عمر نے کہا ہے: اس پر علماء نے اجماع کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيَتْ بِاِحْسَانٍ یہ دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی یہی مراد لی گئی ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَہَا (البقرہ: 230) (دوبار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) اور اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیں تو اس کے لئے اس کی طرف رجوع کا حق ہے اور اگر اس نے اسے تیسری طلاق دے دی تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی کر لے (4)۔ اور یہ قرآن کریم کا وہ محکم حکم ہے جس کی تاویل (اور معنی) میں کوئی اختلاف نہیں، اسی کی مثل عادل راویوں کی احادیث بھی مروی ہیں۔ سعید بن نصر نے بیان کیا کہ ہمیں قاسم بن اصبح نے بیان کیا کہ ہمیں محمد بن وضاح نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ نے بیان کیا اور انہوں نے کہا: ہمیں ابو معاویہ نے اسامیل بن سمیع کے واسطے سے ابوزرین سے حدیث بیان کی کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے آپ کا کیا خیال ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَاَمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيَتْ بِاِحْسَانٍ تو اس میں تیسری طلاق کہاں ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (وہ ہے) فَاَمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيَتْ بِاِحْسَانٍ اور اسے ثوری وغیرہ نے اسامیل بن سمیع سے اور انہوں نے ابوزرین سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ (5)

میں (مفسر) کہتا ہوں: الکلیا الطبری نے یہ خبر ذکر کی ہے اور کہا ہے: یہ نقل کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کو ترجیح دی ہے اور بلاشبہ تیسری طلاق ہی اس ارشاد گرامی میں سیاق خطاب میں مذکور ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ

1۔ البحر الروض، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ 2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 4، دارالحاسن

3۔ البحر الروض، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ 4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دارالمنکر 5۔ سنن دارقطنی، جلد 4، صفحہ 4، دارالحاسن

لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ پس تیسری طلاق اس خطاب کی صلب میں مذکور ہے اور یہ ایسی بینونت کا فائدہ دیتی ہے جو تحریم کا موجب ہے مگر زوج (ثانی) کے بعد (وہ تحریم ختم ہو جاتی ہے) پس ارشاد باری تعالیٰ: أَوْ تَسْرِيحًا بِحُسَانٍ کوئے فائدہ پر محمول کرنا واجب ہے اور وہ عدت گزرنے کے ساتھ دو طلاقیں کے ساتھ بینونت کا واقع ہونا ہے اور اس پر (محمول کرنا واجب ہے) کہ آیت سے مقصود ایسی طلاق کے عدد کا بیان ہے جو تحریم کو ثابت کرتی ہے اور اسے منسوخ کرنا ہے جو ان میں بلا عدد محصور طلاق واقع کرنا جائز تھا اور اگر قول باری تعالیٰ أَوْ تَسْرِيحًا بِحُسَانٍ ہی تیسری طلاق ہو تو یہ تین کے ساتھ تحریم واقع کرنے کا مقصد ظاہر نہیں کرتی، کیونکہ اگر اس پر اقتصار کر لیا جائے تو پھر یہ اس کے لئے بینونت محرمہ کے وقوع پر دلیل نہیں مگر زوج کے بعد، بلاشبہ تحریم کا علم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوا: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ تو پھر یہ ضروری ہے کہ أَوْ تَسْرِيحًا بِحُسَانٍ کا معنی تیسری طلاق نہ ہو۔ اور اگر أَوْ تَسْرِيحًا بِحُسَانٍ تیسری طلاق کے معنی میں ہو تو پھر اس کے پیچھے ارشاد باری تعالیٰ فَإِنْ طَلَّقَهَا چوتھی طلاق ہوگی، کیونکہ فاء تعقیب کے لئے ہے اور یہ ان کے بعدنی طلاق کا تقاضا کرتی ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ سو اس سے ثابت ہوا کہ قول باری تعالیٰ: أَوْ تَسْرِيحًا بِحُسَانٍ سے مراد عورت کو چھوڑ دینا ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام بخاری نے اس آیت پر یہ عنوان باندھا ہے: باب من أجاز الطلاق الثلاث بقوله تعالى: الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَإِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحًا بِحُسَانٍ (یعنی یہ باب اس کے بیان میں ہے جس نے مذکورہ ارشاد گرامی کے ساتھ تین طلاقیں کو جائز قرار دیا ہے) اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ تعداد بلاشبہ ان کے لئے وسعت ہے۔ پس جس نے اپنے اوپر تنگی اور شدت کی تو یہ اس پر لازم ہو جائے گی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: ائمہ فتویٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع کرنے سے لازم ہو جاتی ہے اور یہی جمہور سلف کا قول ہے۔

اور طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے یہ کہا ہے کہ ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع کرنے سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور یہ محمد بن اسحاق اور حجاج بن ارطاة سے روایت کیا جاتا ہے اور ان دونوں سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے کوئی شے لازم نہیں ہوتی اور یہ مقاتل کا قول ہے اور داؤد سے بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا (کوئی شے) واقع نہ ہوگی۔ اور حجاج بن ارطاة اور جمہور سلف اور ائمہ سے مشہور قول یہ ہے کہ وہ تینوں لازم اور واقع ہو جاتی ہیں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ تین طلاقیں اکٹھی ایک کلمہ کے ساتھ واقع کرے یا تین متفرق کلمات کے ساتھ۔

اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا کہ اس سے کوئی شے لازم نہ ہوگی انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَالْبُطْلَانُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ کی دلیل سے استدلال کیا ہے۔ یہ ہر مطلقہ کو شامل ہے سوائے اس کے جسے اس سے خاص کر دیا جائے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور کہا: الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ طلاق دوبار ہے اور تیسری فَإِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحًا بِحُسَانٍ ہے اور جس نے ایک کلمہ میں تین طلاقیں دیں پس وہ لازم نہ ہوگی، کیونکہ وہ قرآن کریم میں مذکور نہیں اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ایک

واقع ہوئی ہے تو انہوں نے تین احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت طاؤس، ابوصہبہ اور عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اور دوسری حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اس کی روایت کے مطابق جس نے یہ بیان کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجوع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور وہ آپ کے لئے ایک طلاق شمار ہوئی (1) اور تیسری حدیث یہ ہے کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجعت کا حکم فرمایا (2) اور رجعت ایک طلاق واقع ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

ان احادیث کا جواب وہ ہے جو امام طحاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عطاء، حضرت عمرو بن دینار، حضرت مالک بن حویرث، حضرت محمد بن ایاس بن بکیر اور حضرت نعمان ابن ابی عیاش رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے (کہ) جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس سے جدا ہو گئی اور اب وہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا مگر دوسرے زوج کے بعد (3) اور اس بارے میں ان ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت کی ہے وہ جماعت (جمہور کی رائے) سے موافقت رکھتی ہے اور طاؤس وغیرہ کی روایت وہن (کمزوری) پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنی رائے کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخالفت کریں۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ طاؤس کی روایت وہم اور غلط ہے۔ حجاز، شام، عراق، مشرق اور مغرب کے شہروں کے فقہاء میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موالی میں سے ابوصہبہ معروف نہیں ہیں۔

قاضی ابوالولید الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک ابن طاؤس سے اس بارے میں روایت صحیح ہے اور ان سے ائمہ نے روایت کی ہے: (یعنی) معمر اور ابن جریج وغیرہ اور ابن طاؤس امام ہیں اور وہ حدیث جس کی طرف وہ اشارہ کر رہے ہیں وہ ہے جسے ابن طاؤس نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق کے عہد اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے زمانہ خلافت کے پہلے دو سال تک تین طلاقیں ایک طلاق تھی۔ پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک لوگ اس امر میں جلدی کرنے لگے ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔ پس اگر ہم اسے ان پر نافذ کر دیں! پھر آپ نے اسے ان پر نافذ کر دیا۔ (4)

اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ ایک طلاق واقع کرتے تھے اس کے بدلے جہاں اب لوگ تین طلاقیں واقع کرتے ہیں اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ بے شک لوگ اس معاملے میں جلدی کرنے لگے

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دارالحاسن

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1877، ضیاء القرآن پبلی کوشنز

3۔ شرح معانی الآثار، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 34، مکتبہ المدینہ عمان
4۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 477-478، وزارت تعلیم

ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی تو آپ نے انہیں ناپسند کیا کہ وہ طلاق دینے کے معاملہ میں جلدی کریں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی پس اگر ابتدائے اسلام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ان کا یہی حال ہوتا جو آپ نے کہا ہے تو ان پر یہ عیب نہ ہوتا کہ انہوں نے اس معاملہ میں جلدی کی ہے جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔

اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ آپ نے اس کے لئے تین طلاقیں کے لازم ہونے کا فتویٰ دیا جس نے اکٹھی تین واقعہ کیں۔ پس اگر ابن طاؤس کی حدیث کے یہ معنی ہیں تو یہ تو ہم نے بیان کر دیے ہیں اور اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو اس معنی پر محمول کیا جائے جس میں وہ تاویل کرتے ہیں جن کے قول کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی، تو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جماعت کے قول کی طرف رجوع کر لیا ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور قیاس کے اعتبار سے ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ طلاق ہے اور اسے وہ واقعہ کرتا ہے جو اس کا مالک ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسے لازم قرار دیا جائے اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب کوئی مفرد طلاق واقع کرے (تو وہ واقع ہو جاتی ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو تاویل الباجی نے بیان کی ہے وہ وہی ہے جس کا معنی الکلیا الطبری نے علمائے حدیث سے ذکر کیا ہے؟ یعنی وہ ایک طلاق دیتے تھے۔ وہی اب تین طلاقیں دیتے ہیں، یعنی وہ ہر طہر میں ایک طلاق نہیں دیتے تھے بلکہ وہ پوری عدت میں ایک طلاق دیتے تھے یہاں تک کہ وہ جدا ہو جاتی اور عدت گزر جاتی۔

قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے بیان کیا ہے: اس کا معنی ہے کہ لوگ ایک طلاق پر اقتصار کرتے تھے، پھر وہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کثرت سے تین طلاقیں دینے لگے۔ قاضی نے کہا: یہی معنی راوی کے اس قول کے زیادہ مشابہ ہے کہ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقیں میں جلدی کی تو آپ نے ان پر جلدی نافذ کر دی۔ اس کا معنی ہے کہ آپ نے ان کا حکم ان پر لازم کر دیا۔

اور رہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث تو دارقطنی نے احمد بن صبیح عن طریف بن ناصح عن معاویہ بن عمار الدہنی عن ابی الزبیر کی سند سے روایت کیا ہے کہ ابوالزبیر نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں درآنحالیکہ وہ حائضہ ہو۔ تو انہوں نے مجھے فرمایا: کیا تو ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پہچانتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں (اور وہ حائضہ تھی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنت کی طرف لوٹا دیا۔ اور دارقطنی نے کہا: تمام کے تمام (راوی) شیعہ ہیں۔ اور محفوظ روایت یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دی۔ (1)

عبید اللہ نے کہا ہے کہ انہوں نے اسے حالت حیض میں ایک طلاق دی تھی مگر انہوں نے سنت کے خلاف عمل کیا تھا۔

اسی طرح صالح بن کیسان، موئی بن عقبہ، اسماعیل بن امیہ، لیث بن سعد، ابن ابی ذئب، ابن جریج، جابر، اسماعیل بن

ابراہیم بن عقبہ نے حضرت نافع سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک طلاق دی تھی (1) اور اسی طرح زہری نے سالم عن ابیہ اور یونس ابن جبیر اور شعبی و حسن سے بیان کیا ہے۔

اور رہی حدیث رکانہ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب، منقطع ہے، کسی ایسی سند سے یہ بیان نہیں کی جاسکتی جس سے استدلال ہو سکتا ہو۔ اسے ابو داؤد نے ابن جریج کی حدیث سے بیان کیا جو انہوں نے بنی رافع کے بعض افراد سے نقل کی ہے اور ان میں کوئی بھی قابل حجت نہیں ہے۔ (یعنی) عن عمرہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے۔ اور اس میں ہے کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ”تو اسے واپس لوٹالے۔“ (2)

تحقیق اسے کئی طرق سے عن نافع بن عجمیر بھی روایت کیا ہے کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قسم دی کہ اس نے اس سے کیا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان کی طرف واپس لوٹا دیا (3)۔ پس یہ اسم اور فعل دونوں میں اضطراب ہے اور اس طرح کی شے سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو کئی طرق سے دارقطنی نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے، بعض میں کہا ہے: حدیثنا محمد بن یحییٰ بن مرداس حدیثنا ابو داؤد السجستانی حدیثنا احمد بن عمرو بن السمر د ابو ثور ابراہیم بن خالد الکلبی اور دوسروں نے کہا: حدیثنا محمد بن ادریس الشافعی حدیثنا عی محمد ابن علی بن شافع عن عبد اللہ بن علی بن السائب عن نافع بن عجمیر بن عبد یزید کہ رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی بیوی سہیمہ المزنیہ کو بتہ طلاق دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا اور کہا: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (بیوی کو) اس کی طرف واپس لوٹا دیا اور انہوں نے دوسری طلاق حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دی اور تیسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں (4)۔ ابو داؤد نے کہا ہے: ”یہ حدیث صحیح ہے۔“ پس حدیث رکانہ میں سے جو صحیح ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی نہ کہ تین طلاقیں دیں۔ اور طلاق البتہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ پس اس سے استدلال ساقط ہو گیا۔ والحمد للہ، واللہ اعلم۔

اور ابو عمر نے کہا کہ حدیث رکانہ کے بارے میں امام شافعی کی روایت اپنے چچا سے زیادہ واضح اور ظاہر ہے اور انہوں نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 476، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886-1887، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتہ، جلد 1، صفحہ 300، ویت۔ ترمذی حدیث، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتہ، جلد 1، صفحہ 300، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایسی زیادتی بیان کی ہے جسے اصول رد نہیں کرتے۔ پس اس کے ناقل کے ثقہ ہونے کی وجہ سے اسے قبول کرنا واجب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ، ان کے چچا اور ان کے دادا رکناہ کے اہل بیت ہیں اور تمام کے تمام بنی عبدالمطلب بن عبدمناف میں سے ہیں اور وہ اس قصہ کو زیادہ بہتر جانتے ہیں جو انہیں پیش آیا۔

فصل: احمد بن محمد بن مغیث الطلیطلی نے اپنی وثائق میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے اور کہا ہے: طلاق دو قسموں پر منقسم ہے: طلاق سنت، طلاق بدعت، پس طلاق سنت وہ ہے جو اس طریقہ پر واقع ہو جو شریعت نے مباح قرار دیا ہے اور طلاق بدعت وہ ہے جو اس کی نفیض اور ضد ہو اور وہ یہ ہے کہ آدمی عورت کو طلاق دے حالت حیض میں یا حالت نفاس میں یا ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دے، پس اگر اس نے ایسا کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی۔

اہل علم کے اس پر اجماع کر لینے کے بعد کہ وہ طلاق دینے والا ہے، ان کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ کتنی طلاقیں اسے لازم ہوں گی، تو حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اسے ایک طلاق لازم ہوگی، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے اور فرمایا: اس کا قول ثلاثا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کیونکہ اس نے تین بار طلاق نہیں دی۔ البتہ اس کا قول ثلاث جائز ہوگا جبکہ وہ اس سے اس کے بارے خبر دے رہا ہو جو گزر چکا ہے۔ پس وہ کہتا ہے: میں نے تین طلاقیں دیں تو یہ ان تین افعال کی خبر دینے والا ہو جائے گا جو اس سے تین اوقات میں صادر ہوئے۔ جیسا کہ کوئی آدمی کہے: ”میں نے کل فلاں سورۃ تین بار پڑھی“ تو وہ صحیح ہوگا اور اگر اس نے ایک بار سورۃ پڑھی اور کہا: میں نے اسے تین بار پڑھا“ تو وہ جھوٹا ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین بار قسم کھائے کہ وہ قسم کو بار بار لوٹاتا رہے تو یہ تین قسمیں ہوں گی اور اگر اس نے ایک بار قسم کھائی اور کہا: اُحلف باللہ ثلاثاً میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین قسمیں کھاتا ہوں تو یہ صرف ایک قسم ہوگی اور طلاق بھی اسی کی مثل ہے۔

حضرت زبیر بن عوام اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے اور ہم نے یہ سب ابن وضاح سے روایت کیا ہے اور شیوخ قرطبہ میں سے ابن زبناح شیخ ہدی، محمد بن تقی بن مخلد، محمد بن عبدالسلام الحسینی جو اپنے وقت میں منفرد عالم دین اور فقیہ عصر تھے، اصبح بن الحباب اور ان کے سوا ایک پوری جماعت نے اسی طرح کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حجت میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لفظ طلاق تفریق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **الطَّلَاقُ مَزْنٌ** اس سے مراد وہ اکثر طلاقیں ہیں (یعنی دو بار طلاق) جن کے بعد امساك بالمعروف ہو سکتا ہے اور اس سے مراد عدت میں رجوع کرنا ہے اور قول باری تعالیٰ: **أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ** کا معنی ہے کہ وہ اسے بغیر رجوع کیے اسی حالت پر چھوڑے رکھے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے (1) اور اس میں اس پر احسان ہے اگر ان دونوں کے درمیان ندامت واقع ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **لَا تَنْدِيهَا لَعَلَّ اللَّهُ يُخْصِدُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا** (الطلاق) (تجھے کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔) اس سے مراد فرقت پر ندامت اور رجعت میں

رغبت رکھنا ہے اور تین کو واقع کرنا اچھا نہیں ہے کیونکہ اس میں اس وسعت کو ترک کرنا ہے جو ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اور اس پر متنبہ کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا طلاق کو متفرقا ذکر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب انہیں جمع کیا جائے تو وہ لفظ واحد ہے (لہذا ایک واقع ہوگی) اور المدونہ میں موجود دیگر مسائل جو اس پر دلالت کرتے ہیں ان پر قیاس کے ذریعے اسے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے انسان کا یہ قول ہے: مالی صدقۃ فی المساکین کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے تو ثلث مال اس کی طرف سے جائز ہوتا ہے۔ اور ابن منذر کی الاشراف میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابوالشعثاء، عطاء اور عمرو بن دینار رحمہم اللہ کہتے ہیں: جس نے باکرہ عورت کو تین طلاقیں دیں تو وہ ایک واقع ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ بسا اوقات انہوں نے ہمت کی اور کہا: غیر المدخول بہا لاعدۃ علیہا، کیونکہ جب اس نے غیر مدخول بہا عورت کو کہا انت طالق ثلاثا تو وہ انت طالق سے اس کے فارغ ہونے کے ساتھ ہی بائنہ ہوگئی، تو ثلاثا کا لفظ اس پر اس حال میں پڑ رہا ہے کہ وہ بائن ہو چکی ہے۔ لہذا یہ لفظ اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوگا، کیونکہ اس کا قول: انت طالق (معنی طلاق کو ادا کرنے میں) بنفسہ مستقل ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ غیر مدخول بہا عورت میں بینونت (جدائی) اس پر موقوف نہ ہو جو اس کے بعد وارد ہو رہا ہے جبکہ اس میں اصل ”انت طالق“ ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام شافعی نے قول باری تعالیٰ تَسْرِیْہِ بِأَحْسَنِ اور سَوَّ حَوْہُہٗ سے اس پر استدلال کیا ہے کہ یہ لفظ طلاق کے لئے صریح ہے۔ (1) حالانکہ علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو محمد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ صریح وہ ہوتا ہے جو کسی بھی طریقہ پر لفظ طلاق کو متضمن ہو، مثلاً وہ کہے: أنت طالق، انت مطلقة، قد طلقک، یا الطلاق لہ لازم۔ اور اس کے سوا الفاظ طلاق میں سے جو بھی اس معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ الفاظ کنایہ ہیں اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

اور قاضی ابوالحسن نے کہا ہے: طلاق کے لئے الفاظ صریح کثیر ہیں اور ان میں سے بعض بعض کی نسبت زیادہ بین اور واضح ہیں: (مثلاً) لفظ طلاق، سراح، فراق، حرام، خلیۃ اور بریۃ وغیرہا۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: صریح تین الفاظ ہیں اور وہ وہ ہیں جن کے بارے قرآن وارد ہو چکا ہے اور وہ ہیں لفظ طلاق، السراح اور الفراق۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: أَوْفَاہِ کُوہُہٗ بِمَعْرُوفٍ (الطلاق: 2) (یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ) اور فرمایا: أَوْ تَسْرِیْہِ بِأَحْسَنِ اور مزید فرمایا: فَطَلَّقُوہُہٗ إِحْدَیْہُمَا (الطلاق: 1) (تو انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب یہ بات پختہ اور ثابت ہوگئی تو پھر طلاق کی دو قسمیں ہیں: صریح اور کنایہ۔ پس صریح تو وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور کنایہ وہ ہے جو اس کے سوا ہے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ صریح میں آدمی نیت کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ صرف لفظ کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور کنایہ نیت کی محتاج ہوتی ہے اور ان کی

دلیل جنہوں نے کہا: بے شک (الفاظ) الحرام، الخلیۃ اور البریۃ، صریح الطلاق ہیں، طلاق کے معنی میں کثیر الاستعمال ہیں یہاں تک کہ وہ اس معنی میں معروف ہیں اور یہ ایقاع طلاق میں بین اور واضح ہو گئے، جیسا کہ جس طرح غائط کا لفظ پست زمین کے لیے وضع کیا گیا، پھر اسے بطریق مجاز قضائے حاجت کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور وہ اس معنی میں زیادہ بین، ظاہر اور مشہور ہو جائے اس کی نسبت جس کے لئے اسے وضع کیا گیا اور ہمارے مسئلہ میں اسی طرح کی مثال ہے۔

پھر عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے: ”اگر طلاقیں ہزار ہوں تو (طلاق) البتۃ ان میں سے کوئی شے باقی نہیں چھوڑتی۔ پس جس نے کہا ہے: البتۃ، تو اس نے انتہائے اخیر کو چھو لیا (1)۔ اسے امام مالک رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الخلیۃ والبریۃ والبتۃ والبائن اور الحرام تین طلاقیں ہیں، اور عورت آدمی کے لئے حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس کے سوا دوسرے خاوند سے شادی کر لے۔ (2) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت ہے کہ البتۃ تین طلاقیں ہیں۔ ان البتۃ ثلاث سند کے اعتبار سے اس میں ضعف ہے، اسے دارقطنی نے بیان کیا ہے اور عنقریب ارشاد خداوندی: وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا کے تحت اس کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے اس کے بارے کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد طلقْتُک میں نے تجھے طلاق دی، کہ یہ مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں کے حق میں صریح طلاق ہے اور جس نے اپنی عورت کو کہا: انت طالق تو طلاق والی ہے تو یہ ایک طلاق ہے مگر یہ کہ وہ اس سے زیادہ کی نیت کرے۔ اور اگر اس نے دو یا تین کی نیت کر لی تو اتنی ہی لازم ہو جائیں گی جن کی اس نے نیت کی اور اگر اس نے کسی شے کی نیت نہ کی تو پھر ایک طلاق ہوگی اور آدمی رجعت کا مالک ہوگا (یعنی ایک طلاق رجعیہ ہوگی) اور اگر اس نے کہا: انت طالق اور کہا: میں نے قید (بیڑیوں) سے آزاد ہونے کا ارادہ کیا ہے تو اس کا قول قبول نہ کیا جائے گا اور طلاق اس پر لازم ہو جائے گی، مگر یہ کہ وہاں کوئی ایسا قرینہ ہو جو اس کے صدق پر دلالت کرتا ہو۔ اور جس نے کہا: انت طالق واحدة، لا رجعة لی علیک تو اس کا قول: لا رجعة لی علیک (مجھے تجھ پر رجوع کا حق نہیں) باطل ہوگا اور اس کے قول واحدة کی وجہ سے اس کے لئے رجعت ثابت ہوگی، کیونکہ واحدة سے مراد تین نہیں ہو سکتیں اور اگر اس نے اپنے قول: لا رجعة لی علیک سے تین کی نیت کی، تو امام مالک کے نزدیک یہ تین ہی ہوں گی۔

اور اس کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد فارقتک (میں نے تجھے جدا کر دیا)، سرحتک (میں نے تجھے چھوڑ دیا)، انت خلیۃ (تو فارغ ہے)، انت بریۃ (تو بری ہے)، انت بائن (تو جدا ہے)، حبلك علی غاربك (تیری رسی تیرے کندھے پر)، انت علی حرام (تو مجھ پر حرام ہے)، الحق باهلك (تو اپنے اہل سے جا مل)، قد دہبتک لأهلك (میں نے تجھے تیرے اہل کے حوالے کر دیا)، قد خلیت سبیلک (میں نے تیرا راستہ چھوڑ دیا)، لا سبیل لی علیک (مجھے تجھ پر کوئی اختیار نہیں) تو امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس سے طلاق

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 511، وزارت تعلیم

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 2، جز الرابع، صفحہ 32، دارالمحاسن

بائن واقع ہوگی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب آدمی نے اپنی بیوی کو کہا استقلی بأمرك (تو اپنے معاملے میں مستقل ہے) یا أمرك لك (تیرا معاملہ تیرے سپرد ہے) یا الحق باهلك۔ (تو اپنے گھر والوں سے جامل) اور انہوں نے اسے قبول کر لیا تو اس سے ایک طلاق بائن ہوگی۔

اور امام مالک سے اس کے بارے میں یہ مروی ہے جس نے اپنی عورت کو کہا: قد فارقتك یا سہحتك کہ یہ صریح طلاق میں سے ہے۔ جیسا کہ اس کا قول: انت طالق صریح ہے اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ طلاق کنایہ ہے، لہذا اس میں کہنے والے کی نیت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا جتنے عدد کا اس نے ارادہ کیا ہے مدخول بہا ہو یا غیر مدخول بہا۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ عورت جس کے ساتھ مدخول نہیں کیا گیا اس کے بارے میں دو میں سے اصح قول یہ ہے کہ ایک طلاق ہوگی، مگر یہ کہ وہ اکثر کی نیت کرے۔ ابن القاسم اور ابن عبدالحکم نے یہی کہا ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ تین طلاقیں ہیں اور اس کی مثل یہ الفاظ بھی ہیں: خلعتك (میں نے تجھے چھوڑ دیا) یا لا ملک لی علیک (میری تجھ پر کوئی ملکیت نہیں)

اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک تمام الفاظ کنایات سے مدخول بہا عورت کے حق میں تین طلاقیں ہوتی ہیں جن میں کہنے والا کوئی نیت نہ کرے اور غیر مدخول بہا کے بارے میں وہ نیت کرے اور اگر وہ حلف اٹھا دے اور کہے: میں نے ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو وہ خطاب میں سے ایک مخاطب ہے کیونکہ مدخول بہا عورت کو اس کا خاوند نہ چھوڑ سکتا ہے نہ جدا کر سکتا ہے اور نہ ہی بری قرار دے سکتا ہے مگر تین طلاقوں کے ساتھ اور جس سے مدخول نہ کیا گیا ہو اسے وہ ایک طلاق کے ساتھ چھوڑ سکتا ہے، بری کر سکتا ہے اور جدا کر سکتا ہے۔

امام مالک اور آپ کے اصحاب کے ایک طائفہ سے مروی ہے اور یہی اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ وہ ان تمام الفاظ میں نیت کرے گا اور طلاق میں سے جس کی اس نے نیت کی وہ اسے لازم ہو جائے گی۔ اور آپ سے تمام کنایات میں سے بالخصوص البتہ کے بارے میں یہ مروی ہے کہ وہ اس سے نیت نہ کرے نہ مدخول بہا کے بارے میں اور نہ غیر مدخول بہا کے بارے میں۔

اور امام ثوری، ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم نے کہا ہے: ان تمام میں اس کی نیت کا اعتبار ہے، پس اگر اس نے تین کی نیت کی تو یہ تین ہوں گی اور اگر ایک کی نیت کی تو وہ ایک بائن ہوگی اور وہ اپنے نفس کے بارے میں زیادہ حقدار ہو جائے گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ ایک ہوگی۔ اور امام زفر رحمہ اللہ نے کہا: اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ دو ہوں گی۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان کیا: ان تمام الفاظ میں وہ طلاق دینے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ کہے: میں نے اپنے کلام سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو پھر اتنی ہوں گی جتنی اس نے نیت کی۔ پس اگر اس نے تین سے کم کی نیت کی تو وہ رجعی ہوگی۔ اور اگر اس نے اسے ایک بائن طلاق دی تو وہ ایک طلاق رجعی ہوگی۔

اور اسحاق نے کہا ہے: ہر وہ کلام جو طلاق سے مشابہت رکھتا ہو تو اس سے وہ طلاق واقع ہو جائے گی جس کی اس نے نیت کی اور ابو ثور نے کہا: یہ طلاق رجعیہ ہوگی اور اس کی نیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ طلاق بائن کا تصور نہیں کرتے مگر خلع یا ایلاء میں اور ان میں یہی روایت محفوظ ہے۔ ابو عبید نے بھی یہی کہا ہے۔

اور امام بخاری نے یہ عنوان باندھا ہے باب اذا قال فارقتك او سرحتك او البرية او الخلية او ماعنى به الطلاق فهو على نيته (1) (یعنی ان الفاظ سے طلاق کا انحصار اس کی نیت پر ہے۔) اور آپ نے اس سے علمائے کوفہ اور امام شافعی کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے قول ماعنى به من الطلاق سے اسحاق کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس میں یہ دلیل ہے کہ ہر وہ کلمہ جو طلاق یا غیر طلاق ہونے کا احتمال رکھتا ہو تو یہ جائز نہیں کہ اس سے طلاق لازمی ہو مگر تب جبکہ متکلم یہ کہے: بلاشبہ اس نے اس سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو اس کے اقرار کے ساتھ اسے طلاق لازم ہو جائے گی اور نکاح کو باطل کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ یقین کے ساتھ اس کے صحیح ہونے پر انہوں نے اجماع کیا ہوا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام مالک کا قول ایسے آدمی کے قول کے بارے میں مختلف ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: اعتدی (تو عدت کے دن شمار کر)، قد خديتك، یا حبلك علی غاربك۔

آپ نے ایک بار کہا: وہ ان میں نیت نہیں کرے گا اور یہ تین طلاقیں ہیں۔ اور ایک بار کہا: وہ ان تمام میں نیت کرے گا۔ مدخول بہا کے بارے میں بھی اور غیر مدخول بہا کے بارے میں بھی اور اسی طرح میں بھی کہتا ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف جمہور نے اختیار کیا ہے اور جو امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ ان الفاظ میں نیت کرے گا اور اسی کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ صحیح ہے، ہم نے اسے دلیل سے بیان کر دیا ہے اور اس صحیح حدیث سے جسے ابو داؤد، ابن ماجہ اور دارقطنی وغیرہم نے یزید بن رکانہ سے بیان کیا ہے کہ رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق البتہ دی اور اس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عورت ان کی طرف لوٹادی۔ ابن ماجہ نے کہا ہے: میں نے ابوالحسن الطنافسی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: یہ حدیث کتنی اشرف واعلیٰ ہے۔ (2)

اور امام مالک نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: انت علی کالمیتة والدم ولحم الخنزیر کہ تو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 792، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق البتہ، جلد 1، صفحہ 149، وزارت تعلیم

ایضاً۔ ابو داؤد، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ترمذی، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھ پر مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی طرح ہے کہ میں اسے البتہ (بالکل جدا) دیکھتا ہوں اگرچہ آدمی کی نیت نہ بھی ہو اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی مگر دوسرے زوج کے بعد۔

اور امام شافعی کے قول میں ہے کہ اگر اس نے طلاق کا ارادہ کیا تو وہ طلاق ہوگی جتنی بھی طلاقوں کا اس نے ارادہ کر لیا اور اگر اس نے طلاق کا ارادہ نہ کیا تو پھر اس کے حلف دینے کے بعد کوئی شے واقع نہ ہوگی۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: ہر وہ لفظ جو کنایہ عن الطلاق ہے کے بارے میں اس باب کی اصل وہ روایت ہے جو حضور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اس عورت کے لئے جس سے کسی نے شادی کی تو اس وقت اس عورت نے کہا: اعوذ باللہ منك۔ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں۔ تو اس نے کہا قد عذت بمعاذ الحق باهلك (1) (تجھے پناہ حاصل ہے تو اپنے گھر والوں کے ساتھ جا مل) پس وہ طلاق ہو گئی۔ اور حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو کہا جبکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے علیحدہ رہنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا الحق باهلك اور وہ طلاق نہ ہوئی تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لفظ نیت کا محتاج ہے اور اس میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا مگر وہی جس کی بولنے والا نیت کرے گا۔ اور اسی طرح تمام الفاظ کنایات کا حکم ہے جو فراق اور غیر فراق کے معنی کا احتمال رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم

اور رہے وہ الفاظ جو الفاظ طلاق میں سے نہیں ہیں اور نہ انہیں فراق (جدائی) سے کنایہ قرار دیا جاسکتا ہے تو اکثر علماء ان میں سے کسی سے طلاق واقع نہیں کرتے اگرچہ کہنے والا اس کا ارادہ بھی کرے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جس نے کسی بھی لفظ سے طلاق کا ارادہ کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی، حتیٰ کہ اس قول کے ساتھ بھی کل و اشہب و قومی و اقعدی۔ (تو کھا، تو پی، تو کھڑی ہو، تو بیٹھ جا) اس میں امام مالک کے اپنے اصحاب کے سوا کسی نے ان کی اتباع نہیں کی۔

قوله تعالى: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۖ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٣٥﴾

اس میں پندرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قوله تعالى: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا اس میں ”أَنْ“ ”يَحِلُّ“ کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور آیت میں خطاب ازواج کو ہے، انہیں منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ازواج سے کوئی شے ضرر اور اذیت پہنچانے کی غرض سے لیں اور یہ وہ خلع ہے جو صحیح نہیں ہوتا مگر اس طرح کہ آدمی ضرر اور اذیت دینے میں متفرد نہ ہو۔ اور ذکر خاص کر انہی چیزوں کا کیا گیا ہے جو خاوندوں نے اپنی عورتوں کو دے رکھی ہوں، کیونکہ لوگوں میں عرف اور رواج یہی ہے کہ فساد اور ناچاکی کے وقت آدمی اس شے کا مطالبہ کرتا ہے جو مرد کے ہاتھ سے عورت کے لئے مہر اور اس کی دیگر حاجات کو پورا کرنے کے لئے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب ما یقیم بہ الطلاق، جلد 1، صفحہ 149۔

بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4852-4853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، کتاب حدیث کعب بن مالک، حدیث نمبر 4068

سامان نکلا ہو۔ اسی وجہ سے اسے ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَلَا يَحِلُّ اللّٰهُ تَعَالٰی کے ارشاد: اَلطَّلَاقِ مَزْنًا اور فَاِنْ طَلَّقَهَا کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے فصل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ طلاق پر فدیہ لینا جائز ہے اور عورت کا مال نہ لینے کی تشدید پر اجماع ہے مگر یہ کہ نافرمانی اور معاملات میں فساد عورت کی جانب سے ہو۔

ابن منذر نے حضرت عثمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب ظلم اور خصومت مرد کی جانب سے ہو اور عورت اس سے خلع لے تو اس کا مال لینا جائز ہے اور وہ گنہگار ہوگا اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہ حلال نہ ہوگا اور جو مال اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: ان کے قول میں سے یہ ظاہر کتاب اللہ، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت (1) ہونے والی خبر اور اس نظریہ کے خلاف ہے جس پر عام اہل علم کا اجماع ہے اور میں گمان نہیں کرتا کہ اگر کسی کو کہا جائے کہ تو خطا کی تلاش میں خوب محنت اور کوشش کر، تو وہ اس سے بڑھ کر کوئی امر نہیں پائے گا کہ کتاب اللہ کسی شے کی تحریم کے بارے حکم لگائے پھر کوئی مقابلہ کرنے والا اس کے مقابل ایسی شے لائے جو نص کے خلاف ہو اور وہ کہنے لگے: بلکہ وہ جائز ہے اور جو کچھ اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابو الحسن بن بطلال نے کہا ہے اور ابن قاسم نے امام مالک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور یہ قول ظاہر کتاب اللہ کے خلاف ہے اور حضرت ثابت بن نضیر کی بیوی والی حدیث کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يُقَيِّمَا حُدُودَ اللّٰهِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کہ وہ (کوئی شے) لے مگر اس اندیشہ اور خوف کے بعد کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور تحریم کو اس کے لئے وعید کے ساتھ مؤکد کیا جس نے حد سے تجاوز کیا۔

اور معنی یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ اپنے ساتھی کے نکاح سے متعلقہ حقوق اس طرح پورے نہ کر سکے گا جس طرح اس پر واجب ہیں۔ اس میں وہ کراہت اور ناپسندیدگی بھی ہے جس کا وہ اعتقاد رکھتا ہے تو پھر عورت پر فدیہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی خاوند پر کچھ لینے میں حرج ہے اور خطاب زوجین (میاں بیوی دونوں) کو ہے اور اَنْ يَّخَافَا میں ضمیر دونوں کے لئے ہے اور اَلَّا يُقَيِّمَا مفعول بہ ہے اور خفت ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ یہ خوف بمعنی علم ہے یعنی وہ دونوں جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہیں کر سکیں گے اور یہی خوف حقیقی ہے اور یہ مکروہ عمل کے واقع ہونے کا ڈر اور خوف ہے اور یہ ظن کے معنی کے قریب ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ اِلَّا اَنْ يَّخَافَا یہ استثناء منقطع ہے۔ (یعنی) لیکن اگر نافرمانی عورتوں کی جانب سے ہو تو پھر تم پر فدیہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حزہ نے اسے الا ان یخافا یا کے ضمہ کے ساتھ (1) صیغہ مجہول میں پڑھا ہے اور فاعل مخذوف ہوگا اور وہ والی اور حکام ہیں۔ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے **فَإِنْ خِفْتُمْ** فرمایا: خوف زوجین کے علاوہ کسی اور کے لئے ذکر کیا ہے (یعنی والی یا حاکم کو خوف ہو) اگر زوجین کا ارادہ کرتا تو کہتا: **فَإِنْ خَافَا** اس میں ان کے لئے حجت اور دلیل ہے جنہوں نے خلع سلطان کے حوالے کیا ہے (یعنی حاکم وقت کے فیصلے کے بغیر خلع نہیں ہو سکتا۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حضرت سعید بن جبیر، حسن اور ابن سیرین رحمہم کا قول ہے اور شعبہ نے کہا ہے، میں نے حضرت قتادہ کو کہا: کس سے حسن نے یہ اخذ کیا ہے کہ خلع سلطان کے سپرد ہے؟ تو انہوں نے کہا: زیاد سے اور یہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جانب سے والی تھے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول زیاد سے معروف ہے اور اس قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں ہے کیونکہ آدمی جب اپنی بیوی سے خلع کرتا ہے تو بلاشبہ وہ ایسی شے پر ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ دونوں راضی ہوتے ہیں اور سلطان اس پر اسے مجبور نہیں کر سکتا اور اس کے قول کی کوئی اصل نہیں ہے جس نے کہا ہے: یہ سلطان کے سپرد ہے اور انہوں نے ابو عبید کے اختیار کا انکار کیا ہے اور اسے رد کیا ہے اور میں ان کے اختیار اور پسند میں اس حرف سے زیادہ بعید اور کوئی شے نہیں جانتا، کیونکہ اعراب، لفظ اور معنی میں سے کوئی بھی اسے ثابت نہیں کرتا۔ جہاں تک اعراب کا تعلق ہے تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے الا ان یخافا کو پڑھا ہے تخافوا اور یہ عربی ہے۔ جب اسے مالم یسم فاعله کی طرف لوٹا یا گیا تو کہا گیا الا ان یخاف، اور رہا لفظ تو اگر اس کا انحصار لفظ یخافا پر ہو تو پھر ضروری ہے کہ کہا جائے: فان خیف۔ اور اگر لفظ فان خفتم پر ہو تو پھر واجب ہے کہ یہ کہا جائے: الا ان تخافوا۔

اور رہا معنی تو یہ بعید ہے کہ کہا جائے کہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم اس میں سے کوئی شے لو جو تم نے انہیں دے رکھی ہے مگر یہ کہ تمہارے سوا کسی کو خوف ہو اور نہ رب العالمین نے یہ کہا ہے: فلا جناح علیکم ان تاخذوا الہ منها فدیۃ، (کہ تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم مرد کے لئے عورت سے فدیہ لو) کہ خلع سلطان کے حوالے ہو جائے۔

امام طحاوی نے کہا ہے: حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ سلطان کے بغیر خلع کا جائز ہونا صحیح ہے اور جس طرح طلاق اور نکاح بغیر سلطان کے جائز ہیں اسی طرح خلع بھی جائز ہے۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا یُقِیْمَا** اگر تمہیں خوف ہو اس پر کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے **حُدُودَ اللہ** کی حدیں۔ یعنی ان حقوق میں جو ان دونوں پر واجب ہیں مثلاً حسن صحبت اور خوبصورت طرز زندگی اور اس میں خطاب حکام کو اور حاکم نہ ہونے کی صورت میں اس طرح کے معاملات میں واسطہ بننے والوں کو کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہ کرنے کا معنی ہے عورت کا اپنے خاوند کے حق کو حقیر جانا اور اس کا اس کی اطاعت و پیروی نہ کرنا وغیرہ حضرت ابن عباس، مالک بن انس اور جمہور فقہاء نے یہی کہا ہے۔ (2)

اور حسن بن ابی الحسن اور ان کے ساتھ ایک جماعت نے کہا ہے: جب عورت نے یہ کہہ دیا کہ میں تیرے حکم کی اطاعت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے غسل جنابت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے قسم پوری نہیں کروں گی تو خلع حلال ہو گیا اور شعبی نے کہا ہے: اَلَا يُقَيِّنَا حُدُودَ اللَّهِ كَمَا مَعْنَى هِيَ کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کریں گے۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے کو غصہ دلانا اور ناراض کرنا ترک طاعت کی طرف دعوت دیتا ہے (1)۔

اور حضرت عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: خلع اور مال لینا حلال ہو جاتا ہے جب کہ عورت اپنے خاوند کو کہے: میں تجھے ناپسند کرتی ہوں اور میں تجھ سے محبت نہیں کرتی اور اسی طرح کے جملے (2)۔ تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑالے۔

امام بخاری نے ایوب عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ثابت بن قیس کے بارے میں اخلاق و کردار اور دین کے اعتبار سے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے (اس اعتبار سے ان میں کوئی عیب اور نقص موجود نہیں) لیکن میں اس کی طاقت نہیں رکھتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کیا تو اس پر اس کا باغ لوٹا دے گی؟“ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ (3)

اسے ابن ماجہ نے حضرت قتادہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ جمیلہ بنت سلول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: قسم بخدا! میں دین اور اخلاق کے بارے میں ثابت بن قیس میں کوئی عیب نہیں پاتی، لیکن میں اسلام میں کفر (ناشکری، انکار) کو ناپسند کرتی ہوں، میں بغض کی وجہ سے اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اسے لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ اس سے اپنا باغ لے لے اور مزید کچھ نہ لے (4)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان سے انتہائی شدید بغض رکھتی تھیں اور وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان بطریق خلع تفریق کر دی۔ اسلام میں یہی پہلا خلع تھا۔

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اسلام میں سب سے پہلے جس نے خلع کیا وہ عبد اللہ بن ابی کی بہن ہے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرا سر اور اس کا سر کبھی جمع نہیں رہ سکتے۔ میں نے خیمے کی ایک طرف اٹھائی تو میں نے اسے ایک جماعت میں آتے دیکھا تو وہ ان تمام میں سب سے زیادہ سیاہ تھا، قد و قامت کے اعتبار سے ان سے چھوٹا تھا اور چہرے کے لحاظ سے سب سے زیادہ قبیح تھا! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں اور اگر وہ چاہے تو میں زائد بھی دوں گی، تو آپ

میں منہا لیا گیا ہے ان دونوں کے مابین تفریق کردی۔ یہ حدیث خلع میں اصل ہے اور جمہور فقہاء اسی پر عمل پیرا ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے بیان کیا: میں اہل علم سے اس کے بارے میں مسلسل سن رہا ہوں اور یہی امر ہے جس پر ہمارے نزدیک اجماع ہے اور وہ یہ کہ آدمی جب عورت کو کوئی ضرر اور تکلیف نہ دے اور اس کی طرف برائی کی نسبت بھی نہ کرے اور مرد کی جانب سے اسے ستایا بھی نہ جائے اور عورت اس سے جدائی اور علیحدگی پسند کرے تو آدمی کے لئے حلال ہے کہ وہ اس سے ہر وہ شے لے لے جو بطور فدیہ وہ اسے دے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کی بیوی کے بارے میں کہا اور اگر ناچاکی اور اختلاف مرد کی جانب سے ہو کہ وہ اسے تنگ کرنا ہو اور اسے اذیت اور ضرر پہنچاتا ہو تو وہ اسے وہ شے واپس لوٹا دے جو اس سے لی ہے۔

عقبہ بن ابی الصہبہ نے کہا ہے: میں نے بکر بن عبد اللہ مزینی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جس کی عورت یہ چاہتی ہے کہ وہ اس سے خلع لے لے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے کوئی شے لے۔

میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے وہ کہاں گیا فان خفتم الا یقیمہا حدود اللہ فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ؟ انہوں نے کہا: یہ منسوخ ہو چکا ہے، میں نے کہا: ناخ آیت کہاں ہے؟ تو انہوں نے کہا: سورۃ النساء میں یہ آیت ہے: **وَ اِنْ اَسَدْتُمْ اَسْتَبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَ اَتَيْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قَطْرًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْہُ شَیْئًا اَتَاْخُذُوْنَہُ بُھْتًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا** (النساء) (1) اور اگر تم ارادہ کر لو کہ بدلو اپنی بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز، کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے اور اپنے شاذ ہونے کی وجہ سے اجماع سے خارج ہے اور دونوں آیتوں میں سے ایک آیت دوسری کو ختم کرنے والی نہیں ہے کہ نسخ واقع ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد **فَاِنْ خَفْتُمْ** الا یہ اس آیت کے ساتھ زائل اور ختم ہونے والا نہیں ہے کیونکہ دونوں کو جب یہ خوف اور اندیشہ ہو تو پھر خاوند **وَ اِنْ اَسَدْتُمْ اَسْتَبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ** (النساء: 20) میں داخل نہیں، کیونکہ یہ صرف مردوں کے لئے ہے اور علامہ طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے یہ آیت محکم ہے (2) اور بکر کے قول کی کوئی حقیقت نہیں اگر عورت دینے کا ارادے کرے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ اپنی زوجہ سے وہ کچھ لے لے جو اسے دے رکھا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت سے انہوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے خلع کو شقاق اور ضرر کی حالت کے ساتھ خاص کیا ہے اور یہ کہ خلع میں یہ شرط ہے اور یہ نظریہ اس روایت سے مزید پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے جو ابو داؤد نے حضرت عائشہ سے بیان کیا ہے کہ حبیبہ بنت سہل حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں تو انہوں نے اسے مارا اور کندھے کے کنارے کی باریک ہڈی توڑ دی، چنانچہ صبح کے وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور شکایت پیش کی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: ”تو اس سے کچھ مال لے لے اور اسے فارغ کر دے۔“

انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے فرمایا: ”ہاں“۔ حضرت ثابت نے کہا: میں اسے دو باغ دیتا ہوں اور دونوں اس کے قبضے میں ہیں۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”تو وہ دونوں لے لے اور اسے جدا کر دے۔“ چنانچہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے وہ دونوں لے لئے اور اسے فارغ کر دیا (1)۔ اور جس موقف پر جمہور فقہاء ہیں وہ یہ ہے کہ ضرر اور تکلیف کی شکایت کیے بغیر خلع جائز ہے۔

جیسا کہ اس پر حدیث بخاری وغیرہ دلالت کرتی ہے (2) اور یہی آیت تو اس میں کوئی حجت موجود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شرط کے انداز میں اس کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اس طور پر اس کا ذکر کیا ہے کہ خلع کے احوال میں اس کا غالب امکان ہے۔ پس یہ قول غالب کے بارے ہے اور وہ ارشاد جو عذر کو ختم کرتا ہے اور علم کو واجب کرتا ہے وہ یہ ہے: **فَإِنْ طَبُنْ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا** (النساء) (پس اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوشدلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے۔)

مسئلہ نمبر 6۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ** تو یہ اس پر دلیل ہے کہ خلع اس سے زیادہ مال کے عوض بھی جائز ہے جو آدمی نے عورت کو دے رکھا ہو (3)۔ تحقیق علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ سو امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور ابو ثور رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے کہ عورت آدمی کو بطور فدیہ اتنا مال دے جس پر دونوں راضی ہوں، چاہے وہ اس سے کم یا زیادہ ہو جو مرد نے عورت کو دے رکھا ہے اور یہ حضرت عثمان بن عفان، ابن عمر رضی اللہ عنہما اور قبیصہ اور نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے اور قبیصہ نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ**۔

اور امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ مکارم اخلاق میں سے نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اہل علم میں سے کسی کو دیکھا کہ وہ اسے مکروہ جانتا ہو اور دارقطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میری بہن انصار میں سے ایک آدمی کی زوجیت میں تھی اس نے اس کے ساتھ ایک باغ کے عوض شادی کی تھی، تو ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی تو وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس پیش ہو گئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو اس کا باغ اسے واپس کر دے اور وہ تجھے طلاق دے دے گا۔“؟ (کیا تجھے قبول ہے) اس نے عرض کی: جی ہاں اور میں اسے زائد بھی دوں گی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے اور اسے زائد بھی دے۔“ (4)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ”اور اگر اس نے چاہا تو میں اسے زیادہ دوں گی اور آپ نے اس بات کا انکار نہیں کیا۔“

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب لی الغدیم، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1901، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 565، دار احیاء التراث العربیہ

4۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، باب المہر، جلد 3، صفحہ 254، دار المحاسن قاہرہ

اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس سے اس مال سے زیادہ نہیں لے گا جو اس نے اسے دیا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت طاؤس، حضرت عطا اور حضرت اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: قضاۃ اس کے مال لینے کی اجازت نہیں دیتے مگر اتنا جو اس نے اسے دیا ہوا ہو۔ یہی قول امام احمد اور اسحاق رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابن جریج نے روایت کیا ہے کہ ابوالزبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں زینب بنت عبد اللہ بن ابی بن سلول تھی۔ اور انہوں نے بطور مہر ایک باغ اسے دیا تھا۔ پھر اس نے انہیں ناپسند کیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”زیادہ تو نہیں البتہ اس کا باغ واپس کر دے۔“ تو اس نے عرض کی! جی ہاں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے وہ باغ لے لیا اور اس کا راستہ چھوڑ دیا (یعنی اسے فارغ کر دیا) اور جب یہ خبر حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو انہوں نے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ قبول ہے (1)۔ اسے ابوالزبیر نے کئی ایک سے سنا ہے اور دارقطنی نے اسے بیان کیا ہے اور حضرت عطا سے مرسل روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آدی خلع لینے والی عورت سے اس سے زیادہ مال نہیں لے گا جتنا اس نے اسے دیا ہوا ہے۔“ (2)

مسئلہ نمبر 7۔ امام مالک کے نزدیک خلع جائز ہے ایسے پھل کے عوض جس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر نہ ہو، بدکنے والے اونٹ کے عوض، بھاگ جانے والے غلام کے عوض، جنین کے عوض جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہو یا اسی طرح کی اور چیزیں جن کی ہلاکت کا امکان ہو، بخلاف بیوع اور نکاح کے اور اس کے لئے ان تمام کا مطالبہ جائز ہے پس اگر وہ اس کے حوالے ہوگئی تو وہ اس کی ہو جائے گی اور اگر اس کے حوالے نہ ہوئی تو پھر اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی اور طلاق اس کے حکم پر نافذ ہو جائے گی۔

امام شافعی نے کہا ہے: خلع جائز ہوگا اور اس کے لئے مہر مثل ہوگا۔ اسے ابن خويز منداد نے امام مالک رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: کیونکہ وہ عقود جن میں معاوضہ ہوتا ہے جب وہ بدل فاسد کو مستفمن ہوں اور وہ ضائع ہو جائے تو ان میں بدل کی مثل واجب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے (لہذا مہر مثل لوٹایا جائے گا۔)

اور ابو ثور نے کہا ہے: خلع باطل ہے، اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خلع جائز ہے اور اس کے لئے وہ ہوگا جو لونڈی کے پیٹ میں ہے اور اگر اس میں بچہ نہ ہو تو اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی۔

اور ”المبسوط“ میں ابن قاسم سے منقول ہے: خلع جائز ہوتا ہے اس پھل کے عوض جو اس کے درخت اس سال دیں گے اور ان کے عوض جو بچے اس کا ریوڑ اس سال دے گا، اس سے امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ اور ابن القاسم کے موقف کی دلیل اس ارشاد کا عموم ہے: **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ**۔

اور قیاس کی جہت سے یہ کہ یہ ان میں سے ہیں جن کا وہ ہبہ اور وصیت کے ساتھ مالک بن جاتا ہے تو پھر جائز ہے کہ یہ معلوم کی طرح خلع میں بھی عوض ہوں اور یہ بھی کہ خلع طلاق ہے اور طلاق اصلاً بغیر عوض کے صحیح ہوتی ہے تو جب بغیر کسی شے

کے عوض کے یہ صحیح ہے تو پھر فاسد عوض کے ساتھ اس کا صحیح ہونا بدرجہ اولیٰ ہوگا، کیونکہ مبذول کی سب سے بری حالت یہی ہے کہ وہ مسکوت عنہ کی طرح ہو اور جب وہ نکاح جو عقد تحلیل ہے فاسد عوض اسے فاسد نہیں کرتا تو یہ اس طلاق کو کیونکر فاسد کر سکتا ہے جو عقد کو زائل کرنے والی اور اسے کھولنے والی ہے (یعنی بدرجہ اولیٰ عوض فاسد اسے فاسد نہیں کرے گا۔)

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی عورت نے اس کے عوض آدمی سے خلع کیا کہ وہ اس سے اپنے بیٹے کو دو سال تک دودھ پلائے گی تو یہ جائز ہے۔ خلع کی صورت میں دو سال کے بعد مدت معلومہ تک اس کا نفقہ بیٹے پر ہوگا اس کے بارے دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک ہے کہ وہ جائز ہے اور یہ مخزومی کا قول ہے اور اسے سخون نے اختیار کیا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ جائز نہیں اسے ابن قاسم نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور اگر خاوند نے اس کی شرط لگائی تو وہ باطل ہے اور زوجہ سے اسے اتار دیا جائے گا (1) (یعنی اس پر اسے لازم نہیں کیا جائے گا۔)

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے بدکنے والے اونٹ، بھاگ جانے والے غلام اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کے مانع ہونے کا امکان ہے کہ عوض خلع کو جائز قرار دیا ہے ان کے ذمہ پر لازم ہے کہ وہ اسے بھی جائز قرار دیں۔ ان کے علاوہ قرویین نے کہا: امام مالک نے اس نفقہ کے عوض خلع سے منع نہیں کیا جو دو سال سے زائد ہو غرر کی وجہ سے۔ بلکہ اس سے منع کیا ہے کیونکہ یہ وہ حق ہے جو ہر حال میں باپ کے ساتھ خاص ہوتا ہے، پس اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کرے اور اس میں اور دو سال کے نفقہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ نفقہ اور یہ دودھ پلانا زوجیت کی حالت میں ماں پر واجب ہوتا ہے اور طلاق کے بعد بھی جب باپ تنگ دست اور مفلس ہو تو جائز ہے کہ وہ نفقہ ماں کی طرف منتقل ہو جائے، کیونکہ یہی اس کا محل ہے۔ اور امام مالک نے اس پر المبسوط میں اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَمَرَآذَانُ يُتِمَّ الرِّضَاعَةَ (البقرہ: 233) (اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہتا ہے۔)

مسئلہ نمبر 9۔ اگر بیٹے کے نفقہ کے عوض وجہ مباح پر خلع واقع ہو اور مدت مکمل ہونے سے پہلے بچہ فوت ہو جائے تو کیا بقیہ نفقہ کے لئے خاوند اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے؟ تو ابن المواز نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ کسی شے کے لئے عورت کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اور ابو الفرج نے آپ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے کیونکہ یہ ایسا حق ہے جو خلع کے عوض اس کے لئے عورت کے ذمہ ثابت ہے اور وہ بچے کی موت سے ساقط نہیں ہوگا، جیسا کہ اگر وہ اس سے خلع کرے ایسے مال کے عوض جو عورت کے ذمہ کے ساتھ متعلق ہو۔ اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے ایسے مال کی شرط نہیں لگائی جو اسے خوشحال بنادے گا، بلکہ اس نے اپنے بچے کی مشقت کی کفایت کرنے کی شرط لگائی ہے اور جب بچہ فوت ہو گیا تو اب اس کے لئے عورت کی طرف کسی شے کے لئے رجوع نہیں ہوگا جیسا کہ اگر کوئی آدمی ایک سال تک کسی بچے پر استحسانا اور تطوعاً خرچ کرنے کی ذمہ داری لے اور بچہ فوت ہو جائے تو اس پر کسی شے کے لئے رجوع نہیں کیا

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب ما جاء فی الخدم، جلد 5، صفحہ 27، السعادة بجوارح حفظہ مصر

جائے گا کیونکہ اس نے اپنے تطوع سے بچے کی مشقت برداشت کرنے کا قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم
امام مالک نے کہا ہے: میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے جو اس طرح کی صورت میں رجوع کرتا ہو اور اگر وہ اس کا پیچھا
کرے تو بھی اس بارے اس کے لئے آپ کا ایک قول ہے۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر عورت فوت ہوگئی تو بچے
کا نفقہ اس کے مال میں ہوگا کیونکہ یہ وہ حق ہے جو اس کی موت سے پہلے اس میں ثابت ہو چکا ہے، لہذا وہ اس کی موت کے
ساتھ ساقط نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جس کسی نے خلع کی صورت میں اپنی عورت پر اس کے حمل کے نفقہ کی شرط لگائی اور عورت کے پاس
کوئی شے نہ ہو تو نفقہ اس آدمی پر ہوگا کیونکہ عورت کے پاس کوئی مال نہیں ہے جس سے وہ خرچ کر سکے اور اگر وہ اس کے بعد
خوشحال ہو جائے تو آدمی اس مال کے لئے اس کی طرف رجوع کر لے جو اس نے خرچ کیا اور وہ اس سے لے لے۔

امام مالک نے کہا: حق یہ ہے کہ آدمی کو اس کے اپنے بچے کے نفقہ کا مکلف اور پابند بنایا جائے اگرچہ اس نے بچے کی ماں
پر اس کے نفقہ کی شرط لگائی ہو بشرطیکہ ماں کے پاس ایسا مال نہ ہو جو وہ اس پر خرچ کر سکے۔

مسئلہ نمبر 11۔ خلع کے بارے میں علماء کا یہ اختلاف ہے کہ کیا وہ طلاق ہے یا فسخ نکاح ہے؟ پس حضرت عثمان،
حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ خلع طلاق ہے (1) اور یہی امام مالک،
ثوری، اوزاعی، ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے۔ پس جس
نے خلع سے دو یا تین طلاقوں کی نیت کی، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک وہ اسے لازم ہو جائیگی اور اصحاب الرائے نے کہا
ہے: اگر خاوند نے تین طلاقوں کی نیت کی تو وہ تین ہی ہوں گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو وہ ایک طلاق بائنہ ہوگی
(کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے)۔

اور امام شافعی نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے: اگر اس نے خلع سے طلاق کی نیت کی اور اس کا نام بھی لیا تو وہ
طلاق ہوگی اور اگر اس نے طلاق کی نیت نہ کی اور نہ اس کا نام لیا تو فرقت واقع نہ ہوگی، آپ نے قدیمی قول میں یہی کہا ہے اور
آپ کا پہلا قول میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ مزنی نے کہا ہے: وہی ان کے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔

اور ابو ثور نے کہا ہے: جب وہ طلاق کا نام نہ لے تو خلع فقط فرقت ہوگی اور طلاق نہیں ہوگی اور اس نے طلاق کا نام لیا تو وہ
طلاق ہوگی اور زوج رجعت کا زیادہ مالک ہوگا جب تک وہ عدت میں رہی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ خلع فسخ ہے، طلاق نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اس کی نیت کرے ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما،
حضرت طاؤس، حضرت عکرمہ، حضرت اسحاق اور امام احمد رحمہ اللہ ہیں۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ابن
عمیینہ نے عمرو سے، انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ابراہیم بن سعد بن ابی
وقاص رضی اللہ عنہما نے ان سے پوچھا کہ ایک آدمی جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر بیوی نے اس سے خلع لے لیا کیا وہ اس

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 18، السعادة بجوارح اللہ معمر

سے شادی کر سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں چاہیے کہ وہ اس سے نکاح کر لے، خلع طلاق نہیں ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کی ابتدا میں اور اس کے آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور خلع کا ذکر ان کے درمیان میں ہے، پس خلع کوئی شے نہیں ہے۔ پھر کہا: **الطَّلَاقُ مَرْثَنٌ قَامَسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيَةً بِإِحْسَانٍ**، پھر پڑھا: **فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ**۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اگر خلع طلاق ہو تو پھر دو طلاقوں کے ذکر کے بعد یہ تیسری ہوگی اور اس کے بعد **فَإِنْ طَلَّقَهَا** چوتھی طلاق پر دال ہوگا، پس تحریم چار طلاقوں کے ساتھ متعلق ہو جائے گی۔

انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے امام ترمذی، ابو داؤد اور دارقطنی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک حیض عدت گزارنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)۔ اور حضرت ربیع بنت معوذ بن عمرو سے روایت ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں خلع لیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا یا اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض کے ساتھ عدت گزارے۔ ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ربیع کی حدیث صحیح ہے کہ اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض عدت گزارے (3)۔ انہوں نے کہا: پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع فسخ ہے نہ کہ طلاق اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ** اور اگر یہ (خلع لینے والی) عورت مطلقہ ہوتی تو اس کے لئے ایک حیض پر اقتصار نہ کیا جاتا (کیونکہ عدت تو تین حیض ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر اس نے اس سے خلع کر لیا، پھر وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے لئے صحیح ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ اگرچہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی نہ کرے۔ کیونکہ اس کے لئے دو طلاقوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور خلع لغو ہے۔

اور جنہوں نے خلع کو طلاق بنایا ہے انہوں نے کہا ہے: اس کے لئے اس عورت کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ وہ دوسرے زوج سے شادی کر لے، کیونکہ خلع کے ساتھ تین طلاقیں مکمل ہو گئی ہیں اور یہی صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: اس آدمی کے بارے میں قول کیسے جائز ہو سکتا ہے جسے اس کی بیوی نے کہا: تو مجھے مال کے عوض طلاق دے دے، پس اس نے اسے طلاق دے دی، کہ یہ طلاق نہیں ہوگی اور اگر اس نے بغیر کسی شے کے عورت کا معاملہ اس کے ہاتھ دے دیا اور اس نے اپنے آپ کو طلاق دے دی تو وہ طلاق ہوگی۔ (فرمایا) رہا قول باری تعالیٰ: **فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ** تو یہ اس قول پر معطوف ہے: **الطَّلَاقُ مَرْثَنٌ** کیونکہ اس کا ارشاد: **أَوْ تَسْرِيَةً بِإِحْسَانٍ** بلاشبہ یہ مراد یہ ہے یا تطلیق ہے اور اگر خلع کا عطف دو طلاقوں پر کیا جائے تو پھر خلع اصلاً جائز ہی نہ ہوگا

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب الخلع بل مخرج او طلاق، جلد 7، صفحہ 316، دار الفکر بیروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب المطلاق، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم اسلام آباد۔ ابو داؤد، باب الخلع، حدیث نمبر 1902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

مگر دو طلاقوں کے بعد اور یہ کوئی بھی نہیں کہتا۔

اور کسی اور نے کہا ہے: آیت میں جو تاویل انہوں نے کی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ الطَّلَاقُ مَزْنٌ نے دو طلاقوں کے حکم کا فائدہ دیا ہے جب وہ ان دونوں کو خلع کی وجہ کے سوا پر واقع کرے۔ اور ان دونوں کے ساتھ قَامَسَاکَ بِمَعْرُوفٍ کے سبب رجعت بھی ثابت ہوگی۔ پھر ان دونوں کا حکم ذکر کیا جب یہ علی وجہ الخلع ہوں۔ پس خلع ان دو کی طرف لوٹ آئے گا جن کا ذکر پہلے ہو چکا، کیونکہ اس سے مقصود طلاق مطلق اور طلاق بالعوض کا بیان ہے اور تیسری طلاق چاہے بالعوض ہو یا بغیر عوض کے ہو بلاشبہ وہ حلت کو ختم کر دیتی ہے مگر زوج ثانی کے بعد۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جواب تو آیت کا ہے اور رہی حدیث! تو ابو داؤد نے کہا ہے۔ جب انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حیض کے بیان میں ذکر کی۔ اس حدیث کو عبد الرزاق نے معمر بن عمرو بن مسلم عن عکرمۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرسل ذکر کیا ہے اور قعنبی نے مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی مثل ہے (1)۔ ابو داؤد نے کہا ہے: ہمارے نزدیک عمل اسی پر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ثوری اور اہل کوفہ کا مذہب ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے اکثر اہل علم اور دوسروں کا بھی یہی مذہب ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حیض۔ کہ مارے میں حدیث اپنی غرابت کے باوجود جیسا کہ امام ترمذی نے کہا ہے اور مرسل ہونے کے باوجود جیسا کہ ابو داؤد نے ذکر کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی (2)، اسے دارقطنی نے معمر بن عمرو بن مسلم عن عکرمۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی۔ یہاں معمر سے ڈیڑھ حیض روایت کرنے والا وہی راوی ہے جو ان سے ایک حیض روایت کرتا ہے اور وہ ہشام بن یوسف ابو عبد الرحمن الصنعانی الیمانی ہے۔ اکیلے امام بخاری نے اس کی روایت نقل کی ہے۔ پس سند اور متن کے اعتبار سے حدیث مضطرب ہے، پس اس سے اس بارے میں استدلال کرنا ساقط ہو گیا کہ خلع فسخ نکاح ہے اور اس بارے میں بھی کہ مطلقہ کی عدت ایک حیض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ہر مطلقہ مدخول بہا کے بارے میں نص باقی رہا۔ سوائے ان کے جنہیں اس سے خاص کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب نے کہا ہے: خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے (3)، اسحاق نے کہا ہے: اگر کوئی جانے والا اس طرف جائے تو وہ مذہب قوی ہے۔“

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کی عدت ایک حیض ہے اور یہی ابان

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم 2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 255، دار الحسن قاہرہ

3۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق واللعان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم۔ ایضاً، ہاب الی الخدم، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بن عثمان اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس کی عدت مطلقہ کی عدت کی طرح ہے اور حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے میں میں کہتا ہوں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ثابت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: تحقیق ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی طرح ہے (1) اور یہ قول صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام مالک کا قول اس کے بارے میں مختلف ہے جس نے بلا عوض خلع واقع کرنے کا قصد کیا۔ پس عبد الوہاب نے کہا ہے: امام مالک کے نزدیک وہ خلع ہے اور طلاق بائن ہے اور آپ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاق بائن نہ ہو گی مگر عوض پائے جانے کے ساتھ۔ اشہب اور امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے، کیونکہ یہ طلاق عوض اور استیفاء عدد سے خالی ہے پس یہ رجعی ہوگی جیسا کہ اگر یہ لفظ طلاق کے ساتھ ہو۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: میرے نزدیک اور دیگر اہل علم کے نزدیک نظر و فکر کے اعتبار سے آپ کے دو قولوں میں سے یہ زیادہ صحیح ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ خلع میں عوض کا حاصل نہ ہونا اسے اپنے مقتضا سے نہیں نکالتا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ شراب یا خنزیر کے عوض خلع کرے۔

مسئلہ نمبر 13۔ خلع کرنے والی عورت وہ ہوتی ہے جو اپنی کل شے کے عوض خلع کرتی ہے۔ اور مفتدیہ فدیہ دینے والی وہ ہوتی ہے جو بعض مال بطور فدیہ دیتی ہے اور بعض لے لیتی ہے اور مبارئۃ مبارات کرنے والی وہ ہوتی ہے جو دخول سے پہلے ہی اپنے خاوند سے جدائی اختیار کر لے۔ پس وہ کہتی ہے: قد ابرأتک فبارئنی (میں نے تجھے جدا کیا پس تو مجھے جدا کر دے۔) یہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے اور عیسیٰ بن دینار نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: مبارئۃ وہ عورت ہے جو نہ کوئی شے لیتی ہے اور نہ کچھ دیتی ہے (2) اور مختلعه (خلع کرنے والی) وہ ہے جو وہ مال بھی دے دیتی ہے جو خاوند نے اسے دیا ہو اور اپنے مال سے اس میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ اور مفتدیہ وہ ہے جو اس مال کے بعض سے فدیہ دیتی ہے جو مرد نے اسے دیا ہو اور بعض اپنے پاس روک لیتی ہے اور یہ سب دخول سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور بعد بھی۔ پس جو دخول سے پہلے ہو اس میں عدت نہیں ہے۔ اور مصالحہ (صلح کرنے والی) مبارئۃ کی مثل ہے۔

قاضی ابو محمد وغیرہ نے کہا ہے: یہ چاروں الفاظ ایک ہی معنی کی طرف راجع ہوتے ہیں (3) اگرچہ ایقاع کے اعتبار سے ان کی صفات مختلف ہیں۔ اور یہ طلاق بائنہ ہے چاہے وہ اس کا نام لے یا نام نہ لے، مرد کے لئے عدت کے دوران رجعت کا حق نہیں ہوگا اور اسے عدت میں اور اس کے بعد ولی کی رضامندی اور مہر کے ساتھ زوج ثانی سے پہلے اور بعد نکاح کا حق حاصل ہوگا، بخلاف ابو ثور کے، کیونکہ عورت نے جب عوض ادا کر دیا تو وہ اپنے نفس کی مالک ہو جائے گی اور اگر طلاق خلع رجعی ہو تو

1۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم

2۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 14، المساعدة بجوارحافظ مصر
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیۃ بیروت

پھر وہ اپنے نفس کی مالک تو نہ ہوئی: پس خاوند کے لئے عوض اور معوض عند دونوں جمع ہو جائیں گے (اور یہ صحیح نہیں ہے۔)
مسئلہ نمبر 14۔ اور یہ عقد مطلق کے ساتھ نافذ ہے: پس اگر عورت نے مرد کے لئے عوض خرچ کر دیا اور اس نے رجعت کی شرط لگالی، تو اس میں دو روایتیں ہیں۔ ابن وہب نے دونوں امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کی ہیں۔ ان میں سے ایک میں اس کا ثبوت ہے اور سخون نے بھی اسی طرح کہا ہے اور دوسری میں اس کی نفی ہے۔ سخون نے کہا ہے: پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں (مرد و عورت) اس پر متفق ہو گئے کہ عوض اس کے مقابلے میں ہوگا جو عد دطلاق میں سے ساقط ہو رہا ہے اور یہ جائز ہے۔

اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عقد میں شرط ایسی قائم کی ہے جو مقصود کے مانع ہے، پس وہ ثابت نہ ہوگی، جیسا کہ اگر وہ عقد نکاح میں شرط رکھ لے کہ میں اس سے وطی نہ کروں گا۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا۔ جب اللہ تعالیٰ نے نکاح اور فراق کے احکام بیان کیے تو فرمایا: تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں جن کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں روزے کی تحریمات کا ذکر کیا اور فرمایا: تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا (یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں سو تم ان کے قریب نہ جاؤ) اور حدود کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ان میں سے ایک وہ حدود الامر ہیں جن کی پیروی لازم ہے اور دوسری حدود النہی ہیں جن سے اجتناب لازم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی اور فرمایا: وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ① (اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھتا ہے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔)

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ② فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ③ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ④

”(دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ پس اگر وہ (دوسرا) طلاق دے اسے تو کوئی حرج نہیں ان دونوں پر کہ رجوع کر لیں بشرطیکہ انہیں خیال ہو کہ وہ قائم رکھ سکیں گے اللہ کی حدود کو اور یہ حدیں ہیں اللہ کی وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔“

قولہ تعالیٰ: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ احناف میں سے بعض مشائخ خراسان نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ خلع والی عورت کو طلاق لاحق ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: ایسی طلاق جس کے عوض فدیہ دیا جاتا ہے اس کے بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے صریح طلاق کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ فاحرف تعقیب ہے (1)۔ اور یہ بعید ہے کہ اسے الظَّلَامِي مَرْتِن کی طرف لوٹایا جائے، کیونکہ درمیان

میں ایسا کلام ہے جو فَإِنْ طَلَّقَهَا کی الطَّلَاقِ مَوْثِقِ پر بنا کرنے کے مانع ہے۔ بلکہ اقرب یہی ہے کہ اس کا رجوع اس پر ہو جو اس کے ساتھ متصل ہے جیسا کہ استثنا (ان شاء اللہ تعالیٰ) میں ہوتا ہے۔ اور یہ اس کی طرف راجع نہیں ہوگا جو اس سے متقدم ہے مگر دلالت کے ساتھ (یعنی جب کوئی قرینہ دال ہو تو پھر متقدم کی طرف راجع ہو سکتا ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَرَبَّاهُنَّ الَّتِي فِي حُجُوبِكُمْ مِّنْ نِّسَاءِ الَّتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ (النساء: ۲۳) (اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔)

پس یہ اسی پر مقصور ہوگی جو اس کے متصل بعد ہے اور اس کی طرف عائد نہیں جو اس پر متقدم ہے یہاں تک کہ عورتوں کی ماؤں کے بارے میں دخول کی شرط نہیں ہوگی۔

علماء کا خلع کے بعد عدت میں طلاق ہونے کے بارے اختلاف ہے، پس ایک گروہ نے کہا ہے: جب آدمی نے اپنی بیوی سے خلع کر لیا پھر اسے طلاق دے دی اور وہ عورت ابھی عدت میں تھی تو جب تک وہ عدت میں ہے اسے طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، شریح، طاؤس، نخعی، زہری، حکم، حماد، ثوری، اصحاب الرائے رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اسے طلاق لازم نہ ہوگی اور یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت عکرمہ، حضرت حسن، حضرت جابر بن زید، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمہم و رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ اور یہی امام مالک کا قول ہے، مگر امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر عورت نے اس شرط پر اسے طلاق کا فدیہ دیا کہ وہ اسے مسلسل تین طلاقیں ترتیب کے ساتھ دے گا پھر جس وقت اس نے اسے طلاق دی تو وہ اس پر ثابت ہوگئی اور اگر اس کے درمیان خاموشی ہو تو جو طلاق خاموشی اور وقفے کے بعد ہوگی وہ کوئی شے نہ ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نسق الکلام کا معنی ہے کہ وہ بعض بعض کے ساتھ متصل ہو اور یہ اس کے لئے ایک حکم ثابت کرتا ہے اسی طرح جب استثناء قسم کے متصل بعد ہو تو اس کے لئے استثنا کا حکم ثابت ہو جاتا ہے اور جب اس سے منفصل ہو تو پھر اس کا متقدم کلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَإِنْ طَلَّقَهَا سے مراد تیسری طلاق ہے فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَہَا اس پر اجماع ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے (کیا) نکاح کافی ہوتا ہے۔ اور اس بارے میں کہ کیا شے تحلیل کو مباح کرتی ہے۔ پس حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ اور آپ کے ساتھ موافقت رکھنے والوں نے کہا ہے: صرف عقد نکاح ہی کافی ہے۔ اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: صرف وطی کافی نہیں ہے یہاں تک کہ انزال ہو جائے۔

جمہور علماء اور تمام فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ اس میں وطی کافی ہے اور اس سے مراد شرمگاہوں کا اس طرح ملنا ہے جو حد اور غسل کو واجب کر دے۔ روزے اور حج کو فاسد کر دے اور زوجین کو محسن بنادے اور کامل مہر لازم کر دے۔

ابن عربی نے کہا ہے: فقہ میں میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ نہیں آیا جو اس سے زیادہ مشکل ہو اور وہ یہ کہ اصول فقہ میں سے ہے کہ کیا حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے یا اواخر اسماء سے؟ سو اگر ہم کہیں کہ حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم

ہے کہ ہم حضرت سعید بن مسیب کے قول کے مطابق کہیں۔ اور اگر ہم کہیں کہ حکم اوخر اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم حشفہ کو فرج میں غائب کرنے کے ساتھ انزال کی شرط بھی لگائیں، کیونکہ یہی ذوق عسیلہ کا آخر ہے (1) جیسا کہ حسن نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ذوق عسیلہ کا معنی وطی کرنا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب کے سوا علماء کی جماعت کا یہی موقف ہے۔ آپ فرماتے ہیں: پس لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ دوسرا اس سے مجامعت کر لے اور میں یہ کہتا ہوں جب دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ نکاح صحیح کر لیا کہ وہ اس سے اس کے حلالہ کا ارادہ نہ کرے تو پھر کوئی حرج نہیں کہ زوج اول اس سے نکاح کر لے۔ اور یہ قول ہے جس کے بارے ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے آپ کے ساتھ موافقت کی ہو سوائے خوارج کی ایک جماعت کے اور اس کے ماسوا کے بارے میں سنت پر اکتفا کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید بن مسیب کے قول کے بارے میں حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ اسے نحاس نے کتاب ”معانی القرآن“ میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: اہل علم کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے، کیونکہ فرمایا: زَوْجًا غَيْرًا حالانکہ زوجیت مقدم ہے پس نکاح جماع کے معنی میں ہوگا۔ مگر سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ یہاں لفظ نکاح نکاح صحیح کے معنی میں ہے جب اس نے اسے حلالہ کرنے کا ارادہ نہ کیا ہو۔

میں (مفسر) نے کہا ہے: میں ان دونوں کے بارے میں یہ گمان کرتا ہوں کہ حدیث عسیلہ ان تک نہیں پہنچی یا وہ ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پس انہوں نے ظاہر قرآن کو لے لیا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرًا وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

ائمہ کرام نے روایت کیا اور الفاظ دارقطنی کے ہیں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور خاوند سے شادی کر لے اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا شہد چکھ لے۔“ (2)

بعض علمائے احناف نے کہا ہے: جو کوئی حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے مذہب کے مطابق عقد نکاح کر لے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ اسے فسخ کر دے اور اس میں آپ کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ علماء کے اجماع سے خارج ہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اور وہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے سمجھا جاتا ہے: حتی ینذوق کل واحد منهما عسیلہ صاحبہ (3) کہ وہ دونوں جماع کی لذت پانے میں برابر ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک اس بارے میں دو قولوں میں سے ایک کے لئے حجت ہے کہ اگر اس نے اس سے وطی کی در آنحالیکہ وہ سوئی پڑی ہو یا اس پر غشی طاری ہو تو وہ طلاق دینے والے (زوج اول) کے لئے حلال نہ ہوگی، کیونکہ اس نے شہد نہیں چکھا جب اسے اس کا ادراک نہ ہوا۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام نسائی نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال گودنے والی اور گودوانے والی، دوسرے کے بال اپنے بالوں میں لگانے والی اور بال لگوانے والی، سود کھانے والے اور

1۔ الکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 196، دار الفکر بیروت

2۔ ارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 32، دار الحاسن قاہرہ

3۔ ایضاً

کھلانے والے، حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے ان تمام پر لعنت کی ہے۔ (1)

اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے پر لعنت کی ہے (2)۔ اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور یہ حدیث حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی اسناد سے مروی ہے اور اہل علم کے نزدیک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے جن کا اس پر عمل ہے ان میں سے حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔

اور تابعین میں سے فقہاء کا بھی یہی قول ہے اور اسی طرح سفیان ثوری، ابن مبارک، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اسحاق رحمہ اللہ بھی کہتے ہیں اور میں نے جارود سے سنا ہے وہ وکیع سے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی اسی طرح کہا ہے اور فرمایا: چاہئے کہ اس باب کے بارے میں اصحاب رائے کا قول بیان کیا جائے اور حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے تاکہ وہ اسے (پہلے خاوند کے لئے) حلال کر دے پھر اسے خیال آیا کہ وہ اسے روک لے تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ نیا نکاح کرے۔

ابو عمر بن عبدالبر نے کہا ہے کہ حلالہ نکالنے والے کے نکاح میں علماء نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک نے کہا ہے: حلالہ نکالنے والا اپنے نکاح پر قائم نہیں رہے گا یہاں تک کہ وہ نکاح جدید کر لے، پس اگر اس نے اس کے ساتھ مجامعت کی تو اس کے لئے مہر مثل ہوگا اور اس کی مجامعت اسے زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ برابر ہے دونوں کو علم ہو یا علم نہ ہو جب اس نے حلالہ کی غرض سے اس کے ساتھ شادی کی۔ اور نہ وہ اپنے نکاح پر برقرار رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امام ثوری اور اوزاعی نے بھی کہا ہے اور اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے جو نکاح خیار اور محلل کے بارے میں امام ثوری سے مروی ہے کہ نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے اور اس میں اور نکاح متعہ کے بارے میں ابن ابی لیلیٰ کا بھی یہی قول ہے اور امام اوزاعی رحمہ اللہ سے نکاح محلل کے بارے میں مروی ہے: کتنا برا ہے جو اس نے کیا ہے اور نکاح جائز ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے: نکاح جائز ہے اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا اور اس کے لئے اسے اپنے پاس روک لینا جائز ہے اگر وہ چاہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ایک بار اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ عورت زوج اول کے لئے حلال نہیں ہوگی اگر اس نے اس کے ساتھ حلالہ کی غرض سے شادی کی اور ایک بار انہوں نے کہا: اس نکاح کے ساتھ وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی بشرطیکہ زوج ثانی اس کے ساتھ مجامعت کرے اور اسے طلاق دے دے اور اس بارے میں انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا کہ اس زوج (مراد زوج ثانی) کا نکاح صحیح ہے اور یہ کہ اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پر قائم رہے۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 101، وزارت تعلیم۔ ایضاً، مسند امام احمد، حدیث نمبر 4283

2۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً، باب ما جاء في المحلل الخ، حدیث نمبر 1038-1039۔ ابوداؤد، باب في التحليل، حدیث نمبر 1778، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المحلل والمحلل له، حدیث نمبر 1923-1924-1925، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے: امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: جب آدمی نے یہ کہا کہ میں تیرے ساتھ شادی کرنے لگا ہوں تاکہ میں تجھے (زوج اول کے لئے) حلال کر دوں پھر اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی نکاح نہیں، تو یہ نکاح متعہ کی قسم ہے اور یہ فاسد ہے، وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا اور اگر اس نے اس نکاح پر وطی کی تو وہ (زوج اول کے لئے) حلال نہ ہوگی اور اگر زوج ثانی نے اس کے ساتھ مطلقاً نکاح کیا نہ اس نے کوئی شرط لگائی اور نہ ہی اس پر حلالہ کی شرط لگائی گئی تو اس بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کے ان کی قدیم کتاب میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک امام مالک رحمہ اللہ کے قول کی مثل ہے اور دوسرا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کی مثل ہے اور ان کی جدید مصری کتاب میں ان کا قول مختلف نہیں کہ نکاح صحیح ہوگا جب اس نے کوئی شرط نہ لگائی اور یہی داؤد کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الماوردی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے کہ اگر حلالہ کی شرط عقد سے پہلے لگائی گئی تو نکاح صحیح ہوگا اور وہ اسے زوج اول کے لئے حلال کر دے گا۔ اور اگر دونوں نے عقد کے دوران حلالہ کی شرط لگائی تو نکاح باطل ہوگا اور وہ اسے پہلے کے لئے حلال نہیں کرے گا۔ فرمایا: یہی امام شافعی کا قول ہے اور حسن اور ابراہیم نے کہا ہے: جب تین میں سے کسی ایک نے حلالہ کا قصد کیا تو نکاح فاسد ہوگا اور یہ بہت شدت اور سختی ہے اور سالم اور قاسم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ حلالہ کی غرض سے شادی کرے بشرطیکہ زوجین کو اس کا علم نہ ہو (1) اور وہ ماجور ہوگا۔ اسی طرح ربیعہ اور یحییٰ بن سعید نے کہا ہے اور داؤد بن علی نے بھی یہی کہا ہے بشرطیکہ عقد کرتے وقت اس کی شرط کا اظہار نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ ہمارے علماء کے نزدیک حلالہ کے لئے نکاح کے جائز ہونے کا دار و مدار نکاح کرنے والے زوج پر ہے۔ خواہ اس کی شرط لگائی جائے یا وہ اس کی نیت کرے اور جب اس میں سے کوئی شے ہوگی تو اس کا نکاح فاسد ہوگا اور وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اس کی وطی اس عورت کو زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ اور طلاق دینے والے خاوند کا اس بارے میں جاننا اور نہ جاننا برابر ہے اور کہا گیا ہے: بے شک اسے چاہئے کہ جب اسے علم ہو کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے والے نے اس لئے اس کے ساتھ شادی کی ہے تو وہ اس کے رجوع سے احتیاط برتے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اسے حلال نہیں کرے گا مگر وہ نکاح جو رغبت کے ساتھ ہو اور اسے عورت کی حاجت اور ضرورت ہو اور اس سے حلالہ کا قصد نہ کیا جائے اور اس کا عورت کے ساتھ وطی کرنا مباح ہو (یعنی) نہ وہ روزے دار ہو، نہ حالت احرام میں ہو اور نہ ہی حیض کی حالت میں ہو اور زوج بالغ مسلمان ہو۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: جب زوج ثانی نکاح صحیح کے ساتھ اس سے وطی کرے اور اس کی فرج میں حشفہ غائب کر دے تو تحقیق دونوں نے شہد چکھ لیا اور اس میں نکاح کرنے والے کا قوی اور ضعیف ہونا برابر ہے اور برابر ہے کہ وہ اسے داخل کرے اپنے ہاتھ کے ساتھ یا عورت کے ہاتھ کے ساتھ اور وہ بچہ ہو یا مراہق (قریب الہلوغ) ہو یا محبوب (مقطوع الذکر) ہو اس کا اتنا حصہ باقی ہو جسے وہ غائب کر سکتا ہو جیسا کہ غیر خصی آدمی غائب کرتا ہے اور برابر ہے کہ خاوند اس سے وطی کرے اس حال

میں کہ وہ عورت احرام باندھے ہوئے ہو یا روزے دار ہوے یہ سب کچھ اس بنا پر ہے جو امام شافعی نے بیان کیا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح کا قول بھی ہے اور بعض اصحاب مالک کا قول بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ابن حبیب نے کہا ہے: اگر وہ اس سے شادی کرے پھر اگر وہ اسے پسند آجائے تو وہ اسے روک لے گا ورنہ اسے حلال کرنے میں اس کے لئے اجر ہوگا تو یہ جائز نہیں۔ جب اس نے اپنے نکاح کو حلالہ کی نیت سے ملا یا تو اب اس کے ساتھ وہ زوج اول کے لئے حلال نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 6۔ آقا کا اپنی اس لونڈی کے ساتھ وطی کرنا جس کا خاوند اسے قطعی طلاق دے دے اسے حلال نہیں کرتا، کیونکہ وہ زوج نہیں ہے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی عبیدہ، مسروق، شعبی، ابراہیم، جابر بن زید، سلیمان بن یسار، حماد بن ابی سلیمان اور ابوالزناد رحمہم کا بھی قول ہے اور اسی موقف پر فقہائے امصار کی جماعت بھی ہے۔ اور عثمان، زید بن ثابت اور زبیر سے اس کے خلاف بھی روایت ہے وہ یہ کہ وہ اسے حلال کر دے گا جب اس کے آقا نے اس کے ساتھ وطی کی اور وہ اس سے نہ دھوکہ دہی کا ارادہ کرے اور نہ ہی حلالہ کا اور وہ اپنے زوج کی طرف نکاح اور مہر کے ساتھ لوٹ جائے گی۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتَّى تَتَّكِبَ زَوْجًا غَيْرَکَ اور آقا اس پر ملک یمین کی حیثیت سے مسلط ہوا ہے اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ انہیں خبر پہنچی ہے کہ حضرت سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہما سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنے غلام کی شادی اپنی ایک لونڈی سے کی، پھر غلام نے اسے طلاق البتہ (قطع کرنے والی طلاق) دی، پھر آقا نے وہ لونڈی اسی غلام کو بہہ کر دی تو کیا وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال ہوگی؟ تو دونوں نے کہا: وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ حضرت امام مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن شہاب رحمہ اللہ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جس کے نکاح میں ایک مملوک لونڈی تھی پھر اس نے اسے خرید لیا درآنحالیکہ اس نے اسے ایک طلاق دے رکھی تھی۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ اس کے لئے ملک یمین کی حیثیت سے حلال ہوگی جب تک وہ اس کی طلاق کو مغلطہ نہ بنائے اور اگر اس نے اسے طلاق مغلطہ دی تو پھر وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (2)۔ ابو عمر نے کہا ہے: علماء کی جماعت اور ائمہ فتویٰ کا یہی موقف ہے، امام مالک، ثوری، اوزاعی، شافعی، ابوحنیفہ، احمد، اسحاق، ابو ثور انہی میں سے ہیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطاء، طاؤس اور حسن رحمہم کہتے ہیں: جب اس نے اسے خرید لیا جس نے اسے طلاق البتہ دی تو وہ اس کے لئے ملک یمین کے طور پر حلال ہوگی، اس لئے کہ یہ ارشاد عام ہے: او ما مملکت ایسانکم۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس قول میں خطا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد او ما مملکت ایسانکم کا معنی ہے مائیں اور بہنیں مباح

نہیں ہیں اور اسی طرح تمام محرمات بھی مباح نہیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ جب مسلمان نے اپنی ذمیہ بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر ایک ذمی نے اس کے ساتھ نکاح کیا اور اس کے ساتھ دخول بھی کیا اور پھر اسے طلاق دے دی تو ایک گروہ نے کہا کہ وہ ذمی اس کے لئے زوج ہے، لہذا اب اس کے لئے زوج اول کی طرف لوٹنا جائز ہے۔ اسی طرح حسن، زہری، سفیان ثوری، شافعی، ابو عبید اور اصحاب الرائے رحمہم نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اسی طرح ہم بھی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: **حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ** اور نصرانی بھی زوج ہے اور مالک اور ربیعہ نے کہا ہے: وہ اسے حلال نہیں کر سکتا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جمہور علماء کا موقف ہے کہ نکاح فاسد تین طلاقوں والی عورت کو حلال نہیں کر سکتا۔ امام مالک، ثوری، امام شافعی، اوزاعی، اصحاب الرائے، امام احمد، اسحاق اور ابو عبید تمام یہ کہتے ہیں کہ وہ نکاح صحیح کے بغیر زوج اول کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔ اور حکم کہتے ہیں کہ وہ زوج ہے اور ابن منذر نے کہا ہے: وہ زوج نہیں ہے کیونکہ ظہار، ایلاء اور لعان میں ازواج کے احکام ان دونوں کے درمیان ثابت نہیں ہیں اور اہل علم میں سے جن سے کچھ یاد رکھا جاسکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ عورت نے جب زوج اول کو کہا: میں نے شادی کی ہے اور میرے خاوند نے مجھ سے دخول کیا ہے اور زوج اول نے اس کی تصدیق کر دی تو وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: احتیاط اس میں ہے کہ وہ اس کی تصدیق نہ کرے جب اس کے دل میں اس کے جھوٹا ہونے کا خیال واقع ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس باب میں انتہائی شدت اور تغلیظ مروی ہے اور آپ کا ارشاد ہے: میرے پاس جو حلالہ نکالنے والا اور جس کے لئے حلالہ نکالا گیا یا گیا تو میں یقیناً ان دونوں کو رجم کر دوں گا (1)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حلالہ نکالنا تو زنا ہے وہ مسلسل زنا ہی کرتے رہیں گے اگرچہ وہ بیس برس تک بھی اس پر قائم رہیں۔

ابو عمر نے کہا ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول فقط تغلیظ کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ آپ سے یہ صحیح روایت ہے کہ آپ نے حرام فرج میں وطی کرنے والے سے حد کو اٹھالیا در آنحالیکہ وہ اس کی تحریم سے جاہل تھا اور آپ نے جہالت کے سبب اسے معذور قرار دیا۔ پس اس بارے میں تاویل اولیٰ اور بہتر ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس پر رجم نہیں ہے۔

قوله تعالى: **فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ** وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ①

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قوله تعالى: **فَإِنْ طَلَّقَهَا** اس میں مراد زوج ثانی ہے (یعنی اگر زوج ثانی اسے طلاق دے دے) **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا** اس میں ہا تثنیہ ضمیر سے مراد عورت اور زوج اول ہے (تو ان دونوں پر کوئی حرج نہیں)۔ یہ حضرت ابن

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 211، دار الکتب العلمیہ

عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے (1)۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے پھر اس کی عدت گزر جائے اور وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور وہ اس سے مجامعت کرے پھر اسے فارغ کر دے اور اس کی عدت بھی گزر جائے پھر وہ پہلے خاوند سے نکاح کرے تو وہ اس کے پاس تین طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (یعنی زوج اول کو از سر نو تین طلاقوں کا اختیار حاصل ہوگا)۔

اور ایسے آدمی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیتا ہے پھر وہ کسی دوسرے سے شادی کرتی ہے، پھر اس سے پہلے خاوند کی طرف لوٹ کر آتی ہے تو اس کے بارے ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس کے پاس اپنی مابقی طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (چاہے مابقی ایک ہو یا دو)۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر اصحاب نے کہا ہے: ان میں حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابی بن کعب، حضرت عمران ابن حصین اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور اسی طرح حضرت زید بن ثابت، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے اور یہی قول حضرت عبیدہ السلمانی، حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت مالک، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلیٰ، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت ابو عبیدہ، حضرت ابو ثور، حضرت محمد بن حسن اور حضرت ابن نصر رحمہم نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ نکاح بھی جدید ہے اور طلاق بھی جدید ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور اسی طرح حضرات عطاء، نخعی، شریح، نعمان اور یعقوب رحمہم نے کہا ہے اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اور وکیع نے اعمش سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ کے اصحاب کہتے ہیں: کیا زوج ثانی تین طلاقوں کو تو گرا دیتا ہے اور وہ ایک اور دو طلاقوں کو نہیں گراتا فرمایا: ہمیں حفص نے حجاج سے، انہوں نے طلحہ سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کہا کرتے تھے: زوج ثانی ایک اور دو طلاقوں کو اسی طرح گرا دیتا ہے جیسے وہ تین طلاقوں کو گرا دیتا ہے سوائے عبیدہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: یہ عورت اس کے پاس اپنی مابقی طلاقوں کے ساتھ رہے گی (2)۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: میں قول اول کے مطابق کہتا ہوں۔

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ دخول کیا ہے تو طلاق بھی جدید ہے اور نکاح بھی جدید ہے اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر وہ اپنی مابقی طلاقوں پر ہوگی۔ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **إِنْ طَلَا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ** یہ شرط ہے۔ طاؤس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اگر دونوں کو طلاق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

2۔ الکتاب المصنف لابن ابی شیبہ، باب من قال عندہ، جلد 4، صفحہ 113، مکتبۃ الزمان للثقافت والعلوم، المدینۃ المنورہ

ہو کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کر سکے گا۔

اور کہا گیا ہے کہ حُدُودِ اللہ سے مراد اس کے فرائض ہیں، یعنی جب دونوں کو علم ہو کہ ان کے درمیان دوسرے نکاح کے سبب صلح اور بہتری ہوگی اور جب خاوند کو علم ہو کہ وہ اپنی بیوی کے نفقہ یا اس کے مہر یا اس کے وہ حقوق جو اس پر واجب ہیں ان میں سے کسی شے سے وہ عاجز ہے تو اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے شادی کرے یہاں تک کہ وہ اسے واضح طور پر بتا دے یا وہ اپنے بارے میں عورت کے حقوق کی ادائیگی پر قدرت کے بارے جانتا ہو اور اسی طرح اگر اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو اسے استمتاع سے روکتی ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے بیان کر دے تاکہ وہ اپنی جانب سے عورت کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اسے نسب کے بارے دھوکے میں مبتلا کرے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے اور اس کے پاس نہ مال ہو اور نہ ہی کوئی قابل ذکر کاروبار اور اس میں جھوٹ بولنے والا ہو۔ اسی طرح عورت پر بھی لازم ہے کہ جب وہ اپنی ذات میں خاوند کے حقوق کی ادائیگی سے عجز کے بارے جانتی ہو یا اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو استمتاع سے مانع ہو مثلاً جنون، جذام، برص یا فرج میں کوئی بیماری ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرد کو دھوکے میں ڈالے اور اس پر لازم ہے کہ اسے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی وضاحت کر دے، جس طرح کہ بائع پر سامان کے بارے واجب ہوتا ہے کہ اس کے سامان میں جو عیوب اور نقائص ہیں وہ انہیں بیان کر دے۔

اور جب زوجین میں سے کوئی اپنے شریک میں کوئی عیب پالے تو اس کے لئے اسے رد کر دینا جائز ہے، پس اگر عیب مرد کی جانب ہو تو عورت کے لئے کامل مہر ہوگا اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا ہو اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اگر عیب عورت کی جانب ہو تو خاوند اسے واپس لوٹا دے اور جو مہر اسے دیا ہے وہ اس سے لے لے اور تحقیق یہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے بنی بیاضہ کی ایک عورت سے شادی کی تو آپ نے اس کے پہلو میں برص کا نشان پایا تو آپ نے اسے رد کر دیا اور فرمایا: ”تم نے مجھ پر اسے پوشیدہ رکھا ہے۔“

اور عنین کی بیوی کے بارے میں امام مالک سے روایت مختلف ہے جب اس نے اپنا آپ مرد کے حوالے کر دیا پھر مرد کے عنین ہونے کے سبب ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی گئی تو آپ نے ایک بار کہا: اس کے لئے مکمل مہر ہوگا اور ایک بار کہا: اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اس کا انحصار اس قول کے اختلاف پر ہے کہ وہ کس کے ساتھ مہر کی مستحق ہوگی کیا اپنے آپ کو مرد کے سپرد کرنے کے ساتھ یا دخول کے ساتھ؟ اس بارے میں بھی دو قول ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے کہ کیا عورت کے ذمہ خدمت کرنا بھی ہے یا نہیں؟ تو ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: عورت پر خدمت کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ عقد استمتاع (لطف اندوز ہونا) کو شامل ہے نہ کہ خدمت کو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ یہ عقد اجارہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ملک رقبہ حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ تو فقط استمتاع پر عقد ہے اور عقد کے ذریعہ صرف استمتاع کا مستحق بنا جاتا ہے نہ کہ اس کے سوا کسی اور کا، لہذا اس سے زیادہ کا عورت سے مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھتے نہیں: **فَإِنْ أَطَعْتُمْ فَلَائِي تَبْتَغُوا عَلَيْهِمْ**

سَبِيلًا۔ (النساء: 34)۔

اور ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: اس پر اس کی حیثیت کے مطابق خدمت ہے، پس اگر وہ عورت شریفۃ الحجل ہے اس کے والدین دولت مند اور خوشحال ہیں تو اس پر گھر کی تدبیر اور خادم کا معاملہ ہوگا اور اگر وہ متوسط الحال ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ بستر وغیرہ بچھائے اور اسی طرح کے دیگر کام۔ اور اگر وہ اس درجہ سے بھی کم ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ گھر میں جھاڑو دے اور کھانا وغیرہ پکائے اور کپڑے وغیرہ دھوئے۔ اور اگر وہ کرد اور دہلیم کی عورتوں میں سے ہو اور ان کے علاقے میں پہاڑ ہوں تو وہ عورت بھی اس کام کی پابند ہوگی جس کی ان کی عورتیں پابند ہوتی ہیں اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ: 228)

اور مسلمانوں کا عرف اور رواج ان کے شہروں میں قدیم و جدید دور سے اس کے بارے جاری ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ کی ازواج مطہرات اور آپ کے صحابہ کرام کی بیویاں آٹا پیسنے، روٹیاں پکانے، ہانڈی تیار کرنے، بستر بچھانے، کھانا پیش کرنے اور اسی طرح کے دیگر کاموں کی پابند ہوتی تھیں اور ہم تو کسی عورت کو نہیں جانتے جس نے اس سے انکار کیا ہو اور نہ ہی اس کا انکار کرنا جائز ہوتا ہے بلکہ وہ تو اپنی عورتوں کو سزا دیتے تھے جب وہ کاموں میں کوتاہی اور سستی کرتیں اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے اور اگر یہ لازم اور ضروری نہ ہوتی تو وہ ان سے اس کا مطالبہ نہ کرتے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قوله تعالى: وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔ حُدُودُ اللَّهِ، وہ ہیں جن سے روکا گیا ہو اور حد فواحش کے ارتکاب کی جرات کرنے سے مانع ہوتی ہے اور احذت المرأة اس کا معنی ہے عورت زینت سے باز آگئی اور رَجُلٌ محدود وہ آدمی جسے خیر سے روک دیا جائے اور البواب حداد یعنی دربان روکنے والا ہے اور یہ مکمل بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اور فرمایا: لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ کیونکہ جاہل جب اس کے لئے امر اور نہی زیادہ ہو جائیں تو وہ نہ اسے یاد رکھتا ہے اور نہ اس کی پاسداری کرتا ہے اور عالم اسے یاد بھی رکھتا ہے اور اس کی پاسداری بھی کرتا ہے پس اسی وجہ سے اس نے علماء کو خطاب کیا ہے اور جاہلوں کو خطاب نہیں کیا۔

وَ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضَرَارًا لِتَعْتَدُوا ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ هُزُوا ۚ وَادْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

”اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو اور وہ پوری کر لیں اپنی عدت پس یا تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو اور جو کوئی کرے گا اس طرح تو وہ ظلم کرے گا اپنی ہی جان پر اور نہ بنا لو اللہ کی آیتوں کو مذاق اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے اور (یاد

کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَّغْنِ أَجَلَهُنَّ اس میں بلغن کا معنی قاربین ہے (یعنی جب وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہو جائیں) اس پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ معنی اس کا محتاج ہے کیونکہ عدت مکمل ہونے کے بعد اسے روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہے (1) اور اس کے بعد والی آیت میں یہ لفظ انتہا کو پہنچنے کے معنی میں ہے، کیونکہ وہاں معنی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ پس یہ لفظ دوسری آیت میں حقیقت ہے اور پہلی میں مجاز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ، امساك بالمعروف کا معنی ان حقوق کے ساتھ قیام ہے جو عورت کی جانب سے مرد پر واجب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علماء کی جماعت نے کہا ہے: بے شک امساك بالمعروف میں سے ہے کہ خاوند جب وہ مال نہ پائے جسے وہ بیوی پر خرچ کرے گا تو وہ اسے طلاق دے دے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ معروف کی حد سے خارج ہو گیا۔ پھر اس کی جگہ حاکم طلاق دے دے گا اس ضرر اور اذیت کی وجہ سے جو عورت کو ایسی حالت میں اس کے پاس رہنے سے لاحق ہو رہی ہے جس میں وہ اس کے نفقہ پر قادر نہیں۔ اور بھوک ایسی شے ہے جس پر صبر نہیں۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو ثور، ابو عبید، یحییٰ القطان اور عبدالرحمن ابن مہدی رحمہم اللہ نے کہا ہے اور صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے اور تابعین میں سے حضرت سعید بن مسیب نے یہی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہی سنت ہے اور اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور ایک گروہ نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور اس پر صبر کرنا عورت کے ذمہ لازم ہوگا اور حاکم کے حکم کے مطابق نفقہ مرد کے ذمہ پڑے گا۔ یہ قول حضرت عطا اور زہری رضی اللہ عنہما کا ہے اور علماء کوفہ اور ثوری رحمہم اللہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَإِنْ كَانَ دُؤُ غُسْرَةً فَنُظْرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ (البقرہ: 280) اور فرمایا: وَأَنْتُمْ حَوْلَ الْيَا لَمِي مِنْكُمْ وَالصُّلَحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ (النور: 32)۔

پس اللہ تعالیٰ نے فقیر کے نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہے تو معلوم ہوا کہ فقر و افلاس کا سبب فرقت ہونا جائز نہیں اور اس کا اس کے باوجود نکاح کرنا مستحب ہے۔

اور یہ بھی کہ زوجین کے درمیان نکاح اجماع کے ساتھ منعقد ہوا ہے لہذا ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی مگر اس کی مثل اجماع کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت کے ساتھ جس کے معارض کوئی روایت نہ ہو۔

اور پہلے قول کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد ہے جو صحیح بخاری میں ہے: ”عورت کہے گی یا مجھے کھانا مہیا کر اور یا مجھے طلاق دے دے۔“ (2) اور یہ محل خلاف میں نص ہے اور ہمارے نزدیک تنگدستی کے سبب ہونے والی فرقت طلاق

رجعی ہے، بخلاف امام شافعی کے کہ ان کا کہنا ہے: وہ طلاق بائنہ ہے کیونکہ یہ بنا کے بعد فرقت ہوئی ہے اس کے ساتھ طلاق کا عدد مکمل نہیں ہوا اور نہ یہ کسی عوض کے لئے اور نہ ہی اس کا سبب خاوند کی جانب سے ضرر ہے، پس یہ رجعیہ ہوگی۔ اس کی اصل مولیٰ (ایلاء کرنے والا) کی طلاق ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **أَوْ سَوِّحُوهُنَّ سَوَّيًّا** یعنی یا تم انہیں طلاق دے دو، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ **وَلَا تُنْسِكُوهُنَّ ضَرَأً أَلَّا يَتَّعِدُوا** امام مالک نے ثور بن زید الدیلی سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسے اس کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے اپنے پاس روکنے کا ارادہ رکھتا ہے اور (صرف اس لئے) تاکہ وہ اس طرح اس پر عدت کو طویل کر دے اور اسے ضرر اور اذیت پہنچائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: **وَلَا تُنْسِكُوهُنَّ ضَرَأً أَلَّا يَتَّعِدُوا** وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ انہیں نصیحت کر رہا ہے (1) اور زجاج نے کہا ہے: **فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ**، یعنی اس نے اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کیا، کیونکہ اس کام سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اسے کرنا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے لئے پیش کرنا ہی ہے۔ اور یہ خبر اس خبر کے موافق ہے جو طلاق اور رجوع کو ترک کرنے کے بارے میں نازل ہوئی جس طریقہ پر اہل جاہلیت تھے، جیسا کہ اس کا بیان **الطَّلَاقُ مَزْنٌ** کے تحت گزر چکا ہے۔ پس ان دونوں خبروں نے ہمیں یہ فائدہ دیا ہے کہ مذکورہ دونوں آیتوں کا نزول قریب قریب ایک ہی معنی میں ہے اور وہ مرد کا عورت کو ضرر اور اذیت پہنچانے کے ارادہ سے اسے اپنے پاس روکنا اور اس کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا**۔ اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو مذاق کے طریقہ پر نہ لو، کیونکہ یہ تمام کے تمام سنجیدہ ہیں۔ پس جس نے ان میں مذاق کیا تو یہ اسے لازم ہو جائیں گے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: دور جاہلیت میں ایک آدمی طلاق دیتا ہے اور کہتا ہے: بلاشبہ میں نے طلاق دی ہے اور مذاق کر رہا ہوں اور وہ غلام کو آزاد کرتا اور کسی سے اپنا نکاح کرتا اور یہ کہتا: میں نے استہزا کیا ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی (2) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ”جس نے طلاق دی یا جس نے کسی کو آزاد کیا یا اپنا نکاح کیا یا کسی کا نکاح کیا اور پھر یہ گمان کیا کہ وہ مذاق کر رہا ہے تو وہ سنجیدہ شمار ہوگا (3)“ (یعنی یہ تمام احکام نافذ ہو جائیں گے) اسے معمر نے روایت کیا ہے کہا ہے: ہمیں عیسیٰ بن یونس نے عمرو سے، انہوں نے حسن سے اور انہوں نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے اور اسی کے معنی میں اسے ذکر کیا ہے اور موطا امام مالک میں ہے کہ ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو بار طلاق دی ہے، آپ میرے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اسے تیری جانب سے تین طلاقیں واقع ہوئیں اور ستانوے طلاقیں کے ساتھ تو نے اللہ تعالیٰ کی آیت کے ساتھ استہزا کیا ہے (4)۔

2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 399، دار الکتب العربیہ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 576، دار احیاء التراث العربیہ

4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 510، وزارت تعلیم

3۔ مجمع الزوائد، باب من نکح او اعتق او طلق لاعبا، جلد 4، صفحہ 529، دار الفکر

اور دارقطنی نے اسماعیل بن امیہ القرشی کی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی آدمی کو سنا کہ اس نے طلاق البتہ دی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا: ”تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو یا اللہ تعالیٰ کے دین کو تمسخر اور مذاق کے طور پر لیتے ہو، جس نے طلاق البتہ دی ہم نے اس کے لئے تین طلاقیں لازم کر دیں اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کر لے۔“ اس میں راوی اسماعیل بن امیہ کوئی ہے اور ضعیف الحدیث ہے۔ (1)

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ آدمی جو اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر کہتا ہے: قسم بخدا! نہ میں تجھے وارث بناؤں گا اور نہ میں تجھے چھوڑوں گا۔“ عورت نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہو گی تو میں تیری طرف رجوع کر لوں گا، تب یہ آیت نازل ہوئی (2): وَلَا تَتَّخِذُوا آلِئِيتِ اللّٰهِ هُزُوًا الْاٰیۃ۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: تمام اقوال آیت کے معنی میں داخل ہیں کیونکہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ تمسخر کرے اسے ہی کہا جائے گا: اتخذھا هُزُوًا۔ اس نے اسے مذاق کے ساتھ لیا ہے اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اس (آیت) کے ساتھ کفر کیا اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اسے پرے پھینک دیا اور اسے نہ لیا اور عمل اس کے خلاف کیا، سو اس بنا پر یہ تمام اقوال آیت میں داخل ہیں اور آیات اللہ سے مراد اس کے دلائل، اس کا امر اور اس کی نہی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے مذاق کے طور پر طلاق دی تو وہ طلاق اسے واقع ہو جائے گی اور اس کے سوا میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان سورہ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تین کام ہیں کہ ان میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان میں مذاق بھی سنجیدگی ہے (اور وہ ہیں) نکاح، طلاق اور رجعت۔“ (3)

اور حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ان تمام نے کہا: تین فعل ہیں جن میں کوئی مذاق اور استہزاء نہیں اور ان میں مذاق کرنے والا بھی سنجیدہ شمار ہوتا ہے اور وہ نکاح، طلاق اور عتاق ہیں۔ (4)

اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ترک نہ کرو کہ تم کوتاہی کرنے والے اور مذاق کرنے والے ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں گناہ سے قولاً استغفار کرنا بھی داخل ہے جبکہ فعلاً اس پر اصرار ہو اور اسی طرح ہر وہ عمل جو اس معنی میں ہو پس اس کے بارے آگاہ رہ۔

1۔ دارقطنی، کتاب الطلاق والایلاء، جلد 4، صفحہ 20، دارالحسن قاہرہ

2۔ البحر الرغیز، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی طلاق المعتوم، حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب فی الطلاق علی المہزل، حدیث نمبر 1875، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، باب من طلق النخ، حدیث نمبر 2028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ السنن الکبریٰ للبخاری، جلد 7، صفحہ 341، دار الفکر

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: **وَإِذْ كُرُوا نَعَمْتَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ**، یعنی اسلام اور احکام کے بیان (کے ساتھ تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اسے یاد کرو۔) **وَالْحِكْمَةُ** اس سے مراد سنت ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مقدس سے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی مراد اور مقصود کو بیان کرتی ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں بیان اور وضاحت نہ ہو (1)۔ **يَعْظُمُ بِهِ** یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے **وَاتَّقُوا اللَّهَ** **وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ** اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

**وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَّغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَزْكَ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝**

”اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے جب کہ رضامند ہو جائیں آپس میں مناسب طریقہ سے۔ یہ فرمان الہی (ہے) نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعے اس کو جو تم سے یقین رکھتا ہو اللہ پر اور قیامت پر، یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور بہت صاف اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ** روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسار کی بہن ابوالہداح کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دی اور اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی، پھر وہ نادام ہوا تو اسے پیغام نکاح بھیجا سو وہ راضی ہو گئی اور اس کے بھائی نے انکار کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے اور کہا: میرا چہرہ تیرے لئے حرام ہے اگر تو اس سے شادی کرے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت مقاتل نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے معقل کو بلایا اور فرمایا: ”اگر تو مومن ہے تو ابینی بہن کو ابوالہداح سے نہ روک۔“ تو معقل نے عرض کی: امنت باللہ اور بہن کی شادی اس سے کر دی (2)۔ اور امام بخاری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن کو اس کے خاوند نے طلاق دی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی پھر اس نے اسے پیغام نکاح بھیجا تو حضرت معقل نے انکار کر دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی (3): **فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ**۔

اور اسے دارقطنی نے بھی حسن سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے: میری ایک بہن تھی میرے پاس اس کے لئے پیغام نکاح آتے تھے اور میں اس سے لوگوں کو روکتا رہتا تھا، پھر میرے چچا کا بیٹا میرے پاس آیا اور اس نے اس کے ساتھ نکاح کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا، پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ دونوں ایک ساتھ رہے پھر اس نے اسے طلاق رجعی دے دی پھر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دارالکتب العلمیہ۔

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم۔

2۔ ایضاً

گزر گئی، پھر اس نے دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دیا تو میں نے کہا: میں نے اس کے بارے لوگوں سے انکار کیا اور میں نے تیرے ساتھ اس کی شادی کر دی پھر تو نے اسے طلاق دی جس میں رجعت کا حق تھا پھر تو نے اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی اور جب میرے پاس پیغام نکاح آئے تو تو بھی دیگر خواہش رکھنے والے لوگوں کے ساتھ میرے پاس نکاح کی خواہش لے کر آیا میں تیرے ساتھ کبھی شادی نہ کروں گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، یا فرمایا: یہ آیت نازل کی گئی: وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَّغْنِ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَبْتَئِخْنَ آذُنَهُنَّ۔ پس میں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور میں نے اس کا نکاح اس سے کر دیا (1)۔

بخاری کی روایت میں ہے: پس حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے اس سے ابھی تک نفرت کی اور کہا: اس نے اسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ اس پر قدرت رکھتا تھا پھر وہ اس کے ساتھ نکاح کی خواہش کر رہا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی پھر حضرت معقل نے حمیت کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت و پیروی کی (2)۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ معقل بن سنان (یعنی نون کے ساتھ) ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتابوں میں معقل بن یسار یا سنان سے روایت کیا ہے اور امام طحاوی نے فرمایا ہے کہ وہ معقل بن سنان ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بغیر ولی کے نکاح جائز نہیں ہوتا کیونکہ حضرت معقل رضی اللہ عنہ کی بہن شیبہ تھیں۔ اگر ولی کے بغیر اختیار اس کے پاس ہوتا تو وہ اپنی شادی کر لیتی اور وہ اپنے ولی معقل کی محتاج نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ میں خطاب اولیاء کو ہے اور شادی کے بارے میں اختیار انہیں کے پاس ہے کہ وہ ان کی رضامندی کے ساتھ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں خطاب ازواج کو ہے اور وہ اس طرح کہ غیر کے نکاح سے روکتے ہوئے اس کا رجوع کر لینا عورت پر عدت کے طویل ہونے کے سبب اذیت ناک اور ضرر رساں ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عورت اپنی شادی خود کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت عورت کی طرف کی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعدِ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ اور ولی کا ذکر نہیں کیا ہے اور اس مسئلہ میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے جو کہ اس کے سبب نزول کے بارے ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَّغْنِ أَجَلَهُنَّ اس مقام پر بلوغ الاجل سے مراد انتہا کو پہنچنا ہے کیونکہ نکاح کی ابتدا کا تصور عدت گزرنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے اور تَعْضُلُوهُنَّ کا معنی ہے تحبسوهن (یعنی جب وہ اپنی عدت کی انتہا کو پہنچ جائیں تو تم انہیں نہ روکو۔)

اور خلیل نے بیان کیا ہے: دجاجة معقل جب مرغی اپنا انڈا روک لے (تب یہ کہا جاتا ہے)۔

اور کہا گیا ہے کہ العُضْلُ کا معنی التضييق والمنع ہے یعنی تنگ کرنا اور روکنا اور یہ جس کے معنی کی طرف ہی راجع ہے۔ کہا جاتا ہے: اردت امرًا فعضلتني عنه یعنی میں نے کام کا ارادہ کیا اور تو نے مجھے اس سے روک دیا اور مجھ پر اسے تنگ اور مشکل کر دیا۔ اور اعضل الامر کہا جاتا ہے جب تجھ پر کام کے ذرائع تنگ ہو جائیں۔ اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: انه لعضلة من العضل جب وہ کام میں کسی قسم کے حیلہ اور ذریعہ پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

اور الازہری نے کہا ہے: عضل کی اصل ان کے اس قول سے ہے: عضلت الناقة (1) (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اونٹنی کا بچہ پھنس جائے اور اس کا نکلنا آسان نہ ہو اور عضلت الدجاجة، جب اس کا انڈا پھنس جائے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے معضلة ولا ابا حسن یعنی مسئلہ مشکل ہے اور اس کے مخارج بہت تنگ ہیں اور حضرت طاؤس نے کہا ہے: تحقیق مشکل ترین فیصلے لائے گئے اور سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کوئی ان پر قائم نہ رہا۔ لقد وردت عضل اقصیة ما قام بها الا ابن عباس اور عربوں کے نزدیک ہر مشکل معضل ہے اور اسی سے امام شافعی کا قول ہے:

إذا المعضلات تصدیننی کشفْتُ حقائقها بالنظر
جب مشکلات مجھے چیلنج کرتی ہیں تو میں ان کے حقائق کو نظر و فکر سے کھول دیتا ہوں

اور کہا جاتا ہے: اعضل الأمر جب معاملہ بہت سخت ہو جائے اور داء عضال یعنی شدید بیماری جس کا درست ہونا مشکل ہے اور وہ طبیبوں کو تھکا دے اور عضل فلان ایہ یعنی فلاں نے اپنی مطلقہ منع کیا۔ يعضلها و يعضلها یعنی ضمہ اور کسرہ دونوں لغتیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قوله تعالى: ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ اس میں ذلکم نہیں کہا کیونکہ یہ جمع کے معنی پر محمول ہے اور اگر ذلکم ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ مثلاً ذلکم اڑکی لکھم و اظهرہ واللہ یعلم اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تمہارے لئے اس میں صلاح اور خیر نہیں ہے۔ و انتم لا تعلمون اور تم اسے نہیں جانتے ہو۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۖ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلِّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدٍهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدٍهَا ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ ۚ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۚ وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا اتَّيْتُم بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ③

”اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی

مدت۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا ان ماؤں کا اور ان کا لباس مناسب طریقہ سے۔ تکلیف نہیں دی جاتی کسی شخص کو مگر اس کی حیثیت کے مطابق۔ نہ ضرر پہنچایا جائے کسی ماں کو اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو (ضرر پہنچایا جائے) اس کے لڑکے کے باعث اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے۔ پس اگر دونوں ارادہ کر لیں دودھ چھڑانے کا اپنی مرضی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں دونوں پر اور اگر تم چاہو تو دودھ پلو او (دایہ سے) اپنی اولاد کو، پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور (خوب) جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے دیکھنے والا ہے۔“

اس میں اٹھارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالْوَالِدَاتُ يٰۤرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ يٰۤحِلْ خَبْرٌ مِّنْ يَّہ۔ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ يٰۤظَرْفِ زمان ہے جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نکاح اور طلاق کا ذکر کر چکا تو پھر اس نے اولاد کا ذکر کیا کیونکہ کبھی زوجین آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان کے پاس بچہ ہوتا ہے۔ پس تب یہ آیت ان مطلقہ عورتوں کے بارے میں ہے جن کی ان کے خاوندوں سے اولاد ہو۔ سدی اور ضحاک وغیرہ نے یہی کہا ہے (1)۔ یعنی وہ خود اجنبی عورتوں کی نسبت اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا زیادہ حق رکھتی ہیں کیونکہ وہ زیادہ شفیق اور زیادہ نرم ہیں اور صغیر بچے کو چھین لینا بچے اور اس کی ماں دونوں کے لئے تکلیف دہ اور ضرر رساں ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچے کو اگر دودھ چھڑا دیا جائے تو ماں ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے اور وہی پرورش کی زیادہ حقدار ہوتی ہے جب تک وہ شادی نہ کرے جیسا کہ آگے آ رہا ہے اور اس پر یہ قول اشکال پیدا کرتا ہے: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ يٰۤرْضِعُهُنَّ وَكُسُوْنُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ کیونکہ مطلقہ عورت تو لباس کی مستحق نہیں ہوتی جب طلاق رجعی نہ ہو بلکہ وہ اجرت کی مستحق ہوتی ہے مگر یہ کہ اسے مکارم اخلاق پر محمول کیا جائے اور کہا جائے: اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ اجرت اس سے کم نہ ہو جو اس کی خوراک اور لباس کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ آیت عام ہے ان مطلقات کے بارے میں بھی جن کی اولاد ہو اور بیویوں کے بارے میں بھی (یعنی تمام کو شامل ہے) اور اظہر یہی ہے کہ یہ آیت ان بیویوں کے بارے میں ہے جن کا نکاح ابھی باقی ہو، کیونکہ وہ نفقہ اور لباس دونوں کی مستحق ہوتی ہیں اور زوجہ نفقہ اور لباس کی مستحق ہوتی ہے چاہے وہ دودھ پلائے یا نہ پلائے، نفقہ اور لباس دونوں تمکین (قدرت) کے مقابلے میں ہیں۔ اور جب وہ دودھ پلانے میں مشغول ہو جائے گی تو قدرت کامل نہ رہے گی اور کبھی یہ وہم کیا جاتا ہے کہ نفقہ ساقط ہو جاتا ہے، پس اس وہم کو اس ارشاد کے ساتھ زائل کر دیا: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ يٰۤرْضِعُهُنَّ (بچے کا باپ) ہے يٰۤرْضِعُهُنَّ وَكُسُوْنُهُنَّ یعنی دودھ پلانے کی حالت میں (ان کا نفقہ اور لباس زوج پر ہے۔) کیونکہ یہ زوج کے مصالح اور منافع میں مشغول ہونا ہے تو یہ اسی طرح ہو گیا جیسا کہ اگر وہ خاوند کے کام کی غرض سے اس کی اجازت کے ساتھ سفر پر چلی جائے تو نفقہ ساقط نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: يُزْضِعْنَ یہ خبر ہے۔ اس کا معنی ہے کہ یہ امر بعض والدات کے لئے وجوب کے معنی پر ہے اور بعض کے لئے مستحب کے معنی پر (1)، جیسا کہ آگے آ رہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے مشروع ہونے کی خبر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور دودھ پلانے کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ کیا یہ ماں کا حق ہے یا یہ اس پر لازم ہے لفظ دونوں کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ اگر ماں پر اس کے لازم ہونے کی تصریح مراد ہوتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا: وَعَلَى الْوَالِدَاتِ رِضَاعُ اَوْلَادِهِنَّ (ماؤں پر اپنی اولاد کو دودھ پلانا لازم ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ يَرْضَعُهَا وَكَسَوَتْهُنَّ لیکن یہ اس پر زوجیت کی حالت میں ہے اور یہی عرف ہے جس سے لازم آتا ہے کہ یہ شرط کی طرح ہو گیا ہے (2) مگر یہ کہ وہ شریف اور خوشحال ہو تو اس کا عرف یہ ہے کہ وہ دودھ نہ پلائے اور یہ شرط کی طرح ہے اور اس پر دودھ پلانا واجب ہے اگر بچہ کسی غیر کو قبول نہ کرے، تو دودھ پلانا اس پر واجب ہے اس کے اختصاص کی وجہ سے بشرطیکہ اور معدوم ہو۔ اور اگر باپ فوت ہو جائے اور بچے کا کوئی مال نہ ہو تو البدنہ میں امام مالک کا یہ مذہب بیان ہوا ہے کہ دودھ پلانا ماں کے لئے لازم ہے بخلاف نفقہ کے اور ابن الجلاب کی کتاب میں ہے: اسے دودھ پلانے کا انتظام کرنا بیت المال کے ذمہ ہوگا۔

اور عبد الوہاب نے کہا ہے: وہ (بچہ) بھی مسلمان فقراء میں سے ایک فقیر ہے۔

اور رہی وہ عورت جسے طلاق بائن دی گئی ہو تو اس پر رضاع نہیں ہے، بلکہ رضاع خاوند پر لازم ہے مگر یہ کہ وہ عورت چاہے تواجرت مثل کے عوض یہ زیادہ حقدار ہوگی اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ خاوند خوشحال ہو اور اگر وہ تنگ دست ہو تو پھر اس مطلقہ عورت کے لئے دودھ پلانا لازم نہیں مگر یہ کہ بچہ اس کے سوا کسی کو قبول نہ کرتا ہو تو اس وقت اسے دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا اور وہ تمام جو دودھ پلانا اس پر لازم کرتے ہیں (ان کا موقف ہے) کہ اگر اسے کوئی عذر لاحق ہو جائے جو اسے دودھ پلانے سے مانع ہو تو دودھ پلانے کا امر باپ کی طرف لوٹ آئے گا۔

اور امام مالک سے مروی ہے کہ باپ جب مفلس ہو اور بچے کا کوئی مال نہ ہو تو دودھ پلانا ماں پر لازم ہے (3) اور اگر اس کا دودھ نہ ہو لیکن اس کے پاس مال ہو تو پھر اپنے مال سے دودھ پلانے کا انتظام کرنا اس پر لازم ہوگا۔

امام شافعی نے فرمایا: دودھ پلانے کا اہتمام لازم نہیں ہوتا مگر باپ پر یاداد پر اور جو بھی اس سے اوپر ہوں اس بارے میں علماء کا نظریہ اس ارشاد کے تحت آئے گا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ۔

کہا جاتا ہے: رَضِعَ يَرْضَعُ رَضَاعًا و رَضَاعًا اور رَضِعَ يَرْضَعُ رَضَاعًا (یعنی پہلے میں را مکسور ہے اور دوسرے میں مفتوح ہے) اور دونوں میں اسم فاعل راضع ہے اور الرضاعة کا معنی اللؤم (بخل کرنا) بھی ہے۔ (یہ لفظ فقط راء کے فتح کے ساتھ ہے۔)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: حَوْلَيْنِ یعنی دو سال، یہ حال الشیء سے ماخوذ ہے جب کوئی شے پلٹ جائے، پس حول

اول وقت سے دوسرے کی طرف پلٹنے والا ہے اور کہا گیا ہے کہ سال کو حول اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اغلباً امور بدل جاتے ہیں۔ کاملین یہ کامل ہونے کے لئے قید ہے کیونکہ کبھی کوئی کہنے والا کہتا ہے: اقمیت عند فلان حولین اور اس سے وہ ایک سال اور دوسرے سال کا کچھ حصہ مراد لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَنُتَعَجِّلُ فِي يَوْمَيْنِ یعنی جو کوئی ایک دن اور دوسرے دن کے کچھ حصے میں جلدی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ اس پر دلیل ہے کہ دو سال دودھ پلانا حتمی نہیں ہے کیونکہ دو سال سے پہلے بھی دودھ چھڑانا جائز ہے۔ لیکن یہ حد اس لئے بیان کی گئی ہے تاکہ زوجین کے درمیان مدت رضاع کے بارے میں تنازع ختم ہو جائے۔ لہذا خاوند پر دو سال سے زیادہ عرصہ اجرت دینا واجب نہیں ہے اور اگر باپ اس مدت سے پہلے دودھ چھڑانا چاہے اور ماں اس پر راضی نہ ہو تو وہ ایسا نہیں کر سکتا اور دو سال میں زیادتی یا کمی تب ہو سکتی ہے جب بچے کے لئے اس میں کوئی نقصان نہ ہو اور والدین رضامند ہوں۔

حضرت مجاہد اور ابن محیصن نے لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ پڑھا ہے یعنی تاء کو فتح کے ساتھ اور الرضاعة کو رفع کے ساتھ۔ یعنی فعل کی نسبت اس کی طرف کی ہے۔

اور ابو حیوہ، ابن ابی عبسہ، جارود بن ابی سبرہ نے الرضاعة کو راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے جیسا کہ الحضارة والحضارة ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے الفعلۃ کے وزن پر الرضعة پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے أن یکمل الرضاعة (1) قراءت کی ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ بصری الرضاعة کو صرف راء کے فتح کے ساتھ اور الرضاع کو صرف راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً القتال اور کوئی الرضاعة کو راء کے کسرہ کے ساتھ اور الرضاع کو راء کے فتح کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمہ اللہ، آپ کے تابعین اور علماء کی ایک جماعت نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ

وہ رضاعت جو حرمت میں نسب کے قائم مقام ہے وہ یہی ہے جو دو سال میں ہو، کیونکہ دو سال گزرنے کے ساتھ رضاعت کی

مدت مکمل ہو گئی اور دو سال کے بعد کی رضاعت معتبر نہیں ہے (2)۔ آپ کا یہ قول مؤطا میں ہے اور یہ آپ سے محمد بن عبدالحکم کی

روایت ہے اور یہی حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی حضرت

زہری، قتادہ، شعبی، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی، احمد، اسحاق، ابو یوسف، محمد اور ابو ثور رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

اور ابن عبدالحکم نے آپ سے دو سال اور کچھ تھوڑے دن زیادہ کا قول روایت کیا ہے۔ عبدالمکک نے کہا ہے کہ وہ مہینہ اور

اس طرح کی مدت ہے۔

اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رضاعت کی مدت دو سال اور دو مہینے ہے (3) اور

ولید بن مسلم نے آپ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دو سالوں کے بعد دودھ پلانے کی جو مدت ہوگی ایک مہینہ یا دو مہینے

یا تین مہینے وہ دو سالوں میں ہی شمار ہوگی اور جو اس سے زائد ہوگی وہ عبث ہوگی۔

اور حضرت نعمان سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دو سالوں کے بعد چھ ماہ تک جو مدت ہوگی وہ رضاع میں ہی شمار ہوگی۔ ان میں پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچے نے جو دو سال کے بعد دودھ پیا ہے اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

اور حضرت سفیان نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا رضاع الا ما كان في الحولين (رضاع نہیں ہے مگر وہی جو دو برس میں ہو۔) دارقطنی نے کہا ہے: اسے ابن عیینہ سے یثیم بن جمیل کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا ہے اور یہ ثقہ اور حافظ راوی ہے۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ یہ خبر آیت اور معنی کے ساتھ موافق ہے۔ یہ کبیر کی رضاعت کی نفی کرتی ہے اور یہ کہ اس کے لئے حرمت کا حکم ثابت نہ ہوگا۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیہ سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے اور علماء میں سے لیث بن سعد بھی یہی کہتے ہیں اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بڑے کی رضاعت کا لحاظ رکھتے ہیں اور آپ کا اس سے رجوع بھی مروی ہے (2)۔ عنقریب سورۃ النساء میں یہ مسئلہ تفصیل سے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ جمہور مفسرین نے کہا ہے: یہ دو سال ہر بچے کے لئے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ اس بچے کے بارے میں جو چھ ماہ تک پیٹ میں رہتا ہے اور اگر وہ سات ماہ تک پیٹ میں رہے تو پھر اس کی رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے اور اگر آٹھ مہینے رہے تو اس کی مدت رضاعت بائیس مہینے ہے اور اگر وہ نو مہینے رہے تو پھر اس کی مدت رضاعت اکیس مہینے ہے (3) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وحملة و فصاله ثلاثون شهراً (اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے) اس بنا پر مدت حمل اور مدت رضاعت دونوں ایک دوسرے میں داخل ہیں اور ایک دوسرے سے اپنا حصہ لے لے گئیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ يَكْفِيهِ إِذَا رَضِعَ مِنْ بَرٍّ أَوْ مِنْ بَنٍ، یعنی باپ پر ہے اور عربی میں وعلى المولود لهم کہنا جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمْعُونَ الْبَيْتَ۔ کیونکہ معنی ہے: وعلى الذی ولد له اور اس پر جس کا بیٹا ہے اور الذی کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کو تعبیر کیا جاسکتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: يَرْزُقُهُنَّ وَيَكْسُوْنَهُنَّ اس حکم میں رزق سے مراد وہ طعام (کھانا) ہے جو کافی ہو اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بچے کا نفقہ والد پر واجب ہے، چاہے وہ کمزور اور عاجز ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے مال کے لئے مقرر فرمایا ہے کیونکہ رضاع کی صورت میں ماں کے واسطے سے غذا بچے تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: وَإِنْ كُنَّ أُولَاتٍ حَمْطٍ

2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 410، دارالکتب العربیہ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الرضاع، جلد 4، صفحہ 174، دارالحسن قاہرہ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دارالکتب العلمیہ

فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ (الطلاق: 6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو تم ان پر خرچہ کرو) کیونکہ انہی کے سبب غذا پہنچتی ہے۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آدمی پر اپنی اولاد میں سے ان بچوں کا نفقہ واجب ہے جن کا کوئی مال نہ ہو۔ اور حضور ﷺ نے ہند بنت عتبہ کو فرمایا اس حال میں کہ اس نے آپ سے عرض کی تھی کہ ابوسفیان انتہائی بخیل آدمی ہے وہ مجھے اتنا نفقہ نہیں دیتا جو میرے لئے اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو تو پھر میں اسے بتائے بغیر اس کے مال سے لے لیتی ہوں، کیا مجھ پر اس میں گناہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: خذی ما یکنفیک وولدک بالمعروف (1) (تو اتنا مال لے لے مناسب طریقے سے جو تیرے لئے اور تیری اولاد کے لئے کافی ہو۔)

اور الکسوة کا معنی لباس ہے اور قوله بِالْمَعْرُوفِ کا معنی ہے جو عرف شرع میں بغیر افراط و تفریط کے متعارف ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نفقہ خاوند کی دولت اور اس کے منصب کے مطابق ہو گا مد یا کسی اور پیمانے کے ساتھ اندازے کی ضرورت نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔ اس کا بیان سورہ الطلاق میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: عورت کو اجرت میں کنجوسی پر صبر کرنے کا پابند اور مکلف نہیں کیا جائے گا اور خاوند کو اسراف (فضول خرچی) کا پابند نہیں کیا جائے گا بلکہ میانہ روی کا لحاظ رکھا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 9۔ اس آیت میں امام مالک کی اس پر دلیل موجود ہے کہ پرورش کا حق ماں کو ہے اور یہ بچے میں اس کے بالغ ہونے تک ہے اور بچی میں نکاح تک ہے اور یہ ماں کا حق ہے اور یہی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب بچہ آٹھ برس کی عمر کو پہنچ جائے تو یہ وہ عمر ہے جس میں وہ تمیز کر سکتا ہے، لہذا اسے والدین کے درمیان اختیار دیا جائے گا کیونکہ اس کی یہ حالت قرآن کریم کی تعلیم، ادب اور دیگر وظائف عبادات کے لئے اس کی ہمت اور استعداد کو متحرک کرنے کی ہے اور اس میں بچہ اور بچی دونوں برابر ہوتے ہیں۔

اور امام نسائی وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا مجھ سے لے لے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بچے کو فرمایا: یہ ”تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو ان میں سے جسے چاہے پکڑ لے“ تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا (2)۔

اور ابو داؤد کی کتاب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک عورت حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا لے جائے، حالانکہ یہ ابو عنہ کے کنوئیں سے مجھے پانی لا کر دیتا ہے اور میرے لئے بہت نفع بخش ہے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”تم دونوں اس کے بارے میں قرعہ اندازی کر لو“۔ تو اس کے خاوند نے کہا: میرے بیٹے کے بارے میں کون میرے ساتھ جھگڑ سکتا ہے؟ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیٹے کو فرمایا: ”یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو جس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، جلد 1، صفحہ 167، وزارت تعلیم

2۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 112، وزارت تعلیم۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب تغیر الصبی ابوہ، حدیث نمبر 2341، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے ان دو میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لے۔“ تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلی گئی (1)۔

اور ہماری دلیل وہ ہے جسے ابو داؤد نے امام اوزاعی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے شک یہ میرا بیٹا ہے میرا پیٹ اس کے لئے جائے حفاظت رہا، میرے پستان اسے سیراب کرتے رہے اور میری گود اس کے لئے گھر بنی رہی اور اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی اور اب اس نے اسے مجھ سے چھیننے کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: انت احق بہ ما لم تنکحی (2) تو اس کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک تو نکاح نہ کرے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زوجین جب آپس میں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ان دونوں کا بچہ ہو تو ماں اس بچے کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک وہ نکاح نہ کرے۔ اسی طرح ابو عمر نے کہا ہے: میں علماء سلف میں سے کہیں بھی مطلقہ عورت کے بارے میں اختلاف نہیں جانتا کہ جب تک وہ شادی نہ کرے تو وہ باپ کی نسبت اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے جس وقت تک وہ چھوٹا بچہ ہے اور کسی شے کی تمیز نہیں کر سکتا بشرطیکہ اس کے پاس وہ حفاظت میں ہو اور (اخراجات کی) کفایت بھی ہو اور اس عورت میں فسق اور اجنبیوں کے سامنے زینت کا اظہار ثابت نہ ہو۔ پھر اس کے بعد اسے اختیار دینے میں اختلاف ہے جبکہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے درمیان تمیز کر سکتا ہو اور یہ عقل رکھتا ہو کہ ان میں سے کون اس کے حق میں اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں بغیر تخیر کے خالہ کے حق میں فیصلہ فرمایا۔

ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اسے لوں گا اور میں ہی اس کا زیادہ حقدار ہوں، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر ہے اور خالہ ماں ہوتی ہے اور حضرت علی نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی میرے گھر ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، میں اس کے لئے (گھر سے) نکلا اور میں نے سفر کیا اور میں اسے لے کر آیا۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور یہ حدیث بیان فرمائی۔ فرمایا: وأما الجارية فأقضى بها لجعفر تكون مع خالتها وأما الخالة أم (3) اور رہی بچی تو میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی،

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1938، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 311، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بلاشبہ خالہ ماں ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ ابن منذر نے کہا ہے: تمام معتمد اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ بچے میں ماں کا حق نہیں ہے جب وہ شادی کر لے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح انہوں نے اپنی ”کتاب الاشراف“ میں کہا ہے اور قاضی عبدالوہاب نے ”شرح الرسالہ“ میں حسن سے ذکر کیا ہے کہ شادی کے سبب پرورش میں اس کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اور امام مالک، امام شافعی، نعمان اور ابو ثور رحمہ اللہ نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ثانی بچے کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ جب بچے کی ماں نہ ہو اور اس کی دادی ہو تو امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: جب بچے کی خالہ نہ ہو تو پھر دادی زیادہ حقدار ہے (1) اور ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا: خالہ دادی سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے (2)۔

اور امام شافعی اور نعمان کے قول میں ہے کہ دادی خالہ سے زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک باپ دادی کی نسبت اپنے بیٹے کے لئے زیادہ اولیٰ ہے (3)۔

ابو عمر نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ہے بشرطیکہ اس کی کوئی اجنبی بیوی نہ ہو۔ پھر باپ کے بعد بہن اور پھر پھوپھی کا حق ہے اور یہ تب ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک کے پاس بچہ محفوظ و مامون ہو اور وہ اس کے پاس حفاظت و کفایت میں ہو اور جب اس طرح نہ ہو تو پھر کسی کو حق حضانت حاصل نہیں، بلکہ اس کے بارے غور و فکر کیا جائے گا جس کے پاس بچہ زیادہ محفوظ ہوگا اور وہ اس کی حفاظت اور خیر اور بھلائی کی تعلیم کے سلسلہ میں انتہائی اچھا اور حسین سلوک کرے گا اور یہ ان کے قول کے مطابق ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ پرورش بچے کا حق ہے اور یہی امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے اور آپ کے اصحاب میں سے بھی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور اسی طرح فاجرہ عورت، ضعیف اور بیماری یا پاچا ہونے کی وجہ سے جو بچے کا حق ادا کرنے سے عاجز ہو وہ اسے حق حضانت نہیں دیتے۔

ابن حبیب نے مطرف سے اور ابن ماجہ شون نے امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ پرورش کا حق پہلے ماں کو ہے، پھر ثانی کو، پھر خالہ کو، پھر دادی کو پھر بچے کی بہن کو پھر بچے کی پھوپھی کو پھر بچے کی بھتیجی کو اور پھر باپ کو ہے۔ دادی بہن سے اولیٰ ہے اور بہن پھوپھی سے اولیٰ ہے اور پھوپھی اپنے مابعد افراد سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور تمام مردوں میں سے اولیاء زیادہ رنج اور اولیٰ ہیں اور خالہ کی بیٹی کے لئے، پھوپھی کی بیٹی کے لئے اور بچے کی بھانجیوں کے لئے اس کی پرورش میں سے کوئی حق نہیں ہے۔ اور جب پرورش کرنے والے کی جانب سے بچے پر ضائع ہونے یا فساد برپا ہونے کا کوئی اندیشہ اور خوف نہ ہو تو وہ اس کی مسلسل پرورش کرتا رہے یہاں تک کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں تک کہ وہ بچہ ہونے کے اطلاق سے نکل جائے۔ اور یہاں تک کہ بچی شادی کر لے مگر یہ کہ باپ سفر پر نکلنے اور وطن سے منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس وقت وہ ماں

اور کسی غیر کی نسبت اپنے بچے کا زیادہ حقدار ہے اگر وہ (بچے کی ماں) منتقل نہ ہونا چاہے اور اگر باپ نے تجارت کے لئے نکلنے کا ارادہ کیا تو پھر اس کے لئے حق حضانت نہیں اور اسی طرح بچے کے وہ اولیاء ہیں جن کے ساتھ وہ رہتا ہے جب وہ وطن بنانے کے لئے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ اور ماں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کو باپ کے رہنے کی جگہ سے منتقل کرے مگر اس صورت میں کہ وہ اتنی مسافت سے بھی قریب ہو جس میں نماز قصر ہو جاتی ہے اور اگر آدمی نے عورت کے شہر سے منتقل ہوتے وقت اس پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ اس کے پاس اپنا بچہ نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اس کا نفقہ اور اس کی مشقت معین سالوں تک اس پر لازم ہوگی، تو اگر عورت نے اسے اپنے ذمہ لازم کر لیا تو وہ اس پر لازم ہو جائے گا۔ اور اگر وہ فوت ہو گئی تو پھر اس کے ترکہ میں سے اس کے لئے اس کے ورثاء کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ قرض ہے جو اس کے ترکہ میں سے لیا جائے گا۔ اور پہلا قول اصح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ اگر بچہ فوت ہو جائے یا جیسا کہ اگر وہ حمل اور رضاع کے خرچہ کی بھی اس سے صلح کر لے اور وہ اسے ساقط کر دے تو پھر اس میں سے کسی شے کے لئے اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ جب ماں شادی کر لے تو اس سے اس کا بچہ نہ چھینا جائے یہاں تک کہ اس کا خاوند اس سے دخول کر لے (1)۔ یہ امام مالک کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب اس نے نکاح کر لیا تو اس کا حق حضانت ختم ہو گیا۔ اور اگر اس نے اسے طلاق دے دی تو امام مالک کے نزدیک اس میں اس کے لئے رجوع کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کا مشہور مذہب یہی ہے اور قاضی اسماعیل نے ذکر کیا ہے اور اسے ابن خویز منداد نے بھی امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں آپ کا قول مختلف ہے۔ سوا یک بار کہا: وہ بچہ اس کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور ایک بار کہا: وہ نہیں لوٹایا جائے گا۔ ابن منذر نے کہا ہے: جب ماں اس شہر سے نکل گئی جس میں اس کا بیٹا تھا، پھر اس کی طرف واپس آگئی تو پھر یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہوگی۔ یہ امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ اور اسی طرح اگر اس نے شادی کی پھر اسے طلاق ہو گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو بچہ بھی اس کے حق میں لوٹا دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا ہے: پس اگر خاوند نے اسے طلاق دی یا وہ فوت ہو گیا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ بچے کو لے لے کیونکہ وہ عذر زائل ہو چکا ہے جس کے سبب بچے کو چھوڑنا جائز ہوا تھا۔

مسئلہ نمبر 12۔ اگر عورت نے اپنے بچے کی پرورش چھوڑ دی اور اس نے اسے لینے کا ارادہ ہی نہ کیا حالانکہ وہ فارغ تھی اور زوج کے سبب مشغول نہ تھی۔ پھر اس کے بعد اس نے بچے کو لینے کا ارادہ کیا تو اس کے بارے غور و فکر کی جائے گی۔ پس اگر اس کا بچہ کو چھوڑنا کسی عذر کے باعث تھا تو اس کے لئے اسے لینا جائز ہے اور اگر اس کا ترک اسے چھوڑنے اور نفرت کے سبب ہو تو اب اس کے بعد اس کے لئے بچے کو لینا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ اور علماء نے ایسے زوجین کے بارے اختلاف کیا ہے جو طلاق کے سبب جدا ہو جاتے ہیں اور زوجہ ذمیہ ہے تو ایک گروہ نے کہا ہے: ذمیہ اور مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے۔

1۔ المدونۃ الکبریٰ، جلد 5، صفحہ 40، السعادة بجوارى المظاہر

یہ قول ابو ثور، اصحاب الرائے اور ابن القاسم صاحب مالک رحمہ اللہ کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: تحقیق ہم نے حدیث مرفوع روایت کی ہے جو اس قول کے موافق ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے۔ اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ بچہ ان میں سے مسلمان کے ساتھ ہوگا۔ یہ قول امام مالک، سوار اور عبد اللہ بن حسن کا ہے اور یہی حضرت امام شافعی سے بھی بیان کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح ان کا ان زوجین میں بھی اختلاف ہے جو آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک آزاد ہے اور دوسرا مملوک۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: آزاد اولیٰ ہے۔ یہ قول حضرت عطاء، ثوری، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمہ اللہ کا ہے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: باپ جب آزاد ہو اور اس کا آزاد بیٹا ہو اور ماں مملوکہ (کنیز) ہو تو بلاشبہ ماں اس کی زیادہ حقدار ہو گی مگر یہ کہ اسے بیچ دیا جائے اور وہ کہیں اور منتقل ہو جائے تو پھر باپ کا حق زیادہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: لَا تُضَارُّ وَالِدَاكَ بِوَلَدِكَ لِأَنَّكَ لَا مَوْلُودَ لَهُ بِوَلَدِكَ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ماں بچے کے باپ کو ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے اسے دودھ پلانے سے انکار نہ کرے یا وہ اجرت مثل سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور باپ کے لئے بھی حلال نہیں ہے کہ ماں کو دودھ پلانے میں اس کی رغبت کے باوجود اس سے منع کرے، یہ قول جمہور مفسرین کا ہے۔ نافع، عاصم، حمزہ اور کسائی نے تضار راء مشددہ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ نہی کی بنا پر محل جزم میں ہے (1) اور اس کی اصل لا تضار ہے اور پہلی راء کو دوسری میں ادغام کیا گیا اور دوساکن ملنے کی وجہ سے دوسری کو فتح دے دیا گیا۔ اسی طرح مضاعف میں کیا جاتا ہے جبکہ اس سے پہلے فتح یا الف ہو، تو کہتا ہے: عض یا رجل (تو کاٹ اے آدمی!) اور ضار فلان یا رجل (تو فلاں کو ضرر پہنچا اے آدمی) یعنی بچہ ماں سے نہیں چھینا جائے گا جب وہ دودھ پلانے پر راضی ہو اور بچہ اس سے مانوس ہو۔

ابو عمرو، ابن کثیر اور ابان نے حضرت عاصم اور ایک جماعت سے تضار سے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا عطف تُكَلِّفُ نَفْسٍ پر کیا ہے اور یہ خبر ہے اور اس سے مراد امر ہے (2)۔

اور یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: لا تضار زوجھا (یعنی وہ اپنے خاوند کو ضرر نہ پہنچائے) کہ وہ یہ کہے: میں اسے دودھ نہیں پلاؤں گی اور نہ خاوند اسے ضرر پہنچائے کہ وہ اس کا بیٹا چھین لے حالانکہ وہ کہہ رہی ہو: میں اسے دودھ پلاؤں گی۔ اور یہ احتمال ہے کہ یہ اصل میں تضار ہے، ہو، اور والدۃ مفعول مالم یسم فاعلہ ہو۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے لا تضار پڑھا ہے یعنی دواء میں سے پہلی مفتوح ہے۔

اور ابو جعفر بن قعقاع نے تضار یعنی راء کو اسکان اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح لا یضار کاتب ہے۔ اور یہ بعید ہے کیونکہ دو ہم مثل لفظ جب جمع ہو جائیں اور وہ دونوں اصلی ہوں تو ان میں سے ایک کو تخفیف کے لئے حذف کرنا جائز نہیں۔ پس یا ادغام ہوگا یا اظہار ہوگا۔ اور آپ سے اسکان اور تشدید بھی مروی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لا

تُضَارُّ بِمِلِّي رَأَى كَسْرَهُ كَسْرَهُ مَرُورِي هِيَ (1)۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ یہ قول باری تعالیٰ: وَعَلَى الْمَوْلُودِ پر معطوف ہے۔ اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس حضرت قتادہ، سدی، حسن اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ وارث سے مراد بچے کا وارث ہے کہ اگر وہ فوت ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے: مراد بچے کا ایسا وارث ہے جو صرف مردوں میں سے ہو کہ دودھ پلانے کا اہتمام کرنا اس کے ذمہ لازم ہوگا جیسا کہ یہ بچے کے باپ پر لازم تھا اگر وہ زندہ ہوتا اور حضرت مجاہد اور حضرت عطاء نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے: مراد بچے کا وارث ہے مردوں اور عورتوں میں سے جو بھی ہو۔ اسے دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے اتنی مقدار جتنا اس کی میراث میں ان کا حصہ ہے (2) اور یہی امام احمد اور اسحاق نے کہا ہے۔

اور قاضی ابواسحاق اسماعیل بن اسحاق نے اپنی کتاب ”معانی القرآن“ میں کہا ہے: ”پس رہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تو انہوں نے کہا ہے: صغیر کا نفقہ اور اسے دودھ پلانا ہر ذی رحم محرم پر واجب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی بہن کا صغیر اور محتاج بیٹا ہو اور چچا کا بیٹا صغیر اور محتاج ہو اور وہی اس کا وارث ہو، تو نفقہ ماموں پر واجب ہوگا اپنے اس بھانجے کے لئے جس کا وہ وارث نہیں ہے اور چچا کے بیٹے سے اپنے چچا کے اس بیٹے کے لئے جس کا وہ وارث ہے نفقہ ساقط ہو جائے گا“۔ ابواسحاق نے کہا ہے: انہوں نے ایسا قول کیا ہے جو نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ ہم کسی کو جانتے ہیں جس نے یہ کہا ہو۔

علامہ طبری نے امام ابوحنیفہ اور آپ کے صاحبین رحمہم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ وارث جس پر بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے وہی اس کا وارث ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اس کا ذی رحم محرم ہو اور اگر چچا کا بیٹا وغیرہ ذی رحم محرم کے ساتھ نہیں ہے تو اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی (3)۔

اور کہا ہے: (الوارث) سے مراد باپ کا حصہ ہے ان پر نفقہ اور لباس دونوں واجب ہوں گے۔

ضحاک نے کہا ہے: اگر بچے کا باپ فوت ہو جائے اور بچے کا مال ہو تو اسے دودھ پلانے والا اس مال سے لے لے گا۔ اور اگر اس کا کوئی مال نہ ہو تو پھر وہ عصبہ سے لے گا۔ اور اگر عصبہ کے پاس بھی مال نہ ہو تو پھر ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے۔ اور قبیسہ بن زویب، ضحاک اور بشیر بن نصر قاضی عمر بن عبدالعزیز رحمہم نے کہا ہے: الوارث سے مراد بچہ بذات خود ہے اور انہوں نے علی الوارث کی تاویل المولود سے ہے جیسا کہ ما علی المولود لہ ہے، یعنی اس پر اپنے مال میں سے اپنے آپ کو دودھ پلانا واجب ہے جب وہ اپنے باپ کا وارث بن جائے۔

اور سفیان نے کہا ہے: یہاں وارث سے مراد بچے کے والدین میں سے ایک کے فوت ہونے کے بعد جو باقی رہ جائے (4)، وہ ہے۔ پس اگر باپ فوت ہو جائے تو ماں پر بچے کی کفالت اور دیکھ بھال کرنا لازم ہے جبکہ بچے کا مال نہ ہو اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 600، دار احیاء التراث العربیہ

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ

عصبہ بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنے میں اس کے ساتھ اتنی مقدار شراکت کرے گا جتنا میراث میں سے اس کا حصہ ہے۔ ابن خويز منداد نے کہا ہے: اگر یتیم فوت ہو، اس کا کوئی مال نہ ہو، تو امام وقت پر بیت المال سے اس کا انتظام کرنا واجب ہے اور اگر امام ایسا نہ کرے تو پھر مسلمانوں پر ایسا کرنا واجب ہے اخص فالأخص کے طریقہ پر۔ اور ماں بچے کے ساتھ سب سے زیادہ مختص ہے لہذا اس پر اسے دودھ پلانا اور اس کا اہتمام کرنا واجب ہوگا نہ وہ بچے کی طرف رجوع کرے گی اور نہ کسی اور کی طرف (یعنی بچے پر اٹھنے والے اخراجات کے لئے بچے یا کسی اور طرف متوجہ نہ ہوگی) اور دودھ پلانا واجب ہے اور نفقہ مستحب ہے اور وجہ استحباب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ اور ازواج پر ان کے ساتھ حقوق کا قیام واجب ہے اور جب خاوند کے فوت ہو جانے یا اس کے تنگ دست ہو جانے کے سبب ان کے حق کا پورا ہونا معذرا اور مشکل ہو جائے تو حق ان سے ساقط نہیں ہوتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ عدت ان (عورتوں) پر واجب ہے اور نفقہ اور سکنتی ان کے خاوندوں پر لازم ہے اور جب ان کے لئے نفقہ معذرا ہو جائے تو ان سے عدت ساقط نہیں ہوتی۔

عبدالرحمن بن قاسم نے الاسدیہ میں امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی کے ذمہ بھائی، قریبی رشتہ دار اور ذورحم محرم کا نفقہ لازم نہیں ہوتا (1)۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ یہ منسوخ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ امام مالک کے الفاظ ہیں اور آپ نے یہ بیان نہیں کیا کہ اس کا نسخ کون ہے اور نہ ہی عبدالرحمن بن قاسم (نے بیان کیا ہے) اور نہ مجھے معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے اصحاب میں سے کسی نے اسے بیان کیا ہو اور وہ جو یہ شبہ ڈالتا ہے کہ وہ ان کے نزدیک اس کا نسخ ہو۔ واللہ اعلم، وہ یہ کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے جب اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک سال کا نفقہ اور سکنتی متوفی کے مال سے واجب کیا پھر اسے منسوخ کر دیا اور اسے اٹھالیا۔ اسی طرح وارث سے بھی اسے منسوخ کر دیا۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اسی بنا پر نفقہ بچے کی اپنی ذات پر اس کے مال سے ہوتا ہے اور وارث پر اس میں سے کوئی شے نہیں ہوتی اس بنا پر جو آ رہا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ، ابن قاسم نے امام مالک سے بیان کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے اور یہ ایسا کلام ہے جس میں غافلوں کے دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑے لوگوں کی عقلیں اس میں حیرت زدہ ہو جاتی ہیں، حالانکہ اس میں امر قریب ہے اور وہ یہ کہ فقہاء و مفسرین میں سے علماء متقدمین تخصیص کو نسخ کا نام دیتے تھے، کیونکہ اس میں ان بعض افراد سے حکم کو اٹھانا ہوتا ہے جنہیں عموم شامل ہوتا ہے۔ یہ ان کا تسامح تھا اور وہ ان کی زبانوں پر جاری رہا یہاں تک کہ اس نے ان کے بعد والے لوگوں کو اشکال میں ڈال دیا۔ اور اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ یہ ما تقدم کی طرف اشارہ ہے۔ پس لوگوں میں سے وہ جنہوں نے ایجاب نفقہ اور تحریم اضرار میں سے تمام کی طرف لوٹا یا ان میں فقہاء میں سے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور سلف میں سے حضرت قتادہ اور حسن رضی اللہ عنہما ہیں اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ کا معنی تمام ما تقدم کی طرف نہیں لوٹنا، بلکہ یہ صرف تحریم اضرار کی طرف لوٹنا ہے اور معنی یہ ہے کہ وارث پر بھی ماں کو ضرر پہنچانا اسی طرح حرام ہے جس طرح باپ پر ہے اور یہی اصل ہے۔ پس جو یہ دعویٰ کرے کہ اس میں عطف جمیع ما تقدم کی طرف راجع ہے تو دلیل لانا اس پر لازم ہے (1)۔ میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ان کا قول هذا هو الاصل اس سے مراد قریب ترین مذکور کی طرف ضمیر کو لوٹنا ہے۔ اور یہی صحیح ہے کیونکہ اگر وہ ان تمام کا ارادہ کرتا یعنی دودھ پلانا، نفقہ مہیا کرنا اور ضرر نہ پہنچانا تو یقیناً فرماتا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ هَذَا پس یہ اس پر دلیل ہے کہ اس کا عطف ضرر سے روکنے پر ہے۔

اور اسی بنا پر تمام مفسرین نے اس کی تاویل اس معنی میں کی ہے جسے قاضی عبدالوہاب نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کو اس طرح ضرر نہ پہنچائے کہ باپ جب اسے اجرت مثلی دے (تو وہ کہے) کہ وہ اسے دودھ نہیں پلائے گی اور نہ باپ اپنے بچے کے باعث ضرر پہنچائے۔ اس طرح کہ ماں جب تیار ہو کہ وہ اسے اجرت مثلی کے عوض دودھ پلائے گی تو پھر اسی کا وہ حق ہے۔ (باپ انکار نہ کرے) کیونکہ ماں بچے کے لئے زیادہ نرم اور زیادہ محبت و شفقت سے پیش آنے والی ہے اور اس کا دودھ کسی بھی اجنبیہ عورت کے دودھ کی نسبت زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: امام مالک، آپ کے تمام اصحاب، شعبی، زہری، ضحاک اور علماء کی ایک جماعت رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِثْلُ ذَلِكَ سے مراد ہے کہ ضرر نہ پہنچایا جائے۔ رہا رزق (نفقہ) اور لباس تو ان میں سے کوئی شے واجب نہ ہوگی۔

اور ابن قاسم نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ نفقہ اور لباس وارث پر ہے پھر اسے اجماع امت کے ساتھ اس معنی میں منسوخ کر دیا گیا ہے کہ وارث کو ضرر نہ پہنچایا جائے اور اختلاف اس میں ہے کہ کیا اس پر نفقہ اور لباس ہے یا نہیں؟

اور یحییٰ بن یعمر نے وعلى الورثة جمع کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ پس اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کریں لایقبل الله صدقة و ذر رحم محتاج کہ اللہ تعالیٰ کوئی صدقہ اس حال میں قبول نہیں فرماتا کہ ذر رحم محتاج ہو۔ تو انہیں کہا جائے گا کہ الرحم ہر ذی رحم کے لئے عام ہے، چاہے وہ محرم ہو یا غیر محرم اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ذر رحم پر صدقہ خرچ کرنا اولیٰ اور ارجح ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اجعلها فی الاقربین (2) (تم صدقہ کو اقربین میں خرچ کرو) پس حدیث کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے اور اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جس کا انہوں نے قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور نحاس نے کہا ہے: رہا اس کا قول جس نے کہا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ کہ اسے ضرر نہ پہنچایا جائے تو یہ قول حسن اور اچھا ہے کیونکہ لوگوں کے اموال ممنوع ہیں اور اس میں کوئی شے بغیر دلیل قطعی کے نہیں نکل سکتی اور جنہوں نے على ورثة الاب

مراد لیا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ نفقہ باپ پر لازم ہے۔ لہذا اس کے وارث بیٹے کے وارثوں سے اولیٰ ہوں گے اور ان کی دلیل جنہوں نے کہا: مراد بیٹے کے وارث ہیں، تو وہ کہتے ہیں: جس طرح وہ اس کے وارث ہوتے ہیں (اسی طرح) وہ اس کے حقوق کو بھی ادا کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: محمد بن جریر ان کے قول کو پسند کرتے تھے جنہوں نے کہا ہے کہ یہاں مراد بیٹے کے وارث ہیں، یہ اگرچہ قول غریب ہے لیکن اس سے استدلال صحیح ہے اور اس کی دلیل بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس کا مال اسی کے زیادہ قریب اور اولیٰ ہے۔ اور فقہاء نے اجماع کیا ہے سوائے اس کے جو ان سے الگ ہو گیا کہ ایک آدمی کا اگر چھوٹا بچہ ہو اور بچے کا مال بھی ہو اور باپ خوشحال ہو تو باپ پر نفقہ اور رضاع واجب نہ ہوگا بلکہ وہ بچے کے مال سے ادا ہوگا۔

اور اگر کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَعَلَى الْوَلَدِ لِلْأُولَادِ حَتَّىٰ يَسْتَوُوا فِي الْمَالِ** کہا جائے گا کہ یہ ضمیر مؤنث کے لئے ہے اور اس کے ساتھ اجماع آیت کی حد ہے، اس کی وضاحت کرنے والا ہے، کوئی مسلمان اس سے نکلنے کی وسعت نہیں رکھتا۔

اور رہا وہ جس نے کہا کہ اس سے مراد وہ ہے جو والدین میں سے ایک کے مرنے کے بعد باقی رہے، تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ماں کے لئے اپنے بچے کو ضائع کرنا جائز نہیں، حالانکہ وہ فوت ہو جائے جو بچے پر اور اس کی ماں پر خرچ کرتا تھا۔ اور امام بخاری نے اس قول کے رد میں ایک باب بیان کیا ہے اس کا عنوان ہے ”باب - وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ، وَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْهُ شَيْءٌ“ اور آگے ام سلمہ اور ہند کی حدیث بیان کی ہے۔

اس میں معنی یہ ہے کہ ام سلمہ کے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیٹے تھے اور ان کا کوئی مال نہ تھا تو اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ اس کے لئے اس میں اجر ہے۔ پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے بیٹوں کا نفقہ اس پر واجب نہیں اور اگر واجب ہوتا تو وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ نہ کہتی: اور میں نے اسے چھوڑ نہیں (1)۔

اور وہی ہند کی حدیث تو اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باپ کے مال سے اپنا نفقہ اور اپنے بچے کا نفقہ لینے کے لئے چھوڑ دیا اور آپ نے نفقہ اس پر واجب نہیں کیا جیسا کہ اسے باپ پر واجب کیا۔ پس امام بخاری نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب باپوں کی زندگی میں بیٹوں کا خرچہ ماؤں پر لازم نہیں ہے تو اسی طرح باپوں کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان پر لازم نہ ہوگا۔

اور رہا ان کا قول جنہوں نے کہا کہ بلاشبہ نفقہ اور لباس ہر ذی رحم محرم پر لازم ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ہر ذی رحم محرم پر خرچ کرے جب وہ فقیر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: اس قول کا معارض یہ ہے کہ نہ اسے کتاب اللہ سے لیا گیا ہے نہ اجماع سے اور نہ ہی سنت صحیحہ سے۔ بلکہ جو قول ہم نے ذکر کیا ہے اس کے سوا یہ کہیں معروف ہی نہیں ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 809، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب النفقات، حدیث نمبر 4950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس رہا قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ پس اگر وارث پر نفقہ اور لباس ہے تو انہوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے: جب وہ اپنا ماموں اور اپنے چچا کا بیٹا چھوڑے تو نفقہ اس کے ماموں پر ہے اور اس کے چچا کے بیٹے پر کوئی شے نہیں ہے تو یہ قرآن کریم کی نص کے خلاف ہے کیونکہ ماموں چچا کے بیٹے کے ساتھ کسی کے قول کے مطابق بھی وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی وہ اکیلا کثیر علماء کے قول کے مطابق وارث بن سکتا ہے اور وہ جنہوں نے اس سے ہر ذی رحم محرم پر نفقہ کا استدلال کیا ہے، اکثر اہل علم اس کے خلاف ہیں۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: فَإِنْ أَرَادَ فِصَالًا اس میں أَرَادَ ا میں ضمیر والدین کے لئے ہے اور فِصَالًا کا معنی ہے دودھ چھڑانا (1)۔ یعنی ماں کے دودھ کے سوا کسی اور خوراک کو غذا بنانا اور الفصال اور الفصل کا معنی الفطام ہے اور اس کا اصل معنی التفریق ہے اور یہ بچے اور پستان کے درمیان تفریق اور جدائی کرنا ہے اور اسی سے الفصیل ہے (یعنی اونٹنی یا گائے کا بچہ) کیونکہ اسے اپنی ماں سے جدا کیا جاتا ہے۔ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا یعنی وہ راضی ہو جائیں دو سالوں سے پہلے۔ فَلَا جُنْدَ حَ عَلَيْهِمَا یعنی امں کا دودھ چھڑانے میں ان پر کوئی گناہ نہیں اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جب مدت رضاع دو سال مقرر کی تو اس نے بیان کر دیا کہ ان دونوں کا دودھ چھڑانا وہی فطام ہے اور ان دونوں کا جدا کرنا وہی فصال ہے اس سے کسی کو مفر نہیں، مگر یہ کہ والدین اس مدت سے کم پر بچے کو نقصان پہنچائے بغیر متفق ہو جائیں اور وہ اس بیان کے ساتھ جائز ہے۔

اور حضرت قتادہ بنی شیبہ نے کہا ہے کہ دو سال دودھ پلانا واجب تھا اور اس سے پہلے دودھ چھڑانا حرام تھا، پھر اس میں تخفیف کی گئی اور دو سال سے کم مدت دودھ پلانا مباح کر دیا گیا، اس قول کے ساتھ فَإِنْ أَرَادَ فِصَالًا الْآیہ۔ اور اس میں احکام میں اجتہاد کے جائز ہونے پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے لئے مشاورت مباح قرار دی ہے ایسے امور میں جو صغیر کی اصلاح کرنے والے ہوں اور یہ ان دونوں کے ظن غالب پر موقوف ہے نہ کہ حقیقت و یقین پر۔ اور التشاور کا معنی ہے: رائے کا اظہار کرنا۔ اسی طرح المشاورة اور المشورة ہے جیسا کہ المعونة اور شئت العسل کا معنی ہے میں نے اسے (شہد کو) نکالا۔ اور شئت الدابة و شورتہا یعنی میں نے اسے چلایا اس کی چال کو تیز کرنے کے لئے اور الشوار کا معنی ہے گھڑ کا سامان، کیونکہ وہ دیکھنے والے کے لئے ظاہر ہوتا ہے اور الشارة کا معنی ہے آدمی کی ہیئت اور الاشارة کا معنی ہے جو تیرے دل میں ہے اسے نکالنا اور اس کا اظہار کرنا۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: وَإِنْ أَرَادْتُمْ أَنْ تُسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ غَيْرَ الْوَالِدَةِ اگر تم چاہو تو اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ والدہ کے علاوہ (دایہ سے) زجاج نے یہی کہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے أَنْ تُسْتَرْضِعُوا اجنبیۃ لاولادکم (کہ تم اجنبی عورت سے اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ) اس کی مثل یہ ارشاد ہے: كَالْوَهْمِ أَوْ ذَرْنُوهُمْ (المطففين: 3) یعنی کالوالہم اذ ورنوالہم اور لام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں ان میں سے ایک حرف کے ساتھ ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

امرتك الخير فافعل ما أمرت به فقد تركتك ذا مال و ذا نسب
میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہ کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے، تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب جائیداد چھوڑا ہے۔

اور یہ جائز نہیں ہے: دعوت زید، اسی دعوت لزید، کیونکہ یہ تلبیس (حقیقت کو چھپانا) تک پہنچا دیتا ہے اور اس نوع میں سماع معتبر ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر اس آیت میں دایہ بنانے کے جواز پر دلیل موجود ہے جبکہ آباء اور مائیں اس پر متفق ہو جائیں اور عکرمہ نے قول باری تعالیٰ لَا تُضَاكِرُوا الْإِثْمَ میں کہا ہے۔ اس کا معنی ہے دایہ۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے (1)۔ اور اصل یہ ہے کہ ہر ماں پر اپنے بچے کو دودھ پلانا لازم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ پس اس نے زوجات کو اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا حکم دیا ہے اور ان کے لئے ازواج پر نفقہ اور لباس واجب کیا ہے اور زوجیت قائم رہے گی اور اگر دودھ پلانے کا انتظام کرنا باپ پر لازم ہوتا تو جب اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کے نفقہ اور لباس کے لازم ہونے کا ذکر کیا ہے تو وہ اس کا بھی ذکر کر دیتا۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ نے دیگر فقہاء امصار کے سوا حسیہ (خاندانی شرف والی عورت) کی استثنا کی ہے اور کہا ہے: اس پر دودھ پلانا لازم نہ ہوگا (2) اور اسے آیت سے نکال دیا ہے اور اصول فقہ کے ایک اصول کے ساتھ اس کی تخصیص کر دی ہے۔ اور وہ ہے العمل بالعادة۔ عمل عادت اور رواج کے مطابق ہوتا ہے اور یہ وہ اصول ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ کے سوا کوئی نہیں سمجھا۔ اور اس میں عمدہ اصول یہ ہے کہ یہ امر دور جاہلیت میں صاحب حسب و شرف لوگوں میں رائج تھا، پھر اسلام آیا اور اس نے اسے تبدیل نہیں کیا اور آپ کے زمانے تک صاحب ثروت و حسب لوگ بچوں کو دودھ پلانے والیوں کے حوالے کرنے کے ساتھ ماؤں کو استمتاع کے لئے فارغ کرنے پر مصر رہے۔ تو آپ نے یہ کہہ دیا اور رہا ہمارے زمانے کا حکم تو ہم نے اسے شرعاً ثابت کر دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: إِذَا سَلَّمْتُمْ جب تم یعنی آباء اجرت دودھ پلانے والی دایہ کو ادا کر دو۔ سفیان نے یہی کہا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: جب تم ماؤں کو ان کی اجرت اس حساب سے ادا کر دو جس کے مطابق انہوں نے دودھ پلانے کے وقت تک دودھ پلایا (3)۔

سات قراء میں سے چھ نے ما آتیتم بمعنی ما أعطیتم پڑھا ہے اور ابن کثیر نے آتیتم بمعنی ما جئتم و فعلتم (جو تم لائے اور تم نے کیا) پڑھا ہے۔ جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

و ما کان من خیر أتوہ فانما توارثہ آباء آبائہم قبل (4)
جو انہوں نے کہا ہے وہ خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ بلاشبہ ان کے آباء کے آباء اس سے پہلے اس کے وارث بنیں ہیں۔

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 311

4۔ ایضاً

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ

حضرت قتادہ اور زہری رحمہما نے کہا ہے اس کا معنی ہے جب تم وہ ادا کرو جو تم نے دودھ پلوانے کے ارادہ سے طے کیا ہے، یعنی والدین میں سے ہر ایک حوالے کر دے اور راضی ہو جائے اور یہ ان دونوں کے اتفاق کی بنا پر ہو اور خیر کے قصد اور امر معروف کے ارادہ سے ہو اور اس احتمال پر سَلَبْتُمْ کے خطاب میں مرد اور عورتیں سبھی داخل ہوں گے (1) اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر خطاب مردوں کو ہے۔

ابوعلی نے کہا ہے: اذا سلمتم ما آتیتم معنی ہے نقدہ او اعطاء ہے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے اور ضمیر کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور تقدیر کلام ہے: ما آتیتموہ، پھر ضمیر کو وصلہ سے حذف کر دیا گیا اور اس تاویل کی بنا پر خطاب مردوں کو ہوگا، کیونکہ وہی دودھ پلانے کی اجرت ادا کرتے ہیں۔ ابوعلی نے کہا ہے: اور یہ احتمال بھی ہے کہ ماصدریہ ہو یعنی اذا سلمتم الاحیان اور معنی پہلے کی طرح ہی ہے، لیکن یہ مضاف کے حذف اور پھر ضمیر کے حذف کے طریقہ سے مستغنی ہو جائے گا۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ
وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

”اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں بیویاں تو وہ بیویاں انتظار کریں چار مہینے اور دس دن اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس) مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب واقف ہے۔“

اس میں پچیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ جب اللہ تعالیٰ نے طلاق کی عدت کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ متصل مسئلہ رضاعت کا ذکر فرمایا، پھر ساتھ ہی عدت وقات کا ذکر بھی کر دیا، تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ عدت وقات طلاق کی مثل ہے۔ وَالَّذِينَ یعنی وہ آدمی جو تم سے فوت ہو جاتے ہیں۔ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا اور وہ بیویاں چھوڑ جاتے ہیں یا اور ان کی بیویاں ہوں، تو وہ بیویاں انتظار کریں گی، زواج نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے۔ کلام میں مبتدا کا حذف بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ أَفَأَنْتُمْ بِمَسْئَلِمْكُمْ يُشِيرُ فِي ذَلِكُمْ ۚ الْتَأْمُرُ ۚ (الحج: 72)

یہ اصل میں هو النار ہے اور ابوعلی فارسی نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً یتربصن بعدہم وہ آدمی جو تم میں فوت ہو جاتے ہیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جاتے ہیں تو وہ ان کے بعد انتظار کریں گی (2) اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: السمن منوان بدرہم یہ اصل میں منوان منہ بدرہم ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے وازواج الذین یتوفون منکم یتربصن (اور وہ ازواج جو تم سے فوت ہو جاتے ہیں تو

ان کی بیویاں انتظار کریں گی۔) پس عبارت میں انتہائی ایجاز اور اختصار ہے۔ اور مہدوی نے سیبویہ سے بیان کیا ہے کہ معنی ہے: وہ فیما بین علیکم الذین یتوفون۔

اور کوفہ کے بعض علمائے نحو نے کہا ہے: الذین کی خبر چھوڑ دی گئی ہے اور مقصود ان کی ازواج کے بارے خبر دینا ہے کہ وہ انتظار کریں گی۔ اور اس لفظ کا معنی ہے مشروع ہونے کی خبر دینا دو جہوں میں سے ایک میں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس عورت کی عدت کے بارے میں ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس میں ظاہراً عموم ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے۔ مہدوی نے بعض علماء سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حاملہ عورتوں کو بھی شامل تھی پھر اسے اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا ہے: وَأُولَاتُ الْأَحْصَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (طلاق: 4) (1) (اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل وضع کر لیں۔)

اور اکثر علماء نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ کے لئے نسخ ہے: وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لَّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ۔ کیونکہ لوگ اسلام کا کچھ عرصہ اس پر قائم رہے جب کوئی آدمی فوت ہوتا اور اپنے پیچھے حاملہ بیوی چھوڑتا تو وہ اپنی بیوی کے لئے ایک سال کے نفقہ کی وصیت کرتا اور سکنتی (رہائش گاہ) کی وصیت کرتا جب تک وہ نہ نکلے اور شادی نہ کر لے، پھر اسے چار مہینے اور دس دن اور میراث کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس میں نسخ نہیں ہے بلکہ یہ سال کی مدت میں کمی کرنا ہے جیسا کہ صلوٰۃ مسافر کہ جب یہ چار سے کم ہو کر دو رکعتیں ہوئی تو یہ نسخ نہیں ہے اور یہ واضح طور پر غلط ہے جب اس کا حکم یہ تھا کہ وہ ایک سال تک عدت گزارے گی جب وہ نہ نکلے اور اگر وہ نکل گئی تو اسے روکا نہ جائے پھر اس حکم کو زائل کر دیا گیا ہے اور اس پر چار مہینے دس دن عدت لازم ہو گئی ہے اور یہی وہ نسخ ہے اور صلوٰۃ مسافر میں اس میں سے کوئی شے نہیں ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نماز دو رکعتیں فرض کی گئی، پھر مقیم کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور صلوٰۃ مسافر کو اپنے حال پر برقرار رکھا گیا (2)۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ایسی حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت وضع حمل ہے۔ یہ جمہور علماء کے نزدیک ہے اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس کی عدت دو مدتوں میں سے آخری مدت (طویل مدت) کو مکمل کرنا ہے۔ اور ہمارے علماء میں سے سحنون نے اسے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور اس کی دلیل جو حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ ان دونوں قولوں کو جمع کرنے کا ارادہ ہے: یعنی وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا (3) اور اس قول کے درمیان: وَأُولَاتُ الْأَحْصَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اور وہ اس طرح کہ جب وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دارالکتب العلمیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، حدیث نمبر 337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 613، دار احیاء التراث العربیۃ

دو مدتوں کی انتہا تک بیٹھی رہی تو اس نے دونوں آیتوں کے مقتضا کے مطابق عمل کیا۔ اور اگر وہ وضع حمل کے ساتھ عدت گزارے تو اس نے عدت وفات والی آیت کے ساتھ عمل ترک کر دیا۔ اور دونوں کو جمع کرنا ترجیح سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔ اس پر تمام اہل اصول کا اتفاق ہے۔ یہ انتہائی اچھی نظر و فکر ہے اگر اس پر حدیث سُبَّيْعَةَ اسلمیہ (1) سے اعتراض نہ کیا جائے کہ اسے اپنے خاوند کی وفات کے بعد چند ہی راتیں گزرنے کے ساتھ نفاس آنے لگا اور اس نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اسے اصحیح میں نقل کیا ہے اور حدیث نے واضح کر دیا ہے کہ رب کریم کا ارشاد: **وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ** مطلقاً اور ان عورتوں کے بارے میں جن کے خاوند فوت ہو جائیں اپنے عموم پر محمول ہے اور عدت وفات دونوں صنفوں میں سے غیر حاملہ کے ساتھ مختص ہے اور اسے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے تقویت حاصل ہوتی ہے اور جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرتا ہوں کہ سورۃ النساء القصصی کی آیت عدت وفات کی آیت کے بعد نازل ہوئی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس کا ظاہر کلام بے شک اس کا ناخ ہے لیکن وہ اس سے مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بلاشبہ یہ آیت اس کے لئے مخصوص ہے اور اس نے اس سے اس کے بعض مشتملات کو نکال دیا ہے اور اسی طرح حدیث سُبَّيْعَةَ عذت وفات سے متاخر ہے۔ کیونکہ سبیعہ کا قصہ حجۃ الوداع کے بعد کا ہے۔ اور اس کا خاوند سعد بن خولہ تھا اور وہ بنی عامر بن لؤی میں سے تھا۔ اور وہ غزوہ بدر میں شامل ہونے والے صحابہ کرام میں سے تھا۔ جس وقت وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اس وقت یہ حاملہ تھی۔ اور یہ وہی ہیں جن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرثیہ کہا کہ وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے ہیں اور ان کے وصال سے نصف مہینہ گزرنے کے بعد اس نے بچے کو جنم دیا۔ اور بخاری نے کہا ہے: چالیس راتیں گزرنے کے بعد (2)۔

اور مسلم نے حضرت عمر بن عبد اللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ سبیعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا۔ اس نے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فتویٰ دیا کہ میں اس وقت سے حلال ہو چکی ہوں جب سے میں نے حمل کو وضع کر لیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے شادی کی اجازت مرحمت فرمادی اگر میرے لئے ضرورت ہو (3)۔

ابن شہاب نے بیان کیا ہے: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ وہ اس وقت شادی کر لے جب بچے کی ولادت ہو جائے اگرچہ اس کا خون جاری ہو، مگر یہ کہ اس کا خاوند اس کے قریب نہ جائے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ اسی نظریہ پر جمہور علماء اور ائمہ فقہاء ہیں۔

اور حسن، شعبی، نخعی اور حماد نے کہا ہے: نفاس والی عورت جب تک دم نفاس میں ہے نکاح نہیں کرے گی اور انہوں نے دو شرطیں لگائیں ہیں۔ ایک وضع حمل اور دوسری نفاس سے پاک ہونا۔ اور حدیث ان کے خلاف حجت ہے اور ان کے لئے اس

1۔ صحیح بخاری، باب واولات الاحمال الخ، حدیث نمبر 4907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صحیح بخاری، باب والذین یتوفون الخ، حدیث نمبر 4168، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، جلد 2، صفحہ 729، وزارت تعلیم

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 486، وزارت تعلیم

قول میں کوئی حجت نہیں ہے۔ فلما تعلت من نفاسها تجتلت للخطاب (1) (جب وہ اپنے نفاس سے پاک ہو جائے تو وہ دعوت نکاح دینے والوں کے لئے بناؤ سنگار کرے) جیسا کہ صحیح مسلم اور ابی داؤد میں ہے۔ کیونکہ تَعَلَّتْ کا اگرچہ اصلی معنی دم نفاس سے پاک ہونا ہے، جیسا کہ خلیل نے بیان کیا ہے، پھر بھی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہاں اس سے مراد اس کے نفاس کے در دوں اور تکلیف کا کم ہونا ہو اور اگر وہ معنی تسلیم کر لیا جائے جو خلیل نے بیان کیا ہے تو پھر اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل سبیحہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد میں ہے ”کہ تو حلال ہو گئی جب سے تو نے وضع حمل کر لیا (2)“ پس آپ ﷺ نے وضع کے وقت حلت کو واقع کیا اور اسی پر اسے معلق کیا اور یہ نہیں فرمایا جب تیرا خون منقطع ہوا اور نہ یہ فرمایا کہ جب تو پاک ہوئی۔ لہذا وہ صحیح ہے جو جمہور نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء کے درمیان اس پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ہر مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے چاہے خاوند رجعت کا مالک ہو یا نہ ہو (یعنی طلاق رجعی ہو یا بائن) وہ عورت آزاد ہو یا لونڈی، مدبرہ ہو یا مکاتبہ۔ البتہ حاملہ متوفیٰ عنہا زوجہا کی مدت عدت میں اختلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور تمام نے آپس میں اختلاف کیے بغیر اس پر اجماع کیا ہے کہ اگر آدمی فوت ہو جائے اور وہ حاملہ عورت پیچھے چھوڑے اور چار مہینے اور دس دن گزر جائیں تو وہ حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ بچے کو جنم دے لے پس اس سے معلوم ہوا کہ مقصود ولادت ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يَتَوَبَّضْنَ، التبرص کا معنی نکاح میں تاخیر کرنا اور صبر کرنا ہے اور مسکن نکاح سے نہ نکلنا ہے وہ اس طرح کہ وہ رات کے وقت اس سے جدا اور علیحدہ نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے متوفیٰ عنہا زوجہا کے لئے اپنی کتاب میں سکنی کا ذکر نہیں کیا ہے جیسا کہ مطلقہ کے لئے اپنے اس قول کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اُسْكِنُوهُنَّ اور کتاب اللہ میں لفظ عدت میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو احواد (سوگ کا اظہار کرنا) پر دلالت کرتی ہو۔ بلکہ فقط فرمایا: يَتَوَبَّضْنَ حدیث طیبہ نے ان تمام چیزوں کو بیان فرمایا ہے اور حضور نبی مکرم ﷺ سے احادیث بالکل ظاہر ہیں کہ عدت وفات میں انتظار بلاشبہ احواد کے ساتھ ہے اور احواد سے مراد زیب و زینت سے، خوبصورت رنگے ہوئے کپڑے پہننے سے اور خوشبو وغیرہ لگانے سے رکنا اور باز رہنا ہے (3) اور یہ جمہور علماء کا قول ہے۔

حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: احواد کوئی شے نہیں ہے صرف زوج سے انتظار کرنا ہے اور عورت کے لئے مباح ہے کہ بناؤ سنگھار کر سکتی ہے اور خوشبو لگا سکتی ہے۔ لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ سنت کے خلاف ہے اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فریضہ بنت مالک بن سلمان کو فرمایا اور اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا: اُمَكْشِي فِي بَيْتِكَ حَتَّى يَمْلَأَ الْكِتَابُ أَجْلَهُ (4) (تو اپنے گھر میں ہی رکی رہ یہاں تک کہ کتاب اللہ کے مطابق عدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) اس نے بیان کیا ہے سو میں نے

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 115، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب عدة العاقل، حدیث نمبر 1962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربیہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 569، وزارت تعلیم

4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

چار مہینے اور دس دن عدت گزاری ہے۔ یہ حدیث ثابت ہے۔ اسے امام مالک نے سعید بن اسحاق بن کعب بن عجرہ سے بیان کیا ہے اور اسے ان سے امام مالک، ثوری، وہیب بن خالد، حماد بن زید، عیسیٰ بن یونس اور ایک کثیر تعداد نے، ابن عیینہ، القطان اور شعبہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

اور تحقیق امام مالک نے اسے ابن شہاب سے روایت کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔
الباجی نے کہا ہے: ان سے ان کے سوا کسی اور نے روایت نہیں کیا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بھی اسے اخذ کیا ہے۔
ابو عمر نے کہا ہے: انہوں نے اس کے ساتھ متوفی عنہا زوجہا کے لئے اپنے گھر میں عدت گزارنے کا فیصلہ کیا ہے اور علمائے حجاز و عراق کے نزدیک یہ حدیث مشہور و معروف ہے کہ متوفی عنہا زوجہا پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر میں عدت گزارے اور اس سے نہ نکلے۔ اور یہی قول حجاز، شام، عراق اور مصر وغیرہ امصار کے فقہاء کی جماعت کا ہے۔

اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی عدت گزارے بلکہ وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں سکنی کا ذکر مطلقاً کے بارے ہے اور ان کی دلیل میں سے یہ بھی ہے کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔

انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ یہ حدیث ایک ایسی عورت روایت کر رہی ہے جس کا علمی مرتبہ معروف نہیں۔ اور سکنی کو واجب کرنا ایک حکم کو واجب کرنا ہے اور احکام ثابت نہیں ہوتے مگر کتاب اللہ کی نص کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ یا اجماع کے ساتھ۔

ابو عمر نے کہا ہے: جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو یہ تو بجمہ اللہ ثابت ہے اور رہا اجماع تو سنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت نہیں کیونکہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو حجت اس کا قول ہوتا ہے جس قول کی تائید اور موافقت سنت کرے۔ وباللہ التوفیق۔
اور حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی داؤد کے قول کی مثل مروی ہے اور اسی طرح حضرت جابر بن زید، عطاء اور حسن بصری رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا اور یہ نہیں فرمایا: يَتَرَبَّصْنَ فِي بَيْوتِهِنَّ (وہ اپنے گھروں میں عدت گزاریں) لہذا عورت جہاں چاہے عدت گزار لے (1)۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

اور عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ معمر نے زہری سے اور انہوں نے حضرت عروہ سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن ام کلثوم کے ساتھ عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلیں اس وقت اس کا خاوند طلحہ بن عبید اللہ شہید ہو چکا تھا اور آپ فتویٰ دیتی تھیں کہ متوفی عنہا زوجہا اپنی عدت کے دوران نکل سکتی ہے (2)۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربیہ
2۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب انطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دار الکتب العلمیہ

فرمایا: ہمیں ثوری نے عبید اللہ بن عمر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے قاسم بن محمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ لوگوں نے اس بارے میں ان کا انکار کیا ہے (1)۔ مزید فرمایا: معمر نے زہری سے ہمیں بیان کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت کے بارے میں رخصت دینے والوں نے عائشہ بنتی نبیہا کے قول کو لیا ہے اور اہل ورع و عزم لوگوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کو لیا ہے۔ (2)

اور مؤطا میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسی عورتوں کو مقام بیداء سے لوٹا دیتے تھے جن کے خاوند فوت ہو چکے ہوتے اور آپ انہیں حج سے منع کرتے تھے (3) اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اجتہاد ہے۔ کیونکہ آپ اس گھر میں عورت کے لئے عدت گزارنے کے قائل تھے جس میں اس کا خاوند فوت ہوا، آپ عورت کے لئے اسے لازم قرار دیتے تھے اور یہی قرآن و سنت کا تقاضا ہے۔ پس عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ حج اور عمرہ کے لئے نکلے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

امام مالک نے کہا ہے: اسے واپس لوٹا دیا جائے گا جب تک کہ اس نے احرام نہ باندھا ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب خاوند رہائش گاہ کا ذاتی طور پر مالک ہو تو عورت کے لئے اس میں عدت گزارنا لازم ہے۔ یہی اکثر فقہاء کا موقف ہے۔ (مثلاً) امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہ۔ اور یہ حدیث فریعیہ کی وجہ سے ہے۔ کیا گھر کو فروخت کرنا جائز ہے جب کہ وہ مرنے والے کی ملکیت ہو اور ورثاء نے اس کا ارادہ کیا ہو؟ تو ہمارے جمہور اصحاب کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے اور اس میں عورت کے عدت گزارنے کی شرط رکھی جائے گی۔

ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ عورت عزاء کی نسبت سکنی کی زیادہ حقدار ہے اور محمد بن حکم نے کہا ہے: یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس میں یہ شک ہو سکتا ہے کہ اس کی عدت طویل ہو جائے۔

اور ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غالب سلامتی ہے اور شک نادر ہے، لہذا یہ عقود کو فاسد کرنے میں مؤثر نہیں ہو سکتا اور اگر اس میں اس شرط کے ساتھ بیع واقع ہو جائے پھر عورت کو شک پڑ جائے، تو امام مالک رحمہ اللہ نے کتاب محمد میں کہا ہے کہ وہ اس مقام کا زیادہ حق رکھتی ہے یہاں تک کہ شک ختم ہو جائے اور ہمارے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ مشتری کے لئے بیع فسخ کرنے یا اسے مکمل کرنے کا اختیار ہو اور کسی شے کے ساتھ اس کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ عدت معتادہ داخل ہوا ہے۔ اور اگر بیع زوال شک کی شرط کے ساتھ واقع ہوئی تو وہ فاسد ہے۔

حنون نے کہا ہے: مشتری کے لئے کوئی حجت نہیں ہے اگرچہ شک پانچ سال تک پھیل جائے کیونکہ وہ عدت پر داخل ہے اور عدت کبھی پانچ سال ہوتی ہے اور اسی طرح اسے ابو زید نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر خاوند کا سکنی تو ہو لیکن ذاتی ملکیت نہ ہو تو عورت کے لئے عدت کی مدت میں سکنی ہوگا۔ بخلاف امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ کے۔ اور اس کی علت فریعیہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے حالانکہ آپ

جانتے تھے کہ اس کا خاوند رہائش گاہ کی ذاتی ملکیت نہیں رکھتا: امکثی فی بیتک حتی یبدغ الکتاب اجلہ (1) (تو اپنے گھر میں ہی ٹھہر یہاں تک کہ لکھی ہوئی مدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ گھر اس عورت کا تھا، پس اس لئے آپ ﷺ نے اسے فرمایا: امکثی فی بیتک (2) کیونکہ معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ اس نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ اس کا خاوند قتل کر دیا گیا ہے اور اس نے اسے ایسے گھر میں چھوڑا ہے جو اس کا نہیں اور اس نے آپ ﷺ سے اجازت طلب کی اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور ہمارے لئے معنی کی نوعیت یہ ہے کہ اس نے ایسا گھر چھوڑا جس کے باسی اس کے اس طرح مالک ہوتے ہیں کہ اس میں اس پر کوئی تاوان اور برائی نہیں ہوتی۔ تو لازم ہے کہ اس کی بیوی اسی میں عدت گزارے، اس کی اصل یہی ہے جبکہ وہ ذاتی طور پر اس کا مالک ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب اس نے کرایہ ادا کر رکھا ہو۔ اور رہی وہ صورت جب اس نے کرایہ نہ ادا کیا ہو تو المدونہ میں ہے کہ میت کے مال میں عورت کے لئے کوئی سکنی نہیں اگرچہ وہ خوشحال ہو۔ کیونکہ عورت کا حق اس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے جس رہائش گاہ کا وہ مکمل طور پر مالک ہوتا ہے اور جس کا کرایہ اور عوض اس نے ادا نہ کیا ہو وہ اس کا کامل طور پر مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عوض کا مالک ہے جو اس کے قبضے میں ہے اور اس میں بیوی کا کوئی حق نہیں مگر میراث کے سبب نہ کہ سکنی کی حیثیت سے، کیونکہ وہ مال ہے سکنی نہیں ہے اور امام محمد نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ میت کے لئے اس کے مال میں کرایہ لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فریضہ کے لئے ارشاد گرامی: امکثی فی بیتک حتی یبدغ الکتاب اجلہ (3) یہ احتمال رکھتا ہے کہ آپ ﷺ نے اسے اس لئے حکم دیا تھا کہ اس کے خاوند نے گھر کا کرایہ ادا کیا ہو یا یہ کہ اس میں اس کی وفات تک سکونت اختیار کی گئی تھی یا یہ کہ گھر والوں نے اس کے لئے اس میں عدت کو مباح قرار دیا تھا کرائے کے عوض یا بغیر کرائے کے یا ان میں سے جو اللہ تعالیٰ نے چاہا جس سے آپ نے یہ جان لیا کہ اس گھر میں رہنا اس کے لئے لازم ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اس عورت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس کے پاس اس کے خاوند کی موت کی خبر آتی ہے اس حال میں کہ وہ اپنے خاوند کے گھر کے سوا کسی اور گھر میں ہو۔ تو امام مالک بن انس رحمہ اللہ نے اسے اس کے گھر اور قرار گاہ کی طرف لوٹنے کا حکم دیا ہے اور یہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب اور نخعی نے کہا ہے کہ وہ وہیں عدت گزارے گی جہاں اس کے پاس خبر پہنچی۔ وہ وہاں سے نہیں جائے گی یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام مالک رحمہ اللہ کا قول صحیح ہے، مگر یہ کہ خاوند نے اسے اس مکان کی طرف منتقل کیا ہو تو پھر عدت اسی مکان میں لازم ہوگی۔

مسئلہ نمبر 11۔ اس عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی حاجات اور ضروریات کے لئے صبح کے وقت لوگوں کے عام پھیل جانے کے وقت سے لے کر شام کے بعد ان کے اپنے گھروں میں پر سکون ہونے کے وقت تک گھر سے نکل سکتی ہے اور وہ اپنے اس گھر کے سواریات کہیں نہیں گزار سکتی۔

اور بخاری اور مسلم میں ام عطیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہیں کرے گی سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ چار مہینے اور دس دن ہے۔ وہ نہ تورنگا ہوا کپڑا پہنے گی سوائے یمنی کپڑے کے (یعنی عصب کا کپڑا) نہ وہ سرمہ لگا سکتی ہے اور نہ خوشبو لگا سکتی ہے مگر جب وہ پاک ہو تو قسط یا اظفار (1) (خوشبو کی دو قسمیں ہیں) میں سے تھوڑی سی لگا سکتی ہے۔

اور ام حبیبہ کی حدیث میں ہے: ”وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ کا اظہار کرے مگر اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن (2) (سوگ کرے گی) الحدیث۔ الاحداد کا معنی ہے: عورت جب تک عدت میں ہے اس کا ہر قسم کی زیب و زینت کو ترک کر دینا مثلاً بھڑکیلا لباس، خوشبو، زیورات، سرمہ اور مہندی لگانا وغیرہ۔ کیونکہ زینت ازواج کی طرف دعوت دیتی ہے، پس سد ذرائع کے طور پر اس سے منع کر دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی حرمت کو تارتا رہنے سے بچانے کے لئے اور عورت زیتون اور تلوں کا تیل کسی خوشبو میں ملا کر اپنے سر کو نہ لگائے۔ کہا جاتا ہے: امرأۃ حادۃ مُحَدُّ سَوَّگ مَنَانِے والی عورت۔ اصمعی نے کہا ہے: ہم حدیث نہیں پہنچاتے۔ اور لایحل کا فاعل وہ مصدر ہے جسے تُحَدُّ مع اُن سے بنانا ممکن ہے یہی مراد ہے تو گویا کہ اس نے کہا: الاحداد۔

مسئلہ نمبر 12۔ حضور نبی مکرم ﷺ کا عورت کو ایمان سے متصف کرنا دو قولوں میں سے ایک کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک ایسی کتابیہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد نہیں ہے۔ یہ قول ابن کناہ اور ابن نافع کا ہے۔ اور اسے اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ابن منذر نے کہا ہے اور ابن القاسم نے روایت کیا ہے کہ اس پر بھی مسلمان عورت کی طرح احداد (سوگ کا اظہار کرنا) ہے۔ یہی لیث، شافعی، ابو ثور اور ہمارے عام اصحاب نے کہا ہے، کیونکہ یہ عدت کے احکام میں سے ایک حکم ہے اور یہ مسلمان کے تحت کتابیہ عورت پر اسی طرح لازم ہے جس طرح رہائش کی جگہ اور عدت لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ حضور نبی مکرم ﷺ کے ارشاد میں: فوق ثلاث الا علی زوج (3) اس پر دلیل ہے کہ مسلمان عورتوں پر تین دنوں سے زیادہ اپنے ازواج کے سوا کسی پر احداد کرنا حرام ہے اور ان پر تین دن سوگ کا اظہار کرنا مباح ہے۔ مرنے کے بعد آنے والی رات سے لے کر تیسری رات کے اختتام تک اسے شمار کیا جائے گا۔ اگر کسی عورت کا دیور فوت ہوا اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تلبس الحادۃ... الخ، حدیث نمبر 4924، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب الکحل للحادۃ، حدیث نمبر 4921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم

حال میں کہ ابھی دن یا رات کا کچھ حصہ باقی تھا تو اسے وہ لغو قرار دے گی اور آنے والی رات سے حساب لگائے گی۔

مسئلہ نمبر 14۔ یہ حدیث اپنے حکم کے عام ہونے کے سبب ان تمام زوجات کو شامل ہے جن سے ان کے ازواج فوت ہو جائیں اور اس میں لونڈیاں، آزاد عورتیں، بڑی اور چھوٹی سب داخل ہیں۔ اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ لونڈی اور صغیرہ پر احاد نہیں ہے آپ سے اسے قاضی ابوالولید الباجی نے بیان کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: لونڈی جو کسی کی بیوی ہو وہ جملہ ازواج میں اور عموم اخبار میں داخل ہے اور یہ قول امام مالک، شافعی، ابو ثور اور اصحاب الرائے رحمہ اللہ کا ہے اور مجھے اس بارے کی اختلاف یاد نہیں ہے اور نہ میں انہیں جانتا ہوں کہ وہ ام ولد پر احاد ہونے کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔ کیونکہ وہ زوجہ نہیں ہوتی اور احادیث ازواج کے بارے میں وارد ہیں۔

الباجی نے کہا ہے: صغیرہ جب ان عورتوں میں سے ہو جو امر و نہی کی عقل رکھتی ہیں اور اس کے لئے جو حد بیان کی جائے اس کا وہ التزام کرتی ہو تو اسے احاد کا حکم دیا جائے گا اور اگر وہ اپنی صغر سنی کے سبب کسی شے کو نہ جانتی ہو تو ابن مزین نے عیسیٰ سے روایت کیا ہے کہ اس کے گھر والے اسے ان تمام چیزوں سے روکیں گے جن سے کبیرہ اجتناب کرتی ہے اور یہ (احداد) اس کے لئے لازم ہے اور صغیرہ پر احاد کے واجب ہونے کی دلیل وہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت نے اپنی اس بیٹی کے بارے پوچھا۔ جس کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں دکھنے لگیں کہ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں“ آپ نے یہ دو بار یا تین بار پوچھا تو آپ ہر بار یہی کہتے رہے ہے ”نہیں“ (1) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عمر کے بارے نہ پوچھا۔ اگر صغیرہ کبر کے سبب حکم مختلف ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عمر کے بارے ضرور سوال کرتے تاکہ آپ اس کا حکم بیان فرمائیں اور اس قسم کے مسئلہ میں بیان میں تاخیر جائز نہیں ہوتی اور یہ دلیل بھی ہے کہ ہر وہ جس پر عدت و فوات لازم ہے اس پر کبیرہ کی طرح احاد کرنا بھی لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ ابن منذر نے کہا ہے: میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ خضاب بھی اس زینت میں داخل ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ سوگ والی عورت کے لئے رنگے ہوئے کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننا جائز نہیں ہے مگر ایسا کپڑا جسے سیاہ رنگ سے رنگا جائے کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی رخصت دی ہے۔ اور زہری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے: اسے چاہئے کہ وہ عصب کا کپڑا نہ پہنے۔ اور یہ حدیث کے خلاف ہے۔

اور المدونہ میں امام مالک نے کہا ہے: وہ یمن کے عصب کا بار یک کپڑا نہیں پہن سکتی اور آپ نے مونے کپڑے کی گنجائش رکھی ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ بار یک کپڑا رنگے ہوئے کپڑے کے قائم مقام ہے (2) اور وہ ریشم، کتان اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 314، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تعد المتوفی الخ، حدیث نمبر 4920، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدة و طلاق السنة، جلد 5، صفحہ 113، السعادة بجوار حافظہ مصر

روئی کا باریک اور موٹا کپڑا پہن سکتی ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہر اس نے رخصت دی ہے جس نے آپ سے سفید لباس کے بارے کچھ محفوظ کیا ہے۔
قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے: امام شافعی کا موقف یہ ہے کہ ہر وہ رنگ جو باعث زینت ہو سوگ منانے والی عورت اسے
مس نہ کرے گی، چاہے وہ باریک ہو یا موٹا ہو۔ اسی طرح قاضی عبدالوہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے: رنگوں میں سے ہر وہ جس کے
ساتھ عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے زیب و زینت اور حسن کا اظہار کرتی ہیں سوگ منانے والی عورت کو چاہئے کہ وہ اس سے
باز رہے۔

اور ہمارے بعض متاخرین مشائخ نے ایسا عمدہ سفید لباس پہننے سے بھی منع کیا ہے جس سے زیب و زینت کی جاسکتی ہے اور
اسی طرح اعلیٰ قسم کا سیاہ لباس (پہننے سے بھی منع کیا ہے)۔

ابن المواز نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ زیور نہیں پہن سکتی اگرچہ وہ لوہے کا بنا ہوا ہو، فی الجملہ ہر وہ شے جسے
ایک عورت اس طور پر پہنتی ہے کہ اسے حسن و خوبصورتی کے اظہار کے لئے بطور زیور استعمال کیا جاتا ہو سوگ منانے والی
عورت اسے نہیں پہن سکتی۔

اور ہمارے اصحاب نے جو اہرات، یواقیت اور زمرد پر کوئی نص بیان نہیں کی حالانکہ وہ بھی زیور کے معنی میں داخل
ہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 16۔ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد کے واجب ہونے پر سوائے حسن کے تمام لوگوں
نے اجماع کیا ہے حسن نے کہا ہے: احداد واجب نہیں۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے عبداللہ بن شداد
بن الہداد نے اسماء بنت عمیس سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ”تین دن تک سوگ کا لباس پہن لے پھر جو چاہے وہ کر (1)۔“

ابن منذر نے کہا ہے: تمام اہل علم میں سے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ احداد کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: وہ عورت
جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور وہ جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ دونوں سرمہ لگا سکتی ہیں، خضاب لگا سکتی ہیں اور جو چاہیں وہ کر سکتی
ہیں۔ حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے احداد ثابت ہے اور جس کے پاس بھی یہ احادیث پہنچی ہیں اس نے اسے تسلیم
کیا ہے۔ شاید حسن بصری تک یہ احادیث نہیں پہنچیں یا پہنچی تو ہیں لیکن آپ نے اسماء بنت عمیس کی حدیث کے سبب ان کی
تاویل کر لی ہے کہ اس نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر سوگ کا اظہار کرنے کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی
اور یہ ان کی بیوی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تین دن کی اجازت عطا فرمائی اور پھر تین دن گزرنے کے بعد اس کی طرف پیغام
بھیجا کہ وہ طہارت کا اہتمام کرے اور سرمہ لگا لے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے کئی وجوہ سے اس کا رد کیا ہے اور امام احمد
بن حنبل رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث شاذ ہے، اس کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اسحاق نے بھی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ طلاق والی عورت پر احوال نہیں ہے، چاہے طلاق رجعی ہو یا بائن، ایک ہو یا اس سے زیادہ۔ یہی قول ربیعہ اور عطا کا ہے۔

اور علمائے کوفہ، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن بن حی، ابو ثور اور ابو عبیدہ رحمہم نے کہا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اس پر احوال ہے اور یہی حضرت سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، ابن سیرین اور حکم بن عیینہ کا قول ہے۔

حکم نے کہا ہے کہ احوال متوفی عنہا زوجہا کی نسبت اس پر زیادہ مؤکد اور شدید ہے اور معنی کے اعتبار سے دونوں عدت میں ہیں جس کے ساتھ نسب کی حفاظت کی جاتی ہے۔

امام شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم نے کہا ہے: احتیاط اسی میں ہے کہ مطلقہ عورت کو زینت سے بچنا چاہئے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ تین دنوں سے زیادہ کسی میت پر سوگ کا اظہار کرے مگر خاوند پر چار مہینے اور دس دن (1) (سوگ منائے)۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور طلاق دینے والا زندہ ہو اس پر احوال نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایسی طلاق دی جس میں وہ رجوع کا مالک ہو پھر وہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے فوراً ہو جائے تو عورت پر عدت وفات ہوگی اور وہ اس کی وارث بھی ہوگی۔ اور وہ عورت جسے حالت مرض میں تین طلاقیں دی جائیں اس کی عدت میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ عدت طلاق گزارے گی (2)۔ یہ قول امام مالک، امام شافعی، یعقوب، ابو عبیدہ اور ابو ثور رحمہم کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہی ہم کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت حیض قرار دی ہے اور اس پر اجماع ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں دی جائیں اگر وہ فوت ہو جائے تو طلاق دینے والا اس کا وارث نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ اس کی بیوی نہیں رہی اور جب وہ اس کی بیوی نہیں تو پھر وہ اس کا خاوند بھی نہیں ہوگا۔

اور ثوری نے کہا ہے: دو عدتوں میں سے جو زیادہ ہوگی اس کے مطابق عدت گزارے گی اور نعمان و محمد نے کہا ہے: اس پر چار مہینے اور دس دن عدت ہوگی اور اس میں تین حیض مکمل کرے گی۔

مسئلہ نمبر 19۔ علماء کا ایسی عورت کے بارے اختلاف ہے جسے اپنے خاوند کے فوت ہونے یا اس کی طرف سے طلاق کی خبر پہنچی۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: طلاق اور وفات کی صورت میں عدت اس دن سے ہوگی جس دن وہ مرتا ہے یا طلاق دیتا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی حضرت مسروق، عطا اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور یہی امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو عبیدہ، ثوری، ابو ثور، اصحاب الرائے اور ابن منذر کا موقف ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم
2۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الطلاق، جلد 6، صفحہ 35، السعادة بجوار محافظہ مصر

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچی۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت حسن بصری، قتادہ، عطا خراسانی اور جلاس بن عمرو رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اگر بینہ قائم ہو جائے تو اس کی عدت یوم وفات یا یوم طلاق سے ہوگی اور اگر بینہ قائم نہ ہو تو اس دن سے جس دن اس کے پاس خبر پہنچی گی۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عدت کو وفات یا طلاق کے ساتھ معلق کیا ہے اور اس لئے بھی کہ اگر وہ اس کی موت کے بارے جان لے اور احدا چھوڑ دے تو عدت گزر جاتی ہے اور جب اس نے علم نہ ہونے کے سبب احدا چھوڑ دیا تو یہ اور زیادہ آسان ہے کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ صغیرہ کی عدت گزر جاتی ہے اور اس پر احدا نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر وہ حاملہ ہو اور وہ خاوند کی طلاق یا اس کی وفات کا علم نہ رکھتی ہو پھر وہ اپنا حمل وضع کر لے تو بلاشبہ اس کی عدت گزر گئی اور اس مسئلہ اور مختلف فیہا مسئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور ان کی دلیل جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کی عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچی گی یہ ہے کہ زیب وزینت ترک کرنے کے سبب عدت عبادت ہے اور وہ قصد اور نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اور قصد نہیں ہو سکتا مگر علم کے بعد۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 20۔ آزاد، لونڈی، صغیرہ، کبیرہ، وہ عورت جو حیض کی عمر کو نہ پہنچے، وہ جو حائضہ ہو اور حیض سے ناامید ہو جائے اور کتابیہ عورت اس کے ساتھ دخول ہوا یا نہیں جبکہ وہ غیر حاملہ ہو ان تمام پر عدت وفات لازم ہوتی ہے اور سوائے لونڈی کے ان تمام کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ کیونکہ اس ارشاد میں آیت عام ہے: **يَتَوَبَّضْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا** اور وہ لونڈی جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت دو مہینے اور پانچ راتیں ہیں۔

ابن عربی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس کی عدت بالا جماع آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے مگر وہ جو اصم سے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے آزاد اور لونڈی کو اس میں برابر قرار دیا ہے، حالانکہ اجماع اس سے پہلے ہے لیکن اپنے بہرے پن کے سبب (1) اس نے سنا نہیں۔

الباجی نے کہا ہے: اس بارے میں ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے سوائے اس کے جو ابن سیرین سے مروی ہے اور وہ ان سے ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے کہا ہے: لونڈی کی عدت آزاد عورت کی عدت کی مثل ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اصم کا قول من حیث النظر صحیح ہے کیونکہ وہ آیات جو مہینوں اور حیضوں کے ساتھ وفات اور طلاق کی عدت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ لونڈی اور آزاد کے حق میں عام ہیں۔ پس اس نقطہ نظر سے آزاد اور لونڈی کی عدت برابر ہے۔ کیونکہ عموماً میں آزاد اور لونڈی کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور جس طرح نکاح میں لونڈی اور آزاد برابر ہیں اسی طرح وہ عدت میں بھی اس کے ساتھ برابر ہوگی۔ واللہ اعلم

ابن عربی نے کہا ہے: امام مالک سے روایت ہے کہ کتابیہ عورت تین حیضوں کے ساتھ عدت گزارے گی تب اس سے

براءت رحم ہوگی اور یہ آپ سے انتہائی فاسد قول منقول ہے، کیونکہ اس قول نے اسے (کتابیہ کو) آیت وفات کے عموم سے خارج کر دیا ہے حالانکہ وہ اس میں شامل ہے اور اس نے اسے آیت طلاق کے عموم میں داخل کر دیا ہے حالانکہ یہ اس میں سے نہیں ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی پر اس کی بنا ہے جو مدونہ میں ہے اس پر عدت نہیں اگر وہ غیر مدخول بہا ہو کیونکہ اس کی براءت رحم معلوم ہے اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ خاوند کے فوت ہونے کے بعد کسی مسلمان یا غیر مسلم سے شادی کر سکتی ہے کیونکہ جب اس پر عدت وفات نہیں ہے اور نہ ہی دخول کے سبب استبراء رحم لازم ہے تو پھر وہ ازواج کے لئے حلال ہے۔

مسئلہ نمبر 21۔ اور علماء نے ام ولد کی عدت کے بارے اختلاف کیا ہے جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔

پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ یہی تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ ان میں سے حضرت سعید بن مسیب، حضرت زہری، حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم اور کئی اور بھی ہیں اور یہی امام اوزاعی اور اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

اور ابو داؤد اور دارقطنی نے قبیسہ بن ذؤیب سے اور انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم پر ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مشتبہ نہ بناؤ کہ متوفی عنہا زوجہا کی عدت چار مہینے دس دن ہے یعنی ام ولد کے حق میں۔ یہ لفظ ابو داؤد کے ہیں اور دارقطنی نے کہا ہے: یہ موقوف ہے۔ اور یہی درست ہے اور یہ مرسل ہے کیونکہ قبیسہ نے عمرو سے سماع نہیں کیا (2)۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور ابو عبید نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور حضرت غلی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی عدت تین حیض ہے اور یہی قول حضرت عطاء، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور اصحاب الرائے رحمہ اللہ علیہم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ عدت آزادی کی حالت میں واجب ہو رہی ہے لہذا یہ واجب ہے کہ عدت کامل ہو اور اس کی اصل آزاد عورت کی عدت ہے۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور نے کہا ہے: اس کی عدت ایک حیض ہے (3) اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

اور طاؤس سے روایت ہے کہ اس کی عدت اس آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے اور اسی طرح حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ وہ سب سے قلیل مدت ہے جو کچھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 211، دار الفکر

2۔ سنن دارقطنی، باب المہر، جلد 2، صفحہ 310، دار الحاسن قاہرہ۔ ایضاً سنن ابی داؤد، باب فی عدۃ ام الولد، حدیث نمبر 1964، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدة وطلاق النساء، جلد 5، صفحہ 120، السعادة بجوارحی افطہ مصر

اس کے بارے میں کہا گیا ہے اور اس میں کوئی سنت نہیں ہے جس کی اتباع کی جائے اور نہ ہی کوئی اجماع ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔ آزادی کی حالت میں اس کی عدت میں ان کے اختلاف کا ذکر حالت وفات میں اختلاف کی طرح برابر برابر ہے۔ مگر امام اوزاعی نے کہا ہے کہ آزادی کی حالت میں اس کی عدت تین حیض ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے اصح قول امام مالک کا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا ہے: **وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ بِأَنفُسِهِمْ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ**۔ پس حیضوں کے انتظار میں یہ شرط ہے کہ وہ طلاق کے سبب ہو۔ پس اس کے ساتھ کسی غیر سبب سے ہونے کی نفی ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَالَّذِينَ يَتَوَقَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ** اَرْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَعَشْرًا۔ پس اس کے وجوب کو اس کے ساتھ معلق کیا ہے کہ انتظار کرنے والی بیوی ہو۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ لونڈی اس کے خلاف ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ بے شک یہ ملک یمین کے سبب موطوءہ لونڈی ہے پس اس کا استبراء رحم ایک حیض سے ہے۔ لونڈی میں اصل یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو کیا ام ولد کی عدت محض استبراء ہے یا عدت ہے؟ پس اس کے بارے ابو محمد نے اپنی معونت میں ذکر کیا ہے کہ ایک حیض استبراء ہے اور عدت نہیں ہے۔ اور المدونہ میں ہے کہ ام ولد پر عدت ہے اور اس کی عدت ایک حیض ہے جس طرح کہ آزاد عورت کی عدت تین حیض ہیں۔ اور اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم نے کہا: یہ عدت ہے تو امام مالک نے فرمایا: میں یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی سے وعدہ کرے جو اس سے نکاح کر لے گا مگر یہ کہ ایک حیض گزر جائے (1)۔

ابن القاسم نے کہا ہے: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے کہا کہ وہ اپنے گھر میں ہی رات گزارے گی اور آپ نے اس کی مدت استبراء کے لئے عدت کا حکم ثابت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہوں یا ایسی مطلقہ جس پر خاوند کو رجوع کا حق ہو در آنحالیکہ وہ حاملہ ہو اس کا خرچہ خاوند پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِنْ كُنَّ أُولَاتٍ حَمْطًا فَلْيُفْقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 6)** (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ بچہ جنمیں۔)

اور حاملہ متولیٰ عنہا زوجہا کے نفقہ کے واجب ہونے کے بارے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرات جابر بن عبد اللہ، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب، حضرت عطاء، حضرت حسن، حضرت عکرمہ، عبد الملک بن یعلیٰ، یحییٰ انصاری، ربیعہ، مالک، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے کہا ہے اور ابو عبید نے اصحاب الرائے سے اسے بیان کیا ہے۔ اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے کل مال سے نفقہ ہوگا اور یہ قول حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، شریح، ابن سیرین، شعبی، ابو العالیہ، نخعی، جلاس بن عمرو، حماد بن ابی سلیمان، ایوب سختیانی، سفیان ثوری اور ابو عبید رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: میں پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں، کیونکہ انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ہر اس آدمی کا نفقہ جس کے نفقہ پر اسے زندگی میں مجبور کیا جاسکتا ہے مثلاً اس کے بچے، بیوی اور اس کے والدین وہ نفقہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو اسی طرح اس کی ازواج میں سے حاملہ کا نفقہ بھی اس سے ساقط ہو جائے گا۔

اور قاضی ابو محمد نے کہا ہے: کیونکہ حمل کا نفقہ دین ثابت نہیں ہے کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کے مال سے متعلق ہو جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تنگدستی کے سبب اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو موت کے سبب اس کا ساقط ہونا زیادہ اولیٰ اور زیادہ مناسب ہے۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَعَشْرًا۔ علماء نے ان چار ماہ اور دس دن میں اختلاف کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے متوفیٰ عنہا زوجہا کی عدت کے لئے وقت مقرر فرمایا ہے کہ کیا ان میں سے وہ ایک بار حیض آنے کی محتاج ہوتی ہے یا نہیں؟ تو بعض نے کہا ہے: جب وہ عورت موطوءہ ہو تو اس کی براءت رحم نہ ہوگی مگر اس حیض کے ساتھ جو اسے چار مہینے اور دس دن کے دوران آئے گا ورنہ وہ مشکوک ہو جائے گی اور بعض دوسروں نے کہا ہے: اس پر چار ماہ اور دس دن سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ اپنے آپ کو واضح شک میں دیکھے۔ کیونکہ اس مدت میں حیض نہیں آتا یا ان میں سے ہو جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا یا اسے پہچان لیا جائے کہ اس کا حیض اسے نہیں آئے گا مگر اس مدت سے زیادہ اور اکثر مدت میں۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: وَعَشْرًا۔ کعب نے ابو جعفر الرازی سے، انہوں نے ربیع بن انس سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ چار مہینوں کے ساتھ دس دن کو کیوں ملایا گیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: کیونکہ اتنی مدت میں روح پھونکی جاتی ہے۔ عنقریب سورۃ الحج میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اصمعی نے کہا ہے: بے شک ہر حاملہ کا بچہ اس کے حمل کی نصف مدت میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ پس یہ بھی حرکت کرنے لگے گا (یعنی فہی مرکضتین ذکر کیا ہے) اور کسی اور نے کہا ہے: ارکضت فی مرکضة (اس نے حرکت دی پس یہ حرکت کرنے والی ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

د مرکضة صریح ابوہا تہان لها الغلامۃ والغلام

اس میں مرکضة اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور خطاب نے کہا ہے: قوله: وَعَشْرًا اس سے مراد راتوں سمیت دن ہیں۔ واللہ اعلم

اور مبرد نے کہا ہے: العشر مؤنث لایا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد مدت ہے۔ اس کا معنی ہے و عشر مدد ہر مدت ایک دن اور ایک رات کی ہے۔ پس رات اپنے دن کے ساتھ مل کر زمانے کی ایک مدت معلوم ہے اور کہا گیا ہے: عشرۃ نہیں فرمایا راتوں کے حکم کو غلبہ دیتے ہوئے کیونکہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے اور ایام ان کے ضمن میں ہوتے ہیں۔ وَعَشْرًا لفظ کے اعتبار سے زیادہ خفیف ہے (1)۔ پس راتوں کو دنوں پر غلبہ دیا جاتا ہے جب یہ تاریخ میں جمع ہو جائیں، کیونکہ مہینوں کی ابتدا

رات سے چاند طلوع ہونے کے وقت ہوتی ہے تو جب مہینے کی ابتدا اور پہلا حصہ رات ہے تو پھر رات کو ہی غلبہ دیا جائے گا۔ آپ کہتے ہیں: صننا خمساً من الشهر ہم نے مہینے سے پانچ روزے رکھے۔ پس راتیں غالب ہوتی ہیں اگرچہ روزہ دن کے وقت ہوتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور علمائے کوفہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد دن اور راتیں ہیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: پس اگر کسی عقد کرنے والے نے اس سے اس قول کی بنا پر نکاح کیا درآنحالیکہ چار مہینے اور دس راتیں گزر چکی تھیں تو وہ نکاح باطل ہوگا یہاں تک کہ دسواں دن بھی گزر جائے۔

اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جب اس کی مدت چار مہینے اور دس راتیں گزر گئی تو وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی اور وہ اس لئے کہ انہوں نے عدت کو مبہم دیکھا تو تانیث کو غلبہ دے دیا اور اسے راتوں پر محمول کر دیا۔ اور یہ موقف فقہاء میں سے امام اوزاعی اور متکلمین میں سے ابوبکر الاصم نے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اربعۃ اشھر وعشر لیل پڑھا ہے۔

قوله تعالى: فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٣٠﴾
اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے اجل (مدت) کی نسبت ان (عورتوں) کی طرف کی ہے کیونکہ وہ انہیں کے معاملے کی حد بیان کی گئی ہے اور اس سے مراد ہے عدت کا گزرنا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قوله تعالى: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے اور یہ اس حکم کے ساتھ متعلق ہے جو حکام اور اولیاء کے لئے ہے (1)۔ فِيمَا فَعَلْنَ اس سے مراد شادی کرنا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے ہوتا ہے (یعنی) بناؤ سنگھار کرنا اور اعداد کو ترک کرنا وغیرہ (2)۔ بِالْمَعْرُوفِ یعنی ایسے طریقے سے جس کی شریعت میں اجازت دی گئی ہے یعنی ازواج کو دیکھنے کا اختیار اور عقد ہونے سے پہلے مہر مقرر کرنا وغیرہ کیونکہ یہ اولیاء کا حق ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ اولیاء کو اختیار ہے کہ وہ انہیں عدت کے دوران شادی کے لئے بناؤ سنگھار کرنے اور آراستہ ہونے اور حسن و خوبصورتی کا اظہار کرنے سے منع کریں۔ اس میں اسحاق کے اس قول کا رد بھی ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض میں داخل ہو جائے تو وہ بائنا ہو جاتی ہے اور پہلے خاوند کے لئے رجعت کا حق منقطع ہو جاتا ہے مگر یہ کہ اس کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ غسل کر لے اور شریک سے روایت ہے کہ اس کے خاوند کے لئے رجعت کا حق رہتا ہے جب تک وہ غسل نہ کرے اگرچہ بیس سال بعد تک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ اور یہاں بلوغ الاجل سے مراد تیسرے حیض کے خون میں اس کے داخل ہونے کے ساتھ عدت کا گزرنا ہے اور اس میں غسل کا ذکر نہیں تو جب اس کی عدت گزر گئی وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی اور بناؤ سنگھار میں سے جو بھی وہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اگر وہ صحیح

ہے تو وہ استحباب پر محمول ہوگی۔ واللہ اعلم۔

(اشارہ اس حدیث کی طرف ہے: عن ابن عباس من أن البراءة إذا طعنت في الحيضة الثالثة بانت و انقطعت رجعة الزوج، وهذا قول اسحاق المتقدم وهو ضعيف) حاشیہ قرطبی

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنُتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ
عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا
مَعْرُوفًا وَلَا تَعْرُضُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٣٦﴾

”اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس بات میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو یا جو چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں، جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، البتہ نہ وعدہ لینا ان سے خفیہ طور پر بھی مگر یہ کہہو (ان سے) شریعت کے مطابق کوئی بات اور نہ پکی کر لو نکاح کی گرہ یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہا کو اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلیم والا ہے۔“

قوله تعالى: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنُتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا
اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قوله تعالى: وَلَا جُنَاحَ يَعْنِي كَوْنِيْ غَنَاهُ نَيْسَ، جُنَاحَ كَامَعْنِيْ غَنَاهُ هُ، يَهِيْ مَعْنِيْ شَرِيْعَتِ مِيْ صَحْ هُ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شاق گزرنے والا امر ہے۔ لغت کے اعتبار سے یہ معنی اصح ہے۔ شاخ نے کہا ہے:

اِذَا تَعَلَّوْا بَرَاكِهَآ خَلِيْجَا تَذَكَّرْ مَا لَدِيْهِ مِنْ الْجَنَاحِ

اس میں الجناح سے مراد مشقت آمیز امر ہے۔

اور قوله تعالى: عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ اس میں خطاب تمام لوگوں کو کیا گیا ہے: اور حکماً اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے دل میں معتدہ کے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتا ہو (1)۔ یعنی عدۃ وفات میں اشارۃ پیغام نکاح دینے میں تم پر کوئی بوجھ اور گناہ نہیں۔ تعریض تصریح کی ضد ہے۔ اس سے مراد افهام المعنی بالشئ المحتمل له ولغیرہ ہے یعنی کسی معنی کو ایسی شے کے ساتھ سمجھا دینا جو اس معنی اور دوسرے کا احتمال رکھتی ہو اور یہ عرض الشئ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کسی شے کی جانب اور طرف ہے۔ گویا وہ اس طرح مطلوبہ شے کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ میرے اس قول سے ہے عر ضت الرجل یعنی میں نے آدمی کو بطور تحفہ ہدیہ پیش کیا اور حدیث طیبہ میں ہے: ان رکبا من المسلمین عرضوا رسول اللہ ﷺ و ابا بکر ثیا بایضا۔ اسی اھدوا لھما۔ کہ مسلمان شہسواروں نے رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کو سفید کپڑے بطور تحفہ پیش کیے۔ اور کلام کے ساتھ تعریض کرنے والا وہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھی تک بات اس طرح پہنچاتا ہے کہ وہ اس کا معنی و مفہوم سمجھ جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع امت ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جو اس کے نکاح کے بارے میں صریح نص ہو اور اس پر متنبہ کرنے والی ہو وہ جائز نہیں ہے اور اسی طرح اس پر بھی امت کا اجماع ہے کہ اس کے ساتھ ایسی کلام کرنا جو فحش ہو اور جماع کا ذکر کرنا یا ایسی گفتگو جو جماع پر ابھارتی ہو یہ بھی جائز نہیں ہے اور اسی طرح جو کلام بھی اس معنی و مفہوم کے مشابہ ہو گا وہ جائز نہیں اور اس کے سوا جو گفتگو ہے اسے جائز قرار دیا گیا ہے اور تصریح کے جو قریب تر کلام ہے وہ حضور نبی رحمت ﷺ کا وہ قول ہے جو آپ نے فاطمہ بنت قیس کے ساتھ کیا: کونی عند ام شریک ولا تسبقینی بنفسک (1) (تو ام شریک کے پاس رہ اور اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ لے جا) اور وہ عورت جو طلاق رجعی کی عدت گزار رہی ہو بالا جماع اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ زوجہ کی طرح ہے اور رہی وہ عورت جو طلاق بائن کی عدت میں ہو تو صحیح قول یہی ہے کہ اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

تعریض کی تفسیر میں بہت سے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔ ان کا مجموعہ دو قسموں کی طرف لوٹتا ہے:

پہلی قسم یہ ہے کہ وہ اس کا ذکر اس کے ولی سے کرے اور اسے اس طرح کہے لا تسبقینی بہلا تو اس کے بارے میں مجھ سے (کسی اور کی طرف) آگے نہ بڑھنا۔) اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے اس کی طرف اس سے اشارہ کرے۔ اور اسے اس طرح کہے: بلاشبہ میں شادی کا ارادہ رکھتا ہوں یا تو بڑی خوبصورت ہے یا بلاشبہ تو صالحہ اور نیک ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ تجھے خیر و برکت عطا فرمانے والا ہے۔ میں تجھ سے رغبت رکھتا ہوں، کون ہے جو تجھ سے اعراض کر سکتا ہے، بے شک تجھ میں رغبت بہت زیادہ ہے، بلاشبہ مجھے کسی عورت کی حاجت و ضرورت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی امر مقدر فرمائے گا تو وہ ہو جائے گا۔ یہ تمام امام مالک اور ابن شہاب کی بیان کردہ تمثیلات ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: ”تو اپنے بارے میں مجھ سے تجاوز نہ کرنا (2)“۔ اور کوئی حرج نہیں کہ وہ اسے کوئی ہدیہ اور تحفہ دے اور یہ کہ عدت کے دوران اس کا کام کاج کر دے جبکہ وہ اس کی شان کے مطابق ہو۔ ابراہیم نے یہی کہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنی مدح اور تعریف کرے اور وہ اپنے پسندیدہ افعال اور خاندانی شرافت کا ذکر کرے جس میں اشارۃ شادی کا تذکرہ بھی ہو۔

ابو جعفر محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے اسی طرح کہا ہے۔ سکینہ بنت حنظلہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن علی رضی اللہ عنہما میرے پاس اجازت لے کر آئے اور میرے خاوند کے فوت ہونے کے وقت سے ابھی میری عدت نہیں گزری تھی اور انہوں نے کہا: تو

جانتی ہے رسول اللہ ﷺ سے میری قرابت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے میری قرابت ہے اور عرب میں میرے مقام و مرتبہ کو بھی تو جانتی ہے۔ میں نے کہا: اے ابو جعفر! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے، بلاشبہ تم ایسے آدمی ہو جس سے مؤاخذہ کیا جائے گا، تم مجھے میری عدت کے دوران پیغام نکاح دے رہے ہو۔ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ میں نے تو تجھے رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی قرابت کے بارے بتایا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ ام سلمہ کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیوہ ہو چکی تھیں اور ارشاد فرمایا: ”یقیناً تو جانتی ہے میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس کا پسندیدہ ہوں اور میری قوم میں میرے مقام سے بھی تو آگاہ ہے۔“ یہی پیغام نکاح تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے (1) اور معتدہ کے پاس ہدیہ بھیجنا بھی جائز ہے اور یہ بھی تعریض میں سے ہے۔ سخون اور بہت سے علماء نے یہی کہا ہے اور ابراہیم نے بھی اسی طرح کہا ہے اور حضرت مجاہدؒ نے یہ ناپسند کیا ہے کہ کوئی اسے یہ کہے: ”تو اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ کرنا اور وہ اسے ہی خفیہ معاہدہ جان لے (2)۔“

قاضی ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک حضور نبی مکرم ﷺ کے اس ارشاد کی تاویل کی بنا پر جائز ہے جو آپ نے فاطمہ کو فرمایا تھا کہ یہ اس کے لئے اس آدمی کے بارے میں رائے کے طور پر ہے جو اس سے شادی کرے گا نہ کہ اس طور پر کہ اس سے اس نے اپنی ذات کا ارادہ کیا ہو، کیونکہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے خلاف ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ الْخُطْبَةُ خَاءُ کے کسرہ کے ساتھ، اس کا معنی ہے کلام اور قصد سے پیغام نکاح دینا اور فعل یا قول سے لطف اندوز ہونا۔ کہا جاتا ہے: خطبھا یخطبھا خطبا و خطبة (پیغام نکاح دینا) اور رجل خطاب کثرت سے پیغام نکاح دینے والا آدمی۔ اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے

بَرَّعَ بِالْعَيْنَيْنِ خُطَابَ الْكُثْبِ يَقُولُ اِنِ خَاطِبٌ وَقَدْ كَذَبَ
وَاِنَّمَا يَخْطُبُ عُسًا مِّنْ حَلَبَ (4)

اور الخطیب اس کا معنی ہے الخاطب پیغام نکاح دینے والا۔ اور الخطیبی کا معنی الخطبة (مگنی) ہے۔

عدی بن زید نے کہا ہے، وہ جذیمہ الابرش کی طرف سے الزباء کی مگنی کے ارادہ کا ذکر کرتا ہے:

لِخَطِيئِىَ اَلَّتِى غَدَرْتُ وَ خَانَتْ وَ هُنَّ ذَوَاتُ غَائِلَةٍ لِّحَيْنَا

اور الخطب سے مراد وہ آدمی ہے جو عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے: ہى خطبه و خطبته التى یخطبها۔ یہ فلاں کی طرف منسوب ہے اور اس کی مگنی تر وہ ہے جسے وہ پیغام بھیجتا ہے۔ اور الخطبة فعلۃ کے وزن پر ہے جیسے جلسۃ اور قعدۃ۔ اور الخطبة خاء کے ضمہ کے ساتھ اس سے مراد وہ کلام ہے جو نکاح وغیرہ میں کہا جاتا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: خطبہ وہ ہے جو اس کے اول اور آخر میں ہو۔ اور اسی طرح وہ جو فعلۃ کے وزن پر ہو جیسے الاكلة

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

4۔ ایضاً

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 224، دار الحاسن قاہرہ

3۔ ایضاً

(خارش) اور الضَّغْطَةُ (تنگی، ایک دفعہ کا بھینچنا) ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **أَوْ أَكُنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ** اس کا معنی ہے اس کی عدت گزرنے کے بعد اس سے شادی کرنے کے بارے جو تم پوشیدہ رکھے ہوئے ہو اور چھپائے ہوئے ہو۔ الاکنان کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا اور مخفی رکھنا۔

کہا جاتا ہے: کننتہ و اکننتہ دونوں کا معنی ایک ہے یعنی میں نے اسے چھپائے رکھا۔

اور کہا گیا ہے: کننتہ یعنی میں نے اسے محفوظ رکھا، یہاں تک کہ اسے کوئی آفت نہ آ پہنچی، اگرچہ وہ مستور اور چھپا ہوا نہ بھی ہو۔ اور اسی سے بَيِّضُ مکنون اور دُرُ مکنون ہے (یعنی چھپایا ہوا انڈا اور موتی) اور اکننتہ کا معنی ہے میں نے اسے مخفی رکھا اور میں نے اسے ڈھانپ لیا۔

اور کہا جاتا ہے: کُنْتُ الشَّيْءَ (من الأجرا) جب تو اسے چھپالے کپڑے سے، یا گھر سے یا زمین وغیرہ سے اور اکننتہ الأمر فی نفسی: میں نے کام کو اپنے دل میں چھپائے رکھا۔ اور عربوں سے یہ جملہ نہیں سنا گیا۔

کننتہ فی نفسی اور کہا جاتا ہے: أَكُنْتُ الْبَيْتَ الْإِنْسَانِ گھر نے انسان کو چھپا لیا وغیرہ۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس سے گناہ کو اٹھا دیا ہے جس نے اخفا اور تعریض کے ساتھ معتدہ سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ایسا وعدہ لینے سے منع فرمایا ہے جو شادی کے بارے صریح ہو اور اس پر اس کی بناء ہو اور وعدے پر اتفاق ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور جاننے کی رخصت دی ہے، نفوس کے غلبہ اور ان کے مغرور ہونے کے سبب اور انسان کے اس کی ملکیت سے کمزور اور ضعیف ہونے کے سبب۔

مسئلہ نمبر 5۔ شوافع نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ تعریض میں حد واجب نہیں ہوگی۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے تعریضاً پیغام نکاح دینے میں گناہ کو اٹھا لیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ قذف کے بارے تعریض کرنا حد کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نکاح میں تعریض کو تصریح کے مقام پر نہیں رکھا۔ ہم نے کہا ہے: یہ (قول) ساقط (الاعتبار) ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے پیغام نکاح میں نکاح کے بارے تصریح کی اجازت نہیں دی۔ اور اس نے ایسی تعریض کی اجازت عطا فرما رکھی ہے جس سے نکاح کو سمجھا جاسکتا ہو۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ تعریض سے قذف سمجھی جائے گی اور عزتوں کی حفاظت کرنا واجب ہوتا ہے اور یہ تعریض کرنے والے پر حد کو ثابت کر دے گا تا کہ فاسق لوگوں کو ایسی تعریض کے ذریعہ عزتوں کو ہاتھ میں لینے کا راستہ نہ مل جائے جس سے وہی سمجھا جاتا ہو جو تصریح سے سمجھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: **عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ**۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، چاہے وہ چھپا ہوا ہو تمہارے دلوں میں یا اعلانیہ ہو تمہاری زبانوں کے ساتھ۔ سو اللہ تعالیٰ نے تعریض کی رخصت دی ہے تصریح نہیں کی۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم انہیں پیغام نکاح دو گے (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: **وَلَكِنْ لَا تَوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا** یعنی تم ان سے خفیہ طور پر معاہدہ نہ کرو۔ اس میں

سِترًا سے پہلے حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ فعل ان میں سے ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور سِترًا کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے: بعض نے کہا ہے اس کا معنی نکاح ہے یعنی کوئی آدمی اس معتدہ کو یہ نہ کہے ”تو مجھ سے شادی کر لے“ بلکہ تعریض کرے اگر ارادہ ہو۔ اور اس سے خفیہ یہ عہد و پیمان نہ لے کہ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جبیر، مالک اور آپ کے اصحاب، شعبی، مجاہد، عکرمہ، سدی اور جمہور اہل علم رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اس تاویل پر سِترًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے بمعنی مستسہین۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الستر سے مراد زنا ہے۔ یعنی تم میں سے کوئی عدت کے دوران زنا اور پھر عدت کے بعد نکاح کا وعدہ نہ لے۔ اس کا یہ معنی جابر ابن زید، ابو مجلز، لاحق بن حمید، حسن بن ابی الحسن، قتادہ، نخعی اور ضحاک رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں الستر بمعنی زنا ہے، یعنی تم ان سے زنا کا وعدہ نہ لو (2) اور اسے طبری نے اختیار کیا ہے اور اس معنی میں ائشی کا قول ہے:

فلا تقربین جَارَةً اِنْ سَتَرَهَا عَلَيْكَ حَرَامٌ فَاَنْتَكُنْ اَوْ تَاْبِدَا
تو کسی پڑوسن کے قریب نہ جا بلاشبہ اس کے ساتھ زنا کرنا تجھ پر حرام ہے پس تو اس سے نکاح کر لے ورنہ تو وحشی ہو جائے گا۔
اور خطیب نے کہا ہے:

و يحرم ستر جارتهم عليهم و ياكل جازهم انف القصاص (3)

اور ان پر اپنی پڑوسن کے ساتھ زنا کرنا حرام ہے ورنہ ان کا پڑوسی سارے پیالے کو کھا جائے گا۔
اور یہ بھی قول ہے کہ الستر کا معنی جماع ہے۔ یعنی تم انہیں نکاح کی ترغیب دینے کے لئے اپنے آپ کو کثرت جماع سے متصف نہ کرو، کیونکہ بیوی کے سوا کسی اور کے ساتھ جماع کا کرنا فحش ہوتا ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور امرؤ القیس نے کہا ہے:

آلا زعمت بسباسة اليوم اننى كبرئت وَاَلا يُحْسِنُ السِّرَ امْثَالِي
اور رو بہ نے کہا ہے:

فكفت عن اسرارها بعد العسق
یعنی اس کے لئے اپنے کو لازم کر لینے کے بعد اس کے جماع سے رک جا۔ اور کبھی السر کا معنی عقد نکاح ہوتا ہے، چاہے وہ سرا ہو یا جہر ہو۔

ائشی نے کہا ہے:

فلن يطلبوا سترها للغنى ولن يسلموها لازها دها

مراد یہ ہے کہ وہ ہرگز اس کے مال کی کثرت کے پیش نظر اس کے نکاح کا مطالبہ نہ کریں اور نہ وہ اسے مال کم ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

اور ابن زید نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَلَٰكِنْ لَّا تُؤَاوِدُوهُنَّ سِرًّا كَمَا مَعْنَى یہ ہے کہ تم ان سے نکاح نہ کرو اور پھر تم اسے چھپاتے پھرو۔ بلکہ جب وہ حلال ہو جائے تو تم اسے ظاہر کرو اور ان سے دخول کرو (1)۔ اور یہی پہلے قول کا معنی ہے۔ پس اس بنا پر ابن زید پہلے قول کے ہی قائل ہیں۔ اور بلاشبہ انہوں نے شاذ قرار دیا ہے کہ عقد کو موعده کا نام دیا جائے اور یہ پریشانی اور اضطراب ہے (2)۔ مکی اور ثعلبی نے ان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہے: وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (3)

مسئلہ نمبر 8۔ قاضی ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: امت کا اس پر اجماع ہے کہ کسی عورت کے لئے اپنے بارے میں عدت کے دوران نکاح کا وعدہ کرنا اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کے بارے میں اور آقا کے لئے اپنی لونڈی کے بارے میں وعدہ کرنا مکروہ ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ ولی جو جبر کرنے کا مالک نہیں ہوتا تو میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں اور اگر وہ نکاح کر دے تو میں اسے فسخ نہیں کرتا۔

امام مالک نے ایسے آدمی کے بارے میں جو عدت میں وعدہ کرتا ہے اور پھر عدت کے بعد شادی کرتا ہے کہا ہے: میرے نزدیک اس کی تفریق زیادہ پسندیدہ ہے چاہے اس سے دخول کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ تفریق ایک طلاق ہوگی اور جب وہ حلال ہو جائے تو پھر وہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دے سکے گا۔ یہ ابن وہب کی روایت ہے (4) اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان کے درمیان وجوباً تفریق کر دی جائے گی۔ ابن القاسم نے یہی کہا ہے اور ابن الحارث نے ابن ماجشون سے اسی طرح بیان کیا ہے اور کچھ زائد کیا ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ یہ تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی (5)۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: اگر اس نے دعوت نکاح صراحۃً دی اور عورت نے بھی صراحۃً اس کا جواب دیا اور عقد نکاح نہ ہوا یہاں تک کہ عدت گزر گئی تو نکاح ثابت ہوگا اور دونوں کے لئے تصریح مکروہ ہوگی۔ کیونکہ نکاح منگنی کے بعد واقع ہوا ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا یہ استثناء منقطع ہے اور الا بمعنی لکن ہے (6)۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے إِلَّا خَطَاً بمعنی لکن خطاً۔ اور قول معروف سے مراد ایسی تعریض ہے جو شرعاً مباح ہو اور ضحاک نے ذکر کیا ہے کہ قول معروف میں سے یہ ہے کہ وہ معتدہ کو کہے: تو میرے لئے اپنے آپ کو محبوس کر لے کیونکہ مجھے تیرے ساتھ رغبت ہے اور وہ کہتی ہے: میں بھی اسی طرح ہوں (7) تو یہ ایک دوسرے سے وعدہ کرنے کے مشابہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ
اس میں نو مسائل ہیں:

4۔ ایضاً

3۔ ایضاً

2۔ ایضاً

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 316، دار الکتب العلمیہ

7۔ ایضاً

6۔ ایضاً

5۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزَمُوا عَزْمَ کے معنی میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ کہا جاتا ہے: عزم الشيء وعزم عليه (اس نے شے کا ارادہ کیا اور اس پر پختہ ہو گیا) اور یہاں معنی ہے: وَلَا تَعْزَمُوا على عقد النكاح (اور تم نکاح کی گرہ پر پختہ نہ ہو جاؤ) اور یہ ایک واضح امر ہے کہ قرآن کریم سب سے فصیح کلام ہے۔ پس جو اس میں وارد ہوا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی صحت و فصاحت میں کوئی شک کیا جاسکتا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (البقرہ: 227) (اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں) اور یہاں فرمایا: وَلَا تَعْزَمُوا عَقْدَ النِّكَاحِ تو اس کا معنی ہے لَا تَعْزَمُوا على عقد النكاح في زمان العدة (تم عدت کے دوران نکاح کی گرہ پختہ نہ کر لو۔) پھر اس سے على کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

سیبویہ نے کہا ہے: ضَرْبُ فُلَانٍ الظَّهْرَ وَالْبَطْنَ یعنی على الظهر والبطن (فلاں کو پیٹھ اور پیٹ پر مارا گیا) سیبویہ نے کہا ہے: ان اشیاء میں حذف پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

نکاح نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ وَلَا تَعْقِدُوا عَقْدَ النِّكَاحِ ہو کیونکہ تَعْزَمُوا اور تَعْقِدُوا کا معنی ایک ہے (اور تم نکاح کی گرہ کو پختہ نہ باندھ لو) اور کہا جاتا ہے: تَعْزَمُوا یعنی زَا کے ضمہ کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ اس سے مراد عدت کا مکمل ہونا ہے اور الكتاب سے یہاں مراد وہ حد ہے جو مقرر کی گئی اور مدت میں سے وہ مقدار ہے جسے بیان کر دیا گیا، لکھ دیا گیا اور اس کا نام کتاب رکھا ہے کیونکہ کتاب اللہ نے اس حد کو بیان کیا ہے اور اسے مقرر کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: کتاب اللہ علیکم۔

اور اسی طرح فرمایا: إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا (النساء) (بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقررہ وقت پر) پس الكتاب کا معنی الفرض (مقرر کرنا) ہے۔ یعنی یہاں تک کہ مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ (حتیٰ یبلغ الفرض أجله)

کتب علیکم الصیام یعنی تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے حتیٰ یبلغ فرض الكتاب یعنی کتاب کی مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ اس تاویل کی بنا پر الكتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور پہلی تاویل پر اس میں کوئی حذف نہیں ہے، سو وہی اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ نے عدت کے دوران عقد نکاح کو حرام قرار دیا ہے اپنے اس ارشاد کے ساتھ: وَلَا تَعْزَمُوا عَقْدَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ یہ محکم ہے، اس کی تاویل پر اجماع ہے کہ بلوغ اجلہ سے مراد انقضاء العدة (عدت کا گزرتا) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ عدت میں تعریض کو مباح قرار دیا ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَزَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ الْآیہ۔

اور علماء نے اس کی اباحت میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے، البتہ انہوں نے تعریض کے الفاظ میں اختلاف کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر

چکا ہے۔ اور انہوں نے اس آدمی کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے جو کسی عورت کو اس کی عدت میں پیغام نکاح دیتا ہے درآنحالیکہ وہ جاہل ہو یا وہ اس سے وعدہ لیتا ہے اور عدت کے بعد عقد نکاح کرتا ہے اور اس سے پہلی آیت میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔ اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ اگر کسی نے عدت میں نکاح کی گرہ پختہ کر لی اور اس پر اطلاع پالی گئی اور حاکم نے اس کا نکاح فسخ کر دیا اور وہ دخول سے پہلے ہوا تو وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ ایسے ہمیشہ کے لئے حرام قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ بھی نکاح میں دلچسپی رکھنے والے دیگر لوگوں کے ساتھ نکاح کا ایک خواہشمند ہو سکتا ہے (اور پیغام نکاح بھیج سکتا ہے) امام مالک نے یہی کہا ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں اس باب کے آخر میں بیان کیا ہے جس کے پیچھے ضرب اجل المفقود ہے۔

اور ابن جلاب نے امام مالک سے ایک روایت بیان کی ہے کہ عقد میں تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اگرچہ نکاح کا فسخ دخول سے پہلے ہو (1)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نکاح عدت میں کیا ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تحریم دائمی ہو۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ اس کے پاس جائے۔ اور اگر عقد عدت میں ہوا اور وہ اس کے پاس داخل ہو اس کی عدت گزرنے کے بعد تو پھر مسئلہ یہ ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 5۔ پس اہل علم میں سے ایک قوم نے کہا ہے: یہ عدت میں دخول کی طرح ہے۔ لہذا دونوں کے درمیان تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اور اہل علم میں سے ایک گروہ نے کہا ہے اس سے تحریم ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی۔ اور امام مالک نے کہا ہے: تحریم دائمی ہوگی اور ایک بار کہا: اس سے تحریم ثابت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل واضح ہے۔ آپ کے دونوں قول المدونہ میں طلاق سنت کے بیان میں ہیں اور اگر اس نے عدت میں دخول کیا تو پھر مسئلہ یہ ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک، لیث اور اوزاعی رحمہم اللہ نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور وہ عورت اس کے لئے کبھی حلال نہ ہوگی۔ امام مالک اور لیث نے کہا ہے: ملک یمین کے ساتھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے مزنی کی اس کے ساتھ شادی کو جائز قرار دیا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ دونوں کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ حضرت سعید نے کہا ہے: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہوگا جس کے عوض اس کی فرج حلال سمجھی گئی (4)۔ اسے امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے۔

اور ثوری، علمائے کوفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور تحریم دائمی نہ ہوگی بلکہ ان کے درمیان فسخ نکاح کیا جائے گا پھر وہ اس کی عدت گزارے گی پھر وہ دعوت نکاح دینے والوں میں سے ایک دعوت نکاح دینے والا ہو جائے گا اور انہوں نے اس پر علماء کے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ اگر وہ اس کے ساتھ زنا کرے تو اس پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 317، دارالکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

4۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 504، وزارت تعلیم

3۔ ایضاً

اس سے شادی کرنا حرام نہیں ہوتا۔ تو اس طرح دوران عدت اس کا اس سے وطی کرنا بھی ہے۔ انہوں نے کہا: یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حسن رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔ اور عبدالرزاق نے ثوری عن اشعث عن الشعبي عن مسروق کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا: وہ دونوں اکٹھے رہ سکتے ہیں، جمع ہو سکتے ہیں۔

قاضی ابوالولید الباجی نے الممشقی میں بیان کیا ہے: عدت میں نکاح کرنے والا اس سے خالی نہ ہوگا کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو یا وہ اس کے پاس عدت میں جائے گا یا عدت کے بعد۔ پس اگر وہ عدت میں اس کے پاس گیا ہے تو پھر مشہور مذہب یہ ہے کہ تحریم دائمی ہوگی۔ یہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا ہے اور شیخ ابوالقاسم نے تفریع میں بیان کیا ہے کہ جب آدمی عدت میں عورت سے شادی کرتا ہے، چاہے وہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات ہو، یہ جانتے ہوئے کہ ایسا کرنا حرام ہے تو اس کے بارے دور وایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی تحریم دائمی ہوگی (کبھی بھی وہ عورت اس پر حلال نہ ہو سکے گی) جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اور دوسری یہ ہے کہ وہ زنا کرنے والا ہے اور اس پر حد لازم ہے اور بچہ اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا اور اس کے لئے جائز ہے کہ جب اس کی عدت گزر جائے تو وہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔ یہی امام شافعی (1) اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ پہلی روایت کی وجہ یہ ہے اور وہی مشہور ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرح فیصلہ کرنے اور لوگوں میں اس کے نافذ ہونے سے ثابت ہے اور آپ کے فیصلے مختلف شہروں میں منتقل ہوتے تھے اور پھیل جاتے تھے اور آپ سے اختلاف کرنے والا کوئی معلوم نہیں، پس اس سے ثابت ہوا کہ اسی پر اجماع ہے۔

قاضی ابو محمد نے بیان کیا ہے کہ اس کی مثل حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کے مشہور ہونے اور عام منتشر ہونے کے باوجود دونوں کے ساتھ اختلاف کرنے والا کوئی نہیں۔ یہی اجماع کا حکم ہے۔

اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممنوع وطی ہے اور اس کی تحریم دائمی نہیں۔ جیسا کہ اگر وہ اپنی شادی خود کرے یا نکاح متعہ کرے یا زنا کرے (تو ان سے دائمی تحریم ثابت نہیں ہوتی)۔

اور قاضی ابوالحسن نے کہا ہے: اس بارے میں امام مالک کا مشہور مذہب نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ابو عمر نے سند بیان کی ہے: حدثنا عبد الوارث بن سفیان حدثنا قاسم بن اصبغ عن محمد بن اسماعیل عن نعیم بن حماد عن ابن المبارک عن اشعث عن الشعبي عن مسروق کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس خبر پہنچی کہ قریش کی ایک عورت سے ثقیف کے ایک آدمی نے اس کی عدت میں شادی کی تو آپ نے ان دونوں کو بلا بھیجا اور ان کے درمیان تفریق کر دی اور ان دونوں کو سزا دی اور فرمایا: تو کبھی اس سے نکاح نہیں کر سکتا اور آپ نے اس کا مہر بیت المال سے دے دیا۔ یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک بھی پہنچی، تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر

رحم فرمائے۔ مہر اور بیت المال کا کیا تعلق ہے۔ وہ دونوں جاہل تھے۔ پس امام کو چاہئے کہ وہ ان دونوں کو سنت کی طرف لوٹا دے۔ عرض کی گئی: آپ ان دونوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے لئے مہر وہ ہے جس کے عوض اس کی فرج کو حلال سمجھا گیا اور ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور ان پر بطور حد کوڑوں کی سزا نہ ہوگی، اور وہ پہلے خاوند کی جانب سے اپنی عدت کو مکمل کرے گی، پھر دوسرے خاوند کی جانب سے کامل تین حیض عدت مکمل کرے گی، پھر اگر وہ چاہے تو اسے دعوت نکاح دے سکتا ہے (1)۔ پس یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: اے لوگو! جہالتوں کو سنت کی طرف لوٹا دو۔ اَلکِیَا الطُّبْرٰی نے کہا ہے: فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ آدمی جس نے کسی عورت کے ساتھ عقد نکاح کیا در آنحالیکہ وہ عورت کسی اور مرد کی عدت میں ہو تو وہ نکاح فاسد ہے اور حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں کا ان سے حد کی نفی پر اتفاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ نکاح فاسد حد کو ثابت نہیں کرتا مگر اس کی جہالت کے باوجود تحریم متفق علیہ ہے اور اس کا علم ہونے کے ساتھ اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور علماء نے اختلاف کیا ہے کہ وہ دونوں کی جانب سے اکٹھی عدت گزارے گی؟ یہ دو عدتوں کا مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 7۔ اہل مدینہ نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ پہلے کی جانب سے بقیہ عدت مکمل کرے گی اور دوسرے کی جانب سے دوسری عدت نئے سرے سے گزارے گی۔ یہی لیث، حسن بن حی، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم کا قول ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ محمد بن قاسم اور ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ دوسرے خاوند کی جانب سے اس کی عدت اس کے لئے اس دن سے کافی ہوگی جس دن مرد اور عورت کے درمیان تفریق کر دی گئی، چاہے وہ حمل کے ساتھ ہو یا حیضوں کے ساتھ ہو یا مہینوں کے ساتھ۔ یہی قول ثوری، اوزاعی اور ابو حنیفہ رحمہم کا ہے اور ان کی دلیل اس پر اجماع ہے کہ پہلا خاوند اپنی بقیہ عدت میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ دوسرے کی عدت میں ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو وہ یقیناً اس کی بقیہ عدت میں اس سے نکاح کر سکتا۔

پہلے گروہ نے جواب دیا اور کہا: یہ لازم نہیں ہے کیونکہ پہلے خاوند کو اس کی بقیہ عدت میں اس سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس پر دوسرے کی عدت واجب ہے۔ یہ دونوں حق ہیں جو دو خاوندوں کی جانب سے اس پر واجب ہیں جیسا کہ آدمیوں کے تمام حقوق واجب ہوتے ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے حق میں داخل نہیں ہو سکتا۔ امام مالک نے ابن شہاب عن سعید بن مسیب اور عن سلیمان بن یسار کی سند سے بیان کیا ہے کہ طلحہ اسد یہ رشید ثقفی کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دے دی اور اس نے اپنی عدت میں نکاح کر لیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے اور اس کے خاوند کو خفیف سی ضربیں لگائیں اور ان کے درمیان تفریق کر دی۔ پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس عورت نے بھی اپنی عدت کے دوران نکاح کیا پس اگر اس کا خاوند ایسا ہے جس نے اس کے ساتھ شادی کی ہے اس نے اس

کے ساتھ دخول نہیں کیا ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے، پھر وہ عورت پہلے خاوند کی جانب سے اپنی بقیہ عدت گزارے، پھر دوسرا پیغام نکاح دینے والوں میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس نے دخول کر لیا ہے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے پھر وہ پہلے کی جانب سے اپنی بقیہ عدت گزارے پھر دوسرے کی جانب سے عدت گزارے پھر وہ کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: حضرت سعید بن مسیب نے فرمایا: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہے جس کے عوض اس کی فرج حلال سمجھی گئی (1)۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ طلحہ طلحہ بنت عبید اللہ ہے، طلحہ بن عبید اللہ التیمی کی بہن ہے اور موطا کے بعض نسخوں میں یحییٰ کی روایت سے یہ ہے: طلحہ الاسدیہ اور یہ خطا اور لاعلمی ہے۔ میں کسی کو نہیں جانتا کہ اس نے یہ کہا ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ: فضر بها عمر بالمخفقة و ضرب زوجها ضربات (2) اس سے مراد ہے کہ آپ نے بطور سزا انہیں یہ ضربیں لگائیں جب کہ ان دونوں نے ایک ممنوع عمل کا ارتکاب کیا اور وہ ہے عدت میں نکاح کرنا۔

اور زہری نے کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ وہ کوڑے کتنی مقدار تک پہنچے۔ فرمایا: اس مسئلہ میں عبد الممالک کے کوڑے دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چالیس کوڑے تھے۔ فرمایا: اس بارے میں قبیسہ بن ذؤیب سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: اگر تم تخفیف بھی کرو تو بیس کوڑے لگاؤ۔ اور ابن حبیب نے ایسی عورت کے بارے میں کہا جو عدت میں شادی کرتی ہے اور مرد اسے مس کرتا ہے یا بوس و کنار کرتا ہے یا مباشرت کرتا ہے یا ہاتھ سے ٹٹولتا ہے یا شہوت کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہے تو زوجین پر سزا ہوگی، ولی پر، گواہوں پر اور ان میں سے ہر اس پر جو یہ جانتا ہو کہ یہ عدت میں ہے اور ان میں سے جو نہ جانتا ہو اس پر سزا نہ ہوگی۔ اور ابن المواز نے کہا ہے: زوجین کو بطور حد کوڑے لگائے جائیں گے اگر دونوں نے عدا کیا ہو۔ اور ابن حبیب کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ یہ اس کے بارے میں ہے جسے عدت کے بارے میں علم ہو۔ اور شاید وہ جو تحریم سے ناواقف ہو اور اس نے فعل ممنوع کا ارتکاب جان بوجھ کر نہ کیا ہو تو وہ وہ ہے جسے سزا دی جائے گی اور اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت اور اس کے خاوند کو ہلکی سی شے کے ساتھ ضربیں لگائیں۔ اور اس بارے میں سزا اور تادیب اس کے حال کے مطابق ہوگی جسے سزا دی جا رہی ہے۔ اور ابن المواز کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ ان دونوں کو تحریم کا علم ہو اور انہوں نے جرات اور دلیری کرتے ہوئے ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہو۔ اور شیخ ابوالقاسم نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں روایتیں عدا کرنے کے بارے میں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حد جاری کی جائے گی اور دوسری کے مطابق سزا دی جائے گی اور حد جاری نہیں کی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ يَحْذِرْهُ الرَّائِي كِي انْتِهَاءِ هِيَ امِر كے وقوع کے بارے میں منع کیا گیا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً
وَمَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِمِ قَدْرًا وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدْرًا مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا

عیب اور نقص پڑنا لاحق ہوا ہے جو مرد کو عقد کے سبب حاصل ہوئی تھی اور مس مہر واجب کے بالمقابل ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب اللہ تعالیٰ نے مطلقہ کی حالت کو یہاں دو قسموں میں تقسیم کر دیا ایک ایسی مطلقہ جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور دوسری ایسی مطلقہ جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ نکاح کی تفویض جائز ہے اور اس سے مراد ہر وہ نکاح ہے جو مہر کا ذکر کیے بغیر کیا جائے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس کے بعد مہر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ پس اگر وہ مقرر کر دیا جائے تو وہ عقد کے ساتھ مل جاتا ہے اور یہ جائز ہے اور اگر وہ نہ مقرر کیا جائے اور طلاق ہو جائے تو پھر بالا جماع مہر واجب نہیں ہوتا (1)۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے یہی کہا ہے۔

اور مہدوی نے حماد بن ابی سلیمان سے نقل کیا ہے کہ جب آدمی عورت کو طلاق دے اور اس سے دخول نہ کیا ہو اور نہ ہی اس کے لئے مقررہ مہر ہو تو اسے نصف مہر مثل پر مجبور کیا جائے اور اگر عقد نکاح کے بعد اور طلاق واقع ہونے سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: طلاق کے سبب وہ نصف نہ ہوگا کیونکہ وہ عقد کے ساتھ واجب نہیں ہوا اور یہ اس ارشاد باری کے ظاہر کے خلاف ہے: **وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً (البقرة: 237)** اور یہ خلاف قیاس بھی ہے، کیونکہ عقد کے بعد مقرر کردہ مہر عقد کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے پس یہ ضروری ہے کہ یہ طلاق کے ساتھ نصف ہو جائے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ مقرر کردہ مہر عقد کے ساتھ ملا دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر مہر مقرر کرنے سے پہلے موت واقع ہو جائے تو ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ ان سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایسی عورت سے شادی کی جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا اور اس کے ساتھ دخول نہ کیا یہاں تک کہ مر گیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لئے اس جیسی عورتوں کا مثل ہوگا نہ اس میں کمی ہوگی اور نہ زیادتی اور اس پر عدت ہوگی اور اس کے لئے میراث بھی ہوگی۔ تو حضرت معقل بن سنان الشجعی کھڑے ہوئے اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں سے ایک عورت بروع بنت واشق کے بارے میں اسی طرح فیصلہ فرمایا جیسے تم نے کیا ہے۔ تو اس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور آپ سے کئی اسناد سے مروی ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض اہل علم اور ان کے سوا دوسروں کا اسی پر عمل ہے اور ثوری، احمد اور اسحاق رحمہم بھی اسی طرح کہتے ہیں۔

اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض اہل علم جن میں حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم شامل ہیں نے کہا ہے کہ جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے اور اس کے ساتھ دخول نہ کرے اور نہ اس کے لئے مہر مقرر کرے یہاں تک کہ مر جائے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے میراث ہوگی اور اس کے لئے مہر نہیں ہوگا اور اس پر عدت ہوگی۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور کہا ہے: اگر بروع بنت واشق کی حدیث ثابت ہے تو پھر یقیناً وہ حجت ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور امام شافعی کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے اس

کے بعد مصر میں اپنے اس قول سے رجوع کر لیا اور بروء بنت واشق کی حدیث کے مطابق بیان کیا۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: بروء کی حدیث ثابت کرنے میں اختلاف ہے، پس قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے ابن ابی زید کے رسالہ کی شرح میں کہا ہے کہ بروء بنت واشق کی حدیث کو حفاظ حدیث اور ائمہ اہل علم نے رد کر دیا ہے اور واقدی نے کہا ہے: یہ حدیث مدینہ منورہ میں پیش ہوئی تو علماء میں سے کسی نے اسے قبول نہیں کیا اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ ہم نے آپ سے اور ابن منذر سے ذکر کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں اور بیان کیا کہ یہی ابو ثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔

اور زہری، اوزاعی، مالک، شافعی رحمہ اللہ سے حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس مسئلہ میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے لئے میراث نہیں ہوگی یہاں تک کہ مہر ہو (یعنی مہر کے بغیر میراث نہیں ہو سکتی) مسروق نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ مہر مقرر ہونے سے پہلے نکاح میں تفریق ہے پس اس میں مہر واجب نہیں اور اس کی اصل طلاق ہے لیکن جب حدیث صحیح ہے تو اس کے مقابلے میں قیاس فاسد ہے اور ابو محمد عبد الحمید نے ایسا مذہب بیان کیا ہے جو حدیث سے موافقت رکھتا ہے۔ الحمد للہ۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: حدیث بروء کو عبد الرزاق نے ثوری عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے اور اس میں ہے: پس معقل بن سنان کھڑے ہوئے اور اس میں ابن مہدی نے ثوری عن فراس عن الشعبي عن مسروق عن عبد اللہ کی سند سے بیان کیا اور کہا: معقل بن یسار۔ اور میرے نزدیک صحیح اس کا قول ہے جس نے معقل بن سنان کہا ہے نہ کہ معقل بن یسار (2)۔ کیونکہ معقل بن یسار قبیلہ مزینہ کا آدمی ہے اور یہ حدیث ایسی عورت کے بارے میں ہے جس کا تعلق قبیلہ اشجع سے ہے نہ کہ مزینہ سے۔ اور اسی طرح اسے داؤد نے شعبی عن علقمہ سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے۔ پس اشجع کے لوگوں نے کہا اور معقل بن سنان یوم حرہ میں شہید ہوئے اور یوم حرہ کے بارے میں شاعر کہتا ہے

ألا تلکم الأنصار تبکی سرائها و أشجع تبکی معقل بن سنان

خبردار! وہ انصار اپنے شیروں کو رو رہے ہیں اور بنی اشجع معقل بن سنان کو رو رہے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ تَنْسُوْهُنَّ اس میں ما بمعنی الذی ہے۔ یعنی اگر تم نے ان عورتوں کو طلاق دی جنہیں تم نے مس نہیں کیا اور تَنْسُوْهُنَّ کو ثلاثی سے تاء کے فتح کے ساتھ پڑھا گیا ہے او یہ نافع، ابن کثیر، ابو عمر، عاصم اور ابن عامر کی قراءت ہے اور حمزہ اور کسائی نے تاسوھن باب مفاعلہ سے پڑھا ہے کیونکہ وطی دونوں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 136، وزارت تعلیم

2۔ ابن ماجہ، باب الرجل یتزو ولا یغرض لھا فی موت، حدیث نمبر 1880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کبھی باب مفاعله میں فاعل بمعنی فعل بھی آتا ہے۔ جیسے طارقت النعل (میں نے نعل کھٹکھٹائے) اور عاقبت التلص (میں نے چور کو سزا دی) اور پہلی قراءت اس باب میں مفاعله کے معنی کا تقاضا کرتی ہے اس معنی کے اعتبار سے جو مس سے سمجھا گیا ہے اور ابوعلی نے اسے ترجیح دی ہے کیونکہ اس معنی کے افعال اس وزن پر ثلاثی آئے ہیں۔ جیسا کہ نکح، سفد، قرع، دفت اور ضرب الفعل (ان تمام میں جفتی کرنے اور وٹلی کرنے کا معنی مشترک ہے) اور دونوں قراءتیں حسن ہیں۔

اور اَوْ تَفْرِضُوا میں اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی واؤ ہے۔ یعنی ما لم تسوهن ولم تفرضوهن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ كَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَ هَابًا سُبُكًا وَكُنَّا فِيهَا دُخَانًا ۝ (الاعراف) (اور کتنی بستیاں تھیں برباد کر دیا ہم نے انہیں۔ پس آیا ان پر عذاب رات کے وقت یا جب وہ دو پہر کو سو رہے تھے۔) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ أَرْسَلْنَاهُ إِلَى مِائَةِ آلَافٍ أَوْ يَزِيدُونَ ۝ (الصافات) (اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف) اور ارشاد گرامی ہے: وَلَا تَطْعَمُ مِنْهُمْ أَشْيًا أَوْ كَفُّورًا ۝ بمعنی و کفورا ہے (الدھر) (اور نہ کہنا ماننے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا) اور یہ قول: وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ (النساء: 43) یہ بمعنی و جاء احد من الغائط و انتم مرضى او مسافرون ہے۔ (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضاء حاجت سے۔)

اور یہ ارشاد: إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (الانعام: 146) اور اسی کے مثل دیگر ارشادات۔ (مگر جو اٹھا رکھی ہوں ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ۔)

اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کے مہر مفروض کا عطف کیا ہے اور فرمایا ہے: وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً

پس اگر پہلا ارشاد مس سے قبل مفروض لہا کی طلاق کے بیان کے لئے ہوتا تو اس کا وہ دوبارہ ذکر نہ فرماتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَتَّعُوهُنَّ اس کا معنی ہے تم انہیں کوئی ایسی شے دو جو ان کے لئے متعہ بن سکتی ہو۔ حضرت ابن عمر، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت حسن بن ابی حسن، حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابو قلابہ، حضرت زہری، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک بن مزاحم رحمہم نے اسے وجوب پر محمول کیا ہے۔

اور ابو عبیدہ، امام مالک بن انس اور ان کے اصحاب اور قاضی شریح رحمہم نے اسے ندب پر محمول کیا ہے (1)۔

پہلے قول والوں نے مقتضائے امر سے استدلال کیا ہے (یعنی الامر للوجوب) اور دوسرا قول کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: حَقَّ عَلَى الْمُحْسِنِينَ أَوْ عَلَى الْمُتَّقِينَ أَوْ لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ لَأَكْثَرُنَّ كُفْرًا ۝ (النساء: 9) (اور اگر تم نے ان سے منع کیا تو ان میں سے اکثر کفر میں اضافہ کریں گے)۔ کیونکہ امر کے عمومات میں ہے متعوهن کے قول میں امتناع ہے اور امتناع کی اضافت ان کی طرف لام تملیک کے ساتھ ہے۔ اس ارشاد میں و للمطلقات متاع اس میں وجوب ندب سے زیادہ ظاہر ہے اور

قولہ: علی المتقین یہ اس کے ایجاب کی تاکید ہے کیونکہ ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے میں اور اس کی نافرمانی اور معصیت کرنے میں اس سے ڈرے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ یہ ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور قول باری تعالیٰ: وَامْتَعُوْهُنَّ کی ضمیر متصل میں اختلاف ہے کہ عورتوں میں سے ان سے کون مراد ہیں؟ تو حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت جابر بن زید، حضرت حسن رضی اللہ عنہم، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت عطاء، حضرت اسحاق اور اصحاب الرائے رحمہم نے کہا ہے: ایسی مطلقہ عورت کے لئے متعہ واجب ہے جس کے پاس جانے اور اس کا مہر مقرر کیے جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے سوا دوسری عورتوں کے حق میں مستحب ہے۔

اور امام مالک اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: ہر مطلقہ عورت کے حق میں متعہ مستحب ہے اگرچہ اس سے دخول کیا گیا ہو، مگر اس کے حق میں کہ جس کے ساتھ دخول نہ کیا گیا اور اس کے لئے مہر مقرر کیا گیا تو اس کے لئے وہی کافی ہے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہوگا (1)۔

اور ابو ثور نے کہا ہے اس کے لئے بھی اور ہر مطلقہ عورت کے لئے متعہ ہے اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول بھی نہ کیا گیا تو اس کے لئے متعہ کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔ زہری نے کہا ہے: اس کے لئے متعہ کا فیصلہ قاضی کرے گا اور جمہور لوگوں نے کہا ہے: قاضی اس کے لئے اس کے بارے فیصلہ نہیں کرے گا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اجماع بلاشبہ صرف آزاد عورت کے حق میں ہے۔ پس رہی لونڈی جب اسے مس کیے جانے اور مہر مقرر ہونے سے قبل طلاق دے دی جائے تو جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس کے لئے متعہ ہوگا۔ امام اوزاعی اور ثوری نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے آقا کے لئے ہوگا اور وہ اپنی مملوکہ کو طلاق کے سبب پہنچنے والی تکلیف کے مقابلے میں کسی مال کا مستحق نہیں ہے۔ رہا امام مالک کے مذہب کا ربط تو ابن شعبان نے کہا ہے: متعہ طلاق کے غم کے بدلے ہوتا ہے، اسی لئے وطی سے پہلے یا بعد خلع لینے والی عورت، مبارات کرنے والی اور لعان کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ وہ ہے جس نے خود طلاق کو اختیار کیا ہے۔

اور ترمذی، عطاء اور نخعی رحمہم نے کہا ہے: خلع لینے والی عورت کے لئے متعہ ہے اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: لعان کرنے والی عورت کے لئے متعہ ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: فسخ کئے گئے نکاح میں کوئی متعہ نہیں ہے۔ ابن المواز نے کہا ہے: ایسا نکاح جس کا عقد صحیح ہونے کے بعد اس میں فسخ داخل ہو جائے تو اس میں متعہ نہیں ہے۔ مثلاً زوجین میں سے ایک دوسرے کا مالک ہو جائے (3)۔ ابن قاسم نے کہا ہے: اس کی اصل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلِلْمُطَلَّقاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ پس یہ حکم طلاق کے ساتھ مختص ہے فسخ اس میں شامل نہیں۔ اور ابن وہب نے مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ عورت جسے اختیار دیا گیا اس کے لئے متعہ ہے بخلاف اس لونڈی کے جو کسی غلام کے نکاح میں آزاد ہو جائے تو اسے اپنے نفس کے بارے اختیار ہوگا۔ پس اس صورت

میں اس کے لئے متعہ نہیں ہوگا رہی وہ آزاد عورت جسے اختیار دیا گیا یا جو مالک ہو جائے یا مرد اس پر کسی لونڈی سے شادی کرے تو وہ ان تمام صورتوں میں اپنے نفس کی مختار ہوتی ہے اور اس کے لئے متعہ بھی ہوتا ہے کیونکہ زوج فرقت کا سبب بنتا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک مقدار کے قلیل اور کثیر ہونے کے اعتبار سے متعہ کی کوئی معروف حد نہیں ہے (1)۔ البتہ لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کم سے کم وہ مقدار جو متعہ میں دینی جائز ہے وہ تیس درہم یا ان کے مشابہ کوئی شے ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سب سے اعلیٰ اور ارفع متعہ خادم ہے پھر لباس ہے اور پھر نفقہ ہے۔ حضرت عطاء نے کہا ہے: اوسط متعہ قمیص، دوپٹہ اور چادر ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہی اس کی کم سے کم مقدار ہے۔ ابن محیریز نے کہا ہے: صاحب دیوان پر تین دینار ہوں گے اور غلام پر متعہ ہوگا۔ اور حسن نے کہا ہے: ہر کوئی اپنی قدر کے مطابق متعہ ادا کرے گا کوئی خادم کے ساتھ، کوئی کپڑوں کے ساتھ، کوئی ایک کپڑے کے ساتھ اور کوئی نفقہ کے ساتھ۔ اسی طرح امام مالک بن انس بھی کہتے ہیں اور یہی قرآن کریم کا مقتضا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے نہ اس کی مقدار مقرر کی ہے اور نہ اس کی حد بیان فرمائی ہے۔ بے شک اس نے ارشاد فرمایا ہے: عَلَى الْمُؤْسِعِ قَدْرُهَا وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدْرُهَا (مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست پر اس کی حیثیت کے مطابق ہے) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیس ہزار اور ایک زقاق (مشکیزہ) شہد بطور متعہ دیا۔ اور شریح نے پانچ سو درہم بطور متعہ دیئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بلاشبہ عورت کی حالت کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔ بعض شوافع نے یہی کہا ہے، انہوں نے کہا ہے: اگر ہم صرف مرد کی حالت کا اعتبار کریں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اگر وہ دو عورتوں سے شادی کرے ان میں سے ایک شریف اور اعلیٰ ہو اور دوسری ادنیٰ اور گھٹیا ہو پھر وہ مس کرنے سے پہلے ہی دونوں کو طلاق دے دے اور دونوں کے لئے مہر مقرر نہ کرے کہ وہ دونوں متعہ میں برابر ہوں۔ پس گھٹیا کے لئے بھی وہی کچھ واجب ہوگا جو شریف اور اعلیٰ کے لئے واجب ہو رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے: مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ (متعہ دو مناسب طریقہ کے ساتھ)۔ اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انتہائی دولت مند اور خوشحال آدمی جب کسی کمینی اور گھٹیا عورت سے شادی کرے کہ وہ اس کی مثل ہو جائے، کیونکہ اس نے جب اسے دخول اور مہر مقرر ہونے سے پہلے طلاق دے دی تو مرد کی حالت اور عورت کے مہر مثل کے اعتبار سے اس پر متعہ لازم ہوگا، پس اس طرح متعہ اس کے مہر مثل کا کئی گنا ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ دخول سے قبل اس کے اس مہر کے کئی گنا کا مستحق ہو جائے گی جس مہر مثل کا وہ دخول کے بعد مستحق ہوگی جس میں استعمال کی انتہا ہے اور وہ وٹلی ہے۔

اصحاب الرائے وغیرہم نے کہا ہے: وہ عورت جسے دخول اور مہر مقرر کیے جانے سے پہلے طلاق دی جاتی ہے اس کا متعہ نصف مہر مثل ہے اس کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ مہر مثل عقد کے سبب لازم ہوا ہے اور متعہ مہر مثل کا ہی بعض ہے، پس یہ اس کے لئے اسی طرح واجب ہوگا جیسے مہر مسمیٰ کا نصف واجب ہوتا ہے جبکہ طلاق قبل از دخول ہو اور اس کی تردید رب العالمین کا یہ ارشاد کرتا ہے: عَلَى الْمُؤْسِعِ قَدْرُهَا وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدْرُهَا اور یہ تحدید چھوڑنے پر دلیل ہے (2) اور اللہ تعالیٰ ہی حقائق الامور

کے بارے جاننے والا ہے۔

اور ثعلبی نے حدیث ذکر کی ہے۔ بیان کیا ہے کہ یہ آیت لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ الْآيَةَ انصار کے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی۔ اس نے بنی حنیفہ کی ایک عورت سے شادی کی اور اس کے لئے مہر مقرر نہ کیا پھر اسے چھونے سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”تو اسے متعہ دے اگرچہ وہ تیری ٹوپی ہی ہو“ متعھا ولو بقلنسوتک۔ (1)

اور دارقطنی نے سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے کہ عائشہ ختمیہ حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے نکاح میں تھی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کر لی گئی تو اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! تجھے خلافت مبارک ہو۔ تو آپ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں اور تو خوشی کا اظہار کر رہی ہے! اذہبی فانت طالق ثلاثا تو جا تجھے تین طلاقیں ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس نے اپنا کمل لپیٹ لیا اور بیٹھ گئی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی۔ پس آپ نے اس کی طرف بطور متعہ دس ہزار اور اس کے مہر میں سے جو ابھی باقی تھا وہ سب بھیج دیا۔ تو اس نے کہا:

متاع قليل من حبيب مفارق

جدا ہونے والے محبوب کی نسبت متعہ انتہائی قلیل ہے۔

پس جب آپ کے پاس اس کا یہ قول پہنچا تو آپ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اپنے جد امجد سے نہ سنا ہوتا یا میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے میرے جد امجد سے سنا۔ آپ فرماتے ہیں: وہ آدمی جس نے اپنی بیوی کو تین مہم یا اقراء کے وقت تین طلاقیں دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور زوج سے شادی کر لے، تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔ (2)

ایک روایت میں ہے کہ قاصد نے انہیں اس کی خبر دی اور وہ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اسے طلاق کے ساتھ مکمل جدا نہ کر دیا ہوتا تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔ لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں ہر طہر کے وقت ایک طلاق یا ہر مہینے کے شروع میں ایک طلاق یا اسے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کر لے (ایسا رجل طلق امرأته ثلاثا عند كل طهر تطليقة او عند رأس كل شهر تطليقة او طلقها ثلاثا جميعا لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره) (3)

مسئلہ نمبر 9۔ وہ آدمی جو متعہ سے جاہل اور ناواقف ہو یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے دے اگرچہ وہ شادی بھی کر لے۔ اور اگر وہ عورت فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء کو دے۔ اسے ابن مواز نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ اور اصبح نے کہا ہے: اگر عورت فوت ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں ہے کیونکہ متعہ طلاق کی وجہ سے پہنچنے والے غم کے سبب عورت کو تسلی دینے کے لئے ہے اور وہ مقصود فوت ہو چکا ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حق ہے

جو مرد کے ذمہ ثابت ہو چکا ہے۔ لہذا وہ دیگر حقوق کی طرح عورت سے اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گا اور یہ ان کے مذہب میں متعہ کے واجب ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: عَلَى الْمُؤْسِيعِ قَدْرُهَا وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدْرُهَا یہ متعہ کے وجوب پر دلیل ہے۔ جمہور نے اسے الْمُؤْسِيعِ یعنی واؤ کے سکون اور سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) اور اس سے مراد وہ ہے جس کی حالت میں وسعت اور خوشحالی ہو۔ کہا جاتا ہے: فلاں ینفق علی قدرہ یعنی فلاں اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ اور ابو حیوہ نے اسے واؤ کے فتح اور سین کی شد اور فتح کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی الْمُؤْسِيعِ) ابن عامر، حمزہ، کسائی اور عاصم نے حفص کی روایت میں دونوں مقامات پر دال کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی قَدْرُهَا) اور ابن کثیر، نافع، ابو عمرو اور عاصم نے ابو بکر کی روایت میں قَدْرُهَا یعنی دونوں جگہوں پر دال کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابو الحسن الاخفش وغیرہ نے کہا ہے: یہ دونوں ہم معنی ہیں، دونوں لغتیں فصیح ہیں۔

اور اسی طرح ابو زید نے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں: خَذَ قَدْرَ كَذَا وَقَدْرَ كَذَا۔ دونوں کا معنی ایک ہے (یعنی اتنی مقدار لے لو) اور کتاب اللہ میں پڑھتے ہیں: فَسَالَتْ اَوْدِيَةً يَقْدِرُهَا (الرعد: 17) (پس بنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ (الانعام: 91) (اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا) اگر دال کو حرکت دی جائے تو بھی جائز ہے اور الْمُقْتِرِ کا معنی ہے قلیل المال (یعنی ایسا آدمی جس کے پاس مال کم ہو، وہ تنگ دست ہو۔) مَتَاعًا یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے (2)۔ یعنی متعہ من متاعاً۔ تم انہیں خرچہ دو بِالْمَغْرُوفِ یعنی جس طرح شریعت میں بیان کیا گیا ہے میانہ روی وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ یعنی یہ نیکوکاروں کا فرض ہے۔ کہا جاتا ہے: حَقَّقْتُ عَلَيْهِ الْقَضَاءَ اَحَقَّقْتُ، یعنی میں نے فیصلہ اس پر لازم کر دیا۔ اس میں اس پر دلیل ہے کہ متعہ واجب ہے کیونکہ اس کے بارے حکم دیا گیا ہے اور قول باری تعالیٰ حَقًّا وجوب کی تاکید کے لئے ہے۔ اور عَلَى الْمُحْسِنِينَ اور عَلَى الْمُتَّقِينَ کا معنی ہے علی المؤمنین یعنی مومنین پر لازم ہے۔ اسی لئے یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے: لست بمحسن ولا متق (کہ میں محسن اور متقی نہیں) اور لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام کے تمام محسنین اور متقین ہوں۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ محسن ہوتے ہیں اور وہ اس کی نافرمانی سے اجتناب کرتے ہیں تاکہ وہ جہنم میں داخل نہ ہوں۔ پس تمام مخلوق پر واجب ہے کہ وہ محسنین اور متقین ہوں اور حَقًّا یہ مَتَاعًا کی صفت ہے یا پھر مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اسے امر کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا
فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بَيْنَهُمَا عَقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ
لِلتَّقْوَى وَلَا تَسْأُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

”اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر تو نصف مہر (ادا کرو) جو تم نے مقرر کیا ہے مگر یہ کہ وہ (اینا حق) معاف کر دیں یا معاف کر دے وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور (اے مردو!) اگر تم معاف کر دو تو یہ بہت قریب ہے تقویٰ سے اور نہ بھلایا کرو احسان کو آپس (کے لین دین) میں، بے شک اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ لوگوں نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے، اس میں سے امام مالک وغیرہ ہیں کہ یہ مہر مقرر ہونے کے بعد متعہ کے حکم سے مطلقہ کو نکالنے والی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسے شامل ہے وَمَتَّعُوْهُنَّ اور حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس آیت کو سورۃ الاحزاب کی آیت نے منسوخ کر دیا ہے، کیونکہ وہ ہر اس مطلقہ کے متعہ کو متضمن ہے جس کے ساتھ دخول نہیں ہوا اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس آیت نے اپنے سے پہلی آیت کو منسوخ کیا ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید اور حضرت قتادہ کا قول محل نظر ہے کیونکہ نسخ کی شروط موجود نہیں ہیں اور انہیں جمع کرنا ممکن ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں کہا ہے: متعہ اس ارشاد کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے ہے: وَلِلْمُطَلَّقاتِ مَتَّاعٌ بِالْمَعْرُوفِ اور غیر مدخول بہا کے لئے اس آیت کے مطابق ہے جو سورۃ الاحزاب میں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ساتھ اس مطلقہ کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اسے قبل از دخول طلاق ہو گئی اور اس کے لئے صرف اس مہر کا نصف ثابت کیا جو اس کے لئے مقرر کیا گیا (2)۔

اور علماء کے ایک فریق نے کہا ہے ان میں سے ابو ثور ہیں کہ عموماً ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے اور اس آیت نے یہ بیان کیا ہے کہ جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا وہ اس میں سے نصف بھی لے گی اور آیت سے اس کے متعہ کو ساقط کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے لئے متعہ اور نصف مہر ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ یعنی جو مہر تم نے مقرر کیا اس کا نصف واجب ہے۔ یعنی بالاجماع مہر میں سے نصف خاوند کے لئے ہے اور نصف عورت کے لئے اور نصف دو میں سے ایک جز ہے۔

پس کہا جاتا ہے: نِصْفُ الْمَاءِ الْقَدْحِ یعنی پانی پیالے کے نصف تک پہنچ گیا۔ اور نصف الازار الساق چادر پنڈلی کے نصف تک ہوگی، ہر وہ شے جو اپنے غیر کے نصف تک پہنچ جائے تو تحقیق وہ اس کا نصف ہو گئی۔

جمہور نے فِئِصْفُ رَفْعِ کے ساتھ پڑھا ہے اور ایک جماعت نے فِئِصْفِ یعنی فَا کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے معنی یہ ہے کہ تم نصف دو۔

حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما نے فِئِصْفُ تمام قرآن میں نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور اسی طرح اصمعی نے ابو عمرو بن العلاء سے قراءت روایت کی ہے (4)۔ کہا جاتا ہے: نِصْفٌ وَنِصْفٌ

نَصِيفٌ۔ یہ تینوں نصف کے بارے میں لغات ہیں اور حدیث میں ہے: لو أن أحدكم انفق مثل أحد ذهباً ما بدع مد أحدہم ولا نصیفہ۔ ای نصفہ۔ (1) (یعنی اگر تم میں سے کوئی ایک پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی کے مد کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے نصف کو) اور نصیف کا معنی القنّاء (اور ہنی دوپٹہ) بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب آدمی نے عورت کو مہر دے دیا پھر اسے قبل از دخول طلاق دے دی اور مہر عورت کے قبضے میں بڑھتا رہا تو امام مالک نے فرمایا ہے: کل سامان جو مرد نے اسے بطور مہر دیا یا غلام تو دونوں کی بڑھوتری دونوں (مرد و عورت) کے لئے ہوگی اور اس کا نقصان بھی دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔

اور اس کی ہلاکت بھی ان دونوں پر اکٹھی پڑے گی، اس صورت میں اس میں سے عورت پر کوئی شے نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اسے سونے یا چاندی کی معینہ مقدار بطور مہر دی اور اس نے اس کے ساتھ غلام یا گھر خرید لیا یا اس کے عوض ان کا کچھ حصہ خرید لیا یا اس کے سوا خوشبو یا گھر کا ساز و سامان یا اس کے علاوہ کوئی ایسی شے خریدی جس میں عورت کا تصرف ہو اپنی حاجت و ضرورت کے لئے اور مرد کے ساتھ اس گھر میں رہنے کی خاطر اپنے معاملات کی اصلاح کے لئے، تو وہ تمام کا تمام اسی کے قائم مقام ہے کہ اگر وہ اسے وہی بطور مہر دیتا اور اس کی نمو اور کمی دونوں کے درمیان منقسم ہوگی۔

اور اگر اس نے اسے قبل از دخول طلاق دی تو پھر اس کے لئے نصف کے سوا کچھ نہیں ہے اور نہ عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ مرد کو اس مہر کا نصف بطور قرض ادا کرے جس پر اس نے قبضہ کیا ہے۔ اور اگر عورت نے کامل مہر یا اس کے کچھ حصہ کے ساتھ کوئی شے خریدی تو وہ اس کے ساتھ مختص ہو جائے گی اور عورت پر مرد کے لئے اس مہر کا نصف بطور قرض ہوگا جس پر عورت نے قبضہ کیا ہے اور اسی طرح اگر عورت نے کسی غیر سے غلام یا گھر خرید لیا اس ہزار کے عوض جو مرد نے اسے بطور مہر دیا تھا پھر اسے دخول سے پہلے طلاق دے دی تو وہ اس پر ہزار کے نصف کے لئے رجوع کر سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کی پھر فوت ہو گیا درآنحالیکہ اس کے لئے مہر مقرر کیا گیا تھا تو اس عورت کے لئے وہ کامل مہر مسمی ہوگا اور میراث بھی ہوگی اور اس پر عدت بھی ہوگی۔

اور علماء نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو عورت کے ساتھ خلوت تو اختیار کرتا ہے اور اس سے مجامعت نہیں کرتا یہاں تک کہ اسے جدا کر دیا۔ تو علمائے کوفہ اور امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس پر تمام مہر واجب ہوگا اور عورت پر عدت بھی ہوگی، کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: خلفائے راشدین نے اس آدمی کے بارے میں فیصلہ فرمایا جس نے دروازہ بند کر لیا یا پردہ لٹکالیا تو اس عورت کے لئے میراث ہوگی اور اس پر عدت بھی ہوگی (2)۔ یہ مرفوع روایت ہے اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

اور امام شافعی کامل مہر واجب نہیں کرتے اور نہ ہی عورت پر عدت ہوگی جبکہ دخول نہ ہو۔ ظاہر قرآن کریم اس کی تائید کرتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب قول النبی لو کنت متخذاً، حدیث 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ السنن الکبریٰ، جلد 7، صفحہ 255، دار الفکر

ہے۔ شریح نے کہا ہے: میں نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بابا یا ستراً کا ذکر کیا ہو، جبکہ آپ کا خیال یہ ہے کہ چونکہ مرد نے عورت کو مس نہیں کیا لہذا اس کے لئے نصف مہر ہوگا۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے۔ اور اس بارے میں ہمارے علماء کا موقف عنقریب سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

رب کریم کے اس ارشاد کے تحت: وَقَدْ افْضَىٰ بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا اَنْ یَّعْفُوَ الَّذِیْ یَبِیِّدُ عُقْدَةَ النِّكَاحِ الْآیۃ۔

اس میں اِلَّا اَنْ یَّعْفُوَ اسْتِثْنَاءٌ مُنْقَطِعٌ ہے۔ کیونکہ ان کا نصف معاف کرنا ان کے لینے کی جنس میں سے نہیں ہے۔ اور یَّعْفُوَ کا معنی یترکن (وہ چھوڑ دیتی ہیں) اور تَصْفَحْنَ (وہ درگزر کرتی ہیں) ہے اور اس کا وزن یَفْعُلْنَ ہے۔ معنی یہ ہے مگر یہ کہ وہ اس نصف کو چھوڑ دیتی ہیں جو ان کے لئے زوج پر واجب ہوتا ہے اور اَنْ داخل ہونے کے باوجود نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ مضارع میں جمع مؤنث کا صیغہ رفع، نصب اور جزم کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے اور یہ ضمیر ہے علامت اعراب نہیں ہے۔ پس اسی وجہ سے نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ اگر نون ساقط ہو جائے تو پھر مذکر کے ساتھ اس کا اشتباہ لازم آئے۔

اس آیت میں معاف کرنے والیوں میں ہر وہ عورت ہے جو اپنی ذات کے معاملہ کی خود مالک ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں مہر ثابت ہو جانے کے بعد اسے ساقط کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ اسے خالص ان کا حق بنایا ہے۔ پس وہ اس میں قائم رکھنے اور ساقط کرنے کا تصرف کر سکتی ہیں جیسے چاہیں جبکہ وہ اپنے نفسوں کے معاملہ کی مالک ہیں اور وہ بالغ، عاقل اور ہدایت یافتہ بھی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور فقہاء و تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے: اس باکرہ عورت کا معاف کرنا بھی جائز ہوتا ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو اور اسے سحون نے المدونہ میں ابن قاسم کے سوا کسی اور سے بیان کیا ہے اس کے بعد کہ ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں ہے۔ رہی وہ جو باپ یا وصی کے زیر پرورش رہی تو اس کا اپنے نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں۔

یہ ایک ہی قول ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں جسے میں جانتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ یَّعْفُوَ الَّذِیْ یَبِیِّدُ اس کا عطف پہلے پر ہے، وہ جنی ہے اور یہ معرب ہے اور حسن نے اَوْ یَّعْفُوَ اَوْ کو ساکن پڑھا ہے (1)۔ گویا کہ انہوں نے واؤ پر فتح کو ثقیل سمجھا ہے۔ لوگوں نے اس ارشاد کے معنی مراد بہ میں اختلاف کیا ہے: اَوْ یَّعْفُوَ الَّذِیْ یَبِیِّدُ عُقْدَةَ النِّكَاحِ پس دارقطنی نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بنی نصر کی ایک عورت سے شادی کی اور پھر دخول سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی اور اس کی طرف کامل مہر بھیج دیا اور فرمایا: میں اسے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِلَّا اَنْ یَّعْفُوَ الَّذِیْ یَبِیِّدُ عُقْدَةَ النِّكَاحِ (بقرہ: 237) اور میں اس سے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں (2)۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ

2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دارالاحسان قاہرہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دارالکتب العلمیہ

کی تاویل کی: **أَوْ يَعْفُوا** الذی یبیدہ **عُقْدَةُ النِّكَاحِ** مراد اپنی ذات ہے ہر حال میں طلاق سے پہلے بھی اور طلاق کے بعد بھی۔ یعنی یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں اپنے نکاح کی گرہ ہے (یعنی عبارت ہے) عقدہ نکاحہ۔ پھر جب لام داخل کیا گیا تو ہاء کو حذف کر دیا گیا، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: **فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى**۔ اسی مأواہ۔ نابغہ نے کہا ہے:

لَهُمْ شِيمَةٌ لَمْ يَعْطَهَا اللَّهُ غَيْرَهُمْ مِنْ الْجُودِ وَالْإِحْلَامِ غَيْرُ عَوَازِبِ

اس میں الاحلام اصل میں احلامہم ہے۔ اسی طرح قول باری تعالیٰ: **عُقْدَةُ النِّكَاحِ** اصل میں عقدہ نکاحہ ہے۔ دارقطنی نے حضرت قتیبہ بن سعید کی حدیث سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ ابن لہیعہ نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ولی عقدہ النکاح الزوج (1) کہ نکاح کی گرہ کا ولی زوج ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب اور قاضی شریح رحمہم سے بھی مسند بیان کی گئی ہے۔ فرمایا: اسی طرح نافع بن جبیر، محمد بن کعب، طاؤس، مجاہد، شعبی اور سعید بن جبیر رحمہم نے بھی کہا ہے اور اس کے سوانے حضرت مجاہد اور حضرت ثوری رحمہم کا اضافہ کیا ہے۔ اسے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہم نے اختیار کیا ہے اور امام شافعی کے قول سے بھی یہی صحیح ہے۔ یہ تمام کے تمام عورت کے مہر میں سے کسی شے پر ولی کے لئے کوئی حق نہیں دیکھتے، اس پر اجماع ہونے کی وجہ سے کہ ولی اگر زوج کو طلاق سے پہلے مہر سے بری کر دے تو یہ جائز نہیں اور اسی طرح طلاق کے بعد بھی ہے۔

اور اس پر بھی اجماع ہے کہ ولی اس کے مال میں سے کوئی شے ہبہ کرنے کا مالک نہیں ہوتا اور مہر بھی اس کا مال ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اولیاء میں سے وہ بھی ہیں جن کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا اور وہ چچا کے بیٹے اور بھائیوں کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح باپ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ان میں سے وہ بھی ہے جس نے کہا وہ ولی ہے، اسے دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بیان کیا ہے (2)۔ انہوں نے کہا ہے: یہی ابراہیم، علقمہ اور حسن رحمہم کا قول ہے اور اس کے سوا حضرت عکرمہ، طاؤس، عطاء، ابوالزناد، زید بن اسلم، ربیعہ، محمد بن کعب، ابن شہاب، اسود بن یزید، شعبی، قتادہ، مالک اور شافعی کے قدیمی قول نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کا نصف مہر معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب اسے طلاق ہو جائے، چاہے وہ حیض کی عمر کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

عیسیٰ بن دینار نے کہا ہے: وہ اس میں سے کسی شے کے لئے اپنے باپ کی طرف رجوع نہیں کرے گی اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سے مراد ولی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول حصہ میں ارشاد فرمایا ہے: **وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَرْصَةٌ مِمَّا فَرَضْتُمْ** (البقرہ: 237) پس ازواج کا ذکر کیا اور اس خطاب کے ساتھ انہیں خطاب فرمایا، پھر فرمایا: **إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ** پس عورتوں کا ذکر کیا۔ **أَوْ يَعْفُوا** الذی یبیدہ **عُقْدَةُ النِّكَاحِ** تو یہ تیسرا حصہ ہے اسے اس زوج کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا جس کا ذکر پہلے ہوا مگر یہ کہ اس کے سوا کوئی موجود نہ ہو، حالانکہ وہ پایا گیا

ہے اور وہ ولی ہے اور وہی مراد ہے۔ اس کا یہ معنی مکی نے بیان کیا ہے اور اسے ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ** اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ہر عورت معاف نہیں کر سکتی، کیونکہ صغیرہ اور وہ عورت جس پر پابندی ہو ان کے لئے معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں قسموں کو بیان فرما دیا اور فرمایا: **إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ** یعنی اگر وہ اس کے اہل ہوں **أَوْ يَعْفُوا** **الَّذِي بَيْنَهُمَا عِقْدَةُ النِّكَاحِ** اور اس سے مراد ولی ہے کیونکہ اس میں اختیار اسی کے پاس ہے۔

اور اسی طرح ابن وہب، اشہب، ابن عبدالحکم اور ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی باکرہ بیٹی کے حق میں باپ ہے اور اپنی لونڈی کے حق میں آقا ہے۔ اور بلاشبہ ولی کا معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب کہ وہ صائب الرائے لوگوں میں سے ہو اور اس کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا جبکہ وہ بیوقوف اور احمق ہو۔

اور اگر کہا جائے: ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے مراد ولی ہے بلکہ اس سے مراد زوج ہے اور یہ اسم اس کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ یہ ولی کی نسبت عقد کرنے کا زیادہ مالک ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ باکرہ بیٹی کے حق میں باپ کی نسبت زوج عقد کا زیادہ مالک ہوتا ہے، بلکہ وہاں تو صرف باکرہ کا باپ مالک ہوتا ہے نہ کہ زوج، کیونکہ جس پر عقد کیا گیا ہے وہ باکرہ کی بضع ہے اور زوج اس کا عقد کرنے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ باپ اس کا مالک ہوتا ہے۔

اور شریح نے بھائی کے نصف مہر معاف کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور اسی طرح عکرمہ نے کہا ہے: اس کا معاف کرنا بھی جائز ہے جس نے دونوں کے درمیان عقد نکاح کیا چاہے وہ چچا ہو یا باپ ہو یا بھائی ہو۔ اگرچہ وہ ناپسند بھی کرے۔ ابوہنیکہ اور شعبی نے **أَوْ يَعْفُوا** و **أَوْ كَوَالِفَ** کے مشابہ قرار دے کر اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی مثل شاعر کا قول بھی ہے:

فما سودتني عامر عن وراثة
ابن الله أن أسو بأم ولا أب
اس میں اسبو کی واؤ کو سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: **وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبَ لِلتَّقْوَىٰ** یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور **تَعْفُوا** اصل **تَعْفُوا** ہے پہلی واؤ کو ساکن کر دیا گیا اس پر حرکت ثقیل ہونے کی وجہ سے، پھر التقای ساکنین کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ خطاب مردوں اور عورتوں کو ہے اور مردوں کو اس میں غلبہ دیا گیا ہے۔ اور لام بمعنی الی ہے یعنی اقرب الی التقویٰ۔

اور جمہور نے اسے تعفوتاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوہنیکہ اور شعبی نے **وَأَنْ يَعْفُوا** یا **أَمْ** کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ ضمیر اسی کی طرف راجع ہے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے دَا ن تعفون تاء کے ساتھ نہیں پڑھا گیا کہ یہ عورتوں کے لئے ہو۔

اور جمہور نے وَلَا تَتَسَوَّا الْفَضْلَ کو دَاؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یحییٰ بن عمر نے اسے کسرہ دیا ہے۔ اور حضرت علی، مجاہد، ابو حیوہ، ابن ابی عبیدہ رضی اللہ عنہم نے وَلَا تَتَسَوَّا الْفَضْلَ پڑھا ہے۔ اور یہ قراءت معنی کو پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ تناسی (بھولنے کا بہانہ کرنا) کا محل ہے نہ کہ نسیان کا مگر تشبیہ کی بنا پر۔

مجاہد نے کہا ہے: الفضل سے مراد مرد کا کل مہر کو مکمل کرنا ہے یا عورت کا اپنے نصف مہر کو چھوڑ دینا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ یہ خبر اپنے ضمن میں محسن کے لئے وعدہ اور غیر محسن کے لئے محرومی کے لئے ہوئے ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر تمہارا معاف کرنا اور تمہارا پورا پورا طلب کرنا مخفی نہیں ہے۔

حِفْظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلّٰهِ قَنِتِيْنَ ﴿۳۶﴾

”پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے عاجزی کرتے ہوئے۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حِفْظُوا یہ خطاب تمام امت کو ہے اور یہ آیت نمازوں کو ان کے اوقات میں ان کی تمام شرائط کے ساتھ قائم کرنے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرنے کا حکم ہے۔

اور محافظت کا معنی کسی نہ پر مداومت اور مواظبت اختیار کرنا ہے اور الوسطی الاوسط کی تانیث ہے اور کسی شے کا وسط اس کا بہترین، عمدہ اور مناسب ہونا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا اس کی تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک اعرابی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

يا اوسط الناس طمًا بي مفاخرهم واکرم الناس أمّا برة و أبا

اور وسط فلان القوم یسطہم یعنی فلاں ان کے وسط میں ہو گیا۔ اور الصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ کا علیحدہ اور منفرد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ الصلوات کے عموم میں بھی وہ داخل ہے تو اس کی عظمت اور مرتبہ کے اظہار کے لئے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّنَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ (الاحزاب: 7) (اور اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے) (اس میں مِنْكَ اور مِنْ نُوحٍ کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے حالانکہ النبیین کے عموم میں یہ داخل ہیں۔ تو یہ اظہار شرف و مرتبہ کے لئے ہے) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ﴿۳۶﴾ (الرحمن) (ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے۔)

(فَاكِهَةٌ کے عموم میں داخل ہونے کے باوجود نخل اور رمان کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے۔)

ابو جعفر الواسطی نے وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ کو اغراء کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اَلْزَمُوا الصَّلَاةَ الْوُسْطَىٰ (تم صلوٰۃ وسطیٰ کو لازم پکڑو) اور اسی طرح حلوانی نے بھی پڑھا ہے۔

اور قالون نے نافع سے الوسطی صا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ طاء اس کی مجاورت میں ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی محل میں سے ہیں۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ صراط وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ لوگوں نے وَالصَّلَاةَ الْوُسْطٰی کی تعیین میں اختلاف کیا ہے اس پر دس اقوال ہیں۔

(۱) اس سے مراد ظہر ہے، کیونکہ یہ نماز دو قولوں میں سے صحیح قول کی بنا پر دن کے وسط میں ہے کہ دن کا آغاز طلوع فجر سے ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور ہم نے ظہر سے ابتدا کی ہے کیونکہ یہی وہ پہلی نماز ہے جو اسلام میں ادا کی گئی۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی الصَّلَاةَ الْوُسْطٰی ہے ان میں سے حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبداللہ بن عمر اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

اور ان روایات میں سے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے ایک وہ ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی، جس وقت ان دونوں نے املا کر ائی حَافِظُوا عَلٰی الصَّلٰوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰی وَصَلَاةِ الْعَصْرِ اسے واؤ کے ساتھ بیان کیا (۱)۔

اور روایت ہے کہ یہ مسلمان پر بہت زیادہ شاق گزرتی ہے کیونکہ یہ تیز گرمی کے وقت میں آتی ہے درآنحالیکہ انہیں اپنے اموال میں کاموں نے خوب تھکا رکھا ہوتا ہے۔

اور ابوداؤد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز سخت گرمی میں ادا فرماتے تھے اور کوئی ایسی نماز نہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر اس سے زیادہ شاق اور مشقت آمیز ہوتی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: حَافِظُوا عَلٰی الصَّلٰوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰی اور یہ بھی فرمایا: اس سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں (۲)۔ اور امام مالک نے مؤطا میں اور ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: صلوٰۃ وسطیٰ صلوٰۃ ظہر ہے (۳)۔

طیالسی نے یہ زیادہ کہا ہے: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سخت گرمی کے وقت میں ادا فرماتے تھے۔

(۲) الصَّلَاةَ الْوُسْطٰی سے مراد نماز عصر ہے، کیونکہ اس سے پہلے دن کی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد رات کی دو نمازیں ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اس استدلال میں سے عمدہ اور اعلیٰ یہ ہے کہ یہ نماز ہے جس کے لئے وسطیٰ کہا گیا ہے کیونکہ یہ دو نمازوں کے درمیان ہے ان میں سے ایک وہ ہے جو سب سے اول فرض کی گئی اور دوسری وہ نماز ہے جو دوسرے نمبر پر فرض کی گئی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی نماز صلوٰۃ وسطیٰ ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم ہیں (۴)، یہی امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم کا مختار ہے۔ امام شافعی

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 59، وزارت تعلیم

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121، وزارت تعلیم

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم

4۔ صحیح بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہ اور اکثر اہل الاثر نے یہی کہا ہے اور عبد الملک بن حبیب نے بھی یہی موقف اپنایا ہے اور ابن عربی نے بھی قبس میں اور ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں اسے ہی اختیار کیا ہے اور کہا ہے: اسی قول پر جمہور لوگ ہیں اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

اور انہوں نے اس باب میں وارد ہونے والی احادیث سے استدلال کیا ہے انہیں مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور میں ان میں سے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیان کروں گا۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الصلوة الوسطی صلاۃ العصر صلاۃ وسطی نماز عصر ہے۔ اسے ترمذی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1) اور ہم اس سے زیادہ احادیث ”القبس فی شرح مؤطا مالک بن انس“ میں لائے ہیں۔

(۳) الصلوة الوسطی سے مراد نماز مغرب ہے۔ قبیصہ بن ابی ذؤیب نے ایک جماعت میں یہی کہا ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ یہ رکعتوں کی تعداد میں متوسط ہے نہ رکعتوں کی تعداد بہت کم ہے اور نہ ہی بہت زیادہ ہے اور نہ ہی سفر میں اس کی قصر کی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ اپنے وقت سے مؤخر کیا ہے اور نہ ہی اسے جلدی ادا فرمایا ہے اور اس کے بعد دو نمازیں جہری ہیں اور اس سے پہلے دو نمازیں سری ہیں اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”بما شبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل ترین نماز مغرب ہے۔ اس نے اسے نہ کسی مسافر سے ساقط کیا اور نہ کسی مقیم سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ رات کی نماز کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ دن کی نمازوں کو ختم کر دیا۔ پس جس نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا اور جس نے اس کے بعد چار رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے بیس سال کے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا۔ یا فرمایا چالیس سال کے۔“

(۴) الصلوة الوسطی سے مراد عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان ہے جن کی قصر نہیں کی جاتی اور یہ نیند کے وقت میں آتی ہے اور اس میں تاخیر کرنا مستحب ہوتا ہے اور یہ شاق اور گراں ہوتی ہے، لہذا اس کی محافظت کی تاکید فرمائی۔

(۵) الصلوة الوسطی سے مراد صبح کی نماز ہے، کیونکہ اس سے پہلے رات کی دو نمازیں ہیں جن میں قراءت بالجہر کی جاتی ہے اور اس کے بعد دن کی دو نمازیں ہیں جن میں سرا قراءت کی جاتی ہے اور اس لئے بھی کہ اس کا وقت داخل ہو جاتا ہے اور لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور اس کے لئے سردی کے موسم میں سردی کی شدت کی وجہ سے اٹھنا اور گرمی کے موسم میں رات کے چھوٹا ہونے کے باعث اٹھنا شاق اور مشکل ہوتا ہے۔

اور جنہوں نے کہا کہ یہی صلوۃ وسطی ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ اسے مؤطا نے بلا غاذ کر کیا ہے۔ (یعنی امام مالک نے المؤطا میں فرمایا کہ ان دونوں سے یہ خبر ان کے پاس پہنچی ہے) اور ترمذی نے اسے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ (معلق ایسی روایت ہے جو غیر مسند ہو) اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی امام مالک اور آپ کے اصحاب کا قول ہے اور اسی کی طرف امام شافعی کا میلان ہے اس میں جو آپ سے اتشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت یہ ہے کہ صلوۃ وسطی نماز عصر ہے اور آپ

1۔ سنن ترمذی، باب ما جاء فی صلوۃ الوسطی، حدیث نمبر 166، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے یہ صحیح اور معروف سند سے مروی ہے۔ (1)

اور جنہوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَقُتُّمُوْا لِلّٰہِ قُنُتَیْنِ یعنی فیہا (اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے اس میں عاجزی کرتے ہوئے) (لیکن استدلال کرنے والوں نے ترجمہ کیا قنوت پڑھتے ہوئے۔) اور صبح کی نماز کے سوا کوئی فرض نماز نہیں ہے جس میں قنوت ہو۔ ابورجاء نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہمیں بصرہ میں صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھائی اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا: یہ وہ صلوٰۃ وسطیٰ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس میں قنوت پڑھتے ہوئے کھڑے رہیں۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں رکوع کے بعد قنوت پڑھی (2)۔ قنوت کا حکم آگے آئے گا اور اس بارے میں علماء کی جو آراء ہیں سورہ آل عمران میں اس ارشاد کے تحت: لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (آل عمران: 128)

(۶) الصَّلٰوۃُ الْوُسْطٰی سے مراد جمعہ کی نماز ہے کیونکہ اس کے لئے جمع ہونے اور اس میں خطبہ ہونے کے سبب اسے خاص کیا گیا ہے اور اسے عید بنایا گیا ہے۔ ابن حبیب اور مکی نے یہ ذکر کیا ہے۔ اور مسلم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس قوم کے لئے جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں لقد ھست ان امر رجلا یصلی بالناس ثم احرق علی رجال یتخلفون من الجمعة بیوتھم (3) میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں کسی آدمی کو لوگوں کو نماز پڑھانے کے لئے حکم دوں پھر ان لوگوں کو ان کے گھروں میں جلا دوں جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

(۷) الصَّلٰوۃُ الْوُسْطٰی سے مراد صبح اور عصر کی دونوں نمازیں ہیں۔ شیخ ابوبکر البہری نے یہی کہا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: یتعاقبون فیکم ملائکۃ باللیل و ملائکۃ بالنھار الحدیث (4) (تم میں رات اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے ہوتے ہیں۔) اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: اما انکم سترون ربکم کما ترون هذا القمر لا تضامون فی رؤیتہ فان استطعتم الا تغلبوا علی صلاۃ قبل طلوع الشمس و صلاۃ قبل غروبھا، یعنی العصر و الفجر۔ (بے شک عنقریب تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم ان چاند کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اس کی رؤیت میں کوئی مشقت نہ ہوگی۔ پس اگر تم

1۔ صحیح بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث نمبر 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت الخ، حدیث نمبر 946، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 232، وزارت تعلیم

4۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 79، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 522، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استطاعت رکھو تو خبردار! اس نماز کے بارے میں تم مغلوب نہ ہو جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہے اور وہ نماز جو غروب آفتاب سے پہلے ہے) ان سے مراد عصر اور فجر کی نمازیں ہیں۔ پھر حضرت جریر نے یہ آیت پڑھی وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا (طہ: 130) (1) (اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔)

اور حضرت عمارہ بن رؤبہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”ہرگز کوئی آگ میں داخل نہ ہوگا جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھی (2)۔“ ان سے مراد بھی فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔

اور انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ صَلَّى الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ (3) جس نے دو ٹھنڈی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ تمام صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہیں۔ ان دونوں نمازوں کو بزدین کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں نمازیں ٹھنڈک کے وقت میں پڑھی جاتی ہیں۔

(۸) الصَّلَاةُ الْاَوْسَطُ سے مراد عشاء اور صبح کی نمازیں ہیں۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مرض کے دوران فرمایا جس میں ان کا وصال ہوا: تم سنو اور تم اپنے پیچھے آنے والوں کو بھی پہنچاؤ ان دونوں نمازوں پر مواظبت اختیار کرو۔ یعنی جماعت کے ساتھ ادا کرو۔ عشاء اور صبح کی نمازیں اور اگر تم جان لو جو ان دونوں میں (اجر) ہے تو تم ان دونوں کو ادا کرنے کے لئے آؤ اگرچہ تمہیں اپنی کہنیوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے۔

ائمہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”اگر وہ جان لیں جو (اجر) عشاء اور صبح کی نمازوں میں ہے تو وہ ان دونوں کے لئے آئیں اگرچہ گھسٹ کر آنا پڑے اور فرمایا بے شک یہ دونوں نمازیں منافقین پر بہت سخت اور بھاری ہیں (4)۔“ اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے والے کے لئے پوری رات قیام کرنے اور عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے والے کے لئے نصف رات قیام کرنے کا (اجر) رکھا گیا ہے۔ اسے امام مالک نے موقوف علی عثمان ذکر کیا ہے اور مسلم نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے آپ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ شَهِدَ الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ كَانَ لَهُ قِيَامُ نِصْفِ لَيْلَةٍ وَمَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ فِي جَمَاعَةٍ كَانَ لَهُ قِيَامُ لَيْلَةٍ (5) جو آدمی عشاء کی جماعت میں حاضر ہوا اس کے لئے نصف رات قیام کرنے کا اجر ہے اور جس نے عشاء اور فجر کی نمازیں

- 1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم
- 2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 521، نسیاء القرآن پبلی کیشنز
- 3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰۃ الفجر، حدیث نمبر 540، نسیاء القرآن پبلی کیشنز
- 4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، باب فضل العشاء الخ، حدیث نمبر 617، نسیاء القرآن پبلی کیشنز
- 5۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 30، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب فضل صلوٰۃ الجماعة، حدیث نمبر 468، نسیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ترمذی، باب ما جاء فی فضل العشاء والفجر فی الجماعة، حدیث نمبر 205، نسیاء القرآن پبلی کیشنز

جماعت کے ساتھ ادا کیں تو اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کی طرح اجر ہے۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جسے امام مالک اور مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

(۹) یہ پانچوں کی پانچویں نمازیں ہیں یہ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ سے فرض اور نفل کو شامل ہے پھر فرض کا خصوصاً ذکر کیا۔

(۱۰) الصَّلَاةُ الْوُسْطَى سے مراد غیر معین نماز ہے۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کیا ہے اور ربیع بن خثیم نے بھی یہی کہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نمازوں میں صلوٰۃ وسطیٰ کو اسی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے جیسے کہ رمضان المبارک میں لیلة القدر کو مخفی رکھا ہے اور جس طرح کہ جمعہ کے دن (مقبول) ساعت کو اور رات کی ان ساعتوں کو مخفی رکھا جن میں دعا مقبول ہوتی ہے، تاکہ وہ رات کے وقت اندھیروں میں عالم الخفیات کی مناجات کے لئے قیام کریں۔

اور جس سے اس کی صحت پر استدلال ہوتا ہے کہ یہ مبہم ہے غیر معین ہے وہ وہ روایت ہے جسے مسلم نے اپنی صحیح میں باب کے آخر میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی: حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَصَلَاةَ الْعَصْرِ تم نمازوں پر اور نماز عصر پر مواظبت اختیار کرو۔ پس ہم نے اسے پڑھا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور یہ نازل ہوئی: حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةَ الْوُسْطَى تو کسی آدمی نے کہا: کیا یہ صلوٰۃ عصر ہی ہے؟ براء نے کہا ہے: میں نے تجھے خبر دی ہے کیسے یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے منسوخ فرمایا؟ (۱) واللہ اعلم۔ پس اس سے لازم ہوا کہ اسے معین کرنے کے بعد اس کی تعیین کو منسوخ کر دیا گیا اور اسے مبہم رکھا گیا پس تعیین اٹھ گئی۔ واللہ اعلم۔

اور یہ مسلم کی پسند ہے، کیونکہ اسے باب کے آخر میں لایا گیا ہے اور علماء متاخرین میں سے کئی ایک نے اسی طرح کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دلائل کے مابین تعارض ہونے اور ترجیح نہ ہونے کی وجہ سے (علماء متاخرین نے یہی کہا ہے۔) پس تمام نمازوں پر محافظت اور ان کے اوقات میں ان کی ادائیگی کے سوا کوئی شے باقی نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ الصَّلَاةُ الْوُسْطَى میں یہ اختلاف ان کے بطلان پر دلالت کرتا ہے جنہوں نے وصلوٰۃ العصر ثابت کیا ہے جو کہ ابو یونس مولیٰ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں مذکور ہے جبکہ آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ آپ کے لئے مصحف قرآنی لکھے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: بلاشبہ یہ الفاظ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تفسیر کی مانند ہیں۔ اور اس پر عمرو بن رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حکم ارشاد فرمایا کہ میں ان کے لئے مصحف لکھوں۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس آپ نے مجھے اسی طرح املاء کرائی حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةَ الْوُسْطَى --- وہی العصر۔۔۔ وَقَوْمُوا لِلَّهِ قِنْتَيْنِ (۲) اور فرمایا: اسی طرح میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا۔ پس آپ کا قول وہی العصر اس پر دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ میں سے الصَّلَاةَ الْوُسْطَى کی اپنے قول وہی العصر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 227، وزارت تعلیم

2۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 121-122، وزارت تعلیم

کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔ اور نافع نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے صلاة العصر کے الفاظ روایت کیے ہیں (1) جیسا کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے صلاة العصر کے الفاظ بھی یعنی بغیر واو کے روایت کیے گئے ہیں (2)۔

اور ابو بکر الانباری نے کہا ہے: اس زائد لفظ میں یہ اختلاف اس کے بطلان پر اور جو کچھ تمام مسلمانوں کے مصحف الامام میں ہے اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اور اس پر ایک دوسری دلیل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جنہوں نے کہا: والصلاة الوسطى وصلاة العصر انہوں نے ہی صلاة وسطی غیر عصر کو قرار دیا ہے۔ اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا رد ہے جسے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: غزوہ احزاب کے دن مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو عصر کی نماز سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج کا رنگ زرد ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شغلونا عن الصلاة الوسطى ملائكة الله اجوافهم وقبورهم ناراً (3) الحدیث۔ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطی سے مشغول رکھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَالصَّلَاةُ الْوُسْطَىٰ میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وتر واجب (فرض) نہیں ہیں، کیونکہ مسلمانوں کا فرض نمازوں کی تعداد پر اتفاق ہے کہ وہ سات سے کم ہیں اور تین سے زیادہ ہیں اور تین سے سات کے درمیان سوائے پانچ کے اور کوئی طاق عدد نہیں ہے۔ اور جفت اعداد کا کوئی وسط نہیں تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور حدیث معراج میں یہی پانچ ہی وہ پچاس ہیں کیونکہ میرے نزدیک قول تبدیل نہیں ہوتا۔ ہی خمس و هن خمسون لا يبدل القول لدي۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَقَوْمُوا لِلَّهِ قَلْبَيْنِ اس کا معنی ہے تم اپنی نمازوں میں عجز و انکساری کرتے ہوئے کھڑے رہو۔ اور لوگوں کا قَلْبَيْنِ کے معنی میں اختلاف ہے۔ حضرت شعبی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے طائعين اطاعت کرنے والے اور حضرت جابر بن زید، عطاء اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: قرآن کریم میں ہر مقام پر قنوت کا لفظ طاعت کے معنی میں ہے۔ اور ابو سعید نے حضور نبی مکرم ﷺ سے یہی بیان کیا ہے اور بے شک ہر دین والے آج وہ نافرمانی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ لہذا اس امت کو کہا گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت و پیروی کرتے ہوئے کھڑے رہو (4)۔

اور مجاہد نے کہا ہے: قَلْبَيْنِ کا معنی ہے خاشعين خشوع کرنے والے۔ قنوت کا معنی ہے رکوع کو طویل کرنا، خشوع کرنا، آنکھوں کو جھکانا اور عجز و انکساری کرنا۔

اور ربیع نے کہا ہے: القنوت کا معنی ہے قیام کو طویل کرنا (5)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور اَقْنِ هُوَ قَانِتٌ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعہ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن للجمہاص، جلد 1، صفحہ 442، دار الکتاب العربیہ بیروت

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 323، دار الکتب العلمیہ

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 227، د۔ ت

5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 324

اَنَّا اَتَيْنَاكَ سَاجِدًا وَقَاطِبًا پڑھا ہے۔ (الزمر: 9) (بھلا جو شخص عبادت میں بسر کرتا ہے رات کی گھڑیاں کبھی سجدہ کرتے ہوئے اور کبھی کھڑے ہوئے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: افضل الصلاة طول القنوت (1) افضل نماز طویل قیام والی ہے۔ مسلم وغیرہ نے اسے بیان کیا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

قَاتِلًا يَدْعُو رَبَّهُ دَعَا عَمِيدٍ مِنَ النَّاسِ اعْتَزِلْ

اس میں بھی قاتل طویل قیام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: قاتلین داعین۔ دعا مانگنے والے، پکارنے والے (2)۔ اور حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک قنوت پڑھی اور آپ رعل و ذکوان کے خلاف دعا مانگتے رہے (3)۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے دعا۔ اس نے دعا مانگی۔ اور ایک قوم نے کہا: ہے اس کا معنی ہے طول قیام۔ اس نے اپنا قیام طویل کیا۔ اور سدی نے کہا ہے: قاتلین کا معنی ہے ساکتین۔ خاموش رہنے والے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت نماز میں کلام کرنے سے روکنے کے لئے نازل ہوئی۔ اور ابتدائے اسلام میں یہ مباح تھی اور یہی صحیح ہے اس روایت کی وجہ سے جسے مسلم وغیرہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرتے تھے، درآنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہوتے اور آپ ہم پر جواب لوٹاتے تھے اور جب ہم نجاشی کے پاس سے لوٹ کر آئے، ہم نے آپ پر سلام پیش کیا تو آپ نے ہمیں جواب نہ لوٹایا، تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ پر نماز میں سلام عرض کرتے تھے اور آپ ہم پر جواب لوٹاتے تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان فی الصلوٰۃ شغلا (4) بے شک نماز میں مشغولیت ہے۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا اور کہا: ہم نماز میں کلام کرتے تھے ایک آدمی اپنے ساتھی سے گفتگو کر لیتا تھا درآنحالیکہ وہ اس کے پہلو میں حالت نماز میں ہوتا، یہاں تک کہ پھر یہ آیت نازل ہوئی: قُومُوا لِلّٰهِ قُنُوتًا۔ پھر ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور گفتگو سے ہمیں روک دیا گیا (5)۔

اور کہا گیا ہے: لغوی اعتبار سے قنوت کا اصل معنی کسی شے پر دوام اختیار کرنا ہے اور اس حیثیت سے کہ لغت میں قنوت کا اصل معنی دوام علی الشیء ہے۔ یہ جائز ہے کہ طاعت و پیروی پر دوام اختیار کرنے والے کو قنوت کا نام دیا جائے اور اسی طرح جس نے قیام، قراءت اور دعا نماز میں طویل کر دیے یا خشوع اور سکوت کو طویل کیا۔ یہ سب کے سب قنوت کرنے والے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ سب کے سب مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نماز میں جان بوجھ کر کلام کرنا جبکہ نمازی جانتا ہو

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت قبل الركوع وبعده، حدیث نمبر 948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ما ینبی عنہ من الکلام، حدیث نمبر 1124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، باب ما ینبی عنہ من الکلام فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر 1125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہ وہ نماز میں ہے اور وہ کلام اس کی نماز کی اصلاح کے بارے میں نہ ہو تو وہ نماز کو فاسد کر دیتی ہے، سوائے اس روایت کے جو اوزاعی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: جس نے نفس کے احیاء کے لئے کلام کی یا اسی جیسے بڑے امور کے بارے میں تو اس کے ساتھ اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ یہ قول نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَقُوْا لِيْلَهٗ قُنِيْتَيْنِ۔ اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نماز میں کلام کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَقُوْا لِيْلَهٗ قُنِيْتَيْنِ۔ (1) الحدیث اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ حکم بیان کیا ہے کہ تم نماز میں کلام نہ کرو“ (2) اور ایسا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے جس کے لئے نماز کو توڑنا وہ پسند کرتا ہو اور اس وجہ سے وہ استیناف سے منع کرتا ہو۔ پس جس کسی نے ایسے کام کے لئے اپنی نماز کو توڑ دیا جسے وہ احیاء نفس یا مال یا ایسا کام جو انہی کے طریقہ پر ہو کے لئے فضیلت دیکھتا ہو تو وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے اور بنا کرے۔ اس مسئلہ میں یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ نماز کے دوران بھول کر کلام کرنے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس امام مالک اور امام شافعی رحمہما علیہما اور ان کے اصحاب ان تمام نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز میں سہواً گفتگو کرنا اسے فاسد نہیں کرتا۔ لیکن امام مالک نے یہ بھی کہا ہے: نماز میں عمداً گفتگو کرنا بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا بشرطیکہ وہ اس کی کیفیت اور اس کی اصلاح کے بارے ہو۔ یہی ربیعہ اور ابن القاسم کا قول ہے۔

اور محنوں نے ابن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک رحمہما علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر کسی قوم کو امام نے دو رکعتیں نماز پڑھائی اور بھول کر سلام پھیر دیا اور انہوں نے اس کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہا) کہی اور وہ اسے نہ سمجھا، تو ان لوگوں میں سے جو اس کے پیچھے نماز میں تھے ایک آدمی نے کہا: بلاشبہ تم نے نماز مکمل نہیں کی سو اپنی نماز مکمل کرو۔ پس وہ قوم کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا یہ حق ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ تو فرمایا: امام انہیں وہ نماز پڑھا دے گا جو ان کی نماز میں سے باقی ہے اور وہ اس کے ساتھ اپنی بقیہ نماز پڑھیں گے ان میں سے وہ بھی جس نے کلام کیا اور ان پر کوئی شے نہ ہوگی اور وہ اس میں وہی کچھ کرنے والے ہوں گے جو کچھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالیدین کے دن کیا۔ یہ المدونہ میں ابن القاسم کا قول ہے اور ان کی روایت امام مالک سے ہے اور یہ امام مالک کے تمام اصحاب ذوالیدین کے مسئلہ میں امام مالک کے قول کے خلاف ہیں سوائے اکیلے ابن قاسم کے، کیونکہ اس بارے میں وہی امام مالک کا قول بیان کرتے ہیں اور ان کے سوا دوسرے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: بلاشبہ یہ ابتداءً اسلام میں ہوا۔ اور آپ لوگ اپنی نماز کے بارے میں پہنچانتے ہیں۔ پس جس کسی نے اس دوران گفتگو کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔ اور یہی قول

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ کل یوم مہولی شان، قبل حدیث الحدیث 6968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عراقیین کا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب، اور ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نماز میں گفتگو کرنا کسی بھی حال میں اسے فاسد کر دیتا ہے چاہے وہ سہوا ہو یا عمداً ہو، نماز کے بارے میں ہو یا کسی غیر کے بارے میں۔ اور یہی ابراہیم نخعی، عطاء، حسن، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ کے اصحاب کا خیال ہے کہ ذوالیدین کے قصہ کے بارے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کی حدیث سے منسوخ ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اگرچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام ہیں لیکن انہوں نے ذوالیدین کی حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے جیسا کہ انہوں نے اس حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے: من ادرکہ الفجر جنباً فلا صوم لہ (1) جسے جنبی حالت میں فجر نے پالیا تو اس کے لئے روزہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کثرت سے مرسل حدیثیں روایت کرتے ہیں۔

اور علی بن زیاد نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں ابو قرہ نے بتایا کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: جب آدمی نماز میں کلام کرے تو مستحب یہ ہے کہ وہ اس کا اعادہ کرے اور بنا نہ کرے۔ مزید کہا: اور ہمیں امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو فرمائی اور اس دن آپ کے اصحاب نے بھی آپ کے ساتھ گفتگو کی، کیونکہ ان کا گمان تھا کہ نماز کم ہو گئی ہے اور آج کسی کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اور سخون نے ابن القاسم سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس نے اکیلے نماز پڑھی اور اپنی طرف سے وہ چار رکعتوں سے فارغ ہو گیا، تو اس کے پہلو میں موجود ایک آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ تو نے تو صرف تین رکعتیں پڑھی ہیں، تو وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: کیا یہ درست ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: اس کی نماز فاسد ہو گئی اور اس کو نہیں چاہئے تھا کہ وہ اس سے کلام کرتا اور نہ یہ چاہئے تھا کہ اس (دوسرے) کی طرف متوجہ ہوتا۔

ابو عمر نے کہا ہے: وہ اس مسئلہ میں جماعت کے ساتھ امام اور منفرد کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ پس وہ امام اور اس کے مقتدیوں کے لئے نماز کی حالت کے بارے کلام کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور منفرد کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ان کے سوا دوسرے اس مسئلہ میں ابن القاسم کے جواب کو منفرد اور امام اور اس کے ساتھیوں پر محمول کرتے ہیں آپ کے اس قول میں اختلاف کی بنا پر جو ذوالیدین کی حدیث کے استعمال میں ہے۔ جیسا کہ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے۔

اور امام شافعی اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: جس نے عمداً کلام کیا اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس نے نماز مکمل نہیں کی اور یہ کہ وہ نماز میں ہے تو اس نے اپنی نماز کو فاسد کر دیا اور اگر اس نے سہواً گفتگو کی یا اس نے گفتگو کی اور وہ یہ گمان کرتا ہو کہ وہ نماز میں نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی طرف سے اسے مکمل کر لیا ہے تو وہ بنا کر سکتا ہے۔

اس مسئلہ میں امام احمد نے اختلاف کیا ہے اور ان سے الاثرم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی نے اپنی نماز کے دوران اس کی اصلاح کے لئے جو گفتگو کی تو اس سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوئی۔ اور اگر اس کے سوا کوئی اور گفتگو کی تو اس کی

نماز فاسد ہوگئی۔ یہی امام مالک کا مشہور قول ہے اور الحزبی نے ان سے ذکر کیا ہے کہ ان کا مذہب اس کے بارے میں جس نے عہد کلام کیا یا بھول کر، یہ ہے کہ اس کی نماز باطل ہوگئی، سوائے صرف امام کے کیونکہ جب اس نے اپنی نماز کی اصلاح کے لئے گفتگو کی تو اس کی نماز باطل نہیں ہوئی۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے سحنون نے یہ استثنایان کی ہے کہ جس نے چار رکعت نماز میں دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور وہاں کلام ہوئی تو نماز باطل نہ ہوگی اور اگر اس کے سوا کسی اور محل میں کلام واقع ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اور صحیح وہ ہے جو امام مالک کا مشہور قول ہے اور حدیث سے استدلال ہے اور احکام کے متعدی ہونے اور شریعت کے عموم کے بارے میں اسے اصل کلی پر محمول کرتے ہوئے اور خصوصیت کے وہم کو دور کرتے ہوئے جبکہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور اگر کوئی کہنے والا کہے: تحقیق کلام بھی نماز میں واقع ہوئی اور سہو بھی، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: ”تسبیح کہنا مردوں کے لئے ہے اور تالی بجانا عورتوں کے لئے ہے“ (1) تو انہوں نے تسبیح کیوں کر نہ کہی؟ تو کہا جائے گا: شاید اس وقت میں انہیں اس کا حکم نہیں تھا اور اگر تھا جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے تسبیح نہ کہی، کیونکہ انہیں یہ وہم ہوا کہ نماز کم ہوگئی ہے۔ اس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ فرمایا: لوگوں میں سے ایک تیز رفتار آدمی نکل گیا تو لوگوں نے کہا: کیا نماز کم ہوگئی ہے؟ پس اس وجہ سے کلام کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

اور بعض مخالفین نے کہا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول صلی بن رسول اللہ ﷺ یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور وہ (ابو ہریرہ) ان میں سے نہ ہوں، جیسا کہ نزال بن سبرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا: ”بے شک ہم اور تم بنی عبد مناف پکارے جاتے تھے اور تم آج بنو عبد اللہ ہو اور ہم بھی بنو عبد اللہ ہیں“۔ (2) اس سے مراد یہ لیا ہے کہ آپ نے یہ اپنی قوم کو فرمایا اور یہ بعید ہے، کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کہیں صلی بن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی حالانکہ اس وقت وہ کافر تھے۔ اہل صلوٰۃ میں سے نہ تھے اور یہ کذب ہوگا، اور نزال کی حدیث وہ بھی من جملہ قوم میں سے تھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا جو سنا۔

اور رہا وہ دعویٰ جو ضیفہ نے نسخ اور ارسال کے بارے کیا ہے تو ہمارے علماء وغیرہم نے ان کے قول کا جواب دیا ہے اور اسے باطل قرار دیا ہے۔ خاص کر حافظ ابو عمر ابن عبد البر نے اپنی کتاب ”المتمہید“ میں یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فتح خیبر کے سال اسلام لائے اور اسی سال مدینہ طیبہ میں آئے۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ کی صحبت میں چار سال تک رہے اور ذوالحجہ کے قصبے کو دیکھا اور اس میں حاضر تھے۔ اور یہ بدر سے پہلے کا نہیں ہے جیسا کہ انہوں نے گمان کیا ہے اور ذوالحجہ میں بدر میں شہید ہوئے۔ فرمایا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذوالحجہ کے دن حاضر ہونا ثقہ حفاظ کی روایت کے مطابق محفوظ ہے اور جنہوں نے اسے جانا، اسے یاد کیا اور اس کا ذکر کیا ان کے خلاف حجت لانے سے جو باز رہے اس میں ان کی کوئی کوتاہی نہیں ہے۔

1- صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 180، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب التعقیق للنساء، حدیث 1128، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، صحیح بخاری، باب تشبیک الاصابہ الخ، حدیث 460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2- شرح مشکل الآثار، جلد 8، صفحہ 282، موسسۃ الرسالۃ بیروت،

مسئلہ نمبر 8۔ القنوت: اس کا معنی قیام ہے اور یہ اس کی ان اقسام میں سے ایک ہے جو ابو بکر بن انباری نے ذکر کی ہیں۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ فرض نماز میں قیام کرنا ہر تندرست اور اس پر قدرت رکھنے والے آدمی پر واجب ہے چاہے وہ منفرد ہو یا امام ہو۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ امام بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس جب کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو“ (1) الحدیث۔ اسے ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا بیان ہے: وَقُومُوا لِلَّهِ قَنِتِينَ اور انہوں نے صحت مند مقتدی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو ایسے مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے جو کھڑے ہونے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اہل علم کے ایک گروہ نے اس کی اجازت دی ہے بلکہ جمہور اہل علم نے، کیونکہ امام کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ”اور جب وہ (امام) بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم تمام بھی بیٹھ کر نماز پڑھو“ (2)۔ یہی اس مسئلہ میں صحیح ہے۔ ابھی ہم بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور علماء کے ایک گروہ نے مریض امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہا ہے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے جبکہ آپ ﷺ نے اپنے اس مرض میں بیٹھ کر نماز پڑھائی جس میں آپ کا وصال ہوا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہو کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ اور آپ ﷺ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ نہیں کیا اور اپنی نماز انہیں کے ساتھ بیٹھ کر مکمل کی اور وہ کھڑے تھے۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ واقعہ آپ کے اپنے گھوڑے سے گرنے کے بعد کا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا دوسرا فعل پہلے فعل کے لئے ناسخ ہے۔

ابو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے ان میں سے امام شافعی رضی اللہ عنہ اور داؤد بن علی ہیں اور یہی ولید بن مسلم کی امام مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ امام کے پہلو میں ان میں سے کوئی کھڑا ہو جائے جو لوگوں کو امام کی نماز کے بارے بتلاتا رہے (یعنی امام کی حرکات و سکنات سے آگاہ رکھے)۔ امام مالک رضی اللہ عنہ سے یہ روایت غریب ہے۔

اور اس کے بارے اہل مدینہ کی ایک جماعت اور دوسروں نے کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی۔

اور امام مالک رضی اللہ عنہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ کوئی بیٹھنے والا کھڑے ہونے والوں کی امامت نہیں کرائے گا۔ پس اگر بیٹھ کر اس نے ان کی امامت کرائی تو امام اور مقتدی تمام کی نماز باطل ہوگی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”میرے بعد بیٹھ کر کوئی بھی امامت نہ کرائے گا“ (3)۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 89، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیؤتم، حدیث نمبر 647-648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیؤتم، حدیث نمبر 648-649، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 398، دار الحسن قاہرہ

فرمایا: اگر امام بیمار ہو تو امام کی نماز مکمل ہوگی اور اس کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز فاسد ہوگی۔ مزید کہا: جس نے بغیر علت کے بیٹھ کر نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ یہ امام مالک سے ابو مصعب نے اپنی مختصر میں روایت بیان کی ہے۔ پس جس نے بیٹھ کر نماز پڑھی اس پر وقت میں اور وقت کے بعد اعادہ واجب ہوگا۔ اور امام مالک سے اس بارے میں روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ صرف وقت میں اعادہ کریں گے۔ اور اس بارے میں امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کا قول امام مالک کے مشہور قول کی مثل ہی ہے۔ انہوں نے اپنے قول کے لئے اور اپنے مذہب کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابو مصعب نے بیان کیا ہے، اسے دارقطنی نے جابر سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالساً دارقطنی نے کہا ہے: اسے جابر جعفی کے سوا کسی نے حضرت شعبی سے روایت نہیں کیا ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔ یہ روایت مرسل ہے، اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ ابو عمر نے کہا ہے: جابر جعفی کسی بھی شے سے حجت نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ اسے مسند روایت کرتا ہو تو پھر اس سے کیسے استدلال ہو سکتا ہے جسے وہ مرسل روایت کرتا ہے؟

امام محمد بن حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: جب مریض امام بیٹھ کر ایسی قوم کو نماز پڑھائے جن میں کچھ صحت مند اور کچھ مریض ہوں تو امام کی نماز اور اس کے پیچھے پڑھنے والوں میں سے ان کی نماز جو کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے صحیح اور جائز ہے اور ان کی نماز جن کے لئے قیام کا حکم ہے باطل ہے۔

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما نے کہا ہے: امام اور تمام مقتدیوں کی نماز جائز ہے اور انہوں نے کہا: اگر امام نے اشارے کے ساتھ ایسے لوگوں کو نماز پڑھائی جو رکوع و سجود کر سکتے ہیں تو تمام کے قول کے مطابق مقتدیوں کی نماز جائز نہیں اور امام کی نماز جائز ہے اور امام زفر کہتے ہیں: ان کی نماز بھی جائز ہوگی کیونکہ انہوں نے اپنے فرض ادا کیے ہیں اور ان کے امام نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی نے بھی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ابو عمر اور ان کے علاوہ ان سے پہلے اور بعد کے علماء نے کہا ہے کہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی، حالانکہ میں نے ان کے سوا کو اس کے خلاف بھی دیکھا ہے جنہوں نے اس باب میں طرق احادیث کو جمع کیا ہے اور ان پر گفتگو کی ہے اور اس بارے میں فقہاء کا اختلاف بھی ذکر کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے ہم اسے اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے تاکہ تیرے لئے راہ صواب واضح ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کے قول کی صحت واضح ہو جائے جس نے یہ کہا کہ تندرست مقتدی کا مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

پس ابو حاتم محمد بن حبان البستی نے المسند الصحیح میں اس کا ذکر کیا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک جماعت میں تھے تو آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم جانتے نہیں ہو کہ جس نے میری اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں میری طاعت ہے؟“ انہوں نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم تو شہادت دیتے ہیں کہ جس کسی نے آپ کی اطاعت کی تحقیق اس نے

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے آپ کی اطاعت ہے۔ پھر فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میری اطاعت یہ ہے کہ تم اپنے امراء کی اطاعت کرو۔ پس اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائیں تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو (1)۔“ اس کی سند میں عقبہ بن ابی الصہباء راوی ہے اور وہ ثقہ ہے، یحییٰ بن معین نے یہی کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس حدیث میں یہ واضح بیان ہے کہ مقتدیوں کا بیٹھ کر نماز پڑھنا جبکہ ان کا امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے اللہ تعالیٰ کی اس اطاعت میں سے ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے۔ یہ میرے نزدیک اس اجماع کی ایک قسم ہے جس کی اجازت پر انہوں نے اجماع کیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے چار ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ فتویٰ دیا ہے۔ (یعنی) حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسید بن حضیر اور حضرت قیس بن فہد رضی اللہ عنہم اور ان صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی ان چار کے خلاف مروی نہیں جو وحی اور قرآن کریم کے نزول کے وقت حاضر تھے اور جنہیں تحریف و تبدیل سے محفوظ رکھا گیا، نہ اسناد متصل کے ساتھ اور نہ منقطع کے ساتھ۔ تو گویا صحابہ کرام نے اس پر اجماع کیا کہ امام جب بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں پر بھی لازم ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھیں۔ اسی طرح جابر بن زید، اوزاعی، مالک بن انس، احمد بن حنبل، اسحاق ابن ابراہیم، ابو ایوب سلیمان بن داؤد البہاشی، ابو خثیمہ، ابن ابی شیبہ، محمد بن اسماعیل اور اصحاب حدیث میں سے جو ان کے تبعین ہیں مثلاً محمد بن نصر اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اور اس حدیث کو حضور نبی رحمت ﷺ سے حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب اور حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔

اس امت میں سب سے اول جس نے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے مقتدی کی نماز کو باطل قرار دیا جبکہ امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے وہ مغیرہ بن مقسم صاحب النخعی ہیں اور ان سے حماد بن ابی سلیمان نے اسے لیا ہے اور پھر حماد سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اسے اخذ کیا ہے اور پھر آپ کے بعد آنے والے آپ کے اصحاب نے آپ کی اتباع کی ہے اور اس بارے میں وہ اعلیٰ روایت جس سے انہوں نے استدلال کیا ہے اسے جابر جعفی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالساً اس روایت کی اسناد اگر صحیح بھی ہو تو بھی یہ مرسل ہے اور مرسل خبر اور وہ جسے کوئی روایت نہ کرے ہمارے نزدیک حکم میں دونوں برابر ہیں، پھر امام ابو حنیفہ کہتے ہیں: جن سے میں نے ملاقات کی ان میں حضرت عطا سے افضل میں نے کوئی نہیں دیکھا اور جن سے میں ملا ان میں جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا میں نے کوئی نہیں دیکھا اور میں کبھی اس کے پاس رائے سے کوئی شے نہیں لایا مگر وہ اس بارے میرے پاس حدیث لایا اور گمان ہوا کہ اس کے پاس اتنے اتنے ہزار رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں ہیں جن کے بارے گفتگو نہیں۔ پس یہ امام اعظم ابو حنیفہ ہیں جو جابر جعفی پر جرح کر رہے ہیں اور اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور یہ اس قول کی ضد ہے جس کی بنا پر آپ کے اصحاب نے آپ کا مذہب اختیار کیا ہے (2)۔

1۔ احسان فی تفریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 470، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ احسان فی تفریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 417 تا 474، موسسۃ الرسالہ بیروت

ابو حاتم نے کہا ہے: رہی حضور نبی کریم ﷺ کی وہ نماز جو آپ نے حالت مرض میں ادا فرمائی تو اس کے بارے میں مجمل اور مختصر اخبار مروی ہیں اور ان میں سے بعض مفصل اور واضح بھی ہیں، تو ان میں سے بعض میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں آکر بیٹھ گئے۔ پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتدا کر رہے تھے (1) اور بعض میں ہے: آپ ﷺ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب تشریف فرما ہو گئے۔ یہ روایت مفصل ہے۔ اس میں ہے: فکان النبی ﷺ یصلی بالناس قاعداً و ابو بکر قائماً پس حضور نبی رحمت ﷺ بیٹھ کر لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے اور ابو بکر کھڑے ہو کر۔

ابو حاتم نے کہا ہے: جہاں تک اس خبر کے اجمال کا تعلق ہے تو بلاشبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس مقام پر اس نماز کو بیان کیا ہے اور آخر القصہ یہ ہے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کے نزدیک کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس نماز میں بھی انہیں بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا جیسا کہ آپ نے انہیں اپنے گھوڑے سے گرنے کے وقت اس کا حکم دیا تھا (2)، محمد بن الحسن بن قتیبہ نے ہمیں خبر دی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں یزید بن موہب نے خبر دی ہے، انہوں نے کہا: مجھے لیث بن سعد نے ابو الزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ بیمار ہوئے تو ہم نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں تک آپ کی تکبیر کی آواز پہنچا رہے تھے۔ راوی فرماتے ہیں: آپ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں کھڑا دیکھا تو آپ ﷺ نے ہماری طرف اشارہ کیا تو ہم بیٹھ گئے اور ہم نے بیٹھ کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھی اور جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو فرمایا: ”قریب ہے کہ تم اہل فارس اور روم کے عمل جیسا عمل کرو وہ اپنے بادشاہوں کے پاس کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں پس تم اس طرح نہ کرو تم اپنے ائمہ کی اقتدا کرو اگر امام کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔“

ابو حاتم نے کہا ہے: پس اس مفصل خبر میں واضح بیان ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب بیٹھے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مقتدی ہو گئے اور وہ آپ ﷺ کی نماز کی اقتدا کرنے لگے اور آپ تکبیر کہتے اور وہ لوگوں تک تکبیر کی آواز پہنچاتے تاکہ وہ آپ ﷺ کی نماز کی اقتدا کریں اور اس وقت آپ ﷺ نے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا جب آپ نے انہیں کھڑے ہوئے دیکھا اور جب آپ اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے انہیں بیٹھنے کا بھی حکم فرمایا جب ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کی اس نماز میں حاضر تھے جس وقت آپ اپنے گھوڑے سے گرے اور آپ کی دائیں جانب کچھ زخمی ہوئی۔ آپ ﷺ ماہ ذی الحجہ ۵ھ کے آخر میں گرے تھے اور وہ اس نماز میں بھی حاضر تھے جو آپ ﷺ نے اپنے مرض کی حالت میں اس تاریخ کے علاوہ ادا فرمائی اور آپ نے ہر خبر کو اس کے الفاظ

2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 490-491

1۔ الاحسان فی تفسیر صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 489، موسسۃ الرسالہ بیروت ایضاً، صحیح بخاری، باب الرجل یاتہ بالامام الخ، حدیث نمبر 672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے ساتھ بیان فرمایا کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ وہ اس نماز میں ذکر کر رہے ہیں؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہتے ہوئے اپنی آواز بلند کی تاکہ لوگ آپ کی اقتدا کریں اور وہ نماز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے سے گرنے کے وقت اپنے گھر میں پڑھائی تھی اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے آپ کو ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کریں تاکہ وہ لوگوں کو آپ کی تکبیر سنوا سکیں۔ تو بلاشبہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عظیم مسجد میں تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حالت مرض میں نماز پڑھائی، پس جب صحیح ہے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ ہم ان اخبار میں سے بعض کو بعض کے لئے ناسخ قرار دیں (1) اور اس نماز کی طرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو آدمیوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں امام تھے اور آپ نے انہیں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور انہیں بھی بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور رہی وہ نماز جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کی آخری نماز پڑھی تو اس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ (یا ثویبہ) رضی اللہ عنہما کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے اور اس میں آپ مقتدی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی کپڑا پہن کر اس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا فرمائی (2)۔ اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، فرمایا: وہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کے ساتھ ایک کپڑا پہن کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر ادا فرمائی (3)، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں دو نمازیں جماعت کے ساتھ ادا فرمائیں نہ کہ ایک نماز۔ اور عبید اللہ ابن عبد اللہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی خبر میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو مردوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ ان دو میں سے ایک حضرت عباس اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور مسروق نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو خبر بیان کی ہے اس میں ہے: پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ میں کچھ آرام اور سکون پایا تو آپ حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ بے شک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین کی طرف دیکھتی رہی وہ سنگریزوں میں لکیر ڈال رہے تھے اور میں آپ کے قدموں کے تلووں کی طرف دیکھتی رہی۔ الحدیث۔

پس یہ تیری اس پر راہنمائی کرتی ہے کہ وہ دو نمازیں تھیں نہ کہ ایک نماز (4)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: ہمیں محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے خبر دی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن بشار نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں بدل بن مبر نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبید اللہ بن عبد اللہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صف میں آپ کے پیچھے تھے (5)۔

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 491-493، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 496

3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ما جاء اذا صل الامام قاعدا، حدیث نمبر 331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صحیح بخاری، باب من قام الی جنب الامام لعلو، حدیث 642۔ صحیح بخاری، باب الرجل یاتہ بالامام، حدیث 672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، باب جعل الامام لیؤتم بہ، حدیث نمبر 648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 483

4۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 488، موسسۃ الرسالہ بیروت

ابو حاتم نے کہا ہے: شعبہ بن حجاج نے زائدہ بن قدامہ سے اس خبر کے متن میں موسیٰ بن ابی عائشہ سے اختلاف کیا ہے۔ پس شعبہ نے حضور نبی کریم ﷺ کو مقتدی بنایا ہے اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور دوسرے لوگوں نے کھڑے ہو کر۔ اور زائدہ نے آپ ﷺ کو امام قرار دیا ہے اور اس حیثیت سے کہ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور قوم نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ اور یہ دونوں انتہائی ثقہ اور حافظ ہیں۔ تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایسی دو روایتیں جن کے ظاہر میں ایک فعل میں تضاد ہے ان میں سے ایک کو مطلق متقدم امر کے لئے ناخ بنا دیا جائے پس جس نے دو حدیثوں میں سے ایک کو حضور نبی کریم ﷺ کے امر متقدم کے لئے ناخ بنایا اور دوسرے کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا تو اس کی صحت پر ثبوت لانا اس کے ذمہ ہے اس نے اپنے خصم کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ دو خبروں سے اسے لے لے جسے اس نے چھوڑا ہے اور اسے چھوڑ دے جسے اس نے لیا ہے۔ اور سنن میں سے اس نوع کی نظیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا اور آپ حالت احرام میں تھے (1) اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ان سے نکاح کیا اور وہ دونوں حلال تھے (یعنی حالت احرام میں نہ تھے۔) (2) پس یہ دونوں حدیثیں ایک فعل میں بظاہر متضاد ہیں بغیر اس کے کہ ہمارے نزدیک ان دونوں کے درمیان تضاد ہو، اصحاب حدیث کی ایک جماعت نے ان دونوں حدیثوں کو متعارض قرار دیا ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں مروی ہیں اور انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خبر کو لے لیا ہے جو اس نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ لاینکح المحرم ولا ینکح (محرم نہ اپنا نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی کا نکاح کر سکتا ہے) تو انہوں نے اسے لے لیا۔ جبکہ یہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے ساتھ موافقت رکھتی ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں روایت کی گئی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر کو چھوڑ دیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ حالت احرام میں نکاح کیا۔ پس جس نے یہ کہا اس کے لئے یہ کہنا لازم ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی حالت مرض میں نماز کے بارے میں دو حدیثیں متضاد ہیں، اس طریقہ پر جو اس سے پہلے ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی خبر لائے جس میں مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم موجود ہو جبکہ ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے اور وہ اسے پکڑ لیں جبکہ وہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے موافق ہو جو حضور نبی کریم ﷺ کی حالت مرض میں نماز کے بارے میں روایت کی گئیں ہیں اور وہ چھوڑ دے اس خبر کو جو ان میں سے منفرد ہو، جیسا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاملہ میں کیا گیا (3)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: بعض عراقیین نے گمان کیا ہے جو کوفیوں کا مذہب اختیار کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ قول واذا صلی قاعدا فسلوا قعودا اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ بیٹھ کر تشهد پڑھے تو تم تمام بھی بیٹھ کر تشهد پڑھو۔ تو یہ خبر کو اس کے عموم سے

1۔ صحیح بخاری، باب التذویج المحرم، حدیث نمبر 1706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ تذویج المحرم، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الاحسان فی تفریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 483 تا 485، موسسۃ الرسالہ بیروت

پھیر دینا ہے جس کے بارے میں خبر وارد ہے بغیر کسی ایسی دلیل کے جو اس معنی کو ثابت کر سکے (1)۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَدْكُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ

تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾

”پھر اگر تم کو ڈر ہو (دشمن وغیرہ کا) تو پیادہ یا سوار (جیسے بن پڑے) پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یاد کرو

اللہ تعالیٰ کو جس طرح اس نے سکھایا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔“

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَإِنْ خِفْتُمْ یہ خوف سے ماخوذ ہے جس کا معنی گھبراہٹ اور ڈر ہے۔ فَرِجَالًا یعنی تم نماز پڑھو

پیدل چلتے ہوئے أَوْ رُكْبَانًا یا سوار۔ یہ رِجَالًا پر معطوف ہے۔ اور الرِّجَال راجل یا رَجُل کی جمع ہے۔ یہ ان کے اس قول

سے ہے: رَجُلٌ الْإِنْسَانُ يَرْجُلُ رَجَلًا جب آدمی کے پاس سواری نہ ہو اور وہ اپنے قدموں پر چلے۔ (صفت کا صیغہ ہوگا) فہو

رَجُلٌ وَ رَاجِلٌ (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یہ اہل حجاز کی لغت ہے، وہ کہتے ہیں: مشی فلان الی بیت اللہ حافیا رَجُلًا

(فلاں بیت اللہ شریف کی طرف ننگے پاؤں پیدل چلا) اسے طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ وَ رَجُلَانِ وَ رَجِيلٌ وَ رَجُلٌ، (2) او

راس کی جمع رِجَالٌ وَ رَجِيلٌ وَ رُجَالٌ وَ رَجَالَةٌ وَ رُجَالٌ وَ رُجُلَانِ وَ رَجُلَةٌ (جیم کے فتح کے ساتھ) وَ أَرْجِلَةٌ وَ أَرْجِلٌ

وَ أَرْجِيلٌ کے اوزان پر بنائی جاتی ہے اور الرُّجُل وہ جو کہ اسم جنس ہے اس کی جمع رِجَال بھی بنائی جاتی ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے بندے کو نماز میں قنوت کی کیفیت میں کھڑے ہونے کا حکم ارشاد فرمایا اور قنوت

سے مراد وقار، سکینہ اور اعضاء کا پرسکون ہونا ہے اور یہ اغلباً آمن اور طمانینت کی حالت میں ممکن ہو سکتا ہے تو پھر حالت خوف

کا ذکر فرمایا جو کبھی کبھار طاری ہو سکتی ہے اور بیان فرمایا کہ یہ عبادت بندے سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی اور اپنے

بندوں کو نماز کے بارے میں رخصت عطا فرمائی کہ وہ اپنے قدموں پر پیدل چلتے ہوئے اور گھوڑے، اونٹ اور اسی طرح کی

کسی شے پر سواری کرتے ہوئے اپنے سر کے اشارے کے ساتھ جس طرف منہ کرنا ممکن ہو متوجہ ہو کر نماز پڑھ لیں۔ یہ

عطاء کا قول ہے، اور یہی اس گھبراہٹ اور خوف کی نماز ہے جب خوف شدت اور سختی کے ساتھ آدمی کی ذات پر مسلط ہو جائے

جنگ کی حالت میں یا ایسا درندہ جو اسے تلاش کر رہا ہو، اس سے خوف کی حالت میں یا ایسے دشمن سے خوف ہو جو اس کا پیچھا کر

رہا ہو یا ایسے سیلاب کا خوف ہو جو اسے اٹھا سکتا ہو۔ بالجملہ ہر وہ شے جس سے آدمی کو اپنی جان پر خوف ہو تو وہی وہ عذر متبج ہے

جسے یہ آیت متضمن ہے (4)۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ رخصت اپنے ضمن میں علماء کا اجماع بھی لئے ہوئے ہے کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو راستوں سے

1۔ احسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 487، موسسۃ الرسالہ بیروت

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیۃ

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیۃ۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہٹ جائے اور رخ تبدیل کر لے اور اپنی عقل کے مطابق اپنی جان بچانے کے لئے ممکنہ اقدام کرے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس خوف کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس میں نماز پیادہ اور سوار پڑھنا جائز ہو جاتی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ہے: مراد ایسا خوف ہے کہ دشمن ان پر بالکل قریب آچکا ہو اور وہ اکٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں اور مسلمان غیر محفوظ ہوں یہاں تک کہ ہتھیار تیر وغیرہ ان تک پہنچ سکتے ہوں یا اس سے بھی زیادہ دشمن ان کے قریب ہو کہ نیزے اور تلواریں ان تک پہنچ سکتی ہوں یا اس کے پاس کوئی ایسا مخبر آئے جس کی خبر کی تصدیق کی جاسکتی ہو اور وہ اسے خبر دے کہ دشمن اس کے قریب ہے اور بڑی تیزی سے وہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے، پس اگر ان دو معنوں میں سے کوئی ایک نہ ہو تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ صلوٰۃ الخوف پڑھے اور اگر خبر کی بنا پر انہوں نے صلوٰۃ خوف پڑھی پھر دشمن چلا گیا تو وہ نماز کا اعادہ نہ کریں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نماز کا اعادہ کریں گے۔ یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: وہ حالت جس میں خوفزدہ ہونے والے کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھے پیادہ یا سوار، قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے یا کسی اور طرف یہ شدت خوف کی حالت ہے اور وہ حالت جس کے بارے میں آثار وارد ہیں وہ اس کے سوا ہے۔ اور صلوٰۃ خوف امام کے ساتھ اور لوگوں کو تقسیم کر کے پڑھی جاتی ہے اور اس آیت میں اس کا حکم نہیں ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور امام مالک نے جنگجو دشمن کے خوف اور درندے کے خوف اور اس جیسی دیگر چیزیں مثلاً حملہ کرنے والا اونٹ، سیلاب یا ہر وہ شے جس میں غالب گمان ہلاکت کا ہو، کے درمیان فرق کیا ہے کہ دشمن کے خوف کے علاوہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرنا مستحب ہے اگر امن اور سکون میسر آ جائے اور اکثر فقہائے امصار نے کہا ہے کہ حکم برابر ہے (چاہے خوف دشمن کا ہو یا کسی درندے وغیرہ کا)

مسئلہ نمبر 5۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلاشبہ قتال نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کا رد کرتی ہے اور ظاہر آیت اس پر قوی دلیل ہے۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ امام شافعی نے کہا ہے: جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے بعض شروط کو ترک کرنے کے جواز کی رخصت عطا فرمائی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ نماز میں قتال کرنا اسے فاسد نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک، امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک خوف کی حالت میں مسافر کی نماز سے رکعتوں کی تعداد کم نہ ہوگی۔

اور حسن بن ابی الحسن اور قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ ایک رکعت اشارے کے ساتھ پڑھ سکتا ہے (1)۔

امام مسلم نے بکیر بن اخنس سے، انہوں نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر شہر میں چار رکعتیں، سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے

وقت ایک رکعت نماز فرض کی ہے (1)۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس روایت کو بیان کرنے میں بکیر بن اخنص منفرد ہے اور وہ روایت حجت نہیں ہوتی جس میں وہ منفرد ہوتا ہے اور نماز میں اولیٰ یہ ہے کہ اس میں احتیاط برتی جائے وہ آدمی جس نے اپنے خوف اور سفر کی حالت میں دو رکعتیں نماز پڑھ لی تو وہ اختلاف سے یقین کی طرف نکل گیا۔

اور ضحاک ابن مزاحم نے کہا ہے: وہ آدمی جسے حالت جنگ یا کسی اور حالت میں موت کا خوف ہو تو وہ ایک رکعت پڑھ سکتا ہے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اسے چاہئے کہ دو تکبیریں کہہ لے۔

اور اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے: اگر وہ صرف ایک تکبیر پر ہی قادر ہو تو وہی اس کی طرف سے جائز ہوگی۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے (2)۔

اور قولہ تعالیٰ: **فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَدْكُوا لِلَّهِ كَمَا عَلَّمَكُم**، یعنی (جب تمہیں امن حاصل ہو جائے) تو تم اس حکم کی طرف لوٹ جاؤ جو تمہیں ارکان کی تکمیل کے بارے دیا گیا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: **أَمِنْتُمْ** کا معنی ہے جب تم دارالفر سے دارالاقامہ کی طرف نکل جاؤ۔ علامہ طبری نے اس کا رد کیا ہے (3) اور ایک جماعت نے کہا ہے: **أَمِنْتُمْ** جب تمہارا وہ خوف زائل ہو جائے جس نے تمہیں اس نماز پر مجبور کر دیا تھا۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے خائف کی بنا کے بارے اس باب میں اختلاف کیا ہے جب وہ امن میں ہو جائے، حضرت امام مالک نے کہا ہے: اگر کسی نے ایک رکعت حالت امن میں پڑھ لی پھر اسے خوف لاحق ہو گیا تو وہ سوار ہو اور اسی پر بنا کر لے (یعنی دوسری رکعت سواری پر پڑھ لے تو نماز مکمل ہو جائے گی)۔ اور اسی طرح اگر کسی نے حالت خوف میں سواری پر ایک رکعت پڑھی، پھر اسے امن ہو گیا، تو وہ اترے اور اسی پر بنا کر لے۔ یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور مزنی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی امن کی حالت میں نماز شروع کرے، پھر اسے خوف لاحق ہو جائے وہ منہ قبلہ شریف کی طرف کرے اور بنانہ کرے اور اگر اس نے حالت خوف میں نماز شروع کی پھر اسے امن حاصل ہو جائے تو وہ بنا کر لے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سواری سے اترنے والا تو بنا کر سکتا ہے (لیکن) سوار ہونے والا بنا نہیں کر سکتا۔ اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: وہ ان تمام صورتوں میں سے کسی میں بھی بنا نہیں کر سکتا۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: **فَإِذَا كُورَ اللَّهُ** کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسی نماز کی تعلیم دی ہے جو اصل نماز کے قائم مقام ہے اور تمہاری کوئی نماز فوت نہیں ہوئی اور یہ وہی ہے جسے تم نہ جانتے تھے اور قول باری **كَمَا مِثْلُ شُكْرِ** ہے تو کہتا ہے: تو میرے ساتھ اسی طرح (سلوک) کر جیسے میں نے تیرے ساتھ کیا اسی طرح بدلہ اور شکر ہوگا اور **مَا لَمْ يَمْ** میں ما، **عَلَّمَكُم** کا مفعول ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ ہمارے علماء رحمہ اللہ نے کہا ہے: صلاۃ کا اصل معنی دعا ہے اور حالت خوف میں تو بدرجہ اولیٰ دعا کے معنی میں ہوگی، اسی لئے خوف کے سبب نماز ساقط نہیں ہوتی اور جب خوف کے سبب نماز ساقط نہیں ہوئی تو پھر یہ زیادہ مناسب اور لائق ہے کہ یہ اس کے سوا حالت مرض یا کسی اور حالت میں ساقط نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہر حال میں نمازوں پر مواظبت اور ان کی محافظت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، چاہے صحت کی حالت ہو یا مرض کی، حضر ہو یا سفر، نماز کی قدرت ہو یا عجز خوف ہو یا امن، یہ کسی حال میں بھی مکلف سے ساقط نہیں ہوتی اور کسی قسم کا فساد اور خلل اس کی فرضیت میں حائل نہیں ہو سکتا، راہ نہیں پکڑ سکتا۔ مریض کا حکم سورہ آل عمران کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ نماز پڑھی جائے گی جس کیفیت میں ممکن ہوگی اور یہ کسی حال میں ساقط نہ ہوگی یہاں تک کہ اگر اسے پڑھنے کا اتفاق نہ ہو مگر آنکھ کے اشارے کے ساتھ تب بھی اسے پڑھنا لازم ہے اور اسی وجہ سے یہ تمام عبادات سے ممتاز ہے، تمام کی تمام عذروں کے سبب ساقط ہو جاتی ہیں اور ان میں رخصت حاصل ہو جاتی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ مسئلہ عظمیٰ ہے، بے شک نماز ترک کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ نماز اس ایمان کے مشابہ ہے جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا اور انہوں نے اس بارے میں کہا ہے: نماز اسلام کے ستونوں میں سے ایک ہے جس کی نیابت نہ بدن کے ساتھ جائز ہوتی ہے اور نہ مال کے ساتھ (یعنی نماز کا قائم مقام کوئی اور بدنی یا مالی عبادت نہیں ہو سکتی) اور اس کے تارک کو قتل کر دیا جائے گا، اس کی اصل شہادتین ہے (1)۔ تارک صلوٰۃ کے بارے میں علماء نے جو کچھ کہا ہے اس کا بیان سورہ براءۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَالَّذِينَ يُتَوَقَّؤْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۖ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ①

”اور جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (انہیں چاہئے کہ) وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے لئے کہ انہیں خرچ دیا جائے ایک سال تک (اور) نہ نکالا جائے (انہیں گھر سے) پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کچھ وہ کریں اپنے معاملہ میں مناسب طور پر اور اللہ بہت زبردست بڑا دانہ ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ يُتَوَقَّؤْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تاویل میں کہا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ اپنے فوت ہونے والے خاوند کے گھر میں ایک سال تک بیٹھی رہے گی اور جب تک وہ گھر سے نہ نکلی اس کے مال میں سے اس پر خرچ کیا جاتا رہے گا اور اگر وہ نکل گئی تو اس کا نفقہ ختم کرنے میں ورثاء پر کوئی حرج نہیں۔ پھر سال کی مدت کو چار مہینے اور دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا اور نفقہ کو سورہ نساء میں چوتھے اور آٹھویں حصے کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ابن زید اور

حضرت ربیع رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ اور سکنی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: یہ آیت جو سورہ البقرہ میں ہے: **وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۚ وَصِيَّةٌ لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ** تحقیق اسے دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے آپ نے اسے کیوں نہیں لکھایا آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے بھتیجے! میں نے اس میں سے کسی شے کو اس کے مکان سے تبدیل نہیں کیا (1)۔

اور علامہ طبری نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے: بے شک یہ آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور عدت چار مہینے اور دس دن ثابت ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وصیت بنادی اس میں سکنی سات مہینے اور بیس راتیں ہے۔ پس اگر عورت چاہے تو اپنی وصیت میں رہے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمُ (2)** ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تمام کا حکم نسخ متفق علیہ کے ذریعے زائل ہو چکا ہے مگر وہ جو طبری نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ کے بارے میں دعویٰ کیا ہے۔ اس بارے میں طبری محل نظر ہیں۔

اور حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس پر اجماع منعقد ہے کہ سال کی مدت منسوخ ہو چکی ہے اور اس کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ دوسروں نے کہا: قولہ وصیۃ کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عورتوں پر زوج کے فوت ہو جانے کے بعد ایک سال تک گھروں میں رہنا واجب ہوتا ہے۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ طبری نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے وہ صحیح ثابت ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے: ہمیں اسحاق، روح، شبل نے ابن ابی کحج سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے: **وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۚ** یہ عدت اپنے زوج کے گھر والوں کے پاس گزارنا واجب تھی پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۚ وَصِيَّةٌ لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمُ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ** فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تمام سال کو سات مہینے اور بیس راتیں وصیت بنادیا، اگر وہ چاہے تو اپنی وصیت میں سکونت رکھے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمُ (3)** مگر پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ”بالشبہ یہ عدت چار مہینے اور دس دن ہے تم میں سے کوئی زمانہ جاہلیت میں سال مکمل ہونے پر میٹگیاں پھینکتی تھی۔“ الحدیث (4) یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شریعت کے احکام نافذ ہونے سے پہلے ان عورتوں کی حالت کا بیان ہے جن کے

1۔ شیخ بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

3۔ شیخ بخاری، تفسیر سورہ بقرہ، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4172، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، شیخ بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4167، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 143، وزارت تعلیم

خاندان فوت ہو جاتے تھے۔ پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سال تک گھروں میں ہی رہنے کا حکم ارشاد فرمایا پھر اس مدت کو چار مہینے دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا یہ وضاحت کے ساتھ سنت ثابتہ میں ہے جسے اخبار آحاد سے نقل کیا گیا ہے۔ اس پر علماء مسلمین کا اجماع ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے یہی کہا ہے، انہوں نے کہا اور اسی طرح پوری آیت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی: **وَالَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ** جمہور علماء کے نزدیک یہ سب منسوخ ہے۔ پھر بیوپسوں کے لئے سال بھر رہائش کی وصیت کرنے کو منسوخ کر دیا گیا، سوائے ایک شاذ روایت کے جسے چھوڑ دیا گیا ہے وہ ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد بن جابر سے روایت کی ہے اور اس پر کوئی متابع نہیں لائی گئی اور نہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد آنے والے علمائے مسلمین میں سے کسی نے اس کے سبب چار مہینے اور دس دن پر اضافہ کیا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں۔

اور ابن جریج نے حضرت مجاہد بن جابر سے اس طرح کی روایت نقل کی ہے جس پر لوگوں کا عمل ہے، پس اجماع منعقد ہو گیا اور اختلاف ختم ہو گیا۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **وَصِيَّةٌ** حضرت نافع، ابن کثیر، کسائی، عاصم نے ایک روایت میں اور ابو بکر رحمہ اللہ نے مبتدا ہونے کی بناء پر **وَصِيَّةٌ** کو مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر **لِأَزْوَاجِهِمْ** ہے۔ اور یہ معنی ہونے کا احتمال بھی ہے علیہم وصیۃ۔ ان پر وصیت لازم ہے اور قول باری تعالیٰ **لِأَزْوَاجِهِمْ** صفت ہو (1)۔ علامہ طبری نے کہا ہے کہ بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ معنی ہے کُتبت علیہم وصیۃ ان پر وصیت فرض کی گئی ہے اور قولہ **لِأَزْوَاجِهِمْ** صفت ہوگا (2)۔ فرمایا: اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور ابن عامر رحمہ اللہ نے وصیۃ منصوب پڑھا ہے اور اسے فعل پر محمول کیا ہے۔ یعنی **فَلْيُوصُوا** وصیۃ پس چاہئے کہ وہ ضرور وصیت کریں پھر میت تو وصیت نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ وفات کے قریب ہوں اور **لِأَزْوَاجِهِمْ** اس قراءت کی بنا پر بھی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے اوصی اللہ وصیۃ۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کو لازم قرار دیا ہے۔ اور **مَتَاعًا**۔ **مَتَعُوْهُنَّ** مَتَاعًا ہے۔ یعنی تم انہیں ضرور نفقہ ادا کرو۔ **يَا جَعَلَ اللَّهُ لَهَنَ ذَلِكَ مَتَاعًا**۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وہ خرچہ مقرر فرما دیا ہے۔ کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہو یا مصدر کے سبب جو کہ الوصیۃ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: **أَوْ إِطْعَمْتُ يَوْمَ دِيٍّ مَسْغَبَةٍ** (البذلہ) یہاں متاع سے مراد اس کے سال کا نفقہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **غَيْرَ إِخْرَاجٍ** اس کا معنی ہے کہ میت کے اولیاء کے لئے اور گھر کے ورثاء کے لئے عورت کو باہر نکالنا جائز نہیں ہے اور **غَيْرَ إِخْرَاجٍ** خفش کے نزدیک مصدر کی بنا پر منصوب ہے، گویا کہ یہ فرمایا لا اخراجا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ متاع کی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ الموصین (وصیت کرنے والے) سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی **مَتَعُوْهُنَّ** غیر **مُخْرَجَاتٍ** (تم انہیں نفقہ دو اس حال میں انہیں نکالنا نہ جائے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

حرف جر کے حذف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ اصل عبارت ہے: من غیر اخراج۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَإِنْ خَرَجْتَ الْآيَةَ اس کا معنی ہے اگر وہ اپنے اختیار اور مرضی سے سال سے پہلے نکل جائیں۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تو کسی ولی پر یا حاکم پر کسی اور پر کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس پر پورا سال اپنے خاوند کے گھر میں ٹھہرنا واجب نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نفقہ منقطع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یا ازواج کی خواہش کے لئے ان پر بناؤ سنگھار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اے ورثاء! ان کے بارے تمہاری نگہبانی کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے پھر ان پر لازم ہے کہ وہ ایک سال عدت گزرنے سے پہلے پہلے شادی نہ کریں یا عدت گزرنے کے بعد ان کی شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مِنْ مَّعْرُوفٍ۔ مراد وہ طریقہ ہے جو شریعت سے موافقت رکھتا ہو۔ وَاللَّهُ عَزِيزٌ بِصِفَتِهِ جو اس کے بارے میں وعید کا تقاضا کرتی ہے جس نے اس آیت میں بیان کردہ حد کی مخالفت کی اور عورت کو نکال دیا حالانکہ وہ نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ حَكِيمٌ یعنی اپنے بندوں کے امور میں سے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے اسے خوب پختہ کرنے والا ہے۔

وَلِلْمُطَلَّاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿٢٣١﴾ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٢٣٢﴾

”اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا پائے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر۔ اسی

طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام تاکہ تم سمجھ جاؤ۔“

اس آیت میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ابو ثور رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ محکم آیت ہے اور متعہ ہر مطلقہ عورت کے لئے لازم ہے اسی طرح زہری نے کہا ہے (زہری نے کہا) یہاں تک کہ ایسی لونڈی کے لئے بھی جسے اس کا خاوند طلاق دے دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے (1) اور اس آیت کی وجہ سے یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

اور امام مالک نے کہا ہے: ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے چاہے اسے دو طلاقیں ہوں یا ایک طلاق، وہ اس کے پاس جائے یا نہ جائے، اس کے لئے مہر مقرر کرے یا نہ کرے، سوائے اس عورت کے جس کے پاس جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لئے نصف مہر کافی ہوگا اور اگر اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لئے متعہ ہوگا چاہے وہ مہر مثلی سے کم ہو یا زیادہ اور اس متعہ کی کوئی حد نہیں ہے، اسے آپ سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور ابن قاسم نے المدونہ سے پردے ڈالنے کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے متعہ مقرر کیا ہے، پھر دوسری آیت میں اس کی استثنا کر دی ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول نہ ہوا تو اسے متعہ سے خارج کر دیا اور ابن زید نے گمان کیا ہے کہ اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ ابن قاسم نے لفظ نسخ

سے لفظ استثنا کی طرف فرار اختیار کیا ہے، اس محل میں استثنا کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ تو صرف نسخ ہے جیسا کہ زید بن اسلم نے کہا ہے اور ابن قاسم نے لازم قرار دیا ہے کہ قوله وَلِلْمُطَلَّقاتِ ہر مطلقہ کو شامل ہے۔ تو پھر نسخ کا قول لازم اور ضروری ہے۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت ان ثیبہ عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا کیونکہ اس آیت کے سوا دوسری میں ان عورتوں کے لئے متعہ کا ذکر گزر چکا ہے جن کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا۔ پس یہ قول ایسی عورت کے بارے میں ہے جس کے لئے مس سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا یہ کبھی عموم میں داخل نہیں ہوئی۔ اور یہ اس بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ طَلَقتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوَهُنَّ يَہ عورتوں میں سے اس صنف کو خاص کر رہا ہے اور جب کہا گیا ہے کہ یہ عموم اس قسم کو بھی شامل ہے تو پھر یہ نسخ ہوگا تخصیص نہیں۔ (۱)

اور امام شافعی نے دوسرے قول میں کہا ہے: بلاشبہ متعہ نہیں ہے مگر اس عورت کے لئے جسے قبل از دخول طلاق دی جائے اور وہاں نہ مس ہو اور نہ مہر مقرر ہو۔ کیونکہ جو مہر میں سے کسی شے کی مستحق ہو جائے تو وہ اپنے حق میں متعہ کی محتاج نہیں رہتی۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَعَالَيْنِ أُمَتِّعُهُنَّ (الاحزاب: 28) اس پر محمول ہے کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کی جانب سے ایک احسان ہے، نہ کہ آپ کے لئے واجب ہے اور قول باری تعالیٰ: فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عَدَاوَةٍ تَعْتَدُوهَا فَمَتِّعُوهُنَّ (الاحزاب: 49) بھی غیر مفروضہ پر محمول ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: وہ عورت جس کا مہر مقرر کیا جائے اس کے لئے مہر ہوگا جب اسے قبل المسمیس طلاق دی جائے، اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے مجامعت کے بغیر نصف مہر لے لیا ہے۔ اور مدخول بہا کو جب طلاق دی جائے تو اس کے لئے متعہ ہوگا، کیونکہ مہر وطی کے مقابلہ میں واقع ہوتا ہے اور متعہ عقد کے ساتھ انتہائی استعمال کے سبب (لازم ہے) اور امام شافعی نے خلع اور مبارات کرنے والی کے لئے بھی متعہ واجب کیا ہے اور امام مالک کے اصحاب نے کہا ہے: فدیہ دینے والی کے لئے کیسے متعہ ہو سکتا ہے حالانکہ وہ خود دیتی ہے تو وہ متعہ کیسے لے گی اور جدائی اور فراق کو اختیار کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے چاہے، وہ خلع لینے والی ہو یا فدیہ دینے والی یا مبارات کرنے والی یا صلح کرنے والی یا لعان کرنے والی یا آزاد ہونے والی فراق اور جدائی کو اختیار کر لے۔ اس کے ساتھ مدخول ہو یا نہ ہو، اس کے لئے مہر مقرر ہو یا نہ ہو۔ تفصیلی بیان پہلے گزر چکا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ

مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٣﴾

”کیا نہیں دیکھا تو نے ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ پھر زندہ فرمایا انہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“

اس میں چھ مسائل ہیں:

1- المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 327، دار الكتب العلمية

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ رُؤِیتَ قَلْبَ مَراد ہے۔ اس کا معنی ہے اَلَمْ تَعْلَمَ کیا آپ نہیں جانتے اور سیبویہ کے نزدیک اس کا معنی ہے: کیا آپ آگاہ نہیں ان لوگوں کے معاملہ کے بارے۔ (یعنی اَلَمْ تَنْبَہ) اور یہ رُؤِیت (یعنی اَلَمْ تَرَ) دو مفعولوں کا محتاج نہیں ہے۔

ابو عبد الرحمن السلمی نے اَلَمْ تَرَ اء کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور القائے حرکت کے بغیر ہی ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کی اصل ہے: اَلَمْ تَرَء۔

ان لوگوں کا قصہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی ایک قوم ہے۔ ان میں وبا پھیل گئی، یہ ایک گاؤں میں تھے جسے ذَاوُذَان کہا جاتا ہے (یہ گاؤں واسط کے مشرقی نواح میں واقع ہے اور ان کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ ہے ”معجم یا قوت“) پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکلے اور ایک وادی میں جا اترے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت مسلط کر دی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ چار ہزار تھے۔ طاعون سے بھاگتے ہوئے نکلے اور انہوں نے کہا: ہم ایسی زمین پر آئے ہیں جہاں موت نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو مار دیا۔ پھر ان کے پاس سے ایک نبی علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا۔

اور کہا گیا ہے کہ وہ آٹھ دن تک مرے رہے اور بعض نے کہا: سات دن تک، واللہ اعلم۔

حضرت حسن نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں بطور سزا مدت مقررہ سے پہلے مار دیا، پھر انہیں باقی ماندہ عمروں کے لئے اٹھا دیا۔ اور بعض نے کہا ہے: ان کے انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات میں سے ایک نبی علیہ السلام کے معجزہ کے اظہار کے لئے ان کے ساتھ ایسا کیا۔ کہا گیا ہے کہ ان کا اسم گرامی حضرت شمعون علیہ السلام ہے۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے کہ وہ بخار سے بھاگے تھے (2)۔

اور بعض کا خیال ہے کہ وہ جہاد سے فرار ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کی زبان سے جہاد کے بارے حکم ارشاد فرمایا، تو وہ جہاد میں قتال ہونے کے سبب موت سے خوفزدہ ہو گئے، پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی تاکہ وہ انہیں متنبہ کر دے کہ کوئی شے انہیں موت سے نجات نہیں دلا سکتی پھر انہیں زندہ کیا اور انہیں اپنے اس ارشاد سے جہاد کے بارے حکم دیا: وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (اور تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرو) حضرت ضحاک نے یہی کہا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تمام کے تمام قصص ضعیف الاسانید ہیں، البتہ آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ اور توقیف کی عبارت میں انسانوں کو ایک قوم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ موت سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا، تاکہ وہ اور ان کے بعد آنے والے تمام یہ جان لیں کہ موت دینا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لہذا کسی ڈرنے والے

کے خوف کا اور کسی دھوکہ کھانے والے کے دھوکہ کا کوئی معنی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اپنے اس امر کا مقدمہ بنایا ہے جو اس نے حضور نبی رحمت ﷺ کی امت کے مومنوں کو جہاد کے بارے حکم فرمایا۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے اور یہی آیت کے ظاہر الفاظ ہیں۔

قوله تعالى: وَهُمْ أُلُوفٌ جمہور نے کہا ہے: یہ الف کی جمع ہے۔ بعض نے کہا ہے: وہ چھ لاکھ تھے۔ بعض نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: وہ چالیس ہزار تھے۔ ابو مالک نے کہا ہے: وہ تیس ہزار تھے (1)۔ سدی کا قول ہے: وہ سینتیس ہزار تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ستر ہزار تھے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی چالیس ہزار اور آٹھ ہزار کی روایت ہے، آپ سے اسے ابن جریج نے روایت کیا ہے۔ آپ سے ہی آٹھ ہزار کی روایت بھی ہے اور آپ سے چار ہزار کی روایت بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تین ہزار تھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ دس ہزار سے زائد تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ أُلُوفٌ اور یہ جمع کثرت ہے اور دس اور اس سے کم لے بارے میں أُلُوفٌ نہیں بولا جاتا۔

ابن زید نے الوف کے لفظ کے بارے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے وہم موتلفون، یعنی انہیں اپنی قوم کے افتراق نے نہیں نکالا اور نہ ان کے درمیان کوئی فتنہ برپا ہوا، بلکہ وہ تو ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھتے تھے اور الفت اس فرقت کے خلاف ہے۔ پس وہ موت سے فرار اختیار کرتے ہوئے اور اپنے خیال کے مطابق زندگی کی خواہش رکھتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی جگہ موت دے دی جو ان کے گمان کے مطابق ان کے لئے جانے نجات تھی۔ پس اس معنی کی بنا پر أُلُوفٌ الف کی جمع ہے۔ جیسا کہ جالس کی جمع جلوس ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دینے کے لئے ایک خاص مدت تک موت دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا اور سزا کے لئے موت دینے کے بعد زندگی ہے اور اپنی مدت مقررہ پر موت آنے کے بعد زندگی نہیں ہے (2)۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب وہ زندہ کیے گئے اور اپنی قوم کی طرف لوٹے تو وہ پہچانے جاسکتے تھے (کہ وہ مردہ تھے) اور موت کی علامات ان کے چہروں پر تھیں اور ان میں سے کوئی جو کپڑا بھی پہنتا تھا تو وہ میلا سا کفن بن جاتا یہاں تک کہ وہ اپنی اس مدت مقررہ پر فوت ہوئے جو ان کے لئے لکھی گئی تھی۔

ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آج تک بنی اسرائیل کی اس نسل میں وہ بوباقی ہے۔ اور روایت ہے کہ وہ عراق کے (شہر) واسط کے پاس تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بد بودار ہو جانے کے بعد زندہ کیے گئے، پس وہ بوا آج تک ان کی نسل میں موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قوله تعالى: حَذَرَ الْمَوْتِ، اى لحذر الموت، یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے۔ اور یہ بھی مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مُؤْتُوا امر تکوین ہے اور کہا جانا بھی بعید نہیں ہے۔ انہیں ندادی گئی اور انہیں کہا گیا: تم مرجاؤ اور یہ

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 228، دار الفکر۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ

بھی بیان کیا گیا ہے کہ دو فرشتوں نے ان کے پاس چیخ لگائی تم مرجاؤ، پس وہ مر گئے۔ پس معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو فرشتوں کے واسطے سے کہا: **مُوتُوا** کہ تم مرجاؤ (1)۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ ان اقوال میں سے زیادہ صحیح (اور زیادہ بین) اور زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ وہ وبا سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے۔ اسے سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: وہ طاعون سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے تو وہ مر گئے، پھر انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ انہیں زندہ فرما دے تاکہ وہ اس کی عبادت کریں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرما دیا (2) اور عمرو بن دینار نے اس آیت کے بارے کہا ہے: ان کی بستی میں طاعون پھیل گیا تو کچھ لوگ وہاں سے نکل گئے اور کچھ لوگ باقی رہ گئے اور نکلنے والوں کی تعداد باقی رہنے والوں کی نسبت زیادہ تھی، فرمایا: پس جو نکل گئے وہ محفوظ رہے اور جو وہیں مقیم رہے وہ مر گئے اور جب دوسری بار ایسا ہوا تو سوائے قلیل لوگوں کے وہ تمام کے تمام نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو بھی موت دے دی، پھر انہیں زندہ کر دیا اور وہ اپنے شہروں کی طرف لوٹ گئے اور ان کی اولاد بھی پیدا ہوئی۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ طاعون سے ڈرتے ہوئے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو ایک ہی ساعت میں مار دیا اور وہ چالیس ہزار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس پر اس آیت میں کئی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے الفاظ بخاری کے ہیں کہ انہوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سنا وہ حضرت سعد کو حدیث بیان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا کا ذکر کیا اور فرمایا: ”(یہ) رجز یا عذاب ہے جس کے ساتھ بعض امتوں کو عذاب دیا گیا پھر اس سے کچھ بچ جانے والے باقی رہے اور وہ ایک بار ختم ہو جاتا ہے اور دوسری بار پھر آتا ہے۔ پس جو کوئی اس کے بارے کسی زمین میں سے تو اسے چاہئے کہ وہ وہاں بالکل نہ آئے اور جو اس علاقے میں ہو کہ وہاں وبا پھیل جائے تو وہ اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلے (3)۔“ اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں قتیبہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں حماد بن زید نے عمرو ابن دینار عن عامر بن سعد عن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سند سے خبر دی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کا ذکر کیا اور فرمایا: ”یہ باقی رہنے والا رجز یا عذاب ہے جو بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر بھیجا گیا۔ پس جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں ہو تو وہاں سے نہ نکلو اور جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں نہ ہو تو تم وہاں نہ جاؤ (4)۔“ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس حدیث کے مقتضا کے مطابق حضرت عمر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عمل کیا جب وہ مقام سرخ سے اس وقت واپس لوٹے جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث کے بارے خبر دی۔ اسی بناء

1۔ البحر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 700، دار احیاء التراث العربیہ
3۔ صحیح بخاری، کتاب الحیل، جلد 2، صفحہ 1032، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 126، وزارت تعلیم۔

ایضاً، من ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ الفرار من الطاعون، حدیث نمبر 985، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پر یہ مؤطا وغیرہ میں مشہور ہے۔

اور ایک قوم نے وباء اور بیماری والی زمین سے فرار کو مکروہ قرار دیا ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”وباء سے بھاگنا میدان جہاد سے بھاگنے کی طرح ہے (1) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی طرف نکلنے کا واقعہ معروف ہے اور اس میں ہے کہ آپ واپس لوٹ آئے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس پر دلیل موجود ہے کہ آدمی پر تکلیف اور اذیت ناک چیزوں کے آنے سے پہلے ان سے بچنا اور احتیاط کرنا لازم ہے اور خوف زدہ کرنے والی اشیاء کے ہجوم اور حملہ سے پہلے ان سے اجتناب کرنا ایک طرف ہو جانا لازم ہے اور ان کے آنے کے بعد اس پر صبر کرنا اور جزع فزع نہ کرنا لازم ہے اور یہ اس لئے ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرمایا ہے جو وباء والی زمین میں نہ ہو کہ وہ وباء پھیل جانے کے بعد اس میں داخل ہو اور جو وہاں ہو اسے وباء پھیل جانے کے بعد اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلنے سے منع فرمایا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسی طرح امور کی تکالیف و مصائب سے ہر بچنے والے کے لئے حکم ہو۔ اس میں اس کے لئے طاعون سے بچنے کی راہ بھی ہے اور یہ معنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی مثل ہے: ”تم دشمن سے ملاقات کی (جنگ کرنے کی) تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجاء کرو اور جب تمہارا ان سے آنا سامنا ہو جائے تو پھر صبر کرو (2)۔“

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقتضا ہے اور اسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیکو کار اور عظیم المرتبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس پر بطور حجت فرمایا جبکہ انہوں نے آپ سے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے فرار ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے ابو عبیدہ! کاش! تیرے سوا کوئی اور یہ کہتا: ہاں، ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف ہی بھاگ رہے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اور اس کے خلاف جو مقدر فرمادیا ہے اس سے بچنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ڈرانے والی اور ہلاک کرنے والی اشیاء سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وسعت و طاقت کے مطابق مکروہات سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ پھر آپ نے انہیں فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تیرا اونٹ ہو اور تو وادی میں اترے جس کے دو کنارے ہوں ان میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسرا قحط زدہ ہو، کیا یہ نہیں ہے کہ اگر تو نے سرسبز و شاداب حصہ میں چرایا تو وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے اور اگر تو نے قحط زدہ حصہ میں چرایا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اس جگہ سے مدینہ منورہ کی طرف لوٹ گئے۔

الکلیا الطبری نے کہا ہے: ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے کہ کفار یا ڈاکو جب ایک کمزور شہر کا قصد کریں اور اس کے باسیوں میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کے سامنے سے دور ہٹ جائیں، اگرچہ موت کی مقررہ مدت

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجناز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2744، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کوئی زیادتی اور کمی نہیں ہو سکتی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وبا سے فرار اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وبا کی جگہ میں جو ہو رہا ہے، شاید اس سے کچھ حصہ لے لیا جائے تاکہ اس مرض عام کے سبب میں اس جگہ والے شریک ہو جائیں اور وہاں سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہ رہے، بلکہ وہ اسے سفر کی ان مشقتوں کی طرف منسوب کرے گا جو اسے وبا کی مبادیات میں سے پہنچیں۔ پس درد کئی گنا بڑھ جائے گا اور ضرر زیادہ ہو جائے گا اور وہ ہر راستے میں ہلاک ہو جائیں گے اور وہ ہر کشادہ اور تنگ جگہ میں گر جائیں گے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے جو کوئی وبا سے نہیں بھاگا وہ محفوظ رہا۔ اسے ابن المدائنی نے بیان کیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی نصیحت کافی ہے کہ فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اَلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوتُوْا، شاید اگر وہ فرار ہو اور بچ جائے تو وہ کہنے لگے: بلاشبہ میں نے اپنے نکلنے کے سبب وبا سے نجات پالی ہے تو اس طرح اس کا اعتقاد خراب اور فاسد ہو جائے گا۔ بالجملہ اس سے فرار ممنوع ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں شہروں کو خالی کرنا لازم آتا ہے اور کمزور لوگ اس سے بھی بری نہیں ہوتے کیونکہ ان پر شہروں سے نکلنا مشکل ہوتا ہے اور ان کے لئے ایسا کرنا آسان نہیں ہوتا اور وہ ان سہولتوں سے شہروں کے خالی ہونے کے سبب اذیت اٹھاتے ہیں جو شہروں کا حصہ ہوتی ہیں اور کمزور لوگوں کے لئے معاون اور مددگار ہوتی ہیں۔

اور جب کسی زمین میں وبا ہو تو وہاں احتیاط، خوف اور ضرر کے مقامات سے پرہیز کرنے کے ارادہ سے کوئی نہ آئے اور ایسے وہموں کو دور کرنے کے لئے جو انسان کے دل میں تشویش پیدا کر دیتے ہیں اور وہاں داخل ہونے میں ہلاکت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں جائز نہیں ہوتا، کیونکہ مکروہ سے اپنے آپ کو بچانا واجب ہے اور اس پر سوء اعتقاد کا خوف کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہ کہنے لگے: اگر میں اس جگہ میں داخل نہ ہوتا تو مجھے یہ تکلیف نہ آتی۔ پس طاعون زدہ علاقے میں داخل ہونے سے منع کرنے یا وہاں سے نکلنے سے منع کرنے میں یہی فائدہ ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: طاعون مقيم پر اور بھاگنے والے پر ایک آزمائش ہے۔ کیونکہ بھاگنے والا کہتا ہے: میں نے اپنے فرار کے سبب نجات پالی ہے اور مقيم کہتا ہے: میں یہاں مقيم رہا سو میں مر گیا۔ اسی قسم کی طرف امام مالک نے اس وقت اشارہ کیا جس وقت ان سے کوڑھ زدہ کی طرف دیکھنے کی کراہت کے بارے پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: میں نے اس میں کوئی کراہت نہیں سنی ہے اور جو روایات اس سے نبی کے بارے وارد ہوئی ہیں وہ صرف اس خوف سے ہیں کہ وہ اسے گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا کر دے گا یا اسے وہ شے (وہم) خوفزدہ کرتی رہے گی جو اس کے دل میں واقع ہو جائے گی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا کے بارے میں فرمایا ہے: ”جب تم کسی زمین میں اس کے بارے سنو تو تم اس کی طرف نہ آؤ اور جب وبا پھیل جائے اور تم وہاں ہو تو پھر اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو۔“ اور اس شہر کے بارے میں بھی پوچھا گیا جس میں موتیں اور بیماریاں واقع ہو رہی ہوں کیا اس سے نکلنا بھی مکروہ ہے؟ تو فرمایا: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا وہ نکلے یا وہیں مقيم رہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: ”جب کسی زمین میں وبا واقع ہو جائے اور تم وہاں ہو تو اس

سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو (1)۔“ اس میں اس پر دلیل ہے کہ فرار کے ارادہ کے بغیر طاعون والے شہر سے نکلنا جائز ہے، بشرطیکہ اعتقاد یہ ہو کہ جو کچھ اسے پہنچنا ہے وہ اس سے خطا نہیں ہو سکتا اور اسی طرح حکم وہاں داخل ہونے کا بھی ہے جبکہ اسے یہ یقین ہو کہ اس کا داخل ہونا اس کی طرف ایسی تقدیر کو نہیں بھیج سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر نہیں بنائی۔ پس آدمی کے لئے وہاں داخل ہونا اور وہاں سے نکلنا اس حد کی بنا پر مباح ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ طاعون پر صبر کی فضیلت اور اس کے بیان کے بارے میں یہ ہے کہ الطاعون برون فاعول الطعن سے ماخوذ ہے مگر یہ کہ جب اسے اصل معنی سے پھیر دیا گیا تو اسے وبا کے سبب عام موت پر دلالت کرنے کے لئے وضع کر دیا گیا۔ جوہری نے یہی کہا ہے اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیہا کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میری امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہے۔“ (2) حضرت عائشہ بنتی نبیہا نے عرض کی: طعن کو تو ہم نے پہچان لیا ہے پس طاعون کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پھوڑ (گلٹی) ہے اونٹ کے پھوڑے (طاعون) کی طرح جو کہ پیٹ سے نیچے والی جگہوں اور بغلوں کے نیچے نکلتا ہے (3)۔

علماء نے کہا ہے: اس وبا کو اللہ تعالیٰ بطور عذاب اور سزا کے اپنے بندوں میں سے گنہگاروں اور کافروں میں سے جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور کبھی اسے صالحین کے لئے شہادت اور رحمت بنا کر بھیج دیتا ہے، جیسا کہ حضرت معاذ بنی نبیہ نے طاعون عمواس میں کہا: بے شک یہ تمہارے لئے شہادت اور رحمت ہے اور تمہارے نبی علیہ السلام کی دعا ہے: اے اللہ! معاذ اور اس کے گھردالوں کو اپنی رحمت سے ان کا حصہ عطا فرما۔ اور ان کی ہتھیلی میں نیزہ مارا گیا۔

حضرت ابو قلابہ بنی نبیہ نے کہا ہے: تحقیق میں نے شہادت اور رحمت کو تو پہچان لیا اور میں اسے نہ پہچان سکا کہ یہ تمہارے نبی کی دعا ہے؟ چنانچہ میں نے اس کے بارے پوچھا تو کہا گیا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا فرمائی کہ آپ کی امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہو، جس وقت آپ نے یہ دعا مانگی کہ آپ کی امت کا آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو تو اس سے آپ کو روک دیا گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دعا مانگی۔

اور حضرت جابر بنی نبیہ وغیرہ کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”طاعون سے بھاگنے والا میدان جہاد کے لشکر سے بھاگنے والے کی طرح ہے اور اس میں صبر کرنے والا میدان جہاد میں صبر کرنے والے کی طرح ہے (4)۔“ اور بخاری میں حضرت یحییٰ بن عمر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے خبر دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے پوچھا، تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ یہ ایک عذاب ہے جسے اللہ تعالیٰ جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے مومنین کے لئے رحمت بنایا ہے، پس کوئی بندہ نہیں ہے جو طاعون میں مبتلا ہو جاتا ہے اور صبر کرتے ہوئے اسی شہر میں ٹھہرا رہتا ہے اور وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اسے ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 494، وزارت تعلیم

2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 253، دار صادر بیروت

3۔ ایضاً

4۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دی ہے مگر اس کے لئے شہید کے اجر کی مثل اجر ہے (1)۔“ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی یہی تفسیر ہے کہ ”طاعون شہادت ہے اور مطعون شہید ہے (2)۔“ یعنی اس پر صبر کرنے والا کہ اس کے اجر کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اور یہ جاننے والا کہ اسے ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے لکھ دی ہے، اسی لئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تمنا کی کہ اس میں فوت ہو جائیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو مر گیا وہ شہید ہے اور جو کوئی طاعون سے خوفزدہ ہو گیا اور اسے مکروہ جانا اور اس سے بھاگ گیا تو وہ اس حدیث کے معنی میں داخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ ابو عمر نے کہا ہے: مجھ تک کوئی خبر نہیں پہنچی کہ اہل علم میں سے کوئی طاعون سے بھاگا ہو سوائے اس کے جو ابن مدائنی نے ذکر کی ہے کہ علی بن زید بن جدعان طاعون کی وجہ سے السیالہ (یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے اہل مدینہ کا مکہ کی طرف آتے ہوئے یہ پہلا مرحلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ملل اور روجاء کے درمیان واقع ہے)۔ (شرح القاموس) کی طرف چلے گئے اور وہ ہر جمعہ کی نماز میں شریک ہونے کے لئے لوٹ آتے تھے اور جب وہ جمعہ میں شریک ہوتے تو لوگ ان کے بارے پکارتے تھے: فت من الطاعون یہ طاعون سے بھاگ گئے ہیں۔ اور وہ السیالہ میں ہی فوت ہوئے۔ ابن مدائنی نے مزید کہا: عمرو بن عبید اور رباط بن محمد رباطیہ کی طرف بھاگ گئے اور ابراہیم بن علی لفقیہی نے اس بارے میں کہا ہے:

و لما استفز الموت كل مكذب صبرث و لم يصبر رباط ولا عمرو

جب موت نے ہر جھٹلانے والے کو ہلاک و برباد کر دیا (تو) میں نے صبر کیا اور رباط اور عمرو نے صبر نہ کیا۔

اور ابو حاتم نے اصمعی سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: بصرہ کے بعض لوگ طاعون سے بھاگے اور ان میں سے کوئی اپنے گدھے پر سوار ہوا اور سفوان (یہ بصرہ میں باب المربد سے ایک مرحلہ کے فاصلہ پر پانی ہے) بمجم یا قوت کی طرف اپنے گھر والوں کے پاس چلا گیا اور اس نے حدی گانے والے کو سنا کہ وہ اس کے پیچھے حدی گارہا ہے:

لن يسبق الله على حصار ولا على ذي منعة طيار

اویا الحتف علی مقدار قد یصبح الله امام الساری

اور مدائنی نے ذکر کیا ہے: عبدالعزیز بن مروان کی حکومت کے دوران مصر میں طاعون پڑا، تو وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکل گیا اور الصعید کے دیہاتی علاقوں میں سے ایک دیہات میں جا اتر۔ اسے سکر یہ الصعید کے مشرق کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے اور مصر کے درمیان دو دن کا فاصلہ ہے (یا قوت) کہا جاتا ہے۔ تو عبدالعزیز نے اس سے پوچھا: تیرا کیا نام ہے؟ تو اس نے کہا: طالب بن مدرک۔ تو اس نے کہا: اوہ میں اپنے آپ کو فسطاط کی طرف لوٹنے والا نہیں دیکھ رہا پھر وہ اسی گاؤں میں مر گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، وزارت تعلیم

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، و۔ ت۔ ایضاً صحیح بخاری، باب صابن کمری الطاعون، حدیث نمبر 92-5291، ضیاء القرآن پبلی کوشنز

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَبِيْعٌ عَلَیْهِمْ ۝

”اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“
یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرنے کا خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے اور اس سے ارادہ اور نیت یہ کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہے (1)۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور یہ ہر راستے کو عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي (آپ فرمادیتے: یہ میری راہ ہے)
امام مالک نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور کوئی راستہ نہیں ہے مگر اس پر یا اس میں یا اس کے لئے قتال کیا جاتا ہے اور ان میں سب سے عظیم دین اسلام ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب ان لوگوں کے لئے ہے جو بنی اسرائیل میں سے زندہ کیے گئے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وَقَاتِلُوا میں داؤ سابقہ امر پر عطف کرنے کے لئے ہے اور کلام میں اس کی تقدیر کو چھوڑ دیا گیا ہے: وَقَالَ لَهُمْ، قَاتِلُوا اور پہلے قول کی بنا پر یہ سارا کلام سابقہ جملہ پر معطوف ہے۔ اور کلام میں مضمر ماننے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا ہے: وَقَاتِلُوا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو حکم ہے کہ تم نہ بھاگو جیسا کہ وہ بھاگ گئے۔ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَبِيْعٌ عَلَیْهِمْ یعنی وہ تمہارے ال کو بھی سن لے گا اگر تم نے اس کی مثل کہا جیسا کہ انہوں نے کہا اور اس سے تمہاری مراد کو بھی جان لے گا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس قول کی کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے جس نے یہ کہا کہ لڑائی کرنے کا حکم ان لوگوں کو ہے جنہیں زندہ کیا گیا۔ واللہ اعلم

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضْعِفُهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

”کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھادے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا اور اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔“
اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حق کی راہ پر جہاد اور قتال کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ شریعت میں سے کوئی شے (حکم) نہیں ہے مگر اس کی حفاظت اور اس کے دفاع میں قتال جائز ہوتا ہے اور ان میں عظیم تر دین اسلام ہے جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں (اپنا مال) خرچ کرنے پر

براہیختہ کیا۔ پس اس خبر میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرنے والا بھی داخل ہے (اور لشکر کی تیاری میں سامان خرچ کرنے والا بھی) کیونکہ وہ بھی ثواب کی امید پر یہ مال دیتا ہے جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حبش عمرہ (غزوہ تبوک) میں کیا (1)۔ اور مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِی اس کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنالے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے اپنے رب سے ثواب چاہتے ہوئے اپنا مال صدقہ کرنے میں بہت تیزی اور جلدی کی۔ ہمیں شیخ الفقه، امام، محدث، قاضی ابوعامر یحییٰ بن عامر بن احمد بن منیع الاشعری نسباً و مذہباً قرطبہ میں۔ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ لوٹائے۔ ربیع الثانی ۲۲۸ھ میں میری طرف سے ان پر قراءت کے دوران انہوں نے خبر دی اور کہا: ہمیں ابواجازہ نے خبر دی، فرمایا: میں نے ابو عبد اللہ بن سعدون سے سماع کرتے ہوئے ابوبکر عبد العزیز بن خلف بن مدین الازدی پر پڑھا، اس نے کہا: ہمیں ابوالحسن علی بن مبران نے بیان کیا اور کہا: ہمیں ابوالحسن محمد بن عبد اللہ ابن زکریا بن حیوہ النیشاپوری (متوفی ۳۶۶ھ) نے بیان کیا اور کہا: ہمیں میرے چچا ابوزکریا یحییٰ ابن زکریا نے خبر دی اور کہا: ہمیں محمد بن معاویہ بن صالح نے بتایا کہ ہمیں خلف بن خلیفہ نے حمید الاعرج عن عبد اللہ بن الحارث عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی: مَنْ ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا تو حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! سَلِّیْ عَلَیْہِمْ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض کا ارادہ فرما رہا ہے؟ تو آپ سَلِّیْ عَلَیْہِمْ نے فرمایا: ”ہاں اے ابوالدحداح۔ تو انہوں نے عرض کی: اپنا دست مبارک مجھے دکھائیں اور پھر آپ نے اسے دراز کیا۔ تو انہوں نے عرض کی: بلاشبہ میں نے اللہ تعالیٰ کو وہ باغ بطور قرض دے دیا جس میں چھ سو کھجور کے درخت ہیں پھر چلتے ہوئے آئے یہاں تک کہ اس باغ کے پاس آگئے اور ام دحداح اپنے بچوں سمیت اس میں تھی، تو آپ نے اسے آواز دی: اے ام دحداح! اس نے کہا: لبیک (میں حاضر ہوں) آپ نے فرمایا: تو باہر نکل آ، میں نے اپنا وہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے (2) جس میں چھ سو درخت ہیں۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی: مَنْ ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا تو حضرت ابوالدحداح نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر شاربوں، یا رسول اللہ! سَلِّیْ عَلَیْہِمْ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب فرما رہا ہے۔ حالانکہ وہ تو قرض سے غنی اور بے نیاز ہے؟ تو آپ سَلِّیْ عَلَیْہِمْ نے فرمایا: ”ہاں وہ تمہیں اس کے عوض جنت میں داخل فرمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔“ تو انہوں نے عرض کی: بلاشبہ اگر میں اپنے رب کو قرض پیش کر دوں تو وہ اس کے عوض میرا ضامن ہو جائے گا اور میری بچی الدحداح کو بھی میرے ساتھ جنت میں پہنچا دے گا؟ تو آپ سَلِّیْ عَلَیْہِمْ نے فرمایا: ”ہاں“ تو انہوں نے عرض کی پھر اپنا ہاتھ مجھے دیجئے، پس رسول اللہ سَلِّیْ عَلَیْہِمْ نے اپنا ہاتھ انہیں دیا، تو انہوں نے کہا: بلاشبہ میرے دو باغ ہیں ان میں سے ایک سافلہ (نحلی زمین) میں ہے اور دوسرا عالیہ (بلند زمین) میں۔ قسم بخدا! میں ان کے سوا کسی شے کا مالک نہیں

1۔ سنن ترمذی، باب فی مناقب عثمان بن عفان، حدیث نمبر 3633، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 250، دار الکتب العلمیہ

ہوں، تحقیق میں نے وہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دے دیے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تو ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے لئے دے دے اور دوسرے کو اپنے اور اپنے بال بچوں کی گزراوقات کے لئے رکھ لے۔“ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں: میں نے ان میں سے زیادہ اچھا اور بہتر اللہ تعالیٰ کے لئے دے دیا اور وہ وہ باغ ہے جس میں چھ سو درخت ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تب اللہ تعالیٰ اس کے عوض تجھے جنت کی جزا عطا فرمائے گا۔“ پھر ابوالدحداح بنی شہر چل پڑے یہاں تک کہ ام الدحداح کے پاس آپہنچے اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں درختوں کے نیچے گھوم پھر رہی تھی تو آپ کہنے لگے:

ہدایک ربی سبیل الرشاد	الی سبیل الخیر و السداد
بینی من الحائط بالوداد	فقد مضی قرضا الی التناد
اقرضتہ اللہ علی اعتمادی	بالظوم لا مین ولا ارتداد
الا رجاء الضعف فی البعاد	فارتحل بالنفس والاولاد
والبیز لا شک فخیرو زاد	قدّمہ المرء الی البعاد

تو ام الدحداح نے کہا: تو نے نفع بخش سودا کیا ہے، اللہ تعالیٰ تجھے اس میں برکت عطا فرمائے جو تو نے خریدا ہے، پھر ام الدحداح نے آپ کو جواب دیا اس طرح کہا:

بشاک اللہ بخیر و فرح	مثک اذی مالدیہ ونصح
قد مشع اللہ عیالی و منہ	بالعجوة السوداء والزہو البدع
والعبد یسعی ولہ ما قد کدح	طول الیالی و علیہ ما اجترح

پھر ام الدحداح اپنے بچوں کے پاس آئی، جو کچھ ان کے مونہوں میں تھا اسے نکالنے لگی اور جوان کے پاس خوشوں میں تھا اسے بھی جھاڑ دیا یہاں تک کہ وہ دوسرے باغ میں منتقل ہو گئی اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”کتنے ہی پھلوں سے لدے ہوئے بھاری بھر کم درخت اور وسیع گھرا ابوالدحداح کے لئے ہیں۔“ (1)

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عربی نے کہا ہے: مخلوق خالق کے حکم، اس کی حکمت، اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس کی قضا و قدر کے مطابق تقسیم ہو گئی جب انہوں نے یہ آیت سنی پس وہ تین حصوں میں بٹ گئے۔

پہلا گروہ انتہائی کمینہ اور رذیل ہے۔ انہوں نے کہا: بے شک محمد (مصطفیٰ ﷺ) کا رب فقیر اور ہمارا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں، پس یہ ایسی جہالت ہے جو کسی بھی صاحب عقل پر مخفی نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے ان کا رد کیا: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِیَاءُ۔ (آل عمران: 181)

اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ جب اس نے یہ قول سنا تو اس نے بخل اور کنجوسی کو ترجیح دی اور مال میں رغبت کو مقدم سمجھا اور انہوں

1۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 249، حدیث نمبر 3451، دار الکتب العلمیہ

نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا، نہ انہوں نے کسی قیدی کو چھڑایا اور نہ کسی کی معاونت کی۔ اطاعت و پیروی سے سستی اور کوتاہی کرتے ہوئے اور اس دنیا کی طرف میلان رکھتے ہوئے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جس نے یہ قول سنا تو اس کی پیروی اور تعمیل میں جلدی کی اور ان میں سے ایک قبول کرنے والے نے تو اپنے مال کی طرف تیزی سے بڑھنے کو ترجیح دی جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قَرْضًا حَسَنًا، القرض کا معنی ہے: اسم لکل ما یلتبس علیہ الجزاء یعنی قرض ہر اس شے کا نام ہے جس پر وہ جزا کا طالب ہوتا ہے۔ اقرض فلان فلاناً یعنی فلاں نے فلاں کو وہ عطا کیا جس کے بدل کا وہ اس سے تقاضا کر سکتا ہے۔ لبید نے کہا:

وَ اِذَا جُوِزَتْ قَرْضًا فَاجْزِهِ اِنَّمَا يَجْزِي الْفَقْرَ لَيْسَ الْجَبَلُ

جب تجھے بطور قرض جزا دی جائے تو تو اس کی جزا دے بلاشبہ جو ان ہی جزا اور بدلہ دیتا ہے نہ کہ اونٹ۔

اور القرض یعنی قاف کے کسرہ کے ساتھ یہ بھی ایک لغت ہے جسے کسائی نے بیان کیا ہے اور استقرضت من فلان کا معنی ہے میں نے اس سے قرض طلب کیا پس اس نے مجھے قرض دے دیا۔ اور اقترضت منه کا معنی ہے میں نے قرض لیا۔ اور زجاج نے کہا ہے: لغت میں قرض کا معنی ہے البلاء الحسن والبلاء السی یعنی اچھی آزمائش اور بری آزمائش۔ امیہ نے کہا ہے:

كُلُّ امْرِئٍ سَوْفَ يُجْزَى قَرْضُهُ حَسَنًا اَوْ سَيِّئًا وَ مَدِينًا مِثْلَ مَا دَانَا
ہر آدمی کو اس کے قرض کا بدلہ دیا جائے گا چاہے وہ حسن ہو یا سیئہ ہو اور جس کو قرض دیا گیا ہے وہ قرض دینے والے کی مثل ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

تُجَاوِزِي الْقَرْضُ بِأَمْثَالِهَا فَبِالْخَيْرِ خَيْرًا وَ بِالشَّرِّ شَرًّا

قرضوں کا بدلہ ان کی مثلوں کے ساتھ ہی دیا جائے گا پس اچھائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ اور شر کا بدلہ شر کے ساتھ ہوگا۔

اور کسائی نے کہا ہے: قرض سے مراد وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جو گزر گئے اور کلمے کا اصل معنی قطع کرنا اور کاٹنا ہے اور اسی سے المقرض قینچی ہے اور اقراضتہ سے مراد یہی ہے کہ میں نے اس کے لئے اپنے مال سے ایک حصہ الگ کر دیا ہے جس پر بدلہ دیا جائے گا۔ اور انقرض القوم: اس کا معنی ہے ان کا اثر ختم ہو گیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ اور یہاں پر القرض اسم ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہاں اقراضاً ہوتا۔

اس آیت میں قرض کی استدعا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگوں کی تقریب الی الفہم اور انہیں ایسے انداز سے مانوس کرنے کے لئے ہے جسے وہ سمجھ سکتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ تو الغنی الحمید ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بندہ مومن کی وہ عطا جس کے عوض وہ آخرت میں ثواب کی امید رکھتا ہے اسے قرض کے ساتھ تشبیہ دی ہے جیسا کہ اس نے جنت کے حصول میں جان اور مال دینے کو بیع اور شر اسے تشبیہ دی ہے۔ اس کا بیان سورہ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت سے مراد صدقہ پر اور فقراء اور محتاج لوگوں پر مال خرچ کرنے اور ان پر وسعت و خوشحالی

لانے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں دین کی مدد و نصرت کرنے پر ابھارنا اور برا بیچنے کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کنایہ فقیر کو اپنی ذات کے ساتھ ذکر کیا ہے صدقہ کی ترغیب دیتے ہوئے۔ اس کی علت یہ ہے کہ اس کی ذات حاجات سے منزہ اور پاک ہے جیسا کہ اس نے مریض، بھوکے اور پیاسے کو کنایہ اپنی ذات سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس کی ذات نقائص و آلام سے پاک ہے۔

اور صحیح حدیث میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہ کی اور میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا اور تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا اور میں نے تجھ سے پانی طلب کیا اور تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔“ تو یہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں تجھے کیسے پلا سکتا تھا حالانکہ تو رب العالمین ہے؟ تو رب العالمین فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا اور تو نے اسے نہ پلایا۔ بلاشبہ اگر تو اسے پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا (1)۔“ اور اسی طرح ان چیزوں میں بھی ہے جو اس سے پہلے ہیں۔ اسے مسلم اور بخاری نے روایت کیا ہے اور یہ سب کی سب اس کے لئے محل شرف میں واقع ہیں جس کے بارے اسے ترغیب دینے کے لئے کنایہ ذکر کیا جس کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قرض لینے والے پر قرض کو واپس لوٹانا واجب ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ خرچ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضائع نہ ہوگا بلکہ وہ بالیقین ثواب لوٹائے گا اور اس نے جزا کو مبہم رکھا ہے اور حدیث شریف میں ہے: ”اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا گیا (مال) سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ تک بڑھا دیا جاتا ہے (2)۔“ جیسا کہ اس کا بیان اس سورۃ میں اس ارشاد کے تحت آئے گا۔ مَثَلُ الَّذِي يَنْفِقُونَ أَصْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ الْآلِیَةِ (بقرہ: 261)۔ اور یہاں فرمایا: فَيُضْعِفُهُ لَهَا أَضْعَافًا كَثِيرَةً (بقرہ: 245) اور اس کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ کوئی حد۔

مسئلہ نمبر 5۔ قرض کا ثواب بہت زیادہ ہے، کیونکہ اس میں ایک مسلمان کے لئے وسعت اور کشادگی لانا ہے۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میں نے شب معراج جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا: صدقے کا اجر اس کی دس مثل ہے اور قرض کا اجر اٹھارہ مثل۔ تو میں نے حضرت جبریل امین علیہ السلام کو کہا: قرض میں کیا ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے؟ تو انہوں نے کہا: کیونکہ سائل سوال کرتا ہے اور اس کے پاس (کچھ مال موجود ہوتا ہے) اور قرض لینے والا بغیر حاجت کے قرض کا مطالبہ نہیں کرتا (3)۔“

محمد بن خلف عسقلانی، یعلیٰ، سلیمان بن یسیر نے قیس بن رومی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ سلیمان بن اذنان نے علقمہ کو ایک ہزار درہم ان کی عطا (وظیفہ) تک قرض دیے پھر جب ان کی عطا کا وقت نکل گیا تو انہوں نے ان سے اس کا تقاضا

1۔ صحیح مسلم، کتاب السیر والصلۃ والادب، جلد 2، صفحہ 318، وزارت تعلیم

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 196، د۔ ت۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل النفقة فی الخ، حدیث 1550، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2421، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا اور اس پر شدت اور سختی کا اظہار کیا، تو انہوں نے وہ پورا کر دیا۔ گویا علقمہ ناراض ہو گئے اور کئی مہینے ٹھہرے رہے (اور ان سے نہ ملے) پھر ان کے پاس آئے اور کہا: مجھے ایک ہزار درہم میری عطا تک قرض دیجئے۔ انہوں نے کہا: ہاں بڑی عزت و کرامت سے! اے ام عتبہ وہ تھیلا لاؤ جس پر مہر لگی ہوئی ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔ راوی کا بیان ہے: چنانچہ وہ لے کر آئی تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! یہ تمہارے وہی درہم ہیں جو تم نے مجھے دیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی نہیں ہلایا۔ تو آپ نے کہا: تیرے باپ کی قسم! جو تو نے میرے ساتھ سلوک کیا کس نے تجھے اس پر ابھارا؟ تو انہوں نے کہا: میں نے تم سے سنا ہے کہ تم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہو کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو دوبار قرض دیتا ہے تو وہ اس کے ایک بار صدقہ دینے کی طرح ہے (1)۔“ فرمایا: مجھے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح خبر دی ہے۔

(ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اس طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مسلمان بھی کسی مسلمان کو ایک دفعہ قرض دیتا ہے وہ اس کے دو دفعہ صدقہ کے برابر ہو جاتا ہے۔“ اسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے مرفوع اور موقوف روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ آدمی کا قرض ایک کا بدلہ ایک ہوتا ہے، یعنی وہ اس پر اتنا ہی لوٹائے گا جتنا اس نے اسے قرض دیا ہے اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ دنانیر، درہم، گندم، جو، کھجور، کشمش اور ہر وہ شے طعام میں سے جس کی مثل موجود ہے اسے قرض کے طور پر لینا جائز ہے اور مسلمانوں نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس پر اجماع کیا ہے کہ قرض میں زیادتی کی شرط لگانا باہ ہے۔ اگرچہ وہ چارے کی ایک مٹھی ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یا ایک دانہ ہو اور جو چیز قرض کے طور پر لی ہے اس سے افضل واپس لوٹانا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی شرط نہ لگائی جائے، کیونکہ یہ احسان کے باب سے ہے۔ البکر کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے: ”بے شک تم میں سے اچھا وہ ہے جو قضا کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے (2)۔“ اسے ائمہ نے روایت کیا ہے، یعنی بخاری اور مسلم وغیرہ ماہی۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف کی ہے جس نے ادائیگی اچھے طریقہ سے کی اور اسے مطلق قرار دیا اور اسے کسی صفت سے مقید نہ کیا اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے البکر کے بارے میں فیصلہ فرمایا اور اس سے مراد عمدہ اور پسندیدہ جوان اونٹ ہے اور عمدہ اونٹ وہ ہوتا ہے جو رباعی ہو۔ اس میں خیار سے مراد مختار ہے اور رباعی سے مراد وہ ہے جو چوتھے سال میں داخل ہو، کیونکہ وہ اس میں اپنے رباعیہ دانت گرا دیتا ہے اور یہ وہ دانت ہیں جو ثنایا سے ملے ہوتے ہیں اور یہ چاروں رباعیات کہلاتے ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور یہ جائز نہیں ہے کہ جس نے قرض لیا ہے وہ قرض دینے والے کو کچھ ہدیہ وغیرہ دے اور نہ ہی قرض دینے والے کو اسے قبول کرنا حلال ہے مگر یہ کہ پہلے بھی دونوں کی عادت ہو (کہ وہ ہدیہ اور تحفہ وغیرہ دیتے رہتے ہوں) سنت اسی طرح ہے۔ ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ ہشام بن عمار، اسماعیل بن عیاش، عتبہ بن حمید الضبی نے یحییٰ بن ابی اسحاق الہنبالی

سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو اپنے بھائی کو مال قرض کے طور پر دیتا ہے اور وہ اسے کچھ ہدیہ دیتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو قرض دے اور وہ اسے ہدیہ دے یا اسے اپنی سواری پر سوار کرے تو وہ اسے نہ قبول کرے اور نہ اس کی سواری پر سوار ہو مگر یہ کہ ان دونوں کے درمیان اس سے پہلے بھی یہ عادت جاری ہو (1)۔“

مسئلہ نمبر 8۔ قرض مال میں سے ہوتا ہے۔ تحقیق ہم اس کا حکم بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ عزت و آبرو سے بھی ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث مروی ہے: ”کیا ہم میں سے کوئی ابو مضمم کی طرح ہونے سے عاجز ہوگا کہ جب وہ اپنے گھر سے نکلتا تو کہتا: اے اللہ! میں نے اپنی عزت تیرے بندوں پر صدقہ کر دی (2)۔“

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ”تو اپنی عزت اپنے فقر و افلاس کے دن کے لئے قرض دے دے۔“ مراد یہ ہے کہ جو کوئی تجھے گالی گلوچ دے تو تو اس سے حق نہ لے اور نہ تو اس پر حد قائم کر یہاں تک کہ قیامت کا دن آجائے جو وافر اجر دینے والا ہے۔

اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے: عزت کو صدقہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور امام مالک سے مروی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ فاسد ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حدیث صحیح میں کہا ہے: ”بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (3)۔“ الحدیث۔ اور یہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ تینوں محرّمات اس میں ایک کے قائم مقام ہیں کہ ان کا احترام کرنا آدمی کے لئے فرض اور لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: حَسَنًا وَاَقْدَىٰ نے کہا ہے: جس کی ذات کو اچھا شمار کیا جائے اور عمرو بن عثمان صدفی نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہ احسان جتلیا جائے اور نہ وہ اسے اذیت اور پریشانی میں مبتلا کرے۔ اور سہل بن عبد اللہ نے کہا ہے: وہ اپنے قرض میں کسی عوض کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَيُضْعِفُهُ لَكُمْ عَصْمٌ وَغَيْرُهُ نے فَيُضْعِفُهُ الف اور فاء کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے عین کو مشدّد بغیر الف کے اور فاء کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر، ابو جعفر اور شیبہ نے تشدید اور فاء کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے الف کے ساتھ اور فاء کو مرفوع پڑھا ہے۔ جنہوں نے اسے رفع دیا ہے انہوں نے یقرض کے ساتھ ملایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ہو يَضْعِفُهُ ہے۔ اور جنہوں نے منصوب پڑھا ہے تو انہوں نے فاء کے ساتھ استفہام کا جواب بنایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے پہلے آن مضمّر ہے۔ تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ اور تشدید کی دلیل اَضْعَافًا كَثِيرَةً ہے کیونکہ تشدید کثرت بیان کرنے کے لئے ہوتی ہے اور حسن اور سدی نے کہا ہے: ہم اس تضعیف (کئی گنا) کو نہیں جانتے مگر صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2422، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 231، دار الفکر
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 632، وزارت تعلیم

ارشاد گرامی ہے: وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرٌ عَظِيمًا (النساء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ جہاد کے نفقہ کے بارے میں ہے اور ہم حساب لگاتے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تھے کہ ایک آدمی کا خرچہ اپنی ذات پر اور اپنے رفقاء پر اور اپنی سواری پر بیس لاکھ تھا۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاللَّهُ يَقْضِي وَيَبْضُطُ یہ ہر شے میں عام ہے، پس وہی تنگ کرنے والا ہے اور وہی فراخ اور کشادہ کرنے والا ہے۔ ہم نے ”شرح الاسماء الحسنی فی الكتاب الاسنی“ میں ان دونوں پر بحث کی ہے۔ وَاللَّهُ تَرْجَعُونَ یہ وعید ہے کہ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ مِنْ بَنِي إِسْرَآءَ يُلُّ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيِّ لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَالَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أَخْرَجَنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاؤُنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ③

”کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے کہ مقرر کر دو ہمارے لئے ایک امیر تاکہ لڑائی کریں ہم اللہ کی راہ میں۔ نبی نے کہا: کہیں ایسا نہ ہو کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد تو تم جہاد نہ کرو وہ کہنے لگے: (کوئی وجہ) نہیں ہمارے لئے کہ ہم جہاد نہ کریں اللہ کی راہ میں حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے بجز چند کے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔“

قتال اور جنگ پر برا بیگنہ کرنے کے بارے میں دوسرا قصہ بیان فرمایا جو بنی اسرائیل میں پیش آیا۔ الملائکا کا معنی ہے اشراف لوگ، گویا کہ وہ شرف و عزت سے بھرے ہوئے ہیں اور زجاج نے کہا ہے: انہیں یہ نام دیا گیا کیونکہ وہ ان چیزوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی انہیں ضرورت اور احتیاج ہوتی تھی۔

اور اس آیت میں الملائ سے مراد قوم ہے، کیونکہ معنی اس کا تقاضا کرتا ہے اور الملائ اسم جمع ہے جیسا کہ قوم اور رھط وغیرہ۔ اور الملائ کا معنی حسن خلق بھی ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: احسنوا للملائ فكلکم سيئوئ، (1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے (تم اخلاق اچھے کر لو تو تم تمام کے تمام سیراب (خوشحال) ہو جاؤ گے)

قولہ تعالیٰ: مِنْ بَعْدِ مُوسَى یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد۔ إِذْ قَالُوا لِنَبِيِّ لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا، کہا گیا ہے کہ وہ نبی حضرت شمویل بن بال بن علقمہ تھے اور وہ ابن العجوز کے لقب سے معروف تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شمعون تھے، سدی نے یہی کہا ہے اور بلاشبہ کہا گیا ہے کہ ابن العجوز لقب اس لئے تھا کہ ان کی ماں بوڑھی تھی تو اس نے

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بیٹے کی التجا کی حالانکہ وہ بوڑھی اور بانجھ ہو چکی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرمادیا اور انہیں سمعون بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس بڑھیا نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ وہ اسے بیٹا عطا فرمائے تو رب کریم نے اس کی دعا سن لی اور بڑھیا نے بچے کو جنم دیا۔ پس اس نے اس کا نام سمعون رکھا، وہ کہتی: اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی ہے اور سین عبرانی زبان میں شین ہو جاتی ہے اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نون تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہے درمیان میں لوگوں کی کئی امتیں ہیں۔ اور حضرت یوشع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلام تھے (1) اور محاسبی نے ذکر کیا ہے کہ ان کا نام اسماعیل تھا۔ واللہ اعلم

یہ آیت بنی اسرائیل کی اس قوم کے بارے خبر ہے جنہیں ذلت نے آیا اور دشمن نے ان پر غلبہ پالیا تو انہوں نے جہاد کے بارے اجازت طلب کی کہ انہیں اس کا حکم دیا جائے اور جب انہیں حکم دیا گیا تو ان میں سے اکثر نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور قلیل لوگ ڈٹے رہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نصرت سے نوازا۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ مذکورہ لوگ وہی ہیں جنہیں موت دی گئی اور پھر وہ زندہ کر دیے گئے۔ واللہ اعلم

قوله تعالى: لُقَاتِلْ يَه نون اور جزم کے ساتھ ہے اور جمہور قراء کی قراءت جواب امر کی بنا پر ہے اور ضحاک اور ابن ابی عبیدہ نے یاء کے ساتھ اور فعل کو مرفوع پڑھا ہے (یعنی يُقَاتِلْ) اور یہ البلدان کی صفت کے محل میں ہے۔

قوله تعالى: قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اور یہ عَسَيْتُمْ بھی ہے یعنی فتح اور کسرہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں۔ دوسری کے مطابق حضرت نافع نے قراءت کی ہے اور باقیوں نے پہلی کے مطابق (یعنی فتح کے ساتھ) اور یہی مشہور ہے۔

ابو حاتم نے کہا ہے: کسرہ کی کوئی وجہ (اور علت) نہیں ہے اور اس کے ساتھ حسن اور ظلمہ نے پڑھا ہے۔

مکی نے اسم فاعل میں کہا ہے: عیس، اور یہ ماضی میں سین کے کسرہ پر دلالت کرتا ہے اور سین پر فتح یہ لغت مشہور ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: کسرہ کی وجہ عربوں کا یہ قول ہے: هو عیس بذلك مثلاً اور ج۔ اور یہ فَعَلَ اور فَعِلَ دونوں کے وزن پر آیا ہے جیسا کہ نَعَم اور نَعِم میں ہے اور اسی طرح عَسِيت اور عَسِيت ہے، پس اگر فعل کی نسبت اسم ظاہر کی طرف کی جائے تو عَسِيتم میں قیاس یہ ہے کہ کہا جائے: عِيسَ زَيْدٌ۔ مثلاً رَضِيَ زَيْدٌ اور اگر یہ کہا جائے تو یہ قیاس کے مطابق ہے اور اگر نہ کہا جائے تو پھر جائز ہے کہ دونوں لغتیں لے لی جائیں۔ اور دونوں میں سے ایک دوسری کی جگہ استعمال ہوتی رہے۔ اور اس کلام کا معنی یہ ہے کیا تم پیٹھ پھیرنے اور فرار اختیار کرنے کے قریب ہو؟ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَا تُقَاتِلُوْا۔ (2)

زجاج نے کہا ہے: اَلَا تُقَاتِلُوْا یہ محل نصب میں ہے، یعنی هل عسيتم مقاتلة (کیا تم لڑائی نہ کرنے کے قریب ہو) قَالُوا وَمَا لَنَا اَلَا تُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اخفش نے کہا ہے: اس میں اَنْ زائدہ ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ یہ اپنے معنی پر محمول

ہے۔ یعنی د ما منعنا (یعنی کون سی شے ہمارے لئے رکاوٹ ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: مالک ألا تصلى؟ ما منعك
یعنی کون سی شے تیرے لئے نماز پڑھنے سے رکاوٹ ہے۔

اور کہا ہے: معنی یہ ہے ہمارے لئے اس میں کون سی شے ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ نہیں کریں گے۔ نحاس
نے کہا: یہ معنی زیادہ عمدہ اور اچھا ہے۔ اور ”أَنْ“ محل نصب میں ہے۔ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا یہ علت بیان ہو رہی ہے اور
اسی طرح وَأَبْنَيْنَا بھی ہے یعنی اپنی اولادوں کے سبب سے (ہم ضرور لڑیں گے)

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ یعنی جب ان پر فرض کر دیا گیا تَوَلَّوْا اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جب اس نے ان
پر قتال فرض کیا اور انہوں نے حقیقت کو دیکھا تو جنگ لڑنے کے بارے میں ان کے افکار تبدیل ہو گئے اور ان کی جانیں نکلنے
لگیں۔ تَوَلَّوْا یعنی ان کی نیتیں مضطرب ہو گئیں اور ان کے عزائم ڈھیلے پڑ گئے۔ یہ حال ہے ان امتوں کا جو بڑی خوشحال اور
متنعم تھیں اور انہوں نے خوشحالی کے اوقات میں جنگ کی تمنا کرتے ہوئے دعا کی درخواست کی اور جب جنگ چھڑ گئی تو
انہوں نے بزدلی دکھائی اور اپنی طبع کی پیروی کی۔

اسی وجہ سے حضور نبی مکرم ﷺ نے ایسی دعا سے اپنے اس ارشاد کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ ”تم دشمن سے ملاقات کی تمنا
نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجا کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر تم ثابت قدم رہو (1)۔“ اسے ائمہ
نے روایت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے قلیل لوگوں کی خبر دی کہ وہ پہلی نیت پر ثابت اور مستحکم رہے اور اللہ تعالیٰ کے
راستے میں جنگ کرنے پر ان کے ارادے برقرار رہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَلَيَّْا يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ
عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ
اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ ۚ
وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٠﴾

”اور کہا انہیں ان کے نبی نے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر، بولے:
کیوں کر ہو سکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر، حالانکہ ہم زیادہ حقدار ہیں حکومت کے اس سے اور نہیں دی گئی
اسے فراخی مال و دولت میں۔ نبی نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور
زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ
وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا یعنی تم نے جو اللہ تعالیٰ سے مانگا ہے اللہ تعالیٰ نے

تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے اور طالوت پانی پلاتے تھے۔ بعض نے کہا: وہ چمڑا رنگنے کا کام کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے: وہ اجرت پر کام کرتے تھے اور عالم بھی تھے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بلند کر دیا جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ وہ حضرت بنیامین کے قبیلے سے تھے اور وہ نہ تو نبوت کے قبیلے سے تھے اور نہ ہی بادشاہت کے قبیلے سے۔ اور نبوت بنی لاویٰ میں تھی اور بادشاہت یہودا کے قبیلے میں تھی، سو اسی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔

حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے: جب بنی اسرائیل کے گروہ نے حضرت شمویل بن بال علیہ السلام سے کہا جو کہا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ ان کی طرف ایک امیر اور بادشاہ بھیجے اور اس پر راہنمائی بھی فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم اپنے اس سینک کی طرف دیکھو جس میں تمہارے گھر میں تیل پڑا ہے۔ جب کوئی آدمی تمہارے پاس آئے اور وہ تیل جوش مار کر آواز نکالنے لگے جو سینک میں ہے، تو وہی بنی اسرائیل کا بادشاہ ہوگا اور اس تیل میں سے کچھ اس کے سر پر لگا دو اور اسے ان پر بادشاہ مقرر کر دو۔

فرمایا: طالوت چمڑے کی دباغت کا کام کرتے تھے۔ ان کا جانور گم ہو گیا اور وہ اس کی تلاش میں نکلے اور حضرت شمویل علیہ السلام کے گھر کا قصد کیا تا کہ وہ اپنے لئے جانور کے معاملہ میں دعا کرائیں یا ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ پالیں کہ امید لگ جائے، تو تیل میں جوش پیدا ہو گیا جیسا ان کا گمان تھا۔ بیان کیا: پس حضرت شمویل علیہ السلام اس کے پاس کھڑے ہوئے اور اسے اٹھالیا اور اس میں سے کچھ تیل طالوت کے سر پر لگا دیا اور اسے فرمایا: تو ان بنی اسرائیل کا بادشاہ اور امیر ہے جن کے بارے اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے (1)۔ پھر بنی اسرائیل کو فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ اور امیر مقرر کیا ہے۔“

طالوت اور جالوت یہ دونوں عجی اسم ہیں اور دونوں معرب ہیں۔ اسی لئے یہ دونوں منصرف نہیں (2)۔ اسی طرح داؤد بھی ہے۔ ان کی جمع طوالت، جوالیت اور دواوید ہے۔ اور اگر کسی آدمی کا نام طاؤس اور راقوڈ رکھا جائے تو یہ دونوں منصرف ہوں گے اگرچہ یہ دونوں عجی ہیں۔

اس کے اور پہلے کے درمیان فرق یہ ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں: الطاؤس، پس الف لام داخل ہوتے ہیں اور یہ عربی میں غیر منصرف بنا دیتے ہیں اور یہ انہیں متمکن نہیں بنا سکتے (یعنی طالوت اور جالوت کو)

قولہ تعالیٰ: اَنِّیْ یَّکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْہِمْ اَعْنِیْ وہ کیسے ہمارا امیر بن سکتا ہے حالانکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کا حق رکھتے ہیں؟ وہ انبیاء علیہم السلام کو تکلیف پہنچانے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے تکبر اور انکار کے بارے میں اپنے طریقے پر چلتے رہے۔ اور انہوں نے کہا: ”اَنِّی“ یعنی کون سی جہت سے۔ پس ”اَنِّی“ یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

حالانکہ ہم بادشاہ کے قبیلے سے ہیں اور وہ اس طرح نہیں ہے اور وہ فقیر اور مفلس ہے۔ پس انہوں نے اس اقویٰ سبب کو چھوڑ دیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور پہلے سے اس کا فیصلہ ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نبی علیہ السلام نے اس قول کے ساتھ

ان پر حجت اور دلیل بیان فرمائی: إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے چن لیا ہے اور یہی حجت قاطعہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے لئے طاوت کو چننے کی علت بھی بیان فرمادی اور وہ اس کی علم میں کشادگی اور وسعت ہے جو انسان کی بقا ہے اور وہ جسم ہے جو جنگ میں اس کا معاون اور مقابلے کے وقت اس کا سامان جنگ ہے۔ پس یہ آیت امام کی صفت اور امامت کے احوال کے بیان کو متضمن ہے اور بلاشبہ اس کے لئے علم، دین اور قوت کا ہونا ضروری ہے نہ کہ نسب کا۔ پس اس میں علم اور فضائل نفس کے ساتھ نسب کا کوئی حصہ نہیں ہے اور بلاشبہ یہ نسب پر مقدم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس نے طاوت کو ان پر علم اور اس کی قوت کی وجہ سے اختیار اور ترجیح دی ہے، اگرچہ نسب کے اعتبار سے وہ اعلیٰ اور اشرف ہیں۔ اور سورت کے پہلے حصہ میں امامت اور اس کی شرائط کا ذکر گزر چکا ہے جو کافی ہے اور دوبارہ اس کے بیان کی حاجت نہیں اور یہ آیت اس میں اصل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اس وقت طاوت بنی اسرائیل میں سب سے بڑا عالم تھا اور بڑا خوبصورت اور طاقتور انسان تھا اور وہ اتنا جسیم تھا کہ دشمن بھی اس سے خوف کھاتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ اس کا نام طاوت اس کی قد و قامت طویل ہونے کی وجہ سے تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جسم کی زیادتی سے مراد خیر اور شجاعت کے اوصاف کی کثرت ہے اور اس سے جسم کا عظیم ہونا مراد نہیں ہے۔ کیا آپ شاعر کے قول کی طرف نہیں دیکھتے:

تری الرجل النحیف فتزدریہ و فی اثوابہ أسدٌ هُزُورٌ
و یعجبک الطیر فتبتلیہ فیخلف ظنک الرجل الطیر
و قد عظم البعیر بغیر لب فلم یستغنِ بالعظم البعیر

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج مطہرات کے لئے ارشاد ہے: ”تم میں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مجھے وہ ملے گی جس کا ہاتھ تم میں سے زیادہ طویل ہوگا۔“ پس وہ آپس میں طوالت کو دیکھنے لگیں۔ تو ان میں حضرت زینب پہلے فوت ہوئیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور صدقہ کرتی تھیں (1)۔ اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے کہ علم سے مراد جنگ کا علم ہے اور یہ بغیر دلیل کے عام کی تخصیص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: علم کی زیادتی اس اعتبار سے تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی اور یہ اس بنا پر ہے کہ طاوت نبی ہوں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ۔ بعض تاویل کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ رب العالمین کا یہ ارشاد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شمول علیہ السلام کے قول میں سے ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ آپ نے انہیں یہ تب کہا جب آپ نے دلائل میں ان کی سرکشی اور ان کے جھگڑے کو دیکھا، تو ارادہ کیا کہ آپ اپنی کلام کو ایسی قطعی دلیل سے مکمل کریں جس پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا ہو، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 291، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاة، حدیث نمبر 1331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک عطا فرمادیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور دنیوی ملک کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف مملوک کی اضافت مالک کی طرف کرنے کی طرح ہے۔ پھر ان کے لئے رشک اور تنبیہ کی بنا پر ان کی طرف سے سوال کے بغیر فرمایا: **إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ** یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے آپ سے اس قول میں صدق پر دلیل طلب کی ہے: **إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا**۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: پہلا قول سیاق آیت کے مطابق زیادہ ظاہر ہے اور دوسرا بنی اسرائیل کے اخلاق ذمیرہ کے زیادہ مشابہ ہے، یہ موقف طبری نے اختیار کیا ہے (1)۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ٥١

”اور کہا انہیں ان کے نبی نے کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون اٹھالائیں گے اس صندوق کو فرشتے۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو۔“

قولہ تعالیٰ: **وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ** یہ بمعنی اتیان التابوت ہے، یعنی تابوت کا آنا ان کی بادشاہی کی نشانی ہے اور تابوت (صندوق) کے بارے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام پر نازل فرمایا (اتارا) اور وہ آپ کے پاس رہا، یہاں تک کہ (وراثہ) چلتے چلتے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اس کی برکت سے ان پر غالب آتے تھے جو کوئی ان سے جنگ لڑتے، حتیٰ کہ بنی اسرائیل نافرمان ہو گئے تو ان سے تابوت چھین لیا گیا اور عمالقہ نے اسے چھینا تھا۔ سدی کے قول کے مطابق وہ جالوت اور اس کے ساتھی تھے اور انہوں نے ان سے تابوت چھین لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ نافرمانی (گناہوں کی کثرت) ذلت و رسوائی کا سبب ہے اور یہ بالکل بین اور واضح ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ تابوت میں نشانی اس طور پر تھی کہ یہ مروی ہے اس میں سے رونے کی آواز سنائی دیتی تھی، پس جب وہ اسے سنتے تو وہ جنگ کے لئے چل پڑتے تھے اور جب یہ آواز پر سکون ہو جاتی تو نہ وہ چلتے اور نہ ہی تابوت چلتا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اسے میدان جنگ میں رکھتے تھے اور وہ مسلسل غالب آتے رہے یہاں تک کہ وہ نافرمان اور گستاخ ہو گئے تو وہ مغلوب ہو گئے اور ان سے تابوت لے لیا گیا اور وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ پس جب انہوں نے ہلاکت اور اپنا ذکر ختم ہونے کی علامت دیکھی، تو ان میں سے بعض نے اسے ناپسند کیا اور وہ اپنے معاملات میں مشاورت کرنے لگے یہاں تک کہ ان

کی ایک جماعت اس پر جمع ہوگئی کہ وہ اپنے وقت کے نبی علیہ السلام کو عرض کریں کہ ہمارے لئے کوئی امیر مقرر کر دو۔ پھر جب نبی علیہ السلام نے انہیں یہ بتایا تمہارا بادشاہ طالوت ہے تو انہوں نے اس میں رجوع کر لیا (یعنی رائے بدل لی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے۔ پس جب انہیں دلیل کے ساتھ خاموش کر دیا گیا تو انہوں نے اس پر بینہ طلب کر لیا۔ یہ طبری کا قول ہے اور جب انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے اس پر شہادت طلب کی جو انہوں نے کہا، تو انہوں نے اپنے رب سے دعا کی تو اس کے سبب اس قوم پر بیماری نازل ہوئی جنہوں نے تابوت لے لیا تھا۔ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے کنیہ (عبادت گاہ) میں رکھا۔ اس میں بت تھے تو وہ بت صبح کے وقت اوندھے پڑے تھے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے بت خانہ میں بڑے بت کے نیچے رکھا۔ پس انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ بت کے اوپر پڑا ہوا تھا، تو انہوں نے اسے اٹھایا اور اسے بت کی ٹانگوں کے ساتھ باندھ دیا اور پھر صبح اس حال میں کی کہ بت کے دونوں ہاتھ اور اس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں اور تابوت کے نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ پس انہوں نے اسے اٹھایا اور ایک قوم کے گاؤں میں جا کر رکھ دیا تو اس قوم کی گردنوں میں درد ہونے لگی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اسے ایک قوم کے پاخانہ کی جگہ رکھا تو وہ بواسیر کی بیماری میں مبتلا ہونے لگے اور جب ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی جس حالت میں وہ تھی تو انہوں نے کہا: یہ تکلیف نہیں ہے مگر اسی تابوت کی وجہ سے۔ پس ہمیں چاہئے کہ ہم اسے بنی اسرائیل کی طرف واپس لوٹا دیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے دو بیلوں کے درمیان ریڑھے پر رکھا اور انہیں بنی اسرائیل کے شہروں کی طرف بھیج دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے وہ بیلوں کو ہانکتے رہے یہاں تک کہ وہ دونوں بنی اسرائیل میں داخل ہو گئے۔ یہ لوگ طالوت کی حکمرانی میں تھے تو انہیں مدد و نصرت کا یقین ہو گیا۔ اس روایت میں یہی ملائکہ کا تابوت کو اٹھانا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ملائکہ اسے اٹھا کر لائے اور حضرت یوشع بن نون نے اسے ریگستان میں رکھ دیا اور یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے ہوا میں تابوت دیکھا یہاں تک کہ وہ ان کے درمیان اتر گیا۔ ربیع بن خثیم نے یہی کہا ہے۔

اور وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ اس تابوت (صندوق) کی مقدار تقریباً تین ہاتھ لمبائی اور دو ہاتھ چوڑائی تھی۔ کلبی نے کہا ہے: یہ ہمسار کی لکڑی سے بنا ہوا تھا جس سے کنگھیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے التابوہ پڑھا ہے اور یہ بھی اس کی لغت ہے اور لوگ آپ کی قراءت پر اسے تاکے ساتھ پڑھتے ہیں اور یہ گزر چکا ہے۔ اور آپ سے التیبوت بھی مروی ہے۔ نحاس نے اسے ذکر کیا ہے۔ اور حمید بن قیس نے یحصلہ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ سَكِينَةٌ اور بقیہ کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ پس سکینہ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر ہے یہ سکون، وقار اور طمانینت سے لیا گیا ہے۔ پس یہ قول فِيهِ سَكِينَةٌ یہ تمہارے دلوں کے سکون کا سبب ہے اس میں جو طالوت کے بارے تم میں اختلاف ہے۔ اور اسی کی طرح یہ ارشاد ہے: فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ نازل فرمایا جس کے سبب اس کے دل کو سکون ہوا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تابوت ان کے دلوں کے سکون کا سبب تھا، پس وہ جہاں بھی ہوئے انہیں اس کے

پاس سکون و اطمینان ملا۔ جب تابوت جنگ میں ان کے ساتھ ہوتا تھا وہ اس سے قطعانہ بھاگتے تھے۔

وہب بن منبہ نے کہا ہے: سکینہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص روح ہے جو کلام کرتی تھی۔ جب ان کا کسی امر میں اختلاف ہو جاتا تو وہ اس کی وضاحت اور بیان کے ساتھ بولتی تھی جو وہ ارادہ رکھتے تھے اور جب وہ جنگ میں چیخ مارتی تو کامیابی و کامرانی ان کے لئے ہو جاتی تھی۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یہ بہت تیز رفتار ہوا تھی اس کا چہرہ انسان کے چہرے کی مثل تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ ایسی ہوا تھی جو ناہموار جگہوں سے بڑی تیزی کے ساتھ گزرتی، اس کے دوسرے تھے (1)۔

اور حضرت مجاہد بن جبر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ ایک بلی کی طرح کا حیوان تھا اس کے دو پر تھے، دم تھی اور اس کی آنکھیں چمکدار تھیں اور جب یہ کسی لشکر کی طرف دیکھتا تو وہ شکست کھا جاتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: یہ جنت سے لائی ہوئی سونے کی ایک طشتری تھی جس میں حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے دل دھوئے جاتے تھے، سدی نے یہی کہا ہے۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ تابوت میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی باقی رہ جانے والی کچھ اشیاء (تبرکات) اور ان کی علامات اور نشانیاں تھیں۔ لوگ اس کے پاس سکون حاصل کرتے تھے، اس سے انس رکھتے تھے اور قوت و طاقت حاصل کرتے تھے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی سورۃ الکہف پڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ گھوڑا اور سیوں کے ساتھ بندھا ہوا تھا تو اس آدمی پر بادل سا چھا گیا اور وہ گھومتا رہا اور اس کے قریب آتا گیا اور اس کا گھوڑا اس کے سبب خوف سے بدکنے اور اچھلنے کودنے لگے۔ جب صبح ہوئی تو وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کا تذکرہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ سکینہ ہے جو قرآن کے سبب نازل ہوا۔“ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک رات اپنے مرید (کھجوریں خشک کرنے کی جگہ) میں قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ الحدیث۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”وہ ملائکہ تھے جو تیری تلاوت بن رہے تھے اور اگر تو پڑھتا رہتا تو وہ صبح اس حال میں کرتے کہ لوگ انہیں دیکھ سکتے جو ان سے مخفی رہتے ہیں (3)۔ اسے بخاری اور مسلم نے بیان کیا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار سکینہ کے نزول اور ایک بار ملائکہ کے نازل ہونے کے بارے فرمایا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ سکینہ اس سایہ میں تھا اور وہ ہمیشہ ملائکہ کے ساتھ اترتا ہے اور اس میں ان کے لئے بھی حجت ہے جنہوں نے کہا کہ سکینہ روح ہے یا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 333، دار الکتب العلمیہ 2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 268، وزارت تعلیم

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 269، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل سورۃ کہف، حدیث نمبر 4625، ضیاء القرآن پبلی کیشنز ایضاً۔ صحیح بخاری، باب فضل المعوذات، حدیث نمبر 4630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایسی شے ہے جس کی روح ہے، کیونکہ قرآن کا سننا صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے لئے جو عقل رکھتا ہے۔ واللہ اعلم
قوله تعالى: وَبَقِيَّةٌ - بقية کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

سو کہا گیا ہے: (اس میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور تختیوں کے ٹکڑے تھے
کیونکہ وہ ٹوٹ گئی تھیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پھینکا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی بیان کیا ہے اور
عکرمہ نے یہ زائد کہا ہے کہ اس میں تورات بھی تھی۔

اور ابوصالح نے کہا ہے: بقية سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، آپ کا لباس، حضرت ہارون علیہ السلام کے
کپڑے اور تورات کی دو تختیاں ہیں۔

اور عطیہ بن سعد نے کہا ہے: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کا عصا، دونوں کے
کپڑے اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں۔

اور ثوری نے کہا ہے: لوگوں میں سے کچھ کہتے ہیں کہ البقية سے مراد سونے کی طشتری میں دو قفیز من (وہ کھانا جو بنی
اسرائیل پر نازل ہوا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ شریف اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں اور
ان میں سے بعض کہتے ہیں: عصا اور نعلین مراد ہیں (1)۔

جو کچھ اس بارے روایت ہے اس کا معنی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے پاس تختیاں لے کر آئے اور
آپ نے انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے پایا، تو آپ نے غصے میں آکر وہ تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔ پس
آپ نے ان میں سے جو صحیح تھیں انہیں نکال لیا اور جو ٹوٹ گئی تھیں ان کے ٹکڑے اٹھائے اور انہیں تابوت میں رکھ دیا۔
اور ضحاک نے کہا ہے: البقية سے مراد جہاد کرنا اور دشمنوں سے قتال کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: تابوت کے بارے میں ان میں سے کوئی امر ہو، یا تو اس میں لکھا ہوا ہے اور یا پھر اس کی ذات کو لانا
ہی اس کے بارے امر کی طرح ہے۔ اور تبرک کی نسبت آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام کی طرف اس حیثیت سے کی گئی کہ
حکم ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف لکھا ہوا تھا اور وہ تمام کے تمام آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام ہی تھے اور کسی آدمی کی
آل سے مراد اس کے قرابتدار ہوتے ہیں (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ
بِمِيٍّ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اعْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا
قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ
بِطَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا اللَّهَ كَمْ مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ

عَلَبَتْ فِتْنَةً كَثِيرَةً بِأُذُنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٣٠﴾

”پھر جب روانہ ہوا طالوت اپنی فوجوں کے ساتھ اس نے کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے سو جس نے پانی پی لیا اس سے، وہ نہیں میرے ساتھیوں سے اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے مگر جس نے بھر لیا ایک چلو اپنے ہاتھ سے، پس سب نے پیا اس سے مگر چند آدمیوں نے ان سے (نہیں پیا) پھر جب عبور کیا اسے طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کہنے لگے: کچھ طاقت نہیں ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی (مگر) کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ وہ ضرور ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قول تعالیٰ: فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ، فَصَلَ کا معنی ہے جب وہ ان کے ساتھ نکلا فصلت النشء فانفصل یعنی میں نے شے کو کاٹا پس وہ کٹ گئی۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: جب طالوت روانہ ہوا تو لشکریوں نے اسے کہا: بے شک ہم سے نہیں اٹھائے جا سکتے، لہذا تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے نہر جاری کر دے۔ تو طالوت نے انہیں کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے۔

سدی کے قول کے مطابق فوجوں کی تعداد اسی ہزار تھی۔ اور حضرت وہب نے کہا ہے کوئی بھی اس سے پیچھے نہ رہا تھا سوائے اس کے جو صغریٰ یا کبرنی یا مرض کی وجہ سے معذور تھا (1)۔ اور الابتلاء کا معنی الاختبار آزمائش اور امتحان ہے۔ اور النہر اور النہر یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی السعة سے ہے (یعنی وسعت، خوشحالی) اور اس سے النہار بھی ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا: وہ نہر جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزما یا وہ اردن اور فلسطین کے درمیان ہے (2)۔ جمہور نے بنہر کو ہا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مجاہد اور حمید الاعرج نے بنہر ہاء کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے اور اس ابتلاء کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا، پس جس کی اطاعت و پیروی پانی کو ترک کرنے میں ظاہر ہوئی تو اس کے بارے میں یہ معلوم ہوگا کہ وہ اس کے سوا دیگر احکام میں بھی مطیع و فرمانبردار رہے گا۔ اور جس پر پانی کے بارے میں اس کی خواہش اور طلب غالب رہی اور اس نے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ بدرجہ اولیٰ دیگر تکالیف و مصائب میں نافرمان ہوگا۔

پس روایت ہے کہ وہ نہر پر پہنچے اس حال میں کہ پیاس انہیں لگی ہوئی تھی اور نہر کا پانی انتہائی میٹھا اور خوبصورت تھا۔ سو اس لئے اطاعت کرنے والوں کو چلو میں لینے کی رخصت دی گئی، تاکہ ان سے شدت پیاس کی اذیت کچھ نہ کچھ ختم ہو جائے اور اس

حال میں وہ نفس کا جھگڑا ختم کر سکیں (1) اور یہ بیان فرمادیا کہ زندگی کی تنگی پر صبر کرنے والوں کی احتیاط کے وقت پیاس کے ضرر اور تکلیف کو ختم کرنے کے لئے ایک چلو کافی ہو رہے گا جن کا قصد و ارادہ آسودگی اور خوشگواہی نہ ہو۔ جیسا کہ عروہ نے کہا ہے:

و أحسوا قراح الباء والباء بارد

اور انہوں نے خالص پانی تھوڑا تھوڑا پلایا اور پانی ٹھنڈا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: حسب المرء لقیات یقین صلیبہ، (2) آدمی کے لئے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی صلب (ریڑھ کی ہڈی مراد پشت) کو سیدھا رکھ سکیں۔

اور بعض وہ لوگ جو معافی کی گہرائی میں غور و فکر کرتے ہیں انہوں نے کہا ہے: یہ آیت ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے بیان فرمائی ہے، پس اللہ تعالیٰ نے دنیا کو نہر سے تشبیہ دی ہے اور اس سے پانی پینے والے کو اس سے جو دنیا کی طرف مائل ہے اور اس سے حظ وافر لینے کا طالب ہے اور پانی نہ پینے والے کو دنیا سے انحراف کرنے والے اور اس میں زہد و تقویٰ اختیار کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے ایک چلو لینے والے کو دنیا میں بقدر حاجت لینے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تینوں احوال مختلف ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کتنی حسین تعبیر ہے اگر اس تاویل میں تحریف اور ظاہر معنی سے خروج کا اندیشہ نہ ہو لیکن اس کا صحیح معنی دوسرا ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ طالوت نبی تھے انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اس کی طرف وحی اور الہام فرمایا اور اس نے الہام کو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش قرار دیا۔ اور جنہوں نے کہا وہ نبی نہ تھا انہوں نے کہا: اسے ان کے نبی حضرت شمویل علیہ السلام نے وحی کے سبب اس کی خبر دی جب طالوت نے اپنی قوم کو اس کے بارے آگاہ کیا اور بلاشبہ یہ آزمائش اس لئے آئی تاکہ صادق اور کاذب کے مابین تمیز ہو سکے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کی اطاعت و پیروی کو آزمائش کے لئے انہیں آگ روشن کرنے اور پھر اس میں کود جانے کا حکم ارشاد فرمایا، لیکن اسے اس معنی پر محمول کیا گیا کہ یہ آپ کا اس امر سے ڈرانے کے لئے مزاح ہے جس کا آپ نے انہیں مکلف اور پابند بنایا تھا، اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي یہاں شَرِبَ بمعنی کَرَعَ ہے (یعنی پانی پر منہ رکھ کر بلا واسطہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 60، وزارت تعلیم

ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراهیة کثرة الاکل، حدیث نمبر 2302، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پانی پینا) اور فَلَکَيْسٌ مِثْنًی کا معنی ہے وہ اس جنگ میں میرا ساتھی نہیں ہے اور اس نے انہیں اس جملہ کے ساتھ ایمان سے خارج نہیں کیا۔

سدی نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے اور لامحالہ ان میں مومن، منافق، محنت کرنے والے اور ست سبھی تھے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا (1) (جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے) یعنی وہ ہمارے اصحاب میں سے نہیں ہے اور وہ ہمارے طریقہ اور ہماری ہدایت پر نہیں ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

اِذَا حَادَلْتُ فِيْ اَسَدٍ فَجُوْرًا فَانِىْ لَسْتُ مِنْكَ وَ لَسْتُ مِثْنًی

جب تو اخلاق میں فسق و فجور کا قصد کرے گا تو پھر میں تجھ سے نہیں ہوں اور تو مجھ سے نہیں ہے۔ اور کلام عرب میں یہ عام رائج ہے کہ جب کسی آدمی کا بیٹا اس کے اسلوب اور طریقہ کے خلاف چلے تو وہ بیٹے کو کہہ دیتا ہے: لَسْتُ مِثْنًی تو مجھ سے نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِثْنًی کہا جاتا ہے: طعمت الشیء یعنی میں نے شے کو چکھ دیا اور اطعمتہ الباء یعنی میں نے اسے پانی چکھایا۔ اور یہاں ومن لم یشربہ نہیں کہا کیونکہ یہ اہل عرب کی عادت ہے کہ جب وہ کسی شے کو مکرر (دوبارہ) ذکر کریں تو وہ اسے دوسرے لفظ کے ساتھ مکرر لاتے ہیں اور لغۃ القرآن تو تمام لغات سے زیادہ فصیح ہے۔ لہذا اس میں اس کی جرح و قدح کا کوئی اعتبار نہیں جو یہ کہتا ہے: کہ طعمت الباء (میں نے پانی چکھایا) نہیں کہا جاسکتا۔

مسئلہ نمبر 5۔ ہمارے علماء نے اس سے سد ذرائع کے قول پر استدلال کیا ہے کیونکہ ذوق (چکھنا) وہ کم سے کم شے ہے جو لفظ طعم میں داخل ہے اور جب طعم سے نہی واقع ہے تو شرب کے وقوع کا اس سے کوئی امکان نہیں ہے جو طعم سے اجتناب کرے گا۔ اسی مبالغہ کی خاطر کلام ومن لم یشرب منه نہیں لائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ پانی طعام ہے اور جب وہ طعام ہے تو پھر وہ (انسان کی زندگی) باقی رکھنے کے لئے خوراک ہے اور بدنوں کی خوراک اسی سے (حاصل ہوتی ہے) تو پھر یہ واجب ہے کہ اس میں ربا جاری ہو۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہی مذہب صحیح ہے۔ (2)

ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے فرمایا: (دریا کے) کنارے پر پانی کی بیج پانی کے ساتھ کرنا متفاضل اور ایک خاص مدت تک اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور امام محمد بن حسن نے کہا ہے: یہ بھی ان چیزوں میں سے ہے جن کا کیل اور وزن کیا جاتا ہے۔ پس اس قول کی بنا پر ان کے نزدیک تفاضل جائز نہیں ہے۔ وہ اس لئے کہ ان کے نزدیک اس میں ربا ہے، کیونکہ ربا میں اس کی علت کیل اور وزن ہیں۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: پانی کی بیج نہ متفاضل جائز ہے اور نہ اس میں معینہ مدت کا ادھار جائز ہے۔ اور ربا میں اس کی علت یہ ہے کہ یہ جنس ماکول میں سے ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن عربی نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ نے کہا ہے: جس کسی نے کہا: اگر میرے فلاں غلام نے فرات سے پیا تو وہ آزاد ہے تو وہ آزاد نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ اس میں منہ لگا کر پانی پیے۔

الکرم کا معنی ہے کہ آدمی دریا سے اپنا منہ لگا کر بلا واسطہ پانی پیے۔ اور اگر اس نے اپنے ہاتھ سے پانی پیا یا برتن کے ساتھ اس سے پیا تو وہ آزاد نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے دریا میں منہ لگا کر پانی پینے اور ہاتھ کے ساتھ پانی پینے کے درمیان فرق کیا ہے (1)۔ فرمایا: یہ فاسد ہے، کیونکہ شرب الماء کا اطلاق لغت عرب میں ہر ہیئت اور صفت پر کیا جاتا ہے۔ ہاتھ کے ساتھ چلو بھر کر یا منہ لگا کر پینا یہ ایک ہی ہے اور جب لغت اور حقیقت وہ شرب پایا گیا جس کی قسم کھائی گئی ہے تو وہ حادث ہو گیا۔ پس اسے جان لو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اہل لغت نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے جیسا کہ کتاب و سنت نے فرق بیان کیا ہے۔

جوہری وغیرہ نے کہا ہے: کَرَعَ فِي الْمَاءِ كُرْعًا (کہا جاتا ہے) جب کوئی اپنے منہ کے ساتھ پانی اس کے محل سے پیے نہ وہ ہتھیلی کے ساتھ پیے اور نہ کسی برتن کے ساتھ اور اس میں دوسری لغت ہے۔ کَرَعَ یعنی را کے کسرہ کے ساتھ یکرع، کَرَعًا۔ اور الکرم سے مراد بارش کا پانی ہے جو منہ میں پڑتا ہے۔

اور رہی حدیث طیبہ تو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے کہ واصل بن عبد اللہ، ابن فضیل نے لیث عن سعید بن عامر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ ہم ایک تالاب کے پاس سے گزرے اور ہم اس میں منہ لگا کر پانی پینے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم منہ لگا کر نہ پیو بلکہ اپنے ہاتھوں کو دھو اور پھر ان سے پانی پیو کیونکہ ہاتھ سے بڑھ کر اچھا اور پاکیزہ برتن کوئی نہیں ہے (2) اور یہ نص ہے۔ لیث بن ابی سلیم مسلم نے اس کی روایت نقل کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ۔ الاغتراف کا معنی ہے: کسی شے سے ہاتھ اور کسی آلہ سے لینا۔ اور اسی سے الْغُرْفَةُ (چمچ) ہے۔ اور الْغُرْفُ، الاغتراف کا ہم معنی ہے۔ اور غُرْفَةُ بِيَدِهِ کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ مصدر ہے اور اغترافاً نہیں کہا، کیونکہ الْغُرْفُ اور الاغتراف کا معنی ایک ہے۔ اور الْغُرْفَةُ کا معنی ہے ایک بار۔ اور اسے غُرْفَةُ بِيَدِهِ کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ شے ہے جس کا چلو بھرا جاتا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ الْغُرْفَةُ ایک ہاتھ کے ساتھ چلو بھرنا اور الْغُرْفَةُ دو ہاتھوں کے ساتھ چلو بھرنا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہتھیلیاں صاف ترین برتن ہیں۔ اسی معنی میں حسن کا قول ہے:

لا يَدْلفون الى ماء بآنية الا اغترافا من الغدران بالزاح
الدليف کا معنی ہے آہستہ چال۔

وہ برتن لے کر پانی کی طرف آہستہ چال نہیں چلتے مگر نہروں سے ہتھیلی کے ساتھ چلو بھرتے ہوئے (لیتے ہیں)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 323، دار الفکر

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاثر، جلد 1، صفحہ 253، وزارت تعلیم۔ ابن ماجہ، باب الشرب بالاکف والکرم، حدیث نمبر 3423، ضیاء القرآن پبلی کوشنز

پس اس قول کی بنا پر کہا کہ وہ مومنین جنہیں اس وقت دوبارہ اٹھائے جانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا ایقان حاصل تھا ان کی تعداد اہل بدر کے برابر تھی۔ **كَمْ مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ**۔ اکثر مفسرین نے اس پر کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہر کو عبور انہوں نے کیا جنہوں نے بالکل پانی نہ پیا اور بعض نے کہا: دشمن کی اتنی کثرت کے باوجود ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ تو ان میں سے جو صاحب عزم و ہمت تھے۔ انہوں نے کہا: **كَمْ مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ** (اللہ کے اذن سے بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم گفتگو کرتے رہتے تھے کہ اہل بدر کی تعداد ان اصحاب طالوت کی تعداد کی مثل تھی جنہوں نے اس کے ساتھ نہر کو عبور کیا وہ تین سو دس سے کچھ زائد آدمی تھے اور ایک روایت میں ہے: تین سو تیرہ آدمی اور اس کے ساتھ صرف مومنین نے اسے عبور کیا تھا (1)۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: **قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ** یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ بمعنی شک ہو یقین نہ ہو۔ یعنی ان لوگوں نے کہا جو وہم رکھتے تھے کہ انہیں طالوت کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا اور وہ شہداء بن کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے۔ پس قتل میں شک پڑ گیا۔

قولہ تعالیٰ: **كَمْ مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً**۔ الفئۃ کا معنی ہے لوگوں کی ایک جماعت اور ان کا ایک گروہ۔ یہ فائٹ رأسہ بالسيف اور فائٹہ سے ماخوذ ہے یعنی میں نے اس کا سر تلوار سے کاٹ دیا۔ اور ان (صحابہ کرام) رضی اللہ عنہم کے قول میں ہے: **كَمْ مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ** (آیہ)۔ یہ قتال پر انگشت دلانا ہے اور صبر کا شعور بیدار کرنا ہے اور ان کی اقتداء اور پیروی کرنا ہے جنہوں نے اپنے رب کی تصدیق کی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح کرنا ہم پر بھی واجب ہے لیکن اعمال قبیحہ اور نیات فاسدہ اس سے مانع ہیں۔ یہاں تک کہ ہم میں سے بڑی تعداد دشمن کی قلیل تعداد کے سامنے شکست خوردہ ہو جاتی ہے جیسا کہ ہم نے کئی بار اس کا مشاہدہ کیا ہے اور ایسا ہمارے اپنے اعمال کے سبب ہے۔

اور بخاری میں ہے: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ تم اپنے اعمال کے ساتھ جنگ لڑتے ہو۔ اور اس میں مسند روایت بھی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارے ضعفاء کے سبب تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری مدد کی جاتی ہے (2)۔“ پس اعمال فاسد ہو چکے ہیں، ضعفاء مہمل ہو گئے ہیں، صبر قلیل ہے، اعتماد ضعیف اور کمزور ہو چکا ہے اور تقویٰ زائل ہو گیا ہے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ** (ال عمران: 200) (صبر کرو اور ثابت قدم رہو) (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لئے) ہمیشہ ہی اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور مزید فرمایا: **وَعَنِ اللَّهِ**

1۔ فتح بخاری، باب عدد اصحاب بدر، حدیث نمبر 3663، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ فتح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 405، وزارت تعلیم

فَتَوَكَّلُوا (اور اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرو) اور مزید فرمایا: إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ﴿٤٠﴾ (النحل) (یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے) ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔) مزید فرمایا: وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ (الحج: 40) (اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا) مزید فرمایا: إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاغْلِبُوا وَادْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٤١﴾ (الانفال) (جب جنگ آزمایا ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو، اور ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کثرت سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ) پس یہی نصرت کے اسباب ہیں اور اس کی شرائط ہیں اور یہ ہمارے پاس معدوم ہیں، ہم میں موجود نہیں ہے۔ پس إِنَّ اللَّهَ وَ إِنَّا لِلَّهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ لَارْجِعُونَ اس پر جو مصیبت اور آفت ہم پر آئے اور ہم میں اترے بلکہ اسلام میں سے سوائے اس کے ذکر کے کوئی شے باقی نہیں رہی اور نہ ہی دین میں سے سوائے اس کی رسم کے کچھ باقی رہا ہے۔ یہ فساد کے ظہور، رعونت و سرکشی کی کثرت اور ہدایت و راہنمائی کی قلت کے سبب ہے۔ یہاں تک کہ دشمن شرق و غرب اور بحر و بر میں غالب آچکا ہے، فتنے عام ہو گئے ہیں، آزمائشیں بڑھ گئی ہیں اور کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی جو رحم فرمانے والا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا
وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٥١﴾

”اور جب سامنے آ گئے جالوت اور اس کی فوجوں کے، تو بارگاہ الہی میں عرض کرنے لگے: اے ہمارے رب!

اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر۔“

بَرَزُوا جب وہ براز میں آ گئے اور براز سے مراد وسیع زمین میں سے کشادہ اور کھلا میدان ہے۔ جالوت عملاق کا امیر تھا اور ان کا بادشاہ تھا اس کا سایہ ایک میل تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ (قوم) بربر اس کی نسل سے ہے اور اس کے بارے میں روایت ہے کہ اس کی فوج میں تین لاکھ گھڑ سوار تھے اور عکرمہ نے کہا ہے: نوے ہزار تھے اور جب مومنین نے اپنے دشمن کی کثرت کو دیکھا تو انہوں نے اپنے رب کی بارگاہ میں عجز و انکساری کی اور یہ رب العالمین کے اس قول کی طرح ہے: وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قُتِلَ مَعَهُ رَاطِبُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٠﴾ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا ۖ إِنَّا نُؤْتِبُهَا لَكَ (العمران) (اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے..... اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے: اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ)

اور رسول اللہ ﷺ کا دشمن سے آمنا سامنا ہوتا تو آپ جنگ میں اس طرح دعا کرتے تھے: اللَّهُمَّ بِنَا أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِمْ وَاجْعَلْهُمْ فِي أَعْيُنِ النَّاسِ كَالْحَبِّ السَّوْدِ (1) اے اللہ! میں تیری مدد و نصرت کے ساتھ ہی حملہ کرتا ہوں اور پلٹ کر آتا ہوں۔

اور آپ ﷺ جب دشمن کے سامنے ہوتے تو اس طرح کہتے: اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِمْ وَاجْعَلْهُمْ فِي أَعْيُنِ النَّاسِ كَالْحَبِّ السَّوْدِ (2) اے اللہ! میں ان کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور تجھے ہی ان کے مقابلے میں دیکھتا ہوں۔“ اور آپ ﷺ نے بدر کے دن دعا مانگی حتیٰ کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی اور آپ اللہ تعالیٰ سے اپنا وعدہ پورا کرنے کی

التجا کرتے رہے۔ اس کا بیان سورہ آل عمران میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاتَّهَى اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ
مِمَّا يَشَاءُ ۚ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ
ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٥١﴾

”پس انہوں نے شکست دی جالوت کے لشکر کو اللہ کے اذن سے۔ اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور عطا فرمائی
داؤد کو اللہ نے حکومت اور دانائی اور سکھا دیا اس کو جو چاہا اور اگر نہ بچاؤ کرتا اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے
ذریعے تو برباد ہو جاتی زمین لیکن اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمانے والا ہے سارے جہانوں پر۔“

قولہ تعالیٰ: فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر مدد و نصرت نازل فرمائی۔ فَهَزَمُوهُمْ تو انہوں نے انہیں شکست
دی (ان کی کمر توڑ دی) اور الہزم کا معنی ہے توڑنا۔ اور اسی سے ہے سقاء مُتَهَزِمٌ یعنی ایسی مشک جو خشکی کے سبب ٹوٹ
جائے اور اسی سے وہ قول ہے جو زمزم کے بارے میں کہا گیا ہے یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا گڑھا ہے (ہُزْمَةُ جَبْرِيل)
یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے زمین کو اپنے پاؤں سے نیچے دبایا، گڑھا بن گیا اور پانی نکل آیا۔ اور الہزم سے مراد وہ
خشک لکڑی بھی ہے جو ٹوٹ جاتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ اس لئے کہ طالوت بادشاہ تھا اور جالوت کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے یہ اپنی قوم میں
سے چنا گیا تھا۔ یہ قد و قامت کے اعتبار سے چھوٹا، زیادہ تر بیمار رہنے والا، زرد رنگ کا تھا اس کی (آنکھیں چھوٹی اور نیلی
تھیں۔) اور جالوت لوگوں میں سے انتہائی مضبوط اور بہت زیادہ قوی تھا۔ اور یہ اکیلا لشکروں کو شکست دے سکتا تھا اور
جالوت کو قتل کر دیا گیا، حالانکہ وہ عمالقہ کا امیر اور سردار تھا اور (قتل کرنے والے) داؤد ابن ایشی تھے۔ یہ ایشی ہمزہ کے کسرہ
کے ساتھ ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وہ داؤد بن زکریا بن رشوی تھے، یہ یہوذا بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی اولاد
میں سے تھے اور بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ ان کو نبوت اور بادشاہت دونوں چیزیں اکٹھی عطا فرمادی گئیں۔ اس
سے پہلے یہ چرواہے تھے اور یہ اپنے بھائیوں میں سے چھوٹے تھے اور ریوڑ چراتے تھے اور ان کے سات بھائی اصحاب
طالوت میں سے تھے۔ پس جب جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے دل میں کہا: میں ضرور بہ ضرور اس جنگ کو دیکھنے کے
لئے جاؤں گا، جب اس راستے پر چلے ایک پتھر کے پاس سے گزرے تو اس نے آپ کو آواز دی اے داؤد! مجھے اٹھالے، اور
میرے ساتھ تو جالوت کو قتل کرے گا، پھر ایک دوسرے پتھر نے انہیں آواز دی، پھر ایک اور نے آواز دی، پس آپ نے
انہیں اٹھالیا اور انہیں اپنے توبرے میں رکھ لیا اور چل پڑے۔ پس جالوت (لشکر کی صفوں سے) باہر نکلا اور دعوت مبارزت
دینے لگا تو لوگوں نے اس کے مقابلے کی جرأت نہ کی اور کمزوری دکھائی یہاں تک کہ طالوت نے کہا: جو اس کا مقابلہ کرے گا
اور اسے قتل کر دے گا میں اس کا نکاح اپنی بیٹی سے کروں گا اور اپنے مال میں اسے حکم بناؤں گا، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام

آئے اور کہا: میں اس کے ساتھ مقابلہ کروں گا اور اسے قتل کر دوں گا (1)، لیکن طالوت نے جب ان کی صف بندی اور چھوٹے قد کو دیکھا تو انہیں کمزور قرار دے کر واپس لوٹا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نیلگوں چھوٹے قد کے تھے۔ پھر طالوت نے دوبارہ اور بارہ اعلان کیا اور پھر بھی حضرت داؤد علیہ السلام ہی باہر نکلے۔ تب طالوت نے ان سے کہا: کیا تو اپنی ذات میں کسی شے سے تجربہ رکھتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں: اس نے پوچھا: وہ کیسے؟ انہوں نے فرمایا: ایک دفعہ ایک بھیڑیا میرے ریوڑ میں داخل ہو گیا تو میں نے اسے مارا، پھر اس کے سر کو پکڑ لیا اور میں نے اسے اس کے جسم سے الگ کر دیا۔ طالوت نے کہا: بھیڑیا تو کمزور ہے، کیا اس کے علاوہ بھی تو کوئی تجربہ رکھتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ایک دفعہ ایک شیر میرے ریوڑ میں آ گیا تو میں نے اسے مارا، پھر میں نے اسے جڑوں سے پکڑ لیا اور میں نے ان دونوں کو چیر ڈالا۔ کیا تو اسے شیر سے بھی زیادہ طاقتور جانتا ہے؟ طالوت نے کہا: نہیں۔ طالوت کے پاس ایک زرہ تھی اور وہ اسی پر پوری آسکتی تھی جو جالوت کو قتل کرے گا۔ پس اس نے اس کے بارے آپ کو آگاہ کیا اور وہ زرہ آپ پر ڈال دی تو وہ بالکل برابر ہو گئی۔ پھر طالوت نے کہا: تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میرا ہتھیار پکڑ لے (اور اس کے مقابلے میں جا)۔ چنانچہ آپ نے ایسا کر لیا، لیکن جب تھوڑا سا چلے تو واپس لوٹ آئے اور لوگوں نے کہا: یہ نوجوان تو بزدل ہو گیا ہے۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے میرے سبب قتل نہ کیا اور اس کے خلاف اس نے میری مدد نہ فرمائی تو پھر یہ گھوڑا اور یہ ہتھیار میرے لئے نفع بخش نہیں ہیں۔ البتہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں اس سے اپنی عادت کے مطابق ہی لڑوں۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام مقلع (پتھر پھینکنے کا گوبھیا، فلاخن) کے ساتھ پتھر پھینکنے کے لوگوں کی نسبت زیادہ ماہر تھے۔ پس آپ (گھوڑے سے) اترے اور اپنے توبرے کو اٹھایا اور اسے لٹکا لیا اور اپنا گوبھیا اٹھایا اور جالوت کی طرف چل نکلے۔ وہ مکمل اپنے ہتھیار پہنے ہوئے تھا، اس کے سر پر خود تھا اس میں تین سوار تھے، جیسا کہ الماوردی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ تو جالوت نے انہیں کہا: اے نوجوان! تو میری طرف نکلا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: اس طرح جیسا کہ تو کہتے کی طرف نکلا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں، بلکہ تو اس سے بھی آسان ہے۔ فرمایا: میں یقیناً آج تیرا گوشت پرندوں اور درندوں کو کھلاؤں گا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حقیر جانتے ہوئے انہیں اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کی، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھایا۔ اور روایت ہے کہ وہ پتھر جڑ چکے تھے اور وہ ایک پتھر بن گیا تھا۔ سو آپ نے اسے پکڑا اور اپنے گوبھیا میں رکھا اور اللہ تعالیٰ کا نام لیا اور اسے گھمایا اور پھینک دیا، پس وہ جالوت کے سر میں جا لگا اور اسے قتل کر دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر اپنے توبرے میں رکھ لیا اور لوگوں میں مل گئے۔ اور طالوت کی فوج نے حملہ کر دیا اور یہی ہزیمت اور شکست تھی (2)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پتھر خود سے ناک کی جگہ پر جا لگا۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے آنکھ پر جا کر لگا اور اس کی گدی کی جانب سے نکل گیا اور اس کے لشکر کی ایک جماعت کو جا کر لگا اور اس نے انہیں قتل کر دیا۔ یہ قول بھی ہے کہ پتھر ٹوٹ کر بکھر گیا یہاں تک کہ لشکر کے ہر فرد کو اس کا کچھ حصہ جا کر لگا اور یہ

(سنگریزوں کی) اس مشیت کی طرح تھا جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے دن بنی ہوازن پر پھینکی۔ واللہ اعلم ان آیات کے قصص میں لوگوں نے بہت زیادہ بیان کیا ہے اور میں نے تیرے لئے ان میں سے خاص مقصود کو ہی ذکر کیا ہے واللہ الحمد۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: طالوت کے اس قول کے بارے میں ہے ”جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کرے گا تو میں اس کی شادی اپنی بیٹی سے کروں گا اور اسے اپنے مال میں حکم بناؤں گا“ یہ مفہوم ہماری شریعت میں بھی ثابت اور موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ امام وقت کہے: جو فلاں کا سر لائے گا تو اس کے لئے اتنا ہوگا، یا جو فلاں کو قیدی بنا کر لائے گا تو اس کے لئے اتنا انعام ہو گا۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ مبارزت امام کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ امام احمد اور اسحاق وغیرہما اس کے بارے میں کہتے ہیں اور اس میں امام اوزاعی سے اختلاف منقول ہے، سوان سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی بھی اپنے امام کی اجازت کے بغیر حملہ نہیں کر سکتا اور یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر امام مبارزت سے روک دے تو پھر اس کی اجازت کے بغیر کوئی مبارزت طلب نہ کرے گا۔

اور ایک گروہ نے مقابلے کو مباح قرار دیا ہے اور انہوں نے امام کی اجازت ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

امام مالک سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو دو صفوں کے درمیان کہتا ہے: کون مقابلہ کرے گا؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کا انحصار اس کی نیت پر ہے اگر اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ رکھتا ہے تو میں امید رکھتا ہوں کہ اس کے لئے کوئی حرج نہ ہوگا۔ زمانہ ماضی میں ایسا کیا جاتا رہا ہے اور امام شافعی نے کہا ہے: مبارزت طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام کی اجازت کے ساتھ مبارزت طلب کرنا اچھا ہے اور اس پر بھی کوئی حرج نہیں ہے جس نے امام کی اجازت کے بغیر مبارزت طلب کیا یہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ اس کے بارے میں کوئی مانع خبر نہیں جانتا۔

وَأَشْهَدُ أَنَّ اللَّهَ الْمَلِكُ وَالْحَكَمَةُ، سدی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو طالوت کا ملک (بادشاہی) اور شمعون کی نبوت عطا فرمائی۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں علم عطا فرمایا وہ زہر ہیں بنانے اور پرندوں کی گفتگو سمجھنے اور دیگر ان علوم کی انواع میں سے کئی عطا فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک زنجیر عطا فرمایا جو کہکشاں اور فلک سے ملا ہوا تھا اور اس کا ایک سر حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ کے پاس تھا اور ہوا میں جو واقعہ بھی پیش آتا زنجیر بجنے لگتا اور اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس واقعہ کا علم ہو جاتا جو وقوع پذیر ہوتا اور کوئی آفت زدہ اسے چھو لیتا تو وہ اس سے نجات پا جاتا اور یہ آپ کی قوم کے دین میں داخل ہونے کی علامت تھی کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں کے ساتھ مس کرتے پھر اپنی ہتھیلیوں کو اپنے سینوں پر مل لیتے اور وہ حضرت داؤد علیہ السلام

کے بعد اس کے پاس فیصلے کرتے تھے یہاں تک کہ اسے اٹھالیا گیا۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا يَشَاءُ يَفْعَلْ بِمَعْنَى مَبَاشَاءٍ ہے اور کبھی ماضی کی جگہ مستقبل کا صیغہ رکھ دیا جاتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٥٠﴾ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ اسی طرح تمام کی قراءت ہے سوائے حضرت نافع کے کیونکہ انہوں نے دَفَاعٌ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل کا مصدر ہو جیسا کہا جاتا ہے: حَسِبْتُ الشَّيْءَ حِسَابًا. آجِثًا، لَقِيتُهُ لِقَاءً، اور اسی کی مثل کتبہ کتابا ہے اور اسی سے كِتَابُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ (النساء) بھی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا ہے۔ پس دَفَاعٌ اور دَفَعٌ دونوں دَفَعٌ کے مصدر ہوں گے۔ یہی سیبویہ کا مذہب ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: دَفَاعٌ اور دَفَعٌ دونوں کا معنی ایک ہے، جیسا طرقت النعل اور طارقت ہے یعنی میں نے جوتے کو ایک دوسرے پر سیا۔ الخصف کا معنی الخرز، سینا ہے۔

ابو نعیدہ نے جمہور کی قراءت کو اختیار کیا ہے (یعنی) وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ اور انہوں نے دَفَاعٌ پڑھنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی غالب نہیں آ سکتا۔ مکی نے کہا ہے: یہ وہم ہے باب مفاعله نے اس میں وہم پیدا کیا ہے اور ایسا نہیں ہے۔ اور لفظ اللہ فعل کے سبب محل رفع میں ہے یعنی لَوْلَا أَنْ يَدْفَعَهُ اللَّهُ۔ اور دَفَاعٌ سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ النَّاسُ مفعول ہے اور بَعْضُهُمْ، النَّاسُ سے بدل ہے اور بَعْضٌ سیبویہ کے نزدیک مفعول ثانی کے محل میں ہے اور یہ ان کے نزدیک تیرے اس قول کی مثل ہے: ذهبت بزيد، تو اس میں زيد مفعول کے محل میں ہے۔ اسے جان لو۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا ان لوگوں کے بارے میں اختلاف ہے جنہیں فساد سے بچایا گیا ہے وہ کون ہیں؟

تو کہا گیا ہے: وہ ابدال ہیں اور وہ چالیس آدمی ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا بدل بنا دیتا ہے۔ اور جب قیامت قریب ہوگی تو وہ تمام فوت ہو جائیں گے ان میں سے پچیس شام میں ہیں اور اٹھارہ عراق میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الابدال يكونون بالشام وهم اربعون رجلا كلما مات منهم رجل ابدل الله مكانه رجلا يستقي بهم الغيث وينصر بهم على الأعداء ويصرف بهم عن اهل الأرض البلاء (1) (بلاشبہ ابدال شام میں ہوں گے اور وہ چالیس آدمی ہیں جب بھی ان میں سے کوئی آدمی فوت ہوا اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اور آدمی مقرر فرما دے گا، ان کے سبب اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے، ان کے سبب دشمنوں کے خلاف مدد فرماتا ہے اور ان کے سبب اہل زمین سے بلائیں اور مصیبتیں دور فرماتا ہے۔) حکیم ترمذی نے اسے نوادر الاصول میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے: انہوں نے کہا: بلاشبہ انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات زمین کے اوتار ہیں اور جب نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت ﷺ کی

امت سے ایک جماعت کو ان کا بدل بنا دیا۔ انہیں ابدال کہا جاتا ہے: اور کثرت صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے ان لوگوں کو فضیلت نہیں دی گئی، بلکہ حسن خلق، صدق و ورع، حسن نیت، تمام مسلمانوں کے لئے دلوں کا صاف اور سلامت ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے انہیں صبر، حلم، دانشمندی اور بغیر کسی ذلت کے تواضع و انکساری اختیار کرنے کی نصیحت کرنے کے سبب انہیں فضیلت دی گئی۔ اور وہ انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں، وہ ایسی قوم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے چن لیا ہے اور انہیں اپنی ذات کے بارے میں اپنے علم کے ساتھ خالص اور مختص کر لیا ہے اور وہ چالیس صدیق ہیں، ان میں سے تیس آدمی حضرت ابراہیم خلیل الرحمن کے یقین کی مثل پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سب اہل زمین سے مصائب اور لوگوں سے آفات اور آزمائشوں کو دور فرماتا ہے اور ان کے سب اہل زمین پر بارش برسائی جاتی ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ان میں سے کوئی آدمی فوت نہیں ہوتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایسا آدمی پیدا فرمادے جو اس کا خلیفہ اور نائب ہوگا (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی فوجوں کے سبب دشمنوں کو دور نہ کرتا تو مشرکین غالب آ جاتے اور وہ مومنین کو قتل کرتے اور شہروں اور مساجد کو برباد کر دیتے۔

اور حضرت سفیان ثوری نے کہا ہے: مراد وہ گواہی اور شہادت دینے والے لوگ ہیں جن کے سبب حقوق حاصل کیے جاتے ہیں اور مکی نے بیان کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے یہ معنی بیان کیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے والوں کے سبب انہیں نہ بچائے جو نماز نہیں پڑھتے اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے سبب ان کی حفاظت نہ کرے جو تقویٰ اختیار نہیں کرتے تو وہ لوگوں کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دے (2)۔

اسی طرح نحاس اور ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا ہے اور تمام مفسرین نے کہا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نیکوکار مومنین کو فجار اور کفار سے نہ بچائے تو زمین برباد اور فاسد ہو جائے۔ اور ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کے نماز پڑھنے والوں کے سبب نماز نہ پڑھنے والوں سے اور تزکیہ اختیار کرنے والوں کے سبب تزکیہ اختیار نہ کرنے والوں سے اور روزے رکھنے والوں کے سبب روزے نہ رکھنے والوں سے اور حج کرنے والوں کے سبب حج نہ کرنے والوں سے اور جہاد کرنے والوں کے سبب جہاد نہ کرنے والوں سے عذاب دور فرماتا رہے گا اور اگر وہ ان اعمال کے ترک کرنے پر جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ انہیں آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہ دے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: ان اللہ ملائکہ تنادی کل یوم لولا عباد رُکعہ و اطفال رُضعہ و بهائم رُتعم لصب علیکم العذاب صبا (بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو ہر روز ندا دیتے ہیں: اگر عبادت گزار بندے نہ ہوتے، شیرخوار بچے نہ ہوتے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو تم پر عذاب موسلا دھا برسا دیا جاتا) (3)۔ اسے

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

1۔ نوادر الاصول، بی بیان عدد الابدال، جلد 1، صفحہ 69، دار صادر بیروت

3۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 155، حدیث نمبر 9820، دار الکتب العلمیہ

ابوبکر الخطیب نے اسی معنی میں حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔
منصور نے ابراہیم عن علقمہ عن عبد اللہ بن شہزاد کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تم میں خشوع کرنے والے آدمی، چرنے والے جانور اور شیر خوار بچے نہ ہوں تو مومنین پر موسلا دھار عذاب برسا دیا جائے (1)۔
بعض نے یہ معنی لیا اور کہا:

لَوْ لَا عِبَادٌ لِلَّهِ ذُكُّمُ وَ صِبْيَةٌ مِنَ الْيَتَامَى رُضِعُوا
اگر اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے نہ ہوں اور شیر خوار یتیم بچے نہ ہوں۔

و مُهْمَلَاتٌ فِي الْفَلَاةِ رُتِعُوا صُبَّ عَلَيْكُمُ الْعَذَابُ الْأَوْجَعُ
اور جنگل میں چھوڑے گئے چرنے والے جانور نہ ہوں تو تم پر دردناک عذاب موسلا دھار برسا دیا جائے۔

اور حضرت جابر بن عبد اللہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ آدمی کے اپنے بیٹے اور پوتے کی اصلاح کرنے کے سبب اس کی اصلاح فرما دیتا ہے اس کے گھر والوں کی اور اس کے ارد گرد کے گھروں کی (اصلاح فرما دیتا ہے) اور وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتے ہیں جب تک وہ ان میں ہو۔“ (2)

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کے سبب آزماتا ہے اور کافر کو مومن کے سبب عافیت عطا کرتا ہے۔
اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لِيَدْفَعُ بِالْمُؤْمِنِ الصَّالِحِ عَنْ مَائَةِ مَنْ اَهْلُ بَيْتِهِ وَ جِوْدَانِهِ الْبَلَاءَ بے شک اللہ تعالیٰ نیک صالح مومن کے سبب اس کے گھر والوں اور پڑوسیوں میں سے سو افراد سے مصیبت اور آفت کو دور فرماتا ہے (3)۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اور کہا گیا ہے: یہ دفاع اور بچاؤ اس شریعت کے سبب ہے جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی زبانوں پر شریعتوں میں سے جاری ہوئیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے سے زبردستی اشیاء چھینتے اور ایک دوسرے کا سامان لوٹتے اور ہلاک ہو جاتے۔
یہ حسین قول ہے کیونکہ روکنے اور دفاع وغیرہ میں عموم ہے۔ پس اس میں غور کر لو۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلٰی الْعٰلَمِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا مومنین سے کفار کے شر کو دور کرنا یہ اس کا فضل اور خاص النعمان ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۱﴾

”یہ آیتیں ہیں اللہ کی ہم پڑھتے ہیں انہیں آپ پر (اے حبیب!) ٹھیک ٹھیک اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔“

تِلْكَ مُبْتَدَا ہے۔ اور اٰیۃ اللہ اس کی خبر ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور خبر نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ بنا لے۔ وَاِنَّكَ

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 755

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صلاة الاستسقاء، جلد 3، صفحہ 345، دار الفکر

3۔ تفسیر معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 355، دار الفکر بیروت

لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ یہ ان کی خبر ہے یعنی وانک لمرسل۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو آگاہ فرمایا ہے کہ یہ آیات وہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور انہیں نبی مرسل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ
دَرَجَاتٍ ۚ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ
مَّنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا ۚ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۝

”یہ سب رسول، ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آ گئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا ان میں سے کوئی ایمان پر (ثابت) رہا اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ الرُّسُلُ یہاں تِلْكَ فرمایا ہے۔ ذلک نہیں فرمایا تو یہ لفظ جمع کی تانیث کی رعایت کرتے ہوئے کہا ہے۔ اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور الرُّسُلُ اس کی صفت ہے اور مبتدا کی خبر مابعد جملہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرسل عطف بیان ہے اور فَضَّلْنَا خبر ہے۔ یہ مشکل آیت ہے اور احادیث ثابت ہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لا تختاروا ما بین الانبیاء (1) (تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دو) اور مزید فرمایا: لا تفضلوا بین انبیاء اللہ (2) (تم اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے درمیان کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو) انہیں ائمہ ثقات نے روایت کیا ہے۔ یعنی تم یہ نہ کہو، فلاں فلاں سے بہتر ہے اور نہ یہ کہو: فلاں فلاں سے افضل ہے۔ کہا جاتا ہے: خیر فلاں بین فلاں وفلان (فلاں نے فلاں فلاں کے درمیان ایک کو بہتر قرار دیا) اور فضیلت دی جب اس نے یہ کہا تو اس میں (فضل) مشدود ہوگا۔

اس معنی کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس ایک قوم نے کہا ہے: یہ حکم آپ ﷺ کی طرف تفضیل کے بارے وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور آپ کے یہ جاننے سے پہلے کا ہے کہ آپ ﷺ اولاد آدم کے سردار ہیں۔ اور بلاشبہ قرآن کریم فضیلت دینے سے روکنے والے حکم کے لئے ناسخ ہے۔

اور ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: آپ ﷺ کے ارشاد انا سید ولد آدم (3) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں) سے مراد قیامت کا دن ہے (یعنی قیامت کے دن آپ اولاد آدم کے سردار ہوں گے) کیونکہ اس دن آپ ﷺ شفاعت فرمائیں

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب بدء الخلق و ذکر الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507، 2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 329، 1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورہ ہنئ اسرائیل، حدیث 4343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور لواء الحمد اور حوض کوثر آپ ہی کے لئے ہوگا۔

اور آپ ﷺ نے تواضع اور انکساری کے طور پر یہ ارشاد فرمایا: لا تختبرونی علی موسیٰ (1) (تم مجھے موسیٰ علیہ السلام سے بہتر اور برتر قرار نہ دو) جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول میں تواضع مراد ہے: ولیتکم ولست بخیرکم (مجھے تمہارا والی بنایا گیا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں) اور اسی طرح آپ ﷺ کے اس ارشاد کا معنی ہے لا یقل احد انا خیر من یونس بن متى (2) (کوئی یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونس بن متى علیہ السلام سے بہتر ہوں) یعنی یہ تواضع اور انکساری کی بنا پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (قلم: 48) (اور تم مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ) اس پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے افضل ہیں۔ کیونکہ رب العالمین فرما رہا ہے: وَلَا تَكُنْ مِثْلَهُ (اور تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ) اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ کا ارشاد لا تفضلونی علیہ (3) (تم مجھے ان پر فضیلت نہ دو) یہ بطریق تواضع ہے۔ اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ تم مجھے ان پر عمل میں فضیلت نہ دو، شاید وہ عملاً مجھ سے افضل ہوں اور نہ ہی آزمائش اور امتحان میں مجھے فضیلت دو کیونکہ وہ آزمائش کے اعتبار سے مجھ سے اعظم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کو قیامت کے دن تمام انبیاء علیہم السلام پر سرداری اور فضیلت عطا فرمائی ہے وہ آپ کے عمل کے سبب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے آپ کو فضیلت دینے کے سبب ہے اور اپنے لئے آپ کو خاص کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس تاویل کو مہلب نے اختیار کیا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس میں گہری غور و خوض سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ گہری غور و خوض اس میں جھگڑے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور وہ یہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہ کچھ کہے جو اسے نہیں کہنا چاہیے اور مقابلے کے وقت ان کا احترام کم ہو جاتا ہے۔

ہمارے شیخ نے کہا ہے: پس یہ نہیں کہا جائے گا: نبی مکرم ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں اور نہ یہ کہا جائے گا: وہ فلاں سے افضل ہیں اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ وہ بہتر ہیں۔ جیسا کہ نبی کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس سے مفضل میں نقص اور عیب کا وہم ہو جاتا ہے، کیونکہ نبی لفظ کے اطلاق سے روکنے کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ اس معنی کا اعتقاد رکھنے سے روکنے کا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کر دیا ہے کہ رسل علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت دی گئی ہے۔ پس آپ یہ نہیں کہیں گے: ہمارے نبی ﷺ انبیاء علیہم السلام سے بہتر ہیں اور نہ یہ کہ آپ فلاں نبی علیہ السلام سے بہتر ہیں، اس سے اجتناب کرتے ہوئے جس سے منع کر دیا گیا ہے اور اس کی اقتدا کرتے ہوئے اور اس اعتقاد کے مطابق عمل کرتے ہوئے جس تفصیل کو قرآن متضمن ہے اور حقائق امور کو اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے احسن قول اس کا ہے جس نے یہ کہا ہے: بلاشبہ فضیلت دینے سے روکنا خالصہ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507

2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 481، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الخصومات، حدیث نمبر 2235، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507

اس نبوت کی جہت سے ہے جو ایک خصلت ہے جس میں کسی کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں، بلکہ یہ فضیلت احوال و خصوصیات، کرامات و الطاف میں زیادتی اور متفرق معجزات کی بنا پر ہے اور رہی نبوت فی ذاتہا تو اس میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں، بلکہ یہ تقاضی دوسرے امور کے سبب ثابت ہوتا ہے جو اس پر مستزاد ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض رسل اولوالعزم ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا ہے اور وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکامی عطا فرمایا اور ان میں سے بعض کے درجات بلند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا** (بنی اسرائیل) (اور تحقیق ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔) اور مزید

فرمایا: **تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ** (یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔) میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اچھا قول ہے، کیونکہ اس نے بغیر نسخ کے آیات اور احادیث کے درمیان تطبیق کر دی ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا قول ان فضائل کی بنا پر ہے جو انہیں عطا فرمائے گئے اور ان وسائل کی وجہ سے ہے جو انہیں دیے گئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام پر اور اہل آسمان پر فضیلت دی ہے تو صحابہ نے پوچھا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما کیونکر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان والوں پر فضیلت دی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَهٌُ مِّنْ دُونِهِ فَذَلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ** (الانبیاء) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی۔) یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرمایا ہے: **إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ** (الفتح) (یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تاکہ دور فرمادے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے۔) پھر انہوں نے کہا: انبیاء علیہم السلام پر آپ کی فضیلت کیسی ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ** (ابراہیم: 4) (اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لئے) (احکام الہی کو) اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ارشاد فرمایا: **وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ** (سبا: 28) (اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف) پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن و انس کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ اے ابو محمد الداری نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: خیر بنی آدم نوح و ابراہیم و موسیٰ و محمد صلی اللہ علیہ وسلم (1) کہ بنی آدم میں سے افضل اور بہتر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہی رسولوں میں سے اولوالعزم ہیں۔ پس یہ تعین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے نص ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جنہیں رسالت عطا فرمائی گئی ہے وہ ان سے افضل ہیں جنہیں رسالت نہیں دی گئی

تو بلاشبہ جنہیں رسالت دی گئی ہے انہیں رسالت کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت دی گئی ہے اور وہ نبوت میں برابر ہیں، یہاں تک کہ رسولوں کو بھی اپنی امتوں کی جانب سے تکذیب اور انہیں قتل کرنے جیسی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچتی رہی ہیں اور یہ ایسی شے ہے جس میں کوئی خفا نہیں ہے مگر ابن عطیہ ابو محمد عبدالحق نے کہا ہے: بلاشبہ قرآن کریم تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ فی الجملہ ہے اس میں کسی ایک مفضول کی تعیین نہیں ہے اور اسی طرح احادیث بھی ہیں اور اسی لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انا اکرم ولد آدم علی ربی (1) (میں اپنے رب کے نزدیک (تمام) اولاد آدم سے زیادہ معزز ہوں) اور فرمایا: ”میں اولاد آدم کا سردار ہوں (2)“ اور آپ نے تعیین نہیں فرمائی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ”کسی کے لئے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں (3)۔“ اور فرمایا: ”تم مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو (4)۔“ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں مفضول کی تعیین سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام نو جوان تھے اور آپ اعبائے نبوت کے نیچے دب گئے، تو جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ حکم توقیفی ہے تو دوسروں کے لئے تو بدرجہ اولیٰ ہوگا (5)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے وہی اولیٰ ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ خبر دی ہے کہ اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو وہ بعض فضیلت والے انبیاء کو بیان بھی کرتا ہے اور ان احوال کا ذکر بھی کرتا ہے جن کے سبب انہیں فضیلت دی ہے۔ پس اس نے فرمایا ہے: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجَتٍ وَّاٰتَيْنَا عِيسٰى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَ (البقرہ: ۲۵۳) (ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں۔)

اور مزید فرمایا: وَاٰتَيْنَا دَاوُدَ ذَبُوْنَا ۖ (بنی اسرائیل) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی اور مزید فرمایا: وَاٰتَيْنَا هٗمُ الْاِنْجِيْلَ (اور ہم نے اسے انجیل عطا فرمائی) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسٰى وَ هٰرُونَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (الانبیاء) (اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پر ہیزگاروں کے لئے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوُدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا (النمل: ۱۵) (اور تحقیق ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا فرمایا) اور مزید فرمایا: وَاِذَا خَذْنَا مِنَ النَّبِيِّنَ مِيثَاقَهُمْ وَ مِّنْكَ وَ مِّنْ نُوحٍ (احزاب: ۷) (اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی نوح سے بھی) پس یہ عام بیان کیا پھر خاص بیان کیا اور آغاز حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح گفتگو صحابہ کام کے بارے میں بھی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ شرف صحبت میں تمام

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، فضل سید المرسلین، جلد 1، صفحہ 514۔ ایضاً، ترمذی، ہاب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 329، وزارت تعلیم

3۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم

4۔ ایضاً

5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

مشترک ہیں، پھر ان فضائل میں وہ متفرق اور جدا جدا ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں مواہب و رسائل میں سے عطا فرمائے ہیں۔ پس وہ ان کے سبب ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اس کے باوجود ان تمام کو صحابیت، عدالت اور ان کی تعریف وغیرہ سب شامل ہیں۔ اور تجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح: 29) ((جان عالم) محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادتمند) جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر بڑا قہر (ہیں) اور مزید فرمایا: وَالزَّمَهُمْ كَلِمَةً التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلُهَا (الفتح: 26) ((اور انہیں استقامت بخش دی تقویٰ کے کلمہ پر اور وہ اس کے حق دار بھی تھے اور اس کے اہل بھی تھے۔) پھر فرمایا: لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَلْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قُتِلَ (الحديد: 10) ((تم میں سے کوئی برابر نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے (راہ خدا میں) مال خرچ کیا اور جنگ کی) اور مزید فرمایا: لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح: 18) ((یقیناً راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ کی اس درخت کے نیچے۔) پس یہ بھی عام اور خاص بیان ہے۔ اور ان سے عیب اور نقص کی نفی کی ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین و نفعنا بحبہم آمین۔

قولہ تعالیٰ: مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ جس سے کلام کی گئی ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے عرض کی گئی: کیا وہ نبی مرسل تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں وہ نبی مکلم تھے“ (یعنی جن سے کلام کی گئی۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: بعض لوگوں نے تاویل یہ کی ہے کہ آدم علیہ السلام کو شرف بمکلامی جنت میں عطا ہوا، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت باقی رہے گی (1)۔ عبادت سے اسم کے طویل ہونے کے سبب ہاضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اصل عبارت ہے: مَنْ كَلَّمَهُ اللَّهُ۔

قولہ تعالیٰ: وَرَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجَاتٍ نَحَاس نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق یہاں بَعْضُهُمْ سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میں سرخ و سیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میرے لئے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاکیزہ بنادی گئی اور ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی اور میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں (2) اور مجھے شفاعت عطا کی گئی۔“ اور اسی سے قرآن کریم، چاند کاشق ہونا، درخت کا آپ سے کلام کرنا، چند کھجوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑی مخلوق کو کھلانا اور ام معبد کی بکری کے خشک ہونے کے بعد اسے دو ہنا وغیرہ تمام معجزات آپ کے متعلق ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور زائد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے اعتبار سے تمام لوگوں سے عظیم تر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ انبیاء علیہم السلام کو ختم کیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ خلق عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ اور لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سوا وہ ہوں جن کی آیات و معجزات بڑے بڑے ہیں۔ اور کلام کا ذکر تاکید ہو سکتا ہے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند مکان

(آسمان) کی طرف اٹھانے اور مراد آسمان میں انبیاء علیہم السلام کے مراتب ہوں جیسا کہ حدیث اسراء میں ہے۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات یہ ہیں: مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفا یاب کرنا اور مٹی سے پرندے بنانا وغیرہ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے۔ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُّسِ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام سے۔ (1)

قوله تعالى: وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَقْتَتَلْنَا الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان رسولوں کے بعد آئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے اور تشبیہ کو جمع سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ قول بھی ہے: من بعد جمیع الرسل یعنی تمام رسولوں کے بعد اور یہی لفظ کا ظاہر معنی ہے۔

اور کہا گیا ہے: بے شک یہ قتال اور جھگڑا ان لوگوں کی طرف سے واقع ہوا جو ان کے بعد آئے اور معنی اس طرح نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ لوگ ہر نبی کے بعد نہ لڑتے جھگڑتے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: اشتريت خيلا ثم بعته (میں نے گھوڑا خریدا پھر اسے بیچ دیا۔) پس اس عبارت میں تیرے لئے جائز ہے کہ تو ایک گھوڑا خریدے اور اسے بیچ دے پھر دوسرا خرید لے اور اسے بیچ دے پھر تیسرا خریدے اور اسے بیچ دے اور اسی طرح یہ نوازل (سخت مصیبتیں) بھی ہیں کہ لوگوں کا ہر نبی علیہ السلام کے بعد اختلاف ہوا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو ایمان لائے اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیوی ساز و سامان کی طلب اور حسد میں کفر اختیار کیا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور قضا و قدر کے ساتھ ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ اس کا خلاف اور برعکس چاہتا تو وہی ہوتا لیکن وہ اس فعل کو سر حکمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔ اور وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فِي نُونٍ كَوْدٍ وَسَاكِنٍ ملنے کی وجہ سے کسرہ دیا گیا ہے اور قرآن کے سوا اور کلام میں اس کا حذف بھی جائز ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

فَلَسْتُ بِأَتِيهِ وَلَا اسْتَطِيعُهُ وَلَاكِ اسْقِنِي أَنْ كَانَ مَأْوَكَ ذَا فَضْلٍ

پس میں اس کی طرف آنے والا نہیں ہوں (جس کی طرف تو نے مجھے دعوت دی ہے) اور نہ میں اس کی استطاعت رکھتا ہوں، لیکن تو مجھے پانی سے سیراب کر اگر تیرے پاس فالتو پانی ہے۔

فِيْنَهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ۔ اس میں مَن مبتدا ہونے اور صفت کے سبب محل رفع میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٣٩﴾

”اے ایمان والو! خرچ کر لو اس (مال) سے جو ہم نے دیا ہے تم کو اس سے پہلے کہ آجائے وہ دن جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ (کفار کے لئے) دوستی ہوگی اور نہ (ان کے لئے) شفاعت۔ اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں۔“

1۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 339، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، حدیث نمبر 323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حسن نے کہا ہے: یہ فرض زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور ابن جریج اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ آیت فرض زکوٰۃ اور نفلی صدقات وغیرہ کو جامع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صحیح ہے لیکن سابقہ آیات قتال کے ذکر میں ہیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ مومنین کے ساتھ اس کو روکتا ہے جو کافروں کے سینوں میں ہے اور اس سے یہ موقف ترجیح پاتا ہے کہ اس سے مراد نذبا اور مستحبا اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا ہے۔ اور آیت کے آخر میں یہ قول اسے مزید تقویت دیتا ہے: **وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ** یعنی تم ان سے اپنی جانوں کے ساتھ لڑتے ہوئے اور اموال خرچ کرتے ہوئے مقابلہ کرو۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل پر ایک بار مال خرچ کرنا واجب ہوگا اور ایک بار مستحب جہاد کے تعین اور اس کے عدم تعین کے اعتبار سے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس (مال) سے خرچ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا اور جس کے ساتھ ان پر انعام کیا۔ اور انہیں روک کر رکھنے سے ڈرایا یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس میں کوئی خرید و فروخت ممکن نہ ہوگی اور نہ ہی کسی نفقہ کو پانا ممکن ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَيَقُولُ رَبِّ لَا أَخْرُتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ فَاصْدَقِي** (تو) (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ (وخیرات) کر لیتا۔

اور الخُلَّة سے مراد خالص دوستی ہے۔ یہ تخلل الأسرار بین الصدیقین سے ماخوذ ہے۔ (دو دوستوں کے درمیان راز خاص ہیں۔) اور الخِلَالَةُ وَالْخِلَالَةُ الْخِلَالَةُ تمام کا معنی دوستی اور محبت ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

و كيف تواصل من أضحيت خللته كأي مزحَب

تو اے کیسے پہنچ سکتا ہے جس کی دوستی ابو مرحب کی طرح ہو گئی ہے۔

اور ابو مرحب سائے کی کنیت ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اس عرقوب کی کنیت ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے: مواعید عرقوب (عرقوب کے وعدے۔) اور الخُلَّة سے مراد میٹھی اور شیریں گھاس بھی ہے جو عام بوٹی سے خالی ہو۔ کہا جاتا ہے: **الْخُلَّةُ خُبْزُ الْإِبِلِ وَالْخُنْضُ فَاكْهَتَهَا** (شیریں گھاس اونٹ کی روٹی ہے اور نمکین و تلخ گھاس اس کا پھل ہے۔) اور الخُلَّة (خاء کے فتح کے ساتھ) اس کا معنی حاجت اور فقر ہے اور الخُلَّة کا معنی ابن مخاض بھی ہے۔ (یعنی ایک سال کا اونٹ)، یہ اسمعی سے روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: **أَتَاهُمْ بِقُرْصٍ كَأَنَّهُ فَرْسَنُ خُلَّةٍ** (وہ ان کے پاس ایک ٹکیہ لے کر آیا گویا کہ وہ اونٹ کا کھر ہے۔) اس کا مؤنث بھی خُلَّة ہی ہے۔ اور میت کے لئے کہا جاتا ہے: **اللَّهُمَّ اصْصَحْ خُلَّتَهُ** (اے اللہ! اس کے اس خلل کی اصلاح فرما دے جو اس نے چھوڑا ہے۔) اور الخُلَّة کا معنی ترش و نمکین گھنا پودا بھی ہے۔

اور الخُلَّة یہ خلل السیوف کا واحد مؤنث ہے۔ اور یہ وہ غلاف ہیں جن کے ساتھ تلواروں کی میانوں کو ڈھانپا جاتا ہے اور یہ سونے وغیرہ کے ساتھ منقش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے **سُيُورٌ تُنْبَسُ ظُهُرُ سَيْتِ الْقَوْسِ** یعنی وہ تسمے جو قوس کی دونوں

طرفوں کے ظاہر کو پہنائے جاتے ہیں اور الخَلَّة کا معنی وہ شے بھی ہے جو دانتوں میں باقی رہ جاتی ہے۔ اس کا بیان سورہ النساء میں الخلیل کے مادہ اشتقاق اور اس کے معنی کی بحث میں آئے گا۔

پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ آخرت میں نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ شفاعت مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت ہے جس کے ساتھ وہ اسے شرف بخشے گا جسے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے لَا بَيِّنَ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ نَصَب کے ساتھ بغیر تنوین کے قراءت کی ہے اور اسی طرح سورہ ابراہیم میں لَا بَيِّنَ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ۔

اور سورہ الطور میں ہے لَا لَغْوَ فِيهَا وَلَا تَأْتِيَمٌ۔ (1)

اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

أَلَا طِعَانَ وَلَا فُرْسَانَ عَادِيَةً
إِلَّا تَجَشُّوْكُمْ عِنْدَ التَّنَائِيْدِ

اس میں بھی لا طِعَانَ وَلَا فُرْسَانَ منصوب ہیں۔

ہمزہ استفہام لَا کے عمل کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے: أَلَا رَجُلَ عِنْدَكَ۔ اور یہ بھی جائز ہے أَلَا رَجُلٌ وَلَا امْرَأَةٌ۔ جیسا کہ بغیر استفہام کے ایسا کہنا جائز ہے۔ پس تو اسے جان لے۔
باقی تمام نے اسے رفع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسا کہ الراعی نے کہا ہے:

وَمَا صَرَمْتُكَ حَتَّى قُلْتُ مُغْلِنَةً لَا نَاقَةَ لِي فِي هَذَا وَلَا جَمَلُ

اور میں نے تجھے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ تو نے اعلان کرتے ہوئے کہا اس میں نہ میری کوئی اونٹنی ہے اور نہ کوئی اونٹ ہے اور یہ روایت بھی ہے: وَمَا هَجَرْتُكَ بِسِ فِتْنَةٍ عَامٍ بِرِدَالَتٍ كَرْتَا ہے جو اس صنف کی تمام وجوہ کو مستغرق ہے۔ گویا کہ یہ جواب ہے اس کا جس نے کہا: کیا اس میں بیع ہوگی؟ پس سائل نے عام سوال کیا، تو پھر جواب بھی نفی عام کے ساتھ دیا جائے گا۔ اور لَا اسم منفی کے ساتھ مل کر ایک اسم کے قائم مقام ہے جو مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور فِيهِ خبر ہے۔ اور اگر چاہے تو اسے یَوْمَ کی صفت بنا لے اور جنہوں نے رفع دیا ہے انہوں نے لَا کو بمنزلہ لَيْسَ قرار دیا ہے اور جواب کو خبر عام بنایا ہے اور گویا یہ اس کا جواب ہے جس نے کہا: ”کیا اس میں بیع ہوگی؟“ یعنی کلام میں بیع سے پہلے مِنْ کو ساقط کر دیا ہے۔ پس جواب ایسا لایا گیا جو رفع سے اسے تبدیل کرنے والا نہیں اور اسم مرفوع مبتدا ہے يَالَيْسَ کا اسم ہے اور فِيهِ خبر ہے۔

کئی نے کہا ہے: بہتر اور عمدہ رفع ہے، کیونکہ اکثر قراء نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اور قرآن کے علاوہ دیگر کلام میں لَا بَيِّنَ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور سیبویہ نے بنی مذجج کے ایک آدمی کے لئے کہا ہے:

هَذَا لَعْنَرُكُمْ الصَّغَارِ بَعِينِهِ لَا أَقْرَبِي أَنْ كَانَ ذَاكَ وَلَا أَبُ

اس میں بھی لَا أَقْرَبِي وَلَا أَبُ پڑھا گیا ہے۔

اور جائز ہے کہ پہلے کو مبنی (برفتہ) پڑھا جائے اور دوسرے کو نصب اور تنوین دی جائے۔ پس تو کہہ سکتا ہے: لا رجل فیہ ولا امرأة، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

لا نسب اليوم ولا خلعة اتسع الخرق على الزاقع
اور لا دونوں مقامات میں زائدہ ہے، پہلے کا عطف محل پر ہے اور دوسرے کا لفظ پر ہے۔ اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلے کو رفع دیا جائے گا اور دوسرے کو مبنی پڑھا جائے گا۔ جیسا کہ آپ کا قول: لا رجل فیہا ولا امرأة، جیسا کہ امیہ نے کہا ہے:

فلا لغو ولا تأثیم فیہا وما فاهوا به أبدا مقیم
اعراب کی پانچویں وجہیں تیرے اس قول میں جائز ہیں: لا حول ولا قوۃ الا باللہ، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔
وَالْكَافِرُونَ یہ مبتدا ہے۔ هُمْ یہ مبتدائے ثانی ہے، الظَّالِمُونَ یہ دوسرے مبتدا کی خبر ہے اور اگر تو چاہے تو هُمْ ضمیر کو زائدہ بنا لے بطور ضمیر فصل کے۔ اور الظَّالِمُونَ خبر ہے الْكَافِرُونَ کی۔ عطاء بن دینار نے کہا ہے (1): سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے یہ کہا ہے: وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ اور یہ نہیں کہا ہے وَالظَّالِمُونَ هُمُ الْكَافِرُونَ (یعنی یہ کہا ہے کہ کفار ظالم ہیں یہ نہیں کہا ہے کہ ظالم کافر ہیں۔)

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ②

”اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے۔ جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم سے مگر جتنا وہ چاہے۔ سار کھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اور نہیں تھکائی اسے زمین و آسمان کی حفاظت اور وہی ہے سب سے بلند عظمت والا۔“

قولہ تعالیٰ: اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ۔ یہ آیۃ الکرسی ہے، یہ قرآن کی آیات کی سردار ہے اور سب سے بڑی آیت ہے، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ یہ رات کے وقت نازل ہوئی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو بلایا اور یہ آیت لکھوا دی۔

حضرت محمد بن حنفیہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب آیۃ الکرسی نازل ہوئی دنیا میں تمام بت گر گئے اور اسی

طرح دنیا میں تمام بادشاہ گر پڑے اور ان کے سروں سے تاج گر گئے اور شیاطین بھاگ پڑے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو مارنے لگے اور ابلیس کے پاس تمام جمع ہو گئے اور اسے اس کے بارے میں مطلع کیا، تو اس نے انہیں کہا کہ وہ اس کے بارے میں تفتیش کریں۔ چنانچہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف آئے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ آیت الکرسی نازل ہوئی ہے۔ ائمہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس قرآن کریم میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟“ انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس کتاب اللہ میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟“ تو میں نے عرض کی: اللہ لا الہ الا هو الْحَقُّ الْقَيُّومُ۔ تو آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ”اے ابا المنذر! تجھے علم مبارک ہو (1)۔“ حکیم ترمذی ابو عبد اللہ نے یہ اضافہ ذکر کیا ہے۔ ”قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس آیت کی ایک زبان ہے اور دو ہونٹ ہیں ساق عرش کے پاس شہنشاہ مطلق کی پاکی بیان کرتی ہے (2)۔“

ابو عبد اللہ نے کہا ہے: یہ آیت اللہ تعالیٰ جل ذکرہ نے اسے نازل فرمایا اور اس کا ثواب اس کے پڑھنے والے کے لئے دنیا اور آخرت میں رکھا ہے۔ پس دنیا میں تو یہ ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کی آفات و مصائب سے حفاظت کرتی ہے۔ نواف البرکالی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: آیت الکرسی تورات میں وَلِیَّةُ اللہ کے نام سے پکاری جاتی ہے اور اس کے پڑھنے والوں کو ملکوت السموات والارض میں عزیز پکارا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو وہ اپنے گھر کے چاروں کونوں میں آیت الکرسی پڑھتے تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اس کے ذریعے چاروں اطراف سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتے تھے اور یہ کہ شیطان آپ کے گھر کے کونوں سے آپ سے دور ہو جائے (3)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک جن سے کشتی کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پچھاڑ دیا، تو جن نے آپ کو کہا: مجھ سے ذرا ہٹو یہاں تک کہ میں آپ کو وہ بتاتا ہوں جس کے ساتھ تم ہم سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے پوچھا، تو اس نے کہا: بلاشبہ تم ہم سے آیت الکرسی کے ساتھ محفوظ رہ سکتے ہو (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اور حدیث میں ہے: جس نے ہر نماز کے پیچھے آیت الکرسی پڑھی تو اس کی روح قبض کرنے کی ذمہ داری رب ذوالجلال لے لیتا ہے اور وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے انبیاء علیہم السلام کی معیت میں جنگ لڑی یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا: میں نے تمہارے نبی ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جس نے ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی تو اس کے لئے موت کے سوا کوئی شے جنت میں داخل ہونے کے مانع نہیں ہے اور اس پر صدیق اور عابد ہی مواظبت اختیار کرتا ہے اور جس نے اسے اس وقت پڑھا جب وہ اپنے بستر پر گیا تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی آية الکرسی، حدیث نمبر 1248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 337-338

3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338

4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338

اسے، اس کے پڑوسیوں کو اور اس کے پڑوسیوں کو اور اس کے ارد گرد کے گھروں کو محفوظ فرما دیا (1)۔“

اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی زکوٰۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد کی، آگے پورا قصہ ذکر کیا۔ اور اس میں ہے: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم خیال یہ ہے کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھا دے گا جن کے سبب اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا، سو میں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ کیا ہیں؟“ میں نے عرض کی: اس نے مجھے کہا ہے: جب تو اپنے بستر میں جائے تو اول سے آخر تک آیۃ الکرسی پڑھا کر اللہ لا اِلهَ اِلاَ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ۔ اور اس نے مجھے کہا ہے: تجھ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلسل محافظ رہے گا اور صبح ہونے تک کوئی شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔ اور وہ (صحابہ کرام) خیر کی چیز لینے کے بہت زیادہ حریص تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اس نے تجھ سے سچ کہا ہے حالانکہ وہ بہت جھوٹا ہے۔ اے ابو ہریرہ! کیا تو اسے جانتا ہے جس سے تو تینوں راتیں باتیں کرتا رہا ہے؟“ عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ شیطان ہے (2)۔“

مسند دارمی ابو محمد میں ہے شعبی نے کہا ہے: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی کا ایک جن سے آمنا سامنا ہو گیا تو وہ آپس میں کشتی کرنے لگے تو اس صحابی نے اسے پچھاڑ دیا۔ تو اس آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ میں تجھے کمزور بلند غبار کی مانند دیکھ رہا ہوں گویا تیرے دونوں ہاتھ کتے کے ہاتھوں کی طرح ہیں، کیا تم اسی طرح ہوتے ہو۔ اے جنوں کے گروہ! یا تو انا میں سے اس طرح ہے؟ اس نے کہا: نہیں قسم بخدا! بلاشبہ میں ان میں سے مضبوط پسلیوں والا ہوں، البتہ تو دوبارہ میرے ساتھ کشتی کر، اگر تو نے مجھے پچھاڑ لیا تو میں تجھے ایسی شے سکھا دوں گا جو تیرے لئے نفع بخش ہوگی۔ صحابی نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے اسے پچھاڑ دیا، تو اس نے کہا: کیا تم آیۃ الکرسی پڑھتے ہو: اللہ لا اِلهَ اِلاَ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ؟ انہوں نے کہا: ہاں، تو اس نے کہا کیونکہ تم جب بھی اسے اپنے گھر میں پڑھو گے تو شیطان گدھے کی مثل ہوا خارج کرتے ہوئے اس سے نکل جائے گا اور پھر صبح ہونے تک اس میں داخل نہ ہوگا۔ اسے ابو نعیم نے ابو عاصم ثقفی سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غریب حدیث میں ذکر کیا ہے۔ ابو معاویہ نے اس کے بارے میں ابو عاصم ثقفی سے، انہوں نے شعبی سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: کیا وہ عمر رضی اللہ عنہ تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: امکان یہی ہے کہ وہ عمر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

ابو محمد دارمی نے کہا ہے۔ الفقیل کا معنی ہے: باریک (کمزور)، الشخیت کا معنی ہے: انتہائی لاغر کمزور، الضلیع کا معنی ہے: پیٹ سے خارج ہونے والی ہوا۔ اور یہ لفظ حاء کے ساتھ الحجب بھی ہے۔

اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس نے حم - المؤمن - الیہ المعصیر تک اور آیۃ الکرسی صبح کے وقت پڑھیں تو شام ہونے تک وہ ان دونوں کے سبب محفوظ رہے گا اور

جس نے ان دونوں کو شام کے وقت پڑھا تو وہ صبح ہونے تک ان کے سبب محفوظ رہے گا (1)۔“ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اور ابو عبد اللہ الترمذی الحکیم نے کہا ہے: روایت کیا گیا ہے کہ مومنین کے لئے محافظت کی خاطر ہر نماز کے بعد انہیں پڑھنا مستحب ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی جس نے ہر نماز کے بعد آیہ الکرسی پڑھنے پر دوام اختیار کیا میں اسے اس سے زیادہ عطا کروں گا جو میں شکر کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور انبیاء علیہم السلام کا اجر اور صدیقین کے اعمال کا اجر اور میں اس پر اپنا دست رحمت پھیلا دیتا ہوں اور اس کے لئے کوئی شے رکاوٹ نہیں ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں مگر یہ کہ ملک الموت اسے لے آئے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! جس نے اس کے بارے سنا وہ اس پر دوام اختیار نہیں کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”میں یہ اپنے بندوں میں سے کسی کو عطا نہیں کروں گا سوائے نبی کے یا صدیق کے یا ایسے آدمی کے جس سے میں محبت کرتا ہوں یا ایسے آدمی کے جس کے بارے میں ارادہ کروں کہ وہ میرے راستے میں قتل ہو جائے۔“

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”اے موسیٰ! جس کسی نے ہر نماز کے بعد آیہ الکرسی پڑھی تو میں اسے انبیاء علیہم السلام (کے اعمال) کا ثواب عطا کروں گا۔ ابو عبد اللہ نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے: میں اسے انبیاء علیہم السلام کے عمل کا ثواب عطا فرماؤں گا اور جہاں تک نبوت کے ثواب کا تعلق ہے تو وہ سوائے انبیاء علیہم السلام کے اور کسی کے لئے نہیں ہے (2)۔

یہ آیت توحید اور اعلیٰ صفات کو متضمن ہے۔ اس میں پچاس کلمے ہیں اور ہر کلمے میں پچاس برکتیں ہیں۔ اور یہ تہائی قرآن کریم کے برابر ہے۔ حدیث طیبہ میں اسی طرح وارد ہے۔ ابن عطیہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

اور لفظ اللہ مبتدا ہے اور لا الہ مبتدا ثانی ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور وہ معبود یا موجود ہے۔ اور اِلَّا هُوَ، لا الہ کے محل سے بدل ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ لا الہ لا الہ مبتدا اور خبر ہے اور یہ مرفوع ہے اور اس معنی پر محمول ہے یعنی ما الہ الا هو۔ (سوائے اس کے کوئی الہ نہیں ہے) اور غیر قرآن میں لا الہ الا الہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور استثنا کی بناء پر ضمیر منصوب ہے۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں کہا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سے کون سی سب سے بڑی آیت آپ پر نازل فرمائی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ لا الہ الا هو اَلْحَى الْقَيُّوْمُ (3) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن کریم میں اشرف اور بلند رتبہ آیت آیہ الکرسی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے: کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کا تکرار مضمرا اور ظاہرا اٹھارہ بار کیا جاتا ہے۔ (اس لئے یہ دوسری آیات

سے بلند رتبہ اور اعلیٰ ہے۔)

الْحَيُّ الْقَيُّومُ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اگر چاہے تو اسے ہُو سے بدل بنا لے اور اگر چاہے تو یہ خبر کے بعد خبر بھی ہو سکتی ہے اور اگر چاہے تو اس سے پہلے مبتدا مضمرب بھی ہو سکتا ہے اور غیر قرآن میں اسے مدح کی بنا پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور الْحَيُّ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے جس کے ساتھ اسے پکارا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام جب مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو وہ انہیں اسماء کے ساتھ دعا مانگتے تھے۔ یا حَيُّ یا قَيُّوم۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت آصف بن برخیا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تخت بلقیس لانے کا ارادہ فرمایا تو اسی قول کے ساتھ دعا مانگی: یا حَيُّ یا قَيُّوم۔ اور یہ قول بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے انہیں فرمایا: ایاہیا ایاہیا یعنی یا حَيُّ یا قَيُّوم۔ اور کہا جاتا ہے: یہی سمندر میں سفر کرنے والوں کی دعا ہے کہ جب انہیں غرق ہونے کا خوف لگتا ہے تو انہی اسماء کے ساتھ دعا مانگتے ہیں (پکارتے ہیں)۔ علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ کہا جائے گا: حَيُّ قَيُّوم جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف خود بیان کیا ہے اور پھر اس میں کوئی غور و فکر کیے بغیر اسے اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔

اور یہ قول بھی ہے: اللہ تعالیٰ نے امور کے محل میں تصرف کرنے اور اشیاء کی مقادیر مقرر کرنے کی وجہ سے اپنا نام حَيُّ رکھا ہے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حَيُّ وہ ہوتا ہے جسے موت نہیں آتی۔ اور سدی نے کہا ہے: الحَيُّ سے مراد باقی رہنے والا ہے۔ لہذا قول ہے:

فَمَا تَرَيْنِي الْيَوْمَ اصْبَحْتُ سَالِمًا فَلَسْتُ بِأَحْيَا مِنْ كَلَابٍ وَ جَعْفَرٍ
پس اگر تو آج مجھے دیکھ رہا ہے کہ میں نے صبح سالم صبح کی ہے تو میں کلاب و جعفر میں سے باقی رہنے والا نہیں ہوں۔ اور کبھی کہا جاتا ہے: بلاشبہ یہی اسم اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ الْقَيُّومُ یہ قائم سے ہے: یعنی مخلوق کو تدبیر کے ساتھ قائم رکھنے والا۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے: ہر نفس کو اس کے ساتھ قائم رکھنے والا جو اس نے کمایا ہے تاکہ وہ اسے اس کے عمل کے مطابق جزا دے، اس حیثیت سے کہ وہ اس کے بارے میں جاننے والا ہے اور ان میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ ذات جو نہ بدلتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ (یعنی نہ اس کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ وہ زوال پذیر ہے) امیہ بن ابی الصلت نے کہا ہے:

لَمْ تَخْلُقِ السَّمَاءَ وَالنَّجْمَ وَالشَّمْسَ مَعَهَا قَمَرٌ يَقُومُ
آسمان اور ستارے، سورج اور اس کے ساتھ قائم ہونے والا چاند نہیں پیدا کئے گئے۔
قَدَرَهُ مُهْنِمِينَ قَيُّومٌ وَالْحَشَا وَالْجَنَّةُ وَالنَّعِيمُ

جسے نگہبان قیوم نے مقرر کیا ہے۔ اور حشر اور جنت اور تمام نعمتیں (نہیں پیدا کی گئیں)

إِلَّا بِأَمْرِ شَانِهٍ عَظِيمٍ

مگر ایسے امر کے لئے جس کی شان انتہائی عظیم ہے۔

علامہ بیہقی نے بیان کیا ہے: میں نے اسماعیل الضریر کی ”عیون التفسیر“ میں الْقَيُّوم کی تفسیر میں دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ہے اور کہا جاتا ہے: وہ وہ ہے جو سوتا نہیں ہے، گویا کہ انہوں نے یہ مفہوم آیۃ الکری میں اس کے بعد والے ارشاد گرامی سے لیا ہے: لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ۔

اور کلبی نے کہا ہے: الْقَيُّوم وہ ہے جس کی ابتداء نہ ہو۔ اسے ابوالانباری نے بیان کیا ہے۔

قیوم کی اصل قَيُّوم ہے، واو اور یاء ایک کلمے میں جمع ہیں ان میں سے پہلا حرف ساکن ہے پس واو کو یاء سے بدلنے کے بعد پہلی یا کو دوسری میں ادغام کر دیا۔ قیوم فاعل کے وزن پر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ واو سے ہے تو یہ قودم ہو جائے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علقمہ، حضرت امش اور حضرت نخعی رحمہم نے الحی القیام الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور اہل لغت کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عربوں کے نزدیک القیوم زیادہ اعراف ہے اور بنا کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور علت کے اعتبار سے زیادہ ثابت ہے۔ اور القیام القوام سے القیام کی طرف منقول ہے۔ الفعال کو الفیعال کی طرف پھیرا گیا ہے، جیسا کہ الصواعک المصابغ کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

إِنْ ذَا الْعَرْشِ لَذِي يَرْزُقُ النَّاسَ وَحَىٰ عَلَيْهِمْ قَيُّومٌ

بلاشبہ صاحب عرش وہ ہے جو لوگوں کو رزق عطا فرماتا ہے اور وہ ان پر حسی و قیوم ہے۔

پھر رب العالمین نے اس کی نفی کی ہے کہ اسے اونگھ آئے یا نیند (یعنی نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند)

السِّنَةُ کا معنی تمام کے قول کے مطابق اونگھ ہے اور اونگھ وہ ہوتی ہے جو آنکھ میں ہوتی ہے اور جب وہ دل میں ہو جائے تو پھر نوم (نیند) ہو جاتی ہے۔ عدی بن رقاہ نے ایک عورت کا فتور نظر کے ساتھ وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وَسَنَانٌ أَقْصَدَهُ الثُّعَاسُ فَرَنْقَتْ فِي عَيْنِهِ سِنَةٌ وَ لَيْسَ بِنَائِمٍ

وسنان کا اونگھ نے ارادہ کر رکھا ہے۔ پس اس کی آنکھوں میں اونگھ داخل ہو چکی ہے اور وہاں نیند نہیں ہے۔

اور مفضل نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ السِّنَةُ یہ سر کی جانب سے ہوتی ہے اور نَعَاسٌ آنکھ میں ہوتی ہے اور نوم (نیند) دل میں ہوتی ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: وسنان وہ ہے جو نیند سے بیدار ہوتا ہے حالانکہ وہ عقل و سمجھ نہیں رکھتا یہاں تک کہ وہ بسا اوقات اپنے گھردلوں پر تلوار نگی کر لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جو کچھ ابن زید نے کہا ہے یہ محل نظر ہے۔ کلام عرب سے اسے نہیں سمجھا جاسکتا (1)۔

اور سدی نے کہا ہے: اَلْسِنَةُ سے مراد اس نیند کی ہوا ہے جو چہرے پر لگتی ہے اور انسان اونگھنے لگتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بالجملہ اس سے مراد وہ فتور اور ڈھیلا پن ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عقل مفقود نہیں ہوتی۔ اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی خلل واقع نہیں ہوتا اور کسی حال میں بھی اسے کوئی اکتاہٹ اور سستی لاحق نہیں ہوتی۔

سنة میں اصل وَ سُنَّةٌ ہے اس میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ یَسُنُّ سے حذف کی گئی ہے اور النوم سے مراد وہ ثقل اور بوجھ ہے جس کے ساتھ انسان کے حق میں ذہن زائل ہو جاتا ہے (یعنی عقل کام نہیں کرتی) اس میں واو عطف کے لئے ہے اور تاکید کے لئے ہے۔

میں کہتا ہوں: لوگ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور حکایت موسیٰ علیہ السلام سے منبر پر بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کیا اللہ تعالیٰ جل شانہ بھی سوتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے آپ کو تین بار بیدار کیا پھر اس نے آپ کو دو بوتلیں دے دیں، ہر ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور آپ کو حکم دیا کہ ان دونوں کی حفاظت کریں۔ فرمایا: پھر آپ سونے لگے اور قریب تھا کہ آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں مل جاتے پھر آپ بیدار ہو جاتے اور آپ انہیں ایک دوسرے سے دور ہٹا لیتے بالآخر آپ گہری نیند سو گئے اور آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں ٹکرائے اور دونوں بوتلیں ٹوٹ گئیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے یہ مثال بیان فرمائی کہ اگر وہ سوتا رہتا تو پھر یہ آسمان اور زمین (اپنی اپنی جگہ) مضبوطی سے ٹھہرے نہ رہتے (1)۔ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسے کئی ایک نے ضعیف کہا ہے اور ان میں سے امام بیہقی بھی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (یعنی زمین و آسمان کی ہر شے) اس کی ملکیت ہے۔ اور وہ تمام کا مالک اور رب ہے۔ عبارت میں مَآذُکَ کیا گیا ہے اگرچہ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو عقل رکھتے ہیں تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں مراد مجموعی طور پر موجود چیزیں ہیں۔ (چاہے وہ ذوی العقول یا غیر ذوی العقول ہوں) علامہ طبری نے کہا ہے: یہ آیت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: مَا نَعْبُدُكُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى (زمر: 3) (ہم بتوں کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے تاکہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ نزدیک کر دیں۔)

قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ اس میں مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِي، ذَا کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور یہ جائز نہیں ہے کہ ذَا زائد ہو جیسا کہ مَآ کے ساتھ زائد کیا گیا ہے کیونکہ مَآ مبہم ہوتا ہے اور ذَا کی اس کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کے ساتھ اسے زائد کر دیا گیا ہے۔

اور اس آیت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کے بارے میں جسے چاہے گا اذن عطا فرمائے گا اور وہ انبیاء علیہم السلام، علماء، مجاہدین، ملائکہ اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جنہیں رب العالمین یہ اعزاز و اکرام اور شرف عطا فرمائے گا۔

پھر وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر انہیں کے لئے جن کے لئے وہ راضی ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَى۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ علماء اور صالحین ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور وہ دونوں منزلوں کے درمیان ہوں گے یا وہاں پہنچ چکے ہوں گے لیکن ان کے اعمال صالحہ بھی ہوں گے۔ اور بخاری باب بقیۃ من ابواب الرؤیۃ میں ہے: بے شک مومنین کہیں گے: اے ہمارے رب! بلاشبہ ہمارے بھائی ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور یہ شفاعت ان کے بارے میں ہے جن کا معاملہ بالکل قریب کا ہوتا ہے (1) جیسا کہ جنت کے دروازے کے ساتھ چمٹنے والا بچہ شفاعت کرے گا۔

بلاشبہ یہ ان کے قرابتداروں اور ان کے جاننے پہچاننے والوں کے بارے میں ہے اور انبیاء علیہم السلام ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ان کے گنہگار امتی اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے بغیر کسی قرابت اور معرفت کے صرف نفس ایمان کے سبب (وہ شفاعت کریں گے)۔ پھر خطاؤں اور گناہوں میں مستغرق ان لوگوں کے بارے میں ارحم الراحمین کی شفاعت باقی رہ جائے گی جن کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت نے کوئی عمل نہ کیا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت حساب کی تعمیل کے بارے میں ہوگی اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہی خاص ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں شفاعت کی کیفیت بڑے شافی بیان کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ شاید آپ رحمہ اللہ نے اسے نہیں پڑھا کہ شفاعت کرنے والے جہنم میں داخل ہوں گے اور وہاں سے ایسے لوگوں کو نکالیں گے جنہوں نے عذاب واجب جان لیا ہوگا۔ پس اس بنا پر یہ کہنا بعید نہیں ہے کہ مومنین کے لئے دو شفاعتیں ہوں گی: ایک شفاعت ان کے بارے میں جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور دوسری شفاعت ان کے بارے میں جو اس تک پہنچ چکے ہوں گے اور اس میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ عطا فرمائے۔ آمین۔

سو آپ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے: ”پھر جہنم پر ایک پل بچھایا جائے گا اور شفاعت کھل جائے گی اور وہ کہنے لگیں گے: اللھم سلم سلم۔ اے اللہ! سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ پل کیسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس میں پاؤں رکھنے کی جگہ پر پھسلن ہوگی (پاؤں قرار نہ پا سکیں گے) اس کے ساتھ لوہے کے ٹیڑھے کنڈے ہوں گے اور اس میں سخت جگہ پر ایسے خاردار پودے ہوں گے جن کو سعدان کہا جاتا ہے۔ پس مومنین اس سے آنکھ جھپکنے کی طرح، بعض بجلی کی طرح، بعض ہوا کی طرح، بعض پرندوں کی طرح اور بعض گھوڑوں اور اونٹوں کی تیز رفتاری کی طرح گزر جائیں گے اور وہ نجات پا جائے گا جو سلامت رہا، جسے فقط خراشیں آئیں اور جسے آتش جہنم میں گرنے سے بچا لیا گیا، یہاں تک کہ جب مومنین آگ سے خلاصی پا جائیں گے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی ان مومنین سے زیادہ طاقتور نہیں جو قیامت کے دن اپنے ان بھائیوں کا حق لینے کے لئے جو جہنم میں ہوں گے اللہ کی بارگاہ میں قسم کے ساتھ عرض کریں گے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دارالکتب العلمیہ۔ بخاری شریف، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رب! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے، تو ان کو کہا جائے گا: تم انہیں نکال لو جنہیں تم پہچانتے ہو۔ پس ان کی صورتیں آگ پر حرام کر دی جائیں گی اور وہ بہت زیادہ مخلوق کو نکال کر لے آئیں گے حالانکہ آگ نے نصف پنڈلی تک اور گھٹنوں تک انہیں پکڑا ہوا ہوگا۔ پھر وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا تھا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا، تو رب العالمین ارشاد فرمائے گا: تم واپس جاؤ اور جس کے دل میں ایک دینار کے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لاؤ۔ پھر وہ کثیر مخلوق کو نکال لائیں گے۔ اور پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پھر رب کریم فرمائے گا تم واپس لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم نصف دینار کے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ کثیر مخلوق کو نکال کر لے آئیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا، پھر رب العالمین ارشاد فرمائے گا تم واپس چلے جاؤ اور جس کے دل میں تم رائی کے دانے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لاؤ چنانچہ وہ کثیر مخلوق کو نکال لائیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں چھوڑی۔“ حضرت ابو سعید بنی سعدی فرماتے تھے: اگر تم اس حدیث کے بارے میری تصدیق نہ کرو تو پھر چاہو تو یہ پڑھ لو: إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً يُّضْعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا (بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر بھی، (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی تو دو گنا کر دیتا ہے اسے اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم۔)

پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ملائکہ شفاعت کر چکے، انبیاء علیہم السلام شفاعت کر چکے اور مومن بھی شفاعت کر چکے اور رب ارحم الراحمین کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ پس اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک قبضہ (مشت) بھرے گا اور اس سے اس قوم کو نکال کر لے آئے گا جنہوں نے کبھی بھی خیر اور نیکی کا عمل نہیں کیا حالانکہ وہ کولہ بن چکے ہوں گے (1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سو میں عرض کروں گا: اے میرے پروردگار! مجھے اس کے بارے اجازت عطا فرما جس نے کہا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ تو رب کریم فرمائے گا: وہ تیرے لئے نہیں ہے۔ یا فرمایا: وہ تیری طرف نہیں ہے۔ مجھے اپنی عزت، کبریائی اور عظمت و جلال کی قسم ہے میں ضرور بہ ضرور اسے نکالوں گا جس نے کہا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ (2)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا ہے: ”یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان قضا (فیصلہ فرمانے) سے فارغ ہوگا اور ارادہ فرمائے گا کہ وہ اہل جہنم میں سے جنہیں چاہے اپنی رحمت کے ساتھ نکال لے تو وہ ملائکہ کو حکم ارشاد فرمائے گا کہ وہ جہنم سے انہیں نکال لائیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے ان میں سے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمانے کا ارادہ کیا ہے اور وہ کہتے ہیں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ پس وہ فرشتے انہیں جہنم

1- صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 102، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2- صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 110، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6956، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں پہچان لیں گے اور وہ انہیں سجدوں کے نشانات سے پہچانیں گے، آگ ابن آدم کو کھا جائے گی سوائے سجدوں کے اثر کے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے آپ پر سجدوں کے اثر (نشان) کو کھانا حرام قرار دیا ہے (1)۔“ الحدیث بطول۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مومنین وغیرہم کی شفاعت بلاشبہ ان کے لئے ہے جو جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے اور اس میں پہنچ چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ اور ابن عطیہ کا قول: ”ان میں سے جو نہیں پہنچے یا پہنچ چکے“ یہ احتمال رکھتا ہے کہ وہ دوسری احادیث سے لیا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قیامت کے دن لوگوں کی کئی صفیں بنائی جائیں گی“..... اور ابن نمیر نے کہا ہے: اہل جنت کی..... پس اہل نار میں سے ایک آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا تو وہ کہے گا: اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب تو نے پانی طلب کیا تو میں نے تجھے خوب جی بھر کر پانی پلایا تھا؟ فرمایا: تو وہ اس کی شفاعت کر دے گا اور ایک اور آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا: کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب میں نے تجھے طہور (جس سے پاکی حاصل کی جائے) دیا تھا؟ چنانچہ وہ اس کی شفاعت کر دے گا..... ابن نمیر نے کہا..... وہ کہے گا اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں جس دن تو نے مجھے فلاں فلاں کام کے لئے بھیجا تھا اور میں تیرے لئے چلا گیا تھا؟ پس وہ اس کی شفاعت کرے گا (2)۔“ رہیں ہمارے نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتیں تو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔

ایک قول ہے کہ وہ تین ہیں ایک قول ہے کہ وہ دو ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ پانچ ہیں۔ اس کا بیان سبحان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ہم نے ان پر کتاب ”التذکرہ“ میں بحث کی ہے۔ والحمد للہ۔

قولہ تعالیٰ: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ دونوں ضمیریں ہر اس ذی عقل کی طرف لوٹ رہی ہیں جنہیں یہ قول متضمن ہے: لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ اور مجاہد نے کہا ہے: مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ سے مراد دنیا اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد آخرت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سب فی نفسہ صحیح ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ما بین الید سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کے سامنے ہے اور ما خلفہ سے مراد ہر وہ شے ہے جو اس کے بعد آئے گی۔ اور حضرت مجاہد کے قول کی طرح ہی سدی وغیرہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ یہاں علم بمعنی معلوم ہے یعنی وہ اس کی معلومات میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے اور یہ حضرت خضر علیہ السلام کے اس قول کی طرح ہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت کہا جب چڑیا نے سمندر میں چونچ ماری، میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم سے کم نہیں ہے مگر اتنا ہی جتنی یہ چڑیا اس سمندر سے کم ہے۔ پس یہ اور جو اس کے مشابہ ہے وہ معلومات کی طرف راجع ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا علم تو وہ ہے جو اس کی ذاتی

1۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6885، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، جلد 1، صفحہ 270، وزارت تعلیم

صفت ہے وہ منقسم نہیں ہوتا۔ اور آیت کا معنی ہے: کسی کے لئے کوئی معلوم نہیں مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اسے جان لے۔
 قولہ تعالیٰ: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کرسی ایک موتی ہے اور قلم بھی ایک موتی ہے اور قلم کی لمبائی سات سو برس کی ہے اور کرسی کی طوالت اتنی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

حماد بن سلمہ نے عاصم بن بہدلہ سے..... اور یہی عاصم بن ابی النجود ہیں..... اور انہوں نے زر بن حبیش کے واسطے سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور کرسی اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) عرش کے اوپر ہے اور وہ اسے جانتا ہے جس میں اور جس پر تم ہو۔ کہا جاتا ہے: کرسی اور کرسی اور جمع الکراسی ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کرسی کا معنی علمہ (1) (اس کا علم) ہے۔

اور علامہ طبری نے اسے ترجیح دی ہے اور کہا ہے: اسی سے وہ کراسہ (کاپی) بھی ہے جو علم کو جمع کرتی ہے۔ (اور محفوظ رکھتی ہے) اور اسی وجہ سے علماء کو الکرسی کہا گیا ہے، کیونکہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

يَخْفُتُ بِهِمُ بَيْضُ الْوُجُوهِ دُ عُصْبَةُ كُرَاسِي بِالْاَحْدَاثِ حِينَ تَنْوُبُ

اچھی شہرت رکھنے والے اور علماء کا گروہ انہیں ان امور کے ساتھ گھیر لیتا ہے (2) جب وہ پیش آتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے: کرسی سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جس کے ساتھ وہ آسمانوں اور زمین کو ٹھہرائے ہوئے ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: اجعل لهذا الحائط كرسيا، اس دیوار کی کرسی بنا دو یعنی وہ جس پر اس کا اعتماد اور سہارا ہو۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے قریب ہے جو انہوں نے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ میں کیا ہے۔ علامہ بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اور ہم نے حضرت ابن مسعود اور حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَسِعَ كُرْسِيُّهُ میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے مراد وہی کرسی ہے جو عرش کے ساتھ مشہور ہے۔ اور اسرائیل نے سدی سے اور انہوں نے ابو مالک سے اس قول وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک وہ چنان جس پر ساتویں زمین ہے اور اس کی اطراف پر مخلوق کی انتہا ہے، اس پر چار فرشتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے چار چہرے ہیں: ایک انسان کا چہرہ، ایک شیر کا چہرہ، ایک بیل کا چہرہ اور ایک گدھ کا چہرہ، پس وہ اس پر کھڑے ہیں حالانکہ وہ زمینوں اور آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سر کرسی کے نیچے ہیں اور کرسی عرش کے نیچے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی کرسی کو عرش کے اوپر رکھے ہوئے ہے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: اس میں اشارہ دو کرسیوں کی طرف

ہے ان میں سے ایک عرش کے نیچے ہے اور دوسری عرش پر رکھی ہوئی ہے۔

اور أسباط عن السدی عن ابی مالک اور عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرة الهمدانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرة الهمدانی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن ناس من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں ارشاد باری تعالیٰ وَسِعَ کُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت موجود ہے کہ آسمان وزمین کرسی کے درمیان میں ہیں اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔ اور محمد بن اس کو بادشاہ کی عظمت اور جلالت سلطان پر محمول کرتے ہیں اور وہ عرش و کرسی کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اور اہل حق ان دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں بڑی وسعت ہے اور اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے اور اس کی کجاوے کے چرچانے کی طرح چرچاہٹ ہے۔

علامہ بیہقی نے کہا: ہم نے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا معنی جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عرش سے (نیچے) رکھی ہوئی ہے (جیسے) تحت سے قدم رکھنے کی جگہ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے مکان کا اثبات نہیں ہے۔ اور حضرت ابن بریدہ نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا: جب حضرت جعفر بن محمد جثہ سے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ”کیا تم نے کوئی انتہائی تعجب خیز شے دیکھی ہے؟“ انہوں نے کہا: میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے اس کے سر پر کھانے کا ایک ٹوکرا ہے۔ پس ایک شہسوار گزرا اور اس نے وہ ٹوکرا گرا دیا۔ پس وہ عورت بیٹھ گئی اور اپنا کھانا (طعام) جمع کرنے لگی۔ پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے کہا: تیرے لئے اس دن ہلاکت اور بربادی ہو جس دن بادشاہ اپنی کرسی رکھے گا اور وہ مظلوم کے لئے ظالم کو پکڑے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: لَا قُدْرَتَ اُمَّةٍ (امت پاک کردی گئی) یا فرمایا: کیف تقدس اُمَّةٍ (امت کیسے پاکی بیان کرتی ہے)..... اس کا کمزور اس کے طاقتور سے اپنا حق نہیں لے سکے گا (1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے۔ ”کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے“ وہ مراد یہ لیتے ہیں (کہ کرسی) عرش رحمن سے اس طرح ہے جیسے بادشاہوں کے تختوں سے قدم رکھنے کی جگہ ہوتی ہے اور یہ عرش کے سامنے بہت بڑی مخلوق ہے اور اس کی نسبت عرش کی طرف ایسے ہی ہے جیسے کرسی کی نسبت بادشاہ کے تخت کی طرف ہے۔

اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے کہ کرسی سے مراد نفس عرش ہے۔ اور یہ قول پسندیدہ نہیں ہے اور جس کا تقاضا احادیث کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ کرسی عرش کے سامنے پیدا کی گئی ہے اور عرش اس سے بڑا ہے (2)۔

اور ابو ادریس خولانی نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم سب سے عظیم آیت کون سی ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آیتہ الکرسی (3) پھر فرمایا:

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342، دار الکتب العلمیہ

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الخلائق، صفحہ 375، حدیث نمبر 9054

3۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 457

... اے ابو ذر! (بیٹھ) سات آسمانوں کو کرسی کے ساتھ ایسی ہی نسبت ہے جیسے وسیع زمین پر پھینکی ہوئی انگوٹھی کے حلقہ کو اس کے ساتھ ہوتی ہے اور عرش کو کرسی پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی وسیع زمین کو انگوٹھی کے حلقہ پر ہوتی ہے۔ "اسے آجری، ابو حاتم ہستی نے اپنی صحیح مسند میں اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔

اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: ساتوں آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں وسیع زمین میں پھینکی ہوئی انگوٹھی کے حلقہ کی طرح ہیں۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے عظیم ہونے کے بارے میں آگاہ کرتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ اس امر عظیم کی حفاظت اسے نہیں تھکاتی۔

اور یُوُودُ کا معنی ہے وہ اسے بھاری اور بوجھل بنا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے: آدنی الشئ بمعنی أثقلنی۔ اس نے مجھے تھکا دیا اور میں نے اس سے مشقت برداشت کی۔ اسی کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ علیہما وغیرہم نے اس لفظ کی تفسیر بیان کی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ اس میں ہا ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ کرسی کے لئے ہو۔ اور جب کرسی کے لئے ہوگی تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کے امر میں سے ہے (یعنی کرسی)..... اور العلیٰ اس سے مراد قدر و منزلت کی بلندی ہے نہ کہ مکان کی بلندی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جگہ اور مکان سے منزہ اور پاک ہے۔

اور علامہ طبری نے ایک قوم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی مخلوق سے بلند ہے کیونکہ اس کا مکان اپنی مخلوق کی جگہوں سے بلند ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جسم ماننے والے جہلاء کا قول ہے اور اصل یہی ہے کہ اسے بیان نہ کیا جائے (1)۔ اور عبد الرحمن بن قرط سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج آسمانوں کی بلندیوں میں تسبیح سنی: سبحان اللہ العلیٰ الاعلیٰ سبحانہ و تعالیٰ اور العلیٰ و العالیٰ ان کا معنی ہے اشیاء پر بہت سخت غلبہ رکھنے والا۔ عرب کہتے ہیں: علا فلان فلانا۔ یعنی فلاں فلاں پر غالب آگیا۔ شاعر نے کہا ہے:

فلما عَلَوْنَا وَ اسْتَوَيْنَا عَلَيْهِمْ تَرَکْنَا هُمْ صَرَعى لِنَسْبِ و کاسِ

پس جب ہم غالب آئے اور ہم نے انہیں خوب ہلاک کیا تو ہم نے ان کے مردوں کو گدھوں اور عقابوں کے لئے چھوڑ دیا اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: اِنْ فِرْعَوْنُ عَلَا فِی الْاَرْضِ۔

العَظِیْمُ۔ یہ صفت ہے۔ اس کا معنی ہے قدر و منزلت اور شرف کے اعتبار سے عظیم۔ یہ اجسام کی عظمت کے معنی میں نہیں ہے۔ علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ العظیم بمعنی المعظم ہے (جس کو عظمت دی جائے) جیسے کہا جاتا ہے: معتیق بمعنی معتق ہے اور اُشّی کا شعر ہے:

فَكَانَ الْخَمْرُ الْعَتِیقَ مِنَ الْاِسِّ فَنِطَ مَزْوَجَةً بِسَاءِ زُلَالٍ (2)

گویا کہ وہ شراب جو اسفط (شراب کی ایک قسم) سے آزاد ہے در آنحالیکہ وہ میٹھے پانی سے ملی ہوئی ہو۔ اور ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اگر یہ بمعنی معظم ہو تو پھر لازم آتا ہے کہ وہ مخلوق

کو پیدا کرنے سے پہلے اور اسے فنا کرنے کے بعد عظیم نہ ہو کیونکہ اس وقت اسے عظیم بنانے والی کوئی شے نہیں (1)۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمَرْ

بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَبِيْعٌ عَلِيمٌ ﴿٣١﴾

”کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں۔ بے شک خوب واضح ہو گئی ہے ہدایت گمراہی سے۔ تو جو انکار کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ تو اس نے پکڑ لیا مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ اس آیت میں دین سے مراد وہ ہے جس کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور وہ ملت ہے اور اس پر قرینہ یہ ارشاد ہے: قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ اور اکرادہ جو ایمان، بیوع، ہبات وغیرہ احکام میں سے ہے یہ اس کا محل نہیں ہے، اس کی بحثِ اَلَا مَنِ الْكِرَاهُ (مگر وہ جسے مجبور کیا جائے) کی تفسیر میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابو عبد الرحمن نے قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ پڑھا ہے اور اسی طرح حسن اور شعبی سے بھی روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: رَشَدٌ يَزُشْدُ رُشْدًا، اور رَشَدٌ يَزُشْدُ رَشْدًا جب آدمی اس شے تک پہنچ جائے جسے وہ پسند کرتا ہے اور غویٰ اس کی ضد ہے۔ نحاس سے یہی منقول ہے۔ ابن عطیہ نے ابو عبد الرحمن السلمی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے الرشاد الف کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن سے الرشداء اور شمین کے ضمہ کے ساتھ بھی مروی ہے (2)۔

الْغَيُّ یہ مصدر ہے غَوَى يَغْوِي سے۔ جب کوئی آدمی اعتقاد یا رائے میں گمراہ ہو جائے اور یہ مطلقاً نہیں کہا جاسکتا اَلْغَيُّ فِي الضَّلَالِ۔ (غی گمراہی میں ہے)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں چھ اقوال ہیں:

(1) کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو دین اسلام پر مجبور کیا اور ان سے لڑائیاں کیں اور آپ ان سے اسلام کے بغیر کسی پر راضی نہ ہوئے۔ سلیمان بن موسیٰ نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اسے اس ارشاد سے منسوخ کر دیا ہے: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ (التوبہ: 73) (اے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بہت سے مفسرین سے یہی مروی ہے۔

(2) یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ صرف اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی کہ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جب وہ جز یہ ادا کریں اور وہ لوگ جن پر زبردستی کی جائے گی وہ بت پرست ہیں۔ سو ان سے اسلام کے سوا کوئی شے قبول نہیں کی جائے گی اور انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ۔ یہ حضرات شعبی، قتادہ، حسن اور ضحاک رحمہم کا قول ہے اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ

2۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 344، دار الكتب العلمية

1۔ جامع البيان للطبري، جلد 3، صفحہ 19، دار احياء التراث العربیہ

سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سنا، آپ بوڑھی نصرانی عورت کو کہہ رہے تھے: اے بڑھیا! تو اسلام قبول کر لے تو محفوظ ہو جائے گی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اس نے جواب دیا: میں انتہائی بوڑھی عورت ہوں اور موت میرے بہت قریب ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! گواہ رہنا اور پھر یہ آیت تلاوت کی: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ الْآيَةُ۔

(۳) وہ قول ہے جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک عورت مقتلات (وہ عورت جس کا بچہ زندہ نہ رہے) ہوتی تھی، پس وہ اپنے اوپر یہ لازم کر لیتی تھی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنائے گی۔ پس جب بنو نضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان سے انصار کے بہت سے بچے تھے۔ تو انہوں نے کہا: ہم اپنے بچے نہیں چھوڑیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ لَقَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ ابوداؤد نے کہا ہے: مقتلات وہ عورت ہوتی ہے جس کا بچہ زندہ نہ رہتا ہو (1)۔

ایک روایت میں ہے: بلاشبہ ہم نے کیا جو ہم نے کیا اور ہم گمان کرنے لگے کہ ان کا دین اس سے افضل ہے جس پر ہم ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام عطا فرمایا تو ہم انہیں اس پر مجبور کرنے لگے تب لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ نازل ہوئی (یعنی) جو چاہے وہ ان کے ساتھ مل جائے اور جو چاہے وہ دین اسلام میں داخل ہو جائے۔ یہ قول حضرت سعید بن جبیر، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہم اللہ کا ہے، مگر آپ نے یہ بھی کہا ہے: انصار کے بچوں کا بنی نضیر میں ہونے کا سبب رضاعت تھا (یعنی دودھ پلانے کے لئے بچے ان کے پاس چھوڑے گئے تھے)۔

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول صحت اسناد کی وجہ سے تمام اقوال سے اولیٰ اور ارجح ہے اور یہ کہ اس کی مثل قول فقط رائے سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) سدی نے کہا ہے: یہ آیت انصار میں سے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، اسے ابو حصین کہا جاتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ شام سے کچھ تاجر زیتون کا تیل لے کر مدینہ طیبہ آئے اور جب انہوں نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا تو حصین کے دونوں بیٹے ان کے پاس آئے اور انہوں نے ان دونوں کو نصرانیت کی دعوت دی، سو وہ دونوں عیسائی ہو گئے اور ان کے ساتھ شام چلے گئے تو ان کا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کے معاملے کی شکایت لے کر حاضر ہوا اور اس نے یہ خواہش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا آدمی بھیج دیں جو انہیں واپس لوٹا لائے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ اور اس وقت تک اہل کتاب کے ساتھ لڑنے کے بارے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اور آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو دور کر دیا ہے وہ دونوں کفر کرنے والوں میں اول ہیں۔“ پس ابو حصین کے دل میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں (کچھ ملال سا) پیدا ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلاش میں کوئی آدمی نہ بھیجا تو اللہ تعالیٰ جل ثناؤہ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَلَا وَرَءَاكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمُ الْآيَةُ (النساء: 65) پھر اللہ تعالیٰ نے لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کو منسوخ کر دیا اور اہل

کتاب کے ساتھ لڑائی کرنے کے بارے سورہ برأت میں حکم ارشاد فرمایا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: فَلَا وَرَیْکَ لَا یُؤْمِنُونَ کے سبب نزول کے بارے میں صحیح حضرت زبیر کا اپنے پڑوسی انصاری (1) کے ساتھ پانی والا واقعہ ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورہ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ۔

(۵) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جو تلوار کے خوف سے اسلام لائے تم اسے مُجْبَر اور مُکْرَہ نہ کہو۔ یہی ان میں پانچواں قول ہے۔

(۶) اور چھٹا قول یہ ہے کہ یہ آیت قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب وہ اہل کتاب میں سے ہوں کہ ان پر زبردستی نہ کی جائے جب وہ بڑے ہوں اور اگر وہ مجوسی ہوں چھوٹے ہوں یا بڑے یا بت پرست ہوں تو بلاشبہ انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے گا، کیونکہ جس نے انہیں قیدی بنا رکھا ہے وہ ان سے ان کے بت پرست ہونے کے ساتھ کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جاتا اور ان کی عورتوں سے وطی نہیں کی جاسکتی اور وہ مردار کھانے اور دیگر نجاستوں کے بارے اعتقاد رکھتے ہیں۔ مالک ان کے لئے انہیں نجس سمجھے گا اور ملک کے اعتبار سے ان سے نفع اٹھانا اس پر معتذر ہو جائے گا۔ نتیجہ اس کے لئے زبردستی کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے اور رہے اشہب تو انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے دین پر ہوں گے جس نے انہیں قیدی بنایا ہے۔ پس جب وہ انکار کریں تو انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے اور چھوٹوں کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ اسی لئے انہیں دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ کسی باطل دین کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔

پس تمام کی تمام انواع کفر جب جزیہ دینے لگیں تو ہم انہیں اسلام پر مجبور نہ کریں گے چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی، قریشی ہوں یا کوئی اور..... اس کا بیان آگے آئے گا۔ علماء نے جزیہ کے بارے میں جو کہا ہے اور جس سے جزیہ قبول کیا جائے گا اس کا بیان سورہ برأت میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قوله تعالیٰ: فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ۔ شرط کی وجہ سے فعل کو جزم دی گئی ہے۔ الطاغوت مؤنث ہے طغی یطغی سے۔ اور علامہ طبری نے یطغو بیان کیا ہے۔ جب کوئی حد سے اس پر زیادتی کرتے ہوئے تجاوز کر جائے (2) اور اس کا وزن فعلوت ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ مفرد مذکر اسم ہے گویا کہ یہ اسم جنس ہے اور قلیل و کثیر کے لئے واقع ہوتا ہے اور ابوعلی کا مذہب یہ ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا رَهْبُوت اور جَبْرُوت۔ اور اس کے ساتھ واحد اور جمع کی صفت لگائی جاسکتی ہے اور اس کے لام کلمے کو عین کلمے کی جگہ اور اس کے عین کو لام کی جگہ بدل دیا گیا ہے جیسا کہ جبذ اور جذب میں ہے۔ پھر واؤ کو متحرک ہونے اور اس کے ماقبل کے متحرک ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا ہے اور طاغوت کہا گیا ہے۔ اس قول کو نحاس نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 343، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، باب سکر الانہار، حدیث نمبر 2187، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 25، دار احیاء التراث العربیہ

اختیار کیا ہے اور کہا گیا ہے: طاغوت کی اصل لغت میں الطُغیان سے ماخوذ ہے اور یہ بغیر اشتقاق کے اپنا معنی ادا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: لآل یہ اللؤلؤ سے ہے۔

اور مبرد نے کہا ہے: یہ جمع ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے (1)۔

جوہری نے کہا ہے: الطاغوت سے مراد کابن، شیطان اور ہر وہ ہے جو گمراہی میں سردار ہو اور کبھی یہ واحد ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يُرِيدُونَ أَنْ يُتَّحَاكُمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا (النساء: 60) ((اس کے باوجود)) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لئے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا۔) اور کبھی جمع ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُولَئِكَ هُمُ الطَّاغُوتُ (البقرہ: 257) ((ان کے ساتھی شیطان ہیں۔)) اور اس کی جمع طواغیت آتی ہے اور وَيُؤْمِنُ بِاللّٰهِ يَمْعُوفُ ہے۔ اور فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ یہ جواب شرط ہے اور الْوُثْقَىٰ کی جمع الْوُثْقَىٰ ہے جیسا کہ الْفُضْلُ کی جمع الْفُضُلُ ہے۔ اور الْوُثْقَىٰ، فُعْلُ کے وزن پر الوثاقۃ سے ہے اور یہ آیت تشبیہ ہے اور مشبہ بہ کے بارے میں مفسرین کی عبارت مختلف ہے۔

پس حضرت مجاہد نے کہا ہے: العروۃ سے مراد ایمان ہے اور سدی نے کہا: اسلام ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اور یہ سب عبارات ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں۔ پھر فرمایا: لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (2) حضرت مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو تبدیل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو تبدیل کر لیں یعنی ان سے ایمان کا نام زائل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ کافر ہو جائیں۔

اور الانفصام کا معنی ایسا ٹوٹنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی نہ ہو۔ اور القصم کا معنی، ایسا توڑنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی بھی ہو۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ”پس آپ ﷺ سے وحی ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی پسینے سے شرابور ہوتی (3)۔“ یعنی پیشانی پسینہ چھوڑ رہی ہوتی تھی۔

جوہری نے کہا: فصم الشئ اس نے اسے توڑ دیا اسے جدا کیے بغیر۔ آپ کہتے ہیں: فصمتہ فانقصم میں نے اسے توڑا تو وہ ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا انْفِصَامَ لَهَا اور اس کی مثل توڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ ذوالرمہ نے ہرن کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے وہ اسے چاندی کے بازو بند کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے:

كَأَنَّهُ دُمْنَجٌ مِنْ فِصَّةِ نَبْءٍ فِي مَلْعَبٍ مِنْ جَوَارِي الْحَيِّ مَفْصُومٍ

بے شک اس نے اسے مفصوم قرار دیا ہے اس کے مڑنے اور ٹیڑھا ہونے کے سبب جب وہ سوتا ہے۔ اور مقصوم قاف کے ساتھ نہیں کہا اس لئے کہ یہ دو حصوں میں بٹ جانا ہوتا ہے۔ اور اقصم البطر کا معنی ہے بارش تھم گئی۔ اور اقصیت عنہ الحتی (اس سے بخارا تر گیا) اور جب کفر شیطان کے ساتھ ہے اور ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جس کا زبان اقرار کرتی ہے

اور دل اعتقاد رکھتا ہے تو نطق کے سبب صفات میں سے سَیِّئٌ اور اعتقاد کی وجہ سے صفات میں سے عَلَیْمٌ ذکر کی گئی ہے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
أُولَئِيهِمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٥﴾

”اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف۔ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں، نکال لے جاتے ہیں انہیں نور سے اندھیروں کی طرف۔ یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“

قولہ تعالیٰ: اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا، الْوَلِيُّ فاعِل کے وزن پر بمعنی فاعل ہے۔ علامہ خطابی نے کہا ہے: الولی الناصرینصر عبادہ المؤمنین۔ یعنی الولی کا معنی مددگار ہے وہ اپنے مومن بندوں کی مدد فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (اللہ تعالیٰ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف۔) اور مزید فرمایا: ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكُفْرَيْنَ لَا مَوْلَى لَهُمْ ۝ (محمد) (یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے اور کفار کا کوئی مددگار نہیں۔)

حضرت قتادہ بنیہ نے کہا ہے: الظلمات سے مراد گمراہی اور نور سے مراد ہدایت ہے اور اسی معنی کو ضحاک اور ربیع نے بیان کیا ہے۔

اور حضرت مجاہد اور عبدہ بن ابی لبابہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا یہ ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے اور جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا۔ پس یہی انہیں نور سے اندھیروں کی جانب نکالنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا یہ اعتقاد رکھنے والے نے نور معتقد میں محفوظ رکھ دیا اور اس سے اندھیروں کی جانب نکل گیا۔ آیت کا لفظ اس تخصیص سے مستغنی ہے، بلکہ یہ تو ہر کفر کرنے والی جماعت میں مترتب ہوتا ہے جس کے بعض افراد ایمان لے آئے ہوں جیسا کہ عرب (1)، اس لئے کہ ان میں سے جو ایمان لایا اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہے اور اس نے اسے کفر کی تاریکی سے نور ایمان کی طرف نکال دیا اور جس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم داعی مرسل کی تشریف آوری کے بعد کفر کیا تو اس کا شیطان اسے گمراہ کرنے والا ہے، گویا کہ اس نے اسے ایمان سے نکال دیا، جبکہ وہ اس کے لئے تیار اور اس میں داخل ہونے کے اہل تھا اور اس نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے جہنم میں داخل ہونے کا حکم لگا دیا، ایمان سے پھیرتے ہوئے۔ اس سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کرتا ہے۔

اور حسن نے اُولَیَّاءُ هُمُ الظَّوَّاعِیْتُ پڑھا ہے، مراد شیاطین ہیں۔ واللہ اعلم

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّي
الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي
بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥﴾

”کیا نہیں دیکھا آپ نے (اے حبیب!) اسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس
وجہ سے کہ دی تھی اسے اللہ نے بادشاہی۔ جب کہ کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے (اسے) کہ میرا رب وہ ہے جو
جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ
اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے۔ (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے اور اللہ
تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: أَلَمْ تَرَ یہ الف توقیفی ہے اور کلام میں تعجب کا معنی ہے یعنی انہوں نے اس کو تعجب میں ڈال
دیا اور فرما دیا کہ: أَلَمْ تَرَ بمعنی ہل رأیت ہے یعنی کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا
کیا اور کیا آپ نے اسے دیکھا جو بستی کے پاس سے گزرا اور وہ نمرود بن کوثر بن کنعان بن سام بن نوح اپنے زمانے کا بادشاہ
اور آگ اور مچھر والا تھا۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ربیع، حضرت سدی، حضرت ابن
اسحاق اور حضرت زید بن اسلم وغیرہم رحمہم اللہ علیہم کا ہے (1) اور اسے ہلاک کرنے کا واقعہ یوں ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے
ساتھ جنگ لڑنے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر پچھروں کا ایک باب کھول دیا۔ پس انہوں نے سورج کو ڈھانپ لیا اور اس
کے لشکر کو کھانے لگے اور انہوں نے سوائے ہڈیوں کے اور کچھ نہ چھوڑا اور ان میں سے ایک اس کے دماغ میں داخل ہو گیا اور
اسے کھا ڈالا یہاں تک کہ وہ چوہیا کی مثل ہو گیا اور اس کے بعد اس کے نزدیک لوگوں میں سے سب سے معزز وہ تھا جو اس کے
دماغ پر بھاری ہتھوڑے کے ساتھ مارتا تھا۔ پس چالیس دن تک وہ اس آزمائش اور مصیبت میں مبتلا رہا۔

ابن جریج نے کہا ہے: زمین میں وہ پہلا بادشاہ تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول مردود ہے۔

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: وہ پہلا حکمران ہے جس نے جبر و استبداد اور رعونت و سرکشی اختیار کی اور وہی بائبل میں صاحب
الصرح (محل کا مالک) تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ پوری دنیا کا حکمران تھا اور یہ دو کافر بادشاہوں میں سے ایک ہے اور دوسرا
بخت نصر ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تھا وہ نمرود بن فالح بن عابر بن شالح بن ارفخشذ بن سام تھا۔ اس تمام کو ابن عطیہ نے بیان کیا ہے (1)۔

اور سہیلی نے بیان کیا ہے کہ وہ نمرود بن کوش بن کنعان بن حام بن نوح تھا اور وہ سواد عراق کا بادشاہ تھا اور اسے اس ضحاک نے حکمران بنایا تھا جو از دھاق سے معروف تھا اور اس کا نام بیوراسب بن اندراست تھا اور وہ تمام سلطنتوں کا بادشاہ تھا اور یہ وہی ہے جسے افریدون بن اثفیان نے قتل کیا تھا اور اس بارے میں حبیب کہتا ہے:

وَ كَانَهُ الضَّحَاكُ مِنْ فَتَكَاتِهِ فِي الْعَالَمِينَ وَأَنْتَ أَفْرِيدُونُ

ضحاک سرکش اور جابر حکمران تھا اور اس کی حکومت ہزار برس تک رہی جس بارے میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ پہلا حکمران ہے جس نے سولی دی اور پہلا حکمران ہے جس نے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور نمرود کا صلیبی بیٹا تھا اس کا نام ”کوش“ تھا یا اس نام کی طرح کا کوئی نام تھا اور اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام نمرود الاصغر تھا اور نمرود الاصغر ایک سال تک حاکم رہا۔ اور نمرود الاکبر کی حکومت چار سو برس تک رہی جیسا کہ اس کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔

اس جھگڑے کے قصص میں دو روایتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے میلے کی طرف نکلے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں کے پاس گئے اور انہیں توڑ دیا۔ جب وہ واپس لوٹے تو آپ نے انہیں کہا: کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جو (نوٹ کر) گر جاتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: تو کس کی عبادت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: بے شک نمرود طعام (انا ج) ذخیرہ کر لیتا تھا اور جب انہیں طعام کی حاجت ہوتی تھی تو وہ اس سے اسے خریدتے تھے اور جب وہ اس کے پاس آتے تھے تو اسے سجدہ کرتے تھے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پاس گئے تو آپ نے اسے سجدہ نہ کیا تو اس نے کہا: تجھے کیا ہے کہ تو مجھے سجدہ نہیں کرتا؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ نمرود نے آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ یہ نمرود بیٹھ گیا اور لوگوں کو اہل و عیال کے لئے طعام لے جانے کا حکم دینے لگا۔ پس جب بھی کوئی قوم آتی یہ ان سے پوچھتا: تمہارا رب اور تمہارا الہ کون ہے؟ تو وہ کہتے: تو ہے، تو یہ کہتا: تم انہیں طعام دے دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے اہل و عیال کو طعام مہیا کرنے کے لئے اس کے پاس آئے تو اس نے آپ سے کہا: تمہارا رب اور تمہارا معبود کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ جب نمرود نے یہ سنا تو اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کے معاملہ کے ساتھ اس کا معارضہ کیا تو وہ کفر اختیار کرنے والا متحیر ہو گیا اور اس نے کہہ دیا: تم اسے انا ج نہ دو۔ تو حضرت ابراہیم

علیہ السلام بغیر کسی شے کے واپس اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گئے۔ راستے میں آپ ریت کے ٹیلے کے پاس سے گزرے جو آٹے کی مثل تھا۔ تو آپ نے اپنے دل میں کہا: اگر میں اس سے اپنا بورا بھریوں تو جب میں اسے لے کر گھر داخل ہوں گا تو بچے خوش ہو جائیں گے یہاں تک کہ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ پس آپ وہ لے گئے، جب آپ اپنے گھر پہنچے تو بچے خوش ہو گئے اور وہ دونوں بوروں کے اوپر کھیلنے لگے اور آپ تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئے۔ تو آپ کی زوجہ محترمہ نے کہا: اگر میں آپ کے لئے کھانا تیار کر دوں جب آپ بیدار ہوں گے تو آپ اسے موجود پائیں گے (اور تناول فرمائیں گے)۔ چنانچہ اس نے ایک بور اکھولا تو انہوں نے اسے اس سے بھی اچھا پایا جتنا سفید آٹا ہوتا ہے اور پھر اس کی روٹیاں پکادیں اور جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو اس نے وہ کھانا آپ کے سامنے رکھ دیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ وہی آٹا ہے جو آپ لائے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جان گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آسانی پیدا فرمادی ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوبکر بن ابی شیبہ نے ابوصالح سے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام طعام لانے کے لئے چلے اور آپ اس پر قادر نہ ہو سکے، تو آپ سرخ موٹی ریت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس سے بورے بھر لیے اور پھر اپنے گھر والوں کی طرف واپس لوٹ آئے۔ تو انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ سرخ گندم ہے۔ پس انہوں نے اسے کھولا تو اسے سرخ گندم ہی پایا اور جب اس میں سے کچھ کاشت کی تو جڑ سے شاخ کے سرے تک سٹ نکلا جو دانوں سے بھرا ہوا تھا (2)۔

اور ربیع وغیرہ نے ان قصص میں کہا ہے کہ نمرود نے جب کہا میں جلاتا بھی ہوں اور مارتا بھی ہوں تو اس نے دو آدمیوں کو حاضر کیا، ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور کہا: تحقیق میں نے اسے زندہ کر دیا اور اسے مار دیا۔ اور جب آپ نے اس پر سورج کا معاملہ لوٹایا تو وہ مبہوت اور متحیر ہو گیا (3)۔ اور النخبر میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ میں سورج کو مغرب سے طلوع کروں گا تا کہ وہ جان لے کہ میں اس پر قادر ہوں (4)۔ پھر نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے حکم دیا تو انہیں آگ میں پھینک دیا گیا اور اسی طرح جابر حکمرانوں کی عادت ہے کہ جب کسی شے کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے اور دلیل لانے سے عاجز ہو جائیں تو وہ سزا دینے میں لگ جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے نجات عطا فرمائی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور سدی نے کہا ہے: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ سے نکلے تو انہوں نے آپ کو بادشاہ کے پاس پیش کر دیا۔ اور اس سے پہلے آپ کو اس پر پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اور اس نے آپ سے گفتگو کی۔ اور آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔ نمرود نے کہا: میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، میں چار

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دارالکتب العلمیہ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 346

2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 330، حدیث نمبر 31819، الزمان للشماعہ والعلوم مدینہ منورہ

4۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4269، منیاء القرآن پبلی کیشنز

آدمیوں کو پکڑوں گا اور انہیں ایک کمرے میں بند کر دوں گا اور وہ کوئی شے کھاپی نہیں سکیں گے یہاں تک کہ جب وہ بھوک سے نڈھال ہو جائیں گے تو میں انہیں نکال دوں گا اور دو کو کھانا وغیرہ کھلاؤں گا۔ پس وہ دونوں زندہ رہیں گے اور دو کو چھوڑ دوں گا اور وہ مرجائیں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطور معارضہ سورج کا معاملہ پیش کر دیا (کہ اگر وہ طاقت رکھتا ہے تو وہ سورج کو مغرب سے طلوع کرے) تو وہ متحیر و مبہوت ہو گیا۔

علمائے اصول نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب رب کریم کا وصف بیان کیا ایسی شے کے ساتھ جو اس کی صفت ہے یعنی احیاء (جلانا) اور اماتۃ (مارنا) لیکن یہ ایسا امر ہے جس کے لئے حقیقت اور مجاز دونوں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حقیقت کا قصد کیا (1) اور نمرود نے مجاز کی پناہ لی اور اپنی قوم پر جھوٹا امر پیش کر دیا۔ اور حضرت ابراہیم نے اسے بطور قیاس جدلی کے تسلیم کر لیا اور آپ اس کے ساتھ مثال سے منتقل ہو گئے اور اس کے سامنے ایک ایسا امر رکھ دیا جس میں مجاز نہیں ہے۔ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ یعنی اس کی دلیل اور حجت حکم سے کٹ گئی، ختم ہو گئی اور اس نے لئے یہ کہنا ممکن نہ رہا کہ میں سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہوں کیونکہ صاحب عقل و فہم اس کی تکذیب کر دیں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ کافر کو بادشاہ (مَلِك) کا نام دینا جائز ہے جب اللہ تعالیٰ دنیا میں اسے بادشاہی، عزت اور بلندی عطا کر دے اور یہ مناظرہ، مجادلہ اور حجت قائم کرنے کے اثبات پر بھی دلالت کرتی ہے۔ قرآن و سنت میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس پر کثیر دلائل موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (البقرہ) (آپ) (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو)

اِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ یعنی تمہارے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ جھگڑا اور بتوں کی عبادت کے بارے میں آپ کی جانب سے ان کا رد بھی بیان فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ الانبیاء وغیرہ میں ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا ہے: قَالُوا اَيْنٰنُوحٌ قَدْ جَدَلْتَنَا فَا كَثُرَتْ جِدَالِنَا فَا تَتَابِعُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱) قَالَ اِنَّمَا يَأْتِيْكُم بِهٖ اللّٰهُ اِنْ شَاءَ وَ مَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (۲) وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْ اِنْ اَرَادْتُ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳) اَمْ يَقُولُوْنَ افْتَرٰهُ قُلْ اِنْ افْتَرَيْتُهُ فَعَلٰى اِجْرَامِيْ وَ اَنَا بَرِيْءٌ مِّمَّا تُشْجِرُوْنَ (۴) (ہود) (وہ) (برا فروختہ ہو کر) بولے اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو) اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ مجادلہ ہے اس کا کئی آیات میں ذکر ہے۔ پس یہ سب کی سب اللہ کی جانب سے دین کے بارے میں سوال و جواب اور مجادلہ کی تعلیم ہے، کیونکہ حق اور باطل کے درمیان فرق ظاہر ہی نہیں ہوتا مگر تبھی جب حق کی دلیل ظاہر اور غالب ہو اور باطل کی دلیل فاسد ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے مجادلہ کیا اور حجت قائم کرنے کے بعد ان سے مباہلہ کیا، جیسا کہ اس کا بیان ”آل

جنہوں نے الف کو حذف کیا ہے تو انہوں نے تخفیف کے لئے اسے حذف کیا ہے کیونکہ فتح اس پر دلالت کرتا ہے۔
جوہری نے کہا ہے: اور رہا ان کا قول اُنَا تو یہ اسم کنایہ ہے اور یہ اکیلا متکلم کے لئے ہے اور یہ مبنی بر فتح ہے تاکہ اس کے اور
اُن حرف ناصب کے درمیان فرق ہو سکے اور آخر میں الف حالت وقف میں حرکت کے بیان کے لئے ہے اور اگر درمیان کلام
میں ہو تو یہ گر جاتا ہے سوائے لغت رویہ کے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

أَنَا سَيْفُ الْعَشِيرَةِ فَأَعْرِفُونِي حُمَيْدًا قَدْ تَذَرَيْتُ السَّنَامَا

اور بَہْت الرجل و بَہْت کا معنی ہے جب آدمی کے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہے اور وہ متحیر ہو کر خاموش ہو جائے۔ یہ
نحاس وغیرہ سے منقول ہے۔

اور علامہ طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے اور انہوں نے بعض عربوں سے اس معنی میں بَہْت یعنی با اور ہا کے فتح کے ساتھ بھی بیان کیا
ہے (1)۔ ابن حنی نے کہا ہے: ابو حیوہ نے فَبَہْت الَّذِي كَفَرَ یعنی ہا کے فتح اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی بَہْت
میں ایک لغت ہے۔ فرمایا: اور ابن السمیق نے فَبَہْت بَاء اور ہاء کے فتح کے ساتھ اس معنی پر پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ
السلام نے اسے متحیر کر دیا جس نے کفر کیا۔ پس الذی محل نصب میں ہے۔ فرمایا: اور یہ بھی جائز ہے کہ بَہْت فتح کے ساتھ بَہْت
میں ہی ایک لغت ہو۔

فرمایا: ابوالحسن اخفش نے فَبَہْت کی قراءت بیان کی ہے جیسا کہ غرق اور دَہْش۔

مزید کہا: اکثر نے ہا میں ضمہ پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ایک قوم نے اس کی قراءت کی تاویل کی ہے جنہوں نے
اسے فتح کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ بمعنی سَبَّ (گالی گلوچ دینا) اور قذف (تہمت لگانا) ہے۔ اور بلاشبہ نمرود ہی ہے جس نے
اس وقت گالیاں دیں جب اس کے دلائل ختم ہو گئے اور اس کے پاس کوئی حیلہ نہ رہا (2)۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَلِيَّ يَحْيٰ هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ
مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتُ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ
بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ
وَانْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِرُهَا ثُمَّ
نَكْسُوهُمَا لُحُومًا ۖ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۖ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

”یا (کیا نہ دیکھا) اس شخص کو جو گزرا ایک بستی پر در آنحالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل۔ کہنے لگا
کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد۔ سو مردہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک
پھر زندہ کیا اسے۔ فرمایا: کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا؟ اس نے عرض کی: میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ
حصہ۔ اللہ نے فرمایا: نہیں، بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سو سال اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور اپنے پینے (کے سامان)

کی طرف۔ یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور یہ سب اس لئے کہ ہم بنائیں تجھے نشانی لوگوں کے لئے اور دیکھ ان ہڈیوں کو کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں پھر (کیسے) ہم پہناتے ہیں انہیں گوشت، پھر جب حقیقت روشن ہوگئی اس کے لئے (تو) اس نے کہا میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

قوله تعالى: اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا۔ اَوْ معنى پر محمول کرتے ہوئے عطف کے لئے ہے اور امام کسائی اور فراء کے نزدیک تقدیر کلام یہ ہے: هل رأيت كالذي حاجه ابراهيم في ربه او كالذي مر على قرية۔ اور مبرد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الم ترالى الذی حاجہ ابراهيم فی ربه، الم تر من هو! كالذي مر على قرية۔ پس کلام میں مَن هو کے الفاظ مضمحل ہیں۔

ابوسفیان بن حسین نے اَوْ كَالَّذِي مَرَّ وَاوْ کے فتح کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ واو عاطفہ ہے اور اس پر الف استفہام داخل ہے جس کا معنی تقریر (1) (پختہ کرنا) ہے۔ اور القرية (یعنی خاص بستی) کو قرية (کوئی بستی) کا نام دیا گیا ہے اس لئے کہ اس میں لوگوں کا اجتماع تھا۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: قَوِيتُ الْمَاءَ یعنی میں نے پانی جمع کیا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ سلیمان بن بریدہ، ناجیہ بن کعب، قتادہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ربیع، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے جو اس بستی کے پاس سے گزرا تھا وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔

حضرات وہب بن منبہ، عبد اللہ بن عبید بن عمیر، عبد اللہ بن بکر بن مضر رحمہم اللہ نے کہا ہے: وہ ارمیاہ تھے اور وہ نبی تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: ارمیاہ ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ نقاش نے وہب بن منبہ سے اسے بیان کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے مگر یہ کہ وہ ایک نام ہو جو اس نام کے موافق ہو کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر تھے اور یہ جو اس بستی کے پاس سے گزرے وہ ان کے بعد کے زمانہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے جیسا کہ اسے حضرت وہب بن منبہ نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اگر خضر علیہ السلام ہی ارمیاہ ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ وہی ہوں کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے اب تک مسلسل موجود ہیں۔ اس بارے میں صحیح روایت اسی طرح ہے۔ اس کا بیان سورۃ الکہف میں آئے گا اور اگر وہ اس واقعہ سے پہلے وصال فرما چکے ہیں تو پھر ابن عطیہ کا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

نحاس اور مکی نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی تھا اس کا نام معلوم نہیں۔ نقاش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے وہ حضرت لوط علیہ السلام کا غلام تھا (2)۔

سہیلی نے قتبی سے بیان کیا ہے وہ ان کے دو قولوں میں سے ایک کے مطابق شعیا تھے اور وہ جس نے اس بستی کو برباد ہونے کے بعد زندہ (آباد) کیا تھا وہ کوٹک الفارسی ہے۔ اور حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ربیع بن انس وغیرہم کے قول کے مطابق وہ بستی جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیت المقدس ہے۔ فرمایا: وہ مصر سے آنے والا تھا اور اس کے جس طعام و

شراب کا ذکر کیا گیا ہے وہ سیزانجیر اور انگور اور چمڑے سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا برتن شراب کا تھا اور یہ بھی ہے کہ اس میں جوس تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پانی کا ایک مٹکا تھا یہی اس کی شراب تھی اور وہ جس نے اس وقت بیت المقدس کو خالی کرایا وہ بخت نصر تھا اور وہ عراق پر لہر اسب کی طرف سے پھریتا سب بن لہر اسب والد اسبند یاد کی جانب سے والی تھا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے کہا ہے: یہ ایک الٹی کی ہوئی بستی تھی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابوصالح کی روایت میں کہا ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل سے جنگ لڑی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو قیدی بنالیا۔ وہ انہیں لے کر آیا اور ان میں عزیر بن شرنیا بھی تھے اور وہ بنی اسرائیل کے علماء میں سے تھے۔ پس وہ ان کے ساتھ بائبل کی طرف آئے، وہ ایک دن اپنے کسی کام سے ہرقل کی عبادت گاہ کی طرف دریائے دجلہ کے کنارے پر نکلے۔ پس وہ درخت کے سائے میں اترے اور وہ اپنے ایک گدھے پر سوار تھے۔ انہوں نے درخت کے سائے میں گدھا باندھا پھر بستی کا چکر لگایا اور وہاں کوئی رہائشی نہ دیکھا اور یہ بستی اپنی چھتوں کے بل گری پڑی تھی تو کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی ہلاکت و بربادی کے بعد زندہ کرے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ وہ بستی ہے جس سے موت کے ڈر سے ہزاروں افراد نکلے۔

ابن زید نے یہی کہا ہے۔ اور ابن زید سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ لوگ جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے وہ ہزاروں تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم مر جاؤ، ان کے پاس سے کوئی آدمی گزرا در آنحالیکہ وہ خالی ہڈیاں تھے جو بالکل ظاہر تھیں۔ پس وہ آدمی کھڑے ہو کر دیکھنے لگا اور اس نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے سو برس تک مردہ رکھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن زید کی جانب سے یہ قول آیت کے الفاظ کے منقض ہے، کیونکہ یہ آیت ایسی بستی کو متضمن ہے جو گری پڑی ہے اور اس میں کوئی انیس و غمخوار نہیں ہے اور ہذا کے ساتھ اشارہ اسی بستی کی طرف ہے اور اسے زندہ کرنے سے مراد اسے آباد کرنا ہے اور اس میں عمارتوں اور رہنے والوں کا موجود ہونا ہے (1)۔

حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ربیع اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ بستی بیت المقدس ہے جبکہ اسے بخت نصر بابل نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اور طویل حدیث میں ہے کہ جس وقت بنی اسرائیل ایسے واقعات سے دوچار ہوئے تو ارمیاء یا عزیر اس بستی کے پاس ٹھہرے اور وہ بہت بڑے ٹیلے کی مانند تھی بیت المقدس کے وسط میں، کیونکہ بخت نصر نے اپنے لشکر کو اس کی طرف مٹی منتقل کرنے کا حکم دیا تھا یہاں تک کہ اس نے اسے پہاڑ کی طرح بنادیا اور ارمیاء نے گھروں کو دیکھا، ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ تو انہوں نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا۔

اور العریش کا معنی ہے: مکان کی چھت۔ اور ہر وہ شے جو اس لئے تیار کی جاتی ہے کہ وہ سایہ دے یا وہ چھپا لے تو وہ

عریش ہے اور اسی سے عریش الذالیہ بھی ہے (کنویں کی من) اور اسی سے رب کریم کا ارشاد بھی ہے: وَمِمَّا يَخْرِشُونَ۔
سدی نے کہا ہے: کہتے ہیں ہی ساقطۃ علی سقفہا، یعنی چھتیں گریں پھر ان پر دیواریں گر پڑیں۔ اسے طبری نے اختیار کیا
ہے اور سدی کے علاوہ دوسروں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ بستی لوگوں سے خالی ہے اور گھر قائم ہیں۔ اور خاویۃ کا معنی
خالیۃ (خالی ہونا) ہے۔ اور الخواء کا اصل (معنی) الخلو ہے۔ کہا جاتا ہے: خَوَالِدَارٌ وَخَوَيْتٌ تَخْوِي خَوَاءَ (یہ الف ممدودہ
کے ساتھ بھی ہے) وَخَوِيًا: أَقْوَتٌ یعنی گھر کا ساکنین سے خالی ہونا (1)۔ اور اسی طرح جب وہ ساقط ہو جائے، گر جائے اور
اسی معنی میں رب کریم کا یہ ارشاد ہے: قَتَلْنَاكَ بِبُيُوتِهِمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا (نمل: 52) اس میں خَاوِيَةً بمعنی خالیہ ہے۔
اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خَاوِيَةً بمعنی ساقطۃ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرْوَتِهَا یعنی وہ گرنے والی ہے
اپنی چھتوں پر۔

الخواء الجوع پیٹ کے غذا سے خالی ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور خَوَاتِ الْمَرْأَةِ اور خَوِيَتٌ بھی ہے خَوِيٌ یعنی عورت کا
پیٹ ولادت کے وقت خالی ہو گیا۔ اور خَوِيَتٌ لہا تخویۃ کہا جاتا ہے جب تو اس کے لئے کھانا تیار کرے جسے وہ کھائے گی اور
اس سے مراد طعام ہے۔ اور الخَوِيَةُ بَعِيلُ کے وزن پر ہے اور اس سے مراد زمین کا نشیبی ہموار حصہ ہے۔ اور خَوِيٌ الْبَعِيدُ جب
اونٹ کے بیٹھنے کے وقت اس کا پیٹ زمین سے دور ہو اور اسی طرح آدمی اپنے سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔
قولہ تعالیٰ: آتِي يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا اس کا معنی ہے: کون سے طریقے اور کون سے سبب سے اللہ تعالیٰ اسے موت کے
بعد زندہ کرے گا؟ ظاہر لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بستی کو آبادی اور مکینوں کے ساتھ زندہ کرنے کے بارے سوال ہے،
جیسا کہ اب ان خراب و برباد شہروں کے بارے کہا جاتا ہے جو آباد ہونے اور مکینوں سے دور ہوتے ہیں کہ یہ کیونکر اپنی بربادی
کے بعد آباد ہوں گے۔ گویا کہ یہ وہاں کھڑے ہونے والے کی طرف سے اظہارِ افسوس ہے جو اس شہر پر عبرت کی نظر ڈال رہا
ہے جس میں اس کے گھر والے اور اس کے دوست احباب موجود تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس کی ذات میں ایسی
شے سے مثال بیان فرمائی جو اس سے عظیم تر ہے جس کے بارے اس نے سوال کیا ہے اور وہ مثال جو اس کے لئے اس کی
ذات میں بیان کی گئی ہے وہ احتمال رکھتی ہے کہ اس کا سوال بنی آدم کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے ہو، یعنی اللہ تعالیٰ
کیونکر اس کے مردوں کو زندہ کرے گا (2)۔

علامہ طبری نے بعض سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: یہ قول احياء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک ہے اور اسی
لئے اس کی ذات میں اس کی مثال بیان کی گئی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک داخل نہیں
ہو سکتا کہ وہ بستی کو دوبارہ آباد کر کے اسے زندہ کر دے۔ بلاشبہ دوسری وجہ میں شک کا تصور صرف جاہل کی طرف سے کیا جاسکتا
ہے اور درست یہ ہے کہ آیت میں شک کی کوئی تاویل نہ کی جائے (3)۔

قولہ تعالیٰ: فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةً عَامٍ، مِائَةً يَهْ ظَرْفُ كِي بِنَاءٍ پَر مَنصُوبُ ہِے اور عام بمعنی سال ہے۔ کہا جاتا ہے: سنون

عُومَ یہ پہلے کی تاکید کے لئے ہے، جیسے کہا جاتا ہے: بَيْنَهُمْ شُغْلٌ شَاغِلٌ۔ اور عَجَاجٌ نے کہا ہے: مِنْ مَزَاعِمِ السَّنِينَ الْعُومِ اس میں العُوم السنین کی تاکید کے لئے ہے۔

اور یہ تقدیر میں عائم کی جمع ہے، مگر یہ مفرد مذکور نہیں ہوتا کیونکہ یہ اسم نہیں ہے بلکہ یہ تو تاکید ہے۔ جوہری نے یہی کہا ہے۔ اور نقاش نے کہا ہے: العام مصدر ہے جیسا کہ عوم مصدر ہے اور اس کے ساتھ سال بھر کے زمانے کا نام رکھا گیا ہے کیونکہ یہ سورج کے فلک میں گھومنے اور چکر لگانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور العوم، الشبَح کی طرح ہے (یعنی تیرنا) اور رب العالمین نے ارشاد فرمایا ہے: كُلُّ فِيْ فَلَكَ يَسْبَحُوْنَ ۝ (الانبیاء) (سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے ہیں۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ نقاش کے قول کے معنی میں ہے اور العام اس بنا پر القول اور القال کی طرح ہے اور اس امانت (مارنے) کا ظاہر معنی جسم سے روح کو نکالنا ہے اور اس آیت کے قصص میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اس کے لئے بھیجا جو اسے آباد کرے گا اور اس بارے میں اہتمام اور کوشش کرے گا، یہاں تک کہ اس کی آبادی کا کمال کہنے والے کو دوبارہ اٹھانے (زندہ کرنے) کے ساتھ ہوگا (1)۔ اور کہا گیا ہے کہ جب اس کی موت کو ستر برس گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ملوک فارس میں سے ایک عظیم بادشاہ بھیجا اسے کوشش کہا جاتا ہے تو اس نے اسے تیس سال میں آباد کر دیا۔

قوله تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا اس کا معنی ہے: پھر اس نے اسے زندہ کر دیا۔ اس کے بارے میں کلام ہو چکی ہے۔ قوله تعالیٰ: قَالَ كَمْ لَبِثْتَ۔ یہ قول کہنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ رب العالمین ہے اور اس نے اسے یہ نہیں کہا ”اگر تو سچا ہے“ جیسا کہ ملائکہ کو فرمایا تھا جیسا کہ پہلے بحث گزر چکی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس نے آسمان کی جانب سے ہاتف غیبی سے سنا وہ اسے یہ کہہ رہا ہے اور یہ بھی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اس سے مخاطب ہوئے۔ اور یہ بھی ہے کہ نبی علیہ السلام نے کہا۔ اور یہ بھی ہے کہ ایک مومن آدمی جو اس کی قوم میں سے تھا اور اس نے اسے مرتے وقت دیکھا تھا اور وہ اس کے زندہ ہونے کے وقت تک زندہ تھا تو اس نے اسے کہا: كَمْ لَبِثْتَ (کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اظہر بات یہ ہے کہ کہنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْصًا۔ واللہ اعلم۔

اہل کوفہ نے كَمْ لَبِثْتَ پڑھا ہے یعنی تانا کوتا میں قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ادغام کر دیا ہے کیونکہ ان دونوں کا مخرج طرف لسان اور ثنایا علیا کی جڑیں ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ دونوں حروف مہموں سے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: ثنا اور تانا کا مخرج جدا جدا ہونے کی وجہ سے اظہار احسن اور بہتر ہے اور کہا جاتا ہے: یہ سوال علی جہۃ تقریر فرشتے کے واسطے سے تھا۔ اور کم ظرف کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔ اس نے یہ قول اس بنا پر کیا جو اس کے نزدیک تھا اور جو اس کے گمان میں تھا اور اس بنا پر وہ اپنی خبر دینے میں جھوٹا نہیں ہو سکتا اور اسی کی مثل اصحاب کہف کا قول ہے: قَالُوا الْيُسْنَى يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف: 19) (بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ) بلاشبہ وہ تین سو نوے برس تک ٹھہرے رہے..... جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا..... اور وہ جھوٹے نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اس مدت کی خبر دی جو ان کے نزدیک تھی، گویا کہ انہوں نے کہا: جو ہمارے نزدیک ہے اور جو ہمارے گمان میں ہے (وہ یہ ہے) کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے۔ اور اس کی نظر ذوالیدین کے قصہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ہے: لَمْ أَقْصِرْ وَلَمْ أَنْسَ (1) (یعنی نہ نماز کم ہوئی اور نہ میں بھولا۔) اور لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے وہ اس بنا پر ہے کہ اس میں جھوٹ حقیقتاً موجود ہے لیکن اس کے سبب اس کا مواخذہ نہیں، ورنہ جھوٹ سے مراد کسی شے کے بارے میں ایسی خبر دینا ہے جو اس کی حقیقت کے خلاف ہو اور یہ علم اور جہالت کے سبب مختلف نہیں ہوتا اور یہ اصول کی نظر میں واضح اور بین ہے اور اس بنا پر جائز ہے کہ یہ کہا جائے: بے شک انبیاء علیہم السلام کسی شے کے بارے میں ایسی خبر دینے سے معصوم نہیں ہیں جو خلاف واقعہ ہو بشرطیکہ وہ بالقصد اور بالارادہ نہ ہو، جیسا کہ وہ سہو و نسیان سے معصوم نہیں ہیں۔ اور یہ وہ ہے جو اس آیت سے تعلق رکھتا ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ابن جریج، قتادہ اور ربیع نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے ایک دن صبح کو موت دی پھر اسے غروب آفتاب سے پہلے زندہ کر کے اٹھا دیا گیا تو اس نے اسے ایک دن گمان کیا اور کہا: میں ایک دن ٹھہرا، پھر اس نے سورج کو باقی دیکھا اور اسے جھوٹا ہونے کا خوف لاحق ہوا تو اس نے کہہ دیا: ”یادن کا کچھ حصہ“ تو اسے کہا گیا: ”بلکہ تو سو سال تک ٹھہرا رہا۔“ اور بستی کی آبادی، اس کے درخت اور اس کی ان عمارتوں کو دیکھا جو اس پر دال تھیں (2)۔

قوله تعالى: فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ۔ طعام سے مراد وہ انجیر ہے جو اس نے اس بستی کے درختوں سے جمع کیا تھا جس کے پاس سے گزرا تھا۔ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قراءت کی ہے وهذا طعامك وشرابك لم يتسنه (اور یہ تیرے کھانے اور تیرے پینے کا سامان ہے، یہ باسی نہیں ہوا) اور طلحہ بن مصرف وغیرہ نے اس طرح پڑھا ہے: وانظر لطعامك وشرابك لسنة (3) اور جمہور نے وصل کلام میں ہا کو ثابت رکھا ہے مگر اخوان (حزہ اور کسائی) اسے حذف کرتے ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس پر وقف ہا کے ساتھ ہے اور طلحہ بن مصرف نے بھی لم يتسن۔ وانظر پڑھا ہے سین میں تا کو مدغم کیا گیا ہے (4)۔ اور جمہور کی قراءت کے مطابق ہا اصل ہے اور ضمہ کو جزم کے سبب حذف کر دیا گیا ہے اور یہ يتسنه ہو جاتا ہے یہ السنہ سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ جوہری نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے سنون اور السنۃ یہ السنین کی واحد ہے۔ اور اس کے ناقص ہونے میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک کے مطابق یہ واوی ہے اور آخر میں ہا ہے۔ اور اس کی اصل سنۃ، جُبۃ کی مثل ہے کیونکہ یہ سنۃ النخلۃ و تسنۃ سے ہے جب اس پر کئی

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 181۔ ایضاً صحیح بخاری، باب هل يأخذ الامام الخ، حدیث نمبر 873، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 350

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دار الکتب العلمیہ

سال گزر جائیں۔ اور نخلۃ سنّاء یعنی درخت ایک سال بار آور ہوتا ہے اور دوسرا سال بار آور نہیں ہوتا۔ اور سنّہاء بھی ہے۔ جیسا کہ انصار میں سے کسی نے کہا ہے:

فَلَيْسَتْ بِسَنِّهَاءٍ وَلَا رُجْبِيَّةٍ وَلَكِنْ عَرَايَا فِي السِّنِّينِ الْجَوَائِحِ (1)

اور اسنہت عند بنی فلان تو اس کے پاس مقیم رہا، و تسنیت بھی ہے۔ اور استأجرته مساناة و مسانہۃ بھی ہے اور اس کی تصغیر سنّیۃ اور سنّیہۃ ہے۔

نحاس نے کہا ہے: جس نے لم یتسن اور انظر پڑھا ہے اس نے تصغیر میں سنّیۃ کہا ہے اور الف کو جزم کے لئے حذف کر دیا ہے اور وقف ہا پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: لم یتسنہ یہ با بیان حرکت کے لئے ہوتی ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ اس کی اصل سانیۃ مساناة سے ہے یعنی میں نے اس کے ساتھ یکے بعد دیگرے کئی سال معاملہ کیا۔ یا یہ سانہت (ہا کے ساتھ) سے ہے۔ پس اگر یہ سانیت سے ہو تو اس کی اصل یتسنی ہے اور الف جزم کی وجہ سے گر گئی۔ اور یہ اصل میں واوی ہے اور اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے سنوات اور اس میں ہا برائے سکتے ہیں اور اگر یہ سانہت سے ہو تو پھر ہا فعل کے لام کلمہ کی جگہ ہے اور سنۃ کی اصل اس بنا پر سنّہۃ ہے اور پہلے قول کی بنا پر سنّوۃ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اُسِنَ المَاءِ سے ماخوذ ہے۔ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب پانی متغیر ہو جائے اور اس بنا پر اس کا یتأسن ہونا لازم آتا ہے۔ ابو عمرو و الشیبانی نے کہا ہے: یہ اس ارشاد سے ہے حَمَاقَسُنُونِ ⑩ (الحجر) پس معنی ہے کہ وہ متغیر نہ ہوا۔ زجاج نے کہا ہے: اس طرح نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ مَسْنُونِ کا معنی متغیر (تبدیل شدہ) نہیں ہے بلکہ اس کا معنی زمین کی سبزی اور طراوت پر انڈیل دیا جانا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: شیبانی کے قول کے مطابق اس کی اصل یتسنن ہے۔ دونوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ اس میں تضعیف (مضعف ہونا) مکروہ ہے تو یہ یتسنی ہو گیا۔ پھر حالت جزمی میں الف کو گرا دیا گیا اور سکتہ کے لئے ہا داخل کر دی گئی۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: لَمْ يَتَسَّنْهُ کا معنی ہے: وہ بد بودار نہیں ہوا۔

نحاس نے کہا ہے: اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اصح یہ ہے کہ یہ السنۃ سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ السنۃ سے ہو اور اس کا معنی قحط سالی ہے۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ (الاعراف: 130) (اور بے شک ہم نے پکڑ لیا فرعونوں کو قحط سالی سے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِينَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ (2) (اے اللہ! ان پر قحط سالی مسلط کر دے حضرت یوسف علیہ السلام (کے زمانے) کے قحط کی طرح) اسی سے کہا جاتا ہے: اُسُنَّتِ الْقَوْمُ یعنی قوم قحط میں مبتلا ہو گئی۔ پس معنی یہ ہوگا: قحطوں اور خشک سالیوں نے تیرے طعام کو تبدیل نہیں کیا یا سالوں اور برسوں نے اسے متغیر نہیں کیا

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 46، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقواء، جلد 1، صفحہ 136، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تسمیۃ الولید، حدیث نمبر 5732، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی وہ اپنی طراوت اور عمدگی پر باقی رہا۔

قولہ تعالیٰ: **وَأَنْظُرْ إِلَىٰ جَنَاحَيْكَ**۔ حضرت وہب بن منبہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کی ہڈیوں کے جڑنے اور اس کے ایک ایک عضو کے زندہ ہونے کی طرف دیکھ۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی طرح زندہ کیا یہاں تک کہ وہ جڑی ہوئی ہڈیاں ہو گیا، پھر اس پر گوشت پیدا کر دیا یہاں تک کہ وہ کامل گدھا بن گیا۔ پھر اس کے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے اس میں روح پھونک دی تو گدھا کھڑا ہو کر بیٹنگنے لگا۔ یہی موقف اکثر مفسرین کا ہے۔

حضرت ضحاک اور حضرت وہب بن منبہ سے بھی یہ روایت کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے کہا، بلکہ اسے کہا گیا: تو اپنے گدھے کی طرف دیکھ در آنحالیکہ وہ اپنے باندھنے کی جگہ میں کھڑا ہے، سو برس میں اسے کوئی شے (آفت، تکلیف) نہیں پہنچی۔ اور وہ ہڈیاں جن کی طرف اس نے دیکھا ہے وہ اس کی اپنی ہڈیاں تھیں، اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں اور اس کے سر کو پہلے زندہ کر دیا اور ابھی اس کا سارا جسم مردہ تھا۔ ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارمیاء اور اس کے گدھے کی طرف اتنی طویل مدت تک دیکھنے سے اندھا کیے رکھا (1)۔

قولہ تعالیٰ: **وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ**۔ فراء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ **وَلِنَجْعَلَكَ** میں واو داخل کی گئی ہے اس پر دلالت کرنے کے لئے کہ یہ اپنے مابعد فعل کے لئے شرط ہے۔ اس کا معنی ہے: **وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ**، ودلالة على البعث بعد الموت جعلنا ذالك۔ (اور یہ سب اس لئے) (کہ ہم بنائیں تجھے لوگوں کے لئے نشان) اور ہم نے بعث بعد الموت پر بطور دلیل اسے بنایا ہے۔ اور اگر تو چاہے تو واو کو مقمہ زائدہ بنالے۔ اور اعمش نے کہا ہے: اس کے نشانی ہونے کا محل یہ ہے کہ وہ اپنی اسی حالت پر نو جوان اٹھا جس حالت پر وہ اس دن تھا جس دن فوت ہوا اور اس نے بیٹے اور پوتے بڑھاپے کی حالت میں پائے۔ حضرت عکرمہ نے کہا ہے: جس دن وہ فوت ہوا اس وقت اس کی عمر چالیس برس تھی (2)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عزیر اپنے گھر والوں سے نکلے اور پیچھے اپنی حاملہ بیوی چھوڑی۔ آپ کی عمر پچاس سال تھی اور اللہ تعالیٰ نے سو برس آپ کو مردہ حالت میں رکھا، پھر آپ کو اٹھایا اور آپ لوٹ کر اپنے گھر والوں کی طرف گئے اس حال میں کہ آپ پچاس سال کے جوان تھے اور آپ کا بیٹا سو برس کا تھا۔ پس آپ کا بیٹا آپ سے پچاس برس بڑا تھا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کو زندہ کیا تو وہ اپنے گدھے پر سوار ہوئے اور اپنے محلہ میں آئے تو نہ وہ لوگوں کو پہچان سکے اور نہ ہی لوگ انہیں پہچان سکے۔ اور انہوں نے اپنے گھر میں ایک نابینا بڑھیا کو پایا وہ ان کی کنیز تھی۔ جب حضرت عزیر ان سے نکلے تھے اس وقت اس کی عمر بیس برس تھی۔ تو آپ نے اسے فرمایا: کیا یہ عزیر کا گھر ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر وہ رونے لگی اور کہنے لگی: عزیر اتنے برس سے ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں عزیر ہوں، اس نے کہا: بلاشبہ عزیر تو سو برس سے ہم سے گم اور مفقود ہیں۔ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سو برس تک مجھے موت دیئے رکھی پھر اس نے مجھے زندہ فرما دیا ہے۔ بڑھیا نے کہا: عزیر تو مریض کے لئے مستجاب

الدعوات تھے اور کسی مصیبت و لذیت میں مبتلا آدمی افاقہ پالیتا تھا تو آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میری بصارت مجھے لوٹا دے۔ سو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ اسی جگہ صحت یاب ہو گئی، گویا اسے بیڑیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ تو وہ کہنے لگی: میں شہادت دیتی ہوں بلاشبہ تو عزیر ہے۔ پھر وہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف چل پڑی اور ان میں حضرت عزیر کا بوڑھا بیٹا بھی تھا اس کی عمر ایک سو اٹھائیس برس تھی اور اس کے بیٹوں کے بیٹے بھی بوڑھے تھے۔ تو بڑھیا نے کہا: اے قوم! یہ عجزیر ہے۔ تو آپ کا بیٹا لوگوں کے ساتھ آپ کی طرف آیا تو ان کے بیٹے نے کہا: میرے باپ کے دونوں کندھوں کے درمیان ہلال کی مثل سیاہ نشان تھا، سو اس نے اسے دیکھا تو وہ عزیر ہی تھے۔ اور کہا گیا ہے: آپ اس حال میں آئے کہ آپ کو پہچاننے والے تمام ہلاک ہو چکے تھے تو آپ ان کے لئے ایک نشانی تھے جو آپ کی قوم میں سے زندہ تھے کیونکہ آپ کے احوال سننے کے سبب وہ یقین رکھتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اتنی مدت آپ کو موت دینے میں اور پھر اس کے بعد آپ کو زندہ کرنے میں بہت عظیم نشانی ہے اور آپ کا سارا معاملہ آنے والے زمانے کے لئے علامت و نشانی ہے۔ بعض کو چھوڑ کر بعض کی تخصیص کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں (1)۔

قوله تعالى: وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا۔ علمائے کوفہ اور ابن عامر نے زاکے ساتھ قراءت کی ہے اور باقیوں نے را کے ساتھ اور ابان نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے نَشْرُهَا یعنی نون کے فتح، شین کے ضمہ اور را کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن اور ابو حبیہ نے قراءت کی ہے اور کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں احیاء (زندہ کرنے) کے معنی میں ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: رَجَعُوا وَرَجَعَتْهُ اور غاض الماء و غُفَّتْ، خَسِرَت الدابة و خَسِرْتَهَا، مگر لغت میں معروف یہ ہے: أَنشَر الله الموتى فنشروا، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا پس وہ زندہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ۖ (مبس) (پھر جب چاہے گا اسے زندہ کر دے گا) اور اس کا اٹھنا کپڑے کے اٹھنے (لپٹنے) کی مثل ہوگا۔ نَشْرُ الْمَيِّتِ يَنْشُرُ نُشُورًا یعنی مرنے والا موت کے بعد زندہ ہو گیا۔

اعشی نے کہا ہے:

حتى يقول الناس ما راؤا يا عَجَبًا للميت الناشِر (2)

یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے جو کچھ انہوں نے دیکھا موت کے بعد زندہ ہونے والے میت کا واقعہ کتنا عجیب ہے۔

گویا موت ہڈیوں اور اعضاء کو لپٹنے کا نام ہے اور احیاء اور اعضاء کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرنا نشر ہے۔

اور ربی نَشْرُهَا کی قراءت زاکے ساتھ تو اس کا معنی ہے: ”ہم انہیں اٹھاتے ہیں“ اور النَشْرُ کا معنی ہے: زمین کی بلند اور

اٹھی ہوئی جگہ۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تري الشعب الخوف فيها كأنه اذا ما علا نشراً حصان مجتل

اس میں نشراً بلند جگہ کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

2- جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربیہ

1- المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ

مکی نے کہا ہے: معنی یہ ہے تو ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم کیسے زندہ کرنے کے لئے ان میں سے بعض کو اٹھا کر بعض پر ترکیب کے ساتھ رکھتے ہیں، کیونکہ النشز کا معنی الار تفاع (بلند ہونا) ہے اور اسی سے المرأة النشوز ہے اس سے مراد ایسی عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ موافقت کرنے سے بلند ہوتی ہے۔ (یعنی اس کے ساتھ موافقت نہیں کرتی) اور اسی سے رب العالمین کا یہ ارشاد ہے: وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانشُرُوا (المجادلہ: ۱۱) (اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو کرو) یعنی تم اٹھو اور مل جاؤ۔ اور یہ بھی ہے کہ را کے ساتھ قراءت ہو تو معنی احياء (زندہ کرنا) ہے۔ اور ہڈیاں انفرادی طور پر زندہ نہیں ہوتیں یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور ز ا اس معنی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ بمعنی انضمام (ملنا) ہے نہ کہ بمعنی احياء۔ پس احياء کے ساتھ آدمی متصف ہے نہ کہ انفرادی طور پر ہڈیاں اور یہ نہیں کہا جاسکتا: هذا عظم حي (یہ زندہ ہڈی ہے)۔ لہذا معنی یہ ہوا: پس تو دیکھ ہڈیوں کی طرف ہم کیسے انہیں زمین میں ان کی جگہوں سے جسم کی طرف اٹھاتے ہیں (جس) جسم والے کو زندہ کرنا مقصود ہے۔

اور نخعی نے نشز ہا نون کے فتح، شین کے ضمہ اور ز ا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے تشبیہ یا کے ساتھ قراءت کی ہے۔

اور کسوف سے مراد وہ کپڑے ہیں جو ڈھانپ لیں اور گوشت کو ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور لبید نے اسلام کے لئے بطور استعارہ اسے استعمال کیا ہے۔ اور کہا ہے:

حَقِّ اِكْتَسَبَتْ مِنَ الْاِسْلَامِ سِرْبًا لَا (۱)

(یہاں تک کہ میں نے اسلام سے لباس پہن لیا، یعنی میں نے اسلام قبول کر لیا۔) اور یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اَعْلَمُ) میں ہمزہ قطعی ہے اور یہ روایت ہے کہ اللہ جل ذکرہ نے اس کے بعض (حصے) کو زندہ فرمایا پھر اسے دکھایا کہ اس نے اس کے بقیہ حصہ کو کیسے زندہ کیا ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ وہ دیکھنے لگا اللہ تعالیٰ کیسے بعض ہڈیوں کو بعض کے ساتھ جوڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب سے اول اس کے سر کو تخلیق فرمایا اور اسے کہا گیا: تو دیکھ، تو اس وقت اس نے کہا: اَعْلَمُ الف قطعی کے ساتھ، یعنی اَعْلَمُ هذا میں اسے جان گیا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ میں معنی یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے وہ شے اس کے لئے بالکل عیاں اور واضح ہو گئی جس سے وہ ناواقف تھا تو اس نے اپنے بالعمین دیکھنے کو قبول کر لیا اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہا: اَعْلَمُ۔ (میں جان گیا)

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ اس نے ایسی شے کو لازم کیا ہے لفظ جس کا تقاضا نہیں کرتا اور اس نے شاذ قول اور ضعیف احتمال کے مطابق تفسیر بیان کی ہے۔ یہ میرے نزدیک اس شے کے بارے میں اقرار نہیں ہے جس کا وہ اس سے پہلے

انکار کرتا تھا جیسا کہ علامہ طبری نے گمان کیا ہے، بلکہ یہ ایسا قول ہے جس پر اعتبار نے ابھارا ہے، جیسا کہ ایک بندہ مومن جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے کوئی عجیب و غریب شے دیکھے تو کہتا ہے: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ اور اسی طرح کے الفاظ۔

ابوعلیٰ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں علم کی اس قسم کو جان گیا جس کا علم میرے پاس نہ تھا (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم نے یہ معنی حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے اور اسی طرح مکی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ مکی نے کہا ہے: بلاشبہ جب اس نے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کر لیا تو اس نے اپنے بارے میں خبر دی، اور اسے مشاہدہ کے ساتھ اس کا یقین ہو گیا اور اس نے اقرار کر لیا کہ وہ جانتا ہے اللہ تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے، یعنی میں علم کی اس قسم کو جان گیا ہوں معائنہ کی بنا پر جسے میں پہلے نہ جانتا تھا اور یہ ان کی قراءت کے مطابق ہے جنہوں نے اَعْلَمُ الف قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ اکثر قراء ہیں۔ اور حمزہ اور کسائی نے حمزہ وصل کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے فرشتے نے کہا: اَعْلَمُ (تو جان لے) اور دوسری یہ کہ وہ اپنی ذات کو اجنبی اور منفصل مخاطب کے قائم مقام رکھے، تو معنی یہ ہو گا کہ جب اس کے لئے حقیقت روشن ہو گئی تو اس نے اپنے آپ کو کہا: اے نفس! تو جان لے یہ وہ علم یقینی ہے جسے تو بالعمین نہ جانتا تھا اور اس معنی کی مثل میں ابوعلیٰ نے کہا ہے:

وَذَعَّ هَرِيرَةً اِنْ الرُّكْبَ مَرْتَحِلَ اَلَمْ تَغْتَبِضْ عَيْنَاكَ لَيْلَةَ اُرْمَدَا
توبلی کو چھوڑ دے۔ بے شک قافلہ کوچ کرنے والا ہے۔ کیا تیری آنکھیں آشوب چشم والی رات بند نہیں ہوئیں
ابن عطیہ نے کہا ہے: ابوعلیٰ اس معنی میں شاعر کے قول سے مانوس ہوئے ہیں:

تَذَكَّرُ مِنْ اَنْتَ و مِنْ اَيْنَ شُرْبُهُ يَوْمَ اَمْرُ نَفْسِيهِ كَذِي الْهَجْمَةِ الْاَبْل (2)

مکی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اور یہ بعید ہے کہ یہ اس کے لئے اللہ جل ذکرہ کی جانب سے علم کے بارے حکم ہو۔ کیونکہ اس نے تو اس پر اپنی قدرت ظاہر فرمادی ہے اور اسے ایسا امر دکھا دیا ہے جس کی صحت کا اسے یقین حاصل ہو گیا اور اس نے قدرت کا اقرار کر لیا۔ لہذا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کے علم کے بارے حکم دے بلکہ اس کے بارے وہ اپنے آپ کو حکم دے رہا ہے اور یہ جائز اور حسن ہے۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حرف میں جو اس پر دلالت ہو رہی ہے کہ یہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کے بارے میں حکم ہے اس معنی میں کہ تو اس کے بارے میں علم کو لازم پکڑ لے اور یقین کر لے جب تو نے معائنہ کر لیا اور یقین کر لیا۔ اس لئے کہ ان کی قراءت میں ہے: قِيلَ اَعْلَمُ۔ اور یہ بھی کہ یہ اپنے ماقبل امر کے موافق ہے جو اس قول میں ہے: فَانْظُرْ اِلَى طَعَامِكَ اور فَانْظُرْ اِلَى حِمَايِكَ اور فَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ پس اسی طرح ہے۔ اَعْلَمُ اَنَّ اللہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پڑھتے تھے قِيلَ اَعْلَمُ اور کہتے تھے: کیا وہ بہتر ہے یا ابراہیم؟ کیونکہ انہیں کہا گیا: وَاَعْلَمُ اَنَّ اللہ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ☺ پس یہ واضح کرتا ہے کہ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا قول ہے جب اس نے احیاء (زندہ کرنے) کا معائنہ کر لیا۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۖ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾

”اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار! دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو۔ فرمایا: (اے ابراہیم) کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لئے ہے) تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل۔ فرمایا: تو پکڑ لے چار پرندے پھر مانوس کر لے انہیں اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا پھر بلا انہیں چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے۔“

لوگوں نے اس سوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے یہ شک کے سبب صادر ہوا یا نہیں؟ تو جمہور نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں کبھی شک لاحق نہیں ہوا۔ بلاشبہ آپ نے معائنہ کا مطالبہ کیا، وہ اس لئے کہ نفوس ہر اس شے کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کے بارے میں خبر دی جائے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: لیس الخبر کالمعاينة (1) (خبر معائنہ کی طرح نہیں ہے) اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے آپ کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا، ابو عمر نے یہی کہا ہے۔ امام خفیش نے کہا ہے: اس سے دل کی روایت مراد نہیں لی گئی بلکہ آپ نے آنکھ کے ساتھ دیکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور حضرت حسن، قتادہ، سعید بن جبیر اور ربیع رحمہم نے بیان کیا ہے: آپ نے سوال کیا تاکہ آپ کے یقین میں مزید اضافہ ہو جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں عنوان بنایا اور کہا: وقال آخرون سال ذالک ربہ، (لہذا شک فی قدرۃ اللہ تعالیٰ) اور دوسروں نے کہا: آپ نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا۔ اور انہوں نے اس عنوان کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول ذکر کیا ہے آپ نے فرمایا: میرے نزدیک قرآن کریم میں کوئی آیت اس سے زیادہ امید افزا نہیں۔

اور حضرت عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں وہ بعض داخل ہو گیا جو لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نحن أحق بالشك من إبراهيم، الحمدیث۔ (ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کے زیادہ حقدار ہیں)۔ پھر علامہ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں جبکہ انہوں نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟ تو رب کریم نے فرمایا: کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن سوال اس لئے ہے تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے اور اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے وہ رکن شدید (مضبوط شے) کی طرف پناہ لیتے تھے اور اگر میں قید میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں تو میں دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیتا (1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو علامہ طبری نے عنوان بنایا ہے میرے نزدیک وہ مردود ہے اور جو عنوان کے تحت انہوں نے ذکر کیا ہے اس کی تاویل کی گئی ہے۔ پس جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کا تعلق ہے: ہی ارجی آیت تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ پر اور دنیا میں مردوں کے زندہ کرنے کے سوال پر رہنمائی موجود ہے اور یہ اس وہم میں ڈالنے والی نہیں ہے اور آپ کا یہ کہنا جائز ہے: ہی ارجی آیت (یہ زیادہ امید دلانے والی آیت ہے) یعنی بلاشبہ ایمان کافی ہے یہ اپنے ساتھ کسی چھان بین اور بحث و تمحیص کا محتاج نہیں ہوتا۔

اور رہا حضرت عطا کا یہ قول: دخل قلب ابراہیم بعض ما يدخل قلوب الناس تو اس کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ شک کرنے والے ہوتے تو یقیناً ہم ان کی نسبت اس کا زیادہ حق رکھتے اور ہم شک نہیں کرتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہ زیادہ مناسب ہے کہ وہ شک نہ کریں (2)۔ پس حدیث طیبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی پر مبنی ہے اور وہ حدیث جس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذالک محض الایمان (3) (وہ خالص ایمان ہے) تو یہ ایسے خطرات (کھٹکنے والی چیزوں) کے بارے میں ہے جو ثابت نہیں رہتے اور رہا شک تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دو امروں کے درمیان توقف کرنا ہے جس میں ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ اور اس کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے نفی کی گئی ہے اور مردوں کو زندہ کرنا تو دلیل سمعی سے ثابت ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بارے زیادہ جانتے تھے اور اس پر آپ کا یہ قول تیری رہنمائی کرتا ہے: رَبِّی الَّذِی یُخِیِّ وَ یُحِیِّتُ اور اس پر شک کرنا اس کے لیے بعید ہے جس کا قدم فقط ایمان میں ثابت ہو تو جو مرتبہ نبوت اور خلت پر فائز ہو اس کے بارے شک کیسے ہو سکتا ہے اور انبیاء علیہم السلام تو کبار سے معصوم ہیں اور بالا جماع ان صغیرہ گناہوں سے بھی جن میں رذالت ہوتی ہے اور جب تو آپ علیہ السلام کے سوال اور آیت کے تمام الفاظ میں غور و فکر کرے گا تو وہ قطعاً شک پیدا نہیں کرتے اور وہ اس طرح کہ سوال کیف کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ سوال کسی شے کی حالت کے بارے ہوتا ہے جو موجود ہو اور سائل اور مسئول دونوں کے نزدیک اس کا وجود مقرر اور ثابت ہو۔ مثلاً تیرا یہ قول: کیف علم زید (زید کا علم کیسا ہے؟) کیف نسج الثوب (کپڑے کی بنائی کیسی ہے) اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔ اور جب تو نے کہا: کیف ثوبک؟ (تیرا کپڑا کیسا ہے) اور کیف زید؟ (زید کیسا ہے) تو بلاشبہ سوال ان کے احوال میں سے کسی حال کے بارے ہے اور کبھی کیف کسی شے کے بارے خبر دینے کے لئے ہوتا ہے جس کی شان یہ ہو

کہ اس کے بارے کیف سے سوال کیا جائے۔ جیسے تیرا یہ قول: کیف شئت فکُن۔ (جس حالت میں تو چاہے تو ہو جا) اور اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے: کیف کان بدء الوحی (وحی کا آغاز کیسے ہوا؟) اور اس آیت میں کَیْفَ زندہ کرنے کی ہیئت کے بارے سوال کرنے کے لئے ہے اور احياء (زندہ کرنا) متقرر اور ثابت شدہ امر ہے۔

لیکن جب ہم نے کسی شے کے وجود کا انکار کرنے والے بعض لوگوں کو پایا ہے کہ وہ اس کے انکار کو اس شے کی حالت کے بارے سوال سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ شے فی نفسہ صحیح نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دعویٰ کرنے والا یہ کہے: انا ارفع هذا الجبل، میں اس پہاڑ کو اٹھا سکتا ہوں۔ تو اسے جھٹلانے والا کہتا ہے: مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھا سکتا ہے؟ تو عبارت میں یہی طریقہ مجاز ہے اور اس کا معنی ہے ایک بار بطور قیاس جدلی کے تسلیم کرنا۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے: میں فرض کرتا ہوں کہ تو اسے اٹھا سکتا ہے سو تو مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھائے گا۔ پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی عبارت اس اشتراک مجازی کے مطابق تھی، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے اسے خالص کر دیا اور اسے اس پر محمول کیا کہ آپ کے لئے حقیقت بیان فرمادی اور آپ کو فرمایا: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی تَوٰس سے امر مکمل ہو گیا اور ہر قسم کے شک سے پاک ہو گیا پھر آپ علیہ السلام نے راحت و طمانینت کے ساتھ اپنے سوال کی علت بیان کی (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے وہ اپنی (انتہا کو) پہنچا۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے بارے میں اس طرح کا شک جائز نہیں ہوتا کیونکہ یہ کفر ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات دوبارہ اٹھائے جانے کے ساتھ ایمان لانے پر متفق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے رکھی ہے کہ اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے اولیاء رحمہم پر شیطان کو کوئی راہ اور غلبہ نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ عِبَادِيْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: ۴۲) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) اور اس لعین نے کہا تھا: اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصٰتِ (ص) یعنی تیرے مخلص بندوں پر میرا تسلط نہیں ہو سکتا) اور جب شیطان کے لئے ان پر کوئی غلبہ اور تسلط نہیں ہے تو پھر وہ انہیں شک میں کیسے ڈال سکتا ہے؟ بلاشبہ آپ نے سوال کیا کہ آپ مردوں کے اجزاء بکھر جانے کے بعد ان کے جمع ہونے کی کیفیت اور پٹھوں اور جلدوں کو پھاڑنے اور بکھیرنے کے بعد انہیں جوڑنے کی کیفیت کا مشاہدہ کریں۔ اور ارادہ یہ کیا کہ آپ علم یقین سے مزید علم یقین کی طرف ترقی کریں۔ پس آپ کا قول: اَرِیْ کَیْفَ یہ کیفیت کے مشاہدہ کی طلب پر دال ہے۔

اور بعض علمائے معانی نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہ رائے فاسد اور مردود ہے اس بیان کے سبب جو اس کے پیچھے ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور اس ارشاد اَوَلَمْ تُؤْمِنْ میں الف برائے استفہام نہیں ہے، بلکہ یہ الف برائے ایجاب و تقریر ہے۔ جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

اَلَسْتُمْ خَیْرٌ مِنْ رُكْبِ الْمَطْلَیَا

کیا تم ان سے بہتر نہیں ہو جو سوار یوں پر سوار ہوئے۔

(یعنی ان سے بہتر ہو۔ تو گویا الف برائے ایجاب ہوا)

اور دُثُومَن میں واوِ حالیہ ہے۔ اس کا معنی ایمان مطلق ہوا اور اس میں مردوں کو زندہ کرنے کی فضیلت داخل ہے۔
 قولہ تعالیٰ: قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لَّيَظْمِنَنَّ قَلْبِي یعنی میں نے تجھ سے سوال کیا ہے تاکہ میرا دل برہان (دلیل) کے ساتھ معلوم اور مشاہدہ کے مابین فرق حاصل ہونے سے مطمئن ہو جائے۔

اور طمانینت کا معنی اعتدال اور سکون ہے اور اعضاء کی طمانینت تو معروف ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شَمِ ارْكَعَ حَتَّى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا۔ (1) الحدیث (پھر تو رکوع کر یہاں تک کہ تو پورے اطمینان سے رکوع کرے) اور دل کی طمانینت یہ ہے کہ کسی شے معتقد میں اس کی فکر پر سکون ہو جائے (اور راحت میں بدل جائے)۔ اور احیاء کے بارے میں فکر کرنا ممنوع نہیں ہے، جیسا کہ آج ہمارے لئے ہے کہ ہم اس میں فکر کریں کیونکہ اس فکر میں ہی عبرت ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو مشاہدہ اور معائنہ کا ارادہ کیا تو احیاء کی صورت میں ان کی فکر ختم ہو جائے گی۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: لَيَظْمِنَنَّ قَلْبِي کا معنی ہے تاکہ میرا دل محفوظ ہو جائے اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ان سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے تاکہ یقین میں اضافہ ہو جائے۔ ابراہیم اور قتادہ نے یہی کہا ہے اور بعض نے کہا ہے: تاکہ وہ میرے ایمان کے ساتھ مزید ایمان کا اضافہ کرے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس معنی میں کوئی زیادتی ممکن نہیں ہوتی مگر فکر سے سکون حاصل کرنے کے ساتھ، ورنہ یقین منقسم نہیں ہوتا (2)۔

سدی اور ابن جبیر نے بھی کہا ہے: کیا تم یقین نہیں رکھتے اس کے ساتھ کہ تم میرے خلیل ہو؟ آپ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ (سوال اس لئے ہے) تاکہ میرا دل خلت کے ساتھ مطمئن ہو جائے۔

اور یہ قول بھی ہے: آپ نے دعا کی کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری دعا قبول کرتا ہوں؟ آپ نے عرض کی: ایمان تو ہے (لیکن سوال اس لئے کیا ہے) تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے کہ تو میری دعا قبول کرتا ہے۔

آپ کو اس پر برا بیچنے کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کو خلیل بنائے گا، تو آپ نے اس پر کسی نشانی (کے حصول) کا ارادہ کیا۔

سائب بن یزید نے یہی کہا ہے اور یہ قول بھی ہے: (کہ وہ) نمرود کا یہ قول تھا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور حسن نے کہا ہے: انہوں نے ایک مردار دیکھا اس کا نصف حصہ خشکی میں پڑا تھا اسے درندے چیر پھاڑ کر کھا رہے تھے اور نصف حصہ سمندر میں تھا اسے سمندری جانور چیر پھاڑ رہے تھے، تو جب آپ نے اسے متفرق ہوتا اور بکھرتا دیکھا تو آپ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 105، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب ابواب صلاة الجماعة، حدیث نمبر 715، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

پسند کیا کہ اسے جڑتا اور ملتا بھی دیکھیں تو آپ نے سوال کر دیا تا کہ آپ کا دل اس کے جمع ہونے کی کیفیت دیکھ کر مطمئن ہو جائے جیسا کہ اس نے تفریق اور تقسیم کی کیفیت کو دیکھا ہے: سو آپ کو کہا گیا: فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ کہا گیا ہے کہ وہ چار پرندے مرغ، مور، کبوتر اور کوا تھے۔ اسے ابن اسحاق نے بعض اہل علم سے ذکر کیا ہے اور مجاہد، ابن جریج، عطاء بن یسار اور ابن زید رحمہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کوئے کی جگہ سارس کا ذکر کیا ہے (1) اور آپ ہی سے یہ بھی ہے کہ آپ نے کبوتر کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے۔ پس آپ نے حسب حکم یہ پرندے پکڑ لئے اور انہیں ذبح کیا اور انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ دیا اور بعض کا گوشت بعض کے ساتھ خون اور پروں سمیت خلط ملط کر دیا یہاں تک کہ آپ بہت تعجب کرنے لگے، پھر اس ملے جلے مجموعہ میں سے ایک ایک جز ہر پہاڑ پر رکھ دیا اور آپ ایسی جگہ پر ٹھہر گئے جہاں سے آپ ان اجزاء کو دیکھ سکتے تھے اور آپ نے پرندوں کے سراپے ہاتھ میں ہی روک لئے۔ پھر کہا: تعالین باذن اللہ (تم اللہ تعالیٰ کے اذن سے آ جاؤ) پس وہ اجزاء اڑنے لگے اور خون خون کی طرف اور پروں کی طرف اڑے یہاں تک کہ پہلے کی طرح وہ سب جڑ گئے اور بغیر سروں کے وہ باقی رہ گئے۔ پھر آپ نے دوبارہ آواز دی تو وہ آپ کے پاس اپنی ٹانگوں پر دوڑتے ہوئے آئے۔ اور پرندے کے لئے سعی کا لفظ نہیں بولا جاتا جب وہ اڑے مگر تمثیل کی بنا پر۔ نحاس نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ان میں سے ایک کی طرف اس کے سر کے بغیر اشارہ کیا تو پرندہ دور ہو گیا اور جب اس کی طرف اس کے سر کے ساتھ اشارہ کیا تو وہ قریب ہوا یہاں تک کہ ہر پرندہ اپنے سر کے ساتھ مل گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اڑ گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے پھر ہر پہاڑ پر ہر ایک کا ایک ایک جز رکھ دے۔

ابوبکر نے عاصم اور ابوجعفر سے جُزْؤًا بروزن فُعْل پڑھا ہے اور ابوجعفر نے جُزْؤًا زاء مشدودہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مہموز مخفف پڑھا ہے یہ اس کی لغات ہیں اور اس کا معنی ہے: نصیب اور حصہ۔

يَأْتِيَنَّكَ سَعِيًّا - سَعِيًّا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور مُزْهِنٌ کا معنی ہے: تو انہیں کاٹ دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، ابو عبیدہ اور ابن انباری رحمہم نے یہی کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: صار الشيء يَصُورُه - یعنی اس نے شے کو کاٹ دیا۔ اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ اور ابوالاسود الدؤلی سے ہے، اور یہ سریانی زبان کے ساتھ تقطیع ہے، تو بہ بن الحمیر نے اس کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فلما جذبت الحبل أطلت نسوعه

بأطراف عيدان شديد سيورها

فأذنت لي الأسباب حتى بلغتها

بنهض و قد كاد ارتقال يصورها

یعنی وہ اسے کاٹ دے گا اور الضور بمعنی القطع (کاٹنا) ہے۔ ضحاک، عکرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی کسی روایت میں کہا ہے جو ان سے روایت کی گئی ہے کہ یہ لفظ نہطی زبان کا ہے اور اس کا معنی ہے: قَطَعْنُ تو انہیں کاٹ دے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: أَمْلَهُنَّ اليك، یعنی تو انہیں ملادے اور انہیں اپنے پاس جمع کر لے۔ کہا جاتا ہے: رجل أصور جب

وہ گردن کو جھکانے والا ہو۔ اور آپ کہتے ہیں: اِنِّی الْیَکُمُ لِأَصُوْرٍ، یعنی بلاشبہ میں تمہاری طرف مشتاق اور راغب ہوں۔ اور امْرَاةٌ صَوْرَاءُ (جھکنے والی عورت) اور اس کی جمع صَوْرٌ ہے جیسا کہ اُسود کی جمع سُودٌ ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اِنَّهُ یَعْلَمُ اَنَا فِی تَلَقُّتِنَا یَوْمَ الْفِرَاقِ اِلٰی جِیْدَاتِنَا صَوْرٌ

اور قولہ اِلَیْکَ تَقْطِیْعُ کی تاویل پر متعلق خذ کے ہے اور کسی مضمہ کی حاجت نہیں۔ اور امالہ اور ضم کی تاویل پر یہ صَرْهَنْ کے متعلق ہے اور کلام میں یہ چھوڑ دیا گیا ہے: فَاَمْلَهُنَّ الْیَکَ ثَمَّ قَطْعُهُنَّ (تم انہیں اپنے پاس جمع کر لو اور پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دو) اور اس میں پانچ قراءتیں ہیں۔ سات میں سے دو یہ ہیں: صاد کا ضمہ، صاد کا کسرہ اور را کی تخفیف۔ اور ایک قوم نے فَصْرَهَنْ یعنی صاد کے ضمہ اور را مفتوحہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے پس تو انہیں باندھ دے۔ اور اسی سے صَرْهَ الدَّنَانِیْرِ ہے۔ اور ایک گروہ نے فَصْرَهَنْ صاد کے کسرہ اور را مفتوحہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے تو انہیں چیر پھاڑ دے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: صَرْهَ الْبَابِ وَ الْقَلَمِ اِذَا صَوْتٌ۔ (دروازہ اور قلم پھٹ گئے جب تو نے آواز لگائی۔) اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: یہ قراءت غریب ہے اور وہ اس لئے کہ مضاعف متعدی بکسر عین بہت قلیل آتا ہے بلکہ اس کا باب یفعل عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسے شَذَّ یَشْذُوْغِیْرَہ۔ لیکن کبھی کبھی اس سے یہ بھی آتا ہے تَمَّ الْحَدِیْثَ یَنْتَہِ وَ یَنْتَہِ۔ اس نے چغلخوری کی۔ اور ہذا الحرب یَهْزُہَا دِیْہِزْہَا، جنگ چھڑ گئی۔

اور اسی سے اَعْشٰی کا شعر ہے:

لِیَعْتَوِرَنَّکَ الْقَوْلُ حَتّٰی تَهْزَہُ

علاوہ ازیں بھی قلیل حروف میں سے ہے۔

ابن جنی نے کہا ہے: پس عکرمہ کی قراءت صاد کے ضمہ کے ساتھ تو یہ را میں ضمہ، فتح اور کسرہ تینوں کا احتمال رکھتی ہے۔ (جیسے مد اور شد) کے را پر ضمہ اس کے بعد ہا پر ضمہ کی وجہ سے ہے۔

پانچویں قراءت صَرْهَنْ صاد کے فتح اور را مکسورہ کی شد کے ساتھ ہے۔ اسے مہدوی وغیرہ نے عکرمہ سے بیان کیا ہے، یہ بمعنی فاحسہن (اور تو انہیں روک لے) ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: صَرْهٰی یُصْبِرٰی جب کوئی قید کر لے، روک لے۔ اور اسی سے الشَّاةُ الْبُصْرَاةُ ہے۔

اور یہاں ایک اعتراض ہے جسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا آخرت کی نشانیوں کے بارے میں کیسے قبول کر لی گئی جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی قبول نہیں کی گئی جو اس قول میں ہے: رَبِّ اٰیْرٰنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (الاعراف: 143) (اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے تاکہ میں تیری طرف دیکھ سکوں) تو ان سے دو جواب منقول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا وہ مکلف باقی رہتے ہوئے صحیح نہیں ہے اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا وہ خاص ہے اور اس کے ساتھ مکلف باقی رہنا صحیح ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ احوال مختلف ہوتے ہیں پس بعض اوقات صلح قبولیت ہوتی ہے اور بعض دوسرے اوقات میں اس بارے میں منع کرنا اور روکنا

اصلح ہوتا ہے جس میں پیشگی اذن نہ ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کے بارے حکم دیا تھا اس سے پہلے کہ آپ کی اولاد ہو اور اس سے پہلے کہ آپ پر وہ صحف نازل کرے۔ واللہ اعلم۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ①

”مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو اگاتا ہے سات بالیں (اور) ہر بال میں سو دانہ ہو اور اللہ تعالیٰ (اس سے بھی) بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور اللہ وسیع بخشش والا جاننے والا ہے۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے وہ قصے بیان کر دیئے جن میں دلائل ہیں، تو اس نے جہاد پر براہِ گنجتہ کیا اور تو جان لے کہ جس نے اس برہان اور دلیل کے بعد جہاد کیا جسے نبی کے بغیر کوئی نہیں لاسکتا تو اس کے لئے اس جہاد میں ثواب عظیم ہے۔ البستی نے اپنی صحیح مسند میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی: ”اے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما۔“ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی، مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَعِفْ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً (البقرہ: 245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا۔) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر عرض کی: ”اے میرے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما۔“ تو یہ آیت نازل ہوئی اِثْمَانِيُوْا فِي الصُّبُوْرِ وَانْجِرْهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ② (الزمر)

اس آیت کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے شرف اور اس کے حسن کی مثال بیان کرنے کے لئے ہیں اور یہ اس پر انگینت دلانے کو متضمن ہیں۔ اور کلام میں مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: مثل نفقة الذين ينفقون اموالهم في سبيل الله كمثل حبة۔ ان کے نفقہ کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے: مثل الذين ينفقون اموالهم كمثل زارع زرع في الارض حبة فأتبتت الحبة سبع سنابل یعنی ان کی مثال جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کسان کی مثل ہے جس نے زمین میں ایک دانہ کاشت کیا اور اس دانے نے سات بالیں اگائیں۔ یعنی سات بالیں نکالیں اور ہر بال میں سو دانہ ہو۔ پس صدقہ کرنے والے کو کاشت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی اور صدقہ کو بیج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ہر صدقہ کے عوض سات سونکیاں عطا فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللَّهُ يُضَعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے سات سو پر بڑھا دیتا ہے۔ پس صدقہ کرنے والے کی مثل کاشت کرنے والے کی مثل ہو جائے گی، (جیسا کہ) اگر وہ اپنے عمل میں حاذق (ماہر) ہو اور بیج عمدہ ہو، زمین آباد ہو تو پیداوار زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس اسی طرح اگر صدقہ کرنے والا جب صالح ہو، مال طیب اور پاک ہو اور وہ اسے اپنے محل میں خرچ کرتا ہو تو ثواب بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جس نے کہا ہے: آیت میں سات

سو گنا پر زیادتی کا ذکر نہیں ہے، جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ روایت کی گئی ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان بن عفان اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو صدقہ پر ابھارا جس وقت آپ نے غزوہ تبوک کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ چار ہزار لے کر حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آٹھ ہزار تھے تو میں نے اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے چار ہزار رکھے ہیں اور چار ہزار میں نے اپنے رب کو بطور قرض پیش کر دیئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بَارَكَ اللَّهُ لَكَ فِيمَا امْسَكَتَ وَفِيمَا اَعْطَيْتَ (اللہ تعالیٰ تجھے برکت عطا فرمائے اس میں بھی جو تو نے (گھر والوں کے لئے) روک لیا اور اس میں بھی جو تو نے پیش کر دیا) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تیاری کا سامان میرے ذمہ ہے جس کے پاس تیاری کا سامان نہیں ہے، تو ان دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ آیت آیت زکوٰۃ نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی پھر آیت زکوٰۃ کے ساتھ یہ منسوخ ہو گئی اور نسخ کے دعویٰ کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور ان میں عظیم تر جہاد ہے تاکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَسْبَلْ حَبَّةً اس میں الحبة اسم جنس ہے ہر اس شے کے لئے جسے انسان کاشت کرتا ہے اور اس سے خوراک حاصل کرتا ہے اور اس سے زیادہ مشہور گندم ہے اور اکثر حب سے مراد یہی لی جاتی ہے اور اسی معنی میں المتکلمس کا قول ہے:

آلَيْتُ حَبَّ الْعِرَاقِ الدَّهْرَ أَطْعَمَهُ وَالْحَبُّ يَأْكُلُهُ فِي الْقَرْيَةِ الشُّوشُ

اور حبة القلب سے مراد دل کی سیاہی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد شرة القلب (دوستی، الفت) ہے اور وہ وہی ہے۔ اور الحبة حاء کے کسرہ کے ساتھ، اس سے مراد ہزیوں کا وہ بیج ہے جو خوراک (غذا) نہیں ہوتا اور حدیث شفاعت میں ہے: فَيَنْبَتُونَ كَمَا تَنْبَت الْحَبَّةُ فِي حِمِيلِ السَّيْلِ (1) (پس وہ اس طرح اگ پڑیں گے جس طرح سیلاب کے لائے ہوئے کچڑ میں بیج اگتے ہیں۔ اور جمع جبب آتی ہے اور الحبة حاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی حب ہے۔ کہا جاتا ہے: نَعَمْ وَحُبَّةٌ وَكِرَامَةٌ۔ (وہ محبت و کرامت کے اعتبار سے اچھا ہے۔) اور الحب کا معنی محبت ہے اور اسی طرح الحب (بالکسر) کا معنی بھی ہے اور الحب سے مراد حبیب (گہرا دوست) بھی ہے۔ جیسے خَذَنَ اور خَدِينُ (گہرا دوست) اور سُنْبِلَةٌ یہ فُنْعَلَةٌ کے وزن پر أسبل الزرع سے ماخوذ ہے جب کھیتی میں بالیس ظاہر ہو جائیں یعنی وہ بالیس چھوڑ دے جس طرح پردے کو لٹکا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اس میں چھپے ہوئے دانے ہیں جس طرح کہ کسی شے پر پردہ لٹکانے سے وہ چھپ جاتی

1۔ صحیح بخاری، باب تفاضل اہل الایمان فی الاعمال، حدیث نمبر 21، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور اس کی جمع سنابل ہے، پھر کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سنبل الدخن (باجرے یا کنگنی کی بال) ہے۔ وہی وہ شے ہے جس کی ایک بال میں اتنی تعداد میں دانے ہوتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ باجرے کی بالیں میں سے ایک بال میں اس تعداد سے دو گنا زیادہ بلکہ اس سے بھی زیادہ دانے ہوتے ہیں۔ ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: گندم کی بالیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں سوداں ہوتے ہیں۔ اور رہے تمام دانے تو وہ کہیں زیادہ ہوتے ہیں، لیکن مثال اس مقدار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اور علامہ طبری رحمہ اللہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: **فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ** اس کا معنی ہے اگر وہ اسے پائے، ورنہ اس بنا پر کہ وہ اسے فرض کرے۔ پھر انہوں نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کا معنی ہے ہر بال نے سوداں اگائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری نے حضرت ضحاک کے قول کو اسی طرح رکھا ہے جیسے انہوں نے کہا ہے اور یہ ضحاک کے قول سے لازم نہیں آتا اور ابو عمرو والدانی نے بیان کیا ہے کہ بعض نے مائۃ کو اس تقدیر پر منصوب پڑھا ہے۔ انبتت مائۃ حبة۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یعقوب حضرمی نے کہا ہے: اور بعض نے پڑھا ہے: **فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ** یہ اس بنا پر ہے کہ یہ انبتت مائۃ حبة ہے۔ اور اسی طرح بعض قراء نے پڑھا ہے: **وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ** اور یہ **وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ** کی بنا پر ہے، یعنی **وَأَعْتَدْنَا لِلَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابَ جَهَنَّمَ**۔ (اور ہم نے جہنم کا عذاب تیار کیا ہے ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا) اور ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے انبتت سنبۃ سنابل میں تا کو سین میں ادغام کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں حروف مہوسہ میں سے ہیں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور ابو عمرو نے شعر بیان کیا ہے:

يَا لَعَنَ اللَّهُ بَنِي السَّعْلَةِ
عَمْرُو بْنُ مَيْمُونٍ لثَامِ النَّاتِ

مراد لوگ (الناس) لئے ہیں اور سین کو تا میں بدل دیا ہے اور باقی قراء نے اصل کی بنا پر دونوں کو ظاہر کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں دو کلمے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قرآن کریم اس بارے میں وارد ہوا ہے کہ نیکی کے جملہ اعمال میں ایک نیکی کا بدلہ اس کی مثل دس کے ساتھ ہے اور یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے کی نیکی کا عوض سات سو گنا ہے اور علماء نے اس قول **وَاللَّهُ يُضَوِّفُ لِمَن يَشَاءُ** کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ سابقہ سات سو کے ذکر کے بیان اور تاکید کے لئے ہے۔ لہذا اس میں سات سو گنا سے بڑھانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے: بلکہ یہ اس پر اطلاع دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے لئے عوض سات سو گنا سے بھی زیادہ کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کی ابتدائی تفسیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث بیان کی گئی ہے اس کے مطابق یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے: **حَدَّثَنَا هَارُونُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الْحِمَالِيُّ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي قَدِيلَةَ عَنْ**

الخلیل بن عبد اللہ عن الحسن بن علی بن ابی طالب و ابی الدرداء و عبد اللہ بن عمرو بن امامہ الباہلی و عبد اللہ بن عمرو و جابر بن عبد اللہ و عمران بن حصین یہ تمام کے تمام صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچہ بھیج دیا اور خود اپنے گھر میں ہی رہا تو اس کے لئے ایک درہم کے بدلے سات سو درہم ہیں۔ اور جو بذات خود بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں شریک ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچہ کیا تو اس کیلئے ایک درہم کے بدلے سات لاکھ درہم ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: **وَاللّٰهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ**۔ (1) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس عوض کو بڑھاتے بڑھاتے بیس لاکھ تک کر دیتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ روایت آپ سے ثابت الاسناد نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ زراعت کا پیشہ ان پیشوں میں سے اعلیٰ ترین پیشہ ہے جنہیں لوگ اختیار کرتے ہیں اور ان کمائیوں میں سے اعلیٰ ہے جن کے ساتھ کام کرنے والے (مزدور) مشغول ہوتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مثال بیان فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا ہے: **مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ الْآيَةَ**۔ اور صحیح مسلم میں حضور نبی کریم ﷺ سے روایت موجود ہے: ”جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا فصل کاشت کرتا ہے اور اس سے پرندے، انسان یا جانور کھاتے ہیں تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے (2)۔“ اور ہشام بن عروہ نے اپنے باپ کے واسطے سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”زمین کی تہوں میں رزق تلاش کرو“ مراد زراعت ہے۔ اسے ترمذی نے بیان کیا ہے۔ اور آپ ﷺ نے کھجور کے درخت کے بارے فرمایا ہے: ”یہ کچھڑ میں گڑھے ہوتے ہیں (اور) محلات میں خوراک باہم پہنچاتے ہیں“ یہ مدح کے محل میں بیان ہوا ہے۔

اور زراعت فروع کفایہ میں سے ہے اور امام وقت پر لازم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس پر مجبور کرے اور اس پر جو اس کی مثل ہے مثلاً درخت لگانا وغیرہ۔ (یعنی باغبانی)

عبد اللہ بن عبد الملک نے حضرت ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور کہا: میری ایسے مال پر رہنمائی کیجئے جس کے لئے میں محنت و مشقت کروں۔

تو ابن شہاب رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار کہے:

اقول لعبد الله يوم لقيته	و قد شدّ أخلاص البطي مشرقاً
تتبع خبايا الأرض وادع مليكها	لعلك يوما ان تجاب فترزقا
فيوتيك مالا واسعاً ذا مشابة	إذا ما مياه الأرض غارت تدققا

1۔ سنن ترمذی، باب ما جاء في النفقة في الأهل، حدیث نمبر 1889۔ ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2749-2750، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المزارعة، باب فضل الزرع، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور مقصد سے بیان کیا گیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا۔ آپ مجھے بیلچہ (یا کدال) عطا فرما رہے ہیں اور آپ نے فرمایا: اسے پکڑ لو کیونکہ یہ زمین کے خزانوں کی چابیاں ہیں۔ (خذا فانها مفتاح خزائن الارض)

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى
لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٦١﴾

”جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں پھر جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں، انہیں کے لئے ثواب ہے ان کا ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ جیش العُصمہ (غزوہ تبوک) کی تیاری کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار لے کر حاضر ہوئے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ڈال دیا، تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ سے اپنا دست مبارک ان میں داخل کرتے ہیں اور انہیں الٹ پلٹ کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: مَا خَرَّ ابْنُ عَفَانَ مَا عَمِلَ الْيَوْمَ اللَّهُمَّ لَا تَنْسَ هَذَا الْيَوْمَ لِعِثْمَانَ آج کے بعد ابن عفان نے جو عمل بھی کیا وہ ان کے لئے نقصان دہ نہیں۔ اے اللہ! تو آج کے دن عثمان کو نہ بھولنا۔“ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے دیکھا ہے۔ آپ کہہ رہے تھے: يَا رَبِّ عِثْمَانَ اِنِّي رَضِيْتُ عَنْ عِثْمَانَ فَارِضٌ عَنْهُ (اے عثمان کے رب! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی رہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو گئی۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى (الآیہ 1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ بالعموم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر جب پہلی آیت میں گزر چکا، تو اس آیت میں یہ بیان کیا کہ وہ حکم اور ثواب بلاشبہ اس کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتا ہے اور نہ وہ دکھ دیتا ہے کیونکہ احسان جتلاتا اور اذیت دینا یہ صدقہ کے ثواب کو باطل کر دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد والی آیت میں بیان کر دیا ہے۔ بلاشبہ آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور متفق علیہ پر خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ سے ثواب کے حصول کا ارادہ کرے اور وہ منفق علیہ سے کسی شے کی امید نہ رکھے اور سوائے اپنے استحقاق کی رعایت کرنے کے اس کے احوال میں سے کسی حال پر نظر نہ رکھے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا تَشْكُورُنَّ ﴿١٦٢﴾ (الہر) (نہ ہم تم سے کسی اجر کے خواہاں ہیں اور نہ شکریہ کے)

اور جب اس نے اس ارادے سے مال خرچ کیا کہ وہ کسی بھی وجہ سے منفق علیہ سے جزا حاصل کرے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہ کیا اور یہ تب ہے جب اس کے اس گمان کے پیچھے خرچ کرنے سے مقصود احسان جتلا نا اور اذیت پہنچانا ہو۔ اور اسی طرح جس نے کسی مضطر اور مجبور آدمی سے مشقت اور تکلیف دور کرنے کے لئے خرچ کیا یا تو اس پر احسان جتلانے کے لئے جس پر خرچ کیا گیا ہے یا مشقت کے کسی دوسرے قرینہ کے سبب اذیت پہنچانے کے لئے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا۔ بلاشبہ اس کا یہ عمل قبول کیا جائے گا جب اس کی یہ عطا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو اور اس کا زیادہ سے زیادہ ارادہ اس (اجر و ثواب) کی خواہش ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا:

يَا عُمَرُ الْخَيْرُ جُزِيتَ الْجَنَّةَ اَنْكُسُ بُيُوتِي وَ اُمَهْنَتُهُ
اے عمر! بھلائی اور نیکی کیجیے آپ کو جنت کی جزادی جائے میری بیٹیوں اور ان کی ماں کو لباس پہنائیے۔

وَ كُنْ لَنَا مِنَ الزَّوْمَانِ جُنَّةً اَقْسَمُ بِاللّٰهِ لَتَفْعَلَنَّهُ
تو ہمارے لئے (مصائب) زمانہ سے ڈھال بن جا۔ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں آپ ضرور ایسا کریں گے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نہ کروں تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

اِذَا اَبَا حَفْصٍ لَّا ذَهَبَنَّهُ
اے ابا حفص! تب میں چلا جاؤں گا۔

پھر آپ نے فرمایا: جب تو چلا گیا تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

تَكُونُ عَنِ حَالِي لَتُسْأَلَنَّهُ يَوْمَ تَكُونُ الْاَعْطِيَاتُ هَنَّةً
میرے حال کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا جس دن عطیات کی آرزو ہوگی۔

وَ مَوْقِفُ الْمَسْئُولِ بَيْنَهُنَّ اَمَّا اِلَى نَارٍ وَاَمَّا جَنَّةً
اور ان کے درمیان مسئلہ کا موقف (ٹھہرنے کی جگہ) یا جہنم ہوگی یا جنت۔

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لگے یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک تر ہو گئی۔ پھر آپ نے فرمایا: اے غلام! اس دن کے لئے اے میری یہ قمیص دے دو نہ کہ اس کے شعر کے لئے۔ قسم بخدا! میں اس کے سوا کسی کا مالک نہیں ہوں۔ ماوردی نے کہا ہے: جب عطا اس ارادہ پر ہو کہ وہ جزا اور شکر کی طلب سے خالی ہو اور احسان جتلانے اور شہرت سے بھی پاک ہو تو وہ خرچ کرنے والے کے لئے انتہائی اشرف و اعلیٰ ہے اور قبول کرنے والے کے لئے باعث مبارک ہے، لیکن جب عطا کرنے والا اپنی عطا سے جزا کا خواہشمند ہو اور اس کے عوض شکر اور ثنا کا طالب ہو تو وہ شہرت کا طالب اور ریا کاری کرنے والا ہے۔ اور ان دونوں میں ایسی ذم اور برائی ہے جو سخاوت کے منافی ہوتی ہے اور اگر اس نے جزا کا مطالبہ کیا تو وہ ایسا نفع کمانے والا تاجر ہے جو حمد اور مدح کا مستحق نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ①

(المدثر) یعنی آپ کسی کو ایسا عطیہ نہ دیں کہ آپ اس کے عوض اس سے افضل و اعلیٰ کی خواہش رکھتے ہوں۔

اور ابن زید نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو خود جہاد میں نہیں نکلتے بلکہ وہ خرچ کرتے ہیں اس حال میں کہ خود بیٹھے ہوتے ہیں اور اس سے پہلی آیت ان کے بارے میں ہے جو بنفس نفیس جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔ فرمایا: اسی لئے ان پر شرط لگائی گئی ہے اور پہلوں پر کوئی شرط نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ اس میں اپنی رائے سے فیصلہ دینے کا اظہار ہو رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مَثَاوِلًا اَذًى، السنّ کسی نعمت و احسان کا ذکر کرنا ہے اس کو شمار کرنے اور گننے کے لئے اور اس کے سبب (دوسرے کو) پریشان کرنے کے لئے۔ مثلاً وہ یہ کہے: قد احسنت اليك و نعشتك میں نے تجھ پر احسان کیا اور تجھے ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ اور اسی کے مشابہ اور الفاظ۔

اور بعض نے کہا ہے: السنّ کا مفہوم ہے اس کے بارے میں گفتگو کرنا جو اس نے دیا یہاں تک کہ وہ گفتگو اس تک پہنچ جائے جسے دیا گیا اور وہ اس کے لئے باعث تکلیف ہو اور احسان جتنا نا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے (1)۔ اور یہ بھی ان تین میں سے ایک ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اور نسائی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تین آدمی ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا: اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا، مرد کی طرح بننے والی عورت جو کہ مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرتی ہو اور دیوث (بے غیرت انسان)۔ اور تین ہیں جو جنت میں داخل نہیں ہوں گے: اپنے والدین کا نافرمان، ہمیشہ شراب پینے والا اور اس کے ساتھ احسان جتنا نے والا جو کسی کو عطا کرے (2)۔“ اور مسلم کی بعض اسناد میں ہے: المثنان (احسان جتنا نے والا) وہ ہے جو کسی کو بغیر احسان جتنا کے کوئی شے نہیں دیتا۔“ اور الاذی سے مراد گالیاں دینا اور شکایت کرنا ہے اور یہ منّ سے اعم ہے۔ کیونکہ منّ، الاذی کا جز ہے لیکن اس کے کثیر الوقوع ہونے کے سبب اس پر نص وارد ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اگر تجھے گمان ہو کہ تیرا سلام اس پر ثقیل اور گراں ہوگا جس پر تو نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کچھ خرچ کیا ہے تو تو اس پر سلام نہ کر اور آپ کو ایک عورت نے کہا: اے ابواسامہ! میری ایسے آدمی پر رہنمائی کیجئے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے کیونکہ وہ تو نکلتے ہیں (اور) وہ پھل کھاتے ہیں بلاشبہ میرے پاس تیرا اور ترکش ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیروں اور تیرے ترکش میں تیرے لئے برکت نہ رکھے تحقیق تو نے انہیں دینے سے پہلے انہیں اذیت اور تکلیف دی ہے۔

ہمارے علماء رحمہم اللہ نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور اس کے پیچھے نہ احسان جتنا یا اور نہ دکھ پہنچایا جیسا کہ اس کا یہ قول: تیرا اصرار اور تیری احتیاج کتنی شدید تھی! تیری جانب سے اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عطا فرمائے۔ اور اسی

طرح کی دیگر مثالیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اجر کی ضمانت دی ہے اور وہ اجر جنت ہے اور اس کی موت کے بعد مستقبل کے لئے اس سے خوف کی نفی کر دی اور اس حزن اور غم کی نفی کر دی جو اسے اس پر ہوا جو دنیا میں سے گزر چکا ہے کیونکہ وہ تو اپنی آخرت کے ساتھ خوش اور مسرور ہوتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے یہ فضل و شرف کافی ہے۔ اور اس میں ان کے لئے دلیل ہے جنہوں نے غنی کو فقیر پر فضیلت دی ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا أَذًى ۚ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ﴿٣١﴾

”اچھی بات کرنا اور (غلطی) معاف کر دینا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے بڑے حلم والا ہے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ**۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی قول معروف اولیٰ و امثل (اچھی بات کرنا اولیٰ اور عمدہ ہے) اس کا ذکر نحاس اور مہدوی نے کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ **قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ** خبر ہو اور مبتدا محذوف ہو۔ یعنی الذی اُمِرْتُمْ بِهِ **قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ**۔ (وہ جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ اچھی بات کرنا ہے) اور قول معروف سے مراد دعا کرنا، انس اور غنخواری کا اظہار کرنا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس کی آرزو کرنا ہے، یہ صدقہ سے بہتر ہے، کیونکہ یہ ظاہر میں صدقہ ہے اور اپنے باطن میں کوئی شے نہیں ہے اور قول معروف کے ذکر میں اجر ہے اور ایسے صدقہ میں کوئی اجر نہیں ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پاکیزہ کلمہ صدقہ ہے (1) اور بلاشبہ تیرا اپنے بھائی کو خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی میں سے ہے۔“ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

پس چاہیے کہ آدمی سائل کو خوشی سے اور مرحبا کہتے ہوئے ملے اور کشادہ روئی اور انتہائی قرب اور فرحت کے ساتھ اس کا سامنا کرے، تاکہ وہ مشکور ہو اگر کچھ عطا کرے اور معذور ہو اگر کچھ نہ دے۔ اور بعض حکماء نے کہا ہے: تو حاجتمند کے ساتھ خندہ پیشانی اور خوش روئی سے ملاقات کر۔ پس اگر تو اس کے شکر سے محروم رہا تو اس کے عذر سے محروم نہ رہے۔ اور ابن لنگک نے کہا ہے کہ ابو بکر بن درید نے ایک حاجت کے بارے میں کسی وزیر کا قصیدہ لکھا جس نے اسے پورا نہ کیا اور اس کے لئے اس کی جانب سے تنگی کا اظہار ہوا تو اس نے کہا:

لَا تَدْخُلَنَّكَ ضَجْرَةٌ مِنْ سَائِلٍ فَلَخِيرٌ دَهْرٌكَ أَنْ تُرَى مُسْتَوْلاً

کسی سائل سے کوئی تنگی تجھ میں نہ آنے پائے۔ پس تیرے زمانے کی خیر اور بھلائی اس میں ہے کہ تیرے سامنے دست

سوال دراز کیا جاتا رہے۔

لَا تَجْبِهَنَّ بِالرِّدِّ وَجْهَ مُؤَمِّلٍ فَبَقَاءُ عِزِّكَ أَنْ تُرَى مَأْمُولاً

1۔ صحیح بخاری، باب من اخذ بالركاب، حدیث نمبر 2767، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو کسی آرزو مند کی حاجت لوٹا کر اس کے چہرے پر نہ مار۔ پس تیری عزت کی بقا اس میں ہے کہ تجھ سے آرزو اور امید وابستہ کی جاتی رہے۔

تَلَقَى الْكَرِيمَ فَتَسْتَدَلَّ بِبِشْرِهِ وَ تَرَى الْعُبُوسَ عَلَى الذَّنِيمِ دَلِيلًا
تو کسی کریم اور سخی سے ملے تو تیرے لئے اس کی دلیل اس کی خندہ پیشانی ہے اور لئیم کی دلیل اس کے چہرے کی یوست اور تیوری چڑھانا ہے۔

وَاعْلَمْ بِأَنَّكَ عَنْ قَلِيلٍ صَائِرٌ خَبْرًا فَكُنْ خَبْرًا يَرُوقُ جَمِيلًا
تو اس کے بارے میں جان کہ تو قلیل کی طرف سے خبر دینے والا ہے۔ پس تو ایسی خبر بن جا جو حسن و جمال کے اعتبار سے خوش کرنے والی ہو۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب سائل سوال کرے تو تم اس پر اس کا سوال کاٹ نہ دو یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے، پھر بڑے وقار اور نرمی کے ساتھ یا تھوڑے سے بدل کے ساتھ یا حسین انداز میں رد کے ساتھ اس پر جواب لوٹاؤ۔ تحقیق تمہارے پاس وہ آتے ہیں جو نہ انسانوں میں سے ہیں اور نہ جنات میں سے ہیں، وہ اس بارے میں تمہارے احسانات کو دیکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائے ہیں۔“

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی دلیل ابوص (برص کا مریض) اقرع (گنجا) اور اعلیٰ (اندھا) والی حدیث ہے (1)، اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک فرشتے نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ایک بار برص کے مریض کی، دوسری بار گنجه آدمی کی اور تیسری بار اندھے آدمی کی مسئول (جس سے سوال کیا جائے) کا امتحان لینے کے لئے۔

اور حضرت بشر بن حارث نے کہا ہے: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی: اے امیر المؤمنین! مجھے کوئی ایسی شے بتائیے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ مجھے نفع عطا فرمائے، تو انہوں نے فرمایا: اغنیاء کا فقراء پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی رغبت اور آرزو رکھتے ہوئے لطف و مہربانی کرنا بہت اچھا ہے اور اس سے اچھا فقراء کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد اور یقین کرتے ہوئے اغنیاء پر سرگشتہ پھرنا ہے، پھر میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! کچھ اضافہ فرمائیے تو آپ نے پیٹھ پھیری اور آپ یہ کہنے لگے:

قَدْ كُنْتُ مَيِّتًا فَصُرْتُ حَيًّا وَعَنْ قَلِيلٍ تَصِيرُ مَيِّتًا
تحقیق تو مردہ تھا اور تو زندہ ہو گیا اور پھر قلیل کے سبب تو مردہ ہو جائے گا۔

فَاخْرَبْ بَدَارَ الْفَنَاءِ بَيْتًا وَ ابْنَ بَدَارِ الْبَقَاءِ بَيْتًا
پس تو دُور الفنا (دنیا) میں گھر گرا دے اور دار البقاء (آخرت) میں گھر بنا لے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَغْفِرًا ۖ۔ یہاں مغفرت سے مراد محتاج کی بری حالت اور خصلت کو چھپانا ہے۔ اور اسی

1۔ شیخ بخاری، باب ما ذکر عن ہنی اسرائیل، حدیث نمبر 3205، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے اعرابی کا قول ہے تحقیق اس نے فصیح کلام کے ساتھ ایک قوم سے سوال کیا تو کہنے والے نے اسے کہا: تو کس (خاندان کا) آدمی ہے؟ تو اس نے اسے کہا: اللہ تعالیٰ مغفرت کرے! بری کمائی نسب ظاہر کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: سائل کو معاف کر دینا جب وہ اصرار کرے، اکھڑپن اور خشکی کا مظاہرہ کرے اس پر ایسا صدقہ کرنے سے بہتر ہے جس کے ساتھ وہ احسان جتلائے اور اسے دکھ پہنچائے۔

نقاش نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ مشکل ہے اعراب (ترکیب) اس کی وضاحت کرے گا۔ وَمَغْفِرَةً مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ ہے اور معنی اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور وہ فعل جو مغفرت تک پہنچا دیتا ہے وہ اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچانا ہو۔ اور عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے: و فعل مغفرة او یہ بھی جائز ہے کہ یہ تیرے اس قول کی مثل ہو: تَفْضُلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ اَكْبَرُ مِنَ الصَّدَقَةِ الَّتِي تَسْتُوْنُ بِهَا (تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اس صدقہ سے بڑا ہے جس کے ساتھ تو احسان جتلاتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کی مغفرت تمہارے اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے ساتھ تم احسان جتلاتے ہو۔ (ای غفران اللہ خیر من صدقتم هذه التي تستون بها)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے غنائے مطلق کی خبر دی ہے کہ وہ بندوں کے صدقہ سے مستغنی ہے اور اس کا حکم صرف اس لئے دیا ہے تاکہ وہ انہیں ثواب عطا کرے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ اسے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا جو احسان جتلائے اپنے صدقہ کے ساتھ اور دکھ پہنچائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ③

”اے ایمان والو! مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر اس آدمی کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور دن قیامت پر۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر مٹی پڑی ہو پھر بر سے اس پر زور کی بارش اور چھوڑ جائے اسے چٹیل صاف پتھر۔ (ریا کار) حاصل نہ کر سکیں گے کچھ بھی اس سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کفر اختیار کرنے والوں کو۔“ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ۔ ان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عدم قبول اور ثواب سے محروم ہونے کو ابطال سے تعبیر کیا ہے اور مراد وہ صدقہ ہے جس کے ساتھ وہ احسان جتلاتا ہے اور دکھ پہنچاتا ہے، جو اس کے سوا ہو وہ مراد نہیں۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ گناہ (سیئات) نیکیوں (حسنات) کو نہ باطل کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں بالکل بے کار بنا دیتے

ہیں۔ پس صدقہ میں احسان جتلا نا اور دکھ پہنچانا بھی اس صدقہ کے سوا کسی صدقہ کو باطل نہیں کرتا۔

جمہور علماء نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک وہ صدقہ جس کے دینے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ احسان جتلائے گا یا اس کے سبب دکھ پہنچائے گا تو وہ قبول نہیں کیا جاتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ کبھی اس پر بطور امارۃ فرشتہ کو مقرر کر دیتا ہے اور وہ اسے لکھتا ہی نہیں۔ اور یہ قول حسن اور اچھا ہے۔ اور عرب اس کے بارے کہتے ہیں جس کے ساتھ احسان جتلا یا جاتا ہے: یَدُ سَوْدَاءَ (سیاہ ہاتھ) یعنی ایسی نعمت جس کو ضائع کر دیا گیا) اور جو کسی کو بغیر سوال کے عطا کرتا ہے اسے یَدُ بَیْضَاءَ (روشن ہاتھ) کہتے ہیں اور جو سوال کرنے پر عطا کرتا ہے اسے یَدُ خَضْرَاءَ (سبز ہاتھ) کہتے ہیں۔ اور بعض بلغاء نے کہا ہے: جس نے اپنی نیکی کے ساتھ احسان جتلا یا اس کا شکر ماقط ہو گیا۔ اور جس نے اپنے عمل کے ساتھ تکبر کیا اس کا اجر ضائع ہو گیا اور بعض شعراء نے کہا ہے:

و صاحب سلفت منه الی ید ابطا علیہ مکافات فعا دان

میرا وہ ساتھی جس کی طرف سے مجھ پر پہلے احسان ہوتا رہا ہے اس پر میری طرف سے بدلہ موخر ہوا تو اس نے میرے ساتھ عداوت اختیار کر لی۔

لما تیقن ان الدھر حاربنی ابدی الندامة فیما کان اولانی

جب یقین ہو گیا کہ زمانے نے مجھ سے جنگ شروع کر دی ہے تو جو شے میرے قریب آئی اسی میں اس نے ندامت ظاہر کر دی۔ اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

افسدت بالحق ما اسدیت من حسن لیس الکریم اذا اسدی بستان

تو نے احسان جتلانے کے ساتھ اس نیکی کو ضائع کر دیا جس کا تو نے احسان کیا اور کریم (سخی آدمی) جب احسان کرتا ہے تو وہ احسان نہیں جتلاتا۔

اور ابو بکر وراق نے کہا اور خوب اچھا کہا:

أحسن من کل حسن فی کل وقت و زمن

ہر اچھائی اور نیکی سے بڑھ کر اچھائی ہر وقت اور ہر زمانے میں

صنیعة مزبونة خالية من المن

وہ احسان ہے جو بڑھایا جائے در آنحالیکہ وہ احسان جتلانے سے خالی ہو۔

ابن سیرین نے ایک آدمی کو سنا وہ دوسرے کو کہہ رہا ہے: فعلت الیک وفعلت (میں نے تیرے ساتھ ایسا کیا اور ایسا کیا)

تو آپ نے اسے کہا: تو خاموش رہ نیکی کو جب شمار کر لیا جائے تو پھر اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ اور حضور نبی مکرم

صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایاکم و الامتنان بالمعروف فانه یبطل الشکر و یسحق الاجر تم نیکی کے

ساتھ احسان جتلانے سے بچو کیونکہ یہ شکر کو باطل کر دیتا ہے اور اجر کو مٹا دیتا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت

فرمائی..... لَا تَبْتَغُوا أَصْدَقَ لَكُمْ بِالنِّعَمِ وَالْآذَى الْآيَةِ۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس آیت کی وجہ سے امام مالک رحمہ اللہ نے مکروہ قرار دیا ہے کہ آدمی اپنا واجب صدقہ اپنے اقارب کو دے تاکہ وہ ان سے تعریف و ثنا کی صورت میں عوض کا طالب نہ ہو۔ وہ ان پر اپنے احسان کا اظہار کرے گا اور وہ اسے اس پر بدلہ اور عوض دینے کی کوشش میں ہوں گے۔ نتیجتاً وہ صدقہ خالصہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نہ ہو گا۔ اور مستحب یہ ہے کہ وہ صدقہ اجنبی لوگوں کو دے۔ اور یہ بھی مستحب ہے کہ وہ کسی غیر کو اس کی تقسیم پر مقرر کرے جبکہ امام وقت عادل نہ ہو، تاکہ احسان جتلا نے اور دکھ پہنچانے کے ساتھ یا جس کو دیا گیا ہے اس کی طرف سے شکر، تعریف یا خدمت کی صورت میں عوض دینے کے سبب وہ ضائع نہ ہو جائے۔ اور یہ اس نفلی صدقہ کے خلاف ہے جو سزا دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا ثواب جب ضائع ہو جائے تو وہ وعید سے محفوظ رہتا ہے اور وہ ایسے آدمی کے حکم پر ہو جاتا ہے جس نے وہ کام نہیں کیا لیکن واجب صدقہ کا جب ثواب ضائع ہو جائے تو اس کی طرف وعید متوجہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے حکم میں ہو چکا ہے جس نے وہ ادا ہی نہیں کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ۔ یہاں کاف محل نصب میں ہے۔ ای ابطال کالذی مئی اور یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کے محل میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال بیان فرمائی ہے جو احسان جتلاتا ہے اپنے صدقہ کے ساتھ اور دکھ پہنچاتا ہے اس آدمی کے ساتھ جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لئے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اس کافر کے ساتھ جو مال خرچ کرتا ہے تاکہ اسے سخی کہا جائے اور طرح طرح سے اس کی تعریف کی جائے۔ پھر اس خرچ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی ایسی چٹان کے ساتھ جس پر مٹی پڑی ہوئی ہو اور گمان کرنے والا اسے اچھی اگانے والی زمین گمان کر رہا ہو اور جب اس پر موسلا دھار بارش پڑے تو وہ اس سے ساری مٹی بہا کر لے جائے اور وہ صاف چٹیل پتھر باقی رہ جائے۔ پس یہ ریا کاری کرنے والا بھی اسی طرح ہے۔

پس احسان جتلاتا، دکھ پہنچانا اور ریا کاری آخرت میں نیت کو ظاہر کر دیں گے اور صدقہ باطل ہو جائے گا جیسا کہ موسلا دھار بارش چٹان کو ظاہر کر دیتی ہے۔ صفوان سے مراد وہ بڑا پتھر ہے جو چکنا ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت سے مراد فضل (اضافی ثواب) کو باطل کرنا ہے نفس ثواب کو باطل کرنا نہیں۔ اپنے نفقہ سے ریا کاری کا ارادہ کرنے والا نہ کہ ثواب کا وہ کافر کی طرح ہے، کیونکہ اس نے اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہیں کیا کہ وہ ثواب کا مستحق ہو۔ اور یہ اس احسان جتلانے والے اور دکھ پہنچانے والے کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد کرتا ہے وہ اس کے ثواب کا مستحق ہوگا اگرچہ اس نے بار بار کسی کو عطا کیا اور اس نے اس کے فضل اور زیادتی کو باطل کر دیا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اپنے احسان جتلانے اور اس کو دکھ پہنچانے کے وقت سے اپنے صدقہ کے ثواب سے محروم ہوتا ہے اور جو اس سے پہلے ہے وہ اس کے لئے لکھ دیا جاتا ہے اور اسے بڑھایا جاتا ہے اور جب وہ احسان جتلاتا ہے اور دکھ پہنچاتا ہے تو اس کی تضعیف (کئی گناہ زیادتی) منقطع ہو جاتی ہے کیونکہ صدقہ دینے والے کے لئے صدقہ بالتدریج بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بہت بڑے پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنے مالک کے ہاتھ سے خالصہ علی وجہ المشروع نکلے تو وہ کئی گنا بڑھا

دیا جاتا ہے اور جب اس کے ساتھ احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا شامل ہو جائے تو اس کے سبب وہ وہیں رک جاتا ہے اور اس سے تضعیف کی زیادتی منقطع ہو جاتی ہے۔ پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم

صَفْوَانِ جمع ہے اور اس کی واحد صَفْوَانَةٌ ہے۔ انخفش نے یہی کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: صفوان واحد ہے جیسا کہ حجر اور کسائی نے کہا ہے: صفوان واحد ہے اور اس کی جمع صفوان، صُفْنِی اور صِفْنِی ہے۔ مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ صُفْنِی صَفَا کی جمع ہے جیسا کہ قفلی جمع قُفْنِی ہے اور اسی معنی سے الصَّفَوَاء اور الصَّفَا ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور زہری نے صَفْوَانِ فاء کو متحرک پڑھا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔ اور قطرب نے صفوان بیان کیا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: صفوان اور صفوان یہ بھی جائز ہے کہ یہ جمع ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ واحد ہو۔ مگر اولیٰ یہ ہے کہ یہ واحد ہو۔ اور دلیل یہ ارشاد گرامی ہے {عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهُ وَاهِلٌ} اگرچہ جمع کے لئے مذکر ضمیر لانا جائز ہوتا ہے مگر کوئی شے دلیل قاطع کے بغیر اپنے باب سے نہیں نکل سکتی۔ اور رہا وہ جو امام کسائی نے جمع کے بارے میں بیان کیا ہے تو وہ فی الحقیقت صحیح نہیں ہے۔ البتہ صفوان صفا کی جمع ہے اور صفا بمعنی صفوان ہے۔ اور اس کی نظیر وَرَل (گوہ کی مانند ایک جانور) اور وَرْلَان، اُمُّ اور اخوان اور گہر اور کِردان (بھورے رنگ اور لمبی چونچ کا ایک پرندہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ رات کو نہیں سوتا ہے۔) ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لَنَا يَوْمٌ وَلِلْكَرْدَانِ يَوْمٌ تَطِيرُ الْبَائِسَاتُ وَ لَا نَطِيرُ

اور عربی میں کِردان کی جمع کِردان ضعیف ہے اور صُفْنِی اور صِفْنِی صفا کی جمع بھی جیسا کہ عَصَا اور الوابل کا معنی ہے: شدید اور موسلا دھار بارش اور (کبھی کہا جاتا ہے) وَبَلَّتِ السَّمَاءُ تَبِيل (آسمان موسلا دھار برسا) اور الارض مَوْبُولَةٌ (اور زمین خوب تر ہو گئی) انخفش نے کہا ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَخَذْنَاكَ أَخْذًا وَبَيْلًا یعنی ہم نے اسے انتہائی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اور ضرب وَبِيل (سخت مار) اور عذاب دبیل (شدید عذاب) اور الصلْد کا معنی ہے: چکنا پتھر۔ امام کسائی نے کہا ہے: صِلْدٌ يَصْلُدُ صِلْدًا اس میں لام متحرک ہے فَهُوَ صِلْدٌ اس میں لام ساکن ہے۔ مراد ہر وہ شے ہے جو کسی شے کو نہ اگائے۔ اور اسی سے جَبِينٌ أَصْلَد (روشن پیشانی) ہے۔ اصمعی نے رُوْبَہ کے لئے شعر کہا ہے:

بَرَأَقَ أَصْلَادُ الْجَبِينِ الْأَجْلَه

نقاش نے کہا ہے: ہذیل کی لغت کے مطابق اصلد کا معنی اجرد (خالی ہونا) ہے۔

اور لَا يَقْدِرُ مَرْؤُنَ کا معنی ہے: ریاکار، کافر اور احسان جتلانے والا کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ عَلٰی شَيْءٍ یعنی اپنے خرچ کرنے سے کسی شے کے ثواب کا نفع اٹھانے پر (وہ قادر نہیں ہو سکیں گے) اور یہی ان کی کمائی ہے انہیں اس کی ضرورت اور حاجت ہونے کے وقت، کیونکہ یہ غیر اللہ کے لئے (صدقہ) تھا۔ اور نفقہ کو کسب سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے اس سے کسب (کمائی) کا ارادہ کیا ہے۔

اور کہا گیا ہے: یہ ریاکار کے لئے اس کا ثواب باطل کرنے کی مثال بیان کی گئی ہے اور احسان جتلانے والے اور اذیت

دینے والے کے لئے اس کی فضل و زیادتی کو باطل کرنے کی مثال ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ
جَنَّةٍ بَرْبُورَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَاتَتْ أَكْطَافَهَا ضَعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۖ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣٦﴾

”اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے اور اس لئے تاکہ
پختہ ہو جائیں ان کے دل ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو، برسا ہو اس پر زور کا مینہ تو لایا ہو وہ
باغ دو گنا پھل اور اگر نہ برسے اس پر بارش تو شبنم ہی کافی ہو جائے اور اللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے۔“
قولہ تعالیٰ: وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ۔ اس میں ابْتِغَاءَ مفعول من
اجلہ ہے۔ اور وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ اس پر معطوف ہے۔ اور مکی نے التثبیت میں کہا ہے: یہ دونوں مفعول من اجلہ ہیں۔
ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور تَثْبِيتًا کو مفعول من اجلہ بنانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ انفاق (خرچ کرنا) تثبیت (پختہ ہو
جانا) کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور ابْتِغَاءَ کو حال کے محل میں مصدر ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور اس میں نصب مفعول من
اجلہ کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن مصدر کی بنا پر نصب دینا اس وجہ سے درست ہے کہ اس پر تَثْبِيتًا مصدر کا عطف ہے۔
جب اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے صدقات کا حال بیان کیا جن کے صدقات کا خیر و بھلائی میں کوئی بڑا حصہ نہیں اور مومنین کو ان
مواقع سے منع فرمایا جو من وجہ اس سے مشابہت رکھتے ہیں تو اس کے بعد اس آیت میں اس قوم کے نفقات کا ذکر فرما رہا ہے
جنہوں نے اپنے صدقات کو پاک کیا کیونکہ وہ شریعت کے موافق اور اس کی طرز پر تھے۔

اور ابْتِغَاءَ کا معنی طلب ہے اور مَرْضَاتِ یہ رَضِيَ يَرْضَى سے مصدر ہے۔ اور تَثْبِيتًا کا معنی ہے کہ وہ پختہ ہو جائیں
جہاں وہ اپنے صدقات کو رکھیں۔ یہ مجاہد اور حسن رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے: آدمی جب صدقہ کا قصد کرے تو وہ
ثابت ہو جاتا ہے۔ پس اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہو تو وہ اسے ادا کر دے اور اگر اس میں شک کی آمیزش ہو
جائے تو اسے روک لے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تصدیق اور یقین کرتے ہوئے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت
ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: اپنے دلوں میں ثواب کی نیت کرتے ہوئے۔ اور
حضرات شعبی، سدی، قتادہ نے بھی، ابن زید اور ابو صالح رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے: وَتَثْبِيتًا کا معنی وَتَيَقُّنًا ہے یعنی کہ ان
کے دلوں کو بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر ان کے پختہ ہونے کا یہی مفہوم ہے۔ یہ
تینوں اقوال حضرت حسن اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی نسبت زیادہ صحیح اور درست ہیں، کیونکہ وہ معنی جسے ان دونوں نے
اختیار کیا ہے اس کی عبارت میں وَتَثْبِيتًا مصدر غیر مصدر پر محمول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اور یہ جائز نہیں ہوتا مگر مصدر کے

ذکر کے ساتھ اور فعل متقدم کی فصاحت و بیان کے ساتھ، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَاللّٰهُ أَشَدُّ مَقَامًا** (نوح) (اور اللہ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے) اور **وَتَبَيَّنَ إِلَيْهِ تَبَيُّنًا** (المزمل) (اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو) لیکن جب فعل کے ساتھ وضاحت نہ ہو تو ایسا مصدر لانا جائز نہیں ہوتا جو اس کا ہم معنی نہ ہو۔ پھر تو کہے گا: میں اسے فلاں فلاں معنی پر محمول کرتا ہوں اس فعل کے لئے جن کا ذکر پہلے نہیں ہوا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کلام عرب کا وسیع راستہ ہے جس کے بارے تو نے جان لیا ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اگر ایسا ہوتا جیسا کہ حضرت مجاہد نے کہا ہے تو پھر **وَتَبَيَّنَ تَبَيُّنًا** سے ہوتا جیسا کہ تکرمت تکرمت ہے۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول کہ یہ **اِخْتِسَابًا** کے معنی میں ہے، یہ نہیں پہچانا جاسکتا مگر اس طرح کہ اس سے مراد یہ لیا جائے کہ ان دلوں نے احتساب کرتے ہوئے ان کی خوب چھان بین کی اور یہ بعید ہے اور حضرت شعبی کا قول اچھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر اپنے دلوں کو پختہ رکھتے ہوئے۔ کہا جاتا ہے: **ثَبَّتْ فُلَانًا فِي هَذَا الْأَمْرِ** میں نے فلاں کو اس کام میں پختہ کر دیا۔ یعنی میں نے اس کے عزم اور ارادہ کی تصحیح کی اور میں نے اس میں اس کی رائے کو قوی کر دیا، اثبتہ تثبیتاً اور میں نے اسے بہت پختہ کر دیا۔ یعنی ان کے دل اللہ تعالیٰ کے وعدے کے ساتھ یقین رکھتے ہوئے اس میں بہت پختہ ہو گئے۔

اور بعض نے کہا ہے: **وَتَبَيَّنَ تَبَيُّنًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ** یعنی وہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر پختہ کر دے گا ای و تثبیتاً من انفسهم لشواہبها۔ یعنی تاکہ اس کے ثواب کے بارے ان کے دل پختہ ہو جائیں بخلاف اس منافق کے جو ثواب کا لمان بھی نہیں رکھتا۔

قولہ تعالیٰ: **كَمْثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ** اس میں جنة کا معنی باغ ہے اور یہ وہ قطعہ زمین ہوتا ہے جس میں درخت اگائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور یہ لفظ جن اور جنین سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ چھپے ہوتے ہیں اور اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ اور **رَبْوَةٍ** کا معنی ہے: ایسی بلند جگہ جس میں بلندی تھوڑی ہو اور اغلباً اس کے ساتھ مٹی کی کثافت اور کثرت بھی ہو۔ اور جوزمین اس طرح ہوتی ہے اس کی پیداوار اور نباتات اچھی ہوتی ہے۔ اسی لئے خاص طور پر ربوہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ریاض الحزن اس میں سے نہیں ہے جیسا کہ طبری نے گمان کیا ہے۔ بلکہ یہ وہ ریاض ہے جو نجد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ تہامہ کے ریاض سے بہتر ہے اور نجد کی نباتات زیادہ معطر اور خوشبودار ہوتی ہیں۔ اور اس کی ہوا زیادہ ٹھنڈی اور راحت بخش ہوتی ہے اور نجد کو ہی حزن کہا جاتا ہے۔ اور تہامہ کی ہوا سوائے رات کے بہت کم صحتمند اور نفع بخش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک اعرابیہ عورت نے کہا ہے: **زَوْجِي كَلِيلُ تَهَامَةٍ** (میرا خاوند تہامہ کی رات کی مثل ہے) (1) اور سدی نے کہا: **بِرَبْوَةٍ** بمعنی بریادۃ ہے یعنی زمین کا وہ حصہ جو پست ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ **قُلُقَّة** (دشواری، پریشانی) سے عبارت ہے اور **رَبْوَةٍ** کا لفظ **رَبَائِرُ** سے ماخوذ ہے جب وہ بڑھ جائے اس میں اضافہ ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، باب حسن المعاشرة مع الاہل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: سدی کی عبارت کوئی شے نہیں ہے کیونکہ رَبّ کی بناء کا معنی کلام عرب میں زیادتی اور اضافہ کرنا ہے اور اسی سے الربو بلند نفس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رَبَّائِیُوبُ جب ربو (زیادتی) اسے آ لے اور ربا الفرس جب دوڑنے یا گھبراہٹ کے سبب گھوڑے کی سانس پھول جائے۔ اور فراء نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: أَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَّابِیَّةً کہ یہ بمعنی زائدہ ہے۔ (یعنی اس نے انہیں سخت مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا) جیسے کہ تیرا یہ قول ہے: أَرَبِیتُ جب تو اس سے زیادہ لے جو تو نے دیا ہو۔ اور رَبِیْتُ فِی بَنِی فُلَانٍ و رَبِیتُ اِی نَشَاتِ فِیْهِمْ۔ (میں نے ان میں نشوونما پائی) اور خلیل نے کہا ہے: الرَّبُّوَةُ بِلَنْدِ زَمِیْنٍ جو اچھی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے جس میں بلاد عرب میں عرف کے اعتبار سے پانی جاری نہیں ہوتا اور ان کے لئے اس کی مثال بیان فرمائی جسے وہ محسوس کر سکتے ہیں اور اس کا اہداک کر سکتے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ربوۃ سے مراد وہ بلند جگہ ہے جس میں نہریں جاری نہیں ہو سکتیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: أَصَابَهَا وَابِلٌ آخر آیت تک اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں جاری پانی نہیں ہے اور نہ ہی اس زمین کی جنس کا ارہ کیا ہے، جس میں نہریں جاری ہو سکتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ربوۃ ذات قرار و معین کا ذکر کیا ہے اور کلام عرب میں معروف یہ ہے کہ ربوۃ سے مراد وہ جگہ ہے جو اپنے آس پاس سے بلند ہو چاہے اس میں پانی جاری ہو یا نہ جاری ہو۔ اور اس میں پانچ لغات ہیں، رُبُوۃُ راء کے ضمہ کے ساتھ، ابن کثیر، حمزہ، کسائی، نافع اور ابو عمرو رحمہم نے پڑھا ہے۔ اور رُبُوۃُ عاصم، ابن عامر اور حسن رحمہم نے راء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور رِبُوۃُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابواسحاق سبعمی نے را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور رَبَاوۃُ ابو جعفر اور ابو عبد الرحمن نے اس طرح پڑھا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

مَنْ مُنْزِلٍ فِی رَوْضَةٍ بِرِیَاوَةٍ بَيْنَ النَّخِيلِ اِلِیْ بَقِیْعِ الْغَرْقَدِ؟

اور رَبَاوۃُ اشہب نے اسے را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے: بِرِیَاوۃُ اور بِرِیَاوۃُ، اور یہ سب الزابیہ سے ہیں اور اس کا فعل رَبَّائِیُوبُ ہے۔

قولہ تعالیٰ: أَصَابَهَا اس میں ہاضمیر کا مرجع ربوۃ ہے۔ وَاِبِلٌ اس کا معنی ہے: شدید بارش۔ شاعر نے کہا ہے:

مَا رَوْضَةٌ مِنْ رِیَاضِ الْحَزْنِ مُغْشَبَةٌ خَضَاءَ جَادَ عَلَیْهَا وَابِلٌ هَیْطٌ

اس میں وابل ہَیْطٌ موسلا دھار بارش کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

فَاتَتْ، اِی اعطت تو لایا ہو اُکَلَّهَا حمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ مراد وہ پھل ہے جو کھایا جاتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ

ارشاد ہے: تُؤْتِیْ اُکَلَّهَا کُلَّ حَبْنٍ (ابراہیم: 25)

ہر شے میں سے کھائی جانے والی شے کو اُکَلٌ کہا جاتا ہے اور الاکلة سے مراد لقمہ ہے۔۔۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے:

فَانْكَانَ لِلطَّعَامِ مَشْفُوْهُ قَلِیْلًا فَلِیَضْعَ فِیْ یَدِهِ مِنْهُ اُکَلَةٌ اَوْ اُکَلَتِیْنِ (اگر کھانا بہت تھوڑا رہ جائے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ میں

اس سے ایک یا دو لقمے رکھ لے۔) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (1)

1۔ صحیح بخاری، باب اذا اتاه خادمه بطعامه، حدیث نمبر 2370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کی اضافت باغ کی طرف یہ اضافت اختصاص ہے۔ جیسا کہ سرج الفرس اور باب الدار میں اضافت اختصاص ہے ورنہ پھل اس میں سے نہیں ہے جسے باغ کہا جاتا ہے۔

نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اُکَلَّھا ہمزہ کو ضمہ اور کاف کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جو مؤنث کی طرف مضاف ہو۔ اور ابو عمرو نے ان دونوں کا فرق بیان کیا ہے کہ جب اسے مذکر کی طرف مضاف کیا جائے مثلاً اُکَلَّھا یا کسی بھی شے کی طرف مضاف نہ ہو مثلاً اُکَلَّھا خَصِطَ (سبا: 16) تو ابو عمرو نے اسے مشقل پڑھا ہے اور دوسرے دونوں نے مخفف پڑھا ہے۔

اور عاصم، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے ان تمام صورتوں میں جو ہم نے ذکر کی ہیں اسے مشقل پڑھا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُکَلَّ اور اُکَلَّ دونوں ہم معنی ہیں۔

ضَعْفَین یعنی وہ دوسری زمین کے مقابلہ میں دو گنا پھل لایا۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے کہ وہ سال میں دو بار پھل لایا۔ اور پہلا قول زیادہ ہے۔ یعنی اس نے اپنی پیداوار ایک سال میں دی جتنی پیداوار دوسری زمین دو سالوں میں دیتی ہے۔

قوله تعالیٰ: فَإِنْ لَّمْ يُصِيبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بلند زمین کی مدح کی تاکید کے لئے ہے۔ اس طرح کہ اگر اسے موسلا دھار بارش نہ بھی پہنچے تو اسے شبنم ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اور یہی دو گنا پھل نکالنے میں شدید بارش کے قائم مقام ہو جاتی ہے اور یہ زمین کے زرخیز اور طیب ہونے کی وجہ سے ہے۔ مبرد وغیرہ نے کہا ہے: تقدیر کلام میں فطلٌّ یکفیهما۔ (پس شبنم ہی اسے کافی ہو جائے) اور زجاج نے کہا ہے: فالذی یصیبھا طلٌّ (اور وہ جس پر شبنم برے) اور طلٌّ سے مراد کمزوری بارش ہے جس کے قطرے باریک اور بالکل خفیف سے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے یہی کہا ہے اور یہ اس کی مشہور لغت ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے جن میں سے حضرت مجاہد ہیں کہ الطل کا معنی شبنم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مجاز اور تشبیہ ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور اہل لغت نے بیان کیا ہے: وَبَلَّتْ اور اَوْ بَلَّتْ، طَلَّتْ اور أَطَلَّتْ۔ اور الصحاح میں ہے: الطلٌّ سے مراد انتہائی ضعیف اور کمزور بارش اور اس کی جمع الطلال ہے۔ اسی سے آپ کہتے ہیں: طَلَّتِ الْأَرْضُ وَاظْلَمَ النَّدَى زَمِنَ پر شبنم پڑی فہی مَطْلُولَةٌ۔

ماوردی نے کہا ہے: شبنم کی کھیتی بارش کی کھیتی سے دگنی ہوتی ہے اور پیداوار کے لحاظ سے کم ہوتی ہے اور اس میں ہے اور اگرچہ پیداوار اور نفع کم ہے۔

بعض نے کہا ہے: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور اس کا معنی ہے: کمثل الجنة بربوة أصابها وابل فان لم یصربها وابل فطل فانت اکلها ضعیفین۔ یعنی باغ کے اوراق (پتے) بہ ہو گئے اور اس کا پھل دو گنا نکلا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلی تاویل زیادہ صحیح ہے اور تقدیم و تاخیر کی کوئی حاجت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان مخلص بندوں کے خرچ کئے ہوئے مال کے بڑھنے کو جن کے صدقات کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا رہتا ہے جیسا کہ گھوڑے اور اونٹ کے بچے کو بڑھاتا وغیرہ ایسے باغ کے پودوں کے بڑھنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بلند جگہ پر واقع ہو بخلاف اس چکنی چٹان کے جس کی مٹی بہہ گئی

اور وہ خالص پتھر باقی رہ گیا۔

اور مسلم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی آدمی بھی جو اپنی پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور صدقہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے دست قدرت کے ساتھ لے لیتا ہے اور پھر اس کی نشوونما کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے اور اونٹ کے بچے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مثل یا اس سے بھی بڑی ہو جاتی ہے“ اسے مؤطانی بھی روایت کیا ہے۔ (1)

قوله تعالى: وَاللَّهُ يَمَّا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ یہ وعدہ اور وعید ہے۔ زہری نے یَعْمَلُونَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا وہ اس سے تمام لوگ مراد لیتے ہیں یا پھر صرف خرچ کرنے والے مراد لیتے ہیں تو اس صورت میں یہ صرف وعدہ ہے۔

أَيُّدُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ مَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٤﴾

”کیا پسند کرتا ہے کوئی تم میں سے کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اس کے نیچے ندیاں (کھجور اور انگور کے علاوہ) اس کے لئے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں اور آلیا ہوا سے بڑھا پے نے اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو (تو کیا وہ پسند کرتا ہے کہ) پہنچے اس باغ کو بگولہ جس میں آگ ہو پھر وہ باغ جل بھن جائے۔ ایسے ہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں تاکہ تم غور و فکر کرو۔“

قوله تعالى: أَيُّدُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ مَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ الایہ۔ طبری نے سدی سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال ہے اور آپ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے، آپ نے بیان فرمایا: یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریاکاروں کے اعمال کے بارے میں بیان فرمائی ہے جنہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ باطل کر دے گا جن کی طرف وہ زیادہ محتاج ہوگا، جیسا کہ اس آدمی کی مثال جس کا ایک باغ ہو اور اس کے بچے ہوں اور وہ اسے کوئی نفع اور فائدہ نہ دیں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور باغ کو بگولہ پہنچے یعنی ایسی تیز آندھی جس میں آگ ہو اور وہ جل جائے اور وہ اسے گم کر دے اس وقت جب وہ اس کا زیادہ محتاج ہو۔ اور ابن زید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد پڑھا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالسَّنِ وَالْأَذَى الْآيہ (بقرہ: 264) پھر فرمایا: پھر اس بارے میں مثال بیان فرمائی اور فرمایا: أَيُّدُ أَحَدُكُمْ الْآيہ۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ اس سے واضح اور زیادہ بین ہے جسے طبری نے ترجیح دی ہے اور یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال نہیں ہے۔ یہی سیاق کلام کا تقاضا ہے۔ اور رباوہ معنی جو اس سیاق کے سوا میں ہے تو وہ ہر منافق یا کافر کے حال کے مشابہ ہے جو ایک عمل کرتا ہے اور وہ گمان رکھتا ہے کہ وہ خوب اچھا کر رہا ہے اور جب وہ حاجت کے وقت وہاں آئے گا تو وہ کوئی شے نہ پائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ مثال اس آدمی کی ہے جس نے غیر اللہ کے لئے عمل کیا چاہے وہ منافق ہو یا کافر ہو۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ مگر بخاری میں آپ سے اس کے خلاف ثابت ہے۔ امام بخاری نے حضرت عبید بن عمیر سے روایت بیان کی ہے (1)، انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو ایک دن کہا: تم کیا رائے رکھتے ہو یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی 'أَيُّوْذُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُوْنَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ ثَمَرِهَا'؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے ہو گئے اور فرمایا: تم کہو: ہم جانتے ہیں یا ہم نہیں جانتے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: اے امیر المومنین! میرے دل میں اس کے بارے ایک شے آرہی ہے۔ آپ نے فرمایا: اے میرے بھتیجے! کہو اور اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھو، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ ایک عمل کی مثال بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کون سا عمل ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: غنی اور سخی آدمی کے عمل کی جو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی میں کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک شیطان بھیج دیا اور اس نے گناہ کے عمل کئے یہاں تک کہ اس نے پہلے عمل کو جلا دیا (2) اور ایک روایت میں ہے: جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا اور اس کی موت قریب آ گئی تو بد بختی کے اعمال میں سے کسی عمل پر اس کا خاتمہ ہوا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے خوش ہوئے (اور اس رائے کو پسند فرمایا) اور ابن ابی ملیکہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا: یہ ایک مثال ہے جو ایسے انسان کی بیان کی گئی ہے جو عمل صالح کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آخری عمر کو پہنچتا ہے اور زیادہ اس کا محتاج ہوتا ہے تو اس وقت برائی اور گناہ کا عمل کر لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ایک نظر اور رائے ہے جس کے ساتھ آیت کو ہر اس شے پر محمول کیا جاسکتا ہے جو اس کے الفاظ کے تحت داخل ہو۔ اور اسی طرح مجاہد، قتادہ اور ربیع وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ کھجور اور انگور کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ ان دونوں کو تمام درختوں پر فضل و شرف حاصل ہے۔

اور حسن نے جنات جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔ 'تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ' اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ 'لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ' یہ ماضی کا مستقبل پر عطف ہے اور وہ 'تَكُوْنَ' ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ 'يُوْذُ' ہے۔ اور کہا گیا ہے: تقدیر عبارت ہے: وقد اصابه الكبر۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معنی پر محمول ہے، کیونکہ معنی یہ ہے: 'أَيُّوْذُ أَحَدُكُمْ أَنْ لَوْ كَانَتْ لَهُ جَنَّةٌ'۔ (کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اگر اس کا ایک باغ ہو۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واو حالیہ ہے اور اسی طرح وَلَهُ میں بھی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ۔ حسن نے کہا ہے: إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ ایسی ہوا جس میں شدید سردی ہو۔ زجاج نے کہا ہے: لغت میں الاعصار سے مراد ایسی شدید اور سخت ہوا ہے جو زمین سے آسمان کی طرف عمود (خط عمودی) کی طرح چلتی ہے اور یہی وہ ہے جسے الزوبعہ کہا جاتا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: الزوبعة جنات کے سرداروں میں سے ایک سردار ہے اور اسی سے الاعصار کا نام زوبعہ رکھا گیا

ہے۔ اور کہا جاتا ہے: افر زوبعہ اور یہ وہ ہوا ہے جو غبار اڑاتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے گویا وہ عمود ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ الا عصار سے مراد وہ ہوا ہے جو بادلوں کو چلاتی ہے جن میں گرج اور چمک ہوتی ہے۔ اور مہدوی نے کہا: اس کو اعصار کہا گیا ہے کیونکہ یہ لپٹ جاتی ہے کپڑے کی طرح جب اسے نچوڑا جائے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول ضعیف ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: بلکہ یہ صحیح ہے، کیونکہ یہی محسوس مشاہدہ ہے کیونکہ یہ عمودی شکل میں لپٹے ہوئے اوپر چڑھتی ہے اور کہا گیا ہے: بلاشبہ ہوا کو اعصار کہا گیا ہے، کیونکہ یہ بادلوں کو نچوڑ دیتی ہے اور بادل مُعَصِرَات کہلاتے ہیں یا تو اس لئے کہ یہ (بارش) اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس یہ عورتوں میں سے معصر کی طرح ہیں یا اس لئے کہ یہ ہواؤں کے سبب نچڑ جاتے ہیں۔

ابن سیدہ نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے معصرات کی تفسیر ریح (ہواؤں) سے کی ہے نہ کہ بادلوں سے۔

ابن زید نے کہا ہے کہ اعصار سے مراد سخت آندھی اور گرم ہوا ہے اور اسی طرح سدی نے بھی کہا ہے کہ اعصار سے مراد ہوا اور سخت گرم آگ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: ایسی ہوا جس میں شدید گرمی اور تپش ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سخت گرمی میں بھی ہوتی ہے اور سخت سردی میں بھی ہوتی ہے اور یہ سب جہنم کی گرمی اور اس کی سانس لینے سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا عَنْ الصَّلَاةِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فِیْحِ جَهَنَّمَ جب گرمی شدید ہو جائے تو نماز کو ٹھنڈا کرو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی گرمی میں سے ہے۔ اور ان النار اشتکت الی ربھا الحدیث (1)۔ (اور بے شک آگ نے اپنے رب کے پاس شکایت کی۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے، یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے کافروں اور منافقین کے لئے بیان فرمائی ہے، جیسا کہ اس آدمی کی حالت جس نے ایک باغ لگایا اور اس میں کثرت سے پھل اگائے پھر اسے بڑھاپا آپہنچا اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو۔ ... اولاد سے مراد بچے، بچیاں اور غلام ہیں۔ پس اس کا گزارا اور اس کی اولاد کا گزارا اسی باغ سے ہو، تو اللہ تعالیٰ اس باغ پر ایسی ہوا چلا دے جس میں آگ ہو اور وہ اسے جلا کر بھسم کر دے اور اس کے پاس کوئی اور قوت و طاقت نہ ہو کہ وہ دوبارہ اسے لگا سکے اور نہ ہی اس کے بیٹوں کے پاس خیر و نفع ہو کہ وہ اپنے باپ کی طرف رجوع کریں۔ اسی طرح کافر اور منافق ہے جب وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس پیش ہوں گے تو اس کے لئے (بھاگنے کا) کوئی ذریعہ نہ ہوگا، اسے اٹھایا جائے گا اور وہ دوسری بار حاضر ہو جائے گا۔ جیسا کہ اس کے پاس کوئی قوت نہیں کہ وہ اپنا باغ دوسری بار لگا سکے۔ اور نہ اس کے پاس وہ ہے جس کا وہ اپنی کبرنی کے وقت محتاج ہے اور اس کی اولاد کمزور ہے اور اس سے مستغنی ہے۔

كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ اس سے مراد ہے تاکہ تم میری عظمت اور میری ربوبیت کی طرف رجوع کرو اور میرے سوا کسی کو دوست نہ بناؤ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: تاکہ تم دنیا کے زوال اور اس کی فنا اور آخرت کے آنے اور اس کی بقا میں غور و فکر کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طِبَّتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنْ

1۔ صحیح بخاری، باب الإبراد بالظہر فی شدۃ الحر، حدیث نمبر 502-504، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الْأَرْضَ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغِشُّوا
فِيهِ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢١٥﴾

”اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے اور نہ ارادہ کرو ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو حالانکہ (اگر تمہیں کوئی ردی چیز دے تو) تم نہ لو اسے بجز اس کے کہ چشم پوشی کر لو اس میں اور (خوب) جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے ہر تعریف کے لائق ہے۔“

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا انْفِقُوا۔ یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امت کو ہے اور یہاں انفاق سے جو معنی مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب، عبیدہ سلمانی اور ابن سیرین رحمہم اللہ نے کہا ہے: اس سے مراد وہ زکوٰۃ ہے جو فرض کی گئی ہے۔ اس میں عمدہ شے کی بجائے ردی اور گھٹیا چیز خرچ کرنے سے لوگوں کو منع کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت براء بن عازب، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے اور لوگوں پر مستحب قرار دیا گیا ہے کہ وہ نفلی صدقہ و خیرات نہ کریں مگر عمدہ اور جید چیز کے ساتھ۔ اور آیت دونوں وجہوں کو شامل ہے لیکن صاحب زکوٰۃ کا تعلق اس اعتبار سے ہے کہ اس آیت کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اسے ردی شے دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ فرض زکوٰۃ کے ساتھ مخصوص ہے اور رہا نفلی صدقہ تو جس طرح آدمی کے لئے نفی صدقہ میں قلیل شے دینا جائز ہوتا ہے تو اسی طرح اس کے لئے کم درجے کی شے نفلی صدقہ میں دینا جائز ہوگا اور درہم کھجور سے بہتر اور اچھا ہے۔

اور ندب والوں نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اِفْعَلْ کالْفِعْلِ (مراد صیغہ امر ہے) ندب و استحباب کی صلاحیت رکھتا ہے جس طرح وہ فرض کی صلاحیت رکھتا ہے اور ردی اور گھٹیا شے دینے سے نفلی صدقہ میں بھی اسی طرح منع کیا گیا ہے جس طرح فرض میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کے لئے عمدہ اور اچھی شے دی جائے۔ اور حضرت براء رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے ردی کھجوروں کا ایک خوشہ لٹکایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: بئسما علق کتنی ردی شے ہے جو اس نے لٹکائی ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ عنقریب یہ مکمل روایت آئے گی۔ اس قول کی بنا پر امر ندب و استحباب پر دلالت کرتا ہے، لہذا انہوں نے مستحب قرار دیا کہ وہ نفلی صدقہ میں اچھی اور عمدہ شے کے سوا کوئی نہ دیں۔

اور جمہور متاویلین نے کہا ہے: مِنْ طِبَالَةٍ کا معنی ہے: عمدہ اور پسندیدہ شے میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔ اور ابن زید نے

1۔ ابن ماجہ، باب النہی عن یغیرہا، حدیث نمبر 1811، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے: حلال چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ کسب (کمائی) وہ ہوتا ہے جو بدن کی مشقت اور محنت سے حاصل ہو۔ اور یہی اجارہ ہے اس کا حکم آگے آئے گا یا تجارت میں باہم گفتگو ہوتی ہے اور وہ بیع ہے اس کا بیان آگے آئے گا اور میراث اس میں داخل ہے کیونکہ غیر وارث نے اسے کمایا ہے، (حاصل کیا ہے)۔

حضرت سہل بن عبد اللہ نے بیان کیا ہے کہ ابن مبارک سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو کچھ کمانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی کمائی سے ارادہ اور نیت یہ کرتا ہو کہ وہ اس سے صلہ رحمی کرے گا، جہاد کرے گا اور وہ نیکی اور خیر کا کام کرنے لگتا ہے اور اس غرض سے کسب کی آفات اور مشقتوں میں داخل ہو جاتا ہے تو انہوں نے کہا: اگر اس کے پاس زندگی گزارنے کے لئے اتنی مقدار میں سامان اور قوت موجود ہو جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے روک سکتا ہو (یعنی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت اسے نہ پڑے) تو پھر اس کسب کو ترک کرنا افضل ہے، کیونکہ جب اس نے حلال طلب کیا اور حلال میں ہی خرچ کیا تو اس سے اس کی کمائی کے بارے اور اس کے خرچ کرنے کے بارے سوال کیا جائے گا اور اسے چھوڑنا زہد ہے کیونکہ زہد حلال چھوڑنے میں ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: اس آیت کے مطابق والد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کمائی سے کھا سکتا ہے اور اس لئے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تمہاری اولاد تمہاری عمدہ اور اچھی کمائی میں سے ہے۔ پس تم اپنی اولاد کے اموال میں سے خوشی خوشی کھاؤ۔“ (1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ یعنی نباتات، معادن اور رکاز (زمین میں قدرتی طور پر گڑی ہوئی دھاتیں) یہ تین ابواب ہیں۔ یہ آیت ان تینوں کو متضمن ہے۔

پس ربی نباتات، دارقطنی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے سنت جاریہ یہ ہے ”کہ پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔“ اور ایک وسق ساٹھ صاع کا ہے اور وہ گندم، جو، کھجور اور کشمش میں سے تین سو صاع ہیں۔ اور زمین جو سبزہ وغیرہ اگاتی ہے اس میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ایک قوم نے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے لئے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ۔ بے شک یہ آیت عام ہے اور زمین سے قلیل یا کثیر مقدار میں پیدا ہونے والی تمام اقسام کی چیزوں کو شامل ہے اور انہوں نے امر کے ظاہر کو دیکھا کہ وہ وجوب کے لئے ہے۔ اس کا مکمل بیان سورہ انعام میں آئے گا۔

اور جہاں تک معدن کا تعلق ہے تو ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جانوروں کا زخم رائیگاں ہے، کنواں ہدر ہے، معدن بھی ہدر ہے اور رکاز میں خمس ہے (2)۔“ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ معادن کا

1۔ ابو داؤد، باب فی الرجل یا کل من مال ولده، حدیث نمبر 3061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب فی الرکاز الخمس، حدیث نمبر 1403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حکم رکاز کے حکم کے سوا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے معادن اور رکاز کے مابین دو فاصلہ کے ساتھ فرق بیان کیا ہے۔ اگر دونوں میں حکم ایک جیسا ہوتا تو آپ فرماتے: معدن ہدر ہے اور اس میں خمس ہے۔ اور جب آپ نے یہ فرمایا: وفي الركاز الخمس تو اس سے معلوم ہوا کہ رکاز کا حکم معدن کے حکم کے سوا ہے اس بارے میں جو اس سے لیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

رکاز دراصل لغت میں اس سے مراد وہ سونا، چاندی اور جواہرات ہیں جو زمین میں گڑے ہوئے ہوں۔ تمام فقہاء کے نزدیک اسی طرح ہے، کیونکہ وہ سونے چاندی کے ان ٹکڑوں کے بارے میں کہتے ہیں جو معدن میں پائے جاتے ہیں وہ زمین میں گڑے ہوئے ہیں وہ عمل، محنت اور مشقت سے نہیں پائے جاتے، ان میں خمس ہے: کیونکہ وہ رکاز ہے اور امام مالک سے روایت ہے کہ معدن میں سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کا حکم اس شے کا حکم ہے جس میں عمل اور محنت کی مشقت کی جاتی ہے جو کچھ معدن سے نکالا جاتا ہے وہ رکاز میں داخل ہے۔ پہلا قول ہی آپ کے مذہب کا حاصل ہے اور اسی پر جمہور فقہاء کا فتویٰ ہے۔

اور عبد اللہ بن سعید ابن ابی سعید مقبری نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے رکاز کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ سونا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین میں اس دن پیدا فرمایا جس دن آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا۔“ یہ عبد اللہ بن سعید متروک الحدیث ہیں۔ اسے ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند سے بھی یہ مروی ہے اور وہ صحیح نہیں ہے، اسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ علماء کی جماعت کے نزدیک دور جاہلیت میں لوگوں کے دفن کئے ہوئے اموال بھی رکاز ہیں وہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کرتے بشرطیکہ اس کا دفن اسلام سے پہلے اموال عادیہ (پرانے اموال) میں سے ہو۔ اور وہ جو زمانہ اسلام کے اموال میں سے ہو تو ان کے نزدیک اس کا حکم لقطہ کے حکم کی مثل ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ رکاز جب پایا جائے تو اس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے بیان کیا ہے: زمانہ جاہلیت کے دینوں میں سے جو سرزمین عرب میں یا اس ہموار اور جنگلی زمین میں پایا جائے جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کی ملکیت میں آئی ہو تو وہ دینہ اسی کے لئے ہوگا جس نے اسے پایا اور اس میں خمس ہوگا اور جو مسلمانوں کی زمین میں پایا جائے تو وہ لقطہ کی مثل ہوگا۔ مزید فرمایا: اور جو دینہ جنگ کے علاقے میں پایا جائے تو وہ اس پوری جماعت (لشکر) کے لئے ہوگا جس نے اسے فتح کیا نہ کہ صرف پانے والے کے لئے اور جو کچھ صلح والے علاقے سے پایا جائے تو وہ اس شہر والوں کے لئے ہوگا نہ کہ عام لوگوں کے لئے اور اس میں پانے والے کے لئے کوئی شے نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ اہل دار میں سے ہو تو پھر وہ ان کے سوا اس کے لئے ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ تمام صلح کرنے والوں کے لئے ہوگا۔

اسماعیل نے کہا ہے: بلاشبہ رکاز کا حکم مال غنیمت کے حکم کے ساتھ ہے کیونکہ وہ کافر کا مال ہے جسے مسلمان نے پایا ہے۔ پس اسے اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے جو کافر کو قتل کرے اور اس کا مال لے لے۔ پس اس کے لئے کل مال کے چار خمس ہوں گے۔

ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک ساز و سامان، جواہرات، لوہا، تانبہ اور اسی طرح کی دیگر چیزوں میں جو بطور رکاز پائی جاتی ہیں ان کے بارے میں کہتے تھے کہ ان میں خمس ہے۔ پھر آپ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا: میں اس میں کوئی شے نہیں

دیکھتا۔ پھر آخری بار جب ہم آپ سے جدا ہوئے تو آپ نے کہا: اس میں خمس ہے۔ اور عموم حدیث کی بنا پر یہی صحیح ہے اور اسی پر جمہور فقہاء ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہ اللہ نے ایسے رکاز کے بارے میں جو گھر میں پایا جاتا ہے کہا ہے: بلاشبہ یہ گھر کے مالک کے لئے ہے نہ کہ پانے والے کے لئے اور اس میں خمس بھی ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس کے برعکس کہا ہے کہ وہ پانے والے کے لئے ہے نہ کہ صاحب خانہ کے لئے اور یہی ثوری کا قول ہے اور اگر وہ جنگل میں پایا جائے تو پھر تمام کے قول کے مطابق وہ پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں خمس ہوگا اور ان کے نزدیک صلح اور جنگ کی زمین کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور اسی طرح ان کے نزدیک عرب کی زمین اور دوسری زمین سب برابر ہے اور ان کے نزدیک پانے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کا خمس اپنے لئے روک لے جبکہ وہ خود محتاج ہو اور اس کے لئے وہ مساکین کو دینا بھی جائز ہے۔

اہل مدینہ اور اصحاب مالک میں سے کچھ ہیں جو ان میں سے کسی شے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا ہے: برابر ہے رکاز جنگ والی زمین یا صلح کی زمین میں پایا جائے یا سرزمین عرب میں ہو یا علاقہ حرب میں جب وہ کسی ایک کی ملکیت نہ ہو اور نہ کسی ایک نے اس کا دعویٰ کیا ہو تو وہ اپنے پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں ظاہر حدیث کے عموم کی بنا پر خمس ہوگا اور یہی لیث، عبد اللہ بن نافع، شافعی اور اکثر اہل علم کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جو معادن سے حاصل کی جاتی ہیں اور کانوں سے نکلتی ہیں ان میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: سونا یا چاندی میں سے جو کچھ کانوں سے نکلتا ہے اس میں کوئی شے واجب نہیں ہوتی یہاں تک کہ سونا بیس مثقال یا چاندی پانچ اوقیہ ہو جائے۔ پس جب یہ دونوں چیزیں اس مقدار کو پہنچ جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اور جو مقدار اس سے زائد ہو اس کے حساب سے اس کی زکوٰۃ بھی ہوگی جب تک وہ معدن میں پائی جائے اور اگر ایک بار وہ ختم ہو جائے اور پھر دوبارہ اس کے بعد پائی جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ شروع کر دی جائے گی اور ان کے نزدیک رکاز کھیتی کی طرح ہے کہ جب کوئی شے نکلے گی تو اسی وقت اس سے زکوٰۃ لے لی جائے گی اور اس پر سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

حنون نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس کی کئی کانیں ہوں کہ وہ ان میں سے ایک میں جو کچھ ہے اسے دوسری سے حاصل ہونے والی شے کے ساتھ نہیں ملائے گا اور نہ ہی زکوٰۃ ادا کرے گا مگر تبھی جب ان میں سے ہر ایک میں سے دو سو درہم یا بیس دینار حاصل ہوں۔ اور محمد بن مسلمہ نے کہا ہے: وہ بعض کو بعض کے ساتھ ملا دے گا اور تمام کی اکٹھی زکوٰۃ ادا کرے گا جیسا کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار میں کیا جاتا ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہ اللہ نے کہا ہے: معدن رکاز کی مثل ہے۔ پس سونے یا چاندی میں سے جو کچھ معدن میں پایا گیا خمس نکالنے کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کا اعتبار کیا جائے گا۔ پس جس نے اپنے ہاتھ سے محنت کے ساتھ وہ شے حاصل کی جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو سال مکمل ہونے پر وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر اس پر سال گزر جائے اور

وہ نصاب اس کے پاس ہو۔ یہ تب ہے جب اس کے پاس اتنا سونا یا چاندی نہ ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہو۔ اور اگر اس کے پاس اس میں سے اتنا ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اسے اس کے ساتھ ملا لے اور اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اسی طرح ان کے نزدیک سال کے دوران جو نفع حاصل ہوگا اسے اپنی جنس کے نصاب کے ساتھ ملایا جائے گا اور اصل نصاب پر سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یہی ثوری کا قول ہے۔

اور مزنی نے امام شافعی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ شے جس میں میں شک کرتا ہوں وہ وہی ہے جو معادن سے نکلتی ہے۔ مزنی نے کہا ہے: ان کی اصل کی بنا پر اولیٰ یہ ہے کہ جو کچھ معدن سے نکلتا ہے وہ فائدہ اور نفع ہو وہ اسے نکالنے کے بعد سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

اور لیث بن سعد نے کہا ہے: سونا اور چاندی میں سے جو کچھ بھی معادن سے نکلتا ہے وہ بمنزلہ نفع اور فائدہ کے ہے وہ نئے سرے سے اس پر سال پورا کرے گا۔ اور یہی امام شافعی کا اس بارے میں قول ہے جسے مزنی نے ان کے مذہب سے حاصل کیا ہے۔

اور اس کے بارے میں داؤد اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: جب اس پر ایسے مالک کے پاس پورا سال گزر جائے جس کی ملکیت صحیح ہو (تو اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی) کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: ”جس نے مال حاصل کیا اس پر زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے“ اسے ترمذی اور دارقطنی نے بیان کیا ہے۔ (1)

اور انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے عبد الرحمن بن انعم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفہ قلوب میں سے ایک قوم کو کچھ سونا عطا فرمایا جو ابھی اپنی مٹی میں ملا ہوا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ یمن سے بھیجا تھا۔ (2)

حضرت امام شافعی نے کہا ہے: مؤلفہ قلوب کا حق زکوٰۃ میں ہے، تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ معادن کا طریقہ وہی ہے جو زکوٰۃ کا طریقہ ہے۔ (یعنی ان کے احکام ایک جیسے ہیں۔)

امام مالک کی دلیل حضرت ربیعہ بن ابی عبد الرحمن کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو معادن قبلیہ (☆) عطا فرمائیں اور یہ الفرع (☆☆) کی طرف میں واقع ہیں اور ان معادن سے آج تک صرف زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یہ حدیث منقطع الاسناد ہے۔ محدثین اس قسم کی حدیث سے استدلال نہیں کرتے لیکن آپ نے عمل کیا ہے اور ان کے نزدیک مدینہ منورہ میں اس کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور اسے در اور دی نے ربیعہ سے، انہوں نے حارث بن بلال المزنی

1۔ سنن ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 572، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3095، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ القبلیہ (بالبحرین) یہ منسوب ہے قبل کی طرف جو ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے اور مدینہ طیبہ سے پانچ دنوں کے فاصلے پر ہے۔

☆☆ الفرع: یہ السقیاء سے بائیں جانب ربذہ کے نواح میں ایک گاؤں ہے۔ اس کے اور مدینہ طیبہ کے درمیان مکہ کی راہ پر آٹھ برید کا فاصلہ ہے اور یہ بھی لہا کیا ہے کہ چار راتوں کی مسافت ہے۔

سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اسے بزار نے ذکر کیا ہے اور اسے کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو قبلیہ کی ساری کانیں عطا فرمائیں جو وہاں کی بلند زمین میں تھیں اور پست زمین میں تھیں۔ اور قدس (مشہور پہاڑ) سے وہ زمین عطا فرمائی جو کاشت کی صلاحیت رکھتی تھی اور آپ نے انہیں کسی مسلمان کا حق نہیں دیا۔ اسے بزار نے بھی ذکر کیا ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کے ضعف پر اجماع کیا ہے۔ یہ حکم ان چیزوں کا ہے جنہیں زمین نکالے اور عنقریب سورۃ النحل میں ان چیزوں کا حکم آئے گا جو سمندر سے نکلیں کیونکہ وہ بھی زمین کا قسم ہے اور سورۃ الانبیاء (1) میں حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا معنی بیان ہوگا: العجاء جرحها جبار ہر ایک کا بیان اپنے محل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ۔ تَيَمَّمُوا کا معنی تقصدوا ہے۔ یعنی تم قصد و ارادہ نہ کرو۔ عنقریب سورۃ النساء میں عرب اشعار سے اس پر شواہد ذکر ہوں گے کہ التیمم بمعنی التقصد ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آیت اس پر دلیل ہے کہ کمائی ہوئی شے طیب اور عمدہ بھی ہوتی ہے اور گھٹیا اور ردی بھی۔ امام نسائی نے حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے اس آیت کے بارے روایت کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَا تَتَّبِعُوا الْخَيْبَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ فرمایا: وہ جُعو ر اور لون حُبِیق (یہ دونوں کھجور کی انتہائی ردی اور گھٹیا اقسام میں سے ہیں)۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو صدقہ میں لینے سے منع فرمایا ہے اور دارقطنی نے حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کے بارے حکم ارشاد فرمایا، تو ایک آدمی ایسی کچی کھجوروں کا خوشہ لے کر آیا (جن کے پکنے اور مکمل ہونے کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ ہوئی تھی)..... سفیان نے کہا: یعنی بالکل ناکارہ اور ردی کھجوریں..... تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ”یہ کون لے کر آیا ہے؟“ اور کوئی کوئی شے بھی نہیں لاتا ہے مگر وہ اس کی طرف منسوب ہوتی ہے جو اسے لے کر آتا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَتَّبِعُوا الْخَيْبَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ۔ راوی نے بیان کیا اور حضور نبی مکرم ﷺ نے جُعو ر اور لون الحُبِیق سے منع فرمایا کہ ان دونوں (قسموں) کو صدقہ میں لیا جائے۔ زہری نے کہا ہے: یہ دونوں قسمیں مدینہ کی کھجوروں میں سے ہیں (2)..... اور اسے ترمذی نے حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث سے روایت کیا ہے (3) اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

علامہ طبری اور نحاس نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وَلَا تَأْمَنُوا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور حضرت مسلم بن جندب نے وَلَا تَيْتَمُونَا کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر نے تَيْتَمُونَا یا کو مشدد پڑھا ہے اور اس لفظ میں کئی لغات ہیں ان میں سے أَمِنْتُ الشَّيْءَ پہلی میم مخفف اور أَمِنْتُ پہلی میم مشدد، اور يَتِمُّنَا اور تَيْتَمُنَا

1۔ ابو داؤد و فی اقطاء الارضین، حدیث نمبر 2661، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابو داؤد، ہاب ما لا یجوز من الشربة فی الصدقة، حدیث نمبر 1369، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

3۔ سنن ترمذی، باب ومن سورة البقرة، حدیث نمبر 2913، نساء القرآن، پہلی کیشنز

ہیں۔ اور ابو عمرو نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے وَلَا تُؤْمِنُوا تَاءِ مضمومہ کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: مِنْهُ تُنْفِقُونَ علامہ جرجانی نے کتاب ”نظم القرآن“ میں کہا ہے کہ لوگوں میں سے ایک فریق نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد الْحَبِیْثِ پر کلام مکمل ہے۔ پھر خبیث کے وصف میں دوسری خبر کی ابتدا کی اور فرمایا: مِنْهُ تُنْفِقُونَ اور تم ردی چیز نہ لو بجز اس کے کہ تم نرمی کا برتاؤ کرو، گویا یہ معنی لوگوں کے لئے عتاب اور ڈانٹ ہے۔ اور مِنْهُ کی ضمیر الْحَبِیْثِ کی طرف راجع ہے۔ اور الْحَبِیْثِ سے مراد انتہائی گھٹیا اور ردی ہے۔ علامہ جرجانی نے کہا ہے: دوسرے فریق نے کہا ہے کہ کلام قول باری تعالیٰ مِنْهُ تک متصل ہے اور مِنْهُ میں ضمیر مَا كَسَبْتُمْ کی طرف راجع ہے۔ اور تُنْفِقُونَ گو حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: اَنَا أَخْرَجَ أَجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَلَسْتُمْ بِأَخْذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغِصُّوا فِيهِ یعنی تم اپنے قرضوں اور اپنے حقوق میں سے لوگوں سے نہیں لیتے مگر یہ کہ تم اس بارے میں نرمی کا برتاؤ کرو اور اپنے حقوق میں سے کچھ چھوڑ دو، حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اس پر راضی نہیں ہوتے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے ہو۔ اس کا یہ معنی حضرت براء بن عازب، حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے اور تم اسے (ردی کو) نہ لو اگرچہ تم اسے بازار میں پاؤ کہ اسے بیچا جا رہا ہے مگر یہ کہ وہ تمہارے لئے اس کے ثمن کم کر دے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ دونوں قول آیت کے زکوٰۃ فرضیہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتے ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے: اگر یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا: وَلَسْتُمْ بِأَخْذِيهِ کیونکہ ردی اور عیب ناک چیز فرض میں کسی بھی حال میں لینا جائز نہیں ہوتا، نہ چشم پوشی کے طریقہ پر اور نہ اس کے سوا کسی طریقہ پر، البتہ چشم پوشی کے بغیر بھی نفل میں لی جاسکتی ہے۔

اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: وَلَسْتُمْ بِأَخْذِيهِ اگر تمہیں ہدیہ دیا جائے (تو تم ردی شے نہ لو) إِلَّا أَنْ تُغِصُّوا فِيهِ مگر یہ کہ تم ہدیہ دینے والے سے حیاء کرو اور اس سے وہ شے قبول کر لو جس کی نہ تمہیں حاجت ہے اور نہ وہ شے فی نفسہ کوئی قدر و منزلت رکھتی ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت کے نفلی صدقہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتا ہے اور ابن زید نے کہا ہے: اور تم حرام چیز نہ لو مگر یہ کہ تم اس کے مکروہ ہونے کے بارے میں اغماض برتو۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: إِلَّا أَنْ تُغِصُّوا فِيهِ۔ جمہور کی قراءت اسی طرح ہے۔ یہ اغضض الرجل فی امر کذا سے ہے۔ جب آدمی کسی کام میں تساہل اور نرمی برتے اور اپنے بعض حق کے ساتھ راضی ہو جائے اور بعض سے درگزر کر لے اور اسی معنی میں طرماح کا قول ہے:

لَمْ يَفْتِنَا بِالْوَتْرِ قَوْمٌ دَلَدُوا نَ أَنْاسَ يَرْضَوْنَ بِالْإِغْمَاضِ

کسی قوم نے وتر کے بارے میں ہمیں فتویٰ نہیں دیا اور سہولت کے لئے لوگ بعض حق کے ساتھ راضی ہو جاتے ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تغبض العین سے لیا گیا ہو کیونکہ جو مکروہ اور ناپسندیدہ شے پر صبر کا ارادہ رکھتا ہے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

اَلِیْ کُمْ وَکُمْ اَشِیْاءٌ مِنْکُمْ تُرِیُّنِیْ اُغْبِضُ عَنْهَا لَسْتُ عَنْهَا بَذِیْ عَنِ
کتنے تک اور تیری طرف سے کتنی اشیاء مجھے شک میں ڈالتی ہیں میں ان سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں میں ان سے اندھا نہیں ہوں۔

اور یہ مکروہ کے وقت اغضاء (آنکھ بند کرنا) کی طرح ہے۔ اور نقاش نے یہی معنی اس آیت میں ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مکی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یا یہ عربوں کے اس قول سے ہے: اُغْبِضُ الرَّجُلَ اِذَا اَتٰی غَا مِضًا مِنْ الْأُمْرِ۔ (یعنی جب کوئی کسی کام میں نرمی برتے و کہا جاتا ہے: اغضب الرجل۔ (آدمی نے نرمی کا سلوک کیا۔) جیسا کہ تو کہتا ہے: اُغْبِضُ یعنی وہ عُبَّان آیا۔ اور اغْزَفُ یعنی وہ عراق آیا اور انجد و اغور، یعنی وہ نجد اور غور آیا اور غور سے مراد تہامہ ہے، یعنی وہ اسے لینے کے لئے کوئی تاویل تلاش کرتا ہے۔ زہری نے اسے تاء کے فتح اور میم کے کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور ان ہی سے تُغْبِضُوا بھی مروی ہے۔ یعنی تاء کے ضمہ، غین کے فتح اور میم کے کسرہ اور اس کی شد کے ساتھ۔ پس پہلی قراءت اس معنی کی بناء پر ہے تم اپنے بائع سے اس کا سودا ختم کر دو کہ وہ تمہارا بھاؤ کم کر دے۔

اور دوسری قراءت اور یہی حضرت قتادہ کی قراءت ہے جو کہ نحاس نے ذکر کی ہے۔ یہ معنی ہے کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔ ابو عمرو والدانی نے کہا ہے کہ زہری کی دونوں قراءتوں کا معنی ہے: ”یہاں تک کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔“ اور مکی نے حسن سے بیان کیا ہے: اِلَّا اَنْ تُغْبِضُوا یعنی میم مشددا اور مفتوح ہے اور قتادہ نے تُغْبِضُوا بھی قراءت کی ہے یعنی تا کے ضمہ، غین کے سکون اور میم مخفف مفتوح کے ساتھ۔ ابو عمرو والدانی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تمہارے لئے اس کی قیمت کم کر دی جائے۔

اسے نحاس نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے اور ابن جنی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اس حال میں پائے جاؤ کہ تم نے تاویل کے سبب یا نرمی کے سبب معاملے میں چشم پوشی کر لی ہے اور تم نے ادنیٰ چیز اپنے لئے لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: اَحَدَتِ الرَّجُلَ وَجَدْتَهُ مَحْمُودًا۔ (میں نے آدمی کی تعریف کی اور میں نے اسے محمود پایا) اسی طرح کی کئی مثالیں ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جمہور کی قراءت تجاوز (درگزر کرنے) اور آنکھیں بند کرنے کے معنی دیتی ہے، کیونکہ اُغْبِضُ غَمَضَ کے قائم مقام ہے۔ اور اسی بنا پر معنی یہ ہے یہاں تک کہ تم اسے لینے میں غور و فکر اور تاویل سے آنکھیں بند کرتے ہوئے آؤ۔ یا تو اس کے حرام ہونے کی وجہ سے ابن زید کے قول کے مطابق اور یا پھر اس لئے کہ ایک ہدیہ ہے یا اسے قرض میں لیا گیا ہے۔

دوسروں کے قول کے مطابق۔

اور مہدوی نے کہا ہے جنہوں نے تَغْبِضُوا پڑھا ہے تو معنی یہ ہے تم اسے لینے سے اپنی بصیرت کی نگاہیں بند رکھتے ہو۔ جوہری نے کہا ہے: غَبَضْتُ عَنْ فلان کا معنی ہے جب بیع یا شرا کے معاملہ میں تو اس پر نرمی کرے۔ اور چشم پوشی کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَسْتُمْ بِاِخْذِيهِ اِلَّا اَنْ تَغْبِضُوْا فِيْهِ کہا جاتا ہے: اُغْبِضَ لِيْ فِيمَا بَعْتَنِي۔ (میرے لئے چشم پوشی اور نرمی کی گئی اس میں جو تو نے مجھے بیچی) گویا تو اس سے زیادتی کا ارادہ رکھتا ہے اس کے ردی ہونے کے سبب اور اس کے دشمن میں سے کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اَنْ يَّحِلَّ نَصْبٌ میں ہے اور تقدیر کلام ہے اِلَّا بِاَنْ۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ اللہ تعالیٰ نے صفت غنی پر متنبہ فرمایا کہ تمہارے صدقات کی اسے کوئی حاجت نہیں۔ پس جو قرب حاصل کرنا چاہے اور ثواب کا طالب ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ ادا کرے ایسی شے کے ساتھ جو قدر و منزلت والی ہو اور مہتمم بالشان ہو کیونکہ وہ اسے اپنے لئے آگے بھیجتا ہے۔

اور حَمِيْدٌ کا معنی ہے: محمود فی کل حال ہر حال میں تعریف کیا ہوا۔ ہم نے ان دونوں اسموں کے معنی الکتاب الاسنی میں ذکر کر دیئے ہیں۔ والحمد للہ۔

اور زجاج نے قول باری تعالیٰ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ کے تحت کہا ہے: اس نے تمہیں حکم نہیں دیا ہے کہ تم حاجت اور تنگی کے باوجود صدقہ کرو البتہ اس نے تمہارے اختیار اور نیک لوگوں کا امتحان لیا ہے اور وہ ان تمام نعمتوں پر تعریف کیا گیا ہے۔

الشَّيْطٰنُ يَّعِدُّكُمْ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۗ وَاللّٰهُ يَعِدُّكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٦٩﴾

”شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی

بخشش کا اور فضل (و کرم) کا اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الشَّيْطٰنُ يَّعِدُّكُمْ الْفَقْرَ اور اس کے مادہ اشتقاق کا معنی پہلے گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی

ضرورت نہیں۔ اور يَّعِدُّكُمْ کا معنی ہے: وہ تمہیں ڈراتا ہے۔ الْفَقْرُ تنگ دستی سے تاکہ تم خرچ نہ کرو۔

یہ آیت ماقبل سے متصل ہے اور یہ کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان کو باز رکھنے میں خاصہ دخل ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ فحشاء (بے حیائی) کا حکم دیتا ہے اور فحشاء سے مراد معاصی اور ان میں خرچ کرنا ہے اور کہا گیا ہے یعنی اس طرح کہ تم صدقہ نہ کرو تم گنہگار ہو جاؤ گے اور آپس میں جدا جدا ہو جاؤ گے اور الْفَقْرُ فاء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا

گیا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔

جوہری نے کہا ہے: الْفَقْرُ میں ایک لغت الْفَقْرُ ہے۔ مثلاً الطُّغْفُ اور الضُّغْفُ۔

مسئلہ نمبر 2- قوله تعالى: وَاللّٰهُ يَبْعِدُ كُمْ مِّنْ مَّغْفِرَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ کلام عرب میں الوعد کا لفظ جب مطلق ہو تو وہ خیر اور بھلائی کے لئے ہوتا ہے اور جب اسے موعود (وہ شے جس کا وعدہ کیا گیا) کے ساتھ مقید کر دیا جائے تو پھر وہ خیر اور شر دونوں کے لئے مقدر ہو سکتا ہے، جیسا کہ البشارۃ تو اس آیت میں لفظ الوعد اکٹھا دو معنوں کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس آیت میں دو وعدے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور دو شیطان کی طرف سے۔

اور امام ترمذی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”بے شک شیطان کی جانب سے ایک وسوسہ یہ ہے کہ وہ شر کے ساتھ خوفزدہ کرتا ہے اور حق کی تکذیب کی طرف راغب کرتا ہے اور فرشتے کا القاء یہ ہے کہ وہ خیر کا وعدہ دلاتا ہے اور حق کی تصدیق کی رغبت دلاتا ہے۔ پس جو کوئی اسے پائے تو اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو کوئی دوسرا انہیں پائے تو اسے چاہیے کہ وہ شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: الشَّيْطٰنُ يَبْعِدُ كُمْ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1) اور غیر قرآن میں باء کو حذف کرنا بھی جائز ہے۔ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ سیبویہ نے شعر کہا ہے:

امرتك الخير فافعل ما امرت به فقد تركتك ذا مال و ذا نسب

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہی کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے۔ تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب نسب چھوڑا ہے۔

اور المغفرة سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر دنیا اور آخرت میں پردہ ڈالنا ہے اور فضل سے مراد دنیا میں رزق ہے اور آخرت میں وسعت اور نعمتیں ہیں۔ تمام کے بارے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 3- نقاش نے ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ اس بارے میں اس آیت سے مانوس ہوئے ہیں کہ فقر (تنگدستی) غنی (دولتمندی، خوشحالی) سے افضل ہے، کیونکہ شیطان بندے کو نیکی اور خیر سے دور ہٹاتا ہے اور وہ اسے فقر کا خوف دلا کر اس سے دور کرتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت میں کوئی حجت قاطعہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ معارضہ قوی ہے اور روایت ہے کہ تورات میں ہے۔ ”میرے بندے میرے رزق سے خرچ کر میں تجھ پر اپنا فضل وسیع کر دوں گا کیونکہ میرا ہاتھ ہر کشادہ ہاتھ سے زیادہ کشادہ ہے۔“ اور قرآن کریم میں اس کا مصداق یہ ارشاد گرامی ہے: وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّٰزِقِينَ ﴿۝۱۰۰﴾ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ خوشحالی اور وسعت عطا فرماتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے جہاں اسے رکھتا ہے اور وہ غیب و شہادۃ کا علم رکھتا ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں ہم نے ان دونوں کا ذکر بھی تمام اسماء میں الکتاب الاسنی میں کیا ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2914، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والحمد لله۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا

أُولَٰئِكَ لَبَابٌ ۝

”عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند۔“

قولہ تعالیٰ: يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرمادیتا ہے۔ یہاں حکمت کے مفہوم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ سدی نے کہا ہے: اس سے مراد نبوت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی معرفت ہے یعنی اس کی فقاہت، نسخ، محکم، غریب اور مقدم و مؤخر آیات کا علم۔ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد بن جبر نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی سمجھ اور فقاہت ہے۔ حضرت مجاہد بن جبر نے کہا ہے: اس سے مراد قول و فعل میں صائب اور درست ہونا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: حکمت سے مراد دین میں عقل و فہم کا رکھنا ہے۔ امام مالک بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے: حکمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی، دین میں فقاہت اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے: حکمت سے مراد خشیت ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی کا قول ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم میں فہم اور سمجھ رکھنا ہے اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے اور حسن نے کہا ہے: حکمت سے مراد ورع ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام اقوال ماسوائے سدی، ربیع اور حسن کے اقوال کے آپس میں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں، کیونکہ حکمت مصدر ہے الاحکام سے اور اس کا معنی ہے: قول یا فعل میں پختہ اور مضبوط ہونا۔ پس کتاب اللہ حکمت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت بھی حکمت ہے اور فضیلت میں سے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ سب حکمت ہے۔ دراصل حکمت وہ شے ہے جس کے سبب انسان سفاہت اور بے وقوفی سے باز رہے، پس علم کو حکمت کہا گیا ہے کیونکہ اس کے سبب اس سے روکا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ سفاہت سے باز رہنے کو جانا جاسکتا ہے اور سفاہت سے مراد ہر وہ فعل ہے جو قبیح ہو۔ اور اس طرح قرآن کریم، عقل اور فہم و فراست (یہ سب حکمت ہیں کیونکہ ان کے سبب سفاہت کے ارتکاب سے باز رہا جاتا ہے۔)

اور بخاری شریف میں ہے: مَنْ يُؤْتِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفْقَهُهُ فِي الدِّينِ (اللہ تعالیٰ جس کے بارے میں خیر اور بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں فقاہت عطا فرمادیتا ہے۔) اور یہاں ارشاد فرمایا: وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (اور جسے دانائی عطا کی گئی یقیناً اسے بہت بھلائی دے دی گئی۔) (۱) اور دوبارہ حکمت کا لفظ ذکر فرمایا اس کے لئے ضمیر ذکر نہیں فرمائی، اس کا اہتمام کرتے ہوئے اور اس کے شرف و فضل پر تنبیہ کرتے ہوئے جیسا کہ اس کا بیان اس قول باری تعالیٰ کے تحت گزر چکا ہے:

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا (البقرہ: 59)

1۔ صحیح بخاری، باب من یؤت اللہ بہ خیرا یشقہ فی الدین، حدیث نمبر 69، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ مروان بن محمد، رفقہ الفسانی نے بیان کیا ہے کہ ہمیں ثابت بن عجلان انصاری نے خبر دی ہے اس نے کہا: بیان کیا جاتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ فرماتا ہے اور جب وہ معلم کو بچوں کو حکمت کی تعلیم دیتے ہوئے سنتا ہے تو وہ اسے ان سے پھیر دیتا ہے۔ مروان نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذْكُرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ⑤ کہا جاتا ہے: بے شک جسے حکمت اور قرآن عطا کر دیئے گئے تحقیق اسے اس سے افضل و اعلیٰ عطا کر دیا گیا جسے پہلی کتابوں اور صحف وغیرہ کا جمیع علم عطا کیا گیا، کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا أُوتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ⑥ (الاسراء)

اور اسے خَيْرًا كَثِيرًا کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ جوامع الکلم ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: جسے علم اور قرآن عطا کیا گیا اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اہل دنیا کے سامنے ان کی دنیا کی وجہ سے نہ جھکے، کیونکہ جو اسے عطا کیا گیا ہے وہ اس سے بہت افضل ہے جو اصحاب دنیا کو دیا گیا ہے (من اعدى العلم والقرآن ينبغى ان يعرف نفسه ولا يتواضع لاهل الدنيا لأجل دنياهم فانها أعطى افضل اصحاب الدنيا) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو متاع قلیل کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (النساء: 77)

اور علم اور قرآن کو خَيْرًا كَثِيرًا کا نام دیا ہے (2)۔

جمہور نے وَمَنْ يُؤْتَ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے اور زہری اور یعقوب نے وَمَنْ يُؤْتَ تاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ (یعنی فعل معروف) اس معنی کی بناء پر وَمَنْ يُؤْتَ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ اور جسے اللہ تعالیٰ دانائی عطا فرمادے۔ اس میں فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے۔ اور مَنْ مفعول اول مقدم ہے اھبہا۔ کما مفعول ثانی ہے اور الالباب کا معنی عقول ہیں اور اس کا واحد لب ہے اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ ⑦ وَمَا لِلظَّالِمِينَ

مِنْ أَنْصَارٍ ⑧

”اور جو تم خرچ کرتے ہو یا منت مانتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور نہیں ہے ظالموں کیلئے کوئی مددگار۔“

یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ عربوں کے رواج میں منتیں کثرت سے مانی جاتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو آدمی بطور نفل اور تبرع فعل کرتا ہے اور ایک وہ جو آدمی اپنے لئے اسے لازم کرنے کے بعد وہ فعل کرتا ہے۔ اور آیت میں وعدہ اور وعید کا معنی موجود ہے، یعنی وہ آدمی جس کی نیت میں اخلاص ہو اسے ثواب دیا جائے گا اور جس نے ریاکاری یا کسی اور معنی مثلاً احسان جتلانے اور دکھ پہنچانے کے لئے خرچ کیا تو وہ ظالم ہوگا۔ اس کا عمل باطل ہو جائے گا اور وہ اپنے لئے اس میں کوئی معاون و مددگار نہیں پائے گا اور يَعْلَمُهُ کا معنی ہے وہ اسے شمار کرتا ہے اور سمجھتا ہے، یہ مجاہد نے کہا ہے (ای یُخَصِّصِيْهِ) اور ضمیر واحد ذکر کی حالانکہ پہلے دو چیزوں کا ذکر کیا، تو نحاس نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ

نَفَقَةٌ۔ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهَا (یعنی جو تم خرچ کرتے ہو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے) اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُہُ پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: وَمَا انْفَقْتُمْ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُہُ۔ اور اس میں ضمیر ”ما“ کی طرف لوٹ رہی ہو۔ جیسا کہ سیبویہ نے (امرء القیس کے لئے) کہا ہے:

فَتَوْضَحَ فَاَلْبِقْرَاۗءَ لَمْ يَعْفُ رَسْمُهَا لِمَا نَسَجَتْهَا مِنْ جَنُوبٍ وَ شَمَالٍ
اس میں نسجتھا میں ہاء ضمیر ماکی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ اس پر معطوف ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: يَعْلَمُہُ میں واحد ضمیر ذکر کی ہے حالانکہ دو چیزوں کا ذکر کیا ہے تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ ارادہ اس کا کیا ہے جسے ذکر کیا گیا ہے یا جسے بیان کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حسین اور اچھا ہے کیونکہ کبھی ضمیر سے مراد وہ تمام ہوتے ہیں جو مذکور ہوتے ہیں اگرچہ وہ کثیر ہوں۔ نذر کی حقیقی تعریف یہ ہے: ہو ما اوجبه البکلف علی نفسه من العبادات مما لو لم یوجبہ لم یلزمہ (ان عبادات میں سے وہ عبادت جو مکلف نے اپنے اوپر لازم کی ہو کہ اگر وہ اسے لازم نہ کرتا تو وہ اس پر لازم نہ ہوتی۔) لہذا جب کوئی فعل آدمی اپنے ذمہ لازم کر لے تو تو کہتا ہے: نذر الرجل، ینذر ذال کے ضمہ کے ساتھ بھی ہے اور ذال کے کسرہ کے ساتھ بھی۔ اس کے کئی احکام ہیں جن کا بیان کسی اور جگہ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ؕ وَاِنْ تُخْفَوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ
وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيرٌ ۝۴۱

”اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لئے اور (صدقہ کی برکت سے) مٹا دے گا تم سے تمہارے بعض گناہ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خبردار ہے۔“

جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے کیونکہ اس میں اظہار کی نسبت اخفاء افضل ہے اور اسی طرح تمام نفلی عبادات میں اخفاء افضل ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ریا ان سے دور رہتا ہے اور واجبات میں اسی طرح نہیں ہے۔ حسن نے کہا ہے: زکوٰۃ میں اظہار احسن ہے اور نفل میں اخفاء افضل ہے کیونکہ یہ اس پر زیادہ دلالت کرتا ہے کہ اس سے ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفل میں سری صدقہ کو اعلانیہ صدقہ پر فضیلت دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ستر گنا ہے اور فرضی صدقہ میں اعلانیہ کو سری پر فضیلت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پچیس گنا ہے۔ فرمایا: تمام اشیاء میں جمیع فرائض اور نوافل اسی طرح ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس طرح کا قول رائے سے نہیں کہا جاسکتا۔ بالیقین وہ امر توقیفی ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”فرض نماز کے سوا آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔“ اور یہ اس لئے ہے کہ فرائض میں ریا داخل نہیں ہوتا اور نوافل اس کے نشانے ہیں۔

اور امام نسائی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک وہ آدمی جو قرآن بالجہر پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ بالجہر دیتا ہے اور جو قرآن سراپڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ سراپڑھتا ہے۔“ اور حدیث میں ہے۔ سرا صدقہ دینا رب العالمین کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے (1)۔“

ابن عربی نے کہا ہے: اعلانیہ صدقہ کی سری صدقہ پر فضیلت کے بارے میں اور نہ ہی سری صدقہ کی اعلانیہ صدقہ پر فضیلت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ہے۔ البتہ اس کے بارے میں اجماع ثابت ہے۔ پس رہا نفلی صدقہ تو اس کے بارے میں صراحۃً قرآن کریم میں موجود ہے کہ یہ سرا دینا جبراً دینے سے افضل ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک اس کا اطلاق غالب کیفیت پر ہے اور اس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ صدقہ میں حالات مختلف ہوتے ہیں صدقہ دینے والے کی حالت کے ساتھ، جس کو صدقہ دیا جائے اس کی حالت کے سبب اور ان لوگوں کی حالت کے ساتھ جو صدقہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ رہا صدقہ دینے والا تو اس کے لئے اس میں سنت کے اظہار اور پیشوائی کا ثواب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے لئے ہے جس کی حالت قوی ہو اور اس کی نیت نیک اور اچھی ہو اور وہ اپنے بارے میں ریا سے محفوظ اور مامون ہو۔ اور رہا وہ آدمی جو اس مرتبہ سے ضعیف اور کمزور ہو تو اس کے لئے سرا صدقہ دینا افضل ہے۔

اور جہاں تک اس کا تعلق ہے جسے صدقہ دیا گیا ہے تو اسے سری صدقہ لوگوں کے اسے حقیر سمجھنے سے محفوظ کرنے والا ہے اور اس شے کی نسبت سے کہ اس نے غنی اور غیر محتاج ہونے کے باوجود صدقہ لیا ہے اور پاکدامنی کو ترک کر دیا ہے اور رہا لوگوں کا حال تو ان کے اعتبار سے بھی سری صدقہ اعلانیہ سے افضل ہے، اس جہت سے کہ وہ کبھی دینے والے کو ریا کاری کا طعنہ دیتے ہیں اور صدقہ لینے کو اس کا مستحق قرار نہیں دیتے اگرچہ ان کے لئے جبری صدقہ میں دلوں کو صدقہ کی طرف مائل اور راغب کرنے کا سامان بھی ہے لیکن آج کے دور میں یہ بہت قلیل ہے۔

یزید بن حبیب نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ پر صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس وہ سرا زکوٰۃ کی تقسیم کا حکم دے رہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے بالخصوص سلف صالحین کے نزدیک اور علامہ طبری نے کہا ہے: لوگوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ واجب صدقہ میں اظہار افضل ہے۔

میں کہتا ہوں: الکلیا الطبری نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ مطلقاً صدقات میں اخفا اولیٰ ہے اور یہ فقیر کا حق ہے اور صاحب مال کے لئے جائز ہے کہ وہ صدقات بذات خود تقسیم کرے۔ جیسا کہ حضرت امام شافعی کا ایک قول ہے اور ان کے دوسرے قول کے مطابق انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہاں صدقات سے مراد نفلی صدقات ہیں نہ کہ وہ فرض جسے ظاہر کرنا اولیٰ ہے تاکہ اسے کوئی تہمت لاحق نہ ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نفلی نماز انفرادی طور پر پڑھنا افضل ہے (یعنی بغیر جماعت کے) اور فرض نماز میں جماعت تہمت سے دور رکھنے والی ہے۔

اور مہدوی نے کہا ہے: آیت سے مراد فرض زکوٰۃ بھی ہے اور نفلی صدقات بھی۔ پس حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

مقدس میں اخفا افضل تھا پھر اس کے بعد لوگوں کے خیالات اور گمان غلط ہو گئے تو علماء نے فرائض میں اظہار کو مستحسن قرار دیا تاکہ کسی کے بارے عدم ادائیگی کا گمان نہ کیا جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول آثار و روایات کے خلاف ہے اور یہ ہمارے زمانے میں فرض صدقہ میں اخفا کے مستحسن ہونے کو مشتبہ کرتا ہے اور اس کے مانع کثیر ہیں اور اسے اعلانیہ نکالنا ریا کے لئے پیش کرنا ہوگا۔ ابن خويز منداد نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ آیت سے فرض زکوٰۃ اور نفل صدقہ مراد لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اخفا کا ذکر کیا ہے اور اس کی مدح کی ہے اور اظہار کا ذکر کیا ہے اور اس کی بھی مدح کی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دونوں کی طرف اکٹھا متوجہ ہوا جائے۔

اور نقاش نے کہا ہے: بے شک اس آیت کو اس قول باری تعالیٰ نے منسوخ کر دیا ہے: **الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْأَيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً** (البقرہ: 274) (جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ) (تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس)

قولہ تعالیٰ: **فَنِعْمَ هِيَ**۔ یہ اظہار صدقہ پر تعریف ہے۔ پھر اس پر یہ حکم لگایا کہ اظہار سے اخفا بہتر ہے اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے جب تو نیکی کرے تو اسے مخفی رکھ اور جب تیرے ساتھ نیکی کی جائے تو تو اسے پھیلا (اذا اصطنعت المعروف فاستره و اذا اصطنعت اليك فانشره)

دعبل الخزاعي نے کہا ہے:

اذا اتقوا اعلنوا امرهم وان انعموا انعموا باكتساب
جب وہ انتقام لیتے ہیں تو اپنے معاملے کا اعلان کرتے ہیں۔ اور اگر وہ نیکی اور احسان کریں تو وہ نیکی خاموشی اور پوشیدہ طور پر کرتے ہیں۔

اور سہل بن ہارون نے کہا ہے:

خل اذا جنته يوما لتسأله اعطاك ماملكت كفاه و اعتذرا
تو چھوڑ دے جب تو کسی دن مانگنے اور سوال کرنے کے لئے اس کے پاس آئے اس نے تجھے وہ عطا کر دیا ہے جس کا تو مالک ہے تو اسے کافی سمجھ اور اس کا عذر قبول کر لے۔

يخفي صنائعه والله يظهرها ان الجليل اذا اخفيته ظهرا
وہ اپنے کارناموں کو چھپاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ظاہر کرتا ہے۔ بلاشبہ نیکی کو جب تو مخفی رکھے تو وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔
حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کوئی نیکی تین خصلتوں کے سوا مکمل نہیں ہوتی: اسے جلدی کرنا، اسے صغیر سمجھنا اور اسے مخفی رکھنا، جب تو نے اسے جلدی کر لیا تو تو نے اسے حاصل کر لیا اور جب تو نے اسے چھوٹا سمجھا تو تو نے اسے عظیم بنادیا اور جب تو نے اسے مخفی رکھا تو تو نے اسے مکمل کر دیا اور بعض شعراء نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

زاد معروفك عندى عظما انه عندك مستور حقير

تیری نیکی میرے نزدیک بہت عظیم اور بڑی ہے بلاشبہ وہ تیرے نزدیک چھپی ہوئی اور حقیر ہے۔

تَتَنَاسَاهُ كَأَن لَّمْ تَأْتِهِ وَهُوَ عِنْدَ النَّاسِ مَشْهُورٌ خَطِيرٌ

تو اسے بھلا دیتا ہے گویا تو نے اسے کیا ہی نہیں حالانکہ وہ لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ مشہور ہوتی ہے۔

قراء نے قول باری تعالیٰ فَنِعْمَتَاهِی میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابو عمرو اور نافع نے ورش کی روایت میں، عاصم نے روایت حفص میں اور ابن کثیر نے فَنِعْمَتَاهِی کونون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عمرو نے بھی اور نافع نے ورش کی روایت کے سوا میں اور عاصم نے ابو بکر اور مفضل کی روایت میں فَنِعْمَتَانِون کے فتح اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور تمام نے میم کو ساکن کیا ہے۔

اور قرآن کے علاوہ دوسرے کلام میں فَنِعْمَ مَاہی پڑھنا بھی جائز ہے۔

نحاس نے کہا ہے لیکن چونکہ یہ سواد میں متصل ہے اس لئے ادغام لازم ہے۔

علمائے نحو نے نِعْمَ میں چار لغات بیان کی ہیں: نِعْمَ الرَّجُلُ زَيْدٌ، یہ اصل ہے اور نِعْمَ الرَّجُلُ یعنی عین کے کسرہ کی وجہ سے نون کے کسرہ کے ساتھ اور نِعْمَ الرَّجُلُ یعنی نون کے فتح اور عین کے سکون کے ساتھ۔ یہ اصل میں نِعْمَ تھا کسرہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور نِعْمَ الرَّجُلُ اور یہ اصح اللغات ہے، اس میں بھی اصل نِعْمَ ہے۔ اور یہ ہر مدح اور تعریف کے محل میں واقع ہوتا ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی اور عین کا کسرہ نون کو دے دیا گیا اور عین کو ساکن کر دیا گیا۔

اور جنہوں نے فَنِعْمَتَاهِی پڑھا ہے تو اس کی دو تقدیریں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ان کی لغت کے مطابق ہو جو نِعْمَ کہتے ہیں اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ یہ جید اور عمدہ لغت پر ہو۔ پس اصل نِعْمَ ہوگا۔ پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے عین کو کسرہ دے دیا گیا۔ نحاس نے کہا ہے کہ ابو عمرو اور نافع سے عین کے ساکن ہونے کے بارے جو قول بیان کیا گیا ہے وہ محال ہے۔ محمد بن یزید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر عین ساکن ہو اور میم مشدد ہو تو کوئی بھی اسے بولنے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ وہ دو ساکنوں کو جمع کرنے کا قصد کرے گا اور حرکت دے گا اور اس کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔

اور ابو علی نے کہا ہے: جس نے عین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اس نے دو ساکنوں کو جمع کر دیا ہے اور ان میں سے پہلا حرف مدولین نہیں ہے اور وہ نحو یوں کے نزدیک تب جائز ہوتا ہے جب کہ پہلا حرف مدہ ہو، کیونکہ مد حرکت کے عوض ہوتی ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ دَابَّةٌ اور ضَوَالٌ وغیرہ، شاید ابو عمرو نے حرکت کو مخفی رکھا ہے اور اسے پر کئے بغیر پڑھا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے بَارِئُکُمْ..... اور یَا مُزُکُّم میں اخفا کیا ہے اور سامع نے سمع اور خفا میں لطف کے سبب اخفا کو اسکان گمان کر لیا ہے۔ ابو علی نے کہا ہے اور جنہوں نے نِعْمَتَانِون کے فتح اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کو اپنے اصل پر لائے ہیں۔ اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

مَا أَقْلْتُ قَدَمَائِیْ إِنْهَمَ نِعْمَ السَّاعُونَ فِی الْأَمْرِ الْمُبِیْرِ

میرے قدم کمزور نہیں ہیں بلاشبہ وہ نیکی کے معاملہ میں کوشش اور سعی کرنے والے بہت اچھے ہیں۔

ابوعلی نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: نِعَمًا مِّن مَّا كُنْتُمْ لِرَبِّكُمْ تَعْبُدُونَ۔ اور تقدیر عبارت نعم شیئا ابداءہ (اسے ظاہر کرنا کتنی اچھی شے ہے) اور الابداء ہی مخصوص بالمدح ہے، مگر مضاف کو حذف کر دیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ دَلَالَت کرتا ہے یعنی الاخفاء خیر۔ بس جس طرح یہاں ضمیر اخفاء کے لئے ہے صدقات کے لئے نہیں ہے۔ پس اسی طرح پہلا فاعل وہ الابداء ہے اور وہی ہے جس کے ساتھ ضمیر متصل ہے، پھر الابداء کو حذف کر دیا گیا اور صدقات کی ضمیر کو اسی کی مثل اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔

وَإِنْ تُخَفُّوهَُا يَشْرَطُ، اسی لئے نون کو حذف کر دیا گیا ہے اور وَتَوْتُوهَُا کو اس پر عطف کیا گیا ہے اور جواب شرط فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيُكَفِّرُ قِرَاءَتِ اس کی قراءت میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابو عمرو، ابن کثیر اور عاصم نے ابو بکر کی روایت میں، قتادہ اور ابن ابی اسحاق تمام نے وَتُكْفِّرُ نون اور را کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور (نافع)، حمزہ اور کسائی نے نون کے ساتھ اور را کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح حضرت عاصم سے بھی مروی ہے اور حسین بن علی الجعفی نے اعمش سے روایت کیا ہے يُكْفِّرُ یعنی را کو منصوب پڑھا ہے۔ ابن عامر نے یا کے ساتھ اور را کو مرفوع پڑھا ہے اور اسے حفص نے عاصم سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حسن سے بھی مروی ہے اور ان سے یا اور جزم کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وَتُكْفِّرُ یعنی تا کے ساتھ، فا کو کسرہ کے ساتھ اور را کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عکرمہ نے وَتُكْفِّرُ پڑھا ہے یعنی تا کے ساتھ اور فا کو مفتوح اور را کو مجزوم..... اور مہدوی نے ابن ہریر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے وَتُكْفِّرُ تا کے ساتھ اور را کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور عکرمہ اور شہر بن حوشب سے بیان کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے تا کے ساتھ اور را کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ پس یہ نو قراءتیں ہیں میں انہیں بیان کرتا ہوں۔ وَتُكْفِّرُ یعنی نون اور رفع کے ساتھ۔ یہ امام خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ نحاس نے بیان کیا ہے کہ سیبویہ نے کہا ہے کہ یہاں رفع کی ایک ہی وجہ ہے اور وہی جید اور عمدہ ہے کیونکہ فا کے بعد کلام غیر جزا کے قائم مقام ہوتا ہے اور معنی پر محمول کرتے ہوئے انہوں نے جزم کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ معنی یہ ہے: وان تخفوها و توتوها الفقراء یکن خیرا لکم و نکفیر عنکم (اور اگر تم صدقوں کو پوشیدہ رکھو اور انہیں فقیروں کو دو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور ہم تم سے بعض گناہ مٹا دیں گے۔)

اور ابو حاتم نے کہا ہے: اعمش نے پڑھا ہے يُكْفِّرُ یا کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے واؤ نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: وہ جو ابو حاتم نے اعمش سے بغیر واؤ کے جزم کے ساتھ بیان کیا ہے تو وہ بدل کے طور پر ہے گویا وہ فا کے محل میں ہے اور وہ جو عاصم سے وَتُكْفِّرُ یا اور رفع کے ساتھ مروی ہے اس کا معنی ہے: وَيُكْفِّرُ اللہ (اور اللہ تعالیٰ مٹا دے گا) اور ابو عبیدہ کا قول ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یکفر الاعطاء (یعنی صدقہ دینا مٹا دے گا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وَتُكْفِّرُ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہوگا اور صدقات مٹا دیں گے۔ المختصر یہ کہ ان قراءتوں میں سے جو نون کے ساتھ ہیں تو

وہ نوان نون عظمت ہے اور جوتا کے ساتھ ہیں تو ان سے مراد صدقہ ہے۔ پس تو اسے یاد کر لے۔ سوائے اس کے جو مکرمہ سے فائز کے فتح کے ساتھ مروی ہے کیونکہ اس قراءت میں تا وہ سینات کے لئے ہے اور ان میں سے جو قراءت یا کے ساتھ ہے تو اس میں منانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور خفیہ صدقہ دینا بھی انہیں منانے والا ہے اسے مکی نے بیان کیا ہے۔

اور ہمارا کارِ فتح تو اس کی دو جہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ فعل مبتدا کی خبر ہو اور تقدیر کلام ہو: ونحن نكفر یا وہی تکفر۔ یعنی صدقہ منادے گا۔ یا واللہ یکفر (اور اللہ تعالیٰ منادے گا) اور دوسری وجہ قطع اور استئناف ہے واو عاطفہ اشتراک کے لئے نہ ہوگی بلکہ جملہ کلام کو جملہ پر عطف کیا جائیگا۔ اور ہم نے جزم کی قراءت کا معنی ذکر کر دیا ہے اور جہاں تک نصب کا تعلق ہے و نكفر تو یہ ضعیف ہے اور یہ ان مضممرہ کی بنا پر ہے اور یہ بعد کی بنا پر جائز ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ جواب استفہام میں نصب کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ جزا کے ساتھ غیر کے وجوب کے سبب شے واجب ہوتی ہے جیسا کہ استفہام۔ ان قراءتوں میں را پر جزم فصیح ہے، کیونکہ یہ تکفیر کے جزا میں داخل ہونے کی خبر دیتی ہے اور اس کے مشروط ہونے کا (اس شرط کے ساتھ) کہ اگر اخفا واقع ہو اور جہاں تک رفع کا تعلق ہے تو اس میں یہ معنی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ اختلاف ہے جسے خلیل اور سیبویہ نے اختیار کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: قَمِنَ سَيِّئَاتِكُمْ میں قَمِنَ صرف تبعیض کے لئے ہے۔ اور علامہ طبری نے ایک جماعت سے بیان کیا ہے کہ یہ زائدہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ان سے خطا ہوئی ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ۔ یہ وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ
فَلَا تُنْفِسْكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ إِلَيْكُمْ
وَأَنْتُمْ لَا تَظْلُمُونَ ﴿٥٠﴾

”نہیں ہے آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا ہاں اللہ سیدھی راہ پر چلاتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو (اپنے) مال سے تو (اس میں) تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ اور تم تو خرچ ہی نہیں کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کے اور جتنا کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پورا ادا کر دیا جائے گا تمہیں اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ۔ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ۔ یہ کلام صدقات کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، تو گویا اس میں مشرکین کو صدقہ دینے کے جواز کو بیان کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں مرسل روایت بیان کی ہے کہ مسلمان ذمی لوگوں میں سے فقراء کو صدقہ دیتے رہتے تھے۔ جب مسلمان فقراء زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا تَتَصَدَّقُوا إِلَّا عَنِ أَهْلِ دِينِكُمْ تم اپنے اہل دین کے سوا کسی کو صدقہ نہ دو۔ تو یہ آیت نازل ہوئی جو ان کے لئے صدقہ مباح کر رہی ہے جو دین اسلام پر نہیں ہیں۔

اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقات لائے جاتے تھے۔ پس ایک یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس آیا اور اس نے کہا: مجھے کچھ عطا فرمائیے تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لیس لك من صدقة المسلمين شئ (تیرے لئے مسلمانوں کے صدقہ میں سے کوئی شے نہیں ہے۔) پس وہ یہودی ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا تو یہ آیت نازل ہو گئی: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا اور اسے مال عطا فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے آیت صدقات کے ساتھ منسوخ کر دیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: انصار میں سے کچھ لوگوں کی بنی قریظہ اور بنی نضیر کے ساتھ رشتہ داریاں تھیں اور وہ انہیں اس تصور اور رغبت کے تحت صدقات نہیں دیتے تھے کہ جب وہ محتاج ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے۔ پس یہ آیت ان کے سبب سے نازل ہوئی۔

اور بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء بنتی نبیہا نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے دادا ابو قحافہ کو کچھ دے پھر وہ اس سے رک گئیں اس لئے کہ وہ کافر ہیں۔ تب اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور علامہ طبری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کا صدقہ روکنے سے مقصود یہ تھا تا کہ وہ لوگ اسلام قبول کر لیں اور دین میں داخل ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ (ان کو سیدھی راہ پر چلانا آپ کے ذمہ نہیں ہے۔) اور یہ قول بھی ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ ماقبل سے متصل نہیں ہے۔ پس یہ صدقات کے بارے میں اور انہیں کفار پر خرچ کرنے کے بارے میں ظاہر ہے بلکہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی ابتدائے کلام ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ صدقہ جو ان کے لئے مباح کیا گیا ہے جیسا کہ مذکورہ آثار سے متضمن ہیں یہ نفلی صدقہ ہے اور جہاں تک فرض زکوٰۃ کا تعلق ہے تو وہ کسی کافر کو دینا جائز نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے: ”مجھے حکم فرمایا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء کی طرف لوٹا دوں (1)۔“ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ تمام جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ذمی کو مالوں کی زکوٰۃ میں سے کوئی شے نہ دی جائے گی، پھر انہوں نے ان میں سے ایک جماعت کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسے بیان کیا ہے اور کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے: مسلمانوں کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اس آیت کے تحت اپنے مشرک قرابتداروں کو فرض زکوٰۃ میں سے دیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ بالا جماع مردود ہے۔ واللہ اعلم۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: انہیں صدقہ فطر دیا جاسکتا ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ صدقہ پاک کرنے والا اور واجب ہے لہذا کسی کافر کو نہیں دیا جائے گا جیسا کہ چوپائے اور عمدہ مال کا صدقہ اور حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اغنوهم عن سوال هذا اليوم تم انہیں اس دن یعنی عید الفطر کے دن سوال کرنے سے غنی کر دو۔ (یعنی تم انہیں اتنا دے دو کہ وہ اس دن سوال کرنے کے محتاج نہ رہیں۔)

میں (منسر) کہتا ہوں: یہ ان کے عید اور نماز عید میں مشغول ہونے کے سبب ہے اور یہ مشرکین میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور صدقہ فطر غیر مسلم کو دینا ان کے قول کے مطابق جائز ہے جنہوں نے اسے سنت قرار دیا ہے اور ہمارے نزدیک دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے وہ آیت کو نیکی، کھانا کھلانے اور صدقات کے اطلاق میں عام قرار دیتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ حکم ان مسلمانوں کے لئے متصور ہے جو اہل ذمہ کے ساتھ اور اہل حرب میں سے جنہیں غلام بنایا گیا ہے ان کے ساتھ ہیں۔

میں کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے: وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِمْ مُسْكِينًا وَيَتَيَّمُونَ أَسِيرًا ① (الدھر) (اور جو کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو۔)

اور اسیر (قیدی) دارالاسلام میں ہوتا ہے اور وہ مشرک ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا يَنْهَضُكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ (المستح: 8) (اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو۔)

پس ان آیات کا ظاہر انہیں جملہ صدقات دینے کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، مگر حضور نبی کریم ﷺ نے ان سے فرض زکوٰۃ کو خاص کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ”ان کے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ لو اور ان کے فقراء پر لو (1)۔“ اور اس پر علماء نے اتفاق کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس جب وہ محتاج ہوں تو انہیں نفلی صدقات میں سے دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

ابن عربی نے کہا ہے: رہا گنہگار مسلمان تو اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسے صدقہ فطر دیا جائے گا مگر جب وہ ارکان اسلام نماز، روزہ وغیرہ کو چھوڑ دے تو پھر اسے صدقہ نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔ اور تمام گنہگار جو کہ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں مسلمانوں میں سے شامل ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا اور صحیح مسلم میں ہے (2) کہ وہ آدمی جس نے کسی غنی، چور اور زانی کو صدقہ دیا اور اس کا صدقہ قبول کر لیا گیا۔ اس کا بیان آگے آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ یعنی اللہ تعالیٰ رہنمائی فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اس میں قدر یہ اور معتزلہ کے گروہوں کا رد ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُفْسِدُكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ۔ یہ شرط اور اس کا جواب ہے۔ اور اس آیت میں خیر سے مراد مال ہے، کیونکہ یہ انفاق کے ذکر سے مقترن ہے اور یہ قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد مال ہے اور جہاں ایسے قرینہ سے مقترن نہ ہو جو اس سے مراد مال ہونے پر دلالت کرتا ہو تو پھر یہ لازم نہیں ہے کہ یہ مال کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب اذا تصدق علی غنی وهو لا یعلم، حدیث نمبر 1332، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

معنی میں ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) اور مزید ارشاد ہے: وَمَثَقَالِ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ (الزلزلة) الی غیر ذلک۔ اور یہ عکرمہ کے اس قول سے پرہیز اور احتیاط کرنا ہے کہ کتاب اللہ میں جہاں کہیں لفظ خیر ہے وہ مال کے معنی میں ہے۔

اور بیان کیا جاتا ہے کہ بعض علماء بہت سی نیکیاں کرتے ہیں پھر حلف اٹھا دیتے ہیں کہ اس نے کسی کے ساتھ خیر (نیکی) نہیں کی۔ تو اس بارے میں اسے کہا جائے تو وہ کہتا ہے: بلاشبہ میں نے اپنے ساتھ یہ عمل کیا ہے اور یہ آیت تلاوت کرتا ہے: وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نُفْسِكُمْ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ نفقہ جو قبولیت کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے وہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے ہو۔ اور ابْتِغَاءً یہ مفعول لہ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے شہادت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور یہ آیت ان کی فضیلت اور مدح کے محل میں وارد ہوئی ہے اور پہلی تاویل کی بنا پر یہ ان پر شرط عائد کرنا ہے اور پھر یہ شرط ان کے علاوہ پوری امت کو شامل ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: انک لن تنفق نفقة تبتغی بها وجه الله تعالیٰ الا جرت بها حتی ما تجعل فی فی امرأتک (1) (بلاشبہ تو ہرگز کوئی نفقہ خرچ نہیں کرے گا جس سے تو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے گا مگر تجھے اس کے عوض اجرت دی جائے گی یہاں تک کہ جو کچھ تو اپنی بیوی کے منہ میں بھی ڈالے گا۔)

قولہ تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤَفِّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ، يُؤَفِّ إِلَيْكُمْ یہ قول باری تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نُفْسِكُمْ کے لئے تاکید اور بیان ہے اور یہ کہ خرچ کرنے والوں کو خرچ کرنے کا ثواب پورا پورا دیا جائے گا اور اس سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی۔ پس یہی کمی ان کے لئے ظلم ہوگی۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ
الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسَيِّئِهِمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِحْقَاقًا وَمَا
تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

”(خیرات) ان فقیروں کے لئے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لئے) چلنے پھرنے کی زمین میں۔ خیال کرتا ہے انہیں ناواقف (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے۔ (اے حبیب! سننا! یہ) آپ پہچانتے ہیں انہیں ان کی صورت سے۔ یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پس یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔“

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لِلْفُقَرَاءِ۔ اس میں لام وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ کے متعلق ہے۔

1۔ فتح، فارسی، کتاب الایمان، حدیث نمبر 54، ضیا، القرآن پہلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مخدوف کے متعلق ہے اور تقدیر عبارت ہے: الانفاق او الصدقة للفقراء۔ سدی، مجاہد وغیرہما نے کہا ہے: ان فقراء سے مراد فقراء مہاجرین ہیں جو قریش اور دوسرے قبائل سے تعلق رکھتے تھے، پھر یہ آیت ہر اس کو شامل ہے جو مستقبل میں فقراء کی صفت کے تحت داخل ہوگا اور مہاجرین فقراء کو ذکر کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ وہاں ان کے سوا کوئی (فقیر) نہ تھا۔ اور یہ فقراء اہل صفہ تھے اور تقریباً چار سو افراد تھے، وہ فقر و افلاس کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے نہ ان کے اہل و عیال تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی مال تھا۔ پس ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ایک صفہ (سایہ دار چبوترہ) تعمیر کیا گیا۔ پس ان کو اہل صفہ کہا گیا۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں اہل صفہ میں سے تھا جب شام ہوتی تھی تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر حاضر ہوتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر آدمی کو حکم ارشاد فرماتے تھے اور وہ ایک آدمی کو ساتھ لے جاتا تھا۔ اور اہل صفہ میں سے جو باقی رہ جاتے وہ دس یا اس سے کم افراد ہوتے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا شام کا کھانا لے آتے اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا تناول کر لیتے اور جب ہم فارغ ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ناموا فی المسجد مسجد میں جا کر سو جاؤ۔

اور ترمذی نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: (یہ آیت) وَلَا تَتَّبِعُوا الْحَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی، ہم کھجوروں کے مالک تھے، فرمایا: ہر آدمی اپنے درخت سے اپنی حیثیت کے مطابق زیادہ یا کم کھجوریں لاتا تھا اور کوئی آدمی ایک خوشہ اور دو خوشے لے کر آتا تھا اور انہیں مسجد میں لٹکا دیتا تھا اور اہل صفہ کے لئے کوئی کھانے کی شے نہ ہوتی تھی تو ان میں سے جب کسی کو بھوک ستاتی تھی تو وہ اس خوشے کے پاس آتا، اسے اپنا عصا مارتا، تو اس سے خشک اور پکی کھجوریں گر پڑتی اور وہ کھا لیتا تھا اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اچھی اور عمدہ شے میں رغبت نہ رکھتے تھے اور وہ ایسا خوشہ لے آتے جس میں ردی اور گھٹیا قسم کی کھجوریں ہوتی تھیں۔ اور کوئی ایسا خوشہ لے کر آتا جو ٹوٹا ہوا ہوتا اور وہ اسے مسجد میں لٹکا دیتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَتَّبِعُوا الْحَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخْذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْضُوا فِيهِ فرمایا: اگر تم میں سے کسی کو ایسا ہدیہ دیا جائے جیسا اس نے دیا ہے تو وہ اسے نہ لے گا مگر چشم پوشی کرتے ہوئے اور حیا کرتے ہوئے۔ فرمایا: پس اس کے بعد ہم میں سے ہر آدمی وہی لاتا تھا جو اس کے پاس عمدہ اور اچھی شے ہوتی تھی۔ فرمایا: یہ حدیث حسن، غریب، صحیح ہے۔

ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ مسجد میں ضرورت کے تحت رہتے تھے اور ضرورت کے تحت ہی صدقہ وغیرہ کھاتے تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر خوشحالی کے دروازے کھول دیئے وہ اس حالت سے مستغنی ہو گئے اور نکل گئے پھر وہ مالک بن گئے اور حاکم بن گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان فقراء مہاجرین کے وہ احوال بیان کئے جو ان پر واپس مڑنے کو واجب کرتے ہیں اور فرمایا: الَّذِينَ أُخْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ كَانُوا إِحْسِرًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ لَا ضَرَرٌ عَلَيْهِمْ وَلَا خَلٌّ لِأَعْيُنِهِمْ فِي كَسَبِ ثِيَابٍ۔ حضرت قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے: أُخْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ کا معنی ہے: جنہوں نے اپنے آپ کو دشمن کے خوف سے اپنے کاروبار میں تصرف کرنے

سے روک لیا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ وَهَ زَمِينَ مِمَّنْ يَحْنُطُونَ پھر نے کی استطاعت نہیں رکھتے کیونکہ تمام شہر مکمل طور پر کفر کے زیر تسلط ہیں اور یہ ابتدائے اسلام میں تھا اور انہیں اکتساب دولت سے باز رکھنے کی علت جہاد تھا اور کفار کا اسلام قبول کرنے سے انکار کرنا کاروبار تجارت میں تصرف کرنے سے مانع تھا۔ نتیجتاً وہ فقراء ہی باقی رہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ کا معنی ہے یعنی کیونکہ انہوں نے جہاد کو لازم پکڑ لیا ہے اور پہلا معنی زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ یعنی بے شک ان کے سوال کرنے اور مانگنے کو چھوڑنے اور ترک کرنے کے سبب اور ان کے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے سبب ناواقف لوگ انہیں مالدار اور اغنیاء گمان کرتے ہیں۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ لفظ فقر کا اطلاق اس پر بھی کرنا جائز ہے جس کا لباس بہت قیمتی ہو اور وہ اسے زکوٰۃ دینے سے مانع نہیں ہوتا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو زکوٰۃ دینے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وہ ان مہاجرین میں سے تھے جو رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد کرتے تھے نہ وہ مریض تھے اور نہ ہی اندھے۔ اور التَّعَفُّفِ یہ تفعیل کے وزن پر ہے اور یہ عفت من الشئ سے مبالغہ کا وزن ہے جب کوئی اس شے سے رکا رہے اور اس کی طلب سے احتیاط برتے۔ اس معنی کے ساتھ حضرت قتادہ وغیرہ نے تفسیر بیان کی ہے اور یحسبہم میں سین کو فتح اور کسرہ دونوں دیئے گئے ہیں اور یہ دو لغتیں ہیں۔ ابوعلی نے کہا ہے: فتح زیادہ قیاس کے مطابق ہے کیونکہ اس کی ماضی میں عین کلمہ مکسور ہے۔ پس اس کا باب مضارع میں مفتوح آتا ہے اور کسرہ کے ساتھ پڑھنا اچھا اور حسین ہے۔ کیونکہ سماع اسی طرح ہے۔ اگرچہ یہ قیاس کے مقابلہ میں شاذ ہے اور من التَّعَفُّفِ میں من ابتدائے غایت کے لئے ہے اور بعض نے کہا ہے: یہ بیان جنس کے لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: تَعْرِفُهُمْ بِسَيِّئِهِمْ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ شکل و صورت سے کسی پر جو آثار ظاہر ہوتے ہیں ان کا اعتبار میں خاصا اثر ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب ہم کسی میت کو دارالاسلام میں دیکھیں اور اس پر زنا رہو (مراد وہ دھاگا سا ہے جو ذمی لوگ اپنی کمر میں باندھتے ہیں) اور وہ غیر مختون ہو تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق اسے دار کے حکم پر آگے کر دیا جائے گا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد: ۳۰) (اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے)

پس یہ آیت ایسے آدمی کو صدقہ دینا جائز ہونے پر دلیل ہے جس کے پاس اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے لباس، کپڑے وغیرہ موجود ہوں۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اس مقدار میں انہوں نے اختلاف کیا ہے جو ضرورت مند ہونے کی صورت میں وہ لے سکتا ہے۔ پس امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اتنی مقدار کا اعتبار کیا ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے ایک سال کی خوراک کا اعتبار کیا ہے اور امام مالک نے چالیس درہم کا اعتبار کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے والے کو زکوٰۃ کا مصرف قرار نہیں دیتے۔

اور البسینا (الف مقصورہ کے ساتھ) اس کا معنی علامت، نشانی ہے اور کبھی اسے مد کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور کہا جاتا

ہے: السَّيِّئَاء۔ اور یہاں اس کے معنی کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد خشوع اور تواضع ہے۔ سدی نے کہا ہے: ان کے چہروں پر حاجت اور فاقہ کشی اور تنگدستی کا اثر مراد ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ان کے کپڑوں کا پھٹا پرانا ہونا مراد ہے اور ایک قوم نے کہا ہے اور اسے مکی نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سجدوں کا اثر ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے اور یہ اس لئے کہ وہ فارغ اور توکل کرنے والے لوگ تھے ان کا زیادہ تر نماز کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ لہذا ان پر سجدوں کے نشانات تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ سیما جس سے مراد سجدوں کا اثر ہے اس میں تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مشترک ہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے: سَيِّئَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (الفتح: ۲۹) (ان کے ایمان و عبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے۔

لہذا اس معنی میں تو ان کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ پس کوئی معنی باقی نہ رہا مگر یہ کہ سیما سے مراد فقر و افلاس اور حاجت مند ہونے کا اثر ہو یا پھر سجدوں کے نشانات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوں، وہ رات کے قیام اور دن کے روزوں کی وجہ سے چہروں کی زردی سے پہچانے جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور رہا خشوع! تو اس کا محل دل ہے اور اس میں غنی اور فقیر سب مشترک ہوتے ہیں، نتیجتاً جو معنی ہم نے اختیار کیا ہے اس کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ والسوفق الالہ۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا۔ إلحاف مصدر ہے جو حال کے محل میں واقع ہے، یعنی معنی ولحفین۔ کہا جاتا ہے: ألحف، أخفى اور ألخ سوال میں اصرار کرنے کے معنی میں برابر ہیں اور کہا جاتا ہے۔ و ليس لِنُحِفٍ مِثْلُ الزد۔

اور إلحاف اللحاف سے مشتق ہے۔ سوال کرنے اور مانگنے میں وجہ طلب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے جیسا کہ اللحاف ڈھانپنے کے معنی کو شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ سائل عوام الناس سے اپنا سوال کرتا ہے اور اپنے سوال میں خوب اصرار کرتا ہے (گویا وہ ان کے ساتھ لپٹ کر سوال کر رہا ہے) اسی معنی میں ابن احمر کا یہ قول ہے:

فَظَلَّ يَحْفَهُنَّ بِتَقَفِّهِهِنَّ يَلْحَفُهُنَّ هُفَافًا ثَخِينًا

شاعر شتر مرغ کا ذکر کر رہا ہے کہ وہ انڈوں کو اپنے پیروں کے نیچے چھپا لیتے ہیں اور وہ ان پر اس طرح پر ڈال لیتا ہے جیسا کہ لحاف اور وہ اپنے سخت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا باریک ہوتا ہے۔

نسائی اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مسکین وہ نہیں ہے جسے ایک یا دو کھجوریں اور ایک یا دو لقمے دیئے جاتے ہیں بلکہ مسکین تو پاکدامن بننے والا (سوال کے لئے ہاتھ نہ پھیلائے والا) ہے اگر چاہو تو یہ پڑھ لو لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا۔

1۔ صحیح بخاری، باب لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا، حدیث نمبر 4175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 5۔ علماء نے قول باری تعالیٰ: لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا کے معنی میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: پس ایک گروہ نے کہا ہے جن میں طبری اور زجاج ہیں کہ اس کا معنی ہے: وہ قطعاً سوال نہیں کرتے اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ سوال سے کلی طور پر بچتے اور پاکدامن رہتے ہیں۔ یہی موقف جمہور مفسرین کا ہے اور پاکدامنی کی صفت ان کے لئے ثابت ہوتی ہے یعنی وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے نہ اصرار کے ساتھ اور نہ بغیر اصرار کے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد الحاف کی نفی ہے، یعنی وہ اصرار اور لپٹے بغیر تو سوال کرتے رہتے ہیں اور یہ فہم کے زیادہ قریب اور اس میں جلدی آنے والی شے ہے اور اس میں اس کی بری حالت پر تنبیہ ہے جو لوگوں سے لپٹ کر سوال کرتا ہے۔

ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ امام مسلم کے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم سوال میں اصرار نہ کرو قسم بخدا! تم میں سے کوئی بھی مجھ سے کسی شے کا سوال نہیں کرتا تو اس کا سوال اس کے لئے مجھ سے کوئی شے نکال لاتا ہے اور میں اسے ناپسند کرتا ہوں، پس اس کے لئے اس میں برکت رکھ دی جائے گی جو کچھ میں نے اسے عطا کیا۔“

اور مؤطا میں ہے، حضرت زید بن اسلم نے حضرت عطاء بن یسار سے اور انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں اور میرے گھروالے بقیع غرقہ میں اترے تو میرے گھروالوں نے مجھے کہا: تو رسول اللہ ﷺ کے پاس جا اور آپ سے ہمارے لئے کوئی چیز لے آتا کہ ہم اسے کھائیں اور وہ اپنی حاجت اور ضرورت ذکر کرنے لگے۔ پس میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو میں نے آپ ﷺ کے پاس ایک آدمی کو سوال کرتے ہوئے پایا اور رسول اللہ ﷺ اسے فرما رہے تھے: لا اجد ما اعطیک میں کوئی ایسی شے نہیں پاتا جو میں تجھے دوں۔ وہ آدمی آپ سے پیٹھ پھیر کر لوٹا اس حال میں کہ وہ بڑے غصے میں تھا اور کہہ رہا تھا مجھے اپنی عمر کی قسم بلاشبہ آپ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بے شک یہ مجھ پر غصے ہو رہا ہے کہ میں نے اسے دینے کے لئے کوئی شے نہیں پائی۔ تم میں سے جس نے اس حال میں سوال کیا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ (چاندی) یا اس کے برابر (سامان) ہو تو تحقیق اس نے بالاصرار اور لپٹ کر سوال کیا۔“

اسدی نے کہا ہے: پس میں نے کہا ہمارے لئے تو دودھ دینے والی ایک اونٹنی اوقیہ سے بہتر ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں..... اس آدمی نے بیان کیا تو میں واپس لوٹ گیا اور میں نے آپ سے کچھ نہ مانگا، پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس جو اور کشمش لائے گئے تو آپ ﷺ نے انہیں ہمارے لئے تقسیم فرما دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غنی فرما دیا۔

ابن عبد البر نے کہا ہے اسی طرح اسے مالک نے روایت کیا ہے اور ہشام بن سعد وغیرہ نے ان کی اتباع کی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے اور علماء کے نزدیک جب صحابی کا نام نہ لیا جائے تو اس کا حکم کسی دوسرے آدمی کے حکم کی طرح نہیں ہے جب اس کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ تمام صحابہ کرام سے جرح اٹھ چکی ہے اور ان کے لئے عدالت ثابت ہے۔ یہ حدیث اس پر دلالت

کرتی ہے کہ اس کے لئے سوال کرنا مکروہ ہے جس کے پاس ایک اوقیہ چاندی ہو۔ پس جس نے سوال کیا اس میں کہ اس کے پاس یہ حد ہو اور اتنی مقدار اور تعداد میں چاندی یا وہ شے ہو جو اس کے قائم مقام ہوتی ہے اور وہ اس کے مساوی ہو تو وہ مُنْجِف ہے (یعنی لپٹ کر سوال کرنے والا ہے) اور میں اہل علم میں سے کسی کو نہیں جانتا مگر ہر کوئی اس کے لئے سوال کو مکروہ قرار دیتا ہے جس کے پاس اتنی مقدار میں چاندی ہو یا اس کے مساوی سونا ہو۔ یہ حکم اس حدیث کے ظاہر کی بنا پر ہے اور جو شے بغیر سوال کے کسی کے پاس آجائے تو اس کے لئے اسے کھانا جائز ہے اگر وہ زکوٰۃ میں سے نہ ہو۔ اور یہ ان (مسائل) میں سے ہے جس میں کسی اختلاف سے واقف نہیں اور اگر وہ شے مال زکوٰۃ میں سے ہو تو اس میں اختلاف ہے اس کا بیان آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ ابن عبد البر نے کہا ہے: سوال کے معافی اور اس کی کراہیت کے بارے میں فقہاء کے جوابات اور اہل ورع کا مذہب بیان کیا گیا ہے اس میں سے احسن ترین وہ ہے جسے اثرم نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے۔ آپ سے سوال کرنے کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کب حلال ہوتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جب اس کے پاس اتنی شے بھی نہ ہو جس سے وہ اپنی صبح اور شام کا کھانا تیار کر سکے۔ یہ حضرت سہل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق ہے (1)۔ ابو عبد اللہ (یہ حضرت امام احمد رحمہ اللہ کی کنیت ہے) کو کہا گیا اگر وہ سوال کرنے پر مجبور ہو جائے تو آپ نے فرمایا: جب وہ مجبور ہو جائے تو اس کے لئے مانگنا مباح ہے پھر کہا گیا: اور اگر وہ مانگنے سے باز رہے تو؟ آپ نے فرمایا: یہ اس کے لئے بہت بہتر ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: میں کسی کے بارے میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ بھوک سے مر جائے گا! اللہ تعالیٰ اسے اس کا رزق ضرور عطا فرمائے گا۔ (ما اظن أحدًا يموت من الجوع! الله ياتيه برزقه) پھر آپ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر فرمائی: مَنْ اسْتَعْفَ اعْفَهُ اللهُ (2) جو پاکدامنی کا طالب ہو اللہ تعالیٰ اسے پاکدامن کر دے گا (یعنی جو سوال سے رکا رہا اللہ تعالیٰ اسے اس سے محفوظ کر دے گا۔)

اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تَعَفَّفْ تو پاکدامن رہ (یعنی کسی سے نہ مانگ) ابو بکر نے بیان کیا ہے: میں نے آپ کو سنا۔ آپ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا جس کے پاس کوئی شے نہیں ہوتی کیا وہ لوگوں سے سوال کر سکتا ہے یا مردار کھا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کیا وہ مردار کھا سکتا ہے جو ایسے آدمی کو پائے جس سے وہ کچھ مانگ سکتا ہو، یہ بہت شنیع اور برا ہے۔ مزید بیان کیا اور میں نے آپ سے یہ بھی سنا کہ آپ سے سوال کیا گیا کیا آدمی کسی دوسرے کے لئے مانگ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، البتہ وہ تعریض کر سکتا ہے۔ (یعنی اشارۃً تو جب اس کی طرف دلواسکتا ہے) جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی وہ ننگے پاؤں تھے، بدن پر کپڑے نہ تھے اور اپنے جسموں کو اونی دھاری دار چادروں سے ڈھانپے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ ابی داؤد، باب من يعطى من صدقة وحد الغناء، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الاستعفاف عن المسألة، حدیث نمبر 1376، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تصدقوا (اے صحابہ!) تم صدقہ کرو۔ آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا: اعطوہم۔ تم انہیں دو..... ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: اشفعوا تو جو اتم مدد کرو تم اجر دیے جاؤ گے (1) تو اس میں دوسرے کے لئے سوال کا اطلاق ہے۔ واللہ اعلم..... اور فرمایا: ألا رجل يتصدق على هذا کیا کوئی آدمی نہیں جو اس پر صدقہ کر سکتا ہو؟ ابو بکر نے بیان کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو کہا گیا ایک آدمی اس آدمی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے: بے شک وہ محتاج ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ تعریض ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بے شک سوال تب بنتا ہے کہ وہ کہے: أعطہ تو اسے دے۔ پھر فرمایا: میرے نزدیک یہ پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ذات کے لئے سوال کرے تو پھر کسی دوسرے کے لئے یہ کیسے پسندیدہ ہو سکتا ہے؟ البتہ میرے نزدیک تعریض کرنا پسندیدہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو داؤد اور نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے کہ فراسی (بنی فراس بن مالک کا کوئی آدمی) نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا میں سوال کر سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں اور اگر تو سائل ہے تو پھر ضروری ہے کہ تو صالحین سے مانگ۔“ پس آپ ﷺ نے حاجت و ضرورت کے وقت اہل فضل و صلاح کے سوال کو مباح قرار دیا ہے اور اگر وہ اپنی حاجت اللہ تعالیٰ کے پاس پیش کرے تو یہ اور اعلیٰ ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے کہا ہے: لوگوں سے حاجات کا مطالبہ کرنا یہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے۔ پس تو اپنی حاجت اس کے پاس پیش کر جو ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک ہے اور چاہیے کہ تیرا بھاگ کر جانا اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ماسویٰ سے کافی ہو جائے گا اور تو خوشحال اور سرور زندگی گزارے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر بغیر مانگے کسی کے پاس کوئی شے آجائے تو اس کے لئے جائز ہے وہ اسے قبول کر لے اور اسے رد نہ کرے کیونکہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے۔ امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت عطاء بن یسار سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف کچھ عطا (ہدیہ، تحفہ) بھیجی تو آپ نے اسے واپس لوٹا دیا، تو رسول اللہ ﷺ نے آپ کو فرمایا: ”تم نے اسے کیوں لوٹا دیا ہے؟“ تو آپ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ نے ہمیں بتایا نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ کوئی شے نہ لے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ وہ سوال کے بارے میں ہے اور رہی وہ شے جو بغیر مانگے مل جائے تو یقیناً وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا ہے۔“ تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں کسی سے کسی شے کے بارے میں سوال نہیں کروں گا اور بن مانگے جو شے بھی میرے پاس آئے گی میں اسے لے لوں گا۔

یہ نص ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اور نسائی نے اپنی سنن میں (2) اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاة، حدیث نمبر 1342، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھے عطیات عطا فرماتے رہتے تھے تو میں عرض کرتا: آپ اسے عطا فرما دیجئے جو مجھ سے زیادہ اس کا محتاج ہے، حتیٰ کہ ایک بار آپ ﷺ نے مجھے مال عطا فرمایا تو میں نے عرض کی: آپ مجھ سے زیادہ محتاج اور حاجت مند کو عطا فرما دیجئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اسے لے لو اور اس مال میں سے جو تمہارے پاس آئے اور تو نہ اس پر جھانکنے والا ہے اور نہ سوال کرنے والا، پس اسے اور اس مال کو لے لو اور تم اس میں اپنے نفس کی اتباع و پیروی نہ کرو۔“ نسائی نے خذہ کے قول کے بعد یہ اضافہ نقل کیا ہے۔ ”پس تم اسے اپنے پاس جمع کر لو یا اسے صدقہ کر دو۔“

اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن سعدی مالکی سے حدیث نقل کی ہے (1) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: اذا اعطيت شيئاً من غير ان تسأل فكل و تصدق (کہ جب تمہیں کوئی شے بغیر سوال کے دی جائے تو اسے کھاؤ اور صدقہ کر دو) یہ روایت تمہارے لئے امام مالک رحمہ اللہ کی مرسل حدیث کو صحیح بناتی ہے۔

الاثرم نے کہا ہے: میں نے ابو عبد اللہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے سنا ان سے حضور نبی مکرم ﷺ کے اس ارشاد کے بارے میں سوال کیا گیا: ”جو شے تیرے پاس بغیر سوال اور بغیر اشراف کے آجائے۔“ اس میں اشراف سے آپ نے کون سا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ تو اس پر جھانکتا رہے اور اپنے دل میں یہ کہتا رہے۔ شاید یہ شے میری طرف بھیج دی جائے۔ آپ سے کہا گیا: اگرچہ وہ تعرض نہ بھی کرے؟ آپ نے فرمایا: ہاں بلاشبہ وہ (اشراف) دل کے ساتھ ہوتا ہے پھر آپ سے کہا گیا: یہ تو بہت سختی ہے آپ نے فرمایا: اگرچہ یہ شدید ہے لیکن یہ اسی طرح ہے۔ آپ سے کہا گیا: اگر کوئی آدمی مجھے عادی نہ بنائے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے مگر یہ کہ اس کا خیال میرے دل میں آئے اور میں کہوں: قریب ہے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے۔ تو آپ نے فرمایا: یہ اشراف ہے۔ پس اگر وہ تیرے پاس آئے اس کے بغیر کہ تو اس کا تصور کرے اور نہ ہی وہ تیرے دل میں کھٹکے تو یہ وہ شے ہے جس میں اشراف نہیں ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: لغت میں الاشراف سے مراد اس شے کی طرف سراٹھانا ہے جو اس آدمی کے پاس ہو جس کی حرص ہو اور اس شے میں بھی حرص اور طمع ہو۔ اور یہ کہ وہ انسان کو خوش کرے اور یہ تعرض کرنے لگے۔ اور امام احمد نے اشراف کی تاویل میں جو کچھ کہا ہے وہ تفسیق اور تشدید ہے اور وہ میرے نزدیک بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے اس سے درگزر فرمائی ہے جو کچھ ان کے دلوں میں پیدا ہو، نہ زبان اس کے ساتھ بولے اور نہ ہی اعضاء اس کے مطابق عمل کریں۔ کفر کے سوا گناہوں میں سے دل جن کا اعتقاد رکھے وہ کوئی شے نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ اس کے مطابق عمل کرے اور دل میں کھٹکنے والے خیال اور وہم سے بالا جماع درگزر کر لیا گیا ہے۔ (یعنی ان پر کوئی مواخذہ نہیں جب تک انہیں عملی جامہ نہ پہنایا جائے۔)

مسئلہ نمبر 8۔ کسی سے کچھ مانگنے میں اصرار کرنا اور اس سے مستغنی ہونے کے باوجود اس سے لپٹ جانا حرام ہے حلال نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے کثرت مال کے باوجود لوگوں سے ان کے مالوں کے بارے میں سوال کیا تو وہ (آگ کے) انگارے مانگ رہا ہے چاہے وہ قلیل طلب کرے یا زیادہ مانگے۔“ اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے

روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی مسلسل (بھیک) مانگتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے گا اور اس کے چہرے میں گوشت (☆) کا ٹکڑا تک نہ ہوگا۔“ اسے مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 9۔ سائل جب محتاج ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ تین بار تک عذر پیش کرتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے اپنا سوال بار بار کرے۔ اور ایسا نہ کرنا افضل ہے اور اگر وہ آدمی جس سے سوال کیا گیا ہے وہ اس کے بارے جانتا ہو اور وہ اس پر قادر بھی ہو جو شے اس نے مانگی ہے تو اس پر اسے عطا کرنا واجب ہے اور اگر وہ اس کے بارے ناواقف ہو تو وہ اسے اس خوف سے دے دے کہ ہو سکتا ہے وہ اپنے سوال میں سچا ہو اور وہ اسے واپس لوٹانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 10۔ اور اگر وہ ایسی شے کا محتاج ہو جس کے ساتھ وہ سنت کو قائم کر سکتا ہے مثلاً ایسے کپڑے کے ساتھ آراستہ ہونا جسے وہ عیہ اور جمعہ (کی نمازوں) میں پہنتا ہو۔ تو ابن عربی نے ذکر کیا ہے: ”میں نے خلیفہ بغداد کی جامع مسجد میں ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ یہ تمہارا بھائی ہے جو تمہارے ساتھ جمعہ کی نماز میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے پاس کپڑے نہیں ہیں جن کے ساتھ یہ جمعہ کی سنت کو قائم کر سکتا ہو۔ پس جب دوسرا جمعہ آیا تو میں نے اس پر دوسرا لباس دیکھا۔ تو مجھے بتایا گیا۔ ابو الطاہر البرسی نے اسے یہ لباس پہنایا ہے اور مدح و تعریف حاصل کی ہے۔“

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٣﴾

”جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ غمگین ہوں گے۔“
اس میں ایک مسئلہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ذر، حضرت ابو امامہ، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم، حضرت عبداللہ بن بشر غافقی اور امام اوزاعی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت ان گھوڑوں کے چارے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں باندھے گئے ہوں۔ اور ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: مجھے محمد بن شعیب بن شابور سے خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا ہمیں سعید بن سنان نے یزید بن عبداللہ بن عریب عن ابیہ عن جدہ عریب کی سند سے خبر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا گیا: الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

1۔ صحیح بخاری، باب من سأل الناس تکثراً، حدیث نمبر 1381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ قاضی عیاض رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ وہ قیامت کے دن ذلیل و خوار ہو کر آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہی محمول ہے اسے اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرہ میں فقط ہڈیاں ہوں گی گوشت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٥٠﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہم اصحاب الخیل کہ ان سے مراد گھوڑوں والے ہیں۔

اور اسی اسناد کے ساتھ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گھوڑے پر خرچ کرنے والا صدقے کے ساتھ اپنا ہاتھ پھیلانے والے کی طرح ہے۔ (یعنی کثرت سے صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔) کہ وہ اسے بند نہیں کرتا۔ ان کا پیشاب اور ان کی لید قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی پاکیزگی کی طرح ہوگی۔“

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے پاس چار درہم تھے تو آپ نے ایک درہم رات کے وقت اور ایک درہم دن کے وقت، ایک درہم سرا اور ایک درہم جبراً صدقہ کر دیئے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے ہمیں عبدالوہاب بن مجاہد نے اپنے باپ کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی خبر دی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: یہ ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے اس طرح عمل کیا اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور آدمی کا نام ذکر نہیں کیا۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اسراف اور کنجوسی کے بغیر خرچ کرتے ہیں اور بایلیل والنہار کا معنی ہے فی الیل والنہار (رات اور دن میں) اور قلہم میں فادخل ہے کیونکہ کلام میں جزا کا معنی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور زید فمنطلق کہنا جائز نہیں ہے۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۚ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ ۚ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٥١﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصَّدَاقَاتِ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٥٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٥٣﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٥٤﴾ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۖ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٥٥﴾

”جو لوگ کھایا کرتے ہیں سود وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے

چھو کر۔ یہ حالت اس لئے ہوگی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ سوداگری بھی سود کی مانند ہے حالانکہ حلال فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو۔ پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے تو وہ (سود سے) رک گیا تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود کھانے لگے تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر ناشکرے گنہگار کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور کرتے رہے اچھے عمل اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز اور دیتے رہے زکوٰۃ کو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔“

تین آیات سود کے احکام، بیع کی عقود کے جواز اور اس کے لئے وعید کو متضمن ہیں جو کوئی سود کو حلال سمجھے اور اس پر عمل کرنے پر مصر ہو۔ اس میں اڑتیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا يَأْكُلُونَ بِمَعْنَى يَأْخُذُونَ ہے (یعنی وہ جو سود لیتے ہیں) اور اخذ (لینے) کو اکل (کھانے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سود کھانے کے لئے ہی لیا جاتا ہے اور ربا کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ کہا جاتا ہے: ربا الشيء يربو۔ جب کوئی شے زیادہ ہو جائے اور اس معنی میں حدیث طیبہ بھی ہے: فلا والله ما اخذنا من لقمة الا ربا من تحتها (قسم بخدا! ہم نے جو لقمہ بھی لیا تو وہ اپنے نیچے سے اور زیادہ ہو گیا) مراد وہ کھانا ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (1)

قیاس یہ ہے کہ یہ یاء کے ساتھ لکھا جائے کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے، حالانکہ انہوں نے اسے قرآن کریم میں واو کے ساتھ لکھا ہے۔

پھر شریعت نے اس اطلاق میں تصرف کیا اور اسے بعض مواقع کے ساتھ محصور کر دیا۔ پس ایک بار اس کا اطلاق حرام کمائی پر کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا: وَ أَخَذْنَاهُمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ (النساء: 161) (اور بوجہ اس کے سود لینے کے حالانکہ منع کئے گئے تھے اس سے) اور اس سے وہ شرعی ربا مراد نہیں لیا جس کے حرام ہونے کا ہم پر حکم لگایا، بلکہ اس سے حرام مال مراد لیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَتُعُونَ لِّلْكَذِبِ أَكُلُونَ لِّلْشَّحْتِ (المائدہ: 42) (قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو بڑے حرام خور ہیں) اس سے مراد مال حرام ہے رشوت وغیرہ۔ اور وہ جسے انہوں نے اُمّیتین کے اموال میں سے حلال سمجھ لیا تھا جہاں انہوں نے کہا: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأَقِيمِينَ سَبِيلٌ (العبران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت) اس بنا پر اس میں نہی ہر مال حرام کو شامل ہے جس طریقہ سے بھی مال کمایا جائے اور وہ ربا جس پر شرعی

1۔ صحیح بخاری، باب السمر مع الضیف والأهل، حدیث نمبر 567، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اصطلاح ہے وہ دو چیزیں ہیں: نساء کو حرام قرار دینا اور عقود اور مطعومات میں تفاضل (زیادتی) جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے اور اس میں غالب وہی ہے جو عرب کرتے تھے، قرض دینے والے کے لئے ان کا یہ قول ہے: اُتَقْضِ امر تُنْہٰی؟ (کیا تو ادا کرے گا یا تو اضافہ کرے گا) پس وہ (قرض دینے والا) مال کی تعداد میں اضافہ کر دیتا اور قرض لینے والا اس پر صبر کرتا اور یہ سب حرام کر دیا گیا ہے اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اکثر وہ بیعیں جنہیں ممنوع قرار دیا گیا ہے ان میں ممنوع ہونے کی علت زیادتی کے معنی کا پایا جانا ہے یا تو عین مال میں زیادتی یا پھر (بالع اور مشتری میں سے) کسی ایک کے لئے تاخیر کے سبب منفعت میں زیادتی وغیرہ..... اور بیوع میں سے وہ جس میں زیادتی کا معنی نہ ہو، جیسا کہ پھل کی بیع کرنا اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اور اسی طرح وہ بیع جو جمعہ کے دن اذان کے وقت ہو، اگر ان کے کرنے والے کو کہا جائے، سود کھانے والا تو یہ مجازاً اور تشبیہاً ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سونے کی بیع سونے کے عوض، چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی بیع گندم کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض اور نمک کی بیع نمک کے عوض برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ ہے۔ پس جس نے زیادتی کی یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو اس نے سود لیا لینے اور دینے والا اس میں برابر ہیں۔“

اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ”جب یہ اصناف مختلف ہوں تو پھر ان کی بیع کرو جیسے تم چاہو بشرطیکہ دست بدست ہو۔“ اور ابو داؤد نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سونے کی بیع سونے کے عوض اس کی پتیاں ہوں اور اس کا عین ہو، چاندی کی بیع چاندی کے عوض اس کی پتیاں ہوں اور اس کا عین ہو، گندم کی بیع گندم کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد اور نمک کی بیع نمک کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد۔ پس جس نے زیادہ دیا یا زیادتی کا طالب ہوا تحقیق اس نے سود لیا اور سونے کو چاندی کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ ان میں سے چاندی کی مقدار زیادہ ہو درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی نسیدہ (ادھار) تو یہ جائز نہیں ہے اور گندم جو کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو ان دونوں میں زیادہ ہوں درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی ادھار تو یہ جائز نہیں (1)۔“ علماء نے اس سنت کے تقاضا کے مطابق قول پر اجماع کیا ہے اور اسی طریقہ پر مسلمان فقہاء کی جماعت ہے مگر گندم اور جو میں، کیونکہ امام مالکؒ نے ان دونوں کو ایک صنف قرار دیا ہے۔ پس ان دونوں میں سے دو کی بیع ایک کے عوض جائز نہیں ہے۔ اور یہی قول لیثؒ، اوزاعیؒ اور مدینہ اور شام کے عظیم علماء کا ہے۔ اور امام مالکؒ نے ان دونوں کی طرف السلت (جو کی ایک قسم جس پر چھلکا نہیں ہوتا) کی اضافت کی ہے اور لیثؒ نے کہا ہے: السلت (جو)، باجرہ اور مکئی یہ ایک ہی صنف ہے اور ابن وہب نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب حدیث طیبہ ثابت ہے تو اس کے ساتھ کسی قول کی کوئی حیثیت نہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الصرف، حدیث نمبر 2907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والسلام نے فرمایا ہے: ”جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو انہیں بیچو بشرطیکہ بیع دست بدست ہو۔“ اور آپ کا یہ ارشاد بھی ہے: ”کہ گندم کی بیع گندم کے عوض اور جو کی بیع جو کے عوض“ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ دونوں دو مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ گندم اور کھجور مختلف ہیں کیونکہ دونوں کی صفات مختلف ہیں اور دونوں کے نام بھی مختلف ہیں۔ اور اگانے والے اور کاٹنے والے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ جدائی اور فرق بالکل واضح اور بین ہے اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری اور اصحاب حدیث کا یہی مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ یہ موقف اختیار کرتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نبی اور تحریم ڈھلے ہوئے دینار اور ڈھلے ہوئے درہم کے بارے میں وارد ہے نہ کہ سونے کی پتریوں اور ڈھالی گئی چاندی کے بارے میں اور نہ ہی اس کے بارے میں جو ڈھلی ہوئی (چاندی) سے شے بنائی گئی ہو۔ اور کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نہیں صرف اس کے بارے میں ہے جو اس سے خاص نمونہ پر تیار کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ ان کی ملاقات حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گئی، جسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے، بیان فرمایا: ہم جہاد میں شریک ہوئے اور لوگوں پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حکمران تھے۔ پس ہم نے بہت زیادہ مال غنیمت اکٹھا کیا اور ہمارے اس مال غنیمت میں چاندی کے برتن بھی تھے۔ تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو لوگوں کے عطیات میں انہیں بیچ ڈالنے کا حکم دیا۔ تو اس بارے میں لوگوں کے مابین تنازع شروع ہو گیا۔ پس اس کی اطلاع حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض اور نمک نمک کے عوض بیچنے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے مگر (اس صورت میں کہ وہ) برابر برابر ہو اور عین کے عوض عین ہو۔ جس نے زیادہ کیا یا زیادتی کا طالب ہو تو تحقیق اس نے سود لیا۔ پس لوگوں نے جو لیا تھا وہ واپس لوٹا دیا۔ پس یہ خبر جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا: خبردار! سنو کیا حال ہے ان لوگوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بیان کرتے ہیں حالانکہ ہم آپ کے پاس حاضر رہتے تھے اور آپ کی صحبت و معیت میں رہتے تھے اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث نہیں سنیں، تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور دوبارہ وہی حدیث بیان فرمائی۔ پھر فرمایا: ہم ضرور بہ ضرور اس کے بارے حدیث بیان کریں گے جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، اگرچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کریں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں نے سیاہ رات میں آپ کے لشکر میں آپ کی صحبت اختیار نہیں کی۔ حماد نے یہی یا اسی طرح کہا ہے۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: یہ بھی روایت ہے کہ یہ قصہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں کا آپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو لیکن عرف میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث محفوظ رہی۔ اور یہی وہ اصل ہے جس پر علماء نے رہا کے باب میں اعتماد اور بھروسہ کیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فعل کے جائز نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ معاملہ حضرت امیر معاویہ

بنی ہنظلہ پر مخفی رہا ہو حالانکہ حضرت ابوالدرداء اور حضرت عبادہ بنی ہنظلہ دونوں نے اسے جان لیا ہو کیونکہ یہ دونوں فقہاء اور کبار صحابہ کرام میں سے جلیل القدر صحابی ہیں، کبھی حضرت ابوبکر و عمر بنی ہنظلہ پر کوئی ایسی شے مخفی رہی جو ان کے سوا دوسرے صحابہ کرام سے پالی گئی جو درجہ اور رتبہ میں ان سے کم ہیں۔ پس حضرت امیر معاویہ بنی ہنظلہ بھی دوسرے ہیں..... اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا مذہب حضرت ابن عباس بنی ہنظلہ کے مذہب کی طرح ہو۔ اس کے باوجود کہ وہ علم کا سمندر تھے وہ ایک درہم کی بیع دو درہم کے ساتھ کرنے میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوسعید بنی ہنظلہ نے انہیں اس سے پھیر دیا۔ اور حضرت امیر معاویہ بنی ہنظلہ کا واقعہ بھی حضرت عبادہ بنی ہنظلہ کے ساتھ اسی طرح ہے اور یہ حضرت عمر بنی ہنظلہ کے دور خلافت میں پیش آیا۔ قبیسہ بن ذؤیب نے کہا ہے: بے شک حضرت عبادہ بنی ہنظلہ نے حضرت امیر معاویہ بنی ہنظلہ کو کسی شے سے منع کیا تو انہوں نے کہا: میں تجھے اس زمین پر نہیں رہنے دوں گا جہاں تو رہ رہا ہے تو وہ مدینہ میں داخل ہو گئے تو حضرت عمر بنی ہنظلہ نے انہیں کہا: کون سی شے تجھے لے آئی ہے؟ تو انہوں نے آپ کو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ تو حضرت عمر بنی ہنظلہ نے فرمایا: تو اپنی جگہ کی طرف لوٹ جا، اللہ تعالیٰ اس زمین کو فاسد کرے جس میں تم اور تمہاری مثل لوگ نہ ہوں! اور ساتھ ہی حضرت امیر معاویہ بنی ہنظلہ کی طرف لکھ دیا لا امارۃ لک علیہ (تجھے اس پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے۔)

مسئلہ نمبر 5۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ حضرت علی بنی ہنظلہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دینار دینار کے عوض ہے اور درہم درہم کے عوض ہے ان کے درمیان کوئی فضل اور زیادتی نہیں ہے جسے چاندی کی حاجت ہو اسے چاہیے کہ وہ اسے سونے کے عوض بدل لے اور اگر سونے کی ضرورت ہو تو پھر اسے چاہیے کہ وہ چاندی کے عوض اسے بدل لے دست بدست (یعنی ایک ہاتھ سے لے اور دوسرے سے دے)

علماء نے بیان کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: الدینار بالدینار والدرہم بالدرہم لا فضل بینہما یہ اس اصل کی جنس کی طرف اشارہ ہے جو ڈھلی ہوئی ہو۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: الفضة بالفضة والذهب بالذهب الحدیث۔ چاندی چاہے سفید ہو یا سیاہ اور سونا سرخ ہو یا زرد کسی کی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیع جائز نہیں ہوتی مگر یہ کہ دونوں ہم مثل ہوں اور ہر حال میں برابر ہوں۔ اسی پر علماء کی ایک جماعت ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ اور حضرت امام مالک سے فلوس کے بارے میں روایت مختلف ہے۔ سو آپ نے انہیں درہم کے ساتھ ملحق کیا ہے اس حیثیت سے کہ یہ اشیاء کے ثمن ہیں اور ایک بار انہیں ان کے ساتھ ملانے سے منع بھی کیا ہے اس اعتبار سے کہ یہ ہر شہر میں ثمن نہیں ہیں بلکہ بعض شہر ان کے ساتھ مختص ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے جو امام مالک رحمہ اللہ کے بہت سے اصحاب سے مروی ہے۔ ان میں سے بعض اسے امام مالک سے تاجر کے بارے میں روایت کرتے ہیں در آنحالیکہ خروج (گھر سے نکلنا) اسے دھوکہ دے رہا ہو۔ اور اس کے سبب اسے ڈھالے گئے درہم یا دنانیر کی حاجت پڑ جائے۔ پس وہ اپنی چاندی یا اپنا سونا لے کر نکال میں آتا ہے اور ڈھالنے والے کو کہتا ہے، میری یہ چاندی یا یہ سونا تو لے لے اور اپنی محنت بھی لے لے اور تو مجھے میرے سونے کے بدلے

ڈھلے ہوئے دنانیر یا میری اس چاندی کے بدلے ڈھلے ہوئے درہم مجھے دے دے۔ کیونکہ مجھے خروج کے وقت دھوکا دیا گیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا جس کے ساتھ میں نکلا ہوں۔ تو ضرورت کے تحت اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے اور بعض لوگوں نے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ ابن عربی رحمہ اللہ نے اپنی قبس میں امام مالک سے تاجر کے سوا دوسروں کے بارے میں بھی اسے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے اس میں تخفیف فرمائی ہے..... اور یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی وہ چاندی بیچے جس کا وزن ایک سو پانچ درہم تھا اور وہ اس کے بدلے اسے سو درہم دے اور یہ خالص رہا ہے۔ اور جس نے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے کہ اگر وہ اسے اس طرح کہے: یہ چاندی مجھے ڈھال دے اور اس پر تو اس سے اجرت کاٹ لے۔ پس جب وہ اسے ڈھال لے اور یہ اسے اس سے لے لے اور یہ اسے اس کی اجرت ادا کر دے۔ پس جو امام مالک نے پہلے کہا ہے وہ وہی ہے جو آخر میں ہوگا۔ امام مالک نے مال کی طرف دیکھا ہے اور اس پر حال کا حکم مرتب کیا ہے اور تمام فقہاء نے اس کا انکار کیا ہے، ابن عربی نے کہا ہے: اس میں امام مالک کی حجت واضح ہے۔

ابو عمر رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ وہ عین رہا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے حرام کیا ہے: مَنْ زَادَ اوْزَادَ فَقَدْ اَرْبَى (جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا تحقیق اس نے سود لیا)

ابن وہب نے اس مسئلہ میں امام مالک کا رد کیا ہے اور اس کا انکار کیا ہے۔

اور علامہ ابہری نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تجارت کے فروغ کے لئے نرم رویہ اپنایا گیا ہے تاکہ تجارتی منڈی ختم ہی نہ ہو جائے اور رہا (سود) نہیں ہے مگر اس پر جو اس سے زیادہ لینے کا ارادہ کرے جو اس کا قصد کرتا ہو اور اسے چاہتا ہو۔ اور ابہری بھول گئے اس کی اصل سد ذرائع میں ہے اور ان کا قول اس آدمی کے بارے میں ہے جس نے کپڑا ادھار بیچا اور وہ اسے خریدنے کی نیت اور ارادہ نہ رکھتا ہو پھر وہ اسے بازار میں پاتا ہے کہ اسے بیچا جا رہا ہے۔ بے شک اس کے لئے اس سے کم قیمت کے ساتھ اسے خریدنا جائز نہیں ہے جتنے کے ساتھ اس نے اسے بیچا تھا، اگرچہ وہ اس کا قصد نہ بھی کرے اور نہ اسے چاہے اور اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور اگر رہا نہیں ہے مگر اسی پر جو اس کا قصد کرے تو پھر (ہر شے) فقہاء پر ہی حرام کی گئی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمارے بازار میں کوئی تجارت نہیں کرے گا مگر وہی جو اس کی خوب سمجھ بوجھ رکھتا ہو ورنہ وہ رہا کھائے گا۔ یہ اس کے لئے بالکل واضح ہے جسے انصاف عطا کیا گیا اور اسے رشد و ہدایت عطا فرمائی گئی۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالک نے زیادتی (لینے دینے) سے روکنے میں انتہائی مبالغہ کیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے متوہم (موہومہ) کو متحقق (ثابت شدہ) کی مثل قرار دیا ہے۔ سو آپ نے ایک دینار اور ایک درہم کی بیع ایک دینار اور ایک درہم کے بدلے کرنے سے منع کیا ہے۔ یہ سد ذرائع کے لئے اور توہمات کی جڑ کاٹنے کے لئے کیا ہے کیونکہ اگر زیادتی کا وہم نہ ہوتا تو وہ آپس میں تبادلہ نہ کرتے اور تقسیم کے وقت مماثلت معذور ہونے کو اس منع کی علت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے سونے اور چاندی کا تبادلہ سونے کے عوض لازم آتا ہے اور اس سے زیادہ واضح یہ ہے کہ انہوں نے تفاضل معنوی سے بھی منع

کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس سے منع کیا ہے کہ کوئی اعلیٰ اور عمدہ سونے کے ایک دینار اور گھٹیا سونے کے ایک دینار کی بیع اعلیٰ کے مقابلہ میں کرے اور گھٹیا پن کو لغو قرار دے۔ اور یہ آپ کی دقت نظر کی علامت ہے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ سے وہ روایت منکر ہے اور وہ صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ خطابی نے کہا ہے: تبر سے مراد سونے اور چاندی کا وہ ٹکڑا ہے جسے ابھی تک ڈھالا نہ گیا ہو اور نہ ہی اس سے دراہم یا دنانیر بنائے گئے ہوں۔ اس کی واحد تَبْرَةٌ ہے۔ اور العین سے مراد وہ ہے جس سے دراہم یا دنانیر بنائے گئے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا ہے کہ ایک مشقال عین سونا بیچا جائے مشقال اور ایسی پتریوں کے ساتھ جو ڈھلی ہوئی نہ ہوں۔ اور اسی طرح مضروب چاندی اور غیر مضروب چاندی کے درمیان تفاوت کو بھی حرام قرار دیا ہے اور آپ ﷺ کے اس ارشاد تَبْرُهَا وَعَيْنُهَا سَوَاءٌ کا یہی معنی ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھجور کی بیع کھجور سے کرنا جائز نہیں ہوتی مگر برابر برابر۔ اور انہوں نے ایک کھجور کی بیع دو کھجوروں کے ساتھ کرنے میں اور گندم کے ایک حب (دانہ یا دو جو کے برابر وزن) کی بیع دو جوؤں کے ساتھ کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ اور امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ثوری رحمہم نے اس سے منع کیا ہے۔ یہی امام مالک کے قول کا قیاس ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ وہ شے جس میں ربا جاری ہوتا ہے اس کی کثیر مقدار میں تفاضل کے سبب توقیسا اور نظر اس کی قلیل مقدار بھی اس میں داخل ہے۔ اور جنہوں نے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ ایک یا دو کھجوریں ضائع کرنے والے پر قیمت واجب نہیں ہوتی، فرمایا: کیونکہ اس کا کوئی ماپ اور وزن نہیں ہے لہذا اس میں تفاضل (زیادتی) جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ تو جان! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے کہ اس باب کے مسائل کثیر ہیں اور اس کی فروع پھیلی ہوئی ہیں، وہ شے جو تیرے لئے مضبوط ہو وہ یہ ہے کہ توربا کی اس علت میں غور و فکر کرے جس کا علماء میں سے ہر ایک نے اعتبار کیا ہے۔ پس امام اعظم ابو حنیفہ رحمہہ نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے کیلی یا وزنی ہونا ہے۔ پس ہر وہ شے جس میں کیلی یا وزن داخل ہوگا آپ کے نزدیک وہ ایک جنس میں سے ہے اور اس کے بعض کی بعض کے ساتھ متفاضلاً یا نسیئاً بیع کرنا جائز نہ ہوگا۔ پس آپ نے مٹی کی مٹی کے ساتھ بیع متفاضل سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں کیل داخل ہوتا ہے اور ایک روٹی کی بیع دو روٹیوں کے ساتھ کرنے کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ آپ کے نزدیک یہ اس کیل میں داخل نہیں ہیں جو اس کی اصل ہے۔ پس یہ اس جنس سے خارج ہوگئی جس میں ربا داخل ہوتا ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے اس شے کا مطعوم (وہ شے جو کھائی جائے) ہونا ہے۔ یہ آپ کا جدید قول ہے۔ پس آپ کے نزدیک آنے کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی روٹی کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز ہے نہ متفاضلاً اور نہ نسیئاً، چاہے روٹی خمیری ہو یا تازہ ہو۔ اور آپ کے نزدیک ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے کرنا جائز نہیں ہے، ایک انار کی بیع دو اناروں سے کرنا جائز نہیں ہے، ایک تربوز کی بیع دو تربوزوں سے کرنا جائز نہیں ہے نہ

دست بدست اور نہ ہی ادھار کیونکہ یہ سب کھایا جانے والا طعام ہے۔

اور آپ نے اپنے پرانے قول میں کہا ہے کہ اس کی علت کیلی یاوزنی ہونا ہے۔

اور اس بارے میں ہمارے اصحاب مالکیہ کی عبارات مختلف ہیں اور ان میں سے جو سب سے اچھی اور حسین ہے وہ یہ ہے کہ وہ شے ایسی جنس سے ہو جو خوراک بن سکتی ہو اور اغلباً زندگی گزارنے کے لئے ذخیرہ کی جاسکتی ہو۔ جیسا کہ گندم، جو، کھجور اور نمک جن پر نص بیان کی گئی ہے اور وہ چیزیں جو ان کے معنی میں ہیں جیسا کہ چاول، مکئی، باجرہ اور تل اور وہ دانے جو ہانڈی میں پکائے جاتے ہیں مثلاً لوبیا، دالیں، سیم اور چنے وغیرہ۔ اور اسی طرح گوشت، دودھ، سرکہ اور تیل وغیرہ۔ اور پھل مثلاً انگور، کشمش اور زیتون وغیرہ اور انجیر میں اختلاف کیا گیا ہے اور شہد اور شکر اس کے ساتھ ملحق کئے جاتے ہیں۔ پس یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن میں نساء کی جہت سے ربا داخل ہوتا ہے اور ان میں تفاضل جائز ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: ”جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو ان کی بیع کرو بشرطیکہ وہ دست بدست ہو۔“ اور ان تازہ پھلوں میں ربا نہیں ہے جو باقی نہیں رہتے مثلاً سیب، تربوز، انار، ناشپاتی، ککڑی، کھیرا، بیگن اور اس کے علاوہ دیگر سبزیاں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: انڈے کی بیع انڈے کے ساتھ متفاضلاً جائز نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جو ذخیرہ کئے جاسکتے ہیں اور ان کے نزدیک برابر برابر بیع جائز ہوتی ہے۔

اور محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم نے کہا ہے: ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے اور زیادہ سے کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو ذخیرہ نہیں کی جاسکتیں۔ اور یہی امام اوزاعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ الرِّبَا کے لفظ میں علماء نحو نے اختلاف کیا ہے۔ بصریوں نے کہا ہے یہ واوی الفاظ میں سے ہے کیونکہ تو اس کے تشبیہ میں کہتا ہے: رَبَّوَان۔ سیبویہ نے یہی کہا ہے اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ یا کے ساتھ لکھا جائے گا اور اس کا تشبیہ یا کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے۔

زجاج نے کہا ہے: میں نے کوئی خطا نہیں دیکھی جو اس سے زیادہ قبیح اور زیادہ شنیع ہو اور لکھنے میں خطا نہیں کافی نہ ہوتی یہاں تک کہ انہوں نے تشبیہ میں غلطی کی، حالانکہ وہ یہ پڑھتے ہیں: وَمَا آتَيْنٰكُمْ مِنْ رَبِّا لِّدَرْبُوَانِ اَمْوَالِ النَّاسِ۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: مصحف میں الرِّبَا واو کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ اس کے درمیان اور زنا کے درمیان فرق ہو جائے۔ ربوا واو کے ساتھ لکھنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ ربایو سے ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قوله تعالى: لَا يَقُومُونَ اِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَيْمَنِ۔ یہ جملہ مبتدا کی خبر ہے اور وہ اَلَّذِيْنَ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ اپنی قبروں سے نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد، حضرت ابن جبیر، قتادہ، ربیع، ضحاک، سدی اور ابن زید رحمہم نے یہی کہا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ شیطان رکھا جائے گا وہ اس کا گلابا تار ہے گا۔ اور تمام نے کہا ہے: اسے بطور سزا

اور تمام اہل محشر کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دینے کے لئے مجنون کی طرح اٹھایا جائے گا۔ اور اس تاویل کو جس پر اجماع کیا گیا ہے یہ بات قوی اور پختہ کرتی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: لا یقومون یوم القیامۃ الا کما یقوم (کہ قیامت کے دن وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: جہاں تک آیت کے الفاظ کا تعلق ہے وہ دنیوی تجارت کی طرف انتہائی حرص و لالچ کے ساتھ کھڑے ہونے والے کی حالت کو پاگل کے کھڑے ہونے کے ساتھ تشبیہ دینے کا احتمال رکھتے ہیں کیونکہ طمع اور رغبت اسے مضطرب کر دیتی ہے یہاں تک کہ اس کے اعضاء مضطرب ہو جاتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ توتیز رفتار چلنے والے کے بارے کہتا ہے کہ وہ اپنی حرکات کی ہیئت میں پاگل لگتا ہے یا تو گھبراہٹ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے اسے پاگل کہا گیا ہے اور اُغشی نے اپنی ناقہ کو اپنے اس قول میں اس کی چستی اور تیزی میں جنون کے ساتھ تشبیہ دی ہے:

و تُصْبِحُ عَنْ غَبِّ الشَّامِی وَ کَانَا
الْمَ بَهَا مِنْ طَائِفِ الْجَنِّ أَوْلَقُ

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لَعَنُوكَ بِي مِنْ حُبِّ أَسْمَاءَ أَوْلَقُ

لیکن وہ جس کے مطابق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے اس کے مطابق مفسرین کے اقوال ظاہر ہیں۔ وہ اس تاویل کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

اور یَتَخَبَّطُهُ یَتَفَعَّلُهُ کے وزن پر خَبَطَ یَخْبِطُ سے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں تَمْلِكُهُ وَ تَعْبَدُهُ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سود کھانے والوں کے لئے علامت قرار دیا ہے اور وہ یہ کہ وہ اسے ان کے پیٹوں میں بڑھا دے گا اور انہیں خوب بو جھل کر دے گا، پس وہ جب اپنی قبروں سے نکلیں گے تو وہ کھڑے ہوں گے اور گر پڑیں گے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ بے شک انہیں قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ ان کے پیٹ حاملہ عورتوں کی طرح پھولے ہوئے ہوں گے اور جب بھی وہ انھیں گے تو گر جائیں گے اور لوگ ان کے اوپر چلتے رہیں گے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ ان کی علامت اور نشانی ہوگی اس سے وہ قیامت کے دن پہچانیں جائیں گے پھر عذاب اس کے پیچھے ہوگا۔ جیسا کہ کینہ رکھنے والا قیامت کے دن اس شے کی شہرت کے ساتھ آئے گا جس کے ساتھ اس نے کینہ رکھا اس کے ساتھ اسے مشہور کیا جائے گا پھر اس کے پیچھے اسے عذاب دیا جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَا کُلُّونَ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سود کھاتے ہیں اور اس کا کاروبار کرتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اَکَلَ (کھانے) کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ انسان کا مال میں سب سے قوی مقصد یہی ہوتا ہے۔ اور اس لئے کہ یہ انتہائی رغبت اور حرص پر دلالت کرتا ہے۔ الجشع کا معنی شدید حرص ہے۔ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ جَشَعٌ بَيْنَ الْجَشَعِ وَ الْقَوْمِ جَشَعُونَ (یعنی انتہائی شدید حرص رکھنے والا آدمی اور قوم) المجمل میں یہی ہے۔ اور کسب (کمائی) کے توابع میں سے اس بعض کو کل کسب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ پس لباس، رہائش، ذخیرہ اور اہل و عیال پر خرچ کرنا سب اس ارشاد میں داخل

ہے۔ اَلَّذِينَ يَأْكُلُونَ

مسئلہ نمبر 12۔ اس آیت میں ان کے انکار کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جنہوں نے جن کی جانب سے گرا دینے کا انکار کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ طبائع کے فعل میں سے ہے اور یہ کہ شیطان نہ انسان میں چل سکتا ہے اور نہ اس کی جانب سے چھو جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں پہلے ان کا رد گزر چکا ہے۔

نسائی نے ابوالیسر سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ اس طرح دعا مانگتے تھے: اللہم انی اعوذ بک من التردی والہدم والغرق والحریق و اعوذ بک ان یتخبطنی الشیطان عند الموت و اعوذ بک ان اموت فی سبیلک مدبرا و اعوذ بک ان اموت لدیغا (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں) (کنویں میں) گرنے سے اور (اس سے کہ مجھ پر کوئی عمارت) گر پڑے اور (پانی میں) غرق ہونے سے اور (آگ میں) جلنے سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان موت کے وقت مجھے پاگل بنادے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں تیرے راستے میں (میدان جہاد سے) پیٹھ پھیرتے ہوئے مروں اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھے کسی شے کے ڈسنے سے موت آئے۔)

اور محمد بن ثنی کی حدیث سے مروی ہے کہ ابو داؤد نے ہمام سے انہوں نے حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ دعا مانگتے تھے: اللہم انی اعوذ بک من الجنون والجذام والبرص و سقی الاسقام (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں جنون سے، جذام سے، برص سے اور بیماریوں کی شدت اور تلخی سے)

اور مس کا معنی جنون ہے۔ کہا جاتا ہے مُسَّ الرجل وألَس، فَهُوَ مَسْسُوسٌ وَمَالُوسٌ جب وہ آدمی مجنون ہو، اور یہ آخرت میں ربا کی علامت ہوگی۔ اور حدیث اسراء میں روایت کیا گیا ہے۔ ”جبرائیل امین علیہ السلام مجھے لے کر چلے تو میں بہت سے لوگوں کے پاس سے گزرا ان میں سے ہر آدمی کا پیٹ بہت بڑے گھر کی مثل ہے درآنحالیکہ وہ آل فرعون کے راستے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور آل فرعون کو صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے پس وہ شدید پیاسے اونٹوں کی مثل آتے ہیں وہ پتھروں اور درختوں سے ٹکراتے ہیں نہ وہ کچھ سنتے ہیں اور نہ عقل رکھتے ہیں پس جب ان بڑے پیٹوں والوں نے انہیں محسوس کیا تو وہ کھڑے ہوئے اور ان کے پیٹ ان پر غالب آگئے اور وہ گرنے لگے پھر ان میں سے کوئی کھڑا ہوتا تو وہ اس کا پیٹ اس پر بھاری ہو جاتا اور وہ گر پڑتا۔ پس وہ واضح استطاعت اور قدرت نہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ آل فرعون نے انہیں ڈھانپ لیا اور وہ انہیں آتے جاتے ہوئے روندنے لگے۔ پس دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ میں یہی ان کا عذاب ہے۔ اور آل فرعون کہتے ہیں اے اللہ! کبھی قیامت قائم نہ کر، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۖ (الغافر) (اور جس روز قیامت قائم ہوگی) (حکم ہوگا) داخل کرو فرعونوں کو سخت تر عذاب میں) میں نے پوچھا..... اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ تو اس نے کہا: ”یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنادیا ہو۔“ اور مس سے مراد جنون ہے اور اسی سے أولق، ألس اور الزود کے الفاظ بھی اسی معنی میں ہیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الزُّبُوَا تَمَامِ مَتَاوَلِينَ کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے اور ان کو کہا گیا ہے: فَلَهُ مَا سَلَفَ (تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا ہے) اور کسی گنہگار مومن کو یہ نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کی بیع ٹوٹ جاتی ہے اور اس کا فعل رد کر دیا جاتا ہے اگرچہ وہ ناواقف ہو۔ سو اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ زِدٌّ (جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے بارے ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ کام مردود ہے) لیکن نافرمان اور معصیت کا ارتکاب کرنے والے اس آیت کی وعید سے ایک طرف ہو کر سود لیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الزُّبُوَا یعنی بے شک قرض کی مدت پوری ہونے کے بعد آخر میں زیادتی اسی طرح ہے جس طرح عقد کی ابتدا میں اصلی ثمن تھے۔ اور عربوں میں صرف یہی رہا معروف تھا۔ پس جب ان کے قرض کی ادائیگی کا وقت آپہنچتا تو وہ مقروض کو کہتے: کیا تو پورا ادا کرے گا یا اسے بڑھائے گا۔ یعنی قرض میں اضافہ کرے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے اور اپنے اس قول حق کے ساتھ ان کے قول کو رد کر دیا ہے: وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الزُّبُوَا اور واضح کر دیا ہے جب مدت گزر جائے اور اس کے پاس ادائیگی کے لئے کچھ نہ ہو تو اسے آسانی اور خوشحالی آنے تک مہلت دی جائے اور یہی وہ رہا ہے جسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نویں ذی الحجہ کے دن اپنے قول کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ جب آپ نے فرمایا: ”خبردار! سنو بلاشبہ تمام سود ختم کر دیا گیا ہے اور وہ پہلا سود جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا سود ہے وہ سارے کا سارا ختم کر دیا گیا ہے۔“ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے اور لوگوں میں سے خاص ترین آدمی سے اس کا آغاز کیا۔ اور یہی امام وقت کے عدل کے طریقوں میں سے ہے کہ وہ عدل کو اپنی ذات پر اور اپنے خواص پر نافذ کرتا ہے اور پھر وہ تمام لوگوں میں پھیل جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الزُّبُوَا یہ قرآن کریم کے عموماًت میں سے ہے۔ اور اس پر الف لام جنس کیلئے ہے۔ عہد کے لئے نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے بیع کا ذکر نہیں ہوا جس کی طرف رجوع کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالْعَصْرُ ۚ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے) پھر اتشئی فرمائی: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے) (اس میں انسان پر الف لام جنسی ہے) اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ بیع عام ہے تو پھر اسے اس کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جس ربا وغیرہ کا ذکر ہم نے کر دیا ہے کہ اس سے منع کر دیا گیا ہے اور ان کا عقد کرنے سے روکا گیا ہے، جیسا کہ خمر، مردار اور کسی حاملہ جانور کا حمل وغیرہ ذالک اور اس بارے میں یہی سنت ہے اور اجماع امت سے ثابت ہے اور اس کی نظیر یہ بھی ہے: اقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ۔

اور وہ تمام کے تمام ظواہر جو عموماًت کا تقاضا کرتے ہیں اور ان میں تخصیص داخل ہو سکتی ہے اور یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ اور بعض نے کہا ہے یہ قرآن کریم کی وہ مجمل آیت ہے جس کی تفسیر بیع کی اس قسم کے ساتھ کی گئی ہے جو حلال کی گئی ہے اور اس کے ساتھ جو حرام کی گئی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے بیع کو حلال کرنے اور اسے حرام کرنے کے بارے میں استعمال کیا جائے مگر تب جب اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے کوئی بیان مقرر نہ ہو۔ اگرچہ یہ تفصیل کے بغیر فی الجملہ

بیوع کی اباحت پر دال ہے اور یہ عموم اور مجمل کے درمیان فرق ہے۔ پس عموم فی الجملہ اور تفصیل کے ساتھ بیوع کی اباحت پر دلالت کرتا ہے جب تک وہ کسی دلیل کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔ اور مجمل ان کی اباحت پر تفصیل سے دلالت نہیں کرتا یہاں تک کہ اس کے ساتھ بیان مقترن ہو۔ اور پہلا زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 16۔ البیوع لغت میں مصدر ہے باع کذا بكذا۔ یعنی اس نے عوض دیا اور معوض لیا۔ اور یہ بائع (بیچنے

والا) کا تقاضا کرتی ہے اور وہ مالک ہوتا ہے یا اس کا نائب ہوتا ہے اور بیع مشتری (خریدار) کا تقاضا کرتی ہے اور یہ وہ ہے جو ثمن ادا کرتا ہے۔ اور بیع کا تقاضا کرتا ہے۔ اور بیع وہ شے ہوتی ہے جس کے ثمن لگائے جائیں یعنی جس کے مقابلے میں ثمن دیئے جاتے ہیں۔ اور اس بنا پر بیع کے چار ارکان ہوئے۔ بائع (بیچنے والا) مشتری (خریدار) ثمن (قیمت) اور ثمن (بیع وہ شے جو بیچی جا رہی ہو) پھر عربوں کے نزدیک معاوضہ اپنے مضاف الیہ کے اختلاف کے سبب مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر معاوضہ رقبہ یعنی ذات کے مقابلہ میں ہو تو اسے بیع کا نام دیا گیا ہے اور اگر رقبہ کی منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اگر وہ منفعت بضع ہو تو اسے نکاح کا نام دیا گیا ہے اور اگر اس کے سوا کسی اور منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اس کا نام اجارہ ہے اور عین (دراہم و دنانیر) کی بیع عین کے عوض ہو تو وہ بیع النقد ہے اور وہی بیع الصرف ہے اور اگر بیع دین موکل کے ساتھ ہو تو وہ بیع سلم ہے۔ اس کا بیان آگے آیۃ الدین میں آئے گا۔ اور بیع الصرف کا حکم گزر چکا ہے اور اجارہ کا حکم سورۃ القصص میں آئے گا اور نکاح میں مہر کا حکم سورۃ النساء میں آئے گا ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے محل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 17۔ بیع قبول اور ایجاب (کا نام) ہے یہ مستقبل اور ماضی کے الفاظ کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ اس میں

ماضی حقیقہ ہوتی ہے اور مستقبل کنایہ ہوتا ہے اور یہ ایسے لفظ صریح اور کنایہ سے واقع ہو جاتی ہے جس سے ملکیت کا منتقل ہونا سمجھا جائے۔ چاہے وہ یہ کہے: بعتك هذه السلعة بعشرة میں نے تجھے یہ سامان دس کے عوض بیچا اور خریدنے والا کہے: اشتريتها۔ میں نے اسے خرید لیا۔ یا خریدنے والا پہلے کہے: اشتريتها۔ میں نے اسے خرید لیا اور پھر بیچنے والا کہے: بعتكها۔ میں نے اسے تجھے بیچ دیا یا بائع کہے: میں تجھے دس کے عوض بیچوں گا اور پھر مشتری کہے: میں خرید لوں گا یا میں نے خرید لیا۔ اور اسی طرح ہے اگر وہ کہے تو اسے دس کے عوض لے لے یا میں نے تجھے یہ دے دیا یا تو اسے لے لے یا تجھے اس میں برکت دی جائے دس کے عوض یا میں نے اسے تیرے حوالے کر دیا اور وہ دونوں بیع کا ارادہ رکھتے ہوں۔ تو ان تمام الفاظ کے ساتھ بیع لازم ہو جائے گی۔ اور اگر بائع نے کہا: میں نے تجھے دس کے عوض بیچ دی پھر وہ مشتری کے قبول کرنے سے پہلے رجوع کر لے تو امام مالکؒ نے کہا ہے: اس کے لئے رجوع کرنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ مشتری کے قبول یا اس کے رد کو سن لے، کیونکہ اس نے اپنی جانب سے اسے دے دیا ہے اور اسے اس پر ثابت کر دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ اس کے لئے جائز ہے کیونکہ ابھی اس پر عقد مکمل نہیں ہوا۔

اور اگر بائع کہے: میں نے تو مذاق کیا تھا تو اس بارے میں روایت مختلف ہے۔ پس آپ نے ایک بار کہا: بیع لازم ہو جائے گی اور اس کے قول کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور ایک بار فرمایا: سامان کی قیمت کی طرف دیکھا جائے گا۔ پس اگر ثمن اس

کی قیمت سے موافقت رکھتے ہوں تو بیع لازم ہوگی اور اگر متفاوت ہوں جیسا کہ غلام ایک درہم کے عوض اور گھرا ایک دینار کے بدلے، تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس نے اس سے بیع کا ارادہ نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ مذاق کرنے والا ہے نتیجتاً بیع لازم نہیں ہوئی۔

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: وَحَزَمَ الْوَلُولُ اِيْهَا الْفَلَامُ عَهْدِيْ هُوَ اور اس سے مراد وہی ربا ہے جس کا کاروبار عرب کرتے تھے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، پھر یہ شامل ہو گا اسے جسے رسول اللہ ﷺ نے حرام کیا ہے اور آپ ﷺ کی جانب سے ایسی بیع سے منع کیا گیا ہے جس میں ربا داخل ہو سکتا ہے اور جو بھی اس کے معنی میں بیوع ہیں ان سے منع کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ عقد ربا کو فسخ کر دیا گیا ہے وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ائمہ نے اسے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سرخ کھجوریں لے کر آئے، تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: ”یہ کہاں سے لائے ہو؟“ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہمارے پاس کچھ ردی کھجوریں تھیں، تو میں نے ان میں سے دو صاع ایک صاع کے عوض بیچ دیں حضور نبی کریم ﷺ کے کھانے کے لئے، تو رسول اللہ ﷺ نے اس وقت فرمایا: ”اوہ! یہی تو عین ربا ہے تو اس طرح نہ کر۔ البتہ جب تو کھجوریں بیچنے کا ارادہ کرے تو تو پہلے ایک بیع کے ساتھ انہیں بیچ دے پھر ان (کے ثمن) کے عوض وہ خرید لے۔“ اور ایک روایت میں ہے۔ ”یہ ربا ہے پس تم اسے لوٹا دو پھر تم ہماری کھجوریں بیچو اور ان کے (ثمن کے) عوض ہمارے لئے کھجوریں خرید لو۔“ (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: آپ ﷺ کا یہ ارشاد: اوہ عین الربا سے مراد وہ ربا ہے جو فی نفسہ حرام ہے نہ کہ وہ جو اس سے مشابہت رکھتا ہے اور آپ کے قول: فرد وہ عقد ربا کو فسخ کرنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے اور یہ بیع کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور یہی جمہور کا قول ہے، بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ کے کہ وہ فرماتے ہیں: بلاشبہ ربا کی بیع اپنے اصل کے اعتبار سے جائز ہے اس حیثیت سے کہ وہ بیع ہے اور اپنے وصف کے اعتبار سے ممنوع ہے اس اعتبار سے کہ وہ ربا ہے۔ پس ربا ساقط ہو جائے گا اور بیع صحیح ہو جائے گی اور اگر اس طرح ہوتا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تو حضور نبی کریم ﷺ اس عقد کو فسخ نہ کرتے اور آپ ایک صاع پر جو زیادتی تھی اسے واپس لوٹانے کا حکم ارشاد فرماتے۔ اور یقیناً ایک صاع کے مقابلہ میں صفحہ کو صحیح قرار دیتے۔

مسئلہ نمبر 20۔ ہر وہ عقد جو واضح طور پر حرام ہو اور اسے فسخ کر دیا جائے تو مشتری پر سامان بعینہ واپس لوٹانا واجب ہے اور اگر مشتری کے ہاتھ سے وہ ضائع ہو گیا تو وہ اس سامان میں قیمت لوٹائے گا جس کی قیمت ہو اور وہ یہ ہیں مثلاً زمین، سامان اور حیوان وغیرہ۔ اور جن کی مثل موجود ہو اس کی مثل واپس لوٹائے گا ورنہ چیزوں میں سے ہو یا کیلی چیزوں میں سے طعام ہو یا عرض (سامان) ہو۔

امام مالک نے کہا ہے: جس کا حرام ہونا بین ہو وہ واپس لوٹا یا جائے گا چاہے وہ ضائع ہو یا نہ ہو۔ اور وہ جو اس میں سے ہو جسے لوگوں نے مکروہ جانا ہو تو اسے رد کر دیا جائے مگر یہ کہ سامان ضائع ہو جائے تو پھر اسے چھوڑ دیا جائے۔ (یعنی رد نہ کیا جائے۔)

مسئلہ نمبر 21۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَبِّهِ فَهُوَ مَعَهَا صَادِقٌ حضرت امام جعفر بن محمد صادق رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، حدیث نمبر 2145، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے سود حرام کر دیا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کو قرض دیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دو بار قرض دینا ایک بار صدقہ دینے کے مساوی ہوتا ہے۔“ اسے بزار نے نقل کیا ہے اور اس کا مکمل معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ مالوں کے لئے باعث ضیاع اور لوگوں کے لئے باعث ہلاکت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَمَنْ جَاءَهُ فَمَا يَعْصِ الْأَمْرَ فَمَنْ جَاءَهُ فَمَا يَعْصِ الْأَمْرَ کے آخر سے علامت تانیث ساقط ہے کیونکہ الموعظة مونث غیر حقیقی ہے اور یہ بمعنی وعظ ہے اور حسن نے علامت تانیث کو ثابت رکھتے ہوئے فَمَنْ جَاءَهُ پڑھا ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیہا کو جب حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے فعل کی خبر دی گئی تو آپ نے یہ آیت پڑھی۔ دارقطنی نے عالیہ بنت النفع سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا کہ میں اور ام حبیبہ مکہ کی طرف نکلیں اور ہم حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیہا کے پاس داخل ہوئیں اور آپ پر سلام عرض کیا تو آپ نے ہم سے پوچھا تم کن میں سے ہو؟ ہم نے عرض کی۔ ہم اہل کوفہ میں سے ہیں، اس نے کہا گویا آپ نے ہم سے اعراض کر لیا۔ پھر ام حبیبہ نے آپ سے عرض کی: اے ام المؤمنین! میری ایک کنیز تھی اور میں نے اسے حضرت زید بن ارقم انصاری رضی اللہ عنہ کو آٹھ سو درہم کے عوض انہیں عطیہ ملنے تک فروخت کر دیا۔ اور پھر انہوں نے اسے بیچنے کا ارادہ کیا تو میں نے ان سے اسے نقد چھ سو درہم کے عوض خرید لیا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ پس آپ بنتی نبیہا ہماری طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا: تیری خرید بہت بری ہے اور وہ بھی جو تو نے خریدی ہے۔ اور زید رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا دے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کئے جانے والے اپنے جہاد کو باطل کر دیا ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔

پھر اس نے آپ سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے اگر میں ان سے اپنے اس المال کے سوا اور کچھ نہ لوں؟ تب آپ نے کہا: فَمَنْ جَاءَهُ فَمَا يَعْصِ الْأَمْرَ فَمَنْ جَاءَهُ فَمَا يَعْصِ الْأَمْرَ (پس جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ (سود سے) رک گیا تو اس کے لئے جائز ہے جو گزر چکا ہے۔) عالیہ ابواسحاق ہمدانی کو فی السبعی کی بیوی اور یونس بن ابی اسحاق کی ماں ہے۔ اور یہ حدیث امام مالک نے بیوع الآجال کے بیان میں نقل کی ہے جو آپ سے ابن وہب نے روایت کی ہے۔ پس اگر بیوع میں ایسی شے ہو جو ممنوع میں پڑنے تک پہنچاتی ہو تو آپ (امام مالک) نے اس بیع سے منع کیا ہے اگرچہ ظاہر اوہ جائز ہو۔ اور جمہور فقہاء نے اس اصل (بنیاد) میں امام مالک سے اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: احکام کا دار و مدار ظاہر پر ہے نہ کہ ظنون پر۔ اور ہماری دلیل سد ذرائع کے بارے قول ہے۔ پس اگر اسے تسلیم کر لیا جائے (تو فہما) ورنہ ہم نے اس کی صحت پر استدلال بیان کیا ہے۔ اور وہ گزر چکا ہے۔ اور یہ حدیث نص ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیہا یہ نہ فرماتیں: ابدغی زیداً انه قد ابطال جہادہ الا ان یتوب یہ ارشاد تو قیفی ہے۔ کیونکہ فقط رائے سے ایسا قول نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اعمال کو باطل کرنے کی معرفت بغیر وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور صحیح مسلم (1) میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”بے شک حلال واضح اور بین

تک کہ تم اپنے دین کی طرف واپس لوٹ آؤ (1)۔“ اس کی اسناد میں ابو عبد الرحمن خراسانی ہے۔ وہ مشہور راوی نہیں ہے۔ ابو عبید ہروی نے العینہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ آدمی اپنا سامان ثمن معلوم کے عوض کسی آدمی کو ایک مقررہ مدت تک ادھار بیچ دے اور پھر اسے اس سے ان ثمنوں سے کم کے عوض خرید لے جتنے کے عوض اسے بیچا تھا۔ فرمایا: اگر کسی نے عینہ کے طالب کی موجودگی میں ایک سامان دوسرے آدمی سے ثمن معلوم کے عوض خریدا اور اس پر قبضہ کر لیا پھر اسے عینہ کے طالب کو اس سے زیادہ ثمن کے عوض مقررہ مدت تک ادھار بیچ دیا جتنے کے عوض اسے خریدا تھا پھر وہ مشتری پہلے بائع سے نقد اس سے کم ثمن کے ساتھ بیچ دے تو یہ بھی عینہ ہے اور یہ پہلے سے زیادہ آسان ہے اور یہ بعض کے نزدیک جائز ہے اور صاحب عینہ کے پاس نقد موجود ہونے کی وجہ سے اسے عینہ کا نام دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ العین سے مراد مال حاضر ہے اور مشتری بلاشبہ اسے خرید رہا ہے تاکہ وہ اسے حاضر مال کے عوض بیچے جو اسے جلدی مل جائے گا۔

مسئلہ نمبر 23۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جس نے کچھ سامان ایک خاص مدت تک ثمن کے عوض فروخت کیا پھر اسے خرید لیا ایسے ثمن کے عوض جو اس ثمن کی جنس میں سے تھے جن کے عوض اسے بیچا تھا تو وہ اس سے خالی نہیں ہے کہ وہ اسے نقد ثمن کے عوض خریدے گا یا اتنی مدت تک ادھار جو اس مدت سے کم تھی جس تک اس نے اسے بیچا تھا یا اس تک جو اس مدت سے زیادہ تھی، ثمن مثلی کے عوض یا اس سے کم کے عوض یا اس سے زیادہ کے عوض۔ پس یہ تین مسائل ہیں۔ جہاں تک پہلے اور دوسرے کا تعلق ہے تو اگر وہ مثل ثمن یا اکثر ثمن کے عوض خریدے تو یہ جائز ہے اور کم ثمن کے عوض ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیہ کی حدیث کے مقتضا کے مطابق جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس نے چھ سو دیے ہیں تاکہ وہ آٹھ سو لے لے اور سامان لغو ہو گیا۔ اور یہ ہی خالص رہا ہے۔ اور رہا تیسرا مسئلہ کہ وہ اس سے زیادہ مدت تک ادھار لے لے، پس اگر اس نے صرف اسے ہی خریدا یا کچھ اور بھی، تو مثل ثمن یا اقل ثمن کے ساتھ یہ جائز ہوگی، البتہ زیادہ ثمن کے عوض جائز نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اس میں سے بعض حصہ خرید لیا تو پھر کسی حال پر بھی یہ خرید جائز نہ ہوگی نہ مثل ثمن کے ساتھ، نہ اقل کے ساتھ اور نہ ہی اکثر کے ساتھ۔ اس باب کے مسائل کو ہمارے علماء نے ستائیس مسائل میں محصور کیا ہے اور ان کا دار و مدار اسی پر ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس تو جان لے۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: فَلَهُ مَا سَلَفَ یعنی سود کے معاملہ میں سے جو گزر چکا ہے اس پر نہ دنیا میں کوئی مواخذہ ہوگا اور نہ آخرت میں، سدی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے لئے حکم ہے جس نے کفار قریش میں سے اسلام قبول کیا اور بنی ثقیف اور ان میں سے جو وہاں تجارت کرتے تھے (ان میں سے جس نے اسلام قبول کیا) اور سلف کا معنی ہے وہ زمانہ جو پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: وَأَمْرًا إِلَى اللَّهِ اس میں چار تاویلات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ضمیر ربا کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہے کہ سود کا معاملہ اس کی یا دوسری چیزوں کی تحریم کو جاری رکھنے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ اور

دوسری یہ کہ ضمیر ماسلف کی طرف لوٹ رہی ہو یعنی جو کچھ گزر چکا ہے اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اسے معاف کرنے کے بارے میں اور اس میں تاوان اور سزا کو ساقط کرنے کے بارے میں۔ اور تیسری یہ ہے کہ ضمیر سود لینے والے (ذی الدینا) کی طرف لوٹ رہی ہے، اس معنی میں کہ اس کا معاملہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے کہ وہ اسے اس سے رکنے پر ثابت قدم رکھے یا اسے دوبارہ ربا میں گناہ کی طرف لوٹا دے۔

اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: یہ قول اچھا اور واضح ہے۔ یعنی مستقبل میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر وہ چاہے تو اسے تحریم پر ثابت رکھے اور اگر چاہے تو اسے مباح قرار دے۔ اور چوتھی تاویل یہ ہے کہ ضمیر رکنے والے اور باز رہنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو لیکن اسے مانوس کرنے اور خیر اور بھلائی میں اس کی آرزو اور امید پھیلانے کے معنی میں، جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ اطاعت اور خیر کے سپرد ہے اور جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ نمو اور توجہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کی اطاعت کے سپرد ہے۔

مسئلہ نمبر 26۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ عَادَ یعنی جو فعل ربا کی طرف لوٹ آیا (یعنی دوبارہ سود کھانے لگا) یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ حضرت سفیان نے یہ کہا ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: جو لوٹا اور اس نے کہا بے شک بیع ربا کی مثل ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اگر ہم کہیں کہ یہ آیت کافر کے بارے میں ہے تو پھر خلود سے مراد حقیقی طور پر ہمیشہ رہنا ہے۔ اور اگر ہم اسے گنہگار مسلمان کے بارے میں قرار دیں تو پھر خلود کا لفظ مجازاً مبالغہ کے معنی میں ہوگا، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: مِنْكَ خَالِدٌ یہ ایسے دوام سے عبارت ہے جو حقیقی طور پر ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔

مسئلہ نمبر 27۔ قولہ تعالیٰ: يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا یعنی اس کی نمو ختم ہو جائے گی اگرچہ وہ زیادہ ہی ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اِنَّ الرِّبَا وَانْ كَثُرَ فَعَاقِبَتُهُ اِلَى قُلٍّ (بلاشبہ سود اگرچہ بہت زیادہ ہو اس کا انجام قلیل ہی ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے کوئی صدقہ، حج، جہاد اور صلہ رحمی قبول نہیں کرے گا۔

الْمَحَقُّ کا معنی النقص والذہاب۔ کم ہونا یا گھٹنا اور ختم ہونا ہے اور اسی سے مُحَاق القبر یعنی چاند کا گھٹنا بھی ہے۔ وَ يُزِيْنُ الصَّدَقَاتِ یعنی وہ دنیا میں خیرات کو برکت کے ساتھ بڑھاتا ہے اور آخرت میں ان کا ثواب کئی گناہ کر کے بڑھادے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ”بے شک تم میں سے کسی کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہوتا ہے اور وہ اسے اس کے لئے بتدریج بڑھاتا رہتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی گھوڑی اور گائے کے بچوں کی نشوونما کرتا ہے، یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے گا اور بے شک ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل ہو جائے گا۔“ (1)

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الصدقة، حدیث نمبر 598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

صحیح بخاری، کتاب الزکاة، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن زبیر نے یُحَقِّقُ یا کے ضمہ اور حاک، کسرہ کو مشدد اور یُبَیِّنُ را کو فتح کے ساتھ اور با کو مشدد پڑھا ہے اور حضور نبی مکرم ﷺ سے اسی طرح مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 28۔ قولہ تعالیٰ: وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ اس میں کفار کی صفت اُثیم مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے، اس حیثیت سے کہ دونوں لفظ مختلف ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفار میں اشتراک کے معنی کو زائل کرنے کے لئے یہ صفت لگائی گئی ہے کیونکہ کبھی اس کا اطلاق اس کسان پر بھی ہوتا ہے جو زمین میں دانا چھپاتا ہے۔ (یعنی کاشت کرتا ہے) ابن فورک نے یہی کہا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَتُوا الزَّكَاةَ کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور نماز اور زکوٰۃ کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا ہے حالانکہ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ انہیں متضمن اور شامل ہے۔ تو یہ ان دونوں کے شرف و عظمت اور ان کی قدر و منزلت پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ دونوں اعمال کی اصل ہیں، نماز بدنی اعمال کی اصل ہے اور زکوٰۃ مالی اعمال کی اصل ہے۔

مسئلہ نمبر 29۔ قولہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ ظاہر یہ ہے کہ وہ اس سود کو باطل کر دے جس پر قبضہ نہیں ہوا ہے، اگرچہ آیت تحریم کے مابقی ہونے سے پہلے اس کا عقد ہو چکا ہو۔ اور جب اس پر قبضہ ہو چکا ہو تو پھر اس کے نسخ کے پیچھے نہ پڑے۔

تحقیق کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی ثقیف کے سبب نازل ہوئی۔ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ اس پر معاہدہ کیا تھا کہ ان کے سود کا مال جو لوگوں پر ہے تو وہ انہیں کے لئے ہے اور جو لوگوں کا ان پر ہے تو وہ ان سے ختم کر دیا گیا ہے، پھر جب ان کے سود کی مقررہ مدتیں آ پہنچیں تو انہوں نے اہل مکہ کی طرف تقاضا کے لئے (پیغام) بھیجا۔ قرظ بن عبدہ کے تھے اور وہ بنو عمرو بن عمیر ثقیف میں سے تھے اور یہ بنی مغیرہ مخزومیوں پر تھے۔ اور بنو مغیرہ نے کہا: ہم کوئی شے نہیں دیں گے کیونکہ رہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اور انہوں نے اپنا معاملہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی طرف لکھا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے حضرت عتاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ بھیجا اور ثقیف نے بھی اس کے بارے جان لیا اور وہ (سود کا مطالبہ کرنے) سے رک گئے۔ یہی آیت کا سبب نزول ہے اور یہ اس مجموعے کا اختصار ہے جو ابن اسحاق، ابن جریج اور سدی وغیرہم نے روایت کیا ہے اور اس کا معنی یہ ہے تم اپنے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کے درمیان کوئی آڑ اور رکاوٹ بنا لو اپنے مابقی رہا کو چھوڑ کر اور اس سے درگزر کر کے۔

مسئلہ نمبر 30۔ قولہ تعالیٰ: إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ یہ اس بنا پر ثقیف کے حق میں شرط محض ہے کیونکہ یہ حکم ان کے اسلام میں داخل ہوتے ہی پہلے پہل نازل ہوا۔ اور جب ہم آیت کو ان کے بارے میں مقدر قرار دیں جن کا ایمان پختہ ہو چکا تھا تو پھر یہ مبالغہ کی جہت پر شرط مجازی ہے جیسا کہ تو اس کے بارے میں کہتا ہے جس کی ذات کو تو ابھارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ "اگر تو مرد ہے تو تو اس طرح کر۔" اور نقاش نے مقاتل بن سلیمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اس آیت میں إِنَّ بمعنی

اِذْ هَے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور لغت میں معروف نہیں ہے۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یَاٰیُهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایمان لانا ہو اور ذُرُوْا هَا بَقِیْ مِنَ التَّوْبَاۤءِ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْمِنِیْنَ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا مراد ہو، کیونکہ اس کے بغیر پہلا ایمان نفع نہیں دے گا اور یہ اس کے سبب مردود ہے جو آیت کے سبب نزول میں بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 31۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاَذْنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ یٰۤاَکْرِهٰۤیۤہُوْنَ سُوْدَنَ جُھُوْزٍ اور جنگ قتل کی دعوت دیتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن سود کھانے والے کو کہا جائے گا: جنگ کے لئے اپنے ہتھیار لے لے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے: جو کوئی سود پر قائم رہے اور اس سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کے امام پر لازم ہے کہ وہ اس سے سود کا مال واپس لے لے، پس اگر وہ باز آ جائے (تو فہما) ورنہ وہ اسے قتل کر دے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو قتل کی دھمکی دی ہے اور انہیں مباح قرار دیا ہے جہاں بھی وہ پکڑے جائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اگر تم باز نہ آئے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے والے ہو، یعنی تم ان کے دشمن ہو۔

ابن خویر منداد نے کہا ہے: اگر کسی نہروالوں نے سود پر اسے حلال سمجھتے ہوئے صلح کر لی تو وہ مرتد ہو گئے اور ان کے بارے میں حکم مرتدین کے حکم کی طرح ہوگا۔ اور اگر وہ اسے حلال نہ سمجھیں تو امام وقت کے لئے ان سے جنگ لڑنا جائز ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اعلان فرمایا ہے فَاَذْنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ (پھر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ سن لیں) اور ابو بکر نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے ”وَأَذْنُوا“ پڑھا ہے۔ اس معنی کی بنیاد پر کہ تم اپنے سوا کو بتادو کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے حالت جنگ میں ہو۔

مسئلہ نمبر 32۔ ابن بکیر نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا: اے ابا عبد اللہ! میں نے ایک آدمی کو نشہ کی حالت میں دیکھا، وہ گالی گلوچ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ چاند کو پکڑ لے، سو میں نے کہا میری بیوی کو طلاق اگر ابن آدم (انسان) کے پیٹ میں شراب سے بڑھ کر کوئی بری شے داخل ہوتی ہو۔ تو آپ نے اسے فرمایا: تو واپس چلا جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ پھر وہ دوسرے دن آیا، تو آپ نے اسے پھر فرمایا: تو واپس لوٹ جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ وہ پھر تیسرے دن آیا تو آپ نے اسے فرمایا: تیری بیوی کو طلاق ہو چکی ہے میں نے کتاب اللہ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں خوب چھان بین کی، گہری غور و فکر کی تو میں نے سود سے بڑھ کر کوئی بری شے نہ دیکھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنگ کا اعلان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 33۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ سود کھانا اور اس کے مطابق کاروبار کرنا گناہ کبیرہ میں سے ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ہم اسے بیان کریں گے۔

حضور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یاتی علی الناس زمان لا یبقی أحد الا اکل الربا ومن لم یأکل الربا اصابه غبارہ (لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ سود کھائے گا اور جس نے نہ کھایا تو اس کا غبار اس تک پہنچ جائے گا۔)

اور دارقطنی نے حضرت عبداللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لدرہم ربنا اشد عند اللہ تعالیٰ من ست وثلاثین زنیۃ فی الخطیئة (سود کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ میں چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ شدید ہے۔)

اور آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: الربا تسعة وتسعون بابا اذناها کاتیان الرجل بأمرہ (1) (سود کے ننانوے دروازے ہیں اور ان میں سے ادنیٰ آدمی کا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کی مثل ہے) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود کھانے والا، کھلانے والا، اسے لکھنے والا اور اس کی شہادت دینے والا سب پر حضور نبی کریم ﷺ کی زبان سے لعنت کی گئی ہے۔

اور امام بخاری نے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (2) کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے خون کے ثمن (قیمت) کتے کے ثمن اور بدکاری کی کمائی سے منع فرمایا ہے اور سود کھانے اور کھلانے والے پر (بال) گودنے اور گدوانے والی پر اور تصویر بنانے والے پر لعنت کی ہے۔ نہی رسول اللہ ﷺ عن ثمن الدماء و ثمن الکلب و کسب البغی و لعن اکل الربا و مؤکلہ و الواشیۃ و المستوشیۃ و المصور اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو اور ان میں سے..... و اکل الربا اور سود کھانے والا۔“

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (3) انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اسے لکھنے والے اور اس پر شاہد بننے والے بھی پر لعنت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 34۔ قولہ تعالیٰ: وَإِنْ تَبُيْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ الْآیہ۔ ابو داؤد نے سلیمان بن عمرو سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے (4) کہ انہوں نے کہا: میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”خبردار! سنو بے شک دور جاہلیت کے سودوں میں سے تمام سود ختم کر دیئے گئے ہیں تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہوں گے نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا۔“ اور آگے پوری حدیث بیان کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کے ساتھ اپنے راس الاموال کی طرف لوٹا دیا اور انہیں فرمایا: سود لینے میں ”تم ظلم نہ کرو“ اور تم پر یہ ظلم نہیں کیا جائے گا۔ کہ تمہارے راس

1۔ ابن ماجہ، باب التغلیظ فی الربا، حدیث نمبر 2264، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ثمن الکلب، حدیث نمبر 2084، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی وضع الربا، حدیث نمبر 2896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يَعْبُدُ آبَاءَهُمْ وَآبَاءَهُمْ أَنْ تَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ (ہود: 87) (کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کرتے ہمارے باپ دادا یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں)

پس اس بنا پر اس سے استدلال درست نہ ہوگا۔ ہاں اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ عقود جو دارالحرب میں واقع ہوں جب امام وقت ان پر غالب آئے تو وہ فسخ کے احکام جاری نہیں کرے گا اگرچہ وہ عقود فاسدہ ہی ہوں۔

مسئلہ نمبر 36۔ ارباب ورع و زہد میں سے بعض غلو کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حلال مال میں جب حرام مال اس طرح مل جائے کہ تمیز ممکن نہ رہے پھر وہ ملے جلے مال میں سے حرام مال کی مقدار مال نکال دے تو پھر بھی (ماقی مال) حلال اور پاک نہ ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جو مال نکالا گیا ہے وہ حلال ہو اور جو باقی ہے وہ حرام ہو۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ دین میں غلو ہے۔ کیونکہ ہر وہ مال جس میں تمیز کرنا (اور اسے علیحدہ علیحدہ کرنا) ممکن نہ رہے تو پھر اس سے مقصود اس کی مالیت ہوتی ہے نہ کہ اس کا عین۔ اور اگر مال ضائع ہو جائے تو پھر اس کی مثل مال اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے مالوں کا مخلوط ہو جانا اس کی تمیز اور علیحدگی کے اعتبار سے اتلاف اور ضیاع ہی ہے جیسا کہ ہلاک کر دینا اس کے عین (ذات) کے لئے اتلاف اور ضیاع ہے اور مثل ضائع ہونے والے مال کے قائم مقام ہوتی ہے اور یہ حسن اور معنی بین اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کہا ہے اموال حرام میں سے جو آدمی کے قبضہ میں ہو اگر وہ سود کا مال ہے تو اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسے اس کے پاس واپس لوٹا دے جس پر سود لگایا تھا اور اگر وہ حاضر نہ ہو تو اسے تلاش کرے اور اگر اسے پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر چاہیے کہ وہ اسے صدقہ کر دے اور اگر اس نے وہ مال ظلماً لیا ہو تو جس کے ساتھ اس نے ظلم کیا ہے اس کے ساتھ بھی اسے اسی طرح معاملہ کرنا چاہئے۔ اور اگر اس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے اور وہ یہ نہ جان سکے کہ جو مال اس کے قبضے میں ہے اس حلال میں سے حرام کتنا ہے تو جو مال اس کے قبضے میں ہے اس میں سے وہ مقدار تلاش کرے جس کا لوٹانا اس پر واجب ہے، یہاں تک کہ اسے اس میں کوئی شک نہ رہے کہ جو مال باقی ہے وہ خالص اس کا اپنا ہے۔ پس جو مال اس نے اپنے قبضے سے زائل کیا اسے وہ ان لوگوں کو واپس لوٹائے گا جن کے بارے میں یہ معروف ہو کہ اس نے اس پر ظلم کیا ہے یا اس سے بطور سود مال لیا ہے اور اگر وہ ایسے آدمی کو پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر اس کی طرف سے وہ مال صدقہ کر دے۔

اور اگر مظالم اس کے ذمہ کا احاطہ کئے ہوئے ہوں اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس پر جو کچھ واجب الادا ہے وہ اسے کثیر ہونے کے سبب کبھی بھی ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا تو اس کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ سب اپنی ملکیت سے زائل کر دے، چاہے مساکین کو دے دے اور چاہے تو ایسے کاموں میں خرچ کر دے جو عام مسلمانوں کی منفعت اور صلاح کے لئے ہوں، یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی شے باقی نہ رہے، سوائے اس کم سے کم لباس کے جس میں نماز جائز ہوتی ہے اور وہ اتنا کپڑا ہے جو شرمگاہ کو ڈھانپ سکے اور وہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ اور ایک دن کی خوراک (باقی رہ جائے) کیونکہ یہ وہ مقدار ہے جو اضطراری حالت میں دوسرے کے مال سے لینا واجب ہوتی ہے، اگرچہ وہ اسے ناپسند کرے جس سے وہ لے رہا ہے۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق یہاں مفلس علیحدہ اور جدا ہو گیا، کیونکہ مفلس کے پاس لوگوں کے

اموال کسی زیادتی یا ظلم کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے وہ مال اس کے حوالے کر رکھے ہوتے ہیں۔ پس اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دیا جائے گا جو اسے چھپالے گا اور وہ وہ ہے جو اس کے لباس کی ہیئت و کیفیت میں ہو۔

اور ابو عبید وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ وہ مفلس کے لئے لباس نہ چھوڑے مگر وہ کم سے کم مقدار جو نماز میں اسے کافی ہو اور وہ وہ ہے جو اسے ناف سے گھٹنے تک ڈھانپ لے، پھر جب بھی کوئی شے اس کے ہاتھ میں آئے اسے وہ اپنے ہاتھ سے نکال دے اور اس سے وہ کچھ روک کر نہ رکھے سوائے اس مقدار کے جو ہم نے ذکر کر دی ہے، یہاں تک کہ وہ جان لے، اور کون اس کی حالت کو جان سکتا ہے کہ اس نے وہ ادا کر دیا ہے جو اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔

مسئلہ نمبر 37۔ یہ وہ وعید ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے سود کھانے کی صورت میں جنگ سے ڈرایا دھمکایا ہے اور اسی کی مثل حضور نبی کریم ﷺ کی جانب سے بٹائی پر کھیتی کرنے کے بارے میں بھی وارد ہے۔ ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یحییٰ بن معین اور ابن رجانے ہمیں خبر دی ہے اور ابن رجانے کہا ہے کہ مجھے ابن خثیم نے ابو الزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جس نے بٹائی پر کھیتی کرنے کو نہ چھوڑا تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے اعلان جنگ سن لے۔“ پس یہ بٹائی پر کھیتی کرنے سے روکنے پر دلیل ہے اور مخابرہ سے مراد زمین کو نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لینا ہے اور اسے مزارعت کہا جاتا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے تمام اصحاب، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے تبعین اور داؤد رحمہ اللہ نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زمین ثلث اور ربع پر دینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس پیداوار کے جز پر جو زمین سے حاصل کی جائے گی، کیونکہ وہ مجہول ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین کو اناج کے عوض کرائے پر دینا جائز ہے بشرطیکہ مقدار معلوم ہو، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”پس جو شے معلوم ہو اس کی ضمانت ہو سکتی ہو تو اس کے عوض کوئی حرج نہیں ہے۔“

اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم نے یہی موقف اپنایا ہے اور امام مالک اور آپ کے اصحاب نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ مسلم نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں زمین کی کھیتی پکنے سے پہلے فروخت کر دیتے تھے اور ہم زمین ثلث، ربع اور مقررہ اناج کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ پس ایک دن میرے چچاؤں میں سے ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایسے معاملے سے منع کیا ہے جو ہمارے لئے باعث نفع تھا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری ہمارے لئے زیادہ نفع بخش ہے اور آپ ﷺ نے ہمیں اس سے منع کیا ہے کہ ہم زمین کی کھیتی پکنے سے پہلے فروخت کر دیں اور ہم زمین ثلث، ربع اور مقررہ اناج کی شرط پر کرائے پر دیں اور آپ نے زمین کے مالک کو حکم دیا ہے کہ وہ خود کاشت کرے یا اسے مزارعت پر دے دے۔ اور آپ نے اس کے کرائے کو اور جو کچھ اس کے سوا ہے اسے ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: پس زمین کا کرایہ اناج میں سے کسی شے کے ساتھ جائز نہیں ہے کسی بھی حال میں چاہے وہ شے کھائی جانے والی ہو

یا پی جانے والی، کیونکہ یہ طعام کے بدلے طعام ادھار بیچنے کے معنی میں ہے اور اسی طرح زمین کا کرایہ ان کے نزدیک اس شے سے دینا بھی جائز نہیں ہے جو زمین سے نکلے گی اگرچہ وہ کھایا اور پیا جانے والا طعام نہ بھی ہو، سوائے لکڑی، کانے اور ایندھن کی لکڑی کے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ بیع مزانہ کے معنی میں ہے۔ (بیع مزانہ سے مراد بغیر کیل اور وزن کے صرف اندازے کے ساتھ کسی شے کی بیع کرنا ہے) یہی وہ ہے جو امام مالک رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب سے محفوظ ہے۔

اور ابن سحنون نے مغیرہ بن عبد الرحمن مخزومی مدنی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ زمین کو اس اناج کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو اس سے نہ پیدا ہوتا ہو اور یحییٰ بن عمر نے مغیرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ تمام اصحاب مالک رحمہ اللہ کا قول ہے۔

اور ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ ابن کنانہ کہتے تھے: زمین کو ایسی شے کے عوض کرائے پر نہیں دیا جائے گا کہ جب وہ شے زمین میں لوٹائی جائے تو وہ اگ پڑے۔ اور اس کے سوا تمام ایسی اشیاء کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو کھائی جاتی ہوں اور ان کے عوض جو نہ کھائی جاتی ہوں چاہے وہ زمین سے پیدا ہوں یا نہ ہوں۔ اور اسی طرح یحییٰ بن یحییٰ نے بھی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہ امام مالک رحمہ اللہ کے قول میں سے ہے۔ (ابن حبیب نے) کہا ہے اور ابن نافع کہا کرتے تھے: زمین کو طعام وغیرہ میں سے ہر شے کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو زمین سے پیدا ہو یا نہ پیدا ہو، ماسوائے گندم اور اس جیسی اجناس کے، کیونکہ یہ محال ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ (اور محالہ سے مراد کھیتی کو پکنے سے پہلے فروخت کہ دینا ہے۔)

اور امام مالک نے الموطا میں کہا ہے وہ آدمی جو اپنی سفید زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ٹکٹ اور ربیع کے عوض دے دیتا ہے تو یہ اس میں سے ہے جس میں دھوکہ داخل ہے کیونکہ پیداوار ایک بار کم ہوتی ہے اور دوسری بار زیادہ ہوتی ہے اور بسا اوقات بالکل کچھ بھی نہیں ہوتا تو زمین کا مالک مقررہ کرایہ ترک کرنے والا ہو جائے گا، بے شک اس کی مثال اس آدمی کی مثل ہے جس نے کسی مزدور کو معین شے کے عوض سفر کے لئے اجرت پر لیا پھر مستاجر نے اجیر کو کہا: میں اپنے اس سفر سے جو نفع حاصل کروں گا اس کا دسواں حصہ تجھے دوں گا وہی تیرے لئے اجرت ہوگی۔ تو نہ یہ حلال ہے اور نہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔

امام مالک نے کہا ہے کسی آدمی کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو، اپنی زمین کو، اپنی کشتی اور اپنے جانور کو اجرت پر دے مگر ایسی معلوم شے کے عوض جو زائل اور ہلاک نہ ہو اور امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب رحمہم بھی یہی کہتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل، لیث، ثوری، اوزاعی، حسن بن حی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کو اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ایک خاص جز مثلاً ٹکٹ اور ربیع وغیرہ کی شرط پر دے دے، یہی ابن عمر رضی اللہ عنہما اور طاؤس رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اور انہوں نے خیبر کے واقعہ سے استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے باسیوں کو ہی اپنی زمینوں پر ان سے حاصل ہونے والی پیداوار اور پھلوں میں سے نصف کی شرط پر عامل مقرر کیا۔ امام احمد نے کہا ہے کہ کھیت کے کرائے سے نبی کے بارے میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث مضطرب

الفاظ ہے اور وہ صحیح نہیں ہے اور قصہ خیر کے بارے قول اولیٰ اور رائج ہے اور وہ حدیث صحیح ہے۔ (1)
تابعین کی ایک جماعت اور ان کے بعد آنے والوں نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ آدمی اپنی کشتی اور اپنی سواری کسی کو دے جس طرح کہ وہ اپنی زمین اس جز کے بدلے دیتا ہے جو اس پیداوار میں سے ہو جو اللہ تعالیٰ اسے محنت کے سبب عطا فرمائے گا۔ اور انہوں نے اس میں اپنی اصل اور بنیاد اس مضاربہ کو بنایا ہے جس پر اجماع ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المزمل میں اس ارشاد کے تحت آئے گا: وَاٰخِرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے کہا ہے کہ ہم بٹائی پر کھیتی کرتے تھے اور ہم اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ ہمیں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، یعنی ہم زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے بعض کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس میں قصہ خیر والی حدیث کا نسخ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو شے امام شافعی رحمہ اللہ کے نسخ کے بارے قول کو صحیح قرار دیتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محافلہ (پکنے سے پہلے کھیتی فروخت کر دینا) مزاہنہ (اندازے سے بیع کرنا) مخابره (بٹائی پر کھیتی کا کام کرنے) اور الثنایا (عقد بیع کے وقت بیع میں سے مجہول شے کی استثنا کر دینا) سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ (جس شے کی استثنا کی گئی ہے) وہ معلوم ہو۔ یہ روایت صحیح ہے۔ اور ابو داؤد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے (2) کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابره سے منع فرمایا ہے۔ میں نے پوچھا۔ مخابره کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تو زمین نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لے لے۔

مسئلہ نمبر 38۔ یہ قراءتوں کے بیان میں ہے۔ جمہور نے مابقی میں یا کو متحرک پڑھا ہے اور حسن نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل جریر کا قول ہے:

هو الخليفة فارضوا مارضى لكم ماضى العزبة ما فى حكمه جَنَفَ

اور عمر بن ربیعہ نے کہا ہے:

كم قد ذكرتك لو أجزى بذكركم يا أشبه الناس كل الناس بالقبر
إني لأجدل أن أمسى مقابلة حُبًا لرؤية من أشبهت في الصور

اس کی اصل مارضیٰ اور آن أمسی ہے۔ اور انہوں نے انہیں سکون دیا ہے اور شعر میں ایسا کثرت سے ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں یا کو الف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو جس طرح الف پر حرکت نہیں آسکتی تو اسی طرح یہاں یا پر بھی حرکت نہیں آسکتی۔ اور اس لغت میں سے جس کی طرف دعوت دینا میں پسند کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میں تجھے اس کی نصیحت

1۔ صحیح بخاری، باب اذا لم يشتمط السنين في المزارعة، حدیث نمبر 2161، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی المخابرة، حدیث نمبر 2958، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کروں وہ واؤ اور یا کو ساکن کرنا ہے۔ حسن نے مابقی الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لغت طی ہے۔ وہ جاریہ کے لئے جاراة اور ناصیہ کے لئے ناصاة بولتے ہیں۔ اور شاعر کا قول ہے:

لَعَبْرَكَ لَا أَخْشَى التَّصَعُّكَ مَابَقَى عَلَى الْأَرْضِ قَيْسُوقُ يَسُوقُ الْأَبَاعِرَا

ابو السمال نے تمام قراء کے درمیان سے مِنَ الزَّيْمُورِ امشودہ کے کسرہ، با کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو الفتح عثمان بن جنی نے کہا ہے: دو اعتبار سے یہ حرف شاذ ہے، ایک تو اس اعتبار سے کہ اس میں کسرہ سے ضمہ کی طرف خروج ہے اور دوسرا اس اعتبار سے کہ اس میں اسم کے آخر میں ضمہ کے بعد واؤ واقع ہے اور مہدوی نے کہا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے الف کو پر پڑھا ہے تو وہ اس سے اس واؤ کی طرف جھک گئی جس سے الف ہے اور سوائے اس وجہ کے کسی پر اسے محمول نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ کلام میں کوئی اسم نہیں جس کے آخر میں واؤ ساکن ہو اور اس سے پہلے ضمہ ہو۔ کسائی اور حمزہ نے الوبا میں اس کسرہ کے محل کی وجہ سے امالہ کیا ہے۔ اور باقیوں نے با کے فتح کی وجہ سے اسے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابو بکر نے عاصم اور حمزہ سے فَأَذْنُوا پڑھا ہے یعنی تم آگاہ ہو جاؤ۔ (ی کو نوا علی اذن) یہ تیرے اس قول سے ہے: انی علی علم (میں جانتا ہوں) اسے ابو عبید نے اصمعی سے بیان کیا ہے۔ اور اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: أَذْنْتُ بِهِ أَذْنًا، اِی عَلِمْتُ بِهِ یعنی میں نے اس کے بارے جان لیا۔ اور مفسرین میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: فَأَذْنُوا کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنگ یقینی سمجھو۔ اور یہ بمعنی الاذن ہے اور ابو علی وغیرہ نے قرآۃ المد کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے: کیونکہ جب انہیں ان دوسروں کو خبردار کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہو اس سے آگاہ نہیں تو لامحالہ انہوں نے انہیں بتایا۔ مزید کہا: پس ان کے بتانے میں ان کا علم ہے اور ان کے علم میں ان کا اعلام (بتانا) نہیں ہے۔ اور علامہ طبری نے قرآۃ القصص کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ مختص ہے۔ بے شک انہیں مد کی قراءت پر اپنے سوا کو آگاہ کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہے اور تمام قراء نے لَا تُظْلِمُونَ تا کے فتح کے ساتھ اور وَلَا تُظْلِمُونَ تا کے ضمہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور مفضل نے عاصم سے لَا تُظْلِمُونَ۔ وَلَا تُظْلِمُونَ یعنی پہلی میں تا کو ضمہ کے ساتھ اور دوسرے میں تا کو فتح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور ابو علی نے کہا ہے۔ جماعت کی قرأت ترجیح یافتہ ہے کیونکہ یہ وَإِنْ تُبْشِرُوا قَوْلٍ سے مناسبت رکھتی ہے اس میں کہ دونوں فعلوں کی اسناد فاعل کی طرف ہے اور تُظْلِمُونَ تاء کے فتح کے ساتھ بھی آتا ہے اور یہ اپنے ماقبل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۖ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ

كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۹۰﴾

”اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو مہلت دو اسے خوشحال ہونے تک، اور بخش دینا اسے (قرض) بہت بہتر ہے

تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو۔“

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ جب اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو ان کے اصل اموال کے

بارے حکم فرمایا در آنحالیکہ وہ ان کے پاس ہو جو مال کو پانے والے ہوں، تو تنگدستی کی حالت میں خوشحال ہونے تک مہلت دینے کا ارشاد فرمایا اور وہ یہ کہ ثقیف نے جب اپنے ان اموال کا مطالبہ کیا جو بنی مغیرہ پر قرض تھے تو بنی مغیرہ نے تنگدستی کا عذر پیش کیا اور کہا: ہمارے پاس کوئی شے نہیں ہے اور انہوں نے اپنے پھلوں کے تیار ہونے کے وقت تک مہلت کا مطالبہ کیا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ **وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ**۔ (1)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ** اس ارشاد کے ساتھ **وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ** صاحب قرض کے اپنے مدیون (مقروض) سے مطالبہ کے ثبوت اور اس کی رضا کے بغیر اس کا مال لینے کے جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ غریم جب امکان کے باوجود قرض ادا کرنے سے رکا رہے تو وہ ظالم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: **فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ** پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اپنے رأس المال کے مطالبہ کو جائز قرار دیا ہے تو جب اس کے لئے مطالبہ کا حق ہے تو پھر وہ جس پر قرض ہے لا محالہ اسے ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ مہدوی اور بعض علماء نے کہا ہے یہ آیت اس طریقہ اور رواج کے لئے ناسخ ہے جو زمانہ جاہلیت میں تنگدست کو بیچنے کے بارے میں تھا اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے اسلام میں اس کے بارے حکم فرمایا تھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پس اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ثابت ہے تب تو یہ نسخ ہے ورنہ یہ نسخ نہیں ہے (2)۔ امام طحاوی نے کہا ہے: ابتدائے اسلام میں قرض میں آزاد آدمی کو بیچ دیا جاتا تھا جب اس کے پس اتنا مال نہ ہوتا جسے وہ اپنے قرض میں ادا کر سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور ارشاد فرمایا: **وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ** اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے دارقطنی نے مسلم بن خالد الزنجی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہمیں زید بن اسلم نے ابن البیلمانی سے اور انہوں نے سرق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کا مجھ پر کچھ مال تھا..... یا کہا مجھ پر قرض تھا..... پس وہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور آپ نے میرے لئے کوئی مال نہ پایا تو آپ نے مجھے اس سے یا فرمایا اس کے لئے فروخت کر دیا۔ بزار نے اسے اس سے طویل سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسلم ابن خالد الزنجی اور عبد الرحمن بن البیلمانی دونوں قائل حجت نہیں ہیں اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا ہے: ارشاد باری تعالیٰ: **فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ** تمام لوگوں کے لئے عام ہے، پس ہر وہ جو تنگدست ہو اسے مہلت دی جائے۔ اور یہی قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حسن اور عام فقہاء رحمہم اللہ کا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے سب سے اچھا قول حضرت عطاء، ضحاک اور ربیع بن خثیم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیت ہر تنگدست کے لئے ہے کہ اسے ربا اور تمام قرضوں میں مہلت دی جائے گی اور یہ قول تمام اقوال کو جامع ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ یہ آیت عام ناسخ ہو ربا کے بارے میں نازل ہوئی ہو پھر دوسرے قرضوں

کا حکم بھی اس کے حکم کی طرح ہو گیا ہو۔ اور اس لئے بھی کہ رفع کے ساتھ قرأت اس معنی میں ہے وان وقع ذوعسراء من الناس اجمعین (اور اگر تمام لوگوں میں سے مقروض تنگ دست واقع ہو۔)

اور حضرت ابن عباس اور شریح رحمہما نے کہا ہے: یہ آیت ربا کے بارے میں خاص ہے اور رہے قرضے اور دیگر تمام معاملات تو اس میں مہلت نہیں ہے بلکہ وہ یا تو ان کے مالکوں کو ادا کرے گا یا اس سے اسے محبوس کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اسے پورا کر دے اور یہی ابراہیم کا قول ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا** (النساء: 58) (بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کردہ امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس پر مرتب ہوتا ہے جب فقر و افلاس شدید اور ذلیل و رسوا کرنے والا نہ ہو اور اگر وہ اس کے فقدان اور فقر کی حالت بالکل صریح اور واضح ہو تو پھر بالضرور اس کے لئے مہلت کا حکم ہوگا (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس آدمی کے قرض زیادہ ہوں اور اس کے قرض خواہ اپنے مال کا مطالبہ کریں تو حاکم کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے اپنے کل مال سے فارغ کر دے اور اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دے جو اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا کر سکے۔ ابن نافع نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے لئے نہیں چھوڑے گا مگر صرف اتنا جو اسے ڈھانپ سکتا ہو۔ اور مشہور یہ ہے کہ وہ اس کے لئے اتنا مروجہ لباس چھوڑ دے گا جس میں کوئی شے فالتو اور اضافی نہ ہو اور اس سے اس کی چادر نہیں چھینی جائے گی بشرطیکہ وہ اسے بطور تہبند پہنتا ہو۔ اور اس کی بیوی کا لباس چھوڑنے میں اور اگر وہ عالم ہے تو اس کی کتابیں فروخت کرنے میں اختلاف ہے۔ اس کے لئے نہ گھر چھوڑا جائے گا اور نہ خادم اور نہ ہی جمعہ کا لباس چھوڑا جائے گا جبکہ اس کی قیمت کم نہ ہو اور اس وقت اسے محبوس کرنا حرام ہوتا ہے اور اس میں اصل اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ** ائمہ نے روایت بیان کی ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی کو ان پھلوں میں نقصان ہو گیا جو اس نے خریدے تھے تو اس کا قرض بہت بڑھ گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تصدقوا علیہ تم اس پر صدقہ کرو پس لوگوں نے اس کے لئے صدقہ دیا لیکن وہ اس مقدار کو نہ پہنچ سکا جس سے اس کا قرض پورا ہو سکتا ہو تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے قرض کا مطالبہ کرنے والوں کو فرمایا: **خذوا ما وجدتم لیس لکم الا ذالک** (تم جو پاؤ وہ لے لو اور تمہارے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔) اور مصنف ابی داؤد میں ہے پس رسول اللہ ﷺ نے اس کے غرماء (قرض کا مطالبہ کرنے والے) کے لئے یہ زائد نہیں کہا کہ ”وہ ان کے لئے اپنا مال چھوڑ دے“ اور یہ نص ہے، پس رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی کو محبوس کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا: اور وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے جیسا کہ شریح نے کہا ہے اور نہ ہی اسے لازم پکڑنے (یعنی اس کے ساتھ ساتھ رہنے) کا حکم فرمایا، بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ ساتھ رہیں گے کیونکہ ممکن ہے اس کا

مال ظاہر ہو جائے اور قرض خواہ اسے مال کمانے کا پابند نہیں کرے گا اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ وباللہ توفیقنا۔
مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک، شافعی، ابو حنیفہ وغیرہم رحمہ اللہ علیہم کے قول کے مطابق مفلس کو مجبوس کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کے پاس مال کا نہ ہونا ظاہر ہو جائے اور امام مالک کے نزدیک اسے مجبوس نہ کیا جائے گا اگر اس پر یہ وہم نہ ہو کہ اس نے اپنا مال غیب کر دیا ہے اور اس کا جھگڑا ہونا بھی ظاہر نہ ہو اور اسی طرح اسے مجبوس نہ کیا جائے گا اگر اس کی تنگدستی درست ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اگر مفلس کا مال جمع کر لیا جائے پھر وہ قرض کا مطالبہ کرنے والوں تک پہنچنے سے پہلے اور بیع سے پہلے ضائع ہو جائے، تو مفلس پر اس کی ضمانت ہوگی اور قرض خواہوں کا قرض اس کے ذمہ ثابت رہے گا اور اگر حاکم نے اس کا مال فروخت کر دیا اور اس کے ثمن پر قبضہ کر لیا پھر قرض خواہوں کے قبضہ سے پہلے وہ ثمن ضائع ہو گئے تو اس کی ضمانت ان پر ہوگی اور مفلس اس سے بری الذمہ ہوگا اور محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے اس کی ضمانت ہمیشہ مفلس سے لی جائے گی یہاں تک کہ وہ غراء تک پہنچ جائے۔

مسئلہ نمبر 7۔ العسۃ کا معنی ہے مال نہ ہونے کی جہت سے حال کا تنگ ہونا اور اسی سے جیش عسرہ ہے۔ (یعنی وہ لشکر جس کے پاس مالی حالت تنگ تھی)۔ اور النظارۃ کا معنی التاخیر (مہلت دینا) ہے۔ اور المیسرۃ مصدر بمعنی الیسر (خوشحال ہونا) ہے۔ اور ذُو اس گان تامہ کی وجہ سے مرفوع ہے جو بمعنی وجد اور حدث ہے۔ یہ سیبویہ اور ابو علی وغیرہما کا قول ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

فَدَى لَبْنَى ذُهْلَ بْنَ شَيْبَانَ نَاقِي
 اِذَا كَانَ يَوْمَ ذُو كَوَاكِبِ اَشْهَبَ
 اور نصب بھی جائز ہے۔ مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ میں ہے وَ اِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ اس معنی کی بنا پر ”کہ اگر مطلوب (مقروض) تنگ دست ہو اور اعمش نے وَ اِنْ كَانَ مُعْسِرًا فَانْظُرُوْهُ پڑھا ہے۔ ابو عمرو والدانی نے احمد بن موسیٰ سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے۔ نحاس، مکی اور نقاش نے کہا ہے: اس قرأت پر آیت کا لفظ اہل ربا کے ساتھ مختص ہو جائے گا اور جمہور نے ذُو پڑھا ہے ان کی قرأت کے مطابق یہ آیت ان تمام کے بارے میں عام ہے جن پر قرض ہو اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں فَاِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فا کے ساتھ ہے اور معتمر نے حجاج الوراق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں وَ اِنْ كَانَ ذَا عُسْرَةٍ ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور جماعت کی قرأت بِنَظَرٍ ظَا کے کسرہ کے ساتھ ہے اور مجاہد، ابورجا اور حسن نے فَانْظُرُوْهُ ظَا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور وہی ہیں جو کہتے ہیں ”کمزید بمعنی کمزید اور وہ کہتے ہیں کَبِد بمعنی کَبِد۔ اور اکیلے نافع نے مَيْسِرَةٌ مِّمِّنْ کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

نحاس نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے فَانْظُرُوْهُ اِلَى مَيْسِرَةٍ یعنی صیغہ امر اور مَيْسِرَةٍ میں سین کو ضمہ، راء کو کسرہ اور درج

کلام میں یا کو ثابت رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور فَنَظَرْتُ بِهٖ پڑھا گیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: فَنَظَرْتُ جائز نہیں ہے، وہ سورۃ النمل میں ہے، کیونکہ وہ ایک عورت ہے جس نے اس کے ساتھ اپنی ذات کے بارے کلام کیا ہے۔ یہ نظرت تنظر فہی نَظَرْتُ سے ہے اور جو سورۃ البقرہ میں ہے وہ التاخیر بمعنی مہلت دینا سے ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے۔ انظرتک بالمدین۔ یعنی میں نے تیرا قرض موخر کر دیا ہے اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَانْظُرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٠١﴾ (الحجر) پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے (ابو اسحاق الزجاج نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: یہ مصادر کے اسماء میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿١٠٢﴾ (واقعه) (نہیں ہو گا جب یہ برپا ہوگی) (اسے) کوئی جھٹلانے والا) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: تَنْظُرُونَ أَن يُفْعَلَ بِهَا قَارِعَةٌ ﴿١٠٣﴾ (القیامہ) (خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ نہ تو زسلوک ہوگا) اور اسی طرح خَائِنَةُ الْأَغْنِيْنَ وغیرہ ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَأَن تَصَدَّقُوا يَهْدِي إِلَى مَبْدَأٍ اور اس کی خبر خیر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ تنگدست پر صدقہ کرنے کو مستحب قرار دیا ہے اور اسے مہلت دے کر اسے بہتر بنا دیا ہے۔ سدی، ابن زید اور ضحاک نے یہی کہا ہے۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارا غنی اور فقیر پر صدقہ کرنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور پہلا قول صحیح ہے اور آیت میں غنی داخل نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ ابو جعفر طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے تنگدست مقروض کو مہلت دی اس کے لئے ہر دن کے عوض صدقہ (کا ثواب) ہے۔“ پھر میں نے عرض کی (کیا) ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہر دن کے عوض صدقہ ہے جب تک قرض کی ادائیگی کا وقت نہ آ پہنچے اور ادائیگی کا وقت آ جانے کے بعد اگر اس نے اسے موخر کر دیا تو اس کے لئے ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے۔“

اور مسلم نے حضرت ابو مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی کا محاسبہ کیا گیا تو اس کے لئے خیر اور نیکی میں سے کوئی شے نہ پائی گئی سوائے اس کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ معاملات کرتا تھا اور خوشحال تھا تو وہ اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ وہ تنگدست سے چشم پوشی کریں، اسے معاف کریں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ عز وجل نے فرمایا: ہم اس سے زیادہ اس کا حق رکھتے ہیں کہ ہم اسے معاف کر دیں۔“

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے مقروض کو تلاش کیا تو وہ آپ سے چھپ گیا پھر آپ نے اسے پالیا تو اس نے کہا: بلاشبہ میں تنگدست ہوں۔ آپ نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ کی قسم۔ اس نے کہا: (ہاں) اللہ کی قسم۔ آپ نے بیان کیا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ بیان فرماتے ہوئے سنا ہے: مَنْ سَرَّاهُ ان يَنْجِيهِ اللهُ مَنْ كَرِهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَلْيَنْفَسْ عَنْ مَعْصِيَةِ اَوْ يَضَعْ عَنْهُ (جسے یہ شے خوش کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے یوم قیامت کی تکالیف سے نجات عطا فرمائے تو

اسے چاہیے کہ وہ تنگدست مقروض کو مہلت دے یا اس سے قرض بالکل ساقط کر دے (یعنی معاف کر دے)۔

ابو الیسر الطویل کی حدیث میں ہے..... اور ان کا نام کعب بن عمرو ہے..... کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی یا اس سے قرض ساقط کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے (عرش کے) سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا۔ مَنْ اَنْظَرَ مَعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظْلَهُ اللهُ فِي ظِلِّهِ اِنْ اَحَادِيثٌ مِّنْ اَسْ كَبَّرَ تَرْغِيبٌ مَوْجُودٌ هُوَ جَسْ كَ بَارِے نَصْ بِيَانِ كِي گُنِي هُوَ اُور حَضْرَتِ ابُو قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْہُ كِي حَدِيثِ اسْ بِرْدَلَالَتِ كَرْتِي هُوَ كَ قَرْضِ كَا مَالِكِ جَبْ اِپْنِے مَقْرُوضِ كِي تَنْگِدَسْتِي كَا عِلْمِ رَكْهْتَا هُوَ يَا سِے اسْ كَا گَمَانِ هُوَ تُو اسْ بِر اسْ كَا مَطَالِبِ حَرَامِ هُوَ، اِگَر چَہ حَاكَمِ كَے پَاسِ اسْ كِي تَنْگِدَسْتِي ثَابِتِ نَہْ بَہِي هُوَ۔

اور انتظار المعسر کا معنی ہے اسے مہلت دینا یہاں تک کہ وہ خوشحال ہو جائے اور الوضع عنہ سے مراد اس کے ذمہ سے قرض کو ساقط کرنا ہے اور دونوں معنوں کو ابو الیسر نے اپنے مقروض کے لئے اس طرح جمع کیا کہ اس کے بارے تحریر منادی اور اسے کہہ دیا: اگر تو ادائیگی کی وسعت پائے تو تو اسے ادا کر دے ورنہ تو بری الذمہ ہے۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٥٠﴾

”اور ڈرتے رہو اس دن سے لوٹائے جاؤ گے جس میں اللہ کی طرف پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے اور ان پر زیادتی نہ کی جائے گی۔“

کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ کے وصال سے نوراتیں قبل نازل ہوئی پھر اس کے بعد کوئی شے نازل نہ ہوئی، ابن جریج نے یہی کہا ہے۔ ابن جبیر اور مقاتل نے کہا ہے: سات راتیں پہلے نازل ہوئی۔ اور تین راتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت آپ ﷺ کے وصال سے تین ساعتیں قبل نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اے آیہ الربا اور آیہ الدین کے درمیان رکھ دو۔“ اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”میرے پاس حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آئے اور کہا اسے دو سو اسی نمبر آیت کے بعد رکھ دو۔“

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت ابی بن کعب، حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ آخر میں جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے: لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ، اٰلِیْ اٰخِرِ الْاٰیَةِ۔ اور پہلا قول زیادہ معروف، بہت زیادہ اصح اور زیادہ مشہور ہے۔ اور اسے ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا ہے: قرآن کریم میں سے جو آخر میں نازل ہوا وہ یہ آیت ہے: وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٥٠﴾ اور حضرت جبریل امین علیہ السلام نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: اے محمد! ﷺ اسے سورۃ البقرہ میں دو سو اسی آیت کے آخر پر رکھو۔“ اسے ابو بکر انباری نے ”کتاب الرذ“ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت آخر میں نازل ہوئی۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ اس کے بعد اکیس دن تک باحیات رہے۔ اس کا بیان سورہ اذا جاء نصر الله والفتح ﴿٥٠﴾ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ آیت تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے اور ایسا حکم ہے جو ہر انسان کے ساتھ خاص ہے اور یَوْمًا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے نہ کہ ظرف ہونے کی بناء پر۔ تَرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ یہ اس کی صفت ہے۔

ابو عمرو نے اسے تا کے فتح اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۖ (الغاشیہ) (بے شک انہیں) (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔) اور حضرت ابی بنیہ کی قرأت پر قیاس کرتے ہوئے یوما تصیرون فیہ الی اللہ (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹو گے۔) اور باقیوں نے اسے تا کے ضمہ اور جیم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ مثلاً مُرَدُّوْا إِلَى اللَّهِ (انعام: ۶۲) (پھر لوٹائیں جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف) وَلَیْسَ رُدُّتُمْ إِلَى رَبِّی (اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹا یا گیا) اور یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قرأت کے اعتبار سے ہے۔ یَوْمًا تَرَدُّونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔)

اور حسن نے یرجعون یا کے ساتھ پڑھا ہے یہ اس معنی کی بنا پر ہے کہ تمام لوگ لوٹائیں جائیں گے۔ ابن جنی نے کہا ہے: گویا اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ اس بنا پر نرمی اور مہربانی فرمائی کہ وہ ان کی طرف رجعت کے ذکر کے ساتھ متوجہ ہوا، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جس کے ساتھ دل پھٹنے لگتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: وَاتَّقُوا يَوْمًا پھر رجعت کے ذکر میں ان کے ساتھ انتہائی نرمی فرماتے ہوئے غیب کی طرف رجوع فرمایا اور جمہور علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ دن جس سے ڈرایا گیا ہے یہ قیامت قائم ہونے، حساب و کتاب اور پوری پوری جزا ملنے کا دن ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس سے مراد موت کا دن ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت کے الفاظ کے حکم کے مطابق پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: إِلَى اللَّهِ میں مضاف محذوف ہے۔ اس کی تقدیر عبارت ہے الی حکم اللہ و فصل قضائہ (یعنی تم لوٹائے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی تقدیر کے فیصلے کی طرف) وَهُمْ یعنی جمع ضمیر کل کے معنی پر محمول ہے نہ کہ لفظ پر۔ مگر حسن کی قرأت میں یَرْجَعُونَ ہے تو اس کے مطابق وَهُمْ میں ضمیر یرجعون میں جمع ضمیر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اس آیت میں اس پر نص ہے کہ ثواب اور عقاب کس اعمال کے متعلق ہیں اور یہ جبر یہ کارو ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدِينٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُبَ بَيْنَكُمْ
كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ
الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمْلِئَ ۖ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلْيُتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۚ
وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رَجَالِكُمْ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى ۚ

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْمُوا أَنْ تَكْتُبُوا صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ
 أَجَلِهِ ۚ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۚ إِلَّا أَنْ تَكُونَ
 تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۚ
 وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ
 فَسُوقٌ بِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَيَعْلَمُ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٧﴾

”اے ایمان والو! جب تم ایک دوسرے کو قرض دو مدت مقررہ تک تو لکھ لیا کرو اسے اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف سے۔ اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے جیسے سکھایا ہے اس کو اللہ نے پس وہ بھی لکھ دے اور لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق (قرضہ) ہے اور ڈرے اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور نہ کمی کرے اس سے ذرہ بھر پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو یا کمزور ہو یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے اور بنالیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو تم (اپنے لئے) گواہ تاکہ اگر بھول جائے ایک عورت تو یاد کرائے (وہ) ایک دوسری کو اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں اور نہ اکتایا کرو اسے لکھنے سے خواہ (رقم قرضہ) تھوڑی ہو یا زیادہ اس کی میعاد تک۔ یہ تحریر عدل قائم کرنے کے لئے بہت مفید ہے اللہ کے نزدیک اور بہت محفوظ رکھنے والی ہے گواہی کو اور آسان طریقہ ہے تمہیں شک سے بچانے کا مگر یہ کہ سودا دست بدستی ہو جس کا تم لین دین آپس میں کرو (اس صورت میں) نہیں تم پر کچھ حرج اگر نہ بھی لکھو اسے اور گواہ ضرور بنالیا کرو جب خرید و فروخت کرو اور ضرر نہ پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ نافرمانی ہوگی تمہاری اور ڈرا کرو اللہ سے اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ (آداب معاشرت) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“

اس میں باون مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَعْتُمْ بَيْنَ يَدَيْنِ الْإِيَّاهِ۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ قرآن کریم نے آیۃ الدین عرش کے پاس سے حاصل کی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت خاص کر بیع سلم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اہل مدینہ کا بیع سلم کرنا اس آیت کے نازل ہونے کے سبب ہے پھر یہ بالا جماع ان عقود کو شامل ہو گئی ہے جن میں قرض اور دین وغیرہ ہوتا ہے (1)۔

ابن خويز منداد نے کہا ہے: یہ آیت تیس احکام کو متضمن ہے اور اس سے ہمارے بعض علماء نے قرضوں میں مدت مقرر

کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے، جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے، کیونکہ انہوں نے قرض اور تمام عقود مداینات میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اور شوافع نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: اس آیت میں تمام قرضوں میں تاویل کے جواز پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلاشبہ اس میں گواہ بنالینے کا حکم ہے جب وہ دین مؤجل ہو، پھر دین میں تاویل کے جواز اور اس کے ممتنع ہونے کے بارے میں دوسری دلیل سے جانا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بِدَیْنِیْہِ تَاکِیْدُہِ۔ جیسا کہ یہ قول ہے وَلَا ظَلَمَ یُطِیْرُ بِجَاحِیْہِ (انعام: ۳۸) (اور نہ کوئی پرندہ جوازاتا ہے اپنے دو پروں سے) فَسَجَدَ الْمَلَائِکَةُ كُلُّہُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۱۰﴾ (الحجر) (پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے) اور دین کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عبارت ہے ہر اس معاملہ سے جس میں دو عوضوں میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا دوسرے کے ذمہ ادھار ہو، کیونکہ عربوں کے نزدیک عین وہ ہے جو حاضر ہو اور دین وہ ہے جو غائب ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وَعَدْتُنَا بِدِرْہَمِیْنَا طَلَاءٌ وَ شَوَاءٌ مَّعْجَلًا غَیْرُ دَیْنِ
اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لِتَرْمِیْ بِنِیِّ السَّنَایَا حِیْثُ شَاعَتْ اِذَا لَمْ تَرْمِ بِیْ فِی الْحُفْرِ تَیْنِ
اِذَا مَا اَوْقَدُوْا حَطْبًا وَ نَارًا فِذَاكَ السَّوْثُ نَقْدًا غَیْرُ دَیْنِ

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو اپنے اس قول حق کے ساتھ بیان کیا ہے اِلَیْ اَجَلٍ مُّسَمًّی۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلَیْ اَجَلٍ مُّسَمًّی ابن منذر نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِلَیْ اَجَلٍ مُّسَمًّی اس پر دلیل ہے کہ بیع سلم کرنا مجہول مدت تک جائز نہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی کتاب اللہ کے معنی کی مثل پر دلیل ہے۔ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور وہ پھلوں میں قرض دو، تین سال کے لئے لے لیا کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو کوئی کھجوروں کے عوض قرض کسی کو دے تو اسے چاہیے کہ وہ معین کیل اور وزن، معین مدت تک قرض دے“ (۱)۔

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اسے بخاری، مسلم وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دور جاہلیت کے لوگ اونٹوں کے گوشت کی بیع اونٹنی کے حمل کے حاملہ ہونے تک کرتے تھے حبل الحبلة کا معنی ہے کہ اونٹنی بچہ جنے پھر وہ حاملہ ہو جو جنا گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمایا (۲)۔ اہل علم میں سے وہ تمام جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ان کا اس پر اجماع ہے کہ جائز بیع سلم وہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے ساتھی کے ساتھ ایسے طعام (اناج) کی بیع سلم کرے جس کی مقدار معلوم ہو اور وصف بھی معلوم ہو، وہ عام زمین کے اناج میں سے ہو جس کی مثل میں وہ غلطی اور خطا نہ کرے، معین کیل کے ساتھ، مدت معلومہ تک معلوم دنانیر یا دراہم کے عوض، جو وہ اسے مسلم فیہ کے بدلے دے گا دونوں

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، باب السلم لی کیل معلوم، حدیث نمبر 2085، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب السلم الی تنتج الناقة، حدیث نمبر 2096، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(رب المسلم اور مسلم الیہ) کے اس مقام سے جدا ہونے سے پہلے پہلے جہاں انہوں نے آپس میں بیع کی ہے اور دونوں اس جگہ کا تعین بھی کریں گے جس میں اس طعام پر قبضہ کیا جائے گا۔ پس جب دونوں نے ایسا کر لیا تو یہ امر جائز ہو گیا اور بیع مسلم صحیح ہو گئی۔ میں اہل علم میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا جو اسے باطل قرار دیتا ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک بیع مسلم کرنا فصل کی کٹائی، پھل توڑنے اور نیروز اور مہرجان کے دنوں تک یہ جائز ہے کیونکہ یہ وقت اور معلوم زمانے کے ساتھ مختص ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ ہمارے علماء نے بیع مسلم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے (۱) یہ معلوم شے کی بیع ہے جو دوسرے کے ذمہ لازم ہو جائے اور اس کا وصف معلوم ہو ایسے دراہم و دنانیر کے عوض جو موجود ہوں یا ایسی شے کے عوض جو ان کے حکم میں ہو مدت معلومہ تک۔ پس اسے معلوم فی الذمۃ کے ساتھ مقید کرنا مجہول سے بچنے کا فائدہ دیتا ہے اور اعیان معینہ میں سلم کرنے سے (بچنے کا فائدہ دیتا ہے) مثلاً وہ جو مدینہ طیبہ کے باسی اس وقت قرض لیتے تھے جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، کیونکہ وہ کھجور کے پھلوں میں ان کے اعیان کے بدلے قرض لیتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرما دیا کیونکہ اس میں دھوکے اور نقصان کا امکان ہے، کیونکہ کبھی وہ درخت خراب ہو جاتے ہیں اور وہ بالکل شمر بار نہیں ہوتے اور ان کا قول محصور بالصفة یہ اس معلوم سے بچنے کے لئے ہے جس کے بارے میں علم تو ہو لیکن تفصیلی علم نہ ہو۔ جیسا کہ اگر کوئی کھجوروں، یا کپڑوں یا مچھلیوں میں بیع مسلم کرے اور ان کی نوع بیان کرے اور نہ ان کی کوئی معین صفت بیان کرے۔

اور ان کا قول بعین حاضرتہ یہ دین کے عوض دین کی بیع کرنے سے بچنے کے لئے ہے اور ان کا قول او ما ہونی حکمہا یہ ان دو اور تین دنوں سے بچنے کے لئے ہے جن میں مسلم الیہ کو رأس المال میں تاخیر کرنا جائز ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک اتنی مقدار اسے مؤخر کرنا جائز ہوتا ہے، شرط کے ساتھ بھی اور بغیر شرط کے بھی کیونکہ یہ بالکل قریب ہے اور اسے اس پر مشروط کرنا جائز نہیں ہے۔

امام شافعی اور امام ابو حنیفہ نے بیع مسلم میں رأس المال کو عقد اور افتراق (رب المسلم اور مسلم الیہ کا مجلس عقد سے جدا ہونا) سے مؤخر کرنا جائز قرار نہیں دیا۔ اور انہوں نے یہ جانا ہے کہ یہ بیع صرف کی طرح ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ دونوں باب مختلف ہیں اور اپنے اپنے اوصاف کے ساتھ مختص ہیں، کیونکہ بیع صرف اس کا باب تنگ ہے اور اس میں شروط زیادہ ہیں بخلاف سلم کے کیونکہ اس پر معاملات کے عیوب بہت زیادہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور قولہم، الی أجل معلوم یہ سلم حال سے بچنا ہے کیونکہ یہ مشہور قول کے مطابق جائز نہیں ہے اور اس کا ذکر آگے آئے گا اور اجل کو معلوم کی صفت سے متصف کرنا اس مجہول مدت سے بچنا ہے جس پر وہ زمانہ جاہلیت میں بیع سلم کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 5۔ سلم اور سلف دونوں لفظ ایک ہی معنی سے عبارت ہیں اور یہ دونوں حدیث میں آئے ہیں مگر اس باب سے خاص اسم سلم ہے کیونکہ سلف قرض پر بولا جاتا ہے اور سلم بالاتفاق جائز بیوع میں سے ایک بیع ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ

1۔ (بیع معلوم فی الذمۃ محصور بالصفة بعین حاضرتہ او ما ہونی حکمہا الی أجل معلوم)

والسلام نے اس شے کی بیع کرنے سے جو تیرے پاس نہ ہو منع فرمایا ہے (1) یہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اور آپ ﷺ نے مسلم میں رخصت دی ہے کیونکہ مسلم جب ذمہ میں معلوم شے کی بیع ہے تو یہ ایک غائب شے کی بیع ہے جس کی طرف متباہین میں سے ہر ایک کی ضرورت دعوت دیتی ہے، کیونکہ رأس المال کا مالک اس کا محتاج ہے کہ وہ پھل خریدے اور پھل کا مالک اسے توڑے اور علیحدہ کرنے سے پہلے اس کے ثمن کا محتاج ہے تاکہ وہ اسے اس پر خرچ کر سکے، پس یہ ظاہر ہوا کہ بیع مسلم ضروری مصالح میں سے ہے۔ اور فقہاء نے اس کا نام بیع المحاجج رکھا ہے۔ اور اگر یہ حالاً (یعنی ثمن اور بیع کا موجود ہونا) ہی جائز ہو تو یہ حکمت باطل ہوگئی اور یہ مصلحت اٹھ گئی اور جو شے تیرے پاس موجود نہیں اس کی بیع سے اس کی استثنا کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ بیع مسلم کی وہ شرائط جن پر اتفاق کیا گیا ہے اور جن میں اختلاف کیا گیا ہے وہ نو ہیں: چھ شرائط مسلم فیہ میں ہیں اور تین بیع مسلم کے رأس المال میں ہیں۔

پس وہ چھ جو مسلم فیہ میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: مسلم فیہ اس کے ذمہ لازم ہو جائے، اس کا وصف بیان ہو، اس کی مقدار معلوم ہو، وہ مؤجل ہو، اس کی مدت معلوم ہو اور وہ مدت پوری ہونے کے وقت محل معین پر موجود ہو۔

اور رہیں وہ تین شرطیں جو رأس المال میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: اس کی جنس معلوم ہو، مقدار معلوم ہو، اور نقد ہو۔ اور یہی وہ تین شرائط ہیں جو رأس المال میں پائی جاتی ہیں اور یہ نقد کے سوا متفق علیہ ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم فیہ اس کے ذمہ ہو جائے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ اس سے مقصود اس کا ذمے میں ہونا ہے، کیونکہ یہ عقد مداینہ ہے (یعنی یہ اس کے ذمہ قرض ہو جاتی ہے) اور اگر ایسا نہ ہو تو از روئے دین کے یہ مشروع نہ ہو اور نہ ہی ربح و رفق کے طور پر لوگ اس کا قصد کریں۔ اور اس قول پر لوگوں کا اتفاق ہے۔ مگر امام مالک نے کہا ہے: کسی معین شے میں بیع مسلم جائز نہیں ہوتی مگر دو شرطوں کے ساتھ۔ ان میں سے ایک یہ کہ وہ بستی محفوظ و مامون ہو اور دوسری یہ کہ وہ اس کے لینے میں شروع ہو جائے مثلاً بکری سے دودھ اور کھجور کے درخت سے تر کھجوریں اور ان کے سوا کسی نے یہ قول نہیں کیا ہے۔ اور یہ دونوں مسئلے دلیل میں صحیح ہیں، کیونکہ بیع مسلم میں تعین متنع ہے مزانہ اور غرر کے خوف سے تاکہ (ادائیگی کے) محل کے وقت وہ متعذر نہ ہو اور جب جگہ مامون ہو تو اغلباً جو شے اس میں ہوتی ہے اس کا پایا جانا متعذر نہیں ہوتا (لہذا) وہ جائز ہے۔ کیونکہ مسائل فقہ میں عواقب اور انجام کی ضمانت کے قطعی ہونے پر یقین نہیں کیا جاسکتا اور ان میں تھوڑے سے دھوکے کا احتمال ضرور ہوتا ہے اور فرعی مسائل میں ایسا بہت زیادہ ہے۔ ان کی تعداد کتب مسائل میں ہے۔

اور رہی بیع مسلم دودھ میں اور ایسی کچی کھجوروں میں جنہیں لینا شروع کر دیا ہو تو یہ مدینہ طیبہ کا مسئلہ ہے اور اس پر اہل مدینہ کا اجماع ہے اور اس کی بناء مصلحت کے قاعدہ پر ہے کیونکہ آدمی دودھ اور کھجوریں یومیہ مزدوری اور اجرت کے طور پر لینے کا محتاج ہے اور ہر روز ابتداء اس کے لئے لینا شاق ہوتا ہے، کیونکہ نقد کبھی موجود نہیں ہوتے اور اس لئے بھی کہ بھاء مختلف ہوتا رہتا ہے اور کھجوروں اور دودھ والا نقد کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس تو سامان ہے وہ اپنے لئے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

پس جب دونوں ہی حاجت میں مشترک ہیں تو دونوں کے لئے اس معاملہ میں رخصت دی گئی ہے عرایا اور دیگر اصول حاجات و مصالح پر قیاس کرتے ہوئے۔

اور رہی دوسری شرط تو وہ یہ ہے کہ اس کی صفت بیان کی گئی ہو۔ یہ متفق علیہ ہے اور اسی طرح تیسری شرط بھی ہے اور اندازہ تین وجہوں سے ہو سکتا ہے۔ کیل (ماپ) وزن اور عدد۔ اور اس کا دار و مدار عرف پر ہوتا ہے اور وہ یا تو لوگوں کا عرف ہوگا یا عرف شرع ہوگا۔

اور رہی چوتھی شرط! تو وہ یہ کہ مسلم فیہ مؤجل ہو اور اس میں اختلاف ہے، پس امام شافعی نے کہا ہے: سلم حال جائز ہوتی ہے اور اکثر علماء نے اس کا انکار کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: مدت مقرر کرنے میں مالکیہ مضطرب ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اسے ایک دن کی طرف لوٹا دیا ہے، یہاں تک کہ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: سلم حال جائز ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس میں تاویل (مدت مقررہ) کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ بیع کی دو قسمیں ہیں: معجل اور وہ معین ہے اور دوسری مؤجل، پس اگر یہ سلم حال ہو اور مسلم الیہ کے پاس اس وقت موجود نہ ہو تو یہ بیع مایس عندک کے باب سے ہو جائے گی۔ پس مدت کا مقرر ہونا اور مہلت ہونا ضروری ہے تاکہ ہر عقد اپنی صفت اور اپنی شرائط کے مطابق خالص ہو۔ اور اس میں احکام شرعیہ جاری ہو سکتے ہوں۔

اور ہمارے علماء کے نزدیک اس کی حد اتنی مدت ہے جتنی مدت میں منڈیاں متغیر ہوتی رہتی ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِیَّیْ اَجَلٍ مُّسَمًّیٍّ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی: اِلَیْ اَجَلٍ مَّعْلُوْمٍ یہ ہر کہنے والے کے قول سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: سلم حال میں سے ہمارے علماء نے جسے جائز قرار دیا ہے وہ وہ ہے جس کا بھاؤ شہروں میں مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس سلم ان چیزوں میں جائز ہوتی ہے جن میں اور اس کے درمیان ایک دن یا دو دن یا تین دن باقی ہوں۔ اور رہا ایک ہی شہر تو اس میں جائز نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا بھاؤ ایک ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور رہی پانچویں شرط اور وہ یہ ہے کہ اجل معلوم ہو تو امت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجل (مدت کے تعین) کے بارے فرما دیا ہے۔

اور امام مالک فقہائے امصار میں سے اس میں منفرد ہیں کہ باغ توڑنے اور فصل کاٹنے کے وقت تک بیع سلم جائز ہے۔ کیونکہ انہوں نے اسے مدت معلوم ہی قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: یَسَالُونُكَ عَنِ الْاَهْلِ تَحْتَ بَحْثٍ گزر چکی ہے۔

اور رہی چھٹی شرط! تو وہ یہ ہے کہ ادائیگی کے وقت وہ موجود ہو تو اس میں بھی امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور اگر مدت پوری ہونے پر امر الہی سے بیع ناپید ہو جائے تو تمام علماء کے نزدیک عقد فسخ ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ بیع سلم کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ مُسَلِّمٌ اِلَیْہِ مُسَلِّمٌ فِیْہِ کا مالک ہو بخلاف بعض سلف کے

کیونکہ امام بخاری نے محمد بن مجالد سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ عبد اللہ بن شداد اور ابو بردہ نے مجھے حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی کی طرف بھیجا اور ان دونوں نے کہا: ان سے پوچھو کیا حضور نبی مکرم ﷺ کے اصحاب آپ کے زمانہ میں گندم میں بیع سلم کرتے تھے؟ تو حضرت عبد اللہ بن شداد نے فرمایا: ہم شام کے رہنے والے کسانوں سے گندم، جو اور زیتون میں معلوم کیل کے ساتھ معلوم مدت تک بیع سلم کرتے تھے۔ میں نے کہا کون ہے جس کے پاس اس کی اصل ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہم اس کے بارے ان سے سوال کرتے رہے پھر ان دونوں نے مجھے عبدالرحمن بن ابزی کی طرف بھیجا، سو میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: حضور نبی مکرم ﷺ کے اصحاب آپ کے عہد مقدس میں بیع سلم کرتے تھے اور ہم ان سے نہ پوچھتے کیا ان کی کھیتی ہے یا نہیں (1)؟ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے عقد کے وقت سے لے کر مدت مقررہ تک مسلم فیہ کا پایا جانا شرط قرار دیا ہے، اس خوف کی وجہ سے کہ مسلم فیہ کا مطالبہ کیا جائے اور وہ نہ پائی جائے تو وہ دھوکہ اور نقصان ہوگا۔ اور تمام فقہاء نے آپ کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ مدت مقررہ مکمل ہونے کے وقت اس کے موجود ہونے کا لحاظ رکھا جائے گا۔ علمائے کوفہ اور ثوری نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر مسلم فیہ ایسی شے ہو جس کا بوجھ ہو اور اسے اٹھانے میں مشقت ہو تو پھر محل قبض کا ذکر کیا جائے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب مسلم فیہ سپرد کرنے کی جگہ کا ذکر نہ کیا گیا تو بیع سلم فاسد ہوگی۔ اور اوزاعی نے کہا ہے: وہ مکروہ ہوگی۔ اور ہمارے نزدیک اگر وہ اس کے ذکر سے خاموش رہے تو عقد فاسد نہ ہوگا اور محل قبض متعین ہو جائے گا۔ امام احمد، اسحاق اور محمد ثین کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس جگہ کا ذکر موجود نہیں ہے جس میں مسلم فیہ پر قبضہ کیا جائے گا۔ اگر یہ بیع سلم کی شرائط میں سے ہوتی تو یقیناً حضور نبی مکرم ﷺ اسے اسی طرح بیان فرمادیتے جس طرح آپ نے کیل، وزن اور اجل (مدت) کے بارے بیان فرمادیا ہے اور اسی کی مثل حضرت ابن ابی اوفی کی حدیث ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ابو داؤد نے سعد الطائی سے، انہوں نے عطیہ بن سعد سے اور انہوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس کسی نے کسی شے میں بیع سلم کی تو اسے چاہیے کہ وہ اسے کسی اور کی طرف نہ پھیرے (2)۔“ ابو محمد عبد الحق بن عطیہ نے کہا ہے: وہ عوفی ہے (یہ عطیہ بن سعد کا لقب ہے) اور کسی نے بھی اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا ہے، اگرچہ بزرگ اور اجلہ راویوں نے اس سے روایت نقل کی ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس آدمی کے بارے میں حکم یہ ہے جس نے معلوم قیمت کے ساتھ مقررہ مدت تک کسی اناج میں بیع سلم کی۔ پس مدت گزر گئی اور خریدنے والے نے بائع کے پاس اس شے میں سے ادا کرنے کے لئے کوئی شے نہ پائی جسے اس نے اس سے خریدا تھا تو وہ اس سے اقالہ کر لے اور اسے چاہیے کہ وہ اس سے چاندی یا سونے یا بعینہ اس ثمن کے سوا جو اس نے اسے دیئے تھے نہ لے اور نہ اس ثمن کے عوض وہ اس سے کوئی اور شے خریدے، یہاں تک کہ وہ ان پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، حدیث نمبر 2088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب السلف لا یعول، حدیث نمبر 3008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قبضہ کر لے اور وہ اس لئے ہے کہ جب اس نے ان ثمنوں کے علاوہ لے لئے جو اس نے دیئے تھے یا اس نے انہیں ایسے سودے کی طرف پھیر دیا جو اس طعام کے سوا ہو جو اس نے اس سے خریدا تھا تو یہ طعام کو پورا کرنے سے پہلے اسے بیچنا لازم آتا ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: تحقیق رسول اللہ ﷺ نے طعام کو پورا کرنے سے پہلے اس کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: **فَاكْتُوبُوْهُ** یعنی تم قرض اور مدت کو لکھ لو..... اور کہا جاتا ہے: کتابت کا حکم دیا گیا ہے لیکن مراد لکھنا اور گواہ بنانا ہے کیونکہ تحریر گواہوں کے بغیر حجت نہیں ہوتی۔ اور کہا جاتا ہے: ہمیں کتابت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ہم بھول نہ جائیں۔

ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حماد بن سلمہ سے، انہوں نے علی بن زید سے انہوں نے یوسف بن مہران سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں فرمایا ہے: **اِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ** الی آخر الآیۃ بلاشبہ جس نے سب سے اول انکار کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد دکھائی تو آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جس کا نور انتہائی روشن اور پھیلا ہوا تھا، تو آپ نے عرض کی اے میرے رب! یہ کون ہے؟ رب کریم نے فرمایا یہ تیرا بیٹا داؤد علیہ السلام ہے۔ عرض کی اے میرے پروردگار اس کی عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ساٹھ برس۔ عرض کی: اے میرے رب! اس کی عمر میں اضافہ فرما دے۔ تو رب کریم نے فرمایا: نہیں مگر یہ کہ تو اپنی عمر میں سے اس میں اضافہ کر دے۔ عرض کی: میری عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ہزار برس۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی: میں نے چالیس برس اسے عطا کر دیئے۔ بیان فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے اس پر تحریر لکھ لی اور اس پر اپنے ملائکہ کو گواہ بنالیا۔ پس جب وفات کا وقت آپہنچا اور ملائکہ حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا ابھی میری عمر سے چالیس برس باقی ہیں۔ ملائکہ نے کہا: بلاشبہ آپ نے وہ اپنے بیٹے داؤد علیہ السلام کو ہبہ کر دیئے تھے تو آپ نے فرمایا: میں نے کسی کو کوئی شے ہبہ نہیں کی۔ آپ نے فرمایا: سو اللہ تعالیٰ نے وہ تحریر نکالی اور اس پر ملائکہ گواہ تھے..... اور ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے لئے سو برس اور آدم علیہ السلام کے لئے ان کی عمر ہزار برس مکمل کر دی (1)۔ اے ترمذی نے بھی نقل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **فَاكْتُوبُوْهُ** میں اس طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ (قرض کے بارے) تحریر لکھے اس طرح جو اس کی مکمل وضاحت کرنے والی ہو اور اس سے ہر قسم کے وہم کو دور کرنے والی ہو ایسے اختلاف کے بارے میں جس کا وہم دو باہم معاملات کرنے والوں کے درمیان ہو سکتا ہے اور اگر وہ دونوں اپنا معاملہ حاکم کے سامنے پیش کریں تو وہ تحریر حاکم کی ایسی راہنمائی کرنے والی ہو جس کے مطابق وہ فیصلہ کر سکے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرضوں کا لکھنا ان کے مالکوں پر واجب ہے، اسی آیت کے ساتھ وہ فرض کیا گیا ہے، چاہے وہ بیع کے سبب ہو یا قرض کی صورت میں ہو، تاکہ اس میں بھول یا انکار ممکن نہ ہو سکے۔ اور یہی علامہ طبری

کا اختیار ہے اور ابن جریج نے کہا ہے: جس کسی کو کوئی قرض دے اسے چاہیے کہ وہ لکھ لے اور جو کوئی شے فروخت کرے تو اسے چاہئے کہ وہ گواہ بنا لے۔

اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: **فَإِنْ أَمِنَ** یہ حکم تحریر کے لئے ناسخ ہے اور اسی طرح ابن جریج نے بیان کیا ہے اور ابن زید نے یہی کہا ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور ربیع نے یہ موقف اپنایا ہے کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ واجب ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس میں تخفیف فرمائی: **فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا**۔

اور جمہور نے کہا ہے: اموال کی حفاظت اور شک کو زائل کرنے کے لئے لکھ لینا مستحب ہے۔ اور جب مقرض متقی ہو تو تحریر اس کے لئے ضرر رساں نہیں اور اگر وہ ایسا نہ ہو تو تحریر اس کے قرض کے بارے اور صاحب حق کی حاجت کے بارے ایک اعتماد اور یاد دہانی ہے، بعض نے کہا ہے: اگر تو گواہ بنا لے تو یہ احتیاط ہے اور اگر تو امین بن جائے تو یہ بھی حلال ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی قول صحیح ہے اور اس میں نسخ مرتب نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لئے اس شے کے بارے میں لکھنا مستحب قرار دیا ہے جسے وہ ہبہ کرے اور اسے چھوڑ دے یہ اجماع سے ثابت ہے اور اس کا مستحب ہونا بلاشبہ لوگوں کے اعتماد اور بھروسہ کی بناء پر ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: **وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ** حضرت عطا وغیرہ نے کہا ہے: کاتب پر واجب ہے کہ وہ لکھے، شعبی نے یہی کہا ہے اور یہ اس وقت ہے جب اس کے سوا کوئی کاتب موجود نہ ہو تو پھر اس پر واجب ہے کہ وہ لکھے۔ سدی نے کہا ہے: اس پر لکھنا واجب ہے جب وہ فارغ ہو۔ پہلے سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے اور دوسرے میں اسے ثابت رکھا گیا ہے کیونکہ دوسرا غائب کے لئے ہے اور پہلا مخاطب کے لئے ہے۔ اور کبھی یہ مخاطب میں ثابت ہوتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَلْتَفَرَّ حُوايَةَ** کے ساتھ ہے اور غائب میں حذف ہو جاتی ہے اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

محمد تفد نفسك كل نفس إذا ما خفت من شيء تبالا

اس میں تفد سے لام محذوف ہے یہ مونث غائب کا صیغہ ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: **بِالْعَدْلِ** یعنی حق اور انصاف کے ساتھ، یعنی صاحب حق کے لئے نہ اس سے زیادہ لکھا جائے گا اور نہ اس سے کم۔ اور فرمایا: **بَيْنَكُمْ** یہ نہیں کہا احد کم، کیونکہ جب وہ آدمی جس کا قرض ہے وہ اس کی کتابت میں شک کر سکتا ہے جس پر قرض ہے اور اسی طرح اس کا برعکس بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے کاتب ایسے آدمی کو قرار دیا ہے جو ان دونوں کے سوا ہو وہ عدل کے ساتھ لکھے، اس کے دل میں اور نہ اس کے قلم میں دونوں میں سے ایک کی دوسرے پر ترجیح ہو۔ (یعنی ایک جانب اس کا جھکاؤ نہ ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک لوگ جب معاملات کرتے ہیں تو کوئی بھی معاملہ سے جدا نہیں ہوتا اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو لکھ سکتے ہیں اور وہ بھی جو نہیں لکھ سکتے، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ ان کے درمیان ایک کاتب عدل و انصاف کے

ساتھ لکھ دے۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بِالْعَدْلِ میں بَاءٌ وَلْيُكْتَبْ کے متعلق ہے کَاتِبٌ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ کوئی معاہدہ (یا دستاویز) نہ لکھے مگر اپنی ذات میں عدل کے ساتھ، حالانکہ اسے بچہ، غلام اور حفاظت و نگرانی کرنے والا سب اسے لکھ سکتے ہیں جبکہ وہ اس کی سمجھ اور فقاہت رکھتے ہوں۔ وہ لوگ جو لکھنے کے لئے مقرر ہوتے ہیں والیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ انہیں چھوڑ دیں مگر جب کہ وہ اپنی رضامندی کے ساتھ کنارہ کش ہو جائیں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: لوگوں کے درمیان معاہدے کوئی نہیں لکھ سکتا مگر وہی جو انہیں جاننے والا ہو، فی نفسہ عادل ہو اور مامون ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيُكْتَبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اس بنا پر باکاتب کے متعلق ہے یعنی چاہیے کہ ان کے درمیان عادل کاتب لکھے، پس بِالْعَدْلِ محل صفت میں واقع ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ اس میں اللہ تعالیٰ نے کاتب کو انکار کرنے سے منع کیا ہے۔ لوگوں نے کاتب پر کتابت کے وجوب اور شاہد پر شہادت کے وجوب میں اختلاف کیا ہے، پس طبری اور ربیع نے کہا ہے۔ ”کاتب پر واجب ہے جب اسے لکھنے کا حکم دیا جائے اور حسن نے کہا ہے: یہ اس پر ایسی جگہ واجب ہے جہاں اس کے سوا اور کوئی کاتب میسر نہ ہو، کیونکہ اس کے انکار سے صاحب قرض کا نقصان ہو جائے گا۔۔۔۔۔ پس اگر صورت حال اس طرح ہو تو پھر یہ فرض ہے اور اگر اس کے سوا دوسرے کاتب پر قدرت ہو تو پھر اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے جبکہ وہ دوسرا اس ذمہ داری کو ادا کرے۔ سدی نے کہا ہے: کاتب پر فارغ ہونے کی حالت میں لکھنا واجب ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مہدوی نے ربیع اور ضحاک سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا يَأْبَ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے وَلَا يُضَاثِرَ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ان کے نظریہ پر جاری ہوتا ہے جن کا یقین یا ظن یہ ہے کہ پہلے متبايعین میں سے جو بھی لکھنا پسند کرے اس پر لکھنا واجب تھا اور اس کے لئے انکار کرنا جائز نہ تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے اسے منسوخ کر دیا: وَلَا يُضَاثِرَ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ اور یہ بعید ہے۔ کیونکہ اس کا واجب ہونا ہر اس پر ثابت نہیں جو بھی متبايعین میں سے اس کا ارادہ کرے وہ جو بھی ہو۔ اگر کتابت واجب ہوتی تو اس کے عوض اجرت لینا صحیح نہ ہوتا، کیونکہ فرائض میں سے کسی فعل پر اجرت لینا باطل ہے اور اس دستاویز کے لکھنے پر اجرت لینے کے جواز میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ امر ارشاد ہے پس وہ لکھتا ہے اور اپنا حق لے لیتا ہے اور ابی یابی شاذ ہے، اور یہ نہیں آتا مگر اس طرح قُلْ يَتَّقِ، ابی یابی، غَسَقَ يَغْسِقُ اور جَبَى الْخَرَجَ يَخِيْ وَيُخِيْ اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيُكْتَبْ، کما میں كاف ان يَكْتُبْ کے متعلق ہے معنی یہ ہے کتبا کما علمہ اللہ، یعنی لکھنا اس طرح ہو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس کے متعلق ہو جو اس قول

میں ہے وَلَا يَأْتِ مَعْنَى كَيْفَ، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر علم کتابت کے ساتھ انعام واحسان فرمایا ہے پس وہ انکار نہ کرے اور چاہیے کہ اسے اسی طرح فضیلت دے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر (اسے) فضیلت دی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کلام اس معنی پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَنْ يَكْتُبَ کے پاس مکمل ہو پھر کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ یہ نیا کلام ہو اور کاف قول باری تعالیٰ فَلْيَكْتُبْ کے متعلق ہو۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: وَيُسَلِّلُ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ اور املا کرانے والا وہ مقروض اور مطلوب ہے جو اپنے بارے میں اپنی زبان سے اقرار کرتا ہے تاکہ جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے وہ اس کے بارے آگاہ کرے۔ املا اور املا ل دو لغتیں ہیں۔ اَمَلَّ اور اَمَلَّ، پس اَمَلَّ اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت ہے اور بنی تمیم کہتے ہیں: اَمَلَيْتُ۔ اور قرآن میں دونوں لغتیں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَهِيَ تُمَلَّى عَلَيْهِ بَكْرًا وَآصِيلًا ⑤ (الفرقان) (پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح وشام) (تاکہ ازبر ہو جائیں) اصل اَمَلَّتُ ہے اس میں لام کو یا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ یہ زیادہ خفیف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے املا کا حکم دیا ہے جس پر حق ہے، کیونکہ شہادت اس کے اقرار کے سبب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں تقویٰ کا حکم دیا ہے جس میں وہ املا کرائے اور حق میں سے کوئی شے کم کرنے سے منع کیا ہے۔ اور النحس کا معنی کم کرنا اور گھٹانا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ وَلَا يَجِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَكْتُبْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ (البقرہ: 228) (اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں) ۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا بعض لوگوں نے کہا ہے: ضعیف سے مراد صغیر ہے اور یہ غلطی ہے کیونکہ سفیہ (بے وقوف) کبھی بڑا بھی ہوتا ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اَوْ ضَعِيْفًا یعنی ایسا کبیر جس کی عقل نہ ہو۔ اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُسَلِّ و وہ جس پر قرض ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی چار قسمیں قرار دی ہیں: ایک مستقل بنفسہ ہو خود املا کرائے۔ اور تین قسموں کے وہ ہیں جو خود املا نہیں کر سکتے اور ہر وقت ان کی تکلیفیں اور اعذار باقی رہتے ہیں، معاملات کے سوا کئی جہتوں میں ان کا حق اس طرح مترتب ہوتا ہے جس طرح کہ میراث جب وہ تقسیم کی جائے وغیر ذلک اور وہ بے وقوف، کمزور اور وہ آدمی ہے جو املا کرانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس سفیہ وہ ہے جس کی رائے اس مال کے بارے میں عمدہ ہو جسے نہ تو اپنی ذات کے لئے لینا اچھا ہوتا ہے اور نہ اس میں سے کوئی شے دینا (حسین ہوتا ہے) اسے اس گھٹیا کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کی بنائی باریک اور ہلکی ہو۔ اور بد زبان کو سفیہ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ بد زبان لوگوں میں سے جاہلوں اور کمزور عقل والے لوگوں میں داخل کر دیتی ہے اور عرب کبھی عقل کی کمزوری پر سفہ کا اطلاق کرتے ہیں اور کبھی بدنی کمزوری پر۔

شاعر نے کہا ہے:

نَخَافُ اَنْ تَسْفَهَ اَحْلَامُنَا وَ يَجْهَلُ الذُّهْرُ مَعَ الْعَالَمِ
اس میں عقل کی کمزوری کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔
اور ذوالرمتہ نے کہا ہے:

مَشِينٌ كَمَا اهْتَزَّتْ رِمَاحُ تَسْفَهَتْ
أَعَالِيهَا مَرُّ الرِّيحِ النَّوَاسِمِ

اس میں بدنی کمزوری اور ضعف کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی اس نے اسے کمزور اور نرم پایا تو اس نے اسے حرکت دی۔

تحقیق انہوں نے کہا ہے: الضعف ضاد کے ضمہ کے ساتھ بدن کی کمزوری کے لئے اور ضاد کے فتح کے ساتھ رائے میں کمزوری کے لئے آتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہیں اور پہلی زیادہ صحیح ہے۔

جبکہ ابو داؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آدمی خریداری کرتا تھا اور اس کی عقل میں ضعف (کمزوری) تھی۔ پس اس کے گھر والے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم فلاں کو روک دیجئے کیونکہ وہ خرید و فروخت کرتا ہے اور اس کی عقل میں ضعف ہے، چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے بیع کرنے سے روک دیا، تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں تو ایک ساعت بھی خرید و فروخت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر تو خرید و فروخت کو چھوڑ نہیں سکتا تو پھر یہ کہہ کر لے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں (1)۔“ اسے ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ سلمیٰ ترمذی نے حدیث انس سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے اور کہا ہے: بے شک ایک آدمی کی عقل میں ضعف تھا اور آگے حدیث ذکر کی (2) اور امام بخاری نے اسے تاریخ میں ذکر کیا ہے اور اس میں یہ کہا ہے۔ ”جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر دھوکہ نہیں ہے اور تو ہر سامان تین راتوں کے خیار کے ساتھ خرید کر۔“ یہ آدمی حبان بن منقذ بن عمرو انصاری تھا اور یحییٰ اور واسع ابن حبان کا والد تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ منقذ یحییٰ اور واسع کا دادا تھا۔ یہ دونوں امام مالک کے شیخ تھے اور منقذ کا والد حبان تھا۔ اس کی عمر ایک سو تیس برس تھی۔ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ایک غزوہ میں زخمی ہو گئے اور زخم ان کے دماغ میں لگا جس سے ان کی عقل اور زبان میں وہم اور خلل پیدا ہو گیا۔

اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: حبان بن منقذ کمزور آدمی تھا اور اس کی قوت بصارت بھی کمزور تھی اس کے سر میں طمانچہ مارا گیا درآنحالیکہ اس کے سر میں زخم ہو گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ہر اس شے میں تین دن کا خیار رکھ دیا جو وہ خریدے گا اور اس کی زبان بھی بوجھل تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: تو خرید و فروخت کر اور یہ کہہ کوئی دھوکہ وغیرہ قبول نہیں۔“ پس میں اسے یہ کہتے ہوئے سنا کرتا تھا: لَا خِذَابَةَ لَا خِذَابَةَ اے حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے، الخلابۃ کا معنی الخدیعة (دھوکہ دہی) ہے۔ اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: اِذَا لَمْ تَغْلِبْ فَاخْلُبْ (3) (جب تو غالب نہ آ سکے تو پھر حیلے اور چال سے مقصد تلاش کر۔)

مسئلہ نمبر 18۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جسے تجربہ کی قلت اور عقل کے ضعف کی وجہ سے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو کیا اس پر پابندی عائد کی جائے یا نہیں؟ تو امام احمد اور اسحاق نے اس پر پابندی کا قول کیا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یقول لی البیع لا خلاۃ، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث 1171

2۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء فیمن یخدع فی البیع، حدیث نمبر 1171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسروں نے کہا ہے اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ دونوں قول ایک ہی مذہب میں ہیں۔ اور صحیح پہلا قول ہے، اس آیت کی بنا پر۔ اور حدیث طیبہ میں اس قول کی بناء پر۔ یا نبی اللہ أحبر علی فلان (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! سنئے اللہ کے حکم فلاں پر پابندی لگا دیجئے) البتہ اس قول کی بنا پر پابندی کا ترک کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یا نبی اللہ انی لا أصبر عن البیع (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! سنئے اللہ کے حکم میں بیع سے رک نہیں سکتا۔) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بیع کو مباح قرار دیا اور اسے اس کے ساتھ خاص کر دیا، کیونکہ وہ جسے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو چاہیے کہ اس پر پابندی لگادی جائے بالخصوص جب اس کی عقل ناقص اور فاسد ہو۔ اور جو شے اس کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے محمد بن اسحاق نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا ہے، محمد بن یحییٰ بن حبان نے مجھے بیان کیا ہے: وہ میرے دادا منقذ بن عمرو تھے اور وہ وہ آدمی تھے جن کے سر میں زخم آگیا، تو ان کی زبان میں لکنت آگئی اور ان کی عقل چھن گئی (یعنی کمزور ہو گئی) وہ تجارت نہیں چھوڑتے تھے اور انہیں ہمیشہ دھوکہ دیا جاتا تھا۔ پس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے اس کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر کوئی دھوکہ (قبول) نہیں پھر تو جو سامان بھی خریدے گا تیرے لئے تین راتوں کا خیار ہوگا پس اگر تو اس پر راضی ہو جائے تو اسے اپنے پاس رکھ لے اور اگر راضی نہ ہو تو اسے اس کے مالک کے پاس لوٹا دے۔“ اور انہوں نے طویل عمر پائی ہے، وہ ایک سو تیس برس تک زندہ رہے ہیں اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب لوگ پھیل گئے اور تعداد میں کثیر ہو گئے تو وہ بازار میں خرید و فروخت کرتے تھے اور شے لے کر اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے حالانکہ انہوں نے غبن فاحش کھایا ہوتا، پھر گھر والے انہیں ملامت کرتے تھے اور کہتے کس کے لئے خریدتے ہو؟ تو وہ کہتے: مجھے خیار حاصل ہے اگر میں پسند کروں تو لے لوں اور اگر نہ پسند کروں تو واپس لوٹا دوں، تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین دن کا خیار عطا فرمایا ہے، پس وہ دوسرے دن یا تیسرے دن سامان اس کے مالک پر واپس لوٹا دیتے، تو وہ کہتا: قسم بخدا! میں اسے قبول نہیں کروں گا، تحقیق تو نے میرا سامان لے لیا ہے اور مجھے دراہم دے دیئے ہیں، تو وہ کہتے: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین دنوں کا اختیار عطا فرمایا ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی آدمی ادھر سے گزرتا تو وہ تاجر کو کہتا: تجھ پر افسوس ہے! بلاشبہ یہ سچ بول رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تین دنوں کا خیار عطا فرمایا تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابو عمر نے الاستیعاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے: بخاری نے تاریخ میں عیاش بن ولید عن عبد الاعلیٰ عن ابن اسحاق کی سند سے اسے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ ضَعِيفًا ضَعِيفٌ سے مراد وہ آدمی ہے جس کی عقل میں نقص اور فساد داخل ہو چکا ہو، لکھوانے سے اس کی فطرت اور طبیعت عاجز ہو یا تو اس کے بولنے میں رکاوٹ ہونے کی وجہ سے یا اس کے گونگا ہونے کی وجہ سے یا ادائے کلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اور یہ بھی کہ کبھی اس کا ولی باپ ہوتا ہے یا وصی۔ اور وہ جو املا کرانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتا وہ صغیر ہے اور اس کا ولی اس کا وصی ہوگا یا اس کا باپ ہوگا۔ اور وہ غائب ہے جو محل اشہاد سے غائب ہو یا تو بیماری کی وجہ سے یا اس کے علاوہ کسی عذر کی وجہ سے اور اس کا ولی اس کا وکیل ہوگا اور رہا گونگا تو یہ جائز ہے کہ وہ بھی ضعیف میں سے ہو۔ اور اولیٰ یہ ہے کہ وہ ان میں سے ہو جو استطاعت نہیں رکھتے۔ پس یہی وہ اصناف ہیں جو ممتاز ہو سکتی ہیں، ان کا

تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 20۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ طبری نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وَلِيُّهُ میں ضمیر الحق کی طرف عائد ہے اور انہوں نے اس بارے میں ربیع سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ضمیر الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ صحیح نہیں ہے اور کس طرح گواہ اس شے پر شہادت دے سکتے ہیں اور سفیہ کے ذمہ اس کی املا کے سبب مال ڈال سکتے ہیں جس کا قرض ہو! یہ شے شریعت میں جائز نہیں ہے مگر اس کا قائل ارادہ رکھتا ہے۔ بے شک وہ جو املا کرانے کی استطاعت نہیں رکھتا بیماری کی وجہ سے یا عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے املا کرانے سے اس کی زبان لڑکھڑا جائے یا گونگا ہونے کی وجہ سے اور جب صورتحال اس طرح ہو تو مریض پر اور جس کی زبان گونگا ہونے کی وجہ سے املا کرانے سے عاجز ہو تو علماء میں سے کسی کے نزدیک کوئی ولی نہیں، مثلاً جو بچے پر اور سفیہ پر ان کے نزدیک جو اس پر پابندی لگاتے ہیں کچھ ثابت نہیں۔ پس جب صورتحال اس طرح ہو تو صاحب حق (قرض کا مالک) عدل و انصاف کے ساتھ املا کرائے اور اسے سنائے جو اس سے عاجز ہے اور جب املا مکمل ہو جائے تو وہ اس کا اقرار کرائے۔ اور یہ معنی آیت سے مراد نہیں ہے اور نہ یہ صحیح ہو سکتا ہے مگر صرف اس کے بارے میں جو بیماری کی وجہ سے املا کرانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور جن کا اس کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 21۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ“ اس پر دلیل ہے کہ بے شک اسے اس بارے میں امین بنایا گیا ہے جسے وہ شروع کر رہا ہے اور جسے وہ پورا کر رہا ہے اور یہ راہن کا قول قسم کے ساتھ قبول ہونے کا تقاضا کرتا ہے جبکہ راہن اور مرتہن کا قرض کی مقدار میں اختلاف ہو جائے اور راہن موجود ہو۔ اور یہی اکثر فقہاء کا مذہب ہے، یعنی سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ۔ اور اسے ہی ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے: کیونکہ مرتہن زیادتی کا دعویٰ کرنے والا ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه (گواہ لانا مدعی پر لازم ہے اور قسم مدعی علیہ پر ہے) اور امام مالک نے کہا ہے: اس صورت میں قول مرتہن کا قبول کیا جائے گا جبکہ وہ (راہن کے) قول اور راہن کی قیمت کے درمیان ہو اور اس سے زیادہ پر اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، تو گویا آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ راہن اور اس کی قسم مرتہن کے لئے شاہد ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ آپ کے اس نظریہ کا رد ہے۔ بے شک وہ جس پر حق ہے وہ راہن ہے اور یہ مسئلہ عنقریب آئے گا۔

اور اگر کوئی کہنے والا کہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے راہن کو شہادت اور کتاب (تحریر) کا بدل بنایا ہے اور شہادت مشہودہ کے صدق پر دال ہے اس قول میں جو اس کے دعویٰ اور راہن کی قیمت کے درمیان ہو جب وہ اس کی قیمت کو پہنچ جائے اور زیادتی کے بارے میں کوئی دستاویز نہ ہو، تو اسے کہا جائے گا راہن اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اس کی قیمت کا قرض کی مقدار کے برابر ہونا واجب ہوتا ہے بسا اوقات مرہونہ شے قلیل اور کثیر کے عوض ہوتی ہے۔ ہاں اکثر اوقات راہن قرض کی مقدار سے کم

نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ اس کے مطابق ہوتی ہے تو ایسا بھی نہیں۔

اور یہ کہنے والا کہتا ہے: قرض کی مقدار میں قسم کے ساتھ مرتہن کے قول کی تصدیق کی جائے گی یہاں تک کہ وہ رہن کی قیمت کے مساوی ہو۔ اور عرف اس پر نہیں ہے بسا اوقات قرض رہن سے کم ہوتا ہے اور یہی اس میں غالب ہے، پس ان کے اس قول کا کوئی نتیجہ نہیں۔

مسئلہ نمبر 22۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ مراد ولی ہے تو اس میں اس پر دلیل ہے کہ اس کا اقرار اپنے یتیم کے خلاف جائز ہے کیونکہ جب اس نے اسے املا کر یا تو اس کا قول اس پر اس بارے میں نافذ ہو گیا جو اس نے اسے لکھوایا۔

مسئلہ نمبر 23۔ اور وہ سفیہ جس پر پابندی عائد کی گئی ہو اس کا اپنے ولی کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا فاسد ہے اس پر اجماع ہے یہ ہمیشہ کے لئے فسخ کر دیا گیا ہے نہ یہ کوئی حکم ثابت کرے گا اور نہ کسی شے میں موثر ہوگا۔ پس اگر سفیہ تصرف کرے اور اس پر کوئی پابندی نہ ہو تو اس بارے میں اختلاف ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: **وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ تَرَجَالِكُمْ**۔ الاستشہاد کا معنی ہے شہادت طلب کرنا (یعنی شاہد بنانا) اور لوگوں کے مابین یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ فرض ہے یا مستحب؟ اور صحیح یہ ہے کہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: **شَهِيدَيْنِ** اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت کے ساتھ شہادت کو حقوق مالیہ، بدنیہ اور حدود میں مرتب فرمایا ہے اور سوائے زنا کے ہر شے میں دو گواہ مقرر کئے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ اور شہید مبالغہ کا وزن ہے اور اس میں اس پر دلالت ہے جو شہادت دے اور وہ اس کی طرف سے بار بار ہو، تو گویا یہ اس کے عادل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 26۔ قولہ تعالیٰ: **مِنْ تَرَجَالِكُمْ** یہ کفار، بچوں اور عورتوں کو چھوڑنے کے بارے نص ہے اور رہے غلام! تو لفظ انہیں شامل ہے اور مجاہد نے کہا ہے مراد آزاد مرد ہیں اور قاضی ابواسحاق نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور اس میں مبالغہ کی حد تک بحث کی ہے اور علماء نے غلاموں کی شہادت کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس شرح، عثمان البتی، احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمہم نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو اور انہوں نے آیت کے لفظ کو غلبہ دیا ہے اور امام مالک، ابو حنیفہ، شافعی اور جمہور علماء رحمہم نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز نہیں ہوتی اور انہوں نے غلامی کے نقص کو غلبہ دیا ہے اور علامہ شعبی اور نخعی نے تھوڑی سی شے میں اسے جائز قرار دیا ہے اور صحیح جمہور کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدِينٍ** اور خطاب **مِنْ تَرَجَالِكُمْ** تک جاری ہے۔ پس ظاہر خطاب ان لوگوں کو شامل ہوگا جو آپس میں قرض کا لین دین کرتے ہیں اور غلام اپنے آقاؤں کی اجازت کے بغیر کسی شے کے مالک نہیں ہوتے۔

اور اگر وہ کہیں کہ آیت کے اول حصہ کا خاص ہونا اس کے آخر کے عموم کے ساتھ تعلق کے مانع نہیں ہے تو انہیں کہا جائے گا اسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد خاص کر رہا ہے: **وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا** جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد میں تراجم اس پر دلیل ہے کہ اندھے اہل شہادت میں سے ہیں لیکن تب جب انہیں یقینی علم ہو۔ مثلاً وہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے شہادت کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو اس سورج کو دیکھ رہا ہے پس تو اس کی مثل پر شہادت دے یا چھوڑ دے“ اور یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد کا اس شے کو دیکھنا شرط ہے جس کے بارے وہ شہادت دے رہا ہے نہ کہ وہ ایسے استدلال کے ساتھ شہادت دے جس میں اس کے خطا کرنے کا احتمال اور امکان ہو۔ البتہ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ وطی کرنا جائز ہوتا ہے جب وہ اس کی آواز پہچان لے، کیونکہ وطی کا عمل کرنا غلبہ ظن کے ساتھ جائز ہے، پس اگر شب زفاف کوئی عورت اس کی طرف بھیج دی گئی اور اسے کہا گیا، یہ تیری بیوی ہے اور وہ اسے نہ پہچانتا ہو تو اس کے لئے اس سے وطی کرنا جائز ہے اور اس کے لئے ہدیہ قبول کرنا حلال ہوتا ہے قاصد کے قول کے ساتھ جو اس کے پاس آئے۔ اور اگر کوئی خبر دینے والا اسے زید کے بارے میں اقرار یا بیع یا قذف یا غصب کی خبر دے تب اس کے لئے مخبر عنہ کے خلاف شہادت دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ شہادت کا راستہ یقین ہے اور ان کے سوا میں ظن غالب کا استعمال جائز ہوتا ہے اور اسی لئے امام شافعی، ابن ابی لیلیٰ اور امام ابو یوسف رحمہم نے کہا ہے: جب اسے نامیٹا ہونے سے پہلے اس کا علم ہو تو اندھا ہونے کے بعد اس کی شہادت جائز ہے۔ اور اس کے اور مشہود علیہ کے درمیان حائل ہونے والا اندھا پن مشہود علیہ میں غیبت اور موت کے طاری ہونے کی طرح ہے اور یہ ان کا مذہب ہے اور وہ جو اندھے کو اس بارے میں ادائے شہادت سے روکتے ہیں جو شہادت اس نے بصارت کے ساتھ لی ہو اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے اور اس کی شہادت اس نسب کے بارے میں صحیح ہوگی جو خبر مشہور سے ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ وہ ایسی شے کے بارے خبر دے جس کا حکم رسول اللہ ﷺ سے تو اتر کے ساتھ ثابت ہو۔

اور علماء میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اندھے کی شہادت کو ان چیزوں میں قبول کیا ہے جن کی شہادت کا ذریعہ آواز ہے کیونکہ انہوں نے اس کے ساتھ استدلال کو حد یقین تک پہنچنے والا خیال کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ آوازوں کا مشتبہ ہونا شکلوں اور رنگوں کے مشتبہ ہونے کی طرح ہی ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آنکھ والے کے لئے بھی آواز پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ نابینے آدمی کا طلاق وغیرہ میں آواز پر شہادت دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ آواز کو پہچانتا ہو۔ ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ میں نے امام مالک سے کہا: ایک آدمی دیوار کے پیچھے سے اپنے پڑوسی کی آواز کو سنتا ہے اور اسے دیکھتا نہیں، وہ یہ سنتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے (کیا) وہ اس پر شہادت دے سکتا ہے درآنحالیکہ اس نے اس کی آواز پہچان لی ہو؟ تو امام مالک نے فرمایا: اس کی شہادت جائز ہے اور یہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، قاسم بن محمد، شریح الکندی، شعبی، عطاء بن ابی رباح، یحییٰ ابن سعید، ربیعہ، ابراہیم نخعی، امام مالک اور لیث رحمہم نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 27۔ قولہ تعالیٰ: فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتْنِیٰ مَعًا كَإِحْدَىٰ هَاتِهِمَا مَنِ السُّبْحِیُّ
تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتیں لے آئے، یہ جمہور کا قول ہے۔ فَرَجُلٌ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور

وَأَمْرًا ثَلَاثِينَ اس پر معطوف ہے اور خبر مخذوف ہے۔ (تقدیر کلام یہ ہے) فرجل و امرأتان یقومان مقامہما۔ یعنی ایک مرد اور دو عورتیں دو مردوں کے قائم مقام ہو جائیں گے۔ اور غیر قرآن میں نصب بھی جائز ہے (یعنی) فاستشهدوا رجلًا و امرأتین۔ پس تم گواہ بناؤ ایک مرد اور دو عورتیں۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: ان خنجرًا فخنجرًا (اگر وہ خنجر لے کر آئے تو تم بھی خنجر لے کر آؤ) اور ایک قوم نے کہا ہے: بلکہ معنی یہ ہے پس اگر دو مرد نہ ہوں، یعنی وہ نہ پائے جائیں تو دو عورتوں کو گواہ بنانا جائز نہ ہوگا مگر مرد نہ ہونے کی صورت میں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (1): یہ ضعیف ہے اور آیت کے الفاظ یہ معنی نہیں دیتے، بلکہ اس سے ظاہر جمہور کا قول ہے، یعنی اگر گواہ بنانے والے کے پاس دو مرد نہ ہوں یعنی اگر صاحب حق اسے چھوڑ دے یا کسی عذر کے سبب اس کا قصد کرے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو مردوں کی موجودگی کے باوجود ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے سوا کسی اور میں اس کا ذکر نہیں فرمایا اور جمہور کے قول کے مطابق اسے صرف اموال میں جائز قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ایک مرد بھی ہو۔ بلاشبہ یہ اموال میں ہو سکتا ہے ان کے سوا میں نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اموال کو پختہ کرنے اور ان کی توثیق کرنے کے اسباب کثیر بنائے ہیں کیونکہ انہیں حاصل کرنے کی جہتیں کثیر ہیں اور ان کے ساتھ عموم بلوی ہونے اور ان کا کاروبار بار بار ہونے کی وجہ سے۔ پس ان میں مضبوطی اور توثیق کو کبھی لکھوانے کے ساتھ، کبھی گواہ بنالینے کے ساتھ، کبھی رہن کے ساتھ اور کبھی ضمان کے ساتھ رکھ دیا۔ اور ان تمام میں عورتوں کی شہادت کو مردوں کے ساتھ داخل کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد إِذَا تَدَايَيْتُمْ بَدَیْنِ سِیْءٍ وَہُمْ نِہِیْنِ ہوتا کہ یہ بضع کے ساتھ مہر کے قرض پر اور دم عہد کی صلح پر مشتمل ہے، کیونکہ وہ شہادت شہادت علی الدین نہیں ہے، بلکہ وہ شہادت علی النکاح ہے اور علماء نے ان معاملات میں اکیلی عورتوں کی شہادت جائز قرار دی ہے جن پر ضرورت کے وقت ان کے سوا کوئی اور مطلع نہیں ہو سکتا اور اسی طرح ضرورت کے وقت بچوں کی شہادت کی اجازت دی گئی ہے ان زخموں اور جھگڑوں میں جو ان کے آپس کے درمیان ہوں۔

تحقیق علماء نے زخموں میں بچوں کی شہادت کے بارے اختلاف کیا ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 28۔ امام مالک نے اسے جائز قرار دیا ہے جب تک وہ مختلف اور متفرق نہ ہوں۔ اور ان میں سے دو سے کم کی شہادت جائز نہیں ہے نہ بڑے کی چھوٹے پر اور نہ چھوٹے کی بڑے پر۔ اور علماء میں سے جو بچوں کے آپس کے جھگڑوں میں ان کی شہادت کے ساتھ فیصلے کرتے تھے وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں اور امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس پر اجماع کیا گیا ہے۔

اور امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم نے بچوں کی شہادت کو جائز قرار نہیں دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنْ تَرَ جَائِلُکُمْ اَوْ مِثْنُ تَرْضَوْنَ اَوْ ذُو عَدْلٍ مِنْکُمْ اور یہ صفات بچوں میں موجود نہیں ہوتیں۔

مسئلہ نمبر 29۔ جب اللہ تعالیٰ نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک آدمی کی شہادت کا بدل قرار دیا ہے تو پھر یہ ضروری

ہے کہ ان دونوں کا حکم ایک مرد کے حکم کی طرح ہو، پس اسی طرح ہمارے نزدیک آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کھائے اور امام شافعی کے نزدیک بھی اسی طرح ہے، لہذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ بھی قسم کھا سکتا ہے کیونکہ مطلقاً دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کا عوض ہے۔ اور اس میں امام اعظم ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے اختلاف کیا ہے اور وہ شاہد کے ساتھ قسم کے قائل نہیں اور انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے شہادت کو تقسیم کیا اور اسے متعدد شمار کیا، لیکن شاہد اور یمین کا ذکر نہیں کیا، لہذا اس کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ جو تقسیم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے یہ قسم اس پر زائد ہے اور یہ نص پر زیادتی ہے اور یہ نسخ ہے اور جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان میں سے ثوری، اوزاعی، عطاء، حکم بن عتبہ اور ایک جماعت ہے۔

بعض نے کہا ہے: شاہد کے ساتھ قسم لے کر فیصلہ کرنا قرآن کے ساتھ منسوخ ہے اور عطا نے یہ گمان کیا ہے کہ سب سے پہلے عبد الملک بن مروان نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور حکم نے کہا ہے: قسم اور شاہد کے ساتھ فیصلہ کرنا بدعت ہے اور سب سے پہلے اس کے ساتھ حضرت معاویہؓ نے فیصلہ کیا اور یہ سب غلط اور وہم ہے جو حق میں سے کسی شے کا فائدہ نہیں دیتا اور جو نفی کرے اور تاواقف ہو وہ اس کی طرح نہیں جو ثابت کرے اور جانتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: **وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ** الایہ۔ میں وہ نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا شاہد کے ساتھ قسم کے بارے میں فیصلہ رد ہو سکتا ہو۔ اور نہ اس میں یہ ہے کہ اسے حقوق کے ساتھ نہیں ملایا جاسکتا اور نہ یہ کہ شہادت کے ساتھ صرف انہی چیزوں میں حق حاصل ہوتا ہے جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے کسی اور کا نہیں، کیونکہ وہ مطلوب کے انکار اور طالب کی قسم کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے۔ بے شک وہ اس کے ساتھ بالا جماع مال کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہے اور یہ ان کے خلاف قطعی رد ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان کے خلاف حجت یہ ہے کہ انہیں کہا جائے گا: آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف مال کا دعویٰ کرے تو کیا مطلوب اس کے بارے میں قسم نہیں دے گا جو حق اس پر ہے؟ پس اگر وہ قسم کھالے تو وہ حق اس سے باطل ہو جائے گا اور اگر قسم سے انکار کر دے تو پھر صاحب حق (مدعی) قسم دے گا کہ اس کا حق یقینی ہے اور اس کا حق مدعی علیہ پر ثابت ہو جائے گا۔ پس یہ ایسی شے ہے جس میں لوگوں میں سے کسی کے نزدیک اور نہ ہی شہروں میں سے کسی شہر میں کوئی اختلاف ہے۔ پس کون سی شے ہے جسے انہوں نے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کون سی کتاب میں اسے پایا ہے؟ پس جس نے اس کا اقرار کیا تو اسے چاہیے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کا بھی اقرار کرے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پھر تعجب ہے کہ مشہور اور صحیح احادیث کے باوجود انہوں نے اسے بدعتی قرار دیا جس نے ان کے مطابق عمل کیا، یہاں تک کہ اس کے فیصلے کو توڑ دیا اور اس کی رائے کو حقیر سمجھا، اس کے باوجود کہ اس کے مطابق خلفائے اربعہ، ابی بن کعب، معاویہ، شریح، عمرو بن عبد العزیز..... اور آپ نے اس کے بارے میں اپنے عمال کی طرف لکھا..... ایسا بن معاویہ، ابوسلمہ بن عبد الرحمن، ابوالزناد اور ربیعہ رحمہم ورحمہم نے عمل کیا ہے اور اسی لئے امام مالک نے کہا ہے۔ اس بارے میں وہی کافی ہے جو سنت کے عمل میں سے گزر چکا ہے۔ کیا آپ ان کے بارے میں رائے رکھتے ہیں کہ ان کے احکام توڑ دیئے جائیں

گے اور ان کی بدعت کے مطابق فیصلے کئے جائیں گے؟ یہ شدید عدم توجہ اور غفلت ہے اور ایسی رائے ہے جو پختہ اور مضبوط نہیں۔ ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمنین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔

حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ صرف اموال میں ہے، اسے سیف بن سلیمان نے قیس بن سعد سے انہوں نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کی یہ سند اصح الاسناد ہے اور یہ حدیث ہے جس کی اسناد میں کسی کے لئے کوئی طعن نہیں ہے اس حدیث کے بارے اہل معرفت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ یحییٰ القطان نے کہا ہے: سیف بن سلیمان ثابت اور مضبوط راوی ہیں میں نے ان سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا اور نسائی نے کہا ہے: یہ اسناد جید ہے، سیف ثقہ راوی ہے اور قیس ثقہ راوی ہے اور مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

ابو بکر البزار نے کہا ہے: سیف بن سلیمان اور قیس بن سعد دونوں ثقہ راوی ہیں اور جوان دونوں کے بعد ہیں وہ ثقاہت اور عدالت میں اپنی شہرت کے سبب ذکر سے مستغنی ہیں اور صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی نہیں جس نے شاہد کے ساتھ قسم کا انکار کیا ہو، بلکہ اس کے بارے ان سے قول مروی ہیں اور مدینہ طیبہ کے جمہور اہل علم اسی موقف پر ہیں اور اس میں حضرت عروہ بن زبیر اور ابن شہابؒ سے اختلاف مروی ہے۔ معمر نے کہا ہے: میں نے زہری سے یمنین مع الشاہد کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ ایسی شے ہے جسے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔ دو شاہدوں کا ہونا ضروری ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ جب قضا کے والی بنے تو پہلا فیصلہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ کیا اور امام مالک اور آپ کے اصحاب، امام شافعی اور آپ کے تابعین، امام احمد، اسحاق، ابو عبید، ابو ثور، داؤد بن علی اور محدثین کی ایک جماعت رحمہم نے یہی کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے متواتر آثار ہیں اور کئی صدیوں سے اہل مدینہ کا اس پر عمل ہے۔ اور امام مالک نے فرمایا ہے: ہر شہر میں ایک شاہد اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ اور آپ نے الموطا میں اس کے سوا کسی مسئلہ کے لئے حجت اور دلیل بیان نہیں فرمائی اور آپ کے ساتھ یمنین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں کیا گیا اور نہ ہی مدینہ طیبہ اور مصر وغیرہ میں آپ کے اصحاب میں سے کسی سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر شہر میں مالکی اس کے سوا اپنے مذہب سے نہیں پہچانے جاسکتے سوائے ہمارے پاس اندلس میں، کیونکہ یحییٰ [بن یحییٰ] نے گمان کیا ہے کہ انہوں نے لیث کو اس کے مطابق فتویٰ دیتے نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے یہ موقف اپنایا ہے۔ اور اس مسئلہ میں یحییٰ نے امام مالک سے اختلاف کیا ہے باوجود اس کے کہ یہ ان کی سنت اور دارالہجرت کے عمل سے مخالفت ہے۔

پھر یمنین مع الشاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ایک حکم کی زیادتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ پر نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے (1) (یعنی پہلے کسی آدمی کے نکاح میں پھوپھی ہو اور پھر سے دوسرا نکاح بھتیجی یا پہلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب لا تنکح المرأة علی عمتها، حدیث نمبر 4718، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خالہ ہو اور پھر بھانجی آجائے تو یہ دونوں ایک آدمی کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔) اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَحَلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَلِكَ (النساء: 24)** (اور حلال کر دی گئی ہیں تمہارے لئے ماسوا ان کے) اور جیسا کہ آپ ﷺ نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمادیا اور درندوں میں سے ہر ذی ناب کا، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ لَا أَجِدُ (الانعام: 145)** (آپ فرمائیے میں نہیں پاتا) اور اسی طرح مسح علی الخفین کا حکم ہے حالانکہ قرآن کریم میں صرف پاؤں کو دھونے یا ان کا مسح کرنے کے بارے میں وارد ہے اور اس قسم کی مثالیں کثیر ہیں۔

اور اگر یہ کہا جاتا جائے کہ قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلے کو منسوخ کر دیا ہے تو پھر یہ کہنا بھی جائز ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاد: **وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الزَّوْجَ (بقرہ: 275)** اور **إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ (النساء: 29)** (مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔) بیع مزابنہ، بیع الغرر، ان چیزوں کی بیع جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ تمام بیوع جو ممنوع ہیں ان کی نہی کے لئے ناسخ ہیں اور یہ کسی کے لئے بھی جائز نہیں، کیونکہ سنت کتاب اللہ کے لئے مبین اور وضاحت کرنے والی ہے۔

اور اگر کہا جائے: بے شک جو حدیث میں وارد ہے اور وہ ایک معین فرد کے بارے فیصلہ ہے اور اس میں عموم نہیں ہے تو ہم کہیں گے، بلکہ وہ اس قاعدہ کی تقعید (روک دینا) سے عبارت ہے، گویا کہ انہوں نے یہ کہا: رسول اللہ ﷺ نے یہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ حکم ثابت کیا ہے اور جو اس تاویل کی شہادت دیتی ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حقوق میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا اور قیاس اور نظر و فکر کے اعتبار سے ہم قسم کو دو عورتوں کی نسبت زیادہ قوی پاتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کا لعان میں کوئی دخل نہیں ہے اور قسم لعان میں داخل ہوتی ہے۔ اور جب حدیث صحیح ہے تو پھر اس کے ساتھ کلام کرنا واجب ہے اور سنت ان کی محتاج نہیں ہوتی جو اس کی پیروی کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ جو اس سے مخالفت کرے گا وہی اس کے خلاف حجت بن جائے گی۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 30۔ اور جب یہ بات پختہ ہو گئی اور یمین مع الشاہد کے ساتھ حکم ثابت ہو گیا، تو قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا: یہ اموال اور ان کے متعلقات کے بارے ہے بدنی حقوق کے بارے نہیں، جو بھی یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے کا قائل ہے ان تمام کی طرف سے اس پر اجماع ہے۔ فرمایا: کیونکہ اموال کے حقوق ابدان کے حقوق سے پست اور ہلکے ہوتے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں عورتوں کی شہادت قبول ہے۔ اور عمد از ختم لگانے کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا قول مختلف ہے، کیا اس میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ قصاص ثابت ہو سکتا ہے؟ اس میں دو روایتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے ساتھ قصاص اور دیت کے درمیان اختیار ثابت ہو جائے گا اور دوسری یہ ہے کہ اس سے کوئی شے بھی ثابت نہ ہو گی کیونکہ یہ بدنی حقوق میں سے ہے۔ فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔

امام مالک نے المؤمنین میں کہا ہے: وہ (یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ) صرف اموال میں ہو سکتا ہے اور عمرو بن دینار نے بھی یہی کہا ہے اور مازری نے کہا ہے: بغیر کسی اختلاف کے اسے صرف مال میں قبول کیا جائے گا اور محض نکاح اور طلاق میں

بغیر کسی اختلاف کے اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر شہادت کا مضمون مال نہ ہو، لیکن وہ مال تک پہنچانے والی ہو، جیسا کہ وصیت اور موت کے بعد نکاح کے بارے شہادت دینا، یہاں تک کہ اس کے ثابت ہونے سے صرف مال وغیرہ کا مطالبہ کیا جائے گا تو اس کی قبولیت میں اختلاف ہے۔ پس جنہوں نے مال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول کیا ہے جیسے وہ اسے مال میں قبول کرتے ہیں اور جنہوں نے حال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

اور مہدوی نے کہا ہے: عام فقہاء کے قول کے مطابق حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں اور اسی طرح اکثر علماء کے قول کے مطابق نکاح اور طلاق میں بھی (ان کی شہادت جائز نہیں) اور یہی امام مالک اور امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے، وہ صرف اموال میں شہادت دے سکتی ہیں اور ہر وہ معاملہ جس میں وہ خود شہادت نہیں دے سکتیں وہ اس میں اپنے سوا کسی اور کی شہادت پر بھی شہادت نہیں دے سکتیں، چاہے ان کے ساتھ کوئی مرد ہو یا نہ ہو اور وہ شہادت نقل نہیں کر سکتیں مگر مرد کے ساتھ (جبکہ) انہوں نے مرد اور عورت سے شہادت نقل کی ہو۔ اور ان تمام معاملات میں دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا جن میں ان کے سوا کوئی حاضر نہ ہو سکتا ہو، جیسا کہ ولادت اور ولادت کے وقت بچے کا رونا وغیرہ۔ یہ سب امام مالک کا مذہب ہے اور بعض مسائل میں اختلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 31۔ قولہ تعالیٰ: **وَمَنْ تَرَصُّونَ مِنَ الشَّهَدَاءِ** یہ رجل و امرأتان کی صفت ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے۔ ابن بکیر وغیرہ نے کہا ہے: یہ حکام کو خطاب کیا گیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ عمدہ قول نہیں ہے، بلکہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے لیکن جن کا اس قضیہ کے ساتھ تعلق ہے وہ صرف حکام ہیں اور یہ کتاب اللہ میں بہت زیادہ ہے کہ ان احکام میں خطاب عام ہوتا ہے جن کے ساتھ تعلق بعض کا ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 32۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَمَنْ تَرَصُّونَ مِنَ الشَّهَدَاءِ** تو یہ اس پر دلیل ہے کہ گواہوں میں سے وہ بھی ہیں جو پسند نہیں کئے جاتے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو عدالت پر محمول نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ ان کے لئے ثابت ہو جائے اور یہ معنی اسلام پر زائد ہے اور یہ جمہور کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا ہے: ہر وہ مسلمان جس کا اسلام ظاہر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ظاہری فسق سے سلامت اور محفوظ ہو تو وہ عادل ہے، اگرچہ وہ مجہول الحال ہو۔

اور شریح عثمان البتی اور ابو ثور نے کہا ہے: وہ مسلمانوں میں سے عادل لوگ ہیں اگرچہ وہ غلام ہوں۔ میں (مفسر) کہتا ہوں..... پس انہوں نے حکم کو عام قرار دیا ہے اور اس سے شہری کے خلاف بدوی (جنگل میں رہنے والا) کی شہادت کا قبول ہونا لازم آتا ہے، بشرطیکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو اور یہی امام شافعی اور ان کی موافقت کرنے والوں نے کہا ہے اور وہ (بھی) ہمارے مردوں اور ہمارے اہل دین میں سے ہے۔ اور اس کا بدوی ہونا اس کے دوسرے شہر سے ہونے کی طرح ہے اور قرآن کریم میں آیات عموماً عادلوں کی شہادت قبول کرنے پر دلالت ہیں اور وہ بدوی اور شہری کو مساوی قرار دیتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَمَنْ تَرَصُّونَ مِنَ الشَّهَدَاءِ** اور مزید ارشاد فرمایا: **وَأَشْهِدُوا ذُوَ عَدْلٍ مِنْكُمْ** (اور تم اپنے میں سے عدل کرنے والوں کو گواہ بنالو) پس **مِنْكُمْ** میں خطاب مسلمانوں کو ہے اور یہ یقیناً اس کا تقاضا کرتا ہے کہ عدالت کا

معنی بالضرور اسلام پر زائد ہو (یعنی وہ مسلمان ہونے کے ساتھ عادل بھی ہو) کیونکہ صفت موصوف پر زائد ہوتی ہے اور اسی طرح **مَنْ تَرْضَوْنَ** بھی اسی کی مثل ہے، بخلاف اس کے جو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے پھر اس کا پسندیدہ ہونا معلوم نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی حالت کو آزما لیا جائے، پس اس سے لازم آتا ہے کہ فقط ظاہر اسلام پر اکتفاء نہ کیا جائے۔ امام احمد بن حنبل، امام مالک نے ان سے ابن وہب کی روایت میں شہری کے خلاف بدوی کی شہادت رد ہونے کا موقف اپنایا ہے، اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بدوی کی شہادت شہر میں رہنے والے کے خلاف جائز نہیں ہوتی (1)۔“ اور صحیح یہ ہے کہ اس کی شہادت جائز ہے جبکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء اور سورۃ البراءۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سفر یا حضر میں شہری کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جب وہ سفر میں ہو تو اس کی شہادت قبول ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: عدالت سے مراد احوال دینیہ میں اعتدال ہے اور یہ تب مکمل ہوتا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو، اپنی مروت کی حفاظت کرنے والا ہو اور گناہ صغیرہ کو ترک کرنے کا محافظ ہو اور امانت کا ظاہر یہ ہے کہ اسے چھپایا نہ جائے (غفلت نہ برتی جائے) اور کہا گیا ہے: عادل قرار دینے والے کے گمان میں باطن صاف ہو اور سیرت مستقیم ہو اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔

مسئلہ نمبر 33۔ جب شہادت ولایت عظیمہ اور مرتبہ بلند ہے اور یہ غیر کے قول کو غیر کے خلاف قبول کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں رضا اور عدالت کی شرط لگائی ہے۔ پس شاہد کے حکم میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق و اوصاف کے ساتھ منفرد ہو اور فضائل و کمالات سے آراستہ اور مزین ہو، یہاں تک کہ اسے دوسروں پر فضیلت و برتری حاصل ہو اور وہی فضیلت اس کا قول قبول کرنے کے بارے اس کے لئے رتبہ اختصاص ثابت کرتی ہو اور اس کی شہادت کے ساتھ مطلوب کے ذمہ کے مشغول ہونے کے بارے حکم لگایا جاسکتا ہو۔ ہمارے علماء کے نزدیک اجتہاد اور امارات و علامات کے ساتھ استدلال کرنے کے جواز پر اسی شے میں جس کے معانی اور احکام مخفی اور پوشیدہ ہوں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کا بیان سورۃ یوسف میں تفصیل کے ساتھ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں ایسی دلیل موجود ہے جو امر کو حکام کے اجتہاد کے سپرد کرنے پر دلالت کرتی ہے اور بسا اوقات وہ شاہد میں غفلت یا شک کو دیکھ لیتا ہے اور اس وجہ سے اس کی شہادت رد کر دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 34۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اموال میں ظاہر اسلام پر اکتفا کیا جائے گا لیکن حدود میں نہیں۔ اور یہ مناقضہ ہے جو آپ کے کلام کو ساقط کر دیتا ہے اور آپ پر اس کے مقاصد فاسد کر دیتا ہے، کیونکہ ہم کہتے ہیں: یہ حقوق میں سے ایک حق ہے۔ پس شہادت میں فقط ظاہر دین پر ہی اکتفاء نہ کیا جائے گا جیسا کہ حدود میں۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 35۔ جب اللہ تعالیٰ نے عقود مداینہ میں شاہد کے لئے عدالت اور رضا کی شرط عائد کی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تو پھر نکاح میں ان کا شرط ہونا بدرجہ اولیٰ ہے، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جہاں انہوں نے فرمایا: بے شک

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب من لا تجوز شہادۃ، حدیث نمبر 2357، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکاح دو فاسق آدمیوں کی شہادت کے ساتھ منعقد ہو جاتا ہے۔ سو آپ نے اموال میں جس احتیاط کا حکم دیا ہے اس کی نکاح سے نفی کر دی ہے حالانکہ یہ زیادہ اولیٰ اور ضروری ہے کیونکہ اس کے ساتھ حل و حرمت اور حد و نسب تعلق رکھتے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول انتہائی ضعیف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رضا اور عدالت کی شرط عائد کی ہے اور اس کا پسندیدہ ہونا خالی اسلام سے معلوم نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو اس کے احوال میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فقط اس کے اس قول سے دھوکہ نہیں کھایا جائے گا کہ میں مسلمان ہوں۔ بسا اوقات اس میں ایسی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں جو اس کی شہادت کو رد کرنے کا موجب ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِنَ الثَّالِثِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ ۚ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۖ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَاسِقَ ۖ** (البقرہ) (اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی اور وہ گواہ بنا تا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے.....) (اور اللہ تعالیٰ) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا) اور مزید فرمایا: **وَإِذَا رَأَوْا آيَاتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ** (المنافقون: 4) (اور جب آپ انہیں دیکھیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے خوشنما معلوم ہوں گے.....)

مسئلہ نمبر 36۔ قولہ تعالیٰ: **أَنْ تَضِلَّ** اِحْدَاهُمَا ابو عبید نے کہا ہے: **تَضِلَّ** بمعنی تنسو ہے (کہ ان میں سے ایک بھول جائے) اور شہادت میں ضلال کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا کچھ حصہ بھول جانا اور کچھ یاد ہو اور آدمی اس کے درمیان حیران باقی رہ جاتا ہے یہی ضال ہے اور جو پوری شہادت بھول جائے تو اس کے لئے یہ نہیں کہا جاتا: ضل فیہا۔ (وہ اس میں بھول گیا) حمزہ نے جزا کے معنی کی بنا پر ان میں حمزہ کو کمسور پڑھا ہے اور **فَتَضَلَّ** کُر میں فا کو اس کا جواب قرار دیا ہے۔ اور شرط اور جواب شرط **رَجُلٍ** و **امْرَأَتَانِ** کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہیں۔ اور **تَضَلَّ** کُر استیناف کی بنا پر مرفوع ہے۔ جیسا کہ یہ قول مرفوع ہے **وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ** (المائدہ: 95) (اور جو) (اب) پھر گیا تو انتقام لے گا اللہ تعالیٰ اس سے) یہ سیبویہ کا قول ہے۔

اور جنہوں نے ان میں حمزہ کو مفتوح پڑھا ہے تو یہ مفعول لہ ہے اور اس میں عامل محذوف ہے اور جماعت کی قرأت کے مطابق **فَتَضَلَّ** کُر منصوب ہے اور اس فعل پر معطوف ہے جس کو ان کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔

نحاس نے کہا ہے: **تَضَلَّ** تا اور ضاد کے فتح کے ساتھ پڑھنا جائز ہے اور **تَضَلَّ** تا کے کسرہ اور ضاد کے فتح کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ پس جس نے کہا: **تَضَلَّ** یہ ان کی لغت پر ہے جنہوں نے کہا ہے: **ضَلِلْتُ** **تَضَلَّ**۔ اور اسی پر آپ **تَضَلَّ** کہتے ہیں اور تا کو کسرہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ ماضی **فَعِلْتُ** ہونے پر دلالت کرے۔ اور محمد بن ابی عیسیٰ ابن عمر نے **أَنْ تَضَلَّ** تا کو ضمہ، ضاد کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ بمعنی **تُنْسَى** (یعنی اگر ان میں سے ایک بھلا دی جائے) اور اسی طرح ان دونوں سے ابو عمرو الدانی نے بیان کیا ہے۔ اور نقاش نے محمد بن ابی عیسیٰ سے تا کے ضمہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے بمعنی **أَنْ تَضَلَّ** الشہادۃ

(کہ وہ شہادت کو بھلا دے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أَضَلُّتُ الْفَرَسَ وَالْبَعِيرَ (میں نے گھوڑے اور اونٹ کو گم کر دیا۔)

جب وہ دونوں تجھ سے ضائع ہو جائیں اور چلے جائیں سو تو انہیں نہ پاسکے۔ (تب یہ جملہ کہا جاتا ہے)

مسئلہ نمبر 37۔ قولہ تعالیٰ: فَتَذَكَّرُ ابْنُ كَثِيرٍ اور ابو عمرو نے ذال اور کاف کو مخفف پڑھا ہے اور اس پر معنی یہ ہوگا کہ تو اسے شہادت میں مذکر کی طرف لوٹا دے، کیونکہ عورت کی شہادت نصف شہادت ہے اور جب دو عورتوں نے شہادت دی تو دونوں کا مجموعہ ایک مرد کی شہادت کی طرح ہوگا۔ سفیان بن عیینہ اور ابو عمرو بن العلاء نے یہی کہا ہے۔ اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، کیونکہ وہ ضلال جس کا معنی نسیان ہے اس کے مقابلہ میں صرف ذکر (یاد دلانا) ہی آسکتا ہے اور یہی جماعت کی قرأت کا معنی ہے۔ فَتَذَكَّرُ یعنی وہ دوسری اسے آگاہ کرے جب وہ غافل ہو جائے اور بھول جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو عمرو کی قرأت اس کی طرف راجع ہے، یعنی اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلادے، کہا جاتا ہے: تَذَكَّرْتُ الشَّيْءَ إِذَا كُنْتُ غَيْرِي وَذَكَرْتُهُ (میں نے اسے یاد دلایا) ان تمام کا معنی ایک ہے الصحاح میں اس طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 38۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا حسن نے کہا ہے یہ آیت دو امور کو جمع کئے ہوئے ہے اور وہ دونوں یہ ہیں کہ تو انکار نہ کرے جب تجھے تحصیل شہادت کے لئے بلایا جائے اور نہ تب جب تجھے ادائے شہادت کی طرف بلایا جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ، ربیع اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یعنی (تو انکار نہ کرے جب تجھے بلایا جائے) تاکہ تو شہادت اخذ کر لے اور اسے کتاب میں ثابت اور محفوظ کر لے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے جب تجھے ادائے شہادت کے لئے بلایا جائے درآنحالیکہ وہ شہادت تجھے حاصل ہو چکی ہو۔ اور نقاش نے حضور نبی مکرم ﷺ کی طرف نسبت کی ہے کہ آپ نے آیت کی اس طرح تفسیر بیان فرمائی ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے پس جب تجھے بلایا جائے تاکہ تو پہلے شہادت دے تو تو اگر چاہے تو جا اور اگر چاہے تو نہ جا۔ ابو مجلز، عطاء، ابراہیم، ابن جبیر، سدی، ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس بنا پر متعاقدین کے پاس گواہوں کا حاضر ہونا واجب نہیں ہے، البتہ قرض لینے دینے والے دونوں افراد پر لازم ہے کہ وہ گواہوں کے پاس حاضر ہوں۔ پس جب وہ دونوں ان کے پاس حاضر ہوں اور دونوں انہیں کتاب میں اپنی شہادت ثبت اور محفوظ کرنے کی درخواست کریں تو یہی وہ حالت ہے جو اس ارشاد سے مراد لینا جائز ہے: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا یعنی گواہ انکار نہ کریں جب انہیں شہادت کے اثبات کے لئے بلایا جائے اور جب ان کی شہادت ثابت ہو جائے، پھر انہیں حاکم کے پاس شہادت ادا کرنے کے لئے بلایا جائے تو یہ وہ دعوت ہے جس کے سبب حاکم کے پاس ان دونوں کی حاضری ہوگی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے جیسا کہ حسن نے کہا ہے: آیت ندب کے اعتبار سے دو امور کو جمع کئے ہوئے ہے۔ پس مسلمانوں پر اپنے بھائیوں کی معاونت کرنا مستحب ہے۔ پس جب گواہوں کی کثرت کے سبب وسعت ہو اور حق معطل ہونے اور منہ سے محفوظ و مامون ہو تو یہ دعوت مستحب ہے اور جسے بلایا گیا ہے اس کے لئے معمولی عذر کے سبب پیچھے رہ جانا جائز ہے

اور اگر وہ بغیر عذر کے بھی پیچھے رہ جائے تو نہ اس پر گناہ ہے اور نہ اس کے لئے ثواب ہے۔

اور جب ضرورت ہو اور حق کے معطل ہونے کا تھوڑا سا بھی خوف ہو تو ندب قوی ہو جائے گا اور یہ وجوب کے قریب ہو جائے گا اور جب اسے یہ علم ہو کہ شاہد کے شہادت سے پیچھے ہو جانے کے سبب حق ضائع اور تلف ہو جائے گا تو پھر اس پر شہادت دینا واجب ہے، بالخصوص جب شہادت اسے حاصل ہو چکی ہو اور دعوت اسے ادا کرنے کے لئے ہو، کیونکہ یہ ظرف زیادہ پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ گردن میں قلادہ ہے اور امانت ادا کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے اس پر دلیل ظاہر ہوتی ہے کہ امام کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں کے لئے گواہوں کا انتظام کرے اور بیت المال سے ان کے لئے ان کی ضروریات پوری کرے اور ان کا لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے تحمل شہادت کے بغیر اور کوئی کام نہ ہو۔ اور اگر اس طرح نہ ہو تو حقوق ضائع اور باطل ہو جائیں گے سو معنی یہ ہوگا: گواہ انکار نہ کریں جب وہ لوگوں کے حقوق اخذ کریں کہ وہ انہیں ادا کریں گے۔ واللہ اعلم۔

اور اگر کہا جائے: یہ شہادت تو بالاجرت ہے، تو ہم کہیں گے: یہ خالصۃً ایسی قوم کی شہادت ہے جنہوں نے اپنے حقوق بیت المال سے پورے کئے اور یہ قاضیوں اور والیوں کی تنخواہوں اور ان جمیع مصالح کی طرح ہے جو مسلمانوں کے لئے معاون ہوتے ہیں۔ اور یہ (شہادت) بھی من جملہ انہی میں سے ہے، واللہ اعلم۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا پس ان کے لئے مقرر کر دیئے۔

مسئلہ نمبر 39۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد وہ ہے جو حاکم کے پاس چل کر جاتا ہے اور یہ ایسا امر ہے جس پر شریعت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے مطابق ہر زمانے میں عمل کیا گیا ہے اور ہر امت نے اسے سمجھا ہے۔ اور ان کی امثال میں سے یہ ہے: فِي بَيْتِهِ يُوقَى الْحَكَمَ (اس کے گھر میں حکم فیصلہ کرنے والا ثالث) کو لایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 40۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو غلام گواہوں کی جماعت سے خارج ہو گیا اور یہی مِنْ تِرْجَالِكُمْ کے عموم کو خاص کر رہا ہے، کیونکہ اس کے لئے اسے قبول کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے (شہادت کے لئے) آنا صحیح ہے، کیونکہ وہ بذات خود مستقل بالحکم نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ غیر کی اجازت سے تصرف کرتا ہے، نتیجتاً وہ منصب شہادت سے اسی طرح گر گیا جیسا کہ وہ ولایت کے مرتبہ سے گر گیا ہے۔ ہاں بلکہ! جیسا کہ وہ جمعہ، جہاد اور حج کے فرض کی ادائیگی سے گرا ہوا ہے (۱)۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 41۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ شہادت کی طرف بلانے کی حالت میں ہے۔ رہا وہ جس کے پاس کسی آدمی کے حق میں شہادت ہو اور اس کا وہ مستحق جو اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے وہ اسے نہ جانتا ہے، تو ایک قوم نے کہا ہے اس شہادت کو ادا کرنا مستحب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا اور بلانے کے وقت اللہ تعالیٰ

نے ادائے شہادت کو فرض قرار دیا ہے اور جب نہ بلایا جائے تو پھر شہادت دینا مستحب ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”گواہوں میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی شہادت دینے کے لئے آئے اس سے قبل کہ اس کے لئے کہا جائے“ اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ شہادت دینا فرض ہے اگرچہ اس کے بارے درخواست نہ کی جائے جبکہ حق کے ضائع یا فوت ہونے کا خوف ہو یا اس پر طلاق یا عتق کا خوف ہو جسے بیوی ہونے کے اعتبار سے اس سے استمتاع کرنے اور غلام سے خدمت لینے کا تصرف حاصل تھا وغیر ذالک۔ پس جس نے اس میں سے کوئی شی اخذ کر رکھی ہو تو اس شہادت کو ادا کرنا اس پر واجب ہوتا ہے اور وہ اس کی ادائیگی کو اس پر موقوف نہیں کرے گا کہ اسے شہادت کے لئے کہا جائے اور وہ اس طرح حق کو ضائع کر دے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **وَاقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ (الطلاق: 2)** (گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے دو) اور مزید فرمایا: **إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ⑤ (الزخرف)** (ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں ہے: انصرا خاٹ ظالما او مظلوما (تو اپنے بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو) تو اس پر اس کی مدد کرنا متعین ہو گیا اس شہادت کی ادائیگی کے ساتھ جو اس کے پاس ہو اس حق کو زندہ کرنے کے لئے جسے انکار مار دے (ضائع کر دے)۔

مسئلہ نمبر 42۔ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ وہ آدمی جس پر شہادت دینا واجب ہو ان وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر جو ہم نے ذکر کی ہیں اور وہ اسے ادا نہ کرے تو یہ شاہد اور شہادت میں عیب ہے اور اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ابن القاسم وغیرہ کا قول ہے۔ اور بعض نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر وہ شہادت حقوق العباد میں سے کسی حق کے بارے ہو تو وہ خالصہ اس نفس شہادت میں عیب ہوگا اور اس کے بعد اسے ادا کرنا اس کے لئے مناسب نہ ہو گا۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ شے جو اس کے عیب کو ثابت کر رہی ہے وہ اس کا اس امر کو ادا نہ کرنے کے سبب فاسق ہو جانا ہے جس امر کی ادائیگی بغیر عذر کے اس پر واجب تھی اور فسق مطلق شہادت کی اہلیت کو سلب کر لیتا ہے اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 43۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: **خَيْرُ الشَّهْدَاءِ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ أَنْ يُسَالَهَا** اور اس ارشاد کے درمیان جو حدیث عمران بن حصین میں ہے کوئی تعارض نہیں (وہ ارشاد یہ ہے) **إِنْ خَيْرُكُمْ قُرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُم ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ** (بے شک تم میں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں) پھر عمران نے کہا: میں نہیں جانتا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے بعد دوبار ذکر فرمایا یا تین بار..... پھر ان کے بعد قوم ہوگی جو شہادت دیں گے اور انہیں شاہد نہیں بنایا جائے گا وہ خیانت کریں گے اور انہیں امین نہیں بنایا جائے گا، وہ نذریں مانیں گے اور پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹا پا ظاہر ہو جائے گا (1)۔ ”دونوں کو صحیحین نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث تین وجوہ پر محمول ہے: ان میں سے ایک یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما يحذر من زهرة الدنيا، حدیث نمبر 5948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس سے مراد جھوٹا گواہ ہو کیونکہ وہ ایسی شے کے بارے گواہی دیتا ہے جس پر اسے شاہد نہ بنایا گیا ہو۔ یعنی ایسی شے کے بارے میں جسے نہ اس نے خود اخذ کیا ہو اور نہ ہی اس جانب اس کی توجہ کرائی گئی ہو۔

اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے باب الجابیہ پر خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں اسی طرح قیام فرماتے تھے جیسے میں تم میں کھڑا ہوں پھر آپ نے فرمایا: یا ایہا الناس اتقوا اللہ فی اصحابی ثم الذین یلونہم ثم الذین یفشو الکذب شہادۃ الزور (اے لوگو! میرے اصحاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر جھوٹ اور جھوٹی شہادت پھیل جائے گی) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ہو جسے حرص اور طمع اس شے کے نافذ کرنے پر برا بیگختہ کرے جس کے ساتھ وہ شہادت دے گا لہذا وہ درخواست سے قبل ہی شہادت دینے میں جلدی کرتا ہے۔ پس یہ شہادت مردود ہے کیونکہ یہ ایسی خواہش پر دلالت کرتی ہے جو شاہد پر غالب ہوتی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے جسے ابراہیم نخعی نے بیان کیا ہے جو کہ اس حدیث کے بعض طرق کے راوی ہیں: وہ ہمیں عہد اور شہادت سے منع کرتے تھے اور ہم ابھی بچے تھے۔

مسئلہ نمبر 44۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَسْمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلٍ۔ تَسْمُوا کا معنی ہے تسلسلہ اور تم اکتاؤ نہیں۔

خفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے سَمِئْتُ أَسْمًا سَامًا وَ سَامَةً وَ سَامًا [وَسَامَةً] دَسَامًا (اکتا جانا) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

سَمِئْتُ تَكَالِيفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَعْشُ ثَمَانِينَ حَوْلًا - لَا أَبَالِكَ - يَسَامِرُ

میں زندگی کی تکالیف سے اکتا گیا اور جو اسی برس تک زندہ رہا..... تیرا باپ نہ ہو وہ اکتا ہی جاتا ہے۔

أَنْ تَكْتُبُوهُ یہ فعل کے سبب محل نصب میں ہے صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا یہ دونوں تکتبہ کی ضمیر سے حال ہیں۔ اور صغیر کو اس کے خاص اہتمام کے سبب مقدم ذکر کیا گیا ہے اور یہ نہی اکتانے سے ہے۔ بلاشبہ یہ اس لئے وارد ہوئی ہے کیونکہ ان کے درمیان قرضوں کا لین دین کثرت سے تھا لہذا ان کے بارے میں یہ خوف ہونے لگا کہ وہ لکھنے سے اکتا جائیں (1) اور کوئی یہ کہنے لگے: قرضے کی یہ مقدار تو بالکل قلیل اور تھوڑی ہے مجھے اسے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے قلیل و کثیر میں لکھنے کی انکیخت دلا کر تاکید فرمائی۔ ہمارے علماء نے کہا ہے مگر وہ شے جو اپنی کمی اور اقرار و انکار میں نفس کے اس کی طرف جھکاؤ نہ ہونے میں وہ قیراط اور اسی کی طرح کی ہو (تو اس میں لکھنے کی ضرورت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 45۔ قولہ تعالیٰ: ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ۔ أَقْسَطُ بمعنی اعدل (یہ تحریر زیادہ عدل کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک) یعنی یہ کہ قلیل و کثیر مقدار کو لکھ لیا جائے اور اس پر گواہ بنائے جائیں۔ (2)

وَأَقْرَبُ لِلشَّهَادَةِ یعنی یہ شہادت کو صحیح کرنے والی اور اسے محفوظ بنانے والی ہے۔ وَأَذْنَى اس کا معنی ہے اقرب۔ زیادہ قریب ہے۔ اور تَرْتَابُوتُمْ شک کرو۔ (یعنی یہ تحریر تمہیں شک سے بچانے کا بہت آسان اور قریب ترین طریقہ ہے۔)

مسئلہ نمبر 46۔ قولہ تعالیٰ: وَأَقْرَبُ لِلشَّهَادَةِ یہ اس پر دلیل ہے کہ شاہد جب کتاب دیکھے اور اسے شہادت یاد نہ ہو تو وہ اسے ادا نہیں کرے گا کیونکہ اس پر اس میں شک داخل ہو چکا ہے اور وہ شہادت نہیں دے سکتا مگر اسی شے کی جسے وہ جانتا ہو، لیکن وہ یہ کہہ سکتا ہے: یہ میری تحریر ہے اور اب مجھے وہ یاد نہیں جو میں نے اس میں لکھا۔ (1)

ابن منذر نے کہا: اہل علم میں سے اکثر وہ جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں وہ اس سے منع کرتے ہیں کہ کوئی شاہد اپنے خط پر شہادت دے جب اسے شہادت یاد نہ ہو۔

اور امام مالک نے اس کے جواز پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے کتابت کی نسبت عدالت کی طرف کی ہے تو اس میں اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے کہ وہ اپنے خط پر شہادت دے اگرچہ اسے یاد نہ بھی ہو۔

ابن مبارک نے معمر عن ابن طاؤس عن ابیہ کی سند سے ایک آدمی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ شہادت پر شہادت دیتا ہے اور پھر اسے بھول جاتا ہے۔ فرمایا: کوئی حرج نہیں کہ وہ شہادت دے، بشرطیکہ وہ تحریری معاہدہ میں اپنی علامت یا اپنے ہاتھ کی تحریر کو پالے۔ ابن مبارک نے کہا: میں نے یہ بہت اچھا سمجھا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی اخبار و روایات مروی ہیں کہ آپ نے کئی اشیاء میں دلائل و شواہد کے ساتھ فیصلہ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے رسل عظام علیہم السلام سے بھی ایسی روایات ہیں جو اس مذہب کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس کے بارے میں مزید بیان سورہ الاحقاف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 47۔ قولہ تعالیٰ: إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُهَا بَيْنَكُمْ اس میں اَنْ استثنا ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے یہ اول کلام سے نہیں ہے (2)۔ انخفش (ابوسعید) نے کہا ہے: اِیْ اَنْ تَقْعَ تِجَارَةٌ (مگر یہ کہ تجارت واقع ہو)۔ پس کان بمعنی وقع اور حدث کے ہے۔ اور ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: وَتُدِيرُهَا بِخَبْرٍ ہے۔ اور اکیلے عاصم نے کان کی خبر ہونے کی بنا پر تجارت پڑھا ہے (3) اور اس کا اسم اس میں مخفی ضمیر ہے اور حَاضِرَةٌ یہ تجارت کی صفت ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے اِنْ تَكُونَ التِّجَارَةُ حَاضِرَةً۔ یا اِنْ تَكُونَ التِّجَارَةُ حَاضِرَةً (مگر یہ کہ سودا دست بدستی ہو) مکی اور ابوعلی فارسی نے اسے اسی طرح مقدر کیا ہے اس کی نظر اور اس پر استشہاد پہلے گزر چکا ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے ان پر لکھنے کی مشقت کو ملاحظہ فرمایا تو اس کے ترک پر نص بیان فرمائی اور ہر اس بیع میں حرج کو اٹھا دیا جو نقد و نقد ہو اور اغلباً یہی بیع ہوتی ہے جبکہ وہ قلیل شے میں ہو مثلاً کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ نہ کہ کثیر میں جیسا کہ املاک وغیرہ (یعنی املاک کی خرید و فروخت میں چونکہ عوض کثیر ہوتا ہے اس لئے اسے لکھنا لازم ہے۔) سدی اور ضحاک نے کہا ہے:

1۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر لبنان 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 3۔ ایضاً

یہ (رخصت) اس سودے میں ہے جو دست بدستی ہو۔ (1)

مسئلہ نمبر 48۔ قولہ تعالیٰ: تَدِيرُوهَا بَيْنَكُمْ یہ ارشاد باہم قبضہ کرنے اور مقبوض کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ جب گھر، زمین اور حیوانوں میں سے کثیر جدائی اور علیحدگی کو قبول نہیں کرتے اور نہ انہیں چھوڑا جاسکتا ہے تو ان کے سودے میں لکھ لینا اچھا ہے اور اس میں قرضے کا لین دین ملحق ہو جائے گا (2) تو گویا تحریر اس کے لئے اعتماد اور مضبوطی کا باعث ہوگی جبکہ یہ قریب ہے کہ احوال بدلنے اور دلوں کی کیفیت میں تغیر آنے سے نزاع وہاں طاری ہو جائے۔ پس جب وہ معاملہ میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گے اور دونوں اپنے اپنے عوض پر قابض ہوں گے اور دونوں میں سے ہر ایک اس شے کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہوگا جو اس نے اپنے ساتھی سے خریدی ہے تو عرفاً و عادتاً تنازع کا خوف کم ہوگا مگر مخفی اور پوشیدہ اسباب کے ساتھ شریعت نے نقد اور ادھار دونوں حالتوں میں ان مصالح پر آگاہ کیا ہے (3) اور جس پر غائب ہوا جاسکتا ہے اور جس پر غائب نہیں ہوا جاسکتا، تحریر، شہادت اور رہن کے ساتھ۔

امام شافعی نے کہا ہے: بیوع تین ہیں: ایک وہ بیع جو کتابت اور گواہوں کے ساتھ ہو اور دوسری وہ بیع جو رہن کے عوض ہو اور تیسری وہ بیع جو امانت کے ساتھ ہو اور پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نقد کے عوض بیع کرتے تھے تو گواہ بنا لیتے تھے اور جب ادھار کوئی شے بیچتے تھے تو اسے لکھ لیتے تھے۔ (4)

مسئلہ نمبر 49۔ قولہ تعالیٰ: وَ أَشْهَدُ ذَا عِلْمٍ طبری نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور تم گواہ بنا لیا کرو چھوٹے سودے پر بھی اور بڑے سودے پر بھی (5)۔ اور لوگوں نے اس کے واجب ہونے یا مستحب ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے (6)، پس حضرات ابو موسیٰ اشعری، ابن عمر، ضحاک، سعید بن مسیب، جابر بن زید، مجاہد، داؤد بن علی اور ان کے بیٹے ابو بکر بن عبد اللہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: بیع کے وقت گواہ بنانا واجب ہے (7)۔ اور اس بارے میں ان میں سے زیادہ شدت حضرت عطاء نے کی ہے انہوں نے کہا ہے: تو گواہ بنا لے جب تو کوئی شے فروخت کرے اور جب تو کوئی شے خریدے درہم کے عوض یا نصف درہم کے عوض یا چوتھائی درہم کے عوض یا اس سے بھی کم کے عوض، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ أَشْهَدُ ذَا إِذَا تَبَايَعْتُمْ (اور گواہ ضرور بنالیا کرو جب خرید و فروخت کرو)

اور ابراہیم نے کہا ہے: گواہ بنا لے جب کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے اگرچہ وہ سبزی کی گانٹھ ہی ہو۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے ان میں سے علامہ طبری بھی ہیں اور انہوں نے کہا ہے: کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے جب وہ کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے مگر یہ کہ اس پر گواہ بنالیا جائے، ورنہ وہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً

3۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر بیروت 4۔ ایضاً

5۔ جامع البیان، صفحہ 158، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربیہ 6۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان 7۔ ایضاً

کتاب اللہ کی مخالفت کرنے والا ہوگا اور اسی طرح اگر وہ مقررہ مدت تک ادھار ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ لکھوا لے اور گواہ بنا لے اگر وہ کوئی کاتب پا لے۔

اور علامہ شعبی اور حسن نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اس امر کا اطلاق معنی ندب (1) اور ارشاد پر ہے وجوب پر نہیں ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہی قول امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ کا ہے۔ اور ابن عربی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تمام کا قول ہے، فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔ اور ضحاک کے سوا کسی سے بھی یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ وجوب کے لئے ہے۔ فرمایا تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کی اور اسے تحریر کیا۔ فرمایا: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کا نسخہ یہ ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ هَذَا مَا اشْتَرَى الْعَدَاءُ بْنُ خَالِدِ بْنِ هُوْذَةَ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، اشترى منه عبداً - اوامۃ - لاداء ولا غائلة ولا خبثۃ بیع المسلم المسلم (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یہ وہ ہے جسے عداء بن خالد بن ہوذہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خریدا ہے، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلام یا کنیز خریدی۔ اس میں کوئی بیماری نہیں، کوئی شر اور فساد نہیں، اور کوئی پلیدی اور نجاست نہیں اور یہ مسلمان کی بیع مسلمان کے ساتھ ہے۔) تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کی اور کسی کو گواہ نہیں بنایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خریدا اور اپنی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھی اور آپ نے کوئی گواہ نہیں بنایا۔ اگر گواہ بنانا امر واجب ہوتا تو جھگڑے کے خوف کی وجہ سے رہن کے ساتھ بھی واجب ہوتا۔ (2)

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے ضحاک رحمہ اللہ کے سوا دوسروں سے وجوب ذکر کیا ہے۔ اور عداء کی اس حدیث کو دارقطنی اور ابوداؤد رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد اسلام قبول کیا۔ اور وہ کہتے ہیں ہم نے حنین کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ لڑی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں غلبہ نہیں دیا اور نہ ہماری مدد کی، پھر وہ اسلام لائے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا کیا۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے راوی کی اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے: ”اصمعی نے کہا ہے: میں نے سعید بن ابی عروبہ سے غائلہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اس سے مراد بھاگ جانا، چوری کرنا اور زنا کرنا ہے اور میں نے ان سے الخبثۃ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: مسلمانوں کے عہد میں رہنے والوں کی خرید و فروخت کرنا (یعنی جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدہ کے تحت رہ رہا ہو)۔

اور امام ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: اس میں وجوب تو باعث قلق واضطراب ہے اور رہا دقائق میں تو وہ بہت مشکل اور شاق ہے اور جو کچھ اکثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایک تاجر گواہ بنانے کو ترک کر کے دوستی کا ارادہ اور قصد کرتا ہے اور کبھی بعض شہروں میں اس کی عادت اور رواج ہوتا ہے (کہ گواہ نہیں بنایا جاتا) اور کبھی وہ عالم اور باعزت بڑے آدمی سے حیا محسوس کرتا ہے لہذا اس پر گواہ نہیں بنایا جاتا، پس یہ سب انتہان (امین بنانا) میں داخل ہیں اور امر بالا شہاد مستحب باقی رہ جاتا ہے، کیونکہ اس میں اغلباً مصلحت ہوتی ہے جب اس سے مانع کوئی عذر موجود نہ ہو جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت۔ ابن ماجہ کتاب التجارات حدیث 2241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہدوی، نحاس اور مکی نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: **وَ أَشْهَدُ** وَإِذَا تَبَايَعْتُمْ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے **فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا** (1) اور نحاس نے اسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور یہ کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَعْتُمْ بَدِّينَ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوا** وَلِيَكْتُبَ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلِيُمِلَّ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلِيَتَّقِيَ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمِلَّ فَوَقْلِي مُمِلٌّ وَلِيَهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْمُوا أَنْ تَكْتُبُوا صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ⑤ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنِ مَقْبُوضَةً فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي أُؤْتِيَ أَمَانَتَهُ اور کہا اس آیت نے اپنے ماقبل کو منسوخ کر دیا ہے۔ (2)

نحاس نے کہا ہے: یہ حسن، حکم اور عبدالرحمن بن زید کا قول ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ حکم پہلے کا مغائر اور اس کے سوا ہے۔ اور بلاشبہ یہ حکم اس کے بارے ہے جو لکھنے والا کاتب نہ پائے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنِ مَقْبُوضَةً** فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا یعنی پھر وہ اس سے رہن کا مطالبہ نہ کرے **فَلْيُؤَدِّ الَّذِي أُؤْتِيَ أَمَانَتَهُ** (البقرہ: 283) (اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کر لے کوئی تم میں سے دوسرے پر پس پائے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اپنی امانت کو۔) فرمایا: اگر اس کا پہلے کے لئے ناخ ہونا جائز ہے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: **وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَلَا يَ (النساء: 43)** (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے.....) یہ اس ارشاد کے لئے ناخ ہو: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ الْآيَةِ (المائدہ: 6)** (اے ایمان والو! جب تم نماز کا ارادہ کرو۔) اور پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: **فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (پس جو) غلام کو) نہ پائے تو وہ دو ماہ لگا تار روزے رکھے۔** (اس ارشاد کے لئے ناخ ہو: فتحیر رقبۃ مومنة (پس ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔)

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: **فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا** کا ابتدائے آیت سے جو کہ امر بالاشہاد پر مشتمل ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دارالکتب العلمیہ بیروت

2۔ جامع البیان، صفحہ 141، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربیہ۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 2355، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نزول میں متاخر ہونا واضح اور ظاہر نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں ایک ساتھ نازل ہوئے۔ اور ایک حالت میں اکٹھے نازل ہونے والے دو حکموں کو نسخ و منسوخ قرار دینا جائز نہیں ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ان سے کہا گیا آیۃ الدین منسوخ ہے تو آپ نے فرمایا: نہیں قسم بخدا! آیۃ الدین محکم ہے اس میں کوئی نسخ وغیرہ نہیں۔ فرمایا: اشہاد یعنی گواہ بنا لینے کا حکم طمانینت کے لئے فرمایا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی توثیق اور پختگی کے لئے کئی طرق اور ذرائع بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک لکھوانا ہے، ایک رہن رکھنا ہے اور ایک گواہ بنالینا ہے۔ اور علمائے امصار کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ رہن بطریق ندب مشروع ہے نہ کہ بطریق وجوب۔ پس گواہ بنانے میں بھی حکم اسی کی مثل سمجھا جائے گا اور لوگ ہمیشہ سفر و حضر، بروجر اور صحراء و پہاڑ میں بغیر گواہ بنائے خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں باوجود اس کے کہ لوگ اسے جانتے ہیں لیکن کوئی انکار نہیں کرتا تو اگر گواہ بنانا واجب ہوتا تو وہ اس واجب کو ترک کرنے والے پر اعتراض کرنا قطعاً ترک نہ کرتے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام خوبصورت استدلال ہے اور اس سے حسین تر وہ ہے جو ترک اشہاد کے بارے میں صریح سنت میں وارد ہے اور وہ وہ روایت ہے جسے دارقطنی نے طارق بن عبد اللہ محاربی سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: ”ہم ربذہ اور جنوب ربذہ سے ایک قافلہ کی صورت میں آئے اور مدینہ طیبہ کے قریب آکر ہم نے پڑاؤ ڈالا اور ہمارے ساتھ ہماری ایک عورت پاکلی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پس اس اثنا میں کہ ہم وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ہمارے پاس ایک آدمی آیا اس پر دوسفید کپڑے تھے اور اس نے سلام کیا اور ہم نے بھی اس پر سلام کا جواب لوٹا یا تو اس نے پوچھا: یہ قافلہ کہاں سے آیا ہے؟ تو ہم نے کہا: ربذہ سے اور ربذہ کے جنوب سے۔ راوی کہتے ہیں: اور ہمارے ساتھ ایک سرخ اونٹ تھا تو اس نے پوچھا کیا تم مجھے اپنا یہ اونٹ بیچتے ہو؟ تو ہم نے کہا: ہاں۔ انہوں نے پوچھا: کتنے کے عوض؟ ہم نے کہا: کھجور کے اتنے اتنے صاع کے عوض۔ اس نے کہا: ہم اس میں سے کوئی شے کم نہیں کرائیں گے (یعنی پورا پورا ادا کریں گے) اور کہا: میں اسے پکڑ لوں، پھر اس نے اونٹ کو سر سے پکڑا یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ میں داخل ہو گیا اور ہم سے اوجھل ہو گیا اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور ہم نے کہا: تم نے اپنا اونٹ ایسے آدمی کو دے دیا ہے جسے تم پہچانتے ہی نہیں! تو اس پاکلی میں بیٹھی ہوئی عورت نے کہا: تم ایک دوسرے کو ملامت نہ کرو میں نے اس آدمی کا چہرہ دیکھ لیا ہے وہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرے، میں نے کسی آدمی کا چہرہ اس کے چہرہ سے بڑھ کر چودھویں رات کے چاند سے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا۔ تو جب شام ہوئی تو ہمارے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں حکم فرمایا ہے کہ تم اس سے کھاؤ یہاں تک کہ تم خوب سیر ہو جاؤ اور تم اپنا کیل کر لو یہاں تک کہ تم اپنا حق پورا کر لو۔ اس نے بیان کیا: پس ہم نے کھایا یہاں تک کہ ہم سیر ہو گئے۔ اور ہم نے کیل کیا یہاں تک کہ ہم نے اپنا حق پورا کر لیا۔ (1)

اور زہری نے عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ ان کے چچا نے انہیں بتایا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس اعرابی نے

کہنا شروع کر دیا: گواہ لاؤ جو یہ شہادت دے کہ میں نے تمہیں (گھوڑا) فروخت کیا ہے..... تو حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ تو نے (گھوڑا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچا ہے۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ”تو کیونکر شہادت دیتا ہے؟“ تو انہوں نے عرض کی: آپ کی تصدیق کرنے کے ساتھ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ راوی کہتے ہیں: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا۔ فجعل رسول اللہ ﷺ شہادۃ خزیمۃ بشہادۃ رجلین اسے نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 50۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يُضَآئِرُ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ اس میں تین اقوال ہیں۔

(1) کاتب نہ لکھے جب تک اسے لکھوایا نہ جائے اور شاہد اپنی شہادت میں کوئی کمی و بیشی نہ کرے۔ حسن، قتادہ، طاؤس اور ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور عطاء بن ینس سے مروی ہے کہ معنی یہ ہے کہ کاتب لکھنے سے اور شاہد شہادت دینے سے انکار نہ کرے (2)۔ ان دونوں قولوں کی بنا پر وَلَا يُضَآئِرُ اصل میں يُضَارُّ رَا کے کسرہ کے ساتھ ہے، پھر ادغام ہوا اور حالت جزمی میں فتح کے خفیف ہونے کی وجہ سے راکو فتح دے دیا گیا (3)۔ نحاس نے کہا ہے: میں نے ابواسحاق کو اس قول کی طرف مائل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ فرمایا: کیونکہ اس کے بعد وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فَسُوقٌ بِكُمْ ہے۔ پس اس طرح ہونا اولیٰ ہے کہ جس نے بغیر حق کے شہادت دی یا لکھنے میں کوئی تغیر و تبدل کیا اسے فاسق کہا جائے اور یہ اس کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اولیٰ ہے کہ آدمی شاہد کو شہادت دینے کے لئے کہے اور وہ مشغول ہو۔ (یعنی شہادت کے لئے فارغ نہ ہو تو اسے فاسق کہا جائے۔) حضرت عمر بن خطاب، ابن عباس اور ابن ابی اسحاق رضی اللہ عنہم نے يُضَارُّ پہلی راکو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حضرت مجاہد، ضحاک، طاؤس اور سدی رحمہم نے کہا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے کہ آیت وَلَا يُضَآئِرُ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ کا معنی یہ ہے کہ شاہد کو شہادت کی طرف اور کاتب کو کتابت کی طرف بلایا جائے اور وہ دونوں مشغول ہوں (4)۔ اور جب وہ دونوں اپنے عذر پیش کر دیں تو وہ ان دونوں کو نکالے اور انہیں اذیت پہنچائے اور ستائے اور کہے: تم دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور اسی طرح کی باتیں ان سے کرے اور انہیں ضرر پہنچائے۔ اس قول کی بنا پر يُضَارُّ کی اصل يُضَارُّ ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے يُضَارُّ پہلی راکو فتح کے ساتھ پڑھا ہے (5)۔ سوال اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ اگر وہ اسے مطلق قرار دیتا تو پھر اس میں ان دونوں کے لئے اپنے دین اور اپنی معاش کے امر سے شغل اور مصروفیت ہے اور لفظ المضارۃ چونکہ دو سے متعلق ہے یہ ان معانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقصی، حدیث نمبر 3130، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن نسائی، کتاب بیوع، صفحہ 228، جلد 2، وزارت تعلیم، اسلام آباد

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت

4۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، صفحہ 145، حدیث نمبر 186، جلد 3، مطبوعہ دار الحسن قاہرہ

5۔ المحرر الوجیز، صفحہ 385، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان

کاتب اور شہید پہلے دونوں قولوں کی بنا پر اپنے فعل کے سبب مرفوع ہیں اور تیسرے قول کی بنا پر نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔

مسئلہ نمبر 51۔ قولہ تعالیٰ: **وَإِنْ تَفْعَلُوا** یعنی اگر تم ستانے کا عمل کرو گے۔ **فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ** تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی، یہ سفیان ثوری سے مروی ہے۔ پس کاتب اور شاہد زیادتی یا کمی کے ساتھ نافرمانی کرتے ہیں اور یہ وہ جھوٹ ہے جو اموال و ابدان میں اذیت پہنچانے والا ہے اور اس میں حق کو باطل کرنا لازم آتا ہے اور اسی طرح ان دونوں کا ستانا اور اذیت دینا یہ بھی ہے کہ جب وہ دونوں نافرمانی میں مشغول ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرنے کے اعتبار سے راہ صواب سے نکل جائیں اور قولہ بکم میں تقدیر عبارت یہ ہے: فسوق حال بکم۔

مسئلہ نمبر 52۔ قولہ تعالیٰ: **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ** یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرا وہ اسے سکھا دے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے دل میں نور پیدا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ سمجھ جائے گا جو اس کی طرف القا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ابتداء فرقان رکھ دے گا یعنی ایسی قوت عطا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکے گا۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا** (الانفال: 29) (اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو وہ پیدا کر دے گا تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت۔) واللہ اعلم۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ مَقْبُوضَةً فَإِنْ أَصَابَكُمْ بَعْضُ
فَلْيُؤَدِّ الَّذِي أُؤْتِيَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ
يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (۳۳)

”اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کر لے کوئی تم میں سے دوسرے پر، پس چاہیے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا ہے اپنی امانت کو اور ضروری ہے کہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اس کا رب ہے۔ اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص چھپاتا ہے اسے تو یقیناً گنہگار ہے اس کا ضمیر۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۔“

اس میں چوبیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے اموال و دیون کی حفاظت کی مصلحت کے لئے لکھوانے اور گواہ بنالینے کے مستحب ہونے کا ذکر فرمایا، تو اس کے بعد ایسے عذروں کا تذکرہ کیا جو لکھوانے سے مانع ہیں اور ان کی صورت میں رہن (گروی رکھنا) کا حکم بیان فرمایا اور عذر کے احوال میں سے سفر پر نص بیان فرمائی جو سفر تمام عذروں پر غالب ہے، بالخصوص اس وقت میں کثرت غزوات کی وجہ سے اور معنوی طور پر اس میں ہر عذر داخل ہے۔ بسا اوقات سفر کے بغیر حضر میں بھی کاتب کا ملنا معذور اور مشکل ہو جاتا ہے جیسا کہ لوگوں کی مشغولیت کے اوقات اور رات کا وقت اور یہ بھی کہ مقروض کی ذمہ داری کے فساد کا خوف

ہو تو یہ بھی ایک ایسا عذر ہے جو رہن کے مطالبہ کو ثابت کرتا ہے۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی جس سے آپ نے جو ادھار لینے کا مطالبہ کیا، تو اس نے کہا: بلاشبہ محمد (ﷺ) میرا مال لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”اس نے جھوٹ بولا ہے بلاشبہ میں زمین میں بھی امین ہوں اور آسمان میں بھی امین ہوں اگر وہ مجھ پر اعتبار کرتا تو میں یقیناً اسے ادا کر دیتا تم میری زرہ اس کے پاس لے جاؤ (1)۔“ پس آپ ﷺ کا وصال ہوا در آنحالیکہ آپ کی زرہ اس کے پاس گروی پڑی ہوئی تھی۔ ابھی اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور علماء نے کہا ہے: سفر میں گروی رکھنا نص قرآن سے ثابت ہے اور حضر میں گروی رکھنا سنت رسول ﷺ سے ثابت ہے اور یہ صحیح ہے اور ہم نے حضر میں آیت سے معنوی طور پر اس کے جائز ہونے کو بیان کیا ہے، کیونکہ کبھی اعذار حضر میں بھی مترتب ہوتے ہیں اور سوائے حضرت مجاہد، ضحاک اور داؤد کے کسی سے بھی حضر میں اس کا ممنوع ہونا مروی نہیں ہے، اس حال میں کہ وہ آیت سے استدلال کرتے ہیں اور آیت میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ یہ کلام اگرچہ شرط کے مخرج میں نکلا ہے سو اس سے مراد غالب احوال ہیں۔ اور آیت میں حالت سفر میں رہن کا ہونا ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو حالت سفر کے بغیر ممنوع ہوتی ہیں۔ صحیحین وغیرہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مذکور ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ایک یہودی سے ایک معین مدت تک اناج خریدا اور اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی (2)۔ اسے نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا اور آپ کی زرہ یہودی کے پاس گھر والوں کے لئے تیس صاع جو کے عوض گروی پڑی ہوئی تھی (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا جَهْرًا بِمَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابی، حضرت مجاہد، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت ابو العالیہ رضی اللہ عنہم نے وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا پڑھا ہے (4)۔ ابو بکر انباری نے کہا ہے: حضرت مجاہد نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور فرمایا ہے: اس کا معنی ہے پس اگر تم دوران سفر سیاہی نہ پاؤ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کُتَّابٌ بھی مروی ہے (5)۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت شاذ ہے اور قراءت عامہ اس کے خلاف ہے۔ اور بہت کم ہی کوئی شے قراءت عامہ سے خارج ہوتی ہے مگر اس میں طعن ہوتا ہے اور کلام تو کاتب کے بارے چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف کے ساتھ لکھے) اور کُتَّابٌ پوری جماعت کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: کتاب اس اعتبار سے حسین ہے کہ ہر مصیبت کے لئے ایک کاتب ہو، پس یہ جمع کے لئے کہا گیا ہے: وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا۔ (اور تم لکھنے والے نہ پاؤ) مہدوی نے ابو العالیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کُتَّابٌ پڑھا ہے اور یہ کتاب کی جمع ہے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً سنن ترمذی، حدیث نمبر 1134، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ روایت بالمعنی

2۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 31، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب البیوع، صفحہ 1926، جلد 1، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 229 4۔ الکشاف، جلد 1، مکتب الاعلام الاسلامی 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386

حیثیت سے کہ نوازل (مصائب) مختلف ہیں۔ اور رہی حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت کُثَّابًا تو نحاس اور مکی نے کہا ہے: یہ کاتب کی جمع ہے جیسے قائم و قیام ہے۔ مکی نے کہا ہے معنی یہ ہے: ”اور اگر دوات، قلم اور قرطاس موجود نہ ہوں اور لکھنے والے کے وجود کی نفی اس آلہ کے معدوم ہونے کے ساتھ ہوتی ہے جو متفق علیہ ہے اور کاتب کی نفی بھی کتاب کی نفی کا تقاضا کرتی ہے، پس دونوں قراءتیں حسین اور اچھی ہیں مگر مصحف کے خط کی جہت سے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **فَرِهْنُ مَقْبُوضَةٌ** ابو عمرو اور ابن کثیر نے **فَرِهْنُ** را اور **ہا** کے ساتھ پڑھا ہے اور ان دونوں سے **ہا** کی تخفیف بھی مروی ہے اور طبری نے کہا ہے: ایک قوم نے یہ تاویل کی ہے کہ **رُهْنُ** را اور **ہا** کے ضمہ کے ساتھ **رہان** کی جمع ہے۔ اور وہ جمع الجمع ہے، اسے **زجاج** نے **فراء** سے بیان کیا ہے (2) اور مہدوی نے کہا ہے: **فَرِهَانُ** مبتدا ہے اور **خبر** محذوف ہے اور معنی ہے **فرہان مقبوضۃ یکفی من ذالک** (تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس پر قبضہ دے دیا کرو اس میں یہ کافی ہو جائے گا) نحاس نے کہا ہے: **عاصم بن ابی النجود** نے **فَرِهْنُ** **ہا** کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ اہل مکہ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں **باب رِہَانُ** ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: **بغل و بغال، (خجر) کبش و کباش (مینڈھا) اور رُهْنُ** اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ **رہان** کی جمع ہو، مثلاً کتاب اور کُتُب ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ **رُهْنُ** کی جمع ہے، جیسا کہ **سُقْفُ** اور **سُقُفُ**، **حُلُقُ** اور **حُلُقُ**، **فُرُشُ** اور **فُرُشُ**، **نَشْرُ** اور **نَشْرُ** اور ان کے مشابہ دیگر الفاظ۔ اور **رُهْنُ** **ہا** کے سکون کے ساتھ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ **رُهْنُ** کی جمع ہے۔ مثلاً **سَهْمُ حَشَمٍ** یعنی باریک اور تیز تر۔ اور **سِهَامُ حَشَمٍ** اور پہلا زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ پہلا نعت (صفت) نہیں ہے اور یہ صفت ہے۔

اور ابوعلی فارسی نے کہا ہے اور **رُهْنُ** کی جمع **مکسر جمع قلت** کے وزن پر میں نہیں جانتا کہ آئی ہو۔ اور اگر آئے تو اس کا قیاس **أَفْعُلُ** ہے جیسے **کَلْبُ** اور **اَکَلْبُ** ہے۔ گویا کہ وہ قلیل کے سبب کثیر سے مستغنی ہیں، جیسا کہ جمع کثرت کے وزن کے ساتھ جمع قلت کے وزن سے اس قول میں مستغنی ہیں: **ثَلَاثَةُ شُؤْعٍ** اور وہ **رَسَنُ** اور **أَرْسَانُ** میں جمع قلت کے وزن کے ساتھ جمع کثرت سے مستغنی ہیں۔ پس **رُهْنُ** دونوں وزنوں پر جمع بنائی جاتی ہے اور وہ دونوں **فُعْلُ** اور **فِعَالُ** ہیں۔ **أَخْفَشُ** نے کہا ہے: **فُعْلُ** کی جمع **فُعْلُ** کے وزن پر قبیح ہے اور یہ قلیل اور شاذ ہے۔ فرمایا: اور کبھی **رِہَانُ** کی جمع **رُهْنُ** آئی ہے، گویا کہ **رُهْنُ** کی جمع **رِہَانُ** بنائی جاتی ہے اور **رِہَانُ** کی جمع **رُهْنُ** بنائی جاتی ہے جیسا کہ **فَرِاشُ** اور **فُرُشُ** ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ **رُهْنُ** کا معنی ہے کسی حق کے عوض توثیق اور اعتماد کے لئے کسی خاص چیز کو روک لینا تاکہ اس کے ثمن سے یا اس کے منافع کے ثمن سے وہ حق پورا کر لیا جائے جبکہ اسے مقروض سے لینا معذرا اور مشکل ہو، اسی طرح علماء نے اس کی تعریف بیان کی ہے اور یہ عرب کلام میں بمعنی دوام اور استمرار ہے۔ ابن سیدہ نے کہا ہے: **ورہنہ** ای **أدامہ** یعنی اس نے اسے ہمیشہ رکھا۔ اور یہ **رہن** بمعنی **دام** سے ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

الْخُبْزُ وَاللَّحْمُ لَهْمٌ رَاهِنٌ وَقَهْوَةٌ رَاوِدَقُهَا سَاكِبٌ (1)

اس میں راہن ہمیشہ رہنے والا کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: رَهْنُ الشَّيْءِ رَهْنًا۔ ای دامن۔ یعنی شے ہمیشہ رہی اور اَرْهَنْتُ لَہم الطعام و الشراب اور میں نے ان کے لئے طعام و شراب ہمیشہ رکھا، وہو طعام راہن اور الراہن کا معنی الثابت (یعنی ثابت رہنے والا، ہمیشہ رہنے والا) اور الراہن کا معنی ہے اونٹوں اور لوگوں میں سے کمزور ہونے والا۔

شاعر کا قول ہے:

أَمَّا تَرَى جِسْمِي خَلًّا قَدْ رَهَنَ هَؤُلَاءِ وَمَا مَجْدُ الرِّجَالِ فِي السِّنَنِ
اس میں رہن کمزور کے معنی میں مستعمل ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: وہ رہن جو کہ وثیقہ اور اعتماد کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے وہ الرهن سے ہے۔ اَرْهَنْتُ اَرهانا (میں نے شے گروی رکھی) اسے ان میں سے بعض نے بیان کیا ہے۔

اور ابوعلی نے کہا ہے: اَرْهَنْتُ فِي الْمُغَالَاةِ (میں نے مہنگائی میں اضافہ کر دیا) اور رہی قرض اور بیع کی صورت تو اس میں ہے فرہنت۔ (2) (پس میں نے قرض اور بیع کے عوض شے گروی رکھی۔)

اور ابو زید نے کہا ہے: اَرْهَنْتُ فِي السَّلْعَةِ اَرهانا (میں نے سامان کی قیمت خوب چڑھا دی) اور یہ مہنگائی کے معنی میں خاص ہے۔

کسی شاعر کا قول ہے:

عِيدِيَّةٌ اَرْهَنْتُ فِيهَا الدَّنَانِيْدُ
عید یہ میں دنانیر بڑھا دیئے گئے ہیں۔

شاعر اونٹنی کا وصف بیان کر رہا ہے اور العید مہرہ کا ایک قبیلہ ہے اور مہرہ کے اونٹ بڑے عمدہ اور اعلیٰ نسل کے ہوتے ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: گروی رکھنے کے معنی میں کہا جاتا ہے: رَهْنْتُ اور اَرْهَنْتُ (میں نے گروی رکھی)

ابن اعرابی اور اخفش نے یہی کہا ہے۔ عبد اللہ بن ہمام السلولی نے کہا ہے:

فَلَمَّا خَشِيتُ أَظْفَارِيَهُمْ نَجَوْتُ وَأَرْهَنْتُهُمْ مَالِكًا (3)
اس میں اَرْهَنْتُهُمْ گروی رکھنے کے معنی میں ہے۔

ثعلب نے کہا ہے: تمام رواۃ نے اَرْهَنْتُهُمْ کہا ہے اس بنا پر کہ رَهْنْتُ اور اَرْهَنْتُهُ دونوں جائز ہیں سوائے اصمعی کے کیونکہ انہوں نے اسے اَرْهَنْتُهُمْ روایت کیا ہے، اس بنا پر کہ انہوں نے فعل مضارع کا عطف فعل ماضی پر کیا ہے اور اسے ان

کے اس قول کے مشابہ قرار دیا ہے: قَسْتُ وَأَصْلُ وَجْهٍ اور یہ مذہب حسن اور اچھا ہے، کیونکہ یہ واوِ حالیہ ہے اور اَصْلُ کو پہلے فعل کے لئے حال بنایا گیا ہے اس معنی کی بنا پر قسّت صا کا وجہ، یعنی میں نے اسے چھوڑا اور آنحالیکہ وہ ان کے پاس مقیم تھا، کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا: أَرْهَنْتُ الشَّيْءَ، بلکہ یہ کہا جاتا ہے: رَهَنْتُهُ (میں نے شے گروی رکھی) اور آپ کہتے ہیں رَهْنٌ لِّسَانِي بِكَذَا، (میں نے اپنی زبان اتنے کے عوض گروی رکھ دی) اور اس میں یہ نہیں کہا جاسکتا، أَرْهَنْتُ، اور ابن السکیت نے کہا ہے: اس میں اَرَهَنْتُ بمعنی اَسْلَفْتُ ہے۔ (یعنی میں نے قرض دیا) اور مرهَنْ وہ ہوتا ہے جو گروی کے طور پر شے لیتا ہے اور وہ شے جو گروی رکھی جائے وہ مرهون اور رهن کہلاتی ہے اور اس کی مؤنث رهنۃ ہے اور رهنۃ فلان علی کذا مرهنة کا معنی ہے میں نے فلاں کو اتنے کی شرط پر خطرے میں ڈال دیا (ای خاطر تھ) اور اَرَهَنْتُ بہ ولدی ارهانا ای اخطر تھم بہ خطرا۔ یعنی میں نے اس کے عوض اپنی اولاد کو خطرے میں ڈال دیا۔ (یعنی شرط پر رکھ دیا) اور الرهنۃ الرهائن کی واحد ہے۔ یہ تمام جوہری سے منقول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: بیع اور قرض کے معاملہ میں بلا اختلاف کہا جائے گا: رهنۃ رهن۔ پھر اسی صدر سے اس شے کا نام رکھ دیا گیا ہے جو دی جاتی ہے۔ تو کہتا ہے: رهنۃ رهن، جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے رهنۃ ثوباً۔ (1)

مسئلہ نمبر 6۔ ابو علی نے کہا ہے جب رهن بمعنی ثبوت اور دوام ہے تو اسی وجہ سے فقہاء کے نزدیک رهن باطل ہو جاتی ہے جب وہ کسی وجہ سے مرتهن کے قبضے سے نکل کر رهن کے پاس چلی جائے، کیونکہ وہ اس سے نکل چکی ہے جو اختیار مرتهن کو اس کے بارے دیا گیا تھا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے نزدیک اس بارے میں یہی معتمد علیہ ہے کہ رهن جب رهن کی طرف مرتهن کے اختیار سے لوٹ جائے تو رهن باطل ہو جائے گی اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے مگر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ عاریۃ یا ودیعتہ (امانت کے طور پر) لوٹے تو پھر رهن باطل نہ ہوگی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کا رهن کے قبضہ کی طرف لوٹنا مطلق سابقہ حکم کو باطل نہیں کرتا اور ہماری دلیل فَرِهْنٌ مَّقْبُوضَةٌ ہے۔ پس جب مرهونہ شیء قابض کے ہاتھ سے نکل جائے تو یہ الفاظ نہ لغتہ اس پر صادق آتے ہیں اور نہ ہی حکماً اس پر صادق آتے ہیں اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ جب کوئی قولاً گروی رکھے اور فعلاً اس پر قبضہ نہ کرے تو وہ حکماً ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَرِهْنٌ مَّقْبُوضَةٌ

امام شافعی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے صرف اس رهن کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو موصوف بالقبض ہو اور جب صفت نہ پائی جائے تو پھر ضروری ہے کہ حکم بھی نہ پایا جائے (3) اور یہ بالکل عیاں اور ظاہر ہے۔

اور مالکیہ نے کہا ہے: رهن عقد کے ساتھ لازم ہو جاتی ہے اور رهن کو رهن دینے پر مجبور کیا جائے گا تا کہ مرتهن اسے خاص کر سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوْفُوا بِالْعُقُودِ (المائدہ: 1) (پورا کرو (اپنے) عہدوں کو) اور یہ بھی ایک عقد ہے اور مزید

ارشاد ہے: **أَوْفُوا بِالْعَهْدِ** (الاسراء: 34) (وعدہ پورا کرو) اور یہ بھی ایک عہد ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: المؤمنون عند شروطهم (1) (مؤمنین اپنی شروط کے ساتھ ہوتے ہیں) اور یہ بھی ایک شرط ہے۔ پس ہمارے نزدیک قبضہ کمال فائدہ کے لئے شرط ہے اور ان دونوں ائمہ کے نزدیک قبضہ اس کے صحیح ہونے اور لازم ہونے کے لئے شرط ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: **مَقْبُوضَةٌ** یہ لفظ مرہن کی رہن کے ساتھ بینونت اور علیحدگی کا تقاضا کرتا ہے اور لوگوں نے مرہن کے قبضہ کے صحیح ہونے پر اجماع کیا ہے اور اسی طرح اس کے وکیل کے قبضہ پر (بھی اجماع ہے) اور عادل آدمی کے قبضہ کے بارے اختلاف ہے جو رہن کو اس کے ہاتھوں پر رکھے گا۔ پس امام مالک، آپ کے تمام اصحاب اور جمہور علماء نے کہا ہے: عادل کا قبضہ کرنا قبضہ ہے اور ابن ابی لیلیٰ، قتادہ، حکم اور عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ قبضہ نہیں ہے اور رہن مقبوض نہیں ہوگی مگر تب جب وہ مرہن کے پاس ہو اور انہوں نے اسے تعبداً دیکھا ہے۔ اور جمہور کا قول معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، کیونکہ جب وہ عادل کے پاس ہو گیا تو وہ لغتاً اور حقیقتاً مقبوض ہو گیا، کیونکہ عادل آدمی صاحب حق کا نائب ہے اور وہ قائم مقام وکیل کے ہے اور یہ ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اور اگر رہن کو عادل آدمی کے قبضہ میں رکھ دیا جائے اور وہ ضائع ہو جائے تو نہ مرہن ضامن ہوگا اور نہ وہ جس کے قبضہ میں اسے رکھا گیا، کیونکہ مرہن کے قبضہ میں تو کوئی شے نہیں آئی جس کا وہ ضامن ہوگا اور جس کے قبضہ میں وہ شے دی گئی ہے وہ امین ہے اور امین ضامن نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **مَقْبُوضَةٌ** تو ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ لفظ اپنے ظاہر اور مطلق ہونے کے ساتھ تقاضا کرتا ہے کہ مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب رحمہ اللہ کے (2)۔ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی گھر کا تیسرا حصہ، اپنے غلام اور تلواریں کا نصف حصہ بطور رہن رکھے، پھر انہوں نے کہا ہے: جب دو آدمیوں کا ایک آدمی پر مال (قرض) ہو اور وہ دونوں اس میں شریک ہوں اور وہ آدمی اس کے عوض دونوں کے پاس زمین رہن رکھ دے تو وہ جائز ہے بشرطیکہ دونوں اس پر قبضہ کر لیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ مشترک شے کو رہن رکھنے کی اجازت ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نصف گھر کا مرہن ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے جیسا کہ اسے بیچنا جائز ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علماء کے نزدیک جو شے ذمہ میں ہو اس کو گلاوی رکھنا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مقبوض ہے بخلاف ان کے جنہوں نے اس سے منع کیا ہے اور اس کی مثال یہ ہے دو آدمی مل کر کاروبار کریں ان میں سے ایک کا دوسرے کے ذمہ قرض ہو۔ پس اس نے اپنا وہی قرض اس کے پاس رہن رکھ دیا جو اس کے ذمہ واجب الادا ہو۔ ابن خويز منداد نے کہا ہے: ہر وہ سامان جس کی بیع کرنا جائز ہے اس کو رہن رکھنا بھی جائز ہے اور اسی علت کی وجہ سے ہم نے اس شے کو رہن رکھنا جائز

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، حدیث 3120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 261

قرار دیا ہے جو مرتہن کے ذمہ واجب الادا ہو، کیونکہ اس کی بیع جائز ہے اور اس لئے بھی کہ وہ مال ہے اس کے ساتھ توثیق واقع ہو سکتی ہے تو پھر اس کا رہن ہونا بھی جائز ہے (تو گویا اسے) موجود سامان پر قیاس کیا گیا ہے۔

اور جنہوں نے اس سے منع کیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس پر قبضہ کرنا متحقق نہیں ہوتا اور رہن کے لازم ہونے میں قبضہ کرنا شرط ہے اور اس لئے بھی کہ قرض کی میعاد مکمل ہونے کے وقت اس سے حق پورا کرنا ضروری ہوتا ہے اور حق کا استیفا اس کی مالیت سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے عین سے اور دین میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”سواری پر اس کے نفقہ کے عوض سوار ہوا جاسکتا ہے جبکہ وہ رہن رکھی ہوئی ہو اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ اس کے نفقہ کے عوض پیا جاسکتا ہے جب مرہونہ ہو اور جو سوار ہوگا اور دودھ پئے گا اسی پر نفقہ ہوگا (1)۔“ اسے ابو داؤد نے بھی نقل کیا ہے اور دونوں جگہوں پریشاب کی بجائے یحلب (2) (دودھ دوہنا) کا لفظ ذکر کیا ہے۔

خطابی نے کہا ہے: یہ کلام مبہم ہے نفس لفظ میں اس کا بیان نہیں ہے جو سوار ہوگا اور دودھ دوہے گا کیا وہ رہن ہے یا مرتہن ہے یا وہ عادل آدمی ہے جس کے قبضہ میں مرہونہ شے دی گئی؟

میں (مفسر) کہتا ہوں: دودھ بیٹوں میں مبین مفسر ذکر آیا ہے اور انہیں کے سبب علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ”جب کوئی جانور گروی رکھا جائے تو اس کا چارہ مرتہن پر ہوگا اور وہ دودھ دوہ کر پی سکتا ہے اور اسی پر اس کا نفقہ ہوگا جو دودھ پئے گا (3)۔“

آپ نے اسے احمد بن علی حدثنایا بن ایوب حدثنایا شیم حدثنایا کریم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اور یہی احمد اور اسحاق کا قول ہے کہ مرتہن بقدر نفقہ مرہونہ جانور کا دودھ دوہ کر اور اس پر سواری کر کے اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

اور ابو ثور نے کہا ہے: جب رہن اس پر خرچ کرتا ہے تو پھر مرتہن اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا اور اگر رہن اس پر خرچہ نہ کرے اور اسے مرتہن کے قبضہ میں چھوڑ دے اور وہی اس پر خرچہ کرے تو اس کے لئے اس پر سوار ہونا اور غلام سے خدمت لینا جائز ہے۔ اور امام اوزاعی اور لیث نے بھی یہی کہا ہے اور دوسری حدیث بھی دارقطنی نے روایت کی ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

اسماعیل بن عیاش کی حدیث میں سے ہے کہ ابن ابی ذئب نے زہری سے انہوں نے مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اور اس کے مالک کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المبیع، جلد 1، صفحہ 341، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الرهن، جلد 1، صفحہ 2329، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب المبیع، جلد 2، صفحہ 141، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الاجارہ، جلد 2، صفحہ 3059، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 34، حدیث نمبر 135، وزارت تعلیم

لئے اس کے منافع ہیں اور اس پر اس کا تاوان ہے (1)۔“

اور یہی امام شافعی، شعبی اور ابن سیرین کا قول ہے اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: رہن کے منافع راہن کے لئے ہیں اور اس کا نفقہ بھی اسی پر ہے اور مرتھن رہن سے کسی قسم کی منفعت حاصل نہیں کر سکتا سوائے وثیقہ کی حفاظت کرنے کے۔

خطابی نے کہا ہے: یہی اقوال میں سے اولیٰ اور زیادہ صحیح ہے اس کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ”رہن ملکیت میں نہیں آئے گا وہ اپنے اس مالک کے لئے ہوگا جس نے اسے رہن رکھا ہے۔ (اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا تاوان (خرچہ) ہے)“ [خطابی نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: من صاحبہ، لصاحبہ کے معنی میں ہے۔] عرب لام کی جگہ من استعمال کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ان کا قول ہے:

أَمِنْ أَمْرٍ أَوْفَى دِمْنَةً لَمْ تُكَلِّمْ

میں (مفسر) کہتا ہوں: لصاحبہ صراحۃً موجود ہے لہذا تاویل کی ضرورت نہیں۔ اور امام طحاوی نے کہا ہے: یہ اس وقت تھا جبکہ رباً مباح تھا اور منفعت لانے والے قرض سے منع نہیں کیا گیا تھا اور نہ ایک شے کے بدلے دوسری شے لینے سے منع کیا گیا تھا اگرچہ وہ دونوں غیر متساوی ہوں، پھر اس کے بعد ربا حرام کر دیا گیا۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مرہونہ لونڈی کے ساتھ راہن کے لئے وطی کرنا جائز نہیں اور اسی طرح اس کا اس سے خدمت لینا بھی جائز نہیں۔ اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ رہن سے کسی بھی اعتبار سے نفع حاصل نہیں کرے گا اور یہی شعبی ہیں جنہوں نے حدیث روایت کی ہے اور اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے اور ان کے نزدیک وہ جائز نہیں مگر وہ منسوخ ہو چکا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ مرہونہ شے کا دودھ اور اس کی پشت راہن کے لئے ہے اور وہ اس سے خالی نہیں ہوگا کہ مرتھن کا اپنے لئے دودھ دوہنا راہن کی اجازت کے ساتھ ہوگا یا اس کی اجازت کے بغیر ہوگا، پس اگر اس کی اجازت کے بغیر ہو تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ”کوئی بھی کسی کے جانور کا دودھ نہ دوہے مگر اس کی اجازت کے ساتھ (2)“ یہ اس کا رد کرتی ہے اور اس کے نسخ کا تقاضا کرتی ہے اور اگر اجازت کے ساتھ ہو تو پھر مجہول، غرر، اس شے کی بیع جو تیرے پاس نہ ہو اور اس کی بیع جو ابھی پیدا نہیں کی گئی کی تحریم کے بارے میں مجمع علیہ اصول ہے، چنانچہ یہ بھی اسے رد کر دے گا کیونکہ ایسا ربا کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن خويزمندانے کہا ہے: اگر مرتھن نے رہن سے نفع اٹھانے کی شرط لگالی تو اس کی دو حالتیں ہیں: اگر وہ قرض کے عوض ہو تو پھر جائز نہیں ہے اور اگر وہ بیع یا اجارہ کی وجہ سے ہو تو جائز ہے، کیونکہ وہ مذکور ثمن کے عوض سامان کو بیچنے والا ہو جائے گا اور

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528

2۔ صحیح مسلم، کتاب الملقط، جلد 2، صفحہ 80، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الملقط، حدیث نمبر 2255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رہن کے منافع مدت معلوم تک ہیں گویا کہ وہ بیع اور اجارہ ہے اور جہاں تک قرض کا تعلق ہے تو وہ ایسا قرض ہو جائے گا جو منفعت کو لایا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ قرض دینے کا مقصود تو یہ ہے کہ وہ باعث قربت ہو اور جب اس میں نفع داخل ہو جائے گا تو وہ جنس میں زیادتی ہو جائے گی اور وہی رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ رہن کا ملکیت میں آنا جائز نہیں اور وہ یہ کہ مرہن شرط لگالے کہ مرہونہ شے اس کے حق کے عوض ہو جائے گی اگر اس نے مقررہ مدت تک وہ حق ادا نہ کیا اور یہ جاہلیت کے افعال میں سے تھا تو حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ باطل کر دیا: لَا يَغْلِقُ الرَّهْنُ (1) رہن ملکیت میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح ہم نے اسے قاف کو رفع دینے کے ساتھ خبر پر مقید کر دیا ہے، یعنی لیس يَغْلِقُ الرَّهْنُ۔ آپ کہتے ہیں: أَغْلَقْتُ الْبَابَ فَهُوَ مُغْلَقٌ۔ (میں نے دروازہ بند کیا پس وہ بند ہو گیا) اور غَلَقَ الرَّهْنُ فِي يَدِ مَرْتَهْنِهِ یہ تب کہا جاتا ہے جب اسے اس کے قبضہ سے چھڑایا نہ جاسکے جیسا کہ شاعر نے کہا:

أَجَارَتْنَا مَنْ يَجْتَمِعُ يَتَفَرَّقُ وَ مَنْ يَكُ رَهْنًا لِلْحَوَادِثِ يُغْلِقُ
اور زہیر نے کہا ہے:

و فَارَقْتُكَ بِرَهْنٍ لَا فَكَانَ لَهُ يَوْمَ الْوَدَاعِ فَأَمْسَى الرَّهْنُ قَدْ غَلِقَا (2)

مسئلہ نمبر 14۔ دارقطنی نے سفیان بن عیینہ کی حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے زیاد بن سعد سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اسی کے لئے اس کے منافع ہوں گے اور اسی پر اس کا تاوان (اخراجات) ہو گا (3)۔“ زیاد بن سعد ثقہ حفاظ میں سے ایک ہیں اور یہ اسناد حسن ہے۔ اور اسے مالک نے ابن شہاب سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رہن ملکیت میں نہیں آئے گی (4)۔“ ابو عمر نے کہا ہے: اسی طرح اسے روایت کیا ہے ہر اس راوی نے جس نے امام مالک سے المؤطا روایت کی ہے جہاں تک میں جانتا ہوں، مگر معن بن عیسیٰ نے اسے متصل بیان کیا ہے اور معن ثقہ راوی ہے، مگر مجھے یہ خدشہ ہے کہ اس میں علی بن عبد الحمید غسانی عن مجاہد بن موسیٰ عن معن بن عیسیٰ سے خطا ہوئی ہے۔ اور اس میں ابو عبد اللہ عمروں نے ابہری سے اپنی اسناد کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: لَهُ غَنِمَةٌ وَعَلَيْهِ غَرَمَةٌ (5) اور راویوں نے ان الفاظ کے رفع میں اختلاف کیا ہے۔ سو ابن ابی ذئب اور معمر وغیرہما نے انہیں مرفوع قرار دیا ہے اور اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یونس نے کہا ابن شہاب نے بیان کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کہتے تھے: رہن اسی کے لئے ہے جس نے اسے رہن رکھا ہے، اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا خرچہ ہے۔

3۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33

2۔ ایضاً

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528

5۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33

4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الاقضية، صفحہ 637

اور ابن شہاب نے خبر دی ہے کہ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا قول ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ہے (1)، مگر معمر نے اسے ابن شہاب سے مرفوع ذکر کیا ہے اور معمر ابن شہاب سے روایت کرنے میں تمام لوگوں سے بڑھ کر مضبوط اور ثقہ ہے۔ اور اس کے مرفوع ہونے پر یحییٰ بن ابی انیسہ نے ان کی اتباع کی ہے۔ اور یحییٰ قوی راوی نہیں ہے۔ دراصل اہل علم کے نزدیک یہ حدیث مرسل منقول ہے اگرچہ کثیر جہتوں سے یہ متصل بھی ہے لیکن وہ اسے معطل قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ حدیث ہے جسے ان میں سے کسی نے مرفوع بیان نہیں کیا اگرچہ اس کی تاویل اور اس کے معنی میں اختلاف ہے۔

اور اسے دارقطنی نے بھی اسماعیل بن عیاش عن ابن ابی ذئب عن الزہری عن سعید عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی سند سے مرفوع بیان کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: اسماعیل نے ابن ابی ذئب سے اس کا سماع نہیں کیا ہے، بلکہ اس نے اسے عباد بن کثیر عن ابن ابی ذئب سے سنا ہے اور عباد ان کے نزدیک ضعیف ہے، قابل حجت نہیں ہے اور اسماعیل بھی ان کے نزدیک حدیث میں غیر مقبول ہے جب وہ اپنے شہر والوں کے علاوہ کسی اور سے حدیث بیان کرے۔ اور جب وہ شامیوں سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث صحیح ہوتی ہے اور جب وہ اہل مدینہ وغیرہم سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث میں بہت زیادہ خطا اور اضطراب ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ رہن کی نمو اور بڑھوتری اس گئے ساتھ داخل ہوتی ہے اگر وہ ایسی ہو جسے الگ نہ کیا جاسکتا ہو جیسا کہ اس کا مونا تازہ ہونا یا وہ نسل ہو جیسا کہ ولادت اور جنین اور وہ جو اس معنی میں ہو جیسا کہ کھجور کے پودوں کو ایک جگہ سے اکھڑ کر دوسری جگہ لگانا اور جوان کے سوا ہو مثلاً غلہ، پھل، دودھ اور اون وغیرہ یہ اس میں داخل نہ ہوں گے مگر یہ کہ وہ (مرتبہ) اس کی شرط لگا لے۔ اور ان دونوں قسموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اولاد زکوٰۃ میں ماؤں کے تابع ہوتی ہے اور اون، دودھ اور درختوں کا پھل اس طرح نہیں ہیں، کیونکہ یہ زکوٰۃ میں اصل کے تابع نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس کی صورت میں ہیں اور نہ اس کے معنی میں اور نہ یہ اس کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔ پس ان کا اپنا حکم ہے ان کے لئے اصل کا حکم نہیں ہے بخلاف بچے اور جنین کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ نمبر 16۔ اور اس آدمی کا رہن رکھنا جائز ہے جس کے مال کو قرض محیط ہو جب تک کہ وہ اسے مفلس قرار نہ دے اور مرتبہ قرض خواہوں کی نسبت رہن کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ امام مالک اور لوگوں کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور امام مالک سے اس کے خلاف بھی مروی ہے..... اور عبدالعزیز بن ابی سلمہ نے یہ کہا ہے کہ قرض خواہ مرتبہ کے ساتھ اس میں داخل ہوں گے اور یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ وہ جس پر پابندی عائد نہ کی گئی ہو تو اس کے تصرفات بیع و شراء میں سے تمام احوال میں صحیح ہوتے ہیں اور قرض خواہوں نے اس شرط پر اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے کہ وہ خرید و فروخت کرے اور (قرض) ادا کرے۔ اس باب میں امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے اور رہن بھی اسی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 17۔ قوله تعالى: فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا الْآيَةُ یہ شرط ہے اور اس کے ساتھ اس کی وصیت کو مربوط کیا

گیا ہے جس پر ادا کرنے اور مال مٹول ترک کرنے کا حق ہے، یعنی اگر وہ جس پر حق ہے صاحب حق کے نزدیک امین اور ثقہ ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی امانت اسے ادا کر دے۔ اور قوله فَلْيُؤَدِّهِ اِلَیْهِ اِلَادَا سے ماخوذ ہے اور مہموز ہے۔ (اور یہی جواب شرط ہے) اور ہمزہ کی تخفیف بھی جائز ہے۔ اور ہمزہ کو واؤ کی صورت میں نقل کیا گیا ہے اور اسے الف سے نہیں بدلا گیا اور نہ ہی بین بین بنایا گیا ہے، کیونکہ الف کا ماقبل صرف مفتوح ہو سکتا ہے اور یہ امر وجوب کے معنی میں ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ قرضوں کی ادائیگی واجب ہونے پر اجماع ہے اور اس بارے میں حاکم کے حکم کے ثبوت پر اور اس کے مقروضوں کو اس پر جبر کرنے پر اجماع ہے اور مزید قرینہ غیر کمال حرام ہونے میں صحاح کی احادیث ہیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 18۔ قوله تعالى: اَمَانَتُهُ اَلْاَمَانَةُ مصدر ہے اور اس کے ساتھ اس شے کا نام رکھا گیا ہے جو کسی کے ذمہ میں ہو۔ اور اس کی اضافت اس کی طرف ہے جس پر قرض ہے۔ اس حیثیت سے اس کی اس کی طرف ایک نسبت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ (النساء: 5) (اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال۔)

مسئلہ نمبر 19۔ قوله تعالى: وَلَيَبْتَغِ اللّٰهُ رَٰبِئَهُ اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اس بارے میں کہ وہ حق میں سے کوئی شے نہ چھپائے۔ اور قوله: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ یہ قول باری تعالیٰ: وَلَا يَضَارُّ عَيْنُ كَلِمَةٍ کے کسرہ کے ساتھ کی تفسیر ہے اور شاہد کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ شہادت چھپانے کے ساتھ ضرر پہنچائے اور یہ نہیں متعدد قرائن کے ساتھ وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اور ان میں سے ایک وعید ہے اور نہی کا محل وہاں ہے جہاں شاہد کو حق کے ضائع ہونے کا خوف ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: شاہد پر شہادت دینا لازم ہے جہاں اسے شہادت دینے کے لئے کہا جائے اور وہاں وہ خبر دے جہاں اس سے خبر کا مطالبہ کیا جائے، فرمایا: اور تو یہ نہ کہہ اخبر بها عند الامير (میں اس کے بارے امیر کے پاس خبر دوں گا) بلکہ (یہ کہہ) اخبر بها (میں اسے اس کے بارے خبر دوں گا) شاید وہ رجوع کر لے اور واپس لوٹ آئے۔ (ابو عبد الرحمن نے ولا یکتُموا یہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے نہی للغائب بنایا ہے۔)

مسئلہ نمبر 20۔ جب حق پر گواہ موجود ہوں تو ان پر اس کی ادائیگی کفایۃ متعین ہے پس اگر دوا سے ادا کر دیں اور حاکم انہیں دو پر اکتفا کر لے تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جائے گا اور اگر وہ اس کے ساتھ اکتفا نہ کرے تو اسے جاری رکھنا متعین ہے، یہاں تک کہ اثبات واقع ہو جائے۔ اور یہ صاحب حق کی دعوت کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے پس جب وہ اس کو کہے: تو میرا حق زندہ (ثابت) کر دے اس شہادت کو ادا کر کے جو میرے لئے تیرے پاس ہے تو وہ اس پر متعین ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قوله تعالى: وَمَنْ يَكْتُمُوا فَاِنَّ اٰثِمَ قَلْبُهُ اس میں دل کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ چھپانا اس کے افعال میں سے ہے اور کیونکہ وہ ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے جس کی اصلاح سے سارے کا سارا بدن اصلاح پالیتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے (2)۔ پس یہاں کل بدن کو بعض کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ (اور یہ اول سورۃ) میں گزر چکا ہے۔ اور الکیا نے کہا ہے: جب اس نے اس کا قصد کیا کہ وہ اسے ادا نہیں کرے گا اور شہادت کی ادائیگی زبان سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6891، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

2۔ صحیح بخاری، کتاب ایمان، جلد 1، صفحہ 13، وزارت تعلیم

ترک کر دی تو گناہ اکٹھا دونوں وجہوں کی طرف راجع ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **إِنَّكُمْ قُلُوبُكُمْ** یہ مجاز ہے اور یہ حقیقت و عید پر دلالت کو پختہ کرنے والا ہے اور یہ معافی کے اعتبار سے بیان کی عمدگی اور اعراب کی لطافت میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: دل کا گناہ اسے مسخ کرنے کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ جب دل کو مسخ کر دیتا ہے تو وہ اسے منافق بنا دیتا ہے اور اس پر مہر لگا دیتا ہے۔
نعوذ باللہ منہ۔

(اور اس کا بیان سورت کی ابتدا میں آچکا ہے) اور **قُلُوبُكُمْ**، آئیم کی وجہ سے مرفوع ہے اور آئیم، **إِنَّ** کی خبر ہے اور اگر چاہے تو آئیم کو مبتدا ہونے کے سبب رفع دے لے اور **قُلُوبُكُمْ** فاعل **سَدَّ** مسد الخبر بن جائے گا اور پھر جملہ **إِنَّ** کی خبر ہوگا۔ اور اگر چاہے تو آئیم کو رفع دے اس بنا پر کہ یہ مبتدا مؤخر کی خبر ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ **قُلُوبُكُمْ**، آئیم سے بدل بعض من الكل ہو۔ اور اگر چاہے تو اسے آئیم کی ضمیر سے بدل بنا لے۔

چوبیس مسائل کی تکمیل اور تتمہ کے طور پر میں نے یہاں تین مسائل بیان کئے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت اور کتابت کا جو حکم فرمایا ہے یہ دونوں فریقوں کی اصلاح اور منافع کے لئے ہے اور ایسے فساد اور تنازع کی نفی کے لئے ہے جو دونوں کو باہمی فساد اور خرابی تک پہنچانے والا ہے، تاکہ شیطان اسے حق کا انکار کرنے اور شریعت نے اس کے لئے جو حد مقرر کی ہے اس سے تجاوز کرنے یا مقدار مستحق پر اقتصار کو ترک کرنے پر نہ اکسائے اور اسی وجہ سے شریعت نے ان مجہول چیزوں کی بیع کرنے کو حرام قرار دیا ہے جن میں عادت اور رواج یہ ہو کہ وہ فریقین کو فساد اور اختلاف تک پہنچا دیتی ہوں اور وہ باہمی کینہ اور ایک دوسرے سے جدائی واقع کرنے والی ہوں۔ اور انہی میں سے وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ حرام قرار دیا ہے جو اور شراب نوشی وغیرہ: **إِنَّهَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ** (المائدہ: 91) (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ)

پس جس نے اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے بارے میں اس کے ادب سکھانے کے ساتھ ادب سیکھ لیا اس نے دین اور دنیا کے منافع جمع کر لئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ لَهُمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ** (النساء: 66) (اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے لوگوں کے اموال اس ارادہ سے لئے کہ وہ انہیں ادا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا (یعنی ادائیگی کے اسباب مہیا فرما دے گا) اور جس نے انہیں ضائع کرنے کے ارادہ سے لئے تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا (1)۔“ اور نسائی نے حضرت میمونہ زوجہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قرض لیا، تو انہیں کہا گیا: اے ام المؤمنین! آپ قرض لے رہی ہیں اور آپ کے پاس اسے ادا کرنے کے وسائل نہیں ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 321۔ ایضاً حدیث نمبر 2212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ”جس نے قرض لیا اور وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کی معاونت فرمائے گا (1)۔“ اور طحاوی، ابو جعفر طبری اور حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم نفسوں کو ان کے امن کے بعد خوفزدہ نہ کرو۔“ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ وہ کیا ہے؟ فرمایا: ”وہ قرض ہے (2)۔“ اور بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے دعا میں اس طرح ذکر کیا: اللھم انی اعوذ بک من الھم والحزن والعجز والكسل والجبن والبخل وضلع الدین وغلبة الرجال (3)۔ (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں غم اور حزن سے، عجز اور سستی، غفلت سے، بزدلی اور بخل سے، قرضے کے بوجھ اور لوگوں کے غلبے سے۔) علماء نے کہا ہے: ضلع الدین سے مراد یہ ہے کہ مقروض ایسے وسائل نہ پائے کہ وہ قرض ادا کر سکے۔ اور یہ عربوں کے اس قول سے بنایا گیا ہے: حیل مضدیع یعنی بہت بھاری اور ثقیل بوجھ اور دابة مضدیع یعنی ایسا جانور جو بوجھ اٹھانے کی قوت نہ رکھتا ہو۔ صاحب العین نے یہی کہا ہے۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا: الذین شین الدین (4) (قرض دین کے لئے عیب ہے۔) اور آپ سے ہی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: الذین ھم باللیل ومذلة بالثھار (5) (قرض رات کا غم ہے اور دن کی ذلت ہے۔) ہمارے علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ عیب اور ذلت ہے کیونکہ اس میں دل و دماغ مشغول رہتے ہیں اور ادائیگی کا غم اور فکر لازم رہتا ہے۔ اور مقروض کے لئے ملاقات کے وقت ذلت اور پستی کا سامنا ہوتا ہے اور اسے اپنے وقت تک مؤخر کر کے اس کا احسان برداشت کرنا ہے۔ اور بسا اوقات وہ اپنی طرف سے اسے پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور پھر اس کے خلاف کرتا ہے یا مقروض اس کے سبب سے گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے یا وہ اس کے لئے قسم کھاتا ہے اور اسے توڑ دیتا ہے۔ وغیر ذلک۔ اسی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گناہ اور قرض سے پناہ مانگتے تھے۔

اور المغرم سے مراد قرض ہے۔ آپ ﷺ سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ کیونکر آپ قرض سے اس قدر پناہ مانگتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک آدمی جب قرض ادا کرتا ہے تو وہ گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے اور وہ وعدہ کرتا ہے اور اس کا خلاف کرتا ہے (6)۔“ اور یہ بھی کہ بسا اوقات وہ مرجاتا ہے اور وہ قرض ادا نہیں کر چکا ہوتا۔ پس وہ اس کے عوض گروی ہو جاتا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بندہ مومن کی روح اپنی قبر میں اس کے قرض کے عوض گروی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کی طرف سے اسے ادا کر دیا جائے (7)۔“ اور یہ تمام کے تمام اسباب دین میں عیب ہی ہیں۔ ان سے دین کا حسن و جمال ضائع ہو جاتا ہے اور اس کا کمال کم ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

1- سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 232

2- مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 146

3- صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 942۔ ایضاً، حدیث نمبر 5005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4- کنز العمال، جلد 6، صفحہ 231

5- ایضاً

6- صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 322

7- سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176، ایضاً، حدیث 2403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3۔ جب اللہ تعالیٰ نے لکھنے، گواہ بنانے اور کوئی شے بطور گروی لینے کا حکم ارشاد فرمایا تو یہ اموال کی حفاظت اور انہیں بڑھانے کا لحاظ رکھنے پر نص قطعی ہے۔ اور یہ جاہل متصوفہ اور ان کی رعایت کرنے والے وہ لوگ جو اس کا لحاظ نہیں رکھتے ان کا رد ہے کہ وہ اپنے تمام اموال سے فارغ ہو جاتے ہیں (یعنی وہ غربا و مساکین وغیرہ کو دے دیتے ہیں) اور وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی کفایت اور حاجت کے لئے بھی کچھ نہیں چھوڑتے، پھر جب وہ محتاج ہوتے ہیں اور ان کے گھر والے فقیر ہوتے ہیں تو پھر یا تو وہ بھائیوں کے احسانات یا ان کے صدقات کا طالب ہوتا ہے یا پھر وہ دنیا داروں اور ان میں سے ظلم کرنے والوں سے کچھ لیتا ہے اور یہ فعل مذموم اور ممنوع ہے۔

ابوالفرج جوزی نے کہا ہے: مجھے ان زہد و ورع اختیار کرنے والوں سے زیادہ تعجب نہیں جنہوں نے اپنی کم علمی کے سبب ایسا کیا، بلکہ زیادہ تعجب ان اقوام کے بارے ہے جو صاحب علم و عقل ہیں انہوں نے اس پر کیسے برا بیچتے کیا۔ اور انہوں نے اس کے بارے حکم دیا باوجود اس کے کہ شرع اور عقل اس کے خلاف ہیں۔ پس محاسبی نے اس بارے میں بہت زیادہ کلام کیا ہے اور ابو حامد طوسی نے اسے پختہ اور مضبوط کیا ہے اور ان کی مدد کی ہے اور میرے نزدیک حارث ابو حامد کی نسبت زیادہ معذور ہے، کیونکہ ابو حامد زیادہ فقیہ ہے مگر ان کے تصوف میں داخل ہونے نے ان پر ان کی مدد و نصرت لازم کر دی جو اس میں پہلے داخل ہو چکے ہیں۔

محاسبی نے اپنے طویل کلام میں کہا ہے: تحقیق مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا: بلاشبہ ہم عبدالرحمن پر اس مال کے بارے میں خوف کھا رہے ہیں جو انہوں نے چھوڑا، تو حضرت کعب نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا تم عبدالرحمن رضی اللہ عنہ پر خوف کھا رہے ہو؟ انہوں نے پاکیزہ مال کمایا، پاکیزہ اور طیب مال خرچ کیا اور حلال و طیب مال چھوڑا۔ پس یہ خبر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو وہ حضرت کعب کو تلاش کرنے کے ارادہ سے غصے کی حالت میں نکلے اور اونٹ کے جڑے کی ہڈی کے پاس سے گزرے تو اسے اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور پھر حضرت کعب کی تلاش میں نکل پڑے، تو حضرت کعب کو بتایا گیا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ آپ کو تلاش کر رہے ہیں تو وہ بھاگتے ہوئے نکل گئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے ان سے مدد لینے لگے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ پس حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت کعب کی تلاش میں نشانات کی اتباع کرتے ہوئے آئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دار پر آ کر رک گئے، جب اندر داخل ہوئے تو حضرت کعب اٹھے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھاگتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اے یہودیہ کے بیٹے! تو یہ گمان رکھتا ہے کہ جو کچھ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے چھوڑا ہے اس کے بارے کوئی حرج نہیں ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور فرمایا: ”کثیر مال و دولت والے ہی قیامت کے دن قلیل مال و دولت والے ہوں گے سوائے ان کے جنہوں نے اس اس طرح خرچ کیا (1) (یعنی نیکی اور صدقہ میں وافر مال خرچ کیا)۔ محاسبی نے کہا ہے: پس یہ عبدالرحمن اپنی فضیلت کے باوجود قیامت کے دن

1۔ مسند احمد حنبلی، جلد 5، صفحہ 152۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاستقراض و اداء الدیون و الحجور و التفلیس، حدیث نمبر 2213

میدان حشر میں روک لئے جائیں گے اس حلال مال کے سبب جو انہوں نے پاکدامنی اور نیکی کرنے کے لئے کمایا اور انہیں فقراء کے ساتھ جنت کی طرف دوڑ کر جانے سے روک دیا جائے گا اور وہ ان کے نشانات پر گھسنے لگیں گے، علاوہ ازیں بھی انہوں نے کلام کیا ہے (☆)۔

ابو حامد نے اس کا ذکر کیا ہے اور حدیث ثعلبہ کے ساتھ اسے پختہ اور قوی کیا ہے۔ وہ یہ کہ اسے مال عطا کیا گیا تو اس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ابو حامد نے کہا ہے: جس نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اور اولیاء کرام رحمہم اللہ کے احوال اور ان کے اقوال میں گہری غور و فکر کی ہے تو اسے اس میں کوئی شک نہیں کہ مال کا نہ ہونا اس کے وجود سے افضل ہے۔ اگرچہ وہ صدقہ و خیرات میں خرچ ہو، کیونکہ وہ کم سے کم شے جو اس میں حاصل ہوتی ہے وہ مال کی اصلاح کے لئے ہمت و کوشش ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مشغول رکھتی ہے۔ پس مرید کو چاہئے کہ وہ اپنا مال نکال دے یہاں تک کہ بقدر ضرورت کے سوا کچھ بھی اس کے پاس باقی نہ رہے۔ پس جو ایک درہم بھی اس کے پاس باقی ہوگا اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے حجاب اور پردہ بن جائے گا۔

علامہ جوزی نے کہا ہے: یہ سب کا سب خلاف شرع اور خلاف عقل ہے اور کوتاہ فہمی ہے اس میں جو مال سے مراد لیا گیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرف عطا فرمایا ہے، اس کی قدر و مرتبہ کو عظمت عطا فرمائی ہے اور اس کی حفاظت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ اسے آدمی کے لئے باعث قوت و طاقت بنایا گیا ہے اور وہ شے جو شریف آدمی کے لئے باعث قوت و طاقت بنائی گئی ہے تو وہ یقیناً شریف ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء: 5) اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال جنہیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی کے لئے) سہارا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مال احمق اور بے وقوف انسان کے حوالے کرنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا: فَإِنْ أَنْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (النساء: 6) (پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال)

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فرمایا: بے شک تیرا اپنے ورثاء کو غنی اور دولت مند چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اس حالت میں چھوڑے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں (1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما نفعنی مال کمال ابی بکر (2) (مجھے کسی مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ”صالح آدمی کے لئے صالح اور پاکیزہ مال نعمت ہے (3)۔ اور آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے آخر میں یہ تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 943

2۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، جلد 1، صفحہ 10۔ ترمذی شریف، حدیث 3594، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 197

☆ یہ محاسبی کی رائے ہو سکتی ہے ورنہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

اللهم اکثر ماله وولده وبارک له فیہ (1) (اے اللہ! اس کے مال واولاد میں کثرت فرما اور اس کے لئے اس میں برکت عطا فرما۔) اور حضرت کعب بنی شیبہؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، بلاشبہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنا سارا مال صدقہ کر دوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنے لئے کچھ مال روک لے یہ تیرے لئے بہتر ہے (2)۔“

علامہ جوزی نے کہا: یہ احادیث کتب صحاح میں نقل کی گئی ہیں اور یہ اس عقیدہ اور نظریہ کے خلاف ہیں جو متصوف رکھتے ہیں کہ مال کی کثرت حجاب اور سزا ہے اور یہ کہ اسے محفوظ رکھنا توکل کے منافی ہے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے فتنہ اور آزمائش سے ڈرا جاتا ہے اور بلاشبہ خلق کثیر نے اس کے خوف کی وجہ سے اس سے اجتناب کیا ہے۔ اور یہ کہ اسے جمع کرنا من وجہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ کہ دل بہت کم فتنوں سے سلامت اور محفوظ رہتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے دل کا ذکر آخرت میں مشغول ہونا نایاب ہو جاتا ہے سو اسی وجہ سے اس کے فتنہ سے ڈرایا گیا ہے۔

اور جہاں تک مال کمانے کا تعلق ہے تو اگر کوئی صرف گزراوقات کے لئے حلال کمانے پر اکتفا کر لے تو یہ ایک ایسا امر ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور رہا وہ جس نے مال جمع کرنے اور حلال مال کثرت سے طلب کرنے کا قصد کیا تو اس کے مقصود اور مدعی میں دیکھا جائے گا۔ پس اگر اس نے فخر و مباہات کا قصد کیا تو یہ مقصود بہت برا ہے اور اگر اس نے اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کی پاکدامنی کا قصد کیا اور اس نے حوادث زمانہ کے لئے مال ذخیرہ کیا اور اس نے بھائیوں کی خوشحالی، فقراء کو غنی بنانے اور نیکی کے کام کرنے کا قصد کیا تو اسے اس ارادہ پر ثواب و اجر عطا کیا جائے گا اور اس نیت کے ساتھ مال جمع کرنا کثیر طاعات و ریاضات سے افضل ہے اور صحابہ کرام میں سے کثیر مخلوق کی نیتیں مال جمع کرنے میں سلیم اور حسین تھیں کیونکہ مال جمع کرنے سے ان کے مقاصد حسین تھے، پس وہ اس کے حریص ہوئے اور انہوں نے اس میں زیادتی اور کثرت کی دعائیں گئیں۔ اور جب ایک مضبوط آدمی کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیز رفتار گھڑ دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس نے گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ وہ کھڑا ہو گیا پھر اس نے اپنا کوڑا پھینک دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اسے اتنی (جگہ) دے دو جہاں اس کا کوڑا پہنچا ہے (3)۔“

اور حضرت سعد بن عبادہؓ اپنی دعائیں کہا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے وسعت و خوشحالی عطا فرما، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: وَ نَزَّادُ گینل بَعِیْز (یوسف: 65) (اور ہم زیادہ لیس گے ایک اونٹ کا بوجھ) اور حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: فَإِنْ أَتَمَمْتَ عَشْرًا فَبِئْسَ عَذَابٌ (القصص: 27) (پھر اگر تم پورے کرو دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی) اور حضرت ایوب علیہ السلام کو جب صحت عطا فرمادی گئی تو ان پر سونے کی مکڑیوں کا بہت بڑا گلہ اڑایا گیا تو آپ پکڑ کر اپنے کپڑے میں ڈالنے لگے اور ان میں کثرت و زیادتی کی طلب کرنے لگے تو آپ کو کہا گیا: کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 298۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 362۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ البراءۃ، حدیث نمبر 4308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 156۔ ابی داؤد، باب فی اقطاع الارضین، حدیث نمبر 2670، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آپ سیر نہیں ہوئے ہیں؟ تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! کیا فقیر بھی تیرے فضل سے سیر ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا انحصار طبائع اور مزاجوں پر ہے۔

اور جہاں تک محاسبی کے کلام کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے وہ علم سے نابلدہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور انہوں نے حضرت کعب اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث ذکر کی ہے وہ محال ہے۔ وہ جہال کی وضع کردہ ہے۔ اور متصوفہ کے ساتھ ان کے ملنے کی وجہ سے حدیث کی عدم صحت ان پر مخفی رہی ہے اور بعض نے اس کے بارے روایت کیا ہے کہ اگرچہ اس کی سند ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے اور وہ مطعون راوی ہے۔

یعنی نے کہا ہے اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا اور تاریخ میں صحیح یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا وصال ۲۵ھ میں ہوا۔ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ۳۲ھ میں ہوا۔ تحقیق وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد بھی سات برس تک زندہ رہے۔ پھر وہ لفظ جو انہوں نے اپنی حدیث میں ذکر کئے ہیں وہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی حدیث موضوع ہے، پھر صحابہ کرام یہ کیسے کہہ سکتے ہیں: ہم عبدالرحمن پر خوف کھا رہے ہیں! کیا حلال مال جمع کرنے کی اباحت پر اجماع منعقد نہیں ہوا ہے پھر اباحت کے ساتھ خوف کی کیا وجہ ہے؟ کیا شریعت ایک شے کے بارے میں اجازت دیتی ہے پھر اسی پر سزا دیتی ہے؟ یہ فہم و ادراک کی قلت کی وجہ سے ہے، پھر کیا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پر اعتراض کر سکتے ہیں، حالانکہ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایسی چیزوں کے سبب بہتر اور افضل ہیں جن کے سبب وہ ایک دوسرے کے قریب بھی نہیں ہو سکتے؟ پھر ان کا اکیلے عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعلق ہونا اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے سیرت صحابہ کو آزمایا اور اس کا تجربہ کیا ہی نہیں، کیونکہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تین سو بہار چھوڑے تھے اور ہر بہار میں تین قنطار تھے! اور البہار کا معنی بوجھ ہے۔

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا مال دو لاکھ پچاس ہزار تھا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نوے ہزار تر کے میں چھوڑے۔ اور اکثر صحابہ کرام نے مال کمایا اور اسے پیچھے چھوڑا اور ان میں سے کسی نے بھی کسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور رہا یہ قول: ان عبدالرحمن یحبو حنوا یوم القیامۃ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے حدیث کو پہچانا اور سمجھا ہی نہیں۔ اور میں تو اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ عبدالرحمن قیامت کے دن گھسٹ کر چلیں، کیا آپ انہیں جانتے نہیں ہیں جو (اسلام قبول کرنے میں) سبقت لے جانے والے ہیں اور آپ ان دس صحابہ کرام میں سے ایک ہیں جن کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے اور آپ اہل بدر میں سے ہیں اور مجلس شوریٰ کے ممبر ہیں تو کیا آپ گھسٹ کر چلیں گے؟ پھر حدیث عمارہ ابن زاذان روایت کرتے ہیں اور امام بخاری نے کہا ہے: بسا اوقات ان کی حدیث مضطرب ہوتی ہے۔ اور امام احمد نے کہا ہے: یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منکر احادیث روایت کرتا ہے اور ابو حاتم رازی نے کہا ہے: یہ قابل حجت نہیں ہے اور دارقطنی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے۔ اور آپ کا یہ قول: ترک المال الحلال افضل من جمعه (مال حلال کو چھوڑ دینا اسے جمع کرنے سے افضل ہے) اس طرح نہیں ہے اور جب نیت و قصد صحیح ہو تو بلا اختلاف علماء کے نزدیک اسے جمع کرنا افضل ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب

کہتے تھے: اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے جو مال طلب نہیں کرتا وہ اس کے ساتھ اپنا قرض ادا کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے اور اگر وہ مر جائے تو وہ اسے اپنے بعد والوں کے لئے بطور میراث چھوڑ دے اور حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے چار سو دینار پیچھے چھوڑے اور حضرت سفیان ثوری نے دو سو دینار پیچھے چھوڑے اور وہ کہتے تھے: المال فی هذا الزمان سلاح اس زمانے میں مال ہتھیار ہے اور اسلاف ہمیشہ مال کی تعریف کرتے رہے اور حوادث زمانہ اور فقراء کی امداد کے لئے اسے جمع کرتے رہے، البتہ ان میں سے ایک گروہ نے عبادات میں مشغول ہونے اور یکسوئی کو ترجیح دیتے ہوئے مال سے پرہیز کی ہے۔ پس انہوں نے تھوڑے مال پر ہی قناعت کی۔ پس اگر قائل یہ کہے: بے شک مال کو کم کرنا قرب امر کے لئے اولیٰ ہے لیکن وہ مرتبہ اثم کو اس کے ساتھ تنگ کرنے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اموال کی حفاظت اور ان کا لحاظ رکھنے پر جو روایات دلالت کرتی ہیں ان میں سے گھٹیا مال اور اعلیٰ مال کے لئے قتال کو مباح قرار دینا بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من قتل دون ماله فهو شهيد (1) (جو اپنے حقیر اور گھٹیا مال (کی حفاظت) میں قتل کر دیا گیا تو وہ شہید ہے) اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنْ تُبَدُّواْ مَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخَفُّوْاْ یُحَاسِبْکُمْ

بِہِ اللّٰهِ ۚ فِیَغْفِرْ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۷۷﴾

”اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپائے رہو حساب لے گا تم سے اس کا اللہ تعالیٰ پھر بخش دے گا جسے چاہے گا اور عذاب دے گا جسے چاہے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

قولہ تعالیٰ: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تُبَدُّواْ مَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخَفُّوْاْ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰهِ اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ لوگوں کا اس ارشاد باری تعالیٰ کے معنی میں اختلاف ہے اور اس بارے میں چار اقوال ہیں۔

(1) کہ یہ ارشاد منسوخ ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، حضرت شعبی، حضرت عطاء، حضرت محمد بن سیرین، حضرت محمد بن کعب، حضرت موکی بن عبیدہ رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام اور تابعین میں سے ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور یہ کہ یہ تکلیف اور پابندی ایک سال تک باقی رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ کشادگی اور وسعت نازل فرمائی: لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اور یہ حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عطاء، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہم کا قول ہے)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ تُبَدُّواْ مَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخَفُّوْاْ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰهِ فرمایا: ان میں سے کوئی شے ان کے دلوں میں داخل ہو (یا) شے میں سے کوئی ان کے دلوں میں داخل نہ ہو، تو حضور نبی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدیات، جلد 1، صفحہ 170۔ صحیح بخاری، باب من قاتل دون ماله، حدیث نمبر 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کریم ﷺ نے فرمایا: ”تم کہو ہم نے سنا، ہم نے اطاعت کی اور ہم نے تسلیم کر لیا۔ فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈال دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ لُنُسِينَا أَوْ أَخْطَانَا (فرمایا: ”میں نے کر دیا“) رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إَصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا (فرمایا: ”میں نے کر دیا“) رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ① (فرمایا: ”میں نے کر دیا۔“) (1) اور ایک روایت میں ہے۔ پس جب انہوں نے ایسا کہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا عَنِ قَرِيبٍ اس کا ذکر آئے گا۔

(۲) حضرت ابن عباس، حضرت عکرمہ، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم نے فرمایا: یہ آیت محکم مخصوص ہے اور یہ اس شہادت کے معنی میں ہے جسے چھپانے سے منع کیا گیا ہے، پھر اس آیت میں بتایا کہ شہادت کو چھپانے والا اسے چھپانے والا ہے جو اس کے دل میں ہے اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔

(۳) یہ آیت اس شک و یقین کے بارے ہے جو نفوس پر طاری ہوتے ہیں، حضرت مجاہد نے بھی یہی کہا ہے۔ (2)
(۴) یہ آیت محکم ہے اور عام ہے منسوخ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا ان اعمال پر بھی حساب لے گا جو انہوں نے کئے اور ان پر بھی جو انہوں نے کئے تو نہیں مگر ان کے دلوں میں ثابت اور پختہ ہو گئے اور انہوں نے انہیں مخفی رکھا اور ان کی نیت اور ارادہ کر لیا۔ پس اللہ تعالیٰ مومنوں کی مغفرت فرمادے گا اور اس کے ساتھ اہل کفر و نفاق کو پکڑ لے گا (3)، علامہ طبری نے ایک قوم سے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے (اس میں) وہ داخل کیا ہے جو اس سے مشابہ ہے۔

علی بن ابی طلحہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، لیکن جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو جمع فرمائے گا تو ارشاد فرمائے گا: ”میں تمہیں اس کے بارے بتاتا ہوں جو تم اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو۔“ پس مومن کو اللہ تعالیٰ اس کے بارے بتائے گا اور پھر ان کی مغفرت فرمادے گا۔ اور رہے شک کرنے والے تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے انہیں بتائے گا جس تکذیب وغیرہ کو انہوں نے چھپائے رکھا تھا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحَاسِبُكُم بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ (البقرہ: 225) یعنی شک اور نفاق میں سے جو تمہارے دلوں نے کمایا اس پر تمہارا مواخذہ کیا جائے گا (4)۔

اور حضرت ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس کے بارے آگاہ فرمائے گا جسے وہ چھپاتا تھا تا کہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے مخفی نہیں۔ اور حدیث میں ہے: ”اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا یہ وہ دن ہے جس میں مخفی رازوں کو ظاہر کر دیا جائے گا اور چھپی ہوئی باتیں باہر نکل آئیں گی۔ میرے لکھنے والے فرشتوں نے نہیں لکھے مگر تمہارے وہی

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78

4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 174

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 173

اعمال جو ظاہر ہوئے اور میں ان پر بھی مطلع ہوں جن پر وہ مطلع نہیں ہوئے، نہ انہوں نے ان کی خبر دی اور نہ ہی انہیں لکھا۔ پس میں ان کے بارے تمہیں خبر دوں گا اور ان پر تمہارا محاسبہ بھی کروں گا اور پھر جسے میں چاہوں گا اسے بخش دوں گا اور جسے چاہوں گا اسے عذاب دوں گا (1)۔“ پس وہ مومنوں کو بخش دے گا اور کافروں کو عذاب دے گا“ اس باب میں یہ اصح روایت ہے۔ اور اسی پر حدیث نبویؐ بھی دلالت کرتی ہے جس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ (نہیں کہا جائے گا) تحقیق حضور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے ”بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ان چیزوں کو معاف فرما دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوں گی جب تک کہ وہ ان کے ساتھ کلام نہ کریں یا ان کے مطابق عمل نہ کریں (2)۔“ چنانچہ ہم کہتے ہیں: یہ ارشاد احکام دنیا پر محمول ہے۔ مثلاً طلاق، عتاق اور وہ بیع جس کا حکم ثابت نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ کلام نہ ہو اور جو آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ بندے کا اس پر مواخذہ ہو گا وہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آخرت میں ہو گا۔

حسن نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے (3)۔ علامہ طبری رحمہ اللہ نے کہا اور دوسروں نے اس معنی کی طرح بیان کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے، مگر انہوں نے یہ کہا ہے: بے شک وہ عذاب جو اس کی جزا ہوتا ہے جو دلوں میں کھٹکے اور اس کے بارے فقط غور و فکر ہو وہ دینوی مصائب و آلام اور دنیا کی تمام تکالیف کے ساتھ ہے پھر اسی معنی کی طرح حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیؐ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی (پانچواں قول ہے) اور علامہ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے کہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی درست ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَإِنْ تُبْدُوا مَالَكُمْ أَوْ تُخْفُوا اس کا معنی ہے ان چیزوں میں سے جو تمہاری وسعت اور تمہارے کسب کے تحت ہیں۔ اور یہ ان چیزوں کے ساتھ ہیں جن کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور جن کے بارے فکر کی جاتی ہے۔ پس جب لفظ ایسے ہیں جن میں دلوں میں کھٹکنے والی چیزیں داخل ہو سکتی ہیں تو صحابہ کرام اور حضور نبی مکرم ﷺ خوفزدہ ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دوسری آیت کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی جس کا اس نے ارادہ کیا اور اسے خاص کر دیا اور اس کے حکم پر نص بیان فرمادی کہ وہ کسی نفس کو مکلف نہیں بنائے گا مگر (اس کا) جو اس کی وسعت میں ہو گا۔ اور دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات ایسے نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا دفاع وسعت میں ہے، بلکہ وہ امر غالب ہے اور وہ ان امور میں سے نہیں ہے جو کمائے جاتے ہیں۔ پس اس بیان اور وضاحت سے مقصود ان کے لئے کشادگی پیدا کرنا اور ان کی پریشانی کا ازالہ کرنا ہے۔ اور باقی آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور جس سے نسخ کا حکم دور کیا جاسکتا ہے اس میں سے یہ بھی ہے کہ یہ آیت خبر کے انداز میں ہے اور اخبار میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی نسخ کا قول کرے تو وہ اس حکم پر مترتب ہوتا ہے جو صحابہ کرام کو اس وقت لاحق ہوا جب وہ اس آیت سے گھبرائے اور اس کی دلیل ان کے لئے حضور نبی مکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: قُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا اس سے یہ حکم ثابت ہو رہا ہے کہ وہ اس ارشاد پر ثابت

قدم ہو جائیں اور اسے لازم پکڑ لیں اور بخشش و غفران کے بارے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا انتظار کریں۔ پس جب یہ حکم پہنچتا کر دیا گیا تو پھر اس میں نسخ کا واقعہ ہونا صحیح ہے۔ اور اس وقت آیت اس قول باری تعالیٰ کے مشابہ ہوگی: **إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ** (الانفال: 65) پس یہ الفاظ بھی الفاظ خبر ہی ہیں لیکن اس کا معنی ہے: **التزموا هذا واثبتوا عليه واصبروا بحسبه** تم اسے لازم پکڑ لو اور اس پر ثابت قدم ہو جاؤ اور اس کے مطابق صبر کرو۔ پھر اس کے بعد اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اور اس بارے میں جو میں جانتا ہوں اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں ہے اور یہ منسوخ ہے دوسو کے مقابلے میں ایک سو کے صبر کرنے (والے حکم) کے ساتھ۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: سورہ البقرہ میں یہ آیت اس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں اضمار اور تفسید ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے **يَحَاسِبُكُمْ بِهِ اللَّهُ** ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا اگر اس نے چاہا۔ اور اس بنا پر کوئی نسخ نہیں ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اس آیت میں جو احسن قول کیا گیا ہے اور وہ ظاہر سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت عام ہے، پھر نجوی کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث (اس میں) داخل کر دی گئی ہے جسے بخاری، مسلم وغیرہا نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”مومن کو قیامت کے دن اپنے رب سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ رب کریم اپنا دست قدرت اس پر رکھ دے گا اور وہ اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا کیا تو (اپنے ان گناہوں کو) پہچانتا ہے؟ تو وہ مومن عرض کرے گا اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں۔ رب کریم فرمائے گا: کیونکہ میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈالے رکھا ہے اور بلاشبہ آج کے دن بھی میں تیرے لئے انہیں بخش دوں گا اور پھر نیکیوں کا نامہ عمل اسے عطا فرما دے گا اور رہے کفار اور منافقین! تو انہیں ساری مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلایا (2)۔“

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مومنین میں سے ان کے بارے نازل ہوئی ہے جو کافروں کو دلی مقرر کرتے تھے۔ یعنی اے مومنین! کفار کی ولایت کے بارے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کا اعلان کرو یا تم اسے چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا۔ واقعی اور مقاتل نے یہ کہا ہے۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے جو کہ آل عمران میں ہے **قُلْ إِنْ تَحْفَظُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يُعْلِمَهُ اللَّهُ** یعنی کفار کی ولایت میں سے جو تمہارے سینوں میں ہے اگر تم اسے چھپاؤ یا تم اسے ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور اس پر اس کا ماقبل قول دلالت کرتا ہے: **لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ** (آل عمران: 28) (نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں اس میں (حقیقت سے) بعد اور دوری ہے، کیونکہ آیت کا سیاق اس کا تقاضا نہیں کرتا اور جو سورہ

1۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 360۔ صحیح بخاری، باب استدالمومن علی نفسه، حدیث نمبر 5609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آل عمران میں ہے وہ بین اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس آیت کے ساتھ اپنی قوم کے پاس تشریف لاتے تھے **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** ^۱ **وَ اِنْ تُبْدُوْا مٰفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحٰسِبْكُمْ اللّٰهُ**۔
مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **فَيَغْفِرْ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبْ مَنْ يَّشَآءُ** ابن کثیر، نافع، ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے فیغفر اور ویعذب کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف جواب شرط پر کیا گیا ہے اور ابن عامر اور عاصم نے دونوں میں رفع کے ساتھ قطعی طور پر پڑھا ہے۔ یعنی **فَهُوَ يَغْفِرُ وَيُعَذِّبُ**۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، اعرج، ابو العالیہ اور عاصم حمذری سے دونوں میں نصب کے ساتھ مروی ہے اس بنا پر کہ ان سے پہلے ان مضمر ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا عطف معنی پر ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فیضاعفه له (1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور باہم مشاکلہ کی وجہ سے لفظ پر عطف عمدہ ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و متی مایع منک کلاماً یتکلم فیجیب بعقل

نحاس نے کہا ہے اور طلحہ بن مصرف سے روایت ہے **یُحَاسِبُکُمْ** بہ اللہ یغفر یعنی بغیر فا کے بدل کی بنا پر۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جعفی اور خلاد نے اسی طرح پڑھا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اسی طرح ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے یہ **یُحَاسِبُکُمْ** سے بدل ہونے کی بنا پر ہے اور یہی محاسبہ کی تفسیر ہے۔ اور یہ شاعر کے اس قول کی طرح ہے:

رُوِیْدَا بَنی شیبان بعض وعیدکم تلاقوا غدا خیل علی سفوان

تلاقوا جیاداً لا تعید عن الوغی اذا ما غدت فی الساذق المتدانی

اور یہ بدل کی بنا پر ہے۔ شاعر نے فعل کو مکرر ذکر کیا ہے، کیونکہ فائدہ اس قول میں ہے جو اس کے پیچھے آ رہا ہے (2)۔ نحاس نے کہا ہے: اگر بغیر فا کے ہو تو جزم کی نسبت رفع زیادہ عمدہ ہے۔ وہ حال کے محل میں ہو جائے گا، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

متی تأتہ تعشو ال ضؤ ناره تجذ خیر نار عندہا خیر موقد

اَمِّنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّ اَمِّنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ

وَرُسُلِهِ لَا نَفَرَقْ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْ رُّسُلِهِ وَقَالُوا سُبْحٰنَا وَاَطْمَئِنَّا غُفْرٰنَكَ رَبَّنَا

وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا

اَكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُوَاخِذْنَا اِنْ لَّيْسِنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اَصْرًا كَمَا

حَمَلْتَهُ عَلٰی الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۚ وَاعْفُ عَنَّا

وَاعْفِرْ لَنَا ۚ وَارْحَمْنَا ۚ اَنْتَ مَوْلٰنَا فَاَنْصُرْنَا عَلٰی الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ۝

”ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن۔ یہ سب دل سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔ ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔ اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کیا۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا خطا کر بیٹھیں اے ہمارے رب! نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں اے ہمارے پروردگار! نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں اور درگزر فرما ہم سے اور بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر، تو ہی ہمارا دوست (مددگار) ہے۔ تو مدد فرما ہماری قوم کفار پر۔“

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ حضرت حسن، مجاہد اور ضحاک سے روایت ہے کہ یہ آیت قصہ معراج میں عطا ہوئی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بعض روایات میں اسی طرح مروی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: تمام قرآن سوائے اس آیت کے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت شب معراج سماعت فرمائی۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا واقعہ معراج سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ لیلۃ المعراج تو مکہ مکرمہ میں تھی اور یہ ساری سوزت مدنی ہے۔

پس جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کا تعلق شب معراج سے ہے انہوں نے فرمایا کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلند یوں کی جانب چڑھے اور آسمانوں میں بلند مقام پر پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام بھی تھے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہی سے آگے گزر گئے تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے عرض کی: بلاشبہ میں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی آپ کے سوا کسی کو اس مقام سے تجاوز کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے گزر گئے یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچے جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا، تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ اپنے رب کریم کو سلام عرض کیجئے، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: التَّحِيَّاتُ لِلَّهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ۔ (قولی عبادات، بدنی عبادات اور مالی عبادات سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ (اے نبی مکرم تجھ پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہوں۔) تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ آپ کی امت کے لئے بھی سلام میں حصہ موجود ہو۔ چنانچہ عرض کی: السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ (1) (سلام ہو ہم پر اور اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں پر۔) تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام اور آسمانوں میں رہنے والے تمام ملائکہ نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، باب التَّحِيَّاتِ الْآخِرَةُ، حدیث نمبر 788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَمَّنَ الرَّسُولُ یہ معنی شکر کی بنا پر ہے یعنی رسول نے تصدیق کی۔ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ (اس (کتاب) کی جو اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی۔) پس حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو بھی کرامت و فضیلت میں شریک کرنے کا ارادہ فرمایا تو کہا: وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلِكِهِ وَكُتُوبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ یعنی وہ کہتے ہیں ہم تمام رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ساتھ ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی کے ساتھ کفر نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی فرق کرتے ہیں جس طرح کہ یہود و نصاریٰ نے فرق کیا..... تو آپ کے رب نے آپ کو فرمایا اس آیت کے بارے ان کی قبولیت کیسی ہے جسے میں نے نازل کیا ہے؟ اور وہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: إِنْ تُبَدُّوْا صَافِي أَنْفُسِكُمْ تَوَرَّسَ اللَّهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ عَفْرَانِكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) یعنی الْمَصِيرُ بمعنی المرجع (لوٹنے کی جگہ) ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا یعنی طاقتھا۔ (اللہ تعالیٰ کسی شخص پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر جتنی اس کی طاقت ہو۔)

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: الا دون طاقتھا مگر اس کی طاقت سے کم۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ یعنی اس کے لئے اس خیر اور نیکی کے عمل کا اجر ہوگا جو اس نے کیا۔ وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ اور اس پر اس برے عمل کا وبال ہوگا جو اس نے کیا۔ تو اس وقت حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے کہا: مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا۔ تب حضور نبی کریم ﷺ نے کہا: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ هَمَّ بِهَا رَبٌّ! هُمْ كَوْنَهُمْ يَكْزُرُونَ اگر ہم بھولیں یعنی لاعلم رہیں اَوْ أَخْطَاْنَا يَا هُمْ خَطَا کر بیٹھیں یعنی اگر ہم ارادہ کریں۔ اور کہا جاتا ہے: اگر ہم عمل کر بیٹھیں بھول کر اور خطا۔ تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے کہا: آپ کو یہ عطا کر دیا گیا، تحقیق آپ کی امت سے خطا اور نسیان اٹھائے گئے ہیں۔ (1)

پس آپ کسی دوسری شے کی التجا کیجئے۔ تو آپ نے کہا: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إَصْرًا، إَصْرًا سَ مِنْ قَبْلِنَا (جیسے تو نے ڈالتا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔) اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے ظلم کے سبب پاکیزہ چیزیں بھی حرام قرار دیں۔ اور وہ جب رات کے وقت گناہ کرتے تھے تو وہ اسے اپنے دروازے پر لکھا ہوا پاتے تھے اور ان پر نمازیں پچاس تھیں، پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف کر دی اور ان سے پچاس نمازیں فرض کرنے کے بعد کم کر دیں (2)۔ پھر عرض کی: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وہ کہہ رہے ہیں: ایسے عمل کا جو ہم پر نہ ڈال جسے کرنے کی طاقت ہم نہیں رکھتے کہ پھر تو ہمیں عذاب دے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا عمل جو ہم پر گراں اور مشکل ہو، کیونکہ اگر انہیں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا تو وہ اس کی طاقت رکھتے

1۔ السنن ابن ماجہ، باب طلاق البکرة والناس، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، ذکر الصلاة، حدیث نمبر 2968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں، لیکن وہ ان پر شاق اور مشکل ہوگا اور وہ اس پر دوام اور ہمیشگی اختیار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ **وَاعْفُ عَنَّا** اور ہمارے ہر قسم کے (گناہوں کو) معاف فرما **وَاعْفِرْ لَنَا** اور ہم سے درگزر فرما اور کہا جاتا ہے: **وَاعْفُ عَنَّا** اور ہمیں مسخ (شکل بدلنے) سے معاف فرما **وَاعْفِرْ لَنَا** اور ہمارے خسف (زمین میں دھنسا) سے درگزر فرما۔ **وَإِذَا حُكِمْنَا** اور ہم پر قذف (پتھر برسانا) سے رحم فرما، کیونکہ سابقہ امتوں میں سے بعض کی شکلیں مسخ کر دی گئیں، بعض کو زمین میں دھنسا دینے کا عذاب دیا گیا اور بعض پر پتھر برسائے گئے۔ پھر کہا **أَنْتَ مَوْلَانَا** یعنی تو ہمارا ولی ہے اور تو ہمارا محافظ ہے۔ **فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ** سو آپ کی دعا قبول کر لی گئی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ”میری ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے۔ نصرت بالرعب مسیرۃ شہر (1) اور کہا جاتا ہے کہ لشکری جب اپنے گھروں سے خالص نیت کے ساتھ نکلتے اور جنگ کا طبل بجاتے تو کفار کے دلوں میں رعب اور ہیبت ایک مہینہ کی مسافت سے واقع ہو جاتی۔ انہیں ان کے نکلنے کا علم ہوتا یا علم نہ ہوتا۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب (معراج سے) لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات وحی فرمائیں تاکہ آپ اپنی امت کو اس کے بارے آگاہ کریں۔ اور اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی ہے۔

زجاج نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نماز اور زکوٰۃ کے فرض ہونے کا ذکر فرمایا اور حج کے احکام اور حیض، طلاق، ایلا کا حکم اور انبیاء علیہم السلام کے قصص بیان فرمائے اور ربا کا حکم بیان فرمایا، (تو) اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اپنی عظمت و شان کا ذکر فرمایا: **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا ذکر فرمایا اور پھر ان تمام کے بارے مومنین کی تصدیق کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا: **اَمَّا الرُّسُوْلُ فَاَنْزَلْنَا إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ** یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اشیاء کی تصدیق کی جن کا ذکر جاری ہے۔ اور اسی طرح تمام مومنین نے اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، اس کی کتب اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا سبب نزول اس کی ماقبل آیت ہے اور وہ یہ ہے **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** **وَإِنْ تُبَدُّوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخَفُّوهُ يَحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۖ فَيَغْفِرْ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبْ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝** کیونکہ جب یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر انتہائی گراں اور شدید ثابت ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور گھٹنے فیک کر بیٹھ گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایسے اعمال کا مکلف بنایا گیا ہے جن کی ہم طاقت رکھتے ہیں: نماز، روزہ، جہاد (اور صدقہ) اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل کی ہے اور ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ تم اس طرح کہو جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا تھا۔ **سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا** (ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی) بلکہ تم یہ کہو **سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا** **غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ** (ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اے ہمارے رب ہم تیری بخشش کے طالب ہیں اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) تو انہوں نے کہا: **سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا** **غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ** پس جب قوم نے اسے پڑھا تو اس کے ساتھ

ان کی زبانیں پست ہو گئیں۔ تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَمِنْ الرَّسُولِ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ اَمِنْ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاطَعْنَا عَفْرَانِكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٥٠﴾

پس جب انہوں نے یہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يَكْلِفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نُسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا فَرَمَا: ”ہاں“ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا فَرَمَا: ”ہاں“ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ فَرَمَا: ”ہاں“ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ﴿٥١﴾ فَرَمَا: ”ہاں“ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پہلی روایت میں یہ قول قد فعلت اور اس روایت میں کہا: نعم یہ اس پر دلیل ہے کہ حدیث بالمعنی نقل کی گئی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور جب اس پر امر پختہ ہو گیا کہ انہوں نے کہا: سَمِعْنَا وَاطَعْنَا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تعریف اور مدح کی اور اس مشقت کو دور کر دیا جو انہیں دلوں میں کھٹکنے والی چیزوں کے سبب ہوئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی طرف کامل متوجہ ہونے کا ثمرہ ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے لئے اس کا برعکس ظاہر ہوا، ان کی مذمت کی اور انہیں ذلت، محتاجی، اور جلا وطنی جیسی مشقتوں میں ڈال دیا جب انہوں نے یہ کہا تھا۔ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی اختیار کرنے کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے احسان اور مہربانی سے اس عذاب اور سزا سے پناہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کی گئی کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کا گھر ہر رات چراغوں کے ساتھ روشن ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: شاید وہ سورۃ البقرہ پڑھتا ہو، سو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نے سورۃ البقرہ میں سے اَمِنْ الرَّسُولِ پڑھی ہے (2)۔ یہ تب نازل ہوئی جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر وہ دھمکی شاق گزری جو اللہ تعالیٰ نے ان تصورات پر حساب لینے کے بارے انہیں فرمائی جنہیں ان کے دل مخفی رکھے ہوئے ہوں گے، تو انہوں نے اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکوہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”شاید تم یہ کہہ رہے ہو سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا جیسا کہ بنی اسرائیل نے کہا تھا۔“ تو انہوں نے عرض کی: (نہیں) بل سَمِعْنَا وَاطَعْنَا۔ بلکہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں اَمِنْ الرَّسُولِ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ نازل فرمائی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اور ان کے لئے فرض ہے کہ وہ ایمان لائیں (3)۔“

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَمِنْ اس کا معنی صدق ہے یعنی تصدیق کی اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور وہ جو نازل کیا گیا وہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 77

2۔ فضائل القرآن، سورۃ القرآن وآیات، صفحہ 229، دار ابن کثیر دمشق بیروت

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 178-179

قرآن کریم ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح پڑھا ہے۔ وَأَمِنَ الْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ بِاللهِ يَهْدِيهِ لَفْظٍ (عطف کی بنا) پر ہے (1)۔ اور غیر قرآن میں معنی پر (عطف کرتے ہوئے) آمَنُوا پڑھنا بھی جائز ہے۔

نافع، ابن کثیر، عاصم ابوبکر کی روایت میں اور ابن عامر رحمہ اللہ نے و کُتِبَ صِيغَةَ جَمْعٍ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور انہوں نے سورۃ التحریم میں کتابہ صیغہ واحد پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو نے یہاں اور سورۃ التحریم میں و کُتِبَ صِيغَةَ جَمْعٍ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے دونوں میں کتابہ واحد کے ساتھ قرأت کی ہے۔ پس جنہوں نے جمع پڑھا ہے انہوں نے کتاب کی جمع کا ارادہ کیا ہے اور جنہوں نے مفرد پڑھا ہے انہوں نے اس مصدر کا ارادہ کیا ہے جو ہر لکھی ہوئی شے کو جامع ہوتا ہے جس کا نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو (2)۔ اور جنہوں نے واحد پڑھا ہے ان کی قرأت میں بھی یہ جائز ہے کہ اس سے مراد جمع لیا جائے، اس اعتبار سے کہ کتاب اسم جنس ہے۔ پس دونوں قرأتیں مساوی طور پر برابر ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ (البقرہ: 213) (تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبریں سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب)۔

جماعت نے دُرُسُہِ سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح رُسُلُنَا و رُسُلُکُمْ و رُسُلُکَ میں ہے سوائے ابو عمرو کے اور ان سے رُسُلُنَا و رُسُلُکُمْ کی تخفیف مروی ہے۔ اور ان سے رُسُلُکَ میں تَحْقِیل اور تخفیف دونوں مروی ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: جنہوں نے رُسُلُکَ کو تَحْقِیل کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کی اصل ہے اور جنہوں نے تخفیف کی ہے تو اسی طرح احاد میں تخفیف کی جاتی ہے، مثلاً عُنُقٌ و طُنْبٌ۔ اور جب احاد میں تخفیف کی جائے تو یہ اس جمع میں زیادہ مناسب ہے جو زیادہ ثقیل ہے۔ فرمایا اس کا (یہ) معنی مکی ہے۔ اور جمہور لوگوں نے لَا نَفَرًا قِي نُونٌ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے یقولون لَا نَفَرًا (3) (وہ کہتے ہیں ہم فرق نہیں کرتے) اور قول حذف کر دیا گیا۔ اور قول کا حذف کرنا کثیر اور زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ یعنی یقولون سَلَامٌ عَلَيْكُمْ۔ (وہ کہیں گے تم پر سلام ہو) اور مزید فرمایا: وَتَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا، اِی یقولون رَبَّنَا (وہ کہیں گے اے ہمارے رب! اور اسی طرح (ان میں ہے) جو اس کی مثل ہیں۔ سعید بن جبیر، یحییٰ بن یعمر، ابو زرہ بن عمرو بن جریر اور یعقوب نے لَا یَفْرُقُ یَا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لفظ کل کی بنا پر ہے۔

ہارون نے کہا ہے: اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَا یَفْرُقُونَ (4) ہے۔ اور بَيْنَ أَحَدٍ مَفْرَدٍ پڑھا ہے آحاد نہیں کہا ہے، کیونکہ اَحَدٌ واحد اور جمع تمام کو شامل ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٥﴾ (الحاقہ) اس میں حَاجِزِينَ احد کی صفت ہے، کیونکہ اس کا معنی جمع ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَا أَحْدَلَتِ الْغَنَائِمُ لَاحِدٍ سَوْدَ الرَّؤُسِ غَيْرُكُمْ (5) (تمہارے سوا بڑے سرداروں میں سے کسی کے لئے غنائم حلال نہیں کی گئیں)۔ اس میں سَوْدُ

4۔ ایضاً

3۔ ایضاً، صفحہ 392

2۔ ایضاً

1۔ البحر الوجیز، جلد 1، صفحہ 391، دار الکتب العلمیہ

5۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 134۔ جامع ترمذی، باب سورۃ الانفال، حدیث نمبر 3010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الرؤس، احد کی صفت ہے۔ اور رؤبہ نے کہا ہے:

اِذَا اُمُورُ النَّاسِ دِينَتُ دِينَكَ لَا يَرْهَبُونَ اَحَدًا مِنْ دُونِكَ
جب لوگوں کے امور تیرے دین کے تابع بنادیئے گئے ہیں تو وہ تیرے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

اس آیت کا معنی ہے: بے شک مومنین یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں ہیں اس میں کہ وہ بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا اس میں حذف ہے، یعنی سَمِعْنَا سَمَاعَ قَابِلِينَ ہم نے قبول کرے والوں کے سماع کی طرح سنا۔ اور کہا گیا ہے: سَمِعَ بمعنی قَبِلَ ہے (یعنی قبول کرنا) جیسا کہ کہا جاتا ہے: سَمِعَ اللہ لِسَنَ حَمْدِهِ، تو اس میں حذف نہ ہوگا۔ المختصر یہ قول اپنے کہنے والے کی مدح کا تقاضا کرتا ہے اور اطاعت کا معنی حکم کو قبول کرنا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: غُفِرَ اِنَّكَ یہ مصدر ہے جیسا کہ کفران اور خسران ہیں اور اس میں عامل فعل مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: اغفر غفرا اِنَّكَ، (تو اپنی بخشش عطا فرما۔) زجاج نے یہی کہا ہے اور اس کے سوا دوسروں نے کہا ہے: نطلب او أسأل غفرا اِنَّكَ (ہم یا میں تیری بخشش کے طالب ہیں۔) وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ یہ دوبارہ زندہ کئے جانے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا اقرار ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو کہا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر غنائم کو حلال کیا ہے سو آپ مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا۔“ پس آپ نے آخر سورت تک التجا کی (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا..... تکلیف سے مراد وہ امر ہے جس کے ساتھ کسی کو آزمایا جائے اور تَكَلَّفْتُ اَلْاَمْرَ کا معنی ہے میں نے اسے کام کرنے کی تکلیف دی، اسے جوہری نے بیان کیا ہے اور اَلْوُسْعُ کا معنی ہے طاقت اور کوشش۔ اور یہ یقینی خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نص بیان فرمائی ہے کہ وہ آیت نازل ہونے کے وقت سے بندوں کو دل یا دیگر اعضاء بدن کے اعمال میں سے کسی عبادت کا پابند اور مکلف نہیں بنائے گا مگر اسی کا جو مکلف کی وسعت اور طاقت میں ہوگی اور اس کے ادراک اور اس کی فطرت کے تقاضا کے مطابق ہوگی تو اس سے مسلمانوں سے وہ غم اور پریشانی دور ہوگئی جو دلوں میں آنے والے تصورات کا حساب لینے کے حکم سے انہیں لاحق ہوئی تھی (2)۔ اور اس آیت کے معنی میں وہ روایت ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کی جسے اس کی ماں نے جنم دیا ہے، کیونکہ میں ایک دن ان کے پیچھے پیچھے گیا اور مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی وہ اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے گھی کی مشک کے سوا کچھ نہ پایا، اس میں گھی کے کچھ اثرات تھے، چنانچہ انہوں نے اسے ہمارے سامنے پھاڑ دیا اور ہم نے اسے چائنا شروع کر دیا جو اس میں گھی اور کھجوروں کا اثر تھا۔ اور وہ کہنے لگے:

مَا كَلَّفَ اللّٰهُ نَفْسًا فَوْقَ طَاقَتِهَا وَلَا تَجُودَ يَدٌ اِلَّا مَا تَجِدُ

اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا اور ہاتھ وہی شے سخاوت کرتا ہے جو وہ پاتا ہے۔
مسئلہ نمبر 5۔ دنیوی احکام میں تکلیف مالا یطاق کے جائز ہونے کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے جبکہ اس پر ان کا اتفاق ہے کہ شریعت میں تکلیف مالا یطاق واقع نہیں ہے اور اس آیت نے اس کے معدوم ہونے کے بارے آگاہ کیا ہے۔ ابوالحسن اشعری اور متکلمین کی ایک جماعت نے کہا ہے: تکلیف مالا یطاق عقلاً جائز ہے۔ اور یہ عقائد شرعیہ میں سے کسی شے کو ساقط نہیں کرتی اور یہ مکلف کو عذاب دینے پر علامت ہے اور اس کے بارے یہی (حکم) قطعی ہے گویا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی مصور کو جو پر گرہ لگانے کا پابند کیا جائے۔ (1)

اور اس کے جواز کے قائلین نے اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں واقع ہے یا نہیں ہے؟ پس ایک جماعت نے کہا ہے: یہ ابولہب کے بارے میں نازل ہونے والی سورت میں واقع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام شریعت کے ساتھ ایمان لانے کا مکلف بنایا اور من جملہ یہ بھی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، کیونکہ اس پر دونوں ہاتھوں کے ٹوٹنے اور آتش جہنم میں پھینکے جانے کا حکم لگایا گیا ہے اور یہ اس پر مطلع کرتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ تحقیق اسے ایمان لانے کا مکلف بنایا جو اس کے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔

اور ایک جماعت نے کہا ہے۔ یہ کبھی واقع نہیں ہوئی۔ اور اس پر اجماع بیان کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ سَيُضِلُّ نَارًا کا معنی یہ ہے: اگر وہ اس میں پہنچا (2) اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

اور يُكَلِّفُ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک محذوف ہے اور وہ عبادۃ یا شیئاً ہے (3)۔ پس اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہم پر اپنا لطف و انعام فرمایا۔ اگر وہ چاہتا تو ہمیں ایسے امور کا مکلف بنا دیتا جو مشقت آمیز اور اذیت رساں ہوتے ہیں جیسا کہ دس کے مقابلہ میں ایک کا ثابت قدم رہنا، انسان کا ہجرت کرنا اور اپنے وطن سے نکلنا اور اپنے گھر والوں، اپنے وطن اور اپنے کاروبار سے کلیۃً علیحدگی اختیار کرنا، لیکن اس نے ہمیں ایسے کاموں کا جو سخت مشقت آمیز ہوں اور ایسے امور جو اذیت اور تکلیف پہنچانے والے ہوں ان کا مکلف اور پابند نہیں بنایا۔ جیسا کہ اس نے ہم سے پہلے لوگوں کو مکلف بنایا مثلاً اپنے نفسوں کو قتل کرنا اور اپنے کپڑوں اور جسم پر پیشاب لگ جانے والی جگہ کا شواغیرہ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سہولت عطا فرمائی اور نرمی فرمائی اور ہم سے اس بوجھ اور طوق کو دور فرما دیا جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے ہوئے تھا۔ فدلّٰہ الحمد والمنۃ والفضل والنعمة۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے وہ نیکیوں اور برائیوں کا ارادہ فرما رہا ہے۔ (یعنی اس کے لئے اجر ہوگا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔) سدی نے یہی کہا ہے۔ اور مفسرین کی جماعت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، ابن عطیہ نے یہ کہا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (الانعام: 164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) اور

1۔ بخاری حدیث، باب من کذب لی حلیہ، حدیث نمبر 6520، فیاء القرآن جلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دار الکتب العلمیہ

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164) (اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے) اور دل میں پیدا ہونے والے تصورات اور اس طرح کے دیگر وساوس انسان کی کمائی اور کسب میں سے نہیں ہیں۔ اور نیکیوں کے ذکر میں نہا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ یہ ان میں سے ہیں جنہیں کرنے سے آدمی خوش ہوتا ہے اور ان کے ساتھ مسرت محسوس کرتا ہے لہذا انہیں اس کی ملکیت کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے اور سیئات کے ذکر میں عَنِهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ وہ بھاری بوجھ ہیں اور انہیں اٹھانا انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہے، اور وہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: لی مال و علی دین (میرے لئے مال ہے اور مجھ پر قرض ہے یعنی مال میری ملکیت ہے اور قرض مجھ پر بوجھ ہے۔)

فعل کسب کو مکرر (دوبار) لایا گیا ہے اور باب مختلف ذکر کیا ہے تاکہ نوع کلام حسین ہو جائے جیسا کہ فرمایا: فَهَلِ الْكَافِرِينَ أَهْلُهُمْ مُؤَيَّدًا ۝ (الطارق) (پس آپ کفار کو (تھوڑی سی) مہلت اور دے دیں کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہیں) ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں میرے لئے جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ نیکیاں وہ ہیں جو بغیر تکلف کے کمائی جاتی ہیں کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کے حکم کے راستہ پر اور طریقہ شریعت پر ہوتا ہے اور برے اعمال تکلف اور مبالغہ کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں، کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کی نبی کے حجاب کو پھاڑ کر ان کے بارے میں تکلف کرتا ہے اور ان کی طرف خطا اور غلطی کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے۔ لہذا آیت میں اس فعل کا دو بابوں سے آنا اس معنی کی حفاظت کے لئے انتہائی حسین ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بندوں کے افعال پر ائمہ نے جو کسب اور اکتساب کا اطلاق کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے ان پر خلق اور خالق کا اطلاق نہیں کیا ہے، بخلاف ان کے جنہوں نے بدعتی گروہوں میں سے اس کا اطلاق کرنے کی جرأت کی ہے۔ اور ہمارے ائمہ میں سے جنہوں نے بندے پر اس کا اطلاق کیا ہے اور یہ کہ وہ فاعل (کام کرنے والا) ہے تو وہ خالصہ مجاز ہے۔ اور مہدوی وغیرہ نے کہا ہے: آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی کو دوسرے کے گناہ کے عوض نہیں پکڑا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: فی نفسہ یہ صحیح ہے لیکن یہ اس آیت کے سوا سے ثابت ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ الکیا طبری نے کہا ہے: قوله تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ جس نے کسی دوسرے کو قتل کر دیا بھاری ہتھیار کے ساتھ یا گلا گھونٹ کر یا پانی میں غرق کر کے تو اس پر قصاص یا دیت کی صورت میں اس کی ضمان ہوگی، بخلاف اس کے جس نے اس کی دیت عاقلہ پر قرار دی ہے اور یہ ظاہر کے خلاف ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ باپ سے قصاص کا ساقط ہونا اس کے شریک سے اس کے ساقط ہونے کا تقاضا نہیں کرتا اور یہ قول عاقلہ پر حد واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے جب وہ مجنون کو اپنی ذات پر قدرت دے۔

اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: ”ہمارے علماء نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ قصاص باپ کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اور خطا کرنے والے کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے قتل کا کسب کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جس پر قصاص واجب نہیں ہوتا

اس کا ایسے آدمی کے ساتھ شریک ہونا جس پر قصاص واجب ہوتا ہے اس حکم کے سقوط میں شبہ نہیں بن سکتا جسے شبہ کے سبب ساقط کر دیا جاتا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نُسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا اس کا مفہوم یہ ہے اس گناہ سے درگزر فرمائے جو ہم سے ان دونوں طریقوں پر یا ان میں سے ایک طریقہ پر صادر ہوتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے رفع عن امتی الخطأ والنسيان وما استكرهوا عليه (2) (میری امت سے خطا، نسیان اور اس (گناہ) کو جس پر انہیں مجبور کیا جائے اٹھالیا گیا ہے۔ یعنی ایسے گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گناہ اٹھالیا گیا ہے۔ البتہ ان احکام میں اختلاف ہے جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ کیا وہ اٹھالے ہیں اور اس سے کوئی شے لازم نہ آئے گی یا اس کے سارے احکام لازم آئیں گے؟ اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ واقعات مختلف ہونے سے یہ بھی مختلف ہوتے ہیں، پس ایک قسم وہ ہے کہ وہ بالاتفاق ساقط نہیں ہوتی مثلاً تاوان، دیات اور فرض نمازیں۔ اور ایک قسم وہ ہے جو بالاتفاق ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً قصاص اور کلمہ کفر زبان پر لانا۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس میں اختلاف ہے مثلاً وہ آدمی جس نے رمضان المبارک میں بھول کر کھالیا یا بھول کر حائض ہو گیا (یعنی قسم توڑ دی) اور وہ کام جو ان کی مثل ہوں اور خطا اور بھول کر واقع ہو سکتے ہوں اور وہ فروع میں معروف ہوں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إَصْرًا۔ إَصْرًا کا معنی ثقل اور بوجھ ہے۔ امام مالک اور ربیع نے کہا ہے: إصر سے مراد انتہائی سخت اور مشکل امر ہے (3) اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ إصر سے مراد عمل کی شدت اور سختی ہے اور وہ جو بنی اسرائیل پر انتہائی شدید اور سخت تھے مثلاً پیشاب وغیرہ کے مسائل۔ اور ضحاک نے کہا ہے: وہ انتہائی تکلیف دہ اور شدید امور برداشت کرتے تھے اور یہ امام مالک اور ربیع رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کی طرح ہی ہے۔ اور اسی سے نابغہ کا قول ہے:

يَا مَانِعَ الْغِيَمِ ان يَغْشَى سَرَاتِهِم
وَالْحَامِلِ الْإِصْرَ عَنْهُمْ بَعْدَ مَا عَرَفُوا

حضرت عطاء نے کہا ہے: الإصر سے مراد شکل مسخ کر کے بندر یا خنزیر بنادینا ہے۔ اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہے جس میں نہ توبہ ہو اور نہ ہی کفارہ ہو (4)۔ اور لغت میں إصر کا معنی عہد ہے۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي اور الإصر کا معنی تنگی، گناہ اور بوجھ ہے اور الإصرار سے مراد وہ رسی ہے جس کے ساتھ بوجھ وغیرہ باندھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: أَصْرًا بِمَعْنَى حَبْسٍ یعنی اس نے اسے روک لیا۔ اور الإصر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اسی سے ہے، جو ہری نے کہا ہے: اسم ظرف مَاصِرٍ اور مَاصِرٍ ہے اور جمع مَاصِرٍ ہے اور عام طور پر تو کہتا ہے معاصر۔

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 264

2۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 233، حدیث نمبر 10307۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب طلاق المکرمۃ والناس، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ

ابن خویز مند اد نے کہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ظاہر سے ہر اس عبادت میں استدلال کیا جائے جس کے بوجھ اور ثقیل ہونے کا خصم دعویٰ کرے، پس یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہے: **وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ** (الحج: 78) اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **الدِّينُ يُسْرُ فَيَسِّرُوا وَلَا تَعْسِرُوا** (1) (دین آسان ہے پس تم آسانی پیدا کرو اور تنگی اور مشکل نہ بناؤ)۔ **اللَّهُمَّ شَقِ عَلَى مَنْ شَقَّ عَلَى أُمَّةٍ مُحَمَّدٍ ﷺ**۔ (اے اللہ اس پر مشقت ڈال دے جس نے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مشقت ڈالی ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسی طرح الکلیا الطبری نے کہا ہے: اس سے حرج اور تنگی کی نفی میں استدلال کیا جاتا ہے اور جس کا ظاہر بخشش اور نرمی کے میلان کے منافی ہو۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: **وَلَا تُحِبُّنَا مَالًا طَائِفَةً لَّنَا** حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو ہم پر شدت اور سختی نہ کر جس طرح تو نے ان پر سختی کی جو ہم سے پہلے تھے۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: ہم پر ایسے اعمال کا بوجھ نہ ڈال جنہیں کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے اور اسی طرح ابن زید نے کہا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: تو ہماری شکلیں بندروں اور خنزیروں میں مسخ نہ کر دے۔ اور سلام بن سابور نے کہا: وہ جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ وہ شہوت پرستی ہے۔ اسے نقاش نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے بیان کیا ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: **وَاعُوذُ بِكَ مِنْ غُلْمَةٍ لَيْسَ لَهَا عِدَّةٌ** (میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس شہوت پرستی سے جس کی عدت نہ ہو)۔ (سدی نے کہا ہے: اس سے مراد وہ سختی اور پیاس ہے جو بنی اسرائیل پر مسلط تھی) (2)۔

قولہ تعالیٰ: **وَاعْفُ عَنَّا** اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما۔ عفو عن ذنبہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو اسے چھوڑ دے اور اسے سزا نہ دے۔ **وَاعْفِرْ لَنَا** ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دے (ان پر پردہ ڈال دے) اور الغفر کا معنی پردہ ہے۔ **وَأَرْحَمْنَا** اور رحمت فرما جس کا آغاز تیری جانب سے ہم پر ہو۔ **أَنْتَ مَوْلَانَا** یعنی تو ہمارا ولی اور ہمارا مددگار ہے۔ اور یہ آیات مخلوق کی تعلیم کے لئے بیان کی گئی ہیں کہ وہ کیسے دعا مانگیں گے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جب اس سورت کی قرأت سے فارغ ہوتے تو کہتے۔ آمین۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کے بارے میں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہو، پس اگر ایسا ہے تو یہ کمال ہے اور اگر یہ سورۃ الحمد پر قیاس کے سبب ہے اس حیثیت سے کہ وہاں دعا ہے اور یہاں بھی دعا ہے تو یہ اچھا ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: میں گمان نہیں رکھتا کہ کسی نے اسلام کو سمجھا ہو اور اس کا ادراک کیا ہو اور وہ ان دونوں (آیات) کو پڑھے بغیر سو جائے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم نے اس معنی میں حضرت ابوسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ

2۔ الحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ

1۔ کشف الغطاء للعجلونی، جلد 1، صفحہ 498، بحوالہ موسوعہ اطراف الحدیث

3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 395

ﷺ نے فرمایا: ”جس نے رات کے وقت سورۃ البقرہ کی یہ دونوں آیتیں پڑھ لیں تو یہ اسے کافی ہیں (1)۔“ کہا گیا ہے: یہ اسے قیام اللیل سے کافی ہیں (یعنی یہ اس طرح ہے گویا اس نے رات کو عبادت کرتے ہوئے گزارا۔) جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جنت کے خزانوں میں سے دو آیتیں نازل فرمائی ہیں، ان کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا ہے رحمن نے مخلوق کو پیدا کرنے سے ایک ہزار برس پہلے اپنے دست قدرت سے انہیں تحریر فرمایا۔ جس نے عشاء کے بعد ان دونوں کو دوبار پڑھا وہ دونوں اس کے لئے قیام اللیل سے کافی ہوں گی۔ اور وہ اَصْحٰنُ التَّوْحٰدِ سے آخر سورۃ البقرہ تک ہیں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں اسے شیطان کے شر سے (محفوظ رکھنے کے لیے) کافی ہوں گی اور اسے اس پر کوئی غلبہ نہ ہو سکے گا۔ اور ابو عمرو الدانی نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنے سے دو ہزار برس پہلے ایک کتاب لکھی پس اس سے یہ تین آیات نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا گیا جس نے انہیں اپنے گھر میں پڑھا تین راتوں تک شیطان اس کے گھر کے قریب نہیں آئے گا (3)۔“

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: اُوْتِيَتْ هَذِهِ الْآيَاتُ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِنْ كُنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ لَمْ يُوْتِهِنَّ نَبِيٌّ قَبْلِي (4) (مجھے سورۃ البقرہ کی یہ آخری آیات عرش کے نیچے والے خزانے سے عطا کی گئی ہیں اور یہ مجھ سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کو عطا نہیں کی گئیں۔) اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں فرشتے کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ انہیں لے کر نازل ہونے کا ذکر گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1- صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب فضل سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 4624، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2- الکشاف، جلد 1، صفحہ 333

3- جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 112۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی آخر سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2807، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4- مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 151

سورہ آل عمران

﴿سورة آل عمران مكية ٨٩﴾ ﴿مكية عا ٢٠﴾

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَللّٰهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝

”الف - لام - میم - اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے، زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝ یہ بالاجماع مدنی سورت ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے کہ تورات میں اس کا نام طیبہ ہے (1)، اور حسن، عمرو بن عبید، عاصم بن ابی النجود اور ابو جعفر الرواسی نے اَللّٰهُمَّ - اَللّٰهُمَّ الف وصل کو قطع کے ساتھ پڑھا ہے، اس تقدیر پر کہ اَللّٰهُمَّ پر وقف ہے۔ جیسا کہ وہ اسماء اعداد مثلاً واحد، اثنان، ثلاثہ اور اربعۃ وغیرہ میں وقف مقدر کرتے ہیں، حالانکہ وہ انہیں اکٹھا اور ملا کر پڑھتے ہیں۔

انفش سعید نے کہا ہے: اَللّٰهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ساکنین کی وجہ سے میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ غلطی ہے۔ ثقیل ہونے کی وجہ سے عرب اس طرح نہیں کہتے۔ نحاس نے کہا ہے: پہلی قرأت ہی قرأت عامہ ہے اور متقدمین علمائے نحو نے اس میں گفتگو کی ہے۔ پس سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے میم کو فتح دیا جائے اور انہوں نے اس کے لئے فتح کو اختیار کیا ہے تاکہ کسرہ اور یا اور اس کے ماقبل کے کسرہ کے درمیان اسے جمع نہ کر دیا جائے۔

اور کسائی نے کہا ہے: حروف تہجی کے ساتھ الف وصل مل جائے اور تو الف وصل کو حذف کر دے تو اسے الف کی حرکت کے ساتھ حرکت دے گا اور یہ کہے گا: اَللّٰهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، والتم اذکر، والتم اقتربت۔

اور امام فراء نے کہا ہے: اَللّٰهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ کی اصل وہی ہے جسے رواسی نے پڑھا ہے پھر ہمزہ کی حرکت میم پر ڈال دی گئی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اَلْحَيُّ الْقَيُّومُ پڑھا ہے (2) اور خارجہ نے کہا ہے: حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اَلْحَيُّ الْقَيُّومُ ہے۔ وہ حروف جو سورتوں کے اوائل میں آئے ہیں ان کے بارے علماء کی آراء سورۃ البقرہ کے شروع میں بیان ہو چکی ہیں۔ اس حیثیت سے اس سورت میں اَللّٰهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّومُ ایسا جملہ آیا ہے جو قائم بنفسہ ہے۔ اور اس میں وہ تمام اقوال متصور ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ امام کسائی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور سورہ آل عمران شروع کی اور پڑھا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سُلَیْمَانَ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَسَلِّمْ۔ اللہ لا الہ الا هو الحی القیام اور پہلی رکعت میں سو آیات تلاوت کیں اور دوسری رکعت میں بقیہ سو آیات پڑھیں (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: دور کعتوں میں ایک سورت نہیں پڑھی جائے گی اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کے لئے جائز ہے۔ اور امام مالک نے المجموعہ میں کہا ہے: اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ (مہتمم) بالشان نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف تلاوت فرمائی اور اسے دور کعتوں میں تقسیم کر دیا (2)۔ اسے نسائی نے بھی بیان کیا ہے اور ابو محمد عبدالحق نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس سورت کی فضیلت میں کئی آثار و اخبار موجود ہیں اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ یہ سورت سانپوں سے امان ہے۔ اور فقراء اور محتاجوں کے لئے یہ خزانہ ہے۔ اور یہ آخرت میں اپنے قاری کی جانب سے جھگڑا کرے گی اور رات کے وقت جس نے اس کی آخری آیات پڑھیں اس کے لئے ساری رات قیام کرنے کی طرح کا ثواب لکھا جائے گا۔ وغیرہ ذالک۔ دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں ابو عبید قاسم بن سلام نے بیان کیا، انہوں نے کہا مجھے عبید اللہ اشجعی نے بتایا، انہوں نے کہا مجھے مسعر نے بیان کیا، انہوں نے کہا: مجھے جابر نے اس حالت میں واقع ہونے سے پہلے بتایا جس میں وہ واقع ہوئے کہ حضرت شعبی سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: فقراء اور محتاجوں کے لئے سورہ آل عمران کتنا بہترین اور اچھا خزانہ ہے جو رات کے آخری حصہ میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے (3)۔ (یعنی نوافل میں اس کی تلاوت کرتا ہے۔)

محمد بن سعید نے، عبد السلام نے جریری سے انہوں نے ابی السلیل سے بیان کیا ہے: ایک آدمی وسیع جنگل میں پہنچا اور اس نے وادی مجنہ میں پناہ لی اور یہ وہ وادی ہے جس میں جو بھی چلتا تھا اسے سانپ ڈس لیتے تھے اور اس وادی کے کنارے پر دوراہب تھے۔ پس جب شام ہوئی تو ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا: قسم بخدا! یہ آدمی ہلاک ہو گیا! راوی کا بیان ہے۔ پس اس آدمی نے سورہ آل عمران پڑھنی شروع کر دی۔ دونوں راہبوں نے کہا: اس نے سورہ طیبہ پڑھی ہے شاید نجات پا جائے گا۔ راوی کہتا ہے: پس اس آدمی نے صحیح سالم صبح کی۔ اور مکحول سے روایت ہے: جس نے جمعہ کے دن سورہ آل عمران پڑھی رات تک ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جس نے رات کے وقت سورہ آل عمران کی آخری آیات پڑھیں تو اس کے لئے پوری رات کے قیام کا ثواب لکھ دیا گیا اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے۔

اور مسلم نے نو اس بن سمان کلانی سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”اے قیامت کے دن قرآن کے ساتھ اور ان اہل قرآن کے ساتھ لایا جائے گا جو اس کے مطابق عمل کرتے رہے اور اس کے آگے سورۃ البقرہ اور آل عمران ہوں گی..... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لئے تین مثالیس بیان فرمائیں جنہیں میں ابھی تک نہیں بھولا، فرمایا: گویا کہ یہ دونوں دو بال ہیں یا دوسیاہ سائے ہیں جن کے درمیان روشنی اور چمک ہے یا گویا

یہ دونوں پرندوں کا گروہ ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے قاری کی جانب سے جھگڑیں گی (1)۔

مسلم نے ہی حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”قرآن کریم پڑھا کرو کیونکہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لئے شفیع بن کر آئے گا تم زہراؤین (یعنی) سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھا کرو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس حال میں آئیں گی گویا کہ یہ دو بادل ہیں یا گویا کہ یہ دو سائے ہیں یا گویا کہ یہ دونوں پرندوں کے غول ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں اور یہ اپنے پڑھنے والوں کی جانب سے جھگڑا کریں گی۔ سورۃ البقرہ پڑھا کرو کیونکہ اسے لے لینا برکت ہے اور اسے چھوڑنا حسرت ہے اور جادوگر اس کی استطاعت نہیں رکھیں گے۔“ معاویہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلہ سے مراد جادوگر ہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ سورۃ البقرہ اور آل عمران کا نام الزہراؤین رکھا گیا ہے اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) بلاشبہ یہ دونوں روشن کرنے والیاں ہیں۔ (زہراؤین) الزہر اور الزہرۃ سے بنایا گیا ہے چونکہ ان کی ہدایت اور راہنمائی کی وجہ سے ان کے قاری کے لئے ان کے انوار یعنی معانی ظاہر اور روشن ہو جاتے ہیں۔ (اس لئے ان کا نام زہراؤین رکھا گیا)

(۲) پھر اس لئے کہ ان کی قرأت پر قیامت کے دن نور تمام مرتب ہوگا۔ اور یہی دوسرا قول ہے۔

(۳) ان دونوں کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو متضمن ہونے میں شریک ہیں، جیسا کہ ابو داؤد وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دونوں آیتوں میں ہے والہکم الہ واحد لا الہ الاہو الرحمن الرحیم اور وہ آیت جو آل عمران میں ہے اللہ لا الہ الاہو الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3) اسے ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ الغمام کا معنی ہے وہ بادل جو اکٹھا اور گھٹنا ہو۔ اور الغیایۃ کا معنی بھی یہی ہے جب کہ وہ سر کے قریب ہو۔ اور یہی ظلتہ بھی ہے اور روایت کا معنی یہ ہے کہ ان دونوں کی تلاوت کرنے والا ان کے ثواب کے سائے میں ہوگا جیسا کہ ایک آدمی اپنے صدقہ کے سائے میں آئے گا۔“ اور قولہ تُحَاجِّجَانِ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ملائکہ پیدا فرمائے گا جو ان کے ثواب کے عوض پڑھنے والے کی جانب سے جھگڑا کریں گے (4)۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے۔ ”بلاشبہ جس نے شَہِدَ اللہُ اَنَّهُ لَا اِلَہَ اِلَّا اللہُ الْاَیُّہِ پڑھی اللہ تعالیٰ ستر فرشتے پیدا فرما دے گا وہ اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔“

اور قولہ: بَیْنَهُمَا شَرْقٌ اسے را کے سکون اور اس کے فتح کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اور یہ روشنی پر تنبیہ ہے، کیونکہ جب فرمایا: سَوِّدَا ان اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تاریک ہیں تو اپنے قول بَیْنَهُمَا شَرْق سے اس کی نفی کی گئی۔ یعنی یہ

دونوں اپنی کثافت کے سبب ان کے درمیان جوان کے نیچے ہوں گے اور سورج کی حرارت اور تپش کی شدت کے درمیان حائل ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس سورت کا ابتدائی حصہ وفد نجران کے سبب نازل ہوا اس بارے میں محمد بن اسحاق نے محمد بن جعفر بن زبیر سے نقل کیا ہے: وہ نصاریٰ تھے جو ساٹھ سواروں پر مشتمل وفد بن کر رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ ان کے اشراف میں سے چودہ افراد ان میں تھے، ان چودہ افراد میں تین آدمی ایسے تھے جن کی طرف ان کا امر لوٹتا تھا۔ (یعنی جملہ معاملات کا انحصار تین افراد پر تھا۔) ایک عاقب تھا جو قوم کا امیر اور ان میں صاحب رائے تھا۔ اور اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ اور ایک ان کا معاون و مددگار سردار تھا اور انہیں اکٹھا کرنے والا تھا اس کا نام الایہم تھا، اور ابو حارثہ بن علقمہ بکر بن وائل میں سے ایک تھا وہ ان کا بشپ اور ان کا عالم تھا، وہ عصر کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے، وہ یمنی کپڑوں کے سبے اور چادریں پہنے ہوئے تھے تو حضور نبی کریم ﷺ کے اصحاب نے کہا: ہم نے ان کی مثل جمال و جلال والا کوئی وفد نہیں دیکھا، ان کی نماز کا وقت ہوا، وہ اٹھے اور حضور نبی مکرم ﷺ کی مسجد میں مشرق کی طرف انہوں نے نماز پڑھی۔ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم انہیں چھوڑ دو“ پھر وہ کئی دنوں تک وہاں ٹھہرے رہے اور رسول اللہ ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مناظرہ کرتے رہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ ابن اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے بیٹے) تھے۔ علاوہ ازیں وہ اضطراب میں ڈالنے والی شنیع باتیں کرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ براہین ساطعہ کے ساتھ ان کا رد کرتے رہے اور ان کی کوئی مدد نہ کی گئی اور انہیں کے بارے میں اس سورت کی ابتدائی تقریباً اسی آیات نازل ہوئیں، یہاں تک کہ ان کا معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں مہبلہ کی دعوت دے دی۔ جیسا کہ سیرت ابن اسحاق وغیرہ میں مذکور ہے (1)۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴿١﴾
مِّن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ﴿٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ
شَدِيدٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ﴿٣﴾

”نازل فرمائی اس نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ تصدیق کرنے والی ہے ان (کتابوں) کی جو اس سے پہلے (اتری) ہیں اور اتاری اس نے تورات اور انجیل، اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور اتارا فرقان کو۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیتوں کے ساتھ ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے بدلہ لینے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے بِالْحَقِّ اس سے مراد صدق (سچائی) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حجت غالبہ ہے اور قرآن کریم کو بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا، سو اسی لئے فرمایا: نَزَّلَ اور تنزیل یکے بعد دیگرے مَرَّةً بعد مَرَّةً نازل کرنے کو کہتے ہیں۔ اور تورات اور انجیل دونوں یکبارگی نازل ہوئیں۔ سو اسی لئے

(ان کے بارے) ارشاد فرمایا اَنْزَلَ اور بِالْحَقِّ میں بالکتاب سے حال کے محل میں ہے۔ اور بامحذوف کے متعلق ہے، تقدیر عبارت ہے آتیا بالحق اور یہ نَزَلَ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ وہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ تیسرے کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ اور مُصَدِّقًا حال مؤکدہ ہے حال منتقلہ نہیں، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ غیر مصدق یعنی غیر موافق ہو، یہ جمہور کا قول ہے اور بعض نے اس میں الانتقال کو مقدر مانتا ہے، اس معنی کی بنا پر کہ وہ مصدق لنفسہ بھی ہے اور مصدق لغيرہ بھی۔

قولہ تعالیٰ: لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہیں۔ اور تورات کا معنی روشنی اور نور ہے۔ یہ مشتق ہے وَرَى الزُّنْد اور وَرَى سے یہ دونوں لغتیں ہیں جب چقماق سے آگ نکلے (تو کہا جاتا ہے وَرَى الزُّنْد) اور اس کی اصل تَوْرِيَّةٌ بروزن تَفْعَلَةٌ ہے۔ تازائدہ ہے اور یا متحرک ہے اس کا ماقبل مفتوح ہے اسے الف سے بدل دیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ تَفْعَلَةٌ ہو اور پھر را کسرہ سے فتح کی طرف منتقل ہو جائے، جیسا کہ انہوں نے جاریۃ میں جَارَاۃ اور ناصیۃ میں ناصاۃ کہا ہے اور یہ دونوں وزن فراء سے منقول ہیں۔

اور خلیل نے کہا ہے: اس کا اصل وزن فَوَعْلَةٌ ہے۔ پس اصل وَوْرِيَّةٌ ہوئی، پھر پہلی واو کوتا سے بدل دیا گیا جیسا کہ تَوَلَّجٌ میں بدلا گیا ہے اور یہ اصل میں وَوَلَّجٌ تھا فَوَعْلٌ کے وزن پر اور یہ وَلَجْتُ سے ماخوذ ہے (1)، اور پھر یا متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدل دیا گیا۔ اور فَوَعْلَةٌ کا وزن تَفْعَلَةٌ کی نسبت زیادہ (قابل استعمال) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ التوراة یہ الثَّوْرِيَّة سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے کسی شے کے بارے تعریف کرنا اور اسے دوسرے سے چھپانا، تو گویا تورات میں زیادہ کنایات ہیں اور بغیر کسی تصریح اور وضاحت کے اشارات ہیں، یہ مورخ کا قول ہے۔

اور جمہور نے پہلا قول اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ مراد تورات اور انجیل ہیں۔ انجیل اِنْفِجِيلٌ کے وزن پر الشَّجَل سے ماخوذ ہے اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی جمع اناجیل اور توراة کی توار بنائی جاتی ہے۔ پس انجیل علوم اور حکم (کے معنی) کے لئے اصل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: لعن اللہ نَاجِلِيْنِہ یعنی اللہ اس کے والدین پر لعنت کرے۔ کیونکہ والدین اس کی اصل ہیں (اس لئے انہیں ناجلیہ کہا گیا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نَجَلْتُ الشَّيْءِ سے بنا ہے جب تو کسی شے کو نکالے (تو یہ جملہ بولتا ہے) پس انجیل کے ساتھ علوم و حکم نکالے گئے ہیں اور اس معنی میں اولاد اور نسل کو اس کے نکلنے کی وجہ سے نجلہ کہا جاتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اَل مَغْشٰی لَمْ یُوْرَثِ اللّٰوْمَ جَدُّہُمْ
اَصَاغَرُہُمْ و کُلُّ فَعْلٍ لَہُمْ نَجْلٌ

اس میں لفظ نَجْلٌ نکالنے کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

الشَّجَل سے مراد وہ پانی ہے جو زمین سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور اسْتَجَلَّتِ الْأَرْضُ کا معنی ہے زمین پانی رسنے کی وجہ سے دلدلی ہو گئی۔ اور اسی کو نَجَالٌ کہتے ہیں جب اس سے پانی نکلنے لگے۔ پس اسی معنی کی بنا پر اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ

تعالیٰ نے اسے حق کا درس دینے والا عافیت بنا کر نازل کیا ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ النَّجْلُ فِي الْعَيْنِ سے ہے۔ اس کا معنی ہے آنکھ کا وسیع اور کشادہ ہونا (1) اور طعنة نجلاء ہے۔
یعنی بڑا نیزہ۔ شاعر نے کہا ہے:

رُبَّمَا خَزْبَةٌ بِسَيْفٍ صَقِيلٍ مِنْ بُضْرَى وَ طَعْنَةِ نَجْلَاءِ

اس میں طعنة نجلاء بڑے نیزہ کے معنی میں مذکور ہے۔

اور اس کے ساتھ انجیل کا نام رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ اصل ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لئے نکالا ہے اور اسے ان پر نور اور ضیاء کے ساتھ پھیلا دیا ہے، وسیع کر دیا ہے۔

اور کہا گیا ہے: کہ التَّنَاجُلُ کا معنی التنازع (جھگڑا کرنا) ہے۔ اور لوگوں کے اس جھگڑا کرنے کی وجہ سے اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے۔ اور شمر نے بعض سے بیان کیا ہے: انجیل سے مراد ہر کتاب ہے جو لکھی ہوئی ہو اور اس کی سطریں وافر ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے: نجل بمعنی عمل اور صنع ہے۔ یعنی کام کرنا۔ کسی نے کہا ہے۔ وانجل في ذاك الصنيع كما نجل (اس کا روبرو میں تو بھی کام کر جیسے اس نے کیا۔)

اور یہ قول بھی ہے کہ تورات اور انجیل سریانی زبان کے الفاظ ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ انجیل سریانی میں انکیون ہے، اسے ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے اسے مذکر و مونث دونوں طرح ذکر کیا جاتا ہے۔ پس جس نے مونث ذکر کیا ہے اس نے صحیفہ کا ارادہ کیا ہے اور جس نے مذکر ذکر کیا ہے اس نے کتاب مراد لی ہے۔ کئی دوسروں نے کہا ہے: کبھی قرآن کو انجیل بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے قصہ میں مروی ہے کہ انہوں نے کہا: یا رب اری فی الألواح اقواما انا جیلہم فی صدورہم فاجعلہم امتی (اے میرے رب! میں تختیوں میں کئی اقوام کو دیکھ رہا ہوں ان کی کتابیں ان کے سینوں میں ہیں پس تو انہیں میرا امتی بنادے) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا تِلْكَ أُمَّةٌ اُحْمَدُوہِ اَحْمَدُ وَ اَحْمَدُ مِثْلُہُمْ کی امت ہے۔ بلاشبہ اس میں آپ نے انا جیل سے قرآن مراد لیا ہے۔ اور حسن نے والا انجیل ہمزہ کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے (2) اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ مثلاً اُنْجِیل۔ اس میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ ان میں سے ہو جنہیں عربوں نے اسماء عجیہ میں سے عربی بنایا ہے۔ اور اس کی ان کے کلام میں کوئی مثال نہ ہو۔

قولہ تعالیٰ: مِنْ قَبْلُ یعنی قرآن کریم سے پہلے هٰذِي لِلنَّاسِ (لوگوں کی ہدایت کے لئے) ابن فورک نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے هٰذِي لِلنَّاسِ الْمُتَّقِينَ (3) یعنی متقی لوگوں کی راہنمائی کے لئے۔ اور اس کی دلیل سورۃ البقرہ میں هٰذِي لِلْمُتَّقِينَ ۝ ہے۔ پس اس عام کو اس خاص کی طرف لوٹا دیا گیا ہے اور هٰذِي یہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور الْفُرْقَانِ سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ پہا، گزر چکا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝

”بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پوشیدہ رہتی اس پر کوئی چیز زمین اور نہ آسمان میں۔“

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اشیاء کے بارے تفصیلی علم رکھنے کی خبر ہے اور اس کی مثل قرآن کریم میں کثیر آیات ہیں۔ پس وہ جانتا ہے اسے بھی جو ہو چکا، اسے بھی جو ہوگا اور اسے بھی جو نہ ہوگا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الہ یا اس کے بیٹے ہو سکتے ہیں حالانکہ ان پر کئی اشیاء مخفی ہیں۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ①

”وہی ہے جو تمہاری تصویریں بناتا ہے (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے کوئی معبود نہیں بغیر اس کے

(وہی) غالب ہے حکمت والا ہے۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ اللہ تعالیٰ نے ماؤں کے رحموں میں انسان کی تصویریں بنانے کی خبر دی ہے۔ اور رحم کی اصل رحمة سے ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جن کے ساتھ ایک دوسرے پر رحم کیا جاتا ہے اور صورت کا اشتقاق صا رہ الی کذا سے ہے جب وہ اس کی طرف مائل ہو جائے، پس صورت مائل ہوتی ہے ایک شبیہ اور ہیئت کی طرف۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان کو بیان کرتی ہے اور اس کے ضمن میں نجران کے عیسائیوں کا رد ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہیں جن کی تصویریں بنائی گئیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج اور المؤمنون میں تصویر کی شرح اور وضاحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ (1) میں اس کی وضاحت کی ہے، جیسا کہ وہاں اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس میں طبائعیین کا بھی رد ہے کیونکہ وہ اسے مستقل فاعل بناتے ہیں اور ان کا رد آیۃ التوحید میں گزر چکا ہے اور مسند ابن سبیر میں حدیث ہے۔ (ان کا نام محمد بن سبیر ہے) ”بے شک اللہ تعالیٰ جنین کی ہڈیاں اور اس کی غضار یف (کچی ہڈیاں جو کھائی جاسکتی ہیں) مرد کی منی سے اور اس کی چربی اور گوشت عورت کی منی سے پیدا فرماتا ہے (2)۔“

اور اس میں اس پر بہت بڑی دلیل ہے کہ بچہ مرد اور عورت کے پانی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں صریحاً موجود ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ (الحجرات: 13) (اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے) اور صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ”کہ ایک یہودی نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں ایک شے کے بارے آپ سے سوال کرنے کے لئے آیا ہوں۔ سوائے نبی یا ایک آدمی یا دو آدمیوں کے اہل زمین میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا: ”تجھے نفع ہوگا اگر میں تجھے بتا دوں؟“ اس نے کہا: میں کان لگا کر پورے غور سے سنوں گا۔ پھر اس نے کہا: میں بچے کے بارے آپ سے پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آدمی کا پانی سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی زرد۔ اور جب وہ دونوں جمع ہو جائیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب

ہو تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے بچہ (مذکر) پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب ہو تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے بچی پیدا ہوتی ہے (1)۔“ الحدیث، اس کا بیان سورۃ الشوریٰ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **كَيْفَ يَشَاءُ** یعنی جسے وہ چاہتا ہے خوبصورت یا بد صورت، سیاہ اور سفید، طویل القامت یا پست قد، اعضاء کے اعتبار سے صحیح سالم یا اچانچ (پیدا کرتا ہے) یہاں تک کہ اس کا شقی (بد بخت) ہونا اور سعید ہونا وغیرہ۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا گیا کہ قرآن آپ کے پاس جمع ہیں تاکہ جو احادیث آپ کے پاس ہیں وہ انہیں سنیں، تو آپ نے انہیں فرمایا: میں تم سے چار چیزوں کے سبب مشغول ہوں اور میں روایت حدیث کے لئے فارغ نہیں ہوں۔ تو آپ سے عرض کی گئی: وہ مشغولیت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان میں سے ایک یہ ہے میں یوم میثاق میں غور و فکر اس حیثیت سے کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”یہ جنت میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے اور یہ جہنم میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔“ اور میں نہیں جانتا اس وقت میں کون سے فریق میں تھا۔ اور دوسری یہ ہے کہ رحم میں میری صورت بنائی گئی تو اس فرشتے نے کہا جو رحموں پر مقرر ہے: ”اے میرے رب! یہ شقی ہے یا سعید ہے (2)“ تو میں نہیں جانتا اس وقت اللہ تعالیٰ نے کیا جواب دیا۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ جس وقت ملک الموت میری روح قبض کرے گا تو وہ کہے گا: ”اے میرے رب! کفر کے ساتھ یا ایمان کے ساتھ“ تو میں نہیں جانتا جواب کیسا ہوگا۔ اور چوتھی شے یہ ہے کہ وہ کہے گا: **وَأَمَّا ذَا الْيَوْمِ آيَئِهَا الْمُجْرِمُونَ** (یسین) (اور) **حُكْمٌ** ہوگا (اے مجرمو!) (میرے دوستوں سے) (آج الگ ہو جاؤ) تو میں نہیں جانتا میں کون سے فریق میں ہوں گا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** یعنی اس کے سوا کوئی خالق نہیں اور نہ کوئی مصور (تصویر بنانے والا) ہے اور یہ اس کی وحدانیت پر دلیل ہے، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الہ مصور ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کی تصویر بنائی گئی ہے یعنی وہ مصور ہیں۔ **الْفَرِيزُ** سے مراد وہ ہے جو مغلوب نہیں ہو سکتا۔ **الْحَكِيمُ** سے مراد ذوالحکمت (صاحب حکمت) یا **مُحْكِمٌ** (حکم دانا بنانے والا) دینے والا) ہے۔ یہ اس کے مقابلہ میں اخص ہے جو تصویر کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (3)

”وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں، پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے سو وہ پیروی کرتے ہیں (صرف) ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے (ان کا مقصد) فتنہ انگیزی اور (غلط) معنی کی تلاش ہے اور نہیں جانتا اس کے صحیح معنی کو بغیر اللہ تعالیٰ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم ایمان لائے ساتھ اس کے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نہیں

نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام مسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ** ① ام المومنین نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کریم کی متشابہ آیتوں کی پیروی کرتے ہیں تو وہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ نام دیا ہے لہذا تم ان سے بچو (1)۔

ابو غالب نے بیان کیا ہے: میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ اپنے گدھے پر سوار تھے، یہاں تک کہ جب وہ مسجد دمشق کے راستے تک پہنچ کر رکے تو وہاں کچھ سرکھڑے کئے گئے، تو آپ نے پوچھا: یہ سرکن کے ہیں؟ تو بتایا گیا: یہ خوارج کے سر ہیں جو عراق سے لائے گئے ہیں۔ تو حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آگ کے کتے ہیں۔ آگ کے کتے ہیں، آگ کے کتے ہیں! آسمان کے سائے کے نیچے شریر ترین مقتول ہیں، اچھائی اور مبارک اس کے لئے جس نے انہیں قتل کیا اور انہوں نے اسے قتل کیا۔ انہوں نے یہی جملہ طوبی لمن قتلہم و قتلوا تمین بار کہا۔ پھر رونے لگے۔ تو میں نے عرض کی: اے ابو امامہ! رضی اللہ عنہ کون سی شے تمہیں رلا رہی ہے؟ تو انہوں نے کہا: ان کے لئے رحمت ہو، بے شک وہ اہل اسلام میں سے تھے پھر اس سے نکل گئے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی **هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ** ② آخر الآیات۔ پھر یہ آیت تلاوت کی: **وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ (آل عمران: 105)** (اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آچکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں)

تو میں نے کہا: اے ابو امامہ! کیا یہ وہ لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ پھر میں نے کہا: کیا یہ ایسی شے ہے جو تم اپنی رائے سے کہہ رہے ہو یا ایسی شے ہے جسے تم نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا ہوں، بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا! (نہیں) بلکہ میں نے اسے رسول اللہ ﷺ سے (کئی بار) سنا ہے نہ ایک بار، نہ دو بار، نہ تین بار، نہ چار بار، نہ پانچ بار، نہ چھ بار، نہ سات بار اور انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں پر رکھ لیں۔ بیان کیا: ورنہ انہیں خاموش کر دیا جاتا (2)۔ انہوں نے یہ تین بار کہا..... پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”بنی اسرائیل اکہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور بقیہ تمام فرقے جہنم میں ہوں

1۔ مجمع مسلم، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 339۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب منہ آیات محکمات، حدیث نمبر 4183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 267، حدیث نمبر 8034۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب من سورۃ آل عمران، حدیث 2926، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور یقیناً یہ امت ان پر ایک فرستے کا اضافہ کرے گی ایک جنت میں ہوگا اور باقی تمام جہنم میں ہوں گے (1)۔“

مسئلہ نمبر 2۔ محکّمات اور متشابہات کے بارے میں متعدد اقوال پر علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور وہی حضرت شعبی اور حضرت سفیان ثوری وغیرہما کے قول کا مقتضا بھی ہے کہ محکّمات قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن کی تاویل معروف ہو اور اس کا معنی و تفسیر سمجھے جاسکیں۔ اور متشابہ وہ ہے جسے جاننے کے لئے کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو یہ ان میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہے نہ کہ اپنی خلق کے ساتھ۔ بعض علماء نے کہا ہے: ان کی مثال میں قیامت قائم ہونے کا وقت ہے، یا جوج اور ماجوج اور دجال کا نکلنا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے اور اسی طرح سورتوں کے اوائل میں حروف مقطعات ہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احسن قول ہے جو متشابہ کے بارے کیا گیا ہے اور ہم نے سورۃ البقرہ کے اوائل میں ربیع بن خثیم سے پہلے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو نازل فرمایا اور اس میں سے جو چاہا اسے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا (3)، الحدیث۔ اور ابو عثمان نے کہا ہے: محکم سے مراد وہ سورۃ فاتحہ ہے جس کے بغیر نماز جائز نہیں ہوتی۔ اور محمد بن فضل نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سورۃ اخلاص ہے کیونکہ اس میں فقط توحید کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن سارے کا سارا محکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَكْتُبُ أَحْكَمُتِ الْاٰيٰتِ** (ہود: 1) (یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنادی گئی ہیں جس کی آیتیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام کا تمام متشابہ ہے، کیونکہ ارشاد گرامی ہے: کتابا متشابہا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کے معنی میں سے اس میں کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ **يَكْتُبُ أَحْكَمُتِ الْاٰيٰتِ** یعنی نظم اور وصف میں اس کی آیات پختہ اور مضبوط ہیں اور یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق ہیں اور کتابا متشابہا کا معنی ہے کہ اس کی بعض آیات بعض کے مشابہ ہیں اور بعض بعض کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: **اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ** اور **وَاٰخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ** سے مراد یہ معنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں متشابہ احتمال اور اشتباہ کے باب سے ہے جو اس قول میں ہے ان البقرہ تشابہ علینا یعنی وہ گائے ہم پر ملتبس ہو گئی۔ یعنی یہ (لفظ) گائیوں میں سے بہت سی انواع کا احتمال رکھتا ہے۔ اور محکم سے مراد وہ ہے جو اس کے مقابلہ میں ہو۔ اور وہ وہ ہے جس میں کوئی التباس نہ ہو اور وہ سوائے ایک وجہ کے اور کوئی احتمال نہ رکھتا ہو۔ اور کہا گیا ہے: بے شک متشابہ وہ ہے جو کئی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے، پھر جب ان وجوہ کو ایک وجہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور باقی باطل قرار دی جائیں تو وہ متشابہ محکم ہو جاتا ہے۔ پس محکم ہمیشہ اصل ہوتا ہے اور فروع اس کی طرف لوٹائی جاتی ہیں اور متشابہ وہی فرع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: محکّمات سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **قُلْ تَعَالَوْا اَنْتُلْ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ تَمِنَ اٰیٰتِ** تک، اور سورۃ بنی اسرائیل میں یہ ارشاد ہے: **وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ**

1۔ المجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 273، حدیث نمبر 8051

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 401، دار الکتب العلمیہ

3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 400

إِحْسَانًا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ایک مثال ہے جو آپ نے محکمات کے بارے میں بیان فرمائی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا: محکمات سے مراد قرآن کریم کی ناسخ آیات، احکام حرام کو بیان کرنے والی اور اس کے فرائض کو بیان کرنے والی وہ آیات ہیں جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور جن کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور تشابہات سے مراد اس کی منسوخ آیات، اس کی مقدم و مؤخر آیات، اس کی امثال، اس کی اقسام اور وہ جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور ان کے مطابق عمل نہیں کیا جاتا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: محکمات سے مراد ناسخ آیات ہیں اور تشابہات سے مراد منسوخ آیات ہیں۔ اور یہی حضرت قتادہ، ربیع اور ضحاک نے کہا ہے (1)۔

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: محکمات وہ آیات ہیں جن میں رب کریم کی حجت، بندوں کی عصمت اور جھگڑوں اور باطل کو دور کرنے کا ذکر ہے، جس معنی پر انہیں وضع کیا گیا ہے اس سے نہ انہیں پھیرا جاسکے اور نہ اس میں کوئی تحریف کی جاسکے۔ اور تشابہات وہ ہیں جن میں تصریف و تحریف اور تاویل ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بندوں کو آزمایا ہے، مجاہد اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں سب سے احسن قول یہی ہے (2)۔

نحاس نے کہا ہے: جو کچھ محکمات اور تشابہات کے بارے میں کہا گیا ہے ان میں احسن یہ ہے کہ محکمات وہ ہیں جو قائم بنفسہ ہیں ان میں کسی اور کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (الاخلاص: 4) اور وَ إِنْ لَعَفَا لِمَنِ تَابَ (طہ: 82) اور تشابہات مثلاً ان الله يغفر الذنوب جميعاً میں ان ارشادات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے: وَ إِنْ لَعَفَا لِمَنِ تَابَ (طہ: 82) اور إِنْ أَلَّفَ الْبُيُوتَ أَنْ تُقَرَّبَ (النساء: 48)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ نحاس نے کہا ہے وہ اس کی وضاحت کرتا ہے جسے ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے اور وہی وضع زبان پر جاری ہے اور وہ یہ کہ محکم احکم سے اسم مفعول ہے اور الاحکام کا معنی الاتقان (پختہ کرنا) ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لفظ واضح المعنی ہو اس میں کوئی اشکال اور تردد نہیں ہوتا۔ بلاشبہ وہ (محکم) اپنے مفرد کلمات کے واضح ہونے اور ان کی ترکیب کے پختہ اور مضبوط ہونے میں اسی طرح ہوتا ہے اور جب دو امروں میں سے کوئی ایک مختل ہو جائے تو اس میں تشابہ اور اشکال آ جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: مشابہ کی کئی وجوہ ہیں، ایک وہ ہے جس کے ساتھ حکم متعلق ہوتا ہے وہ یہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہو کہ دو آیتوں میں سے کون سی آیت نے دوسری کو منسوخ کر دیا ہے، جیسا کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایسی حاملہ عورت کے بارے جس کا خاوند فوت ہو جائے یہ نظریہ ہے کہ یہ دونوں مدتوں میں سے زیادہ کے ساتھ عدت گزارے گی اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی عدت وضع حمل ہے، اور وہ

کہتے ہیں: چھوٹی سورۃ نساء (1) (یعنی سورۃ طلاق) نے چار مہینے اور دس دن عدت والے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔ اور اسی طرح ان کا وارث کے لئے وصیت کرنے کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ منسوخ کر دی گئی ہے یا منسوخ نہیں کی گئی؟ اور اسی طرح دو آیتوں میں تعارض کی صورت میں اختلاف ہے کہ ان میں سے اولیٰ کون سی ہے کہ اسے مقدم کیا جائے جب نسخ نہ پہچانا جائے اور نہ اس کی شرائط پائی جائیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: **وَاجِلْ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ (النساء: 24)** یہ تقاضا کرتا ہے کہ ملک یمین کی حیثیت سے دو قریبی عورتوں کو اپنے پاس جمع کرنا مباح ہے، جبکہ ارشاد باری تعالیٰ: **وَ اَنْ تَجْعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 23)** اس سے منع کرتا ہے اور اسی میں سے وہ تعارض بھی ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں پایا جاتا ہے اور وہ جو قیاس میں پایا جائے، پس وہی متشابہ ہے اور ایک آیت کو دو قرأتوں سے پڑھنا متشابہ میں سے نہیں ہے اور اسم کبھی محتمل یا مجمل ہوتا ہے وہ تفسیر کا محتاج ہوتا ہے، کیونکہ اس میں سے واجب اتنی مقدار ہی ہوتی ہے جسے وہ اسم یا پوری آیت شامل ہوتی ہے اور دو قرأتیں دو آیتوں کی طرح ہوتی ہیں اور دونوں کے موجب کے مطابق عمل واجب ہوتا ہے، جیسا کہ پڑھا گیا ہے: **وَ اَمْسَحُوْا بِرُءُوسِكُمْ وَاَنْزِلْكُمْ (المائدہ: 6)** (اَنْزِلْكُمْ) کی قرأت فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ بخاری نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کہا: میں قرآن کریم میں ایسی اشیاء پاتا ہوں جو مجھے مختلف نظر آتی ہیں۔ (یعنی ان میں اختلاف ہے) آپ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ اس نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ** (المومن) (تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔) اور فرمایا: **وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ** (الطور) (اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے) اور کہا: **وَلَا يَكْتُمُونَ لِلَّهِ حَدِيثًا** (وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے) اور پھر کہا: **وَاللَّهُ رَاقِبًا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ** (الانعام) (قسم بخدا! اے ہمارے رب ہم شرک نہ تھے) تو انہوں نے اس آیت میں (اپنے شرک کو) چھپایا۔ اور سورہ النازعات میں ہے **أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا** ^۱ **رَفَعَ سَنَاهَا فَسَوَّيَاهَا** ^۲ **وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا** ^۳ **وَالْأَرْضُ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا** ^۴ پس اس میں زمین کی تخلیق سے پہلے آسمان کی تخلیق کا ذکر کیا، پھر فرمایا **إِنِّي كُنْتُ لَمَكْتُفَرُونَ** ^۵ **بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أُنْدَادًا** ^۶ **ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ** ^۷ **وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَمْوَاجَ السَّيْفِ** ^۸ **أَرْبَعَةً آيَاتٍ** ^۹ **سَوَاءٌ لِّلنَّاسِ يَلْمِزْنَ** ^{۱۰} **ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا** ^{۱۱} **قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ** ^{۱۲} (فصلت) سو اس میں آسمان کی تخلیق سے پہلے زمین کی تخلیق کا ذکر کیا اور فرمایا: **وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا رَحِيمًا** ^{۱۳} (النسا) اور **وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا** ^{۱۴} (النسا) تو گویا کہ وہ تھا پھر

1- صحیح بخاری، باب تفسیر سورة الطلاق، حدیث نمبر 4529، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گیا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فلا انساب بینہم نفخہ اولیٰ کے بارے میں ہے پھر صور میں پھونکا جائے گا اور جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہو گا وہ گر پڑے گا سوائے اس کے جس کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اس وقت ان کے درمیان نہ نسب ہوں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کے بارے پوچھیں گے۔ پھر دوسرے نفخہ میں ان میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

اور جہاں تک ما کنا مشرکین اور ولا یکتبون اللہ حدیث کا تعلق ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ اخلاص والوں کے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا، تو مشرکین کہیں گے! آؤ ہم کہتے ہیں: ہم مشرک نہیں تھے، تو اللہ تعالیٰ ان کے منہوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے اعمال کے بارے ان کے اعضاء گفتگو کریں گے تو اس وقت یہ معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی بات کو نہیں چھپائے گا اور اس وقت کفار یہ خواہش کریں گے کاش وہ مسلمان ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں تخلیق فرمایا، پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی تو دو دنوں میں انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمان بنادیا، پھر زمین کو بچھایا اور اس سے پانی اور کھیتی نکالی اور ان میں پہاڑ، درخت، ٹیلے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب دوسرے دو دنوں میں تخلیق فرمادیا۔ پس اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِلَّا تَرَوْا بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا** (نازعات) نتیجتاً زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ چار دنوں میں تخلیق کیا گیا اور دو دنوں میں آسمان بنایا گیا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: **وكان الله غفورا رحیما** (یعنی وہ ذاتی طور پر غفور اور رحیم ہے یعنی وہ ہمیشہ رہا اور ہمیشہ اسی طرح رہے گا)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کا ارادہ نہیں کیا مگر اسے اسی کے مطابق کیا جو ارادہ فرمایا۔ تجھ پر افسوس ہے! چاہیے کہ تجھ پر قرآن مختلف نہ ہو، کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **وَإِخْرُجْ مُتَشَبِّهًا** اس میں **إِخْرُجْ** غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اسے الف لام سے معدول کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اصل یہ ہے کہ یہ الف لام کے ساتھ صیغہ صفت ہو جیسا الکبر اور الصغر، پس جب اسے الف لام کے جاری ہونے کی جگہ سے معدول کر دیا گیا تو یہ غیر منصرف ہو گیا۔ ابو عبید نے کہا ہے: انہوں نے اسے منصرف نہیں کہا کیونکہ اس کا واحد منصرف نہیں ہوتا چاہے وہ معرفہ ہو یا نکرہ۔ اور مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اس بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ غضاب اور عطاش بھی منصرف نہ ہوں۔ اور امام کسائی نے کہا ہے: یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ صفت ہے۔ اور مبرد نے اس کا بھی انکار کیا ہے اور کہا ہے: بے شک لہذا اور حطنا بھی دونوں صفتیں ہیں اور یہ دونوں منصرف ہیں۔

سیبویہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ **إِخْرُجْ** الف لام سے معدول ہو، کیونکہ اگر یہ الف لام سے معدول ہوتا تو یہ معرفہ ہوتا، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ سحر تمام اقوال میں معرفہ ہے کیونکہ یہ السحر سے معدول ہے اور اُمس اس کے قول کے مطابق جس نے کہا: ذهب اُمس یہ اُمس سے معدول ہے، پس اگر **إِخْرُجْ** بھی الف لام سے معدول ہوتا تو وہ بھی معرفہ ہوتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نکرہ کے ساتھ اس کی صفت بیان کی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قوله تعالى: فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ لِّسَانِ الَّذِينَ مَبْتَدَأِ هُوَ كَيْفَ سَبَبُ مَرْفُوعٍ هُوَ اور خبر فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ هُوَ۔ اور زَيْغٌ کا معنی جھکاؤ اور کجی ہے اور اسی سے زاغۃ الشمس (سورج کا ڈھلنا) اور زاغۃ الابصار (آنکھوں کا ٹھکنا) ہے۔ اور کہا جاتا ہے: زاغۃ یزید کا معنی جھکاؤ ہے وہ قصد و ارادہ ترک کر دے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (الصف: 5) (پس جب انہوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) اور یہ آیت کفار، زندیق، جاہل، بدعتی تمام گروہوں کو عام ہے۔ اگرچہ اس وقت اس سے اشارہ نجران کے عیسائیوں کی طرف تھا۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے اس ارشاد فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر یہ حروریہ اور خارجیوں کے گروہ نہیں ہیں تو پھر میں نہیں جانتا وہ کون ہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ تفسیر حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے گزر چکی ہے۔ وہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قوله تعالى: فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ہمارے شیخ ابو العباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: متشابہ کی پیروی کرنے والے اس سے خالی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی پیروی کریں اور اسے جمع کرتے رہیں قرآن کریم میں تشکیک تلاش کرنے کے لئے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لئے، جیسا کہ زنادقہ اور قرآن کریم میں طعنہ زنی کرنے والے قرامطہ نے کیا، یا وہ متشابہ کے ظواہر کے مطابق اعتقاد رکھنے کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، جیسا کہ ان مجسمہ نے کیا جنہوں نے قرآن کریم اور احادیث طیبہ سے ان آیات و روایات کو جمع کیا جن کا ظاہر (اللہ تعالیٰ کی) جسمیت پر دلالت کرتا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے یہ اعتقاد رکھا کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم مجسم ہے اور وہ صورت مصورہ ہے اس کا چہرہ، آنکھ، ہاتھ، پہلو، پاؤں اور انگلیاں سبھی اعضاء ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان سے مبرہ اور بلند ہے یا وہ متشابہ کی پیروی کرتے ہیں ان کی تاویلات کو ظاہر کرنے کے لئے اور ان کے معانی کی وضاحت کرنے کے لئے یا جیسا کہ صبیغ نے کیا جس وقت اس نے عمر پر کثرت سے اس بارے سوال کئے۔ پس یہ چار اقسام ہوئیں:

(۱) ان کے کفر میں کوئی شک نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کئے بغیر ان کے بارے میں قتل کا حکم دیا ہے۔

(۲) صحیح قول ان کی تکفیر کا ہے، کیونکہ ان کے اور بتوں اور تصویروں کی عبادت کرنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اور اگر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی، ورنہ یہ قتل کر دیئے جائیں گے جیسا کہ مرتد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(۳) چونکہ اس کی تاویل کے جواز میں اختلاف ہے لہذا اسی بنا پر اس کے جائز ہونے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اور

یہ بات معلوم ہے کہ سلف کا مذہب متشابہ کی تاویل کے لئے تعرض کو ترک کرنا ہے باوجود اس کے کہ انہیں ان کے ظاہر معنی کے محال ہونے کا یقین تھا۔ پس وہ کہتے: تم اس سے گزر جاؤ جیسے وہ آئے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی تاویلات کا اظہار کرنا چاہیے اور اسے ایسے معنی پر محمول کیا جائے بغیر یقین کے جس پر لغتہ محمول کرنا صحیح ہو جیسا کہ مجمل کی تعیین کی جاتی ہے۔

(۴) اس میں حکم ادب بلوغ کا ہے، جیسا کہ حضرت عمر نے صبیغ کے ساتھ کیا اور ابو بکر انباری نے کہا ہے: ائمہ سلف اسے سزا

دیتے تھے جو قرآن کریم کے مشکل حروف (متشابہ) کی تفسیر کے بارے سوال کرتا تھا۔ کیونکہ سائل اگر اپنے سوال سے بدعت کو دوام بخشنے اور فتنہ برپا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ درحقیقت انکار اور بہت بڑی تعزیر کا مستحق ہے اور اگر اس کا یہ قصد نہیں تب بھی وہ گناہ کا جرم کرنے کے سبب عتاب کا مستحق ہے، کیونکہ اس نے منافقین طحٰدین کے لئے اس وقت ایک راستہ ایجاد کر دیا ہے کہ وہ تاویل کے حقائق اور قرآن کریم کے مناج سے انحراف کرتے ہوئے قرآن کریم میں تحریف کرنے کے بارے کمزور مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور ان میں تشکیک پیدا کرنے کا قصد و ارادہ کریں۔ اور اسی سے وہ روایت ہے جو اسماعیل بن اسحاق القاضی نے ہمیں بیان کی کہ ہمیں سلیمان بن حرب نے حماد بن زید عن یزید بن حازم عن سلیمان بن یسار کی سند سے یہ خبر دی ہے کہ صبیح بن عسل مدینہ طیبہ آیا اور وہ قرآن کریم کی متشابہ (آیات) اور دیگر اشیاء کے بارے سوال کرنے لگا تو اس کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے اسے بلا بھیجا۔ پس اسے حاضر کیا گیا تو آپ نے اس کے لئے کھجور کے گچھوں کی جڑیں تیار کی ہوئی تھیں۔ پس جب وہ حاضر ہوا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں عبد اللہ صبیح ہوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں عبد اللہ عمر ہوں، پھر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس جڑ کے ساتھ اس کے سر پر ضرب لگائی اور اسے زخمی کر دیا، پھر لگا تار اسے مارا یہاں تک کہ اس کا خون اس کے چہرے پر بہنے لگا، تو اس نے کہا: یہ کافی ہے اے امیر المومنین! قسم بخدا! جو میں اپنے سر میں پاتا تھا وہ نکل گیا ہے (1) اور اس کے ادب کے بارے میں روایات مختلف ہیں ان کا ذکر سورہ الذاریات میں آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی طرف متوجہ کیا اور اسے اس کے دل میں ڈال دیا۔ پس اس نے توبہ کر لی اور اس کی توبہ انتہائی اچھی اور حسین تھی۔ اور ابْتِغَاءُ الْفِتْنَةِ کا معنی ہے مومنین کے لئے التباس اور شبہات کو طلب کرنا تاکہ وہ ان کے درمیان فساد پیدا کر دیں اور وہ لوگوں کو اپنی کجی کی طرف لوٹا لائیں اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: ابْتِغَاءُ تَأْوِيلِهِ کا معنی ہے کہ انہوں نے اپنے دوبارہ اٹھائے جانے اور زندہ کئے جانے کے بارے تاویل تلاش کی، تو اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمادیا کہ اس کی اور اس کے وقت کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا: اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ یعنی جس دن وہ اسے دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے یعنی دوبارہ زندہ کیا جانا، قبروں سے اٹھایا جانا اور عذاب..... يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ..... یعنی انہوں نے تو اسے چھوڑ دیا ہے..... قَدْ جَاءَتْ رُسُلٌ مِمَّنْ بَالِغُ الْحَقِّ (اعراف: 53) یعنی تحقیق ہم نے اس کی تاویل دیکھ لی جس کے بارے ہمیں رسل علیہم السلام نے آگاہ کیا تھا۔ فرمایا: پس وقف اس قول باری تعالیٰ پر ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ دوبارہ کب اٹھایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ، کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت جن میں جی بن اخطب بھی تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ہمیں خبر پہنچی ہے کہ آپ پر الہام نازل ہوئی ہے۔ پس اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں تو پھر آپ کی امت کی بادشاہی اکہتر برس ہوگی، کیونکہ حساب الجمل میں الف سے مراد ایک ہے، لام سے مراد تیس ہیں

1۔ سنن دارمی، کتاب مقدمہ باب، من ہاب الفتیاء وکراہ النظم والہدم، جلد اول، حدیث نمبر 144 مکتبہ مدینہ منورہ

اور میم سے مراد چالیس ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ اور یہاں تاویل بمعنی تفسیر ہوگا۔ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: تاویل هذه الكلمة على كذا (یعنی اس کلمہ کی تفسیر اس معنی پر ہے) اور یہ مایوول الأمر الیہ کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ (یعنی جس کی طرف امر لوٹتا ہے۔) اور اس کا اشتقاق آل الأمر الیہ سے ہے یعنی بمعنی صار۔ اور اَوْلَتْهُ تَأْوِيلًا بمعنی صَيَّرَتْهُ ہے۔ (یعنی میں نے اس کی تاویل کی) اور بعض فقہاء نے اس کی تعریف کی اور کہا: هو ابداء احتمال في اللفظ مقصود بدليل خارج عنه۔ یعنی کسی لفظ میں مقصود احتمال کو خارجی دلیل کے ساتھ ظاہر کرنا۔ اور تفسیر سے مراد لفظ کا بیان اور اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا مَرْيَبَ فِيهِ یعنی اس میں کوئی شک نہیں۔ اور تفسیر کی اصل فسرٌ ہے اور اس کا معنی بیان ہے، کہا جاتا ہے: فسرت الشيء (بالتخفيف) افسرہ (بالکسر) فسرتا اور تاویل معنی کا بیان ہوتا ہے، جیسا کہ یہ قول لاشك فيه عند المومنين یعنی مومنین کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں یا چونکہ یہ فی نفسہ حق ہے لہذا اس کی ذات شک کو قبول نہیں کرتی۔ اور بلاشبہ شک شک کرنے والے کا وصف ہے اور جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دادا کے بارے میں اب (باپ) ہونے کا قول ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں تاویل کی ہے: يَا بَنِي آدَمَ۔

مسئلہ نمبر 8۔ قوله تعالى: وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ۔ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ میں علماء کا اختلاف ہے، کیا یہ ابتداء کلام ہے اور اس کا ماقبل سے تعلق منقطع ہے، یا یہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے اور واو جمع کے لئے ہے۔ اکثر کا موقف یہ ہے کہ یہ ماقبل سے منقطع ہے اور یہ کہ قول باری تعالیٰ إِلَّا اللَّهُ پر پہلا کلام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہم اور کئی دوسروں کا ہے، اور یہی امام کسائی، خفش فراء اور ابو عبید وغیرہم کا مذہب ہے۔ ابونہیک اسدی نے کہا ہے: بے شک تم اس آیت کو ملاتے ہو حالانکہ یہ اس سے منقطع ہے۔ اور راخنین کے علم کی انتہاء نہیں مگر ان کے اس قول پر اَمْتَابِهِمْ كُلُّ قَوْمٍ عِنْدَ مَا تَبَيَّنَ اور اسی کی مثل حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے اور علامہ طبری نے اسی طرح یونس بن اشہب عن مالک بن انس سے بیان کیا ہے (1)۔ اور اس بنا پر يَقُولُونَ، الرَّاسِخُونَ کی خبر ہے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ کتاب جس کے ساتھ ایمان لانے اور جس کی تصدیق کرنے کا ہمیں حکم ارشاد فرمایا ہے اس کی آیات کی دو قسمیں بنادی ہیں، ایک محکم اور دوسری متشابہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے قائل سے فرمایا: هُوَ الَّذِي نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا پس بتا دیا کہ کتاب میں متشابہ کو اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی اس کی تاویل کو نہیں جانتا، پھر اللہ تعالیٰ نے راخنین فی العلم کی تعریف بیان فرمائی کہ وہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے۔ اور اگر ان کی طرف سے ایمان صحیح نہ ہوتا تو وہ اس پر تعریف کے مستحق نہ ہوتے۔ اور اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ اس آیت میں وقف تام اس قول پر ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ اور جو اس کے بعد ہے وہ دوسرا نیا کلام ہے اور وہ یہ قول ہے: وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ

امثالہ اور یہی حضرات ابن مسعود، ابی بن کعب، ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ روایت ہے کہ التَّاسِخُونُ کا اپنے ماقبل پر عطف نسق ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ بھی اس کا علم رکھتے ہیں۔ اور اس کے بارے میں بعض اہل لغت نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: اس کا معنی ہے والراسخون فی العلم یعلمونہ قائلین امنا (راسخون فی العلم اسے جانتے ہیں درآنحالیکہ وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے) اور یہ گمان ہے کہ یَقُولُونَ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور عام اہل لغت اس کا انکار کرتے ہیں اور اسے بعید سمجھتے ہیں، کیونکہ عرب فعل اور مفعول کو اکٹھا مضمحل نہیں کرتے اور حال مذکور نہیں ہوتا مگر تبھی جب فعل ظاہر ہو اور جب فعل ظاہر نہیں تو وہ حال نہیں ہو سکتا اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ کہا جانا بھی جائز ہے۔ عبد اللہ را کباً، یعنی اقبل عبد اللہ را کباً۔ بلاشبہ فعل مذکور کے ساتھ یہ جائز ہوتا ہے جیسا کہ یہ قول: عبد اللہ یتکلم یصدق بین الناس (عبد اللہ کلام کر رہا ہے درآنحالیکہ وہ لوگوں کے درمیان صلح کر رہا ہے۔) تو اس میں یصلح اس کے لئے حال ہے۔ اسی طرح شاعر کا قول ہے..... ابو عمر نے یہ مجھے سنایا ہے اور اس نے کہا ہمیں ابو العباس ثعلب نے سنایا ہے:

ارسلت فیہا قِطْبًا لُّكَالِکَا یَقْصُرُ یَنْشِیْ ویَطُولُ بَارِکَا

بمعنی یقصر ماشیاً (یعنی یشی حال واقع ہو رہا ہے۔) پس عام علماء کا قول علمائے نحو کے مذاہب کی تائید سے اکیلے حضرت مجاہد کے قول سے اولیٰ اور ارنج ہے اور یہ بھی کہ یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے کسی شے کی نفی کرے اور اسے اپنی ذات کے لئے ثابت کرے اور پھر اس میں کوئی اس کا شریک ہو۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں دیکھتے: قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل: 65) (آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے۔) اور یہ ارشاد: لَا یُجَلِّیْہَا لِوَقْتِہَا اِلَّا هُوَ (الاعراف: 187) (نہیں ظاہر کرے گا اسے اپنے وقت پر مگر وہی) اور یہ ارشاد: کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہُ (القصص: 88) (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے) پس یہ سب انہیں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے اور اپنے سوا کسی کو اس میں شریک نہیں کیا۔ اور اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰهُ اور اگر "والراسخون" واو عطف نسق کے لئے ہو تو پھر اس قول کا کوئی فائدہ نہیں کُلُّ مَنْ عِنْدَہٗ سَآءٌ۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ خطابی نے بیان کیا ہے انہوں نے حضرت مجاہد وغیرہ کے قول کے سبب نہیں کہا، تحقیق انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ التَّاسِخُونُ اسم جلالۃ پر معطوف ہے اور وہ بھی متشابہ کا علم رکھنے میں شامل ہیں۔ اور بلاشبہ وہ اس کے بارے اپنے علم کے ساتھ ہی کہتے ہیں امثالہ (ہم اس کے ساتھ ایمان لائے، اور ربیع، محمد بن جعفر بن زبیر اور قاسم بن محمد وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر یَقُولُونَ، التَّاسِخُونُ سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے (1)، جیسا کہ شاعر نے کہا:

الریح تبکی شجوها والبرق یلثم فی الغمامہ (2)

یہ شعر دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے، پس یہ بھی جائز ہے کہ والبرق مبتدا ہو، اور تاویل اول کی بنا پر یلبس خبر ہو اور یہ ماقبل سے منقطع ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الريح پر معطوف ہو، اور یلبس دوسری تاویل کی بنا پر حال کے محل میں ہو بمعنی لا یصفا۔ اور یہ قول کرنے والوں نے بھی اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے رسوخ فی العلم کے ساتھ ان کی مدح کی، پس وہ کیسے ان کی مدح کر سکتا تھا جبکہ وہ جاہل اور ناواقف ہوتے؟ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: انا من یعلم تأویلہ (1) (میں بھی ان میں سے ہوں جو اس کی تاویل جانتے ہیں) اور حضرت مجاہد نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: انا من یعلم تأویلہ۔ اے ان سے امام الحرمین ابوالمعالی نے بیان کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بعض علماء نے اس قول کو پہلے قول کی طرف ہی لوٹا یا ہے اور کہا ہے: کلام مکمل ہو رہا ہے عند اللہ پر اس کا معنی ہے یعنی مشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور راسخون فی العلم اس کے بعض کو جانتے ہیں در آنحالیکہ وہ یہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے (اور ان کا یہ علم) ان دلائل کے سبب ہے جو محکم آیات میں بیان کئے گئے ہیں اور اسے اس کی قدرت دی گئی ہے جس نے اسے اس کی طرف لوٹا یا ہے۔ پس جب انہوں نے بعض تاویل کو جان لیا اور بعض کو نہ جانا اور انہوں نے یہ کہا: ہم تمام کے ساتھ ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے، اور ان مخفی چیزوں میں سے جو اس کی شرع صالح میں ہیں جنہیں ہمارا علم محیط نہیں تو ان کا علم ہمارے رب کے پاس ہے۔ اور اگر کوئی کہے: الا کہے کہ راسخین پر بعض کی تفسیر مشتبہ ہو گئی۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نہیں جانتا الا وہ کیا ہے اور۔ جانتا ہوں کہ غسلین کیا ہے، تو کہا جائے گا: یہ کوئی الزام نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے بعد اسے جان لیا اور اس کی تفسیر بیان فرمائی جس پر واقف ہوئے۔ اور اس سے زیادہ پختہ اور مضبوط جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا دکل راسخ۔ کہ اس سے یہ ثابت ہو۔ پس جب ایک کو اس کا علم نہیں ہو تو دوسرے نے اسے جان لیا۔ اور ابن فورک نے اسے ترجیح دی ہے کہ راسخون فی العلم تاویل جانتے ہیں اور انہوں نے اس میں خوب بیان کیا ہے (2) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے ہے۔ اللہم فقہہ فی الدین و علمہ التاویل (3) (اے اللہ! اسے دین میں فقہت عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا فرما) وہ جسے تیرے لئے وہ بیان کرے، یعنی اسے اپنی کتاب کے معانی کا علم عطا فرما۔ اور اس بناء پر وقف و الترسخون فی العلم پر ہو گا۔ ہمارے شیخ ابو العباس احمد بن عمر نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ انہیں راسخین کا نام دینا اس کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس محکم سے زیادہ علم رکھتے ہیں جسے جاننے میں وہ تمام لوگ برابر ہوتے ہیں جو کلام عرب کو سمجھتے ہیں اور پھر کون سی شے میں ان کا رسوخ ہے جب وہ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا سب جانتے ہیں! لیکن تشابہ متنوع قسم ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے جسے یقیناً کوئی نہیں جانتا جیسا کہ روت اور قیامت کا علم کہ یہ ان میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم غیب کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اور اس کا علم کوئی

2۔ ایضاً صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ

3۔ تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، جلد 14، صفحہ 435، دار الکتب المصریۃ۔ ایضاً، بخاری، کتاب الوضوء، حدیث 140، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں حاصل کر سکتا نہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور نہ کوئی اور۔ پس حذاق اور متبحر علماء میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ راخنین متشابہ کا علم نہیں رکھتے تو انہوں نے متشابہ کی اسی نوع کا ارادہ کیا ہے اور رہا وہ جسے وجوہ لغت پر اور کلام عرب کی طرز پر محمول کرنا ممکن ہوتا ہے تو اس میں تاویل کی جاسکتی ہے اور اس کی صحیح تاویل جانی جاسکتی ہے اور اس سے اسے زائل کیا جاسکتا ہے جس کا تعلق غیر صحیح تاویل کے ساتھ ہو، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قول: **وَرُؤُوحٌ مِنْهُ، اِلٰی غٰیذِ الذِّلْکَ۔** پس کسی کو راخ کا نام نہیں دیا جاسکتا مگر تبھی جب وہ (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) دی گئی قدرت و استطاعت کے مطابق اس نوع میں سے کثیر کا علم رکھتا ہو۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ متشابہ سے مراد منسوخ ہے تو اس قول کی بنا پر راخنین کو تاویل کے علم میں داخل کرنا صحیح ہے لیکن متشابہات کو اس نوع کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے (1)۔

الرُّسُوخُ کا معنی ہے کسی شے میں ثابت ہونا۔ اور ہر ثابت راخ ہوتا ہے۔ اور اجرام میں اس کی اصل یہ ہے کہ اس نے پہاڑ اور درخت زمین میں راخ کر دیئے (2)، شاعر نے کہا ہے:

لَقَدْ رَسَخْتُ فِي الصَّدْرِ مَتًى مَوْدَةً لِّلَيْلَىٰ أَبْثُ آيَاتَهَا أَنْ تَغَيَّرَا

میری طرف سے لیلیٰ کے لئے محبت سینے میں راخ ہو گئی اس کی علامات نے انکار کر دیا کہ وہ متغیر ہوں۔

اور رسخ الایمان فی قلب فلان یزسخ رسخاً۔ فلاں کے دل میں ایمان راخ ہو گیا۔

اور بعض نے بیان کیا ہے: رسخ الغدیر: اس کا معنی ہے تالاب کا پانی بہہ پڑا۔ اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے پس یہ اضداد میں سے ہے۔

اور رَسَخٌ وَرَضَخٌ وَرَضَنٌ وَرَسَبٌ تمام مثبت فیہ کے معنی میں ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راخنین فی العلم کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ”وہ وہ ہے جس کی قسم سچی ہو، اس کی زبان سچ بولے اور اس کا دل مستقیم اور سیدھا ہو۔“ **هُوَ مِنْ بَرِّتِ يَمِينِهِ وَصَدَقَ لِسَانُهُ وَاسْتَقَامَ قَلْبُهُ (3)** اور اگر کہا جائے: قرآن کریم میں متشابہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: 44)** (اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف) تو اللہ تعالیٰ نے کیونکر تمام قرآن کو واضح نہیں بنایا؟ تو اسے کہا جائے گا: حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر اس میں حکمت علماء کی فضیلت کا اظہار ہے، کیونکہ اگر سارا قرآن واضح ہوتا تو علماء میں سے بعض کی بعض پر فضیلت ظاہر نہ ہوتی۔ اور اسی طرح وہ کرتا ہے جو کوئی شے تصنیف کرتا ہے کہ اس کے بعض مقامات کو واضح ذکر کرتا ہے اور بعض کو مشکل بنا دیتا ہے اور اس میں (علماء کی) جماعت کے لئے جگہ چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ شے جسے پانا آسان ہو اس کی قدر و قیمت کم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: **كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا** اس میں ضمیر ہے جو کتاب اللہ کے محکم و متشابہ سبھی کی طرف لوٹ رہی ہے اور تقدیر عبارت ہے: **كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا**۔ اور لفظ **كُلٌّ** کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے،

کیونکہ یہ لفظ اضافت کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر فرمایا: وَهَآئِكَ كُنتُمْ لَنَا أَوْلُوًّا إِلَّا لِبَابٍ يَعْنِي صَاحِبِ عَقْلٍ هِيَ يَهِي كَهْتَا هِيَ اور ایمان لاتا ہے اور جہاں وقف ہو وہاں وقف کرتا ہے اور تشابہ کی اتباع چھوڑ دیتا ہے۔ اور لب کا معنی عقل ہے اور لب کل شئی سے مراد ہر شے کا مغز اور اس کا خالص ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے عقل کو لب کہا گیا ہے اور اولو، ذو کی جمع ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ①

”اے ہمارے رب! نہ ٹیڑھے کر ہمارے دل بعد اس کے کہ تو نے ہدایت دی ہمیں اور عطا فرما ہمیں اپنے پاس سے رحمت بے شک تو ہی سب کچھ بہت زیادہ دینے والا ہے۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا اس کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے یقولون وہ کہتے ہیں۔ اور یہ راخنین کی جانب سے بطور حکایت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو قل یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہئے) اور کہا جاتا ہے: ازاعة القلب (دل کو ٹیڑھا کرنے) سے مراد فساد برپا کرنا اور دین سے اعراض برتنا ہے۔ کیا وہ خوفزدہ ہو رہے تھے حالانکہ انہیں ہدایت دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ انہیں فساد کی طرف منتقل کر دے گا؟ تو جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی فرمادی تو یہ التجا کرنے لگے کہ وہ انہیں اعمال میں سے کسی ایسے عمل کے ساتھ نہ آزمائے جو ان پر ثقیل اور بھاری ہو اور وہ اس سے عاجز آجائیں، جیسا کہ ارشاد ہے: وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنْ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوْ احْرُسُوا مِنْ دِيَارِهِمْ (النساء: 66) (اور اگر ہم فرض کر دیتے ان پر کہ قتل کرو اپنے آپ کو یا نکل جاؤ اپنے گھروں سے۔)

ابن کسان نے کہا ہے: انہوں نے التجا کی کہ وہ ٹیڑھے نہ ہو جائیں کہ پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دے، جیسے یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (الصف: 5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) یعنی تو ہمیں اپنی ہدایت پر ثابت قدم رکھ جب تو نے ہمیں ہدایت عطا فرمادی ہے اور یہ کہ ہم ٹیڑھے نہ ہو جائیں کہ ہم مستحق بن جائیں کہ تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا کر دے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ماقبل کلام سے منقطع ہے اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اہل الزلیغ (ٹیڑھا ہونے والے) کا ذکر کیا تو اس کے پیچھے استلئے کہ اس کے ساتھ اپنے بندوں کو اپنی بارگاہ سے مانگنے کی دعا سکھائی کہ وہ اس برے گروہ میں سے نہ ہو جائیں جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور وہ اہل زلیغ ہیں۔

اور المؤمنو طا میں حضرت ابو عبد اللہ الصناجی سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا اور مغرب کی نماز آپ کے پیچھے ادا کی، تو آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ قصار مفصل میں سے ایک سورت کی قرأت کی، پھر جب تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آپ کے اتنا قریب تھا کہ میرے کپڑے آپ کے کپڑوں کے ساتھ مس کرنے کے قریب ہو گئے، تو میں نے آپ کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ یہ

آیت رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا الْآيَةَ پڑھتے ہوئے سنا (1)۔ علماء نے کہا ہے: آپ کا یہ آیت پڑھنا قنوت اور دعا کی ایک قسم ہے کیونکہ آپ کے دور میں مرتدین کا معاملہ (خاصا پریشان کن) تھا۔ اور اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک مغرب کی نماز میں قنوت پڑھنا جائز ہے اور ہر نماز میں بھی جب مسلمانوں پر ایسا شدید امر چھا جائے جو انہیں خوفزدہ اور مضطرب کر دے اور وہ اس سے اپنے آپ پر خوف محسوس کرنے لگیں۔

اور ترمذی نے شہر بن حوشب کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کہا: اے ام المؤمنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر کون سی دعا مانگا کرتے تھے جب آپ کے پاس ہوتے؟ تو انہوں نے بیان فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ ہوتی یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک (اے دلوں کو بدلنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ) تو میں عرض کرتی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اکثر یہ دعا مانگتے ہیں یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک! تو آپ نے فرمایا: یا اُم سلمة انه ليس آدمي الا وقلبه بين اصبعين من اصابع الله فمن شاء اقام و من شاء ازاغ (اے ام سلمہ! بے شک کوئی آدمی نہیں مگر اس کا دل رب العالمین کے دست قدرت کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے پس وہ جسے چاہے اسے سیدھا رکھے اور جسے چاہے ٹیڑھا کر دے) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا اِمَام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے (2) اور یہ آیت معتزلہ کے اس قول میں ان کے خلاف حجت ہے: بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کو گمراہ نہیں کرتا۔ اگر دلوں کو ٹیڑھا کرنا اس کی جانب سے نہ ہو تو پھر یہ جائز نہیں کہ اسے دور کرنے کے بارے دعا، اس سے کی جائے جس پر اس کا کرنا جائز ہی نہیں ہوتا۔

ابو داؤد الجراح نے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا فعل کی نسبت قلوب کی طرف کرتے ہوئے قرأت کی اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف انتہائی رغبت اور میلان ہے اور دونوں قرأتوں پر آیت کا معنی یہ ہے کہ تیری جانب سے زیغ (ٹیڑھا پن) کو دلوں میں پیدا کرنا نہ ہو کہ وہ ٹیڑھے ہو جائیں (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً یعنی اپنے پاس سے اور اپنی جانب سے فضل و رحمت عطا فرمانہ کہ ہمارے کسی سبب سے اور نہ عمل سے۔ اس میں تابعداری اور عجز و انکساری کا اظہار ہے (4)۔ اور لَدُنْ میں چار لغتیں ہیں۔ ایک لَدُنْ یعنی لام کے فتح، دال کے ضمہ اور نون کی جزم کے ساتھ۔ اور یہی زیادہ فصیح ہے۔ اور دوسری لام کے فتح، دال کے ضمہ اور نون کے حذف کے ساتھ (یعنی لَدُ)، اور تیسری لام کے ضمہ، دال کی جزم اور نون کے فتح کے ساتھ (یعنی لَدُنْ) اور چوتھی لام کے فتح، دال کے سکون اور نون کے فتح کے ساتھ (یعنی لَدُنْ)

شاید جاہل متصوفہ اور زنادقہ باطنیہ اس آیت اور اس کی مثل آیات سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں: علم تو وہی ہے جو بغیر کسب کے ابتداء اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور کتابوں اور اوراق میں دیکھنا تو حجاب ہے۔ یہ (نظریہ) مردود ہے اس کا بیان

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 190

4۔ ایضاً

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 63، وزارت تعلیم، اسلام آباد

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ

اپنے محل میں آئے گا۔

اور آیت کا معنی ہے: ہمیں رحمت سے صادر ہونے والی نعمتیں عطا فرما، کیونکہ رحمت صفت ذات کی طرف راجع ہے اور اس میں بہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا (1)۔ کہا جاتا ہے: وَهَبَ يَهَبُ، یہ اصل میں يَوْهَبُ ہا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ يَوْهَبُ ہا کے فتح کے ساتھ ہے تو اس نے خطا اور غلطی کی ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا جیسے اس نے کہا ہے تو پھر واؤ حذف نہ ہوتی، جیسا کہ يَوْجَلُ میں حذف نہیں ہوئی۔ بلاشبہ واؤ کسرہ اور یا کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے حذف کردی گئی پھر ان کے حذف کے بعد کسرہ کو فتح میں بدل دیا گیا کیونکہ اس میں ہا حروف حلقی میں سے ایک ہے۔

رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝

”اے ہمارے پروردگار! بے شک تو جمع کرنے والا ہے سب لوگوں کو اس دن کے لئے نہیں کوئی شبہ جس (آئے) میں، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پھرتا اپنے وعدہ سے۔“

یعنی تو لوگوں کے متفرق ہونے کے بعد انہیں اٹھانے والا اور انہیں لانے والا ہے اور اس میں قیامت کے دن کے لئے دوبارہ اٹھائے جانے کا اقرار ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہی وہ تاویل ہے جس کا علم راخنین فی العلم کوہوا اور انہوں نے اس کا اقرار کیا اور انہوں نے اختلاف کیا جنہوں نے اس کی اتباع کی جو ان پر دوبارہ اٹھائے جانے کے معاملہ میں مشتبہ ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اور الزب کا معنی شک ہے (2) اور اس کے محامل (محمول ہونے کے محل) سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں، اور میعاد مفعول کے وزن پر الوعد سے ماخوذ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَنْ تَغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۚ

”بے شک وہ کفار ہیں اور نہ ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (سے عذاب) سے کچھ بھی۔ اور نہ ہی (بد بخت) ایندھن ہیں آگ کا۔“

اس کا معنی بین اور واضح ہے۔ یعنی ان کے اموال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے کوئی شے ہرگز ان سے دور نہ کر سکیں گے۔ اور سلمیٰ نے لَنْ یُغْنِیَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے (3)۔ اس لئے کہ فعل متعدهم ہے اور فاعل کے درمیان فاصلہ موجود ہے اور حسن نے یُغْنِیَ یاء کے ساتھ قرأت کی ہے مگر آخری یا کو تخفیف کے لئے سکون دیا ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

كفى باليأس من أسماء كافي
و ليس يسقيها اذغال شافي

اس میں حق یہ تھا کہ وہ کافیا کہتا پس اس نے یا کو چھوڑ دیا۔

اور اسی کی مثل فرانے شعر کہا ہے:

كَانَ اَيْدِيَهُنَّ بِالْقَاعِ الْقَرِيقُ اَيْدِي جَوَارِ يَتَعَاطَيْنَ الْوَرَقِ

الْقَرِيقُ اور الْقَرِيقَةُ القاع میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اَيْدِيَهُنَّ بِمَعْنَى عِنْدَہُ، ابو عبید نے یہی کہا ہے۔ اُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ، الوقود یہ جلنے والی لکڑی کا اسم ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ حسن، مجاہد اور طلحہ بن مصرف نے وَقُودُ وَاوْ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام ہے حطب وَقُودُ النَّارِ۔ (1) اور عرب کلام میں یہ جائز ہے کہ جب وَاوْ مضموم ہو تو اسے ہمزہ سے بدل دیا جائے لہذا اُقُود پڑھنا جائز ہے جیسا کہ اُقْتَتَد۔

اور وَقُودُ وَاوْ کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے اور وَقَدَّتِ النَّارُ تقد کہا جاتا ہے جب آگ بھڑک اٹھے۔ ابن مبارک نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ دین غالب آئے گا یہاں تک کہ سمندروں کو عبور کر لے گا اور یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کرتے ہوئے) گھوڑے سمندروں میں ڈال دیئے جائیں گے، پھر کچھ تو میں آئیں گی وہ قرآن کریم پڑھیں گے اور جب وہ اسے پڑھیں گے تو کہیں گے: کون ہم سے بڑھ کر قاری ہے اور کون ہم سے بڑھ کر عالم ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم ان میں کوئی خیر اور بھلائی دیکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ”وہ تم میں سے ہوں گے اور وہ اس امت میں سے ہوں گے اور وہی آگ کا ایندھن ہوں گے (2)۔“

كَذَّابٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَآَخَذَهُمُ اللّٰهُ

بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَاللّٰهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

”(ان کا طریقہ) مثل طریقہ آل فرعون کے اور ان لوگوں کے تھا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے جھٹلایا ہماری

آیتوں کو پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔“

الدَّابُّ کا معنی عادت اور طریقہ ہے۔ اور دَابُّ الرَّجُلِ فی عملہ یداب دَابًّا و دُؤْبًا کہا جاتا ہے جب وہ اپنے کام میں کوشش کرے اور خوب محنت کرے اور اَدَابَتہ اُنَّا اور اَدَابٌ بَعِیْرہ جب وہ اونٹ کو چلانے میں خوب تھکا دے۔ اور الدائبان سے مراد رات اور دن ہیں۔ ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے یعقوب کو یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کَذَّابٌ کہ یہ ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے اور انہوں نے مجھے کہا در آنحالیکہ میں نو جوانی کی حالت میں تھا۔ کون سی شے پر کَذَّابٌ جائز ہو سکتا ہے؟ تو س۔ س۔ کہا: میرا گمان ہے کہ یہ دَبَّ یَذَّاب دَابًّا سے ہے۔ تو انہوں نے میری بات کو قبول کر لیا اور میرے چھوٹا ہونے کے باوجود میری عمدہ وضاحت پر اظہار تعجب و مسرت کیا اور میں نہیں جانتا کیا یہ کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ نحاس نے کہا ہے: یہ قول غلط ہے، بالیقین دَبَّ نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ کہا جائے گا دَابُّ یَذَّاب دُؤْبًا [و دَابًّا]، اسی طرح نحو یوں نے بھی بیان کیا ہے، ان میں سے امام فراء نے اسے کتاب المصادر میں بیان کیا ہے، جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

كَذَابِكُمْ مِنْ أَمْرِ الْخُبْرَةِ قَبْلَهَا وَجَارَتِهَا أَمْرُ الزَّيْنَابِ بِمَا سَأَلَ
پس رہا الذاب تو یہ کہنا جائز ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: شَعْرٌ وَشَعْرٌ، نَهْرٌ وَنَهْرٌ کیونکہ اس میں حروف حلقی میں سے ایک حرف ہے، البتہ الکاف میں اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے: یہ محل رفع میں ہے تقدیر کلام ہے ذَابُهُمْ كَذَابُ آلِ فِرْعَوْنَ، یعنی آپ ﷺ کے ساتھ کفار کا رویہ اسی طرح ہے جیسے آل فرعون کا رویہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اور فرار کا خیال ہے کہ معنی یہ ہے: عرب آل فرعون کے کفر کی طرح کافر ہو گئے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: یہ جائز نہیں کہ کاف کفر والے متعلق ہو، کیونکہ کفر و اہلہ میں داخل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اخَذَهُمُ اللہ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں شدید پکڑ لیا جیسا کہ اس نے آل فرعون کو پکڑا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس ارشاد کے متعلق ہے: لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ یعنی انہیں دولت نے کوئی فائدہ نہ دیا جیسا کہ آل فرعون کو ان کے مال اور اولاد نے کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور یہ ان کے لئے جواب ہے جو جہاد سے پیچھے رہ گئے۔ اور انہوں نے کہا: ہمارے مالوں اور ہمارے گھر والوں نے ہمیں مشغول رکھا۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں لفظ وقود سے مقدر شدہ کوئی فعل عامل ہو۔ اور تشبیہ نفس احراق (جلنے) میں ہو۔ اور اس معنی کی تائید اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۖ ۝۱۰۱ التَّامِرُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۖ ۝۱۰۲ (المومن) (اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونوں کو سخت عذاب نے۔ دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہوگی) (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونوں کو سخت تر عذاب میں)

پہلا قول ارجح ہے (۱) اور علماء میں۔ یہ کئی ایک نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: كَذَابُ آلِ فِرْعَوْنَ کا معنی ہے جیسا کہ آل فرعون کی عادت اور رویہ تھا، وہ کہہ رہے ہیں: ان کافروں کا الحاد اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اسی طرح ہے جیسا کہ آل فرعون نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اپنایا اور کہا: یہ معنی ازہری نے بیان کیا ہے۔ اور رہا وہ قول جو سورۃ الانفال میں ہے كَذَابُ آلِ فِرْعَوْنَ تو اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں قتل اور قید کی سزا دی گئی جیسا کہ آل فرعون کو غرق اور ہلاکت کی سزا دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْهُ سُبُوْحًا وَّاَمْسًا وَّلَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ وَتِلْكَ اٰيَاتُ الْاَنْفَالِ ۚ وَالَّذِيْنَ لَا يَمْلِكُوْا شَيْْئًا يَّسْتَكْبِرُوْنَ ۚ (یعنی آیات متلوہ) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جو وحدانیت پر بطور دلیل بیان کی گئی ہیں۔ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَغْلَبُوْنَ وَّاسْتَكْبَرُوْنَ وَّتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْاِهْلٰۤاۤدُ ۝۱۰۳

”(اے میرے رسول!) فرما دو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا کہ عنقریب تم مغلوب کئے جاؤ گے اور ہانکے جاؤ گے جہنم کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔“

گُفْرُ وَا سے مراد یہودی ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان بدر میں قریش کو شکست سے دو چار کیا (اور فتح و کامرانی کے ساتھ) مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے یہودیوں کو جمع کیا اور فرمایا: ”اے گروہ یہود! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس کی مثل عذاب سے جو اس نے بدر کے دن قریش پر نازل کیا قبل اس کے کہ وہ تم پر بھی وہی نازل کرے جو ان پر نازل کیا۔ تحقیق تم جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجا ہوا نبی ہوں تم اسے اپنی کتاب میں بھی پاتے ہو اور اللہ تعالیٰ نے تم سے عہد بھی لے رکھا ہے۔“ تو انہوں نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھے یہ بات دھوکہ نہ دے کہ تو نے ان لوگوں کو قتل کیا جو نا تجربہ کار تھے وہ فنون جنگ سے ناواقف تھے، پس تم نے ان میں (قتل و غارت) کا موقع پالیا! قسم بخدا اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ چھیڑی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کتنے (بہادر اور تجربہ کار) لوگ ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قُلْ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْيُهُمْ تَغْلِبُهُمْ سَعْيُهُمْ اُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاكِبُونَ (سورہ ابراہیم: 48) اور تمہیں آخرت میں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ یہ عکرمہ اور سعید بن جبیر کی حضرت ابن عباس کا۔ وَتُحْشَرُونَ اِلٰی جَهَنَّمَ اور تمہیں آخرت میں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ یہ عکرمہ اور سعید بن جبیر کی حضرت ابن عباس سے روایت ہے (1)۔ اور آپ ہی سے ابو صالح کی روایت میں ہے کہ یہودی جب خوش ہوئے اس تکلیف اور اذیت سے جس سے مسلمان غزوہ احد کے دن دو چار ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پس اس بنا پر سَيُغْلِبُهُمْ سَعْيُهُمْ یا کے ساتھ، مراد قریش ہیں وَيُحْشَرُونَ یا کے ساتھ یعنی دونوں لفظ یا کے ساتھ ہیں اور یہ حضرت نافع کی قرأت ہے۔

قوله تعالى: وَيُسَّسُ الْإِبْهَادُ مراد جہنم ہے یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے برا ہے وہ جو انہوں نے اپنے لئے ٹھکانا بنایا، تو گویا معنی یہ ہوا: ان کا وہ فعل بہت برا ہے۔ س نے انہیں جہنم تک پہنچا دیا (2)۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ
يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأَى الْعَيْنِ ۗ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بَصَرَهُمْ مَنْ يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً
لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿١٣﴾

”بے شک تھا تمہارے لئے (عبرت کا) نشان (ان) دو گروہوں میں جو ملے تھے (میدان بدر میں) ایک گروہ لڑتا تھا اللہ کی راہ میں اور دوسرا کافر تھا دیکھ رہے تھے (مسلمان انہیں) اپنے سے دو چند (اپنی) آنکھوں سے اور اللہ مدد کرتا ہے اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے یقیناً اس واقعہ (بدر) میں بہت بڑا سبق ہے آنکھ والوں کے لئے۔“

قوله تعالى: قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ، آيَةٌ كَامَعْنَى علامت ہے۔ اور یہاں گان فرمایا کانت نہیں فرمایا، کیونکہ آیۃ کی تانیث غیر حقیقی ہے اور کہا گیا ہے: 'ا سے بیان کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ یعنی قد کان لکم بیان (بے شک تمہارے لئے بیان اور وضاحت تھی)

تو اس میں معنی کو اپنایا گیا ہے اور لفظ کو چھوڑ دیا گیا ہے: جیسا کہ امری القیس کا قول ہے:

بَرْهَرَةٌ رُؤْدَةٌ رَحْصَةٌ كَخُرْعُوبَةٍ الْبَانَةِ الْمُنْفِطِرِ

اور اس میں المنفطرۃ نہیں کہا، کیونکہ انہوں نے قضیب کے معنی کو پیش نظر رکھا ہے۔

اور فرما نے کہا ہے: اسے مذکر ذکر کیا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان صفت سے فاصلہ کیا گیا ہے اور جب اسم اور فعل کے درمیان صفت حائل ہوگئی تو فعل مذکر لایا گیا۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں اس قول کے تحت گزر چکا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا قَضَيْتُمْ أَحَدَكُمُ الْمَوْتَ أَنْ تَرَكَ خَيْرٌ ۚ الْوَصِيَّةُ (البقرہ: 180) (فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آجائے تم میں سے کسی کے موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کو وصیت کرے) فِي فِتْنَتَيْنِ التَّقَاتِ یعنی مسلمانوں اور مشرکوں کے دو گروہ جو بدر کے دن ملے تھے۔ فِئۃ جمہور نے فِئۃ رفع کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی احداہما فِئۃ۔

اور حسن اور مجاہد نے فِئۃ جر کے ساتھ پڑھا ہے وَأُخْرَى كَافِرَةٍ کو بدل ہونے کی بنا پر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن ابی بلہ نے دونوں میں نصب پڑھی ہے (1)۔

احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: حال ہونے کی بنا پر نصب پڑھنا جائز ہے، یعنی التقتا مختلفتین مؤمنۃ و کافرۃ۔ زجاج نے کہا ہے: نصب پڑھی گئی ہے بمعنی اعنی۔ اور لوگوں کی جماعت کو فِئۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے فِئۃ اور تکلیف کے وقت۔

اور زجاج نے کہا ہے: الفِئۃ کا معنی جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہے اور یہ فَأَوْتُ رَأْسَهُ بِالسَّيْفِ سے ماخوذ ہے۔ (یعنی میں نے تلوار کے ساتھ اس کا سر جدا کر دیا۔) اور کہا جاتا ہے: فآیتہ۔ (یہ تب کہے گا) جب تو اسے پھاڑ دے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان دونوں گروہوں سے اشارہ ان کی طرف ہے جو غزوہ بدر کے دن ملے تھے (2)۔ اور اس کے مخاطب کے بارے میں اختلاف ہے۔

پس کہا گیا ہے: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ مومنوں کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہو، یہ احتمال بھی ہے کہ خطاب تمام کفار کو کیا گیا ہو اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ مدینہ طیبہ کے یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہو۔ اور ان میں سے ہر احتمال کے مطابق قوم نے قول کیا ہے (3)۔ اور مومنین کو خطاب کا فائدہ نفوس کو ثابت قدم رکھنا اور انہیں تشجیع دلانا ہے یہاں تک کہ وہ دو چند اور کئی چند ہو کر آگے بڑھے، جیسا کہ واقع ہوا ہے۔

قوله تعالى: يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأَى الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ابو علی نے کہا ہے: اس آیت میں رویت سے مراد آنکھ کے ساتھ دیکھنا ہے۔ اسی لئے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے (4)۔ مکی اور مہدوی نے کہا ہے: اس پر رَأَى الْعَيْنِ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ اور نافع نے تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں

2۔ ایضاً، صفحہ 407

4۔ ایضاً، صفحہ 407

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ

3۔ ایضاً، صفحہ 406

نے یا کے ساتھ۔ مِثْلَيْهِمْ کو تَرَوْنَهُمْ میں ہا اور میم سے حال ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ اور جمہور لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ترون کا فاعل مومنین ہیں۔ اور اس کے ساتھ ضمیر متصل کفار کے لئے ہے (1)۔

اور ابو بکر نے اس کا انکار کیا ہے کہ اسے تَرَوْنَهُمْ کے ساتھ پڑھا جائے۔ انہوں نے کہا ہے۔ اور اگر اس طرح ہوتا تو پھر مِثْلَيْكُمْ ہوتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ لازم نہیں آتا، لیکن یہ جائز ہے کہ وہ مثلی اصحابکم ہو۔ مکی نے کہا ہے: تَرَوْنَهُمْ کے ساتھ لَكُمْ میں خطاب کی بنا پر واقع ہوا ہے۔ اور اچھا یہ ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہو۔ اور ہا اور میم (ہم) مشرکین کے لئے ہو۔ اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ مثلیکم کاف کے ساتھ پڑھیں اور یہ خط کی مخالفت کی وجہ سے جائز نہیں ہے، لیکن یہ کہ کلام خطاب سے غیب کی طرف نکلنے پر واقع ہو، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: حَتَّىٰ اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهٖمْ اَوْرِیْہُمْ اور یہ ارشاد ہے: وَمَا اَتَيْنٰكُمْ مِنْ زَكٰوٰتٍ اَوْ اٰیٰتٍ فَآوٰیٰتُكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (روم: 39) اور غیب کی طرف رجوع کیا۔

پس مِثْلَيْهِمْ میں ہا اور میم احتمال رکھتے ہیں کہ وہ مشرکین کے لئے ہو، یعنی اے مسلمانو! تم مشرکوں کو دو چند دیکھ رہے تھے اس تعداد سے جس پر وہ تھے اور معنوی طور پر یہ بعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نگاہوں میں مشرکوں کو زیادہ نہیں کیا، بلکہ اس نے ہمیں یہ بتایا کہ اس نے انہیں مومنین کی نگاہوں میں کم کر دیا، پس معنی یہ ہوگا: اے مومنین! تم مشرکوں کو تعداد میں اپنے سے دو چند دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ ان سے تین گنا تھے، پس اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مسلمانوں کی نظروں سے کم کر دیا اور انہیں اپنی تعداد سے دو گنا مشرکین دکھائے تاکہ ان کے دل قوی اور مضبوط ہو جائیں اور ان میں جرأت و دلیری آجائے۔ اور انہیں یہ بتادیا گیا تھا کہ ان میں سے سو افراد دو سو کافروں پر غالب آجائیں گے۔ اور مسلمانوں کو مشرکین کی نظروں میں کم کر دیا تاکہ وہ ان پر حملے کی جرأت کریں اور پھر ان میں اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نافذ ہو۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مِثْلَيْهِمْ میں ضمیر مسلمانوں کے لئے ہو یعنی اے مسلمانو! تم مسلمانوں کو اس تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے جس پر تم تھے۔ یعنی تم اپنے آپ کو اپنی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ایسا اس لئے کیا تاکہ ان کے نفوس مشرکین کے ساتھ مقابلہ کے لئے قوی اور طاقتور ہو جائیں۔ پہلی تاویل اولیٰ اور رائج ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: اِذْ يُرِيكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَاوِكَ قَلِيْلًا (الانفال: 43) (یاد کرو جب دکھایا اللہ نے آپ کو لشکر کفار خواب میں قلیل)

اور یہ ارشاد: وَ اِذْ يُرِيكُمُوْهُمْ اِذَا التَّقِيْتُمْ فِیْ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا (الانفال: 44) (اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے دکھایا تمہیں لشکر کفار جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے اپنے پہلو میں ایک آدمی کو کہا: کیا تو انہیں ستر دیکھ رہا ہے؟ تو اس نے کہا: میں انہیں سو گمان کر رہا ہوں۔ پس جب ہم نے قیدیوں کو پکڑا تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہزار تھے (2)۔ اور علامہ طبری نے ایک قول سے بیان کیا ہے کہ انہوں

نے کہا: بلکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی نظروں میں مومنین کی تعداد کو زیادہ کر دیا یہاں تک کہ وہ ان کے نزدیک ان سے دو گنا تھے۔ اور طبری نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسی طرح کئی جہتوں سے یہ مردود ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مومنوں کی نگاہوں میں کم کر دیا تھا جیسا کہ گزر چکا ہے (1)۔ اور اس تاویل کی بنا پر ہو تو ترون کافروں کے لئے ہو گا یعنی اسے کافروں! تم مومنوں کو ان کی اصلی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم انہیں اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فراء نے گمان کیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم انہیں دو گنا دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ تین گنا تھے۔ اور یہ بعید ہے لغت میں غیر معروف ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ باب الغلط ہے۔ اس میں غلطی تمام قیاسوں میں ہے، کیونکہ ہم کسی شے کی مثل کو اس کا مساوی سمجھتے ہیں اور ہم اس کی دو مثل اسے سمجھتے ہیں جو دو بار اس کے مساوی ہوتی ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: فراء نے اس کا قول بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: جیسا کہ تو کہتا ہے اور تیرے پاس غلام ہو کہ میں اس کی مثل کا محتاج ہوں۔ پس تو اس کا اور اس کی مثل کا محتاج ہو گا۔ اور تو یہ کہے: میں اس کی دو مثل کا محتاج ہوں، تو تو تین گنا کا محتاج ہو گا اور معنی اور لغت اس کے خلاف ہے جو اس نے کہا۔

اور وہ جو فراء نے اس میں بیان کیا ہے کہ مشرکین غزوہ بدر کے دن مومنین سے تین گنا تھے۔ پس اسے یہ وہم ہوا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ انہیں دیکھ رہے ہوں مگر ان کی اسی تعداد پر (جس پر وہ تھے) اور یہ بعید ہے اور معنی اس کے مطابق نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو اعتبار سے ان کی تعداد بدل کر دکھائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اس میں نفع اور فائدہ دیکھا، کیونکہ مومنین کے دل اس کے ساتھ قوی ہو جائیں گے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علامت و نشانی ہو جائے۔ اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور رہی یا کی قرأت تو ابن کیسان نے کہا ہے: یَوْمَ نَهَمُّ فِيهَا اور مِمَّ (یعنی ہم ضمیر) وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مِثْلِهِمْ میں ہا اور مِمَّ فِئَةً تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ پر عائد ہے اور اضمار میں سے یہ وہ ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: يُؤْتِيهِمْ نَصْرَهُ مَنِ يَشَاءُ۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ کافر دکھائی دینے میں مسلمانوں کی دو مثل تھے حالانکہ تعداد میں وہ تین مثل تھے، فرمایا یہاں رویت یہود کے لئے ہے اور مکی نے کہا ہے: یہاں رویت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے والے گروہ کے لئے ہے اور جس کو دیکھا گیا وہ کافروں کا گروہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا گروہ کافروں کے گروہ کو مومنین کے گروہ کا دو گنا دیکھ رہا تھا حالانکہ کافروں کا گروہ مومنین سے تین گنا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی نظروں میں کم کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور لَنْكُمْ میں خطاب یہودیوں کے لئے ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور طلحہ رضی اللہ عنہما نے تَوَدَّ نَهْمٌ تَا كَوْضَمَ کے ساتھ اور سلمیٰ نے تَا مَضْمُومَہ کے ساتھ فعل مجہول کی بنا پر پڑھا ہے (2)۔ وَاللَّهُ يُؤْتِيهِمْ نَصْرَهُ مَنِ يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ والحمد لله۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ
وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۚ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَبَٰثِ ۝

”آراستہ کی گنی لوگوں کے لئے ان خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے اور خزانے جمع کئے ہوئے سونے اور
چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور چوپائے اور کھیتی یہ سب کچھ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اللہ ہے
جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔“

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: زُيِّنَ لِلنَّاسِ زُيِّنَ تزیین سے ہے۔ اور آراستہ کرنے والے کے بارے میں لوگوں کا
اختلاف ہے، ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے آراستہ کیا ہے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول کا ظاہر معنی یہی
ہے، اسے بخاری نے ذکر کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلٰی الْاَرْضِ زِينَةً لِّهَا (الکہف: 7) (بے شک ہم
نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں ان کے لئے باعث زینت)

اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے میرے رب! اس وقت تو نے اسے ہمارے لئے آراستہ کیا ہے! پھر یہ آیت نازل
ہوئی قُلْ اَوْ زَيْنَتْكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ (آل عمران: 15) (آپ فرمائیے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز)

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آراستہ کرنے والا شیطان ہے اور حضرت حسن کے قول کا ظاہر یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا:
کس نے اسے آراستہ کیا ہے؟ اس کے خالق سے زیادہ شدید اس کی مذمت کرنے والا کوئی نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی تزیین یہ
ہے کہ اس نے اسے ایجاد کیا اور نفع کے لئے اسے تیار کیا اور ان اشیاء کی طرف میلان فطرت میں رکھ دیا۔ اور شیطان کی تزیین
یہ ہے کہ اس نے وسوسہ اندازی کی بددھو کے میں مبتلا کیا اور بغیر اسباب کے انہیں لینے کو حسین قرار دیا۔ اور آیت دونوں وجہوں
پر مشتمل ہے۔ اے اللہ! میں تمام لوگوں کے لئے وعظ و نصیحت ہے اور اس کے ضمن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معصروں و غیرہ
کے لئے زجر و تنبیخ ہے (1)۔ جمہور نے مفعول کا فعل ہونے کی بنا پر زُيِّنَ (یعنی مجہول) پڑھا ہے۔ اور حُبُّ کو رفع دیا ہے۔ اور
نصرت شحاک اور مجاہد نے فاعل کا فعل ہونے کی بنا پر زُيِّنَ (یعنی معروف) پڑھا ہے اور حُبُّ کو نصب دی ہے (2)۔ اور
الشَّهَوَاتِ میں اسم اور صفت میں فرق کرنے کے لئے سا کو حرکت دی گئی ہے۔ اور الشَّهَوَاتِ شَهْوَةٌ کی جمع ہے اور یہ معروف
ہے۔ اور آدمی کی خواہش رکھنے والا ہوتا ہے، (کہا جاتا ہے رجل شہوان للشہو) اور شے کی خواہش رکھی جاتی ہے
(ابدا کہا جاتا ہے شئ شہی اشیاء شہی) اور شہوات (خواہشات) کی اتباع و پیروی سرکش بنادیتی ہے اور ان کی اطاعت
انے ہلاک کردیتی ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ”جنت کا احاطہ مصائب و مکروہات سے کیا گیا ہے اور جہنم کا احاطہ خواہشات سے

کیا گیا ہے“ اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے (1)۔ اور اس تمثیل کا فائدہ یہ ہے کہ جنت حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تبھی جب مصائب و مکروہات کے جنگل کو کاٹ دیا جائے اور ان پر صبر کیا جائے اور جہنم سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تب جب شہوات کو چھوڑ دیا جائے اور نفس کو ان سے چھٹکارا دلا دیا جائے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جنت کا راستہ ٹیلوں کے سبب کٹھن اور دشوار ہے اور جہنم کا راستہ نرم ہموار زمین ہونے کے سبب سہل ہے۔“ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی یہی ہے: حفت الجنة بالمكاره و حفت النار بالشهوات (2) یعنی جنت کا راستہ مشکل ہے کیونکہ اس میں چلنے کے لئے کئی ٹیلوں سے اوپر چڑھنا پڑھتا ہے، اور جہنم کا راستہ آسان ہے اس میں نہ کوئی ناہمواری ہے اور نہ دشوار گزاری۔ اور یہی معنی اس قول کا ہے سہل بسهوة اور یہ لفظ سین مہملہ کے ساتھ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قوله تعالى: مِنَ النِّسَاءِ ان کی عادت اور رویہ کی وجہ سے لوگوں کا کثرت سے ان کی طرف میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے، کیونکہ وہ شیطان کا جال (پھندا) اور مردوں کے لئے فتنہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی شدید فتنہ نہیں چھوڑا (3)“ اسے بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔ پس عورتوں کا فتنہ تمام اشیاء سے زیادہ شدید اور سخت ہے۔ اور کہا جاتا ہے: عورتوں میں دو فتنے ہیں اور اولاد میں ایک فتنہ ہے۔ پس وہ دو جو عورتوں میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قطع رحمی تک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ عورت اپنے خاوند کو ماؤں اور بہنوں سے تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیتی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ آدمی کو حلال و حرام مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور رہے بیٹے! تو ان میں صرف ایک فتنہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو ان کے لئے مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تُسکنوا نساء کم الغرف ولا تعلموهن الکتاب (4) (تم اپنی عورتوں کو بالا خانوں میں سکونت نہ دو اور تم انہیں لکھنا نہ سکھاؤ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ڈرایا (اور محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔) کیونکہ ان کے لئے بالا خانوں میں سکونت اختیار کرنے میں مردوں کی طرف دیکھنا (آسان) ہے۔ اور اس میں ان کے لئے نہ حفاظت ہے اور نہ پردہ۔ کیونکہ وہ مردوں پر جھانکتی رہیں گی نتیجتاً فتنہ اور آزمائش کھڑی ہو جائے گی اور کیونکہ یہ مرد سے پیدا کی گئی ہیں، لہذا ان کی خواہش اور قصد مرد کی جانب ہوتی ہے۔ اور مرد میں شہوت پیدا کر دی گئی ہے اور عورت کو مرد کے لئے باعث راحت و تسکین بنا دیا گیا ہے، پس دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے محفوظ و مامون نہیں اور انہیں لکھنے کی تعلیم دینے میں یہ فتنہ بھی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة و مصفحة نعيمها و اهلها، جلد 2، صفحہ 378

2۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، باب حجبت النار بالشهوات، حدیث نمبر 6006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب ما یستقی من شوم المرأة، حدیث 4706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 380، حدیث نمبر 44999

اور کتاب الشہاب میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث موجود ہے: **أَعْرِضُوا النِّسَاءَ يَلْزَمُنَ الْحَجَالَ** (1) (تم عورتوں کو چھوڑ دو وہ اپنے خاص کمروں کو لازم پکڑے رکھیں گی) پس آدمی پر لازم ہے جب وہ ان زمانوں میں صبر نہ کر سکے تو وہ کسی دیندار عورت کو تلاش کرے تاکہ وہ اپنے دین کو محفوظ رکھ سکے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **عَلَيْكَ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبْتُ يَدَاكَ** (2) (تجھ پر کسی دیندار عورت کو تلاش کرنا لازم ہے تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں) اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **لَا تَزَوِّجُوا النِّسَاءَ لِحَسَنِهِنَّ فَعَسَى حَسَنُهُنَّ أَنْ يُرَدِّيَهُنَّ وَلَا تَزَوِّجُوهُنَّ لَا مَوَالِهِنَّ فَعَسَى أَمْوَالُهُنَّ أَنْ تَطْغِيَهُنَّ وَلَكِنْ تَزَوِّجُوهُنَّ عَلَى الدِّينِ وَلَا مَآئِمَةَ سَوْدَاءَ خَرْمَاءَ ذَاتِ دِينَ أَفْضَلُ** (3) (تم عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے شادی نہ کرو کیونکہ قریب ہے ان کا حسن انہیں ہلاک کر دے، اور تم ان کے مالوں کی وجہ سے ان سے شادی نہ کرو کیونکہ قریب ہے ان کے مال انہیں سرکش بنادیں البتہ تم دین کی بنا پر ان سے شادی کرو اور سیاہ رنگ چھیدے ہوئے کانوں (اور کٹی ہوئی ناک) والی دیندار کنیز افضل ہے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **وَالْبَيْنِينَ** اس کا عطف اپنے ماقبل پر ہے اور بنین کا واحد ابن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی جانب سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: **إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي** (بے شک میرا بیٹا میری اہل میں سے ہے۔) اور اس کی تصغیر بُنًی ہے۔ جیسا کہ لقمان نے کہا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ”کیا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے تیری کوئی اولاد ہے؟“ انہوں نے عرض کی: جی ہاں، میرا اس سے ایک بیٹا ہے اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اس کے لئے میرے پاس طعام کا ایک کنواں ہو اور بنی جبلہ کا جو فرد بھی باقی رہے وہ اسے کھلاتا رہے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر تو نے ایسا کیا ہے تو بلاشبہ وہ (بیٹے) دلوں کی الفت اور راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بزدل بنادینے والے، بخیل بنادینے والے اور غمزدہ کر دینے والے ہیں۔ لئن قلت ذالک انہم لشمر القلوب وقزاة الاعین وانہم مع ذالک لسجبنۃ مبخلة محزنة۔“ (4)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **وَالْقَنَاطِطِ**، القناطر قنطار کی جمع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَأْتَيْتُمُ احْدَهْنَ قَنَطَارًا**۔ اور اس سے مراد مال کی بہت بڑی گانٹھ ہے (5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایک پیمانے کا نام ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے، جیسا کہ رطل اور ربع وغیرہ۔ اور جوشی اس خاص وزن تک پہنچ جائے اس کے لئے کہا جاتا ہے: **هَذَا قَنَطَارٌ** یعنی یہ قنطار کے مساوی اور برابر ہے۔ اور عرب کہتے ہیں: **قَنْطَرُ الرَّجُلِ**۔ جب اس کا مال اس حد کو پہنچ جائے کہ قنطار کے ساتھ وہ اس کا وزن کرے۔ اور زجاج نے کہا ہے: **القنطار ما خوذ به عقد الشئ واحكامه** (6) سے (یعنی کسی شے کو باندھنا اور اسے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 374، حدیث نمبر 44962

2۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، جلد 1، صفحہ 474۔ ایضاً صحیح بخاری، الاکفاء فی الدین، حدیث 4700، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 135۔ ایضاً ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث 1848، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 211۔ 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ

6۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 409

مضبوط کرنا، عرب کہتے ہیں: قنطرت الشيء۔ جب تو اسے خوب پختہ اور مضبوط کر دے اور اسی سے القنطرۃ ہے کہ اس کے پختہ ہونے کی وجہ سے اس کا نام قنطرۃ رکھا گیا ہے جیسا کہ طرفہ نے کہا ہے:

كَهَنْطَرَةً الزُّومِي اَقْسَمَ رَبُّهَا لَتُكْتَفَنَ حَتَّى تُشَادَّ بِقَرْمَدٍ

اور القنطرۃ سے مراد وہ شے ہے جس کا عقد کیا جائے تو گویا قنطار مال کا عقد کرتا ہے (1) اور علماء نے اس کی حد بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کتنی ہے، اس کے بارے متعدد اقوال ہیں۔ سو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”ایک قنطار ایک ہزار دو سو اوقیہ کا ہے۔“ اور اسی کے مطابق حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور علماء کی ایک جماعت نے قول کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اور یہی صحیح ترین قول ہے: لیکن شہروں میں اوقیہ کی مقدار مختلف ہونے کے سبب قنطار بھی مختلف ہوتا ہے (2)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے، اسے البستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایک قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے اور ایک اوقیہ اس سے بہتر ہے جو کچھ زمین و آسمان کے مابین ہے (3)۔“ اور یہی قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کیا ہے اور مسند ابی محمد الدارمی میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ”جس نے ایک رات میں دس آیات پڑھیں اسے ذاکرین میں لکھ دیا جائے گا اور جس نے سو آیات پڑھیں اسے قانتین (بندگی پر قائم و دائم رہنے والے) میں لکھ دیا جائے گا اور جس نے پانچ سو سے ہزار آیات تک پڑھیں تو وہ صبح اس حال میں کرے گا کہ اس کے لئے ایک قنطار اجر ہوگا۔“ عرض کی گئی: قنطار کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: مِلَّ مَسْلَكٌ ثَوْرٌ ذَهَبًا (مشکیزہ سونے سے بھرا ہوا ہو۔)

یہ روایت موقوف ہے اور ابو نصرۃ العبیدی نے یہی کہا ہے اور ابن سیدہ نے بیان کیا ہے: یہ سریانی زبان میں اسی طرح ہے اور نقاش نے ابن کلبی سے بیان کیا ہے کہ یہ لغت روم کے مطابق بھی اسی طرح ہے (4) اور حضرت ابن عباس، حضرت ضحاک اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: قنطار کی مقدار، بارہ سو مثقال چاندی ہے، اسے حسن نے مرفوع ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: چاندی کے بارہ ہزار درہم اور سونے میں سے ایک ہزار دینار مسلم آدمی کی دیت ہے۔ اور حسن اور ضحاک سے یہی مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی ہزار ہیں۔ حضرت قتادہ نے کہا: سونے کے ایک سو رطل یا چاندی کے اسی ہزار درہم (5) اور ابو حمزہ الثمالی نے بیان کیا ہے: افریقہ اور اندلس میں ایک قنطار سے مراد آٹھ ہزار مثقال سونا یا چاندی ہے۔ سدی نے کہا ہے: چار ہزار مثقال کا ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: ستر ہزار مثقال کا۔ اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (6) اور مکی نے ایک قول بیان کیا ہے کہ ایک قنطار چالیس اوقیہ سونا یا چاندی ہے، اور یہی

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 408

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 268۔ ایضاً مسند امام احمد حدیث 8758

6۔ ایضاً

5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 408

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408-409، دار الکتب العلمیہ

ابن سیدہ نے المحکم میں بیان کیا ہے اور کہا ہے: لغت بربر کے مطابق ایک قطار ہزار مثقال کا ہے اور ربیع بن انس نے کہا ہے: قطار سے مراد مال کثیر ہے جو بعض بعض پر پڑا ہو (1)۔

اور عربوں کے نزدیک یہی معروف ہے۔ اور اسی کے مطابق یہ ارشاد ہے: **وَأَتَيْتُمُ احْدَهُنَّ قَطَارًا** (النساء: 20) یعنی تم نے ان میں سے ایک کو مال کثیر دیا۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: ”بے شک صفوان بن امیہ زمانہ جاہلیت میں ایک قطار کو پہنچ گیا اور اس کا باپ بھی قطار کو پہنچ گیا۔“ یعنی اس کا مال قطار ہو گیا۔ اور حکم سے روایت ہے: قطار وہ ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ اور **الْمُقَنْطَرَةُ** کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس طبری وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے **الْمُضَقَّفَةُ** (دو چند کیا ہوا) گویا قباطیر سے مراد تین قطار اور مقنطرہ سے مراد نو ہیں (2)۔ اور فراء سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: قناطیر قطار کی جمع ہے اور مقنطرہ جمع الجمع ہے۔ پس وہ نو قطار ہو جائیں گے۔ سدی نے کہا ہے: مقنطرہ سے مراد ڈھالا ہوا سونا یا چاندی ہے یہاں تک کہ دنا نیر یا دراہم ہو جائے۔ مکی نے کہا ہے: یہ **المقنطرۃ السکملۃ** (یعنی جمع کئے ہوئے خزانے) (3) ”سکمل قطار“۔ اور اسے ہروی نے بیان کیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: **بِدَارٌ مُبْدَرَةٌ** (دس ہزار کی تھیلی جو ان سے بھری ہوئی ہو) اور **آلاف مؤلفۃ** (ہزاروں جو جمع کئے گئے ہوں)۔ اور بعض نے کہا ہے: اور اسی لئے بنا (عمارت) کو اس کی بناوٹ ایک دوسرے کے اوپر گھنی اور مضبوط ہونے کی وجہ سے قنطرہ کہا جاتا ہے۔

ابن کیسان اور فراء نے کہا ہے: نو قطار سے کم مقنطرہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: **المقنطرۃ** حضور مال اور اس کے بھاری بھر کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ (4)

اور صحیح البستی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے دس آیات کے ساتھ قیام کیا وہ غافلین میں سے نہیں لکھا جائے گا اور جس نے سو آیات کے ساتھ قیام کیا اسے قانتین میں لکھا جائے گا اور جس نے ہزار آیتوں کے ساتھ قیام کیا تو اسے مقنطریں (خزانہ جمع کرنے والے) میں لکھا جائے گا (5)۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: **مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ**۔ **الذَّهَبُ** مونث ہے کہا جاتا ہے: **الذهب الحسنۃ** (یہ حسین سونا ہے) اس کی جمع ذہاب اور ذہوب آتی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ **ذَہَبَةٌ** لکی جمع ہو۔ اور جمع اذہاب بنائی جائے۔ اور ذہب فلان مذہب احسن (فلاں خوب اچھی طرح گزر گیا) اور الذہب اہل یمن کا ایک پیمانہ بھی ہے۔ اور رجل ذہب جب کوئی آدمی سونے کی کان دیکھے اور حیران رہ جائے۔ اور **الفضۃ** یہ تو معروف ہے اور اس کی جمع **فِضْضٌ** ہے۔ پس الذہب، الذہاب سے ماخوذ ہے۔ اور **الفضۃ** یہ **انفض الشئ** (شے کا متفرق ہونا) سے ماخوذ ہے۔ اور اسی سے **فَضَضْتُ الْقَوْمَ** **فَانْفَضُوا** ہے۔ یعنی میں نے قوم کو تقسیم کیا تو وہ تقسیم ہو گئی اور یہ مادہ اشتقاق ان دونوں کے زوال اور ان کے عدم ثبوت کا احساس دلاتا ہے۔ جیسا وجود میں کیا گیا ہے۔ اور اس معنی میں جو سب سے اچھا کہا گیا ہے وہ بعض کا یہ قول ہے:

النَّارِ آخِرُ دِينَارٍ نَفَقَتْ بِهِ وَاللَّهُمَّ آخِرُ هَذَا الدِّهْمِ الْجَارِي

جس دینار کے بارے تو نے گفتگو کی ہے اس کا آخر آگ ہے اور اس جاری دہم کا آخر غم ہے۔

وَالْمَرْءُ بَيْنَهُمَا إِنْ كَانَ ذَا وَرَعٍ مُعَذِّبُ الْقَلْبِ بَيْنَ النَّارِ

اگر آدمی کمزور دل ہو تو وہ ان دونوں کے درمیان اس حال میں ہوتا ہے کہ اس کا دل غم اور آگ کے درمیان عذاب میں مبتلا

رہتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَالْخَيْلِ الْخَيْلِ مَوْثٌ ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ابو عبیدہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: خیل کا واحد خائل ہے، جیسا طیر کا واحد طائر اور ضئین کا واحد ضائن ہے اور گھوڑے کو یہ نام اسی لئے دیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنی چال میں اکڑ اور تکبر کا اظہار کرتا ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ یہ اسم جمع ہے لفظوں میں اس کا کوئی واحد نہیں، (1) (بلکہ) اس کا واحد فرس ہے، جیسا کہ یہ الفاظ القوم، الرهط، النساء اور الابل وغیرہ..... اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو ہوا سے پیدا کیا ہے اور اسی لئے اسے بغیر پروں کے اڑنے والا بنا دیا“ (مراد اس کی تیز رفتاری ہے۔) اور وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جنوب کی ہوا سے تخلیق فرمایا ہے۔ حضرت وہب نے کہا ہے: کوئی تسبیح، تکبیر اور تہلیل نہیں ہے جسے پڑھنے والا پڑھتا ہے مگر وہ (گھوڑا) اسے تا بھی ہے اور اسے اسی کی مثل کے ساتھ جواب بھی دیتا ہے۔ گھوڑے کا ذکر اور اس کے وصف کا بیان سورۃ الانفال میں آئے، جو اس میں کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر تمام جانور پیش فرمائے اور آپ کو کہا گیا: ان میں سے ایک پسند کر لو۔ تو انہوں نے گھوڑا چنا۔ تو آپ کو فرمایا گیا: تم نے اپنی عزت کو اختیار کیا ہے۔ پس اسی وجہ سے اس کا نام الخیر پڑ گیا۔ اور اس کا نام خیل رکھا گیا کیونکہ یہ (گھوڑا) العز سے موسوم ہے اور جو اس پر سوار ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے عزت پالیتا ہے اور وہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر اظہار فخر کرتا ہے۔ اور اس کا نام فرس رکھا گیا ہے کیونکہ یہ شیر کے جھپٹنے کی طرح اچھلتے کودتے فضا کی مسافتوں کو طے کر لیتا ہے اور وہ زور سے روندتے ہوئے انہیں اس طرح کاٹتا ہے جیسا کہ اپنے ہاتھ سے کوئی شے دبوچ لی جائے۔ اور اس کا نام عربی رکھا گیا ہے کیونکہ اسے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے کعبہ معظمہ کی بنیادیں اٹھانے کی جزا کے طور پر لایا گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عربی ہیں۔ پس چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو عطا ہوا اس لئے اس کا نام عربی رکھا گیا۔

اور حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: ”شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا جس میں عتیق گھوڑا ہو (2)“ گھوڑے کو عتیق اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ وہ ہجانہ سے جدا اور مبرا ہوتا ہے (ہجانہ سے مراد خراب نسل کا گھوڑا جس میں گھوڑی ترکی ہو اور گھوڑا عربی ہو تو ان سے پیدا ہونے والے گھوڑے کو ہجین کہا جاتا ہے۔)

اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”بہترین گھوڑا وہ سیاہ رنگ کا گھوڑا ہے جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو اور اس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ بھی سفید ہو۔ (پھر وہ جس کی پیشانی اور چاروں پاؤں سفید ہوں) طلق الیمین ہو (یعنی اس کا دایاں پاؤں سفید نہ ہو) اور اگر سیاہ (ادھم) گھوڑا نہ ہو تو پھر کُمیت (جس کا رنگ سیاہی مائل ہو) گھوڑا جو اسی وضع پر ہو (1)۔“

اسے ترمذی نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور مسند دارمی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں گھوڑا خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں [میں کون سا گھوڑا خریدوں؟] تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو سیاہ رنگ کا گھوڑا خرید جس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ سفید ہوں اور محجل طلق الیمین ہو۔ (یعنی اس کی پیشانی اور تین پاؤں سفید ہوں) یا پھر اسی صورت پر کُمیت گھوڑا خرید لے تو نفع پائے گا اور تو سلامت رہے گا (2)۔“ اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے نزدیک عورتوں کے بعد گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ شے کوئی نہ تھی (3)۔ اور ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے ہیں، ایک آدمی کے لئے باعث اجر ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے باعث ستر (پردہ) ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے بوجھ ہوتا ہے (4)۔“ یہ حدیث طویل اور مشہور ہونے کے سبب ذکر سے مستغنی ہے۔ گھوڑوں کے احکام کا ذکر سورۃ الانفال اور النحل میں آئے گا جو کافی ہو گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: الْمُسَوَّمَةُ مراد چراگا ہوں میں چرنے والے، حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: سامت الدابة والشاة جب گھوڑا اور بکری چرنے کے لئے جائے تسوم سومافھی سائۃ (5)۔ اور اُسستھا انا جب تو انہیں چرنے کے لئے چھوڑے فھی مسامة اور سومتھا تسوبافھی مُسَوَّمَة۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے طلوع آفتاب سے پہلے جانور چرانے سے اور دودھ والے جانور ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے (6)۔ (اس حدیث میں السوم کا لفظ چرنے کے معنی میں ہے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَيُؤْثِرُونَ ۝ (النحل) (جس میں تم (مویثی) چراتے ہو) اخل نے کہا ہے:

مثل ابن بزعۃ أو کآخر مشله أول لك ابن مسیمۃ الاجمال

مراد اونٹ کو چرانے والے کا بیٹا ہے اور السوام سے مراد ہر چرنے والا جانور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں جہاد کے لئے تیار کیا جائے۔ ابن زید نے یہی کہا ہے (7)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً ترمذی، باب کتاب الجہاد، حدیث 1619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارمی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 131، حدیث نمبر 2433 3۔ سنن نسائی، کتاب الخیل والسبق والرمی، جلد 2، صفحہ 122

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب السبق والرمی، جلد 10، صفحہ 15

صحیح بخاری، باب شرب الناس والدواب من الانهار، حدیث 2198، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، صفحہ 160

5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ

7۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العلمیہ

حضرت مجاہد نے کہا ہے: **الْمُسَوَّمَةُ** وہ ہوتا ہے جو بہت موٹا تازہ اور خوبصورت ہو۔ اور حضرت عکرمہ نے کہا ہے: **سَوَّمَهَا** الحسن (1) (اس نے اسے خوبصورت نشانات لگائے یا اس نے اسے اچھی طرح چرنے کے لئے چھوڑا۔) اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے، انہی کے قول سے ہے: رجل وسیم خوبصورت چہرے والا آدمی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: **الْمُسَوَّمَةُ** ایسے گھوڑے جن کے چہروں پر ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن سے ان کی پہچان ہو سکے (2)۔ یہ السیماء سے ہے اور اس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ اور یہی کسائی اور عبیدہ کا مذہب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ذکر کیا گیا ہے لفظ ان تمام کا احتمال رکھتا ہے، پس وہ گھوڑا جو چرنے والا ہو، اچھی طرح تیار کیا ہوا ہو اور اسے ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن کے سبب دوسروں سے اس کی پہچان ہو سکے (وہی) مراد ہوگا۔ ابو زید نے کہا ہے: اس کی اصل یہ ہے کہ تو اس پر ایسی اون اور علامت بنا دے جو اس کے سارے بدن میں نمایاں ہو تاکہ چراگاہ میں وہ اسے ماسویٰ سے ممتاز اور الگ کر دے۔

ابن فارس اللغوی نے اپنی مجمل میں بیان کیا ہے: **الْمُسَوَّمَةُ** سے مراد وہ گھوڑا ہے جو چھوڑا جائے اور اس پر اس کا سوار بھی ہو۔ اور مورج نے کہا ہے: **الْمُسَوَّمَةُ** کا معنی ہے داغ دیا ہوا۔ مبرد نے کہا ہے: وہ جو شہروں میں معروف ہو۔ ابن کیسان نے کہا ہے: جس میں سیاہ و سفید داغ ہوں۔ یہ تمام معانی سیماء کے متقارب ہیں۔ نابغہ نے کہا ہے:

و ضُنِرَ أَقْدَاحُ مُسَوَّمَاتٍ عَلَيْهَا مَغَشَّرُ أَشْبَاهِ جِنِّ (3)

مسئلہ نمبر 8۔ قول تعالیٰ: **وَالْأَنْعَامِ** ابن کیسان نے کہا ہے جب تو کہے **نَعَم** تو اس کا اطلاق صرف اونٹ پر ہوتا ہے اور جب کہے **الْأَنْعَامِ** تو اس میں اونٹ اور تمام چرنے والے جانور آ جاتے ہیں۔

فراء نے کہا ہے: یہ لفظ مذکر ہے اس کی مونث نہیں آتی، وہ کہتے ہیں: **هَذَا نَعَمٌ وَارِدٌ** (یہ اونٹ آ رہا ہے) اس کی جمع **انعام** آتی ہے۔ بروی نے کہا ہے: **نَعَمٌ** مذکر و مونث دونوں کے لئے آتا ہے۔ اور **الْأَنْعَامِ** سے مراد اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ جانور ہیں اور جب کہا جائے: **النَّعَمُ** تو پھر صرف اونٹ مراد ہوتا ہے اور حسان نے کہا ہے:

و كانت لا يزال بها انيس خلال مروجها نَعَمٌ وَ شَاءُ

اس میں **نَعَمٌ** سے مراد اونٹ ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں عروہ الباری سے مرفوع روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ”اونٹ اپنے مالکوں کے لئے (باعث) عزت ہے اور بکریاں باعث برکت ہیں اور خیر و بھلائی یوم قیامت تک گھوڑے کی پیشانی میں رکھ دی گئی ہے (4)۔“ اور اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بکری جنت کے جانوروں میں سے ہے (5)“ اور

3۔ ایضاً صفحہ 410

2۔ ایضاً

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجار، صفحہ 168۔ ابن ماجہ، کتاب التجار، حدیث نمبر 2295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجار، صفحہ 168۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب التجار، حدیث نمبر 2296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغنیاء کو بکریاں رکھنے کا اور فقراء کو مرغیاں رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا اور فرمایا: اغنیاء کے مرغیاں رکھنے کے وقت اللہ تعالیٰ شہروں کو ہلاک و برباد کرنے کی اجازت دے دیتا ہے (1)۔ اور اسی میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تو بکریاں رکھ لے کیونکہ ان میں برکت ہے (2)۔“ انہوں نے اسے ابوبکر بن ابی شیبہ عن دکیع عن ہشام بن عروہ عن ابیہ عن ام ہانی کی سند سے بیان کیا ہے اور یہ اسناد صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَالْحَرْثُ یہاں حرث ہر اس شے کا نام ہے جسے کاشت کیا جاتا ہے اور یہ مصدر ہے جس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے، تو کہتا ہے: حَرَّثَ الرَّجُلُ حَرْثًا جب وہ کھیتی باڑی کے لئے زمین کو پھاڑے (اس میں ہل چلائے) اور حراثتہ کا اسم دانے کاشت کرنے، باغات لگانے اور دیگر کاشتکاری کی انواع پر بولا جاتا ہے اور حدیث میں ہے: ”تو اپنی دنیا کے لئے کھیتی باڑی کر گویا کہ تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔“ کہا جاتا ہے حرث اور احتراث (میں نے کھیتی باڑی کی) اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ”تم اس قرآن میں خوب غور و فکر اور تحقیق کرو۔“ ابن عربی نے کہا ہے: الحرث کا معنی تفتیش کرنا، تحقیق کرنا ہے۔

اور حدیث میں ہے: أصدق الاسماء الحارث (3) ناموں میں سے اصدق نام حارث ہے کیونکہ حارث وہ ہوتا ہے جو کمانے والا ہو اور احتراث المال کا معنی مال کی کمائی ہے اور المحراث: آگ کو بھڑکانے اور ہلانے والی سیخ ہے اور المحراث قوس میں تانت کی جگہ ہے۔ اس کی جمع أحرثہ ہے۔ اور أحرث الرجل ناقضہ آدمی نے ناقہ کو خوب تھکا دیا، کمزور کر دیا۔ اور حضرت معاویہ کی حدیث میں ہے: ما فعلت نواضحکم؟ تمہارے پانی پلانے والے اونٹوں نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: حراثناہا یوم بدر۔ ہم نے انہیں بدر کے دن خوب کمزور کیا اور تھکایا (اشارہ اس طرف ہے کہ ان کے اشیاء کو قتل کیا ہے۔ النہایہ) ابو عبید نے کہا ہے: وہ اس سے ہزلناہا (ہم نے انہیں کمزور کیا ہے۔) کہا جاتا ہے: حرث الدابة اور احراثتہا دونوں لغتیں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ انہوں نے ہل کا لوہا (جس کے ساتھ زمین پھاڑی جاتی ہے) اور کوئی شے دیکھی تو کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”یہ کسی قوم کے گھر میں داخل نہیں ہوتی مگر ذلت اس کے ساتھ داخل ہوتی ہے (4)۔“ کہا گیا ہے کہ اس ارشاد میں ذل سے مراد زمین کے ان حقوق کی مشقت ہے جن کی ادائیگی ہل چلانے والوں پر لازم ہوتی ہے اور ائمہ اور سلاطین ان کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اور مہلب نے کہا ہے: اس حدیث طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حقیقی معنی تو واللہ اعلم بہر حال یہ بلند احوال اور باعزت

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، حدیث نمبر 2297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ 2۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2294، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الہدایۃ والنہایۃ، جلد 12، صفحہ 192

4۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعہ، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اشراف ترین کاموں سے رزق طلب کرنے پر برا بیگختہ کرنا ہے اور یہ اس لئے ہوا کہ حضور نبی مکرم ﷺ کو اپنی امت کے بارے میں ہل چلانے میں مشغول ہونے، گھوڑوں کی سواری اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کو ضائع کرنے کا خدشہ لاحق ہوا، کیونکہ اگر یہ ہل چلانے میں مشغول ہو گئے تو پھر ان پر وہ امم اور گروہ غالب آجائیں گے جو گھوڑوں کی سواری ان کی کمائی سے اسباب زندگی تلاش کرنے کے لئے کرتے ہیں۔“ پس آپ ﷺ نے انہیں جہاد سے اسباب زندگی تلاش کرنے پر ابھارا نہ کہ مسلسل زمین کی آبادی اور مشقت کو لازم پکڑنے سے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو ان بنو اور خوب مضبوط اور طاقتور بنو اور اونٹوں کی سواری چھوڑ دو اور گھوڑوں پر کود کر بیٹھو تم پر اونٹ چرانے والے غالب نہیں آئیں گے۔ پس آپ نے انہیں مسلسل گھوڑے رکھنے اور ان پر اچھل کر بیٹھنے کے لئے اپنے ابدان کی ورزش کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور صحیحین میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”جس کسی مسلمان نے کوئی درخت لگایا یا کوئی فصل کاشت کی اور اس سے کوئی پرندہ یا انسان یا کوئی جانور کھائے تو اس کے لئے وہ صدقہ ہوگا (1)۔“

علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے مال کی چار قسمیں ذکر کی ہیں اور مال کی ہر نوع کے سبب لوگوں کی ایک قسم خوشحال اور تمول ہوتی ہے۔ پس سونے اور چاندی سے تاجر لوگ خوشحال ہوتے ہیں اور نشان زدہ گھوڑوں کے سبب بادشاہ اور امراء خوشحال ہوتے ہیں اور رہے چوپائے تو ان سے شہروں میں بسنے والے خوشحال ہوتے ہیں اور جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے تو اس سے دیہات میں رہنے والے خوشحالی حاصل کرتے ہیں اور ہر قسم کی آزمائش اسی نوع کے لئے ہوتی ہے جو اس سے خوشحال ہوتی ہے اور جہاں تک عورتوں اور اولاد کا تعلق ہے تو یہ تمام کے لئے آزمائش اور فتنہ ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ سامان جس سے دنیا میں لطف اندوز ہوا جاتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ باقی نہیں رہتا، اس میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور آخرت کے بارے ترغیب ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ دنیا سامان ہے اور سامان دنیا میں سے کوئی شے نیک اور صالحہ عورت سے افضل نہیں (2)۔“

اور ایک حدیث میں ہے: ”تو دنیا میں زہد اختیار کر اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت فرمائے گا (3)۔“ یعنی دنیوی ساز و سامان میں جاہ و شہرت اور ضرورت سے زائد مال کو چھوڑ دے۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”سوائے ان خصال کے ابن آدم (انسان) کا کوئی حق نہیں ہے۔ گھر جو اسے سکونت دیتا ہے، کپڑا جو اس کی شرمگاہ کو چھپاتا ہے اور خشک روٹی اور پانی (4)۔“ ترمذی نے اسے مقدم بن معدیکرب کی حدیث سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحراث والمزارعة، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 134۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، صفحہ 311۔ ایضاً، ابن ماجہ، صفحہ 4091، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 57۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نقل کیا ہے۔

حضرت سہل بن عبد اللہ سے پوچھا گیا: بندے پر دنیا اور تمام شہوات کو چھوڑنا کیونکر آسان ہو جاتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: آدمی کے ان کاموں میں مشغول ہو جانے کے ساتھ جن کا اسے حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور المآب کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے، آب یوؤب ایابا کہا جاتا ہے جب کوئی لوٹ کر آئے۔ امرؤ القیس نے کہا:

و قد طوفت فی الآفاق حتی
تحقیق میں آفاق میں گھوما پھر ایہاں تک کہ میں غنیمت کی بجائے لوٹ آنے پر راضی ہو گیا۔
اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

و کل ذی غیبة یوؤب و غائب الموت لایوؤب (2)

ہر غیب ہونے والا لوٹ آتا ہے (لیکن) موت کے سبب غائب ہونے والا لوٹ کر نہیں آتا۔ مآب کی اصل مأوؤب ہے واؤ کی حرکت نقل کر کے ماقبل ہمزہ کو دی اور واؤ کو الف سے بدل دیا گیا۔ جیسا کہ مقال میں کہا گیا ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اس میں دنیا کی قلت اور اس کی حقارت کو بیان کرنا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف حسین انداز میں لوٹنے کی ترغیب ہے۔

قُلْ أُوْنِیْکُمْ بِخَیْرِ مِّنْ ذٰلِکُمْ ۖ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتْ تَجْرِیْ مِّنْ تَحْتِہَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْہَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَ رِضْوَانٌ مِّنْ اللّٰہِ ۗ وَاللّٰہُ بِصِیْرِ بِالْعِبَادِ ۝

”اے میرے رسول! آپ فرمائیے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز، ان کے لئے جو متقی بنے ان کے رب کے ہاں باغات ہیں، رواں ہیں ان کے نیچے نہریں، ہمیشہ رہیں گے (متقی) ان میں اور (ان کے لئے) پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور حاصل ہوگی انہیں خوشنودی اللہ کی اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو۔“

سوال کی انتہاء مِّنْ ذٰلِکُمْ پر ہے۔ اور لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا خبر مقدم ہے اور جَنَّتْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سوال کی انتہاء عِنْدَ رَبِّهِمْ پر ہے اور جَنَّتْ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے ذالک جنات (3) اور اس تاویل کی بنا پر جَنَّتْ کو خیر سے بدل کر مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔ لیکن پہلی صورت میں یہ جائز نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی مثل ہے: ”عورت سے چار چیزوں کے سبب نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے۔ پس تو دین والی کو تلاش کر تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں“ تنکح المرأة لأربع لساہا وحسبہا وجمالہا و دینہا فاظفر بذات الدین تربت یداک۔ (4) اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس میں فاظفر بذات الدین اس آیت

کی مثال ہے اور جو اس سے پہلے ہے وہ اس سے پہلی آیت کی مثال ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے دنیا سے تسلی دینے اور اسے چھوڑنے والے نفوس کو تقویت دینے کے لئے یہ ذکر کیا ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں اس آیت کے الفاظ کے معانی گزر چکے ہیں۔ الرضوان رضا سے مصدر ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا ”کیا تم کسی شے کا ارادہ رکھتے ہو کہ میں تمہارے لئے اس کا اضافہ کر دوں؟“ تو وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! اور کون سی شے اس سے افضل ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: ”میری رضا سو اس کے بعد میں کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا (1)۔“

اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَاللَّهُ بِصِيْرٍ بِالْعِبَادِ ① میں وعدہ اور وعید دونوں ہیں۔

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا أَمْنَا فَأَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ② الصَّابِرِينَ

وَالصَّادِقِينَ وَالْقَنِتَّةِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِأَلْسِنِهِمْ ③

”یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! یقیناً ہم ایمان لائے تو معاف فرما دے ہمارے لئے ہمارے گناہ اور بچالے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ (یہ مصیبتوں میں) صبر کرنے والے ہیں اور (ہر حالت میں) سچ بولنے والے ہیں اور (عبادت میں) عاجزی کرنے والے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے ہیں اور (اپنے گناہوں کی) معافی مانگنے والے ہیں سحری کے وقت۔“

اس میں الَّذِينَ۔ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا سے بدل ہے۔ اور اگر چاہو تو مرفوع پڑھ لو اور تقدیر کلام ہوگی ھ الذین یا پھر بدت کی بناء پر منصوب پڑھ لو۔ رَبَّنَا اصل میں یا ربنا ہے۔ إِنَّنَا أَمْنَا کا معنی ہے یقیناً ہم نے تصدیق کی۔ فَأَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا یہ مغفرت کی دعا اور التجاء ہے۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ الصَّابِرِينَ یعنی یہ گناہوں اور شہوات سے صبر کرنے والے ہیں اور بعض نے کہا کہ وہ طاعات پر صبر کرنے والے ہیں۔ وَالصَّادِقِينَ اور افعال و اقوال میں سچ بولنے والے ہیں۔ وَالْقَنِتَّةِينَ اور وہ اطاعت و پیروی کرنے والے ہیں۔ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں۔ اور سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر یہ معافی گزر چکے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان متقی لوگوں کے احوال تفصیل سے بیان کئے ہیں جن کے لئے جنات کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِأَلْسِنِهِمْ کے معنی میں اختلاف ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ مغفرت کی دعا اور التجاء کرنے والے لوگ ہیں اور قتادہ نے کہا ہے: ان سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے، کیونکہ وہی نماز پڑھتے ہیں اور وہی استغفار کرتے ہیں۔ اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103۔ ایضاً صحیح بخاری، باب صفة الجنة والنار، حدیث نمبر 6067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ

سحری کا وقت خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بارے میں ظن غالب یہ ہے کہ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو کہا: سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي (میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا) ”بلاشبہ آپ نے اس دعا کو سحری کے وقت تک موخر کر دیا (1)“ اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام سے دریافت فرمایا: ”رات کے کون سے حصہ میں (دعا) زیادہ سنی جاتی ہے؟“ تو انہوں نے جواب دیا: ”میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ سحری کے وقت عرش وجد کناں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے سَحْرٌ اور سَحْرٌ یعنی حا کے فتح اور اس کے سکون کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: سحر سے مراد وہ وقت ہے جب رات واپس پلٹ رہی ہوتی ہے یہاں تک کہ فجر ثانی طلوع ہو جائے اور ابن زید نے کہا ہے: سحر سے مراد رات کا آخری چھٹا حصہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بارے میں صحیح ترین روایت وہ ہے جسے ائمہ حدیث نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) ہر رات جب رات کا پہلا تہائی حصہ گزر جاتا ہے آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں کون ہے وہ جو مجھ سے دعا مانگ رہا ہو کہ میں اس کی دعا قبول کر لوں، کون ہے وہ جو مجھ سے سوال کر رہا ہو کہ میں اسے عطا کروں، کون ہے وہ جو مجھ سے مغفرت طلب کر رہا ہو کہ میں اس کی مغفرت فرما دوں پس وہ اسی طرح ندا دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔“ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں حتیٰ ینفجر الصبح یہاں تک کہ صبح پھوٹ پڑتی ہے (2)۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں..... اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ اور اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اولیٰ اور ارجح وہ ہے جو نسائی کی کتاب میں بطور مفسر موجود ہے۔

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ مہلت دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ رات کا پہلا نصف حصہ گزر جاتا ہے پھر وہ منادی کو حکم دیتا ہے پس وہ کہتا ہے: کیا کوئی دعا مانگنے والا ہے اس کی دعا قبول کی جائے گی، کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے اس کی مغفرت کر دی جائے گی، کیا کوئی سائل اور حاجتمند ہے اسے عطا کیا جائے گا“ اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے (3)، اور یہ ارشاد اشکال کو رفع کر دیتا ہے اور ہر احتمال کو واضح کر دیتا ہے۔ اور بے شک پہلے ارشاد میں مضاف محذوف ہے یعنی عبارت اس طرح ہے یُنْزِلُ مَلَكَ رَبِّنَا فَيَقُولُ۔ اور یُنْزِلُ یاء کو ضمہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور یہ بھی اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ وبالله توفیقنا۔ اور ہم نے اس کا ذکر کتاب الاسنی فی شرح أسساء الله الحسنی و صفاته العلیٰ میں کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 196۔ ایضاً، ترمذی، حدیث نمبر 3493، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، باب صلاة اللیل، صلاة المسافرين، جلد 1، صفحہ 258۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب الدعاء فی الصلوة، حدیث نمبر 1077، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الجواہر الماسان، جلد 1، صفحہ 239، دار الکتب العلمیہ بیروت

مسئلہ: استغفار کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مغفرت طلب کرنے والوں کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ اور کئی دوسری آیات میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ** حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سحری کے وقت ستر مرتبہ استغفار کریں (1)۔ اور حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے: جب رات کا پہلا حصہ ہوتا ہے تو ایک ندادینے والا ندادیتا ہے چاہیے کہ اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے اٹھ کھڑے ہوں چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سحری تک اسی طرح نماز پڑھتے رہتے ہیں اور جب سحری کا وقت ہوتا ہے تو ندادینے والا ندادیتا ہے: مغفرت طلب کرنے والے کہاں ہیں کہ وہ مغفرت طلب کریں، پس دوسرا گروہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور جب فجر طلوع ہو جاتی ہے تو ندادینے والا ندادیتا ہے: خبردار سنو! چاہیے کہ غافل لوگ اٹھ کھڑے ہوں پس وہ اپنے بستروں سے اسی طرح اٹھتے ہیں جیسا کہ مردوں کو ان کی قبروں سے اٹھاما جائے گا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر جب میں اپنے گھروں کو آباد کرنے والوں کی طرف، میری رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کی طرف اور سحری کے وقت تہجد پڑھنے والوں اور استغفار کرنے والوں کی طرف دیکھتا ہوں تو ان کے سبب ان سے عذاب پھیر دیتا ہوں۔“ **ان الله يقول اني لا هم بعذاب اهل الارض فاذا نظرت الي عتار يبيق والى المتحابين في والى المستهجدين والمستغفرين بالاسحار صرفت عنهم العذاب بهم**۔ (2)

حضرت مکحول نے کہا ہے: جب امت میں پندرہ افراد موجود ہوں جو ہر روز پچیس مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہوں تو اللہ تعالیٰ عام عذاب کے ساتھ اس امت کا مواخذہ نہیں فرماتا۔ اسے ابو نعیم نے کتاب الحلیہ میں ذکر کیا ہے۔ اور حضرت نافع نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رات جاگتے رہتے تھے پھر فرماتے: اے نافع! کیا سحری کا وقت ہو چکا ہے؟ میں عرض کرتا: نہیں۔ پھر آپ دوبارہ نماز پڑھنے لگ جاتے، پھر آپ پوچھتے، پس جب میں کہتا: ہاں (سحری کا وقت ہو چکا ہے) تو آپ بیٹھ جاتے اور استغفار کرنے لگتے (3) اور ابراہیم بن حاطب نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے سحری کے وقت مسجد کے ایک کونے میں آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے حکم دیا تو میں نے تیری اطاعت و پیروی کی، یہ سحری کا وقت ہے تو میری مغفرت فرما دے۔ یا رب، امرتني فاطعتك، وهذا سحر فاغفر لي پس میں نے دیکھا تو وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد حضور قلب کے ساتھ زبان سے استغفار کرنا ہے، نہ کہ وہ جو ابن زید نے کہا کہ مستغفرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں (5)۔ واللہ اعلم۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا: اے میرے بیٹے! مرغ تجھ سے زیادہ دانا اور عقلمند نہ ہونے پائے، کہ وہ تو سحری کے

2- شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 501، حدیث نمبر 9051

5- ایضاً

4- ایضاً

1- المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ

3- المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ

وقت ندادیتا ہے اور تو سویا ہی رہے۔

استغفار کے الفاظ میں مختار اور پسندیدہ وہ ہیں جو امام بخاری رحمہ اللہ نے شداد بن اوس سے روایت کئے ہیں اور آپ کی الجامع میں اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سید الاستغفار یہ ہے کہ تو کہے: اللہم انت ربی لا اله الا انت خلقتنی وانا عبدک وانا علی عہدک و وعدک ما استطعت اعود بک من شر ما صنعت اُبوءُ لک بنعمتک علی و اُبوءُ بذنبی فاغفر لی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت... (اے اللہ! تو میرا رب ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا فرمایا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ پر ہوں جتنی مجھ میں قدرت اور استطاعت ہے میں تیری پناہ مانگتا ہوں ہر اس عمل کے شر سے جو میں نے کیا تیری جو نعمتیں مجھ پر ہیں میں ان کے سبب تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، تو میری مغفرت فرما دے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں ہے۔)

فرمایا... جس کسی نے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ دن کے وقت یہ پڑھا پھر اسی دن شام ہونے سے پہلے پہلے وہ فوت ہو گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہو گا اور جس کسی نے رات کے وقت یہ پڑھا اور پھر اسی رات صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ فوت ہو گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہو گا (1)۔ اور ابو محمد عبد الغنی نے سعید بن ابی لہیعہ کی حدیث عن ابی صخر عن ابی معاویہ عن سعید بن جبیر عن ابی الصہباء البکری عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا پھر ارشاد فرمایا: ”کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھا دوں (جب) تو انہیں کہے تو اگر تیرے گناہ پیونٹیوں کی گزر گاہ کی طرح بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ تیرے لئے انہیں معاف فرما دے اس بنا پر کہ اس نے تیری مغفرت فرمادی ہے: اللہم لا اله الا انت سبحانک عملت سوءا و ظلمت نفسی فاغفر لی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت (2) (اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تیری ذات پاک ہے میں نے برائی کے اعمال کئے ہیں اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے سو تو میری مغفرت فرما دے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا۔)

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَالْمَلَكُ وَالْعِلْمُ قَا بِمَا بِالْقِسْطِ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٠﴾

”شہادت دی اللہ تعالیٰ نے (اس بات کی کہ) بے شک نہیں کوئی خدا سوائے اس کے۔ اور (یہی گواہی دی) فرشتوں نے اور اہل علم نے (ان سب نے بھی یہی گواہی دی کہ وہ) قائم فرمانے والا ہے عدل و انصاف کو نہیں کوئی معبود سوائے اس کے (جو) عزت والا حکمت والا ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ کعبہ معظمہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے جب

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 933۔ ایضاً، بخاری، صلوٰۃ، 5831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، جلد 2، صفحہ 677، حدیث نمبر 5052۔ ایضاً، بخاری، باب الدعاء قبل السلام، حدیث نمبر 790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ آیت نازل ہوئی تو وہ تمام سجدے میں گر گئے (1)۔

اور کلبی نے کہا ہے: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کے پاس اہل شام کے علماء میں سے دو عالم حاضر ہوئے، جب ان دونوں نے مدینہ طیبہ کو دیکھا تو ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: یہ شہر اس نبی مکرم ﷺ کے شہر کے اوصاف کے ساتھ کتنی زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو آخر زمانہ میں تشریف لائے گا! چنانچہ جب وہ دونوں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ کی علامات اور صفات کو دیکھ کر آپ کو پہچان لیا، تو انہوں نے آپ سے پوچھا: کیا آپ محمد (ﷺ) ہیں؟ آپ نے فرمایا ”ہاں“ پھر کہا: کیا آپ احمد (ﷺ) ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ دونوں نے کہا: ہم آپ سے شہادت کے بارے پوچھتے ہیں پس اگر آپ نے ہمیں اس کے بارے بتا دیا تو ہم آپ کے ساتھ ایمان لے آئیں گے اور ہم آپ کی تصدیق کریں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا: ”تم مجھ سے پوچھو“ تو انہوں نے کہا: کتاب اللہ میں سب سے بڑی شہادت کے بارے آپ ہمیں بتائیے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَابِئًا بِأَلْقُسُطِ چنانچہ وہ دونوں اسلام لے آئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کر دی (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ أُولُو الْعِلْمِ سے مراد حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور ابن کيسان نے کہا ہے: مہاجرین اور انصار ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے: اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے ہیں اور ہمدی اور کلبی نے کہا ہے: مراد تمام مومنین ہیں اور یہی قول زیادہ واضح اور ظاہر ہے کیونکہ یہ عام ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں علم کی فضیلت اور علماء کے شرف و فضل پر دلیل ہے، کیونکہ اگر کوئی اور علماء سے اشرف و اعلیٰ ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اور ملائکہ کے نام کے ساتھ اسی طرح ملا کر ذکر کرتا جیسا کہ علماء کا ذکر کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے علم کے شرف و عظمت کے سبب ہی اپنے نبی مکرم ﷺ کو فرمایا: وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا پس اگر کوئی اور شے علم کی نسبت زیادہ شرف والی ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم ارشاد فرماتا کہ اس میں زیادتی اور اضافہ کی التجا کریں جیسا کہ علم میں زیادتی اور اضافہ کی طلب کا حکم ارشاد فرمایا اور آپ ﷺ نے فرمایا: ان العلماء ورثة الانبياء (3) (بلاشبہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں) اور مزید فرمایا: العلماء أُمْنَاءُ اللَّهِ عَنِ خَلْقِهِ (4) (علماء اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق پر امین ہیں) اور یہ علماء کے لئے عظیم شرف اور بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور دین میں ان کے لئے بہت بڑا مقام اور بلند رتبہ ہے۔ ابو محمد عبد الغنی الحافظ نے برکتہ ابن خشیط کی حدیث نقل کی ہے اور یہ عنکل بن حکارک ہیں اور اس کی تفسیر برکتہ بن خشیط ہے اور یہ حافظ ہیں۔

ہمیں عمر ابن مول، محمد بن ابی الخصب، عنکل، محمد بن اسحاق، شریک نے ابو اسحاق سے حدیث بیان کی کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: العلماء ورثة الانبياء يحبهم اهل السماء ويستغفر لهم

1۔ نزاد المسیر، جلد 1، صفحہ 294

2۔ اسباب النزول لنیشابوری، صفحہ 63

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157

4۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 134، حدیث نمبر 28675

الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیامۃ (1) (علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں جب وہ فوت ہو جائیں گے تو یوم قیامت تک سمندر میں مچھلیاں ان کے لئے مغفرت طلب کرتی رہیں گی۔) اس باب میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے جسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ غالب القطان نے بیان کیا ہے: میں تجارت کی غرض سے کوفہ آیا اور میں حضرت اعمش کے قریب اتر۔ اور میں ان سے اختلاف رکھتا تھا۔ پس جب رات ہوئی تو میں نے بصرہ میں نزول کا ارادہ کیا وہ اٹھے اور انہوں نے رات کے وقت نماز تہجد ادا کی اور یہ آیت تلاوت کی شَہِدَ اللہُ اَنَّهُ لَا اِلَہَ اِلَّا ہُوَ الْمَلِکُہُ وَاُولُو الْعِلْمِ قَاِیْمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلَہَ اِلَّا ہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝۱۱ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللہِ الْاِسْلَامُ اعمش نے کہا میں اس بارے شہادت دیتا ہوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور میں یہ شہادت اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رکھتا ہوں اور یہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس ودیعت ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین (فقط) اسلام ہے۔ انہوں نے بار بار یہ کہا..... پس میں صبح کے وقت ان کی طرف گیا اور میں نے انہیں الوداع کہا پھر کہا: بلاشبہ میں نے تمہیں یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے اس کے بارے میں تمہیں کیا خبر پہنچی ہے؟ میں ایک سال تک تمہارے پاس رہا ہوں تم نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: قسم بخدا! میں ایک سال تک اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بیان کروں گا۔ وہ فرماتے ہیں: پس میں اٹھا اور میں نے ان کے دروازے پر اس دن کے بارے لکھ دیا، پس جب سال گزر چکا تو میں نے کہا: اے ابو محمد! سال گزر چکا ہے۔ تو انہوں نے کہا: مجھے ابو وائل نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یجاء بصاحبہا یوم القیامۃ فیقول اللہ تعالیٰ عبدی عہد الی وانا احق من وافی اذ خلوا عبدی الجنۃ (3) اس آیت پڑھنے والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندے نے میرے ساتھ عہد کیا ہے اور میں کسی بھی وفا کرنے والے سے زیادہ حق رکھتا ہوں پس تم میرے بندے کو جنت میں داخل کر دو۔

ابو الفرج الجوزی نے کہا ہے: غالب القطان سے مراد غالب بن خطاف القطان ہے جو اعمش سے حدیث شَہِدَ اللہُ روایت کرتا ہے اور یہ حدیث مفصل ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے: اس کی حدیث میں ضعف بین اور واضح ہے۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا غالب بن خطاف القطان ثقہ ہے، ثقہ ہے۔ ابن معین نے کہا: ثقہ ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ صدوق اور صالح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تیرے لئے اس کی عدالت اور ثقاہت کے لئے یہی کافی ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما نے اپنی کتابوں میں اس کی حدیث نقل کی ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 135، حدیث نمبر 28679

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157۔ ایضاً ابی داؤد، حدیث نمبر 3157، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ عالم التزیل، جلد 1، صفحہ 440

نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”جس نے اپنے سونے کے وقت یہ آیت پڑھی شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَاُولُو الْعِلْمِ قَاۤیْمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ اللّٰهُ تعالیٰ اس کے لئے ستر ہزار فرشتے پیدا فرمادے گا اور وہ اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔“ اور کہا جاتا ہے: جس نے اس شہادت کے بارے اپنے صحیح قلب سے اقرار کر لیا تحقیق اس نے عدل قائم کر لیا۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کعبہ معظمہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت تھے قبائل عرب میں سے ہر قبیلے کے لئے ایک یا دو بت تھے۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو تمام بت اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ ریز ہو گئے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: شَهِدَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا اور آگاہ فرمایا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: شہد فلان عند القاضی (اس کا معنی ہے) فلاں نے قاضی کے سامنے اس کے بارے بیان کیا جس کا حق ہے یا جس پر حق ہے۔ زجان نے کہا ہے: شاہد وہ ہوتا ہے جو کسی شے کو جانتا ہے اور اس کی وضاحت کرتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر ایسی شے کے ساتھ ہماری راہنمائی فرمائی ہے جسے اس نے تخلیق فرمایا اور بیان فرمایا۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: شَهِدَ اللّٰهُ بمعنی قضی اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے (فیصلہ فرمایا) آگاہ فرمایا۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کئی اعتبار سے مردود ہے (2)۔

امام کسائی نے قول باری تعالیٰ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور اِنَّ الدِّیْنَ مِیْن اُنْ کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے۔ مبرد نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے: ان الدین عند اللہ الاسلام بانہ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ پھر یا کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ کہا: امرتک الخیر یہ اصل میں بالخیر ہے۔ کسائی نے کہا ہے تو ان دونوں کو اکٹھی نصب دے، اس معنی میں شہد اللہ انہ کذا، وان الدین عند اللہ۔ ابن کیسان نے کہا ہے: دوسرا ان پہلے سے بدل ہے، کیونکہ اسلام ہی معنی توحید کی تفسیر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی قرأت کی ہے جو کسائی نے بیان کیا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ یعنی اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان الدین اس میں ان کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے (3) اور تقدیر کلام یہ ہے شہد اللہ ان الدین الاسلام پھر ابتدا کی اور فرمایا: اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اور ابوالمہلب نے شَهِدَ اللّٰهُ حال ہونے کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور ان سے شَهِدَ اللّٰهُ بھی مروی ہے (4)۔

اور شعبہ نے عاصم بن زرعم ابی کی سند سے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ اس طرح پڑھتے تھے ان الدین عند اللہ الحنیفیۃ لا الیہودیۃ ولا النصرانیۃ ولا المجوسیۃ (5) ابو بکر انباری نے کہا ہے: کسی صاحب تمیز آدمی پر یہ مخفی نہیں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ سے یہ کلام تفسیر کی حیثیت سے مروی ہے اور ناقلین حدیث میں سے کسی نے اسے قرآن میں داخل کر دیا ہے۔ اور قائلنا قول باری تعالیٰ شَهِدَ اللّٰهُ میں اسم جلالت سے یا قول باری تعالیٰ اِلَّا هُوَ سے حال مؤکدہ ہونے

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 294 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 412، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 132۔ ایضاً، ترمذی، باب مناقب اہل بیت النبی ﷺ، حدیث نمبر 3726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی بنا پر منصوب ہے (1)۔ اور فرما نے کہا ہے: وہ قطع کی بنا پر منصوب ہے، اس کی اصل القائم ہے پس جب الف لام کو کاٹ دیا گیا تو اسے نصب دے دی گئی جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے وَلَئِنَّ الدِّينَ وَاصِبًا اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں القائم بالقسط ہے لغت اور صفت ہونے کی بنا پر۔ اور القسط کا معنی عدل ہے (2)۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ اسے دوبارہ لایا گیا ہے کیونکہ پہلا دعویٰ کے محل میں واقع ہے اور دوسرا شہادت حکم کے محل میں واقع ہے اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلا وصف اور توحید ہے اور دوسرا رسم (حکم) اور تعلیم ہے۔ یعنی تم کہو لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا

جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ⑩

”بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور نہیں جھگڑا کیا جن کو دی گئی تھی کتاب مگر بعد اس کے کہ آگیا تھا ان کے پاس صحیح علم (اور یہ جھگڑا) باہمی حسد کی وجہ سے تھا اور جو انکار کرتا ہے اللہ کی آیتوں کا تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ اس آیت میں دین سے مراد طاعت اور ملت ہے اور اسلام بمعنی ایمان اور طاعات ہے، ابو العالیہ نے یہی کہا ہے اور اسی پر جمہور متکلمین ہیں (3) اور حدیث جبریل (4) کے مطابق ایمان اور اسلام کے مسمیٰ میں دراصل تغایر ہے۔ (یعنی دونوں لفظوں کا اطلاق علیحدہ علیحدہ معنی پر ہوتا ہے۔) اور کبھی معنی مرادفہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کا نام دے دیا جاتا ہے، جیسا کہ وفد عبدالقیس کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اللہ وحدہ لا شریک کے ساتھ ایمان لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو ایمان کیا ہے؟“ انہوں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ و صوم رمضان و ان تؤدوا خمساً من المغنم الحدیث (5)۔ (یہ شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم مال غنیمت سے خمس ادا کرو۔) اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں اور ان میں سے ادنیٰ تکلیف وہ شے کو راستے سے ہٹانا ہے اور اعلیٰ ترین باب لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہنا ہے۔“ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے (6) اور مسلم نے یہ زیادہ کیا ہے والحياء شعبة من الايمان (7) (حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے)

3۔ ایضاً

2۔ ایضاً

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دارالکتب العلمیہ

4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 12۔ ایضاً، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 35۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب اداء الخمس من الايمان، حدیث 51، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب امور الایمان، حدیث نمبر 8، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

7۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47

اور یہ تداخل کے معنی میں ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک بولا جاتا ہے اور اس سے مراد اس کا اپنا اصل مسمیٰ اور دوسرے کا مسمیٰ لیا جاتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے کیونکہ اس میں تصدیق اور اعمال دونوں داخل ہیں اور اسی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے۔ الایمان معرفة بالقلب و قول باللسان و عمل بالارکان (ایمان سے مراد دل سے معرفت حاصل کرنا، زبان سے قول کرنا اور ارکان کے مطابق عمل کرنا ہے) اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے (1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور حقیقی معنی وضعا اور شرعاً پہلا ہی ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ وسعت کے باب سے ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله تعالى: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ الاَیہ۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اختلاف کے بارے خبر دی ہے کہ وہ حقائق کے بارے علم رکھتے تھے اور یہ کہ وہ دنیا کے خواہشمند اور طالب تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ نے (2) یہی کہا ہے اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: اور نہیں جھگڑا کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی آپس میں حسد کرتے ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (صحیح) علم آگیا۔ انفس نے یہی کہا ہے۔ محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: اس آیت سے مراد نصاریٰ ہیں اور یہ نجران کے عیسائیوں کے لئے جھڑک ہے (3)۔ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: اس سے مراد یہود ہیں اور الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ کا لفظ یہود و نصاریٰ تمام کو شامل ہے (4)۔ یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب عطا کی گئی وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں نہیں جھگڑے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس صحیح علم آگیا تھا۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور نبوت کا بیان ان کی کتابوں میں آچکا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس آیت سے مراد یہ ہے) جنہیں انجیل عطا کی گئی انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا نہیں کیا اور آپ کے بارے میں انہوں نے متفرق قول نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس یہ علم آگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ یکتا اور منفرد معبود ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور بَغِيًّا مَفْعُولٌ مِنْ اَجَلِهِ ہونے کی وجہ سے يٰ اَلَّذِيْنَ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (5)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَاِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۚ وَقُلْ لِلَّذِيْنَ اُوتُوا الْكِتٰبَ وَ
الْاُمِّيْنَ ؕ اَسْلَمْتُ ۚ فَاِنْ اَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۗ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ
وَاللّٰهُ بِصِيْرٍ بِالْعِبَادِ ۝

”پھر اگر (اب بھی) جھگڑا کریں آپ سے تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے جھکا دیا ہے اپنا سر اللہ کے سامنے اور جنہوں نے میری پیروی کی اور کہئے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں سے کہ کیا تم اسلام لائے پس اگر وہ اسلام لے آئیں جب تو ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیر لیں تو اتنا ہی آپ کے ذمہ تھا کہ آپ پیغام پہنچا دیں (جو آپ نے پہنچا دیا) اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو۔“

1۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، صفحہ 8۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ایضاً

4۔ ایضاً

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ

قوله تعالى: فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ یعنی اگر وہ جھوٹے من گھڑت اقوال اور مغالطوں کے ساتھ آپ سے جھگڑا کریں، تو آپ اپنا معاملہ اس کی طرف منسوب کیجئے جس کا ایمان اور تبلیغ میں سے آپ کو مکلف بنایا گیا ہے اور آپ کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہی ہے (1)۔ اور قول باری تعالیٰ: وَجْهِيَ بِمَعْنَى ذَاتِي هِيَ (یعنی میں نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دیا ہے) اور حدیث طیبہ میں بھی ہے: سجد وجہی للذی خلقہ وصورة (2) (میری ذات نے اسے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اسے صورت عطا کی)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الوجه بمعنی القصد ہے۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں خرج فلان فی وجه کذا (فلاں اس ارادے اور قصد میں نکلا) یہ معنی سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے، پہلا معنی زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور ساری ذات کو وجہ کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ (چہرہ) آدمی کے تمام اعضاء میں سے زیادہ شرف و عزت والا ہے اور حواس کو جمع کرنے والا ہے۔ اور کسی شاعر نے کہا:

اسلمت وجهی لمن اسلمت له المزن تحمل عذبا زللا
اس میں وجہ بمعنی ذات ذکر کیا گیا ہے۔

اور ماہر متکلمین نے اس ارشاد گرامی وَیَنْتَقِي وَجْهَهُ رَبِّكَ میں کہا ہے کہ اس میں وجہ سے مراد ذات ہے (3) اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ عمل ہے جس کے ساتھ اس کی ذات کا قصد کیا جاتا ہے اور قولہ: وَمَنِ اتَّبَعَنِ میں مَنْ محل رفع میں ہے اور یہ اَسْلَمْتُ کی تا پر معطوف ہے۔ یعنی جنہوں نے میری پیروی کی انہوں نے بھی (اپنا آپ) جھکا دیا۔ اور ضمیر مرفوع متصل پر بغیر تاکید کے عطف جائز ہوتا ہے جبکہ دونوں کے درمیان فاصلہ آجائے۔

حضرت نافع، ابو عمرو اور یعقوب نے اتبعین میں یا کو اپنے اصل پر ثابت رکھا ہے اور دوسروں نے مصحف کی اتباع میں اسے حذف کر دیا ہے کیونکہ یہ اس میں بغیر یاء کے ہے (4)۔ اور شاعر نے کہا ہے:

لیس تخفی یسارق قدر یوم ولقد تخف شیتی إعساری

میری خوشحالی دن کی قدر کو نہیں چھپاتی بلکہ میری عادت و کردار میری تنگدستی کو چھپا دیتا ہے۔

قوله تعالى: وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ وَاللَّهُ بِبَصِيرٍ بِالْعِبَادِ ①۔ لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور اُمِّيِّينَ سے مراد وہ ہیں جن کی کوئی کتاب نہیں اور وہ مشرکین عرب ہیں۔ اَسْلَمْتُمْ میں استفہام تقریری ہے۔ اور اس کے ضمن میں امر ہے۔ یعنی اسلموا (یعنی تم اسلام لے آؤ) علامہ طبری وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: اَسْلَمْتُمْ یہ تہدید ہے اور یہی اچھا اور بہتر مفہوم ہے۔ کیونکہ معنی ہے: کیا تم اسلام لائے یا نہیں؟

2- صحیح مسلم، ملاحہ المسافرين، جلد 1، صفحہ 263

4- معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ

1- المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ

3- المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ

اور ارشاد گرامی فَقَدْ اهْتَدَوْا میں ماضی کا صیغہ ان کے لئے ہدایت کے وقوع اور اس کی تحصیل میں اظہار مبالغہ کے لئے ہے (1)۔ اور الْبَدْعُ بدع کا مصدر ہے اس کے فعل میں عین کلمہ مخفف ہے۔ (بَدْعٌ) یعنی بلاشبہ آپ پر صرف تبلیغ کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حکم ان میں سے ہے جو جہاد کے ساتھ منسوخ ہو چکا ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس آیت کی تاریخ نزول کی پہچان کا محتاج ہے۔ ظاہر تو یہی ہے کہ یہ آیت وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، کیونکہ معنی یہ ہے کہ بلاشبہ آپ پر یہ لازم ہے کہ آپ کی طرف قتال وغیرہ احکام میں سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ وہ ان تک پہنچادیں (2)۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ① أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَالُهُمْ مِنْ نَّصْرِينَ ②

”بے شک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے ہیں انبیاء کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں عدل و انصاف کا لوگوں میں سے تو خوشخبری دو انہیں دردناک عذاب کی۔ یہ ہیں وہ (بد نصیب) اکارت گئے جن کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہے ان کے لئے کوئی مددگار۔“

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ ابوالعباس المبرد نے کہا ہے: بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ تھے ان کے پاس انبیاء علیہم السلام انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لئے آئے تو انہوں نے انہیں قتل کر دیا اور پھر ان کے بعد مومنین میں سے کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے انہیں بھی قتل کر دیا، پس انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور اسی طرح معقل بن ابی مسکین نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات بغیر کتاب کے بنی اسرائیل کے پاس آتے رہے اور وہ انہیں قتل کرتے رہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کے قمعین میں سے ایک گروہ اٹھا اور وہ انہیں عدل و انصاف کا درس دینے لگا، تو وہ بھی قتل کئے جانے لگے (3) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بری قوم وہ قوم ہے جو ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں اور کتنی بری قوم وہ قوم جو نیکی کا حکم نہیں دیتے اور منکر سے منع نہیں کرتے اور کتنی بری قوم ہے وہ جس میں بندہ مومن احتیاط اور پرہیز کے ساتھ چلتا ہے (4)۔“

اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بنی اسرائیل نے دن کے اول حصہ کی ایک ساعت میں تینتالیس انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا، پھر بنی اسرائیل کے لوگوں میں سے ایک سو بارہ آدمی اٹھے اور انہوں نے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا تو اسی دن کے آخری حصہ میں وہ سب کے سب قتل کر دیئے گئے اور وہ وہی لوگ ہیں جن کا

2۔ ایضاً

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دارالکتب العلمیہ

4۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 2، صفحہ 23، حدیث نمبر 2145

3۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 253

ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے (1)۔ اسے المہدوی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اور شعبہ نے ابو اسحاق عن ابی عبیدۃ عن عبد اللہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ بنی اسرائیل ایک دن میں ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرتے رہے پھر دن کے آخر میں ان کی سزیوں کے بازار لگ گئے (2)۔ پس اگر کہنے والا کہے کہ وہ جنہیں یہ نصیحت کی گئی ہے انہوں نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان کے فعل کے ساتھ راضی ہیں جنہوں نے قتل کیا ہے پس یہ بھی انہیں کی طرح ہو گئے۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے بھی حضور نبی مکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے ساتھ قتال کیا اور انہوں نے ان کے قتل کا ارادہ اور قصد کیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَإِذْ يَبْغُوكُمُ الْيَهُودُ الْأَعْرَابُ لِيُكْفِرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ الَّتِي كُفِّرُوا بَهَا قَبْلَ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ** (الانفال: 30) (اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تاکہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں۔)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سابقہ امتوں میں واجب تھا اور یہی رسالت کا فائدہ اور نبوت کی خلافت ہے۔ حسن نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”جس نے نیکی کا حکم دیا یا برائی سے روکا تو وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے (3)۔“

اور درہ بنت ابی لہب نے بیان کیا ہے ایک آدمی حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ لوگوں میں سے بہتر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”(وہ) جس نے انہیں نیکی کا حکم دیا اور انہیں برائی سے منع کیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے لئے ڈرایا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب انہیں جمع اور اکٹھا کیا (4)۔“ اور قرآن کریم میں ہے: **الْمُتَّقُونَ وَالْمُتَّقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (التوبہ: 67) (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مومنین اور منافقین کے درمیان فرق بنا دیا ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ مومن کے اوصاف میں سے خاص ترین وصف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس کا سرخیل اسلام کی طرف دعوت دینا اور اس پر قتال کرنا ہے۔ پھر امر بالمعروف ہر ایک کے لائق اور مناسب نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اسے سلطان وقت قائم کرتا ہے کیونکہ حدود کا قیام اسی کے سبب ہوتا ہے، تعزیر اس کی رائے کے سپرد ہوتی ہے، قید کرنا اور چھوڑنا اسی کے حوالے ہوتا ہے اور جلا وطنی وغیرہ کے احکام اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ پس وہ ہر شہر میں نیک، صالح، طاقتور، عالم اور امانتدار آدمی مقرر کرے گا اور اسے ان احکام کے نفاذ کا حکم دے گا اور اس طرز پر حدود بغیر کسی زیادتی کے جاری رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ** (الحج: 41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو)

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 297

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 432

3۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 77، حدیث نمبر 5564

نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ اہل السنۃ کے نزدیک ناہی کے لئے عادل ہونا شرط نہیں ہے بخلاف مبتدعہ کے وہ کہتے ہیں: کسی کو عادل کے سوا کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ نظریہ ساقط الاعتبار ہے، کیونکہ عدالت تو مخلوق میں سے قلیل لوگوں میں محصور ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام لوگوں میں عام ہے اور اگر وہ اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کریں، اَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْهَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 44) (کیا تم حکم کرتے ہو (دوسرے) لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو) اور قول باری تعالیٰ: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿۱۰۱﴾ اور اسی طرح کی دیگر آیات سے۔ (القصف) (بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں ہو) تو انہیں کہا جائے گا: ان آیات میں وہ عمل کرنے پر مذمت بیان کی گئی ہے جس سے منع کیا گیا ہے نہ کہ یہ مذمت نہی عن المنکر کرنے پر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس عمل سے منع کیا گیا ہے اسے کرنے والا اس کی نسبت زیادہ قبیح ہے جو اسے نہیں کرتا اور اسی وجہ سے وہ جہنم میں اسی طرح گھومتا رہے گا جس طرح گدھا چکی کے ساتھ گھومتا ہے۔ ہم نے اس کی تفصیل سورۃ البقرہ میں قول باری تعالیٰ اَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کے تحت بیان کر دی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ مسلمانوں نے اس بارے میں اجماع کیا ہے جو ابن عبدالبر نے ذکر کیا ہے کہ منکر کو تبدیل کرنا ہر اس پر واجب ہے جو اس پر قادر ہو اور جبکہ اس فریضہ (تغییر منکر) کی ادائیگی میں اسے ایسی ملامت اور خوف لاحق ہو جو باعث اذیت نہ ہو پھر بھی اس فریضہ کی ادائیگی ۱۔ پر واجب ہے اور اگر وہ قدرت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے روکے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اپنے دل سے (برا جانے) اس پر اس سے زیادہ کچھ نہیں..... اور جب وہ اپنے دل سے برا جانے تو پھر وہ اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داری ادا کرے جب وہ اس کے سوا کچھ استطاعت نہ رکھتا ہو۔ بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید میں بہت زیادہ احادیث مروی ہیں لیکن وہ استطاعت اور قدرت کے ساتھ مقید ہیں۔ حسن نے کہا ہے: بلاشبہ مومن کو امید کے لیے اور جاہل کو تعلیم کے لیے کلام کی جاتی ہے۔ پس وہ جس نے اپنی تلوار یا کوڑا رکھ دیا اور پھر کہا: اَتَقِنِي اَتَقِنِي (مجھ سے توج اور ڈر) تو اس میں نہ تیرے لئے کچھ (خطرہ) ہے اور نہ اس کے لئے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسے آدمی کے بارے میں جو منکر (برائی) کو دیکھے اور اسے تبدیل کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ اعتراف کرے کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے (۱)۔ ابن لہیعہ نے اعرج سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی مومن کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔“ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اپنے آپ کو ذلیل کرنا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ ایسی بلا اور مصیبت سے تعرض کرتا ہے جس کے لئے وہ استطاعت نہیں رکھتا (2)۔“

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسے علی بن زید بن جدعان عن الحسن بن جندب عن حذیفہ عن النبی

1۔ الفردوس بما ثور الخطاب، جلد 2، صفحہ 28، حدیث نمبر 2178

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المغن، صفحہ 299۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، نضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے بیان کیا ہے (1)۔ اور ان دونوں میں کلام ہے۔ اور بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: آدمی جب کسی برائی کو دیکھے اور وہ اسے روکنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ تین بار یہ کہے اللہم ان هذا منك (اے اللہ! بلاشبہ یہ منکر (برائی) ہے پس جب اس نے یہ کہہ دیا تو اس نے وہ کر دیا جو اس پر (لازم) تھا۔

ابن عربی نے خیال کیا ہے کہ جسے برائی کے زوال کی امید ہو اور اس کی تبدیلی سے اسے اپنی ذات پر ضرب یا قتل کا خوف ہو تو اکثر علماء کے نزدیک اس خطرہ کے وقت اس کا اس مشقت میں پڑنا جائز ہے اور اگر برائی کے زوال کی امید نہ ہو تو پھر ان کے نزدیک کون سا فائدہ ہے۔ فرمایا: قسم بخدا! میرے نزدیک جب نیت خالص ہے تو اسے چاہیے وہ اس مشقت میں پڑ جائے کیفیت جو بھی ہو اور کسی کی پرواہ نہ کرے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے خلاف ہے جو ابو عمر نے اجماع کا ذکر کیا ہے اور یہ آیت قتل کا خوف ہونے کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَأُمُرٌ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ (لقمان: 17) (نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے۔) اور یہ اشارہ اذیت پہنچانے کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ائمہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھے تو پھر اپنی زبان سے روک دے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو پھر اپنے دل سے (اسے برا سمجھے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے (3)۔“ علماء نے کہا ہے: ہاتھ کے ساتھ امر بالمعروف امراء (حکام وقت) پر لازم ہے اور زبان کے ساتھ امر بالمعروف علماء کے ذمہ ہے اور دل کے ساتھ ضعفاء یعنی عوام الناس پر لازم ہے۔ پس روکنے کے لئے برائی کا ازالہ کرنا جب زبان کے ساتھ ممکن ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے۔ اور اگر اس کے لئے سزا یا قتال کے بغیر ازالہ ممکن نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ یہ بھی کرے۔ اور اگر برائی قتال کے بغیر زائل ہو جائے تو پھر قتال جائز نہیں اور یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لیا گیا ہے: فَقَاتِلُوا الَّذِينَ تَبَيَّنَ حَتَّى تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (الحجرات: 9) (تو پھر سب (مل کر) لڑو اس سے جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف)

اور اسی پر علماء نے اس کی بنیاد رکھی ہے کہ جب کوئی کسی ذات پر یا مال پر حملہ آور کو اپنی ذات سے یا اپنے مال سے یا کسی اور کی ذات سے دور ہٹائے تو اس کا توحق ہے لیکن اس پر کوئی شے (بطور تادان) لازم نہیں۔ اگر زید نے عمرو کو دیکھا کہ اس نے بکر کا مال (اٹھانے یا ضائع کرنے کا) قصد کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس سے اسے روکے جبکہ مال کا مالک اس پر قادر نہ ہو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن، ابن العربی، جلد 1، صفحہ 266

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 51۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، حدیث نمبر 4002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور نہ اس کے ساتھ راضی ہو۔ حتیٰ کہ علماء نے کہا: اگر ہم [قصاص] بھی فرض کر لیں۔ اوسکھا گیا ہے: ہر شہر میں جس میں چار قسم کے لوگ ہوں تو اس کے رہنے والے آزمائش اور بلا سے محفوظ رہتے ہیں۔ اہم عادل جو ظلم نہ کرتا ہو اور عالم جو راہ ہدایت پر گامزن ہو اور مشائخ جو نیکی کا حکم دیتے ہوں اور برائی سے روکتے ہوں اور علم کے حصول اور قرآن کریم کی تعلیم پر براہیختہ کرتے ہوں۔ اور ان کی عورتیں پردے میں رہتی ہوں اور زمانہ جاہلیت کی طرح وہ زیب و آرائش کا اظہار نہ کرتی ہوں۔

مسئلہ نمبر 6۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عرض کی گئی: یا رسول اللہ ﷺ ہم کب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ”جب تم میں وہ ظاہر ہو جائے جو تم سے پہلی امتوں میں ظاہر ہوا۔“ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ہم سے پہلی امتوں میں کیا ظاہر ہوا؟ تو آپ نے فرمایا: الملک فی صغار کہ و الفاحشة فی کبار کہ و العلم فی ردالتکم (حکمرانی تمہارے چھوٹوں اور گھٹیا لوگوں میں ہو اور تمہارے بڑوں (اعلیٰ قسم کے لوگوں) میں فحاشی نام ہو جائے اور علم تمہارے ذلیل (اور کمینے) لوگوں میں ہو۔) زید نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم ﷺ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے و العلم فی ردالتکم یعنی جب علم فاسق لوگوں میں آجائے۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے (1)، اس باب کا مزید بیان سورۃ المائدہ وغیرہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور فَبَشِّرْهُمْ اور وَحَبِّطْ کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ
ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ فَرِيقًا مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ۝

”کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا کچھ حصہ کتاب کا (جب) بلائے جاتے ہیں کتاب الہی کی طرف تاکہ تصفیہ کر دے ان کے باہمی جھڑپوں کا تو پیٹھ پھیر لیتا ہے ایک گروہ ان میں سے در آنحالیکہ وہ روگردانی کرنے والے ہوتے ہیں۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اس سبب سے نازل ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ بیت المدراہ میں یہودیوں کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، تو نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے آپ ﷺ سے کہا: اے محمد! ﷺ آپ کون سے دین پر ہیں؟ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ میں ملت ابراہیم علیہ السلام پر ہوں۔“ تو ان دونوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام تو یہودی تھے۔ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم میرے پاس تورات لے آؤ پس وہی ہمارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔“ تو ان دونوں نے اس کا انکار کر دیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اور نقاش نے بیان کیا ہے: یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کیونکہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضور نبی رحمت ﷺ کی

نبوت کا انکار کر دیا، تو حضور نبی مکرم ﷺ نے انہیں فرمایا: ”تم میرے پاس تورات لے آؤ اس میں میری صفات موجود ہیں۔“ تو انہوں نے انکار کر دیا (1)۔ جمہور نے لِيُخَكِّمَ پڑھا ہے اور ابو جعفر یزید بن القعقاع نے لِيُخَكِّمَ یا کوضمہ کے ساتھ پڑھا ہے (2) اور پہلی قرأت احسن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَذَا كِتَابُنَا يُنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الباقیہ: 29) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جس کو دعوت دی جائے اس کا حاکم کے پاس پیش ہونا واجب ہے کیونکہ اسے کتاب اللہ کی طرف دعوت دی گئی ہے، پس اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو وہ مخالف ہو گیا اور مخالف اور مخالف کی قدر و منزلت کے مطابق اس پر ادب سکھانے کے لئے زجر و توبیخ کرنا متعین ہو جاتا ہے۔ اور یہی حکم ہمارے پاس اندلس اور بلاد عرب میں جاری ہے، لیکن دیار مصر میں ایسا نہیں ہے۔ اور یہ وہ حکم ہے جسے ہم نے سورۃ النور میں پوری تفصیل کے ساتھ اس ارشاد باری تعالیٰ کے تحت بیان کیا ہے: وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ ۚ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ أَفِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَمْ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَخِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ (النور) (اور جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت ایک جماعت ان میں روگردانی کرنے لگتی ہے..... (بلکہ درحقیقت) وہ خود ظالم ہیں) اور زہری نے حسن سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جسے اس کے خصم نے مسلمان حکام میں سے کسی حاکم کے پاس بلایا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ظالم ہو اور اس کا کوئی حق نہ ہو (3)۔“ ابن عربی نے کہا ہے: ”یہ حدیث باطل ہے اور رہا آپ کا یہ قول فَهُوَ ظَالِمٌ تو یہ کلام صحیح ہے اور جہاں تک فلاح حق لہ کا تعلق ہے تو وہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ کی مراد یہ ہو کہ وہ غیباً الحق (کہ وہ غیر حق پر ہو) ابن خویر منداد مالکی نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جسے حاکم کی مجلس کی طرف بلایا جائے اس پر واجب ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ حاکم فاسق ہے یا اسے مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان عداوت کا علم ہو۔“

مسئلہ نمبر 3۔ اور اس آیت میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ سابقہ شرائع ہمارے لئے بھی شریعت ہیں سوائے اس حکم کے جس کے منسوخ ہونے کا ہمیں علم ہو۔ اور یہ کہ سابقہ انبیاء علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق فیصلہ کرنا ہم پر واجب ہوتا ہے، اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ اور یہ کہ تورات نہ ہم پڑھیں گے اور نہ جو کچھ اس میں ہے اس پر ہم عمل کریں گے، کیونکہ وہ جن کے قبضہ میں ہے وہ اس پر امین نہیں ہیں اور انہوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا ہے اور اگر ہم جان لیں کہ اس میں کوئی ایسی شے ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ہمارے لئے اس کی قرأت جائز ہے۔ اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جبکہ انہوں نے حضرت کعب کو فرمایا: ”اگر تو جان لے کہ یہ وہی تورات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران پر

نازل فرمایا ہے تو پھر تو اسے پڑھ۔

اور حضور نبی کریم ﷺ اس کے بارے جانتے تھے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اسی لئے آپ نے انہیں اس کی طرف اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کی طرف دعوت دی۔ اس کا بیان عنقریب سورۃ المائدہ میں آئے گا اور ان اخبار کا بیان جو اس کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَسْنَاَ النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۚ وَغَرَّهٖمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَّا

كَانُوْا يَفْتُرُوْنَ ۝۳۱

”اس (بیباکی) کی وجہ یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ بالکل نہ چھوڑے گی ہمیں دوزخ کی آگ مگر چند دن گئے ہوئے اور فریب میں مبتلا رکھا انہیں ان کے دین کے معاملہ میں ان باتوں نے جو وہ خود گھڑا کرتے تھے۔“
یہ (ان کے) پیٹھ پھیرنے اور اعراض کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور ان کے اپنے اس قول سے دھوکہ کھانے کی طرف: نحن ابناء اللہ و احباوہ اور اسی طرح کے ان کے دیگر اقوال۔ اور سورۃ البقرہ کے اس قول کے معنی میں کلام گزر چکی ہے: لَنْ تَسْنَاَ النَّارُ۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْتُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِیْهِ ۚ وَوَفِیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا

يُظْلَمُوْنَ ۝۳۲

”تو کیا حال ہوگا (ان کا) جب ہم جمع کریں گے انہیں اس روز جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور پورا پورا بدلہ

دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

یہ توقیف اور تعجب کی جہت پر حضور نبی مکرم ﷺ اور آپ کی امت کو خطاب ہے (1)، یعنی کیا حال ہوگا ان کا یا وہ کیا کریں گے جب قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے اور ان سے ان کے وہ حسن مضمل ہو جائیں گے جن کا وہ دنیا میں دعویٰ کرتے تھے اور جو کچھ انہوں نے اپنے کفر، اپنی جرأت اور اپنے قبیح اعمال میں سے کمایا اس کا انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ قول باری تعالیٰ لِيَوْمٍ میں لام بمعنی فی ہے، کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور بصریوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے لحساب یوم۔ (اس دن کے حساب کے لئے) اور طبری نے کہا ہے: لیسا یحدث فی یوم۔ (2) (اس کے لئے جو اس دن میں ظاہر ہوگا)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۚ بِیَدِکَ الْخَیْرُ ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۳۳

”(اے حبیب! یوں) عرض کرو اے اللہ! اے مالک مالکوں کے تو بخش دیتا ہے ملک جسے چاہتا ہے اور چھین

لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی، شہد اللہ اور قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِکَ الْمَلِکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِ الْخَیْرِ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ تُولِیْجُ اللَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُولِیْجُ النَّهَارَ فِی اللَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمِیْتِ وَتُخْرِجُ الْمِیْتِ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ نازل فرمائے، تو یہ عرش کے ساتھ معلق ہو گئیں (اس طرح کہ) ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہ تھا اور انہوں نے عرض کی: اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں دار الذنوب اور ان لوگوں کی طرف اتار رہا ہے جو تیری نافرمانی کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے میری عزت و جلال کی قسم! کوئی بندہ ہر فرض نماز کے بعد تمہیں نہیں پڑھے گا مگر میں اسے حظیرۃ القدس میں اس کے اعلیٰ مقام پر سکونت عطا فرماؤں گا اور یہ کہ میں اس کی طرف ہر روز اپنی مخفی آنکھوں کے ساتھ ستر بار دیکھوں گا اور یہ کہ میں ہر روز اس کی ستر حاجات پوری فرماؤں گا ان میں سے سب سے ادنیٰ مغفرت ہے اور یہ کہ میں اسے ہر دشمن سے پناہ عطا فرماؤں گا اور اس کے خلاف اس کی مدد کروں گا اور جنت میں داخل ہونے سے کوئی شے اس کے لئے مانع اور رکاوٹ نہیں ہوگی مگر یہ کہ وہ فوت ہو جائے۔“

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں ایک دن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روک دیا گیا اور میں آپ کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا نہ کر سکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے معاذ! تجھے نماز جمعہ سے کس شے نے روکا ہے؟“ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یوحنا بن ہار یا یہودی کا مجھ پر ایک اوقیہ چاندی قرض تھا اور وہ میرے دروازے پر میری تاک میں تھا، پس مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ مجھے آپ سے روک دے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے معاذ! کیا تو پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرا قرض ادا فرما دے؟“ میں نے عرض کی: ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر روز یہ پڑھا کر قل اللّٰهُمَّ مالک الْمَلِکِ... تا قولہ... بغیر حساب رحمن الدنیا والآخرہ رحیمہما تعطی منهما من تشاء و تمنع منهما من تشاء اقض عنی دینی (اے دنیا اور آخرت میں بہت زیادہ رحم فرمانے والے اور مہربان تو جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے تو مجھ سے میرا قرض ادا فرما دے) تو اگر تجھ پر اتنا سونا قرض ہوگا جس سے ساری زمین بھر جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تجھ سے اسے ادا فرمائے گا۔“ اے ابونعیم الحافظ نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عطا خراسانی سے بھی روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قرآن کریم میں سے چند آیات یا کلمات سکھائے۔ زمین میں کوئی مسلمان نہیں ہے جو ان کے ساتھ دعا مانگے اور وہ ستایا، دایا، یا اس پر تاوان ہو یا وہ مقرض ہو مگر اللہ تعالیٰ اس کی حاجت و پورا فرما دے گا اور اس کے غم اور پریشانی کو دور فرما دے گا، مجھے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روک لیا گیا۔ پھر آگے مذکورہ روایت بیان کی۔ حضرت عطا کی حدیث غریب ہے انہوں نے اسے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ فتح کیا اور اپنی امت کے ساتھ ملک فارس اور روم کا وعدہ فرمایا تو منافقین اور یہودیوں نے کہا: یہ بعید از امکان ہے! ملک فارس اور روم کہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آسکتے ہیں! وہ ان سے کہیں زیادہ عزت والے اور طاقتور ہیں، کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کافی نہیں ہوا کہ یہ ملک فارس اور روم کا طمع کر رہے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے اس قول میں باطل نظریہ کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی: ”بے شک عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا ہیں“ اور وہ اس طرح کہ یہ اوصاف ہر صحیح الفطرت آدمی کے لئے واضح اور ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کوئی شے نہیں ہیں (2)۔ ابن اسحاق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے عناد اور ان کے کفر کے بارے آگاہ کیا ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات اور معجزات عطا فرمائے ہیں جو ان کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ لیکن اللہ تعالیٰ ان اشیاء میں منفرد اور یکتا ہے۔ ارشاد فرامی ہے: **تَوَكَّلْ عَلَى الْمَلِكِ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتُعْزِزُ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ مَزِيدٌ فَرَمَا: تَوَلَّجَ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتَوَلَّجَ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ** ⑤ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام الہ ہوتے تو یہ اختیار ان کے پاس بھی ہوتا۔ پس اس میں یہی قیاس ہے اور یہی واضح نشانی ہے۔

قوله تعالیٰ: **قُلِ اللَّهُمَّ** علمائے نحو نے لفظ **اللَّهُمَّ** کی ترکیب میں اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں ہا مضموم ہے اور میم مفتوح مشدد ہے اور یہ منادی ہے (3) اور اعشیٰ کے قول میں میم مخفف بھی مذکور ہے۔

کدعوة من ابی زباج یسعها اللهم الکبار

جیسا کہ ابورباح کی دعا سے انتہائی عظمت و شان والا معبود حقیقی سن رہا ہے۔

خلیل، سیبویہ اور تمام بصریوں نے کہا ہے: **اللَّهُمَّ** کی اصل یا اللہ ہے، پس جب کلمہ کو حرف نداء یا کے بغیر استعمال کیا گیا تو انہوں نے اس کا بدل میم مشدد کو بنا دیا پس وہ دو حروف لائے اور وہ دو میمیں ہیں دو حرفوں کے عوض اور وہ دونوں یا اور الف ہیں۔ اور ہا پر ضمہ یہ اسم منادی مفرد کا ضمہ ہے۔ اور امام فراء اور علمائے کوفہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ **اللَّهُمَّ** میں اصل یا اللہ اُمنا بخیر۔ پھر اسے حذف کر دیا گیا اور دو کلموں کو ملا دیا گیا اور ہا پر ضمہ یہ وہی ضمہ ہے جو اُمنا میں تھا۔ جب ہمزہ کو حذف کر دیا گیا تو حرکت منتقل ہو گئی (4)۔

نحاس نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک یہ بہت بڑی خطا ہے اور اس میں قول وہی ہے جو امام خلیل اور سیبویہ نے کیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ محال ہے کہ وہ ضمہ چھوڑ دیا جائے جو ند مفرد پر دلیل ہے اور یہ کہ لفظ اللہ میں اُم کا ضمہ رکھا جائے یہ تو اللہ تعالیٰ کے اسم میں الحاد ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ زجاج کی طرف سے انتہائی غلو اور زیادتی ہے (5)۔ اور انہوں نے

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416، دار الکتب العلمیہ

1۔ اسباب النزول الواحدی، صفحہ 63

5۔ ایضاً

4۔ ایضاً

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ

یہ خیال کیا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی یا اللہ اُم نہیں سنا۔ اور نہ ہی عرب یہ کہتے ہیں: یا اللہم۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ کبھی کبھی حرف نداء اللہم پر داخل ہو جاتا ہے اور اس پر انہوں نے راجز کا یہ قول بیان کیا ہے۔ غفرث أو عذبت یا اللہما (اے اللہ! تو بخش دے یا تو عذاب دے)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وَمَا عَلَيْكَ أَنْ تَقُولَ كَلِمًا سَبَّحْتَ أَوْ هَلَّتْ يَا اللَّهُ مَا
تَجْهَرُ لَزَامٌ لَيْسَ كَمَا جَبَّحْتَ تَوْسَعُ اللَّهُ يَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَمَا تَقُولُ يَا اللَّهُ مَا (اے اللہ!)
أُرْدُدُ عَلَيْنَا شَيْخَنَا مُسَلِّمًا فَإِنَّا مِنْ خَيْرِهِ لَنْ نَعْدَمَا (1)
تو ہم پر ہمارے شیخ کو صحیح سالم لوٹا دے پس ہمیں ان کی خیر و برکت سے ہرگز محروم نہ کیا جائے۔
کسی اور نے کہا:

إِنِّي إِذَا مَا حَدَّثَ أَلَنَّا أَقُولُ يَا اللَّهُ مَا اللَّهُمَا
بلاشبہ جب کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آتا ہے تو میں کہتا ہوں اے اللہ! اے اللہ!
انہوں نے کہا ہے: اگر میم حرف نداء کا عوض ہوتی تو یہ دونوں جمع نہ ہوتے۔
زجاج نے کہا ہے: یہ شاذ ہے اور اس کا قائل معروف نہیں اور اسے چھوڑا نہیں جاسکتا ہے جو کتاب اللہ میں ہے (2) اور یہ
تمام دیوان العرب میں ہے اور اسی کی مثل اس قول میں بھی وارد ہے۔

هَذَا نَفْسًا نِي فِي مَنْ فَمَوْنِيهَا عَلَى النَّبِيعِ الْعَادِي أَشَدَّ رَجَامٍ
کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ ہم اور انہم میں میم مخفف کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن میم مشدود کا اضافہ نہیں کیا جاتا (3)۔ اور بعض
نحویوں نے کہا ہے جو کچھ کوفیوں نے کہا ہے وہ خطا اور غلطی ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہوتا جیسے انہوں نے کہا ہے تو پھر یہ کہا جانا
واجب اور ضروری ہے: اللہم اور اسی پر اقتصار کیا جائے کیونکہ اس کے ساتھ دعا ہے۔ اور یہ بھی کہ آپ کہتے ہیں: انت اللہم
الرزاق۔ پس اگر اس طرح ہو جیسے انہوں نے دعویٰ کیا ہے تو تو نے مبتدا اور خبر کے درمیان دو جملوں کے ساتھ فاصلہ کر دیا۔
نضر بن شمیل نے کہا ہے: جس نے اللہم کہا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے جمیع اسماء کے ساتھ پکارا۔ اور حسن نے کہا ہے:
اللہم دعا کو جامع ہوتا ہے (4)۔

قوله تعالى: هَلِكَ الْمَلِكُ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عز و جل سے
عرض کی کہ وہ آپ کی امت کو ملک فارس عطا فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (5)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ حضور
نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ملک فارس اور روم آپ کی امت کو عطا فرمادے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو

تعلیم دی کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ عامانگیں۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور مُلِک سیبویہ کے نزدیک منصوب ہے اس بنا پر کہ یہ نداء ثانی ہے، اور اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی ہے: قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ اور ان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ اسے اللّٰہ کی صفت بنایا جائے کیونکہ اس کے ساتھ میم ملی ہوئی ہے، اور محمد بن یزید اور ابراہیم بن سری الزجاج نے ان سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: مالک ترکیب میں اسم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اسی طرح فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ میں ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: یہی ابو العباس المبرد کا مذہب ہے اور جو سیبویہ نے کہا ہے وہ زیادہ صحیح اور زیادہ واضح ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اسماء موصوفہ میں اللّٰہ کی طرز پر کوئی شے نہیں ہے کیونکہ یہ اسم مفرد ہے اور اس کے ساتھ (اسم) صوت کو ملایا گیا ہے اور اصوات کی صفت نہیں لگائی جاتی جیسا غاق اور اس کے مشابہ الفاظ۔ اور اسم مفرد کا حکم یہ ہے کہ اس کی صفت نہ لگائی جائے اگرچہ علمائے (نحو) نے کئی مقامات پر اس کی صفت لگائی ہے۔ اور جب یہاں وہ اسم ملا دیا گیا جس کی صفت نہیں لگائی جاتی تو پھر قیاس یہی ہے کہ صفت نہ لگائی جائے کیونکہ یہ صوت کے ساتھ ملنے کے سبب صوت کی طرح ہو گیا ہے۔ جیسا کہ حَتِیْہل پس اس کی صفت نہیں لگائی گئی (1)۔ اور الْمُلْکِ یہاں مراد نبوت ہے (2)۔ یہ حضرت مجاہد کا قول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد غلبہ ہے اور یہ بھی ہے کہ مراد مال اور غلام وغیرہ ہیں (3)۔ ”زجاج نے کہا ہے: معنی ہے (اے) بندوں کے مالک اور اس (شے) کے مالک جس کے وہ مالک ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی ہے اے دنیا اور آخرت کے مالک (4)۔ اور تُوْتِی الْمُلْکِ کا معنی ہے: تو ایمان اور اسلام عطا کرتا ہے۔ مَن تَشَاءُ یعنی جسے تو چاہتا ہے کہ تو اسے وہ عطا فرمائے۔ اور اسی طرح اس کا مابعد بھی ہے۔ اور اس میں محذوف (کلام) مقدر ماننا ضروری ہے۔ یعنی وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ آن تنزعه منه، پھر اسے حذف کر دیا گیا۔ اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

أَهْلٌ لِهَذَا الدَّهْرِ مِنْ مُتَعَتِّلٍ عَلَى النَّاسِ مَهْمَا شَاءَ بِالنَّاسِ يَفْعَلُ

زجاج نے کہا ہے: (اس میں اصل عبارت اس طرح ہے۔) مَهْمَا شَاءَ ان یفعل بالناس یفعل (جب وہ لوگوں کے ساتھ کچھ کرنا چاہے تو وہ کر دیتا ہے۔) اور قول باری تعالیٰ: وَتَنْزِعُ مِمَّنْ تَشَاءُ کہا جاتا ہے: عز کا معنی ہے جب وہ بلند ہو اور غالب ہو۔ اور اسی سے ہے وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ (وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔) وَتُنْزِلُ مِمَّنْ تَشَاءُ ذُلْ يَذِلُّ ذُلًّا (جب وہ غالب آئے اور مسلط ہو جائے۔)

طرفہ نے کہا ہے:

بَطِينٌ عَنِ الْجُنَى سَرِيعٌ إِلَى الْخَنَا ذَلِيلٌ بِأَجْمَاعِ الرِّجَالِ مُلْهَدٌ بِبَيْتِكَ الْخَيْرُ يَعْنِي تِيرَهِ قَبْضِ مِثْلِهِ خَيْرٌ وَشَرٌّ أَوْ رَأْسٌ (یعنی شر کو) حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: مَرَّابِنِلَ تَقِينُكُمْ الْخَرَّ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: خیر کو اس لئے خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ دعا اور اس کے فضل میں رغبت رکھنے کا مکمل ہے۔ نقاش نے کہا ہے: بَيْدِكَ الْخَيْرُ کا مفہوم ہے مدد و نصرت اور غنیمت تیرے قبضہ میں ہے (1)۔ اور اہل الاشارات نے کہا ہے: ابو جہل بہت زیادہ مال پر ملکیت رکھتا تھا اور وہ غزوہ بدر کے دن کنوئیں میں گر گیا۔ اور حضرت صہیب، حضرت بلال اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم فقراء تھے ان کے پاس کوئی مال نہ تھا اور ان کی ملکیت ایمان تھا قُلِ اللَّهُمَّ لَكَ الْمُلْكُ تُوْقِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ تو ابو طالب کے یتیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کرتا ہے کنوئیں کے کنارے پر، یہاں تک کہ وہ ان ابدان کو ندادیتا ہے جو کنوئیں میں پھینک دیئے گئے ہیں: اے عتبہ، اے شبیہ۔ تو جسے چاہتا ہے عزت اور غلبہ عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ اے صہیب، اے بلال تم یہ اعتقاد نہ رکھو کہ ہم نے تمہیں تمہارے بغض کے سبب دنیا سے روک دیا ہے۔ بَيْدَكَ الْخَيْرُ۔ عجز میں سے کوئی شے تمہارے لئے رکاوٹ نہیں۔ اِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ حق کا انعام عام ہے وہ جسے چاہتا ہے والی بنا دیتا ہے۔

تَوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتَوَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ

الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑤

”تو داخل کرتا ہے رات (کا حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے تو دن (کا حصہ) رات میں اور نکالتا ہے تو زندہ کو

مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔“

حضرت ابن عباس، مجاہد، حسن، قتادہ اور سدی نے ارشاد باری تعالیٰ تَوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ کے معنی میں بیان کیا ہے کہ تو دونوں (رات اور دن) میں سے ایک کی کچی کو دوسرے میں داخل کر دیتا ہے (2)، یہاں تک کہ دن پندرہ ساعت کا ہو جاتا ہے اور وہ طویل ترین دن ہوتا ہے اور رات نو ساعت کی ہو جاتی ہے اور وہ چھوٹی ترین رات ہوتی ہے۔ اور اسی طرح تَوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ کا معنی بھی ہے۔ اور یہ کلی کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور آیت کے الفاظ یہ احتمال بھی رکھتے ہیں کہ اس میں رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا داخل ہو۔ اور ان میں سے ایک کا زوال دوسرے میں داخل ہونا ہو (3)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ پس حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے نکالتا ہے۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور معمر نے حضرت زہری سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عورتوں کے پاس تشریف لے گئے تو وہاں ایک حسین و جمیل عورت موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”یہ کون ہے؟“ تو انہوں نے عرض کی: یہ آپ کی خالائیں میں سے ایک ہے۔ آپ نے پھر ارشاد فرمایا: ”یہ کون ہے؟“ انہوں نے عرض کی: یہ خالدہ بنت اسود بن عبد یغوث ہے۔ تب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سُبْحَانَ الَّذِي يَخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ (پاک ہے وہ ذات جو زندہ کو مردہ سے نکالتی ہے) وہ عورت نیک اور صالحہ تھی اور اس کا باپ کافر تھا۔ تو اس قول کی بنا پر مراد یہ ہے کہ کافر کا دل مردہ ہے اور مومن کا دل زندہ ہے، پس موت اور حیات دونوں

مستعار ہیں۔ اور اکثر علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آیت میں حیات اور موت دونوں حقیقت ہیں۔ اور حضرت عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مرغی کو اندے سے نکالنا ہے اس میں مرغی زندہ ہے اور اندہ مردہ ہے اور اندہ جو کہ مردہ ہے اسے مرغی سے نکالتا ہے جو کہ زندہ ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد نطفہ ہے جو آدمی سے خارج ہوتا ہے اور اس میں نطفہ مردہ ہے اور آدمی زندہ ہے اور آدمی نطفہ سے زندہ نکلتا ہے حالانکہ نطفہ مردہ ہے۔

اور حضرت عکرمہ اور سدی نے کہا ہے: مراد دانہ ہے جو بالی سے نکلتا ہے اور بالی دانے سے نکلتی ہے اور گٹھلی کھجور سے نکلتی ہے اور کھجور گٹھلی سے نکلتی ہے اور کھجور اور بالی میں حیات تشبیہا موجود ہے (1)۔ پھر فرمایا: وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ گویا کہ وہ جو کچھ عطا کرتا ہے اس کا حساب نہیں لے گا۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ
فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَةً وَيُحَذِّرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى
اللَّهِ الْمَصِيرُ ①

”نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر اور جس نے کیا یہ کام، پس نہ رہا (اس کا) اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ۔ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے (یعنی غضب سے) اور اللہ ہی کی طرف (سب نے) لوٹ کر جاتا ہے۔“
اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو منع فرمایا ہے کہ وہ کفار کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں اور انہیں دوست بنائیں۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ (2) اور وہاں اس معنی کا بیان آ رہا ہے۔ اور فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ کا معنی ہے پس وہ اللہ کے گروہ میں سے نہیں ہے اور نہ ہی اس کے دوستوں میں سے ہے۔ (یعنی فلیس من حزب اللہ ولا من اولیائہ فی شئی) اور یہ واسأل القریۃ کی مثل ہے۔ یہودیہ نے بیان کیا ہے ہونی فرسخین یعنی وہ میرے اور میرے ساتھیوں سے دو فرسخ پر ہے۔ (ای من اصحابی و معی) پھر استثناء کی اور وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور فرمایا: إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَةً حضرت معاذ بن جبل اور حضرت مجاہد بن جسر نے فرمایا: تقیہ (بچاؤ) ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے قوی اور طاقتور ہونے سے پہلے پہلے تھا۔ پس آج اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے بچیں اور احتیاط برتیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ (تقیہ) یہ ہے کہ آدمی زبان سے قول کرے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، تو نہ وہ قتل کیا جائے گا اور نہ وہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اور حسن نے کہا ہے: تقیہ (اپنا بچاؤ کرنا) قیامت کے دن تک آدمی کے لئے جائز ہے اور قتل میں کوئی تقیہ نہیں ہے۔

حضرت جابر بن زید، مجاہد اور ضحاک نے کہا ہے: إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَةً۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: مومن جب کفار کے درمیان موجود ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ انہیں زبان کے ساتھ دھوکہ دیتا رہے جب اسے اپنی ذات پر خوف ہے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو۔ اور تقیہ حلال نہیں ہوتا مگر تب جب قتل کا خوف ہو یا اعضائے بدن کٹنے کا خوف ہو یا انتہائی شدید اذیت پہنچنے کا خطرہ ہو۔ اور جسے کفر پر مجبور کیا گیا تو اس کے لئے صحیح یہ ہے کہ وہ سولی چڑھ جائے اور کفریہ کلمات زبان پر نہ لائے۔ (یعنی اس پر کلمہ کفر کہنا واجب نہیں ہے) بلکہ اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل سورہ النحل میں آئے گی ان شاء اللہ۔ حمزہ اور کسائی نے تقاة میں امالہ کیا ہے (1) اور باقیوں نے اسے پر پڑھا ہے۔ اور تقاة اصل میں دُقیۃ بروزن فَعَلۃ ہے جیسا کہ تُوَدۃ اور تہمة ہیں پھر واؤ کوتا سے اور یا کو الف سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ بدری اور متقی صحابی تھے اور ان کا یہود کے ساتھ معاہدہ تھا۔ پس جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احزاب کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، بلاشبہ میرے ساتھ یہود کے پانچ سو آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ نکلیں، تو ہم ان کے سبب دشمن پر غالب آسکیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ الْآیہ۔ (2)

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ انہوں نے وہ بعض گفتگو کی جس کا مشرکین نے ان سے ارادہ کیا، اس کا بیان سورہ النحل میں آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ زجاج نے کہا ہے: ای وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ اِيَاہ اور اللہ تعالیٰ ہی تمہیں ڈراتا ہے پھر تم اس سے (یعنی ایاہ سے) اس کے سبب (یعنی نفسہ کے سبب) مستغنی ہو گئے اور وہ مستعمل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ پس اس کا معنی ہے تو جانتا ہے جو کچھ میرے پاس ہے اور جو میری حقیقت ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے پاس ہے اور نہ وہ جو تیری حقیقت ہے۔ کسی دوسرے نے کہا: معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی سزا سے ڈراتا ہے (3) (لہذا) یہ وَاسْأَلِ الْقُرْآنَ لِي مُثَل ہے اور فرمایا: تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي تو میری غیب اور چھپی ہوئی شئی کو جانتا ہے۔ اور النفس کو ضمیر کی جگہ پر رکھا گیا ہے کیونکہ اضمار نفس میں ہی ہوتا ہے۔ وَ إِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ای والی جزاء اللہ، الْمَصِيرُ اور اللہ تعالیٰ کی جزا کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ اس میں دوبارہ زندہ کئے جانے کا اقرار ہے۔

قُلْ إِنْ تَخْشَوْنَ مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْذَرُونَ يَعْلَمُهُ اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي

الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ①

”فرمادیتے ہیں اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے یا ظاہر کرو اسے، جانتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اور جانتا ہے جو

کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

پس وہ سینوں میں مخفی اور چھپی چیزوں کو اور ان تمام کو جن پر وہ مشتمل ہیں جاننے والا ہے اور ان تمام کے بارے جاننے والا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور انہیں جاننے والا ہے جنہیں یہ گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ علام الغیوب ہے اس سے ذرہ برابر کوئی شے پوشیدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی شے غائب ہے اس کی ذات پاک ہے لا الہ الا هو عالم الغیب والشہادۃ۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَتَذَكَّرُ ۚ اِنَّ

بَيْنَهَا وَبَيْنَ اَمَدٍ اَبْعَدًا ۚ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ۚ وَاللّٰهُ رَعُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝

”جس دن موجود پائے گا ہر نفس جو کی تھی اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کچھ کی تھی اس نے برائی۔ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان (حائل ہوتی) مدت دراز اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے (عذاب) سے اور اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔“

یَوْمَ منصوب ہے اور اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منقطع ہو (یعنی مذکورہ ارشادات میں سے کسی کے ساتھ یہ متصل نہ ہو۔) اس بنا پر کہ اس سے پہلے اذکر فعل مضمر ہو۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ۔ یوم تبدل الارض۔

اور مُحْضَرًا ما کے صلہ میں ضمیر محذوف سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یوم تجد کل نفس ما عملته من خیر محضراً اور یہ اس بنا پر ہے کہ تَجِدُ، وجدان الضالۃ (گمشدہ کو پانا) سے ماخوذ ہو۔ اور وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ میں ما پہلے ما پر معطوف ہو۔ اور تَوَدُّ دوسرے ما سے حال ہونے کے محل میں ہے۔ اور اگر تَجِدُ کو بمعنی تعلم بنایا جائے تو پھر مُحْضَرًا مفعول ثانی ہے۔ اور اسی طرح تَوَدُّ بھی دوسرے مفعول کے محل میں ہوگا۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی یوم تجد کل نفس جزاء ما عملت محضراً اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسرا ما مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔ اور تَوَدُّ بھی مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو۔ اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ما بمعنی جزا ہو۔ کیونکہ تَوَدُّ مرفوع ہے۔ اور اگر یہ ماضی ہوتا تو اس کا جزا ہونا جائز ہوتا اور کلام کا معنی اس طرح ہوتا: وما عملت من سوءٍ وذل لو ان بینہا و بینہ امد ابعداً (اور جو کچھ برائی اس نے کی تھی وہ تمنا کرتا ہے کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان مدت دراز حائل ہو جاتی) یعنی جیسا کہ مشرق و مغرب کے درمیان بعد ہے۔ اور جب ما کو شرطیہ بنایا جائے تو فعل مضارع مجزوم ہوتا ہے، مگر یہ کہ تو اسے حذف فاعل پر محمول کرے۔ اور تقدیر کلام یہ ہو: وما عملت من سوءٍ فہی تود۔ ابو علی نے کہا ہے: میرے نزدیک فراء کے قول کا یہی قیاس ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ اَطَعْتُمْهُمْ اِنَّکُمْ لَمَشْرِکُوْنَ میں کہا ہے کہ یہ حذف فا کی بنا پر ہے۔ اور اَلَا مَدَّ کا معنی غایت (انتہا) ہے اور اس کی جمع آماد ہے۔ اور کہا جاتا ہے استولی علی الامد۔ اسی غالب سابقا۔ وہ سبقت لیتے ہوئے غالب آ گیا۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

إِلَّا لِمِثْلِكَ أَوْ مِنْ أَمَدٍ أَمَدًا - اِذَا غَضِبَ غَضِبًا - یعنی جب وہ شدید غصے ہو جائے تو یہ جملہ کہا جاتا ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ①

”(اے محبوب!) آپ فرمائیے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لئے گناہ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔“

الْحُبُّ کا معنی ہے محبت اور اسی طرح الْحَبُّ بالکسر بھی ہے۔ اور الْحَبُّ بمعنی الحبيب بھی ہے جیسا کہ الْخِدْن اور الْخَدِين (دوست) ہے۔ کہا جاتا ہے أَحَبُّهُ فَهُوَ مُحِبٌّ اور حَبُّهُ يَحِبُّهُ (بالکسر) فَهُوَ مَحْبُوبٌ (یعنی پہلا محبت کرنے والا اور دوسرا جس سے محبت کی جائے) جوہری نے کہا ہے: یہ شاذ ہے، کیونکہ مضاعف میں یفعل بالکسر نہیں آتا۔

ابوالفتح نے کہا ہے: اس میں اصل حُبُّ ہے جیسا کہ ظَرْفٌ پھر با کو ساکن کیا گیا اور اسے دوسری با میں مدغم کر دیا گیا۔ ابن الدہان سعید نے کہا ہے: حُبٌّ میں دو لغتیں ہیں: حُبٌّ اور أَحَبُّ اور اس بنا میں حُبُّ اصل میں حُبُّ تھا جیسا کہ ظَرْفٌ اس پر ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے: حَبَّبْتُ۔ اور فَعْلٌ سے صفت کا صیغہ اَكْثَرُ فَعِيلٌ کے وزن پر آتا ہے۔ ابوالفتح نے کہا ہے: اور أَحَبُّ پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ یہ یا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور فَاتَّبِعُونِي يُحِبُّكُمْ اللَّهُ اور حُبُّ فَعْلٌ کے وزن پر آتا ہے کیونکہ ان کا قول ہے حبيب۔ اور فعل کے وزن پر آتا ہے جیسا کہ ان کا قول محبوب ہے: اور حب متعدی سے اسم فاعل نہیں آتا، پس یہ نہیں کہا جاتا: أَنَا حَابٌّ۔ اور أَفْعَلٌ سے اسم مفعول بہت کم آتا ہے۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے: مِنِّي بِمَنْزِلَةِ الْمُحَبِّ الْمَكْرَمِ (میرے نزدیک معزز محبوب کے قائم مقام ہے) اور ابو زید نے بیان کیا ہے: حَبَّبْتُهُ أَحَبُّهُ۔ اور شعر بیان کیا:

فَوَاللَّهِ لَوْ لَا تَمَرَّةٌ مَا حَبَّبْتُهُ وَلَا كَانَ أَدْنَى مِنْ عَوِيفٍ وَ هَاشِمٍ

لَعَمْرِكَ إِنِّي وَ طَلَابٌ مُضِرٌ لَكَالْمُزْدَادِ مِنَّا حَبٌّ بَغْدَا

اسمعی نے بیان کیا ہے: حرف مضارع کو فتح دیا گیا ہے در آنحالیکہ با اکیلی ہے۔ اور الْحَبُّ الحابیہ فارسی سے عربی بنایا گیا ہے۔ اور اس کی جمع حَبَابٌ اور حَبِيبَةٌ آتی ہے۔ اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ اور یہ آیت وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ گمان کیا کہ انہوں نے جو کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہے، محمد بن جعفر بن زبیر نے یہی کہا ہے (2)۔

اور حسن اور ابن جریج نے بیان کیا ہے: یہ آیت اہل کتاب کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا:

آسمان کے باسیوں میں اعلان کر دیتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں کو ناپسند کرتا ہے تو تم بھی اسے مبغوض جانو..... فرمایا..... پس وہ بھی اسے مبغوض جانتے ہیں پھر زمین میں اس کے لئے نفرت رکھ دی جاتی ہے (1)۔ اس کے بارے مزید بیان سورہ مریم کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابور جالطاردی نے ذَاتِیْعُوْنِیْ بِاُکُوْفَتِہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وَیَغْفِرْ لَکُمْ کا عطف یُحِبُّکُمْ پر کیا ہے۔ اور محبوب نے ابو عمرو بن علاء سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یغفر کی را کو لکھ کی لام میں مدغم کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: امام ظلیل اور سیبویہ را کو لام میں ادغام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ابو عمرو نے اس طرح کی غلطی کرنے سے صرف نظر کیا ہے شاید وہ حرکت کو مخفی کر دیتے ہیں جیسا کہ وہ کثیر اشیاء میں ایسا کرتے ہیں۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ①

”آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ کی اور (اس کے) رسول کی پھر اگر وہ منہ پھیریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کفر کرنے والوں کو۔“

قوله تعالیٰ: قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ اس کا بیان سورہ النساء میں آئے گا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا یہ شرط ہے، مگر چونکہ یہ ماضی ہے اسے اعراب نہیں دیا جاسکتا (یعنی یہ معرب نہیں ہے) اور تقدیر کلام یہ ہے فان تولوا عنی کفرہم داعر ضوا عن طاعة الله ورسوله۔ (اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم سنی نہ ہوں کی اطاعت سے اعراض کر لیں) فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے فعل کو پسند نہیں کرتا اور وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فرمایا: فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ کیونکہ عرب جب کسی شے کی عظمت بیان کرتے ہیں تو اس کے ذکر کا اعادہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ سیبویہ کے اس شعر میں ہے:

لَا أَرَى الْمَوْتَ يَسْبِقُ الْمَوْتَ شَيْئًا نَغْصَ الْمَوْتُ ذَا الْغِنَى وَالْفَقِيرَا
میں موت کو نہیں پاتا کہ کوئی شے موت سے سبقت لے جاسکتی ہے موت نے خوشحال اور فقیر آدمی کی زندگی کو مکدر اور بد مزہ کر دیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ②

”بے شک اللہ تعالیٰ نے جن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم علیہم السلام کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہان والوں پر۔“

قوله تعالیٰ: إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى آدَمَ وَنُوحًا۔ اصْطَفَى بمعنی اختار ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جن لیا۔ سورہ البقرہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح آدم کا مادہ اشتقاق اور آپ کی کنیت کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ان اللہ اصطفى

دینہم بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کا دین چن لیا اور وہ دین، دین اسلام ہے، سو مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔
اور زجاج نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے زمانے کے رہنے والوں پر نبوت کے لئے چن لیا اور وَنُوحًا کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ نوح سے مشتق ہے اور یہ عجمی اسم ہے مگر یہ منصرف ہے کیونکہ یہ سہ حرفی ہے (اور اس کا درمیان والا حرف ساکن ہے۔) اور آپ مرسلین کے شیخ ہیں اور آپ ہی پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اہل زمین کی طرف مبعوث فرمایا اور ساتھ ہی بنیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں اور تمام قرابت رکھنے والی عورتیں حرام قرار دیں۔ اور جس کسی نے یہ کہا ہے کہ بعض مؤرخین کے نزدیک حضرت ادریس علیہ السلام آپ سے پہلے تھے، اسے وہم ہی ہے اس کا بیان سورۃ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قوله تعالیٰ: **وَالْإِبْرَاهِيمَ وَالْعِزْرَةَ عَلَى الْعَالَمِينَ** آل کا معنی اور جس پر اس کا اطلاق کیا جاسکتا ہے مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں ہو چکا ہے۔ اور بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: آل ابراہیم اور آل عمران سے مراد وہ مومنین ہیں جو آل ابراہیم، آل عمران، آل یاسین اور آل محمد رضی اللہ عنہم میں سے مومنین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **إِنَّ أَوَّلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لِلْذِّنِّ الشَّعْوَةُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ** (1) (آل عمران) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل ابراہیم سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے اور یہ کہ حضور نبی رحمت رضی اللہ عنہ بھی آل ابراہیم میں سے ہیں (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آل ابراہیم سے مراد ان کی اپنی ذات ہے۔ اور اسی طرح آل عمران ہے، اس کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَبَقِيَّةُ قِمَاتِكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ** (البقرہ: 248) (اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون (3)) اور حدیث میں ہے: ”مجھے آل داؤد کی دعاؤں میں سے ایک دعا عطا کی گئی“ (4) اور شاعر نے کہا ہے:

ولا تبك مَيْتًا بعد ميت أحبّه
عدوّ د عباس و آل ابی بکر (5)
اور تو نہ رو کسی میت پر اپنے سب سے زیادہ محبت کرنے والوں کے مرنے کے بعد یعنی حضرت علی، حضرت عباس اور آل ابی بکر۔ اس میں آل ابی بکر سے مراد ان کی ذات ہے۔
اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

يُلَاقِي مَنْ تَذَكَّرَ آلَ لَيْلَى
كما يَلْقَى التَّسْلِيمُ مِنَ الْعِدَادِ

- 1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 488
- 2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 452
- 3۔ صحیح بخاری، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 755
- 4۔ صحیح بخاری، باب حسن الصوت بالقراءة للقرآن، حدیث 4660، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
- 5۔ البحر الرائق، جلد 1، صفحہ 423، دار الکتب العلمیہ

اس میں تذکر آل لیلیٰ سے مراد اس کی ذات ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل عمران ہی آل ابراہیم ہے۔
 جیسا کہ فرمایا: ذُرِّيَّةُ بَعْضِهِم مِّنْ بَعْضٍ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ آپ کی والدہ عمران کی بیٹی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: ان کی اپنی ذات مراد ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: وہ عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے باپ ہیں اور وہ عمران بن یصہر بن فاہاث بن لاوی بن یعقوب ہیں (1)۔
 اور کلبی نے کہا ہے: وہ مریم کے باپ عمران ہیں اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور سہلی نے بیان کیا ہے: وہ عمران ابن ماتان ہیں اور ان کی بیوی حنہ (بالنون) ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے کیونکہ تمام کے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام انہیں کی نسل میں سے ہیں۔ اور عمران غیر منصرف ہے کیونکہ اس کے آخر میں الف نون زائد تان ہے۔ اور قولہ تعالیٰ عَلَى الْعَالَمِينَ کا معنی ہے علیٰ عالمی زمانہم۔ (یعنی انہیں اپنے زمانے کے باسیوں پر چن لیا)، یہ اہل تفسیر کے قول کے مطابق ہے اور ترمذی حکیم ابو عبد اللہ محمد بن علی نے کہا ہے: جَمِيعُ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ یعنی تمام مخلوق پر۔ اور کہا گیا ہے: عَلَى الْعَالَمِينَ صور پھونکنے کے دن تک تمام مخلوق پر (انہیں چن لیا) اور یہ اس لئے کہ یہ رسل اور انبیاء علیہم السلام تھے اور یہی مخلوق میں چنے ہوئے تھے۔

اور رہے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ! تو آپ کا مرتبہ (مقام) اصطفاء سے کہیں بلند ہے کیونکہ آپ تو اللہ تعالیٰ کے حبیب اور رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ⑤ (الانبیاء) پس اور رسل علیہم السلام رحمت کے لئے پیدا کئے گئے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات کو سراپا رحمت تخلیق فرمایا گیا۔ اسی لئے آپ مخلوق کے لئے امان بن گئے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تو مخلوق یوم قیامت تک عذاب سے محفوظ و مامون ہو گئی۔ اور بقیہ تمام انبیاء علیہم السلام اس مقام پر فائز نہ ہوئے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا: اَنَا رَحْمَةٌ مَّهْدَاةٌ (2) آپ خبر دے رہے ہیں کہ آپ کی ذات اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے لئے رحمت ہے۔ اور آپ کا قول مہداتہ کا معنی ہے: آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے لئے ہدیہ اور تحفہ ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پانچ چیزوں کے ساتھ چنا، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت کے ساتھ انتہائی حسین صورت میں تخلیق فرمایا، دوسری یہ ہے کہ انہیں تمام چیزوں کے اسماء سکھا دیئے، تیسری یہ ہے کہ ملائکہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ انہیں سجدہ کریں، چوتھی یہ ہے کہ انہیں جنت میں سکونت عطا فرمائی اور پانچویں یہ ہے کہ انہیں ابوالبشر بنایا اور پانچ چیزوں کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کو منتخب فرمایا: پہلی یہ کہ آپ کو ابوالبشر بنایا کیونکہ پہلے تمام کے تمام لوگ غرق کر دیئے گئے اور صرف آپ کی ذریت اور اولاد ہی باقی رہی۔ اور دوسری یہ کہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائی اور کہا جاتا ہے: مبارک اور بشارت ہے اس کے لئے جس کی عمر طویل ہو اور اس کا عمل حسین اور اچھا ہو (3)۔ اور تیسری یہ کہ کفار اور مومنین کے بارے میں آپ کی دعا کو قبول فرمایا اور چوتھی

2- شعب الایمان، کتاب حب النبی ﷺ، جلد 2، صفحہ 164، حدیث نمبر 1448

1- معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 453

3- جامع ترمذی، باب ما جاء فی طول العمر للمومن، حدیث نمبر 2251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ ہے کہ آپ کو کشتی پر اٹھایا اور پانچویں یہ کہ آپ پہلے آدمی تھے جنہوں نے احکام شرعیہ کو منسوخ کیا۔ آپ سے پہلے خالائوں اور پھوپھیوں سے شادی کرنا حرام نہ تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی پانچ چیزوں کے ساتھ چٹا: پہلی یہ کہ آپ کو ابو الانبیاء بنایا، کیونکہ یہ روایت ہے کہ آپ کے زمانہ سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک آپ کی صلب سے ایک ہزار نبی تشریف لائے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل بنایا، تیسری یہ کہ آپ کو نارنرود سے نجات عطا فرمائی (اور اسے آپ کے لئے گلزار بنادیا) اور چوتھی یہ کہ آپ کو لوگوں کا امام بنایا اور پانچویں یہ کہ آپ کو کچھ کلمات کے ساتھ آزمایا اور آپ کو توفیق عطا فرمائی یہاں تک کہ آپ نے انہیں مکمل فرمایا۔ (یعنی آپ تمام آزمائشوں میں کامیاب و کامران ہوئے) پھر فرمایا **وَالْأَلِ عِمْرَانُ** اگر عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے والد ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو عالمین پر چن لیا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم پر من و سلویٰ نازل فرمایا اور عالم میں انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا۔ اور اگر عمران حضرت مریم علیہا السلام کے باپ ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مریم کو چن لیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے جنم دیا اور عالم میں کسی کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

ذُرِّيَّةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۖ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٠﴾

”یہ ایک نسل ہے بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“
ذُرِّيَّةٌ کا معنی اور اس کا مادہ اشتقاق سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہاں یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے، انفس نے یہی کہا ہے۔ ای فی حال کون بعضهم من بعض یعنی اس حال میں کہ وہ بعض بعض سے ہیں، ای ذریۃ بعضها من ولد بعض یعنی ایک نسل ہے در آنحالیکہ ان میں سے بعض بعض کی اولاد میں سے ہیں۔ کو فیوں نے کہا ہے: بالیقین یہی ہے۔
 زجاج نے کہا ہے: یہ بدل ہے ای اصطفیٰ ذریۃ بعضها من بعض (یعنی اللہ تعالیٰ نے چن لیا ایک نسل کو جن میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں) اور **بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ** کا معنی ہے یعنی دین میں ایک دوسرے کی مدد کرنے میں (باہم معاون ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا **الْمُنَاقِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ** بعضهم من بعض یعنی ضلالت و گمراہی میں (۱۰) ایک دوسرے کے مددگار ہیں، حسن اور قتادہ نے یہی کہا ہے (۱) اور بعض نے کہا ہے: وہ اجتباء، اصطفاء اور نبوت میں ایک دوسرے کا بعض ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے اور یہ (معنی) سب سے کمزور ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ
 إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٠﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۖ وَاللَّهُ
 أَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتُ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي
 أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿١١﴾

”جب عرض کی عمران کی بیوی نے اے میرے رب! میں نذر مانتی ہوں تیرے لئے جو میرے شکم میں ہے (سب کاموں سے) آزاد کر کے، سو قبول فرمالے (یہ نذرانہ) مجھ سے بے شک تو ہی (دعا کن) سننے والا، (نیتوں کو) جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا سے (توحیرت و حسرت سے) بولی اے رب! میں نے تو جنم دیا ایک لڑکی کو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا۔ اور نہیں تھا لڑکا (جس کا وہ سوال کرتی تھی) مانند اس لڑکی کے۔ اور (ماں نے کہا) میں نے نام رکھا ہے اس کا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ ابوعبیدہ نے کہا ہے: اِذْ زائده ہے اور محمد بن یزید نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے اِذْ کَرِ اِذْ۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اصطفیٰ آل عمران اذ قالت امرأة عمران۔ اللہ تعالیٰ نے آل عمران کو چن لیا جب عمران کی بیوی نے عرض کی۔ اور یہ حنہ بنت فاقود بن قنبل حضرت مریم علیہا السلام کی ماں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دادی تھی۔ یہ عربی نام نہیں ہے اور نہ ہی عربی میں کسی عورت کا نام حنہ معروف ہے۔ عربی میں ابو حنہ البدری ہے۔ اور اس میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ابو حنہ ہے اور یہی اصح ہے اور اس کا نام عامر ہے۔ اور حنہ کی خانقاہ شام میں ہے اور ایک دوسری بھی ہے اسے بھی دیر حنہ ہی کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ابونواس نے کہا ہے:

يا دَيْرَ حَنَّةَ مِنْ ذَاتِ الْاَكْبَرِاحِ مَنْ يَضْحُ عَنْكَ فَاَنْ لَسْتُ بِالصَّاحِ
اس میں یا دیر حنہ سے استشہاد کیا گیا ہے۔

اور عرب میں حبہ تو کثیر ہیں، ان میں سے ایک ابو حنہ انصاری ہیں اور ابو السناہل بن بعلک جو کہ حدیث سبیعہ میں مذکور ہیں (1)۔ وہ بھی حبہ ہیں اور حنہ خا، معجمہ کے ساتھ تو کوئی معروف نہیں سوائے بنت یحییٰ بن اکثم القاضی کے اور یہ محمد بن نصر کی ماں ہے اور حنہ تو کوئی معروف نہیں سوائے ابو حنہ کے اور یہ ذی الرمه شاعر کاموں ہے یہ سب ابن ماکولا کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا، نذر کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہ (نذر) بند سے پر لازم نہیں ہوتی مگر اس طرح کہ بندہ خود اسے اپنے اوپر لازم کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ جب حاملہ ہوئیں تو انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے نجات عطا فرمائی اور میں نے اسے جنا جو میرے پیٹ میں ہے تو میں اسے (سب کاموں سے) آزاد کر دوں گی۔ اور لَكَ کا معنی ہے لعبادتک یعنی تیری عبادت کے لئے اور مُحَرَّرًا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ مفعول مخذوف کی صفت ہے یعنی اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ غلامًا مُحَرَّرًا تفسیر، سیاق کلام اور اعراب (ترکیب) کے اعتبار سے پہلا مفہوم زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ جہاں تک ترکیب کا تعلق ہے تو نعت کو منوعات کے قائم

1۔ تنخ، فاری، باب فضل من شهد ہذا، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مقام رکھنا کئی مقامات پر جائز نہیں ہوتا اور کئی دوسرے مقامات پر مجازی طور پر جائز ہوتا ہے اور ربی تفسیر، تو کہا گیا ہے کہ عمران کی بیوی کے اس قول کا سبب یہ ہے کہ وہ عمر رسیدہ تھی بچے کو جنم نہ دے سکتی تھی۔

اور یہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں رہ رہے تھے اور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے ایک پرندے کو دیکھا وہ اپنے بچے کو چوگ دے رہا تھا تو اس وجہ سے اس کے دل میں بھی اضطراب اور حرکت پیدا ہوئی اور اس نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ اسے بچہ عطا فرمائے اور نذر مانی کہ اگر اس نے (بچہ) جنا تو وہ اسے (ہر کام سے) آزاد کر دے گی۔ یعنی وہ خالصہ اللہ تعالیٰ کے لئے آزاد ہوگا۔ عبادت گاہ کا خادم ہوگا اور اسی کے لئے وقف ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ ہوگا۔ اور ایسا کرنا ان کی شریعت میں جائز تھا اور ان کی اولاد پر لازم تھا کہ وہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ پس جب اس نے حضرت مریم علیہا السلام کو جنم دیا تو کہا: رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی اے رب! میں نے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے۔ یعنی لڑکی تو کنیہ کی خدمت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، کہا گیا ہے یا اس وجہ سے کہ اسے حیض اور دیگر تکلیفیں لاحق ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: (یا اس وجہ سے) کہ وہ مردوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور وہ امید کر رہی تھی کہ وہ بچہ ہوگا پس اسی وجہ سے اس نے اسے آزاد کر دیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن عربی نے کہا ہے: ”اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عمران کی بیوی کے حمل تک نذر کوئی راستہ نہیں پاسکتی کیونکہ وہ آزاد تھی۔ اور اگر اس کی بیوی کنیز ہوتی تو بھی کوئی اختلاف نہیں کہ آدمی کے لئے اپنے بچے کے بارے میں نذر ماننا صحیح نہیں ہوتا تو کیونکر اس نے اس کی حالت میں تصرف کر لیا، کیونکہ اگر نذر ماننے والا غلام ہو تو اس بارے میں اس کا کوئی قول مضبوط اور پختہ نہیں۔ اور اگر آزاد ہو تو یہ صحیح نہیں کہ وہ اس کا مملوک ہو۔ اور عورت بھی اسی طرح ہے تو پھر اس بارے میں نذر کی وجہ کیا ہے؟ بلاشبہ اس کا حقیقی معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ بے شک آدمی اپنے بچے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ وہ اس سے انس حاصل کرے، اس سے مدد لے اور اس کے ساتھ اطمینان اور تسلی پائے۔ پس اس عورت نے بھی بچے سے انس حاصل کرنے اور سکون اور راحت پانے کے لئے بچے کی خواہش اور طلب کی تو جب اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان فرمادیا تو اس نے نذر مانی کہ وہ اس سے انس حاصل کرنے کے اپنے حصہ سے دستبردار ہوتی ہے اور وہ خالصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے وقف ہوگا۔ اور یہ نیکو کار آزاد لوگوں کی نذر ہے۔ اور اس نے اس سے ارادہ یہ کیا ہے کہ وہ میری جانب سے آزاد ہوگا اور دنیا کی غلامی اور اس کی مشغولیت سے آزاد ہوگا۔ صوفیاء میں سے ایک آدمی نے اپنی ماں کو کہا: اے ماں! تو مجھے اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دے میں اس کی عبادت کروں گا اور علم حاصل کروں گا تو ماں نے کہا: ہاں (میں نے تجھے چھوڑ دیا) پس وہ چلا گیا یہاں تک کہ اس نے غور و فکر کیا تو پھر ماں کی طرف واپس لوٹ کر آیا اور دروازے پر دستک دی تو ماں نے پوچھا: کون ہے؟ اس نے جواب دیا: میں تیرا فلاں بیٹا ہوں۔ تو ماں نے کہا: ہم نے تجھے اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیا ہے اور ہم تجھے واپس نہیں لوٹائیں گے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مُحَرَّرًا یہ ماخوذ ہے اس حرۃ (آزادی) سے جو عبودیتہ (غلامی) کی ضد ہے۔ اسی

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ بعض شافعیہ نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ رمضان المبارک میں دن کے وقت وطی کے سلسلہ میں عورت اپنے خاوند کی پیروی اور مطاوعت اختیار کرے تو وجوب کفارہ میں مرد عورت کے مساوی نہیں ہوگا۔

ابن عربی نے کہا ہے: اور یہ ان کی طرف سے غفلت ہے، کیونکہ یہ خبر ہم سے پہلے والوں کی شریعت میں سے ہے اور وہ اس طرح کا قول نہیں کرتے تھے۔ اور اس صالحہ عورت نے اپنے کلام کے ساتھ اس کا قصد کیا ہے جس کے بارے اس کی خابہ حالت اور اس کے کلام کا مقطع شہادت دیتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے بچے کے لئے مسجد کی خدمت کرنے کی نذر مانی تھی۔ پس جب اس نے اسے بچی دیکھا جو اس کی صلاحیت نہیں رکھتی تو چونکہ وہ عورت ہے تو اس نے اپنے مقصود کے خلاف پائے جانے کی وجہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں معذرت پیش کی اور ”مریم“ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ مونث معرفہ ہے اور یہ عجمی بھی ہے۔ نحاس نے اسی طرح کہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَإِنِّي سَتِيَّتُهُمَا مَرِيَمَ ان کی لغت میں مریم کا معنی خادمہ الرب ہے۔ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ اس میں حاضمر سے مراد مریم ہے۔ وَذُرِّيَّتُهُمَا مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کبھی ذریت کا اطلاق صرف بیٹے پر ہوتا ہے (1)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے شیطان اسے کچوکا لگاتا ہے اور وہ شیطان کے کچوکا لگانے سے چیخ کر روتا ہے سوائے ابن مریم اور ان کی ماں کے۔“ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو۔ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ہمارے علماء نے کہا ہے: پس اس حدیث نے یہ فائدہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کی دعا کو قبول فرمایا ہے۔ کیونکہ شیطان سوائے مریم اور ان کے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے تمام اولاد آدم کو حتیٰ کہ انبیاء اور اولیاء کو بھی کچوکے لگاتا ہے۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کے پہلو میں کچوکا لگاتا ہے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کے، ان دونوں کے درمیان حجاب ڈال دیا گیا پس اس کا کچوکا حجاب پر لگا اور دونوں کے لئے اس سے کوئی شے پار نہ ہوئی (2)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر اس طرح نہ ہو تو پھر ان دونوں کی خصوصیت باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیطان کے کچوکا لگانے سے جس کوس کیا گیا ہے اس کو گمراہ کرنا اور بھٹکانا اس سے لازم آتا ہے، کیونکہ یہ ظن فاسد ہے۔ پس کتنے انبیاء اور اولیاء ہیں کہ شیطان نے فساد اور بھٹکانے کے طرح طرح کے طریقوں سے ان سے تعرض کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے محفوظ و مامون رکھا جو شیطان کا ارادہ تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا إِنَّ عِبَادِيَ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (الحجر: 42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا)۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ بنی آدم میں سے ہر ایک کو شیاطین میں سے اس کے ساتھی کے حوالے کیا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (3)

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3177، غیا، القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب صفۃ المفسدین وبنوہ، حدیث نمبر 3044، غیا، القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2323

پس حضرت مریم اور ان کا بیٹا اگرچہ دونوں شیطان کے کچوکے سے بچائے گئے ہیں لیکن ان دونوں کو اس کی ملازمت اور مقارنت سے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ واللہ اعلم۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۖ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ لَيْسَ لِي لَكَ هَذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۖ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۖ

”پھر قبول فرمایا اسے اس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ اور پروان چڑھایا اسے اچھا پروان چڑھانا اور نگران بنادیا اس کا زکریا کو جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا (اس کی) عبادت گاہ میں (تو) موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں (ایک بار) بولے اے مریم! کہاں سے تمہارے لئے آتا ہے یہ (رزق) مریم بولیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔ وہیں دعا مانگی زکریا نے اپنے رب سے عرض کی اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد بے شک تو ہی سننے والا ہے دعا کا۔“

قولہ تعالیٰ: فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ اس کا معنی ہے: اسے سعداء کے راستے پر چلایا۔ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: تقبل کا معنی ہے تربیت میں کفیل بنانا اور اس کے معاملات کو ادا کرنا۔ اور حسن نے کہا ہے تقبل کا معنی ہے کہ اس کے رب نے اسے رات، دن میں سے کبھی ایک ساعت بھی اذیت اور تکلیف نہیں دی۔ اور وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا سے مراد ہے اس کی خلقت کو بغیر کسی کمی و بیشی کے صحیح بنایا، پس وہ ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا عام بچہ سال میں نشوونما پاتا ہے۔ قبول اور نبات دونوں مصدر ہیں لیکن اپنے فعل کے ہم وزن مصدر نہیں۔ فی الحقیقت مصدر تَقَبَّلًا اور اَنْبَتًا ہیں۔

شاعر نے کہا:

أَكْفَرًا بَعْدَ رَدِّ الْمَوْتِ عَنِّي وَ بَعْدَ عَطَائِكَ الْمَائَةِ الْبَرِّتَاعَا
شاعر کی مراد بعد اعطائك ہے۔ لیکن جب کہا اَنْبَتَهَا تو یہ نبت پر دلیل ہے (انبات بنت کو مستلزم ہے) اسی طرح امرؤ القیس نے کہا ہے۔

فَصَرْنَا إِلَى الْحَسَنِ وَرَقًى كَلَامُنَا وَ رُضْتُ فَذَلْتُ صَعْبَةً أَيْ إِذْلَالٍ
بلاشبہ ذلث کا مصدر ذلٌّ ہے۔ لیکن اس نے اسے اَذَلَّتْ کے معنی پر لوٹا دیا ہے اور اسی طرح ہر اس کا حال ہے جو اس باب میں آتا ہے۔ پس تَقَبَّلَ اور قَبِلَ کا معنی ایک ہے۔ پس معنی ہوا فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ کہ اس کے رب نے اسے اچھی

طرح قبول کر لیا۔

اور اسی کی مثل رو بہ کا قول ہے۔

وَقَدْ تَقَوَّيْتُ انْطَوَاءَ الْحِضْبِ

اس میں تَقَوَّيْتُ اور انطویت کا معنی ایک ہے۔

اور اسی کی مثل القطامی کا قول ہے:

و خیر الامر ما استقبلت منه و لیس بأن تتبّع اتباعا

کیونکہ تَتَّبَعْتَ اور اتبعت دونوں ہم معنی ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے وَأَنْزَلَ الْمَلَائِكَةَ النَّزِيلَ کیونکہ نَزَلَ اور أَنْزَلَ کا معنی ایک ہے۔ اور مفضل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے۔ وانبثها فنبثت نباتا حسنا۔ (اس کے رب نے اسے پروان چڑھایا اور وہ خوب اچھی طرح پروان چڑھی)۔ اور معنی کی رعایت کرنا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اور قبول میں اصل ضمہ ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جیسا کہ دُخِلَ اور خُرِجَ۔ اور فتح قلیل حروف میں آیا ہے جیسا کہ دُلِيعٌ اور ذُوعٌ۔ یہ تین ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ابو عمرو، کسائی اور ائمہ نے یہی کہا ہے۔ اور زجاج نے ”قبول“ کو اصل کی بنا پر قاف کے ضمہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

قوله تعالى: وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا یعنی مریم کو حضرت زکریا علیہ السلام کے ساتھ ملا دیا (سپر د کر دیا)۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: وہ اس کی دیکھ بھال کے ضامن بن گئے۔ کوفیوں نے وَكَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: وَكَفَّلَهَا رَبُّهَا زَكَرِيَّا، یعنی اس کی کفالت ان کے ذمہ لازم کر دی۔ اور اس پر انہیں مقرر کر دیا اور اسے ان کے لئے آسان بنا دیا۔

اور مصحف ابی میں ہے وَكَفَّلَهَا متعدی میں ہمزہ تشدید کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہ اس سے پہلے فَتَقَبَّلَهَا اور أُنْبِئْتُهَا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں خبر دی اس کے بارے جو اس کے ساتھ کیا، پس اسی وجہ سے وَكَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ ذکر کیا۔ اور باقیوں نے فعل کی نسبت حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف کرنے کی بنا پر اسے مخفف پڑھا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ اس کی کفالت اور اس کے معاملات کے والی اور نگران بن گئے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (ان میں سے کون مریم کی نگرانی کرے گا؟) مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے، کیونکہ تشدید بھی تخفیف کی طرف ہی لڑتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے زکریا علیہ السلام کی نگرانی میں دیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے ضامن اور نگران بنے۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے کفیل بنے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت کے ساتھ ہی بنے۔ پس اس بناء پر دونوں قرائتیں باہم متداخل ہیں۔

عمرو بن موسیٰ نے عبد اللہ بن شہر اور ابی عبد اللہ الحمزنی سے وَكَفَّلَهَا فا کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ انفس نے کہا ہے: کہا جاتا ہے كَفَّلَ يَكْفُلُ اور كَفَّلَ يَكْفُلُ (یعنی یہ دونوں باب ہیں) اور میں نے كَفَّلَ نہیں سنا، حالانکہ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اور مجاہد نے فَتَقَبَّلَهَا سَوال اور طلب کی بنا پر لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور رَبَّهَا کو نصب کے ساتھ اس لئے کہ اس کی نسبت (حرف) ندا کی طرف ہے۔ اور وَأَنْبَتَهَا میں تا کو سکون کے ساتھ وَكَفَّلَهَا میں لام کو سکون کے ساتھ، اور ”زکریا“ کو مد اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے ”زکریا“ کو بغیر مد اور حمزہ کے پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے مد کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے حمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اہل حجاز ”زکریا“ کو مد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس میں قصر کرتے ہیں۔ اور اہل نجد اس سے الف کو حذف کر دیتے ہیں اور اسے منصرف پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: زکریٰ۔

انحفش نے کہا ہے: اس میں چار لغات ہیں: مد اور قصر اور زکریٰ یا کی تشدید اور منصرف اور زکریٰ اور رأیت زکریا۔ ابو حاتم نے کہا ہے: زکریٰ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ عجمہ ہے اور یہ غلط ہے، کیونکہ جو اس میں ”یا“ ہے اس طرح کے الفاظ منصرف ہوتے ہیں مثلاً کرسی اور یحییٰ اور زکریا مد اور قصر کی صورت میں منصرف نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث، عجمہ اور تعریف ہے۔

قوله تعالى: كَلَّمَآدَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ لِيَزِيمُ أَلَيْسَ لَكَ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنْ أَلَّهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قوله تعالى: كَلَّمَآدَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ لغت میں محراب سے مراد مجلس میں قابل تکریم جگہ ہے۔ اس کا مزید بیان سورہ مریم میں آئے گا۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ ”(حضرت مریم) ایک کمرہ میں رہتی تھیں اور حضرت زکریا علیہ السلام ان کے پاس سیزمی سے چڑھ کر آتے تھے۔

جیسا کہ وضاح الیمن نے کہا ہے:

رَبَّةٌ مَجْرَابٌ إِذَا جَثُّهَا لَمْ أَلْقَهَا حَتَّى ارْتَقَى سُلَّمًا

محراب (مکان) میں رہنے والی، جب بھی میں اس کے پاس آتا ہوں تو میں اس سے ملاقات نہیں کر سکتا یہاں تک کہ میں

سیڑھی چڑھتا ہوں۔

اس سے مراد رَبَّةٌ غُرْفَةٌ ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: عمران کی بیوی عمر رسیدہ ہونے کے بعد حاملہ ہوئی تو اس نے نذر مانی کہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ ہر طرح سے آزاد ہے، تو عمران نے اسے کہا: تیری ہلاکت ہو! تو نے کیا کیا ہے؟ تیرا کیا خیال ہے اگر وہ بچی ہوئی؟ تو اس وجہ سے دونوں ہی مغموم ہو گئے۔ پھر عمران فوت ہو گئے اور حملہ حاملہ تھی اس نے بچی کو جنم دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے خوب اچھی طرح قبول کر لیا اور وہ صرف بچوں کو آزاد چھوڑتے تھے، تو علماء نے ان قلموں کے ساتھ اس کے بارے قرعہ اندازی کی جن کے ساتھ وہ وحی لکھتے تھے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ پس زکریا علیہ السلام کو اس پر نگران مقرر کر دیا اور انہوں نے اس کے لئے ایک جگہ بنائی اور جب وہ تھوڑی بڑی عمر کی ہو گئی تو آپ نے اس کے لئے محراب بنا دیا اور اس جگہ کی طرف آپ سیزمی کے ساتھ اوپر چڑھتے تھے اور آپ نے اس کے لئے ایک دایہ (دودھ

پلانے والی) اجرت پر رکھی اور آپ اس پر دروازہ بند کر جاتے تھے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کے سوا کوئی اس کے پاس داخل نہ ہو سکتا تھا یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئی۔ پس جب وہ حائضہ ہوئی تو آپ اسے اپنے گھر کی طرف نکال کر لے گئے اور وہ اپنی خالہ کے پاس رہنے لگی اور کلبی کے قول کے مطابق اس کی خالہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی تھی۔ مقاتل نے کہا ہے: اس کی بہن حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ تھی۔ اور جب وہ حیض سے پاک ہو گئی اور اس نے غسل کر لیا تو آپ اسے محراب کی طرف لوٹا لائے۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے حیض نہ آتا تھا اور وہ اس سے پاک رہتی تھی۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے پاس آتے تو آپ اس کے پاس موسم سرما کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل موسم سرما میں پاتے تھے، تو آپ نے فرمایا: اے مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آتے ہیں؟ تو اس نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتے ہیں تو اس وقت حضرت زکریا علیہ السلام نے بچے کی خواہش کی اور کہا: بے شک وہ جو اس کے پاس پھل لاتا ہے وہ مجھے بچہ عطا کرنے پر بھی قادر ہے اور انی کا معنی ہے من این۔ کہاں سے۔ ابو عبیدہ نے یہی کہا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اس میں تساہل ہے، کیونکہ ائین جگہ اور مکان کے بارے سوال کے لئے آتا ہے اور انی مذاہب اور جہات کے بارے سوال کے لئے آتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ کون سے مذاہب اور کون سی جہات سے تیرے لئے یہ ہیں۔ کمیت نے ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے:

أَنِي وَمِنْ أَيْنَ أَبْكَ الطَّرَبُ مِنْ حَيْثُ لَا صَبُوةٌ وَلَا رَيْبُ

اس میں انی جہات اور این مکان کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

اور کتباً، وَجَدَ کے سبب منصوب ہے ای کل دَخْنَةُ (ہر بار داخل ہوتے وقت) إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑤ کہا گیا ہے: یہ مریم کے قول میں سے ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اور یہی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا اور بچے کی التجا کا سبب بن گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ۔ هُنَالِكَ محل نصب میں واقع ہے، کیونکہ یہ ظرف ہے اور اسے زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ظرف مکان ہے۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: هُنَالِكَ ظرف زمان کے لئے ہے اور هناك ظرف مکان کے لئے آتا ہے اور کبھی اسے اس کی جگہ بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ اور هَبْ لِيْ کا معنی ہے مجھے عطا فرما مِنْ لَدُنْكَ اپنی بارگاہ سے ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً صالح اور نیک نسل (بچہ) ذُرِّيَّةً واحد اور جمع اور مذکر اور مونث تمام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں واحد کے لئے ہے۔ اور اس پر قول باری تعالیٰ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا دلالت کرتا ہے کیونکہ یہاں اولیا نہیں فرمایا۔ اور طَيِّبَةً کو مونث لایا گیا ہے کیونکہ لفظ ذُرِّيَّةً مونث ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول:

أَبُوكَ خَلِيفَةٌ وَلَدَتَهُ أُخْرَى وَانْتَ خَلِيفَةُ ذَاكَ الْكَمَالِ

اس میں لفظ خلیفہ کے مونث ہونے کی وجہ سے ولدتہ کو مونث لایا گیا ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے رجل مات وترك ذرية طيبة أجري

اللہ له مثل اجر عملهم ولم ينقص من اجورهم شيئاً (جو کوئی آدمی فوت ہوا اور اس نے نیک اور صالح اولاد پیچھے چھوڑی تو اللہ تعالیٰ اسے ان کے اعمال کے اجر کی مثل اجر عطا فرمائے گا اور ان کے اجر میں سے کوئی شی کم نہ ہوگی۔) سورۃ البقرۃ میں لفظ ذُرِّيَّةً کا مادہ اشتقاق گزر چکا ہے۔ اور طَيِّبَةً کا معنی ہے صالح، نیک اور بابرکت إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ بلاشبہ تو ہی دعا کو قبول فرمانے والا ہے اور اسی سے سب اللہ لمن حمد لا بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت بچے کی طلب اور خواہش کرنے پر دلیل ہے اور یہ مرسلین اور صدیقین کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً (الرعد: 38) (اور بے شک ہم نے بھیجی کئی رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ان کے لئے بیویاں اور اولاد۔)

اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تہجد اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع فرمادیا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اس کی اجازت عطا فرمادیتے تو ہم خصی ہو جاتے اور ابن ماجہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح میری سنت ہے پس جس نے میری سنت کے مطابق عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں ہے اور تم شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا اور جو کوئی قدرت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نکاح کر لے اور جو (قدرت) نہ پائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ یہی اس کے لئے وجاء (شہوت نکاح کو کاٹنے کا ذریعہ) ہے۔ (1)

اور اس میں ان بعض جاہل متصوف کا رد ہے جنہوں نے کہا ہے: جو بچے کی خواہش اور طلب رکھتا ہے وہ احمق ہے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کند ذہن اور بے وقوف ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدِّقٍ فِي الْآخِرِينَ ۝ (الشعراء) (اور بنادے میرے لئے سچی ناموری آئندہ آنے والوں میں) اور مزید فرمایا: وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَأَيْنَاهُ لَنَا مِن مِّنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ (الفرقان: 74) (اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! مرحمت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک)

اور امام بخاری نے تو اس عنوان سے باب باندھا ہے باب طلب الولد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو اس دن فرمایا جس وقت ان کا بیٹا فوت ہوا۔ ”کیا تم نے آج رات مباشرت کی ہے“ انہوں نے عرض کی۔ جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: بَارَكَ اللَّهُ لَكُمْ فِي غَابِرِ لَيْلَتِكُمْ (اللہ تعالیٰ تمہاری گزشتہ رات کے بارے میں تم دونوں کو برکت عطا فرمائے) فرمایا پس وہ حاملہ ہو گئی (2)۔ اور بخاری میں ہے: سفیان نے بیان کیا ہے انصار میں سے ایک آدمی نے کہا ہے: میں نے نو بچے پائے ہیں ان تمام نے قرآن کریم پڑھا ہے (3) اور یہ بھی عنوان ہے باب الدعاء بكثرة الولد مع البركة (برکت کے ساتھ اولاد کی کثرت کی دعا کا بیان) اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ام سلیم نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا خادم انس

1۔ ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث نمبر 1835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ صحیح بخاری، کتاب الوقیہ، حدیث 5048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من لم یظهر حزنہ عند المصیبة، حدیث 1218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیما اعطیتہ (اے اللہ! اس کے مال اور اس کی اولاد میں کثرت عطا فرما اور جو تو اسے عطا فرمائے اس میں اس کے لئے برکت عطا فرما)۔ (1)

اور حضور ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرما اور ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ بلند فرما اور باقی رہنے والے لوگوں میں سے اسے اچھا خلیفہ (نائب) عطا فرما۔“ اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: ”تم بچے جننے والی اور محبت کرنے والی (عورت) سے شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا (2)۔“ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اس معنی میں بہت سی روایات ہیں جو بچے کی طلب پر ابھارتی ہیں اور اس طرف متوجہ کرتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی زندگی میں اور اپنی موت کے بعد اس کے نفع اور فوائد کا امیدوار ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اذا مات أحدکم انقطع عملہ الا من ثلاث جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین کے۔ اس میں ذکر فرمایا اؤ ولد صالح یدعولہ یا نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا ہو۔ اگر اس حدیث کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو تو اس میں یہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا تو انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں اپنے بچے اور اپنی بیوی کی ہدایت کے لئے تضرع اور التجا کرتا رہے کہ وہ دونوں کو ہدایت، نیکی، پاکدامنی اور رعایت کی توفیق عطا فرمائے اور یہ کہ وہ دونوں دین اور دنیا میں اس کے معاون و مددگار ہوں یہاں تک کہ دونوں کے سبب اس کی منفعت اور فوائد دنیا اور آخرت میں عظیم ہو جائیں۔ کیا آپ حضرت زکریا علیہ السلام کے قول میں غور نہیں کرتے **وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا** (مریم) اور عرض کی **ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً** اور کہا **لَنَأْمِنَ أَزْوَاجُنَا وَذُرِّيَّتُنَا قَرَّةَ أَعْيُنٍ**۔ اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی اور کہا: اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیہ اسے بخاری (3) اور مسلم نے نقل کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمَحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيحْيَى مُصَدِّقًا

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ①

”پھر آواز دی ان کو فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے (اپنی) عبادت گاہ میں کہ بے شک اللہ تعالیٰ خوشخبری دیتا ہے آپ کو یحییٰ کی جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرمان کی اور سردار ہوگا اور ہمیشہ عورتوں سے بچنے والا ہوگا اور نبی ہوگا صالحین سے۔“

قولہ تعالیٰ: **فَنَادَتْهُ الْمَلِكَةُ** حمزہ اور کسائی نے **فَنَادَا** مذکر ہونے کی بنا پر الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں اس میں امالہ کرتے ہیں کیونکہ یہ (الف) اصل میں یا ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ چوتھی جگہ ہے اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود

1۔ صحیح بخاری، باب معوۃ النبی لخادمہ بطول العمر و بکثرة مالہ، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، باب النہی عن تزویج من لم یلد من النساء، حدیث نمبر 1754، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من زار قومًا ولم یفطر عندهم، حدیث نمبر 1846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہ کی قرأت الف کے ساتھ ہی ہے اور یہی ابو عبید کی پسند ہے۔

اور جریر نے مغیرہ کے واسطے سے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود پورے قرآن میں ملائکہ کو مذکور قرار دیتے ہیں۔ ابو عبید نے کہا ہے: ہم انہیں جانتے ہیں کہ انہوں نے اسے مشرکین کے خلاف اختیار کیا ہے کیونکہ مشرکین نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔

نحاس نے کہا ہے: یہ ایسا استدلال ہے جس سے کوئی شے حاصل نہیں کی جاسکتی کیونکہ عرب کہتے ہیں: قَالَتِ الرِّجَالُ اور قال الرجال اور اسی طرح النساء کے ساتھ بھی کرتے ہیں (یعنی مذکر و مونث دونوں طرح استعمال کر لیتے ہیں۔) اور ان پر قرآن کریم سے استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے کہ ان کے خلاف قرآن کریم سے اس طرح حجت لائی جائے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کریں: **وَإِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ الْبَتَّةُ** ان کے خلاف اس ارشاد میں حجت ہے: **أَشْهَدُ** اَخْلَقْتَهُمْ یعنی انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا۔ پس وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ مونث ہیں۔ تحقیق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ظن اور محض خواہش ہے۔ اور رہا فتنا دافہ تو یہ جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر جائز ہے اور ناداتہ جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر جائز ہے۔

مکی نے کہا ہے: الملائكة ذوی العقول میں سے جمع مکسر ہے اور یہ تانیث میں قائم مقام غیر ذوی العقول کے ہے۔ آپ کہتے ہیں: هی الرجال و هی الجذوع و هی الجبال و قالت الاعراب۔ اور اسے یہ ارشاد اور تقویت دیتا ہے۔ وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ اور دوسری جگہ مذکور ہے: وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ اور اسی پر اجماع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ پس اس جمع کو مذکر و مونث دونوں طرح لانا اچھا ہے اور سدی نے کہا ہے: اکیلے حضرت جبرائیل امین نے انہیں ندادی۔ (ناداء جبرائیل وحده) اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے اور قرآن کریم میں ہے: يُنْزِلُ الْمَلَائِكَةُ بِالزُّوْحِ مِنْ أَمْرِہِ مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور روح سے مراد وحی ہے۔ اور عربی میں یہ جائز ہے کہ واحد کے بارے جمع کے لفظ کے ساتھ خبر دی جائے اور قرآن کریم میں آیا ہے: الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ سے مراد نعیم بن مسعود ہے، جیسا کہ آگے آئے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں تمام ملائکہ نے ندادی اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ یعنی ندان کی جانب سے آئی۔

قوله تعالى: وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمَحَارِبِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ اس میں وَهُوَ قَائِمٌ مبتدا اور خبر ہے۔ اور يُصَلِّي محل رفع میں ہے اور اگر چاہے تو ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں رکھ لے۔ اَنَّ اللَّهَ اَصْل میں بان الله ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اِنَّ پڑھا ہے یعنی قالت ان الله۔ پس ندا بمعنی قول ہے۔ يُبَشِّرُكَ تشدید کے ساتھ اہل مدینہ کی قرأت ہے۔ اور حمزہ نے يُبَشِّرُكَ مخفف پڑھا ہے۔ اسی طرح حمید بن قیس مکی نے کہا ہے مگر یہ کہ انہوں نے شین کو کسرہ یا ضمہ اور با کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انخس نے کہا ہے: یہ تینوں لغات ایک معنی میں ہیں۔

پہلی کی دلیل اور یہ ایک جماعت کی قرأت ہے کہ اس مادہ سے جو بھی فعل ماضی یا امر کا صیغہ قرآن کریم میں ہے وہ بمقتل

کے ساتھ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَشِّرْهُ عِبَادِي - فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ - فَبَشِّرْهُ بِمَا بِإِسْحَاقَ - قَالُوا بَشِّرْنَاكَ بِالْحَقِّ اور رہی دوسری تو وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے اور وہ بَشِّرْ يَنْبَشِرُ سے ہے اور وہ اہل تہامہ کی لغت ہے۔ اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

بَشْرٌ عَيَالِي اِذَا رَأَيْتُ صَحِيفَةً
اَتَتْكَ مِنَ الْحَجَاجِ يُتَى كِتَابُهَا
اس میں محل استشہاد بَشْرٌ ہے۔
اور دوسرے نے کہا:

وَإِذَا رَأَيْتُ الْبَاهِشِينَ إِلَى النَّدَى
فَأَنْعُمُهُمْ وَأَبْشِرْ مَا بَشَرُوا بِهِ
اس میں محل استشہاد بِمَا بَشَرُوا بِهِ ہے۔

اور جہاں تک تیسری قرأت کا تعلق ہے تو وہ أَبْشَرَ يُبَشِّرُ ابْنِ شَارَا سے ہے۔
شاعر نے کہا:

يَا أُمَّ عَمْرٍو أَبْشِرِي بِالْبُشْرَى
مَوْتٌ ذَرِيعٌ وَجَرَادٌ عَظَلَى
اس میں محل استشہاد أَبْشِرِي ہے۔

قولہ تعالیٰ: يَخْبِيهِ پہلی کتاب میں ان کا نام حیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ سارہ کا نام یسارہ تھا۔ اور عربی میں اس کی تفسیر لاحد (وہ بچے نہ جنے گی) ہے۔ پس جب انہیں اسحاق کی بشارت دی گئی تو انہیں کہا گیا: سارہ اور انہیں یہ نام حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دیا، تو انہوں نے کہا: اے ابراہیم! علیہ السلام میرے نام سے ایک حرف کیوں کم کر دیا گیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی جبرائیل علیہ السلام سے کہا تو انہوں نے کہا: ”بلاشبہ یہ حرف ان کے اس بیٹے کے نام میں زائد کر دیا گیا ہے جو افضل انبیاء میں سے ہے اس کا نام حی ہے اور اس کا نام یحییٰ رکھ دیا گیا ہے۔“ نقاش نے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ان کا نام یحییٰ رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان اور نبوت کے ساتھ پیدا فرمایا (اور زندہ رکھا) اور بعض نے کہا ہے: ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سبب لوگوں کو ہدایت کے ساتھ احیاء عطا فرمایا اور مقاتل نے کہا ہے: ان کا اسم اللہ تعالیٰ کے اسم حی سے مشتق ہے پس یحییٰ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کیونکہ ان کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کی رحم کو زندہ کر دیا۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةِ قَوْلِ اللَّهِ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق کلمۃ من اللہ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ وہ اللہ کے کلمہ کُن سے پیدا ہوئے۔ پس وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ ابو السمال العدوی نے بِكَلِمَةِ تمام قرآن میں کاف کو مکسور اور لام کو ساکن پڑھا ہے۔ اور یہ فصیح لغت ہے جیسا کہ کشف اور فیخذ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام کلمہ اس لئے ہے کیونکہ لوگ ان سے اسی طرح ہدایت پاتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہدایت اور راہنمائی پاتے تھے۔

اور ابو عبید نے کہا ہے: بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ کا معنی ہے بکتاب من اللہ (یعنی جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کی کتاب کی۔) فرمایا: اور عرب کہتے ہیں انشدنی کلمۃ ای قصیدۃ اس نے میرے سامنے قصیدہ پڑھا۔ جیسا کہ روایت ہے کہ الحویدرہ کا حضرت حسان بن ثابتؓ کے پاس ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: لعن اللہ کلمتہ یعنی قصیدتہ۔ (اللہ تعالیٰ اس کے قصیدہ پر لعنت کرے) اور اس کے علاوہ بھی کئی اقوال کہے گئے ہیں۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور اکثر علماء اسی پر ہیں اور یحییٰ علیہ السلام وہ پہلے فرد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی۔ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چھ مہینے بڑے تھے۔ اور دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ پس جب حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کی شہادت سنی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اٹھے اور انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور وہ ایک کپڑے میں (لپٹے) پڑے تھے اور علامہ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مریم جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں تو اسی وقت ان کی بہن حضرت یحییٰ علیہ السلام سے حاملہ تھی، تو وہ اپنی بہن کی ملاقات کے لئے آئی اور کہا: اے مریم! کیا تجھے معلوم ہوا ہے کہ میں حاملہ ہوں؟ تو حضرت مریم علیہا السلام نے اسے کہا: کیا تو نے محسوس کیا ہے کہ میں حاملہ ہوں؟ تو اس نے آپ کو کہا: جو میرے پیٹ میں ہے میں اسے پارہی ہوں کہ وہ اسے سجدہ کر رہا ہے جو تیرے پیٹ میں ہے۔ اسی وجہ سے یہ روایت کیا گیا کہ انہوں نے اپنے جنین کو محسوس کیا کہ وہ اپنا سر حضرت مریم کے پیٹ کی طرف جھکا رہا ہے۔ سدی نے کہا ہے: پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ اور مُصَدِّقًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَ سَيِّدًا اس کا معنی السید (سردار) وہ جو اپنی قوم کا سردار ہوتا ہے۔ اور اس کے قول پر (کسی کام کی) انتہا ہو جاتی ہے اور اس کی اصل سَيُّودٌ ہے کہا جاتا ہے: فلان اسود من فلان۔ یہ افعول کے وزن پر صیغہ اسم تفضیل ہے اور السیادۃ سے بنایا گیا ہے اور اسی میں اس پر دلیل موجود ہے کہ انسان کا نام سید رکھنا جائز ہے جیسا کہ یہ جائز ہوتا ہے کہ اس کا نام عزیز یا کریم رکھا جائے۔ (1)

اور اسی طرح حضور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے بنی قریظہ (☆) کو فرمایا:۔ (اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو۔) اور بخاری و مسلم میں ہے (2) کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت امام حسن بن علیؓ کے بارے فرمایا: ان ابني هذا سيد و لعل الله يمدح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين (بلاشبہ میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے اللہ تعالیٰ اس کے سبب مسلمانوں کے دو بہت بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔) اور پھر اسی طرح ہوا۔ کیونکہ جب حضرت علیؓ شہید ہوئے تو چالیس ہزار سے زائد لوگوں نے آپ کی بیعت کی اور بہت سے ان میں سے تھے جو ان کے باپ سے پیچھے رہ گئے تھے اور ان میں سے تھے جنہوں نے ان کی بیعت توڑ دی تھی، آپ تقریباً سات ماہ تک عراق اور اس کے بعد خراسان میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3812، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، کتاب الصلح، حدیث 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆۔ تفسیر میں الفاظ یہی ہیں جبکہ اصل میں یہ ارشاد حضرت سعد بن معاذ کے حق میں انصار کو ہے۔

خلیفہ رہے، پھر آپ اہل حجاز اور اہل عراق کا لشکر ساتھ لے کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف چلے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اہل شام کو لے کر آپ کی طرف چلے۔ پس جب دونوں لشکر ایک جگہ آمنے سامنے ہوئے وہ انبار کی اطراف میں عراق کی زمین میں سے مسکن کہلاتی ہے، تو امام حسن رضی اللہ عنہ نے جنگ کو ناپسند کیا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی ایک غالب نہیں آسکتا یہاں تک کہ دوسرے کا اکثر حصہ ہلاک ہو جائے۔ پس مسلمان ہلاک ہوں گے، تو آپ نے ان شرائط پر معاملہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا جو شرائط آپ نے ان پر عائد کی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد امارت (حکمرانی) آپ کی ہوگی۔ پس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان تمام کا التزام کیا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سچا ثابت ہوا ان ابی ہذا سید بلاشبہ میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اور اس سے بڑا سردار کوئی نہیں ہو سکتا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول سردار بنائے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے کہ وَسَيِّدًا کا مفہوم ہے کہ وہ علم و عبادت میں سردار ہیں۔ ابن جبیر اور ضحاک نے کہا ہے: علم اور تقویٰ میں سردار ہیں۔

مجاہد نے کہا ہے: السید سے مراد کریم سخی ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: وہ جس پر غصہ غالب نہ آتا ہو۔ اور زجاج نے کہا ہے: سید وہ ہے جو اپنے ساتھیوں پر خیر اور نیکی کے کام میں فوقیت رکھتا ہو۔ اور یہ لفظ (تمام) کو جامع ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: السید کا معنی دو سال کی بھیڑ بھی ہے۔ اور حدیث میں ہے: ثنی من الضان خیر من السید المعز بھیڑوں میں دوندی دو برس کی بھیڑ سے بہتر اور افضل ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

سواءً علیہ شاة عامٍ دنت له لیذبها للضیف أم شاة سید
وَحَصُورٌ اِیہ اصل ہے الحصر سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے روکنا، قید کرنا، حَصْنُ الشَّيْءِ وَاخْصَصْنِي جب کوئی شے مجھے روک لے۔

جیسا کہ ابن میادہ نے کہا ہے:

و ما هجر لیدی ان تكون تباعدت علیک ولا ان اخصرتک شغول
اور ناقة حصور: ضیقة الاحلیل یعنی جس اونٹنی کے تھنوں (یا پیشاب) کا سوراخ تنگ ہو۔ اور حَصُور وہ ہوتا ہے جو عورتوں کے پاس نہ آسکتا ہو (یعنی جماع کے قابل نہ ہو) گویا کہ اسے ان سے روک دیا گیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رجل حصور و حصیر جب کہ وہ اپنی بخشش اور عطا کو روک لے اور وہ کچھ نہ نکالے جو کچھ اس کے ہم نشین نکال رہے ہیں کہا جاتا ہے: شرب القوم فحصر علیہم فلاں ای بخل۔ (قوم نے شراب پی تو ان پر فلاں نے پابندی لگا دی، یعنی اس نے ان کے ساتھ بخل کیا۔) یہ ابو عمرو سے منقول ہے۔

اخطل نے کہا ہے:

و شاربٌ مُزِجٌ بالکأسِ نادِ مِنی لا بالحَصُورِ ولا فیہا بِسِوَارِ

اور قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا یعنی جہنم کو ہم نے کافروں کے لئے قید خانہ بنایا ہے اور الحصیر سے مراد مِلک ہے کیونکہ اسے روک لیا جاتا ہے۔

اور لبید نے کہا ہے:

و قُصَامُ غُلْبِ الرِّقَابِ كَانَهُمْ جُنَّ لَدَى بَابِ الْحَصِيرِ قِيَامُ

اس میں باب الحصیر سے مراد مِلک ہے۔

پس حضرت یحییٰ علیہ السلام حضور تھے یہ بروزن فِعْلُ بمعنی مفعول ہے یعنی آپ عورتوں کے ساتھ مباشرت نہ کر سکتے تھے۔ گویا کہ انہیں اس سے روک لیا گیا جو کچھ مردوں میں ہوتا ہے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے۔ اور فِعْلُ بمعنی مفعول لغت میں کثیر الاستعمال ہے۔ اسی سے حلوب بمعنی مخلوبۃ ہے۔

شاعر نے کہا:

فِيهَا اثْنَتَانِ دَارِبَعُونَ حَلُوبَةً سُوْدًا كَخَافِيَةِ الْغُرَابِ الْأَسْحَمِ

اس میں حلوبۃ سے استدلال کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابن جبیر، قتادہ، عطاء، ابوالشعثاء، حسن، سدی اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: (حضور) اس سے مراد وہ ہے جو عورتوں سے باز رہتا ہے اور قدرت کے باوجود وہ ان کے قریب نہیں جاتا۔ اور دو اعتبار سے یہی اصح قول ہے۔ ایک یہ ہے کہ یہ ان کی مدح اور تعریف ہے اور بلاشبہ تعریف اکثر فعل کسی کے سبب ہوتی ہے نہ کہ فطری اور طبعی فعل پر اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فِعْلُ لغت میں فاعل کے صیغوں میں سے ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

ضَرَبْتُ بِنَصْلِ السَّيْفِ سُوْقَ سِمَانِهَا إِذَا عَدِمُوا إِزَادَ أَفَانُكَ عَاقِرُ

اس میں محل استشہاد لفظ ضَرَبْتُ ہے۔

پس معنی یہ ہے کہ اپنے نفس کو شہوات سے روکنے والا ہے۔ اور شاید یہ ان کی شریعت میں تھا اور رہی ہماری شریعت تو اس میں نکاح ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضور سے مراد وہ عتین ہے جس کا ذکر نہ ہو کہ وہ اس کے سبب وطی کر سکتا ہو اور نہ اسے انزال ہوتا ہو یہ حضرت ابن عباس سے بھی، حضرت سعید ابن مسیب اور ضحاک نے کہا ہے۔ اور ابو صالح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”ہر انسان اللہ تعالیٰ سے گناہ کے ساتھ ملاقات کرے گا، درآنحالیکہ اس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ اس کے سبب اسے عذاب دے گا یا پھر رحم فرمائے گا سوائے یحییٰ بن زکریا کے، کیونکہ وہ وَهَّابٌ وَصَّيَّاهُ وَحُصُونٌ وَنَبِيَّاتٌ الصَّالِحِينَ تھے۔ پھر حضور نبی مکرم ﷺ نے اپنا دست مبارک زمین کے ایک تنکے کی طرف نیچے کیا اور اسے اٹھالیا اور فرمایا: ”ان کا ذکر اس تنکے کی مثل تھا۔“ اور قول

بھی ہے کہ اس کا معنی ہے: وہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچانے اور روکنے والا ہے۔ وَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ زجاج نے کہا ہے: الصالح الذی یؤدی بینه ما افترض علیہ والی الناس حقوقہم۔ (کہ صالح وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض ادا کرتا ہے اور لوگوں کو ان کے حقوق عطا کرتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنِّیْ یَكُوْنُ لِیْ عُلْمٌ وَقَدْ بَلَغَنِی الْکِبَرُ وَاَمْرًا تِیْ عَاقِرٌ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝

”زکریا کہنے لگے اے رب! کیونکر ہوگا میرے ہاں لڑکا حالانکہ آلیا ہے مجھے بڑھا پے نے اور میری بیوی بانجھ

ہے فرمایا بات اسی طرح ہے (جیسی تم نے کہی) لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔“

کہا گیا ہے: یہاں رب سے مراد جبریل امین علیہ السلام ہیں یعنی انہوں نے حضرت جبریل امین علیہ السلام کو کہا: رب،

اے میرے سردار..... کیونکر میرے ہاں لڑکا ہوگا؟ یہ کبھی کا قول ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: رب سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اَنِّیْ بمعنی کیف ہے اور یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے اور اس استفہام کے معنی میں دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کیا اس کے ہاں بچہ ہوگا حالانکہ وہ اور اس کی بیوی اپنے اس حال پر ہیں یا انہیں اس حال پر لوٹا دیا جائے گا جس سے بچہ ہو سکتا ہے؟ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کیا انہیں اپنی اسی بانجھ بیوی سے بچہ عطا کیا جائے گا یا کسی اور سے؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ کون سے درجہ کے سبب اس کا حقدار سمجھا گیا ہے حالانکہ میں اور میری بیوی اس حال پر ہیں۔ آپ نے یہ غلطی وجہ التواضع کہا۔

اور روایت ہے کہ آپ کی دعا اور جس وقت آپ کو اس کی بشارت دی گئی ان کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ تھا۔ اور جس دن آپ کو بشارت دی گئی تھی اس وقت آپ کی عمر نوے برس تھی اور آپ کی اہلیہ کی عمر بھی اس کے قریب تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک نے کہا: جب آپ کو خوشخبری دی گئی اس وقت آپ کی عمر ایک سو بیس برس تھی اور آپ کی بیوی کی عمر اٹھانوے برس تھی۔

پس اسی لئے یہ قول ہے وَاَمْرًا تِیْ عَاقِرٌ یعنی میری بیوی بانجھ ہے وہ بچہ نہیں جن سکتی۔ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ عَاقِرٌ وَاِمْرَاةٌ عَاقِرٌ جس میں بانجھ پن واضح اور ظاہر ہو۔ اور (کہا جاتا ہے) عَقْرَتٌ وَاَمْرَةٌ (دونوں میں قاف مضموم ہے) تَعَقَّرَ عَقْرًا وَاَمْرًا بانجھ ہو گئی، مثلاً حسنت تحسن حسناً، یہ ابوزید سے منقول ہے اور عَقَارٌ بھی ہے اور دونوں میں اسم فاعل فعل سے فعیلۃ کے وزن پر ہے۔ کہا جاتا ہے: عَظَمَتْ فَهِيَ عَظِيْمَةٌ اور ظَرَفَتْ فَهِيَ ظَرِيْفَةٌ اور عَاقِرٌ کہا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد نسب کی بنا پر بانجھ پن والا ہے اور اگر یہ فعل کی بنا پر ہوتا تو کہتا: عَقَرَتْ فَهِيَ عَقِيْرَةٌ گویا کہ وہ اس کے سبب بانجھ ہے، یعنی عمر کے اعتبار سے بڑھا پانچ جننے سے اس کے لئے مانع ہے۔ اور عَاقِرٌ سے مراد ریت کی وہ کثیر مقدار ہے جو کوئی شے اگنے نہ دے۔ اور عَقْرٌ عورت کے مہر کو بھی کہتے ہیں جب شبہ کے ساتھ اس سے وطی کی جائے۔ اور بَيْضَةُ الْعَقْرِ، اس سے مراد مرغ کا انڈا ہے، کیونکہ یہ اس کی عمر میں طویل مدت تک ایک خاص سفیدی سی لے آتا ہے اور عَقْرُ النَّارِ بھی ہے، یعنی آگ کا وسط اور اس کا بڑا حصہ۔

اور عقر الحوض حوض کا پچھلا حصہ جہاں اونٹ کھڑے ہوتے ہیں جب وہ اس پر آئیں، کہا جاتا ہے: عقر اور عقر مثلاً عسرا اور عسرا۔ اور اس کی جمع الاعقار ہے اور یہ لفظ مشترک ہے۔ اور کذلک میں کاف محل نصب میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی مثل جو چاہتا ہے کرتا ہے اور الغلام، الغلمہ سے مشتق ہے اور اس کا معنی نکاح کی طلب کا شدید ہونا ہے اور اغتلم الفعل غلمۃ وہ شہوة ضربا سے بھڑک اٹھا۔

لیلی الاخیلیہ نے کہا ہے:

شفاها من الداء الغضال الذی بہا علاقر اذا هَزَّ القنّاة سقاها

اور الغلام سے مراد ایسا نوجوان جس کی لبیں نکل رہی ہوں اور وہ جس میں غلومة اور غلومیتہ (جوانی) واضح ہو۔ اور اس کی جمع الغلمۃ اور الغلمان ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ان الغیلم الشاب و الجاریۃ ایضا (یعنی جوان آدمی اور جوان لڑکی) اور الغیلم کچھوے کو بھی کہتے ہیں اور الغیلم جگہ بھی ہے۔ اور اغتلم البحر کا معنی ہے: سمندر نے جوش مارا اور اس کی امواج تلاطم خیز ہوئیں۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّي آيَةً ۚ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ۚ

وَإِذْ كُنَّا رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحُوا بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۖ

”عرض کی اے میرے رب! مقرر فرما دے میرے لئے کوئی نشانی۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ نہ بات کر سکو گے

لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کرو اپنے پروردگار کو بہت اور پاکی بیان کرو (اس کی) شام اور صبح۔“

اس میں تین، مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّي آيَةً یہاں جَعَلَ بمعنی صیتر ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ اور لی مفعول ثانی کے محل میں واقع ہے۔ جب انہیں بچے کی بشارت دی گئی اور ان کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں تو انہوں نے علامت کا مطالبہ کیا جس کے ساتھ وہ اس امر کی صحت اور اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کو پہچان لیں، تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ چونکہ انہوں نے علامت اور نشانی کا مطالبہ کیا ہے لہذا ملائکہ کے ان کے آمنے سامنے ہونے کے بعد لوگوں کے ساتھ کلام کرنے سے سکوت اور خاموشی انہیں آپہنچے گی۔ (یعنی وہ کلام نہ کر سکیں گے) اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اور اسی طرح اگر مرض کے سبب گونگا پن یا اس طرح کی کوئی شے نہ ہو تو اس میں ہر حال پر کچھ نہ کچھ سزا ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: بے شک حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ جب ان کے سبب یحییٰ سے حاملہ ہوئی تو انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ کسی کے ساتھ کلام کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اور وہ اس کے باوجود تورات پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور جب وہ کسی اور سے گفتگو کرنے کا ارادہ کرتے تو نہ بول سکتے تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: إِلَّا رَمْزًا لغت میں الرمز سے مراد ہونٹوں کے ساتھ اشارہ کرنا ہے اور کبھی کبھی یہ بھنوں،

آنکھوں اور دونوں ہاتھوں کے ساتھ اشارہ کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اس کا اصل معنی حرکت ہے۔ اور کہا گیا ہے: آپ نے اس علامت کا مطالبہ طمانیت و راحت میں زیادتی اور اضافہ کے لئے کیا تھا۔ معنی یہ ہے: تو نعمت مکمل اور تمام فرما دے اس طرح کہ تو میرے لئے کوئی علامت اور نشانی بنا دے۔ اور وہ علامت مزید نعمت اور کرامت ہو جائے گی، تو آپ کو کہا گیا: اَيُّنِكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ یعنی تم تین رات تک کلام نہ کر سکو گے۔ اس قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد ہے جو ملائکہ کے آپ کو بشارت دینے کے بعد ہے۔

وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا یعنی میں نے اپنی قدرت کے ساتھ تجھے پیدا کیا ہے تو اسی طرح تیرے لئے بچہ بھی پیدا فرما دیں گے۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے۔ قنادہ کا قول ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو ترک کلام کے ساتھ سزا دی گئی۔ یہ قول قابل التفات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی خبر نہیں دی کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے منع فرمایا ہے۔ اور اس میں کلام یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: تو میرے لئے ایسی علامت اور نشانی بنا دے جو بچہ ہونے پر دلالت کرتی ہو، جبکہ وہ مجھ سے غائب ہے اور مَرْمُزًا استثناء منقطع کی بنا پر منصوب ہے، انخفش نے یہی کہا ہے اور کسائی نے کہا ہے: رَمَزِيرٌ مَزْدِيرٌ مَزْمَزٌ۔ اور اِلَّا مَرْمُزًا کو میم کے فتح اور رُمُزًا میم اور را کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کی واحد رمزة ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اشارہ کلام کے قائم مقام ہوتا ہے اور یہ کثیر احادیث میں موجود ہے اور اشارات کو اس امر نے موکد اور پختہ کر دیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوداء کے بارے میں اس کے ساتھ ہی فیصلہ فرمایا جبکہ آپ نے اسے کہا این اللہ۔ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ تو اس نے اپنے سر سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتقها فانها مؤمنة تو اسے آزاد کر دے کیونکہ یہ مومنہ ہے۔ تو آپ نے اشارہ کے ساتھ اس اسلام کی اجازت دے دی جو اس دین کی اصل ہے جو جان اور مال کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے ساتھ جنت کا مستحق بنا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آتش جہنم سے نجات پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ایمان کا اسی طرح فیصلہ فرمایا جس طرح اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے جو زبان سے بول کر اقرار کرتا ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ اشارہ تمام دین میں قابل عمل ہے۔ اور یہی عام فقہاء کا قول ہے۔

ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ گونگا آدمی جب طلاق کے لئے اشارہ کرے تو وہ لازم ہو جاتی ہے۔ اور امام شافعی نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جو بیمار ہوتا ہے اور اس کی زبان مختل ہو جاتی ہے تو وہ رجعت اور طلاق کے مسائل میں گونگے کی طرح ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ جائز ہے جبکہ اس کا اشارہ معروف ہو (یعنی اسے سمجھنے میں کوئی شبہ نہ ہو) اور اگر اس میں شک ہو تو پھر وہ باطل ہے، یہ قیاس نہیں ہے البتہ یہ استحسان ہے۔ ان تمام میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ باطل ہو کیونکہ وہ کلام نہیں کر سکتا اور اس کا اشارہ سمجھا نہیں جاسکتا۔

ابو الحسن بن بطلال نے کہا ہے: اور انہوں نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو اپنے اس قول پر محمول کیا ہے کہ انہیں ان احادیث کا علم نہیں ہوا جو دین کے مختلف احکام کے بارے میں اشارات کے جواز کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ اور شاید امام بخاری

نے باب الاشارة في الطلاق والامور کے عنوان سے ان کے رد کا قصد کیا ہے۔ (1)

اور حضرت عطاء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد **أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ** سے تین دن کے روزے کا قصد کیا ہے اور وہ جب روزہ رکھتے تھے تو وہ صرف اشارے کے ساتھ ہی گفتگو کرتے تھے۔ اور یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ بعض ان افراد نے کہا ہے جو سنت کے ساتھ قرآن کریم کا نسخ جائز قرار دیتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کلام کرنے سے روک دیا گیا حالانکہ وہ اس پر قادر تھے اور یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: **لَا صَمْتَ يَوْمًا إِلَى اللَّيْلِ** (کسی دن رات تک خاموش رہنا جائز نہیں) اور اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں (2)۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کسی آفت کے سبب کلام سے روک دیا گیا جو انہیں لاحق ہوئی اور اس نے انہیں کلام سے روک دیا اور وہ آفت صحت کے باوجود کلام پر قادر نہ ہونا ہے، اسی طرح مفسرین نے کہا ہے۔ اور بہت سے علماء نے یہ کہا ہے کہ حدیث طیبہ **لَا صَمْتَ يَوْمًا إِلَى اللَّيْلِ** کا معنی یہ ہے کہ پورا دن رات تک اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خاموشی (جائز) نہیں ہے اور رہی فضول اور بے فائدہ گفتگو! تو اس سے تو خاموشی اچھی اور بہتر ہے۔

قولہ تعالیٰ: **وَإِذْ كُنَّا رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَتَحِبُّ بِالْعَصِيِّ وَالْإِبْكَارِ** اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی زبان بند ہونے کے باوجود اپنے دل میں ذکر کبھی نہ چھوڑے، یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ذکر کا معنی گزر چکا ہے۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اگر کسی کو ذکر ترک کرنے کی رخصت دی جاتی تو وہ یقیناً حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے سبب دی جاتی **أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا سَمْرًا** **وَإِذْ كُنَّا رَبَّكَ كَثِيرًا** اور اس آدمی کو دی جاتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جہاد میں ہوتا ہے: **إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَابْتُتُوا وَإِذْ كُنَّا اللَّهُ كَثِيرًا** اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

وَسَيَحِبُّ بمعنی صل ہے یعنی تو نماز پڑھ۔ اس میں صلاۃ (نماز) کو **سُبْحَةً** کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر قسم کی برائی اور نقص سے اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تنزیہ بیان کرنا ہے اور العشی، عشیۃ کی جمع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واحد ہے اور اس سے مراد سورج کے زوال پذیر ہونے کے وقت سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت ہے، یہ حضرت مجاہدؒ سے منقول ہے۔ اور موطا میں قاسم بن محمد سے منقول ہے میں نے لوگوں کو نہیں پایا مگر یہ کہ وہ ظہر کی نماز عشی کے وقت ادا کرتے ہیں اور **الْإِبْكَارِ** سے مراد طلوع فجر سے چاشت تک کا وقت ہے۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ لِمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ①

”اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہیں اور خوب پاک کر دیا ہے تمہیں اور

پسند کیا ہے تجھے سارے جہان کی عورتوں سے۔“

1۔ متن فارسی، باب الاشارة في الطلاق والانوار، قبل الحدیث 4883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، باب ما جاء منقطع الیتم۔ حدیث نمبر 2489، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قوله تعالى: إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَبِئْسَ شَكَّ اللَّهُ تَعَالَىٰ نے تمہیں اختیار کر لیا ہے (چن لیا ہے) اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔
وَكَهَذَا اور تجھے خوب پاک کر دیا ہے کفر سے۔

حضرت مجاہد اور حسن سے یہی مروی ہے اور زجاج نے کہا ہے: اور تمہیں پاک کر دیا ہے تمام الانشوں سے مثلاً حیض، نفاس وغیرہما۔ اور تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دینے کے لئے پسند کر لیا ہے۔ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِينَ یعنی اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر، حسن اور ابن جریج وغیرہما نے یہی بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِينَ قیامت قائم ہونے کے دن تک تمام جہان والی عورتوں کو شامل ہے اور یہی صحیح ہے ہم اسے بیان کریں گے اور یہی زجاج وغیرہ کا قول ہے۔

اصطفاء کا ذکر دوبارہ کیا گیا ہے کیونکہ پہلے کا معنی ہے کہ تمہیں چن لیا ہے اپنی عبادت کے لئے اور دوسرے کا معنی ہے کہ تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے لئے چن لیا ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابو موسیٰ بنی ہاشم سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (1) ”مردوں میں سے کامل بہت سے ہیں اور عورتوں میں سے سوائے مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ کے سوا کوئی کامل نہیں اور بلاشبہ عائشہ کی فضیلت دوسری عورتوں پر اسی طرح ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر۔“ ہمارے علماء رحمہم نے کہا ہے: کمال سے مراد انتہا کو پہنچنا اور مکمل ہونا ہے۔ اور اس کا فعل ماضی مکمل میم کے فتح اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ اور مضارع یکمیل میم کے ضمہ کے ساتھ آتا ہے اور ہر شے کا کمال اس کی اپنی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے اور کمال مطلق تو فقط اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نوع انسان میں سے کامل ترین حضرات انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات ہیں اور پھر ان کے بعد اولیاء مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر کہا گیا: بے شک وہ کمال جس کا ذکر حدیث طیبہ میں کیا گیا ہے اس سے مراد تو نبوت ہے تو اس پر یہ لازم آتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام اور آسیہ دونوں نبیہ ہوں اور اس طرح کہا گیا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف فرشتہ کے واسطے وحی فرمائی ہے جیسا کہ اس نے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی فرمائی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اس کا بیان سورۃ مریم میں بھی آئے گا اور یہی آسیہ تو کوئی ایسی شے بیان نہیں ہوئی جو واضح طور پر اس کی نبوت پر دلالت کرتی ہو بلکہ اس کے صدیقہ ہونے پر۔ اور اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہو۔ اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

صحیح اسناد سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اور آپ سے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: ”سارے جہان کی عورتوں سے بہتر چار عورتیں ہیں مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم جو فرعون کی بیوی ہے، حضرت خدیجہ بنت خویلد اور حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم“ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے: ”اہل جنت کی عورتوں میں سے افضل خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم ہیں (2)۔“ اور آپ ہی سے ایک دوسری سند سے مروی ہے: ”مریم کے بعد اہل جنت کی عورتوں کی سردار

حضرت فاطمہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما ہیں۔“

پس قرآن و احادیث کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام سارے جہان کی عورتوں سے افضل ہے حضرت مائی حواء علیہا السلام سے لے کر اس آخری عورت تک جس پر قیامت قائم ہوگی (سب سے افضل ہے) کیونکہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تکلیف اخبار، اور بشارت کے بارے میں وحی ان تک اسی طرح پہنچائی ہے جس طرح تمام انبیاء علیہم السلام تک پہنچائی، پس اس طرح یہ نبیہ ہیں اور نبی ولی سے افضل ہوتا ہے پس یہ تمام عورتوں سے افضل ہیں مطلقاً اولین و آخرین سب شامل ہیں۔ پھر ان کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں پھر ان کے بعد حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور پھر ان کے بعد آسیہ رضی اللہ عنہا۔ اور اسی طرح موسیٰ بن عقبہ نے کرب کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سارے جہان کی عورتوں کی سردار مریم ہیں پھر فاطمہ، پھر خدیجہ اور پھر آسیہ ہے“ یہ حدیث حسن ہے اشکال کو دور کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو اس کے ساتھ خاص کیا ہے جو عورتوں میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا اور وہ یہ کہ روح القدس ان سے ہمکلام ہوئے، ان کے قریب ہوئے اور عورتوں میں سے کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا اور انہوں نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی۔ اور جب انہیں بشارت دی گئی تو کسی نشانی کا مطالبہ نہیں کیا جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے نشانی کا مطالبہ کیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن مقدس میں صدیقہ کا نام دیا ہے اور فرمایا: وَ اُمُّهُ صِدِّيقَةٌ اور فرمایا: وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَ كُتِبَ لَهَا مِنَ الْقَائِلِينَ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے صدیقہ ہونے کی شہادت دی اور ان کے لئے کلمات بشارت کی تصدیق کرنے کی شہادت دی اور ان کے لئے عجز و انکساری اور اطاعت شعاری کی شہادت دی۔ اور بلاشبہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کو بچے کی بشارت دی گئی تو انہوں نے اپنے بڑھاپے اور اپنی بیوی کے بانجھ پن کی طرف دیکھا اور کہا: کیونکر میرے لئے بچہ ہو سکتا ہے حالانکہ میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے، سو نشانی طلب کی اور حضرت مریم کو بچے کی بشارت دی گئی تو اس نے یہ دیکھا کہ وہ باکرہ ہے اور اسے کسی بشر (انسان) نے مس نہیں کیا تو اسے کہا گیا: كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ اِیْ طَرَحَ تِیْرَے رب نے کہا ہے۔

پس انہوں نے اسی پر اقتصار کیا اور اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کر دی اور کوئی ایسی علامت اور نشانی طلب نہ کی جس سے اس امر کی حقیقت کو جانا جاسکتا ہو۔ بنات آدم میں سے سارے جہان کی عورتوں میں کسی عورت کے لئے اس قسم کے مناقب نہیں ہیں، اسی لئے یہ روایت ہے کہ وہ جنت کی طرف رسل علیہم السلام کے ساتھ پہلے جانے والوں میں جائیں گی۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ”اگر میں قسم کھاؤں کہ میری امت کے سابقین سے پہلے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے دس سے کچھ زائد افراد کے ان میں سے حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کے تو میں یقیناً اپنی قسم میں سچا ہوں۔“

تحقیق اس پر یہ فرض اور لازم ہو جاتا ہے جس پر ظاہری علم کھلا اور اس نے اشیاء ظاہرہ سے اشیاء باطنہ پر استدلال کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو جان لے (1): انا سید ولد آدم ولا فخر (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے کوئی فخر نہیں۔) لواء الحمد یوم القیامۃ بیدی و مفاتیح الکرم بیدی و انا اول خطیب و اول شفیع و اول مبشر و اول و اول (قیامت کے دن لواء الحمد میرے ہاتھ میں ہوگا اور کرم کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی اور میں پہلا خطیب ہوں گا اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور میں سب سے پہلے بشارت دینے والا ہوں گا اور میں (فلاں میں) اول ہوں گا اور (فلاں میں) اول ہوں گا) (2) اور رسل علیہم السلام کو دنیا میں یہ سرداری حاصل نہیں ہوئی مگر باطن میں کسی امر عظیم کے سبب (انہیں یہ مقام ملا) اور اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کی شان ہے کہ انہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے صدیقہ اور کلمات کی تصدیق کرنے کی شہادت نصیب نہیں ہوئی مگر ایسے مرتبہ کے سبب جو انتہائی قرب عطا کرنے والا ہے۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ وہ نبیہ نہیں انہوں نے کہا ہے: ان کا فرشتے کو دیکھنا اسی طرح ہے جس طرح حضرت جبریل علیہ السلام کو وحیہ کلبی کی صورت میں دیکھا گیا جس وقت انہوں نے اسلام اور ایمان کے بارے سوال کئے تھے اور اس روایت کے باوجود صحابہ کرام انبیاء نہیں ہوئے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے اور اکثر اسی موقف پر ہیں۔ واللہ اعلم۔

لَمَرِّمُ اقْتَنَى لِرَبِّكَ وَاسْجُدْ مِیْ وَاسْمَا کَعِیْ مَعَ الرَّکِیْنِ ۝

”اے مریم! خلوص سے عبادت کرتی رہ اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔“

مراد یہ ہے کہ اے مریم! نماز میں قیام طویل کر۔ یہ مجاہد سے منقول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: تو اطاعت و عبادت پر دوام اختیار کر، قنوت کے بارے تفصیلی گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: جب ملائکہ نے انہیں یہ کہا تو وہ نماز میں کھڑی ہوئیں یہاں تک کہ ان کے قدم درم آلود ہو گئے۔ اور ان سے خون اور پیپ بہنے لگی۔ وَاسْجُدْ مِیْ وَاسْمَا کَعِیْ یہاں رکوع پر سجود کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور اس بارے میں اختلاف سورۃ البقرہ میں اس ارشاد کے تحت گزر چکا ہے اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ پس جب تو کہے: قام زید و عمرو تو یہ مراد لینا جائز ہے کہ عمرو زید سے پہلے کھڑا ہوا ہو۔ پس اس بنا پر معنی یہ ہوگا وار کعی و اسجدی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی شریعت میں سجدہ رکوع سے پہلے تھا۔ مَعَ الرَّکِیْنِ کہا گیا ہے اس کا معنی ہے افعلی کفعلہم تو ان کی طرح کا فعل کر اگرچہ تو ان کے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد نماز باجماعت ہے۔ یہ بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ

يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝

”یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم وحی کرتے ہیں ان کی آپ کی طرف اور نہ تھے آپ ان کے

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر الشفاء، حدیث نمبر 4297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پاس جب پھینک رہے تھے وہ (مجاور) اپنی قلمیں (یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ) کون ان میں سے سرپرستی کرے مریم کی اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ یعنی یہ جو حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کے واقعات ہم نے ذکر کئے ہیں یہ اخبار غیب میں سے ہیں۔ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے اس حیثیت سے کہ آپ نے حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کے واقعہ کی خبر دی حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابوں میں نہیں پڑھا تھا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرمایا اور اہل کتاب نے اس بارے آپ کی تصدیق کی۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: نُوحِيْهِ اِلَيْكَ میں ضمیر کو ذالک کی طرف لوٹایا گیا ہے اور اسی کی یاد دلائی گئی ہے اور الایحاء یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کچھ بھیجنے کے معنی میں ہے۔ اور وحی الہام، اشارہ اور کئی دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے۔ اور لغت میں اس کی اصل خفیہ کسی شے سے آگاہ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے الہام کو بھی وحی کا نام دیا جاتا ہے اور اسی سے ہے وَ اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلَى الْخَوَارِیْثِ اور قول باری تعالیٰ: وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اور کہا گیا ہے: اَوْحٰی اِلَی الْخَوَارِیْثِ کا معنی ہے ”میں نے انہیں حکم دیا، کہا جاتا ہے: وحی اور ادھی، رمی اور آدمی یہ ہم معنی ہیں۔ عجاج نے کہا ہے: اوحی لہا القرار فاستقرت یعنی اس نے زمین کو قرار پکڑنے کا حکم دیا پس وہ قرار پذیر ہو گئی۔

اور حدیث میں ہے: الوحی الوحی مراد انتہائی سرعت اور تیزی ہے اور اس سے فعل توحیت توحیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: الوحی کا معنی اشارہ، کتابت اور رسالہ (بھیجنا) ہے۔ اور ہر وہ شے جسے تو کسی غیر کی طرف القاء کرے یہاں تک کہ وہ اسے جان لے وہی وحی ہے وہ جیسے بھی ہو۔ اور الوحی کا معنی السریع ہے۔ اور الوحی کا معنی الصوت آواز ہے۔ اور کہا جاتا ہے: استوحینا ہم یعنی ہم نے ان کی مدد طلب کی۔

کسی نے کہا:

اوحیت مینونا لها والأزراق

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے پاس موجود نہ تھے۔ اِذْ یُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ۔ اقلام قلم کی جمع ہے۔ یہ قلمتہ سے ہے اس کا معنی ہے: فلاں نے اسے کاٹ دیا۔ کہا گیا ہے: قِداحہم و سہامہم یعنی مراد ان کے تیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی وہ قلمیں مراد ہیں جن سے وہ تورات لکھتے تھے اور یہی عمدہ معنی ہے، کیونکہ ازلام (جوائے کے تیر) سے تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور کہا ہے ذٰلِکُمْ فِسْقٌ۔

مگر وہ ان کی اجازت دیتا ہے اس طور پر کہ وہ انہیں اس طرز پر استعمال نہ کریں جس طرح دور جاہلیت میں کرتے تھے۔ اَیُّهُمْ یُکْفَلُ مَرْیَمَ یعنی کون مریم کی پرورش اور تربیت کرے گا؟ تو حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے گھر ہے۔ اور ان کے نکاح میں اشیع بنت فاقد تھی جو کہ مریم کی ماں حنہ بنت فاقد کی بہن

تھی۔ بنی اسرائیل نے کہا: ہم اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے عالم کی بیٹی ہے۔ پس انہوں نے اس پر قرعہ اندازی کی اور ہر ایک اپنا قلم لے کر آیا۔ اور انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ قلم جاری پانی میں ڈالیں گے پس جس کا قلم ٹھہر گیا اور پانی اسے بہا کرنے لے گیا تو وہ اس کی پرورش اور تربیت کرے گا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس قلم بہہ گئے اور حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم اوپر بلند ہو گیا۔“ اور یہ آپ کی نشانی اور معجزہ تھا، کیونکہ آپ نبی تھے اور معجزات اور علامات آپ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔

اور اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ یہ مبتدا اور خبر اس فعل مضمر کے سبب محل نصب میں واقع ہیں جس پر کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام ہے: ينظرون اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ اور فعل لفظ اِی میں کوئی عمل نہیں کرتا کیونکہ وہ برائے استفہام ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے بعض علماء نے اس آیت سے قرعہ اندازی کے اثبات پر استدلال کیا ہے اور ہماری شریعت میں یہی اصل اور بنیاد ہے ہر اس کے لئے جو تقسیم میں عدل و انصاف کرنا چاہے اور جمہور فقہاء کے نزدیک دو مساوی جثتوں میں یہی سنت ہے، تاکہ ان کے درمیان عدل ہو سکے اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور اس آدمی کے بارے میں وہم و گمان اٹھ جائے جو ان کی تقسیم کا والی بنتا ہے۔ اور ان میں سے کسی کو اس کے ساتھی پر فضیلت نہ دی جائے گی جبکہ مقسوم ایک جنس سے ہو یہی کتاب و سنت کی اتباع ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب نے قرعہ اندازی پر عمل کرنے کو رد کر دیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں وارد ہونے والی احادیث کو بھی رد کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ ان کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں اور یہ جوئے کے ان تیروں کے مشابہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اور ابن منذر نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے اسے (قرعہ اندازی کو) جائز قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے: قیاس کے مطابق قرعہ صحیح نہیں ہوتا لیکن ہم نے اس مسئلہ میں قیاس کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ہم نے آثار اور سنت کو پکڑ لیا ہے۔

ابو عبید نے کہا ہے: قرعہ اندازی کے مطابق تین انبیاء نے عمل کیا ہے: مراد حضرت یونس علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام اور ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں..... ابن منذر نے کہا ہے: جو شے شرکاء کے مابین تقسیم کی جاتی ہے اس میں قرعہ اندازی پر عمل کرنا ایسا ہے گویا اس پر اہل علم کا اجماع ہے اور جس نے اس کا رد کیا ہے اس کے قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں۔ امام بخاری نے کتاب الشہادات کے آخر میں یہ عنوان ذکر کیا ہے باب القرعة فی المشكلات وقول اللہ عزوجل، اِذْ يُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے: ”حدود اللہ پر قائم رہنے والے اور ان میں واقع ہونے والے کی مثال اس قوم کی مثل ہے جنہوں نے کشتی پر قرعہ اندازی کی (1)..... الحدیث“ عنقریب اس کا بیان سورۃ الانفال اور سورۃ الزخرف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ام العلاء کی حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون کا حصہ رہائش میں ان کے لئے تقسیم ہو گیا جب انصار نے مہاجرین کی رہائش کے لئے قرعہ اندازی کی (2)، الحدیث۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ

اندازی کرتے اور جس کسی کے نام پر قرعہ نکلتا اسے ساتھ لے جاتے، آگے حدیث ذکر کی۔ (1)

اس بارے میں حضرت امام مالک سے مختلف روایات ہیں۔ آپ نے ایک بار کہا حدیث کی وجہ سے وہ قرعہ اندازی کرے گا اور ایک بار کہا: ازواج میں سے جو سفر میں اس کے موافق ہوگی اسے وہ سفر پر لے جائے گا۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کے اجر و ثواب کو لوگ جانتے ہوتے پھر وہ قرعہ اندازی کے بغیر اس کا موقع نہ پاتے تو یقیناً وہ قرعہ اندازی کرتے (2)۔“ اس بارے میں احادیث کثیر ہیں۔ قرعہ اندازی کی کیفیت اور اختلاف کتب فقہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام اور ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قرعہ اندازی ان میں سے ہے کہ اگر تم اس پر بغیر قرعہ اندازی کے راضی ہو جاؤ تو وہ جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ”یہ ضعیف ہے، کیونکہ قرعہ اندازی کا فائدہ ہی یہ ہے کہ باہم اختلاف اور جھگڑے کی صورت میں کسی مخفی حکم کو نکالنا اور ظاہر کرنا اور رہا وہ حکم جو اس میں رضامندی کے ساتھ نکالا جاتا ہے وہ ایک دوسرا باب ہے۔ اور کسی کے لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قرعہ باہم رضامندی کے محل میں ڈالا جاتا ہے، کیونکہ یہ کبھی بھی باہم رضامندی کے ساتھ نہیں ہوتا۔“ یہ ہوتا ہی ان چیزوں میں ہے جن میں لوگوں کے مابین اختلاف اور جھگڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ بخل کیا جاتا ہے۔

امام شافعی اور جنہوں نے اس کے بارے کہا ہے ان کے نزدیک قرعہ اندازی کا طریقہ یہ ہے کہ کاغذ کے مساوی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں اور ہر ٹکڑے پر حصہ دار کا نام لکھ دیا جائے پھر انہیں مٹی کی ایسی گولیوں میں رکھ دیا جائے جو مساوی ہوں ان میں کوئی تفاوت نہ ہو۔ پھر وہ تھوڑی تھوڑی خشک کر لی جائیں پھر وہ کسی آدمی کے کپڑے میں ڈال دی جائیں جو وہاں حاضر نہ ہو۔ اور انہیں کپڑے سے ڈھانپ دیا جائے پھر وہ اپنا ہاتھ اس میں داخل کرے اور ایک نکال لے اور جس آدمی کا نام لے اسے وہ جز اور حصہ دے دے جس پر قرعہ اندازی کی گئی۔

مسئلہ نمبر 4۔ یہ آیت اس پر بھی دال ہے کہ سوائے دادی کے تمام قرابتداروں کی نسبت خالہ کے لئے حق پرورش زیادہ ہے۔ اور تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے لئے فرمایا تھا اور ان کے نکاح میں ان کی خالہ تھی۔ اور فرمایا: ”بلاشبہ خالہ ماں کے قائم مقام ہے (3)۔“ یہ مسئلہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے (4)۔ انہوں نے بیان فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: اسے میں لوں گا، میں اپنے چچا کی بیٹی کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے پاس ہے اور بلاشبہ خالہ ماں ہی ہوتی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اپنے چچا کی بیٹی کا

2۔ ایضاً حدیث نمبر 2492

1۔ صحیح بخاری، باب القرعة فی المشكلات، حدیث 2491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً کتاب الصلح، حدیث نمبر 2501، ایضاً

4۔ ابی داؤد، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ میرے عقد میں رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید بنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، کیونکہ میں اس کی طرف گیا، میں نے سفر کیا اور اسے ساتھ لے کر آیا۔ پس حضور نبی مکرم ﷺ تشریف لائے اور حدیث ذکر کی فرمایا: ”جہاں تک بچی کا ذکر ہے تو میں حضرت جعفر کے حق میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی بلاشبہ خالہ ماں ہوتی ہے۔“ ابن ابی خيثمہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے وصی تھے۔ پس اس بنا پر خالہ وصی کی نسبت بھی زیادہ حق رکھتی ہے۔ اور چچا کا بیٹا جب خاوند ہو تو وہ خالہ کے حق حضانت کو ختم نہیں کرتا اگرچہ وہ اس کا محرم نہ ہو۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ لِمَرِيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۖ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ ٥١

”جب کہا فرشتوں نے اے مریم! اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے تجھے ایک حکم کی اپنے پاس سے اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا معزز ہوگا دنیا اور آخرت میں اور (اللہ کے) مقربین سے ہوگا۔ اور گفتگو کرے گا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں بھی اور پکی عمر میں بھی اور نیکو کاروں میں سے ہوگا۔“

یہ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کی دلیل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اِذْ يُخَوِّصُونَ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ کے متعلق ہو۔ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ابوالسّمان نے اسے بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ پڑھا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسْمُهُ الْمَسِيحُ اس میں اسْمُہا نہیں فرمایا کیونکہ کلمۃ بمعنی ولد ہے۔ اور مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور اس کا معنی صدیق ہے، حضرت ابراہیم نخعی نے یہی کہا ہے اور یہ معرب الفاظ میں سے ہے۔ اور اس میں اصل شین ہے اور وہ مشترک ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: مسیح کا معنی پسینہ ہے اور المسیح کا معنی الصدیق ہے اور مسیح کا معنی ایسا درہم بھی ہے جس پر نقش مٹا ہوا ہو۔ اور الْمَسْحُ کا معنی جماع ہے۔ کہا جاتا ہے مَسَحَہَا اور الالمسح سے مراد نرم و ملائم جگہ بھی ہے۔ اور المسحاء وہ عورت جس کے کوہو اور ران کمزور ہوں۔ و بفلان مَسْحَةٌ من جمال (فلاں کے پاس انتہائی مضبوط عمدہ اونٹ ہے) اور المسائح انتہائی مضبوط عمدہ اونٹ اس کی واحد مَسِيحَةٌ ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

لَهَا مَسَائِحُ زُورٌ فِي مَرَاكِضِهَا لِيْنٌ وَ لَيْسَ بِهَا وَهْنٌ وَالْأَرْفَقُ

اس میں لفظ مسائح اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور مسیح ابن مریم کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون سے مادہ سے لیا گیا ہے؟ پس کہا گیا ہے: کیونکہ آپ نے زمین میں خوب سیاحت کی اور آپ نے حفاظت کے لئے کوئی گھر نہیں بنایا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ جب کسی کوڑھ زدہ کو پھونک مارتے تھے تو وہ صحت یاب ہو جاتا تھا، تو اسی وجہ سے آپ کا نام مسیح پڑ گیا۔ اس بنا پر یہ فعل بمعنی فاعل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ آپ کو برکت کا تیل لگایا گیا تھا، انبیاء علیہم السلام کو جو تیل لگایا جاتا ہے وہ انتہائی خوشبودار ہوتا ہے، پس جب وہ لگایا جاتا ہے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نبی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے چونکہ ان کے دونوں (پاؤں کے) تلووں کو مس کیا گیا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ”کیونکہ حسن و جمال نے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا اور وہ ان پر ظاہر اور عیاں تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں گناہوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔ اور ابو الہیثم نے کہا ہے: مسیح، مسیح کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے مسحہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی حسین اور مبارک پیدا فرمایا اور مسخہ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی ملعون اور قبیح پیدا کیا۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: المسیح الضدیق یعنی مسیح کا معنی صدیق ہے۔ اور مسیح کا معنی اعدو (کانا) ہے۔ اور دجال کو یہی نام دیا گیا ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: مسیح دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اصل میں مسیح یعنی شین کے ساتھ ہے اور پھر اسے عربی کی طرف منتقل کیا گیا ہے جیسا کہ موشی کو عربی میں موئی بنا دیا گیا ہے اور دجال تو اس کا نام مسیح اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کی ایک آنکھ مسخ کر دی گئی ہے اور دجال کے لئے مسیح میم کے کسرہ اور سین کی شد کے ساتھ کہا گیا ہے اور بعض اسی طرح خانقے والی کے ساتھ کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں مسیح یعنی میم مفتوح ہے خانقے والی ہے اور سین مخفف ہے۔ پہلا زیادہ مشہور ہے اور اکثر کا قول اسی کے مطابق ہے۔ اور اس کا وہ نام اس لئے ہے کیونکہ وہ زمین میں گھومتا پھرتا رہے گا اور سوائے مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور بیت المقدس کے تمام شہروں میں داخل ہوگا اور یہ فعل بمعنی فاعل ہے۔ پس دجال زمین میں فساد برپا کرنے کے لئے چکر لگائے گا، گھومے گا اور ابن مریم علیہ السلام بخشش و عطا کے لئے سیاحت کریں گے۔ اور اس بنا پر کہ اس کی ایک آنکھ بند کر دی گئی ہے فعل بمعنی مفعول ہوگا۔

اور شاعر نے کہا:

إِنَّ الْمَسِيحَ يَقْتُلُ الْمَسِيحَا

بے شک مسیح علیہ السلام مسیح (دجال) کو قتل کر دیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے سوا کوئی شہر نہیں ہے مگر دجال اس میں داخل ہوگا (1)۔“ الحدیث۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے ”سوائے کعبہ اور بیت المقدس کے“ اسے ابو جعفر طبری نے ذکر کیا ہے اور ابو جعفر طحاوی نے ”مسجد طور“ کا اضافہ ذکر کیا ہے اور اسے انہوں نے جنادہ بن ابی امیہ عن بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ وہ ساری زمین پر غالب آجائے گا سوائے حرم پاک اور بیت المقدس کے اور وہ مومنین کو بیت المقدس میں محصور کر دے

گا۔“ اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ”پس ہمارے درمیان وہ اسی طرح ہوگا کہ اچانک اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کو مبعوث فرمائے گا۔ وہ دمشق کے مشرق سے سفید منارہ کے پاس نزول فرمائیں گے اس حال میں کہ وہ ورس اور زعفران سے رنگا ہوا لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور اپنے ہاتھ دو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے ہوں گے جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو اس سے قطرے گریں گے اور جب اسے اٹھائیں گے تو اس سے چاندی کے جے گریں گے جو اپنی ہیئت و شکل میں موتیوں کی مثل ہوں گے۔ پس کسی کافر کے لئے حلال نہ ہوگا کہ وہ آپ کی سانس کی ہوا کو پائے مگر وہ مر جائے گا۔ اور آپ کی سانس کی انتہا وہاں تک ہوگی جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی پس آپ اسے تلاش کریں گے یہاں تک کہ اسے باب لد (لد فسطین میں بیت المقدس کے قریب ایک گاؤں ہے) کے پاس پالیں گے اور اسے قتل کر دیں گے، الحدیث۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے کسی سے مشتق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ نام رکھا ہے، اس بنا پر عیسیٰ مسیح سے بدل کل ہوگا۔ اور عیسیٰ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے وہ غیر منصرف ہے۔ اور اگر آپ اسے عربی قرار دیں تو پھر اس کے غیر منصرف ہونے کے لئے معرفہ یا نکرہ ہونے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث موجود ہے (اور یہ قائم مقام دو سببوں کے ہے) اور یہ مشتق ہوگا عاسہ یعوسہ سے یعنی جب کوئی کسی کے لئے تدبیر اور انتظام کرے اور اس پر ڈٹ جائے اور قائم رہے۔

وَجِيهًا كَامَعْنٰی ہے شریف، صاحب قدر و منزلت اور یہ لفظ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، انخفش نے یہی کہا ہے۔ وَهِنَ الْمُقَرَّبَيْنِ اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقربین میں۔ ہوگا۔ یہ وَجِيهًا پر معطوف ہے یعنی بمعنی مقرب با انخفش نے یہی کہا ہے۔ اور وجیہ کی جمع دُجھاء اور وجہاء ہے۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ اس کا عطف بھی وجیہا پر کیا گیا ہے۔ انخفش نے بھی یہی کہا ہے۔ اور التَّهْدِی سے مراد بچے کی تیر خوار سا۔ یہ م کا بچھونا ہے۔ اور مہدت الأمر کہا جاتا ہے جب تو اسے تیار کرے اور پھر اسے روندے۔ اور قرآن کریم میں ہے: فَلَا نَفْسٍ لَهُمْ يَهْدُوْنَ (الروم) (تو وہ اپنے لئے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں) اور امتہد الشئ کا معنی ہے کسی شے کا اس طرح بلند ہونا جس طرح اونٹ کی کوہان بلند ہوتی ہے۔ وَكَهْلًا، الکھل سے مراد عمر کا وہ حصہ ہے جو بچپن اور شیخوختہ کے میان ہوتا ہے (یعنی پکی عمر) اور امرأة کھلة پکی عمر کی عورت۔ اور اکتھلت الروضة جب باغ میں کلیاں عام ہو جائیں۔ کہتے ہیں کہ آپ گہوارے میں لوگوں سے بطور معجزہ اور علامت کے گفتگو کرتے تھے اور پکی عمر میں وحی اور رسالت کے سبب گفتگو کرتے تھے۔

ابو العباس نے کہا ہے: آپ نے گہوارے میں لوگوں سے اس وقت گفتگو کی جب آپ نے اپنی ماں کی برأت کا اظہار فرمایا اور کہا: اِنِّی عَبْدُ اللّٰهِ الْاَبْدِی۔ اور رہی حالت کہولت کی گفتگو! تو جب اللہ تعالیٰ آپ کو آسمان سے نازل فرمائے گا تو اس وقت آپ کو تینتیس برس کی عمر والی حالت پر نازل فرمائے گا اور یہی کھل کی حالت ہے تو آپ انہیں فرمائیں گے: اِنِّی عَبْدُ اللّٰهِ جیسا کہ آپ نے گہوارے میں کہا تھا۔ پس یہ دونوں معجزے اور دلائل ہیں۔

مہدوی نے کہا ہے: آیت کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمادیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گہوارے میں ان سے گفتگو کریں گے اور کہولت کی حالت میں ان سے گفتگو کرنے تک وہ زندہ رہیں گے، جبکہ عادت یہ ہے کہ جس کسی نے گہوارے میں گفتگو کی وہ زندہ نہیں رہا۔

زجاج نے کہا ہے: وَكَهَلًا بِمَعْنَى وَيَكَلِّمُ النَّاسَ كَهَلًا ہے۔ اور فراء اور اخفش نے کہا ہے: یہ وَجِيهًا پر معطوف ہے۔ اور کہا گیا ہے اس کا معنی ہے اور وہ لوگوں سے صغریٰ اور کہولت کی عمر میں گفتگو کریں گے۔ ابن جرتج نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ الکھل کا معنی حلیم اور بردبار ہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: لغت میں یہ معنی معروف نہیں۔ اہل لغت کے نزدیک الکھل سے مراد چالیس سال کے قریب کی عمر ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: سولہ برس تک کی عمر کو حَدَّث (لڑکپن) کہا جاتا ہے۔ پھر بتیس سال تک جوانی ہوتی ہے۔ اور پھر تینتیسویں سال میں کہولت شروع ہو جاتی ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ وَ مِنَ الصَّالِحِينَ اس کا عطف وَجِيهًا پر کیا گیا ہے یعنی وَهُوَ مِنَ الْعِبَادِ الصَّالِحِينَ۔ (اور وہ نیکو کار بندوں میں سے ہوگا۔) ابوبکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ادریس نے حصین سے اور انہوں نے ہلال بن یساف سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: گہوارے میں تین کے سوا کسی نے گفتگو نہیں کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، صاحب یوسف اور صاحب جرتج۔ اسی طرح کہا او صاحب یوسف۔

اور یہی صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”گہوارے میں سوائے تین کے کسی نے کلام نہیں کیا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور صاحب جرتج اور صاحب الجبار اور یہ اس دوران ہوا جب بچہ اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔“ اور انہوں نے طویل حدیث بیان کی۔ اور حضرت صہیب کی حدیث میں اصحاب اخدود کے واقعہ میں یہ بھی آیا ہے ”کہ ایک عورت کو لایا گیا تا کہ اسے ایمان لانے کی وجہ سے آگ میں ڈال دیا جائے اور اس کے ساتھ ایک (شیر خوار) بچہ بھی تھا۔“ اور مسلم کے علاوہ میں ہے ”وہ شیر خوار تھا تو عورت آگ میں کودنے سے ذرا خوفزدہ ہوئی تو اس بچے نے کہا یا امہ اصبری فانك على الحق اے میری ماں! تو صبر کر (یعنی آگ میں ڈالے جانے سے خوفزدہ نہ ہو) کیونکہ تو ہی حق پر ہے۔“

اور ضحاک نے کہا ہے: گہوارے میں چھ نے کلام کی ہے۔ شاہد یوسف، فرعون کی بیوی کی ماضطہ کا بچہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ، صاحب جرتج اور صاحب جبار اور انہوں نے اخدود کا ذکر نہیں کیا اور انہوں نے صاحب الاخدود کو ساقط کر دیا ہے اور اس سمیت کلام کرنے والے سات ہو جائیں گے۔ اس کے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے درمیان کوئی معارضت نہیں ہے ”کہ گہوارے میں تین کے سوا کسی نے کلام نہیں کیا“ آپ نے کلام حصر کے ساتھ فرمایا۔ کیونکہ آپ نے ان کے بارے خبر دی جن کا علم آپ کو اس وقت بذریعہ وحی عطا فرمایا گیا پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس کے بارے چاہا آپ کو آگاہ فرمایا اور آپ نے اس کے بارے خبر دی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا صاحب یوسف تو اس کے بارے کلام آگے آئے گا۔ اور صاحب جرتج، صاحب الجبار اور

صورت) میں تو وہ فوراً ہو جاتی ہے پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں تندرست کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور (لا علاج) کوڑھی کو اور میں زندہ کرتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور بتلاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان معجزوں میں (میری صداقت کی) بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایماندار ہو۔“

قولہ تعالیٰ: وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْحِيدَ وَالْإِنجِيلَ ابن جریر نے کہا ہے: الكتاب سے مراد کتابت کرنا اور لکھنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد تورات اور انجیل کے علاوہ کوئی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سکھائی۔

وَرَسُولًا (یعنی) اور ہم اسے رسول بنائیں گے یا وہ ان سے رسول کی حیثیت سے ہمکلام ہوگا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ وَجِئًا پر معطوف ہے اور انخفش نے کہا ہے: اگر چاہے تَوْذَرَسُولًا میں واؤ کو مقم بنادے اور رسولاً کو ضمیر سے حال: لے تقدیر کلام ہوگی ویعلمہ الكتاب رسولاً (اور اللہ تعالیٰ اسے کتاب سکھائے گا اس حال میں کہ وہ رسول ہوگا) اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے ”انبیاء بنی اسرائیل میں سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں“ اِنِّیْ اَخْلَقْتُ لَكُمْ یعنی میں تمہارے لئے تصویر اور شکل سی بنا دیتا ہوں۔ مِنَ الطَّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ اعرج اور ابو جعفر نے کہینہ شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے ہمزہ کے ساتھ۔

اور الطیر مذکر و مونث دونوں ہو سکتا ہے۔ فَأَنْفُخُ فِيْهِ اور ان میں سے ایک میں پھونک مارتا ہوں یا کیچڑ میں پھونکتا ہوں تو وہ پرندہ اڑنے والا ہو جائے گا۔ اور طائر اور طیر یہ تاجرا و تجرب کی مثل ہیں۔

وہب نے کہا ہے: وہ اڑتا رہا جب تک لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے اور جب وہ ان کی آنکھوں سے غائب ہو گیا تو مردہ ہو کر گر پڑا کہ مخلوق کا فعل اللہ تعالیٰ کے فعل سے ممتاز ہو جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے چمگاڈ کے سوا کوئی نہیں بنایا کیونکہ خلقت کے اعتبار سے وہ کامل ترین پرندہ ہے تاکہ وہ قدرت میں انتہا کو پہنچ جائے، کیونکہ اس کے پستان بھی ہیں، دانت بھی اور کان بھی ہیں اور اسے حیض بھی آتا ہے، وہ پاک بھی ہوتا ہے اور بچے بھی جنتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: انہوں نے چمگاڈ بنانے کا مطالبہ کیا کیونکہ وہ خلقت میں تمام سے عجیب تر ہے اور اس کے عجائب میں سے یہ ہے کہ اس میں گوشت بھی ہے اور خون بھی، وہ بغیر پروں کے اڑتا ہے اور حیوانوں کی طرح بچوں کو جنم دیتا ہے اور وہ اس طرح انڈے نہیں دیتا جس طرح باقی تمام پرندے انڈے دیتے ہیں، اس کی کھیری ہوتی ہے اور اس سے دودھ نکلتا ہے، وہ نہ دن کی ہشتی میں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی رات کی تاریکی میں، بلکہ وہ صرف دو ساعتوں میں دیکھ سکتا ہے، ایک ساعت سورج غروب ہونے کے بعد اور ایک ساعت طلوع فجر کے بعد اس سے پہلے کہ وہ خوب روشن ہو۔ اور وہ اس طرح ہنستا ہے جس طرح آدمی ہنستا ہے اور اسے اسی طرح حیض آتا ہے جس طرح عورت کو حیض آتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بے شک ان کا آپ سے اس بارے میں سوال کرنا تعنت اور سرکشی کی بنا پر تھا تو انہوں نے کہا: ہمارے لئے

چمگاڑ بناؤ اور اس میں روح ڈال دو اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں، پس آپ نے مٹی لی اور اس سے چمگاڑ بنایا پھر اس میں پھونک ماری تو وہ زمین و آسمان کے درمیان اڑنے لگا، اس میں مٹی اور پھونک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے، جس طرح کہ پھونک جبریل امین علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔

قوله تعالیٰ: وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ۔ الاکمہ وہ جو اندھا اور نابینا پیدا ہوتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور اسی طرح ابو عبیدہ نے کہا ہے: وہ جو اندھا پیدا کیا جاتا ہے اور رویت کے بارے کسی نے کہا:

فَارْتَدَّ ارْتِدَادَ الْأَكْمَه

ابن فارس نے کہا ہے: الاکمہ کا معنی نابینا (یعنی) انسان پیدا ہوتا ہے اس حال میں کہ اسے یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ سوید نے کہا ہے: گنہت عیناہ حتی ایضتا (اس کی آنکھیں اندھی ہیں یہاں تک کہ وہ سفید ہو گئیں)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ جو دن کے وقت تو دیکھتا ہے لیکن رات کے وقت نہیں دیکھ سکتا۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اعمش ہیں، البتہ لغت میں اس کا معنی عمی اندھا پن ہے، کہا جاتا ہے کِمَہ یَکْمَہ کَمَہا اور کَمَہتھا۔ انا کا معنی ہے جب تو اسے اندھا کر دے۔ اور برص تو معروف بیماری ہے یعنی وہ سفید داغ جو ساری جلد پر چھا جاتے ہیں (اور اسے سفید کر دیتے ہیں) اور الابصر کا معنی قمر (چاند) بھی ہے اور سام ابرص (چھپکلی) تو معروف ہے اور اس کی جمع اباریص آتی ہے ان دونوں بیماریوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں عاجز کر دینے والی ہیں (یعنی) ان کا علاج انتہائی مشقت آمیز اور مشکل ہے گویا لا علاج بیماریاں ہیں) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا غلبہ اور دور دورہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسی کی جنس سے انہیں معجزہ دکھا دیا۔

وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے چار آدمیوں کو زندہ کیا: عاذر کو وہ آپ کا دوست تھا، بڑھیا کے بیٹے کو، ابیہ العاشر کو اور سام بن نوح کو۔ فانہ اعلم، پس عاذر نے تو چند دن قبل وفات پائی تھی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی پس وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی چربی ٹپکنے کے قریب ہو گئی پس وہ زندہ رہا اور اس کی اولاد بھی ہوئی۔ اور رہا ابن العجوز! تو آپ اس کے پاس سے گزرے اسے چار پائی پر اٹھایا جا رہا تھا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے پہن لئے اور چار پائی اپنی گردن پر اٹھالی اور اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گیا اور جہاں تک بنت العاشر کا تعلق ہے تو آپ ایک رات اس کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اس کے بعد زندہ ہو گئی اور اس کی اولاد بھی ہوئی، پس جب بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو کہنے لگے: بلاشبہ آپ انہیں زندہ کرتے ہیں جن کی موت قریب قریب واقع ہوئی ہے تو شاید وہ ابھی نہ مرے ہوں بلکہ ان پر سکتہ طاری ہوا ہو، تو آپ ہمارے لئے سام بن نوح کو زندہ کریں۔ تو آپ نے انہیں فرمایا: تم اس کی قبر کے بارے میری راہنمائی کرو۔ چنانچہ آپ نکلے اور آپ کے ساتھ قوم بھی نکلی یہاں تک کہ اس کی قبر کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اپنی قبر سے اس حال میں نکلا کہ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا: تیرا سر کیسے سفید ہو گیا ہے حالانکہ تمہارے زمانے میں بڑھاپا نہیں تھا؟ تو اس نے جواب دیا: اے روح اللہ! بلاشبہ تو نے مجھے بلایا ہے اور میں نے یہ آواز سنی کوئی کہہ رہا ہے: روح اللہ کو جواب دو، تو میں نے یہ گمان کیا کہ

قیامت قائم ہو چکی ہے، پس اس خوف کی وجہ سے میرا سر سفید ہو گیا ہے۔ پھر آپ نے اس سے نزع کے بارے پوچھا، تو اس نے کہا: اے روح اللہ! بلاشبہ نزع کی تلخی میری سانس کی نالی سے (نزرہ سے) ابھی ختم نہیں ہوئی حالانکہ میری موت کے وقت سے (اب تک) چار ہزار برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، پھر اس نے قوم کو کہا: تم ان کی تصدیق کر لو کیونکہ یہ نبی ہیں، تو ان میں سے بعض آپ کے ساتھ ایمان لے آئے اور بعض نے آپ کو جھٹلا دیا۔ اور کہا: یہ سحر ہے۔ اسماعیل بن عیاش کی حدیث سے مروی ہے کہ انہوں نے ذکر کیا مجھے محمد بن طلحہ نے ایک آدمی سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام جب کسی مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو آپ دو رکعت نماز ادا فرماتے پہلی رکعت میں تَبْرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ اور دوسری میں تنزِيل السَّجْدَةِ کی قرأت فرماتے اور جب فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے پھر ان سات اسماء کے وسیلہ سے دعا مانگتے: يَا قَدِيمُ، يَا خَفِيُّ، يَا دَائِمُ، يَا فَرْدُ، يَا دَثَرُ، يَا أَحَدُ، يَا صَمَدُ، اسے علامہ بیہقی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے۔ اس کی اسناد قوی نہیں ہیں۔

قوله تعالى: وَأَنْتُمْ كُنْتُمْ مَيِّتًا تَأْكُلُونَ وَمَاتَ دَخْرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ یعنی میں تمہیں اس کے بارے بتلاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم جمع کر کے رکھتے ہو۔ اور یہ اس لئے ہوا کہ جب آپ نے ان کے لئے مردے زندہ کئے تو انہوں نے آپ سے ایک دوسرے معجزے کا مطالبہ کر دیا اور انہوں نے کہا: آپ ہمیں اس کے بارے بتائیے جو ہم اپنے گھروں میں کھاتے ہیں اور جو آنے والے کل کے لئے جمع کر کے رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے انہیں آگاہ کیا اور فرمایا: اے فلاں! تو نے فلاں چیز کھائی اور تو نے فلاں فلاں چیز جمع کر کے رکھی۔ اسی کے بارے قولہ وَأَنْتُمْ كُنْتُمْ مَيِّتًا ہے۔

مجاہد، زہری اور سختیانی نے ذال معجمہ کے ساتھ و مات دخر و مخفف پڑھا ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: آپ تعلیم گاہ میں بچوں کو ان چیزوں کے بارے بتلاتے تھے جو وہ جمع کر کے رکھ آتے تھے یہاں تک کہ ان کے والدین نے انہیں آپ کے پاس بیٹھنے سے روک دیا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: آپ نے انہیں اس کے بارے بتایا جو وہ دسترخوان سے کھا کر آتے اور جو وہ خفیہ (چھپ کر) اس سے جمع کر آتے تھے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيِّ مِنَ التَّوْرَةِ وَلِأَجْلِ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ
وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝٤٠ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوهُ ۖ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝٤١

”اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب تورات کی اور تاکہ میں حلال کردوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر اور لایا ہوں تمہارے پاس ایک نشانی تمہارے رب کی طرف سے سو، ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے مجھے اور مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے تمہیں، سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔“

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اِسْ كِي جوجھ سے پہلے آئی۔ وَلَا حِلَّ لَكُمْ اِس كِي حذف ہے، اِی وَلَا حِلَّ لَكُمْ جئتكم (اور تا کہ میں تمہارے لئے حلال کر دوں میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں) بَعْضُ الَّذِي حُوتَمَ عَلَيْكُمْ یعنی کھانے کی اشیاء میں سے بعض جو تم پر پہلے حرام کی گئی تھیں۔

کہا گیا ہے: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا جو ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں اور وہ تورات میں نہ تھیں، مثلاً تھوم کھانا اور ہر ناخن والا جانور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا جنہیں ان پر علماء نے حرام کر دیا تھا اور وہ تورات میں ان پر حرام نہ کی گئی تھیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ بعض بمعنی کل ہو۔ اور لبید نے کہا ہے:

تَرَكَ اَمْكِنَةً اِذَا لَمْ اَرْضَهَا اَوْ يَرْتَبِطُ بَعْضُ النُّفُوسِ جِبَامُهَا
اس میں بعض بمعنی کل استعمال ہوا ہے۔

یہ قول اہل لغت میں سے اہل نظر و فکر کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ بعض اور جز اس جگہ پر بمعنی کل نہیں ہو سکتے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کیا جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حرام کیا تھا مثلاً تھوم کھانا وغیرہ۔ اور آپ نے ان کے لئے قتل، چوری اور فحاشی وغیرہ کو حلال نہیں کیا۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی نرمی اور ملائمت کے ساتھ ان کے پاس تشریف لائے ان چیزوں کے بارے میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس لے کر آئے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اونٹوں کی تحریم اور تھوم وغیرہ اشیاء کی تحریم کا حکم لے کر ان کے پاس آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے بعض کی حلت کا حکم لے کر آئے۔

نخعی نے بَعْضُ الَّذِي حُوتَمَ عَلَيْكُمْ پڑھا ہے۔ یعنی یہ کُتَمَ کی مثل ہے بمعنی صَارَ حراماً۔ یعنی وہ حرام ہو گیا کے معنی میں ہے۔ اور کبھی بعض کو بمعنی کل بھی رکھا جاتا ہے جبکہ وہاں ایسا قرینہ متصل ہو جو اس پر دلالت کرے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

اَبَا مِنْذِرٍ اَفْنَيْتَ فَاَسْتَبَقِ بَعْضُنَا حَتَّائِكَ بَعْضُ الشَّاهُونَ مِنْ بَعْضِ
اس میں بعض الشَّاهُونَ سے مراد کل ہے۔ وَجُئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ اس میں آ یہ کو واحد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ آیات ہیں، اس وجہ سے کہ یہ آپ کی رسالت پر دلالت کرنے کے اعتبار سے جنس واحد ہے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ
أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَأَشْهَدُ بِأَنَّ مُسْلِمُونَ ﴿٥٦﴾

”پھر جب محسوس کیا عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کفر (وانکار) (تو) آپ نے کہا: کون ہیں میرے مددگار

اللہ کی راہ میں؟ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی، ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور (اے نبی!) آپ گواہ ہو جائیو کہ ہم (حکم الہی کے سامنے) سر جھکائے ہوئے ہیں۔“

قوله تعالى: فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کفر محسوس کیا۔ آیت میں أَحَسَّ بمعنی عَلِمَ اور وَجَدَ کے ہے (یعنی جانا اور پایا) زجاج نے یہی کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: أَحَسَّ، عَرَفَ (آپ نے پہچانا) کے معنی میں ہے۔ اور اس کا اصل معنی کسی شے کو حاسہ کے ساتھ پانا ہے (وجود الشئ بالحاسة) اور احساس کا معنی کسی شے کو جانا ہے (العلم بالشئ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ تُحِشُّ مِنْهُمْ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَهُمْ (مریم: 98) کیا آپ ان میں سے کسی کو جانتے ہیں؟ اور الحس بمعنی قتل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِذْ تَحْسُونَهُمْ بِإِذْنِهِ (آل عمران: 152) (جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے) اور اسی معنی میں جراد (مکزی) کے بارے میں حدیث بھی ہے إِذَا حَسَّ الْبَرْدُ (جب سردی نے اسے ہلاک کر دیا) مِنْهُمْ الْكُفْرَ یعنی ان کا اللہ کے ساتھ کفر و انکار کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ نے ان سے کلمہ کفر سنا اور فراء نے کہا ہے: انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔

قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ۔ فرمایا: کون ہے وہ جس سے میں ان کے خلاف مدد طلب کروں؟ سدی اور ثوری وغیرہ مانے کہا: یہاں إِلَى اللَّهِ بمعنی مع اللہ ہے یعنی الی بمعنی مع ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَى أَنْفُسِهِمْ یعنی مع اموالکم۔ (یعنی تم اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال نہ کھاؤ۔) واللہ اعلم۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے مَنْ أَنْصَارِي فِي السَّبِيلِ إِلَى اللَّهِ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کون میرے مددگار ہیں؟) کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے کون ہے جو اپنی نصرت اور مدد کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کے ساتھ ملائے گا؟ ان دونوں قولوں کے مطابق الی اپنے اصل معنی پر ہے اور یہی جید اور عمدہ ہے۔ اور آپ نے نصرت اور مدد طلب کی تاکہ اس کے سبب آپ اپنی قوم سے حفاظت میں رہیں اور اعلانیہ دعوت دے سکیں، حسن اور مجاہد سے یہ معنی منقول ہے۔ اور انبیاء و اولیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقہ یہی ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةٌ أَذْأُوتِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۖ (ہود) (اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلے کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی) یعنی خاندان اور اصحاب میری مدد کرتے۔ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ حَوَارِيُّونَ نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کے دین کے مددگار ہیں۔ اور حواریوں سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب ہیں اور وہ بارہ آدمی تھے، کلیبی اور ابوروق نے یہی کہا ہے۔

ان کا یہ نام رکھنے میں اختلاف ہے، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے سفید کپڑوں کی وجہ سے انہیں یہ نام دیا گیا، وہ صیادین (شکاری) تھے۔ ابن ابی نجیح اور ابن ارقطاع نے کہا ہے: وہ دھوبی تھے۔ تو انہیں یہ نام کپڑے خوب صاف کرنے کی وجہ سے دیا گیا۔ حضرت عطاء نے کہا ہے: حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو متفرق عمال کے سپرد کیا اور سب سے آخر میں آپ نے انہیں حواریوں کے حوالے کر دیا اور وہ دھوبی اور رنگساز تھے، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معلم نے

سفر کا ارادہ کیا، تو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا: میرے پاس مختلف رنگوں کے بہت سے کپڑے ہیں اور میں نے تمہیں رنگ کہنا سکھا دیا ہے پس تم انہیں رنگ دینا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک منکا رنگ پکایا اور اس میں تمام کپڑے ڈال دیئے اور کہا: تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسی طرح ہو جا جو میں تجھ سے ارادہ رکھتا ہوں۔ پس حواری آیا اور سارے کپڑے منکے میں پڑے ہوئے تھے۔ جب اس نے انہیں دیکھا تو کہا: تو نے انہیں خراب کر دیا ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سرخ، زرد اور سبز اور دیگر ان رنگوں میں کپڑے نکالے جو رنگ ان میں سے ہر کپڑے پر لکھا ہوا تھا، یہ دیکھ کر حواری بہت متعجب ہوا اور اس نے جان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس نے لوگوں کو آپ کی طرف بلایا پس وہ آپ کے ساتھ ایمان لائے اور وہی حواری تھے۔ حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا ہے: انہیں یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ وہ انبیاء علیہ السلام کے ساتھ خاص تھے اور وہ اس سے اپنے دلوں کی صفائی اور طہارت کا ارادہ رکھتے تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ بادشاہ تھے، اس طرح کہ بادشاہ نے کھانے کی دعوت کی اور لوگوں کو اس پر بلایا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے جو پیالہ تھا وہ ذرا کم نہ ہوا تو بادشاہ نے آپ کو کہا: آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، تو اس نے کہا میں اپنی یہ سلطنت چھوڑتا ہوں اور تمہاری اتباع کرتا ہوں۔ پس وہ اپنے قبیعین کو ساتھ لے کر آپ کے ساتھ چل پڑا، تو وہی حواری ہیں، یہ ابن عون نے کہا ہے۔ لغت میں الحَوْر کا اصل معنی سفیدی ہے اور حَوْرَت الشیاب کا معنی ہے میں نے کپڑے کو خوب صاف کیا، سفید کیا اور الحَوْرَی من الطعام ما حَوْرَ یعنی جو کھانا خوب اچھی طرح پکایا جائے۔ اور احْوَز کا معنی ابیض (سفید ہونا) ہے۔ اور الجفنة المحورة: سفید چمڑے سے بنی ہوئی نیام اور الحواری کا معنی مددگار بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لکل نبی حواری و حواری الزبیر (1) (ہر نبی کا حواری (مددگار) ہے اور میرا حواری زبیر ہے) اور الحواریات سفید عورتیں۔

اور کسی نے کہا:

فقل للحواریات یبکین غیرونا ولا تبکنا الا الکلاب النوابغ

پس تو ان سفید عورتوں سے کہہ دے وہ ہمارے سوا اوروں پر روئیں اور ہم پر نہ روئیں گے مگر بھونکنے والے کتے۔

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أُنزِلَتْ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿۵۷﴾

”اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا اور ہم نے تابعداری کی رسول کی، تو لکھ لے

ہمیں (حق پر) گواہی دینے والوں کے ساتھ۔“

قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أُنزِلَتْ یعنی وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے بِمَا أُنزِلَتْ یعنی اس کے ساتھ جو تو نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا اور اس پر جو تو نے اپنے حکم میں سے ظاہر اور بیان کیا۔ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ رسول سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ شاہدین سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے، یہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور معنی یہ ہے ہمارے اسماء ان کے اسماء کے ساتھ لکھ لے اور ہمیں من جملہ ان میں سے بنادے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے ہمیں ان کے ساتھ لکھ لے جنہوں نے تیرے انبیاء علیہم السلام کی صدق و سچائی کے ساتھ شہادت دی۔

وَمَكْرُؤًا مَّكَرَ اللَّهِ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِيْنَ ﴿٥٦﴾

”اور یہودیوں نے بھی (سیح قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (سیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر (اور موثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَمَكْرُؤًا مَّكَرَ اللَّهِ اسرائیل کے وہ کفار ہیں جن سے آپ نے کفر محسوس کیا یعنی آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب ان کی قوم اور ان کی ماں نے اپنے درمیان سے نکال دیا تو آپ حواریوں کے ساتھ ان کی طرف لوٹ کر آئے اور ان میں اعلانیہ دعوت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا، تو انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ بنایا اور انہوں نے آپ کے قتل پر اتفاق کیا، پس یہی ان کا مکر اور خفیہ تدبیر ہے۔ اور مَّكَرَ اللَّهِ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لئے ایسی خفیہ تدبیر کرنا ہے جسے وہ نہ جانتے ہوں، فراء وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب بھی انہوں نے کوئی گناہ اور غلطی کی تو ہم نے انہیں ایک تازہ اور اچھی نعمت عطا کر دی۔

اور زجاج نے کہا ہے: مَّكَرَ اللَّهِ سے مراد انہیں ان کی خفیہ تدبیر پر جزا اور بدلہ دینا ہے، پس جزا اور بدلے کو ابتدا کا نام دیا گیا ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: اللَّهُ يُسْتَهْزِئُ بِهِمْ اور وَهُوَ خَادِعُهُمْ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لغت میں مکر کا اصل معنی حیلہ کرنا اور دھوکہ دینا ہے۔ اور مکر کا معنی خدالۃ الساق (پنڈلی کا بھر جانا) ہے اور امراۃ مبکورة الساقین (ایسی عورت جس کی دونوں پنڈلیاں گول اور بھری ہوئی ہوں) اور مکر کپڑوں کی ایک قسم بھی ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بلکہ اس سے مراد گیر و اور سرخ منی ہے، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَّكَرَ اللَّهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ کو دوسروں کے سامنے کر دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف سے اٹھالیا اور وہ اس طرح ہوا کہ یہودی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تو آپ ان سے بھاگ کر گھر میں داخل ہوئے تو حضرت جبرائیل امین نے آپ کو روشن دان سے آسمان کی طرف اٹھالیا، تو ان کے بادشاہ نے ان میں سے ایک خبیث آدمی کو کہا اسے یہود اکھا جاتا تھا: تو ان پر داخل ہو اور انہیں قتل کر دے، پس وہ روشن دان سے اندر داخل ہوا لیکن وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ مشابہ بنادیا، پس جب وہ نکلا تو انہوں نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ دیکھا چنانچہ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا اور پھر اسے سولی دے دی۔ بعد ازاں انہوں نے کہا: اس کا چہرہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چہرہ سے مشابہت رکھتا ہے اور اس کا بدن ہمارے اپنے ساتھی کے بدن سے مشابہ ہے، پس اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں! اور اگر یہ عیسیٰ ہیں تو پھر ہمارا ساتھی کہاں ہے؟ پھر ان کے درمیان جنگ

اٹھانے والا ہوں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: توفیت مالی من فلان یعنی میں نے فلاں سے اپنا مال قبضے میں لے لیا۔ اور وہب بن جبہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دن کی تین ساعتوں کے لئے موت دی اور پھر انہیں آسمان کی طرف اٹھالیا۔ لیکن یہ قول بعید از حقیقت ہے۔ کیونکہ آپ کے آسمان سے اترنے اور دجال کو قتل کرنے کے بارے میں حضور نبی مکرم ﷺ سے صحیح احادیث مروی ہیں، جیسا کہ ہم نے اسے ”کتاب التذکرہ“ میں بیان کیا ہے اور اس کتاب میں بھی کچھ گزر چکا ہے اور کچھ آگے آئے گا۔

اور ابن زید نے کہا ہے: متوفیک بمعنی قابضک (میں تجھے قبضہ میں لینے والا ہوں) ہے اور متوفیک اور رافعک ایک ہی ہے اور اس کے بعد موت نہیں ہے۔

ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ متوفیک کا معنی مسیتک ہے (یعنی میں تجھے موت دینے والا ہوں) حضرت ربیع بن انس نے کہا ہے کہ اس سے مراد نیند کی موت ہے، (جیسا کہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وهو الذی یتوفی فاکم باللیل یعنی تمہیں رات کے وقت سلا دیتا ہے کیونکہ نیند اخو الموت ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب آپ سے پوچھا گیا کیا جنت میں نیند ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، نیند اخو الموت ہے اور جنت میں کوئی موت نہیں، اسے دارقطنی نے بیان کیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر وفات اور بغیر نیند کے آسمان کی طرف اٹھالیا، جیسا کہ حسن اور ابن زید نے کہا ہے اور اسے ہی طبری نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت ہے۔ اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔ ضحاک نے کہا ہے: واقعہ یہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، حواری ایک کمرے میں جمع ہوئے اور وہ بارہ آدمی تھے تو حضرت مسیح علیہ السلام کمرے کے طاق سے ان پر داخل ہوئے تو ابلیس نے یہود کی جماعت کو اس سے آگاہ کر دیا، چنانچہ ان میں سے چار ہزار آدمی سوار ہو کر آئے اور انہوں نے کمرے کے دروازہ کو گھیر لیا، تو حضرت مسیح نے حواریوں کو کہا: تم میں سے کون ہے جو نکلے گا اور اسے قتل کر دیا جائے گا اور وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا؟ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں، پس آپ نے اون سے بنا ہوا ایک جبہ اور ایک عمامہ اس کی طرف پھینکا اور اسے اپنا نیزہ (مراد ایسا ڈنڈا جس کے نیچے پھل لگا ہوا ہو) بھی عطا فرمایا اور اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنادیا گیا، وہ یہود کی طرف نکلا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور اسے سولی دے دی اور رہے حضرت مسیح علیہ السلام! تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پر عطا فرمائے اور انہیں نور کا لباس پہنادیا اور ان سے کھانے پینے کی لذت منقطع کر دی تو وہ ملائکہ کے ساتھ اڑ گئے۔

ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اعمش نے منہال سے، انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو وہ اپنے اصحاب کی طرف نکلے وہ بارہ آدمی تھے، ایک معین کمرے میں جمع تھے اور آپ کے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے تو آپ نے انہیں کہا: خبردار! بلاشبہ تم میں سے وہ ہے جو عنقریب میرے بارے میں بارہ

مرتبہ انکار کرے گا اس کے بعد کہ وہ میرے ساتھ ایمان لا چکا ہے، پھر آپ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جس پر میری شبیہ ڈال دی جائے پھر وہ میری جگہ قتل کر دیا جائے تو وہ میرے درجہ میں میرے ساتھ ہوگا؟ تو ان کے جوانوں میں سے ایک جوان اٹھا اور اس نے کہا میں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو بیٹھ جا، پھر آپ نے دوبارہ بات کی تو وہی جوان اٹھا اور اس نے کہا: میں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو بیٹھ جا۔ آپ نے پھر اپنی بات کی تو وہی جوان پھر اٹھا اور اس نے کہا: میں، تو اب کی بار آپ نے فرمایا: ہاں تو ہی وہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پرتاؤ ڈال دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس سوراخ سے اوپر اٹھالیا جو گھر میں آسمان کی طرف تھا۔ راوی نے بیان کیا: اور پھر تلاش کرنے والے یہودی آئے اور انہوں نے اس مشابہ شخص کو پکڑ لیا اور اسے قتل کر دیا اور پھر اسے سولی پر لٹکا دیا اور ان میں سے بعض نے آپ کا بارہ مرتبہ انکار کیا بعد اس کے کہ وہ آپ کے ساتھ ایمان لا چکے تھے، پس اس طرح وہ تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقے نے کہا: ہم میں اللہ تعالیٰ رہا جب تک اس نے چاہا پھر وہ آسمان کی طرف بلند ہو گیا اور وہ یعقوبیہ ہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا: ہم میں ابن اللہ رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا اور یہ نسطوریہ ہیں۔ اور ایک فرقے نے کہا: ہم میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اور پھر اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور یہ مسلمان ہیں۔ پھر دونوں کافر گروہ مسلمان گروہ پر غالب آ گئے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ پھر اسلام مسلسل متا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو وہ قتل کر دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی

فَاصْنَتْ طَآئِفَةٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَآءِيلَ وَكَفَرْتُ طَآئِفَةٌ ۚ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا (الصّف: 14) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے آباء ایمان لائے علیٰ عَدُوِّهِمْ یعنی ہم نے اہل ایمان کے دین کو کفار کے دین پر غلبہ دینے میں ان کی تائید کی فَاصْبَحُوا ظَاهِرِينَ پس وہ غالب ہو گئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قسم بخدا! ابن مریم عادل حکمران کی حیثیت سے ضرور نازل ہوں گے وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور خنزیر کو ضرور قتل کریں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے اور جوان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور ان پر کوئی کام نہ کیا جائے گا اور کینہ، باہم ایک دوسرے سے بغض رکھنا اور باہمی حسد سب ختم ہو جائے گا اور آپ مال کی طرف دعوت دیں گے اور کوئی اسے قبول نہ کرے گا۔“

اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! ابن مریم کو (مکہ اور مدینہ کے درمیان) روحاء کے راستہ پر ڈالا جائے گا حج کے لئے یا عمرہ کرنے کے لئے یا اس لئے تاکہ وہ دونوں کو ایک ساتھ کریں۔“

وہ کسی نئی شریعت کے ساتھ نزول نہیں فرمائیں گے کہ اس سے ہماری شریعت منسوخ ہو جائے بلکہ وہ ان امور کی تجدید کے لئے نازل ہوں گے جو اس شریعت کے قبیحین نے اس سے بوسیدہ کر دیئے ہیں اور مٹا ڈالے ہیں۔ اسی طرح صحیح مسلم میں

1۔ بخاری، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام، حدیث نمبر 3192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم کیسی (شان سے) ہو گے جب ابن مریم تم میں نزول فرمائیں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا“ اور ایک روایت میں الفاظ فامکم منکم ہیں۔ ابن ابی ذئب نے کہا: تم جانتے ہو تم میں سے امکم کیا ہے؟ میں نے کہا: آپ ہی مجھے بتائیے۔ تو انہوں نے کہا: پس تمہاری اصل (فامکم) تمہارے رب تبارک و تعالیٰ کی کتاب ہے اور تمہارے نبی ﷺ کی سنت ہے (1)۔ ہم نے ”کتاب التذکرہ“ میں اس بارے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ والحمد للہ۔

اور مُتَوَفِّيكَ اصل میں مُتَوَفِّيكَ ہے اور ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور یہ ان کی خبر ہے اور وَرَافِعُكَ اس پر معطوف ہے، اور اسی طرح مُطَهَّرُكَ اور وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ بھی ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے (اے محمد ﷺ) آپ کی اتباع کی۔ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا ابست اور قیام دلیل کے ساتھ غالب ان پر جنہوں نے کفر کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے: بالعز والغلبة۔ یعنی عزت اور غلبے کے ساتھ کفر کرنے والوں پر غالب۔ اور ضحاک اور محمد ابن ابان نے کہا ہے: مراد حواری ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَاَعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ⑤ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ⑥ ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ⑦

”تو وہ جنہوں نے کفر کیا میں عذاب دوں گا انہیں سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہوگا ان کے لئے کوئی مددگار۔ اور وہ جو ایمان لائے اور کئے نیک کام تو اللہ پورے پورے دے گا انہیں ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظالم کرنے والوں سے۔ یہ جو ہم پڑھ کر سنا رہے ہیں آپ کو آیتیں ہیں اور نصیحت حکمت والی۔“

قولہ تعالیٰ: فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَاَعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ یعنی میں انہیں دنیا میں قتل، سولی، قید اور جزیہ کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے ساتھ سخت عذاب دوں گا۔

ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ، ذَلِكَ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور اس کی خبر نَتْلُوهُ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الامر ذالک ہو یعنی مبتدا مضر ہو۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ⑧
الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ⑨

”بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے،

1۔ صحیح بخاری، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام، حدیث نمبر 3193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پھر فرمایا اسے ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (اے سننے والے) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے پس تو نہ ہو جا شک کرنے والوں سے۔“

قولہ تعالیٰ: اِنَّ مَثَلَ عِيسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ یہ آیت قیاس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ اور تشبیہ اس بناء پر واقع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آدم علیہ السلام کی طرح بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہے، اس بنا پر نہیں ہے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور ایک شے دوسری شے کے مشابہ ہوتی ہے جب وہ دونوں ایک وصف میں جمع ہوں اگرچہ فی الحقیقت دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہو، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق فرمایا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو مٹی سے پیدا نہیں کیا گیا پس اس جہت سے دونوں کے درمیان فرق ہے لیکن جس شے میں دونوں کو تشبیہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا ہے اور اس لئے بھی کہ دونوں کی خلقت کی اصل مٹی سے ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام بھی نفس مٹی سے پیدا نہیں کئے گئے، بلکہ مٹی کو کیچڑ بنایا پھر اسے صلصال (سوکھی ہوئی بجنے والی مٹی) بنایا پھر اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا، تو اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرا، پھر آپ کو بغیر باپ کے بشر بنایا۔

اور یہ آیت وفد نجران کے سبب نازل ہوئی جبکہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے اس قول کی وجہ سے انکار کیا: ان عیسیٰ عبد اللہ و کلمتہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کا کلمہ ہیں۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں کوئی بندہ دکھائیں جو بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہو، تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”آدم علیہ السلام جو ان کے باپ تھے وہ عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تمہارے لئے تعجب خیز ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا صرف باپ نہیں لیکن آدم علیہ السلام کا نہ باپ ہے اور نہ ہی ماں“ اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَأْتِيَنَّكَ بِشَيْءٍ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (وہ آپ کے پاس کوئی مثال نہیں لائیں گے) اِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ (مگر ہم آدم علیہ السلام کے بارے میں آپ کے پاس حق لے کر آئے)۔ وَ اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (اور کتنی اچھی تفسیر بیان کی) اور روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ہم تم سے پہلے مسلمان تھے، تو آپ نے فرمایا: ”تم نے جھوٹ بولا ہے تین چیزیں تمہیں اسلام سے روک رہی ہیں۔ ایک تمہارا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) اور دوسرا تمہارا خنزیر کھانا اور تیسرا تمہارا صلیب کو سجدہ کرنا۔“ تو انہوں نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ مَثَلَ عِيسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۱۰ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۱۱ فَمَنْ حَا جَكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اٰهْنَاءَ نَا وَاٰهْنَاءَ كُمْ وَنِسَاءَ نَا وَنِسَاءَ كُمْ وَانْفُسَا وَاَنْفُسَكُمْ ۚ ثُمَّ تَبَيَّنْ لَهُمْ فَنَجَعْلُ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلٰی الْكَافِرِيْنَ ۝۱۲ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بلایا، تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی۔ تب انہوں نے کہا: کیا اس کے سوا بھی کوئی شے آپ ہم پر پیش فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسلام یا جزیہ یا جنگ تو انہوں نے ان میں سے جزیہ کا اقرار کیا اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور قول باری تعالیٰ اَدَمَ پر کلام مکمل ہو گیا۔

پھر فرمایا: خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ یہ بمعنی فَكَانَ ہے۔ جب معنی معلوم اور معروف ہو تو مستقبل ماضی کے محل میں واقع ہو سکتا ہے۔

فراء نے کہا: الْحَقُّ مِنْ تَرَاتُكُ یہ مرفوع ہے اور اس سے پہلے ہو مبتدا مضمّر ہے۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کی خبر مِنْ تَرَاتُكُ کے قول میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الحق فاعل ہے یعنی جاءت الحق۔

فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُنْتَرَيْنِ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے قطعاً شک کرنے والے نہیں۔

فَمَنْ حَا جَكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا
وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ
اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ①

”پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس بارے میں اس کے بعد کہ آگیا آپ کے پاس (یقینی) علم تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی، پھر برسا عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر۔“
اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ حَا جَكَ فِيهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جو شخص آپ سے جھگڑا کرے فیہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اس کے بعد کہ آپ کے پاس اس بارے میں یقینی علم آگیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فَقُلْ تَعَالَوْا یعنی اقبلوا ہے، تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ۔ یہ لفظ وضع تو اس کے لئے کیا گیا ہے جس کی کوئی قدر و منزلت اور رفعت و شان ہو اور پھر ہر آنے اور متوجہ ہونے کی دعوت دینے والے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس کا مزید بیان سورۃ الانعام میں آئے گا۔ نَدْعُ یہ محل جزم میں ہے أَبْنَاءَنَا یہ اس پر دلیل ہے کہ بیٹوں کے بیٹوں کو ابنا کا نام دیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم امام حسن، امام حسین رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر آئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما رہے تھے: ”اگر میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔“ اور یہی اس ارشاد کا معنی ہے ثُمَّ نَبْتَهِلْ یعنی ہم دعا میں انتہائی عجز و انکساری اختیار کریں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ ابو عبیدہ اور کسائی نے کہا ہے کہ نبتہل بمعنی نلتعن ہے اور ابنتہال کا اصل معنی یہی ہے کہ دعا میں لعن وغیرہ کے ساتھ انتہائی کوشش کرنا۔
لبید نے کہا ہے:

فی کھول سادۃ من قومہ نظر الدھر الیہم فابتہل

یعنی زمانے نے انہیں ہلاک کرنے میں پوری کوشش کی۔

کہا جاتا ہے: بھلہ اللہ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی۔ اور البھل کا معنی لعن ہے۔ اور البھل کا معنی ماء قلیل (تھوڑا پانی) بھی ہے اور ابھلتہ تب کہا جاتا ہے جب تو اسے اور اس کے ارادہ کو چھوڑ دے۔ اور بھلتہ کا بھی یہی معنی ہے۔ اور ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے: بھلہ اللہ یہ بھلہ بھلہ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اہل نجران تھے: ان کے رؤساء میں قابل ذکر، عاقب اور ابن حارث تھے۔ فَجَعَلَ لَعْنَتُ اللَّهِ عَلَى الْكُذِّبَيْنِ (پھر ہم جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجیں)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامت میں سے ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی اور انہوں نے اس سے انکار کیا اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے اس کے بعد کہ ان کے بڑے سردار عاقب نے انہیں بتایا کہ اگر انہوں نے آپ سے مباہلہ کیا تو پھر ان پر یہ وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی، کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں، اور تحقیق تم جانتے ہو کہ وہ تمہارے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفصیل لے کر آئے ہیں، تو انہوں نے مباہلہ ترک کر دیا اور اپنے شہروں کی طرف واپس چلے گئے اس شرط پر کہ وہ ہر سال ایک ہزار حلہ صفر کے مہینہ میں اور ایک ہزار حلہ رجب کے مہینہ میں ادا کریں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے بدلے اسی پر ان سے صلح کر لی۔

مسئلہ نمبر 3۔ بہت سے علماء نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مباہلہ کے وقت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ قول نَدْعُ أَهْنَاءَ نَاوْ أَهْنَاءَ کُمْ اور امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ کا یہ ارشاد اِنْ اِبْنِيْ هَذَا سَيِّدٌ (1) امام حسن و حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص ہے کہ ان دونوں کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہونے کا نام دیا گیا، ان کے سوا کسی کے لئے یہ حکم نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "قیامت کے دن ہر سبب و نسب کٹ جائے گا سوائے میرے نسب و سبب کے" اسی لئے بعض اصحاب شافعی نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس نے فلاں کے بیٹے کے لئے وصیت کی اور اس کا صلیبی بیٹا نہ تھا اور اس کے بیٹے کا بیٹا اور بیٹی کا بیٹا تھا، بلاشبہ وہ وصیت بیٹے کے بیٹے کے لئے ہوگی نہ بیٹی کے بیٹے کے لئے اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ اس کے بارے میں مزید بیان سورۃ الانعام اور ارحرف میں آئے گا ان شاء اللہ۔

اِنَّ هٰذَا لَهٗوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهٗوَ الْعَزِیْزُ

الْحَكِیْمُ ۝ فَانْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ ۝

"بے شک یہی ہے واقعہ سچا اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور بے شک اللہ ہی غالب ہے (اور) حکمت والا

ہے۔ پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ خوب جانتے والا ہے فسار پر پا کرنے والوں کو۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰذَا لَهٗوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ قول باری تعالیٰ اِنَّ هٰذَا میں اشارہ قرآن اور اس میں موجود قصص کی طرف ہے، انہیں قصص کا نام دیا گیا ہے کیونکہ ان میں معانی تسلسل کے ساتھ ہوتے ہیں اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، حدیث نمبر 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فلان یقص أثر فلان یعنی فلاں فلاں کی اتباع میں آرہا ہے۔

وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ اس میں مِنْ زائدہ تاکید کے لئے ہے اور معنی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الہ (معبود) نہیں (وما الہ الا اللہ) الْعَزِيزُ یعنی وہ جو مغلوب نہیں ہوتا۔ الْحَكِيمُ اس کا معنی ہے صاحب حکمت اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔ والحمد لله۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۱۰﴾

”(میرے نبی!) آپ کہئے اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو یکساں ہے ہمارے اور تمہارے درمیان (وہ یہ کہ) ہم نہ عبادت کریں (کسی کی) سوائے اللہ کے اور نہ شریک ٹھہرائیں اس کے ساتھ کسی چیز کو اور نہ بنا لے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا پھر اگر وہ روگردانی کریں (اس سے) تو تم کہہ دو گواہ رہنا (اے اہل کتاب) کہ ہم مسلمان ہیں۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ حسن، ابن زید اور سدی کے قول کے مطابق یہ خطاب اہل نجران کو ہے اور قتادہ اور ابن جریج وغیرہما کے قول کے مطابق خطاب مدینہ کے یہودیوں کو ہے، انہیں اس لئے خطاب کیا گیا کیونکہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی اطاعت و پیروی کرنے میں رب کی طرح بنا رکھا تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ تمام کے لئے ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قل کی طرف جو گرامی نامہ تحریر فرمایا اس میں ہے۔ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ... من محمد رسول الله اني هرقل عظيم الروم سلام على من اتبع الهدى [اما بعد فاني ادعوك بدعاة الاسلام] اسلم تسلمه [واسلمه] يؤت الله اجر من اتبع الهدى فان توليت فان عديت اثم الاريسين، ويا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم ان لا نعبد الا الله... الى قوله: فقولوا اشهدوا باننا مسلمون۔ (1)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ... (یہ خط) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شاہ روم ہرقل کی طرف ہے اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کی اتباع اور پیروی کی [اما بعد میں تجھے دعوت اسلام دیتا ہوں] تو اسلام قبول کر لے محفوظ ہو جائے گا [اور تو اسلام لے آ] اللہ تعالیٰ تجھے دوبارہ جہنم فرمائے گا اور اگر تو نے اعراض یہ تو تجھ پر اپنے جملہ لواحقین و تبعین کا کناہ ہوگا اور اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ تا قولہ ”تو تم کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں“ یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔

السواء کا معنی عدل اور نصف و نصف ہے، قتادہ نے یہی کہا ہے۔

اور زبیر نے کہا ہے:

أَرُونِي خُطَّةً لَا ضَمِيمَ فِيهَا يُسْوَى بَيْنَنَا فِيهَا السَّوَاءُ

مجھے کوئی ایسا کام دکھاؤ جس میں ظلم نہ ہو اور اس میں ہمارے درمیان عدل کیا جاتا ہو۔

فراء نے کہا ہے: عدل کے معنی ادا کرنے کے لئے سَوَّى اور سَوَّى کہا جاتا ہے، پس جب تو سین کو فتح دے گا تو اسے مد کے ساتھ پڑھے گا اور جب تو سین پر کسرہ یا ضمہ پڑھے گا تو اسے قصر کے ساتھ پڑھے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَكَانًا سَوَّى فرمایا: اور حضرت عبد اللہ کی قرأت میں ہے الی کلمۃ عدل بیننا و بینکم اور قنبل (ابو السمال العدوی) نے کلمۃ لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے لام کی حرکت کاف کو دے دی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: کَبَد پس معنی یہ ہے تم اسے قبول کرو جس کی طرف تمہیں دعوت دی گئی ہے اور وہی وہ کلمہ عادلہ مستقیمہ ہے جس میں حق سے کہیں اور ذرا میلان اور جھکاؤ نہیں اور اس کی تفسیر اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ کی ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ اس میں اَنْ، کلمۃ سے بدل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے یا مبتدا مضمّر ہونے کی بنا پر یہ محل رفع میں ہے، تقدیر کلام یہ ہے اَنْ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ۔ یا پھر یہ اَنْ مفسرہ ہے اور اس کا کوئی محل نہیں، اور اس کے ساتھ نَعْبُدُ اور جو اس پر معطوف ہے اس پر رفع اور جزم دونوں جائز ہیں: پس جزم اس بنا پر کہ اَنْ مفسرہ بمعنی ای ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنْ اَمْسُوْا اور لا جازمہ ہو۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور اس بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ نَعْبُدُ کو رفع دیا جائے اور یہ اور اس کا مابعد خبر ہو۔ اور بمعنی اَنْ لَا نَعْبُدُ رفع دینا جائز ہے اور اس کی مثل یہ ارشاد ہے اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۚ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ صَرًا وَلَا نَفْعًا ﴿٥﴾ (طہ) کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا)

اور کسائی اور فراء نے کہا ہے: وَلَا تُشْرِكْ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ یعنی یہ جزم کے ساتھ ہیں اس وہم کی بنا پر کہ اول کلام میں اَنْ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَتَّخِذُ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ یعنی ہم کسی شے کو حلال کرنے یا اسے حرام کرنے میں اس کی اتباع اور پیروی نہ کریں گے مگر اسی میں جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اتخذوا احبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی حرام کردہ اور حلال کردہ چیزوں کو قبول کرنے میں اپنے رب کے رتبہ اور درجہ میں رکھا ان چیزوں کے بارے میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نہ حرام کیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حلال کیا۔

اور یہ ایسے استحسان کے بارے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے جس کا انحصار کسی دلیل شرعی پر نہ ہو، الکیا الطبری نے کہا ہے: مثلاً امام اعظم ابو حنیفہ کے وہ استحسانات جو ان اندازوں اور تقدیرات کے بارے ہیں جو انہوں نے بذات خود بغیر واضح دلائل کے مقرر کئے۔ اور اس میں ان رد و افض کا بھی رد ہے جو یہ کہتے ہیں: دلیل شرعی کا سہارا لئے بغیر بھی امام کا قول قبول کرنا واجب ہے اور یہ کہ وہ اسے حلال کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو بغیر اس کے کہ وہ کوئی مستند دلیل شرعی بیان کرے۔ ارہاب رب کی جمع ہے اور یہاں دُون بمعنی غیر ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **فَإِنْ تَوَلَّوْا** یعنی اگر وہ اس سے اعراض کر لیں جس کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے۔ **فَقُولُوا** اَشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ تو تم کہہ دو گواہ رہنا ہم دین اسلام کے ساتھ متصف ہیں، اس کے احکام کی پیروی کرنے والے ہیں اور ہم ان احسانات اور انعامات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہم پر ہیں۔ ہم کسی کو رب بنانے والے نہیں ہیں نہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ عزیر علیہ السلام کو اور نہ ہی ملائکہ کو، کیونکہ وہ ہماری مثل بشر ہیں وہ ہمارے حدود کی طرح حادث ہیں۔ اور راہبوں سے کسی ایسی شے کو قبول نہیں کریں گے جسے انہوں نے ہم پر حرام کیا ہو جب تک اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر حرام نہ کیا ہو، کہ ہم انہیں رب بنا لیں۔ اور مکرّمہ نے کہا ہے: **يَتَّخِذُ** بمعنی یسجد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ تک سجدہ (تعظیمی) جائز تھا پھر حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت معاذ بنی بنی کو منع فرما دیا جب انہوں نے سجدہ کرنے کا ارادہ کیا، جیسا کہ سورہ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا ہمارے بعض بعض کے لئے جھک سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ”نہیں“ پھر ہم نے عرض کی: کیا ہم آپس میں ایک دوسرے سے معاف کر سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں البتہ تم ایک دوسرے سے مصافحہ کرو“ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے (1)۔ اس بارے میں مزید بیان سورہ یوسف میں آئے گا اور سورہ واقعہ میں کہ قرآن یا اس کے جز کو بغیر طہارت کے چھونا کیسا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ

بَعْدِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

”اے اہل کتاب! کیوں جھگڑتے ہو تم ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں اتاری گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھ سکتے۔“

قولہ تعالیٰ: **يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ**، لِمَ اصل میں لِمَا ہے، استفہام اور خبر کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہ آیت یہود و نصاریٰ میں سے ہر فریق کے اس دعویٰ کے سبب نازل ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے دین پر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی بایں طور کہ یہودی اور نصرانی دونوں ہی آپ کے بعد ہوئے ہیں، سو اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۚ** الآیہ۔

زجاج نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے خلاف واضح حجت ہے، کیونکہ تورات و انجیل دونوں ان کے بعد نازل کی گئیں اور ان دونوں میں ادیان میں سے کسی ایک کا نام نہیں ہے اور اسلام کا نام ہر کتاب میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہزار برس کا عرصہ تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بھی ہزار برس کا فاصلہ تھا۔ **أَفَلَا تَعْقِلُونَ** کیا تم اپنی دلیل اور قول کے بطلان کو نہیں جانتے۔ واللہ اعلم۔

هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَآجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

”سنئے ہو! تم وہ لوگ ہو جو جھگڑتے رہے ہو (اب تک) ان باتوں میں جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا پس (اب) کیوں جھگڑنے لگے ہو ان باتوں میں نہیں ہے تمہیں جن کا کچھ علم اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“
اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَآجَجْتُمْ یعنی تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھگڑتے ہو، کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات کو جانتے تھے جو وہ اپنی کتاب میں پاتے تھے پس آپ کے بارے میں انہوں نے باطل اور غلط جھگڑا کیا۔ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس دعویٰ پر کہ وہ یہودی تھے یا عیسائی (کیوں جھگڑنے لگے ہو جبکہ تمہیں اس بارے میں کچھ علم ہی نہیں)
هَآأَنْتُمْ دراصل اَنتُمْ تھا اس میں پہلے ہمزہ کو ہا سے بدل دیا گیا کیونکہ یہ اس کی اُخت ہے، ابو عمرو بن العلاء اور اخفش سے یہی منقول ہے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا اور حسین قول ہے۔ اور قبل نے ابن کثیر سے هَآأَنْتُمْ، هَعْنَتُمْ کی مثل نقل کیا ہے اور اس سے احسن یہ ہے کہ ہا ہمزہ سے بدل کر آئی ہو اور اس کی اصل اَنتُمْ ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ هَآأَنْتُمْ کے لئے ہو اور یہ اَنتُمْ پر داخل ہوئی ہو اور الف کو کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہو۔ اور هَؤُلَاءِ میں دو لغتیں ہیں یعنی مد اور قصر اور عربوں میں سے بعض اسے قصر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

ابو حاتم نے کہا ہے:

لَعَبْرَتٌ اَنَا وَالْاَحَالِيفُ هَؤُلَاءِ لَفِي مِحْنَةٍ اُظْفَارُهَا لَمْ تَقَمَّ

اس میں هَؤُلَاءِ کو قصر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اور یہاں هَؤُلَاءِ محل ندا میں واقع ہے یعنی یا هَؤُلَاءِ۔ اور هَؤُلَاءِ کو اَنتُمْ کی خبر بنانا بھی جائز ہے، اس بنا پر کہ اُولَآءِ بمعنی الذین ہو اور اس کا مابعد اس کا صلہ ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَنتُمْ کی خبر حاججتم ہو۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اس کے بارے میں جھگڑنا منع ہے جس کے بارے میں علم نہ ہو اور اس سے روکنے اور منع کرنے کے ممنوع ہونے پر دلیل موجود ہے جو اس کے نزدیک متحقق اور ثابت نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَآجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ۔

اور اس کے بارے میں جھگڑنے کا حکم موجود ہے جس کے بارے میں علم اور یقین ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَاوِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ (النمل: ۱۲۵) (اور ان سے بحث (و مناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ اور (شائستہ ہو) اور حضور نبی

مکرم سنیؑ پہم سے مروی ہے کہ ایک آدمی آپ کے پاس حاضر ہوا، اس نے اپنے بچے کا انکار کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! سنیؑ پہم میری بیوی نے ایک سیاہ رنگ کے بچے کو جنم دیا ہے۔ تو رسول اللہ سنیؑ پہم نے فرمایا: ”کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟“ اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ”ان کی رنگت کیسی ہے؟“ اس نے عرض کی: وہ سرخ رنگ کے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا ان میں کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے؟ اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ”وہ کہاں سے آیا؟“ اس نے عرض کی: شاید اصل اس کے مشابہ ہو، تو رسول اللہ سنیؑ پہم نے فرمایا: ”اور یہ بچہ شاید اصل اس کے مشابہ ہو (1)۔“ یہی جھگڑے کی حقیقت اور رسول اللہ سنیؑ پہم کی جانب سے استدلال کو واضح اور ظاہر کرنے کی انتہا ہے۔

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ

الْمُشْرِكِينَ ۝

”نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے۔“

اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے دعاوی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پاکی اور برأت بیان فرمائی اور یہ بیان فرمایا کہ وہ حنیفیہ اسلامیہ (خالص اسلامی دین) پر تھے اور وہ شرک نہ تھے۔ اور حنیف وہ ہوتا ہے جو توحید کا اقرار کرتا ہے، حج ادا کرتا ہے، قربانی دیتا ہے، مختون ہوتا ہے اور قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے مادہ اشتقاق کے بارے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور لغت میں مسلم وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو اور اس کی اطاعت و پیروی کرنے والا ہو۔ اور اسلام کا معنی سورۃ البقرہ میں بالتفصیل گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

إِنَّ أَوَّلَى الْثَّامِسِ بِإِبْرَاهِيمَ لِلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ

الْمُؤْمِنِينَ ۝

”بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے کہ سرداران یہود نے کہا: قسم بخدا! اے محمد (سنیؑ پہم) آپ یقیناً جانتے ہیں کہ ہم آپ اور آپ کے سوا کسی اور کی نسبت دین ابراہیمی کے نزدیک تر لوگ ہیں، کیونکہ وہ یہودی تھے اور آپ کو سوائے حسد کے اور کچھ نہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اَوَّلَىٰ بِمَعْنَىٰ أَحَقُّ ہے (یعنی زیادہ حق رکھنا) یہ کہا گیا ہے: معاونت (مدد) اور نصرت میں (یعنی مدد اور نصرت کے اعتبار سے قریب تر وہ تھے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حجت کے اعتبار سے قریب تر وہ تھے۔ لِلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وہ جو آپ کی ملت اور سنت پر تھے۔ وَهَذَا النَّبِيُّ حضور نبی کریم سنیؑ پہم کی تعظیم (اور توقیر) کے

1۔ صحیح بخاری، باب اذا عرض بنی الولد، حدیث نمبر 4893، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے آپ کا ذکر علیحدہ کیا گیا، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے **فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرَمَانٌ** اور مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور لفظ **هَذَا** محل رفع میں ہے اور الذین پر معطوف ہے، اور النبی۔ **هَذَا** کی صفت ہے یا عطف بیان ہے اور اگر اسے محل نصب میں رکھا جائے تو بھی کلام میں جائز ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف اتباع کی ہاضمیر پر ہوگا۔ **وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ** یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کا مددگار ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان لكل نبي وليا من النبيين وان ولي منهم ابي و خليل ربي**۔ بے شک ہر نبی کا انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی (نہ کوئی) مددگار ہے اور ان میں سے میرے مددگار میرے باپ (جد اعلیٰ حضرت ابراہیم) اور میرے رب کے خلیل ہیں (1)۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی..... **إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ** (آل عمران: 68) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم)۔

وَدَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَو يُضِلُّوكُمْ ۖ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا

يَشْعُرُونَ ۝

”دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ کسی طرح گمراہ کر دیں تمہیں اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔“

یہ آیت حضرات معاذ بن جبل، حذیفہ بن یمان، اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت بنی نضیر، قریظہ اور بنی قینقاع کے یہودیوں نے انہیں اپنے دین کی طرف دعوت دی۔ اور یہ آیت اس قول باری تعالیٰ کی مثل ہے: **وَدَّتْ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖ حَسَدًا** (البقرہ: 109) (دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنادیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے۔) اس قول کی بنا پر **مِنْ تَبَعِيضِ كَيْ لَمْ يَكُنْ** ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد جمیع اہل کتاب ہیں، تو پھر **مِنْ** بیان جنس کے لئے ہوگا۔

اور **لَوْ يُضِلُّوكُمْ** کا معنی ہے وہ تمہیں دین اسلام سے رجوع اور اس کی مخالفت کے سبب معصیت اور گناہ میں مبتلا کر دیں۔ اور ابن جریج نے کہا ہے: **يُضِلُّونَكُمْ** کا معنی ہے **يُهْلِكُونَكُمْ** یعنی وہ تمہیں ہلاک کر دیں۔ اور اسی میں اخطل کا قول ہے:

كُنْتُ الْقَذَى فِي مَوْجِ أَكْدَرَ مُزِيدٍ قَذَفَ الْإِنِّ بِهَ فَضْلًا ضَلَالًا

اس میں ضل ضلالا بمعنی هلك ہلاکا ہے۔

وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ اس میں نفی اور اثبات ہے (یعنی اوروں سے ضلالت و گمراہی کی نفی ہے اور ان کی اپنی ذاتوں کے لئے اس کا اثبات ہے۔ یعنی وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو) **وَمَا يَشْعُرُونَ** یعنی وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ وہ مومنین کو گمراہ کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَصَايَشْعُرُونَ کا معنی ہے: وہ اسلام کی صحت کو نہیں جانتے حالانکہ ان پر واجب ہے کہ وہ اسے جانیں اور سمجھیں، کیونکہ اس کی براہین ظاہر اور دلائل واضح ہیں۔ واللہ اعلم۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ⑤

”اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا حالانکہ تم خود گواہ ہو۔“

یعنی ان آیات کے صحیح ہونے کے تم خود گواہ ہو جو تمہارے پاس تمہاری کتابوں میں ہیں، یہ حضرت قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اور تم ان کی مثل انبیاء علیہم السلام کی ان آیات و علامات کے گواہ ہو جن کے بارے تم خود اقرار کرتے ہو۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ⑥

”اے اہل کتاب! کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور (کیوں) چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔“

اللبس کا معنی ہے الخلط یعنی ملا دینا (گڈمڈ کر دینا) سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور اس آیت کا معنی اور جو آیت اس سے پہلے ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ اسے جواب استفہام ہونے کی وجہ سے تَكْتُمُوا پڑھنا بھی جائز ہے۔ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ یہ جملہ حالیہ ہے یعنی حالانکہ تم جانتے ہو۔

وَقَالَتْ طَآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ

النَّهَارِ وَآكُفُّوا أَلْخِرَةَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ⑦

”کہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو اتاری گئی ایمان والوں پر صبح کے وقت

اور انکار کر دو اس کا سر شام شاید (اس طرح) وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں۔“

یہ آیت کعب بن اشرف اور مالک بن صفی وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے اپنی قوم کے سفلہ اور احمق لوگوں کو کہا کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو ایمان والوں پر اتاری گئی صبح کے وقت، وَجْهَ النَّهَارِ سے مراد دن کا پہلا اور اول حصہ ہے۔ اور اس کے بہت حسین ہونے کی وجہ سے اسے وَجْهًا کا نام دیا گیا ہے اور اس کا اول وہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے (مراد صبح ہے)۔

شاعر نے کہا ہے:

و تَضَوُّ فِي وَجْهِ النَّهَارِ مَنِيرَةٌ كَجَمَانَةِ الْبَحْرِى سُلْ نِظَامُهَا

دن کی صبح کو روشنی اس طرح منور کرتی ہے جیسا کہ موتیوں کو لڑی میں پرودیا گیا ہو۔

اور ایک دوسرے نے کہا:

مَنْ كَانَ مَسْرُورًا بِمَقْتَلِ مَالِكٍ فَلِيَّاتٍ نَسُوتُنَا بِوَجْهِ نَهَارٍ

جو مالک کے قتل سے سرور ہے اسے چاہیے کہ وہ ہماری عورتوں کو صبح سویرے لے آئے اور وجہ الثہار اور اسی طرح اخذ کا ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہیں۔

اور حضرت قتادہ کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے اس لئے ایسا کیا تا کہ وہ مسلمانوں کو شک میں مبتلا کر دیں۔ اور الطائفة کا معنی الجباعۃ ہے، یہ طاف یطوف سے ہے اور کبھی نفس طائفة کے معنی پر واحد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں میں سے بعض نے بعض کو کہا: دن کے اول حصہ میں محمد ﷺ کے ساتھ ایمان کا اظہار کرو اور پھر دن کے آخر میں اس کا انکار کر دو، کیونکہ جب تم اس طرح کرو گے تو جو ان کی اتباع اور پیروی کر رہے ہیں ان کے لئے اپنے دین میں شک پیدا ہو جائے گا پس وہ ان کے دین سے تمہارے دین کی طرف لوٹ آئیں گے اور یہ کہنے لگیں گے: بے شک اہل کتاب اس بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم صبح کے وقت آپ کی نماز کے ساتھ ایمان لے آؤ جس میں منہ بیت المقدس کی طرف ہے کیونکہ وہ حق ہے اور سر شام آپ کی نماز کا انکار کر دو جس میں منہ کعبہ کی طرف ہے، شاید وہ تمہارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔

اور مقاتل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ صبح کے وقت حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پاس آئے اور آپ کے پاس سے لوٹ کر گئے تو انہوں نے سفلہ لوگوں کو کہا: وہ حق ہے تم اس کی اتباع اور پیروی کرو، بعد ازاں انہوں نے کہا: یہاں تک کہ ہم تورات دیکھ لیں، پھر وہ سر شام لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا: تحقیق ہم نے تورات میں دیکھا ہے وہ پسندیدہ نہیں ہے، وہ کہنے لگے: بلاشبہ وہ حق نہیں ہے اور اس سے انہوں نے ارادہ یہ کیا کہ وہ سفلہ لوگوں پر معاملہ مشتبه کر دیں اور یہ کہ وہ اس بارے میں انہیں شک میں مبتلا کر دیں۔

وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنْ الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ
مَا أُوتِيْتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنْ الْفَضْلُ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ
يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

”(ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں) کہ مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی۔ فرمائیے ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) دیا جاسکتا ہے کسی کو جیسے تمہیں دیا گیا یا کوئی حجت لاسکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس۔ (اے حبیب ﷺ!) فرما دیجئے کہ فضل (و کرم) تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

تو لہ تعالیٰ: وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ یہ نبی ہے اور یہ یہود کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کلام میں سے ہے، یعنی ان کے رؤساء نے سفلہ اور گھٹیا لوگوں کو کہا۔ اور سدی نے بیان کیا ہے: یہ خیبر کے یہودیوں کی مدینہ طیبہ کے یہودیوں کے ساتھ افتلو میں سے ہے۔ اور یہ آیت اس سورۃ میں مشکل ترین آیت ہے۔

اور حسن اور مجاہد سے مروی ہے کہ آیت کا معنی ہے: تم کسی کی بات نہ مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور تم یہ نہ مانو کہ وہ تم پر تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لا سکتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت ہے ہی نہیں، پس دین کے اعتبار سے تم ان سے زیادہ صحیح ہو۔ اُن اور یُحَاجُّوْکُمْ دونوں محل جریں ہیں اسی بَأْنِ یَحَاجُّوْکُمْ اسی باحتجاجہم یعنی تم اس بارے میں ان کی تصدیق نہ کرو کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔

اَنْ یُّؤْتٰی اَحَدٌ قِشْلَ مَا اُوْتِیْتُمْ (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) کسی کو اتنا دیا جاسکتا ہے جیسے تمہیں دیا گیا ہے مثلاً تورات، من و سلوی اور سمندر کا پھٹنا اور علاوہ ازیں دیگر علامات و فضائل۔

پس اَنْ یُّؤْتٰی۔ اُوْیَحَاجُّوْکُمْ کے بعد مؤخر ہوگا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الْهُدٰی هُدٰی اللّٰهِ وِکَلَامِہٖ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

اور انخفش نے کہا ہے: معنی یہ ہے اور تم مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور مت مانو یہ کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے اور نہ اس کی تصدیق کرو کہ وہ تم پر کوئی حجت لا سکتے ہیں، یہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ کلام معطوف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اور تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔ پس استفہام پر مد بھی اس انکار کی تاکید کے لئے ہے جو انہوں نے کہا ہے: ”بے شک کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جاسکتا جیسا انہیں دیا گیا ہے، کیونکہ علمائے یہود نے انہیں کہا ہے: تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے، یعنی کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جاسکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے، پس کلام اپنی ترتیب پر ہے اور اُن محل رفع میں ہے ان کے قول کے مطابق جنہوں نے تیرے اس قول میں رفع دیا ہے۔ اُزید ضربتہ، اور خبر مخذوف ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: اَنْ یُّؤْتٰی اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِیْتُمْ تَصَدَّقُوْنَ اَوْ تَقْرُوْنَ، ای ایتاء موجود مصدق اَوْ مُقَرَّبہ، ای لا تصدقون بذالک۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ فعل مضمر کی بنا پر اُن محل نصب میں ہو، جیسا کہ تیرے اس قول میں جائز ہے اُزید ضربتہ اور عربی میں یہ زیادہ قوی ہے کیونکہ استفہام بالفعل اولیٰ ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی: اَتَقْرٰوْنَ اَنْ یُّؤْتٰی اَوْ اَتَشِیْعُوْنَ ذَالِکَ اَوْ اَتَذْکُرُوْنَ ذَالِکَ نَحْوہ۔

اور ابن کثیر، ابن محیسن اور حمید نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: اَنْ بمعنی اِلَا اَنْ ہے پھر لام جر کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا اور اسے مد کے ساتھ بدل دیا گیا، جیسا کہ اس کی قراءت جس نے اس طرح پڑھا اَنْ کَانَ ذَا مَالٍ یہ اصل میں اِلَا اَنْ ہے۔ اور اس قراءت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اُوْیَحَاجُّوْکُمْ مَوْنِیْنَ کو خطاب کرنے کی طرف رجوع ہے، یا پھر اُوْیَحَاجُّوْکُمْ اَنْ ہوگا، کیونکہ یہ دونوں حرف شک اور جزا ہیں اور ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ رکھا جاسکتا ہے۔ اور آیت کی تقدیر اس طرح ہے: وَاَنْ یَحَاجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ یَا مَعْشَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ،

پس تم فرما دیجئے! اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہدایت اور فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور ہم اسی پر ہیں۔ اور جس نے بغیر مد کے پڑھا ہے اس نے کہا ہے: بے شک پہلی نفی ان کے قول وَلَا تُؤْمِنُوا میں ان کے انکار پر دلالت کرتی ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ یہودی علماء نے ان سے کہا: تم اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے، یعنی نہ ان کے پاس ایمان ہے اور نہ ہی کوئی حجت، پس علم و حکمت، کتاب و حجت، من و سلوئی اور سمندر کا پھٹنا وغیرہ فضائل و کرامات کا معنی پر عطف کیا گیا ہے، یعنی بلاشبہ یہ سب صرف تم ہی میں موجود ہیں پس تم یہ بات مت مانو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں۔ پس اس قرأت کے مطابق کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور لام زائدہ ہے اور من استثنیٰ اول میں سے نہیں ہے، ورنہ کلام جائز نہیں ہوگا۔ اور أَحَدٌ داخل کیا گیا ہے کیونکہ اول کلام نفی ہے، پس اسے اُن کے صلہ میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ وہ فعل منفی کا مفعول ہے، اور جر دینے والا عامل نہ ہونے کی وجہ سے اُن محل نصب میں ہے اور خلیل نے کہا ہے: اُن محل جر میں ہے کیونکہ اس سے پہلے جر دینے والا لفظ محذوف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام زائدہ نہیں ہے اور تُؤْمِنُوا یہ تَقَرُّوا پر محمول ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ تم مت مانو سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اس کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: تم اس کے بارے مت خبر دو جو تمہاری کتاب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف موجود ہیں سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں تاکہ بتوں کی عبادت اور ان کی تصدیق کی طرف کوئی راہ نہ ہو۔

اور فرما نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہودیوں کا کلام اس ارشاد پر ختم ہو چکا ہو اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ اور پھر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہو: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدٰى اللّٰهِ یعنی بلاشبہ بیان حق ہی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے۔ اَنْ يُّؤْتٰى اَحَدٌ قِسْلًا مَّا اَوْتِيتُمْ (اس معنی میں) بالکل بین اور ظاہر ہے کہ کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جاسکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔ اور لَا، اُن کے بعد مقدرہ ہے۔ یعنی لِّسَلَا يُؤْتٰى، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَصْلُوْا یعنی لِّسَلَا تَصْلُوْا، تاکہ تم گمراہ نہ ہو۔ پس اسی لئے کلام میں أَحَدٌ کا داخل ہونا صحیح ہے۔ اور اَوْ بِمَعْنٰی حَتّٰی اور اِلَّا اُن ہے۔

جیسا کہ امرء القیس نے کہا ہے:

نَحَاوَلْ مُلْكًا اَوْ نَمُوْتَ فَنُعْذَرَا

فَقُلْتُ لَهُ لَا تَبِكْ عَيْنُكَ اِنَّمَا

اس میں اَوْ نَمُوْتَ اِلَّا اَنْ نَمُوْتَ کے معنی میں ہے۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

كَسَرْتُ كُفُوْبَهَا اَوْ تَسْتَقِيْمَا

وَكُنْتُ اِذَا غَمَزْتُ قَنَاقَةَ قَوْمٍ

اس میں اَوْ تَسْتَقِيْمَا حَتّٰی اَنْ تَسْتَقِيْمَا کے معنی میں ہے اور اس کی مثل ان کا یہ قول ہے: لَا نَلْتَقٰى اَوْ تَقْوِمُ السَّاعَةَ،

اس میں اَوْ بِمَعْنَى حَتَّى يَأْتِيَ اُنْكَرُكَ ہے اور اسی طرح کسائی کا مذہب ہے۔

اور اخفش کے نزدیک یہ اَوْ عاطفہ ہے اور یہ عطف وَلَا تَوْصُوْا پر ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی لَا اِيْمَانَ لَهُمْ وَلَا حِجَّةَ (نہ ان کا ایمان ہے اور نہ ان کی کوئی دلیل) اور یہ عطف معنی پر کیا گیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ پوری آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو خطاب ہو ان کے دلوں کو ثابت قدم رکھنے کے لئے اور ان کی نگاہوں میں تیزی پیدا کرنے کے لئے، تاکہ وہ یہودیوں کی تلبیس اور ان کے اپنے دین کو آراستہ اور مزین کر کے پیش کرنے کے وقت کسی شک میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور معنی یہ ہو: اے گروہ مومنین! تم بات نہ مانو مگر ان لوگوں کی جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ اس کی مثل فضل و کرم اور دین میں سے کسی کو نہیں دیا جاسکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے اور نہ یہ مانو کہ تمہارا کوئی مخالف تمہارے دین کے بارے میں تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لاسکتا ہے یا وہ اس پر قدرت رکھتا ہے، کیونکہ ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور بلاشبہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔

ضحاک نے کہا ہے: بے شک یہودیوں نے کہا ہم اپنے رب کے پاس اس پر حجت لائیں گے جس نے ہمارے دین میں ہماری مخالفت کی، پس اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ بے شک وہ پھسلائے گئے ہیں اور عذاب دیئے گئے ہیں اور مومنین غالب آنے والے ہیں۔ اور ان کی حجت ان کا قیامت کے دن جھگڑنا ہے۔ اور حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک یہود و نصاریٰ ہمارے بارے میں ہمارے رب کے پاس حجت لائیں گے اور وہ کہیں گے تو نے ہمیں ایک اجر دیا ہے اور انہیں تو نے دو اجر دیئے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا میں نے تمہارے ساتھ تمہارے حقوق کے بارے میں کسی قسم کی زیادتی کی ہے؟ وہ عرض کریں گے نہیں، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرا فضل ہے جسے میں چاہتا ہوں اسے عطا کرتا ہوں۔“ (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر وہ جانتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے ہے تو وہ ہمارے بارے میں ہمارے رب کے پاس حجت نہ لاتے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو آگاہ فرمادیا کہ وہ قیامت کے دن تمہارے بارے میں تمہارے رب کے پاس حجت لائیں گے، پھر فرمایا! تم اب ان سے کہہ دو اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ بے شک فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ ابن کثیر نے اُن یٰوَقُّ کو استفہام کی بنا پر مد کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ اعشیٰ نے بھی کہا ہے:

اَنَّ رَأَتْ رَجُلًا اَغْشَى اَضْرَ بِهِ رَيْبُ الْمُنُونِ وَدَهْرٌ مُّثْبِلٌ خَبِلُ

اور باقیوں نے خبر کی بنا پر بغیر مد کے پڑھا ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے اُن یٰوَقُّ ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اس بنا پر کہ اس میں معنی نفی کا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سے ہوگا جیسا کہ فراء نے کہا ہے۔ اور معنی ہوگا: اے محمد! ﷺ آپ فرمادیجئے: ”بے شک ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو کسی کو اس کی مثل عطا نہیں کیا جائے گا جیسا تمہیں عطا کیا گیا ہے یا نہ کوئی حجت لاسکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس“ یعنی یہودی باطل پر ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہم تم سے افضل ہیں۔ اور اُوَيَحَاجُّوْكُمْ کو اُن

1۔ صحیح بخاری، باب الاجارة الى صلوة العصر، حدیث نمبر 2108، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مضمّرہ اور اؤ کے ساتھ نصب دی گئی ہے اور اؤ کے بعد اُن کو مضمّر کیا جاتا ہے جب وہ حتیٰ اور اِلّا اُن کے معنی میں ہو۔
اور حسن نے اُن یوٹی یعنی تا کو کسرہ کے ساتھ اور یا کو مفتوح پڑھا ہے معنی یہ ہوگا اُن یوٹی اِحْدًا مِثْلَ مَا اوْتِيتُمْ (کہ
کوئی کسی کو اتنا دے گا جتنا تمہیں دیا گیا ہے۔) اس میں سے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔

قوله تعالى: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدٰى اللّٰهِ اس میں دو قول ہیں:

ایک یہ کہ خیر اور نیکی کی طرف ہدایت کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ اسے
اپنے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کو عطا فرماتا ہے، سو تم انکار نہ کرو کہ تمہارے سوا کسی کو اس کی مثل عطا کیا جائے جیسا تمہیں
عطا کیا گیا ہے، پس اگر وہ اس کا انکار کریں تو ان سے فرما دیجئے اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ کہ فضل و کرم اللہ
تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے: آپ فرما دیجئے ہدایت تو وہی ہے جو اس اللہ کی ہدایت ہو جس نے جو مومنین کو حضرت محمد مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے کے بارے عطا فرمائی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اور بعض اہل اشارات نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: تم (حسن) معاشرت نہ رکھو سوائے ان کے جو تمہارے احوال
اور تمہارے طریقہ میں تم سے موافقت کرتے ہیں، کیونکہ جو تم سے موافقت نہیں کرتا وہ تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

”خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔“

یعنی وہ اپنی نبوت اور ہدایت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جسے چاہتا ہے، یہ قول حسن اور مجاہد وغیرہما کا ہے۔ ابن جریج نے
کہا ہے: وہ خاص کر لیتا ہے اسلام اور قرآن کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ ابو عثمان نے کہا ہے: یہ حسین تر قول ہے جس کے ساتھ
امیدوار کی امید اور خوفزدہ ہونے والے کا خوف باقی رہتا ہے۔ ”اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔“

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَامَنُہٗ بِقِطْعَا يُّوْدَہٗ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَامَنُہٗ

بِدِيْنَارٍ اِلَّا يُوْدَہٗ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآبًا ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِی

الْاَمِيْنِ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

”اور اہل کتاب سے بعض ایسے (دیانتدار) ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی

کا) تو ادا کر دے اسے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک

اشرفی تو واپس نہ کرے گا اسے بھی تیری طرف مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے، اس (بددیانتی) کی وجہ یہ

ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت اور یہ لوگ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ

حالانکہ وہ جانتے ہیں۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدُّ إِلَيْكَ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام (ان اہل کتاب میں سے تھے) وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدُّ إِلَيْكَ اس سے مراد فحاص بن عازوراء یہودی ہے، ایک آدمی نے اس کے پاس کچھ دینار امانت رکھے تو اس نے اس میں خیانت کی۔

اور یہ بھی قول ہے کہ ان سے مراد کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی ہیں۔ ابن وثاب اور اشہب عقیلی نے مَنْ إِنْ تَتِمَّنْہ قرأت کی ہے اور یہ ان کی لغت پر ہے جو نستعین پڑھتے ہیں اور یہ بنی بکر اور بنی تمیم کی لغت ہے۔ اور حضرت عبداللہ کی قرأت میں مَالِكٍ تَتِمَّنَّا علی یوسف کے الفاظ ہیں، جبکہ باقیوں نے الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع اور کسائی نے یُوذِی اور اج میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: ابو عمرو، اعش، عاصم اور حمزہ نے ابو بکر کی روایت میں ہا پر وقف کر کے پڑھا ہے یعنی یُوذِی الیک۔ نحاس نے کہا ہے: بعض نحو یوں کے نزدیک ہا کو ساکن کرنا بغیر شعر کے جائز نہیں ہے اور بعض نے اسے مطلقاً جائز قرار نہیں دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ جنہوں نے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے انہوں نے غلطی کی ہے اور یہ کہ انہیں وہم ہوا ہے کہ جزم ہا پر واقع ہوئی ہے اور ابو عمرو نے اس سے پاک قرار دیا کہ اس کی مثل اس پر جائز ہو اور ان سے صحیح روایت یہ ہے کہ وہ ہا کو کسرہ دیتے ہیں اور یہی یزید بن قعقاع کی قرأت ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ بعض عربوں کا مذہب یہ ہے کہ وہ ہا کو جزم دیتے ہیں جب اس کا ماقبل متحرک ہو، وہ کہتے ہیں: ضربتہ ضرباً شدیداً، جیسا کہ وہ انتم اور قستم کی میم کو سکون دیتے ہیں اور اس کی اصل رفع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لہارای ألا دَعَه ولا شِبَعُ مال الی ارطاة حَقِیف فاضْطَجَعُ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس مقام پر ہا کو ساکن کرنا جائز ہے کیونکہ وہ جزم کے محل میں واقع ہے اور یہ یا ختم ہو جانے والی ہے۔ ابو المنذر سلام اور زہری نے یُوذِی بغیر واؤ کے ہا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ، حمید اور مجاہد نے یُوذِی کو واؤ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے لئے واؤ کو اختیار کیا گیا ہے کیونکہ واؤ ضغٹ سے ادا ہوتی ہے اور ہا بعیدۃ المخرج ہے۔ (یعنی اس کی ادائیگی کا محل بعید ہے)

سیبویہ نے کہا ہے: مذکر میں واؤ مؤنث میں الف کے قائم مقام ہے اور اسے یا سے بدل دیا جاتا ہے کیونکہ یا زیادہ خفیف ہے، جبکہ اس کا ماقبل کسرہ یا یا ہو اور یا حذف ہو جاتی ہے اور کسرہ باقی رہتا ہے، کیونکہ یا کبھی حذف ہو جاتی ہے اور فعل مرفوع ہو تو اسے اپنے حال پر ثابت رکھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں کچھ خائن ہیں اور کچھ امین ہیں اور مومنین ان میں تمیز نہیں کر سکتے، پس چاہیے کہ وہ ان تمام سے اجتناب کریں اور اہل کتاب کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ مومنین بھی اسی طرح ہیں، اس لئے کہ ان میں خیانت زیادہ پائی جاتی ہے، پس کلام غالب کے بارے میں کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور قنطار کی تفسیر پہلے گزر

چکی ہے اور رہا دینار تو وہ چوبیس قیراط کا ہوتا ہے اور ایک قیراط درمیانے جو کے تین جہوں کے برابر ہوتا ہے اور اس کا مجموعہ بہتر ہے ہیں اور اس پر اجماع کیا گیا ہے۔ جس نے کثیر کی حفاظت کی اور اسے ادا کر دیا تو (حفاظت اور ادائیگی) قلیل میں بدرجہ اولیٰ ہوگی اور جس نے تھوڑے میں خیانت کی یا اسے روک کر رکھا تو وہ کثیر میں اور زیادہ ہوگی۔ اور یہ مفہوم خطاب کے ساتھ قول پر انتہائی واضح دلیل ہے۔ اور اس میں علماء کے مابین بہت زیادہ اختلاف ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں جو ادا کرتا ہے اور وہ جو ادا نہیں کرتا مگر وہی جو اس پر لازم ہوتا ہے اور کبھی لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو ادا نہیں کرتا اگرچہ تو اس کے پاس ہمیشہ کھڑا رہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں کیونکہ یہ غالب اور معتاد ہیں اور تیسری نادر ہے، لہذا کلام غالب کے بارے ہے اور طلحہ بن مصرف اور ابو عبد الرحمن السلمی وغیرہا نے دمت دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور کسرہ از السراۃ کی لغت ہے، یہ دمت تدام سے ماخوذ ہے جیسا خفت تخاف ہے۔ اور اخفش نے دمت تدوم بیان کیا ہے، اور یہ شاذ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد سے اپنے اس موقف پر استدلال کیا ہے کہ غریم (مقروض)

کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیے **إِلَّا مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا** اور تمام علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور سورۃ البقرہ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ہمارے علماء میں سے بعض بغداد کے رہنے والوں نے بہت زیادہ قرض لینے والے کو جس میں رکھنے پر اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: **وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ تَأْمَنُ بِدِينِنَا لَا يُوَدِّعُ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا** تو جب اسے لازم پکڑنا اور تصرف سے اسے روکنا جائز ہے تو اسے جس میں رکھنا بھی جائز ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک **إِلَّا مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا** کا معنی ہے پس وہ تیری وجہ سے تجھ سے ڈرتا ہے اور تجھ سے حیاء محسوس کرتا ہے، کیونکہ حیاء آنکھوں میں ہوتا ہے، کیا آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول جانتے نہیں ہیں: **لَا تَطْلُبُوا مِنَ الْأَعْي حَاجَةً فَإِنَّ الْحَيَاءَ فِي الْعَيْنَيْنِ تَمَّ اندھے سے حاجت کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ حیاء آنکھوں میں ہوتا ہے۔ اور جب تو اپنے بھائی سے حاجت کا مطالبہ کرے تو تو اپنے چہرے (کو متوجہ کر کے) اس کی طرف دیکھ یہاں تک کہ وہ حیاء محسوس کرنے لگے تو وہ اسے (حاجت کو) پورا کر دے گا۔ اور کہا جاتا ہے: قَائِمًا بمعنی ملازم مالہ ہے (یعنی اسے لازم پکڑتے ہوئے) پس اگر تو نے اسے مہلت دی تو وہ تیرا انکار کر دے گا۔**

اور یہ بھی کہا گیا ہے: قیام سے مراد مسلسل مطالبہ کرنا ہے نہ کہ عین قیام مراد ہے۔ اور دینار اصل میں دِنَّار ہے کثرت استعمال کی وجہ سے تخفیف کے لئے دونوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کی جمع دنانیر آتی ہے اور تصغیر دُنَيْنِیر بنائی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ دین میں امانت انتہائی عظیم المرتبت ہے اور اس کی عظمت و قدر میں سے یہ ہے کہ یہ اور رحم (صلہ

رحمی) پل صراط کی دونوں جانبوں پر کھڑے ہوں گے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے اور اسے عبور کرنے پر کوئی قادر نہ ہوگا مگر وہی جو

ان دونوں کی حفاظت اور پاسداری کرے گا۔

اور مسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں رفع امانت کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے بیان فرمایا: ”آدمی نیند کی حالت میں سو جائے گا اور اس کے دل سے امانت قبض کر لی جائے گی“ الحدیث۔ یہ روایت سورۃ البقرہ کے اول میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن مصطفیٰ، محمد بن حرب نے سعید بن سنان عن ابی الزاہرہ عن ابی شجرہ کثیر ابن مرہ عن ابن عمر بنی بنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے حیا چھین لیتا ہے اور جب وہ اس سے حیا چھین لیتا ہے تو اسے نفرت اور ناپسندیدگی کے سوا کچھ نہیں ملتا اور جب اسے نفرت اور ناپسندیدگی آتی ہے تو اس سے امانت چھین لی جاتی ہے اور جب اس سے امانت چھین لی جاتی ہے تو پھر وہ خود خیانت کا ارتکاب کرتا ہے اور اس سے خیانت کی جاتی ہے اور جب وہ خود خیانت کرنے لگتا ہے اور اس سے خیانت کی جاتی ہے تو اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے اور جب اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے تو پھر اسے صرف دھتکار اور لعنت آپہنچتی ہے اور اسے دھتکار اور لعنت پڑنے لگتی ہے تو اس سے اسلام کا قلاوہ اتار لیا جاتا ہے (1)۔“ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اذ الامانة الى من ائتمنتك ولا تخن من خانك اس کی امانت ادا کر جس نے تجھے امین بنایا اور اس کے ساتھ خیانت نہ کر جس نے تجھ سے خیانت کی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت میں تمام اہل کتاب کے لئے اور نہ ہی ان میں سے بعض کے لئے کوئی تبدیلی ہے، بخلاف ان کے جو اس طرف گئے ہیں، کیونکہ فاسق مسلمانوں میں بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو امانت ادا کرتے ہیں اور مال کثیر پر امین بنائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عادل نہیں ہوتے۔ پس عدالت و شہادت کے طریق میں امانت فی الحال کی ادائیگی کو معاملہ اور ودیعت کی جہت سے جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، کیا آپ ان کا قول جانتے نہیں لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمَیْنِ سَبِیْلٌ (آل عمران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت) پس وہ کیسے عدل کر سکتا ہے جو کوئی بغیر حرج کے اپنے اوپر ہمارے اموال اور ہماری عزتیں مباح سمجھنے کا اعتقاد رکھتا ہے اور اگر ان کی تعدیل میں اتنا کافی ہوتا تو یقیناً ان کی شہادت مسلمانوں پر سنی جاتی۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمَیْنِ سَبِیْلٌ کہا گیا ہے کہ یہودی جب مسلمانوں سے خرید و فروخت کرتے تھے تو کہتے تھے: ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت نہیں ہے..... یعنی ان کے ساتھ ظلم میں کوئی حرج نہیں ہے..... اس لئے کہ انہوں نے ہماری مخالفت کی ہے۔ اور انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ان کی کتاب میں موجود ہے، پس اللہ عز وجل نے انہیں جھٹلایا اور ان کا رد کر دیا۔ اور فرمایا: بَلٰی یعنی کیوں نہیں ان پر ان کے جھوٹ کی وجہ سے اور ان کے عربوں کے مال حلال سمجھنے کی وجہ سے عذاب کی راہ ہے۔

ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: کلام مکمل ہو گیا ہے، پھر فرمایا مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدٍ وَاٰتٰی اور کہا جاتا ہے: بے شک یہودی اعرابیوں سے اموال قرض لیتے تھے پس جب حقوق کے مالک اسلام لائے تو یہودیوں نے کہا: تمہارے لئے ہم پر کوئی شے واجب الادا نہیں، کیونکہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے لہذا ہم سے تمہارا قرض ساقط ہو چکا ہے۔

1۔ ابن ماجہ، باب ذہاب الامانة، حدیث نمبر 4043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ تورات کا حکم ہے سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا بلیٰ یہ ان کے اس قول کا رد ہے لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّمَةِ سَبِيلٌ یعنی اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کہتے ہو، پھر نئے سرے سے ارشاد فرمایا: مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ یعنی جس نے وعدہ پورا کیا اور شرک سے بچتا رہا تو وہ جھٹلانے والوں میں سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ اس سے محبت فرماتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: بے شک ہم ارادۃ اہل ذمہ کے اموال میں سے مرغیاں اور بکریاں پکڑ لیتے ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں ہم پر اس میں کوئی حرج نہیں ہے؟ تو آپ نے اسے فرمایا: یہ تو اسی طرح ہے جیسے اہل کتاب نے کہا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّمَةِ سَبِيلٌ بلاشبہ جب وہ جزیہ ادا کر دیں تو تمہارے لئے ان کے اموال ان کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہیں، عبدالرزاق نے اسے معمر بن ابی اسحاق الہمدانی عن صعصعة بن جلاق قال ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کافر کو قبولیت شہادت کا اہل قرار نہیں دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے فرمایا ہے کہ یہ کذاب ہے اور اس میں ان کافروں پر رد ہے جو اللہ تعالیٰ کی تحریم کے بغیر (چیزوں کو) حرام قرار دیتے ہیں اور اس کی تحلیل کے بغیر (چیزوں کو) حلال قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اسے شریعت میں سے قرار دیتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا ہے: اور اس سے ان کا رد نکلتا ہے جو بغیر دلیل کے استحسان کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں اور میں اہل قبلہ میں سے کسی کو نہیں جانتا کہ اس نے یہ کہا ہو۔ اور حدیث میں ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جاہلیت کی کوئی شے نہیں ہے مگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہے سوائے امانت کے کیونکہ اسے نیکو کار اور فاجر تک پہنچایا گیا ہے (1)۔“

بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ①

”ہاں کیوں نہیں جس نے پورا کیا اپنا وعدہ اور پرہیزگار بنا تو بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے۔“

مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور یہ شرط ہے اور أَوْفَىٰ محل جزم میں ہے اور اتَّقَىٰ معطوف علیہ ہے، یعنی اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور وہ جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی اس نے اس شے کو حلال سمجھا جو اس پر حرام کی گئی۔ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ یعنی اللہ ان سے محبت فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے اولیاء سے محبت کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے اور قول باری تعالیٰ بِعَهْدِهِ میں ہا، ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ اور اس کا ذکر اس ارشاد میں بھی ہے وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ② اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ وعدہ پورا کرنے والے اور کفر و خیانت اور نقض عہد سے پرہیز کرنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو۔ عہد مصدر ہے جسے فاعل اور مفعول (دونوں) کی طرف مضاف کیا جاسکتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ

وَلَا يَكِلُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ①

”بے شک جو لوگ خریدتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت، یہ وہ (بد نصیب) ہیں کہ کچھ حصہ نہیں ان کے لئے آخرت میں اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ اور دیکھے گا بھی نہیں ان کی طرف قیامت کے روز اور نہ پاک کرے گا انہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

ہیں

مسئلہ نمبر 1۔ ائمہ نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میرے اور ایک یہودی آدمی کے درمیان زمین کا تنازعہ ہوا تو اس نے میرے (حق کا) انکار کر دیا سو میں اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ”کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟“ میں نے عرض کی: نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو فرمایا: ”تو حلف دے دے۔“ میں نے عرض کی: ”تب یہ تو حلف دے دے گا اور میرا مال لے جائے گا، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اِلٰى اٰخِرِ الْاَيَةِ۔ (1)

اور ائمہ نے یہ بھی حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کسی نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم کے ساتھ کاٹ دیا تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا“ تو ایک آدمی نے آپ سے عرض کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ وہ تھوڑی سی شے بھی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ وہ درخت کی ایک ٹہنی ہی ہو۔“ اور لَا يَكِلُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اور احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حاکم کا حکم قضاء ظاہر کے ساتھ باطن میں مال کو حلال نہیں کرتا جبکہ محکوم لہ اس کے بطلان کو جانتا ہو اور ائمہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلاشبہ تم میرے پاس آ کر جھگڑتے ہو اور بلاشبہ میں تو بشر ہوں شاید تمہارے بعض اپنی دلیل اور حجت بیان کرنے میں بعض کی نسبت خطا کریں میں تمہارے درمیان اس کے بارے فیصلہ کرتا ہوں جو میں تم سے سنتا ہوں پس جس کے لئے اس کے بھائی کے حق میں سے کسی شے کا میں فیصلہ کروں تو وہ اسے نہ لے کیونکہ گویا میں اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ رہا ہوں جس کے ساتھ وہ قیامت کے دن آئے گا۔“ (2)

اس میں ائمہ کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں امام ابو حنیفہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: بلاشبہ حاکم کا وہ فیصلہ جس کا دار و مدار شہادت باطلہ پر ہو اور وہ اس کے لئے اس شرمگاہ کو حلال کر دیتا ہے جسے اس پر حرام کیا گیا تھا، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ گمان کیا ہے کہ اگر دو جھوٹے گواہوں نے ایک آدمی پر اپنی بیوی، طلاق دینے کے بارے شہادت دی اور حاکم نے ان کی شہادت کے مطابق فیصلہ کر دیا تو بلاشبہ اس کی شرمگاہ اس کے ساتھ اس شادی کرنے والے کے لئے حلال ہوگی

1۔ صحیح بخاری، باب کلام الخصوم بعضهم فی بعض، حدیث نمبر 2239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحلیل، حدیث نمبر 6452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو یہ جانتا ہے کہ فیصلہ باطل ہے۔ اور آپ پر اس صحیح اور صریح حدیث سے اعراض کرنے کا عیب لگایا گیا ہے۔ اور اس طرح کہ آپ نے اموال کو بچا لیا اور آپ نے احکام فاسدہ کے سبب انہیں مباح سمجھنے کی طرف غور نہیں فرمایا۔ اور اس سے آپ نے شرمگاہوں کی حفاظت نہیں کی حالانکہ شرمگاہیں زیادہ حق رکھتی ہیں کہ ان کے بارے احتیاط برتی جائے اور ان کی حفاظت کی جائے۔ ان کے قول کا بطلان آیت لعان میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ (☆)۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُونُ السِّنْتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ
الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ
الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٥٠﴾

”اور بے شک ان میں ایک فریق وہ ہے جو مروڑتے ہیں اپنی زبان کو کتاب کے ساتھ تاکہ تم خیال کرنے لگو (ان کی) اس (الٹ پھیر) کو بھی اصل کتاب سے حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں یہ بھی اللہ کی طرف سے (اترا) ہے حالانکہ وہ نہیں ہے اللہ کے پاس سے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ جان بوجھ کر۔“

فریقاً سے مراد یہود کی ایک جماعت اور گروہ ہے۔ يَلُونُ السِّنْتَهُمْ بِالْكِتَابِ ابو جعفر اور شبیبہ نے (معنی) تکثیر کی بنا پر يَلُونُ پڑھا ہے۔ جب وہ اسے جھکالے، مروڑ لے اور اسی سے یہ معنی ہے وہ کلام میں تحریف کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ اسے مقصد سے پھیر دیتے ہیں، اللہ کا اصل معنی الميل (ایک طرف جھکنا) ہے۔ لَوِي بیدہ (اس نے اپنا ہاتھ پھیر دیا) اور لَوِي برأسہ اور اس نے اپنا سر پھیر دیا۔ قَوْلُهُ تَعَالَى: لَيَّا بِالْأَسْنَتِهِمْ یعنی حق سے عناد رکھتے ہوئے اور اس سے غیر کی طرف پھیرتے ہوئے (اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں) اور وَلَا تَلُونُ عَلٰی أَحَدٍ کا معنی ہے لَا تَعْرُجُونَ عَلَيْهِ (اس پر نہیں چڑھو گے)، کہا جاتا ہے لَوِي عَلَيْهِ جب وہ اس پر چڑھے اور مقیم ہو جائے۔ اور اللہ کا معنی ہے المِطْل مروڑنا (لوہے کو بڑھانے کے لئے کاٹنا) نال مٹول کرنا۔ لَوَاهُ بَدِينَهُ يَلُوهُ لَيًّا وَلَيًّا مَطْلُهُ یعنی اس نے اسے قرض کی ادائیگی میں نال مٹول کی۔

شاعر نے کہا:

قد كنت دانت بها حسانا مخافة الإفلاس والديانا
يحسن بيع الأصل والعيانا

ذوالرمہ نے کہا ہے:

تریدین لسانی وانت ملینۃ و أحسن یا ذات البشاح الثقاضینا
اور حدیث میں ہے لَوِ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَ عَقُوبَتَهُ (پانے والے کا نال مٹول کرنا اپنی عزت اور اپنی سزا کو حلال کر دیتا ہے۔)

نیز امام اعظم ابو حنیفہ کے بارے میں یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ یہ امام اعظم کے نقطہ نظر میں عدم تدریج بنا پر ہے اس کی تفصیل ہدایہ کتاب الزکاح میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اور السنۃ، لسان کی جمع ہے لغت میں جس نے مذکر قرار دیا ہے اور جس نے مونث قرار دیا ہے اس نے ألسن کہا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٦٦﴾

”نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لئے کہ (جب) عطا فرما دے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر (وہ تو یہ کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے اس لئے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے۔“

مَا كَانَ اس کا معنی ہے ماینبغی یعنی نہیں چاہیے، جیسا کہ فرمایا: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَاً اور مَا كَانَ يَنْبَغِي أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ تَكُنَّ مِثْلَ مَا يَكُونُ لَنَا مِنْ دُونِ اللَّهِ (مناہی) اور لفظ بشر واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے کیونکہ یہ قائم مقام مصدر کے ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کے مطابق یہاں مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور حکم سے مراد علم اور فہم ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تتم سے مراد احکام ہیں۔ یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنی نبوت کے لئے جھوٹوں کو نہیں چنتا۔ اور اگر کوئی انسان ایسا کرتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ نبوت کی آیات و علامات اس سے سلب کر لیتا۔ اَنْ يُؤْتِيَهُ اور يَقُولُ کے درمیان اشتراک کی بنا پر ثُمَّ يَقُولُ کو نصب دی گئی ہے یعنی کسی نبی کے لئے نبوت کا ہونا اور اس کا یہ قول: كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ جمع نہیں ہو سکتے۔ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ یعنی البتہ یہ جائز ہے کہ وہ نبی ان سے کہے كُونُوا رَبَّانِيِّينَ تم اللہ والے ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ پوری سورۃ قول باری تعالیٰ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تک کا سبب نزول نجران کے نصاریٰ تھے، لیکن یہود کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا، کیونکہ انہوں نے بھی انکار اور عناد انہیں کی طرح کیا۔

رَبَّانِيِّينَ اس کا واحد رَبَّانِي ہے یہ الرَّبِّ کی طرف منسوب ہے اور ربانی وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی صفات علم کے ساتھ اپنے بڑا ہونے سے پہلے تربیت کرتا ہے، گویا کہ وہ امور کو آسان بنانے میں رب سبحانہ کی اقتدا کرتا ہے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض نے کہا ہے یہ اصل میں رَبَّانِي تھا پھر مبالغہ کے لئے اس میں الف اور نون داخل کر دیئے گئے، جیسا کہ عظیم اللحیہ کے لئے کہا جاتا ہے: لِحْيَانِ اور عظیم الجُتہ (بہت ہی زیادہ) کے لئے جُتَانِ اور غلیظ الرقبہ (موٹی گردن والا) کے لئے رَقَبَانِ کہا جاتا ہے۔ اور مبرد نے کہا ہے: الرِّبَانِيُّون سے مراد ارباب علم ہیں، ان کا واحد ربان ہے، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے رَبَّهٖ يَرِيْئُهُ فَهُوَ رَبَّانٍ جب وہ اسے مدبر بنائے اور اسی کی اصلاح کرے، اس بنا پر اس کا معنی ہے یدبرون امور الناس ویصلحونہا وہ لوگوں کے امور کی تدبیر کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور اس میں الف اور نون مبالغہ کے لئے ہیں جیسا کہ ان کا قول رِیَان اور عطشان ہے پھر اس کے ساتھ یائے نسبت ملا دی گئی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: لِحْيَانِ۔

رَبَّعَانِ اور جتانی۔

شاعر نے کہا ہے:

لَو كُنْتُ مَرْتَهَنًا فِي الْجَوِّ انْزَلَنِي مِنْهُ الْحَدِيثُ وَ رَبَّانِي اُحْبَارِي

پس ربانی کا معنی رب العالمین کے دین کا ایسا عالم ہے جو اپنے علم کے ساتھ ساتھ عمل کرتا ہے، کیونکہ جب وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرے تو پھر عالم نہیں۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور ابورزین نے کہا ہے: ربانی سے مراد ایسا عالم ہے جو حکیم اور دانا بھی ہو۔

حضرت شعبہ نے حضرت عاصم سے، انہوں نے حضرت زر سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ فرمایا مراد ایسے حکماء ہیں جو علماء ہوں۔ ابن جبیر نے کہا ہے: مراد ایسے حکماء ہیں جو انتہائی متقی اور پرہیزگار ہوں۔

اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ حفظ قرآن کے لئے بہت محنت اور جدوجہد کو چھوڑ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ اور ابن زید نے کہا ہے: ربانیوں سے مراد ولی اور جید علماء ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے فرمایا ہے: ربانیوں احبار (علماء) سے فائق اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ قول اچھا ہے، کیونکہ احبار تو علماء ہی ہیں اور ربانی وہ ہوتا ہے جو علم بصیرت کو سیاست و دانائی کے ساتھ جمع کرتا ہے، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: رَبَّ أَمْرَ النَّاسِ يَرْثُهُ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ لوگوں کے معاملہ کی اصلاح کر دے اور اس کے نتیجے میں قائم ہو جائے، فہو رابٌّ اور رَبَّانِيٌّ تکشیر پر دلالت کرتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: میں نے کسی عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے ربانی سے مراد حلال و حرام اور امر و نہی کے بارے جاننے والا عالم ہے اور وہ جو امت کی اخبار اور جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہوگا کے بارے جاننے والا ہو۔

جس دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وصال ہوا اس دن محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہا: الیوم مات ربان هذه الأمة۔ (1) آج اس امت کے عالم ربانی کا وصال ہو گیا۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی مومن و مرد و عورت اور آزاد و غلام نہیں مگر اس پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ قرآن کا علم حاصل کرے اور اس کے دین میں تفقہ حاصل کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ آیا یہ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ابو عمرو اور اہل مدینہ نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ علم سے ماخوذ ہے۔ اور ابو حاتم نے اسی قرأت کو پسند کیا ہے۔ ابو عمرو نے کہا ہے: اور اس کی تصدیق تَدْرُسُونَ کرتا ہے (کیونکہ) التدریس سے تشدید کے ساتھ تَدْرُسُونَ نہیں کہا گیا۔ ابن عامر اور اہل کوفہ نے تعلیم سے تشدید کے ساتھ تَعْلِمُونَ پڑھا ہے اور ابو عبیدہ نے اسے اختیار کیا ہے (اور) کہا ہے: کیونکہ یہ دونوں معنوں (یعنی) تَعْلِمُونَ اور تَدْرُسُونَ کو جامع ہے۔

مکی نے کہا ہے: تشدیدِ ابلغ ہے، کیونکہ ہر معلم عالم بمعنی یُعَلِّمُ ہوتا ہے لیکن ہر وہ جو کسی شے کا علم رکھتا ہو وہ معلّم نہیں ہوتا، پس تشدیدِ علم اور تعلیم دونوں پر دلالت کرتی ہے اور تخفیف صرف علم پر دلالت کرتی ہے، پس تعلیم ابلغ اور زیادہ قابلِ تعریف ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ ذم میں ابلغ ہے۔ جنہوں نے تخفیف کی قرأت کو ترجیح دی ہے، انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کیا ہے: **كُونُوا رَٰبِثِينَ** فرمایا: تم حکماء علماء ہو جاؤ، پس یوں کہا جانا بعید ہے کونوا فقہاء حکماء علماء بتعلیمکم یعنی تم اپنی تعلیم کے ساتھ فقہاء حکماء علماء ہو جاؤ۔ حسن نے کہا ہے: تم اپنے علم کے ساتھ حکماء علماء ہو جاؤ۔ اور ابو حیوہ نے **تَذَرِّسُونَ**۔ اذرس یذرس (یعنی باب افعال) سے پڑھا ہے۔ اور حضرت مجاہد سے **تَعَلَّمُونَ** تا کے فتح اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اصل میں **تَتَعَلَّمُونَ** تھا۔

وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّنَ أَرْبَابًا ۚ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۚ

”اور وہ (مقبول بندہ) نہیں حکم دے گا تمہیں اس بات کا کہ بنا لو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا (تم خود سوچو) کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا بعد اس کے کہ تم مسلمان بن چکے ہو۔“

ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے **أَنْ يُؤْتِيَهُ** پر عطف کرتے ہوئے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے یہ قول تقویت دیتا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہم آپ کو رب بنالیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّيْنَ بِمَا لَكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا كُنْتُمْ تُدْرَسُونَ ۚ** وَلَا يَأْمُرُكُمْ اور اس میں ضمیر بشر کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں وہ انسان حکم نہیں دے گا بشر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔

اور باقیوں نے اسے پہلے کلام سے جدا ہونے اور استئناف کی بنا پر رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور اس میں ضمیر کا مرجع اللہ عز وجل کا اسم گرامی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم نہیں دے گا کہ تم بنا لو اور اس قرأت کو یہ تقویت دیتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں **وَلَكِنْ يَأْمُرُكُمْ** ہے پس یہ استئناف پر دلالت کرتا ہے اور ضمیر بھی اللہ عز وجل کے لئے ہے، اسے مکی نے ذکر کیا ہے اور سیبویہ اور زجاج نے بھی یہی کہا ہے اور ابن جریج اور ایک جماعت نے کہا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم نہیں دیں گے۔ یہی قرأت ابو عمرو، کسائی اور اہل حرین کی ہے۔

أَنْ تَتَّخِذُوا کہ تم ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو خدا بنا لو، یہ نصاریٰ میں موجود تھا وہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی تعظیم کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں خدا بنا لیا۔ **أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** یہ انکار اور تعجب کے طریقہ پر ہے، پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر حرام قرار دیا کہ وہ لوگوں کو ایسے بندے بنادیں کہ وہ ان کے خدا بن جائیں البتہ مخلوق پر ان کی حرمت کو لازم کر دیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی یہ نہ کہے عبیدی وأمتی (اے میرے بندے اور اے میری بندی) بلکہ یہ کہنا چاہیے فتائی و فتائی (اے میرے جوان اور اے میری

دو شیزہ) اور تم میں سے کوئی کسی کو یہ نہ کہے رہی۔ (اے میرے رب) بلکہ یہ کہنا چاہئے سیدی (اے میرے آقا) (1) اور قرآن کریم میں ہے اذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ اِس کے معنی کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِذَا خَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ لَمَّا اَتٰیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَ حِکْمَةٍ ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَ لَتَنْصُرُنَّہُ ۚ قَالَ ؕ اَقْرُرْتُہُمْ وَاَخَذْتُہُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اٰصْرٰی ۚ قَالُوْۤا اَقْرُرْنَا ۚ قَالَ فَاَشْہَدُوْۤا اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰہِدِیْنَ ۝۱۱

”اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ کہ قسم ہے تمہیں اس کی جو دوں میں تم کو کتاب اور حکمت سے پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو ان (کتابوں) کی جو تمہارے پاس ہیں تو تم ضرور ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی (اس کے بعد) فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اٹھالیا تم نے اس پر میرا بھاری ذمہ؟ سب نے عرض کی: ہم نے اقرار کیا (اللہ نے) فرمایا: تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔“

کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ بعض بعض کی تصدیق کریں اور بعض بعض کو ایمان کا حکم دیں (یعنی وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور ایک دوسرے پر ایمان لائیں۔) سو تصدیق کے ساتھ مدد و نصرت کرنے کا یہی معنی ہے۔ یہ قول سعید بن جبیر، قتادہ، طاؤس، سدی اور حسم، رحمہ اللہ علیہم کا ہے اور یہی آیت کا ظاہر مفہوم ہے۔ طاؤس نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام سے یہ وعدہ لیا کہ وہ بعد میں آنے والوں کے ساتھ ایمان لائیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قرأت کی ہے وَ اِذَا خَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوْۤا الْکِتٰبَ۔ کسائی نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ وَ اِذَا خَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ بمعنی وَاِذَا خَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ مَعَ النَّبِیِّیْنَ ہو۔

اور بصریوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا تو تحقیق یہ وعدہ انہیں سے لیا جو ان کے ساتھ تھے، کیونکہ انہوں نے ہی ان کی اتباع و پیروی کی اور انہوں نے ہی ان کی تصدیق کی۔ اور قول باری تعالیٰ لَمَّا میں ما بمعنی الذی ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے میں نے خلیل ابن احمد سے قول باری تعالیٰ وَ اِذَا خَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ لَمَّا اَتٰیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَ حِکْمَةٍ کے بارے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا: لَمَّا بمعنی الذی ہے۔

نحاس نے کہا ہے۔ خلیل کے قول کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے للذی اَتٰیْتُکُمْ، پھر اسم کے طویل ہونے کی وجہ سے ہا کو حذف کر دیا گیا۔ اور الذی مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر مِّنْ کِتٰبٍ وَ حِکْمَةٍ ہے اور مِّنْ بیان جنس کے لئے ہے اور یہ کہنے والے کے اس قول کی طرح ہے: لَزِیْدٌ اَفْضَلُ مِنْکَ اور یہی انْفِشْ کا قول ہے کہ یہ لام ابتدا ہے۔

المبتدوی نے بیان کیا ہے: قولہ: ثُمَّ جَآءَ کُمْ اور اس کا مابعد جملہ صلہ پر معطوف ہے اور اس سے موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر مخدوف ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ بِہ۔

قوله تعالى: ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اس آیت میں رسول سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ معین فرد کی طرف ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً... تا قوله: وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْكُمْ فَكَذَّبُوهُ۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمام کے تمام انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائیں اور آپ کی مدد کریں اگر وہ آپ کو پالیں اور انہیں یہ بھی حکم ارشاد فرمایا کہ وہ یہی وعدہ اپنی اپنی امتوں سے لیں۔ اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ میں لام اس قسم کا جواب ہے جو وعدہ لینے کی صورت میں ہے کیونکہ یہ اختلاف (قسم لینے) کے قائم مقام ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ کلام میں کہتے ہیں اخذت میثاقلک لتفعلن کذا تو اس صورت میں گویا تو نے یہ کہا: میں تجھ سے حلف لیتا ہوں اور قسم اور جواب قسم کے درمیان فاصلہ اس حرف جار کے سبب ہے جو ابن کثیرہ کی قرأت میں لَبَّأ ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور جنہوں نے اسے فتح دیا ہے انہوں نے اسے اس قسم کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے جو اخذ میثاق ہے اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ میں محذوف قسم کا جواب ہے یعنی اصل عبارت ہے۔ واللہ لتؤمنن بہ۔

مبرد۔ کسائی اور زجاج نے کہا ہے: ما شرط ہے اس پر لام تحقیق داخل ہوا ہے جیسا کہ یہ ان پر داخل ہوتا ہے، اور اس کا معنی ہے [لہما] آیتیکم، پس ما کا محل نصب ہے اور آیتیکم کا محل جزم ہے اور ثُمَّ جَاءَكُمْ کُمْ معطوف علیہ ہے، لَتُؤْمِنُنَّ بہ اس میں لام جواب و جزا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ (اسراء: 86) (اس میں لنذہبن جواب اور جزا ہے۔)

اور کسائی کا بیان ہے کہ لَتُؤْمِنُنَّ بہ قسم کا معتمد ہے اور یہ کلام اول کے ساتھ متصل ہے اور جواب و جزا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ أُولَئِكَ اس بنا پر ضمیر عائد مقدر ماننے کی ضرورت نہیں۔

اور اہل کوفہ نے لِمَا آتیتکم لام مکسور کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی بمعنی الذی ہے اور یہ اخذ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے پختہ وعدہ لیا اس لئے کہ اس نے انہیں کتاب و حکمت عطا فرمائی پھر اگر تمہارے پاس رسول آجائے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو اس وعدہ کے بعد تم ضرور ضرور اس کے ساتھ ایمان لانا، کیونکہ اخذ الميثاق، استخلاف کے معنی میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: اس بارے میں ابو عبیدہ کا قول اچھا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کا معنی یہ ہے واذا اخذ الله ميثاق الذين اتوا الكتاب لتؤمنن به لما آتیتکم من ذکر التوراة۔

اور جب اللہ نے ان سے وعدہ لیا جنہیں کتاب عطا کی گئی تو تم ضرور اس کے ساتھ ایمان لانا کیونکہ میں نے تمہیں تورات کا ذکر عطا فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ تم ضرور ضرور لوگوں کو اس کے بارے آگاہ کرو گے جو تمہارے پاس کتاب و حکمت لے کر آئے۔ ضرور ضرور لوگوں پر یہ لازم کرو گے کہ وہ (اس کے ساتھ) ایمان لائیں۔ (واذا اخذ الله ميثاق النبيين لتعلمن الناس لما جاءكم من كتاب وحكمة، ولتأخذن على الناس ان يؤمنوا) اور اس حذف پر یہ ارشاد و ال ہے وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذُلِكُمْ إِصْرِي اور یہ بھی

کہا گیا ہے کہ جنہوں نے لِمَا میں لام کو کسرہ دیا ہے وہ لام بمعنی بعد ہے، یعنی بعد ما اتیتکم من کتاب و حکمة، (بعد اس کے کہ میں تمہیں کتاب و حکمت عطا کر دوں۔)

جیسا نابغہ نے کہا ہے:

توہمت آیات لها فعرفتها لستة أعوام و ذالعام سابع
مجھے اس کی نشانیوں کا وہم ہوا تو میں نے اسے چھ سال بعد پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔ اس میں لستہ اعوام بمعنی

بعد ستہ اعوام ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے لِمَا کو مشدود پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے حین اتیتکم یعنی جب میں تمہیں عطا کر دوں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں اصل تخفیف ہو۔ پھر من زائد کر دیا گیا ہوا ان کے مذہب کے مطابق جو اس کی زیادتی کو واجب قرار دیتے ہیں تو یہ لمن ما ہو گیا اور پھر ادغام کے لئے نون کو میم سے بدل دیا گیا، پس تین میم جمع ہو گئے تو ان میں پہلے میم کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا۔ اور اہل مدینہ نے تعظیم کی بنا پر آتینا کم پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے آتیتکم صیغہ واحد پڑھا ہے۔ پھر تمام انبیاء علیہم السلام کو کتاب نہیں دی گئی بلکہ بعض کو عطا کی گئی ہے، لیکن غلبہ انہیں دیا گیا ہے جنہیں کتاب عطا کی گئی ہے۔ اور مراد تمام انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لینا ہے پس جنہیں کتاب عطا نہیں کی گئی تو وہ بھی ان کے حکم میں ہیں جنہیں کتاب دی گئی ہے کیونکہ انہیں حکم اور نبوت عطا فرمائے گئے ہیں اور یہ بھی ہے کہ جنہیں کتاب نہیں دی گئی تو انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سے پہلے والی کتاب لے لیں (اور اس کے احکام پر عمل کریں۔) نتیجتاً یہ بھی ان کی صفت کے تحت داخل ہو گئے جنہیں کتاب دی گئی۔

قوله تعالى: ءَاَقْدَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰیٰ ذٰلِكُمْ اٰصِرِيْ ؕ قَالُوْا اَقْدَرْنَا ؕ قَالَ فَاَشْهَدُوْا ؕ اَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ؕ اَقْدَرْتُمْ يٰۤاَقْرَارُ سے ماخوذ ہے۔ اور الاصر اور الاصر دو لغتیں ہیں اور اس سے مراد عہد ہے۔ لغت میں الاصر کا معنی ثقل (بوجھ) ہے۔ اور عہد کو اصر کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ بہت بڑی رکاوٹ اور سختی ہے۔ قَالَ فَاَشْهَدُوْا بمعنی اعدوا۔ فرمایا پس تم جان لو، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ زجاج نے کہا ہے: تم بیان کرو کیونکہ شاہد وہ ہوتا ہے جو مدعی کے دعویٰ کی تصحیح کرتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم گواہ بنا لو اپنے آپ پر اور اپنے تبعین پر۔ وَاَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ اور میں بھی تم پر اور ان پر گواہوں میں سے ہوں۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا ”پس تم ان پر گواہ رہنا“ تو یہ غیر مذکور سے کنایہ ہوگا۔

فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۱

”پھر جو کوئی پھر سے اس (پختہ عہد) کے بعد تو وہی لوگ فاسق ہیں۔“

من شرطیہ ہے پس انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں سے جس نے وعدہ لئے جانے کے بعد ایمان سے منہ پھیرا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ پس وہ ایمان سے خارج ہیں اور فاسق بمعنی خارج۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا
وَالِيهِ يُرْجَعُونَ ﴿٥٠﴾ قُلْ أَمَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ
وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ
رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٥١﴾

”کیا اللہ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) تلاش کرتے ہیں حالانکہ اسی کے حضور سر جھکا دیا ہے ہر چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا مجبوری سے اور اسی کی طرف وہ (سب) لوٹائے جائیں گے۔ آپ فرمائیے ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا ہم پر اور جو اتارا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ، عیسیٰ اور (دوسرے) انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے نہیں فرق کرتے ہم کسی کے درمیان ان میں سے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔“

قوله تعالى: أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ کلمی نے کہا ہے: کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے نصاریٰ کے ساتھ اپنا جھگڑا حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا اور عرض کی: ہم میں سے کون زیادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہے؟ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”دونوں فریق آپ کے دین سے بری ہیں“ (یعنی دونوں اس پر نہیں ہیں) تو انہوں نے کہا: نہ ہم آپ کے فیصلے پر راضی ہیں اور نہ ہی ہم آپ کا دین قبول کرتے ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ کیا اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) وہ تلاش کرتے ہیں۔ آیت میں غَيْرَ کو يَبْغُونَ فعل کے سبب نصب دی گئی ہے یعنی یبغون غیر دین اللہ۔ اور صرف عمرو نے یبغون کو خبر کی بنا پر یا کے ساتھ پڑھا ہے اور وَ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ کو خطاب کی بنا پر تا سے (پڑھا ہے) فرمایا: چونکہ پہلا خاص ہے اور دوسرا عام ہے لہذا معنی میں افتراق کے لئے ان کے درمیان فرق کیا گیا ہے اور حفص وغیرہ نے یبغون اور یرجعون دونوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ اور باقیوں نے دونوں کو خطاب کی بنا پر تا سے پڑھا ہے، اس ارشاد کی وجہ سے لَمَّا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ، واللہ اعلم۔

قوله تعالى: وَلَهُ أَسْلَمَ یعنی سر جھکا دیا، سر تسلیم ختم کر دیا اور تمام مخلوق اطاعت و پیروی کرنے والی اور سر جھکانے والی ہے، کیونکہ وہ ایسی فطرت پر ہے جس سے نکلنے کی وہ قدرت نہیں رکھتی۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ مومن نے خوشی اور رضامندی سے سر تسلیم خم کر لیا ہے اور کافر نے اپنی موت کے وقت مجبوری سے (سر جھکایا) اور وہ اسے کوئی نفع نہ دے گا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا (المومن: 85) (پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: کافر کا اسلام مجبوراً ہے کیونکہ اس کا سجدہ غیر اللہ کے لئے ہے اور اس کے سائے کا سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَتَّحُونَ ظِلُّهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ ذَاخِرُونَ ﴿٥٢﴾ (النحل) (کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا

ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہارِ عجز کر رہے ہیں۔ (وَاللّٰهُ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظَلُّهُمْ بِالْعُدُوِّ وَالْاَصَالِ) (الرعد) (اور اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس صورت پر پیدا فرمایا جس کا ان سے ارادہ فرمایا، پس ان میں سے کچھ حسین ہے اور کچھ قبیح، کچھ طویل ہے اور چھوٹے قد کی، کچھ صحت مند ہے اور کچھ بیمار اور تمام کے تمام مجبوراً جھکے ہوئے ہیں۔ پس صحیح رضا مندی اور خوشی سے اطاعت کرنے والے ہیں اور اسے پسند کرنے والے ہیں اور مریض جھکتے ہیں، اطاعت اختیار کرتے ہیں اگر وہ مجبور ہوں۔ اور الطوع کا معنی ہے سہولت کے ساتھ جھکنا اور اتباع کرنا۔ اور الکرہ وہ ہوتا ہے جو مشقت کے ساتھ ہو، مجبوراً ہو اور دل سے اس کا انکار ہو۔ اور طَوْعًا وَكَرْهًا دونوں مصدر ہیں اور حال کے محل میں واقع ہیں، یعنی یہ طائعتین اور مکہرہین کے معنی میں ہیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد باری تعالیٰ کے بارے فرمایا: وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا فرمایا: ”ملائکہ نے آسمان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور انصار اور عبد القیس نے زمین میں“ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تم میرے اصحاب کو گالی گلوچ نہ دو کیونکہ میرے اصحاب اللہ تعالیٰ کے خوف سے اسلام لائے اور لوگ تلوار کے خوف سے اسلام لائے“۔ (1)

اور عکرمہ نے کہا ہے: طَوْعًا سے مراد وہ ہے جس نے بغیر کسی بحث مباحثہ کے اسلام قبول کیا اور کَرْهًا سے مراد وہ ہے جس نے حجت اور دلیل نے توحید کی جانب مجبور کر دیا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَلَیِّنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَیْقُوْنَنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) (اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے اللہ نے) وَلَیِّنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَیْقُوْنَنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: 61) (اور اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنایا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے)

حسن نے کہا ہے: یہ (لفظ) عام ہے مگر اس کا معنی خاص ہے۔ اور آپ سے مروی ہے اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ اور کلام مکمل ہوئی۔ پھر فرمایا: وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا فرمایا: مجبوری سے اطاعت کرنے والا منافق ہے جسے اس کا عمل کوئی نفع نہ دے گا، اور طَوْعًا وَكَرْهًا دونوں مصدر ہیں، حال کے محل میں واقع ہیں۔ حضرت مجاہدؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی سواری سرکش ہو جائے یا وہ بدکنے لگے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے کان میں یہ آیت پڑھے: اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا الی آخر الایہ۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿ۛ﴾

”اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے اور وہ قیامت کو زیاں کاروں میں سے ہوگا۔“

غَيَّرَ يَتَّبِعُ فعل کا مفعول ہے اور دِينًا تفسیر کی بناء پر منصوب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دِينًا، يَتَّبِعُ فعل کے سبب منصوب ہو اور غَيَّرَ، الذین سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہو۔

حضرت مجاہد اور سدی رحمہما نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت جلاس بن سدید کے بھائی حارث ابن سدید کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ انصار میں سے تھا وہ اور اس کے ساتھ بارہ افراد دین اسلام سے مرتد ہو گئے اور وہ مکہ میں کفار سے جا ملے، تو یہ آیت نازل ہوئی، پھر اس نے اپنے بھائی کی طرف پیغام بھیجا جبکہ وہ توبہ کا طالب ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اس نے ان آیات کے نازل ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ہشام نے بیان کیا ہے: یعنی وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ایک زیاں کار ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو۔ تو صلہ اور موصول کے درمیان تفریق کی جاتی۔ اور مازنی نے کہا ہے: الخاسرین پر الف لام ایسے ہی ہے جسے الرجل پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ: وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۳۰﴾ کے تحت یہ گزر چکا ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾

”کیسے ہو سکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد اور وہ (پہلے خود) گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور آچکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ انصار میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا پھر وہ مرتد ہو گیا اور مشرکین سے جا ملا، بعد ازاں وہ اپنے کئے پر نادم ہوا، تو اس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا، تم میرے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرو کیا میرے لئے توبہ ہے؟ تو اس کی قوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی کیا اس کی توبہ (قبول) ہو سکتی ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾ اُولَٰئِكَ جَزَاءُ ۤهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۳۲﴾ خُلِدُوا فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِي تَابُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوا ۚ فَاِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳۴﴾ پس آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ انصار میں سے ایک آدمی مرتد ہو گیا اور مشرکین سے جا ملا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾ اُولَٰئِكَ جَزَاءُ ۤهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۳۲﴾ خُلِدُوا فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِي تَابُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوا ۚ فَاِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳۴﴾

تَابُوا (آل عمران) (کیسے ہو سکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد..... مگر وہ لوگ جنہوں نے سچے دل سے توبہ کر لی)

پس اس کی قوم نے اسے اس کی طرف بھیج دیا، تو جب اس پر یہ آیت پڑھی گئی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میری قوم نے رسول اللہ ﷺ کے پاس مجھے جھٹلایا نہیں اور نہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے بارے میں جھوٹا سمجھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تینوں کو سچا قرار دیا ہے، چنانچہ وہ تائب ہو کر واپس لوٹ آیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے توبہ کو قبول فرمایا اور اسے چھوڑ دیا۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ حضور نبی مکرم ﷺ کے بارے میں بشارت دیتے تھے اور کفر کرنے والوں کے خلاف آپ کے وسیلہ سے فتح کی دعا مانگتے تھے، لیکن جب آپ ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے سرکشی کی اور کفر اختیار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **أُولَٰئِكَ جَزَاءُ ۾ أَنۢ عَلَی۾ہُمۡ لَع۾ۃُ اللہِ وَال۾لَکَہِ وَال۾نَّاسِ أَج۾عَی۾نَ** (آل عمران) (ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی، فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔) پھر کہا گیا ہے: **کَی۾فَ لَظ۾** استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے یعنی لا یھدی اللہ اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: **کَی۾فَ یَکُونُ لِل۾ش۾کَی۾نَ عَہ۾دُ اللہِ وَعَندَ رَسلہِ** یعنی لا یكون لهم عہد (ان کے لئے کوئی عہد نہیں ہو سکتا۔)

اور شاعر نے کہا ہے:

کیف نومی علی الفراش و لئنا ییشل القوم غارۃ شعواء

اس میں بھی کیف نومی سے مراد ہے لا نومی یعنی میرے لئے کوئی غینہ نہیں۔ واللہ لا یھدی القوم الظالمین کہا جاتا ہے کہ ظاہر آیت یہ ہے کہ جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا اور جو کوئی ظالم ہوا، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا، حالانکہ ہم نے بہت سے مرتدین کو دیکھا کہ وہ اسلام لائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت عطا فرمائی اور کثیر ظالموں کو دیکھا انہوں نے اپنے ظلم سے توبہ کر لی۔ تو اسے کہا جائے گا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دے گا جب تک وہ اپنے کفر اور اپنے ظلم پر قائم رہے اور انہوں نے اسلام قبول نہ کیا، لیکن جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور توبہ کر لی تو اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں توفیق دی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

أُولَٰئِكَ جَزَاءُ ۾ أَنۢ عَلَی۾ہُمۡ لَع۾ۃُ اللہِ وَال۾لَکَہِ وَال۾نَّاسِ أَج۾عَی۾نَ ۝ خُلَی۾۾ی۾نَ فِی۾ہَا لَا یُخَفَّفُ عَن۾ہُمُ الْعَذَابُ وَلَا ہُمۡ یُنظَرُونَ ۝ إِلَّا الَّذِی۾نَ تَابُوا مِنۢ بَع۾دِ ذَٰلِکَ وَأَص۾لَحُوا ۚ فَإِنَّ اللہَ غَفُورٌ رَّحِی۾مٌ ۝

''ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی فرشتوں کی، اور سب انسانوں کی۔ ہمیشہ رہیں اسی پھٹکار میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے (سچے دل سے) توبہ کر لی اس کے بعد اور اپنی اصلاح کر لی تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (انہیں بخش دے گا)۔''

یعنی اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور لعنة الله والناس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔
وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ یعنی نہ انہیں موخر کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی، پھر اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کی استثناء فرمائی اور ارشاد فرمایا: إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ تَابُوا حَارِثِ بْنِ سُوَيْدٍ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے معنوی طور پر آیت میں ہر وہ داخل ہے جس نے اسلام کی طرف رجوع کیا اور اس کے لئے مخلص ہو گیا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ
الضَّالُّونَ ⑤

”یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں ہرگز نہ قبول کی جائے گی
ان کی توبہ اور یہی لوگ ہیں جو گمراہ ہیں۔“

حضرت قتادہ، عطا خراسانی اور حسن نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے ساتھ کفر کیا اور پھر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کا انکار کر کے اپنے کفر میں اور اضافہ کر لیا۔ اور ابوالعالیہ نے کہا ہے۔ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و صفت کے ساتھ ایمان لانے کے بعد کفر کیا۔ ثُمَّ أَزْدَادُوا كُفْرًا پھر اپنے کفر پر قائم رہ کر انہوں نے اس میں اور اضافہ کر لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: أَزْدَادُوا كُفْرًا وہ کفر میں بڑھتے ہی گئے ان گناہوں کے سبب جو انہوں نے کئے۔ اور یہ علامہ طبری کا اختیار کردہ ہے۔ اور یہ آیت ان کے نزدیک یہود کے بارے میں ہے۔

لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یہ اس آیت کی وجہ سے مشکل ہے: وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ (الشوریٰ: 25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے۔)

سو یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے موت کے وقت ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ اللَّهَ (النساء: 18) اور نہیں یہ توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لئے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آجائے کسی ایک کو ان میں سے موت (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب)

اور حضرت حسن، قتادہ اور عطاء بن ابی ریحان سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یقیناً اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کی جان (روح) حلقوم تک نہ پہنچے (1)۔“ اور اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی وہ حالت جس پر وہ کفر کرنے سے پہلے تھے (اس پر نہیں لوٹ سکتے) کیونکہ کفر نے اسے ضائع کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی جب وہ اپنے کفر سے دوسرے کفر کی طرف رجوع کریں، بلاشبہ ان کی توبہ قبول

کی جائے گی جب انہوں نے اسلام کی طرف رجوع کیا۔ اور قطرب نے کہا ہے: یہ آیت اہل مکہ میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تکالیف زمانہ کا انتظار کر رہے ہیں، پس اگر ہمارے لئے واپسی ممکن ہوئی تو ہم اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَذَادُوا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ** یعنی ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی درآنحالیکہ وہ کفر پر مقیم رہیں، پس اسے ہی توبہ غیر مقبولہ کا نام دیا ہے، کیونکہ قوم کا عزم صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ توبہ مکمل طور پر قبول فرماتا ہے بشرطیکہ عزم و ارادہ صحیح ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِّلٌ إِلَّا رِضٌ ذَهَبًا وَلَوْ أَقْتَلِ بِهِ ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَالَهُمْ مِنْ نُصْرِينَ ۝

”جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لئے) عوضانہ دے اتنا سونا، ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے ان کا کوئی مددگار۔“

الْبَلِّ کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ مقدار ہے جو کسی شے کو بھر دیتی ہے اور البَلِّ مفتحہ کے ساتھ مصدر ہے تیرا کسی شے کو بھر دینا اور کہا جاتا ہے: **أَعْطَنِي مِلَّةً وَ مِلَّةً وَ ثَلَاثَةَ أَمْلِيَةٍ**۔ اور **وَلَوْ أَقْتَلِ بِهِ** میں واو کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مقم اور زائدہ ہے۔ اور معنی یہ ہے: **فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِّلٌ إِلَّا رِضٌ ذَهَبًا وَلَوْ أَقْتَلِ بِهِ** اور علماء نحو میں سے اہل نظر نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ واو مقم ہو کیونکہ یہ معنی پر دلالت کر رہی ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: سوان میں سے کسی سے زمین بھر سونا تبرعاً قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے بطور فدیہ دے۔ اور **ذَهَبًا** فراء کے قول کے مطابق بطور تفسیر منصوب ہے۔ مفضل نے کہا ہے: تفسیر کے لئے شرط یہ ہے کہ کلام تام ہو اور وہ مبہم ہو، جیسے تیرا یہ قول ہے: **عِنْدِي عَشْرُونَ**، اس میں عدد معلوم ہے اور معدود مبہم ہے، پس جب تو نے درہتا کہا تو تو نے تفسیر بیان کر دی۔ بلاشبہ اسے بطور تمیز نصب دی گئی ہے کیونکہ اس کے لئے کوئی ایسا عامل نہیں ہے جو اسے کسرہ دے رہا ہو اور نہ ہی اسے کوئی رفع دینے والا عامل ہے۔ اور نصب خفیف ترین حرکت ہے اور یہ ہر اس کے لئے بنائی گئی ہے جس میں کوئی عامل نہ ہو۔ اور کسائی نے کہا ہے: اسے **مِنْ** کو مضمّر کر کے نصب دی گئی ہے۔ یعنی اصل میں تھا **مِنْ ذَهَبٍ**، جیسا کہ اس قول میں ہے: **أَوْ عَدَلْ ذَٰلِكَ صِيَامًا**۔ ای **مِنْ صِيَامٍ**۔

اور بخاری اور مسلم میں حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن کافر کو لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا: تیرا کیا خیال ہے اگر تیرے لئے زمین بھر سونا ہو۔ کیا تو اسے بطور فدیہ دے سکتا ہے؟ تو وہ کہے گا۔ ہاں۔ پھر اسے کہا جائے گا: تحقیق تجھ سے ایسی چیز کا مطالبہ کیا تھا جو اس سے بہت زیادہ آسان تھی۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم نے قد کنت کی بجائے کذبت، قد سئلت کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ (تو نے جھوٹ بولا ہے حالانکہ تجھ سے اس کا سوال کیا گیا تھا۔) (1)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

”ہرگز نہ پاسکو گے تم کامل نیکی (کارتبہ) جب تک نہ خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ائمہ کرام نے روایت بیان کی ہے اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا! ہمارا رب ہمارے مالوں کے بارے میں ہم سے سوال کر رہا ہے پس یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو گواہ بناتا ہوں اس پر کہ میں نے اپنی زمین اللہ تعالیٰ کے لئے دے دی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو اسے اپنے قرابتداروں حسان ابن ثابت اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما میں تقسیم کر دے۔“ (1)

اور المؤمنو طامیں ہے ”ان کے اموال میں سے ان کے نزدیک پسندیدہ مال بیرحاء تھا اور وہ مسجد کے سامنے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جاتے تھے اور اس کا میٹھا اور طیب پانی نوش فرماتے تھے۔“ پھر آگے وہی حدیث ذکر کی۔ تو اس آیت میں خطاب کے ظاہر اور اس کے عموم کو عمل میں لانے پر دلیل موجود ہے، کیونکہ جب آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے کوئی معنی مذکور کلام سے نہیں سمجھے۔ کیا آپ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے نہیں کہ جب انہوں نے آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا الْآیۃ سنی تو انہوں نے توقف کی ضرورت محسوس نہیں کی یہاں تک کہ دوسری آیت کے ذریعہ اس کا بیان اور وضاحت آجائے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے خرچ کریں یا کوئی سنت سامنے آجائے جو اس کی وضاحت کرنے والی ہو کیونکہ وہ تو بہت سی اشیاء کو پسند کرتے ہیں۔

اور اسی طرح حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بھی کیا کہ آپ نے اپنے پسندیدہ گھوڑے کا قصد کیا اسے سبیل کہا جاتا تھا اور کہا: اے اللہ! یقیناً تو جانتا ہے کہ میرے نزدیک میرے اس گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ مال کوئی نہیں ہے، پس آپ اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے اور عرض کی: یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان ہے (اسے قبول فرمائیے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ”اسے قبضے میں لے لو“ تو گویا حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے اپنے دل میں کچھ (وہم سا) پایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ قد قبلہا منك بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اسے تجھ سے قبول فرمالیا ہے۔ اسے اسد بن موسیٰ نے ذکر کیا ہے (2)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے غلام نافع کو آزاد کیا اور اس میں حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے انہیں ہزار دینار عطا کئے۔ صفیہ بنت ابی عبید نے کہا ہے: میں ان کے بارے گمان کرتی ہوں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل کی: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔

اور شبل نے ابونعیم سے اور انہوں نے حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ وہ مدائن کسریٰ کی فتح کے دن جلواء کے قیدیوں سے ان کے لئے ایک لونڈی خریدیں، تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا تو اس نے آپ کو بہت خوش کیا، تو انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کر دیا۔ اور حضرت ثوری سے مروی ہے کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ربیع بن خثیم کی ام ولد نے بیان کیا ہے کہ جب ان کے پاس کوئی سائل آتا تو وہ مجھے فرماتے اے فلانہ! سائل کو شکر دے دو، کیونکہ ربیع شکر بہت پسند کرتا تھا۔ سفیان نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی (یہی) تاویل کرتے ہیں: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ شکر کی بوریاں خریدتے تھے اور انہیں صدقہ کر دیتے تھے تو آپ سے عرض کی گئی: آپ اس کی قیمت کیوں نہیں صدقہ کر دیتے؟ تو آپ نے فرمایا: کیونکہ شکر میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی زیادہ پسندیدہ اور محبوب شے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کر دوں۔

اور حسن نے کہا ہے: یقیناً تم اسے ہرگز نہیں پاسکو گے جسے تم پسند کرتے ہو مگر اسے چھوڑ کر جس کی خواہش اور چاہت تم رکھتے ہو اور تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے جس کی تم آرزو رکھتے ہو مگر اس پر صبر کرتے ہوئے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ الْبِرُّ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے: اس سے مراد جنت ہے، یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عطا، حضرت مجاہد، عمرو بن میمون اور سدی رضی اللہ عنہم ورحمہم اللہ عنہم سے منقول ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی۔ لَنْ تَنَالُوا ثَوَابَ الْبِرِّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (تم نیکی کا ثواب ہرگز نہیں پاسکتے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔) اور الثَّوَالُ بمعنی عطا ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے تولتہ تنویداً یعنی میں نے اسے عطا کیا۔ اور نالنی من فلان معروف ینالنی، یعنی وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ سو معنی یہ ہوگا: تم ہرگز جنت تک نہ پہنچ سکو گے اور نہ تم اسے پاسکو گے یہاں تک کہ تم خرچ کر دو (راہ خدا میں) ان چیزوں میں سے جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔

اور بعض نے کہا ہے: البر سے مراد عمل صالح (نیکی) ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ”تم پر سچ بولنا لازم ہے کیونکہ سچائی عمل صالح کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور عمل صالح جنت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔“ (1) ”سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔

عطیہ العوفی نے کہا ہے: الْبِرُّ سے مراد طاعت ہے۔ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: تم ہرگز دین اور تقویٰ کا شرف و مرتبہ نہ پاسکو گے یہاں تک کہ تم صدقہ کرو در آنحالیکہ تم صحت مند اور حریص ہو، تم زندگی کی آرزو رکھتے ہو اور فقر و افلاس سے ڈرتے ہو۔ اور حسن سے منقول ہے کہ حَتَّى تُنْفِقُوا سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ مجاہد اور کلبی نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے اسے آیت زکوٰۃ نے منسوخ کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے خرچ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو خیر اور نیکی کی راہ میں مثلاً صدقہ یا علاوہ ازیں دیگر طاعات وغیرہ اور یہ جامع معنی ہے۔ اور نسائی نے صعصعہ بن معاویہ سے روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا: میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ملا تو میں نے کہا کوئی حدیث بیان فرمائیے تو انہوں نے کہا: ہاں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو مسلمان آدمی اپنے ہر مال سے جوڑا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو جنت کے تمام دربان اس کا استقبال کریں گے اور ان میں سے ہر کوئی اسے اس کی طرف بلائے گا جو اس کے پاس ہے۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: اگر تو وہ (مال) اونٹ ہیں تو پھر دو اونٹ (صدقہ کرے) اور اگر وہ گائیں ہیں تو پھر وہ دو گائیں (صدقہ کرے)۔ اور ابو بکر الوراق نے کہا ہے: (اللہ تعالیٰ نے) اس آیت کے ساتھ مکارم اخلاق پر ان کی راہنمائی کی ہے۔ یعنی تم ہر گز اپنے ساتھ میری نیکی کو نہیں پاسکو گے مگر اس طرح کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرو اور اپنے اموال اور جاہ و حشمت میں سے ان پر خرچ کرو، پس جب تم اس طرح کرو گے تو پھر میری نیکی، احسان اور میرا لطف و مہربانی تمہیں آپہنچے گی۔

حضرت مجاہد نے کہا: یہ اس ارشاد کی مثل ہے: وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حَيْثُ مَسْكِنَتَا - وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ یعنی جب وہ جانتا ہے تو اس پر جزاء عطا فرمائے گا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَةُ ۚ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٥٠﴾
اِفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٥١﴾

”سب کھانے کی چیز حلال تھیں بنی اسرائیل کے لئے مگر وہ جسے حرام کیا اسرائیل نے اپنے آپ پر اس سے پہلے کہ نازل کی گئی تورہ۔ آپ فرماؤ: لاؤ تورہ پھر پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔ پس جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اس کے بعد تو وہی ظالم ہیں۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حَلَالًا یعنی حلال۔ (کھانے کی ہر چیز حلال تھی۔) پھر استثنا کی اور فرمایا: إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: آپ ہمیں بتائیے، کون سی شے اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اپنے آپ پر حرام کی تھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ جنگل میں رہتے تھے اور وہ عرق النساء (کی بیماری) میں مبتلا ہو گئے اور وہ اونٹوں کے گوشت اور ان کے دودھ کے سوا کوئی پسندیدہ اور مناسب شے نہ پاتے تھے۔“ انہوں نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے۔ (1) اور حدیث ذکر کی۔ اور کہا جاتا ہے: (بے شک آپ نے) نذر مانی کہ اگر آپ اس بیماری سے شفا یاب ہو گئے تو وہ اپنا پسندیدہ کھانا پینا چھوڑ دیں گے اور آپ کے نزدیک پسندیدہ کھانا پینا اونٹ کا گوشت اور ان کا دودھ تھا۔

حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور سدی رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام حرام سے بیت المقدس کا ارادہ کرتے ہوئے آئے جبکہ آپ اپنے بھائی عیصو سے بھاگے، آپ انتہائی مضبوط اور قوی آدمی تھے، پس آپ کی ملاقات ایک

فرشتے سے ہوئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے گمان کیا کہ یہ ڈاکو ہے چنانچہ آپ نے اس کے ساتھ لڑائی کی کہ آپ اس کو پچھاڑ دیں، تو فرشتے نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ران پر کچوکا لگایا اور پھر وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا اور یعقوب علیہ السلام اس کی طرف دیکھتے رہے تو اس طرح آپ پر عرق النساء کی بیماری غالب آگئی اور اس کے سبب شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئے، درد کی وجہ سے رات کو نیند نہ آتی تھی بلکہ آپ چیختے ہوئے رات گزارتے تھے، تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں شفاء عطا فرمادی تو (ہڈی نہیں کھائیں گے) اور نہ ہی وہ ایسا کھانا کھائیں گے جس میں ہڈی ہوگی تو انہوں نے اسے اپنے اوپر حرام کر لیا، تو اس کے بعد ان کے بیٹے بھی ان کی پیروی کرنے لگے اور وہ گوشت سے ہڈیوں کو نکال دیتے تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو فرشتے کا کچوکا لگانے کا سبب یہ تھا کہ وہ نذر مانیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بارہ بیٹے عطا فرمائے اور وہ صحیح سالم بیت المقدس آئے تو وہ ان میں سے آخری کو ذبح کریں گے۔ پس وہ ان کی نذر سے نکلنے کے لئے تھا، حضرت ضحاک سے یہی منقول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا یہ تحریم حضرت یعقوب علیہ السلام کے اپنے اجتہاد سے تھی یا اللہ تعالیٰ کے اذن سے؟ تو اس میں صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کی نسبت ان کی طرف کی ہے۔ فرمایا **إِلَّا مَا حَظَّمَهُ** اور یہ کہ نبی کو جب اس کا اجتہاد کسی حکم تک پہنچا دے تو وہ دین ہوتا ہے اور اس کی اتباع ہمارے اوپر لازم ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے اس پر پختہ فرمادیتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے اور اس کی اتباع لازم ہو جاتی ہے، اسی طرح اس کو اجازت دی جاتی ہے اور وہ اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد کا موجب متعین ہو جاتا ہے جب وہ اس پر قادر ہو اور اگر اس کے لئے اس کی تحریم کے بارے پہلے اجازت نہ ہو تو وہ تحلیل و تحریم کی جانب بغیر اجازت کے نہیں بڑھتا۔ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح روایت کے مطابق شہد کو حرام کیا (1) یا اپنی کنیز ماریہ کو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تحریم کی توثیق نہ کی اور یہ ارشاد نازل ہوا۔ **لَمْ تُحَظَّمْ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ** اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

الکلیا الطبری نے کہا ہے یہ کہا جانا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مطلق ارشاد **لَمْ تُحَظَّمْ مَا أَحَلَّ اللَّهُ** تقاضا کرتا ہے کہ یہ ماریہ کے ساتھ مختص نہ ہو۔

اور امام شافعی نے یہ رائے بیان کی ہے کہ اس صورت میں کفارہ کا واجب ہونا غیر معقول ہے، تو آپ نے اسے محل نص کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ دراصل کفارہ ہر مباح کو حرام قرار دینے کی صورت میں ہے اور آپ نے اسے قسم کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْبَةِ فَأَتُوبُهَا إِنَّ كُنتُمْ صَادِقِينَ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء میں مبتلا ہوئے تو حکماء نے آپ کے لئے یہ تجویز کیا کہ آپ اونٹ کے گوشت سے پرہیز کریں چنانچہ آپ نے اسے اپنے آپ پر حرام قرار دیا۔ پھر یہودیوں نے کہا: بلاشبہ ہم اپنے آپ پر اونٹ کا گوشت حرام

1۔ صحیح بخاری، باب لم تعمر ما احل الله لك، حدیث نمبر 4862، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قرار دیتے ہیں، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے حرام قرار دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تحریم کا حکم تورات میں نازل فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی اور ان کا رد کر دیا اور فرمایا: اے محمد! **مَنْ يَكْفُرْ بِاللَّسْوَةِ فَاَتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** لیکن وہ نہ لائے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **فَمِنْ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ** زجاج نے کہا ہے: ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کے لئے اس آیت میں بہت بڑی دلیل ہے، آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ یہ ان کی کتاب میں نہیں ہے اور آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ تورات لے آئیں لیکن انہوں نے انکار کیا۔ یعنی انہوں نے یہ پہچان لیا کہ آپ ﷺ نے وحی کے سبب یہ ارشاد فرمایا ہے۔

اور عطیہ العوفی نے کہا ہے: بلاشبہ وہ ان پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے حرام کرنے کی وجہ سے حرام ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ اسرائیل نے اس وقت کہا جب انہیں عرق النساء کا مرض لاحق ہوا: قسم بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے عافیت اور صحت عطا فرمائی تو کوئی بچہ اسے (گوشت کو) نہیں کھائے گا، حالانکہ وہ ان پر حرام نہیں کیا گیا تھا۔ اور کلبی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے تورات میں ان پر حرام نہیں کیا بلکہ تورات کے بعد ان کے ظلم اور کفر کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا۔ اور بنی اسرائیل جب بڑے بڑے گناہ کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر پاکیزہ اور طیب کھانا حرام کر دیا یا ان پر عذاب نازل کر دیا اور وہ موت ہے، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَيُظْلَمُ مِّنَ الَّذِيْنَ هٰذَا حَرَمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء: 160)** (سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لئے) اور ارشاد گرامی ہے: **وَعَلَى الَّذِيْنَ هٰذَا حَرَمْنَا مَنَآكِلَ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَمْنَا عَلَيْهِمْ شَحُوْمَهُمَا اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا اَوِ الْحَوَايَا اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذٰلِكَ جَزٰئُهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۗ وَاِنَّ لَاصْدٰقُوْنَ ۝۱۰ (الانعام)** (اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور..... یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں۔)

مسئلہ نمبر 4۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں یہ عنوان ذکر کیا ہے **دواء عرق النساء** ہشام بن عمار اور راشد ابن سعید الرملی نے بیان کیا ہے کہ ولید بن مسلم، ہشام بن حسان، انس بن سیرین تمام نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا، عرق النساء کا علاج جنگلی بکری کی لاث ہے جسے پگھلایا جائے، پھر اسے تین اجزاء میں تقسیم کیا جائے، پھر ہر روز ایک جز نہار منہ پیا جائے۔“ (1)

اور ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرق النساء کے بارے میں ارشاد فرمایا: ”عربی مینڈھے کی لاث لی جائے نہ وہ چھوٹا ہو اور نہ ہی بہت بڑا اور اسے چھوٹا چھوٹا کاٹ لیا جائے اور پھر اس کی چربی پگھلا کر نکال لی جائے اور اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر روز ایک تہائی حصہ نہار منہ لے لیا جائے۔“ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے سو سے زیادہ افراد کو اس کے بارے میں بتایا اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے

1۔ ابن ماجہ، باب دواء عرق النساء، حدیث نمبر 3453، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تندرست ہو گئے۔

حضرت شعبہ نے بیان کیا ہے: حجاج بن یوسف کے زمانے میں عرق النساء کے متعلق ایک شیخ نے مجھے بتایا: میں تجھے عظمت و شان والے اللہ کی قسم دیتا ہوں اگر تو (اس سے) تندرست نہ ہو تو میں تجھے آگ کے ساتھ داغ دوں گا یا تجھے استرے کے ساتھ مونڈ دوں گا۔ حضرت شعبہ نے بیان کیا: تحقیق میں نے اس کا تجربہ کیا، تو اسے کہہ، اور تو اس جگہ پر اسے کل دے۔

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ ۖ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ⑤

”آپ کہہ دیجئے: سچ فرمایا ہے اللہ نے پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو ہر باطل سے الگ تھلگ تھے اور (بالکل) نہ تھے وہ شرک کرنے والوں سے۔“

اے محمد! ﷺ آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے، بلاشبہ وہ تورات میں حرام نہیں کیا گیا ہے۔ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ یہ ان کے باطل دعویٰ کو انہی پر رد کرنا اور لوٹانا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبْرَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ⑥ فِيهِ آيَاتٌ

بَيَّنَّتْ مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۚ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ

اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ⑦

”بے شک پہلا (عبادت) خانہ جو بنایا گیا لوگوں کے لئے وہی ہے جو مکہ میں ہے، بڑا برکت والا، ہدایت (کا سرچشمہ) ہے سب جہانوں کے لئے۔ اس میں روشن نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے اور جو بھی داخل ہو اس میں ہو جاتا ہے (ہر خطرہ سے) محفوظ۔ اور اللہ کے لئے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی اور جو شخص (اس کے باوجود) انکار کرے تو بے شک اللہ بے نیاز ہے سارے جہان سے۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس پہلی مسجد کے بارے میں پوچھا جو زمین پر بنائی گئی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسجد حرام“۔ میں نے عرض کی پھر کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ نے فرمایا: ”مسجد اقصیٰ“۔ میں نے عرض کی: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”چالیس سال، پھر ساری زمین تیرے لئے مسجد بنا دی گئی جہاں کہیں تجھے نماز کا وقت ہو جائے تو تو وہیں نماز پڑھ لے۔“ (1)

حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس سے پہلے کوئی عبادت خانہ نہیں بنایا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیت سے پہلے بیوت تو کثیر تھے، لیکن یہاں بیت سے مراد وہ ہے جو عبادت کے لئے سب سے

1۔ صحیح بخاری، باب یزفون النسلان لی المشق، حدیث نمبر 3115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اول بنایا گیا۔

اور حضرت مجاہد نے بیان کیا: مسلمان اور یہودی ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے پس یہودیوں نے کہا: بیت المقدس کعبہ سے افضل اور اعظم ہے، کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت گاہ ہے اور ارض مقدس میں ہے۔ اور مسلمانوں نے کہا: (نہیں) بلکہ کعبہ معظمہ افضل ہے۔

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور سورۃ البقرہ میں بیت اللہ کی بناوٹ اور سب سے اول جس نے اسے بنایا اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین کی کسی شے کو تخلیق فرمانے سے دو ہزار برس پہلے اس بیت کی جگہ کو تخلیق فرمایا اور اس کی بنیادیں نیچے والی ساتویں زمین میں ہیں اور جہاں تک مسجد اقصیٰ کا تعلق ہے تو اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے، جیسا کہ اسے امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بیت المقدس کو بنایا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے تین خصلتوں اور اعزاز کا سوال کیا [انہوں نے اللہ تعالیٰ سے] حاکم بنائے جانے کی التجا کی کہ وہ انہیں حکومت عطا فرمائے۔ پس وہ انہیں عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملک کی التجا کی کہ آپ کے بعد کسی کے لئے ایسی بادشاہی نہ ہو پس وہ بھی آپ کو عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کی جب وہ مسجد بنانے سے فارغ ہوئے کہ جو بھی اس میں آکر نماز ادا کرے تو وہ اسے گناہوں سے اسی طرح پاک کر دے جس طرح وہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا پس یہ اعزاز بھی انہیں عطا کر دیا گیا۔“ دونوں حدیثوں کے درمیان اشکال ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے درمیان طویل مدت کا فاصلہ ہے اہل تواریخ نے کہا ہے: وہ مدت ہزار برس سے زیادہ ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے اسے نئے سرے سے بنایا جس کی بنیاد ان کے سوا (کسی اور) نے رکھی تھی۔ اور یہ روایت ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف بنایا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس یہ جائز ہے کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد میں سے کسی نے چالیس سال بعد بیت المقدس کو تعمیر کیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ملائکہ نے ہی بیت اللہ کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسے بنایا ہو، یہ سب احتمالات ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو زمین میں گھر بنانے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ کہ وہ اس کا طواف کریں اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تھا، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اسے ہی بنایا جو پہلے بنایا جا چکا تھا اور اس کا طواف کیا، پھر ان کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بناوٹ کو مکمل کیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لَلَّذِي بِهَيْكَلَةٍ يَرَانِ كِي خَيْرٌ ہے اور اس میں لام برائے تاکید ہے اور بئکۃ سے مراد وہ خاص جگہ ہے جہاں بیت اللہ شریف ہے اور مکہ تو سارا شہر ہے، یہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

اور محمد بن شہاب نے کہا ہے کہ بئکۃ سے مراد مسجد ہے اور مکہ سے مراد سارا حرم ہے، اس میں گھر داخل ہوتے ہیں۔ اور مجاہد

نے کہا ہے: بکۃ سے مراد مکہ ہی ہے۔ پس اس میں میم کو با سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ عربوں نے کہا ہے: طین لازب و لازم، حضرت ضحاک اور مورج نے یہی کہا ہے۔

پھر یہ کہا گیا ہے کہ بکۃ، البکۃ سے مشتق ہے اور اس کا معنی ازدحام اور بھیڑ ہے۔ جب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو کہا جاتا ہے تبان القوم۔ طواف کی جگہ لوگوں کی بھیڑ اور ازدحام ہونے کی وجہ سے اس کا نام بکۃ رکھا گیا ہے۔ اور البکۃ کا معنی ہے دق العنق۔ گردن توڑنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام بکۃ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ بڑے بڑے جابروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جب وہ اس میں ظلم و زیادتی کی طرف مائل ہوں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب بھی کسی جابر نے برائی کی نیت سے اس کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پاش پاش کر دیا۔ اور رہا مکہ! تو کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام پانی کی قلت کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ اس کا قصد کر کے آنے والا اتنی مشقت پاتا ہے جو اس کی ہڈیوں سے گودا اور مغز کو خشک کر دیتی ہے، یہ معنی ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: مککت العظم اذا خرجت مافیہ۔ یعنی ہڈیوں میں جو کچھ ہے تو وہ سب نکال لے تب کہے گا مککت العظم (میں نے ہڈی کو خالی کر لیا) اور مکت الفصیل ضرع امہ و امتکۃ جب بچھڑا کھیری میں موجود سارا دودھ چوس لے اور اسے پی لے تب یہ کہا جاتا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

مکت فلم تثبق فی اجوافها درنا

انہوں نے دودھ چوسا اور ان میں کوئی دودھ نہ چھوڑا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ اسے ہلاک اور تباہ کر دیتا ہے جو اس میں ظلم و زیادتی کرے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ لوگ اس میں تمسخر کرتے تھے اور ہنستے تھے اور یہ معنی اس ارشاد باری تعالیٰ سے لیا گیا ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً۔ یعنی وہ اس میں تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ اور یہ اس کے منصرف ہونے کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ مکۃ دو حرفی مضاعف ہے۔ اور مُكَاءٌ حرفی معتل ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مُبَارَكًا سے مبارک بنایا کیونکہ اس میں عمل کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور برکت کا معنی کثرة الخیر ہے۔ اور یہ لفظ وَضِعٌ کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا بکۃ سے ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور معنی یہ ہے: الذی استقر بکۃ مبارکاً (یعنی وہ جو مکہ میں قیام پذیر رہا جس میں برکت رکھ دی گئی۔)

اور غیر قرآن میں مبارک پڑھنا بھی جائز ہے یا تو اس لئے کہ یہ خبر ثانی ہے یا اس لئے کہ یہ الذی سے بدل ہے یا اس بنا پر کہ مبتدا مضمّر ہے وَهَذِي لِلْعَلَمِينَ یہ اس پر معطوف ہے۔ اور یہ وہو هَذِي لِلْعَلَمِينَ کے معنی میں ہوگا۔ اور غیر قرآن میں اسے مبارک جہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے اس صورت میں یہ البیت کی نعت اور صفت ہوگا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ اسے مبتدا یا صفت ہونے کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ اہل مکہ، ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے آیۃ بینۃ واحد پڑھا ہے، یعنی مقام ابراہیم واحد اور ایک ہے۔ انہوں نے کہا کہ مقام

ابراہیم میں ان کے قدموں کا نشان ایک واضح اور ظاہر علامت ہے۔ اور حضرت مجاہد نے مقام ابراہیم کی تفسیر پورے حرم سے کی ہے۔ اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس کی آیات اور نشانیوں میں سے صفا اور مروہ، رکن اور مقام ابراہیم ہیں۔ اور باقیوں نے اسے جمع کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اس سے ارادہ مقام ابراہیم، حجر اسود، حطیم، زمزم اور دیگر تمام مشاعر کا کیا ہے۔

فرمایا: ابو جعفر الخاس نے کہا ہے: جنہوں نے آیات بینات پڑھا ہے تو ان کی قرأت زیادہ واضح اور بین ہے، کیونکہ صفا اور مروہ بھی آیات و علامات میں سے ہیں۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ پرندہ صحیح سالم حالت میں بیت اللہ شریف سے بلند نہیں ہو سکتا۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب کوئی شکاری شکار کو تلاش کر رہا ہو تو جب وہ حرم پاک میں داخل ہو جائے تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ بارش جب رکن یمانی کی جانب ہو تو ہریالی اور شادابی یمین میں ہوتی ہے۔ اور جب رکن شامی کی جانب ہو تو شادابی شام میں ہوتی ہے۔ اور جب پورے بیت اللہ پر ہو تو شادابی سارے شہروں میں آتی ہے اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جمرات پر جس قدر اضافہ کیا جاتا ہے وہ ایک ہی مقدار پر دکھائی دیتے ہیں۔

اور المقام ان کے اس قول سے ہے قمت مقاما اور یہ وہ جگہ جس میں کھڑا ہوا جاتا ہے اور المقام تیرے اس قول سے ہے اقامت مقاما اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور مقام میں اختلاف بھی گزر چکا ہے اور اس میں صحیح یہ ہے اور المقام مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور خبر مخدوف ہے اور تقدیر کلام ہے: منها مقام ابراہیم۔ اخفش نے یہی کہا ہے اور محمد بن یزید نے بیان کیا ہے کہ مقام آیات سے بدل ہے اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے۔ یعنی بمعنی ہی مقام ابراہیم ہے۔ اور کلام عرب میں اخفش کا قول معروف ہے جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

لها متاع و أعوان غَدَوْنَ بِهٖ - قَتَبَتْ وَ غَرِبَ إِذَا مَا أُفْرِغَ انْشَحَقَا

یعنی اس کا بہاؤ دور ہو گیا اور ختم ہو گیا..... اور ابوالعباس کا قول ہے۔ بے شک مقام بمعنی مقامات ہے، کیونکہ یہ مصدر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَتَّمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ۔

اور شاعر نے کہا:

إِنَّ الْعَيُونَ الَّتِي فِي طَرَفِهَا مَرَضٌ

یعنی فی اطرافہا۔

اور اسے وہ حدیث جو اس طرح مروی ہے اور تقویت دیتی ہے۔ الحج [كله] مقام ابراہیم (کہ حج سارے کا سارا مقام ابراہیم ہے۔)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ بھی حرم پاک کی نشانیوں میں سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے، کیونکہ اس کے گرد و نواح سے لوگوں کو لوٹ لیا جاتا تھا، لیکن اس میں کوئی جابر اور ظالم نہیں داخل ہوتا تھا، حالانکہ وہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اسے پامال کیا اور حرم پاک تک کسی کو نہ پہنچنے دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ

نے ارشاد فرمایا: أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۖ (الفیل) (کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔)

اور بعض اہل معانی نے کہا ہے: آیت سورہ توخبر ہے حالانکہ اس میں معنی امر کا ہے، تقدیر کلام یہ ہے ومن دخله فآمنوه (اور جو اس میں داخل ہو جائے تو تم اسے امن اور پناہ دے دو۔) جیسا کہ یہ قول ہے: فَلَا رَفْتَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (یعنی نہ تم برائی کی باتیں کرو اور نہ فسق کا ارتکاب کرو اور نہ ہی آپس میں جھگڑا فساد کرو۔) اسی معنی کی وجہ سے امام سابق حضرت نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اور اس کے سبب وہ حد کا مستحق بن گیا پھر اس نے حرم پاک میں پناہ لے لی تو اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے امن اور پناہ کو واجب قرار دیا جو اس میں داخل ہو گیا اور یہی سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر افراد ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے (1): ”ہر وہ جس نے یہ کہا ہے وہ دو اعتبار سے وہم میں مبتلا ہوا ہے۔“ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آیت کو سمجھا ہی نہیں کہ یہ ماضی میں ہونے والے واقعہ کی خبر ہے اور اس سے مستقبل کے حکم کا اثبات مقصود نہیں اور دوسرا یہ ہے کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ امن اور پناہ گزر چکی ہے اور یہ کہ قتل و قتال اس کے بعد اس میں واقع ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خبر واقع نہ ہوگی بخلاف اس کے جس کی خبر دی گئی ہے، پس یہ بھی اس پر دلیل ہے کہ یہ ماضی میں ہو چکا ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: جب وہ حرم میں پناہ لے لے تو اسے نہ کھلایا جائے گا اور نہ پلایا جائے گا، نہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا جائے گا اور نہ ہی کلام اس سے کی جائے گی یہاں تک کہ وہ باہر نکل آئے، پس اسے نکلنے پر مجبور کرنا اس کے ساتھ اس کا امن میں ہونا اور محفوظ ہونا صحیح نہ ہوگا۔ اور آپ ہی سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: حرم پاک میں اعضاء میں قصاص واقع ہو سکتا ہے حالانکہ اس کے ساتھ بھی امن صحیح نہیں ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ حرم پاک میں حدود قائم کی جاسکتی ہیں، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن خطل کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا حالانکہ وہ غلاف کعبہ کے ساتھ چمٹا پڑا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ثوری نے منصور سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جس کسی نے حرم میں حد کا ارتکاب کیا تو اس پر حرم میں حد قائم کی جائے گی اور اگر حل میں اس کا ارتکاب کیا اور پھر حرم میں پناہ لے لی تو اس سے نہ کلام کی جائے اور نہ خرید و فروخت کی جائے یہاں تک کہ وہ حرم پاک سے نکل آئے تو پھر اس پر حد قائم کی جائے گی اور یہی امام شعبی کا قول ہے اور یہی کوفیوں کی حجت اور دلیل ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آیت کے معنی سے یہی سمجھے ہیں اور وہ حبر الامۃ اور عالم الامۃ ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس سے ہر اس پر نعمتوں کے شمار کرنے کا ارادہ اور قصد کیا گیا ہے جو ان سے جاہل اور ناواقف ہے اور عرب میں اس کے منکر بھی تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا مَّا أُمِنَّا وَيُحْتَفَفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت: 67) (کیا

انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنادیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے۔ پس وہ دور جاہلیت میں تھے جو کوئی اس میں داخل ہوتا اور اس میں پناہ لے لیتا تو وہ قتل و غارت سے امن میں ہو جاتا، جیسا کہ اس کا بیان سورہ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: جو کوئی دور جاہلیت میں اس میں داخل ہوا وہ امن پانے والا اور محفوظ ہو گیا۔ اور یہ حسن اور اچھا ہے (1)۔

اور روایت ہے کہ کسی ملحد نے بعض علماء کو کہا: کیا قرآن کریم میں نہیں ہے وَمَنْ دَخَلَ كَانَ اِمْنًا پس ہم اس میں داخل ہوئے اور ہم نے اس اس طرح کیا اور جو کوئی اس میں تھا وہ محفوظ نہیں ہوا۔ تو انہوں نے انہیں کہا: کیا تو عربوں میں سے نہیں ہے! جو کوئی یہ کہتا ہے من دخل داری کان امنًا (جو کوئی میرے گھر میں داخل ہو گیا وہ محفوظ ہو گیا) وہ اس سے کیا مراد لیتا ہے؟ کیا یہ اسی طرح نہیں کہ کوئی اپنی اطاعت اور پیروی کرنے والے کو کہے: کف عنه فقد امنتہ و کففت عنه؟ (تو اس سے رک جا تحقیق میں نے اسے پناہ دے رکھی ہے اور تو اس سے رک جائے؟ اس نے کہا: ہاں کیوں نہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: پس اسی طرح یہ قول ہے۔ وَمَنْ دَخَلَ كَانَ اِمْنًا۔

اور یحییٰ بن جعدہ نے کہا ہے: وَمَنْ دَخَلَ كَانَ اِمْنًا کا معنی ہے یعنی وہ آگ (کے عذاب) سے محفوظ ہو گیا۔ میں (مفسر) کہتا ہوں یہ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث شفاعت منقول ہے: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی قیامت کے دن حق کی بحث میں مومنین سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو قسم دلانے والا نہ ہوگا جو کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان بھائیوں کے لئے اصرار کر رہے ہوں جو کہ جہنم میں ہوں گے اے ہمارے رب! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج ادا کرتے تھے، تو انہیں کہا جائے گا: اسے نکال لو جسے تم پہنچانتے ہوں“ الحدیث (2)۔ بلاشبہ وہ آگ سے محفوظ ہو جائے گا جو مناسک ادا کرنے کے لئے اس میں داخل ہوا اس کی تعظیم کرتے ہوئے، اس کے حق کو پہنچانتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے۔

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: جو کوئی پورے اخلاص اور صفائے باطن کے ساتھ اس میں داخل ہوا جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اس میں داخل ہوئے تو یقیناً وہ اس کے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: ”جس نے حج کیا اور برائی کے بارے کوئی گفتگو نہ کی اور نہ ہی فسق کا مرتکب ہوا تو وہ اپنے گناہوں سے اسی طرح پاک ہو گیا جیسے اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا اور حج مبرور کی جزا سوائے جنت کے اور کوئی نہیں۔“ حسن نے بیان کیا ہے: حج مبرور یہ ہے کہ وہ دنیا سے دوری اختیار کرتے ہوئے اور آخرت میں رغبت رکھتے ہوئے واپس لوٹے۔

اور یہ اشعار بھی کہے:

یا کعبۃ اللہ دعویٰ اللّٰجی دعویٰ مستشعر و محتاج
اے کعبہ معظمہ! جو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے پناہ لینے والے کے لئے دعا ہے اور شعار پہننے والے اور محتاج کے لئے جائے دعا ہے۔
و دَعَمَ اَحِبَّاهُ و مَسْكَنَهُ فِجَاءُ مَا بَيْنَ خَائِفٍ رَاجٍ
اپنے احباب اور اپنے مکینوں کو الوداع کہہ پس (ہر کوئی) بیم ورجا کی کیفیت لئے ہوئے آیا۔

ان یقبل اللہ سعیہ کرمًا نِجَاءُ وَالَا فلیس بالناحی
اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ اس کی سعی قبول فرمائی تو وہ نجات پا گیا ورنہ کوئی نجات پانے والا نہیں۔
وانت ممن تُرجی شفاعتہ فاعطف علی وافر بن حجاج
اور تو ان میں سے ہے جن کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے پس تو وافر بن حجاج پر مہربانی فرما۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جو کوئی عمرہ قضا کے سال حضور نبی رحمت ﷺ کی معیت میں اس میں داخل ہو وہ امان میں آ گیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِينَ۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں مَنْ غَيْرِ ذِی الْعَقُولِ کے لئے ہے اور یہ آیت شکار کے امان میں ہونے کے بارے ہے اور یہ شاذ ہے اور قرآن کریم میں ہے: فَمِنْهُمْ مَنْ يَنْشِئُ عَلَىٰ بَطْنِهِ الْاَيَةَ۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَنِي الْعَلِيْمُ ﴿٥٠﴾
اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ اس میں لام ایجاب والزام کے لئے ہے پھر اسے ارشاد باری تعالیٰ: عَلٰی کے ساتھ مؤکد کیا، یہ عربوں کے نزدیک الفاظ وجوب کی تاکید لگانے والے حروف میں سے ہے۔ پس جب کوئی عربی یہ کہے: لفلان عنی کذا، تو تحقیق اس نے اسے مؤکد کر دیا اور اپنے اوپر واجب کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بلیغ ترین الفاظ وجوب کے ساتھ حج کا ذکر کیا اپنے حق کی تاکید لگاتے ہوئے اور اس کی حرمت کی تعظیم کرتے ہوئے۔ اور اس کے فرض ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ ارکان اسلام میں سے ایک ہے اور یہ ساری عمر میں صرف ایک بار واجب ہوتا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یہ ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حدیث بیان کی ہے اور اسے حضور نبی مکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے اور وہ حدیث باطل ہے، صحیح نہیں ہے اور ان کی وجوہ (اور دلائل) میں اجماع مدافعت کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں حضرت سفیان ثوری نے علاء بن مسیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”رب کریم فرماتا ہے بلاشبہ میں نے اپنے بندے کو وسیع اور وافر رزق عطا فرمایا ہے اور اس نے ہر چار سال میں میری طرف محروم کے لئے کوئی

شے نہیں لوٹائی۔“ یہ علاء بن مسیب بن رافع کا بلی کوفی کی مشہور حدیث ہے اور آپ محدثین کی اولاد میں سے ہیں، اور ان سے کئی ایک نے روایت کیا ہے، ان میں سے بعض نے پانچ سال کا ذکر کیا ہے اور بعض نے سند اس طرح بیان کی ہے۔ عن العلاء بن یونس بن خباب عن ابی سعید، علاءہ ازیں بھی اس میں اختلاف ہے۔

اور ملاحظہ نے حج کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: چونکہ اس میں کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور یہ حیاء کے خلاف ہے اور سعی کرنا ہے اور یہ وقار کو ختم کر دیتی ہے اور بلا مقصد کنکریاں مارنا یہ خلاف عقل ہے، پس انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حج کے یہ تمام افعال باطل ہیں، کیونکہ وہ ان کی حکمت اور علت کو نہیں پہچان سکے اور وہ اس سے جاہل ہیں کہ مولیٰ کی اپنے بندے کے ساتھ یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اسے ان تمام افعال کا مقصود اور مدعی بھی سمجھائے گا جس کا وہ اسے حکم دے گا اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ بندہ ہر اس فعل کے فائدہ سے آگاہ ہو جس کا وہ مکلف ہے، بلکہ اس پر تو اطاعت کرنا متعین ہو جاتا ہے اور فائدہ کا مطالبہ اور مقصود کے بارے سوال کے بغیر پیروی کرنا لازم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضور نبی مکرم ﷺ اپنے تلبیہ میں یہ الفاظ کہتے تھے لبیک حقاً حقاً تعبتاً اور قال بیک الہ الحق۔ (1)

اور ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: ایہا الناس قد فرض اللہ علیکم الحج فحجوا (اے لوگو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے پس تم حج کرو) تو ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا ہر سال؟ تو آپ ﷺ خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین بار یہ سوال کیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لو قلت نعم لوجبت ولما استطعتم (اگر میں کہہ دیتا ہاں تو یقیناً وہ (ہر سال) واجب ہو جاتا اور پھر تم اس کی استطاعت نہ رکھتے) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم مجھے اس (شے) کے بارے چھوڑ دو جو میں تمہارے لئے چھوڑ دوں کیونکہ تم سے پہلے لوگ کثرت سے سوال کرنے اور اپنے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف رکھنے کے سبب ہی ہلاک اور برباد ہوئے ہیں۔ پس جب میں تمہیں کسی شے کے بارے میں حکم دوں تو تم اسے بجالاؤ جتنی تم استطاعت رکھتے ہو اور جب میں تمہیں کسی شے سے منع کر دوں تو تم اسے چھوڑ دو۔“ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ اس حدیث نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ جب خطاب مکلفین پر کسی شے کی فرضیت کے بارے ان کی طرف متوجہ ہو تو اسے ایک بار کرنا ہی کافی ہوتا ہے اور وہ تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔ الاستاذ ابو اسحاق الاسفرائینی وغیرہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو آپ کے اصحاب نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا ہمارا حج ہمارے اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے۔“ اور یہ ان کے رد کے بارے میں نص ہے جنہوں نے یہ کہا ہے۔ (حج) ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے، حالانکہ حج عربوں کے نزدیک معلوم اور ان میں مشہور تھا اور یہ ان اعمال میں سے تھا جن میں وہ اپنی منڈیوں، اپنی طاعت و فرمانبرداری اور اپنے دین ابراہیمی پر قائم رہنے میں رغبت اور دلچسپی رکھتے تھے۔ پس جب دین اسلام آیا تو انہیں اس کے بارے خطاب کیا گیا جسے وہ جانتے تھے اور وہ شے ان پر لازم کی گئی

جسے وہ پہچانتے تھے۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ نے فرض حج سے پہلے حج ادا فرمایا (1) اور آپ ﷺ نے عرفات میں وقوف کیا اور آپ ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت اور دین میں کوئی تبدیلی نہ کی جسے انہوں نے تبدیل کر لیا تھا، جس وقت قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور کہتے تھے: ہم اہل حرم ہیں ہم اس سے نہیں نکلیں گے اور ہم مذہب میں بڑے سخت ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: جو میں جانتا ہوں اس میں عجیب ترین یہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ہجرت سے پہلے دوبار حج ادا فرمایا اور آپ سے اس کے سبب فرض ساقط ہو گیا، کیونکہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ندا پر لبیک کہی جب انہیں یہ کہا گیا: **اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ** (آپ لوگوں میں حج کے بارے اعلان کر دیں۔)

الکلیا الطبری نے کہا ہے: یہ بعید ہے، کیونکہ جب آپ ﷺ کی شریعت میں یہ موجود ہے **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ** پس آپ کی شریعت میں حکم خطاب کے ساتھ آپ پر اس کا واجب ہونا ضروری ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خطاب انہیں کیا ہے جنہوں نے حج ادا نہیں کیا، یہ ایسا فیصلہ اور تخصیص ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ اور اس پر یہ لازم آتا ہے کہ اس خطاب کے ساتھ اس پر حج واجب نہ ہو جس نے دین ابراہیمی کے مطابق حج کر لیا اور یہ حقیقت سے انتہائی بعید ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کتاب وسنت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے نہ کہ علی الفور، یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے جو ابن خویز مند اد نے ذکر کیا ہے اور یہی امام شافعی اور امام محمد بن حسن رحمہ اللہ علیہما کا قول ہے اور امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور متاخرین مالکیہ میں سے بعض اہل بغداد نے یہ کہا ہے کہ اس کی ادائیگی علی الفور واجب ہوتی ہے اور اس پر قدرت رکھتے ہوئے اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے اور یہی داؤد کا قول ہے۔ اور صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ سورہ حج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا** (الحج: 27) (اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پیادہ) اور سورہ حج مکیہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الْاَيَةُ**۔ اور یہ سورۃ غزوہ احد کے سال ۳ھ میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے ۱۲ھ تک حج ادا نہیں فرمایا۔

رہی سنت! تو ضمام بن ثعلبہ سعدی کی حدیث ہے جو کہ بنی سعد بن بکر سے تھے وہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اسلام کے بارے سوال کیا تو آپ ﷺ نے کلمہ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا ذکر فرمایا۔ اسے حضرت ابن عباس (2)، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور ان تمام میں حج کا ذکر ہے اور یہ کہ وہ فرض قرار دیا گیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اپنے سیاق کے اعتبار سے احسن اور اتم ہے۔ اور اس کے فرض ہونے کے وقت میں اختلاف ہے، سو بعض نے کہا ہے ۵ھ، بعض نے کہا ہے ۷ھ اور بعض نے کہا ہے اس کا وقت ۹ھ ہے اور ابن ہشام

1۔ ابن ماجہ، باب حجة رسول اللہ ﷺ، حدیث نمبر 3066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ما جاء في العلم وقوله تعالى قل رب زدني علما، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے ابو عبیدہ الواقدی سے جنگ احزاب سے واپسی کے بعد غزوہ خندق کا سال ذکر کیا ہے۔

ابن عبد البر نے بیان کیا ہے: اس بات پر دلیل کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہے اس پر اجماع علماء ہے کہ حج پر قدرت رکھنے والا فاسق نہیں جبکہ وہ اسے ایک یا دو سال یا اسی طرح کی کچھ مدت مؤخر کر دے اور یہ کہ جب استطاعت رکھنے کے کئی سال بعد جب اس نے حج ادا کر دیا تو تحقیق اس نے وہ حج اپنے وقت میں ہی ادا کیا اور تمام کے نزدیک وہ اس آدمی کی طرح نہیں جس کی نماز فوت ہو جائے یہاں تک کہ اس کا وقت نکل گیا اور پھر وقت نکلنے کے بعد وہ اسے قضا کرے اور نہ اس کی طرح ہے جس کے بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے فوت ہو جائیں اور پھر وہ اس کی قضا کرے اور نہ اس کی طرح جس نے اپنا حج فاسد کر دیا ہو اور پھر وہ اس کی قضا کرے، پس جب علماء نے اس پر اجماع کر لیا کہ جس نے اپنی استطاعت کے وقت سے کئی سال بعد حج کیا اسے یہ نہیں کہا جائے گا: تو اسے قضا کرنے والا ہے جو تجھ پر واجب تھا، تو ہم نے یقیناً جان لیا کہ حج کے وقت میں وسعت رکھی گئی ہے اور یہ کہ یہ علی التراخی واجب ہوتا ہے نہ کہ علی الفور..... ابو عمر نے کہا ہے: جس نے بھی بالتراخی کا قول کیا ہے وہ اس بارے میں کوئی حد بیان نہیں کرتا، مگر صرف یہ کہ سخون سے روایت ہے کہ ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اتنی استطاعت پاتا ہے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہے اور پھر وہ اس پر قدرت رکھنے کے باوجود بہت سے سالوں تک اسے مؤخر کر دیتا ہے کیا حج میں اس تاخیر کے سبب اسے فاسق کہا جائے گا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں اگرچہ اس کی عمر کے ساٹھ سال گزر جائیں، البتہ جب اس کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر جائے گی تو اسے فاسق قرار دیا جائے گا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی۔ یہ توقیف اور حد ہے اور شرع میں حدود صرف اسی سے اخذ کی جاتی ہیں جسے ان کی وضاحت کا اختیار ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسے ابن خویز مند اد نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے، ابن قاسم وغیرہ نے کہا ہے: اگر اس نے حج کو ساٹھ برس کی عمر تک مؤخر کیا تو وہ گنہگار نہ ہوگا اور اگر اسے ساٹھ سال کی عمر کے بعد بھی مؤخر کیا تو اسے گنہگار قرار دیا جائے گا، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا (۱): ”میری امت کی عمریں ساٹھ سے ستر برس کے درمیان ہیں اور وہ کم ہیں جو اس سے تجاوز کریں گے۔“ تو گویا اس عشرے میں اس پر خطاب تنگ ہو جاتا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: بعض لوگوں (جیسا کہ سخون وغیرہ) نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: معتزک امتی بین الستین الی السبعین وقل من یجاوز ذالک (میری امت کی عمریں ساٹھ برس سے ستر برس تک کے درمیان ہیں اور وہ قلیل ہیں جو اس سے تجاوز کریں گے) اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسا کلام ہے جو آپ نے اپنی امت کی اغلب عمروں کے بارے میں بیان فرمایا ہے، اگر حدیث صحیح ہے اور اس میں ستر برس تک توسیع پر دلیل موجود ہے، کیونکہ اغلباً ایسا ہی ہے اور یہ مناسب نہیں ہے اس جیسی کمزور تاویل کے ساتھ اس کو بالیقین فاسق قرار دیا جائے جس کی عدالت و امانت بالکل صحیح ہو۔ وبالله التوفیق۔

1۔ ابن ماجہ، باب العمل والاجل، حدیث نمبر 4225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، روایۃ بالمعنی

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ** کے ساتھ خطاب عام ہے اور اس کا اطلاق تمام پر ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ”اگرچہ لوگوں نے مطلق عمومات میں اختلاف کیا ہے مگر انہوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت تمام لوگوں مردوں اور عورتوں پر محمول ہے، سوائے صغیر (نابالغ) بچوں کے کیونکہ وہ بالا جماع اصول تکلیف سے خارج ہیں اور اسی طرح غلام بھی اس میں داخل نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے انہیں مطلق عموم سے خارج کر دیا ہے **مَنْ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا** اور غلام قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ آقا سے اس عبادت سے اپنے حقوق کی وجہ سے روکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حق پر آقا کے حق کو بندوں کے ساتھ نرمی اور ان کی مصلحت کے لئے مقدم کیا ہے اور اس میں امت اور ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، پس ہم اس کے ساتھ تعریف نہیں کریں گے جسے ہم جانتے نہیں اور اس پر اجماع کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔“

ابن منذر نے کہا ہے: عام اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے سوائے ان کے جو ان سے جدا اور الگ رہے اور وہ ان میں سے ہیں جن کے اختلاف کی کوئی قدر و منزلت نہیں، کہ بچہ جب اپنی حالت صغر میں حج کرے اور غلام جب اپنی غلامی کی حالت میں حج کرے، پھر وہ بچہ بالغ ہو جائے اور غلام آزاد ہو جائے تو بلاشبہ ان دونوں پر حج اسلام فرض ہوگا جب وہ اس کی قدرت اور استطاعت پالیں گے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: داؤد نے فقہاء امصار، ائمہ اثر کی غلام کے بارے میں مخالفت کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے نزدیک وہ حج کا مخاطب ہے اور وہ جمہور علماء کے نزدیک عام خطاب سے خارج ہے جو اس ارشاد میں ہے **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ** **مَنْ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا** اور اس میں دلیل اس میں تصرف کی قدرت نہ ہونا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہ غلام کے لئے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر حج کرنا جائز نہیں ہوتا، جیسا کہ وہ جمعہ کے خطاب سے خارج ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ** (جمعہ: 9)۔ سوائے چند کے، عام علماء کے نزدیک یہی حکم ہے اور اسی طرح وہ ایجاب شہادت کے خطاب سے خارج ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ أَنْ إِذَا مَا دُعُوا** (البقرہ: 282) (اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائیں جائیں)۔ پس اس میں بھی غلام داخل نہیں اور جس طرح بچے کا نکلنا اس قول سے جائز ہے **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ** حالانکہ وہ بھی الناس میں سے ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بچے سے قلم اٹھالیا گیا ہے۔ اور عورت اس ارشاد سے خارج ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ** حالانکہ یہ ان میں سے ہے جنہیں اسم ایمان شامل ہے اور اسی طرح مذکورہ خطاب سے غلام بھی خارج ہے اور یہ حجاز، عراق، شام اور افریقہ کے فقہاء کا قول ہے اور ان کی مثل سے ان پر تاویل کتاب کی تحریف جائز نہیں۔

اور اگر کہا جائے: جب غلام مسجد حرام میں حاضر ہو اور اس کا آقا سے اجازت بھی دے دے تو پھر حج کیونکر لازم نہ ہوگا؟ تو جواباً یہ کہا جائے گا کہ یہ سوال اجماع پر ہے اور بسا اوقات وہ اس کی علت بیان نہیں کرتا، لیکن جب یہ حکم علی الاجماع ثابت

ہے تو ہم نے اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا کہ غلامی کی حالت میں اس کے حج کو حج اسلام شمار نہ کیا جائے گا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کسی بچے نے حج کیا پھر اس نے حج کی استطاعت پالی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی اعرابی نے حج کیا پھر اس نے ہجرت کی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی غلام نے حج کیا پھر اسے آزاد کر دیا گیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے۔“ ابن عربی نے کہا ہے: ”ہمارے بعض علماء نے نرمی سے کام لیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ غلام پر حج ثابت (لازم) نہیں اگرچہ آقا سے اجازت دے دے کیونکہ وہ فی الاصل کافر تھا اور کافر کا حج کسی شمار میں نہیں اور پھر جب اس پر غلامی کی ضرب ہمیشہ کے لئے لگادی گئی تو وہ حکم حج کا مخاطب ہی نہ رہا۔

یہ تین وجوہ سے فاسد ہے پس تم انہیں جان لو:

- (۱) بلاشبہ ہمارے نزدیک کفار فروعاً شرعیہ کے مخاطب ہیں اور اس بارے میں امام مالک کے قول میں کوئی اختلاف نہیں۔
- (۲) تمام عبادات نماز، روزہ وغیرہ اس پر لازم ہوتی ہیں اس کے باوجود کہ وہ غلام ہے اور اگر وہ یہی فعل اپنی حالت کفر میں کرے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حج بھی انہیں کی مثل ہے۔
- (۳) یہ کہ کفر اسلام کے سبب ختم ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کا ختم ہونا بھی ثابت ہے۔ پس یہ واضح ہو گیا کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں معتمد علیہ آقا کے حقوق کا مقدم ہونا ہے۔ واللہ الموفق۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا** اس میں مِنْ بدل بعض من الكل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے، یہ اکثر نحو یوں کا قول ہے۔

اور کسائی نے یہ اجازت بھی دی ہے کہ مَنْ حج البيت کے سبب محل رفع میں ہو اور تقدیر کلام یہ ہو ان يحج البيت مَنْ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شرط ہے اور استطاع محل جزم میں ہے اور جواب شرط محذوف ہے یعنی مَنْ استطاع اليه سبيلاً فعليه الحج۔

دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا حج ہر سال فرض ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں بلکہ صرف ایک بار حج کرنا فرض ہے۔“ پھر عرض کی گئی! یہ سبیل کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”زاد راہ اور سواری“ اور انہوں نے اسے حضرت انس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہم سے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے **وَاللَّهُ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا** بیان فرمایا کہ اس کے بارے میں پوچھا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو اونٹ کی پشت پالے“

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ابن ماجہ نے بھی اپنی سنن میں نقل کیا ہے اور امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے وہ اپنی جامع میں ذکر کی ہے اور کہا ہے: حدیث حسن۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اور اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ آدمی جب زاد

راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس پر حج واجب ہے۔ اور ابراہیم بن یزید خوزی مکی کی قوت حفظ کے بارے میں بعض اہل حدیث نے کلام کیا ہے (1) اور ان دونوں نے اسے کعب سے اور دارقطنی نے سفیان بن سعید سے اسے نقل کیا ہے..... اور انہوں نے کہا کہ ابراہیم بن یزید نے محمد بن عباد سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کون سی شے حج کو واجب کر دیتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”زاد راہ اور سواری پر قدرت“ عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم حاجی کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غبار آلود بالوں والا جس نے خوشبو کا استعمال ترک کر دیا ہو۔“ اور پھر ایک دوسرا کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم حج کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: العَجَّ والشَّجَّ۔ کعب نے کہا ہے: عَج سے مراد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور شَج سے مراد قربانی کا جانور ذبح کرنا ہے، یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ زاد راہ اور سواری پر قادر ہونا حج واجب ہونے کے لئے شرط ہے ان میں حضرت عمر بن خطاب اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطاء، اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی، حضرت ثوری، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور حضرت ابن حبیب رحمہم نے بھی اپنایا ہے اور اسی کی مثل عبدوس نے سخون سے ذکر کیا ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: استطاعت کی دو صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے بدن کے ساتھ قدرت رکھتا ہو اور وہ اتنا بال پاتا ہو جو اسے حج کے لئے پہنچا سکے گا۔ اور دوسری یہ ہے کہ وہ اپنے بدن میں کمزور ہو وہ اپنی سواری پر ثابت نہ رہ سکتا ہو اور وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی اطاعت و پیروی کرتا ہو (اس میں کہ) جب وہ اسے حکم دے کہ وہ اس کی جانب سے اجرت کے ساتھ اور بغیر اجرت کے حج کرے۔ (یعنی اپنی جانب سے کسی دوسرے کو حج پر بھیج سکتا ہو) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ رہا وہ جو اپنے بدن کے ساتھ استطاعت اور قدرت رکھتا ہے تو اس پر کتاب اللہ کے اس ارشاد کے ساتھ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا حج فرض لازم ہوتا ہے اور جو استطاعت بالمال رکھتا ہے تو اس پر سنت کے مطابق حج فرض لازم ہوتا ہے جیسا کہ حدیث خشمیہ آگے آرہی ہے۔

اور مستطیع بنفسہ سے مراد وہ قوی اور طاقتور آدمی ہے جسے سواری پر سوار ہونے کی مشقت کے بغیر کوئی مشقت لاحق نہ ہو، کیونکہ یہ آدمی جب زاد راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس کی ذات پر فرض حج لازم ہو جاتا ہے اور بلاشبہ زاد راہ اور سواری دونوں کے نہ ہونے یا ان میں سے ایک کے نہ ہونے کی صورت میں اس سے حج کا فرض ساقط ہو جاتا ہے، پس اگر وہ پیدل چلنے پر قادر ہو تو وہ زاد راہ پالے یا راستے میں زاد راہ کمانے پر قادر ہو اپنے کاروبار اور پیشہ سے مثلاً ٹکینے اور منکے بیچنا اور حجامۃ (پچھ لگانا) یا اسی طرح کا کوئی کام، تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ پیدل حج کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ امام شافعی نے کہا ہے: مرد عورت کے مقابلہ میں کم معذور ہوتا ہے کیونکہ وہ زیادہ قوی اور طاقتور ہوتا ہے اور یہ حکم ان کے نزدیک بطریق

1۔ ابن ماجہ، باب ما لا جب الحج، حدیث نمبر 2886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استحباب ہے نہ کہ بطریق وجوب پس اگر وہ راستے میں لوگوں سے مانگنے کے سبب زادراہ پر قادر ہو تو اس کے لئے حج کرنا مکروہ ہے کیونکہ وہ لوگوں پر بوجھ اور بھاری ہو جائے گا۔

اور امام مالک بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے: جب وہ چلنے پر قادر ہو اور زادراہ پالے تو اس پر حج کرنا فرض ہے اور اگر وہ سواری کا مالک نہ ہو، البتہ وہ راستے میں چلنے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے غور و فکر کی جائے گی اور اگر وہ زادراہ کا مالک ہو تو اس پر فرض حج کی ادائیگی واجب ہے اور اگر وہ زادراہ کا مالک نہ ہو لیکن وہ راستے میں اپنی حاجت کے مطابق کمانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے بھی غور و فکر کی جائے گی اور اگر وہ ایسے اہل مروءت میں سے ہو جو بذات خود کمائی نہیں کر سکتے تو اس پر واجب نہ ہوگا اور اگر وہ ان میں سے ہو جو تجارت یا کسی کاروبار کے ذریعہ اپنی کفایت اور ضرورت پوری کر سکتا ہے تو اس پر فرض حج لازم ہے اور اسی طرح اگر اس کی عادت لوگوں سے سوال کرنا اور مانگنا ہو تو اس پر بھی فرض حج لازم ہے۔

اور اسی طرح امام مالک نے چلنے کی طاقت رکھنے والے پر حج کو واجب کیا ہے، اگرچہ اس کے ساتھ زادراہ اور سواری نہ بھی ہو۔ اور یہی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، شعبی اور عکرمہ کا قول ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: اگر وہ جوان، طاقتور اور صحت مند ہو اور اس کا مال نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے کھانے کے عوض اپنے آپ کو اجرت پر دے دے یا اپنے کسی بیٹے کو یہاں تک کہ وہ اپنا حج پورا کر لے۔

تو حضرت مقاتل نے انہیں: "کیا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس کا مکلف بنایا ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل چل کر آئیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اگر ان میں سے کسی کی مکہ مکرمہ میں میراث ہو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ بلکہ وہ تو اس کی طرف چلے گا اگرچہ سرین کے بل گھسٹ کر ہی آنا پڑے، اسی طرح اس پر حج بھی واجب ہوگا۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: **وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا** اس میں **رِجَالًا** معنی مشاة ہے یعنی پیدل چلتے ہوئے۔

انہوں نے کہا ہے: کیونکہ فرائض اعیان میں سے حج عبادات بدنہ میں سے ہے، لہذا یہ واجب ہے کہ اس کے واجب ہونے کی شرائط میں سے نہ زادراہ ہو اور نہ ہی سواری ہو جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔

انہوں نے کہا: اگر زادراہ اور سواری کے بارے خوزی کی حدیث صحیح ہے تو ہم نے اسے عوام الناس پر محمول کیا ہے اور ان میں سے اکثر دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے ہیں..... اور مطلق کلام کو غالب احوال پر محمول کرنا شریعت میں بہت زیادہ ہے اور کلام عرب اور اس کے اشعار میں وافر ہے۔

ابن وہب، ابن القاسم اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں لوگ اپنی طاقت اپنی سہولت اور اپنی مضبوطی کی مقدار پر ہیں۔ اشہب نے مالک کو کہا: کیا وہ زادراہ اور سواری ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں قسم بخدا، وہ نہیں ہے مگر لوگوں کی طاقت کی مقدار پر، کبھی آدمی زادراہ اور سواری پاتا ہے لیکن وہ چلنے پر قدرت نہیں رکھتا اور دوسرا پیدل چلنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب استطاعت پائی جائے اور حج کا فرض متوجہ ہو تو کبھی ایسا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جو حج سے روک

دیتا ہے، مثلاً قرض خواہ اسے نکلنے سے روک دے یہاں تک کہ وہ قرض ادا کر دے۔ اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا اس کے بچے ہوں اس پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے تو اس پر حج لازم نہیں ہوگا یہاں تک کہ ان کے لئے اتنا نفقہ ہو جو اس کے جانے سے لے کر واپس لوٹنے تک غائب رہنے کی مدت کے لئے کافی ہو، کیونکہ اہل و عیال کا یہ خرچہ تو علی الفور فرض ہے اور حج علی التراخی فرض ہے، پس عیال کو مقدم کرنا اولیٰ ہے اور حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”آدمی کے لئے اتنا گناہ ہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کر دے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔“ اور اسی طرح والدین ہیں آدمی ان پر ہلاکت اور مصیبت لانے اور ان کی مہربانیوں اور شفقتوں کا عوض اور بدلہ نہ دینے سے خوفزدہ رہتا ہے، پس اس کے لئے حج کی طرف کوئی راستہ نہیں ہے اور اگر وہ اسے شوق و محبت اور وحشت کی وجہ سے روک لیں تو اس کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

اور عورت کو اس کا خاوند روک سکتا ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ اسے نہیں روک سکتا۔ اور صحیح قول یہی ہے کہ روکنا جائز ہے، بالخصوص جب ہم نے یہ کہا ہے کہ حج بالفور لازم نہیں ہوتا۔ اور سمندر اس کے وجوب کے مانع نہیں ہوتا جبکہ غالب گمان سلامتی کا ہو، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور وہ اپنے بارے میں یہ جانتا ہو کہ اس کا سر نہیں چکرائے گا۔ اور اگر اس پر غالب گمان ہلاکت یا سر چکرائے کا ہو یہاں تک کہ وہ نماز بھی معطل کر دے تو پھر نہیں۔ اور اگر وہ سواروں کی کثرت اور جگہ کی تنگی کے سبب سجدہ کرنے کی جگہ نہ پائے تو امام مالک نے کہا ہے: جب وہ رکوع و سجود کی استطاعت نہ رکھے مگر اپنے بھائی کی پشت پر تو پھر وہ اس پر سوار نہ ہوگا۔ پھر کہا: کیا وہ وہاں سوار ہو سکتا ہے جہاں وہ نماز نہ پڑھ سکے؟ اس کے لئے ہلاکت اور بربادی ہے جو نماز کو ترک کر دے۔ اور حج ساقط ہو جاتا ہے جب راستے میں ایسا دشمن ہو جو جانوں کو ضائع کرنے کا سبب ہو یا اموال کو لوٹتا ہو جبکہ وہ کسی مخصوص دھمکی کے ساتھ دھمکائے یا وہ کسی برباد اور ہلاک کرنے والی مقدار کے ساتھ دھمکائے اور اگر دھمکی ہلاک و برباد کرنے کی نہ ہو تو حج کے ساقط ہونے میں اختلاف ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: وہ ایک حبہ بھی نہیں دے گا اور حج کا فرض ساقط ہو جائے گا۔ اور مانگنے والے پر حج واجب ہوتا ہے جبکہ وہ اس کی عادت ہو اور اس کا ظن غالب یہ ہو کہ وہ اسے پالے گا جو اسے عطا کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس پر واجب نہ ہوگا، اس بنا پر کہ اس میں استطاعت کی رعایت لازم ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب موانع زائل ہو جائیں اور اس کے پاس دراہم و دنانیر میں سے ایسی کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو اور اس کے پاس سامان ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ حج کے لئے اپنے سامان میں سے وہ بیچ دے جو اس حال میں بیچا جاسکتا ہے جب اس پر دین اور قرض ہو۔ اور ابن القاسم سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس کا مشکیزہ ہو اور اس کے سوا اس کا کچھ نہ ہو، کیا وہ حج اسلام کے لئے اسے بیچ دے گا اور اپنی اولاد کو چھوڑ دے گا در آنحالیکہ ان کے لئے کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ زندگی گزار سکتے ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں، وہ اس پر ہے اور وہ اپنی اولاد کو صدقہ میں چھوڑ دے گا۔ لیکن صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”آدمی کے لئے گناہ کے اعتبار سے یہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کر دے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔“ اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے مذہب سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ حج لازم نہیں ہوتا مگر

اس کے لئے جس کے پاس اتنے اخراجات موجود ہوں جو جانے سے لے کر لوٹنے تک کافی ہوں۔ آپ نے یہ الاملاء میں کہا ہے: اگرچہ اس کے اہل و عیال نہ ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: رجوع کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس پر اپنے شہر کے قیام کو ترک کرنے میں کوئی بڑی مشقت نہیں ہے، کیونکہ اس میں نہ اس کے اہل ہیں اور نہ کوئی عیال اور ہر شہر (ملک) اس کے لئے وطن ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ انسان اپنے وطن سے جدائی کے سبب اسی طرح وحشت سی محسوس کرتا ہے جس طرح وہ اپنے گھر والوں کے فراق میں مضطرب رہتا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ باکرہ عورت جب زنا کرے تو اسے کوزے لگائے جاتے ہیں اور اسے اس کے شہر سے جلا وطن کر دیا جاتا ہے چاہے وہاں اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔

امام شافعی نے ”الام“ میں کہا ہے: جب آدمی کا گھر اور خادم ہو اور اس کے پاس اپنے گھر والوں کے لئے اتنا خرچہ موجود ہو جو اس کی عدم موجودگی میں ان کے لئے کافی ہو جائے تو اس پر حج لازم ہوگا۔ اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ اعتبار کیا ہے کہ حج کا مال خادم اور گھر سے فالتو اور زائد ہو، کیونکہ آپ نے اسے گھر والوں کے نفقہ پر مقدم کیا ہے، گویا کہ آپ نے کہا ہے: ان تمام کے بعد (اس کے پاس حج کا مال ہو)۔

اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اس پر لازم ہے کہ گھر اور خادم فروخت کر دے اور اپنے گھر والوں کے لئے گھر اور خادم کرائے پر لے اور اگر اس کے پاس ایسا سامان ہو جس کے ساتھ وہ تجارت کرتا ہو اور اس کا نفع علی الدوام اس کی ذاتی اور اہل و عیال کی کفایت کی مقدار ہو اور جب وہ اصل مال سے کچھ خرچ کر دے تو اس کا نفع مختل ہو جائے اور وہ اس کی حاجت و ضرورت کے لئے کافی نہ رہے، تو کیا اصل مال سے اس پر حج لازم ہوگا یا نہیں؟

اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول جمہور کا ہے اور وہی صحیح اور مشہور ہے، کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر اس کی زمین ہو اس کا غلہ اسے کافی ہو رہتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ حج میں اصل زمین فروخت کر دے، پس اسی طرح سامان بھی ہے اور ابن شریح نے کہا ہے: وہ اس پر لازم نہ ہوگا اور وہ سامان کو باقی رکھے گا اور اس کے اصل سے حج نہیں کرے گا، کیونکہ اس پر حج اس مال سے واجب ہوتا ہے جو اس کی کفایت اور حاجت سے فالتو ہو۔ پس یہ گفتگو استطاعت بالبدن والمال کے بارے میں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مریض اور معصوب (جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو) اور العصب کا معنی کاٹنا ہوتا ہے اور اسی سے تلوار کا نام عصب رکھا گیا ہے، گویا کہ جو اس حالت کو پہنچ چکا ہو کہ وہ سواری کو نہ مضبوطی سے تھامنے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ اس پر مضبوطی سے بیٹھ سکتا ہو تو وہ اسی کی طرح ہے جس کے اعضاء کاٹ دیئے گئے ہوں، جبکہ وہ کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو، علماء نے ان دونوں کے حکم میں اختلاف کیا ہے اپنے اس اجماع کے بعد کہ حج کے لئے چلنا ان دونوں پر لازم نہیں، کیونکہ حج اللہ تعالیٰ نے قدرت رکھنے والے پر فرض کیا ہے اور اس پر اجماع ہے اور مریض اور معصوب دونوں میں استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔

امام مالکؒ نے کہا ہے: جب آدمی معصوب ہو تو اس سے حج کا فریضہ بالکل ساقط ہو جاتا ہے، چاہے وہ اس پر قادر ہو جو اس کی طرف سے مال کے عوض یا بغیر مال کے حج کر سکتا ہو اس پر حج فرض لازم نہ ہوگا۔ اور اگر اس پر حج واجب ہو گیا پھر اس کا

کوئی عضو کاٹ دیا گیا اور وہ اپا ج ہو گیا تو اس سے حج کا فریضہ ساقط ہو جائے گا اور یہ جائز نہ ہوگا کہ اس کی زندگی میں کسی بھی اعتبار سے کوئی اس کی طرف سے حج کرے، بلکہ اگر وہ وصیت کرے کہ اس کی موت کے بعد اس کی طرف سے حج کیا جائے اور اس کے ترکہ کے تیسرے حصہ سے حج کیا جائے تو یہ نفل ہوگا۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: **وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى**۔ پس اس میں یہ خبر ہے کہ اس کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو اس نے خود کوشش کی۔

پس جس نے کہا ہے: اس کے لئے اس کے سوا کسی اور نے سعی کی ہے تو اس نے ظاہر آیت کا خلاف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد **وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ** کے مطابق یہ استطاعت رکھنے والا نہیں ہے، کیونکہ حج سے مراد مکلف آدمی کا بذات خود بیت اللہ شریف کا قصد کرنا ہے، کیونکہ یہ ایک عبادت ہے اور اس سے عاجز ہونے کے ساتھ اس میں نیابت درست نہیں جیسا کہ نماز میں (نیابت درست نہیں ہوتی) اور محمد بن منکدر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ ایک حج کے سبب تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا (ایک) مرنے والے کو (دوسرا) اس کی طرف سے حج کرنے والے کو اور (تیسرا) اسے بھیجنے والے کو۔ اسے الطبرانی القاسم سلیمان بن احمد نے بیان کیا ہے اور اس طرح سند بیان کی ہے حدیثنا عمرو بن حصین السدوسی قال حدثنا ابو معشر عن محمد بن المنکدر۔ اور آگے انہوں نے اسے بیان کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو معشر کا نام صحیح ہے اور وہ ان کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: اپا ج مریض وہ جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو اور شیخ کبیر جو ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی بات ماننے اور پیروی کرنے کے لئے تیار ہو: ب وہ اسے اپنی طرف سے حج کرنے کا حکم دے تو وہ بھی من وجہ استطاعت رکھنے والا ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ اتنے مال پر قادر ہو کہ وہ اس کے عوض ایسے آدمی کو اجرت پر لے سکے جو اس کی طرف سے حج کرے گا کیونکہ وہ اس پر حج کا فریضہ لازم کر رہا ہے اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے شیخ کبیر (انتہائی بوڑھا آدمی) کو فرمایا جو حج نہ کر سکے وہ ایک آدمی کو تیار کرے جو اس کی طرف سے حج کرے گا اور یہی موقف ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، ابن مبارک، احمد اور اسحاق نے اختیار کیا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو طاعت و نیابت اس کے لئے پیش کرے اور وہ اس کی طرف سے حج کرے، پس امام شافعی، امام احمد اور ابن راہویہ کے نزدیک اس پر بھی حج لازم ہوگا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے: صرف طاعت و پیروی پیش کرنے کے ساتھ کسی حال میں حج لازم نہیں ہوگا۔

امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ بنی خشم کی ایک عورت نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ حج اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر فرض ہے میں نے اپنے باپ کو انتہائی بوڑھا پایا ہے وہ سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ

مسئلہ پہلے نے فرمایا: ”ہاں“ اور یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ہوا (1)۔ اور ایک روایت میں ہے: وہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اونٹ کی پیٹھ پر سکون سے بیٹھ سکے، تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تو اس کی طرف سے حج کرتیرا کیا خیال ہے اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کر دیتی؟“ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: ”پس اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے (2)۔“ پس حضور نبی مکرم ﷺ نے اس بنا پر حج کو واجب قرار دیا کہ اس کی بیٹی نے اس کی اطاعت و پیروی کی اور اس نے اپنا آپ اس کے لئے پیش کیا کہ وہ اس کی طرف سے حج کرے گی۔ تو جب بیٹی کی پیروی کے سبب اس پر حج واجب ہے تو پھر بدرجہ اولیٰ اتنے مال پر قادر ہونے کی صورت میں حج واجب ہوگا جس کے عوض وہ کسی کو اجرت پر لے سکتا ہے۔ پھر اگر وہ طاعت کے بغیر مال اس کے لئے خرچ کرے تو صحیح یہ ہے کہ اس کا قبول کرنا اس کے لئے لازم نہیں ہے اور اس کے ساتھ حج کرنا اس کی اپنی طرف سے ہوگا اور وہ اس کے لئے مال خرچ کرنے کے سبب مستطیع شمار نہ ہوگا۔

اور ہمارے علماء نے کہا ہے: خشمیہ کی حدیث سے مقصود (حج کو) واجب کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کے دینی اور دنیوی مصالح کے بارے غور و فکر اور طبعاً اور شرعاً ان کے لئے جانب منفعت پر ابھارنا اور برا بیختہ کرنا ہے۔ پس جب آپ ﷺ نے ایک عورت کے اپنے والد کے بارے میں خیر اور نیکی کے جذبات، ظاہری فرمانبرداری، رغبت صادقہ اور اسے نیکی اور ثواب پہنچانے کی حرص کو دیکھا اور یہ کہ وہ اس کے حج کی برکت سے محروم رہنے پر اظہار تأسف کر رہی ہے تو آپ ﷺ نے اسے اسی طرح جواب دیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک دوسری عورت کو فرمایا جس نے یہ عرض کی: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج نہ کر سکی یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئی کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو اس کی طرف سے حج کر، تیری کیا رائے ہے اگر تیری ماں پر قرض ہوتا کیا تو اسے ادا کر دیتی؟“ اس نے عرض کی: جی ہاں (3)۔ تو اس میں جو کچھ ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ احسانات اور مردوں کو نیکی اور خیرات کا ثواب پہنچانے کے باب سے ہے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آپ ﷺ نے فعل حج کو قرضے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بات بالا جماع ثابت ہے کہ اگر کوئی فوت ہو جائے اور اس پر قرض ہو تو اس کے ولی پر اسے اپنے مال سے ادا کرنا واجب نہیں اور اگر اس نے بطور احسان ادا کر دیا تو اس کی طرف سے قرض ادا ہو جائے گا۔

اور اس میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ اس حدیث میں حج اس کے باپ پر فرض نہیں جس کی تصریح اس عورت نے اپنے اس قول سے کی ہے لایستطیع اور جواستطاعت نہیں رکھتا اس پر حج فرض نہیں ہوتا..... اور یہ تصریح وجوب کی نفی اور فرض کے منع کے بارے میں ہے اور یہ جائز نہیں ہوتا کہ جس کی حدیث کی ابتدا میں بالیقین نفی ہو وہی حدیث کے آخر میں ظنا ثابت ہو۔

اے آپ کا یہ قول ثابت کر رہا ہے: فدين الله احق ان يقضى (پس اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے) کیونکہ یہ بالاجماع اپنے ظاہر پر نہیں ہے، کیونکہ بلاشبہ بندے کا قرض ادائیگی اور قضا کے زیادہ قریب ہے اور

2- ابن ماجہ، باب الحج عن الميت، حدیث 2899، ایضاً

1- صحیح بخاری، کتاب الحج، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3- صحیح بخاری، باب الحج والذکور... الخ، حدیث 1720، ایضاً

بالاجماع اسی سے ابتدا ہوتی ہے کیونکہ بندہ فقیر ہے اور اللہ تعالیٰ مستغنی ہے۔

ابن عربی نے یہی کہا ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک خشمیہ کی حدیث اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس میں اضطراب ہے اور ابن وہب اور ابو مصعب نے کہا ہے: یہ صرف اولاد کے حق میں ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: یہ ایسے بوڑھے کے بارے میں ہے جسے اٹھانے والا کوئی نہ ہو اور وہ حج نہ کر سکے، حج کی رخصت کے لئے ہے اور اس آدمی کے بارے میں رخصت ہے جو فوت ہو گیا اور وہ حج نہ کر سکا، کہ اس کی طرف سے اس کا بیٹا حج کرے اگرچہ وہ اسے اس بارے میں وصیت نہ بھی کرے اور یہ اس کی طرف سے جائز ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پس یہ معصوب اور اس کے ہم مثل کے بارے میں کلام ہے۔ اور خشمیہ کی حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے اور یہ حسن کے اس قول کی تردید کرتی ہے کہ عورت کا مرد کی جانب سے حج کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جب مکلف کے پاس ایسی خوراک نہ ہو جسے وہ راستے میں استعمال کرے گا تو اس پر حج لازم نہیں۔ اور اگر اسے کوئی اجنبی ایسا مال ہبہ کرے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو تو اسے قبول کرنا بالاجماع اس پر لازم نہیں، کیونکہ اس میں احسان کا احساس اسے لاحق ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی آدمی نے اپنے باپ کو مال ہبہ کیا، تو امام شافعی نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ آدمی کا بیٹا اس کی اپنی کمائی ہے، اس میں اس پر کوئی احسان نہیں ہے۔

اور امام مالک اور امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس پر لازم نہیں ہے، کیونکہ اس میں حرمت ابوت کا ساقط ہونا ہے، جب کہ کہا یہ جاتا ہے قد جزاہ وقد وفا، تحقیق اس نے اسے جزا دی اور اس نے اس کے ساتھ وفا کی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور جو کوئی فرض حج کا انکار کرے اور وہ اسے واجب نہ جانے۔ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: بے شک وہ جس نے حج کی قدرت رکھنے کے باوجود اسے ترک کر دیا تو وہ کافر ہے۔

اور ترمذی نے حارث سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو آدمی مالک ہو ازاد راہ کا اور ایسی سواری کا جو اسے بیت اللہ شریف تک پہنچا سکتی ہو اور وہ حج نہ کرے تو اس پر (کوئی حرج) نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے اور وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرما رہا ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيلًا ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے، ہم اسے اس سند کے سوا نہیں پہنچاتے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اور ہلال بن عبد اللہ مجہول راوی ہے اور حارث کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے (1) اور اسی طرح حضرت ابو امامہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور عبد خیر بن یزید نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: "اے لوگو! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں پر

حج فرض کیا ہے جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور جس نے نہ کیا تو اسے چاہیے کہ وہ جس حال پر چاہے مرجائے اگر چاہے تو وہ یہودی یا نصرانی ہو یا مجوسی مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو بیمار ہو یا جابر سلطان (کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہو) خبردار! جان لو نہ اس کے لئے میری شفاعت میں کوئی حصہ ہے اور نہ وہ میرے حوض پر آئے گا۔“ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے حج تک پہنچا سکتا ہو اور اس نے حج نہ کیا یا اس کے پاس اتنا مال ہو جس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور اس نے زکوٰۃ نہ دی تو وہ موت کے وقت رجعت (واپسی کا سوال کرے گا۔“ تو کہا گیا: اے ابن عباس! نبیؐ نہ بے شک ہم تو اسے کافروں کے لئے دیکھتے رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس بارے تم پر قرآن کریم پڑھتا ہوں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَسِرُونَ ① وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقْتُ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ ② (المنافقون) (۱) (اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کر دیں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے۔ اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھائے میں ہوں گے۔ اور خرچ کر لو اس رزق سے جو ہم نے تم کو دیا اس سے پیشتر کہ آجائے تم میں سے کسی کے پاس موت تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ (و خیرات) کر لیتا اور نیکیوں میں شامل ہو جاتا۔)

حسن بن صالح نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: پس میں زکوٰۃ دوں گا اور میں حج کروں گا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ کسی آدمی نے آپ سے اس آیت کے بارے پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا: من حج لا یرجو ثوابا و جلس لا یخاف عقابا فقد کفر بہ (جس نے حج کیا اور ثواب کی امید نہ رکھی یا بیٹھا رہا اور سزا کا خوف نہ رکھا تو اس نے اس کے ساتھ کفر کیا۔) اور حضرت قتادہ نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تحقیق میں نے ارادہ کیا کہ میں لوگوں کو شہروں کی طرف بھیجوں اور وہ ایسے آدمی پر نظر رکھیں جس کے پاس مال ہے اور اس نے حج نہیں کیا پس وہ اس پر جزیہ لگا دیں، پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔

میں کہتا ہوں: یہ انتہائی شدت اور سختی کے محل میں وارد ہوئی ہے اور اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت اس معنی کو مطمئن ہے کہ جو آدمی فوت ہوا اور اس نے حج نہ کیا حالانکہ وہ اس کی قدرت رکھتا تھا تو وعید اس کی طرف متوجہ ہوگی اور کسی دوسرے کا اس کی طرف سے حج کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اگر غیر کا حج کرنا اس سے فرض کو ساقط کر دے تو اس سے وعید ساقط ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اگر میرا کوئی پڑوسی فوت ہوا اور اس کے پاس وسعت اور خوشحالی ہو اور اس نے حج نہ کیا تو میں نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ③ قُلْ

1- جامع ترمذی، باب دمن سورۃ المنافقین، حدیث 3238، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنَ امْنٍ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٦٨﴾

”آپ فرمائیے اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ آپ فرمائیے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اسے جو ایمان لا چکا تم چاہتے ہو کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دو حالانکہ تم خود (اس کی راستی کے) گواہ ہو۔ اور نہیں ہے اللہ بے خبران (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔“

قولہ تعالیٰ: قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ یعنی (اے اہل کتاب!) تم کیونکر اللہ تعالیٰ کے دین سے پھرتے ہو۔ مَنَ امْنٍ (اسے جو ایمان لا چکا) حسن نے تَصُدُّونَ تاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ (یعنی) صَدَّ اور أَصَدَّ، مثلاً صِلَ اللّٰحْمُ اور أَصَلَ جب گوشت بد بودار ہو جائے، اور خَتَمَ اور أَخْتَمَ بھی ہے جب تغیر اور تبدیلی آجائے۔ تَبْغُونَهَا عِوَجًا یعنی تم اس کے لئے چاہتے ہو (یعنی تَبْغُونَهَا بمعنی تطلبون لہا ہے) پھر اس سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ إِذَا كَانُوا فِيهِمْ كَذِبًا كَانُوا فِيهِمْ كَذِبًا یعنی طلبتہ میں نے اسے طلب کیا، چاہا۔ اور أَبْغَيْتَهُ كَذِبًا یعنی میں نے اس کی مدد کی۔ اور العوج کا معنی جھکنا اور ٹیڑھا ہونا ہے دین میں، قول میں اور عمل میں اور ہر وہ جو سیدھے راستے سے نکل جائے۔ (یہ معنی تب ہے جب عین مکور ہو۔) اور اگر عین مفتوح ہو تو پھر معنی ہے دیوار کا ٹیڑھا ہونا اور ہر کھڑے ہونے والے شخص کا ٹیڑھا ہونا، یہ ابو عبیدہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَعِوَجٍ لَهُ كَإِصْوَاعٍ لِّلْأَعْوَجِ لَمَّا هَمَّ سَوَّاهُ وَخِصَّ بِهِمْ رَبُّهُمْ فَرَّقَهُمْ أَلَيْسَ فِي آيَاتِنَا لَعْنَةُ الْآعْوَجِ لَمَّا هَمَّ سَوَّاهُ وَخِصَّ بِهِمْ رَبُّهُمْ فَرَّقَهُمْ (سیدھا) کھڑا ہوا اور ٹھہرا۔ اور العائج ٹھہرنے والے کو کہتے ہیں۔

شاعر کا قول ہے:

نرى العرصات أو اثر الخيام

هل اتم عائجون بنا لعنا

اس میں عائجون ٹھہرنے والے کے معنی میں ہے۔

اور الرجل الأعوج کا معنی ہے بد اخلاق آدمی اور وہ جس کا ٹیڑھا پن واضح اور ظاہر ہو اور العوج من الخيل سے مراد وہ گھوڑا ہے جس کی ٹانگوں میں ٹیڑھا پن اور دوری ہو۔ اور اعوجیۃ من الخيل کی نسبت ایسے گھوڑے کی طرف کی جاتی ہے جو زماں جاہلیت میں (تیز رفتار اور) دوسروں پر سبقت لے جانے والا ہوتا۔

اور کہا جاتا ہے: فرس مُحْتَبٍ یعنی جب گھوڑے کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بغیر پھیلاؤ کے دوری ہو اور یہ مدح اور تعریف ہے اور کہا جاتا ہے: الحَنَبُ یعنی دونوں پنڈلیوں میں ٹیڑھا پن ہونا۔ خلیل نے کہا ہے: الثَّخَنِيْبُ جو شدت (اقتوت) سے متصف ہے اور یہ اعوجا جہ (ٹیڑھا پن) نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ ۚ حَالَانِکَہ تم عقلمند ہو (اور سمجھ بوجھ رکھتے ہو) اور یہ بھی کہا گیا ہے: حَالَانِکَہ تم تورات میں

لکھے ہوئے پر گواہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین جس کے بغیر کوئی دین قبول نہ کیا جائے گا وہ اسلام ہے، کیونکہ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نعت (اور اوصاف کا بیان) ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ
إِيمَانِكُمْ كُفْرِينَ ۝

”اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا اہل کتاب سے (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں۔“

یہ آیت ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اوس اور خزرج کے درمیان اس فتنہ کو از سر نو اٹھانے کا ارادہ کیا جو ایک بار حضور نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے ختم ہو چکا تھا پس وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا اور انہیں شعر سنائے دونوں قبیلوں میں سے ایک نے اسے اپنی جنگ کے بارے کہا، تو دوسرے قبیلے نے کہا: تحقیق ہمارے شاعر نے فلاں فلاں دن کہا، تو گویا اس طرح ان میں اختلاف اور شدت داخل ہو گئی، تو انہوں نے کہا: آؤ ہم جنگ کو پھر سے اسی طرح شروع کر دیں جس طرح پہلے تھی۔ تو انہوں نے آواز دی: اے آل اوس۔ اور دوسروں نے پکارا: اے آل خزرج، پس وہ اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ہتھیار اٹھائے اور لڑنے کے لئے صفیں باندھ لیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پس حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور دونوں صفوں کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے اور خوب بلند آواز سے یہ آیت پڑھی۔ پس جب انہوں نے آپ ﷺ کی آواز نہ سنی تو وہ آپ کے لئے خاموش ہو گئے اور توجہ سے سننے لگے اور جب آپ فارغ ہوئے تو انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے اور رونے لگے، یہ حضرت عکرمہ، ابن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور جس نے ایسا کیا وہ شاس بن قیس یہودی تھا، اس نے اوس اور خزرج کے خلاف سازش کی اور انہیں وہ جنگیں یاد دلانے لگا جو ان کے درمیان واقع ہوئیں تھیں اور حضور نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور آپ نے انہیں نصیحت فرمائی، تو قوم نے پہچان لیا کہ یہ شیطان کا کچوکا ہے اور ان کے دشمن کا مکر ہے۔ پس انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک دیئے اور رونے لگے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے، پھر حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں ارشاد سنتے ہوئے اور اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا۔ مراد اوس و خزرج ہیں۔ اِنْ تَطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ یعنی شاس اور اس کے ساتھی۔ (اگر تم کہا مانو گے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا) يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كُفْرِينَ (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) وہ لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: کوئی ہماری طرف آنے والا نہ تھا جو ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، پس آپ نے ہماری طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ہم رک گئے، باز آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے معاملات کی اصلاح فرمادی۔ پس ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ کوئی شخص نہ تھا، سو میں نے

کوئی دن نہیں دیکھا جو اس دن کے اول حصہ سے زیادہ قبیح اور وحشت ناک ہو اور اس کے آخری حصہ سے زیادہ حسین اور پسندیدہ ہو۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۚ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ
فَقَدْ هَدَىٰ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١١﴾

”اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کرنے لگے حالانکہ تم وہ ہو کہ پڑھی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں اللہ کا رسول بھی تشریف فرما ہے اور جو مضبوطی سے پکڑتا ہے اللہ (کے دامن) کو تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ تک۔“

اللہ تعالیٰ نے بطور تعجب یہ ارشاد فرمایا: وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ سے مراد قرآن کریم ہے وَفِيكُمْ رَسُولُهُ اور تم میں اس کا رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف فرما ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: زمانہ جاہلیت میں قبیلہ اوس اور خزرج کے درمیان جنگ و جدال جاری رہا تو انہوں نے اسی کا ذکر کیا جو ان کے درمیان ہوتا تھا، نتیجتاً ان میں سے بعض نے بعض پر تلواریں سونت لیں۔ پس حضور نبی مکرم ﷺ کو لایا گیا اور اس کا تذکرہ آپ ﷺ کے پاس کیا گیا تو آپ ان کی طرف تشریف لے گئے، چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۚ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هَدَىٰ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٢﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا

اور اس آیت میں وہ بھی داخل ہیں جنہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو نہیں دیکھا، کیونکہ آپ ﷺ کی سنت میں سے جو بھی ان میں ہے وہی آپ ﷺ کو دیکھنے کے قائم مقام ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب صرف حضور نبی مکرم ﷺ کے صحابہ کرام کو ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ ان میں تشریف فرما تھے اور وہ آپ ﷺ کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خطاب ساری امت کو ہو، کیونکہ آپ کے آثار و علامات اور وہ قرآن کریم جو ہمیں عطا کیا گیا وہ ہم میں حضور نبی مکرم ﷺ کی جگہ ہی ہے اگرچہ ہم نے آپ کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس آیت میں دو واضح علم ہیں۔ ایک کتاب اللہ کا اور ایک نبی اللہ ﷺ۔ پس نبی اللہ ﷺ تو گزر گئے اور رہی کتاب اللہ تو اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت اور نعمت کے طور پر ان کے درمیان باقی رکھا اور اس میں اس کے حلال و حرام سے متعلق احکام اور طاعت و معصیت سبھی کا ذکر ہے۔ وَكَيْفَ يَحِلُّ نَصَبٌ فِيهِمْ ۚ وَكَيْفَ يَحِلُّ نَصَبٌ فِيهِمْ ۚ وَكَيْفَ يَحِلُّ نَصَبٌ فِيهِمْ ۚ وَكَيْفَ يَحِلُّ نَصَبٌ فِيهِمْ ۚ

گیا ہے اور فتح کی وجہ یہ ہے کیونکہ فاکا قبل یا ہے اور یا اور کسرہ کا جمع ہونا باعث ثقل ہے۔ قول تعالیٰ: وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی طاعت کو مضبوطی سے تھامتا اور پکڑتا ہے۔ فَقَدْ هَدَىٰ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ تو اسے ضرور سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے اور اسے اس کی توفیق دی جاتی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: **يَعْتَصِمُ بِاللّٰهِ** کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: **وَمَنْ يَّعْتَصِمِ بِاللّٰهِ** کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: **أَعَصَمَ بِهِ** واعتصم اور تمسك و استمسك جب وہ اس کے ساتھ چمٹ جائے اور غیر کو چھوڑ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ اور اعتصمت فلانا (یعنی) میں نے اس کے لئے وہ تیار کیا جسے وہ مضبوطی سے پکڑ سکتا ہے اور ہر وہ جو کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہو وہ **مُعَصِمٌ** اور **مُعْتَصِمٌ** ہے۔ اور جو کسی شے کو روکنے والا ہو تو وہ **عاصم** کہلاتا ہے۔

جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے:

أَنَا ابْنُ الْعَاصِيْنَ بَنِي تَمِيمٍ إِذَا مَا اعْظَمُ الْحَدَثَانِ نَابَا
اس میں عاصمین (روکنے والے) کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔
اور نابغہ نے کہا ہے:

يُظَلُّ مِنْ خَوْفِهِ الْمَذْمُوعُ مَعْصِيًا بِالْخَيْرِ زَانَةً بَعْدَ الْإِيمَانِ وَالشَّجْدِ
اس میں معصم مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے۔
اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

فَأَشْرَطَ فِيهَا نَفْسَهُ وَهُوَ مُتَعَصِمٌ وَأَلْقَى بِأَسْبَابِ لَهُ وَتَوَكَّلَا
پس اس نے اس میں اپنی جان کو پیش کر دیا حالانکہ وہ اسے روکنے اور بچانے والا تھا اور اس نے اسباب (دوسائل) پھینک دیئے اور توکل اپنا لیا۔

اور **عَصَبُ الطَّعَامِ**: یعنی کھانے نے اس سے بھوک کو دور کر دیا، عرب کہتے ہیں: **عَصَمَ فُلَانًا الطَّعَامُ** ای منعه من الجوع۔ پس اسی لئے انہوں نے سولق (ستو) کی کنیت ابو عاصم رکھی ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: عرب روٹی کو عاصم اور جابر کا نام دیتے ہیں۔

جیسا کہ شعر میں ہے:

فَلَا تَلُومِيْنِي وَ لُومِي جَابِرًا فَجَابِرٌ كَلَفْنِي الْهَوَا جِرَا
پس تو مجھے ملامت نہ کر بلکہ تو روٹی کو ملامت کر پس روٹی نے ہی مجھے دوپہر کے وقت مشقت میں ڈال رکھا ہے۔
اور وہ اسے عامر کا نام بھی دیتے ہیں۔

کسی شاعر نے کہا:

أَبُو مَالِكٍ يَعْتَادُنِي بِالْطَّعَائِرِ يَجِيئُ فَيُلْقِي رَجُلَهُ عِنْدَ عَامِرٍ
بھوک کو دوپہر کے وقت میرے پاس آنے کی عادت ہے وہ آتی ہے اور روٹی کے پاس اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی ہے۔
ابو مالک بھوک کی کنیت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٠﴾

”اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا اور (خبردار) نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔“

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

امام بخاری (نحاس) نے مرہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حق تقاتہ ان يطاع فلا يعصى وان يذ كر فلا ينسى وان يشكر فلا يكفر (1) (حق تقاتہ کا مفہوم یہ ہے کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے اور اس کا ذکر کیا جائے اور اسے بھلا یا نہ جائے اور شکر ادا کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مفہوم یہ ہے کہ آنکھ جھپکنے کی دیر بھی نافرمانی نہ کی جائے۔ اور مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ اس پر کون قادر ہوگا؟ اور یہ ان پر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔) تو اس نے اس آیت کو منسوخ کر دیا، یہ حضرت قتادہ، ربیع، اور ابن زید سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ارشاد گرامی فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ اس آیت کا بیان ہے۔ اور معنی یہ ہے: پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ نسخ تب ہوتا ہے جب دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو اور جمع کرنا ممکن ہو تو وہ اولیٰ ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ منسوخ نہیں ہے، البتہ حَقَّ تُقَاتِهِ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا جائے جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں اللہ کی راہ میں کسی لومۃ لائم (ملامت کرنے والے کی ملامت) کی پرواہ نہ ہو۔ اور تم عدل و انصاف کو قائم کرو اگرچہ وہ تمہاری ذاتوں اور تمہارے بیٹوں کے خلاف ہی ہو۔

نحاس نے کہا ہے: جب بھی آیت میں مسلمانوں پر کسی واجب کا ذکر کیا جائے کہ وہ اس پر عمل کریں تو اس میں نسخ واقع نہیں ہوتا۔ اور قول باری تعالیٰ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ

أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ

النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٣١﴾

”اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر

فرمائی جب کہ تم تھے (آپس میں) دشمن پس اس نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں تو بن گئے تم اس کے

احسان سے بھائی بھائی اور تم (کھڑے) تھے دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تو اس نے بچا لیا تمہیں اس (میں گرنے) سے۔ یونہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں تاکہ تم ہدایت پر ثابت رہو۔“
اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قوله تعالى: وَاعْتَصِمُوا - العصمة کا معنی ہے المنعة (یعنی عزت اور قوت) اور اسی وجہ سے بذرقہ کو عصمة کہا جاتا ہے۔ اور بذرقہ: قافلہ کی حفاظت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (یعنی محافظ و نگران) اور وہ یہ ہے کہ وہ قافلہ کے ساتھ ایسے افراد کو بھیجے جو اس کی ان سے حفاظت کریں گے جو اسے اذیت اور تکلیف پہنچائیں گے۔ ابن خالویہ نے کہا ہے: البذرقہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ فارسی کلمہ ہے اور عربوں نے اسے عربی بنا لیا ہے، کہا جاتا ہے: بعث السلطان بذرقہ مع القافدة (سلطان نے قافلہ کے ساتھ محافظ بھیجے۔)

اور لفظ الحبل مشترک ہے اور لغت میں اس کا اصلی معنی یہ ہے السبب الذی یوصل بہ الی البغیة والحاجة وہ بب جس کے ذریعہ مقصد اور حاجت تک پہنچا جاتا ہے اور حبل کا معنی حبل العاتق (کندھے کا پٹھا) بھی ہے اور حبل سے مراد ریت کا ایک لمبا اور طویل قطعہ بھی ہے اور اسی معنی میں ایک حدیث ہے: واللہ ما ترک من حبل الا وقفت علیہ، فہل لی من حج (1) (قسم بخدا میں نے کوئی ریت کا لمبا ٹکڑا نہیں چھوڑا مگر میں نے اس پر وقوف کیا، تو کیا میرا حج ہو گیا؟)
اور حبل کا معنی رسی بھی ہے اور اس کا معنی عہد بھی ہے۔

اعشی نے کہا ہے:

اخذت من الأخری الیک حبالہا

واذا تُجَوِّزُهَا جِبَالٌ قَبِيلَةٌ

اس میں حبل سے مراد امان اور پناہ ہے۔

اور حبل کا معنی مصیبت بھی ہے۔

کثیر نے کہا ہے:

بَنُصَحِ أَتَى الْوَاشُونَ أَمْ بِحُبُولٍ

فَلَا تَعْبِلِي يَا عَزُّ أَنْ تَتَفَهَّي

اس میں حبل مصائب کے معنی میں ہے۔

اور حبالۃ کا معنی شکاری کا پھندا (اور جال) ہے۔ اور آیت میں سوائے عہد کے معنی کے کوئی معنی مراد نہیں ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حبل اللہ سے مراد قرآن کریم ہے اور اسے حضرت علی اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے (2) اور حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور ابو

1۔ ابن ماجہ، باب اتی عرفۃ قبل الفجر لیلة جمع، حدیث نمبر 3006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ترمذی، باب ما جاء فضل القرآن، حدیث نمبر 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

معاویہ نے ہجری (مراد ابراہیم بن مسلم العبدی ہے) سے، انہوں نے ابوالاحوص سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ یہ قرآن ہی جبل اللہ (اللہ کی رسی) ہے۔“

اور تقی بن مخلد نے اسی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، حدیثنا یحییٰ بن عبدالحمید حدیثنا ہشیم عن العوام بن حوشب عن الشعبي عن عبد الله بن مسعود وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا فرمایا: جبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

اور آپ سے اور کئی دوسروں سے یہ کئی وجوہ سے مروی ہے اور تمام کا معنی باہم متقارب اور ایک دوسرے میں داخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ الفت و محبت کا حکم ارشاد فرما رہا ہے اور فرقت و جدائی سے منع فرما رہا ہے، کیونکہ فرقت ہلاکت ہے اور جماعت و اتفاق (باعث) نجات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ابن مبارک پر رحم فرمائے۔

اس نے کہا:

ان الجماعة حبل الله فاعتصموا منه بعدوة الوثقى لمن دانا

اس میں جبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَفَرَّقُوا یعنی تم اپنے دین میں جدا جدا نہ ہونا جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنے ادیان میں جدا جدا ہو گئے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ مختلف اغراض اور خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے جدا جدا نہ ہو جانا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سلسلہ میں بھائی بھائی ہو جاؤ، تو وہ ان کے لئے باہمی قطع تعلقی اور باہمی عداوت و دشمنی سے ڈھال اور روکنے کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کا مابعد ارشاد گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے: وَإِذْ كَرُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔

اور اس میں فروعات میں اختلاف کے حرام ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ وہ کوئی اختلاف نہیں، جبکہ اختلاف وہ ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے آپس میں محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہونا معتذر ہو اور رہا مسائل اجتہاد یہ کا حکم، تو ان میں اختلاف فرائض اور معانی شرع کی باریکیاں اور لطائف نکالنے اور مستنبط کرنے کے سبب سے ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پیش آنے والے حوادث و واقعات کے احکام میں مسلسل اختلاف بھی کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے محبت اور الفت سے پیش آتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت کا اختلاف رحمت ہے“ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اختلاف سے منع فرمایا ہے جو جھگڑے اور فساد کا سبب ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہودی اکہتر فرقوں میں یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور عیسائی بھی اسی کی مثل (فرقوں میں تقسیم ہوئے) اور میری امت بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی۔“

ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔ (1)

اور انہوں نے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا ہے (1)۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یقیناً میری امت پر بالکل برابر برابر وہی حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی آدمی اپنی ماں کے پاس اعلانیہ (برائی کے لئے) آتا تھا تو یقیناً میری امت میں سے بھی ایسا ہوگا جو اسی طرح کا فعل کرے گا اور بلاشبہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری امت بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک گروہ کے وہ تمام کے تمام جہنم میں ہوں گے“ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ایک کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا اَنَا عَلَيْهِ و اصحابی جو اس (دین) پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابہ کرام ہیں۔ انہوں نے اسے عبد اللہ بن زیاد الافرقی کی حدیث سے عبد اللہ بن یزید عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسے اس سند کے سوا سے نہیں پہچانتے۔ ابو عمر نے کہا ہے: عبد اللہ افریقی ثقہ راوی ہے، اس کی قوم نے اس کی توثیق کی ہے اور انہوں نے اس کی تعریف کی ہے اور دوسروں نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور ابو داؤد نے اسے اپنی سنن میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”خبردار! سنو تم سے پہلے اہل کتاب بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور یہ ملت عنقریب بہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی بہتر جہنم میں ہوں گے اور ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور وہ الجماعة ہے۔ بلاشبہ عنقریب میری امت سے کچھ تجارتی گروہ نکلیں گے ان کے ساتھ خواہشات اس طح ہوں گی جس طرح الکلب (باؤلا کتا کاٹے کی بیماری) اپنے مریض کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کے بدن کی کوئی رگ اور ونی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر وہ اس میں داخل ہو جاتی ہے۔“ (2)

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو دنیا سے اس حال میں جدا ہوا کہ اس میں اللہ تعالیٰ وحدہ کے بارے میں اخلاص ہو، اس کی عبادت میں کوئی اور شریک نہ ہو، وہ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے تو وہ اس حال میں فوت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔“ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اور وہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جسے رسل علیہم السلام نے کر آئے اور انہوں نے اسے اپنے رب کی طرف سے پہنچایا اس سے پہلے کہ احادیث میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوا اور احواء و خواہشات میں اختلاف ہو اور اس کی تصدیق سب سے آخر میں نازل ہوئی کتاب اللہ میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْكِتَابِ وَهُمْ لَا يَخْلِفُونَ أَلَمْ تَابُوا؟ (التوبہ: 11) (پس اگر یہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں۔)

انہوں نے اسے نصر بن علی جہضمی عن ابی احمد بن ابی جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن انس رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ (3) ابو الفرج جوزی نے کہا ہے: اگر کہا جائے یہ فرقے تو معروف ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ہم افتراق اور اصولی فرقوں کو

1۔ سنن ترمذی، باب ما جاء في افتراق هذه الامة، حدیث نمبر 2565، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ابن ماجہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 68، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، کتاب التوبہ، حدیث نمبر 3981، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جانتے ہیں اور پھر فرقوں میں سے ہر گروہ کئی فرقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اگرچہ ہم نے ان فرقوں کے اسماء اور ان کے مذاہب کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اصولی فرقوں میں سے یہ ہمارے لئے بالکل ظاہر ہیں حروریہ، قدریہ، جہبیہ، مرجئہ، رافضہ، اور جبریہ۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے: اصل گمراہ فرقے یہی چھ فرقے ہیں اور ان میں سے ہر فرقہ بارہ فرقوں میں منقسم ہے تو اس طرح بہتر فرقے ہو گئے۔

حروریہ بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا ازرقیہ ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی کو مومن نہیں جانتے۔ اور انہوں نے اہل قبلہ کو کافر قرار دیا سوائے ان کے جنہوں نے ان کے قول کو قبول کیا۔

(۲) اباضیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے ہمارے قول کو لے لیا تو وہ مومن ہے اور جس نے اس سے اعراض کیا تو وہ منافق ہے۔

(۳) ثعلبیہ: ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی فیصلہ نہیں فرمایا اور نہ کوئی تقدیر بنائی۔

(۴) خازمیہ: انہوں نے کہا: ہم نہیں جانتے ایمان کیا ہے اور تمام مخلوق معذور ہے۔

(۵) خلفیہ: ان کا گمان ہے کہ مرد یا عورت میں سے جس نے بھی جہاد ترک کیا تو وہ کافر ہو گیا۔

(۶) کوزیہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو مس کرے کیونکہ پاک چیز کو نجس سے نہیں پہچانا جاسکتا اور نہ کوئی اپنے ساتھ کسی کو کھانا کھلائے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے اور غسل کر لے۔

(۷) کنزیہ: انہوں نے کہا ہے: کوئی کسی کو یہ اختیار اور گنجائش نہ دے کہ وہ اپنا مال کسی کو دے دے، کیونکہ بسا اوقات وہ مستحق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے زمین میں جمع کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اہل حق ظاہر ہو جائیں۔

(۸) شمرخیہ: انہوں نے کہا ہے: اجنبی عورتوں کو مس کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ خوشبودار پودے (پھول) ہیں۔

(۹) اخنسیہ: انہوں نے کہا ہے: میت کو اس کی موت کے بعد کوئی خیر و شر لاحق نہیں ہوتا۔

(۱۰) حکمیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے مخلوق کی طرف بلایا تو وہ کافر ہے۔

(۱۱) معتزلہ: انہوں نے کہا ہے: ہم پر حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کا معاملہ مشتبہ ہے لہذا ہم دونوں فریقوں سے بری الذمہ ہیں۔

(۱۲) میمونہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے اہل محبت کی رضا کے بغیر کوئی امام نہیں ہو سکتا۔

اور قدریہ بھی بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے۔

(۱) احمریہ: یہ وہ فرقہ ہے جن کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ لی جانب سے عدل کی شرط میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے امور کا مالک بنائے اور وہ ان کے گناہوں کے درمیان حائل رہے۔

(۲) ثنویہ: ان کا خیال ہے کہ خیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور شر شیطان کی طرف سے ہے۔

(۳) معتزلہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے کہا کہ قرآن کریم مخلوق ہے اور انہوں نے [صفات] ربوبیہ کا انکار کیا ہے۔

(۴) کینسانیہ: انہوں نے کہا ہے: ہم نہیں جانتے کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں یا بندوں کی جانب سے اور نہ ہم یہ

جانتے ہیں کہ کیا اس کے بعد لوگوں کو ثواب دیا جائے گا یا انہیں سزا دی جائے گی۔

(۵) شیطانیہ: ان کا کہنا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا ہے۔

(۶) شریکیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک کفر کے سوا تمام برائیاں مقدر ہیں۔

(۷) دھیہ: انہوں نے کہا ہے: مخلوق کے افعال اور ان کے کلام کے لئے کوئی ذات نہیں اور نہ ہی نیکی اور بدی کے لئے کوئی ذات ہے۔

(۸) زبریہ: انہوں نے کہا ہے: ہر کتاب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اس کے مطابق عمل کرنا فرض ہے چاہے وہ ناسخ ہو یا منسوخ۔

(۹) مسعدیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے نافرمانی کی پھر توبہ کی تو اس کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

(۱۰) ناکشیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت توڑ دی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(۱۱) قاسطیہ: انہوں نے ابراہیم بن نظام کی اس کے اس قول میں اتباع اور پیروی کی ہے کہ جس نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ شے ہے تو وہ کافر ہے۔

اور جھبیہ بارہ فرقوں میں منقسم ہیں۔

(۱) معطلہ: انہوں نے خیال کیا ہے کہ ہر وہ شے جس پر انسان کا وہم واقع ہو سکتا ہے تو وہ مخلوق ہے اور یہ کہ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جاسکتا ہے تو وہ کافر ہے۔

(۲) مریسیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی اکثر صفات مخلوق ہیں۔

(۳) مکتزقہ: انہوں نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں موجود ہے۔

(۴) واردیہ: انہوں نے کہا ہے: وہ آتش جہنم میں داخل نہ ہوگا جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور جو اس میں داخل ہوا وہ اس سے کبھی نہ نکالا جائے گا۔

(۵) زنادقہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے لئے رب ثابت کرے، کیونکہ حواس کے ادراک کے بغیر اثبات نہیں ہو سکتا اور جس کا ادراک نہ ہو وہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۶) حراقتیہ: انہوں نے یہ گمان کیا ہے کہ کافر کو ایک بار آگ جلا دے گی پھر وہ ہمیشہ جلا ہوا باقی رہے گا اور وہ آگ کی حرارت کو نہیں پائے گا۔

(۷) مخلوقیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔

(۸) فانیہ: ان کا گمان ہے کہ جنت اور جہنم دونوں فنا ہو جائیں گی اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے کہا کہ انہیں پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

(۹) عبدیہ: انہوں نے رسل علیہم السلام کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حکماء تھے۔

(۱۰) واقعہ: انہوں نے کہا: نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ غیر مخلوق ہے۔

(۱۱) قبریہ: یہ عذاب قبر اور شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

(۱۲) لفظیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارا قرآن کا تلفظ کرنا مخلوق ہے۔

اور مرجئہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) تارکیتہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق پر کوئی فریضہ نہیں ہے سوائے اس کے ساتھ ایمان لانے کے،

پس جو کوئی اس کے ساتھ ایمان لایا تو اسے چاہیے وہ جو چاہے کرے۔

(۲) سائبیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو آزاد چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ جو چاہیں کریں۔

(۳) راجیتہ: انہوں نے کہا ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے کو طائع اور گناہ کرنے والے کو عاصی نہیں کہا جائے گا

کیونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس کیا ہے۔

(۴) سالیبیہ: انہوں نے کہا ہے کہ طاعت ایمان میں سے نہیں ہے۔

(۵) بھیشیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ایمان علم ہے اور جو حق کو باطل سے اور حلال کو حرام سے نہیں پہچان سکتا تو وہ کافر ہے۔

(۶) عبدیہ: ان کا کہنا ہے کہ ایمان عمل کا نام ہے۔

(۷) منقوصیہ: انہوں نے کہا ہے: ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے۔

(۸) مستثنیہ: انہوں نے کہا ہے: استثناء ایمان میں سے ہے۔ (یعنی ان شاء اللہ کہنا)

(۹) مشبہ: انہوں نے کہا ہے: آنکھ آنکھ کی طرح ہے اور ہاتھ ہاتھ کی طرح ہے (یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ثابت کرتے

ہیں نعوذ باللہ من ذالک)

(۱۰) حشیویہ: انہوں نے کہا ہے: تمام احادیث کا حکم ایک ہے، پس ان کے نزدیک نفل کو ترک کرنے والا فرض کو چھوڑنے

والے کی طرح ہے۔

(۱۱) ظاہریہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے قیاس کی نفی کی ہے۔

(۱۲) بدعیہ: وہ پہلا آدمی جس نے اس امت میں ان واقعات کا آغاز کیا۔

اور رافضیہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) علویہ: انہوں نے کہا کہ رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا تھا لیکن حضرت جبریل امین نے خطا کی (اور پیغام رسالت حضور

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دیا)۔

(۲) امریہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے کام میں شریک ہیں۔

(۳) شیعہ: ان کا موقف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں اور آپ کے بعد آپ کے ولی ہیں۔ بلاشبہ

امت نے دوسروں کی بیعت کے سبب کفر کیا ہے۔

(۴) اسحاقیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک نبوت یوم قیامت تک متصل ہے اور ہر وہ جو اہل بیت کا علم جانتا ہے تو وہ نبی ہے۔
(۵) ناؤوسیہ: انہوں نے کہا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ ساری امت سے افضل ہیں۔ اور جس کسی نے کسی غیر کو آپ پر فضیلت دی تو وہ کافر ہو گیا۔

(۶) امامیہ: انہوں نے کہا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کسی امام کے بغیر ہو، بلاشبہ امام کو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تعلیم دیتے ہیں۔ اور جب ایک فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرے کو بدل دیتے ہیں۔

(۷) زیدیہ: انہوں نے کہا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد نمازوں میں ائمہ ہوں گے پس جب ان میں سے کوئی موجود ہو تو پھر کسی غیر کے پیچھے نماز جائز نہیں ان کے نیکو کار اور ان کے فاجر (سبھی برابر ہیں)

(۸) عباسیہ: ان کا گمان ہے کہ حضرت عباس کا کسی غیر کی نسبت خلافت کا حق زیادہ ہے۔

(۹) تناسخیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ارواح میں تنازع ہوتا رہتا ہے، پس جو کوئی محسن اور نیکو کار ہو اس کی روح نکلتی ہے اور ایسی مخلوق میں داخل ہو جاتی ہے جو اپنی زندگی کے ساتھ سعادت اندوز ہو رہی ہوتی ہے۔

(۱۰) رجعیہ: ان کا نظریہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب دنیا کی طرف لوٹ کر آئیں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔

(۱۱) لاعنہ: یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت معاویہ، حضرت ابو موسیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم وغیرہ پر لعن کرتے ہیں۔

(۱۲) متربصہ: یہ زاہدوں کے لباس کی طرح لباس پہنتے ہیں اور ہر زمانے میں ایک آدمی کھڑا کرتے ہیں جس کی طرف امر کی نسبت کرتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ اس امت کا امام مہدی ہے اور جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا مقرر کر دیتے ہیں۔

پھر جبریہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) مضطربہ: انہوں نے کہا ہے: آدمی کا کوئی فعل (اور اختیار) نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

(۲) افعالیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے لئے افعال ہیں لیکن ہمارے پاس ان کے لئے کوئی استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم چوپاؤں کی مانند ہیں کہ ہم نہیں رسی ڈال کر ہانکتے اور چلاتے ہیں۔

(۳) مفرد غیہ: انہوں نے کہا ہے: تمام اشیاء پیدا کر دی گئی ہیں اور اب کوئی شے پیدا نہیں کی جائے گی۔

(۴) نجاریہ: ان کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے فعل پر عذاب دے گا نہ کہ ان کے فعل پر۔

(۵) منانیتہ: انہوں نے کہا ہے: تجھ پر اس کے بارے عمل کرنا لازم ہے جو تیرے دل میں کھٹکے پس تو وہ کام کر جس میں تجھے بھلائی اور خیر معلوم ہو۔

(۶) کسبیہ: انہوں نے کہا ہے: بندہ نہ ثواب طلب کرے گا نہ سزا۔

(۷) سابقہ: ان کا کہنا ہے: جو چاہے وہ عمل کرے اور جو چاہے وہ عمل نہ کرے، کیونکہ سعید کو اس کے گناہ کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور شقی اور بد بخت کو اس کی نیکی کوئی فائدہ نہ دے گی۔

(۸) حبیبہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا جام پی لیا تو اس سے ارکان کی عبادت ساقط ہو گئی۔

(۹) خوفیہ: ان کا نظریہ ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی اس کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اس سے ڈرے، کیونکہ ایک دوست اپنے دوست سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔

(۱۰) فکریہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے علم میں اضافہ کیا تو اس نے اپنی مقدار عبادت اس سے ساقط کر دی۔

(۱۱) خشبیہ: انہوں نے کہا ہے: دنیا بندوں کے درمیان برابر ہے، ان کے درمیان اس میں کوئی فضیلت نہیں جس کے لئے ان کے باپ آدم نے انہیں وارث بنایا ہے۔

(۱۲) مثنیہ: انہوں نے کہا ہے: ہماری طرف سے فعل ہے اور ہمارے لئے استطاعت و قدرت ہے۔

وہ فرقے جو اس امت میں زائد ہوئے ان کا بیان عنقریب سورۃ الانعام کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماک الحنفی کو کہا: اے حنفی، جماعت کو لازم پکڑ لے جماعت کو اختیار کر لے، کیونکہ سابقہ امتیں اپنے تفرقہ کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین چیزیں پسند فرماتا ہے اور تین چیزیں ناپسند فرماتا ہے: وہ تمہارے لئے پسند فرماتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور یہ کہ تم سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور وہ تمہارے لئے یہ تین چیزیں ناپسند کرتا ہے۔ قیل وقال، کثرتہ سوال اور مال کو ضائع کرنا۔“

پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا واجب قرار دیا ہے اور اختلاف کے وقت ان دونوں کی طرف رجوع کرنا لازم قرار دیا ہے۔ اور اس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اعتقاداً اور عملاً کتاب و سنت کو مضبوط پکڑنے پر اجماع کریں اور یہی کلمات میں اتفاق لانے اور متفرقات کو منظم کرنے کا وہ سبب ہے جس کے ساتھ دنیا اور دین کے مصالح مکمل ہوتے ہیں اور (اسی میں) اختلاف سے بچاؤ اور سلامتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جمع اور اکٹھا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس افتراق سے منع کیا ہے جو اہل کتابین (یہود و نصاریٰ) میں موجود تھا۔ مکمل آیت کا یہی معنی ہے اور اس میں اس اجماع کے صحیح ہونے پر دلیل بھی موجود ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: **وَإِذْ كُذِّبَتْ إِلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا**۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کو یاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور سب سے عظیم اور بڑی نعمت اسلام اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے، کیونکہ اس کے سبب عداوت اور نفرت و فرقت زائل ہو گئی اور باہمی محبت و الفت پیدا ہو گئی۔ اور اس میں مراد قبیلہ اوس اور خزرج ہیں اور یہ آیت عام ہے۔

اور فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا کا معنی ہے کہ تم نعمت اسلام کے سبب دین میں بھائی بھائی ہو گئے اور قرآن کریم میں جہاں بھی ”أَصْبَحْتُمْ“ ہے وہ بمعنی صِرْتُمْ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا۔ ای صا ر غَائِرًا۔
 اخوانِ اخ کی جمع ہے اور اس کا نام اُخاس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے بھائی کے مذہب کا قصد و ارادہ کرتا ہے، اور شفا ہر شے کی طرف اور اس کے کنارے کو کہتے ہیں۔ اور اسی طرح شفیر بھی ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَلٰی شَفَا جُرْفٍ هَآیَا (التوبہ: 109) (وادی کے کھوکھلے دھانے کے کنارے پر)
 راجز نے کہا:

نحن حضرنا للحجيج سجلة نابتة فوق شفاها بقلة
 اس میں بھی شفا طرف اور کنارہ کے معنی میں ہے۔

اور اشفی علی الشی کا معنی ہے اشرف علیہ یعنی وہ اس پر جھانکا اور اسی سے ہے أشفی المريض علی الموت یعنی مریض موت پر جھانکنے لگا (مراد یہ ہے کہ وہ قریب الموت ہو گیا) اور مابقی منه الا شفا ای قلیل یعنی اس سے تھوڑا باقی رہ گیا۔ ابن السکیت نے کہا ہے: آدمی کے لئے اس کی موت کے وقت چاند کے لئے اس کی آخری راتوں میں اور سورج کے لئے اس کے غروب ہونے کے وقت کہا جاتا ہے: مابقی منه الا شفا ای قلیل۔
 عجاج نے کہا ہے:

و مَرَبَاءَ عَالٍ لِن تَشْرِفًا أَشْرَفْتَهُ بَلَا شَفَىٰ أَوْ بَشَفَىٰ
 قولہ: بلا شفی۔ ای غابت الشمس یعنی مراد ہے سورج غروب ہو گیا اور بشفی کا معنی ہے تحقیق اس سے تھوڑا سا باقی ہے۔ اور یہ لفظ ذوات الیاء (یائی) میں سے ہے اور اس میں ایک لغت یہ بھی ہے کہ یہ واوی ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: شفا اصل میں شَفَوَ ہے، اسی لئے اس کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس میں امالہ نہیں کیا جاتا۔ اور خفش نے کہا ہے: جب اس میں امالہ جائز نہیں تو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ واوی کلمات میں سے ہے اور اس لئے بھی کہ امالہ یا کو واضح کرتا ہے اور اس کا ثنیہ شفو ان ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: یہ تمثیل ہے اس سے ان کا کفر سے ایمان کی طرف نکلنا مراد لیا جا رہا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥٠﴾

”ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک جماعت جو بلا یا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روکا کرے بدی سے اور یہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔“

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں گفتگو اسی سورۃ میں نزر چکی ہے۔

اور قِنْكُمْ میں مِنْ بعضیہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ حکم دینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ علماء ہوں اور تمام لوگ علماء

نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بیان جنس کے لئے ہے اور معنی ہے چاہیے کہ تم تمام کے تمام اسی طرح ہو۔
 میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ انہیں معین کیا: الَّذِينَ اِنْ مَكَثْتُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ الْآيَةِ (الحج: 41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو۔)

اور تمام لوگوں کو قدرت نہیں دی گئی اور ابن زبیر نے پڑھا ہے: وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسْتَعِينُونَ اللّٰهَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ (اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں جو کچھ انہیں پہنچے) ابوبکر الانباری نے کہا ہے: یہ زیادتی ابن زبیر کی طرف سے تفسیر ہے اور یہ ان کا اپنا کلام ہے اس میں نقل کرنے والوں میں سے بعض نے غلطی کی ہے اور اس نے اسے الفاظ قرآن کے ساتھ ملا دیا ہے، جو کچھ بیان کر رہا ہوں اس کی صحت پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو میرے باپ نے مجھے اس سند سے بیان کی ہے حدثنا [حسن] بن عرفة حدثنا وکیع عن ابی عاصم بن ابی عون عن صبیح انہوں نے کہا: میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس طرح پڑھتے ہوئے سنا: وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسْتَعِينُونَ اللّٰهَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ اور کوئی عقلمند اس میں شک نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس زیادتی کے قرآن میں سے ہونے کا اعتقاد نہ رکھتے تھے، کیونکہ آپ نے اسے اپنے اس مصحف میں نہیں لکھا جو امام المسلمین ہے، بلکہ آپ نے اسے وعظ و نصیحت کرنے کے لئے اور ما قبل رب العالمین کے کلام کو موکد کرنے کے لئے اس کا ذکر کیا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾

”اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آچکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں اور ان لوگوں کے لئے عذاب ہے بہت بڑا۔“
 جمہور مفسرین کے قول کے مطابق مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد اس امت کے مبتدع (بدعت کا ارتکاب کرنے والے) لوگ ہیں۔ اور ابوامامہ نے کہا ہے: وہ لوگ حروریہ ہیں، اور پھر یہ آیت تلاوت کی۔ اور جابر بن عبد اللہ نے کہا ہے: کَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ اور وہ لوگ یہود و نصاریٰ ہیں۔ جَاءَهُمْ جمع کی بنا پر مذکر ذکر کیا گیا ہے اور جَاءَتْهُمْ جماعت کی بنا پر ذکر کیا گیا ہے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ ۖ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ

اِيْمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي

رَاحَةِ اللّٰهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٧﴾

”اس دن (جبکہ) روشن ہوں گے کئی چہرے اور کالے ہوں گے کئی منہ تو وہ جو سیاہ رو ہوں گے (انہیں کہا جائے

گا) کہ کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد تو اب چکھو عذاب (کی اذیتیں) بوجہ اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے۔ اور وہ (خوش نصیب) لوگ روشن ہوں گے جن کے چہرے تو وہ رحمت الہی (کے سائے) میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ** یعنی قیامت کے دن جب وہ اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو مومنین کے چہرے روشن اور سفید ہوں گے اور کافروں کے منہ کالے ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نامہ اعمال پڑھنے کے وقت ہوگا جب مومن اپنا نامہ عمل پڑھے گا اور اس میں اپنی نیکیاں دیکھے گا تو وہ انتہائی خوش ہوگا اور اس کا چہرہ چمک اٹھے گا اور جب کافر اور منافق اپنا نامہ عمل پڑھیں گے اور اس میں اپنی برائیاں اور گناہ دیکھیں گے تو ان کا چہرہ سیاہ کالا ہو جائے گا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: بے شک ایسا میزان کے پاس ہوگا کہ جب اس کی نیکیاں بھاری ہو جائیں گی تو اس کا چہرہ روشن ہو جائے گا اور جب (کافر) کے گناہ بھاری ہو جائیں گے تو اس کا منہ سیاہ ہو جائے گا۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے وقت ہوگا **وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ** (یس) اور کہا جاتا ہے: جب قیامت کا دن ہوگا تو ہر فریق کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے معبود کے پاس جمع ہو جائیں، پس جب وہ اس تک پہنچیں گے تو پریشان اور غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے، پس مومنین، اہل کتاب اور منافقین باقی رہ جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ مومنوں کو فرمائے گا: **مَنْ رَبُّكُمْ؟** تمہارا رب کون ہے؟ تو وہ عرض کریں گے: ربنا اللہ عزوجل ہمارا رب اللہ عزوجل ہے۔ تو وہ انہیں فرمائے گا: **”کیا تم اسے پہچان لو گے جب تم اسے دیکھو گے؟“** تو وہ عرض کریں گے: اس کی ذات پاک ہے! جب اس نے اعتراف کر لیا تو ہم اسے پہچان لیں گے، پس وہ اس کا دیدار کرنے لگیں گے جیسے اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اور مومنین اللہ تعالیٰ کے لئے سجدے میں گر جائیں گے اور ان کے چہرے برف کی مثل سفید ہو جائیں گے اور منافقین اور اہل کتاب باقی رہ جائیں گے، وہ سجدہ کرنے پر قادر نہیں ہوں گے تو غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ** اور اس کی قرأت میں تبیض و تسود دونوں تا کو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں: **إِبْيَضَّتْ**، پس تا کو اسی طرح کسرہ دیا جاتا ہے جیسے اس میں الف کو..... اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور اسی کے مطابق یحییٰ بن وثاب نے پڑھا ہے اور زہری نے یوم تبیاض و تسواد پڑھا ہے۔ اور تا کو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے اور یوم بیض و جود جمع مذکر کی بنا پر یا کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور اُقْتَتَتْ کی مثل اُجُوه بھی جائز ہے۔ اور ابیضاض الوجوہ سے مراد ان کا نعمتوں کے ساتھ چمک اٹھنا اور روشن ہونا ہے اور ان کی سیاہی سے مراد وہ ہے جو دردناک عذاب میں سے ان پر چھا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور علماء نے تعین میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل سنت کے چہرے روشن (اور منور) ہوں گے اور اہل بدعت کے منہ سیاہ کالے ہوں گے۔

س (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کو مالک بن سلیمان ہروی غسان کے بھائی نے مالک بن انس سے انہوں نے حضرت نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌُ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌُ کے بارے میں ارشاد فرمایا: یعنی تبیض وجوہ اہل السنۃ و تسود وجوہ اہل البدعہ۔ اسے ابو بکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں کہا ہے: یہ مالک کی حدیث میں ہے۔ مکر ہے۔

حضرت عطاء نے کہا ہے: مہاجرین و انصار کے چہرے روشن ہوں گے اور بنی قریظہ اور نصیر کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اور حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ کفار ہیں اور ان کو کہا جائے گا: کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد کیونکہ تم نے اس وقت اقرار کیا تھا جب تم حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے چونٹیوں کی مثل نکالے گئے تھے۔ اسے علامہ طبری نے اختیار کیا ہے: حسن نے کہا ہے: یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔ قتادہ نے کہا ہے: یہ مرتدین کے بارے میں ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اہل کتاب میں سے ایک قوم ہے۔ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرتے تھے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کی بھی تصدیق کرتے تھے لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا۔ پس اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اے بھی زجاج نے اختیار کیا ہے۔ اور مالک بن انس نے کہا ہے: یہ اہل اہواء کے بارے میں ہے۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ یہ حرور یہ کے بارے میں ہے۔ اور ایک دوسری خبر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قدر یہ کے بارے میں ہے۔ اور ترمذی نے ابو غالب سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: ابو امامہ رضی اللہ عنہ باب دمشق پر کھڑے کئے گئے سروں کو دیکھا (1)، تو حضرت ابو امامہ نے کہا: جہنمی کہتے ہیں آسمان کی چھت کے نیچے شری ترین مقتول ہیں، بہترین اور اچھے نیکوکار مقتول وہ تھے جنہیں انہوں نے قتل کیا تھا..... پھر آپ نے یہ آیت پڑھی یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌُ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌُ الی آخر الایۃ۔ میں نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: اگر میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا سوائے ایک بار یا دو بار یا تین بار کے..... یہاں تک کہ انہوں نے سات بار تک گنا..... تو میں تمہیں یہ بیان نہ کرتا۔ (امام ترمذی نے) کہا: یہ حدیث حسن ہے۔

اور صحیح بخاری میں حضرت اہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلاشبہ میں تمہارے لئے حوض (کوثر) پر پہلے موجود ہوں گا جو کوئی میرے پاس سے گزرے گا وہ وہاں سے پیئے گا اور جس نے (ایک بار) پی لیا وہ کبھی پیاس محسوس نہیں کرے گا یقیناً کئی گروہ میرے پاس آئیں گے میں انہیں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے پھر میرے اور ان کے درمیان کچھ حائل کر دیا جائے گا۔“

ابو حازم نے کہا ہے: نعمان بن ابی عیاش نے مجھے سنا اور کہا: کیا تو نے اہل بن سعد سے اسی طرح سنا ہے؟ میں نے کہا:

ہاں۔ تو اس نے کہا: میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا اور میں نے آپ سے سنا، وہ اس میں یہ اضافہ بیان کرتے تھے: ”تو میں کہوں گا بلاشبہ وہ تو میرے ہیں تو کہا جائے گا بلاشبہ آپ نہیں جانتے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے۔ اس کے لئے ہلاکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہے جس نے میرے بعد (دین) تبدیل کر لیا۔“ (1)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب کا ایک گروہ قیامت کے دن میرے پاس حوض پر آئے گا، تو انہیں حوض سے نکال دیا جائے گا تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار! میرے اصحاب ہیں تو وہ فرمائے گا آپ کے علم میں وہ نہیں ہے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے بلاشبہ یہ لوگ اٹے پاؤں لوٹ کر مرتد ہو گئے۔“ (2)

اس معنی میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں تغیر و تبدل کیا یا ایسی بدعت کا ارتکاب کیا جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو اور نہ اس کے بارے اللہ تعالیٰ اجازت دے تو وہ حوض سے بھگائے جانے والوں میں سے ہوگا اور اس سے دور رہنے والوں میں سے ہوگا جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان میں سب سے زیادہ مطرود اور بعید وہ ہوگا جس نے جماعت مسلمین سے اختلاف کیا اور ان کے راستہ سے علیحدہ ہو گیا جیسا کہ خوارج اپنے مختلف فرقوں کی بنا پر اور روافض اپنی واضح گمراہی کی بنا پر اور معتزلہ طرح طرح کی خواہشات اور ہوس پرستی کی بنا پر، یہ تمام کے تمام دین میں تبدیلی لانے والے اور بدعت کا ارتکاب کرنے والے ہیں اور اسی طرح وہ ظالم جو ظلم و ستم میں، حق کو منانے میں اور اہل حق کو قتل اور ذلیل و رسوا کرنے میں انتہائی زیادتی کرنے والے ہیں اور وہ جو اعلانیہ گناہ کبیرہ کرنے والے ہیں اور جو معاصی اور گناہوں کو حقیر اور ہلکا سمجھنے والے ہیں اور راہ حق سے انحراف کرنے والوں، خواہش پرستوں اور بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کی جماعت، ان تمام کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہی اس آیت سے مراد ہوں۔ اور مثال اسی طرح ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے، کسی کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں رکھا جائے گا سوائے اس انکار کرنے والے کافر کے جس کے دل میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔ اور ابن قاسم نے کہا ہے: کبھی اہل اہواء کے سوا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے جو اہل اہواء کی نسبت زیادہ شریر ہوتا ہے یہ کہتے ہیں: اخلاص کی تکمیل گناہوں سے اجتناب کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ اس کلام میں حذف ہے یعنی فیقال لہم۔ (تو انہیں کہا جائے گا) أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ (کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد) یعنی یوم میثاق کو جب انہوں نے کہہ دیا ہئی (ہاں تو ہمارا رب ہے) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ یہود کے لئے ہے۔ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے لیکن جب آپ تشریف لائے تو انہوں نے (آپ کا انکار کیا اور) آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اور ابوالعالیہ نے کہا: یہ خطاب منافقین کے لئے ہے کہا جائے گا: کیا تم نے سرا اور خفیہ کفر کیا تھا اعلانیہ اقرار کرنے کے بعد۔ اور اہل عرب کا اس پر اجماع ہے کہ امّا کے جواب میں فالانا ضروری ہے کیونکہ اس کا معنی میرے اس قول میں ہے: أما زید فسنطلق،

1۔ صحیح بخاری، باب فی الحوض و قول تعالیٰ اِنَّا اعطیناک الکوثر، حدیث نمبر 6097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 6098، ایضاً

مہمایکن من شیء فزید منطلق۔

اور قول باری تعالیٰ: وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وَجُوهُهُمْ بِسَبِّ اللَّهِ تَعَالَىٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے اور اس کے عہد کو پورا کرنے والے لوگ ہوں گے۔ فَنَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ یعنی وہ ہمیشہ اس کی جنت اور دار عزت و کرامت میں باقی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انہیں میں سے بنائے اور بدعتوں اور ضلالتوں کی راہوں سے ہمیں بچائے اور محفوظ رکھے اور ہمیں ان کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کرتے رہے۔ آمین۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوَهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ ۝ وَ لِلَّهِ مَا فِي

السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝

”یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو ٹھیک ٹھیک اور نہیں ارادہ رکھتا اللہ ظلم کرنے کا دنیا والوں پر۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے کام۔“

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ یہ مبتدا اور خبر ہے اور مراد قرآن کریم ہے۔ نَتْلُوَهَا عَلَيْكَ یعنی آپ پر جبریل امین کو نازل کرتے ہیں سو وہ آپ پر آیات پڑھتا ہے۔ بِالْحَقِّ یعنی صدق و سچائی کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ یہ آیات جو ذکر کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ کی جہتیں اور اس کے دلائل ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تِلْكَ بمعنی ہذا ہے۔ لیکن جب یہ گزر گئیں تو اس طرح ہو گئیں گویا یہ دور اور بعید ہیں۔ لہذا تِلْكَ ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ آيَاتُ اللَّهِ، تِلْكَ سے بدل ہو۔ اور وہ نعت اور صفت نہ ہو، کیونکہ مبہم مضاف کے ساتھ نعت نہیں بن سکتا۔ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ یعنی وہ انہیں بغیر گناہ کے عذاب نہ دے گا۔ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ مہدوی نے کہا ہے کہ اس کی ماقبل کے ساتھ وجہ اتصال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنین اور کافرین کے احوال کا ذکر کیا اور یہ کہ وہ دنیا والوں پر ظلم نہیں کرے گا، تو اس کے متصل بعد اپنی قدرتوں کی وسعت اور ظلم سے اپنے مستغنی ہونے کا ذکر کیا، اس لئے کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے وہ سب اس کے قبضہ میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ابتدائے کلام ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے بیان کیا ہے کہ زمین و آسمان میں سب کا سب اسی کا ہے یہاں تک کہ وہ اسی سے سوال کریں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۚ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ

وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ۝

”ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت و بھلائی) کے لئے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو

برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو یہ بہتر ہوتا ان کے لئے بعض ان میں سے مومن ہیں اور زیادہ ان میں سے نافرمان ہیں۔“

قوله تعالى: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ ترمذی نے بھزبن حکیم عن ابیہ عن جدہ کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے بارے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”تم ستر امتوں کو مکمل کرنے والے ہو تم ان میں بہتر ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ مکرم و محترم ہو“ اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ (1)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم لوگوں کے لئے لوگوں کی نسبت بہترین (اور نفع بخش) ہیں ہم انہیں زنجیروں کے ساتھ اسلام کی طرف کھینچ کر لارہے ہیں (2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس نے ان کے کام کی طرح کام کیا وہ انہیں کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت ہے یعنی جو ان میں سے صالحین اور اہل فضل ہیں۔ اور وہ قیامت کے دن لوگوں پر شاہد ہوں گے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ”تم آیت میں ذکر کردہ شرائط کی بنا پر بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت و بھلائی کے لئے ظاہر کی گئی ہے۔“

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم لوح محفوظ میں ہو (3) اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم جب سے ایمان لائے ہو بہترین امت ہو۔ اور کہا گیا ہے: یہ نبی مکرم ﷺ اور آپ کی امت کے ساتھ پہلے آنے والوں کے لئے بشارت کے طور پر آئی ہے۔ سو معنی یہ ہے کہ تم اپنے سے پہلے آنے والے اہل کتاب کے نزدیک بہترین امت ہو۔ اور انہیں نے کہا ہے: مراد اہل امت، یعنی بہترین دین والے ہیں۔

اور کسی شاعر نے کہا:

حلفتُ فلم اترك لنفسك ريةً وهل يَأْمَنُ ذِئَابَةُ دُهو طائِع

میں نے قسم کھائی سو میں نے تیری ذات کے لئے کوئی شک نہیں چھوڑا اور کیا دیندار گناہ کرے گا حالانکہ وہ طاعت شعار

اور فرمانبردار ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ کان تامہ ہے اور معنی ہے تم پیدا کئے گئے اور تم بہترین امت قرار پائے گئے۔ اور خَيْرَ أُمَّةٍ حال ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کان زائدہ ہے اور معنی ہے اتم خیر امة (تم بہترین امت ہو)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن من سورۃ آل عمران، جلد 2، صفحہ 125، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 4277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 4191، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531

اور سبویہ نے کہا ہے:

وَجِئَانِ لَنَا كَانُوا كَرَامِ

(اور ہمارے عزت و اکرام والے پڑوسی ہیں) اس میں کان زائدہ ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَيْفَ نَكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ (مریم) (ہم کیسے بات کریں اس سے جو گہوارہ میں (کمن بچہ ہے۔) اور وَاذْكُرْ وَاِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَلَّمَكُمُ (الاعراف: 86) (اور یاد کرو (وہ وقت) جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں بڑھادیا) اور دوسرے مقام پر فرمایا: وَاذْكُرْ وَاِذْ اَنْتُمْ قَلِيلٌ (الانفال: 26) (اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے۔) اور سفیان نے میسرہ اشجعی سے، انہوں نے ابو حازم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: تم لوگوں کو زنجیروں کے ساتھ اسلام کی طرف کھینچ کر لاتے ہو (1)۔ نحاس نے کہا ہے: اس کے مطابق تقدیر کلام اس طرح ہے کنتم للناس خیر امة تم لوگوں کے لئے بہترین امت ہو۔

اور حضرت مجاہد کے قول کے مطابق تقدیر کلام یہ ہے: کنتم خیر امة اذ کنتم تاملون بالمعروف وتنہون عن المنکر (تم بہترین امت ہو جبکہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔) اور یہ قول بھی ہے: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بہترین امت ہوگئی کیونکہ ان میں سے مسلمان زیادہ ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان میں عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے لئے ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیر الناس قرنی۔ بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جن میں مجھے مبعوث کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب قرآن کی نص سے ثابت ہو گیا کہ یہ امت تمام امتوں سے بہتر اور افضل ہے۔ ائمہ نے عمران بن حصین سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملتے ہیں (یعنی تابعین) پھر وہ جو ان کے ساتھ ملتے ہیں (یعنی تابع تابعین)“ (2) (الحديث) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس امت کے پہلے لوگ بعد میں آنے والوں سے افضل ہیں، یہی موقف جید اور عظیم علماء نے اپنایا ہے اور یہ کہ جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی اور آپ کو دیکھا اگرچہ عمر میں ایک ہی بار، وہ آپ کے بعد آنے والوں سے افضل ہے اور یہ کہ فضیلت صحبت کے برابر مساوی کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔

ابو عمر بن عبد البر اس طرف گئے ہیں کہ کبھی کوئی وصف صحابہ کرام کے بعد آنے والے میں اس سے افضل ہو سکتا ہے جو جملہ صحابہ کرام میں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: خیر الناس قرنی۔ اپنے عموم پر نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں بھی

1۔ عالم التزیل، جلد 1، صفحہ 531

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل صحابہ، باب فضل الصحابہ ثم الذین یدعونہم، جلد 2، صفحہ 309، اسلام آباد۔ ایضاً،

صحیح بخاری، حدیث نمبر 2457، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فاضل اور مفضول دونوں قسم کے لوگ جمع تھے۔ آپ کے زمانہ میں منافقین کی وہ جماعت جو ایمان کا اظہار کرتے تھے اور وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے جن پر یا ان میں سے بعض پر حدود قائم کی گئیں بھی جمع تھے۔ اور آپ نے ان کے لئے ہی کہا: جو تم چور، شرابی اور زانی کے بارے میں کہتے ہو۔ اور آپ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے سامنے فرمایا: لا تسبوا اصحابی (تم میرے صحابہ گرام کو گالی گلوچ نہ دو۔ (1)) اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے فرمایا: لا تسبب من هو خیر منك (تو اسے گالی نہ دے جو تجھ سے بہتر ہے) اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طوبی لمن رآنی و آمن بی طوبی سبع مرات لمن لم یزنی و آمن بی (سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا اور سات بار سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے نہیں دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا)

اور مسند ابی داؤد الطیالسی میں عن محمد بن ابی حمید عن زید بن اسلم عن ابیہ عن عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا: ”کیا تم جانے ہو کون سی مخلوق ایمان کے اعتبار سے افضل ہے۔“ ہم نے عرض کی ”ملائکہ“ آپ نے فرمایا: ”ان کے بارے تو حق ہے ان کے علاوہ کون ہیں؟“ ہم نے عرض کی انبیاء علیہم السلام۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان کے بارے تو حق ہے بلکہ ان کے علاوہ کون ہے“ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایمان کے اعتبار سے مخلوق میں سے افضل وہ قوم ہے جو ابھی مردوں کی صلیبوں میں ہے وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں وہ ورق (کتاب) پائیں گے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے مطابق عمل کریں گے پس وہی ایمان کے اعتبار سے افضل المخلوق ہیں۔“

اور صالح بن جبیر نے ابو جمہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم سے کوئی بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے اور دو تختیوں کے درمیان ایک کتاب پائیں گے جو کچھ اس میں ہے اس کے ساتھ وہ ایمان لے آئیں گے اور وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔“ اور ابو عمر نے کہا ہے: ابو جمہ صحابی ہیں اور ان کا نام حبیب بن سباع ہے اور صالح بن جبیر ثقہ تابعین میں سے ہیں۔ اور حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلاشبہ تمہارے ایسے دن آنے والے ہیں کہ ان میں اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہوگا ان میں عمل کرنے والے کے لئے اس کی مثل عمل کرنے والے پچاس آدمیوں کا اجر ہوگا (2)“ (یعنی ان کے اجر کی مثل اسے اجر دیا جائے گا) عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ان میں سے (پچاس آدمیوں کی مثل)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(نہیں) بلکہ تم میں سے“ (پچاس آدمیوں کی مثل)۔

ابو عمر نے کہا: بل منکم کے الفاظ سے بعض محدثین خاموش ہیں۔ اور انہوں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قول باری تعالیٰ: لَنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تاویل میں کہا ہے: جس نے تمہارے فعل کی مثل فعل کیا وہ تمہاری مثل ہے۔ احادیث کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ پہلی (روایات) خصوصیت کی بنا پر ہیں۔ واللہ الموفق۔

1۔ مسلم کتاب فضائل صحابہ، باب تحریم سبت الصحابہ، جلد 2، صفحہ 310

2۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث نمبر 4003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس باب کی احادیث کی توجیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک آپ ﷺ کے زمانے کو اس بنا پر فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ لوگ کفار کی کثرت، ان کی اذیتوں پر اپنے صبر کرنے اور اپنے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھنے کے سبب اپنے ایمان میں غرباء تھے اور بلاشبہ اس امت کے آخر میں آنے والے لوگوں نے جب دین کو قائم کیا اور اسے مضبوطی سے تھام لیا اور جب شر، فسق، فتنہ و فساد، گناہ اور کبار کے ظہور کے وقت وہ اپنے رب کی اطاعت و فرمانبرداری پر ثابت قدم رہے تو اس وقت وہ بھی غرباء ہو گئے اور اس وقت میں ان کے اعمال اسی طرح پاکیزہ رہے جس طرح پہلے لوگوں کے اعمال پاکیزہ تھے اور اس کی شہادت حضور نبی مکرم ﷺ کا ارشاد بھی دیتا ہے: **بدا الاسلام غریبا و سيعود كما بدأ فطوبى للغرباء** (اسلام کا آغاز ہوا در آنحالیکہ وہ غریب تھا اور عنقریب اس حالت کی طرف لوٹ جائے گا جیسے شروع ہوا تھا پس غرباء کے لئے مبارکباد اور سعادت مند دی ہے) (1)۔ اور ابو ثعلبہ کی حدیث بھی اس کی شہادت دیتی ہے اور اس کی شہادت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بھی دیتا ہے: **”میری امت بارش کی طرح ہے یہ معلوم نہیں ہو سکتا اس کا اول بہتر ہے یا اس کا آخر۔“** اسے ابو داؤد طیالسی اور ابوعیسیٰ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور اسے ہشام بن عبید اللہ رازی نے مالک سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **مثل امتی مثل المطر لا یذری أوله خیرا أم اخره** (2)۔ اسے دارقطنی نے مسند حدیث مالک میں ذکر کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: ہشام بن عبید اللہ ثقہ راوی ہے محدثین اس میں اختلاف نہیں کرتے۔

اور روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت کے والی بنے تو آپ نے حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ میری طرف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی سیرت لکھو تا کہ میں اس کے مطابق (عمل) کروں، تو حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا: اگر تم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت پر عمل کیا تو پھر تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہو کیونکہ تمہارا زمانہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آدمیوں کی طرح ہیں۔ راوی کا بیان ہے: اور آپ نے اپنے زمانہ کے فقہاء کی طرف لکھا، تو ان تمام نے بھی آپ کی طرف حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے قول کی طرح ہی لکھا۔

بعض اجل علماء نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد خیر الناس قرنی کا اس ارشاد کو معارض قرار دیا ہے: **خیر الناس من طال عمره و حسن عمله و شمل الناس من طال عمره و ساء عمله** (3) (لوگوں میں سے بہتر اور اچھا وہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل حسین و جمیل رہا۔ اور لوگوں میں سے شریروہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل برا رہا) ابو عمر نے کہا: یہ احادیث اپنی اسناد کے تواتر اور حسن ہونے کے ساتھ اس امت کے اول اور اس کے آخر کے درمیان مساوات اور

1۔ جامع الترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 547، اسلام آباد۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث 3975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 84، اسلام آباد

2۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال باب ما جاء فی صلوات الخمس، جلد 2، صفحہ 110/577، اسلام آباد

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد باب ما جاء فی طول العمر للمؤمن، جلد 2، صفحہ 56، اسلام آباد

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزہد باب ما جاء فی طول العمر للمؤمن، حدیث نمبر 2252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

برابری کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور اس کا معنی وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ایمان لانا اور عمل صالح کرنا ایسے زمانہ میں جو فاسد ہو چکا ہے اور اس میں اہل علم و دین کو اٹھالیا جائے گا اور اس میں فسق اور فتنہ و فساد وافر ہو جائے گا اور مومن کو ذلیل و رسوا کیا جائے گا اور فاجر کی عزت و تکریم کی جائے گی۔ اور دین غربت کی طرف لوٹ آئے گا جیسا کہ شروع میں غریب تھا..... اور اس میں دین پر قائم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہوگا۔ پس اس وقت اس امت کا اول عمل کی فضیلت میں اس کے آخر کے ساتھ برابر ہو جائے گا، سوائے اہل بدر اور حدیبیہ کے اور جس نے اس باب کے آثار میں تدبر اور غور و فکر کیا تو اس کے لئے یہ صحیح اور سیدھی راہ ہے۔ واللہ یوقی فضلہ من یشاء۔ (اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے اپنا فضل عطا فرما دیتا ہے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یہ اس امت کی مدح ہے کہ جس دین پر وہ قائم ہیں اور وہ اس کے ساتھ متصف ہیں۔ اور جب انہوں نے تبدیلی کو چھوڑ دیا اور منکر (گناہ کا عمل) پر اتفاق کر لیا تو ان سے مدح و تعریف کا اسم ختم اور زائل ہو گیا۔ اور انہیں ذم اور برائی کا نام لاحق ہو گیا..... اور وہی ان کی ہلاکت اور بربادی کا سبب بن گیا..... اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے کلام سورہ کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهٖمْ۔ یہ خبر دی ہے کہ اہل کتاب کا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا ان کے لئے بہتر تھا اور یہ خبر دی ہے کہ ان میں مومن اور فاسق دونوں قسم کے لوگ ہیں۔ البتہ فاسق زیادہ ہیں۔

لَنْ يَنْصُرُوْكُمْ اِلَّا اَرٰى ۚ وَاِنْ يُقَاتِلُوْكُمْ يَوَلُّوْكُمْ اِلَّا ذَبَابًا ۚ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝۱

”(کچھ) نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا سوائے ستانے کے اور اگر لڑیں گے تمہارے ساتھ تو پھیر دیں گے تمہاری طرف اپنی پیٹھیں (اور بھاگ جائیں گے) پھر ان کی امداد نہ کی جائے گی۔“

قولہ تعالیٰ: لَنْ يَنْصُرُوْكُمْ اِلَّا اَرٰى یعنی ان کا جھٹلانا، تحریف کرنا اور ان کا بہتان لگانا (تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا) اور نہ ہی ان کو غلبہ حاصل ہوگا۔ یہ حسن اور قنادہ سے منقول ہے۔ اور استثنا متصل ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں سوائے معمولی ضرر اور تکلیف کے کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، پس الاذی مصدر کے محل میں واقع ہے اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے ایک وعدہ ہے کہ اہل کتاب ان پر غالب نہ آسکیں گے اور یہ کہ ان کی ان کے خلاف مدد کی جائے گی اور انہیں ان کی طرف سے سوائے بہتان اور تحریف کی اذیت کے اور کوئی بگاڑ اور استیصال نہیں پہنچے گا اور رہا انجام (اور آخرت) تو وہ مومنین کے لئے ہی ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے اور معنی ہے وہ بالیقین تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے، البتہ وہ تمہیں اس کے ساتھ اذیت دیں گے جو کچھ تمہیں سنائیں گے۔ مقاتل نے کہا ہے: سرداران یہود کعب، عدی، نعمان، ابورافع، ابویاسر، کنانہ اور ابن صوریہ اپنے میں سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف جاتے اور انہیں ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ستاتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَنْ يَنْصُرُوْكُمْ اِلَّا اَرٰى (۱) یعنی سوائے زبانی اذیت کے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ یہاں کلام مکمل ہو گیا۔ پھر فرمایا: وَاِنْ

بمعنی احتملوہ ہے یعنی انہوں نے اللہ کا غضب اٹھایا، برداشت کیا۔ اور لغت میں اس کا اصل معنی ہے کہ ان پر غضب لازم ہو گیا۔ اور سورہ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ پھر خبر دی کہ ان کے ساتھ یہ کیوں کیا گیا، تو فرمایا: ذَلِك بِأَنَّهُمْ كَانُوا يُكَفِّرُونَ بَأْيَتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَلِكُمْ هُمَا عَصَاوَا كَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١٠﴾ اس کی مکمل بحث سورہ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ پھر خبر دی اور فرمایا: ليسوا سواء وہ سب برابر نہیں۔ اور کلام مکمل ہو گیا اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت برابر اور یکساں نہیں (1)۔ اور ابوخیثمہ زہیر بن حرب نے بیان کیا ہے حدثنا هاشم بن القاسم حدثنا شيبان عن عاصم عن زهري عن ابن مسعود بنى رسول الله ﷺ نے [ایک رات] عشاء کی نماز مؤخر فرمائی پھر آپ مسجد کی طرف تشریف لے گئے تو دیکھا لوگ نماز کے لئے انتظار کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا: ”بلاشبہ تمہارے سوا اہل ادیان میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو اس وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہوں۔“ فرمایا: اور یہ آیت نازل کی گئی لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ أَنْتَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿١١﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٢﴾ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿١٣﴾ (2) ابن وہب نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ أَنْتَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ یعنی وہ جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے۔ اور ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے جب حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید اور اسید بن عبید اسلام لائے اور جو بھی یہود میں سے اسلام لایا، پس وہ ایمان لائے، انہوں نے تصدیق کی، اسلام کی طرف راغب ہوئے اور اس میں پختگی اور رسوخ حاصل کیا، تو یہودی علماء اور ان میں سے اہل کفر کہتے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ نہ ایمان لائے اور نہ ہی آپ کی اتباع و پیروی کی مگر ہمارے شریر لوگوں نے، اگر وہ ہمارے اچھے اور نیک لوگوں میں سے ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کے دین کو نہ چھوڑتے اور کسی غیر کی طرف نہ جاتے، تو ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا (3): لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ أَنْتَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿١١﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٢﴾ اور انخفش نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے من اهل الكتاب ذوا ممة، ای ذو طریقہ حسنة (4)۔ یعنی اچھے طریقے اور راستے والے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

و هل يأتين ذوا ممة و هو طائع

(کیا اچھے طریقے والا گناہ کرتا ہے حالانکہ وہ اطاعت و فرمانبرداری کر رہا ہے۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور تقدیر کلام ہے من اهل الكتاب امة قائمة و آخری غیر قائمہ۔ پس پہلے پراکتفا کرتے ہوئے دوسرے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابو ذؤیب کا قول بھی ہے:

عصانی الیہا القلبُ اِنِّیْ لِامْرِءٍ مَطِیْعٌ فَمَا اِدْرِیْ اُرْشِدُ طَلَبُهَا (1)

اس کی طرف مائل ہونے میں دل نے میرا ساتھ نہ دیا بلاشبہ میں تو اس کے حکم کا مطیع و فرمانبردار ہوں سو میں نہیں جانتا کہ اس سے (حق کا) مطالبہ کرنا ہدایت ہے (یا گمراہی)۔ تو اس میں مراد اُرْشِدُ امر غمغمی ہے اور اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

فراء نے کہا ہے: امة، سواء کے سبب مرفوع ہے (2) اور تقدیر عبارت ہے: لیس یستوی امة من اهل الكتاب قائمة یتدون آیات اللہ و امة کافرة۔ (اہل کتاب میں سے ایک گروہ جو حق پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں وہ اور کفر کرنے والا گروہ برابر نہیں ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کئی اعتبار سے غلط ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ امة کو سواء کے ساتھ رفع دیا گیا ہے تو اس میں لیس کے اسم کی طرف لوٹنے والی کوئی شے نہیں ہے اور رفع ایسی شے کے سبب دیا جا رہا ہے جو فعل کے قائم مقام نہیں ہے اور اسے مضمر مانا جائے گا جس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کافر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لہذا اسے مضمر ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی مثل ہے: اکلونی البراغیث (3) اور ذهبوا اصحابک۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اکلونی البراغیث ان کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔

اور اِنَّاۤءَ النَّیْلِ اس سے مراد رات کی ساعتیں ہیں (4)۔ اس کا واحد اِنِّیْ و اُنِّیْ اور اِنِّیْ ہے۔ اور یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یَسْجُدُوْنَ بمعنی یصلون (وہ نماز پڑھتے ہیں) ہے۔

یہ فراء اور زجاج سے مروی ہے، کیونکہ تلاوت رکوع و سجود میں نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَکُمْ یَسْجُدُوْنَ۔ اسی یصلون۔ اور سورۃ الفرقان میں ہے: وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اسْجُدُوْا لِلْمَلَائِکِیْنِ اور سورۃ النجم میں ہے فَاسْجُدُوْا

لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۝ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد صرف معروف سجدہ ہی لیا جا رہا ہے۔ اور سبب نزول اسے رد کر رہا ہے اور یہ کہ مراد عشاء کی نماز ہے جیسا کہ ہم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے، پس بتوں کی پوجا کرنے والوں پر جو نہی رات

چھا جاتی ہے تو وہ سو جاتے اور موحدین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نماز عشاء کے لئے کھڑے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب ان کے قیام کا ذکر کیا تو فرمایا وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ یعنی (سجدوں کے) ساتھ قیام بھی

تھا۔ اور ثوری نے کہا ہے: یہ مغرب و عشاء کے درمیان کی نماز ہے (5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قیام لیل کے بارے میں ہے۔ اور بنی شیبہ کے ایک آدمی سے روایت ہے وہ کتابیں پڑھتا تھا اس نے کہا: بلاشبہ ہم رب العالمین کے کلام میں سے ایک

کلام پاتے ہیں۔ کیا اونٹ یا بکریاں چرانے والا گمان کرتا ہے جو کہ رات آتے ہی منفرد اور علیحدہ ہو (کرسو) جاتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو رات کے وقت قیام و سجود کرتا ہے؟ **يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ** یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا اقرار کرتے ہیں اور حضور نبی مکرم محمد **صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ** کی تصدیق کرتے ہیں۔ **وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ** کہا گیا ہے کہ یہ کلام عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی مکرم **صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ** کی اتباع و پیروی کا حکم ہے۔ **وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** نہی عن المنکر سے مراد آپ کی مخالفت سے منع کرنا اور روکنا ہے۔ **وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ** یعنی وہ نیکی کے اعمال بغیر کسی بوجھ اور ثقل کے جلدی سے کرتے ہیں اس لئے کہ وہ ثواب اور اجر کی مقدار سے واقف و آگاہ ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ فوت ہونے سے پہلے اعمال کرنے میں جلدی اور تیزی کرتے ہیں۔ **وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّٰلِحِينَ** اور یہ لوگ صالحین کے ساتھ ہوں گے جنت میں اور وہ حضور نبی رحمت **صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ** کے اصحاب ہیں۔ **وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ** اعمش، ابن وثاب، حمزہ، کسائی، حفص اور خلف نے دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے، (اس لئے کہ یہ) امة قائمہ کے بارے خبر ہے۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابو عبیدہ کی پسند ہے۔ اور باقیوں نے خطاب کی بنا پر دونوں کوتا کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** اسے ابو حاتم نے اختیار کیا ہے اور ابو عمرو و دونوں قرأتوں کو یعنی یا اور تا کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ اور آیت کا معنی ہے: تم جو بھی نیک عمل کرو گے تو ہر گز تمہیں اس کے ثواب سے انکار نہیں کیا جائے گا بلکہ تمہاری قدر افزائی کی جائے گی اور اس پر تمہیں اجر و ثواب اور جزا دی جائے گی۔ (1)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ١١

”بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہر گز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرہ بھر اور وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمسر رہیں گے۔“

قولہ تعالیٰ: **إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا** مقال نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب میں سے مومنین کا ذکر کیا تو پھر ان کے کفار کا ذکر کیا اور وہ اس کا یہ قول ہے **إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا** اسے ابتداء بنایا اور فرمایا: بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے مال کی کثرت اور ان کی اولاد کی کثرت انہیں ہرگز اللہ کے عذاب سے ذرہ بھر نہیں بچا سکیں گے۔ اولاد کا ذکر خاص طور پر کیا گیا کیونکہ نسب کے اعتبار سے وہی ان کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ **وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ** یہ مبتدا اور خبر ہیں اور اسی طرح **هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ** بھی ہے ان تمام کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ

ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلِكْتُهُمْ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١٠﴾

”مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں ایسی ہے جیسے ہوا ہوا اس میں سخت ٹھنڈک ہو (اور) لگے وہ ایک قوم کے کھیت کو جنہوں نے ظلم کیا ہوا اپنے نفسوں پر پھر فنا کر دے اس کھیت کو۔ نہیں ظلم کیا ان پر اللہ تعالیٰ نے لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔“

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ اس میں صایہ صلاحیت بھی رکھتا ہے کہ وہ مصدر یہ ہوا اور یہ بھی کہ وہ بمعنی الذی ہو، اور ضمیر عائد محذوف ہو، یعنی مثل ما ینفقونہ۔ اور کمثل ریح کا معنی ہے کمثل مہب ریح (ہوا چلنے کی طرح) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: الصر کا معنی سخت ٹھنڈک ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصل الصریر ہے جس کا معنی آواز ہے، پس مراد شدید ہوا کی آواز ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ اس آگ کے بھڑکنے کی آواز ہے جو اس ہوا میں ہو۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے: بلاشبہ اس مکڑی کو کھانے سے منع کیا گیا ہے جسے سخت ٹھنڈی ہوانے مار دیا ہو۔ اور آیت کا معنی ہے: کافروں کے خرچ کئے ہوئے مال کے باطل اور ضائع ہونے اور اس کے نفع بخش نہ ہونے کی مثال اس کھیتی اور فصل کی طرح ہے جسے سخت ٹھنڈی ہوا یا آگ لگی ہو اور اس نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا ہو۔ اور اس کے مالکوں کو ذرہ بھر فائدہ نہ ہو حالانکہ وہ اس سے نفع اور فائدہ کی امید رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ اللَّهُ تَعَالَى نے اس کے ساتھ ان پر ظلم نہیں کیا وَلَكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ لیکن وہ خود ہی کفر و معصیت کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے حق کا انکار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ انہوں نے زراعت کے وقت کے بغیر اور اس کی جگہ کے بغیر کھیتی کاشت کی پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ادب سکھایا، اس لئے کہ انہوں نے ایک شے کو غیر محل میں رکھا۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنْتُمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمْ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١١﴾

”اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا رازدار غیروں کو وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے میں وہ پسند کرتے ہیں جو چیز تمہیں ضرر دے، ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے صاف بیان کر دیں تمہارے لئے اپنی آیتیں اگر تم سمجھ دار ہو۔“

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھنے سے منع کرنے اور اس پر زجر و توبیخ کرنے کو مؤکد

کیا ہے۔ اور اس کا تعلق سابقہ اس ارشاد کے ساتھ ہے۔ ان تطيعوا فريقا من الذين اوتوا الكتاب اور البطانہ مصدر ہے اور اس کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کا نام رکھا جاسکتا ہے اور بطانۃ الرجل سے مراد وہ خاص دوست اور افراد ہیں جو اس کے خفیہ معاملات پر بھی آگاہ ہوتے ہیں اور یہ اصل میں البطن سے ماخوذ ہے جو الظهر کے خلاف ہے۔ اور بطن فلان بفلان یبطن بطونا و بطانۃ جب کوئی کسی کے ساتھ خاص ہو اور اس کے اندرونی معاملات میں تہہ تک پہنچا ہوا ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اولئك خلصائي نعم و بطانتي و هم عیبتی من دون کل قریب

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس آیت کے ساتھ منع فرمایا ہے کہ وہ کفار، یہود اور اہل اہواء کو اپنے معاملات میں دخیل اور راز دار بنائیں کہ وہ آراء اور مشاورت میں ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کر کے اور اپنے معاملات ان کے سپرد کر دیں۔ اور کہا جاتا ہے: کل من کان علی خلاف مذهبک و دینک فلا ینبغی لک ان تحدثہ۔ یعنی ہر وہ جو تیرے مذہب اور تیرے دین کے خلاف ہے اس کے ساتھ تیرا مشاورت اور گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ شاعر نے کہا:

عن المرء لا تسأل وسل عن قرینه فکل قرین بالمقارن یقتدی

ہر آدمی سے سوال نہ کر بلکہ اپنے ساتھی سے سوال کر پس ہر ساتھی اپنے مصاحب کی ہی اقتدی کرتا ہے اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو اس کے بارے غور و فکر کرنی چاہیے جسے وہ دوست بنا رہا ہے۔“ (1)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم لوگوں کو ان کے بھائیوں (دوستوں) پر قیاس کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس معنی اور سبب کو بیان فرمایا جس کے لئے اس نے اس تعلق اور دوستی سے منع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا: لَا يَأْلُو نَكُمْ حَبَالًا، خیالاً معنی فساد ہے یعنی تمہارے فساد اور بربادی میں وہ کوئی کسر اور کمی نہیں چھوڑیں گے۔ یعنی بلاشبہ اگرچہ وہ ظاہر میں تمہارے ساتھ قتال اور جنگ نہیں کریں گے لیکن مکر و فریب اور دھوکہ دینے میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قول باری تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُو نَكُمْ حَبَالًا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان سے مراد خوارج ہیں۔“ اور روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو کاتب بنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف شدید عتاب آمیز خط لکھا اور یہ آیت بھی ساتھ تحریر فرمائی۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الآداب باب من یومر أن یجالس، جلد 2، صفحہ 308۔

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء فی اخذ المال... الخ، حدیث 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء فی اخذ المال، جلد 2، صفحہ 60/513، اسلام آباد

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حساب لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آپ کو وہ پیش کیا اور آپ کو تعجب میں ڈال دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کتاب (تحریر) لائے اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تیرا کاتب کہاں ہے یہ کتاب لوگوں پر پڑھے؟ تو انہوں نے عرض کی: وہ تو مسجد میں داخل نہیں ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا: کیوں! کیا وہ جہنی ہے؟ انہوں نے عرض کی: وہ نصرانی ہے، تو آپ نے انہیں خوب جھڑکا اور فرمایا: تو انہیں قریب نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دور کیا ہے اور تو ان کی عزت و تکریم نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل و رسوا کیا ہے اور تو انہیں امین نہ بنا جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خائن قرار دیا ہے۔ (لا تَذْنِبْهُمْ وَ قَدْ اقْصَاهُمْ اللَّهُ وَلَا تَكْرِمْهُمْ وَ قَدْ اِهَانَهُمُ اللَّهُ وَلَا تَأْمَنْهُمْ وَ قَدْ خَوَّنَهُمُ اللَّهُ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: تم اہل کتاب کو عامل نہ بناؤ کیونکہ وہ سود اور رشوت کو حلال سمجھتے ہیں اور اپنے اموال اور اپنی رعایا پر ان لوگوں سے مدد طلب کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ (لَا تَسْتَعْمِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ فَإِنْ مَسَتْكُمْ الرِّشَا وَ اسْتَعِينُوا عَلَىٰ أَمْوَالِكُمْ وَ عَلَىٰ رِعْيَتِكُمْ بِالَّذِينَ يَخْشَوْنَ اللَّهَ تَعَالَىٰ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا: یہاں حیرہ کی عیسائیوں میں سے ایک آدمی ہے اس سے بہتر لکھنے والا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی قلم کے ساتھ اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے۔ کیا وہ آپ کی طرف سے کاتب نہ ہو جائے؟ تو آپ نے فرمایا: میں مومنین کے سوا کسی کو راز دار نہیں بناؤں گا (1)۔ پس اہل ذمہ کو کاتب بنانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سوا دیگر بیع و شراء کے معاملات، میں سے کسی میں ان کا تصرف کرنا اور انہیں نیابت کی ذمہ داری سونپنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس زمانے میں اہل کتاب کو کاتب اور امین بنانے کے سبب احوال بدل چکے ہیں اور وہ والیوں اور امراء کے کند ذہن اور جاہل ہونے کے سبب سردار بن گئے ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کوئی خلیفہ بنایا ہے مگر اس کے دور از دان اور خواص ہیں ان میں سے ایک اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور اس پر برا بیغختہ کرتا ہے اور دوسرا اسے شر کا حکم دیتا ہے اور اسے اس پر ابھارتا ہے پس معصوم (اور محفوظ) وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا (اور بچالیا)۔ (2)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں غریب نہ لکھو“ (3)۔ حسن بن ابی الحسن نے اس کی تفسیر اور وضاحت کی اور فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارادہ یہ فرمایا ہے کہ تم اپنے معاملات میں سے کسی کے بارے میں مشرکین سے مشاورت نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ کراؤ۔ حسن نے کہا: یعنی کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ الْآيَةُ۔ (4)

1۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 496

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، جلد 2، صفحہ 1068، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث 6121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، کتاب مسند المکثرین، باب مسند جابر بن عبد اللہ، جلد 3، صفحہ 99، مطبوعہ دار صادر 4۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 298

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **مَنْ دُونَكُمْ اِيْ مِنْ سِوَاكُمْ** (یعنی تم اپنے سوا کسی غیر کو ازدار نہ بناؤ)

فراء نے کہا: وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذَالِكَ بمعنی سوی ذالک۔ یعنی اس میں دُونَ بمعنی سوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَنْ دُونَكُمْ یعنی سیرت اور حسن مذہب میں (کسی غیر کو ازدار نہ بناؤ) اور لَا يَأْتِيَنَّكُمْ خَبَالًا کا معنی ہے وہ ایسے معاملہ میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے جس میں تمہارے لئے فساد اور بگاڑ ہوگا۔ اور یہ بِطَانَةٌ مِّنْ دُونِكُمْ کی صفت کے محل میں ہے۔ کہا جاتا ہے: لَا تَلَوْجِهْهُ اِيعْنِيْ مِیْنِ كُوْنِیْ كَسْرٍ نِّهْیْ اِثْهَارِ كُھُوْنِ كَا (کوئی کوتاہی نہیں کروں گا) اور اَلْوُثُ اَلْوَا كَا معنی ہے میں نے کوتاہی کی۔ امر و القیس نے کہا ہے:

وما البرء مادامت حُشاشَةُ نَفْسِهِ
بمدركِ اطرافِ الخطوبِ ولا آلِ
اس میں ولا آل کا لفظ مذکورہ معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور الخَبَالُ، الخَبْلُ ہے اور الخَبْلُ کا معنی فساد اور بگاڑ ہے اور یہ افعال، ابدان اور عقول میں ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: مَنْ أَصِيبَ بَدَمٌ أَوْ خَبْلٌ (1) یعنی وہ جسے ایسا زخم لگا جو عضو کو ضائع اور فاسد کر دے۔ اور الخَبْلُ کا معنی اعضاء کا فاسد ہونا ہے اور رَجُلٌ خَبْلٌ وَ مُخْتَبِلٌ (فاسد اور بگڑا ہوا آدمی) اور خَبْلَةُ الْحُبِّ (یعنی محبت نے اسے بگاڑ دیا) اس نے کہا ہے:

أَبْنَى لُبَيْفَى لَسْتُ بِبِيدٍ إِلَّا يَدًا مَخْبُولَةً الْعَضِدِ
یہ فاسدة العضد ہے۔ (یعنی کٹا ہوا فاسد بازو)
فراء نے کہا ہے:

نَظَرَ ابْنُ سَعْدٍ نَظْرَةً وَ بَتَّ بِهَا
اس میں بھی خیال بمعنی فساد ہے۔

اور خَبَالًا مفعول ثانی کے اعتبار سے منصوب ہے، کیونکہ اَلْوُثُ و مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور اگر چاہے تو مصدر (یعنی مفعول مطلق) کی حیثیت سے منصوب مان لے یعنی یخبلونکم خبالا۔ اور اگر چاہے تو حرف جر کے حذف کے سبب منصوب تصور کر لے یعنی اصل میں بالخبال تھا، جیسا کہ انہوں نے کہا: اوجعته ضرباً (یعنی بالضرب میں نے اسے مار کے ساتھ تکلیف دی۔) اور قول باری تعالیٰ وَ ذُوَا مَا عَنِتُّمْ مِمَّا مَصْرُورٌ یہ ہے، یعنی و ذُوَا عَنِتُّكُمْ یعنی وہ پسند کرتے ہیں اسے جو تم پر شاق گزرتی ہے اور العنت کا معنی مشقت ہے (2) اور اس کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ** یعنی تمہارے لئے عداوت اور تکذیب ان کے مونہوں

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات من قتل له قتیل فهو بالخیار بین احدی ثلاث

ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 2613، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 537

(زبانوں) سے ظاہر ہو چکی ہے اور البغضاء بمعنی بغض ہے اور یہ حب (محبت) کی ضد ہے اور البغضاء مصدر مؤنث ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مونہوں کا ذکر کیا ہے نہ کہ زبانوں کا یہ ان کے اپنی ان باتوں میں لغویات اور بے احتیاط گفتگو کرنے کی طرف اشارہ ہے، پس وہ اس چھپنے والے سے فوق اور اوپر تھے جس کی آنکھوں میں بغض ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس معنی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی ہے ”کہ آدمی اپنے بھائی کی عزت کے بارے میں اپنے منہ کو حیا میں رکھے اس کا معنی منہ کھولنا ہے۔ کہا جاتا ہے: شعی الحمار فاه بالنہیق (گدھے نے بیٹگے ہوئے اپنا منہ کھولا۔) اور شعی الفم نفسہ (منہ بذات خود کھل گیا) اور شعی اللجام فم الفرس شحیاً (لگام نے گھوڑے کا منہ مکمل طور پر کھول دیا۔) اور جاءت الخیل شواحی۔ یعنی گھوڑے اپنے منہ کھولے ہوئے آئے۔ اس حدیث سے جواز پر دلیل خطاب نہیں سمجھی جاسکتی کہ کوئی اپنے بھائی کی عزت میں خفیہ داخل ہو جائے، کیونکہ باتفاق علماء وہ حرام ہے۔ (1)

اور قرآن کریم میں ہے ولا یغتب بعضکم بعضاً الا یہ۔ (اور تم آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (2)۔“ اور شحوا کا ذکر بے احتیاطی اور بے تکلفی کی طرف اشارہ ہے۔ فاعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اور اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دشمن کی شہادت دشمن کے خلاف جائز نہیں ہوتی اور اسی طرح اہل مدینہ اور اہل حجاز نے کہا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ سے اس کا جواز مروی ہے۔ ابن بطلان نے ابن شعبان سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کسی دشمن کی شہادت اپنے دشمن کے خلاف کسی بھی شے میں جائز نہیں، اگرچہ وہ سراپا عدل ہو اور عداوت عدالت کو زائل کر دیتی ہے تو پھر کافر کی عداوت کا کیا حال ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ بِخَبْرٍ دِینَا اور آگاہ کرنا ہے کہ وہ جو بغض و حسد چھپائے رکھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا وہ اپنے مونہوں سے اظہار کرتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قد بدء البغضاء پڑھا ہے۔ یعنی فعل کو مذکر ذکر کیا ہے، اس لئے کہ البغضاء بمعنی البغض ہے۔ (3)

هَآنَتُمْ اَوْ لَا تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَکُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتَابِ کُلِّہٖ ؕ وَاِذَا الْقُوْکُمْ قَالُوْا اٰمَنَّا ؕ وَاِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَلَیْکُمْ اِلَّا نَامِلًا مِّنَ الْغِیْظِ ؕ قُلْ مُؤْتُوْا بِغِیْظِکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلَیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۱۹

”سنو! تم تو وہ (پاک دل) ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے اور وہ (ذرا) محبت نہیں کرتے تم سے اور مانتے ہو تم سب کتابوں کو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ فرمائیے: مر جاؤ اپنے غصہ (کی آگ میں جل کر) یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کا۔“

قوله تعالى: هَآأَنْتُمْ أُولَآءِ تُشْجِبُونَهُمْ (یعنی تم تو منافقین ہیں) (یعنی تم تو منافقین سے محبت کرتے ہو۔) اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَإِذَا الْقَوْمُ كَفَرُوا قَالُوا آمَنَّا (جب وہ تمہیں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں)۔ ابو العالیہ اور مقاتل نے یہی کہا ہے یہاں السحبۃ بمعنی مصافاة (یعنی خالص محبت کرنا) ہے۔ یعنی اے مسلمانو! تم تو ان کے ساتھ خالص محبت کرتے ہو اور وہ اپنے نفاق کی وجہ سے تمہارے ساتھ خالص محبت نہیں کرتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: تم تو ان کے لئے اسلام کا ارادہ رکھتے ہو اور وہ تمہارے لئے کفر چاہتے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد یہود ہیں۔ اکثر (علماء) نے یہی کہا ہے۔ الکتاب اسم جنس ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس سے مراد کتابیں ہیں۔ اور یہودی بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ امْنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا إِنَّا نؤمنُ بِمَا أَنزَلَ عَلَيْنَا وَنَكْفُرُ بِمَا وَرَاءَهُ (البقرہ: ۹۱) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے: ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرنے۔ ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ۔)

وَإِذَا الْقَوْمُ كَفَرُوا قَالُوا آمَنَّا یعنی کہتے ہیں: ہم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ایمان لائے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ وَإِذَا خَلَوْا وَرَجَبُوهَا بَيْنَهُمْ فِي الْأَرْضِ قَالُوا آمَنَّا (یعنی پورے) ہیں۔ مِنَ الْغَيْظِ یعنی وہ تم پر شدید غصہ سے انگلیوں کے پورے چباتے ہیں اور ان کے بعض بعض کو کہتے ہیں: کیا تم ان کی طرف دیکھتے ہو یہ ظاہر ہوئے اور بہت زیادہ ہو گئے۔ اور العَضُّ کا مفہوم ہے شدید غصے کا اظہار کرنا (۱) اس کے نفاذ کی قدرت نہ رکھتے ہوئے اور اسی معنی میں حضرت ابوطالب کا قول ہے:

يَعْضُونَ غَيْظًا خَلْفَنَا بِالْأَنَامِلِ

(وہ ہمارے پیچھے شدید غصہ کے سبب انگلیوں کو چباتے ہیں۔)

اور دوسرے نے کہا ہے:

إِذَا رَأَوْنِي أَطَالَ اللَّهُ غَيْظَهُمْ عَصُوا مِنَ الْغَيْظِ اطراف الأباهيم

جب انہوں نے مجھے دیکھا تو وہ اپنے انگوٹھوں کے اطراف کو غصے سے کانٹے لگے۔ اللہ تعالیٰ ان کے غصہ میں اور اضافہ کرے۔

کہا جاتا ہے: عَضَّ يَعْضُ عَضًا وَعَضِيضًا اور العَضُّ (عین کے ضمہ کے ساتھ ہو) تو معنی ہے: اس نے اہل امصار کے

چوپاؤں کو چارہ ڈالا۔ مثلاً الكسب (کمائی) اور النوى المروض (توڑی ہوئی گٹھلی) اسی سے کہا جاتا ہے: أَعْضَ الْقَوْمُ،

جب ان کے اونٹ گھاس کھانے لگیں۔ اور بعید عَضَضِيٌّ، یعنی موٹا تازہ اونٹ گویا اسے اس طرف منسوب کیا گیا ہے اور

عَضَّ (عین کے کسرہ کے ساتھ ہو) تو معنی ہے: لوگوں میں سے انتہائی ہوشیار اور انتہائی چالاک۔ اور عَضَّ الْأَنَامِلُ یعنی

انگوٹھوں کا ٹٹنا سے مراد ایسا فعل ہے جس پر انتہائی غصہ ہو اور آدمی اسے کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، یا ایسے کام میں پڑنا جسے

تبدیل کرنے پر آدمی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور یہ دانتوں کے ساتھ کاٹنا اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ قریب المرگ آدمی پر ہاتھ کو (دانتوں کے ساتھ) پکڑنا ہوتا ہے اور اسی طرح شرمندہ آدمی کا دانتوں کو ٹکرانا بھی ہوتا ہے، علاوہ ازیں غمزہ اور پریشان حال آدمی کا زمین پر بیٹھ کر لکیریں لگانا اور کنکریوں کو گننا بھی اسی قبیلے سے ہے۔ اور یہ عض ضا د ساقطہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور عظم الزمان ظاء مشالہ کے ساتھ۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

وعظ زمان یا بن مردان لم يدع من المال الأمسحتا او مجلف

اس میں عظم زمان عض الزمان کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

الانامل کا واحد انملة (میم کے ضمہ کے ساتھ) ہے۔ اور میم کو فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور ضمہ زیادہ مشہور ہے۔

اور ابوالجوزاء نے جب یہ آیت تلاوت کی تو اس نے کہا: یہ اباضیہ ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صفت قیامت تک آنے والے بہت سے اہل بدعت میں پائی جائے گی۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مُؤْتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ اگر کہا جائے، وہ کیسے نہیں مرے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ

جب کسی شے کو فرمائے: کُنْ (تو ہو جا) فیكون (تو وہ ہو جاتی ہے)؟ تو اس کی طرف سے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ ان میں

سے ایک یہ ہے..... اس بارے میں مفسرین میں سے علامہ طبری اور کثیر نے کہا ہے: یہ ان کے لئے بددعا ہے۔

یعنی اے محمد! سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ تم فرماؤ تم مسلسل اپنے غصہ میں جلتے رہو یہاں تک کہ تم مرجاؤ۔ اور اس پر توجیہ یہ ہے کہ آپ ان

کے لئے ان کے سامنے اور پیچھے بددعا کرتے رہیں بخلاف لعنت کرنے کے۔ (1)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ انہیں خبر دے دو کہ وہ اسے بالکل نہ پاسکیں گے جس کی آرزو اور خواہش رکھتے ہیں،

کیونکہ موت اس کے قریب ہے تو اس معنی کی بنا پر دعا کا معنی زائل ہو گیا اور تقریر اور غصہ دلانے کا معنی باقی رہا اور یہ معنی مسافر

بن ابی عمرو کے قول کے ساتھ بھی جاری ہوتا ہے:

و یتمنی فی ارومتنا و نفقا عین من حسدا

اور اسی معنی کی طرف یہ قول باری تعالیٰ بھی راہنمائی کرتا ہے: مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَّنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

فَلْيَبْذُذْ سَبَبَ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ (الحج: 15) (اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں

کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہیے کہ لٹک جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا ڈال

کر) اسے کاٹ دے۔)

إِنْ تَبَسَّسْتُمْ حَسَنَةً تَسَوْهُمْ وَإِنْ تُبْصِكُمْ سَيِّئَةً يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ تَصْبِرُوا

وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿١٦﴾

”(ان کا حال تو یہ ہے کہ) اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو (بڑے) خوش ہوتے ہیں اس سے اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو نہ نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا فریب کچھ بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اس کا) احاطہ کئے ہوئے ہے۔“

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَسْأَلْهُمْ حَسَنَةً تَسْأَلْهُمْ سُلْسٰی نے اسے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تا کے ساتھ۔ اور یہ لفظ عام ہے ہر اس شے کو شامل ہے جو اچھی ہو سکتی ہے اور بری ہو سکتی ہے۔ اور مفسرین نے جو (خِصْب) شادابی (جَذْب) خشک سالی، مومنین کا اجتماع اور ان کے درمیان فرقت کا ہونا اور دیگران جیسے اقوال مثالیں ذکر کی ہیں اور یہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور آیت میں معنی یہ ہے کہ ہر وہ جس کی یہ حالت ہو کہ اس میں شدید عداوت اور حق و کینہ ہو اور مسلمانوں پر تکالیف آنے کے وقت اسے خوشی اور مسرت ہوتی ہو وہ اس اہل نہیں کہ اسے رازدار بنایا جائے، بالخصوص جہاد جیسے اس امر عظیم میں جو کہ دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہے۔

کسی کہنے والے نے کتنا خوب کہا ہے:

كل العداوة قد ترجى افاقتهما
الا عداوة من عاداك من حسد

ہر عداوت اور دشمنی کے ختم ہونے کی امید کی جاسکتی ہے سوائے اس کی عداوت کے جس نے تیرے ساتھ حسد کیا۔

وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَاغْرَمْ اِنْ اِذِیْتَ رَسَالٰیْہِیْ عَلٰی صَبْرٍ کَرِہٍ (1) اور طاعت اور مومنین کی محبت و دوستی پر صبر کرتے رہو وَ تَشْقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُهُمْ شَیْئًا کہاجاتا ہے: ضارہ یضوّرہ یضیّرہ ضیّرًا وَ ضَوْرًا، پس اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقویٰ کے ساتھ ان کے ضرر اور نقصان کی نفی کی شرط بیان کی ہے اور یہ مومنین کے لئے تسلی اور ان کے دلوں کے لئے باعث تقویت ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں..... کہ حرمیان اور ابو عمرو نے لَا یَضُرُّکُمْ پڑھا ہے یہ ضارَ یضیّرُ سے ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول لَا ضَیْرُ ہے۔ اور دوساکن ملنے کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا گیا، کیونکہ جب اسے ضمہ کو حذف کر دیا گیا تو را اور یا دونوں ساکن باقی رہ گئیں لہذا یا کو حذف کر دیا گیا اور اسے ہی حذف کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ضارَہ یضوّرہ سنا ہے اور انہوں نے لَا یَضُرُّکُمْ کی اجازت دی ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَا یَضُرُّکُمْ ہے۔ [اور کوفیوں نے لَا یَضُرُّکُمْ را کو ضمہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ضَرَّ یضُرُّ سے ہے۔] اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فا کو مضمّر ماننے کی تقدیر پر مرفوع ہو اور معنی ہو: فلا یضُرُّکم، (پس وہ تمہیں نقصان نہ دے گا)

اور اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے:

مَنْ یَفْعَلِ الْحَسَنَاتِ اللّٰهُ یَشْکُرْہَا

(جو نیکیاں کرے گا اللہ تعالیٰ ان کی قدر افزائی فرمائے گا۔) یہ کسائی اور فراء کا قول ہے، یا یہ تقدیم کی نیت پر مرفوع ہوگا۔

اور سبویہ نے کہا ہے:

انك ان يُضْرَعُ اخوك تُضْرَعُ

(بلاشبہ تو بچھاڑ دیا جائے گا اگر تیرے بھائی کو بچھاڑ دیا گیا۔)

آیت کا مفہوم یہ ہو گا لا یضْرَکُم ان تصبوا و تتقوا (تمہارا صبر کرنا اور تمہارا ڈرنا) (اور تقویٰ اختیار کرنا) تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے جزم دی جائے اور دوساکن جمع ہونے کی وجہ سے راء کو ضمہ دیا جائے کیونکہ وہ ضمہ کے بعد واقع ہے۔ اور اسی طرح فعل مجزوم ہونے کی بنا پر راء کے فتح کی قرأت بھی ہے اور اجتماع ساکنین کی صورت میں فتح کے خفیف حرکت ہونے کی وجہ سے یضْرَکُم کو مفتوح پڑھا گیا ہے۔ اسے ابو زید نے مفضل عن عاصم سے روایت کیا ہے۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور نحاس نے بیان کیا ہے: اور مفضل ضبی نے عاصم سے لَا یضْرَکُم گمان کیا ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے راء کو کسرہ دیا گیا ہے۔

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱﴾

”اور یاد کرو (اے محبوب!) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپ اپنے گھروں سے (اور میدان احد میں) بٹھا

رہے تھے مومنوں کو مورچوں پر جنگ کے لئے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ، اِذْ میں عامل فعل مضمر ہے اور تقدیر کلام ہے: واذ کر اذ غدوت، یعنی اور آپ یاد کرو (اے محبوب!) جب آپ صبح سویرے چلے۔ مِنْ اَهْلِكَ اپنے گھر سے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیہا کے پاس سے۔ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ یہ غزوہ احد تھا اور اسی کے بارے میں یہ مکمل آیت نازل ہوئی۔ اور مجاہد، حسن، مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ نے کہا ہے: یہ غزوہ خندق کے بارے میں ہے اور حسن سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ غزوہ بدر کے بارے میں ہے اور جمہور کا قول یہ ہے کہ یہ غزوہ احد کے بارے میں ہے (۱) اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: اِذْ هَبْتَ طَّآئِفَتَيْنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں۔) اور یہ بلاشبہ غزوہ احد میں ہوا تھا۔ اور مشرکین نے تین ہزار افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ مدینہ طیبہ پر (چڑھائی کا) قصد کیا تا کہ وہ ان سے غزوہ بدر کی ناکامی اور شکست کا بدلہ و انتقام لیں، پس وہ احد پہاڑ کے نزدیک مدینہ طیبہ کے بالمقابل وادی کے کنارے جا اترے، یہ ۳ھ بارہ شوال بدھ کا دن تھا، ہجرت سے اکتیسواں مہینہ شروع ہو چکا تھا اور وہ جمعرات کے دن وہاں مقیم ہو گئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مدینہ طیبہ میں تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی تلوار میں دندانے پڑ گئے ہیں اور یہ کہ آپ کے لئے بیل ذبح کیا جا رہا ہے اور یہ کہ آپ نے اپنا دست مبارک محفوظ اور مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر یہ فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کا ایک گروہ شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ آپ کے خاندان میں سے ایک آدمی کو بھی شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ محفوظ زرہ مدینہ طیبہ ہے۔

اسے مسلم نے نقل کیا ہے (1)۔ اور یہ سب کچھ اسی کے مطابق ہے جو کچھ اس غزوہ میں سے معروف و مشہور ہے۔ اور تبوک کا اصل معنی ہے گھر بنانا، (ٹھکانا بنانا) بَوَاتُہ منزلاً کہا جائے گا جب تو کسی جگہ سکونت اختیار کرے اور اسی معنی میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعِدًّا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (2) (جس نے عداوت میرے بارے میں جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے) یعنی اس میں گھر بنالے۔ پس تَبَوَّأُ الْمُؤْمِنِينَ کا معنی ہے آپ ان کے لئے صف بندی کی جگہیں بنا رہے تھے اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے خواب میں دیکھا جیسا کہ ایک سونے والا دیکھتا ہے گویا کہ میں پے درپے مینڈھے لارہا ہوں اور گویا میری تلوار کی دھار ٹوٹ گئی ہے تو میں نے تعبیر یہ کی کہ میں قوم کے مینڈھے کو قتل کروں گا اور میں نے اپنی تلوار کی دھار ٹوٹنے کی تعبیر یہ کی کہ میری آل میں سے ایک آدمی شہید کر دیا جائے گا۔“ پس حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اور رسول اللہ ﷺ نے طلحہ کو قتل کیا اور وہ (کفار کا) علمبردار تھا۔ اور موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب سے بیان کیا ہے: مہاجرین کا علمبردار رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک آدمی تھا تو اس نے کہا: میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کروں گا جو میرے ساتھ ہے، تو طلحہ بن عثمان جو کہ سعید بن عثمان نخعی کا بھائی تھا اس نے اسے کہا: اے عاصم! کیا تیرے لئے مقابلے کی طاقت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ پس وہ آدمی اس پر تیزی سے چھینا اور طلحہ کے سر پر تلوار دے ماری یہاں تک کہ تلوار اس کی داڑھی پر لگی اور اس نے اسے قتل کر دیا تو علمبردار کا قتل ہونا رسول اللہ ﷺ کے خواب کی تصدیق ہے کائناتی مردف کبشا۔

إِذْ هَمَّتْ طَّآفِقَتَيْنِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا ۖ وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا ۚ وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾

”جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا (اس لئے اس نے اس لغزش سے بچالیا) اور صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے مومنوں کو۔“

إِذْ فِي عَالِ تَبَوَّأُ يَأْسِيْنُهُمْ عَلِيْمٌ ہے۔ اور دو جماعتوں سے مراد خزرج میں سے بنو سلمہ اور اوس میں سے بنو حارثہ ہیں اور یہ دونوں غزوہ احد میں لشکر کے دو پہلو تھے (3)۔ اور أَنْ تَفْشَلَا کا معنی ہے کہ وہ بزدلی کا اظہار کریں (اور ہمت ہار دیں)۔ بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا: ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی إِذْ هَمَّتْ طَّآفِقَتَيْنِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا ۖ وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا فرمایا: ہمارے دو گروہ، بنو حارثہ اور بنو سلمہ تھے اور پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ نازل نہ ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بنو حارث، بنو خزرج اور بنو نضیر تھے اور نبیت بنی اوس میں سے عمرو بن مالک تھے۔

اور فِشَل سے مراد بزدلی ہے، اس کا لغوی معنی یہی ہے اور دونوں گروہوں کا ارادہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب لشکر کے

1۔ بخاری کتاب المناقب، حدیث 3352، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ مسلم المقدمہ، جلد 1، صفحہ 7، اسلام آباد

4۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 541

مدینہ منورہ سے باہر نکلنے کے بعد عبد اللہ بن ابی اپنے منافق ساتھیوں سمیت واپس لوٹ آیا (تو انہوں نے بھی ارادہ کیا) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی حفاظت فرمائی اور یہ واپس نہ لوٹے، اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا** یعنی اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی حفاظت فرما رہا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہوں نے (لشکر کے ساتھ) نکلنے سے (پیچھے) بیٹھے رہنے کا ارادہ کیا اور وہ ان میں سے صغیر (چھوٹے) تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے دلوں میں آنے والا خیال تھا جو ان کے دلوں میں پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو اس پر مطلع فرمادیا تو ان کی بصیرت میں اضافہ ہو گیا اور اس بزدلی اور سستی کا مظاہرہ نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا اور ان میں سے بعض نے بعض کی مذمت کی اور وہ حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ اٹھے تو رسول اللہ ﷺ چل پڑے یہاں تک کہ آپ مشرکین کے قریب جا پہنچے، آپ ﷺ ایک ہزار افراد کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکلے تھے اور پھر عبد اللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سوا ساتھیوں کو ساتھ لے کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے واپس لوٹ آیا، کیونکہ اس کی رائے سے اختلاف کیا گیا تھا جب اس نے مدینہ طیبہ میں بیٹھے رہنے اور وہیں قتال کرنے کا اشارہ دیا تھا اگر دشمن ان پر حملہ آور ہو اور اس کی رائے رسول اللہ ﷺ کی رائے کے موافق تھی (1) اور اکثر انصار نے اس کا انکار کیا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان میں سے وہ شہید ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کے ساتھ عزت و تکریم عطا فرمائی۔ امام مالک نے فرمایا ہے، غزوہ احد میں مہاجرین میں سے چار اور انصار میں سے ستر افراد نے جام شہادت نوش کیا۔

المقاعد: مقعد کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے بیٹھنے کی جگہ اور یہ مواقف کے قائم مقام ہے لیکن لفظ قعود ثبوت پر دلالت ہے اور بالخصوص تیر انداز ثابت قدم تھے۔ مختصر اغزوہ احد کا یہی مفہوم ہے، اس کا تفصیلی اور شافی بیان آگے آئے گا۔

اس دن مشرکین کے ساتھ سو گھوڑ سوار تھے اور ان پر خالد بن ولید سربراہ تھے اور اس دن مسلمانوں کے ساتھ کوئی گھوڑا نہ تھا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا اور پتھر کے ساتھ نچلی طرف سے دائیں جانب کے چار دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ ﷺ کے سر مبارک کا خود توڑ دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی امت اور دین کی جانب سے اس سے افضل و اعلیٰ جزا عطا فرمائی جو اپنے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کو اس کے صبر پر عطا فرمائی اور وہ جس نے نبی مکرم ﷺ سے اس دن اعراض کیا تھا وہ عمرو بن قعبہ لیشی اور عتبہ بن ابی وقاص تھا اور کہا گیا ہے: فقیہ محمد بن مسلم بن شہاب کا دادا عبد اللہ بن شہاب وہ ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کی پیشانی مبارک کو زخمی کیا تھا۔ واقدی نے کہا ہے: ہمارے نزدیک ثابت یہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے چہرہ اقدس کو زخمی کرنے والا ابن قعبہ تھا۔ اور جس نے آپ ﷺ کے منہ پر پتھر مار کر آپ کے دندان مبارک کو شہید کیا تھا وہ عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ واقدی نے اپنی سند کے ساتھ نافع بن جبر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے مہاجرین میں سے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میں احد کے دن حاضر تھا اور میں

نے تیر دیکھے ہر جانب سے آرہے تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان میں تھے اور ہر تیر آپ سے پھیر دیا جاتا تھا۔ تحقیق میں نے عبد اللہ بن شہاب زہری کو اس دن یہ کہتے ہوئے سنا: محمد (ﷺ) پر میری راہنمائی کرو، محمد (ﷺ) علیہ وآلہ وسلم پر میری راہنمائی کرو، اگر وہ بچ گئے تو میں نہیں بچ سکوں گا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ اس کے پہلو میں تھے کوئی بھی آپ کے ساتھ نہ تھا پھر وہ آپ سے آگے گزر گیا، تو اس بارے میں صفوان نے اسے ڈانٹ پلائی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں، میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں: بلاشبہ انہیں ہم سے محفوظ رکھا گیا ہے! ہم چار آدمی نکلے اور ہم نے آپ کے قتل کا آپس میں پختہ معاہدہ کیا [لیکن ہم آپ پر راہ نہ پاسکے۔] اور ایک پتھر رسول اللہ ﷺ کو آگیا یہاں تک کہ آپ گڑھے میں گر گئے، اسے ابو عامر راہب نے مسلمانوں کے لئے بطور دھوکہ اور چال کے کھودا تھا پس آپ ﷺ اپنے پہلو کے بل گرے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو سہارا دیا یہاں تک کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد مالک بن سنان نے رسول اللہ ﷺ کے زخم سے خون چوس لیا اور آپ کے خود کے دو حلقے آپ ﷺ کے چہرہ مبارک میں پیوست ہو گئے اور انہیں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے نکالا۔ اور اپنے دانتوں کے ساتھ انہیں پکڑا تو وہ گر گئے، تو آپ نے انہیں جڑ سے توڑ دیا اور آپ رضی اللہ عنہ کو ان کا ٹوٹنا خوبصورت لگتا تھا اور اس غزوہ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ آپ کو وحشی نے قتل کیا تھا۔ وحشی جبیر بن مطعم کا غلام تھا اور جبیر نے اس کو کہا: اگر تو نے محمد (ﷺ) کو قتل کیا تو ہم تجھے گھوڑوں کی لگا میں تھیں یں گے اور اگر تو نے علی بن ابی طالب کو قتل کیا تو ہم تجھے ایک سو اونٹنیاں دیں گے وہ سب کی سب سیاہ ہوں گی اور اگر تو نے حمزہ کو قتل کیا تو تو آزاد ہو جائے گا، وحشی نے کہا: رہے محمد (ﷺ) ان پر نگران اور محافظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے کوئی بھی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور جہاں تک علی (رضی اللہ عنہ) کا تعلق ہے تو انہیں جس نے بھی مقابلے کی دعوت دی ہے انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے اور رہا حمزہ! تو وہ بہادر آدمی ہیں، قریب ہے کہ میرا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو میں انہیں قتل کر دوں۔ اور وہاں ہند بھی تھی جب وحشی تیار ہوا یا وہ اس کے پاس سے گزری تو اس نے کہا: ہاں ابو دسمہ! تو (سینہ کو) ٹھنڈا کر تو تو بھی پرسکون اور ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پس وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے مشرکین کی جماعت پر حملہ کر دیا، پس جب آپ اپنے حملہ سے کامیابی کے ساتھ واپس لوٹے اور وحشی کے پاس سے گزرے تو اس نے چھوٹے نیزے کے ساتھ آپ پر حملہ کر دیا اور وہ آپ کو جا لگا اور جان لیوا ثابت ہوا رضی اللہ عنہ۔

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے: پھر ہند نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چاک کر کے کلیجہ باہر نکالا اور اسے دانتوں کے ساتھ چبایا لیکن اسے نکل نہ سکی اور پھر اسے پھینک دیا پھر ایک بلند چٹان پر چڑھ گئی اور بلند آواز سے چیخ کر یہ کہا:

نحن جزیناکم بیوم بدر والحرب بعد الحرب ذات سغب

(اے مسلمانو!) ہم نے یوم بدر کا بدلہ چکا دیا اور جنگ کے بعد جنگ آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکتی ہے:

ما کان عن عتبۃ لی من صبر ولا اخی و عتہ و بکری

مجھے (اپنے باپ) عتبہ، اپنے بھائی (ولید بن عتبہ)، اس کے چچا (شیبہ بن ربیعہ) اور اپنے پہلے بیٹے (حظلمہ بن ابی

سفیان) سے صبر نہیں آتا تھا۔

شفیت نفسی و قضیت نذری شفیت وحشی غلیل صدری
میں نے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا اور اپنی نذر پوری کر لی۔ اے وحشی! تو نے میرے سینے کی جلن کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔

فشکر وحشی عن عمری حتی ترق اعطی فی قبری
پس مجھ پر ساری زندگی وحشی کا شکر یہ ادا کرنا لازم ہے یہاں تک کہ میری ہڈیاں میری قبر میں بوسیدہ ہو جائیں۔
پھر اس کا جواب بند بنت اثاثہ بن عباد بن عبدالمطلب نے دیا اور کہا:

خزیت فی بدر و بعد بدر یابنت وقاع عظیم الکفر
اے انتہائی گھٹیا اور پرلے درجے کے کافر کی بیٹی! تو بدر میں بھی رسوا ہوئی اور بدر کے بعد بھی۔

صبتك الله غداة الفجر منها شہین الطوال الزهر
اللہ تعالیٰ علی الصبح دراز قد اور خوش اخلاق ہاشمیوں کو تیرے پاس لے آیا:

بکل قطاع حسام یقری حمزۃ لیثی و عن صقری
میرے شیر حضرت حمزہ اور میرے شاہین حضرت علی رضی اللہ عنہما ہر تیز کاٹنے والی تلوار کے ساتھ تمہارے سر قلم کر رہے تھے،

اذ رام شیب و ابوک غدری فحضا منه صواحی النخی
و نذرک السوء فشتا نذر

جب شیبہ اور تیرے باپ (عتبہ) نے میرے ساتھ بد عہدی کا ارادہ کیا تو ان دونوں نے (یعنی حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے) اس کے سینے کے کھلے اطراف کو لہو لہان کر دیا اور تیرا بدی کی نذر ماننا بہت بری نذر ہے۔
اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر روتے ہوئے یہ اشعار لکھے:

بکت عینی و حق لها بکاھا و ما یغنی البکاء ولا العویل
میری آنکھ رو پڑی اور رونا اس کا حق بنتا ہے لیکن رونے اور واویل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں:

عن أسد الاله غداة قالوا أحزمة ذاکم الزجل القتل
(میری آنکھیں) شیر خدا پر اس روز (رو پڑیں) جب لوگوں نے کہا: کیا یہ مقتول آدمی حمزہ ہیں؟

أصیب المسلمون به جمیعا هنات و قد أصیب به الرسول
آپ کے قتل سے سب مسلمانوں کو تکلیف پہنچی اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تکلیف پہنچی۔

أبا یغنی لك الأركان هذت وانت الباجد البر الوصول
اے ابو یعلیٰ! (یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) آپ کے تمام اعضاء کاٹ دیئے گئے حالانکہ آپ ایک شریف، نیک اور ہر ایک سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے۔

علیک سلام ربک فی جنان مغالطھا نعیم لایزول
آپ پر آپ کے رب کی طرف سے ان جنتوں میں سلام پہنچے جن میں لازوال نعمتیں ملتی رہیں گی۔

ألا یا ہاشم الأخیار صبرا فکل فعالیکم حسن جمیل
اے قبیلہ ہاشم میں سب سے بہتر فرد صبر کر، تمہارا ہر کام نہایت حسین و جمیل ہے۔

رسولُ اللہ مصطبر کریم بأمر اللہ ینطق اذ ینقول
اللہ کے رسول ﷺ صابر اور کریم ہیں، وہ جب بھی کچھ فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہی بولتے ہیں۔

ألا مَنْ مُبْدِعُ عَنی لُؤیَا فبعد الیوم دائلۃ تَدُول
ارے کون شخص ہے جو میری طرف سے قبیلہ لؤی کو یہ پیغام پہنچا دے کہ آج کی جنگ کے بعد ایک دوسری جنگ کی نوبت آکر رہے گی۔

و قَبْلَ الیومِ ماعرفوا و ذاقوا وقائِعنا بہا یُشفی الغلیل
اور آج کی جنگ سے پہلے (غزوہ بدر میں) جو کفار نے ہمیں خوب پہچان لیا۔ اور ہمارے مقابلے کا مزہ چکھ لیا (وہ بھی پہنچا دے) اس جنگ میں ہمارے تصادم سے پیاسوں کی پیاس بجھائی جاتی رہی۔

نَسِیتُم ضَرْبَنَا بِقَلِیبِ بَدْر غداۃ اُتاکم الموتُ العجیل
قلیب بدر کے پاس تم ہماری شیرزنی کو بھول گئے ہو جس روز موت تمہارے پاس بڑی تیزی سے آرہی تھی۔

غداۃ ثوی أبوجہل صریعا علیہ الطیر حائِئۃ تجول
جس روز ابو جہل دھڑام سے گر کر ہلاک ہو گیا اور اس کے اوپر پرندے گھوم گھوم کر آ جا رہے تھے۔

و عتبۃ وابنہ خِرا جمیعا و شیبۃ عضہ السیف الصقیل
اور عتبہ اور اس کا بیٹا دونوں زمین پر گر پڑے اور شیبہ کو بھی صیقل کی ہوئی تلوار نے کاٹ کر رکھ دیا۔

و مَثْرُکُنَا اُمَیۃ مُجْلَعِینَا و فی حیز دمہ لَدُنْ نبیل
اور ہم نے امیہ کو بھی زمین پر دراز کر دیا در آنحالیکہ اس کے سینے کے نچلے حصے میں ایک بہت بڑا نیزہ داخل تھا۔

و هَامَ بنی ربیعۃ سائلوها ففی اسیافنا منها فلول
اور بنی ربیعہ کی کھوپڑیوں سے پوچھو، ان کو کاٹنے کی وجہ سے ہماری تلواروں میں دندانے پڑنے ہوئے ہیں۔

ألا یا ہندُ فابکی لا تَسبِی فانتِ الوالِیۃ العُبری الہبول
ارے اے ہند! اب خوب رو اور رونے سے نہ اکتا کیونکہ تو ہی شدت غم کی وجہ سے بڑے بڑے آنسو بہانے والی اور اپنے عزیزوں کو کھودینے والی ہے۔

ألا یا ہندُ لا تُبَدِی شَمَاتَا بحمزۃ اِنَّ عِزُّکُم ذلیل

ارے اے ہند! تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوشی کا اظہار نہ کر کیونکہ تمہاری عزت خاک میں مل چکی ہے۔
اور آپ کی بہن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بھی مرثیہ کہا اور وہ کتب سیرت میں مذکور ہے۔ رضی اللہ عنہا۔

قوله تعالى: وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ توکل کا بیان ہے، توکل کا لغوی معنی: اظہار العجز والاعتماد علی الغیر ہے (یعنی عجز کا اظہار کرنا اور غیر پر اعتماد کرنا) اور وَ اَكْلَ فُلَانٍ (کہا جاتا ہے) جب کوئی کسی دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا کام ضائع کر دے۔

توکل کی حقیقت میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس حضرت سہل بن عبد اللہ سے اس کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: قالت فرقة۔ الرضا بالظمان، و قطع الظم من المخلوقين ایک جماعت نے کہا ہے: توکل سے مراد ضمان کے ساتھ راضی ہونا اور مخلوق سے کسی حرص اور لالچ کو ختم کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: التوکل ترك الأسباب والركون الى مسبب الأسباب کہ توکل سے مراد اسباب کو ترک کرنا ہے اور مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ پس جب کوئی سبب اسے مسبب سے مشغول کر دے گا تو اس سے توکل کا اسم بھی زائل ہو جائے گا۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جنہوں نے کہا ہے کہ توکل سبب ترک کرنے کے ساتھ ہوتا ہے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں طعن کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَكُلُوا مِنَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا (پس تم اس سے کھاؤ جو تم نے حلال طیب (مال) کمایا) تو اس میں غنیمت بمعنی کمائی ہے اور مزید ارشاد فرمایا: فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (تو یہ بھی عمل ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ السَّحْتَرَفَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کوئی پیشہ (اور کام) کرنے والے بندے کو پسند فرماتا ہے۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سر یہ پر قرض دیتے تھے اور آپ کے سوا کسی اور نے کہا ہے: یہ عام فقہاء کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کا معنی یہ ہے ہو الثقة بالله والايقان بأن قضاء ما مضى کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ یقین رکھنا اور یہ ايقان رکھنا کہ اس کی قضا اور فیصلہ نافذ ہونے والا ہے اور سعی اور محنت کرنے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنا ایسے کاموں میں جن میں اسباب ضروری ہیں مثلاً کھانا، پینا، دشمن سے احتیاط اور بچاؤ کرنا، اسلحہ تیار کرنا اور ان تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کرنا جن کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کرتی ہے اور یہی موقف محققین صوفیہ نے اختیار کیا ہے لیکن ان کے نزدیک اسم توکل ان اسباب کے ساتھ طمانینت و راحت کے حصول اور دلوں کو ان کی طرف ملتفت کرنے کا تقاضا نہیں کرتا، کیونکہ یہ نہ تو کوئی نفع لا سکتے ہیں اور نہ کوئی ضرر دور کر سکتے ہیں، بلکہ سبب اور مسبب دونوں ہی اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں اور سب اس کی جانب سے اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے اور متوکل کی جانب سے ان اسباب کی طرف جھکاؤ اور میلان واقع ہوتا ہے تو وہ اس اسم (کے مفہوم) سے نکل جاتا ہے پھر توکل کرنے والوں کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔

(۱) توکل کی قدرت رکھنے والے کی حالت! یہ تو ان اسباب میں سے کسی شے کی طرف اپنے دل کے ساتھ متوجہ ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی وہ حکم امر کے سوا ان میں مشغول ہوتا ہے۔

(۲) قدرت نہ رکھنے والے کی حالت: اور یہ وہ ہوتا ہے جس کی توجہ ان اسباب کی طرف وقتاً فوقتاً ہو جاتی ہے مگر وہ عملی

طریقوں اور دلائل قطعیہ اور حالیہ ذوق کے ساتھ ان کو اپنے آپ سے دور رکھتا ہے، پس وہ اسی طرح کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جود و عطا کے ساتھ قدرت رکھنے والے متوکلین کے مقام پر فائز فرما دیتا ہے اور اسے عارفین کے درجات کے ساتھ ملا دیتا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ ﴿١٣﴾ اِذْ تَقُولُ
لِلْمُؤْمِنِينَ اَلَنْ يَكْفِيَكُمْ اَنْ يُبَدِّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ اَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ ﴿١٤﴾
بَلَىٰ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُبَدِّدُكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ
اَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿١٥﴾

”اور بے شک مدد کی تھی تمہاری اللہ تعالیٰ نے (میدان) بدر میں حالانکہ تم بالکل کمزور تھے۔ پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے تاکہ تم (اس بروقت امداد کا) شکر ادا کر سکو۔ (عجب سہانی گھڑی تھی) جب آپ فرما رہے تھے مومنوں سے: کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہاری مدد فرمائے تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے ہیں۔ ہاں کافی ہے بشرطیکہ تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور (اگر) آدمی تمہیں کفار تم پر تیزی سے اسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔“

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ غزوہ بدر سترہ رمضان المبارک، بروز جمعہ ہجرت کے اٹھارہویں ماہ واقع ہوا، اور بدر، وہاں پانی کا ایک کنواں ہے اسی سبب سے اس جگہ کا نام بدر ہے اور شعبی نے کہا ہے: وہ پانی قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کا تھا اس کا نام بدر تھا (1) اور اس وجہ سے اس جگہ کا نام بدر رکھا گیا۔ پہلا معنی زیادہ اور عام ہے۔ واقعہ بدر غیر منقول جگہ کا نام ہے اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر کے ضمن میں سورہ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اذِلَّةٌ کا معنی ہے بہت کم، تھوڑے، کیونکہ وہ اس دن تین سو تیرہ یا چودہ آدمی تھے (2)۔ اور ان کے دشمن کی تعداد نو سو سے ہزار تک کے درمیان تھی۔ اور اذِلَّةٌ ذلیل کی جمع ہے۔ اور اس مقام پر ذل کا اسم استعارۃ استعمال کیا گیا ہے، وہ اپنی ذاتوں میں تو یقیناً عزت والے اور غالب تھے، لیکن اپنے دشمنوں کی طرف اپنی نسبت کے اعتبار سے اور زمین کے مختلف حصص میں بسنے والے جمیع کفار کے مقابلے میں غور و فکر کے وقت ان کی قلت اور کمی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ان پر غلبہ پالیا جائے گا۔ اور النصر کا معنی عون (مدد کرنا) ہے، پس اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر کے دن ان کی مدد فرمائی اور ان میں مشرکین کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور اسی دن پر اسلام کی بنیاد پڑی اور یہ وہ پہلی جنگ تھی جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ غزوات میں شرکت

فرمائی اور ان میں سے آٹھ میں باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا (1)۔ اور اسی میں ابن اسحاق سے یہ روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ملا اور میں نے ان سے پوچھا: کتنے غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے؟ تو انہوں نے فرمایا: انیس غزوات میں۔ پھر میں نے پوچھا: کتنے غزوات میں تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: سترہ غزوات میں۔ پھر میں نے کہا: وہ کون سا پہلا غزوہ ہے جس میں آپ شریک ہوئے؟ انہوں نے فرمایا: ذات العسیر یا ذات العشیر (2)۔ اور یہ سب کچھ اس کے خلاف ہے جو اہل تاریخ و سیر نے کہا ہے۔ محمد بن سعد نے کتاب الطبقات میں کہا ہے: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات ستائیس ہیں اور آپ کے سرایا چھپن ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ چھیالیس ہیں اور وہ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کیا ہے وہ بدر، احد، مرہ، یسبع، خندق، خیبر، قرظہ، الفتح، حنین اور طائف ہیں۔ ابن سعد نے کہا ہے: یہ وہ ہے جس پر ہمارا اجماع ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر میں، خیبر سے واپسی پر وادی القریٰ میں اور الغابہ (شام کی طرف مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ ہے) میں قتال کیا ہے (3) اور جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ حضرت زید اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک نے اس کے بارے خبر دی ہے جو اس کے علم یا اس کے مشاہدہ میں تھا۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ”پہلا غزوہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے وہ ذات العسیر ہے، یہ بھی اس کے خلاف ہے جو اہل التواریخ والیسیر نے کہا ہے۔ محمد بن سعد نے کہا ہے: غزوہ عسیرہ سے پہلے تین غزوات ہوئے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ان میں شریک ہوئے۔ اور ابن عبد البر نے ”کتاب الدرر فی المغازی والیسیر“ میں کہا ہے: پہلا غزوہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے غزوہ ودان ہے اور یہ اہ صفر میں واقع ہوا اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچے تو ماہ ربیع الاول کی بارہ راتیں گزر چکی تھیں، پھر آپ بقیہ ربیع الاول اور ۲ھ کے صفر تک وہیں مقیم رہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور صفر کے مہینے میں نکلے اور مدینہ طیبہ پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا حتیٰ کہ آپ ودان پہنچ گئے اور بنی ضمرہ سے مصالحت کر لی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کی جانب لوٹ گئے اور جنگ نہ ہوئی اور اسی کا نام غزوہ ابواء بھی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مذکورہ سال کے ربیع الثانی کے مہینے تک مدینہ طیبہ میں مقیم رہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکلے اور سائب بن عثمان بن مظعون کو مدینہ طیبہ پر عامل مقرر فرمایا، یہاں تک کہ آپ رضوی (مدینہ طیبہ میں ایک پہاڑ ہے) کے قریب بواط (قبیلہ جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے) پہنچ گئے پھر آپ مدینہ طیبہ واپس تشریف لے گئے اور جنگ نہ ہوئی۔ بعد ازاں آپ ربیع الثانی کے بقیہ ایام اور کچھ ایام جمادی الاول کے وہیں رہے پھر آپ غزوہ کے ارادہ سے نکلے اور مدینہ طیبہ پر ابو سلمہ بن عبد الاسد کو خلیفہ مقرر کیا اور مدینہ (مکہ مکرمہ کی ایک وادی ہے) کے راستے سے عسیرہ کی طرف چل دیے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن اسحاق نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں اور حضرت علی

1۔ مسلم کتاب الجہاد والیسیر، جلد 2، صفحہ 18، قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ مسلم کتاب الجہاد والیسیر، جلد 2، صفحہ 118، قدیمی کتب خانہ کراچی

ایضاً: بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الطبقات النبیہ ابن عبد، کتاب ذکر عدد مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 5، دار بیروت

بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بطن میں ہونے والے غزوہ عثیرہ میں دونوں دوست (ایک ساتھ) تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں اترے تو ایک مہینہ تک وہیں مقیم رہے اور وہاں بنی مدلج اور ان کے حلفاء بنی ضمرہ وغیرہ کے ساتھ صلح کر لی اور ان سے عداوت ترک کر دی، تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا: کیا تیرے لئے ممکن ہے (اے) ابوالیقظان کہ تو ان کے پاس آئے؟ بنی مدلج کی ایک جماعت بیدار رہ کر ان کے لئے کام کر رہی ہے ہم دیکھیں وہ کیسے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم ان کے پاس آئے اور ان کی طرف کچھ دقت تک دیکھتے رہے پھر ہم پر نیند غالب آ گئی تو ہم نے زمین کی مٹی میں کھجور کے چھوٹے درختوں کا قصد کیا اور ان میں آکر سو گئے، پھر قسم بخدا! ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اپنے قدموں کے ساتھ جگایا، تو ہم بیٹھ گئے اور ہم اس مٹی سے لٹھرے پڑے تھے تو اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: مابالذی یا اباتراب تجھے کیا ہوا ہے اے اباتراب! تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے خبر دی جو ہمیں پیش آیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ألا اخبرکم باشقی الناس رجلین (کیا میں تمہیں ایسے دو آدمیوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمام لوگوں سے زیادہ بد بخت ہیں؟ ہم نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قوم شمود کا حیر جس نے (حضرت صالح علیہ السلام کی) اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اور (دوسرا وہ) جو تجھے اے علی! اس پر مارے گا۔۔۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اپنے سر پر رکھا۔۔۔ یہاں تک کہ یہ اس سے تر ہو گیا“ اور (پھر) آپ سے اپنا دست مبارک اپنی ریش مبارک پر رکھا (1)۔ پس ابو عمر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم بقیہ جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخرہ کی کچھ راتیں وہیں مقیم رہے اور اس میں بنی مدلج سے مصالحت کی، پھر واپس لوٹ آئے اور جنگ تک نوبت نہ آئی، پھر اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں کے فاصلے کے ساتھ غزوہ بدر الاولیٰ ہوا، یہ وہ تفصیل ہے جس میں اہل التواریخ والسیر کوئی شک نہیں کرتے، پس حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے خبر دی جو کچھ ان کے پاس تھا۔ واللہ اعلم۔

اور کہا جاتا ہے: ذات العسیرین کے ساتھ بھی ہے اور شہین کے ساتھ بھی اور اس پر ہا کا اضافہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: العثیرۃ۔ پھر غزوہ بدر الکبریٰ ہوا اور جو بھی اس میں حاضر ہوئے ان کے لئے فضیلت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی اور عظیم جنگ ہے اس میں علماء کی ایک جماعت کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے ساتھ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی مدد فرمائی اور ظاہر آیت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے، نہ کہ غزوہ احد میں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ ایسا غزوہ احد میں ہوا تو انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ سے تا قولہ تَشْكُرُونَ کو دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ قرار دیا ہے۔ یہ عام شعبی کا قول ہے۔ اور لوگوں نے ان سے اختلاف کیا ہے اور روایات بالکل ظاہر اور واضح ہیں کہ ملائکہ غزوہ بدر کے دن حاضر ہوئے اور عملاً جنگ میں شریک ہوئے اور اسی کے بارے ابو اسید مالک بن ربیعہ کا قول ہے اور یہ بدر میں حاضر تھے، اگر میں اب تمہارے ساتھ بدر میں ہوتا اور میری آنکھیں سلامت ہوتیں تو میں تمہیں وہ گھائی دکھاتا جس سے ملائکہ ظاہر ہوئے تھے مجھے اس میں کوئی شک اور اختلاف نہیں ہے۔ اے عقیل نے زہری عن ابی حازم سلسلہ بن دینار سے روایت کیا

ہے۔ ابن ابی حاتم نے کہا ہے: اس ایک حدیث کے سوا زہری کی ابو حازم سے کوئی حدیث معروف نہیں اور ابواسید کے بارے کہا جاتا ہے کہ آپ ہی بدری صحابہ کرام میں سے سب سے آخر میں فوت ہوئے، اسے ابو عمر نے الاستیعاب وغیرہ میں ذکر کیا ہے اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور ہے آپ نے بیان فرمایا: غزوہ بدر کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا کہ ان کی تعداد ایک ہزار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد تین سو انیس ہے، تو نبی مکرم قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے، پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کرنے لگے: اللّٰهُمَّ انجِزْ لِي مَا وَعَدْتَنِي اللّٰهُمَّ اَنْ تَهْلِكَ هَذِهِ الْعَصَابَةُ مِنْ اَهْلِ الْاِسْلَامِ لَا تَعْبُدُ فِي الْاَرْضِ (اے اللہ! میرے لئے وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے، اے اللہ! وہ عطا فرما جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے، اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ شریف کی طرف منہ کئے ہاتھ پھیلا کر مسلسل اپنے رب کریم سے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی، پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، انہوں نے چادر اٹھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر اسے ڈال دیا، پھر پیچھے کی جانب سے آپ کو پکڑ لیا اور عرض کی: یا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے رب کی بارگاہ میں تمہاری طرف سے مناجات کافی ہے، وہ تمہارا وہ وعدہ پورا فرمائے گا جو اس نے تمہارے ساتھ فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَبْ لَكُمْ اَنِّي مُصِذٌكُمْ بِالْفِئَةِ مِنَ الْمَلَكَةِ؛ وَفِئَةٌ ۝ (الانفال) (یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔) پس اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی۔

ابوزمیل نے کہا ہے کہ مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اس دن مسلمانوں میں سے کوئی آدمی کسی مشرک کے پیچھے تیز دوڑ رہا تھا تو اس نے اپنے سامنے اس پر کوڑا پڑنے کی آواز اور شہسوار کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے: اقدم حیزوم، (حیزوم آگے بڑھ) تو اس نے اپنے سامنے مشرک کی طرف دیکھا کہ وہ چت گر گیا ہے، تو اس نے اس کی طرف دیکھا کہ اس کی ناک توڑ دی گئی ہے اور اس کا چہرہ اس طرح پھاڑ دیا گیا ہے [جس طرح کوڑے کی ضرب کے ساتھ۔] پس وہ تمام کے تمام اکٹھے ہو گئے تو ایک انصاری آیا اور اس نے اس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقت ذالک من مدد السماء الثالثة (تو نے سچ کہا ہے وہ تیسرے آسمان سے مدد آئی) پس اس دن وہ ستر مارے گئے اور ستر قیدی بنائے گئے۔ آگے حدیث ذکر کی (1) اور عنقریب سورہ الانفال کے آخر میں مکمل آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پس سنت اور قرآن نے اسی کی موافقت کی ہے جو کچھ جمہور نے کہا ہے، والحمد للہ۔

خارجہ بن ابراہیم نے اپنے باپ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امین علیہ السلام سے پوچھا: ”بدر کے دن ملائکہ میں سے کون یہ کہہ رہا تھا اقدم حیزوم؟“ تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے عرض کی:

1۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب المداد بالملائكة في غزوة بدر و ابا حة الفتن، جلد 2، صفحہ 93، اسلام آباد

یا محمد (ﷺ) ماکل اهل السماء اعراف (اے محمد! منشیٰ علیہم میں تمام اہل آسمان کو نہیں پہچانتا۔)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: اس اثنا میں کہ میں بدر کے کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچ رہا تھا کہ تیز ہوا آئی جس کی مثل میں نے کبھی نہ دیکھی تھی، پھر وہ چلی گئی۔ پھر اتنی تیز ہوا آئی کہ میں نے اس کی مثل کبھی نہ دیکھی تھی مگر وہی جو اس سے پہلے آئی تھی۔ راوی کا بیان ہے: میرا گمان ہے کہ انہوں نے ذکر کیا، پھر انتہائی تیز اور شدید ہوا آئی، پس پہلی ہوا کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام ہزار ملائکہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس اترے اور دوسری ہوا کے وقت حضرت میکائیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی دائیں جانب اترے اور آپ ﷺ کی دائیں جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور تیسری ہوا کے وقت حضرت اسرافیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بائیں جانب اترے اور میسرہ میں میں تھا۔

اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں نے بذات خود غزوہ بدر کے دن دیکھا کہ ہم میں سے کوئی اپنی تلوار کے ساتھ مشرک کے سر کی طرف اشارہ کرتا ہے تو تلوار اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا سر اس کے جسم سے کٹ کر گر پڑتا۔ اور حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ لوگ غزوہ بدر کے دن کفار کے ان مقتولوں کو پہنچانتے تھے جنہیں فرشتوں نے قتل کیا تھا انہوں نے انہیں گردنوں کے اوپر ضرب لگا کر قتل کیا تھا اور پوروں پر آگ کے نشان کی مثل نشان تھے وہ اس کے ساتھ جلادئے گئے، یہ سب بیہقی رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے: بے شک ملائکہ قتال کرتے رہے ہیں اور کفار میں ان کی ضرب کی علامت بالکل ظاہر تھی، کیونکہ جس جگہ ان کی ضرب لگی اس جگہ میں آگ بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ ابو جہل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے مجھے قتل کیا ہے؟ بلاشبہ مجھے اس نے قتل کیا ہے جس کے گھوڑے کے سم تک میرا نیزہ بھی نہیں پہنچ سکا اگرچہ کوشش تو نے کی ہے۔ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہوا کہ مومنین کے دلوں کو تسکین اور راحت نصیب ہوئی اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو یوم قیامت تک مجاہدین بنادیا، پس ہر لشکر جس نے صبر کیا اور اخلاص اپنایا فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور ان کی معیت میں جنگ میں شریک ہوں گے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد نے فرمایا: ملائکہ نے بدر کے دن کے سوا کہیں جنگ نہیں لڑی۔ اور اس کے سوا میں وہ صرف حاضر ہوئے ہیں لیکن وہ قتال نہیں کرتے بلاشبہ وہ تعداد (میں اضافہ کا سبب) یا مدد ہوتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہے کہ وہ دعا کرتے رہتے ہیں اور تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ ان کے لئے (اجر و ثواب میں) اضافہ کا سبب بنتے ہیں جو اس دن قتال کرتے ہیں، پس اس بناء پر تو ملائکہ نے بدر کے دن بھی قتال نہیں کیا بلکہ وہ صرف ثابت قدم رہنے کی دعا کے لئے حاضر ہوئے، پہلا قول اکثر کا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ بدر کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار کے ساتھ ان کی امداد فرمائی پھر وہ تین ہزار ہو گئے اور پھر بڑھ کر پانچ ہزار ہو گئے (1)، پس اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَبَ لَكُمْ اَنْتِی

مُيِّدُكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرَدِّفِينَ ① اور بَلَىٰ ۚ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَذَا يُبَدِّلْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ② پس مومنین نے بدر کے دن صبر کیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو اللہ تعالیٰ نے پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی امداد فرمائی جیسا کہ ان سے وعدہ کیا تھا، پس یہ سب غزوہ بدر کے دن ہوا۔ اور حسن نے کہا ہے: پس یہ پانچ ہزار یوم قیامت تک مومنین کے لئے مدد و معاون رہیں گے۔

حضرت شعبی نے کہا ہے: بدر کے دن حضور نبی مکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کو یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محارب بنی مشرکین کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ خبر حضور نبی مکرم ﷺ اور مسلمانوں پر شاق گزری، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اَلَنْ يَكْفِيَكُمْ... تا قولہ... مُسَوِّمِينَ پس کرز کو شکست اور ہزیمت کی خبر موصول ہوئی تو اس نے اس کی کوئی مدد نہ کی اور واپس لوٹ گیا، پس اللہ تعالیٰ نے بھی پانچ ہزار کے ساتھ ان کی مدد نہ کی، بلکہ ایک ہزار کے ساتھ ان کی مدد کی گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن مومنین سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کی طاعت و فرمانبرداری پر ڈٹے رہے، اور اس کے محارم سے بچتے رہے تو وہ ان کی تمام جنگوں میں مدد فرمائے گا۔ لیکن جنگ احزاب کے سوانہ انہوں نے صبر کیا اور نہ ہی وہ محارم سے بچے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی جب انہوں نے بنی قریظہ کا محاصرہ کیا۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ جنگ احد کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سے مدد کا وعدہ فرمایا بشرطیکہ انہوں نے صبر کیا پس انہوں نے صبر نہ کیا اور نہ ہی ایک فرشتے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی، اگر ان کی مدد کی جاتی تو پھر انہیں ہزیمت نہ اٹھانی پڑتی۔ عکرمہ اور ضحاک نے یہی کہا ہے (2) اور اگر کہا جائے: تحقیق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے بدر کے دن رسول اللہ ﷺ کی دائیں اور بائیں جانب دو آدمیوں کو دیکھا وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور وہ دونوں آپ کی جانب سے انتہائی شدید جنگ لڑ رہے تھے، میں نے ان دونوں کو کبھی نہ اس سے پہلے دیکھا اور نہ ہی اس کے بعد (3) (دیکھا)۔ اس کے بارے کہا گیا ہے: شاید یہ حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ مختص ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے دو فرشتے خاص کر دیئے جو آپ کی طرف سے جنگ لڑیں گے اور یہ صحابہ کرام کے لئے امداد نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ ملائکہ کا نازل ہونا مدد و نصرت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ رب العالمین اس کا محتاج اور ضرورت مند نہیں ہے، بلکہ مخلوق اس کی محتاج ہے پس چاہیے کہ دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور اسی پر اعتماد اور توکل ہو، کیونکہ سبب اور بغیر سبب کے وہی ناصر اور مدد فرمانے والا ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ③ (یسین) (اس کام کا حکم، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے) لیکن اس نے اس کے بارے خبر دی ہے تاکہ مخلوق اس کی پیروی کرے جس کا اللہ تعالیٰ انہیں حکم فرمائے ان اسباب میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ④

(الاحزاب) (اور آپ سنت الہی میں ہرگز کوئی تغیر و تبدل نہ پائیں گے) اور اس طرح توکل میں کوئی نقص اور عیب پیدا نہ ہوگا، اور یہ ان کا رد ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اسباب تو ضعیفاء اور کمزوروں کے لئے بنائے گئے ہیں نہ کہ اقویاء اور طاقتوروں کے لئے، کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام تو اقویاء اور طاقتور تھے اور ان کے سوا دوسرے ضعیفاء اور کمزور ہیں اور یہ بالکل واضح ہے۔ مذکاللفظ شر میں اور امدکاللفظ خیر میں (مدد کے لئے استعمال ہوتا ہے) جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ ابو حیوہ نے مُنْزِلِینَ زَاکُو کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے یعنی وہ مدد و نصرت اتارنے والے ہیں۔ اور ابن عامر نے کثرت کی بنا پر زَاکُو مشدد اور مفتوح پڑھا ہے۔ پھر فرمایا: بَلَّی (ہاں کافی ہے) اور کلام مکمل ہو گئی۔ اِنْ تَصْبِرُوْا یہ شرط ہے یعنی اگر تم دشمن کے مقابلے میں صبر کرو و تَتَّقُوْا یہ اس پر معطوف ہے، یعنی تم اس کی معصیت اور نافرمانی سے بچے رہو۔ یُمِیْدُ کُمُ یہ جواب شرط ہے۔ (تو وہ تمہاری مدد کرے گا) اور قِنْ قُوْا مِرْہِمُ کا معنی ہے مَنْ وَجْہِہُمْ (یعنی اگر ان کی طرف سے تیزی ہو جائے) یہ عکرمہ، قتادہ اور حسن، ربیع، سدی اور ابن زید رحمہ اللہ عظیم نے کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَنْ غَضِبَہُمْ (یعنی اگر وہ آجائیں اپنے غضب سے) یہ مجاہد اور ضحاک سے منقول ہے۔ وہ غزوہ احد کے دن ان حالات سے غضب میں تھے جن کا غزوہ بدر کے دن انہیں سامنا کرنا پڑا (1)۔ اور الفور کا اصلی معنی کسی شے کی طرف قصد کرنا اور اسے خوب محنت و مشقت کے ساتھ لینا ہے اور یہ ان کے اس قول سے ہے: فَارَتْ الْقِدْرُ تَفُورُ فَوْزًا و فَوْزَانًا۔ جب ہانڈی خوب ابلنے لگے اور الفور کا معنی المغْلِیان (ابلنا) ہے۔ اور فار غَضِبَہ جب غصہ خوب بھڑک جائے (تو یہ کہا جاتا ہے) اور اس کا فعل فورہ سے ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ ساکن ہو۔ اور الفوارۃ جو کچھ ہانڈی میں سے ابلتا اور کھولتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَفَارَ التَّنُّوْرُ (تور ابل گیا) شاعر نے کہا ہے:

تفور علینا قدرہم فنَدِیْمُہَا

ہمارے خلاف ان کی ہنڈیاں ابلنے لگتی ہیں تو ہم انہیں ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مُسَوِّمِیْنَ یہ واؤ کے فتح کے ساتھ اسم مفعول ہے۔ اور یہ ابن عامر، حمزہ، کسائی اور نافع کی قرأت ہے یعنی جن کی علامت کے ساتھ پہچان کرائی گئی ہے۔ اور مُسَوِّمِیْنَ واؤ کے کسرہ کے ساتھ اسم فاعل ہے۔ اور یہ ابو عمرو، ابن کثیر اور عاصم کی قرأت ہے (2) اور یہ بھی سابقہ معنی کا احتمال رکھتا ہے یعنی انہوں نے علامت کے ساتھ اپنی اور اپنے گھوڑوں کی پہچان کرائی۔ علامہ طبری وغیرہ نے اس قرأت کو ترجیح دی ہے اور بہت سے مفسرین نے کہا ہے: مُسَوِّمِیْنَ یعنی وہ اپنے گھوڑے جنگ میں بھیجنے والے ہیں۔ اور مہدوی نے مُسَوِّمِیْنَ بفتح واؤ میں یہ معنی ذکر کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار کے خلاف بھیجا۔ اور ابن فورک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور پہلی قرأت کے مطابق انہوں نے ملائکہ کی نشانی میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے علاوہ سے مرہی ہے کہ ملائکہ سفید نمائے باندھے ہوئے تھے اور (ان کی طرف کو) اپنے کندھوں کے درمیان چھوڑ رکھا تھا (3) (یعنی ایک لڑکندھوں کے درمیان لٹکا رکھا تھا) اسے بہتقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے اور مہدوی نے اسے زجاج سے بیان کیا ہے مگر حضرت جبریل امین علیہ

السلام حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی طرح زرد رنگ کا عمامہ باندھے ہوئے تھے اور ابن اسحاق نے اسے بیان کیا ہے۔ اور ربیع نے بیان کیا ہے کہ ان کی نشانی یہ تھی کہ وہ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بیہقی نے حضرت سہل بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے بدر کے دن زمین و آسمان کے درمیان ابلق گھوڑوں پر کچھ چمکتے اور روشن آدمی دیکھے در آنحالیکہ وہ نشان زدہ تھے وہ قتل کر رہے تھے اور قیدی بنا رہے تھے۔ پس ان کا قول: معلّمین اس پر دلیل ہے کہ ابلق گھوڑے کوئی نشانی نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ان کے گھوڑوں کی دُمیں اور کلغیاں کٹی ہوئی تھیں اور پیشانیوں اور دُموں پر رنگ برنگی اون کے ساتھ نشان لگے ہوئے تھے۔ (1)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: بدر کے دن ملائکہ سفید اون کے ساتھ گھوڑوں کی پیشانیوں اور ان کی دُموں پر نشان لگائے ہوئے تھے (2) اور عباد بن عبد اللہ بن زبیر، ہشام بن عروہ اور کلبی نے کہا ہے: ملائکہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نشانی میں نازل ہوئے وہ زرد رنگ کے عمامے باندھے ہوئے تھے در آنحالیکہ وہ ان کے کندھوں پر لٹک رہے تھے (3)۔ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں صاحبزادوں حضرت عبد اللہ اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: زرد رنگ کی چادر تھی جس کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بطور عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

میں کہتا ہوں: اور آیت اس پر دلیل ہے..... اور یہ چوتھا مسئلہ ہے..... (۴) یعنی یہ قبائل اور لشکروں کے لئے کوئی علامت اور کوڑ بنانے پر دلالت کرتی ہے جو ان کے لئے حاکم وقت متعین کرتا ہے تاکہ ہر قبیلہ اور ہر لشکر جنگ کے وقت دوسرے سے ممتاز اور الگ رہے اور یہ آیت ابلق گھوڑوں کی فضیلت پر بھی دلیل ہے کیونکہ ملائکہ نے ان پر نزول فرمایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی موافقت میں ملائکہ ان پر نازل ہوئے، کیونکہ وہ تھوڑا ابلق تھا اور اس کے سوا ان کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا، پس ملائکہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی تعظیم و تکریم میں ابلق گھوڑوں پر اترے، جس طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت جبریل امین علیہ السلام زرد عمامہ باندھ کر نزول فرما ہوئے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت اس پر بھی دلیل ہے..... اور یہی پانچواں مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ کہ اون کا لباس وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام اور صالحین نے پہنا ہے۔ اور ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ انہی کے ہیں کہ حضرت ابو بردہ نے اپنے باپ سے روایت کیا اور کہا کہ میرے باپ نے مجھے بتایا: اگر تو ہمارے ساتھ حاضر ہوتا در آنحالیکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جب بارش ہم پر برسی تو یقیناً تو گمان کرتا کہ ہماری ہوا بھیڑوں کی ہوا کی طرح ہے (4)، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنگ آستینوں والا اون کا بنا ہوا روی جبہ زیب تن فرمایا۔

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 544

2۔ ایضاً

1۔ ادکام القرآن، جلد 1، صفحہ 297

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، حدیث 3515، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب اللباس، حدیث 3551، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب اللباس، جلد 1، صفحہ 209، اسلام آباد

اسے ائمہ نے روایت کیا ہے (1) اور حضرت یونس علیہ السلام نے بھی اسے پہنا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان سورہ النحل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت مجاہد نے ذکر کیا ہے کہ ان کے گھوڑوں کی دھنیں اور کلغیاں کٹی ہوئی تھیں تو یہ بہت بعید ہے، کیونکہ مصنف ابی داؤد میں عتبہ بن عبد سلمیٰ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”تم گھوڑوں کی پیشانیاں نہ کاٹو (یعنی ان کے بال نہ کاٹو) اور نہ ہی ان کی کلغیاں اور نہ ہی ان کی دھنیں، کیونکہ ان کی دھنیں ان کی جربہ ہے اور ان کی کلغیاں ان کے لئے حرارت ہیں اور ان کی پیشانیوں میں خیر اور بھلائی رکھ دی گئی ہے۔“ (2) پس حضرت مجاہد کا قول اس حکم توقیفی کا محتاج ہے کہ ملائکہ کے گھوڑے اس صفت پر تھے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت رنگوں میں سے سفید اور زرد رنگ کے حسن پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ ملائکہ انہی کے ساتھ نازل ہوئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جس نے زرد رنگ کے نعل پہن لئے اس کی حاجت پوری کر دی گئی (3)۔ وراپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے کپڑوں میں سے سفید پہنو کیونکہ وہ تمہارے بہترین اور خیر و برکت والے کپڑے ہیں اور اپنے مردوں کو سفید کپڑے میں کفن دو (4) اور رہے عمائم تو وہ عربوں کا تاج اور ان کا لباس ہے“ اور رکانہ نے روایت کیا ہے..... اس نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ کشتی لڑی تو حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے پچھاڑ دیا۔

رکانہ نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: فرق ما بیننا و بین المشاکین العمام علی القلائس (5) (کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپوں پر عمائم باندھنا ہے) اسے ابو داؤد نے بیان کیا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے اس کی اسناد مجہول ہے اس کے بعض راویوں کا سماع بعض سے معروف نہیں۔

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ ۖ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ

الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿١٣٧﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿١٣٨﴾

”اور نہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس

سے اور (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب (اور) حکمت والا ہے۔

(یہ مدد اس لئے تھی) تاکہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں سے یا ذلیل کر دے ان کو پس لوٹ جائیں ناامداد ہو کر۔“

قولہ تعالیٰ: وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ اس میں ناضمیر مدد کے لئے ہے اور وہ ملائکہ ہیں یا وعدہ ہے یا امداد ہے، اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ حدیث نمبر 350، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2180، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 344، اسلام آباد

3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 297

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، حدیث نمبر 3380، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، باب العمام علی القلائس، جلد 1، صفحہ 210، اسلام آباد۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 1706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس پر قول باری تعالیٰ یُنِذِرُكُمْ دلائل کرتا ہے یا پھر ضمیر تسویم (نشان لگانا) یا انزال (اتارنا) یا معنوی طور پر عدد کے لئے ہے، کیونکہ خمسۃ آلف عدد ہے۔ وَلِتَّظْمِنَ قُلُوبُكُمْ بِہِ اس میں لام، لام کی ہے، یعنی ولتظمن قلوبکم بہ جعلہ (تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں ایسا کیا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا۔ ای حفظاً لہا جعل ذالک (اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں کے ساتھ آراستہ کیا اور اس کی حفاظت کے لئے اسے بنایا۔)

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ یعنی مومنین کی مدد نصرت نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے، اس میں کافروں کی مدد داخل نہیں ہے، کیونکہ انہیں جو غلبہ حاصل ہوتا ہے وہ بلاشبہ رسوائی، برے انجام اور خسارے سے بھرا اور گھرا ہوتا ہے۔

لَيَقْطَعَنَّ طَرَفَايِنِ الَّذِينَ كَفَرُوا (یعنی تاکہ وہ قتل کے ساتھ کافروں کا ایک حصہ کاٹ دے) اور نظم آیت اس طرح ہے: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ لَيَقْطَعَنَّ (تحقیق اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن تمہاری مدد فرمائی تاکہ وہ کاٹ دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے وما النصر الا من عند الله ليقطع (مدد نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے تاکہ وہ کاٹ دے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ یُنِذِرُكُمْ کے متعلق ہو، (یعنی وہ تمہاری مدد کرے گا تاکہ وہ کاٹ دے) اور معنی ہے: مشرکین میں سے جو بدر کے دن قتل کئے گئے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے۔ سدی نے کہا ہے: یعنی اس کے ساتھ جو مشرکین غزوہ احد کے دن قتل کئے گئے اور وہ اٹھارہ آدمی تھے۔

اور يَكْبِتُهُمْ کا معنی ہے يحزنهم (یا وہ انہیں پریشان اور غمزدہ کر دے، اور المکبوت کا معنی محزون (غمگین) ہے۔ اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو طلحہ کے پاس آئے تو ان کے بیٹے کو پریشان اور غمزدہ دیکھا۔ تو فرمایا: ”اے کیا ہوا ہے؟“ تو عرض کی گئی: اس کا اونٹ مر گیا ہے۔ اور اس کی اصل جو کہ بعض اہل لغت نے بیان کی ہے یکبدہم ہے ای یصیبهم بالحزن والغیظ فی اکبادہم (1) (یعنی وہ انہیں غم و اندوہ اور غیظ و غضب ان کے دلوں (کلیجوں) میں پہنچائے۔) پھر دال کوتا سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سَبَتَ رَاسُهَا وَرَبَصَدَہِ میں دال کوتا سے بدلا گیا ہے یعنی اس نے اس کا سر مونڈ دیا (2)۔ کبت اللہ العدو کبتا (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اللہ تعالیٰ دشمن کو پھیر دے اور اسے ذلیل و رسوا کر دے، اور کبدہ کا معنی ہے اصابہ فی کبدہ (یعنی اس نے اس کے دل میں تکلیف پہنچائی) کہا جاتا ہے: قد احرق الحزن کبدہ (غم نے اس کے دل کو جلا دیا) اور احرق العداۃ کبدہ (دشمنی نے اس کا جگر جلا دیا۔) اور عرب دشمن کے لئے کہتے ہیں: أسود الکبد۔ (جگر سیاہ ہو گیا) اُشی نے کہا ہے:

فما أجمت من اتیان قوم من الأعداء والاکباد سود

اس میں الاکباد سود جگر سیاہ ہونے کے معنی میں ہے۔

گویا کہ شدت عداوت کے سبب جب جگر جل جاتا ہے تو وہ سیاہ ہو جاتا ہے اور ابو مجلز نے او یکبدہم وال کے ساتھ پڑھا

ہے۔ اور الخائب سے مراد وہ ہے جس کی امید ٹوٹ چکی ہو (کچھ ہاتھ نہ آئے) خاب یخیب اذا لم یصل ما یتطلب یعنی جو طلب کیا جب وہ اسے نہ پائے تو اس کے لئے خاب یخیب کا لفظ کہا جاتا ہے۔ اور الخائب یعنی ایسا عیب ہے جسے وہ چھپا نہ سکتا ہو۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴿٣٩﴾ وَاللَّهُ
مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ
غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٤٠﴾

”نہیں ہے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل چاہے تو اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے اور چاہے تو عذاب دے انہیں، پس بے شک وہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔“
اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم میں موجود ہے کہ غزوہ احد میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ کا سر زخمی کر دیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خون صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے: ”وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جنہوں نے اپنے نبی کا سر زخمی کر دیا اور اس کے دانت توڑ دیئے حالانکہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔“ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ۔ (1)

ضحاک نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے لئے بددعا کرنے کا ارادہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے استئصال اور بربادی کے بارے دعا مانگنے کی اجازت طلب کی، تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے جان لیا کہ ان میں سے بعض عنقریب اسلام قبول کر لیں گے، چنانچہ پھر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے ان میں سے حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ افراد ہیں۔

ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم چار آدمیوں کے لئے بددعا کرتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ آیت نازل فرمائی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی ہدایت اور توفیق عطا فرمادی۔ اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ (2)

اور قولہ تعالیٰ: أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے یہ لِيَقْطَعَ لَهُمْ قَطْرًا پر معطوف ہے اور معنی ہے تاکہ وہ ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر دے یا انہیں شکست و ہزیمت کے ساتھ ذلیل و رسوا کر دے یا ان کی توبہ قبول فرمائے یا انہیں عذاب دے۔ اور یہاں اَوْ بمعنی حتیٰ اور اِلَّا اُنْ ہے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

... اَوْ نَمُوتُ فَتُعَذِّرَا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 108، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن سورہ آل عمران، جلد 1، صفحہ 125، اسلام آباد

ہمارے علماء نے کہا ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد: کیف یفلح قوم شجوا رأس نبیہم یہ بعید سمجھنا ہے اس کے لئے توفیق کو جس نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأُمُورِ شَیْءٌ یہ اسے قریب کرنا ہے جسے آپ نے بعید سمجھا اور ان کے اسلام قبول کرنے میں حرص و طمع کا اظہار ہے۔

اور جب اس بارے میں آپ ﷺ کو طمع دلایا گیا تو آپ ﷺ نے اس طرح عرض کی: اللہم اغفر لقومی فانہم لا یعلمون (1) (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔) جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: گویا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھ رہا ہوں آپ انبیاء میں سے کسی نبی علیہ السلام کا ذکر فرما رہے ہیں کہ آپ کی قوم نے آپ کو مارا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: ”اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔“

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حکایت کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں اور وہ محلی عنہ ہیں اور اس پر صریح اور واضح دلیل یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ کا چہرہ مقدس زخمی کر دیا گیا غزوہ احد میں تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر انتہائی شاک گزرا تو انہوں نے عرض کی: اگر آپ ان کے لئے بددعا فرمائیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے تو دعوت دینے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے (2)، اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما کیونکہ وہ نہیں جانتے۔“ گویا کہ آپ ﷺ کی طرف واقعہ احد پیش آنے سے پہلے اس کے بارے وحی کی گئی اور نبی مکرم ﷺ نے اسے اپنے لئے معین نہیں کیا اور جب آپ کو یہ واقعہ پیش آیا تو متعین ہو گیا کہ معنی یہی ہے اور اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض کلام میں اس بارے میں جو کہا ہے وہ بھی اس کی وضاحت کرتا ہے: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر شمار ہوں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے بارے میں بددعا کی اور یہ کہا: رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فِی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا ۝ (الآیہ (نوح) (اے رب! زمین پر کافروں کا کوئی گھر نہ چھوڑ۔) اور اگر آپ ہمارے خلاف اس طرح کی دعا کرتے تو ہم اپنے آخر کی طرف سے ہلاک ہو جاتے، حالانکہ آپ کی پشت کو روند ا گیا، آپ کا چہرہ خون آلود کیا گیا اور آپ کے دندان مبارک شہید کئے گئے لیکن آپ نے کلمہ خیر کے سوا کچھ نہ کہا اور یہ دعا کی: رب اغفر لقومی فانہم لا یعلمون (3) اور آپ کا قول: اشتد غضب اللہ علی قوم کسروا رباعیۃ نبیہم (4) (اللہ تعالیٰ کا غضب شدید اور سخت ہوا اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبی علیہ السلام کے دندان مبارک شہید کر دیئے) یہ خالصہ اس کے لئے ہے جس نے عملاً ایسا کیا اور ہم نے اس کا نام ذکر کر دیا ہے اگرچہ اس کے بارے اختلاف ہے اور ہم نے یہ کہا کہ یہ مباشر (عمل کرنے والے) کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کہ ان میں سے ایک جماعت نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفطن باب العبر علی البلاء، صفحہ 300۔ ایضاً، معجم بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث 3218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معجم مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 323، اسلام آباد

3۔ معجم مسلم، کتاب الجہاد باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 208

4۔ معجم مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 108۔ ایضاً، معجم بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3765، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسلام قبول کر لیا جو جنگ احد میں شریک ہوئے تھے اور خوب اچھی طرح اسلام لائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء کوفہ نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت اس قنوت کے لئے ناسخ ہے جو حضور نبی مکرم ﷺ صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد پڑھا کرتے تھے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو فجر کی نماز میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا: اللھم ربنا و لک الحمد فی الآخرة ... پھر کہا... اللھم العن فلانا و فلانا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَیْسَ لَکَ مِنْ الْأَمْرِ شَیْءٌ أَوْ یَتُوبَ عَلَیْہِم أَوْ یُعَذِّبْہُمُ الْآیہ۔ اسے بخاری نے نقل کیا ہے (1) اور امام مسلم نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے یہ اس سے زیادہ مکمل اور اتم ہے (2) اور یہ نسخ کا محل نہیں ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ امر ان کے پاس نہیں ہے اور یہ کہ وہ غیب میں سے کچھ نہیں جانتے مگر وہی جو میں انہیں بتاتا ہوں اور یہ کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ جسے چاہے گا اس کی توبہ قبول فرمائے گا اور جس کے لئے چاہے گا اسے جلدی عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے: لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ شَیْءٌ وَ اللہ مافی السموات وَ مافی الارض وَ دُونَکَ وَ دُونَہُمْ یَغْفِرُ لِمَن یشاء وَ یتوب علی من یشاء (آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے نہ آپ کا ہے اور نہ ہی ان کا ہے وہ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جس کی چاہتا ہے توبہ قبول فرما لیتا ہے) پس اس میں کوئی نسخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد لَیْسَ لَکَ مِنْ الْأَمْرِ شَیْءٌ سے یہ بیان کیا ہے کہ تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہوتے ہیں اس میں قدر یہ وغیرہ کا رد ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نماز فجر اور اس کے علاوہ نمازوں میں قنوت پڑھنے کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس کوفیوں نے نماز فجر وغیرہ میں قنوت سے منع کیا ہے اور یہی مذہب لیث اور صاحب مالک یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا ہے۔ اور شعبی نے اس کا انکار کیا ہے اور مؤطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ کسی نماز میں قنوت نہ پڑھتے تھے (3) اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ نے عن خلف عن ابی مالک اشجعی عن ابیہ کی سند سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے دعائے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہ پڑھی، پھر فرمایا: اے بیٹے! یہ بدعت ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فجر کی نماز میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام کتاب اللہ، جلد 2، صفحہ 1091، اسلام آباد۔ ایضاً، حدیث نمبر 6800، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، تفسیر سورہ آل عمران، حدیث نمبر 4194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مؤطا امام مالک، باب القنوت فی الصبح صفحہ 143، اسلام آباد

4۔ سنن نسائی، باب ترک القنوت، جلد 1، صفحہ 164۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی ترک القنوت، حدیث نمبر 368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمیشہ قنوت پڑھی جائے گی اور تمام نمازوں میں (پڑھی جائے گی) جبکہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو۔ امام شافعیؒ اور طبری نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نماز فجر میں مستحب ہے اور یہ امام شافعیؒ سے مروی ہے اور حسن اور سحنون نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے اور یہی علی بن زیاد کی اس روایت کا تقاضا ہے جو امام مالکؒ سے مروی ہے کہ جان بوجھ کر اسے چھوڑنے والا نماز کا اعادہ کرے گا اور علامہ طبری نے اس پر اجماع بیان کیا ہے کہ اسے چھوڑ دینا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ اور حسن سے منقول ہے کہ قنوت کے ترک ہو جانے میں سجدہ سہولازم ہے اور یہی امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ دارقطنی نے سعید ابن عبدالعزیز سے اس کے بارے میں بیان کیا ہے جو صبح کی نماز میں قنوت بھول گیا۔ فرمایا: وہ سہو کے دو سجدے کرے گا۔ اور امام مالک نے رکوع سے پہلے کو اختیار کیا ہے اور یہی اسحاق کا قول ہے اور یہی امام شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا بھی قول ہے۔ اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے اس بارے میں اختیار مروی ہے (یعنی چاہے تو رکوع سے پہلے پڑھے اور چاہے تو رکوع کے بعد) اور دارقطنی نے اسناد صحیح کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں مسلسل قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور ابوداؤد نے مراسل میں خالد بن ابی عمران سے ذکر کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ ﷺ مضر کے خلاف دعا کر رہے تھے کہ اچانک جبرائیل امین حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ خاموش رہیے تو آپ ﷺ خاموش ہو گئے، پھر انہوں نے کہا: ”اے محمد! ﷺ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گالی گلوچ اور لعن طعن کرنے کے لئے نہیں بھیجا، بلکہ اس نے آپ کو رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے اور اس نے آپ کو عذاب کے لئے نہیں بھیجا، لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ۔ راوی نے بیان کیا: پھر انہوں نے آپ ﷺ کو یہ دعائے قنوت سکھائی پس فرمایا: اللھم انا نستعینک و نستغفرک و تو من بک و نخنع لک و نخدع و نترك من یکفرک اللھم ایاک نعبد و لک نصلى و نسجد و الیک نستعی و نحفد و نرجو رحمتک و نخاف عذابک الجذ ان عذابک بالکافرین ملحق۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۴۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿۱۴۱﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۱۴۲﴾

”اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود و گنا چو گنا کر کے اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور بچو اس آگ سے جو

تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (کریم) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

قولہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً سود کھانے سے یہ نہی قصہ احد کے درمیان جملہ

مقرضہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مجھے اس بارے میں روایت کردہ کوئی شے یاد نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت مجاہد نے بیان کیا ہے: وہ ایک مدت تک بیچ کرتے تھے اور جب مدت مقررہ گزر جاتی تو

وہ اسے مؤخر کرنے کی شرط پر ثمن میں اضافہ کر دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا

الزَّبَّاءُ أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً [میں کہتا ہوں] تمام گناہوں میں سے ربا کو خاص کیا گیا ہے، کیونکہ یہ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں جنگ کی اجازت دی ہے: فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (البقرہ: 279) (اور تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) اور جنگ قتل کی خبر دیتی ہے، گویا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے: اگر تم سود سے نہ بچے تو تمہیں ہزیمت کا سامنا ہوگا اور تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں سود چھوڑنے کا حکم دیا، کیونکہ ان کے نزدیک اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم۔ اور أَضْعَافًا حَالِ ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور مُضَاعَفَةً اس کی صفت ہے۔ اور اسے مُضَاعَفَةً بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ سود جس میں عرب قرض کو دو گنا کر لیتے تھے اور طالب کہتا تھا: کیا تو ادا کرے گا یا سود دے گا؟ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور مُضَاعَفَةً یہ ایک سال کے بعد دوسرے سال دو گنا کو چار گنا کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ وہ کرتے تھے، پس یہ عبارت موکدہ ان کے فعل کے انتہائی برا اور قبیح ہونے پر دلیل ہے، اسی لئے خاص طور پر تضعیف کی حالت ذکر کی گئی ہے۔

قوله تعالى: **وَاتَّقُوا اللَّهَ** یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو سود کے مالوں میں اور تم انہیں نہ کھاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں خوفزدہ کیا (1) اور فرمایا: **وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ** بہت سے مفسرین نے کہا ہے یہ وعید اس کے لئے ہے جس نے سود کو حلال سمجھا اور جس نے ربا کو حلال سمجھا وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنا ہے ایسے عمل سے بچو جو تم سے ایمان کو چھین لیتا ہے کہ تم (اس کے سبب) آتش جہنم کو واجب کر لو گے، کیونکہ گناہوں میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں کرنے والا ایمان کے چھن جانے کو واجب کر لیتا ہے اور اس پر خوف کیا جانے لگتا ہے، انہیں میں سے والدین کی نافرمانی بھی ہے۔ اور اس بارے میں ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک آدمی اپنے والدین کا نافرمان تھا اسے علقمہ کہا جاتا تھا، تو موت کے وقت اسے کہا گیا کہو لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، تو وہ اس پر قادر نہ ہو سکا یہاں تک کہ اس کی ماں اس کے پاس آئی اور وہ اس سے راضی ہوئی۔ اور ایسے ہی گناہوں میں سے قطع تعلقی، سود خوری اور امانت میں خیانت کرنا ہے۔ ابو بکر و راق نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اکثر اوقات موت کے وقت بندے سے ایمان نکال لیا جاتا ہے۔ پھر ابو بکر نے بیان کیا: پس ہم ایسے گناہوں میں غور و فکر کرتے رہے جو ایمان کو نکال دیتے ہیں تو ہم نے بندوں پر ظلم سے بڑھ کر تیزی کے ساتھ کسی کو ایمان نکالنے والا نہیں پایا۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ آگ (جہنم) کو پیدا کیا گیا ہے یہ جہیمہ کا رد ہے، کیونکہ معدوم تیار شدہ نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا: وَأَطِيعُوا اللَّهَ يَعْنِي فَرَائِضَ مِّنْ اللَّهِ تَعَالَىٰ كِي طَاعَتِ كَرُوْا الرَّسُوْلَ اور سنن میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو)

لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٣﴾

”اور دوڑ و بخشش کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور (دوڑ و) جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی ہے جو تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لئے۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ سَارِعُوا حضرت نافع اور ابن عامر نے واؤ کے بغیر سَارِعُوا پڑھا ہے۔ اور اسی طرح اہل مدینہ اور اہل شام کے مصاحف میں ہے (1)۔ اور باقی سات نے وَ سَارِعُوا واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: دونوں قراءتیں رائج اور صحیح ہیں، پس جنہوں نے واؤ کے ساتھ قرأت کی ہے انہوں نے جملہ کا عطف جملہ پر کیا ہے اور جنہوں نے واؤ کو چھوڑ دیا ہے وہ اس لئے ہے کہ دوسرا جملہ پہلے کے ساتھ اس طرح ملتبس ہے کہ اسے حرف عطف واؤ کی حاجت اور ضرورت ہی نہیں۔ اور السارعة کا معنی السبادرة (جلدی کرنا، تیزی کرنا) ہے اور یہ باب مفاعلہ ہے۔ اور آیت میں حذف ہے، یعنی سارِعُوا الی ما یوجب المغفرة وہی الطاعة (یعنی اس عمل کی طرف تیزی سے آؤ جو مغفرت و بخشش کو واجب کر دیتا ہے اور وہ طاعت و فرمانبرداری ہے۔

حضرت انس ابن مالک اور مکحول نے وَ سَارِعُوا الی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَبِّکُمْ کی تفسیر میں کہا ہے: اس کا معنی ہے تم دوڑ و تکبیر تحریمہ کی طرف اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تیزی سے آؤ فرائض ادا کرنے کی طرف، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم جلدی سے آؤ اخلاص کی طرف۔ اور کلبی نے کہا ہے: تم سود سے توبہ کی طرف دوڑو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میدان جنگ میں ثابت قدمی کی طرف آؤ اور ان کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ اور آیت ان تمام کو شامل ہے اور اس کا معنی وہی ہے جو فاستبقوا الخیرات کا معنی ہے (کہ تم خیر اور نیکی کے کاموں کی طرف تیزی سے آگے بڑھو) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ جَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ تقدیر عبارت ہے کعرض السموات والارض۔ اور مضاف محذوف ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: مَا خَلَقْکُمْ وَلَا بَعَثْکُمْ إِلَّا کَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ اِی الْاِکْخَلَقْ

نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَبَعَثَهَا۔

شاعر نے کہا ہے:

حسبت بُغَامَ رَاحِلَتِي عَنَاقًا وَ مَا هِيَ وَئِبَ غَدْرِكَ بِالْعَنَاقِ
اس میں مراد صوت عناق (بھیڑ کے بچے کی آواز) ہے۔ اس کی نظیر سورہ حدید میں ہے: وَ جَنَّةٌ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (2) (اور جنت اس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کی طرح ہے۔)

اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: آسمان و زمین آپس میں بعض بعض کے ساتھ ملا دیئے جائیں گے جیسا کہ کپڑوں کو پھیلا یا جاتا ہے اور بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے، پس یہ جنت کا عرض ہے

اور اس کا طول سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ جمہور کا قول ہے۔ اور اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے ”کہ سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلے میں اس طرح ہیں جیسے وہ دراہم جو زمین کے وسیع بیابان میں پھینک دیئے جائیں اور کرسی عرش کے مقابلہ میں اس انگٹھی کی طرح ہے جو زمین کے وسیع بیابان میں پھینک دی گئی ہو۔“ یہ مخلوقات سے آسمانوں اور زمین کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑی اور عظیم ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ان تمام سے اعظم ہے۔

اور کبھی نے کہا ہے: جنتیں چار ہیں، جنة عدن، جنة البأوی، جنة الفردوس اور جنة النعیم اور ان میں سے ہر جنت زمین و آسمان کے عرض کی مثل ہے اگر وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور اسماعیل السدی نے کہا ہے: اگر آسمانوں اور زمین کو توڑ دیا جائے اور وہ رائی کے دانے ہو جائیں اور پھر ہر دانے کے بدلے جنت ہو تو اس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کی طرح ہے۔ اور صحیح روایت میں ہے: ”بے شک اہل جنت میں سے رتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ وہ ہوگا جو تمنا کرے گا اور آرزو کرتا رہے گا یہاں تک کہ جب اس کی آرزو میں ختم ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: لَكَ ذَالِكُ وَعَشْرَةُ امْثَالِهِ (تیرے لئے وہ بھی ہے اور اس کی مثل دس اور بھی ہیں۔) اسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، اسے مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے اور یعلیٰ بن ابی مرہ نے بیان کیا ہے۔ میں حمص میں تنوخی سے ملا جو کہ ہر قل کی طرف سے قاصد بن کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا وہ شیخ کبیر تھا۔ اس نے کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر قل کا خط لے کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ صحیفہ اپنی بائیں طرف والے آدمی کو دیا، پھر میں نے پوچھا: تمہارا کون وہ ساتھی ہے جو اسے پڑھے گا؟ انہوں نے کہا: معاویہ، پس تب یہ میرے صاحب کی تحریر ہے۔ بلاشبہ آپ نے لکھا ہے آپ مجھے ایسی جنت کی طرف دعوت دے رہے ہیں جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو جہنم کہاں ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سبحان اللہ رات کہاں ہوتی ہے جب دن آجاتا ہے۔“ (1)

اور اسی طرح کی دلیل سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے خلاف استدلال کیا جب انہوں نے آپ کو کہا: کیا تم نے اس قول کو دیکھا ہے وَجَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ جَنَّتُ تَوَجَّهْتُمْ لَهَا؟ اور انہوں نے آپ کو کہا: آپ وہ لائیں جو اس سے مشابہت رکھتا ہو جو تورات میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے عرض کے سبب طول پر آگاہ فرمایا کیونکہ اغلباً طول عرض سے زیادہ ہوتا ہے اور طول جب ذکر کر دیا جائے تو وہ عرض کی مقدار پر دلالت نہیں کرتا۔ زہری نے کہا ہے: جنت کا عرض بیان کیا گیا ہے اور رہا اس کا طول تو اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (2) اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: مُتَّكِئِينَ عَلَى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ إِسْتَنْزَاقٍ (الرحمن: 54) (وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بستروں پر جن کے استرقادیز کے ہوں گے۔) تو اس میں بطائین کو اس حسین ترین شے کے ساتھ متصف کیا گیا ہے جو زینت اور خوبصورتی سے جانی جاتی ہے جبکہ یہ معلوم ہے کہ ظواہر باطن کے مقابلہ میں زیادہ حسین اور آتقن ہوتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: بلاد عریضة وفلاة عریضة یعنی وسیع شہر اور بیابان۔

شاعر نے کہا ہے:

كَانَ بِلَادَ اللَّهِ وَهِيَ عَرِيضَةٌ عَلَى الْخَائِفِ الْمَطْلُوبِ كِفَّةٌ حَابِلٍ

اس میں وہی عریضہ وسیع و عریض ہونے کے معنی میں ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: مقطع عرب پر کلام بطور استعارہ جاری ہے، پس جب جنت وسعت اور انفساح کے اعتبار سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہے تو پھر اسے آسمانوں اور زمین کے عرض کے ساتھ بیان کرنا انتہائی حسین عبارت ہے، جیسا کہ تو کسی آدمی کے لئے کہتا ہے: هذا بحر (یہ تو سمندر ہے) اور حیوانوں میں سے کسی بڑے کے لئے یہ کہتا ہے: هذا جبل یہ پہاڑ ہے تو آیت نے عرضاً حد بیان کرنے کا قصد نہیں کیا، البتہ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ ہر اس شے سے وسیع تر ہے جسے تم نے دیکھا ہے، اور عام علماء کا نظریہ ہے کہ جنت تخلیق کردی گئی ہے اور یہ موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَعَدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ اور اس کا بیان حدیث اسراء وغیرہ میں ہے جو صحیحین وغیرہما میں بیان کی گئی ہے۔

اور معتزلہ نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں (جنت اور جہنم) ہمارے وقت میں موجود نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ جب آسمانوں اور زمین کو لپیٹ دے گا تو پھر وہ جنت اور جہنم کو جہاں چاہے گا بنادے گا، کیونکہ یہ دونوں ثواب و عقاب کے لئے دار جزا ہیں، لہذا احکام کا مکلف بنائے جانے کے بعد جزا کے وقت میں انہیں بنایا جائے گا، تاکہ دار التکلیف اور دار الجزا، دنیا میں جمع نہ ہو جائیں۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: جنت میں قیامت کے دن اضافہ کر دیا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں مندر بن سعید وغیرہ کا تعلق قائم کیا گیا ہے ان سے جنہوں نے کہا: بلاشبہ ابھی تک جنت تخلیق نہیں کی گئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن فورک کا یہ قول "کہ اس میں اضافہ کیا جائے گا" یہ جنت کے موجود ہونے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ ایسی سند کا محتاج ہے جو زیادتی کے عذر میں قطعی ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اس بارے میں سچ کہا ہے کہ جب انہوں نے کہا: جب ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ان دراہم کی طرح ہیں جو زمین کے وسیع بیابان میں ڈال دیئے گئے ہوں اور کرسی عرش کے سامنے اس انگوٹھی کی طرح ہے جسے وسیع زمین میں رکھ دیا گیا ہے، تو جنت اب اسی حالت پر ہے جس پر وہ آخرت میں ہوگی کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، کیونکہ عرش اس کی چھت ہے، یہ اس کے مطابق ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ چھت اپنے نیچے آنے والی ہر شے کو گھیرے ہوتا ہے اور کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے اور جب تمام مخلوقات اس (عرش) کی نسبت ایک انگوٹھی کی طرح ہیں تو پھر کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہو اور اس کے طول و عرض کو جانتا ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے جو ایسا خالق ہے جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور نہ ہی اس کی مملکت کی وسعت کی کوئی غایت اور حد ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالصَّرَّاءِ وَالْكُظُمِينَ الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

اللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

وہ (پرہیزگار) جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی اور تنگ دستی میں اور ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو اور درگزر کرنے

والے ہیں لوگوں سے اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔“
اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِينَ يُنْفِقُونَ یہ ان متقین کی صفت ہے جن کے لئے جنت تیار کی گئی ہے اور ظاہر آیت یہ ہے کہ یہ فعل مندوب الیہ کے ساتھ مدح اور تعریف ہے اور السَّرَّاءِ کا معنی آسانی اور الضَّرَّاءِ کا معنی تنگی ہے۔ یہ ابن عباس، کلبی اور مقاتل رحمہم نے کہا ہے اور عبید بن عمیر اور ضحاک نے کہا ہے کہ السَّرَّاءِ اور الضَّرَّاءِ کا معنی خوشحالی اور تنگ دستی ہے۔ اور صحت و بیماری کی حالت میں بھی یہی کہا جاتا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ فی السَّرَّاءِ کا معنی ہے زندگی میں اور فی الضَّرَّاءِ سے مراد وہ ہے جس کی وہ موت کے بعد وصیت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فی السَّرَّاءِ سے مراد شادی اور ولیموں میں خرچ کرنا ہے اور فی الضَّرَّاءِ سے مراد تکالیف اور ماتم میں خرچ کرنا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: فی السَّرَّاءِ سے مراد وہ نفقہ ہے جو تمہیں خوش کرتا ہے مثلاً اولاد اور قرابتداروں پر خرچ کرنا اور ضراء سے مراد دشمنوں پر خرچ کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فی السَّرَّاءِ سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ وہ جوان کی مہمان نوازی کرتا ہے اور اسے ہدیہ دیتا ہے اور ضراء وہ ہے جس کو وہ تکلیف میں مبتلا لوگوں پر خرچ کرتا اور اس سے ان پر صدقہ کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں۔ یہ آیت عام ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ اور یہ ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 2۔ اور كَظَمَ الْغَيْظَ کا معنی ہے غصے کو پیٹ میں لوٹانا، کہا جاتا ہے: كَظَمَ غَيْظَهُ یعنی وہ اس پر خاموش رہا اور اس کا اظہار نہ کیا باوجود اس کے کہ وہ اپنے دشمن پر برسنے اور عملاً وہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اور كَظَمَتِ السِّقَاءَ کا معنی ہے میں نے مشکیزہ بھرا اور اس کا منہ بند کر دیا اور الكَظَامَةُ وہ شے جس کے ساتھ پانی کا راستہ بند کیا جاتا ہے اور اسی سے الكَظَامُ اس تسمہ (دھاگے) کو بھی کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مشکیزے کا منہ بند کیا جاتا ہے اور كَظَمَ الْبَعِيدَ جرتہ جب اونٹ جگالی کو اپنے پیٹ میں لوٹا دے، اور کبھی كَظَمَ اس معنی کے لئے بولا جاتا ہے کہ وہ جگالی سے رک گیا قبل اس کے کہ وہ اسے اپنے منہ کی طرف بھیجے۔ اسے زجاج نے بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: كَظَمَ الْبَعِيدَ وَالنَّاقَةَ جب یہ جگالی نہ کریں۔

اور اسی سے راعی کا قول ہے:

فَأَقْضَ بَعْدَ كُظُومِهِمْ بَجْرَةً مِنْ ذِي الْأَبَارِقِ اذْ رَعَيْنَ خَقِيلًا

اس میں جگالی سے رکنے کے معنی میں لفظ كُظُومِ استعمال ہوا ہے۔

الحقیل، ایک جگہ ہے۔ اور الحقیل ایک بوٹی بھی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گھبراہٹ اور مشقت و تھکاوٹ کے وقت ایسا کرتا ہے اور وہ جگالی نہیں کرتا۔

اعشی نے اونٹوں کو خر کرنے والے آدمی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا اور وہ اس سے گھبراتے ہیں:

قَدْ تَكْظَمُ الْبُزْلُ مِنْهُ حِينَ تَبْصُرُهُ حَتَّى تَقْطَعَ فِي أَجْوَافِهَا الْجُرُورَ

طاقتور اونٹ بھی جب اسے دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے یہاں تک کہ جگالی اس کے پیٹ میں ہی کٹ جاتی ہے۔ (یعنی جگالی کے لئے پیٹ سے باہر کوئی شے نہیں لاسکتا۔)

اور اسی سے ہے، رجل کظیم و مکتوم جب کوئی غم و اندوہ اور حزن و ملال سے بھرا ہوا ہو۔

اور قرآن کریم میں ہے: **وَابْيَضَّتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ** (یوسف) (اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے) **إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ** (القلم) (جب اس نے پکارا اور وہ غم و اندوہ سے بھرا ہوا تھا) اور غیظ غضب کی اصل اور بنیاد ہے اور اکثر اوقات تو یہ دونوں لازم و ملزوم ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ غیظ جوارح (اعضاء بدن) پر ظاہر نہیں ہوتا بخلاف غضب کے کیونکہ یہ جوارح میں ایسے فعل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جو ضروری ہوتا ہے اسی لئے جب غضب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقصود وہ افعال ہوتے ہیں جو **الْمَغْضُوبُ عَلَيْهِمْ** میں ظاہر ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے غیظ کی تفسیر غضب سے کی ہے اور یہ عمدہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ** لوگوں کو معاف کرنا نیکی اور خیر کے افعال میں سے انتہائی عظیم فعل ہے، اس حیثیت سے کہ آدمی کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ معاف کر دے اور یہ کہ وہ اپنے حق کی طرف متوجہ ہو اور ہر وہ جو سزا کا مستحق ہو لیکن اسے چھوڑ دیا جائے تو تحقیق اسے معاف کر دیا گیا اور **عَنِ النَّاسِ** کے معنی میں اختلاف ہے پس ابو العالیہ، بکلی اور زجاج نے کہا ہے: **وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ** سے مراد غلاموں کو معاف کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مثال کے طور پر یہ بہت اچھا ہے، کیونکہ وہ خادم ہوتے ہیں اور وہ کثرت سے غلطیاں لرتے ہیں اور ان پر قدرت آسان ہوتی ہے اور سزا کو نافذ کرنا سہل ہوتا ہے، اسی لئے مفسر نے اس کے ساتھ مثال بیان کی ہے۔ اور میمون بن مہران سے روایت ہے کہ ان کی ایک کنیز تھی وہ ایک دن ایک بڑا پیالہ لے کر آئی اس میں گرم شوربہ تھا اور آپ کے پاس کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ پس وہ گر پڑی اور شوربہ آپ پر پڑ گیا، تو میمون نے اسے مارنا چاہا تو اس لونڈی نے کہا: اے میرے آقا! آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کیجئے: **وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ** تو اس نے کہا: تحقیق میں نے کر دیا، پھر اس سے کہا: جو اس کے بعد ہے اس پر بھی عمل کیجئے **وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ** تو اس نے کہا: میں نے تجھے معاف کر دیا۔ پھر اس لونڈی نے کہا: **وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ** تو میمون نے کہا: میں نے تجھ پر احسان کر دیا، پس تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آزاد ہے۔ احنف بن قیس سے اسی طرح مروی ہے۔

اور حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے: **وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ** اور وہ لوگوں کے ظلم اور ان کی برائیوں سے درگزر کرنے والے ہیں (1)۔ یہ حکم عام ہے اور یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مقاتل بن حیان نے اس آیت میں کہا ہے: ہم ہمک خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت فرمایا: ”میری امت میں سے یہ قلیل (لوگ) ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ حالانکہ گزشتہ امتوں میں یہ کثیر لوگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح اور تعریف فرمائی ہے جو غصے کے وقت بخش دیتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: **وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ** (الشوری) (اور جب وہ غضبناک ہوئے

ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں) اور غصہ پی جانے والوں کی اس قول کے ساتھ تعریف فرمائی: وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ اور یہ خبر دی ہے کہ وہ انہیں ان کے اس احسان کے سبب پسند کرتا ہے۔

اور غصہ پی جانے، لوگوں سے درگزر کرنے اور غضب کے وقت نفس کا مالک ہونے کے بارے کئی احادیث وارد ہیں۔ اور یہی انتہائی عظیم عبادت اور جہاد بالنفس ہے، پس آپ ﷺ نے فرمایا: ”طاقور وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ طاقور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے (1)۔“ اور آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا ہے: ”جو گھونٹ بھی آدمی پیتا ہے وہ اس کے لئے خیر اور نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں غصہ کے گھونٹ سے بڑھ کر اجر والا کوئی نہیں (2)۔“ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ، ہر شے سے زیادہ سخت اور شدید کون سی شے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا غضب“ پھر اس نے عرض کی: کون سی شے اللہ تعالیٰ کے غضب سے نجات دلاتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو غصہ نہ کر۔“

عربی نے کہا ہے:

وَإِذَا غَضِبْتَ فَكُنْ وَقُورًا كَاطْمًا لِلْغَيْظِ تَبْصُرُ مَا تَقُولُ وَتَسْمَعُ

جب تجھے غصہ آئے تو انتہائی وقار کے ساتھ غصہ پینے والا ہو جا اور اسے غور سے دیکھ جو کہہ رہا ہے اور سن رہا ہے۔

فَكَفَى بِهِ شَرَفًا تَصْبُرُ سَاعَةً يَرْضَى بِهَا عَنْكَ الْإِلَهِ وَتُرْفَعُ

پس ایک ساعت کا صبر کرنا از روئے شرف کے کافی ہے جس کے سبب تجھ سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور تو بلند مرتبہ کر دیا جائے اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے عفو کے بارے کہا ہے:

لَنْ يَبْلُغَ الْمَجْدَ اقْوَامٌ دَانَ شَرَفُوا حَتَّى يُذَلُّوا وَإِنْ عَزَّوْا الْاَقْوَامَ

قومیں ہرگز بزرگی کو نہ پاسکیں گی اگرچہ وہ شریف ہوں یہاں تک کہ انہیں ذلیل و خوار کر دیا جائے گا اگرچہ وہ قوموں پر غالب ہوں۔

وَيُشْتَمُوا فَتَرَى الْاَلْوَانَ مُشْرِقَةً لَا عَفْوَ ذَلِ وَلَكِنْ عَفْوُ اِكْرَامٍ

اور انہیں گالی گلوچ نہیں دی جاتیں اور وہ کائنات کو روشن دیکھتی ہیں ان کی یہ عفو درگزر ذلت و رسوائی کی نہیں ہوتی بلکہ عزت و اکرام کی ہوتی ہے۔

ابوداؤد اور ابویسی ترمذی نے حضرت سہل بن معاذ بن انس جہنی سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطے سے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے غصہ پی لیا حالانکہ وہ اسے نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کے سامنے اسے بلائے گا یہاں تک کہ اسے حور کے بارے اختیار عطا فرما دے گا کہ جسے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب باب الخدم من الغضب، جلد 2، صفحہ 903، کراچی۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 5649، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ کتاب الزہد باب الحلم، صفحہ 319، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4178، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے لے لے۔“ فرمایا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (1)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا جس کسی کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اسے چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ اور کہا جائے گا: یہ کون ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے؟ تو لوگوں سے درگزر کرنے والے کھڑے ہوں گے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔“ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اور ابن مبارک نے کہا ہے: میں منصور کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے ایک آدمی کو قتل کرنے کا حکم دیا، تو میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ”جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک منادی ندا دے گا جس کا اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی احسان ہو تو وہ آگے بڑھے پس کوئی آگے نہیں بڑھے گا سوائے اس کے جس نے گناہ اور غلطی سے درگزر کی۔“ پس یہ حکم اپنے اطلاق پر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ** یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے احسان پر ثواب عطا فرماتا ہے۔ حضرت سری سقطی نے کہا ہے: احسان یہ ہے کہ تو امکان کے وقت احسان کرے، پس ہر وقت تیرے لئے احسان ممکن نہیں ہوگا۔ شاعر نے کہا ہے:

بادِرْ بِخَيْرٍ اِذَا مَا كُنْتَ مُقْتَدِرًا فليس في كل وقت انت مقتدر
تو خیر اور نیکی کے عمل میں جلدی کر جب تو اس کی قدرت رکھتا ہو۔ ہر وقت میں تو اس پر قادر نہیں ہوگا۔
اور ابو العباس الجہانی نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

ليس في كل ساعة وأوانٍ تنهياً صنائع الاحسان
ہر ساعت اور ہر وقت میں احسان کرنے والا (اس کے لئے) تیار نہیں ہوتا۔

واذا أمكنت فبادر إليها حذرًا من تعدٍ الامكان
اور جب امکان ہو تو پھر اس کی طرف جلدی کر اس خوف سے کہ کہیں امکان معذرت نہ ہو جائے۔ محسن اور احسان کے بارے میں قول سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ

وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٣٥﴾

”اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کر بیٹھیں کوئی برا کام یا ظلم کریں اپنے آپ پر (تو فوراً) ذکر کرنے لگتے ہیں اللہ کا اور معافی مانگنے لگتے ہیں اپنے گناہوں کی اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔ اور نہیں اصرار کرتے اس پر جو ان سے سرزد ہوا اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں۔“

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب من کظم غیظاً، جلد 2، صفحہ 303، اسلام آباد۔ ایضاً، حدیث نمبر 4147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ اللَّهُ تَعَالَىٰ نے اس آیت میں ایک صنف کا ذکر کیا ہے اور یہ پہلی صنف (کے لوگوں) سے (درجہ میں) کم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت اور احسان کے ساتھ ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور یہ توبہ کرنے والے لوگ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عطا کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت نبھان التمار کے بارے میں نازل ہوئی ہے..... اس کی کنیت ابو مقبل تھی..... اس کے پاس ایک حسین و جمیل عورت آئی اور اس نے اسے کھجوریں فروخت کیں اور پھر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اس کا بوسہ لیا اور پھر اپنے اس عمل پر نادم اور شرمندہ ہوا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

ابوداؤد طیالسی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے اور ابوبکر نے سچ کہا ہے..... کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو بندہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر وضو کرتا ہے اور دو رکعت نماز ادا کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرما دیتا ہے۔“ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی..... وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ... الآية۔

اور دوسری یہ آیت..... وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا وَيَظْلِمْ نَفْسَهُ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے (2) اور یہ عام ہے۔ تحقیق آیت کسی سبب خاص کے تحت نازل ہوتی ہے اور پھر وہ ان تمام کو شامل ہوتی ہے جو وہ کرے یا اس سے زیادہ فعل کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک ثقفی ایک غزوہ میں گیا اور اس نے اپنا ایک انصاری دوست اپنے گھر والوں کے پاس چھوڑا، تو اس نے اس میں خیانت کی کہ اس نے اسے دبوچ لیا اور وہ عورت اپنے لئے اسے دور بٹاتی رہی لیکن اس نے اس کے ہاتھ کا بوسہ لے لیا، پھر وہ اس پر نادم ہوا تو وہ زمین میں پیچھتے چلاتے نکل گیا وہ اپنے فعل پر انتہائی نادم تھا اور توبہ کر رہا تھا، پس وہ ثقفی واپس آیا تو اس کی زوجہ نے اس کے ساتھی کے فعل کے بارے اسے بتایا، تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑا، پس وہ انصاری حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پاس اس امید سے آیا کہ وہ ان کے پاس کوئی وسعت اور گنجائش پالے گا لیکن انہوں نے اسے خوب جھڑکا اور ڈانٹ ڈپٹ کی، پھر وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو اپنے فعل کے بارے میں عرض کی، تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ حدیث کے مطابق عموم ہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم سے زیادہ مکرم تھے، اس حیثیت سے کہ ان میں سے گناہ کرنے والے کی سزا صبح کے وقت اس کے دروازے پر

1۔ اسباب النزول، صفحہ 81

2۔ جامع الترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، جامع ترمذی، کتاب التفسیر من سورہ آل عمران، حدیث 2932، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ اسباب النزول، صفحہ 82

لکھی ہوئی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے گناہ کا کفارہ اس کے گھر کی دہلیز پر لکھ دیا جاتا تھا ”تو اپنی ناک توڑ دے، تو اپنا کان کاٹ لے، تو اس طرح کر“۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور رحمت فرماتے ہوئے اور بنی اسرائیل کے اس فعل کے عوض یہ آیت نازل فرمائی۔

اور روایت کیا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس رو پڑا۔ اور الفاحشۃ کا اطلاق ہر معصیت (گناہ) پر کیا جاتا ہے، حالانکہ اکثر طور پر یہ زنا کے ساتھ خاص ہے یہاں تک کہ حضرت جابر بن عبد اللہ اور سدی نے اس آیت میں اس کی تفسیر زنا کے ساتھ ہی کی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ اَوْ ظَلَمُوا اَنْفُسَهُمْ میں لفظ اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ واؤ کے معنی میں ہے اور مراد وہ (گناہ) ہیں جو کبائر میں شامل نہ ہوں۔

ذُکِّرُوا اللہ اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے اور اس سے حیا کرتے ہوئے اس کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو ضحاکؒ نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑی پیشی کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ فکر کرنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس کے بارے پوچھے گا، اسے کبھی اور مقاتل نے بیان کیا ہے۔

اور مقاتل سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ گناہ ہو جانے کے وقت زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ فَاسْتَغْفَرُوا لِنُفُوسِهِمْ یعنی وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور ہر وہ دعا جس میں یہ معنی ہو یا اس کے الفاظ ہوں تو وہ استغفار کہلاتا ہے۔ اس سورہ کی ابتداء میں سید الاستغفار کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ کہ اس کا وقت سحری کا ہے۔ پس استغفار عظیم ہے اور اس کا ثواب بہت بڑا ہے، حتیٰ کہ ترمذی نے حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث ذکر کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”جس نے یہ کہا استغفر اللہ الذی لا الہ الا هو الہی القیوم و اتوب الیہ (1) تو اس کو بخش دیا جائے گا اگرچہ وہ میدان جہاں سے ہی بھاگا ہو۔“

اور مکحول نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ”میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ استغفار کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔“ اور حضرت مکحول نے کہا ہے: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ استغفار کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ اور حضرت مکحول خود بھی کثیر الاستغفار تھے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: مطلوب استغفار وہ ہے جو اصرار کی گرہ کو کھول دیتا ہے اور اس کا معنی دل میں مثبت ہو جاتا ہے نہ کہ صرف زبان سے تلفظ کرنا ہے۔ پس جس نے اپنی زبان سے کہا: استغفر اللہ، اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی پر مصر رہا تو اس کا یہ استغفار مزید استغفار کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے صغیرہ گناہ کبائر کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہاں استغفار مزید استغفار کا محتاج ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ آپ یہ قول اپنے زمانے میں کہتے تھے، تو ہمارے اس زمانے میں کیفیت کیا ہوگی جس میں انسان ظلم و ستم پر منہ کے بل گرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور اس پر ایسا حریص ہے کہ اسے چھوڑ نہیں سکتا اور تسبیح اس کے ہاتھ

میں ہوتی ہے در آنحالیکہ یہ گمان کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہ کی اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر رہا ہے اور یہ اس کی طرف سے استہزا اور استخفاف (حقیر سمجھنا) ہے اور قرآن کریم میں ہے وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا (اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو تمسخر نہ بناؤ۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قوله تعالى: وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہے جو گناہوں کی مغفرت فرمادے اور ان کی سزا کو زائل کر دے۔

وَلَمْ يُصِرُّوا یعنی جو کچھ انہوں نے کیا اس پر وہ ثابت قدم نہیں ہو جاتے اور نہ اس کا پختہ عزم کرتے ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: یعنی وہ اس پر ہمیشگی اور دوام اختیار نہیں کرتے۔ اور معبد بن صبیح نے کہا ہے: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور میری ایک جانب علی رضی اللہ عنہ تھے، پس آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا میں نے بغیر وضو کے نماز پڑھی ہے پھر آپ گئے اور وضو کیا اور پھر نماز پڑھائی۔ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰی مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ اصرار کا معنی ہے هو العزم بالقلب عی الامر وترت الإقلاع عنه یعنی کسی کام پر دل سے پختہ عزم کرنا اور اس سے باز رہنے کو ترک کرنا۔ اور اسی سے صر الدنایہ ہے یعنی انہیں مضبوط باندھنا۔

حطیہ نے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

عوابس بالشعث الكمأة اذا ابتغوا
عَلَّاتَهَا بِالْبُحْصَاتِ أَصْرَتْ
یعنی وہ اپنے دشمنوں کے خلاف ثابت قدم رہے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الاصرار الشبوت علی المعاصی۔ یعنی اصرار سے مراد گناہوں پر ثابت ہونا اور ڈٹ جانا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

يُصِرُّ بِاللَّيْلِ مَا تَخْفَى شَوَاكِلُهُ
یا وَيَحْ كُل مِصْرَ الْقَلْبِ خَشَار

اس میں اصرار کا لفظ مذکورہ معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

سہل بن عبد اللہ نے کہا ہے: جاہل مردہ ہے، بھولنے والا سونے والا ہے، اور گناہ کرنے والا نشے میں ہے اور اصرار کرنے والا ہلاک ہونے والا ہے اور اصرار کا معنی بار بار کرنا ہے۔ یعنی وہ یہ کہتا رہے کہ میں کل توبہ کروں گا؟ اور یہ نفس کا دعویٰ ہے، وہ آنے والے کل کیسے توبہ کرے گا جب کہ وہ اس کا مالک ہی نہ ہوگا۔

اور سہل کے سوا کسی اور نے کہا ہے: اصرار کا معنی ہے کہ وہ توبہ نہ کرنے کی نیت کرے اور جب وہ خالص توبہ کی نیت کرے گا تو اصرار سے نکل جائے گا۔ اور سہل کا قول احسن ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لا توبة مع اصرار (یعنی) گناہ پر اصرار کے ساتھ کوئی توبہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: توبہ پر ابھارنے والی اور اصرار کو حل کرنے والی (شے) کتاب اللہ العزیز

الغفار میں دائمی غور و فکر کرنا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنت اور اطاعت کرنے والوں کے ساتھ وعدوں کی تفصیل ذکر کی ہے اور جو کچھ اس میں عذاب جہنم اور گنہگاروں کو ڈرانے کا بیان کیا ہے اور وہ اس پر ہمیشہ غور و فکر کرتا رہے یہاں تک کہ اس کا خوف اور امید قوی ہو جائے اور وہ رغبت رکھتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے اور یہ رغبت اور رہبت ہی خوف اور رجاء کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ وہ سزا سے خوفزدہ رہتا ہے اور ثواب کی امید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی راہ صواب کی توفیق دینے والا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اس پر ابھارنے والی وہ تنبیہ الہی ہے جس کے ساتھ وہ اسے متنبہ کرتا ہے جس کے لئے وہ سعادت کا ارادہ کرے اور گناہوں کے قبح اور ضرر کا کیونکہ وہ تو ہلاک کرنے والا زہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اختلاف لفظ میں ہے نہ کہ معنی میں، کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید میں اس کی تنبیہ کے بغیر غور و فکر نہیں کرتا، پس جب بندہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ اپنے آپ کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو ان گناہوں سے بھرا ہوا پاتا ہے جو اس نے کمائے ہیں اور ان برائیوں سے جن کا اس نے ارتکاب کیا ہے اور پھر اس کو تاہی اور سستی پر اس میں ندامت اور شرمندگی کے جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے سابقہ اعمال کی مثل اعمال کرنا چھوڑ دیتا ہے تو ایسے آدمی پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ تائب (توبہ کرنے والا) ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر وہ معصیت پر اصرار کرنے والا ہوگا اور ہلاکت کے اسباب کو لازم پکڑنے والا ہوگا۔

سہل بن عبد اللہ نے کہا ہے: تائب کی علامت یہ ہے کہ گناہ اسے کھانے پینے سے مشغول رکھے جیسا کہ وہ تین صحابہ کرام جو غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے۔ (1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَهُمْ يَعْلَمُونَ اس میں کئی اقوال ہیں۔ پس کہا گیا ہے: یعنی وہ اپنے گناہوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے توبہ کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبد اللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبد اللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مغفرت طلب کی تو انہیں بخش دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ان (چیزوں) کے بارے جانتے ہیں جو میں نے ان پر حرام کی ہیں، یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، مقاتل اور کلبی تمام نے کہا ہے: اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اصرار تکلیف دہ ہے اور اسے چھوڑ دینا سرکشی کی نسبت بہتر ہے۔ اور حسن بن فضل نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب ہے جو گناہ کو بخش دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: انہوں نے یہ معنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے لیا ہے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ اپنے رب کریم سے اسے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بندہ ایک گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے اے اللہ! میرا گناہ بخش دے تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے ایک گناہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ کو معاف فرما

دیتا ہے اور گناہ کے سبب وہ پکڑ لیتا ہے پھر وہ لوٹتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے: اے میرے پروردگار! میرے لئے میرا گناہ بخش دے..... پس اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل دوبارہ کر کیا اور آخر میں فرمایا: اَعْمَلْ مَاشِئْتَ فَقَدْ غُفِرَتْ لَكَ تَوْبَةُ جَوَابِ عَمَلِ كَرَمٍ نِيْلٍ دِيَا (1)۔ اے مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دوبارہ گناہ کر کے توبہ کو توڑنے کے بعد دوبارہ توبہ کرنا صحیح ہے۔

کیونکہ پہلی توبہ طاعت ہے وہ گزر چکی ہے اور صحیح ہے اور دوسرا گناہ سرزد ہونے کی وجہ سے اب وہ دوسری نئی توبہ کا محتاج ہے اور گناہ کی طرف لوٹنا اگرچہ اس کی ابتدا سے زیادہ قبیح ہے، کیونکہ گناہ کی نسبت توبہ توڑنے کی طرف ہے، تو توبہ کی طرف لوٹنا اس کی ابتدا سے زیادہ اچھا ہے، کیونکہ اس کی طرف کریم اور سخی کے دروازے کو التجا کے اصرار کے ساتھ لازم پکڑنے کی نسبت ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

اور حدیث کے آخر میں یہ قول اَعْمَلْ مَاشِئْتَ یہ امر ہے اور اس کا معنی ایک قول کے مطابق اکرام (عزت کرنا) ہے، پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے باب سے ہو جائے گا: اِذْ خُلُوْا بِسَلَامٍ (ق: 34) (داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی سے) کلام کا آخر مخاطب کی حالت کے بارے خبر ہے کہ اس کے سابقہ گناہوں سے اس کی مغفرت کر دی گئی ہے اور وہ اپنے مستقبل کے کاموں میں ان شاء اللہ محفوظ ہوگا۔

آیت اور حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ گناہ کے اعتراف اور اس سے استغفار کرنے کا عظیم فائدہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنِ الْعَبْدُ اِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ ثُمَّ تَابَ اِلَى اللّٰهِ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (2) (بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر لے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔) اسے صحیحین نے روایت کیا ہے۔ اور کسی شاعر نے کہا ہے:

يَسْتَوْجِبُ الْعَفْوُ الْفَتَى اِذَا اعْتَرَفَ بِمَا جَنَى مِنَ الذُّنُوبِ وَ اِقْتَرَفَ
نَوْجَانِ عَفْوٍ وَ دَرَكٍ وَ كَوَاجِبٍ كَرِيْمٍ جَبَّاهُ اِنْ كَانَتْ اِثْمَانُ اسْنَانِ
اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

اَثَرُ ذَنْبِكَ ثُمَّ اَطْلُبْ تَجَاوُزَهُ اِنْ الْجُحُوْدَ جُحُوْدَ الذُّنُبِ ذُنْبَانِ
اپنے گناہ کا اقرار کر پھر اس سے درگزر کرنے کا مطالبہ کر بلاشبہ گناہ کا انکار کرنا دو گناہ ہیں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے (ختم کر دے) اور ایک ایسی قوم لے آئے جو گناہ کریں گے اور استغفار کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا۔ (وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْلَمْ تَذْنُبُوا لَذَهَبَ اللّٰهُ

1۔ مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 357، کراچی۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6953، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب حدیث الالک، جلد 2، صفحہ 596، اسلام آباد۔ صحیح بخاری، کتاب الشهادات، حدیث 2467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بکم ولجاء بقوم یذنبون ویستغفرون فیغفرلہم (1) اور اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی غفار اور تواب کا یہی فائدہ ہے۔ ہم نے اسے ”الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی“ میں بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ گناہ وہ ہیں جن سے توبہ کی جاسکتی ہے چاہے وہ کفر ہو یا اس کے سوا کوئی اور پس کافر کی توبہ اس کا ایمان لانا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ وہ اپنے سابقہ کفر پر نادم بھی ہو، صرف ایمان لانا نفس توبہ نہیں ہے اور اگر گناہ کفر کے علاوہ ہو تو پھر یا تو وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہوگا یا وہ کسی بندے کا حق ہوگا، پس حقوق اللہ میں سے ہونے کی صورت میں توبہ کے لئے اسے چھوڑ دینا کافی ہوتا ہے، سوائے ان کے جن میں شریعت نے صرف ترک کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض کی طرف قضا کی نسبت کی ہے جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔ اور ان میں بعض وہ ہیں جن کی طرف کفارہ کی نسبت کی ہے جیسا کہ قسم توڑ دینا اور ظہار وغیرہ میں۔ اور رہے حقوق العباد تو انہیں ان کے مستحقین تک پہنچانا ضروری ہے اور اگر وہ نہ پائے جائیں تو ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا۔ اور جو کوئی تنگدستی کے سبب اس کی وسعت نہ پائے جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے تو پھر معاف فرمانا اللہ تعالیٰ کا معمول ہے اور اس کا فضل وافر ہے، پس کتنے تجات کا وہ ضامن بنا ہے اور اس نے سینات کو حسنات سے بدل دیا ہے۔ عنقریب اس کا مزید بیان آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ انسان پر یہ لازم نہیں ہے کہ جب اسے اپنا گناہ یاد نہ ہو اور وہ اسے نہ جانتا ہو کہ وہ اس معین گناہ کی طرف سے توبہ کرے، بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ جب اسے گناہ یاد آ جائے تو وہ اس سے توبہ کر لے۔ اور بہت سے لوگوں نے اس میں تاویل کی ہے جو ہمارے شیخ ابو محمد عبد المعطی الاسکندرانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام محاسبی رحمہ اللہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اجناس معاصی سے توبہ کرنا صحیح نہیں ہوتا اور یہ کہ ان تمام پر نادم ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جوارح کے ہر فعل سے اور اپنے دل کے ہر عقیدہ سے معین طور پر توبہ کرے۔ انہوں نے ان کے قول سے یہی گمان کیا ہے، حالانکہ یہ ان کی مراد نہیں ہے اور نہ ان کا کلام اس کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ مکلف کا حکم یہ ہے کہ جب وہ اپنے افعال کا حکم پہچان لے اور معصیت کو غیر سے پہچان لے، تو اس کے لئے ان تمام سے توبہ کرنا صحیح ہے جنہیں اس نے پہچان لیا، کیونکہ اگر اس نے اپنے ماضی کے فعل کے گناہ ہونے کو نہ پہچانا تو اس کے لئے اس سے توبہ کرنا ممکن نہ ہوگا نہ انفراد اور نہ تفصیلاً۔ اس کی مثال وہ آدمی ہے جو سود کے دروازوں میں سے کسی دروازے کو لے لیتا ہے اور وہ یہ نہیں پہچانتا کہ یہ ربوا ہے، پھر جب اس نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ٢٨ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (البقرہ)** (اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایماندار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے)

تو اس پر یہ تہدید انتہائی شدید ثابت ہوئی اور اس کا گمان تھا کہ وہ سود سے سالم اور محفوظ ہے، لیکن اب جب اسے سود کی حقیقت کا علم ہوا پھر وہ اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں متفکر ہوا یا اور اس نے جان لیا کہ وہ سابقہ دنوں میں سود میں

سے بہت سی چیزیں لیتا رہا ہے، تو اب اس پر صحیح ہے کہ وہ ان تمام پر نادم ہو، اس کے اوقات کی تعیین اس پر لازم نہیں۔ اور اسی طرح ان تمام گناہوں اور برائیوں کا حکم ہے جن میں وہ واقع ہوتا رہا ہے مثلاً غیبت، چغلیخوری اور ان کے علاوہ وہ محرمات جن کے حرام ہونے کا اسے علم نہیں تھا، پس جب فقہانہ حاصل کر لے اور اس کے کلام میں سے جو گزر چکا ہے اسے تلاش کر لے تو وہ مجموعی طور پر اس سے توبہ کر لے، اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے جس میں اس سے کوتاہی ہوئی ہے اس پر اظہار ندامت کرے، اور جب اس نے حلال سمجھا اسے جو اس پر ظلم تھا تو اس نے مجموعی طور پر اسے حلال قرار دیا اور اس کا نفس اپنا حق چھوڑنے کے ساتھ خوش رہا تو یہ جائز ہے، کیونکہ یہ مجہول شے بہہ کرنے کے باب سے ہے، یہ بندے کے بخل اور اپنے حق کی طلب پر اس کی حرص کے ساتھ ساتھ ہے۔ تو پھر اس اکرم الاکرین کے بارے کیفیت کیا ہوگی جو طاعات اور ان کے اسباب عطا فرمانے والا ہے اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے درگزر فرمانے والا ہے؟ ہمارے شیخ رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ امام کی مراد ہے اور یہی وہ معنی ہے جس پر ان کا کلام دلالت کرتا ہے اس کے لئے جس نے اس کی تلاش کی، اور جو یہ گمان کرنے والے نے گمان کر لیا ہے کہ ندامت صحیح نہ ہوگی مگر ہر معین اور ہر معینہ حرکات و سکنات پر تو یہ تکلیف مالا یطاق کے باب سے ہے، جو شرعاً واقع نہیں ہے اگرچہ عقلاً جائز ہے، اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ یہ پہچان رکھتا ہو کہ شراب پیتے وقت اس نے کتنے گھونٹ پیئے ہیں، اور زنا کرتے وقت اس نے کتنی بار حرکت کی ہے اور حرام کی طرف چلتے ہوئے اس نے کتنے قدم چلے ہیں، اور یہ ایسی شے ہے جس کی کوئی بھی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس سے تفصیلاً توبہ کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس بارے میں توبہ کے احکام اور اس کی شرائط کا مزید بیان سورۃ النساء وغیرہا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قول باری تعالیٰ: وَلَمْ يُصْرِفْ فِيهِ اس پر واضح حجت اور قطعی دلیل موجود ہے کہ یہ اس کے لئے ہے جو کچھ اس نے زبان سے کہا، اور لسان الامۃ القاضی ابو بکر بن طیب نے کہا ہے کہ انسان کا اس کے سبب بھی مواخذہ کیا جائے گا جس پر اس نے اپنے ضمیر کو ثابت اور پختہ کر لیا اور جس برائی کا اس نے اپنے دل سے عزم مصمم کر لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے وَمَنْ يُؤْذِ فِيهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ اَلِیْمٍ ۝ (الحج) (اور جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق تو ہم اسے چکھائیں گے دردناک عذاب)۔

اور مزید فرمایا: فَاصْبَحْتَ كَالْصَّرِيمِ ۝ (القلم) (چنانچہ (لہلہاتا) باغ کئے ہوئے کھیت کی مانند ہو گیا۔) پس انہیں ان کے پختہ عزم کے سبب ان کے فعل سے پہلے ہی سزا دے دی گئی اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور بخاری شریف میں ہے ”جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر آمنے سامنے آتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہوں گے۔“ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس قاتل کے بارے میں تو سمجھ آئی، لیکن مقتول نے کیا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ بھی تو اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا حریص تھا۔“ (1)

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید کو حرص کے ساتھ معلق کیا ہے اور یہ عزم اور پختہ ارادہ ہی ہے اور ہتھیار کے اظہار کو لغو کر دیا ہے

اور اس سے زیادہ نص وہ ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے ابو کبشہ انماری کی حدیث سے، اور اسے صحیح مرفوع قرار دیا ہے۔ ”بے شک دنیا چار قسم کے آدمیوں کے لئے ہے ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال اور علم عطا فرمایا اور وہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا رہتا ہے اور اس میں صلہ رحمی کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حق کو جانتا ہے تو یہ افضل ترین مقام و مرتبہ پر ہوگا، اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور اسے مال نہ دیا اور وہ [نیت کے اعتبار سے صادق اور سچا ہو] اور وہ یہ کہتا ہو اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا اور اس نے اس کی نیت کی تو ان دونوں کا اجر برابر ہو گا۔ اور تیسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اسے علم نہیں دیا اور وہ [اپنے مال میں بغیر علم کے تصرف کرتا ہے] اور اس میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا، اور نہ وہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی حق جانتا ہے تو وہ اجنبی اور رذیل درجہ میں ہوگا، اور چوتھا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے نہ مال عطا فرمایا اور نہ ہی علم، اور وہ کہتا ہے اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں یقیناً اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا اور وہی اس کی نیت ہو تو دونوں کا بوجھ برابر ہوگا۔ (1)“ اور یہ وہ ہے جس کی طرف قاضی گئے ہیں اور اسی پر عام سلف اور اہل علم فقہاء، محدثین اور متکلمین ہیں، اور اس کے خلاف جس نے یہ گمان کیا ہے کہ جس شے کا انسان قصد کرتا ہے اگرچہ وہ اس پر ثابت اور پختہ ہو جائے تو صرف ارادہ کے سبب اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور اس کے لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کوئی حجت نہیں ہے: ”جس نے گناہ کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو اس کے بارے کچھ نہیں لکھا جائے گا اور اگر اس کے مطابق عمل کیا تو اس پر ایک گناہ لکھا جائے گا (2)“۔ کیونکہ فلم یعملھا کا معنی ہے: اور اس نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہ کیا۔ اور اس کی دلیل وہ ہے جو ہم نے ذکر کی ہے، اور فان عملھا کا معنی ہے: اگر اس نے اسے ظاہر کیا یا اس کا ارادہ کیا۔ اور اس کی دلیل بھی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ وبالله توفیقنا۔

أُولَٰئِكَ جَزَاءُ هُمْ مَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿٥٦﴾

”یہ وہ (نیک بخت) ہیں جن کا بدلہ بخشش ہے اپنے رب کی طرف سے اور جنت رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں،

ہمیشہ رہیں گے اور ان میں کیا ہی اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ گناہوں کی بخشش کو ان کے لئے لازم کیا ہے جو اپنی توبہ میں مخلص ہیں اور اپنے گناہ پر مصر نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصہ احد کے ساتھ متصل ہو، یعنی جو بھاگے پھر توبہ کر لی اور اصرار نہ کیا تو ان کے لئے مغفرت ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۖ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

1۔ جامع الترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56، اسلام آباد، صفحہ 507، لاہور

2۔ مسلم، باب الاسماء برسول اللہ ﷺ، فی فیہ الصلوات، جلد 1، صفحہ 91، آرام باغ کراچی

الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٦﴾

”گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج و زوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔“
یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کے لئے تسلی ہے، اور سنن سنۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد صراط مستقیم ہے۔ (کہا جاتا ہے) فلان علی السنۃ یعنی فلاں سیدھے راستے پر ہے وہ خواہشات نفسانی میں سے کسی شے کی طرف جھکتا نہیں۔
ہذلی نے کہا ہے:

فأول راضٍ سنۃً من یسیرھا
تو اس راستے سے خوفزدہ اور پریشان نہ ہو جس پر تو چلا کیونکہ جو اس پر چلتا ہے وہ پہلے اس راستے سے راضی ہوتا ہے۔
اور سنۃ سے مراد وہ امام ہے جس کی اتباع اور اقتدا کی جائے، کہا جاتا ہے: سن فلان سنۃ حسنة و سیئة جب وہ کوئی ایسا کام کرے جس کی اقتدا اور پیروی کی جائے اس میں خیر ہو یا شر۔
لبید نے کہا ہے:

من معشیرا سنت لهم اباؤهم
اہل خانہ کے لئے ان کے آباء۔ رقیقہ مقرر کر دیا ہے اور ہر قوم کے لئے مقتدا اور ان کا امام ہے۔
اور سنۃ سے مراد امت، اور سنن سے مراد امام ہیں، یہ معنی مفصل سے منقول ہے۔
اور اس نے شعر کہا ہے:

ماعاین الناس من فضل کفضلهم
لوگوں نے ان کے فضل کی طرح کوئی فضل نہیں دیکھا اور نہ ان کی مثل سابقہ امتوں میں کوئی دیکھا۔
اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی اہل سنن ہیں، اور مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور ابو یزید نے کہا ہے: مراد امثال ہیں۔ عطا کا قول ہے: مراد شرائع ہیں۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے قد خلت من قبلکم سنن یعنی ہلاکت کے ساتھ ان میں گزر چکی ہیں جنہوں نے تم سے پہلے جھٹلایا ہے جیسا کہ قوم عاد اور ثمود اور العاقبہ کا معنی ہے: کسی امر کا آخر یعنی انجام۔ اور یہ احد کے دن میں ہوا۔ وہ فرماتا ہے: پس میں انہیں مہلت دوں گا اور میں انہیں ڈھیل دیتا رہوں گا اور میں ان کے لئے تدبیر اپناتا رہوں گا یہاں تک کہ لکھی ہوئی تقدیر اپنی مقررہ مدت کو پہنچ جائے گی، یعنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی نصرت و مدد کے ساتھ اور ان کے دشمن کافروں کو ہلاک کرنے کے ساتھ۔

هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿١٧﴾

”یہ ایک بیان ہے لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے اور ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے واسطے۔“
یعنی یہ قرآن ایک بیان ہے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کی طرف اشارہ ہے: قد

خَلَّتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ اور الموعظة کا معنی وعظ (نصیحت) ہے اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٢٩﴾

”اور نہ (تو) ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تمہیں سر بلند ہو گے اگر تم سچے مومن ہو۔“

غزوہ احد میں مومنین کو اپنے شہداء اور زخمی ہونے والے افراد کے سبب جو تکلیف اور غم لاحق ہوا اس آیت میں اس پر انہیں حوصلہ اور تسلی دلائی جا رہی ہے، اور اس میں انہیں اپنے دشمن کے خلاف جہاد پر ابھارا جا رہا ہے اور انہیں عجز اور بزدلی دکھانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ پس فرمایا: وَلَا تَهِنُوا یعنی اے اصحاب محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنے دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے سے بزدلی کا اظہار نہ کرو اس تکلیف کی وجہ سے جو تمہیں پہنچی۔

وَلَا تَحْزَنُوا اور اپنی پشتوں پر غم سوار نہ کرو، اور نہ ہی اس ہزیمت اور مصیبت کے سبب غمزدہ ہو جو تمہیں پہنچی۔ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ یعنی اگر تم میرے وعدہ کی سچائی کے ساتھ ایمان رکھتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ إِنْ بِمَعْنَى اِذْ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب احد کے دن شکست خوردہ ہوئے پس ہم ان کے درمیان اسی طرح تھے کہ اچانک خالد بن ولید مشرکین گھوڑ سواروں کے ساتھ آگیا، وہ چاہتا تھا کہ وہ ان پر پہاڑ کی جانب سے حملہ آور ہو اور غالب آئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی: ”اے اللہ! وہ ہم پر غالب نہ آئے اے اللہ! تیرے سوا ہماری کوئی قوت نہیں اے اللہ! اس جماعت کے سوا اس شہر میں کوئی تیری عبادت نہیں کرے گا۔“ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور مسلمان تیر اندازوں کا ایک گروہ اکٹھا ہوا اور وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور انہوں نے مشرک گھوڑ سواروں پر تیر برسائے یہاں تک کہ انہیں شکست سے دو چار کر دیا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ (1) یعنی احد کے بعد تم ہی دشمن پر غالب رہو گے۔ پس اس کے بعد انہوں نے کوئی لشکر نہیں بھیجا مگر انہیں ہر اس جنگ میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوئی، اور ہر اس جنگ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئی اور اس میں صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی ہو تو ظفر و فتح ان کا مقدر بنی، اور یہ تمام شہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے عہد میں ہی فتح ہوئے، پھر ان کے ختم ہو جانے کے بعد اس طرح کوئی شہر بھی فتح نہیں ہوا جس طرح وہ اس وقت میں فتح کرتے تھے۔ اس آیت میں اس امت کی فضیلت کا بیان ہے، کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب فرمایا ہے جس کے ساتھ اس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو خطاب فرمایا ہے، کیونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا: إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ ﴿١٣٠﴾ (ط) (یقیناً تم ہی غالب رہو گے) اور اس امت کو فرمایا: وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی الاعلیٰ سے مشتق ہے پس اس کی ذات پاک اور بلند ہے، اور مومنین کے لئے فرمایا: وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ۔

إِنْ يَبْسُوكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ

الظِّلِّينَ ﴿١٠﴾

”(احد میں) اگر لگی ہے تمہیں چوٹ تو (بدر میں) لگ چکی ہے (تمہاری دشمن) قوم کو بھی چوٹ ایسی ہی اور یہ (ہار جیت کے) دن ہم پھراتے رہتے ہیں انہیں لوگوں میں اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنائے تم میں سے کچھ شہید اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔“

قولہ تعالیٰ: اِنْ يَنْسَلِكُمْ قَرْحٌ، قَرْحٌ کا معنی زخم، چوٹ ہے اس میں کسائی اور اخفش سے ضمہ اور فتح کے ساتھ دونوں لغتیں منقول ہیں (یعنی قَرْحٌ اور قَرْحٌ) مثلاً عَقْرٌ اور عَقْرٌ۔ اور فراء نے کہا ہے: فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی زخم ہے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی زخم کا درد ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اگر احد کے دن تمہیں زخم لگا ہے تو بدر کے دن (تمہاری دشمن) قوم کو بھی اسی کی مثل زخم لگا ہے۔ اور محمد بن سمیع نے مصدر کی بنا پر فا اور را کے فتح کے ساتھ قَرْحٌ پڑھا ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ کہا گیا ہے: یہ جنگ میں ہوتا ہے، ایک بار مومنین کے لئے ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرمائے، اور ایک بار کافروں کے لئے ہوتی ہے جب مومنین نافرمانیاں کرنے لگیں تاکہ وہ انہیں آزمائش میں ڈالے اور ان کے گناہوں کو کم کرے، اور رہی یہ صورت کہ جب وہ نافرمانیاں نہ کریں تو پھر یقیناً اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ہم پھراتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان خوشی اور غم، صحت اور بیماری، اور خوشحالی اور تنگدستی کو اور الذُّوْلَةُ کا معنی ہے ایک بار۔

شاعر نے کہا ہے:

فِيَوْمٍ لَنَا وَ يَوْمٍ عَلَيْنَا وَ يَوْمٌ نُسَاءُ وَ يَوْمٌ نُسْتَرُ
پس ایک دن ہمارے حق میں ہوتا ہے اور ایک دن ہمارے خلاف اور کبھی ہمیں اذیت دی جاتی ہے اور کبھی ہمیں خوش کیا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَيَعْلَمَنَّ الَّذِينَ آمَنُوا اس کا معنی ہے: بلاشبہ یہ پھرنا اس لئے ہے تاکہ مومن کو منافق سے (جدا) دکھایا جائے اور ان میں سے بعض کو بعض سے ممتاز کیا جاسکے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا آصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجُجُنِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ الَّذِينَ نَافَقُوا (آل عمران) اور یہ بھی کہا گیا ہے تاکہ وہ مومنین کے صبر کو جان لے، (یعنی) ایسا علم جس پر جزا واقع ہوگی جیسا کہ انہیں مکلف بنانے سے پہلے اس کا غیبی علم ہے۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَتَّخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَيَتَّخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ یعنی وہ تمہیں شہادت کے ساتھ تکریم اور اعزاز عطا فرمائے، یعنی تاکہ ایک قوم (جماعت) قتل کی جائے اور وہ لوگوں پر اپنے اعمال کے سبب گواہ ہو جائیں۔ اور کہا گیا ہے کہ اسی وجہ سے اسے شہید کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے شہید اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ جنت اس کے لئے حاضر کر دی جاتی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا نام شہید اس لئے ہے کیونکہ ان کی ارواح دارالسلام میں حاضر ہیں، کیونکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں،

اور ان کے سوا دوسروں کی ارواح جنت تک نہیں پہنچتی ہیں، پس شہید بمعنی شاہد ہے یعنی جنت کے لئے حاضر ہونے والا، آنے والے بیان کے مطابق یہی صحیح معنی ہے۔ اور شہادت کی فضیلت بہت عظیم ہے، اور تیرے لئے اس کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: **إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ الْآيَةَ (التوبہ: 111)** (یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٌ طَيِّبَةٌ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ (القصف) (اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچالے تمہیں دردناک عذاب سے (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے..... یہی بڑی کامیابی ہے۔)**

اور صحیح البستی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”شہید قتل سے اتنی ہی تکلیف پاتا ہے جتنی تم میں سے کوئی پھوڑے سے پاتا ہے (1)۔“ اور نسائی نے بیان کیا ہے کہ راشد بن سعد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی سے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مومنین کو کیا ہوا ہے کہ سوائے شہید کے انہیں اپنی قبروں میں آزمائش اور فتنہ میں ڈالا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس کے سر پر تلواروں کی چمک فتنہ اور آزمائش کے لئے کافی ہے (2)۔“ اور بخاری میں ہے۔ ”مسلمانوں میں سے احد کے دن جو شہید کئے گئے“ ان میں سے حضرت حمزہ، ایمان، نصر بن انس، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم ہیں، عمرو بن علی نے مجھے بیان کیا ہے کہ معاذ بن ہشام نے کہا: میرے باپ نے حضرت قتادہ سے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم قبائل عرب میں سے کوئی ایسا قبیلہ نہیں جانتے جس میں انصار سے بڑھ کر شہید ہوں اور قیامت کے دن وہ ان سے زیادہ عزت والا ہو۔

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اور ہمیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے کہ ان میں سے احد کے دن ستر آدمی شہید کئے گئے اور ہر معونہ کے دن ستر اور یمامہ کے دن بھی ستر (آدمی شہید کئے گئے)۔ فرمایا: ہر معونہ کا واقعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوا، اور جنگ یمامہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلّمہ کذاب سے لڑی گئی (3)۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو لایا گیا اور آپ کے جسم پر نیزے، تلوار اور تیر کے ساٹھ کے قریب زخم تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر دست مبارک پھیرنے لگے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس طرح جڑنے اور مندمل ہونے لگے گویا وہ تھے ہی نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **وَيَتَّخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ** اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ارادہ امر کا غیر ہے۔ (یعنی

2۔ سنن نسائی، کتاب الجنازہ، جلد 1، صفحہ 289، اسلام آباد

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، صفحہ 206، اسلام آباد

3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584، آرام ہاؤس کراچی

دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔) جیسا کہ اہل السنۃ یہی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو مومنین کے قتل سے منع کیا ہے، یعنی حضرت حمزہ اور آپ کے ساتھیوں کو ﷺ۔ اور ان کے قتل کا ارادہ فرمایا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کھانے سے منع فرمایا اور کھانے کا ارادہ فرمایا پس آدم علیہ السلام اس میں واقع ہوئے۔ اور اس کے برعکس یہ ہے کہ ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور اس کا ارادہ نہیں کیا پس وہ اس سے رک گیا، اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قول حق کے ساتھ اشارہ بھی واقع ہے: **وَلَكِنْ كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ (التوبة: 46)** (لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑا ہونے کو اس لئے پست ہمت کر دیا نہیں)۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمام کو جہاد کا حکم دیا ہے، لیکن سستی، کاہلی اور سفر سے رہ جانے والے اسباب بھی پیدا فرمادئے پس وہ پیچھے بیٹھ رہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: بدر کے دن حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو عرض کی: ”آپ قیدیوں کے بارے میں اپنے اصحاب کو اختیار دے دیجئے اگر وہ چاہیں تو قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو اس شرط پر فدیہ لے لیں کہ اسندہ سال ان کے برابر ان میں سے قتل کئے جائیں گے تو انہوں نے کہا: ہم فدیہ لیں گے اور ہم میں سے قتل کئے جائیں گے۔“ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے (1)۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اپنے اولیاء کی شہادت کے ساتھ پورا کر دیا اس کے بعد کہ انہیں اختیار دیا تو انہوں نے قتل کو اختیار کیا۔

وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین کو دوست نہیں رکھتا یعنی اگر وہ مومنین کی جانب سے کفار کو کچھ دے تو وہ انہیں پسند نہیں کرتا ہے اور اگر وہ مومنین کے سبب کچھ تکلیف پہنچائے تو بلاشبہ وہ مومنین کو دوست رکھتا ہے۔

وَلِيُخَصَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيُمَحِّقَ الْكُفْرِينَ ۝

”اور اس لئے کہ نکھارے اللہ تعالیٰ انہیں جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو۔“

اس میں تین اقوال ہیں: **يُخَصَّ** بمعنی یختبر (تاکہ وہ آزمائے) دوسرا **يَطْفَرُ** (تاکہ وہ انہیں گناہوں سے پاک کرے) اس صورت میں مضاف محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو ختم کر دے جو ایمان لائے، فراء نے یہی کہا ہے اور تیسرا **يُخَصَّ** بمعنی یخلص (تاکہ وہ انہیں نکھار دے اور صاف کر دے) یہ معنی زیادہ غریب ہے۔

خلیل نے کہا ہے: کہا جاتا ہے **مَخَصَّ الْحَبْلِ يَخَصُّ مَخَصًا** جب رسی کی اون کٹ جائے، اور اسی سے ہے **اللَّهُمَّ مَخَصَّ عَنَاذِنَا** اے اللہ! ہم سے ہمارے گناہوں کو صاف کر دے (ختم کر دے) یعنی ہمیں ان کی سزا سے نجات عطا فرما۔ اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: میں نے محمد بن یزید عن خلیل یہ قرأت کی: **التَّحْصِصُ** (بمعنی) التخلیص ہے۔ کہا جاتا ہے: **مَخَصَّةٌ** [یحصہ] محصا جب وہ اسے نجات دلا دے، صاف کر دے، پس معنی ہوگا: اس پر ہے کہ وہ مومنین کو آزمائے تاکہ وہ انہیں ثواب عطا فرمائے اور انہیں ان کے گناہوں سے نجات دلائے۔ **وَيُمَحِّقَ الْكُفْرِينَ** یعنی وہ انہیں ہلاک

کر کے تباہ و برباد کر دے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ
الصَّابِرِينَ ﴿٣٧﴾

”کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنگ میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے اور دیکھا ہی نہیں (آزمائش میں) صبر کرنے والوں کو۔“

أَمْ بِمَعْنَى بَلْ هِيَ۔ اور کہا گیا ہے: میم زائدہ ہے اور معنی ہے: اے وہ جو احد کے دن شکست خوردہ ہوئے کیا تم گمان رکھتے ہو کہ تم اسی طرح جنت میں داخل ہو جاؤ گے جیسے وہ داخل ہوئے جو شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے زخم اور قتل کے درد پر صبر اختیار کیا اس کے بغیر کہ تم ان کے راستے پر چلو اور ان کے صبر کی طرح صبر کرو؟ نہیں، یہاں تک يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ یعنی (تم میں سے جنہوں نے جہاد کیا اللہ تعالیٰ کے بارے) علم شہادت (حاصل کر لے) تاکہ اس پر جزا واقع ہو۔ اور معنی ہے: اور تم نے جہاد نہیں کیا کہ وہ تم سے اسے جان لے۔ اس میں لما بمعنی لم ہے اور سیبویہ نے لم اور لما کے درمیان فرق کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ لم یفعل، فَعَلَ کی نفی ہے، اور لَمَّا یَفْعَل، قَدْ فَعَلَ کی نفی ہے۔ وَيَعْلَمُ الصَّابِرِينَ یہ ان مضمحلہ کے سبب منصوب ہے، یہ خلیل سے روایت ہے، اور حسن اور یحییٰ بن عمر نے يَعْلَمُ الصَّابِرِينَ عطف نسق کی بنا پر جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے قطع کی بنا پر رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی دھویعلم۔ اور یہ قرأت عبد الوارث نے ابو عمرو سے روایت کی ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہاں واو بمعنی حتیٰ ہے، یعنی ولما یعلم اللہ الذین جاهدوا منکم حتی یعلم صبرہم کما تقدم انفا۔ حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا یہاں تک کہ وہ ان کے صبر کو دیکھ لے جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُلَاقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿٣٨﴾

”اور تم تو آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو سواب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو۔“

قوله تعالى: وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ یعنی تم تو شہادت کی آرزو کرتے تھے اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو۔ اعمش نے مِنْ قَبْلِ أَنْ تُلَاقَوْهُ پڑھا ہے یعنی قتل سے پہلے اور یہ کہا گیا ہے: اس سے پہلے کہ تم اسباب موت سے ملاقات کرو۔ اور یہ اس لئے کہ ان میں سے بہت سے غزوہ بدر میں حاضر نہیں تھے تو وہ اس دن کی آرزو اور تمنا کر رہے تھے جس میں جنگ ہو گی، تو جب احد کا دن آیا تو وہ شکست کھا گئے، اور ان میں وہ بھی تھے جو مضبوط رہے اور ڈٹے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے، اور ان میں سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نصر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ کیونکہ جب مسلمان بکھرے تو انہوں نے کہا: اے اللہ! میں تیری طرف اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں جو کچھ انہوں نے کیا ہے، اور پھر (پوری قوت کے ساتھ) لڑنے

لگے اور کہا: بلاشبہ یہاں تو جنت کی خوشبو ہے! میں اسے پالوں گا، اور لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم نے انہیں صرف انگلیوں کے پوروں سے پہچانا تھا اور ہم نے ان کے بدن پر اسی سے زائد زخم پائے۔ ان کے بارے میں اور ان جیسے دیگر افراد کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا، **يَا جَالُ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ (1) (الاحزاب: 23)** (ایسے جو امراد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا) پس یہ آیت شکست خوردہ ہونے والوں کے حق میں عتاب ہے، اور بالخصوص ان کے لئے جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے نکلنے پر ابھارا تھا، اور اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

اور موت کی تمنا مسلمانوں سے شہادت کی تمنا کی طرف راجع ہوتی ہے جس کا دار و مدار (میدان) جہاد میں صبر و ثبات پر ہے، نہ کہ اس سے مراد کفار کا انہیں قتل کرنا ہے، کیونکہ یہ تو معصیت اور کفر ہے اور معصیت کا ارادہ کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے یہ التجا اور دعا کرنے پر برا بیغختہ کیا جاتا ہے کہ وہ انہیں شہادت عطا فرمائے اور وہ جہاد میں ہر اختیار کرنے کی التجا کرتے ہیں اگرچہ وہ انہیں قتل تک ہی پہنچادے۔

قوله تعالیٰ: **وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ** انفس نے کہا: یہ تکریر بمعنی تاکید ہے اس قول: **ثُمَّ رَأَيْتُمُوهُ** کے لئے، جیسا کہ اس قول میں ہے ولا طائر يطير بجناحيه اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور تم آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہو تمہاری آنکھوں میں کوئی بیماری نہیں ہے، [جیسا کہ] تو کہتا ہے: قد رأيت كذا وكذا ليس في عينيك علة، (تو نے اس طرح دیکھ لیا ہے اور تیری آنکھوں میں کوئی بیماری نہیں۔) یعنی تو نے اسے حقیقتاً دیکھ لیا ہے، اور یہ معنی تو کید کی طرف راجع ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: **وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ** اور تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہے ہو۔ آیت میں اضمار ہے، تقدیر کلام یہ ہے۔ فقد رأيتموه و اتم تنظرون فلم انهزمتم؟ (تحقیق تم نے اسے دیکھ لیا ہے اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو تو پھر تم نے شکست کیوں کھائی؟)

**وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ
انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَصُرَ اللَّهُ شَيْئًا وَ
سَيَجْزِي اللَّهُ الشَّكِرِينَ ۝**

”اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول۔ تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں پھر جاؤ گے تم اٹے پاؤں (دین اسلام سے) اور جو پھرتا ہے اٹے پاؤں تو نہیں بگاڑ سکے گا اللہ کا کچھ بھی اور جلدی اجر دے گا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے کہ یہ احد کے دن مسلمانوں کے شکست کھانے کے سبب نازل ہوئی اس وقت شیطان نے

چیخ کر کہا: قد قتل محمد۔ (تحقیق محمد مصطفیٰ ﷺ کو شہید کر دیا گیا۔) عطیہ العوفی نے کہا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: تحقیق محمد مصطفیٰ ﷺ کو موت دی گئی ہے پس تم انہیں اپنے ہاتھوں کے ساتھ دو کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور بعض نے کہا ہے: اگر محمد مصطفیٰ ﷺ کو موت دی گئی ہے تو کیا تم اس حالت پر باقی نہیں رہو گے جس پر تمہارے انبیاء رہے یہاں تک کہ تم آپ سے جا ملو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كَتَبْنَا مُوَجَّلَاتٍ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ۝ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيِّ قُتِلَ مَعَهُ رَاسِيُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۝ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا (1)۔ اس میں مانا فیہ ہے اور اس کا ما بعد مبتدا اور خبر ہے، اور ما کا عمل باطل ہو گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح قرأت کی ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ رُسُلٌ یعنی بغیر الف لام کے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس پر آگاہ فرمایا ہے کہ رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات اپنی قوم میں ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں ہیں، اور یہ کہ اس کو مضبوطی سے تھامنا واجب ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے اگرچہ رسول موت یا قتل کے سبب نقود ہو۔ اور اپنے نبی مکرم ﷺ کی عزت و تکریم فرمائی [آپ کے دو وصفوں (دو اسموں کے ساتھ جو دونوں آپ کے اسم سے مشتق ہیں محمد اور احمد ﷺ عرب کہتے ہیں: رَجُلٌ مُحْسودٌ وَمُحْتَدٌ جب اس کے خصائل حمیدہ کثیر ہوں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

إلى المأجد القريم الجواد المحمد
تحقيق یہ معنی سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اور عباس بن مرد اس نے کہا ہے:

يا خاتم النبأ انك مرسل
بالخير كل هدى السبيل هذا
اے خاتم الانبیاء! بلاشبہ آپ خیر و بھلائی کے ساتھ بھیجے گئے ہیں ہر راہ ہدایت آپ ہی کی ہدایت ہے۔
ان الاله بنی عليك محبة
لی خلقه و محتدا سنا کا

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں تجھ پر محبت کی بنیاد رکھی ہے اور تیرا نام محمد مصطفیٰ ﷺ رکھا ہے۔

پس یہ آیت شکست کھانے والوں کے عتاب کا تمہ ہے، یعنی ان کے لئے شکست کھانا نہیں ہے اگرچہ محمد مصطفیٰ ﷺ بھی شہید کر دیئے جائیں، اور نبوت موت کو دور نہیں کر سکتی، اور ادیان انبیاء علیہم السلام کی موت سے زائل نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور آپ کی جرأت پر سب سے بڑھ کر دلیل ہے، کیونکہ

شجاعت اور جرأت کی تعریف اور حد مصائب و آلام آنے کے وقت دل کا ثابت رہنا ہے، اور حضور نبی مکرم ﷺ کی موت سے بڑی اور کوئی مصیبت نہیں۔ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے، پس اسی وقت آپ کی شجاعت اور آپ کا علم ظاہر ہوا۔ لوگوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے، ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی (معاملہ) مخفی رکھا، اور معاملہ مضطرب ہو گیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ساتھ اس حقیقت کو ظاہر کیا جب آپ اپنی رہائش گاہ سے آئے۔

بخاری میں اسی طرح ہے (1) اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ جو کہ خارجہ کی بیٹی تھی، کے ساتھ عوالی میں تھے، تو لوگ کہنے لگے: حضور نبی مکرم ﷺ فوت نہیں ہوئے بلکہ یہ انہیں حالات میں سے ایک حالت ہے جو وحی لیتے وقت آپ پر طاری ہوتی تھی۔ اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور آپ نے آپ ﷺ کے چہرہ اقدس سے (کپڑا) اٹھایا اور آپ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور دوبار کہا: انت اکرم علی اللہ من ان یسیتک (آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں کہ وہ آپ کو موت دے)

قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ وصال فرما گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد کے ایک کونے میں کہہ رہے تھے: قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے، اور نہ وہ فوت ہوں گے یہاں تک کہ منافقین میں سے بہت سے لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: من کان یعبدا اللہ فان اللہ حمی لم یت، ومن کان یعبدا محمدا فان محمدا قد مات جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو زندہ ہے وہ فوت نہیں ہوا۔ اور جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو محمد ﷺ تو فوت ہو چکے ہیں، وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَآيُنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَصُرَ اللّٰهُ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِينَ ﴿۱۰﴾ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ”گویا میں نے تو یہ آیت اس دن کے سوا پڑھی ہی نہیں (2)۔“ اور انہوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا جو پہلے انہوں نے کہا تھا۔ اسے والی ابونصر عبید اللہ نے اپنی کتاب ”الابانۃ“ میں ذکر کیا ہے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس وقت سنا جب رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی اور آپ رسول اللہ ﷺ کے منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پہلے شہادت دی اور کہا: اما بعد! میں نے کل تمہیں ایک بات کہی تھی اور وہ اس طرح نہ تھی جیسے میں نے کہی تھی۔ اور قسم بخدا! میں نے وہ بات جو تمہیں کہی اسے اس کتاب میں نہیں پایا جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور نہ ہی اس عہد میں پایا جو عہد رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا، البتہ میں یہ امید کرتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ زندہ رہیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے بعد آئیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 118، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1615، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے..... آپ کے کہنے کی مراد یہ تھی کہ آپ ﷺ کو موت آخر میں آئے گی..... پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کے لئے اپنی پسند کو تمہاری پسند پر ترجیح دی، اور یہ وہ کتاب ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کی راہنمائی فرمائی پس تم اسے پکڑ لو تم ہدایت پا جاؤ گے اس کی طرف جو رسول اللہ ﷺ نے راہنمائی فرمائی۔ (1)

واللی ابونصر نے کہا: وہ بات جو انہوں نے کہی پھر اس سے رجوع کر لیا وہ یہ ہے ”کہ حضور نبی مکرم ﷺ فوت نہیں ہوئے اور وہ ہرگز فوت نہیں ہوں گے یہاں تک کہ لوگوں کے ہاتھ اور ان کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے اور انہوں نے یہ اس عظیم صدمہ کی وجہ سے کہا جو انہیں لاحق ہوا اور انہیں فتنہ اور منافقین کے ظہور کا خدشہ ہوا، اور جب انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قوت یقین کا مشاہدہ کیا، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا: كُلُّ نَفْسٍ ذَا أَلْبَقَةٍ الْمَوْتُ أَوْرَثَكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ۔

اور وہ جو انہوں نے اس دن کہا..... تو یہ آگاہ ہوئے اور یہ بات (ان کے ذہن میں) راسخ ہو گئی۔ اور انہوں نے کہا: گویا میں نے یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے سنی ہی نہیں۔ اور لوگ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں نکل پڑے، گویا یہ آیت کبھی نازل نہیں ہوئی مگر اسی دن (2)۔ اور آپ ﷺ کا وصال بلا اختلاف پیر کے دن ہوا، اسی وقت میں جس میں آپ ﷺ ہجرت کے وقت مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے جس وقت دھوپ خوب سخت ہو چکی تھی، اور آپ ﷺ کو منگل کے دن دفن کیا گیا، اور یہ قول بھی ہے کہ بدھ کی رات کو (آپ کو دفن کیا گیا) (3)

صفیہ بنت عبدالمطلب نے رسول اللہ ﷺ کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:

ألا يا رسول الله كنت رجاءنا و كنت بنا براء و لم تك جافيا

خبردار! یا رسول اللہ ﷺ آپ ہماری امید تھے اور آپ ہمارے محسن تھے اور کبھی اعراض نہ برتتے تھے۔

و كنت رحيا هاديا و معلما

اور بڑے مہربان، راہبر اور معلم تھے چاہیے کہ آج کے دن آپ پر ہر رونے والا روئے۔

لعمرك ما أبكى النبي لفقده و لكن لما أخصى من الهرج اتيا

تیری عمر کی قسم میں نبی مکرم ﷺ کے مفقود ہونے کے سبب نہیں روؤں گی البتہ جب مجھے کسی حرج اور مصیبت آنے کا

خدشہ ہوگا۔

كان على قلبي لذكر محبدا و ما خفت من بعد النبي المكاويا

گو یا میرے دل پر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہے اور مجھے نبی مکرم ﷺ کے بعد کسی گالیاں دینے والے کا کوئی خوف نہیں۔

أفطم صلى الله رب محبدا على جدث أمسى بيثرب ثاويا

میں چھوڑتی ہوں اللہ تعالیٰ پر جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا رب ہے کہ وہ اس قبر پر رحمتیں نازل فرمائے جو یثرب میں آباد ہے۔

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث 1165، ایضاً

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6679، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1298، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فَدَى لِرَسُولٍ - اللهُ أَقْبَى وَ خَالَتِي وَ عَمِي وَ أَبَائِي وَ نَفْسِي وَ مَالِيَا

رسول اللہ ﷺ پر میری ماں، میری خالہ، میری پھوپھی، میری جان اور میرا مال سبھی نثار ہوں۔

صَدَقْتُ وَ بَلَّغْتُ الرِّسَالَةَ صَادِقًا وَ مَتَّ صَلِيبَ الْعُودِ أَبَدًا صَافِيَا

آپ نے سچ بولا اور پیغام رسالت کو صداقت کے ساتھ پہنچایا اور آپ نے لکڑی کی صلیب کو ختم کر دیا اور خوب صاف کر دیا۔

فَلَوْ أَنَّ رِبَّ النَّاسِ أَبْقَى نَبِيَّنَا سَعِدْنَا، وَ لَكِنْ أَمْرُهُ كَانَ مَاضِيَا

پس اگر رب العالمین ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باقی رکھتا تو ہماری سعادت مندی تھی لیکن اس کا امر فیصلہ کن ہے۔

عَلَيْكَ مِنْ اللهِ السَّلَامُ تَحِيَّةٌ وَ أَدْخِلْتَ جَنَاتٍ مِنَ الْعَذْنِ رَاضِيَا

آپ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے صلوٰۃ و سلام ہو اور آپ کو جنات عدن میں داخل کیا جائے اس حال میں کہ آپ راضی اور

خوش ہوں۔

أَرَى حَسْبَنَا أَيْتَمَهُ وَ تَرْكَتَهُ يُبَكِّي وَ يَدْعُو جَدَّهُ الْيَوْمَ نَاعِيَا

میں دیکھ رہی ہوں آپ نے ہی ہمارے حسب کو مکمل کیا ہے اور اسے رلاتے ہوئے چھوڑ دیا ہے اور آج یہ دور اپنے دادا کو

پکار رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی تدفین کو کیوں مؤخر کیا گیا حالانکہ آپ نے اہل بیت کو اپنی میگوئی کی تدفین کو مؤخر کرنے پر کہا: ”اپنے مردوں کی تدفین میں جلدی کرو اور تم ان میں تاخیر نہ کرو“ (1)۔ تو اس کا جواب تین طرح سے دیا گیا ہے۔

(1) ایک تو وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کے وصال فرمانے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اتفاق نہ تھا۔

(2) اس لئے کہ وہ اس مقام اور جگہ کو نہ جانتے تھے جہاں وہ آپ کو دفن کریں۔ پس ایک جماعت نے کہا: جنت البقیع میں دفن

کیا جائے اور دوسرے گروہ نے کہا: مسجد میں، اور ایک قوم نے کہا: آپ کو روکا جائے گا یہاں تک کہ آپ کو اپنے باپ ابراہیم

علیہ السلام کی طرف اٹھالیا جائے، یہاں تک کہ عالم اکبر (مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) نے کہا: میں نے آپ ﷺ کو یہ

کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ما دفن نبی الا حیث یوت (کسی نبی کو دفن نہیں کیا جاتا مگر اسی جگہ جہاں اس کا وصال ہوتا ہے)

اسے ابن ماجہ اور مؤطا وغیرہا نے بیان کیا ہے۔ (2)

(3) وہ اس اختلاف میں مشغول ہو گئے جو مہاجرین و انصار کے درمیان بیعت کے بارے میں واقع ہوا، پس وہ اس میں غورو

فکر کرتے رہے یہاں تک کہ معاملہ واضح ہو گیا اور کام منظم ہو گیا اور حالات پر سکون ہو گئے، اور خلافت اپنے نصاب میں پہنچتے

ہو گئی پس انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی، پھر دوسرے دن ان میں سے ایک جماعت نے برضا اور رغبت

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 108، کراچی۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجنائز، صفحہ 212، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری بیعت کی، پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے سبب مرتدین کے فتنہ سے نجات دلائی اور آپ کے سبب دین کو تقویت حاصل ہوئی، والحمد للہ رب العالمین۔ پھر اس کے بعد انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کی طرف رجوع کیا اور آپ کے دفن کے بارے میں غور و فکر کی تب انہوں نے آپ ﷺ کو غسل دیا اور آپ کو کفن پہنایا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا آپ ﷺ پر نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں، پس بعض نے کہا ہے: کسی نے بھی آپ ﷺ پر نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ ہر ایک آپ ﷺ کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتا رہا، کیونکہ آپ ﷺ کی شان اس سے اشرف و اعلیٰ ہے کہ آپ پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ اور علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ کلام ضعیف ہے، کیونکہ سنت یہی ہے کہ آپ پر نماز جنازہ میں کھڑے ہو کر درود پاک پڑھا جائے گا، جیسا کہ آپ پر دعائیں درود پاک پڑھا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہے: اللہم صل علی محمد الی یوم القیامۃ (اے اللہ! حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر یوم قیامت تک رحمتیں نازل فرما۔) اور یہ ہمارے لئے بھی باعث نفع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ ﷺ پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی، کیونکہ وہاں کوئی امام نہ تھا۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ وہ جو انہیں فرض نماز پڑھا رہا تھا وہی اس نماز میں ان کی امامت کرتا رہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگوں نے آپ ﷺ پر انفرادی طور پر نماز پڑھی، کیونکہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ آخری عہد تھا، چنانچہ انہوں نے چاہا کہ ہر کوئی آپ کی مخصوص برکتیں حاصل کر لے نہ کہ وہ ان میں کسی غیر کے تابع ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسناد حسن بلکہ صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے اور اس میں ہے: جب لوگ منگل کے دن آپ کی تجہیز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ کو اپنے گھر میں چار پائی پر رکھا گیا، پھر لوگ رسول اللہ ﷺ پر گروہ درگروہ داخل ہوئے اور آپ پر صلوٰۃ (درود) پڑھتے رہے، حتیٰ کہ جب وہ فارغ ہوئے تو انہوں نے عورتوں کو وہاں حاضری کا موقع دیا، یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوئیں تو پھر بچوں کو حاضری کی اجازت دی گئی، اور کسی نے بھی رسول اللہ ﷺ پر لوگوں کی امامت نہیں کرائی۔ اس حدیث کو انہوں نے نصر ابن علی جہضمی سے اس سند کے ساتھ بیان کیا ہے ابن ابی شیبہ بن جریر حدیثنا ابی عن محمد بن اسحاق قال حدثنی حسین ابن عبد اللہ عن عکرمۃ عن ابن عباس، الحدیث بطولہ۔ (1)

مسئلہ نمبر 5۔ حضور نبی مکرم ﷺ کے وصال کے بعد حالات کی تبدیلی کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ہر شے منور و روشن ہو گئی، اور جس دن آپ ﷺ کا مدینہ طیبہ میں وصال ہوا تو وہاں کی ہر شے تاریک ہو گئی۔ اور ہم نے حضور نبی مکرم ﷺ سے ہاتھ نہیں جھاڑے یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کا انکار کر دیا۔

ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے (2) اور کہا ہے: محمد بن بشار، عبد الرحمن بن مہدی، سفیان نے عبد اللہ بن دینار سے اور

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 118۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1620، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنی عورتوں کے ساتھ کلام کرنے اور دل لگی کرنے سے بچتے تھے اس خوف سے کہ کہیں ہمارے بارے میں قرآن نہ نازل ہو جائے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو پھر ہم کلام کرنے لگے۔ (1)

اور ام سلمہ بنت ابی امیہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسند روایت ہے (کہ انہوں نے کہا) لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کسی نمازی کی نظر اپنے قدموں سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں میں سے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوتا تو ان میں سے کسی کی نظر پیشانی رکھنے کی جگہ سے تجاوز نہ کرتی، پھر جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں سے جب کوئی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا تو کسی کی نظر قبلہ کی سمت سے نہ پھرتی، پھر جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو فتنے برپا ہو گئے اور لوگ نماز میں دائیں بائیں متوجہ ہونے لگے۔ (2)

قولہ تعالیٰ: اَقَامِن مَّاتٍ اَوْ قُتِلَ اَنْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ اس میں اَقَامِن مَّاتٍ شرط ہے اور اَوْ قُتِلَ اس پر معطوف ہے اور اَنْقَلَبْتُمْ جواب شرط ہے اور حرف استفہام حرف جزا پر داخل ہے کیونکہ شرط اسی کے ساتھ منعقد ہے اور یہ ایک جملہ اور ایک خبر ہو گیا ہے اور معنی یہ ہے: اَفْتَنَقَلَبُوْنَ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ اِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ؟ (کیا تم اٹے پاؤں (دین اسلام سے) پھر جاؤ گے اگر آپ انتقال فرما جائیں یا آپ کو شہید کر دیا جائے) اور اسی طرح (حکم ہے) ہر استفہام کا جو حرف جزا پر داخل ہو، کیونکہ وہ اپنے محل میں نہیں ہوتا، اور اس کا محل یہ ہے کہ وہ جواب شرط سے پہلے ہو۔ اور قول باری تعالیٰ: اَنْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ ایک تمثیل ہے، اور اس کا معنی ہے: تم اپنے ایمان کے بعد کفار کی طرف لوٹ جاؤ گے، حضرت قتادہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ اس کے بارے کہا جاتا ہے جو اس حالت کی طرف لوٹ آئے جس پر وہ پہلے تھا انقلب علی عقبیہ۔ اور اسی معنی میں نَكَصَ عَلٰی عَقْبَيْہ بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں انقلاب (لوٹنے) سے مراد شکست کھانا ہے، اور یہ حقیقت ہے نہ کہ مجاز۔ اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم نے مرتدین کا فعل کیا ہے اگرچہ یہ ردة (مرتد ہونا) نہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰی عَقْبَيْہ فَلَنْ يُّصْرَا اللّٰہُ شِیْئًا (اور جو اٹے پاؤں پھرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا) بلکہ اپنی ذات کا نقصان کرے گا اور مخالفت کے سبب اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اسے کوئی طاقت نفع نہیں دے سکتی اور نہ کوئی معصیت اسے کوئی نقصان اور ضرر پہنچا سکتی ہے۔

وَسَيَجْزِي اللّٰہُ الشَّکْرِیْنَ (اور اللہ تعالیٰ جلدی اجر دے گا شکر کرنے والوں کو) یعنی وہ جنہوں نے صبر کیا اور جہاد کیا اور شہید کر دیئے گئے۔ اور وَسَيَجْزِي اللّٰہُ الشَّکْرِیْنَ قول باری تعالیٰ: فَلَنْ يُّصْرَا اللّٰہُ شِیْئًا کے بعد آیا ہے اور یہ وعدہ کا وعید کے ساتھ اتصال ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1621، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز، صفحہ 119، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كَتَبَ مُوَجَّلًا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا
نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ﴿٣٥﴾

”اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے۔ لکھا ہوا ہے (موت کا) مقررہ وقت اور جو شخص چاہتا ہے دنیا کا فائدہ، ہم دیتے ہیں اس کو اس سے اور جو شخص چاہتا ہے آخرت کا فائدہ ہم دیتے ہیں اسے اس میں سے اور ہم جلدی اجر دیں گے (اپنے) شکر گزار بندوں کو۔“

قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كَتَبَ مُوَجَّلًا یہ جہاد پر ابھارتا ہے اور اس پر آگاہ کرنا ہے کہ موت لازم اور ضروری ہے اور ہر انسان مقتول ہو یا غیر مقتول وہ مرنے والا ہے جب وہ اپنی (موت کی) لکھی ہوئی مقررہ مدت تک پہنچ جائے کیونکہ مُوَجَّلًا کا معنی الی اجل (مقررہ مدت تک) ہے۔ اور بِإِذْنِ اللَّهِ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی قضا اور اس کی تقدیر سے۔ اور کَتَبَ مصدر کی بنا پر منصوب ہے یعنی کتب اللہ کَتَبَ مُوَجَّلًا۔ (اللہ تعالیٰ نے موت کا مقررہ وقت لکھ دیا ہے۔) اور اجل الموت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ سبحانہ کے علم میں ہے، کہ زندہ کی روح اس کے جسم سے جدا ہوگی، اور جب بندہ قتل کیا جاتا ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ وہی اس کی موت کا مقررہ وقت ہے، اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے: اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو وہ زندہ رہتا۔ اور قول باری تعالیٰ كَتَبَ مُوَجَّلًا پر دلیل فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٦﴾ (النحل) (پس جب آ جاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے ہو سکتے ہیں) اور فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ (العنکبوت: 5) (تو (وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے) اور لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٧﴾ (الرعد) (ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے)

اور معتزلی کہتا ہے: موت کا وقت متقدم اور متاخر ہوتا رہتا ہے اور یہ کہ جسے قتل کر دیا جائے وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک ہو جاتا ہے اور اسی طرح ہر وہ حیوان جو ذبح کر دیا جائے تو وہ بھی اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک ہو گیا، اسی لئے قاتل پر ضمان اور دیت واجب ہوتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ کوئی نفس اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک نہیں ہوگا۔ اس کا مزید بیان سورہ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں علم کے لکھنے اور اسے مدون کرنے پر دلیل موجود ہے اور اس کا بیان سورہ طہ میں اس قول کے تحت آئے گا۔ قَالَ عَلَّمَهَا عِنْدَ رَبِّي كِتَابًا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا (ثواب الدنیا) سے مراد غنیمت ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے غنیمت کی طلب میں مرکز کو چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ہر اس کے بارے میں عام ہے جس نے آخرت کی بجائے صرف دنیا کا ارادہ کیا، اور معنی یہ ہے: ہم اس میں سے اسے وہ دیں گے جو اس کے لئے حصہ مقرر کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ہے: مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ (الاسراء: 18) (جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں۔) وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ

الْآخِرَةُ نَفْسُهُ مِنْهَا يَعْنِي هَمْ اَسْ اِسْ كَيْفِ كِي كِي جَزَا عَطَا فَرَمَا كِي كِي، اِسِي طَرَزِ پَر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ جس کے لئے چاہے گا نیکیاں دو گناہ کر دے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اور آپ کے وہ ساتھی ہیں جو مرکز پر ڈٹے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔

وَسَنَجْزِي الشَّكْرِيْنَ يَعْنِي هَمْ اَنَّهُمْ اَبَدِي ثَوَابِ عَطَا فَرَمَا كِي كِي جَوَانِ كِي كِي لَعْنَةِ تَرْكِ اَنْهَزَامِ پَر جَزَا اور بدلہ ہوگا اور یہ سابقہ بیان کی تاکید ہے کہ آخرت میں انہیں مزید عطا کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَسَنَجْزِي الشَّكْرِيْنَ اور ہم انہیں دنیا میں رزق عطا کریں گے تاکہ یہ وہم نہ کیا جائے کہ شکر گزار اپنے مقوم سے محروم کر دیا جاتا ہے اس میں سے جسے کافر پالیتا ہے۔

وَكَايْنِ مَنْ نَبِيٍّ قُتِلَ مَعَهُ رَاطِيُونَ كَثِيرٌ ۖ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ

اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿١٣٠﴾ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ اِلَّا

اَنْ قَالُوا رَبَّنَا غُفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَاِسْرَافُنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبَّتْ اَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ﴿١٣١﴾

”اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے سونہ ہمت ہاری انہوں نے بوجہ ان تکلیفوں کے جو پہنچی انہیں اللہ کی راہ میں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ انہوں نے ہار مانی اور اللہ تعالیٰ پیار کرتا ہے (تکلیفوں میں) صبر کرنے والوں سے۔ اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں کیں ہم نے اپنے کام میں اور ثابت قدم رکھ ہمیں اور فتح دے ہم کو قوم کفار پر۔“

قوله تعالى: وَكَأَيِّنْ مِنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مَعَهُ رَاطِيُونَ كَثِيرٌ زہری نے بیان کیا ہے: غزوہ احد کے دن شیطان نے چیخ کر کہا: قتل محمد (محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل کر دیئے گئے) تو اس سے مسلمانوں کی ایک جماعت شکست خوردہ ہو گئی۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں پہلا آدمی تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا، میں نے خود کے نیچے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کو چمکتے ہوئے دیکھا، تو میں نے اپنی بلند آواز کے ساتھ پکار کر کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ فرمایا کہ تو خاموش رہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَكَأَيِّنْ مِنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مَعَهُ رَاطِيُونَ كَثِيرٌ ۖ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا اِلَّا يَ۔ اور کَايْنِ كَمَ ہے۔ خلیل اور سبوحہ نے کہا ہے: یہ ای ہے اس پر کاف تشبیہ داخل ہوا اور اس کے ساتھ اسے بنایا گیا۔ پس یہ کلام میں کم کے معنی میں ہے۔

اور اسے مصحف میں نون کے ساتھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے اسے اپنے اصل سے نقل کیا گیا ہے پس اس کے معنی کے تغیر کی وجہ سے اس کے لفظ کو بھی بدل دیا گیا ہے، پھر اس کا استعمال کثیر ہے اور عرب تو اس کے ساتھ کھیلتے رہے اور انہوں

نے اس میں قلب اور حذف کا تصرف کیا ہے۔ اور اس میں چار لغات ہیں جن کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ ابن کثیر نے اسے وکائن، وکاعین کی مثل فاعل کے وزن پر پڑھا ہے اور اس کی اصل کئی ہے پھر یا کو الف سے بدل دیا گیا جیسا کہ یتأس میں تبدیل کیا گیا اور کہا گیا ہے یاءس۔

شاعر نے کہا ہے:

وَ كَائِنٌ بِالْأَبَاطِحِ مِنْ صَدِيقٍ يَرَانِي لَوْ أُصِيبْتُ هُوَ الْمُنْصَابَا
اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

وَ كَائِنٌ رَدَدْنَا عَنْكُمْ مَدَجَجٍ يَجِيءُ أَمَامَ الزُّكْبِ يَزْدِي مُقْتَعَا
اور ایک اور نے کہا ہے:

وَ كَائِنٌ فِي الْبَعَاثِ مِنْ أَنَاسٍ أَخُوهُمْ فَوْقَهُمْ وَهُمْ كِرَامُ
مذکورہ تمام اشعار میں وکائن فاعل کے وزن پر پڑھا گیا ہے۔

اور ابن محیسن نے وکین پڑھا ہے یعنی مہموز مقصور ہے جیسا کہ وکین اور یہ کائن سے بنایا گیا ہے اور اس کے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے وکاین بھی ہے جیسا کہ وکعین اور یہ کئی مخفف کا مقلوب ہے۔ اور باقیوں نے وکاین کعین کی مثل تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی اصل ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

كَعَائِنٌ مِنْ أَنَاسٍ لَمْ يَزَالُوا أَخُوهُمْ فَوْقَهُمْ وَهُمْ كِرَامُ
اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

كَائِنٌ أَبَدْنَا مِنْ عَدُوِّ بَعِزَّنَا وَ كَائِنٌ أَجَزْنَا مِنْ ضَعِيفٍ وَ خَائِفٍ
اور اسے دو لغتوں کے درمیان جمع کر دیا گیا ہے: کائِن و کائِن، اور ایک پانچویں لغت ہے کین جیسا کہ کینعن، گویا یہ کین سے مخفف ہے اور کائِن کا مقلوب ہے۔ علامہ جوہری نے سوائے دو لغتوں کے کوئی ذکر نہیں کی: کائِن مثلاً کاعین، اور کائِن مثلاً کعین، آپ کہتے ہیں کائِن رجلاً لقیث، اس میں رجلاً تمیز کی بنا پر کائِن کے بعد منصوب ہے۔ اور آپ یہ بھی کہتے ہیں: کائِن من رجل لقیث، کائِن کے بعد من داخل کرنا نصب کی نسبت اکثر اور عمدہ ہے۔ اور بکائِن تبیع هذا الشوب؟ معنی بکم تبیع ہے۔ (تم یہ کپڑا کتنے میں بیچو گے)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

وَ كَائِنٌ دَعَرْنَا مِنْ مَهَاقٍ وَ رَامِجٍ بِلَادُ الْعِدَا لَيْسَتْ لَهُ بِلَادُ
اس میں کائِن بمعنی کم استعمال ہو رہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: ابو عمرو نے وقف کیا ہے اور وکائی بغیر نون کے پڑھا ہے، کیونکہ یہ تنوین ہے اور سورہ ابن مہارک نے

کسائی سے اسے روایت کیا ہے۔ اور باقیوں نے خط مصحف کی اتباع کرتے ہوئے نون کے ساتھ وقف کیا ہے۔ اور آیت کا معنی مومنوں کو تشجیع دلانا اور انبیاء علیہم السلام کے بہترین متبعین میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں ان کی اقتداء اور پیروی کرنے کا حکم دینا ہے، یعنی کثیر انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والوں کو شہید کیا گیا یا انبیاء علیہم السلام میں سے کثیر شہید کر دیئے گئے اور ان کی امتیں مرتد نہیں ہوئیں، یہ دو قول ہیں: پہلا حسن اور سعید بن جبیر کا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کوئی نبی کسی جنگ میں کبھی شہید نہیں کیا گیا (1)۔ اور ابن جبیر نے کہا ہے: ہم نے نہیں سنا کہ کوئی نبی علیہ السلام جنگ میں شہید کر دیا گیا ہو (2)۔ اور دوسرا قول حضرت قتادہ اور عکرمہ سے منقول ہے۔ اس قول کی بنا پر قَتْل پر وقف کرنا جائز ہے، اور یہ قرأت (قَتْل) نافع، ابن جبیر، ابو عمرو اور یعقوب کی ہے۔ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے، اور اس میں دو جہیں ہیں: ایک یہ کہ قَتْل صرف نبی پر واقع ہو رہا ہے، اور اس صورت میں قَتْل پر کلام کی تکمیل ہو جاتی ہے اور کلام میں اضافہ ہوگا یعنی و معہ ربیون کثیر، جیسا کہ کہا جاتا ہے: قَتْلَ الْاَمِیْرُ مَعَهُ جِیْشٌ عَظِیْمٌ، یعنی و معہ جیش عظیم۔ اور خرجت معی تجارۃ، امی و معی۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قتل نبی علیہ السلام اور اس کے ساتھ اللہ والوں کو بھی شامل ہو، اور کلام کی توجیہ یہ ہوگی کہ ان میں سے بعض شہید کر دیئے گئے جو اس (نبی علیہ السلام) کے ساتھ تھے، عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم و بنی سلیم، (یعنی) ان میں سے بعض قتل کر دیئے گئے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَمَا وَهَنُوا ان میں سے مابقی کی طرف راجع ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول نزول آیت کے ساتھ زیادہ مشابہت اور زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید نہیں کئے گئے، بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ کرام کی ایک جماعت شہید کی گئی۔ اور کوفیوں اور ابن عامر نے قاتل پڑھا ہے۔

اور یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور اسے ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے جب ان کی مدح اور تعریف کی جنہوں نے جہاد کیا تو جو شہید کر دیئے گئے وہ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ اور جب مدح ان کی ہو جو شہید کر دیئے گئے تو پھر ان کے سوا باقی اس میں داخل نہ ہوئے، پس قَاتِلْ اَعْم (3) اور زیادہ قابل مدح ہے، اور رِبِیُّونَ دَا کے کسرہ کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت رَا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رَا کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے، اس میں تین لغات ہیں۔ اور رِبِیُّونَ سے مراد بہت سی جماعتیں ہیں، یہ حضرت مجاہد، قتادہ، ضحاک اور عکرمہ سے منقول ہے (4)، ان کا واحد رِبِیُّ رَا کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ ہے، یہ رِبِیُّ کی طرف منسوب ہے یہ رَا کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے اور رَا کے ضمہ کے ساتھ بھی۔ اور اس کا معنی ہے جماعت، گروہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الرِّبِیُّونَ سے مراد ألوف کثیرہ (یعنی کئی ہزار) ہیں (5)۔ اور ابن زید نے کہا ہے: الرِّبِیُّونَ سے مراد اتباع و پیروی کرنے والے ہیں (6)۔ پہلا معنی لغت میں زیادہ معروف ہے، اور اسی معنی میں (کپڑے کا) وہ ٹکڑا ہے جس میں جوئے کے تیز جمع

کئے جاتے ہیں اسے رَبَّةٌ اور رُبَّةٌ کہا جاتا ہے۔ اور رِبَاب سے مراد وہ قبائل ہیں جو جمع ہوں۔ اور ابان بن ثعلب نے کہا ہے: الرِّبِّيُّ دس ہزار ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد صبر کرنے والے علماء ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ربیع اور سدی نے کہا ہے: اس سے مراد الجمع الکثیر (بہت بڑا اجتماع) ہے۔

حسان نے کہا ہے:

وَإِذَا مَعْشَرٌ تَجَافَوْا عَنِ الْحَقِّ حَصَلْنَا عَلَيْهِم رُبِّيَا

جب لوگ حق سے دور ہو گئے تو ہم نے ان پر جمع کثیر کو مسلط کر دیا۔

اور زجاج نے کہا ہے: یہاں دو قرآتیں ہیں رِبِّيُّونَ را کے ضمہ کے ساتھ اور رِبِّيُّونَ دا کے کسرہ کے ساتھ، رہا رِبِّيُّونَ تو اس کا معنی ہے جماعت کثیرہ اور کہا جاتا ہے: دس ہزار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رِبِّيُّونَ دا کے فتح کے ساتھ یہ رب کی طرف منسوب ہے۔ خلیل نے کہا ہے: الرِّبِّيُّ ان بندوں میں سے ایک جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ڈٹے رہے اور صبر کیا اور وہی ربانیون ہیں ان کی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی معرفت، عبادت اور الوہیت کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

قرآن تعالیٰ: فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَهَنُوا وہ کمزور ہو گئے، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ الوهن کا معنی ہے خوف کے سبب ہمت اور قوت کا ٹوٹ جانا۔ اور حسن اور ابوالسالم نے وَهْنُوا ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ابوزید سے منقول ہیں۔ وَهْنُ الشَّيْءِ يَهِنُ وَهْنًا۔ اور أَوْهَنْتُهُ أَنَا وَهَنْتُهُ اس کا معنی ہے میں نے اسے کمزور کر دیا۔ اور الواهنة کا معنی ہے پسلیوں کا نیچے آنا اور ان کا چھوٹا ہونا اور الوهن من الابل سے مراد اونٹ کا بوجھل اور موٹا ہونا ہے اور الوهن سے مراد رات کی وہ ساعت بھی ہے جو گزر جاتی ہے، اور اسی طرح السنوہن بھی ہے۔ اور أَوْهَنَّا یعنی ہم اس ساعت میں ہو گئے، مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کے شہید ہونے کی وجہ سے یا ان کے قتل کی وجہ سے جو ان میں شہید کر دیئے گئے ہمت نہ ہاری یعنی ان کے باقی رہنے والوں نے ہمت نہ ہاری، پس اس میں مضاف محذوف ہے۔ وَمَا ضَعُفُوا اور وہ اپنے دشمن کی وجہ سے کمزور نہیں ہوئے۔ وَمَا اسْتَكَانُوا یعنی (انہوں نے ہار نہ مانی) اس تکلیف اور مصیبت کی وجہ سے جو انہیں جہاد میں پہنچی۔ اور الاستكانة کا معنی ذلت اور خضوع ہے (یعنی نہ وہ جھکے اور نہ عجز کا اظہار کیا) اور اس کی اصل وَاسْتَكَانُوا، افعلوا کے وزن پر ہے، پھر کاف کے فتح میں اشباع کیا گیا تو اس سے الف پیدا ہوا۔

اور جنہوں نے اسے گُزِن سے بنایا ہے تو پھر یہ استفعلوا کے وزن پر ہے۔ (یعنی باب استفعال ہے) اور پہلا آیت کے معنی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اور فَمَا وَهَنُوا وَمَا ضَعُفُوا اور عین کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور کسائی نے ضَعَفُوا عین کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی اس کے بعد کہ ان میں سے کچھ شہید کر دیئے گئے یا ان کے نبی علیہ السلام کو شہید کر دیا گیا یہ کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ بھاگے نہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو موت پر

پیش کر دیا، اور انہوں نے مغفرت طلب کی تاکہ ان کی سوت گناہوں سے توبہ ہو جائے اگر انہیں شہادت عطا فرمادی جائے، اور انہوں نے ثابت قدم رہنے کی التجا کی یہاں تک کہ وہ شکست خوردہ نہ ہوئے، اور اپنے دشمنوں کے خلاف فتح و نصرت کی دعا مانگی۔ اور انہوں نے ثبات بالاقدام کو خاص کیا نہ کہ دیگر اعضائے بدن کو اس لئے کہ اعتماد اور انحصار انہی پر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے اصحاب محمد! سَلِّمُ عَلَیْہِمْ تَمَّ نے اس طرح کیوں کیا اور کہا؟ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور انہیں نصرت، فتح، دنیا میں مال غنیمت اور آخرت میں مغفرت عطا فرمائی جب وہ اس کی طرف چلے گئے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے مخلص، توبہ کرنے والے، سچ بولنے والے اور اپنے دین کی مدد و نصرت کرنے والے بندوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرتا ہے۔ جو اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے سچے وعدہ اور سچے قول کے ساتھ ثابت قدم رہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ یعنی (اللہ تعالیٰ ان سے پیارا اور محبت کرتا ہے) جو جہاد میں صبر اختیار کرتے ہیں اور بعض نے وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ رَفَعَ کے ساتھ پڑھا ہے اس میں قول کو کَانَ کا اسم بنایا گیا ہے، سو اس کا معنی ہوگا وَمَا كَانَ قَوْلُهُمُ الْاَقْوَلُہُمْ (اور ان کی کوئی گفتگو نہ تھی سوائے اس قول کے) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا (اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے) اس میں مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ وَاسْرَافْنَا اور جو زیادتیاں ہم نے کی ہیں مراد کبیرہ گناہ ہیں۔ اور اسراف کا معنی ہے: الافراط فی الشئ و مجاوزة الحد یعنی کسی شے میں زیادتی کرنا اور حد سے تجاوز کرنا۔ اور صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگتے تھے اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ وَ جَهْدِيْ وَ اسْرَافِيْ فِيْ اَمْرِيْ وَ اَمَّا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِّنِّيْ (1) (اے اللہ! میری خطائیں، میری جہالت (میری عدم علم) میری اپنے معاملے میں زیادتی اور وہ جسے تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے میری مغفرت اور بخشش فرما۔) اور آگے حدیث ذکر کی (2)۔ چنانچہ انسان پر لازم ہے کہ وہ اس دعا پر عمل کرے جو کتاب اللہ اور صحیح سنت میں ہے اور اس کے سوا کو چھوڑ دے اور یہ نہ کہے: میں اس طرح پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام اور اپنے اولیاء کے لئے پسند فرمایا اور انہیں تعلیم دی کہ وہ کیسے دعا مانگیں۔

فَاَتَتْهُمْ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٩﴾

”تو دے دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ثواب (یعنی کامیابی) اور عمدہ ثواب آخرت کا (یعنی نعیم جنت اور لذت و

صل) اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکو کاروں سے۔“

قول تعالیٰ: فَاَتَتْهُمْ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کر دیا ثَوَابَ الدُّنْيَا یعنی دشمنوں کے لئے دنیا کی نعمت اور ان پر فتح کا مرانی وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ یعنی جنت اور جہنم کی۔ فَاَتَتْهُمْ اللّٰهُ پڑھا ہے یعنی یہ ثواب سے مانگا ہے۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اس کا غہوم پہلے گزر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوبِيْ، حدیث نمبر 5919، ضیاء القرآن پبلشرز، لاہور۔

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعوات و التَّوْبَاتِ، باب فی الادعیۃ، جلد 2، صفحہ 349، اسلام آباد۔

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الدعوات، حدیث نمبر 5919، ضیاء القرآن پبلشرز، لاہور۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يُرَدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا
خِسْرَيْنَ ۖ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّصِيرِينَ ۝

”اے ایمان والو! اگر پیروی کرو گے تم کافروں کی تو وہ پھیر دیں گے تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) تو تم لوٹو

گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔ بلکہ اللہ حامی ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔“

جب اللہ تعالیٰ نے ان کی اقتدا کا حکم دیا جو انبیاء علیہم السلام کے انصار و معاونین میں سے پہلے گزر چکے ہیں تو کافروں کی طاعت و پیروی سے ڈرایا، کافروں سے مراد مشرکین عرب یعنی ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد منافقین ہیں انہوں نے مومنین کو ہزیمت کے وقت یہ کہا: تم اپنے آباء و اجداد کے دین کی طرف لوٹ آؤ (1)۔ یُرَدُّوْكُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ یعنی وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے۔ فَتَنْقَلِبُوْا خِسْرٰیْنِ تو تم لوٹو گے اس حال میں کہ تم خسارے اور نقصان میں ہو گے۔ پھر فرمایا: بَلِ اللّٰهُ مَوْلَاكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار اور تمہارا محافظ ہے اگر تم اس کی اطاعت کرو گے۔ اور بَلِ اللّٰهُ نَصَب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، تقدیر عبارت یہ ہے بل و اطیعوا اللہ مولا کم۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطٰنًا
وَمَا لَهُمُ النَّارُ ۚ وَيُسَّ مَثْوٰی الظّٰلِمِيْنَ ۝

”ابھی ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس لئے کہ انہوں نے شریک بنالیا اللہ کے ساتھ اس کو جس

کے لئے نہیں اتاری اللہ نے کوئی دلیل اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے اور بہت بری جگہ ہے ظالموں کی۔“

اسی کی مثل ہے وَقَذٰفٍ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبُ ابن عامر اور کسائی نے الرُّعْبُ عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور الرُّعْبُ کا معنی خوف ہے، کہا جاتا ہے: رَعْبُهُ رُعْبًا و رُعْبًا، فهو مرعوب۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الرعب مصدر ہو اور الرُّعْبُ اسم ہو۔ اور اس کی اصل الملاء سے ہے (بھرنا) کہا جاتا ہے: سَيْلٌ رَّاعِبٌ يَمْلَأُ الْوَادِي (یعنی ایسا سیلاب جو وادی کو بھر دے) اور رعبت الحوض کا معنی ہے میں نے حوض کو بھر دیا۔

اور آیت کا معنی ہوگا: ہم عنقریب مشرکین کے دلوں کو خوف اور گھبراہٹ سے بھر دیں گے۔ اور سختیانی نے سَيُلْقِيْ يٰء کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے نون عظمت کے ساتھ پڑھا ہے۔

سدی وغیرہ نے کہا ہے: جب ابوسفیان اور مشرکین احد کے دن مکہ مکرمہ کی طرف متوجہ ہو کر چلے وہ چلتے رہے یہاں تک کہ جب وہ کچھ راستہ طے کر چکے تو نادام اور شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے: ہم نے کہا ہے وہ کتنا برا ہے! ہم نے انہیں قتل کیا ہے یہاں تک کہ جب بکھرے ہوئے چند افراد کے سوا کوئی باقی نہیں رہا تو ہم نے انہیں چھوڑ دیا ہے، واپس چلو اور انہیں مکمل طور پر ہلاک کر دو۔

پس جب انہوں نے اس کا عزم و ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا یہاں تک کہ انہوں نے جو قصد کیا تھا اس سے رجوع کر لیا (1)۔ اور القاء در حقیقت اجسام میں استعمال کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَالْقَىٰ الْأَكْوَاعَ** (اور اس نے تختیاں پھینکیں) **فَالْقُوا جِبَالَهُمْ وَعَصِيَّتَهُم** (الشعراء: 44) (تو انہوں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں میدان میں) **فَالْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ** (پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا) شاعر نے کہا ہے:

فَالْقَىٰ عَصَاهَا وَاسْتَقَرَّ بِهَا النَّوَىٰ

پس اس نے اپنا عصا پھینکا اور اس کے ساتھ گھر سا کن ہو گیا۔

پھر کبھی مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے، اور اس ارشاد میں: **وَالْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي** (طہ: 39) (اور (اے موسیٰ) میں نے پر تو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جانب سے) اور **الْقَىٰ عَلَيْكَ مَسْأَلَةً** (اور اس نے تجھ پر سوال کیا ہے۔)

قولہ تعالیٰ: **بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ** یہ علت بیان ہو رہی ہے، یعنی ان کے دلوں میں رعب ڈالنے کا سبب ان کا شرک کرنا ہے، اور یہ مامصدر یہ ہے اور کہا جاتا ہے: **أَشْرَكَ بِهِ** یعنی اس نے اس کے غیر کو اس کے مساوی قرار دیا تا کہ وہ اسے شریک بنالے۔ قولہ تعالیٰ: **مَا لَهُمْ يُنْزِلُ بِهِ سُلْطَانًا** سلطان سے مراد حجت اور بیان ہے، اور عذر اور برہان (دلیل) ہے، اسی وجہ سے والی کو سلطان کہا گیا ہے، کیونکہ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی حجت ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ سلیط سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وہ ہے جس سے چراغ روشن کئے جاتے ہیں، اور وہ تلوں کا تیل ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

أَمَالَ السَّلِيْطُ بِالذُّبَالِ الْمَفْثَلِ

پس سلطان (دلیل) کے ساتھ حق کے اظہار اور باطل کو مٹانے میں روشنی اور نور حاصل کیا جاتا ہے اور کہا گیا ہے: السلیط کا معنی حدید (لوہا) ہے اور السلاطۃ کا معنی الحدۃ (غضب) ہے اور السلاطۃ تسلیط سے ہے اور اس کا معنی قہر اور غلبہ ہے اور سلطان اسی سے ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ پس سلطان کا اصل معنی قوت ہے، کیونکہ قوت کے ساتھ اسی طرح غلبہ پایا جاتا ہے جس طرح دلیل کے ساتھ غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور السلیطۃ کا معنی ہے شور و شغب اور چیخ و پکار کرنے والی عورت۔ اور سلیط سے مراد فصیح اللسان آدمی ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ کسی دین میں بھی بتوں کی عبادت ثابت نہیں، اور اس کے جواز پر عقلی دلیل بھی کوئی نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام اور ان کے لوٹنے کی جگہ کے بارے خبر دی اور فرمایا: **وَمَا لَهُمُ النَّارُ** (اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے) پھر اس کی مذمت بیان کی اور فرمایا: **وَيُسْـَٔسُ مَشْـَٔوِیَ الظَّالِمِیْنَ** اور المشوی، مراد وہ جگہ ہے جس میں انہیں رکھا جائے گا، کہا جاتا ہے: **مَشْـَٔوِیَ ثَوَاءٍ** اور السادی: اس سے مراد ہر وہ جگہ ہے جس کی طرف کوئی شے رات یا دن کے وقت لوٹ کر آتی ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ
فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِمَّنْ بَعْدَ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَ
مِنْكُمْ مَن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۚ وَاللَّهُ
ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٦﴾

”اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ
جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اللہ
نے دکھا دیا تھا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے۔ بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں
آخرت کے پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ آزمائے تمہیں اور بے شک اس نے معاف فرما دیا تم
کو اور اللہ تعالیٰ بہت فضل و کرم فرمانے والا ہے مومنوں پر۔“

محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ احد کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف مراجعت فرما ہوئے اس
حال میں کہ انہیں تکلیف اور اذیت پہنچی تھی تو بعض نے بعض کو کہا: کہاں سے یہ اذیت ہمیں پہنچی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے
ساتھ فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا تھا! تب یہ آیت نازل ہوئی (۱) اور یہ وہ ہے کہ انہوں نے مشرکوں کے علمبردار کو قتل کیا اور اس
کے بعد علم پر ان میں سے سات افراد کو قتل کیا، اور ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی مگر یہ کہ وہ مال غنیمت جمع
کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور بعض تیر اندازوں نے بھی مال غنیمت کی طلب میں اپنا مرکز چھوڑ دیا اور وہی ناکامی کا سبب بن
گیا۔ بخاری نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب احد کا دن تھا اور ہمارا مشرکین سے
آمنہ سامنا ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے تیر اندازوں میں سے کچھ لوگوں کو (ایک درہ میں) بٹھایا اور ان پر حضرت عبد اللہ بن جبیر
رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور آپ نے انہیں فرمایا: ”تم اپنی جگہ کو قطعاً نہ چھوڑنا [اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں تو تم اپنی
جگہ کو نہ چھوڑنا] اور اگر تم انہیں دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ رہے ہیں تو پھر بھی تم ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرنا۔“ راوی کا بیان ہے
کہ جب جنگ ہوئی اور مسلمانوں نے انہیں شکست سے دو چار کر دیا حتیٰ کہ ہم نے عورتوں کی طرف دیکھا وہ بڑی تیزی سے پہاڑ
کی طرف بھاگ رہی ہیں، اور انہوں نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کے پازیب ظاہر دکھائی
دے رہے ہیں تو وہ کہنے لگے: مال غنیمت لوٹ لو مال غنیمت لوٹ لو۔ تو حضرت عبد اللہ بن جبیر نے انہیں کہا: ٹھہر جاؤ، رک جاؤ! کیا
رسول اللہ ﷺ نے تم سے عہد نہیں لیا کہ تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا، لیکن وہ چلے گئے پس جب وہ ان کی طرف آئے تو اللہ تعالیٰ نے
ان کے چہروں کو پھیر دیا (2) اور مسلمانوں میں سے ستر افراد شہید کر دیئے گئے۔ پھر ابوسفیان بن حرب ایک بلند جگہ سے

1۔ عالم التزیل، جلد 1، صفحہ 565۔ ایضاً، اسباب النزول، صفحہ 83

2۔ بخاری کتاب المغازی باب غزوہ احد، حدیث نمبر 3737، فیما القرآن، پہلی کیشنز

ہمارے اوپر جھانکا اور اس نے کہا: کیا قوم میں محمد (ﷺ) ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم اسے جواب نہ دینا“ یہاں تک کہ اس نے تین بار پکارا۔ پھر اس نے کہا: کیا قوم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ تین بار اس نے یہ پوچھا، تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم اسے جواب نہ دینا“ پھر اس نے کہا: کیا قوم میں عمر [بن خطاب] ہیں؟ اس نے یہ بھی تین بار پوچھا۔ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم اسے جواب نہ دینا“ پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: یہ سب لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آپ پر ضبط نہ رکھ سکے اور کہا: اے اللہ تعالیٰ کے دشمن! تو نے جھوٹ بولا ہے! اللہ تعالیٰ نے تجھے باقی رکھا ہے تاکہ وہ اس طرح تجھے ذلیل و رسوا کرے، تو اس نے کہا: اعلٰ ہبل: اے ہبل تو بلند ہو گیا (غالب آگیا) یہ جملہ اس نے دوبارہ کہا۔ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم اسے جواب دو“ تو صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ہم کیا کہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”تم کہو اللہ اعلٰ و اجل“ اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور بزرگ ہے۔

ابوسفیان نے کہا: لنا عزی ولا عزی لکم (ہمارے لئے تو عزیٰ ہے اور تمہارے لئے کوئی عزیٰ نہیں) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم اسے جواب دو“ صحابہ نے عرض کی: ہم کیا کہیں یا رسول اللہ ﷺ؟ تو آپ نے فرمایا: تم کہو اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا: آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے، اور جنگ تو ڈول کی مانند ہے (یعنی اس کا نتیجہ کبھی ایک فریق کے حق میں ہوتا ہے کبھی دوسرے فریق کے حق میں جس طرح ڈول میں پانی کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم) بلاشبہ تم قوم میں ایسے مقتول پاؤ گے جن کا مسئلہ کر دیا گیا ہے میں نے اس کے بارے حکم نہیں دیا لہذا تم مجھے برا نہ کہنا (1)۔ اور بخاری اور مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے دائیں اور بائیں جانب دو آدمی دیکھے وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی جانب سے شدید ترین جنگ لڑ رہے تھے اور حضرت سعد سے ایک روایت میں ہے، ان دونوں پر سفید لباس تھا میں نے ان دونوں کو نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ بعد میں۔ مراد حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں (2)۔ اور دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: یقاتلان عن رسول اللہ ﷺ اشد القتال ما رأیتہما قبل ذالک الیوم ولا بعده۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ملائکہ نے مسلمانوں کی معیت میں اس دن جنگ نہیں لڑی، اور نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد سوائے یوم بدر کے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: حضرت مجاہدؒ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ملائکہ نے احد کے دن اس قوم کی طرف سے جنگ نہیں لڑی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی اور وہ اس حکم پر قائم نہیں رہے جو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا۔ اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان سے صبر و تقویٰ کی شرط پر وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ اور وہ اس نے پورا کر دیا، اور جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب غزوہ احد قول اللہ تعالیٰ، جلد 2، صفحہ 579، قدیمی کتب خانہ کراچی

ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 252، اسلام آباد۔ ایضاً، صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اپنی صفوں کو چھوڑ دیا اور تیر اندازوں نے بھی اس عہد کو ترک کر دیا جو رسول اللہ ﷺ نے ان سے لیا تھا کہ وہ اپنی جگہ کو ہرگز نہ چھوڑیں، اور انہوں نے دنیا کا ارادہ کیا تو ان سے ملائکہ کی مدد اٹھالی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ** تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دیا اور انہیں فتح دکھادی، اور جب انہوں نے نافرمانی کی تو اس کے بعد ان پر آزمائش اور بلا کو مسلط کر دیا۔

اور عمر بن اسحاق نے کہا ہے: جب احد کا دن تھا وہ رسول اللہ ﷺ سے بکھر گئے اور حضرت سعد آپ کے سامنے تیر پھینک رہے تھے اور ایک نوجوان انہیں تیر پکڑا رہا تھا جب بھی کوئی تیر چلا جاتا تو وہ تیر انہیں دیتا۔ اور کہتا: اے ابا اسحاق! تیر چلاؤ۔ پس جب فارغ ہوئے انہوں نے دیکھا وہ جوان کون ہے؟ تو نہ انہوں نے اسے دیکھا اور نہ اسے پہچانا۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: جب مشرکوں کا علمبردار قتل ہو گیا اور ان کا جھنڈا گر گیا، تو اسے عمرہ بنت علقمہ حارثیہ نے اٹھایا تھا۔ اس بارے میں حضرت حسان کہتے ہیں:

فَلَوْلَا لَوَاءُ الْحَارِثِيَّةِ أَصْبَحُوا يَبَاعُونَ فِي الْأَسْوَاقِ بَيْنَ الْجَلَّابِ

پس اگر عمرہ حارثیہ کا جھنڈا نہ ہوتا تو انہیں بازاروں میں سامان تجارت کی طرح فروخت کر دیا جاتا۔

اور **تَحُسُّونَهُمْ** کا معنی ہے تم انہیں قتل کر رہے تھے اور تم ان کا نام و نشان مٹا رہے تھے۔

شاعر نے کہا ہے:

حَسَنَاهُمْ بِالسَّيْفِ حَسًّا فَأَصْبَحَتْ بَقِيَّتُهُمْ قَدْ شَرِدُوا أَوْ تَبَدَّدُوا

ہم نے تلوار کے ساتھ ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے پس ان کے بقیہ رہنے والوں کو بھگا دیا گیا ہے یا وہ بکھر گئے ہیں۔

اور جریر نے کہا ہے:

تَحُسُّهُمْ السَّيْفُ كَمَا تَسَامَى حَرِيقُ النَّارِ فِي الْأَجْمِ الْحَصِيدِ

اس میں بھی **تَحُسُّهُمْ** کلی طور پر ختم کر دینے اور نام و نشان مٹا دینے کے معنی میں ہے۔

ابو عبید نے کہا ہے: **الْحَسُّ** کا معنی ہے قتل کے ساتھ ہلاک و برباد کر دینا (1)، کہا جاتا ہے: جواد محسوس جب سردی سے قتل اور تباہ کر دے۔ اور **البرد محسۃ للنبت** یعنی سردی نباتات کو جلا کر ختم کر دینے والی ہے۔ اور **سَنَّةٌ حَسُوسٌ** یعنی خشک سالی ہر شے کو کھا جاتی ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے:

إِذَا شَكُونَا سَنَةً حَسُوسًا تَاكُلُ بَعْدَ الْأَحْضَرِ الْيَبْسَا

جب ہم شکوہ کرتے خشک سالی کا جو کہ سبزی کے بعد خشکی کو بھی کھا جاتی ہے اور اس کی اصل الحس سے ہے جس کا معنی ہے حاسہ کے ساتھ کسی شے کا ادراک کرنا۔ پس **حَسَّةٌ** کا معنی ہے اس نے اس کی حس کو قتل کے سبب ختم کر دیا۔ **بِإِذْنِهِ** یعنی اللہ تعالیٰ کے علم سے یا اس کی قضا اور امر سے۔ **حَقَّى إِذَا فُتِلْتُمْ** یعنی جب تم بزدل ہو گئے اور تم کمزور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: **فُتِلَ**

يَفْشَلُ فَهُوَ فَاشِلٌ وَفَشَلٌ - اور حَتَّى کا جواب محذوف ہے ای حَتَّى اذا فُشِلْتُمْ امْتَحِنْتُمْ۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے تو تم امتحان میں ڈال دیئے گئے) اور اس کی مثل جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَيْمًا فِي السَّمَاءِ (الانعام: 35) فافعل۔ (تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیرھی آسمان میں) (تو اس پر چڑھ جاؤ)

اور فرما نے کہا ہے: حَتَّى کا جواب وَتَنَازَعْتُمْ ہے اور واؤ مَقْبَحَہ زائدہ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے فَلَمَّا اسْلَمْنَا وَتَلَّهَ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ اِی نَادِیْنَاهُ (یعنی اس میں بھی واؤ مقمّمہ زائدہ ہے) اور امرؤ القیس نے کہا ہے:

فَلَمَّا اَجَزْنَا سَاحَةَ الْحَيِّ وَاتَّحَى اِی اتَّحَى

اس میں بھی واؤ زائدہ ہے۔ اور ان کے نزدیک وَعَصَيْتُمْ میں بھی واؤ کو مقمّمہ قرار دینا جائز ہے۔ یعنی حَتَّى اذا فُشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ عَصَيْتُمْ۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے) (رسول کے) حکم کے بارے میں تو تم نے نافرمانی کی۔) اور اس بنا پر اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی حَتَّى اذا تَنَازَعْتُمْ وَعَصَيْتُمْ فُشِلْتُمْ (یہاں تک کہ جب تم جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو تم بزدل ہو گئے۔)

اور ابو علی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ جواب صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ ہو، اور ثُمَّ زائدہ ہو، اور تقدیر کلام یہ ہو حَتَّى اذا فُشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ وَعَصَيْتُمْ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو اس نے تم کو ان سے پھیر دیا۔)

اور بعض نحویوں نے اس کے زائدہ ہونے میں شاعر کا قول بیان کیا ہے:

أَرَانِي إِذَا مَا بَيْتٌ عَلَى هَوًى فَشِمٌ إِذَا أَصْبَحْتُ أَصْبَحْتُ عَادِيَا

اور خفش نے اس کے زائدہ ہونے کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنْ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمُ (التوبة: 118) (یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجہ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ سے مگر اسی کی ذات۔ تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حَتَّى بمعنی الی ہے اور اس وقت اس کا کوئی جواب نہ ہوگا، یعنی صدقکم اللہ وعدہ الی ان فُشِلْتُمْ، (اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دیا یہاں تک کہ تم بزدل ہو گئے) یعنی وہ وعدہ ثابت قدم رہنے کی شرط کے ساتھ تھا۔ اور تَنَازَعْتُمْ کا معنی ہے اختلفتم (تم اختلاف کرنے لگے) یعنی اس وقت تیر اندازوں میں سے بعض نے کہا: ہم غنائم کو جاملیں گے (یعنی مال غنیمت جمع کریں گے) اور بعض نے کہا: بلکہ ہم تو اسی جگہ ثابت قدم رہیں گے جہاں ثابت رہنے کا حضور نبی مکرم ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

قِرْنُ بَعْدَ مَا أَلَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ یعنی وہ غلبہ جو احد کے دن مسلمانوں کو ابتدائی مرحلہ میں ہی حاصل : گیا، اور یہ اس وقت

حاصل ہوا جبکہ مشرکین کا علمبردار پچھاڑ (قتل کر) دیا گیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اور اسے جو نہی قتل کیا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب منتشر ہو گئے اور وہ متفرق گروہوں میں بٹ گئے اور انہوں نے دشمن پر شدید حملے کئے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں اپنے ساز و سامان سے محروم کر دیا۔ اور مشرک گھوڑ سواروں نے مسلمانوں پر تین بار حملہ کیا ہر بار تیروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا گیا پس وہ مغلوب ہو کر واپس لوٹے اور مسلمانوں نے حملہ کیا اور انہوں نے ان کو خوب قتل کیا۔ پس جب پچاس تیر اندازوں نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بھائیوں کو فتح عطا فرمادی ہے تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! ہم یہاں کسی کام کے لئے نہیں بیٹھے رہیں گے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے اور ہمارے بھائی مشرکوں کے لشکر میں ہیں۔ اور ان میں سے کچھ گروہوں نے کہا: ہم کیونکر ٹھہرے رہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دو چار کر دیا ہے؟ چنانچہ انہوں نے اپنے ان مقامات کو چھوڑ دیا جن کے بارے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ انہیں قطعاً نہ چھوڑیں۔ اور وہ آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور بزدل ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی پس گھوڑ سوار تیز رفتاری کے ساتھ قتال کرتے ہوئے ان میں آپہنچے۔ آیت کے الفاظ ان کے لئے زجر و توبیخ کا تقاضا کرتے ہیں، اور ان کو جھڑکنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مدد و نصرت کی مبادی کو دیکھ لیا تھا، پس ان کے لئے یہ جاننا واجب تھا کہ فتح و نصرت کی تکمیل ثابت قدم رہنے میں ہے نہ کہ انہزام میں، پھر جھگڑے کا سبب بیان کیا اور فرمایا: مِنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا تَمَّ مِنْ بَعْضِ دُنْيَا يَعْنِي مَالٍ غَنِيْمَتِ كَيْدِ الْغُلَبَاةِ۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم نہیں جانتے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی دنیا اور اس کے ساز و سامان کی خواہش رکھتا ہے یہاں تک کہ احد کا دن آ گیا (تب ہمیں اس کا احساس ہوا) وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ اور تم میں سے بعض آخرت کے طلبگار ہیں (1) اور وہ وہ ہیں جو اپنے مرکز میں ثابت قدم رہے، اور انہوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بارے میں اپنے امیر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مخالفت نہ کی، اور خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل نے ان پر حملہ کر دیا، اس وقت یہ دونوں کافر تھے اور انہوں نے آپ کو اپنے باقی ساتھیوں سمیت شہید کر دیا۔ رحمہم اللہ۔

ان پر عملہ کر دیا، اس وقت یہ دونوں کامرے کے چاروں طرف بکھیر دیے گئے۔

اور یہ عتاب ان کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنے مقام کو چھوڑا نہ کہ ان کے ساتھ جو ثابت قدم رہے کیونکہ جو ثابت رہے وہ تو ثواب کے ساتھ کامیاب و کامران تھے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے جب کسی قوم پر عام عذاب نازل ہو تو نیکوکار اور بچے بھی ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن جو ان پر نازل ہوا وہ عذاب اور سزا نہیں ہوتی بلکہ ان کے لئے اجر و ثواب کا سبب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ہو جائے ہیں۔ ان جوان پرماروں کو وہ عذاب اور سزا میں سے اس لئے بچا دیا کہ ان کے لئے یہ آیت نازل ہوئی تھی۔
 قولہ تعالیٰ: ثُمَّ صَرَفْنَا عَنْهُمْ كَيْدَهُنَّ لِيُتْلِيَ الْكُفْرُ الْكُفْرَ (پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ تمہیں آزمائے) یعنی اس کے بعد کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر چکے تھے تمہیں ان سے ناکامی کے ساتھ واپس لوٹا دیا اور یہ اس پر دلیل ہے کہ معصیت اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور معتزلہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے پھر تم واپس لوٹ آئے، انصاف تم، پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت کافروں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب اور خوف نکالنے کے اعتبار سے ہے مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالنے کے لئے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ کافروں کے دلوں سے رعب اور خوف نکالنا یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کو

حقیر سمجھنے لگیں قبیح اور برا ہے اور ان کے نزدیک بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبیح (فعل) واقع ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا کوئی معنی باقی نہ رہے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا معنی ہے اس نے تمہیں ان کی طلب اور تعاقب کا پابند نہیں بنایا۔

قرآن تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ یعنی اس نے تمہیں معصیت اور مخالفت کے بعد ہلاک اور تباہ نہیں کیا۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب تمام کے لئے ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ان تیر اندازوں کے لئے ہے جنہوں نے اس حکم کی مخالفت کی جو انہیں دیا گیا۔ اسے نحاس نے اختیار کیا ہے اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: اس آیت کی نظیر یہ قول ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ (البقرہ: 52) (پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے) وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اور اللہ تعالیٰ عفو و مغفرت کے ساتھ مومنوں پر فضل و کرم فرمانے والا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی جگہ ایسی مدد نہیں کی گئی جیسی احد کے دن مدد کی گئی، فرمایا: اور ہم نے اس کا انکار کیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میرے اور اس کے درمیان جس نے انکار کیا یہ کتاب اللہ ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ یوم احد کے بارے فرماتا ہے: وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِآذُنِهِ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ الحش سے مراد قتل کرنا ہے۔ حَتَّىٰ إِذَا فُشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِمَّا بَعْدَ مَا أَرْسَلَكُمْ مَّا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ⑤ بلاشبہ اس سے مراد تیر انداز ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک جگہ میں کھڑا کیا پھر ارشاد فرمایا: ”تم ہماری پشتوں کی حفاظت کرو پس اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم قتل کر رہے ہیں تو تم ہماری مدد نہ کرنا اور اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم مال غنیمت اکٹھا کر رہے ہیں تو تم ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا۔“ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہو گئے اور مشرکین کے لشکر کو مباح قرار دیا تو تمام تیر انداز واپس لوٹ آئے اور لشکر میں داخل ہو گئے اور مال غنیمت لوٹنے لگے، تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی صفیں جڑ گئیں، پس وہ اس طرح ہو گئے اور آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کا جال بنایا..... اور وہ آپس میں مل گئے (یعنی خلط ملط ہو گئے) پس جب تیر اندازوں نے اس درہ کو خالی کر دیا جس میں وہ تھے تو گھوڑ سوار اسی راستے سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر داخل ہو گئے اور بعض نے بعض کو مارا اور آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ اور مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ شہید ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لئے ابھی دن کی ابتدا تھی یہاں تک کہ مشرکین کے سات یا نو علمبردار قتل کر دیئے گئے اور مسلمان پہاڑ کی طرف چلے گئے، اور وہ وہاں تک نہ پہنچے جسے لوگ الغار کہتے ہیں، بلاشبہ وہ مہراں (جبل احد کے ساتھ پانی کا چشمہ) کے نیچے رہے اور شیطان چیخ اٹھا: قتل محمد (ﷺ) (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا) اور اس میں کوئی شک نہ کیا گیا کہ وہ حق اور سچ ہے۔ پس ہم اسی طرح رہے اور ہم آپ کے شہید ہونے کے بارے شک نہ کرتے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو سعدوں (حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ) کے درمیان ہم پر ظاہر ہوئے جب آپ چلے تو ہم آپ

کو اپنے قدموں کی طرف جھکنے کے سبب پہچان گئے۔ تو ہم اتنا خوش ہوئے گویا ہمیں (اس میں سے) کوئی مصیبت پہنچی ہی نہیں جو مصیبت ہمیں آئی تھی۔ راوی نے بیان کیا: پس آپ ﷺ ہماری طرف چڑھے اور آپ فرما رہے تھے: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہو جنہوں نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلود کیا (1)۔ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: مسلمانوں میں سے سب سے پہلے میں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا تھا، میں نے آپ ﷺ کو آپ کی آنکھوں سے پہچانا تھا جو خود کے نیچے سے روشن اور ظاہر تھیں تو میں نے اپنی بلند آواز سے ندا لگائی: اے مسلمانوں کے گروہ! تمہیں بشارت ہو یہ رسول اللہ ﷺ ہیں آپ تشریف لائے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے میری طرف اشارہ کیا کہ تو خاموش رہ۔

إِذْ تَصْعَدُونَ وَلَا تَكُونُوا عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أَخْرَجِكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍ

لِكَيْ لَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۖ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٧﴾

”یاد کرو جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے کسی کو اور رسول کریم (ﷺ) بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے پس اللہ نے پہنچایا تمہیں غم کے بدلے غم تاکہ تم نہ غمگین ہو اس چیز پر جو کھو گئی ہے تم سے اور نہ اس مصیبت پر جو پہنچی ہے تمہیں اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔“

إِذْ قَوْلَ بَارِي تَعَالَى: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ عام قرأت تَصْعَدُونَ تا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ابو رجا العطار دی، ابو عبد الرحمن سلمی، حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے تا اور عین دونوں کو مفتوح پڑھا ہے (2) یعنی تَصْعَدُونَ الجبل (تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے)۔ ابن محیسن اور شبل نے اذ یصعدون ولا یلدون دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن نے تَكُونُوا ایک واو کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو بکر بن عیاش نے عاصم سے وَلَا تَكُونُوا تا کو ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ لغت شاذہ ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: اصعدت (کہا جائے گا) جب تو اپنے چہرے کو پھیرتے ہوئے گزر جائے، اور صعدت (کہا جاتا ہے) جب تو پہاڑ یا کسی اور پر چڑھے، بلند ہو (3)۔

پس الاصعاد کا معنی ہموار زمین میں اور وادیوں اور گھاٹیوں کے بطن میں چلنا ہے اور الصعود کا معنی پہاڑوں، چھتوں، سیڑھیوں اور راستوں پر چڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان کا پہاڑ پر چڑھنا وادی میں چلنے کے بعد ہو، پس تَصْعَدُونَ اور تَصْعَدُونَ دونوں قرأتوں کے مطابق معنی صحیح ہوگا۔

حضرت قتادہ اور حضرت ربیع نے بیان کیا ہے کہ وہ احد کے دن وادی میں چلے۔ اور حضرت ابی کی قرأت اِذْ تَصْعَدُونَ فی الوادی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ احد میں فرار ہو کر چڑھے۔ نتیجتاً دونوں قرأتیں صحیح ہیں، اس دن شکست کھانے والے چلنے اور چڑھنے والے تھے۔ واللہ اعلم۔

مبرداور قتی نے کہا ہے: اصعد کا معنی ہے جب وہ جانے میں خوب دور ہو جائے (4)، پس اصعاد زمین میں خوب دور

1۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب تفسیر باب آل عمران، جلد 2، صفحہ 325-324، دار الکتب العلمیہ

4۔ ایضاً

3۔ ایضاً

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 567

چلے جانے کو کہتے ہیں اور یہ بلندی کی جانب خوب چڑھنے کی طرح ہے۔
شاعر نے کہا ہے:

ألا أيهذا السائل أين أصدت فإن لها من بطن يثرب موعدا

خبردار! اے مجھ سے سوال کرنے والے تو کہاں دور چلا گیا ہے کیونکہ اس کے لئے وادی یثرب جائے وعدہ ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اصعاد کا معنی سفر کو شروع کرنا اور اس کا آغاز کرنا ہے اور انحدر کا معنی سفر سے واپس لوٹنا ہے، کہا جاتا ہے: اصعدنا من بغداد الى مكة والى خراسان اور اسی کے مشابہ جبکہ ہم اس کی طرف نکلیں اور سفر شروع کر دیں۔ اور انحدرنا جب ہم واپس لوٹیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے:

قد كنت تبكين على الاصعاد فاليوم مبرحت و صاح الحادي

اس میں اصعاد سفر شروع کرنے کے معنی میں ہے۔

اور مفضل نے کہا ہے: صعد، اصعد اور صعدتینوں کا معنی ایک ہے (1) اور تلودن کا معنی ہے تعزجون و تقيسون، یعنی تم میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بھاگتے ہوئے (یعنی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تک نہیں۔) کیونکہ کسی شے کی طرف متوجہ ہونے والا اس کی طرف اپنی گردن کو موڑتا ہے یا اپنی سواری کی لگام کو موڑتا ہے۔ علیٰ آحاد مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، کلبی نے یہی کہا ہے۔ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِيْ اٰخِرِكُمْ اى فى اٰخِرِكُمْ (اور رسول اللہ ﷺ تمہیں پیچھے سے بلا رہے تھے) کہا جاتا ہے: جاء فلان فى آخر الناس أخررة الناس و آخرى الناس و أخريات الناس (یعنی فلاں لوگوں کے آخر میں آیا، پیچھے آیا) اور بخاری میں ہے اٰخِرِكُمْ آخر کم کی تائید ہے: عمرو بن خالد، زہیر اور ابو اسحاق نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے سنا انہوں نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم ﷺ نے احد کے دن کچھ لوگوں پر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور وہ بھاگ کر آگئے جبکہ ان کے پیچھے رہ کر رسول اللہ ﷺ ان کو بلاتے رہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ سوائے بارہ افراد کے کوئی باقی نہ رہا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم ﷺ کی یہ پکار منکر (گناہ) کو تبدیل کرنے کے لئے تھی، کیونکہ یہ محال ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ منکر جو کہ بھاگتا ہے کو دیکھیں اور پھر اس سے منع نہ کریں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس بنا پر ہے کہ انہزام معصیت ہو اور اس طرح ہے نہیں، اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔
قولہ تعالیٰ: فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمِّ لَعْنَةٍ میں غم کا معنی ہے التغطية (ڈھانپنا) غمت الشئ کا معنی ہے میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ اور يوم غم و ليلة غمة (کہا جاتا ہے) جبکہ دن اور رات دونوں تاریک ہوں اور اسی سے غم الهلال بھی ہے جب چاند دکھائی نہ دے، اور غمتی الامر يغتمنى (کام نے مجھے ڈھانپ لیا) یعنی مجھ پر غالب آگیا۔
حضرت مجاہد اور قتادہ وغیرہ نے کہا ہے: پہلا غم تو مقتول ہونا اور زخمی ہونا تھا، اور دوسرا غم حضور نبی کریم ﷺ کی شہادت

کی خبر نے ان میں اضطراب پیدا کر دیا، جبکہ شیطان نے اس کے بارے چچ کر کہا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: پہلا غم وہ ہے جو فتح و کامرانی اور مال غنیمت ان سے کھو گیا اور دوسرا وہ جو قتل اور ہزیمت کا انہیں سامنا ہوا۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ پہلا غم ہزیمت ہے، اور دوسرا ابوسفیان اور خالد بن ولید کا ان پر پہاڑ سے جھانکنا ہے۔ پس جب مسلمانوں نے ان کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں غمزدہ کر دیا، اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان پر جھانک رہے ہیں اور وہ انہیں قتل کریں گے پس اس نے انہیں وہ کچھ بھلا دیا جو انہیں حاصل ہوا تھا، تو اس وقت حضور نبی مکرم ﷺ نے یہ دعا مانگی: اللّٰهُمَّ لَا يَعْلُنْ عَلَيْنَا (اے اللہ! کوئی ہم پر غالب نہ آئے) جب کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس بنا پر بغیم میں با بمعنی علیٰ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اپنے باب (اصل معنی) پر ہے اور معنی یہ ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو اپنی مخالفت کے سبب غمزدہ کیا پس اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں غم پہنچایا اس غم کے بدلے جو ان کی طرف سے آپ ﷺ کو پہنچایا گیا۔ اور حسن نے کہا ہے: فَأَثَابَكُمْ غَمًّا پس اللہ تعالیٰ نے تمہیں احد کے دن غم پہنچایا بغیم اس کے بدلے جو غم بدر کے دن مشرکین کو پہنچا۔ اور غم کو ثواب کا نام دیا گیا ہے جس طرح کہ گناہ کی جزا کو ذنب کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہ پر آگاہ کر دیا پس وہ اس کے سبب اس مصیبت میں مشغول ہو گئے جو انہیں پہنچی تھی۔ قوله تعالیٰ: تَكِيلًا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾ اس میں لام قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بغیم کے متعلق ہے یعنی یہ غم اس غم کے بعد تھا تا کہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو مال غنیمت تم سے کھو گیا، اور نہ اس مصیبت پر جو ہزیمت اور شکست کی صورت میں انہیں پہنچی۔

پہلا قول زیادہ اچھا ہے اور قول باری تعالیٰ: مَا أَصَابَكُمْ میں مَا محل جر میں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لہلہ ہے۔ یعنی لکی تحزنوا علی ما فاتکم و ما اصابکم عقوبة لكم علی مخالفتکم رسول اللہ ﷺ۔ (تا کہ تم اس پر غمگین نہ ہو جو تم سے (مال غنیمت) کھو گیا اور جو مصیبت تم کو پہنچی اس بنا پر کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی)

اور یہ اس قول کی مثل ہے: مَا مَنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ (الاعراف: 12) ای آن تسجد (کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے) اور اس قول کی مثل ہے لَمَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ (الحديد: 29) ای لیعلم (تم پر یہ خصوصی کرم اس لئے کیا تا کہ جان لیں اہل کتاب) یہ مفضل کا قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بغیم سے مراد یہ ہے کہ تم پر لگا تا غم آئے تا کہ تم اس کے بعد غنائم کے بارے میں (کسی فکر میں) مشغول نہ ہو۔ وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ اس میں تحذیر اور وعید کا معنی ہے۔

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنَةً نُّعَاسًا يَّغْشَى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ

يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قَتَلْنَا هَٰؤُلَاءِ قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ
الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ
وَلِيُمَخِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥٠﴾

”پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر غم و اندوہ کے بعد راحت (یعنی) غنودگی جو چھارہ ہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے اور ایک جماعت ایسی تھی جسے فکر پڑا ہوا تھا (صرف) اپنی جانوں کا بدگمانی کر رہے تھے اللہ کے ساتھ بلا وجہ عہد جاہلیت کی بدگمانی، کہتے: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے آپ فرمائیے: اختیار تو سارا اللہ کا ہے چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر۔ کہتے ہیں: (اپنے دلوں میں) اگر ہوتا ہمارا اس کام میں کچھ دخل تو نہ مارے جاتے ہم یہاں (اس بے دردی سے) آپ فرمائیے کہ اگر تم (بیٹھے) ہوتے اپنے گھروں میں تو ضرور نکل آتے۔ (وہاں سے) وہ لوگ، لکھا جا چکا ہے جن کا قتل ہونا اپنی قتل گاہوں کی طرف (یہ سارے مصائب اس لئے تھے) تاکہ آزمائے اللہ تعالیٰ جو کچھ تمہارے سینوں میں (چھپا) تھا اور صاف کر دے جو (میل کچیل) تمہارے دلوں میں تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کا۔“

قولہ تعالیٰ: لَمْ أَنْزَلْ عَلَيْهِمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنَةً نُعَاسًا، أَمْنَةً اور أَمْنٌ دونوں مساوی اور ہم معنی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ أَمْنَةً (راحت) اسباب خوف کے ساتھ ہوتی ہے، اور امن خوف نہ ہونے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ (أَمْنَةً) منصوب ہے۔ أَنْزَلَ کے سبب، اور نُعَاسًا اس (أَمْنَةً) سے بدل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے مفعول لہ کی بنا پر نصب دی گئی ہے، گویا کہ یہ کہا ہے: انزل علیکم للأمنۃ نعاسًا، (پھر تم پر راحت کے لئے غنودگی اتاری)۔ ابن محیسن نے أَمْنَةً میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احد کے دن ان غموں کے بعد مومنین پر غنودگی کے ساتھ فضل و احسان فرمایا یہاں تک کہ ان میں سے اکثر سو گئے، بلاشبہ سوتا وہی ہے جو امن و سکون میں ہوتا ہے اور خوفزدہ آدمی سو نہیں سکتا۔ بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے اوپر غنودگی اور نیند طاری ہو گئی احد کے دن حالانکہ ہم اپنی صفوں میں تھے، انہوں نے بیان کیا: پس میری تلوار میرے ہاتھ سے گرنے لگتی تو میں اسے اٹھا لیتا اور کبھی وہ گر جاتی اور میں اسے اٹھا لیتا۔ (1)

يَقْنِيهِمْ اَسَ تَاوِيَا دُونُوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اگر یا کے ساتھ ہو تو ضمیر کا مرجع نعاس ہوگا، اور اگر تَا کے ساتھ ہو تو ضمیر کا مرجع امنۃ ہوگا۔ اور الطائفة کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ وَطَآءُ قَدْ أَهْتَتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ مراد منافقین ہیں یعنی معتب بن قشیر اور اس کے ساتھی، وہ مال غنیمت کے طمع اور مومنین کے خوف میں نکلے تو نیند ان پر طاری نہ ہوئی اور وہ اپنی حاضری پر تاسف کرنے لگے، اور وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے اور وَطَآءُ قَدْ أَهْتَتْهُمْ کا معنی ہے اس نے انہیں غم پر ابھارا

اور غم وہ ہے جس کا قصد کیا گیا، کہا جاتا ہے: اُھتَنِی الشَّيْءُ یعنی وہ میرا غم اور فکر ہے اور اَمْرٌ مِھُمْ: انتہائی سخت اور شدید معاملہ۔ اور اُھتَنِی الامر۔ اَمْرٌ نے مجھے غم اور اضطراب میں ڈال دیا، اور اُھتَنِی کا معنی ہے اذابنی اس نے مجھے پگھلا دیا۔ اور وَ طَائِفَةٌ مِّنْ وَّ اَوْ حَالِیہ ہے اور بمعنی اذ ہے۔ یعنی اذ طَائِفَةٌ یَظُنُّونَ جبکہ ایک جماعت بدگمانی کرنے لگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امر باطل ہے اور یہ کہ ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ ظَنُّ الْجَاهِلِیَّةِ یعنی اہل جاہلیت کی بدگمانی۔ اور اس سے مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

یَقُولُونَ هَلْ لَّنَا مِّنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اس میں لفظ استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے، یعنی مَا لَنَا شَیْءٌ مِنَ الْاَمْرِ، (ہمارا اس کام میں کوئی دخل نہیں) یعنی خروج کے معاملہ میں، بلاشبہ ہمیں تو بالا کراہ نکالا گیا ہے، اور اس پر ان کی طرف سے بطور خبر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: لَوْ كَانَ لَنَا مِّنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَا قُتِلْنَا هُنَا (اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں (اس بے دردی سے) نہ مارے جاتے۔) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس دن ہم پر نیند طاری کر دی گئی، اور میں معتب بن قشیر کا قول سن رہا تھا حالانکہ مجھ پر نیند غالب آرہی تھی وہ کہہ رہا تھا: اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں (اس بے دردی کے ساتھ) نہ مارے جاتے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے قول کا معنی یہ ہے ہمیں اس کامیابی میں سے کچھ حاصل نہیں ہوا جس کا وعدہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

قَوْلُهُ تَعَالٰی: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ ابو عمرو اور یعقوب نے کُلُّہ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ مبتدا ہے اور اللہ اس کی خبر ہے۔ اور پھر پورا جملہ اس کی خبر ہے۔ اور یہ اس قول کی طرح ہے: وَ یَوْمَ الْقِیَمَةِ تَرٰی الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلٰی اللّٰهِ وَ جُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ (الزمر: 60) (اور روز قیامت آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے)

اور باقیوں نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ان الامر اجمع للہ، اور یہ تاکید ہے اور یہ احاطہ اور عموم میں اجمع کے معنی میں ہے، اور اجمع صرف توکید کے لئے ہی ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ امر کی صفت ہے اور اخفش نے کہا ہے: یہ بدل ہے یعنی مدد و نصرت اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کی مدد کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے رسوا کر دیتا ہے، اور جویر نے ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ یُظَنُّونَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنُّ الْجَاهِلِیَّةِ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس سے مراد تقدیر کو جھٹلانا ہے (2) اور یہ اس لئے کہ انہوں نے اس بارے میں کلام کیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ یعنی اچھی اور بری تقدیر سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یُخَفُّونَ فِیْ اَنْفُسِهِمْ یعنی وہ چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں شرک، کفر اور تکذیب۔ مَا لَا یُھْدُوْنَ لَکَ وہ جو تمہارے لئے ظاہر نہیں کرتے۔ یَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِّنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَا قُتِلْنَا هُنَا یعنی (اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا) تو ہماری جماعت قتل نہ کی جاتی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: منافقین کہتے اگر ہماری عقل ہوتی تو ہم اہل مکہ کے ساتھ جنگ کے لئے نہ نکلتے، اور نہ ہمارے سردار قتل کئے جاتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ جواب لوٹایا اور کہا: قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ ھِیْؤَتِکُمْ

لَبَّوْذَآ اٰپ فرمائیے: اگر تم اپنے گھروں میں (بیٹھے) ہوتے تو (وہاں سے) ضرور نکل آتے (وہ لوگ) الَّذِیْنَ کُتِبَ جَن کے بارے لکھا جا چکا ہے (یعنی جن کا مقدر بنا دیا گیا ہے) عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ قتل یعنی لوح محفوظ میں۔ الی مضا جمعہم یعنی اپنی قتل گاہوں کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ یعنی ان پر قتال (جنگ) فرض کیا گیا ہے پس اسے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ اسے اس کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔

ابو حیوہ نے لَبِئْذَہٗ کے ضمہ اور را کی شد کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی يُجْعَلُ یخرج (انہیں نکال لیا جائے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اے منافقین! اگر تم پیچھے رہ جاتے تو تم اس کے علاوہ کسی دوسرے میدان جنگ کی طرف نکل پڑتے اس میں تم قتل کر دیئے جاؤ گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آزمائے گا جو کچھ سینوں میں چھپا ہوا ہے اور اسے مومنین کے لئے ظاہر کر دے گا۔

اور قول باری تعالیٰ وَلَيَبْتَلِيَنَّ میں واؤ مقمہ ہے جیسا کہ اس قول میں ہے: وَلَيَكُونَنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ یعنی لیکن۔ اور اس فعل کو حذف کر دیا گیا ہے جو لام کئی کے ساتھ ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے وَلَيَبْتَلِيَنَّ اللّٰهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلَيُمَحِّصَنَّ مَا فِي قُلُوبِكُمْ اللّٰهُ تعالیٰ نے تم پر قتال اور جنگ مقدر کر دی ہے اور احد کے دن اس نے تمہاری مدد نہیں کی تاکہ وہ تمہارے صبر کو آزمائے۔ اور تم سے تمہارے گناہ معاف کر دے اگر تم توبہ کرو اور مخلص ہو جاؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَيَبْتَلِيَنَّ کا معنی ہے تاکہ وہ تمہارے ساتھ مختبر کا معاملہ کرے۔ اور بعض نے کہا ہے: تاکہ تم سے مشاہدہ واقع ہو جس کا اسے غیباً علم ہے۔ اور کہا گیا ہے: یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے۔ و تقدیر عبارت ہے لَيَبْتَلِيَنَّ اولیاء اللّٰہ تعالیٰ۔ تاکہ وہ اولیاء اللّٰہ کو آزمائے۔ اور تمحیص کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ یعنی سینوں میں خیر و شر میں سے جو ہے (اللّٰہ اسے جانتا ہے) اور یہ قول بھی ہے: کہ ذات الصدور سے مراد سینے ہی ہیں، کیونکہ ذات الشئ سے مراد اس کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ ۖ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٥٥﴾

”بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم سے اس روز جب مقابلہ میں نکلے تھے دونوں لشکر تو پھسلادیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے اور بے شک (اب) معاف فرما دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں یقیناً اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے۔“

قوله تعالى: اِنَّمَا اسْتَزَلْتُمُ الشَّيْطٰنُ بَعْضَ مَا كَسَبُوْا يه جملہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا کی خبر ہے۔ اور مراد وہ ہیں جو مشرکین سے احد کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ حضرت سدی نے کہا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو ہزیمت کے وقت مدینہ طیبہ کی طرف بھاگ گئے نہ کہ وہ جو پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اس قوم کے ان معین افراد کے بارے ہے جو اپنی ہزیمت کے وقت میں تین دن تک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے اور پھر لوٹ گئے۔ اور اسْتَزَلْتُمُ الشَّيْطٰنُ کا معنی ہے شیطان نے ان کے پھسلنے کا تقاضا کیا اس طرح کہ انہیں ان کی گزشتہ خطائیں یاد دلائیں، تو وہ ثابت رہنے پر مجبور ہو گئے تاکہ وہ قتل نہ کر دیئے جائیں۔ اور بَعْضَ مَا كَسَبُوْا کا یہی معنی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اُسْتَزَلُّهُمْ کا معنی ہے۔ اس نے انہیں پھسلاہٹ پر ابھارا، یہ باب استفعال ہے اور الزلۃ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی خطا اور گناہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زَلَّ اور اَزَلَّ دونوں کا معنی ایک ہے۔ پھر کہا گیا: انہیں اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے سے پہلے قتال (جنگ) پر مجبور کیا گیا تو اسی وجہ سے وہ پیٹھ پھیر گئے۔ یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق یہ ہے کہ انہوں نے مرکز کو چھوڑ کر اور مال غنیمت کی طرف مائل ہو کر حضور نبی مکرم ﷺ کی نافرمانی کی۔

اور حسن نے کہا ہے: مَا كَسَبُوا (یعنی اس کے عوض) جو انہوں نے ابلیس کا قول قبول کیا جو اس نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔ اور کلبی نے کہا ہے: شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال آراستہ اور مزین کئے اور یہ قول بھی ہے کہ انہمازم معصیۃ نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے مدینہ منورہ میں قلعہ بند ہونے کا ارادہ کیا، پس دشمن نے ان میں اپنا طمع اور حرص ختم کر دی جب انہوں نے یہ سن لیا کہ حضور نبی مکرم ﷺ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ کہا جانا بھی جائز ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کی پکار کو اس خوف کی وجہ سے سنا ہی نہیں جس خوف اور ڈر میں وہ مبتلا تھے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ دشمن کی تعداد کئی گناہ زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ سات سو تھے اور دشمن کی تعداد تین ہزار تھی۔ اور ایسی حالت میں بھاگنا جائز ہوتا ہے، لیکن نبی کریم ﷺ سے بھاگنا خطا اور گناہ ہے جو جائز نہیں ہے۔ اور شاید انہیں یہ وہم بھی ہو گیا کہ حضور نبی مکرم ﷺ پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ ان میں سے پہلا قول احسن ہے۔ المختصر اگر معاملہ کو ثابت شدہ گناہ پر محمول کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا ہے۔ اور اگر اسے انہمازم جائز پر محمول کیا جائے تو آیت ان کے بارے میں ہے جو ہزیمت سے بہت دور ہیں اور اتنی مقدار پر زائد ہے جو جائز قرار دی گئی ہے۔ ابواللیث سمرقندی نصر بن محمد بن ابراہیم نے کہا ہے: خلیل بن احمد، سراج، قتیبہ، ابوبکر بن غیلان نے جریر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مابین گفتگو ہوئی، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: کیا تم مجھے برا بھلا کہتے ہو حالانکہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، اور میں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی (یعنی بیعت رضوان میں میں حاضر تھا۔) اور تم نے بیعت نہیں کی۔ اور احد کے دن تم نے بھی پیٹھ پھیرنے والوں کے ساتھ پیٹھ پھیر لی تھی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیتے ہوئے فرمایا: جہاں تک تمہارا یہ قول ہے کہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، تو میں کسی ایسے کام سے غائب نہیں ہوا جس میں رسول اللہ ﷺ حاضر ہوئے ہوں، مگر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی بیمار تھی اور میں ان کے پاس ان کی حیار داری کے لئے رہا، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے مسلمانوں کے حصص کے ساتھ برابر کا حصہ دیا اور رہا بیعت الشجرہ کا مسئلہ تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے مشرکین مکہ کے پاس بطور سفیر بھیجا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر مارا اور فرمایا ہذا لعثمان یہ عثمان کے لئے ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کا دایاں اور آپ کا بایاں میرے دائیں اور بائیں سے میرے لئے انتہائی بہتر ہے اور رہا یوم الجمع (احد کادن) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ تُوِثِّمُ بھي ان میں بھی ان میں شامل ہو گیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ نتیجتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دلیل سے غالب آ گئے۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ معنی صحیح ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے انہوں نے بیان کیا: عبدان، ابو حمزہ نے عثمان بن مویب سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: ایک آدمی آیا اور اس نے بیت اللہ شریف کا حج کیا تو اس نے ایک قوم کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس نے پوچھا: یہ بیٹھنے والے لوگ کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا: یہ قریش ہیں۔ اس نے پوچھا: شیخ کون ہے؟ انہوں نے بتایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، پس وہ ان کے پاس آیا اور کہا: میں ایک شے کے بارے تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا مجھے بتاؤ گے؟ اس نے کہا: میں تجھے اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں، کیا تم یہ جانتے ہو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ احد کے دن فرار ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے کہا: کیا آپ ان کے بارے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بدر کے دن بھی میدان سے غائب تھے وہ اس میں حاضر نہیں ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

پھر اس نے پوچھا: کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بیعت رضوان سے بھی پیچھے رہ گئے اور اس میں حاضر نہ ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ راوی نے کہا: پس اس آدمی نے نعرہ تکبیر بلند کیا، تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آؤ میں تجھے بتاؤں اور جن امور کے بارے تو نے مجھ سے سوال کیا ہے میں تیرے لئے اس کی وضاحت کروں، جہاں تک احد کے دن آپ کے فرار کا تعلق ہے تو میں یہ شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمادیا ہے اور رہا بدر سے ان کے غائب ہونے کا معاملہ! تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھی اور وہ بیمار تھیں تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: إِنَّ لَكَ أَجْرَ رَجُلٍ مِّنْ شَهِدٍ بَدْرًا وَسَهْمَهُ (بلاشبہ تمہارے لئے اس آدمی کے برابر اجر اور مال غنیمت سے) حصہ ہے جو غزوہ بدر میں حاضر ہوئے۔) اور جہاں تک بیعت رضوان سے غائب ہونے کا تعلق ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ اگر بطن مکہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے زیادہ عزت والا کوئی موجود ہوتا تو یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جگہ اسے بھیجتے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کے بعد بیعت رضوان ہوئی، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کے بارے میں فرمایا: ہذا يد عثمان بن عفان کا ہاتھ ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا: ہذا لعثمان بن عفان یہ بیعت عثمان کے لئے ہے۔ اب اسے تو اپنے ساتھ لے جا۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول کرنا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فحج آدم موسى۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام دلیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ اور وہ اس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کے سبب اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جنت سے نکالنے پر زجر و توخی اور ملامت کریں، تو حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں فرمایا: کیا تم مجھے ایسے کام پر ملامت کرتے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال پہلے میرا مقدر بنادیا تھا (2) اور اللہ تعالیٰ نے میری توبہ کو قبول فرمائی ہے اور جس

1۔ صحیح بخاری کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 581، اسلام آباد

2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب حکم اللہ موسیٰ تکلیماً، جلد 2، صفحہ 119، اسلام آباد۔ مسلم کتاب القدر، باب تہاج آدم موسیٰ، جلد 2، صفحہ 335۔ کراچی

ایضاً صحیح بخاری، کتاب القدر، حدیث نمبر 6124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی توبہ قبول ہو جائے تو اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا اور جس کا کوئی گناہ نہ ہو تو اسے ملامت نہیں کی جاسکتی، اور اسی طرح وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف فرمادے اور بلاشبہ وہ یہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور اس کی خبر سچی ہے۔ اور ان دو کے سوا توبہ کرنے والے گنہگار اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے بھی ہیں، پس وہ اس پریشانی اور خوف میں ہوتے ہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ کی جائے، اور اگر قبول کر لی جائے تو بھی خوف ان پر غالب ہوتا ہے کیونکہ انہیں اس کے بارے علم نہیں ہوتا۔ فاعلم۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي
الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ
حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۖ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٦٦﴾

”اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر اختیار کیا اور جو کہتے تھے اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر کرتے کسی علاقہ میں یا ہوتے تھے جہاد کرنے والے کہ اگر وہ ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تاکہ بنائے اللہ تعالیٰ اس (خیال باطل) کو حسرت (کا باعث) ان کے دلوں میں اور (درحقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا ۖ امراد منافقین ہیں۔

وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ یعنی جو نفاق میں یا نسب میں (ان کے بھائی تھے) اور ان سرایا میں گئے جنہیں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برمعونہ کی طرف بھیجا (انہیں کہتے تھے) لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا (اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے) تو اس میں مسلمانوں کو ان کی مثل قول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد إِذَا ضَرَبُوا یہ زمانہ ماضی کے لئے ہے، یعنی اذ ضربوا، (جب انہوں نے سفر کیا) کیونکہ کلام میں شرط کا معنی ہے اس حیثیت سے کہ الَّذِينَ مَبْهَمٌ غیر موقت ہے، پس إِذَا، اذ کے محل میں واقع ہے۔ جیسا کہ ماضی جزا میں مستقبل کے محل میں واقع ہوتی ہے۔ اور ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ کا معنی ہے انہوں نے زمین میں سفر کیا اور تجارت یا دیگر کاموں کے لئے چلے اور مر گئے۔ اَوْ كَانُوا غُزًى یا وہ جہاد میں گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ اور الغُزًى جمع منقوص ہے اس کا لفظ حالت رُفْعی اور جری میں تبدل نہیں ہوتا، اور ان کا واحد غَاز ہے، جیسا کہ راکعہ کی جمع رُكْع، صائم کی جمع صُوم، نائم کی جمع نُوم، شاہد کی جمع شُہد، اور غائب کی جمع غُیْب ہے۔ اور جمع میں غَزَاةً بھی جائز ہے جیسا کہ قُضَاةٌ اور غُزَاءُ کے ساتھ بھی مثلاً ضُرَابٌ اور صُوماء اور کہا جاتا ہے: غَزًى، الغَزَاة کی جمع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

قل للقوافل والغزى اذا غزوا

اس میں الغزى الغزاة کی جمع کے طور پر مذکور ہے۔

اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے غَزًى تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور الْغَزِيَّةُ ایسی عورت جس کا خاوند جہاد پر ہو۔

اور اَتَانِ مُغْنِيَةً یعنی ایسی گدھی جس کا بچہ موخر ہو جائے (بیچھے ہو جائے) اور پھر اسے نکالا جائے۔ اور اَغْزَتْ الثَّاقَةَ جب اس کی جان تنگ ہو جائے۔ اور اَلْغَزْوُ کا معنی ہے کسی شے کا قصد و ارادہ کرنا۔ اور اَلْمَغْزِي سے مراد مقصد ہے۔ اور غزو کی طرف نسبت کی وجہ سے غَزَوْتُ کہا جاتا ہے۔

قوله تعالى: لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ یعنی ان کے گمان اور ان کے قول کو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں باعث حسرت بنادے۔ اور لام قول باری تعالیٰ قَالُوا کے متعلق ہے۔ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے گمان کو بنادے کہ اگر وہ نہ نکلتے تو قتل نہ کئے جاتے حَسْرَةً اس کا معنی ندامت ہے۔

فِي قُلُوبِهِمْ اور حسرت کا مفہوم ہے کھوجانے والی شے پر اظہارِ افسوس کرنا جس تک پہنچنا مقدر نہ ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فَوَاحِشٍ لَّمْ يَقْضِ مِنْهَا لُبَانَتِي وَ لَمْ اَتَمَّعْ بِالْجَوَارِ وَ بِالْقُرْبِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ محذوف سے متعلق ہے اور معنی ہے تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ۔

تاکہ اللہ تعالیٰ بنائے اس قول کو ان کے دلوں میں (باعث) حسرت کیونکہ ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم ان کی تصدیق نہ کرو اور نہ تم ان کی طرف متوجہ ہو، پس یہی ان کے دلوں میں حسرت ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: ”تاکہ اللہ تعالیٰ اسے ان کے دلوں میں حسرت بنائے قیامت کے دن کیونکہ اس دن وہ رسوائی اور ندامت میں ہوں گے اور اس دن مسلمان نعمتوں اور کرامت میں ہوں گے۔“ قوله تعالى: وَ اَللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ یعنی اللہ تعالیٰ ہی اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اسے زندہ رکھے جو جنگ کے لئے نکلتا ہے اور اسے مار دے جو اپنے اہل خانہ میں مقیم اور ٹھہرا ہوا ہے۔ وَ اَللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ اسے یا اور تادونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہو جانا اور اس میں مرجانا تمام دنیا سے بہتر ہے۔

وَلَيْنُ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اَوْ مِتُّمْ لَمَغْفِرَةً مِّنَ اللَّهِ وَ رَحْمَةً خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ⑤

وَلَيْنُ مِتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللَّهُ تُحْشَرُونَ ⑥

”اور واقعی اگر تم قتل کئے جاؤ یا خدا میں یا تم مرجاد تو اللہ کی بخشش اور رحمت (جو تمہیں نصیب ہوگی) بہت بہتر

ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو اللہ کے حضور جمع کئے جاؤ گے۔“

جواب الجزاء محذوف ہے، اور یہ جواب قسم کے سبب اس سے مستغنی ہے اور جواب قسم اس قول میں ہے: لَمَغْفِرَةً مِّنَ اللَّهِ وَ رَحْمَةً اور جواب قسم کے سبب مستغنی ہونا اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ اس کے لئے صدر کلام (ضروری) ہے، اور اس کا معنی ہے۔ لِيَغْفِرَنَّ لَكُمْ وَهُوَ ضرور بہ ضرورت تمہاری مغفرت فرمادے گا۔

اور اہل حجاز کہتے ہیں: مِثْمٌ، میم کے کسرہ کے ساتھ جیسا کہ نِثْمٌ ہے۔ یہ مَاتَ يَمَاتُ سے ماخوذ ہے جیسا کہ خَفْتُ يَخَافُ ہے۔ اور سَفَلَى مُضَرَّ کہتے ہیں: مِثْمٌ، یہ میم کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسا کہ صُنْثُمٌ، اور یہ مَاتَ يَمُوتُ سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ

تیرا قول: کان یكون اور قال، یقول۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ اور یہ اچھا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تُحْشَرُونَ یہ وعظ و نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قول کے ساتھ نصیحت کی ہے، یعنی تم جنگ سے بھاگو نہیں اور نہ اس سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، بلکہ تم اس کی سزا اور اس کے دردناک عذاب سے بھاگو، کیونکہ تمہیں اس کی طرف لوٹنا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی تمہارے لئے نہ نقصان اور ضرر کا مالک ہے اور نہ ہی نفع کا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۚ

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿٥٩﴾

”پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں ان کے لئے اور اگر ہوتے آپ تند مزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے تو آپ درگزر فرمائیے ان سے اور بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور صلاح مشورہ کیجئے ان سے اس کام میں اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔“

ماصلہ ہے اس میں تاکید کا معنی ہے، آی فبرحمة، جیسا کہ اس قول میں ہے: عَنَّا قَلِيلٌ۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّثْلَ شَأْنِهِمْ۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ۔ اور یہ علی الاطلاق زائدہ نہیں ہے، بلکہ اس پر زائدہ ہونے کا اطلاق سیبویہ نے کیا ہے اس حیثیت سے کہ اس کا عمل زائل ہو چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ما نکرہ ہے اور با کے سبب محل جر میں ہے وَرَحْمَةً اس سے بدل ہے۔ اور آیت کا معنی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب احد کے دن پیٹھ پھیرنے والوں سے نرمی کی اور ان سے کوئی سختی نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ آپ نے یہ رویہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا کردہ توفیق کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَا اسْتَفْهَمِيہ ہے اور معنی یہ ہے: پس کتنی رحمت ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہ آپ ان کے لئے نرم ہو گئے ہیں، تو یہ بطور تعجب ہے۔ اور اس میں حقیقت سے دوری ہے، کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو یہ فَبِمَا بَغِيرِ الْف کے ہوتا۔ لِنْتَ یہ لَانَ یَدِینُ لَیِّنًا وَلَیِّنًا فَتَحَ کے ساتھ سے ماخوذ ہے۔ اور الْفَظُّ الْغَلِیْظُ کا معنی ہے خشک مزاج۔ فَظَّظْتَ تَفْظُ فَظَاظَةً وَ فَظَاظًا فَانْتَ فَظٌ۔ (تو تند خو ہے) اس کی مونث فَظَّةٌ ہے اور جمع افظاظا ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے یہ ہیں کہ نہ آپ تند خو ہیں، نہ سخت دل اور نہ ہی بازاروں میں ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھنے والے ہیں۔ (1)

مفصل نے اشعار کہے ہیں جن سے فظ کے مذکر ہونے کا ثبوت ملتا ہے:

و لیس بفظ فی الادان والاولی
و فظ علی اعداءه یحذرؤنه
یؤمنون جدواہ ولکنہ سهل
فسطوتہ حشف و نائلہ جزل

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1981،، ایضاً، کتاب التفسیر، حدیث نمبر 4461، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں لفظ فُظَّ دونوں جگہ مذکور ہوا ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے اس کے مونث ہونے کے بارے کہا ہے:

أَمُوتُ مِنَ الضَّرِّ فِي مَنْزِلِي وَ غَيْرِي يَمُوتُ مِنَ الْكَلَةِ
وَ دُنْيَا اتَجُودُ عَلَى الْجَاهِلِيَّةِ وَ هِيَ عَلَى ذِي النُّهَى فَظَه

اس میں لفظ فظہ سمونث ذکر کیا گیا ہے۔

اور غُلْظُ القلب سے مراد چہرے پر تیوری چڑھانا ہے (اور کرخت چہرے کے ساتھ کسی کی طرف متوجہ ہونا ہے) رغائب سے بہت کم متاثر ہونا اور شفقت و رحمت کا بہت کم ہونا ہے۔
اور اسی کے بارے شاعر کا قول ہے:

يُنْكِي عَلَيْنَا وَلَا نَبْكِي عَلَى أَحَدٍ لَنَحْنُ أَغْلُظُ أَكْبَادًا مِنَ الْإِبِلِ
ہم پر رویا جائے گا اور ہم کسی پر نہیں روئیں گے یقیناً ہم اونٹ سے زیادہ سخت دل ہیں۔
اور لَا نَفْقُؤَا کا معنی ہے لتفتقوا، (تو وہ بکھر جاتے) فضضتهم فانفضوا، یعنی میں نے انہیں منتشر کیا پس وہ منتشر ہو گئے، اور اسی بارے میں ابوالنجم کا قول ہے۔
وہ اونٹ کا وصف بیان کرتا ہے:

مُسْتَعَجَلَاتُ الْقَيْضِ غَيْرُ جُرْدٍ يَنْفُضُ عَنْهُنَّ الْحَصَى بِالضُّنْدِ
انفض کا اصل معنی توڑنا ہے، اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: لَا يَنْفُضُ اللَّهُ فَآكَ۔
(اللہ تیرے منہ کو سلامت رکھے "یعنی نہ توڑے") اور اس کا معنی ہے: اے محمد! صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اگر آپ کی نرمی نہ ہوتی تو حیا (خجالت) اور خوف انہیں تمہارے قریب آنے سے روکتا اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر چکے تھے۔
قوله تعالى: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔
اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو ان کاموں کا حکم فرمایا ہے جو انتہائی تدریج کے ساتھ اور آہستہ آہستہ ہیں۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا کہ آپ انہیں معاف فرمادیں جو خاص کر آپ کو قبیحین کی طرف سے اذیت پہنچی ہے، پس جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اس فعل کے بارے مغفرت طلب کریں جو قبیحین سے صادر ہوا، جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو وہ اس اہل ہو گئے کہ امور میں ان سے مشورہ لیا جائے، اہل لغت نے کہا ہے: الاستشارة عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: شُرْتُ الدابة و شورتھا جب تو اس کے بارے دوڑنے وغیرہ کی خبر جان لے۔ اور وہ جگہ جس میں گھوڑے دوڑتے ہیں اسے مشور کہا جاتا ہے۔ اور کبھی ان کے اس قول سے ہوتا ہے: شُرْتُ العسل واشترته فهو مشور و مشتار جیسا تو اسے اپنی جگہ سے لے لے، عدی بن زید نے کہا ہے:

فِي سَمَاعٍ يَأْذُنُ الشَّيْخُ لَهُ وَحَدِيثٌ مِثْلُ مَا ذِي مُشَارٍ

اس میں مشار مذکور معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شوری (مشاورت) قواعد شریعت اور پختگی احکام میں سے ہے، جو اہل علم اور اہل دین سے مشاورت نہیں کرتا تو اس کا معزول ہونا واجب ہے۔ یہ ایسا حکم ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مومنین کی مدح اور تعریف کی ہے: **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ**۔

اعرابی نے کہا ہے: **مَا غِيْبَتْ قَطُّ حَتَّى يُغَيَّبَنَّ قَوْمِي**، (مجھ سے کبھی غیب اور دھوکہ نہیں کیا گیا مگر یہ کہ میری قوم سے دھوکہ کیا جائے۔) کہا گیا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں کوئی کام بھی نہیں کرتا یہاں تک کہ میں ان سے مشاورت کر لوں۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: حکمرانوں پر علماء سے ان معاملات میں مشورہ کرنا واجب ہے جنہیں وہ نہیں جانتے اور امور دین میں سے جن میں انہیں مشکل درپیش ہو اور فوجی ماہرین سے ان امور میں جو جنگ سے تعلق رکھتے ہیں اور لوگوں کے سرداروں سے ان امور میں سے جو مصالح سے تعلق رکھتے ہیں اور کتاب، وزراء اور عمال کے سربراہوں سے ان امور میں جو شہروں کے مصالح، منافع اور ان کی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے: **مَانَدَمٌ مِّنْ اسْتِشَارٍ** (جس نے مشاورت کی وہ نادم اور شرمندہ نہیں ہوا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جو اپنی رائے پر اتر آیا وہ گمراہ ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** یہ آیت کاموں میں اجتہاد اور امکان وحی کے ساتھ ظنوں کو لینے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو اس بارے میں اجازت عطا فرمائی ہے اور اہل تاویل نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس میں اپنے اصحاب سے مشاورت کریں، پس ایک گروہ نے کہا ہے: یہ جنگوں کی تدبیر کے بارے میں ہے، دشمن کے ساتھ آنا سا مانا ہونے کے وقت کے بارے میں ہے اور اپنے نفوس کو مطمئن اور پاکیزہ رکھنے کے لئے اور اپنی اقدار کو بلند کرنے کے لئے اور اپنے دین پر جمع کرنے کے لئے (مشاورت ہے) اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ساتھ آپ کو ان کی رائے سے غنی کر دیا ہے۔ یہ حضرت قتادہ، ربیع، ابن اسحاق، اور شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ امام شافعی نے کہا ہے: یہ اس قول کی طرح ہے **وَالْبَكْرُ تُسْتَأْمَرُ** (باکرہ عورت سے اس کے دل کی پاکیزگی کے لئے اجازت لی جائے گی)۔ (مشاورت کی جائے گی)۔ یہ اس لئے نہیں کہ یہ واجب ہے۔ اور مقاتل، قتادہ اور ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے: عربوں کے سرداروں سے جب کسی معاملہ میں مشاورت نہ کی جاتی تو وہ ان پر شاق اور گراں گزرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے معاملات میں مشاورت کریں، کیونکہ یہ ان کے لئے انتہائی مہربانی اور کرم ہے اور ان کے حسد و کینہ کو بہت دور کرنے والا ہے (1) اور ان کے دلوں کو پاک کرنے والا ہے۔ پس جب آپ ان سے مشاورت کریں گے تو وہ اپنے لئے آپ کی عزت و تکریم کو پہچان جائیں گے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: یہ اس بارے میں ہے جس میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ حضرت حسن بصری اور ضحاک رحمہ اللہ سے یہی

1۔ من ابی داؤد، کتاب ۱۱۱، باب فی المشورۃ، جلد 2، صفحہ 343، اسلام آباد

مروی ہے، ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو مشاورت کا حکم اس لئے نہیں دیا کہ آپ کو ان کی رائے کی حاجت اور ضرورت ہے (1)، بلکہ مراد یہ ہے کہ آپ انہیں مشاورت کی فضیلت سے آگاہ فرمائیں اور تاکہ آپ کے بعد آپ کی امت اس کی اقتدا اور پیروی کرے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ (اور آپ بعض معاملات میں ان سے مشاورت کریں۔) اور کسی کہنے والے نے کتنا اچھا کہا ہے:

شاور صديقك في الخفي المشكل واقبل نصيحة ناصح متفضل
مشکل اور مخفی کاموں میں اپنے دوست سے مشورہ کر اور مہربان نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو قبول کر۔

فان الله قد اوصى بذاك نبیه فی قوله شاورهم و توکل
پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے اپنے نبی ﷺ کو نصیحت فرمائی ہے اپنے اس ارشاد میں کہ آپ ان سے مشاورت کریں، اور توکل اختیار کریں۔

مسئلہ نمبر 4۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: المستشار مؤتمن (2) جس سے مشورہ لیا جائے اس پر امین بنایا جاتا ہے۔ علماء نے کہا ہے: مستشار کی تعریف یہ ہے کہ اگر مشورہ احکام کے بارے میں ہو تو وہ عالم اور دیندار ہو اور سوائے عاقل کے ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کسی آدمی کا دین مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کی عقل مکمل نہ ہو۔ اور جب اس سے مشورہ لیا جائے تو اس صفت سے متصف ہو اور وہ اصلاح کی پوری کوشش کرے اور وہ اپنی جدوجہد اور صلاحیت صرف کرے اور پھر اشارۃً خطا واقع ہو جائے تو اس پر کوئی تادان نہیں۔ خطابی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ دنیوی امور میں مستشار کی تعریف یہ ہے کہ وہ عاقل ہو، تجربہ کار ہو اور مشورہ طلب کرنے والے سے محبت کرنے والا ہو۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

شاور صديقك في الخفي المشكل
(تو مشکل اور مخفی کام میں اپنے دوست سے مشورہ کر۔) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔
اور دوسرے نے کہا ہے:

و ان باب امر عليك التوى فشاوّر لبيباً و تعصه
اور اگر کسی کام کا دروازہ تجھ پر بند ہو جائے تو کسی دانا اور عقلمند سے مشورہ کر لے اور تو اس کی نافرمانی نہ کر۔

1۔ معالم التنزيل، جلد 1، صفحہ 572، دار فکریروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیذان والآداب، باب ان المستشار مؤتمن، حدیث 2747، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور مشاورت برکت ہے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: مَا نَدِمَ مَنْ اسْتَشَارَ وَلَا خَابَ مَنْ اسْتَخَارَ (وہ نادم نہ ہو گا جس نے مشورہ کیا اور وہ خائب و خاسر نہ ہو گا جس نے استخارہ کیا۔) اور حضرت بہل بن سعد الساعدی نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے: ”کوئی بندہ کبھی مشورہ کے سبب شقی اور بد بخت نہیں ہوا اور کوئی رائے کے استغنا کے ساتھ سعید اور خوش بخت نہیں ہوا۔“ اور بعض نے کہا ہے: اس سے مشاورت کر جو امور کا تجربہ رکھتا ہو، کیونکہ وہ تجھے اپنی ایسی رائے دے گا جو اس پر انتہائی مہنگی واقع ہوگی اور تو اسے مفت حاصل کر لے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لئے مجلس شوریٰ مقرر فرمائی، حالانکہ یہ بہت بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔ امام بخاری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے ائمہ کرام اہل علم امناء سے امور مباحہ میں مشاورت کرتے تھے تاکہ آسانی اور سہولت کے ساتھ وہ ان پر عمل پیرا ہو سکیں (1)۔ حضرت سفیان ثوری نے بیان کیا ہے: چاہیے کہ تمہارے مشیر متقی اور امانتدار ہوں اور ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں۔ اور حسن نے کہا ہے: قسم بخدا! جو قوم آپس میں مشورہ کرتی ہے تو جو وہاں حاضر ہوتے ہیں وہ ان کی راہنمائی افضل کی طرف کر دیتے ہیں۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کوئی قوم نہیں جن کا مشورہ ہو اور ان کے ساتھ احمد یا محمد نامی آدمی بھی حاضر ہو اور وہ اسے اپنے مشورہ میں شامل کریں مگر اسے ان کے لئے پسند کر لیا جائے گا۔“

مسئلہ نمبر 6۔ شوریٰ کی بنیاد اختلاف آراء پر ہے اور مشورہ لینے والا اس اختلاف میں غور و فکر کرتا ہے اور ایسے قول کو دیکھتا ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہو اگر اس لئے ممکن ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ اس میں سے جہاں تک چاہے راہنمائی فرمادے تو وہ اس پر پختہ ہو جائے اور اسے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے نافذ کر دے، کیونکہ مطلوب تک پہنچنے کی یہی انتہائی کوشش ہے اور اس آیت میں اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا کہ جب آپ کسی کام کا ارادہ کریں تو اس میں لگ جائیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، نہ کہ آپ ان کی مشاورت کا ارادہ کریں۔ اور عزم سے مراد ایسا امر ہے جس میں خوب غور و فکر کی گئی ہو اور اسے مہذب بنا دیا گیا ہو، وہ بغیر نظر و فکر کے صرف رائے سے عزم نہیں بن سکتا، مگر عرب کے بہادروں کے بارے طویل قصائد کے قطعہ میں۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

اِذَا هَمَّ الْقِي بَيْنَ عَيْنِيهِ عَزَمَهُ وَ نَكَبَ مِنْ ذِكْرِ الْعَوَاقِبِ جَانِبَا
جب وہ قصد کرتا ہے تو اپنے عزم کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے اور ہم انجام کے ذکر کو ایک جانب ڈال دیتے ہیں۔

وَلَمْ يَسْتَشِرْ فِي رَأْيِهِ غَيْرَ نَفْسِهِ وَ لَمْ يَرْضَ إِلَّا قَائِمَ السَّيْفِ صَاحِبَا
اور وہ اپنی رائے میں اپنے سوا کسی سے مشورہ نہیں کرتا اور تلوار اٹھانے والے کے سوا کسی ساتھی سے راضی نہیں ہوتا۔
اور نقاش نے کہا ہے: العزم اور العزم دونوں کا معنی ایک ہے، حاء کو عین سے بدلا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، اور حزم سے مراد کسی کام میں عمدہ اور گہری غور و فکر کرنا اور اس کی کانٹ چھانٹ کرنا (یعنی مہذب بنانا) ہے اور اس میں خطا سے بچنا اور احتیاط کرنا ہے۔

اور العزم سے مراد کام کرنے کا قصد کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ** پس مشاورت اور جو اس کے معنی میں ہے وہ حزم ہے اور عرب کہتے ہیں: **قَدْ أَحْزَمَ لَوْ أَعَزَمَ** (میں احتیاط برتوں گا اگر میں قصد کروں گا) اور امام جعفر الصادق اور جابر بن عبد اللہ نے **فَإِذَا عَزَمْتَ** کا کوضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عزم کی نسبت اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی ہے کیونکہ وہی اس کی ہدایت اور توفیق عطا فرمانے والا ہے، جیسا کہ اس نے کہا ہے: **وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ** (الانفال: 17) (اور اے محبوب!) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مشیت خاک) جب آپ نے پھینکی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔)

اور کلام کا معنی ہے یعنی میں نے آپ کا قصد کیا ہے اور میں نے آپ کی راہنمائی کی ہے **فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** (سو آپ اللہ تعالیٰ پر توکل کیجئے) اور باقیوں نے تا کوفتہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مہلب نے کہا ہے: اور نبی مکرم ﷺ نے اپنے رب کے حکم سے اس کی پیروی کی ہے اور فرمایا ہے: ”کسی نبی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اپنے ہتھیار پہننے کے بعد پھر انہیں اتارے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادے (1)“ یعنی اس کے لئے مناسب نہیں کہ جب وہ عزم کر لے تو پھر اس سے پھر جائے، کیونکہ اس سے اس توکل کو توڑنا لازم آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزیمت کے ساتھ شرط قرار دیا ہے۔

پس آپ ﷺ کا اپنے ہتھیار پہننے کا اشارہ احد کے دن نکلنے کی طرف ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کے ساتھ مشرف و مکرم فرمایا اور وہ مومنین صلحاء تھے جو غزوہ بدر میں حاضر نہ ہو سکے تھے: یا رسول اللہ! ﷺ ہمارے ساتھ ہمارے دشمن کی طرف نکلے، یہ عزیمت پر دال ہے اور آپ ﷺ نے قعود (مدینہ منورہ میں ہی رہنے) کا اشارہ کیا اور اسی طرح عبد اللہ بن ابی نے بھی اسی کا اشارہ دیا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ یہیں مقیم رہنے اور لوگوں کے ساتھ ان کی طرف نہ نکلے، پس اگر وہ ٹھہر گئے تو وہ بری مجلس کے ساتھ ٹھہریں گے اور اگر وہ ہماری طرف مدینہ طیبہ میں آئے تو ہم فناؤں اور گلیوں کے دھانوں پر ان سے جنگ لڑیں گے اور عورتیں اور بچے ٹیلوں پر چڑھ کر ان پر پتھر پھینکیں گے، قسم بخدا! اس شہر میں دشمن نے کبھی بھی ہمارے ساتھ جنگ نہیں لڑی مگر ہم اس پر غالب آئے اور جب بھی ہم اس سے نکل کر دشمن کی طرف گئے تو وہ ہم پر غالب آئے۔ جن کا ذکر ہم نے کیا ہے انہوں نے اس رائے کا انکار کر دیا اور انہوں نے لوگوں کو تشبیح دلائی اور جنگ کی طرف دعوت دی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے نماز جمعہ پڑھائی اور نماز کے بعد اپنے کا شانہ اقدس میں تشریف لے گئے اور اپنے ہتھیار پہنے۔ نتیجتاً وہ قوم نادم ہوئی اور انہوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کو مجبور کیا ہے، پس جب آپ ہتھیار پہن کر ان کی طرف تشریف لائے تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ، اگر آپ کی خواہش ہے تو یہیں ٹھہر جائیں کیونکہ ہم آپ کو مجبور کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب وہ

اپنے ہتھیار پہن لے تو پھر انہیں قتال کرنے سے پہلے اتار دے۔“ (1)

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: **فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ توکل کا معنی عجز کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا ہے اور اس کا اسم التکلیان ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: **اتَّكَلْتُ عَلَيْهِ فِي أَمْرِي** (میں نے اپنے کام میں اس پر اعتماد کیا ہے) اور اس کی اصل **اِذْ تَكَلَّتْ** ہے واؤ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدلا گیا ہے، پھر یا کو تا سے بدل دیا گیا اور پھر اسے تا افتعال میں مدغم کر دیا گیا۔ اور کہا جاتا ہے: **وَكَلَّتَهُ بِأَمْرِي** توکیلاً (میں نے اسے اپنے کام کا وکیل بنایا) اس کا اسم وکالة ہے واؤ مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔

علماء نے توکل کے بارے میں اختلاف کیا ہے، متصوفہ میں سے ایک گروہ نے کہا ہے: اس کا مستحق صرف وہ ہوتا ہے جس کے دل میں غیر اللہ یعنی درندے یا کسی اور شے کا خوف نہ ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ضمان کی وجہ سے رزق کی تلاش میں سعی اور جدوجہد کرنا چھوڑ دے۔ اور عام فقہاء نے کہا ہے: وہ جس کا ذکر قول باری تعالیٰ: **وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ** ⑤ کے تحت ہو چکا ہے۔ اور وہی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، حالانکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام خوفزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنے اس قول میں خبر دی ہے: **لَا تَخَافَا وَارْجِعَا إِلَىٰ ذِكْرِكُمَا وَلَا يَخَفْ هَارُونَ** ⑥ (موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو۔) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس قول سے خبر دی ہے: **فَلَمَّا رَأَىٰ أَن يُدْخِلَهُمْ لَا تَقْصِلْ إِلَيْهِ نَكَرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً** ⑦ **قَالُوا لَا تَخَفْ** (ہود: 70) (پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے۔ فرشتوں نے کہا ڈریے نہیں) پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام خوفزدہ ہوئے۔ تو یہ دونوں مثالیں تیرے لئے کافی ہیں..... تو ان دونوں کے سوا کا ذکرنا تو بدرجہ اولیٰ ہے۔ اور اس معنی کا بیان آگے آئے گا۔

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرْكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۚ

وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ⑤

”اگر مدد فرمائے تمہاری اللہ تعالیٰ تو کوئی غالب نہیں آسکتا تم پر اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو

مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد۔ اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔“

قولہ تعالیٰ: **إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ** یعنی تم اسی پر توکل کرو کیونکہ اگر وہ تمہاری مدد فرمائے اور تمہارے دشمن سے تمہاری حفاظت کرے تو تم ہرگز مغلوب نہ ہو گے۔ **وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ** اور اگر وہ اپنا تعاون تمہارے ساتھ چھوڑ دے۔ **فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرْكُمْ مِنْ بَعْدِهِ** یعنی اس کے بعد کوئی بھی تمہاری مدد نہ کرے گا، یعنی اس کے تمہیں چھوڑنے کے بعد، کیونکہ اس نے فرمایا ہے: **وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ** اور الخذلان کا معنی ہے مدد اور تعاون چھوڑ دینا۔ اور المخذول: جسے چھوڑ دیا گیا ہو، جس کی پرواہ نہ

ابن عطیہ نے کہا ہے: کہا گیا ہے یہ قول مومنین کی جانب سے تھا انہوں نے یہ گمان نہیں کیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول منافقین کی جانب سے تھا اور یہ روایت بھی ہے کہ گم ہونے والی شے تلواری تھی۔ یہ اقوال بیان کئے جاسکتے ہیں اس بنا پر کہ قرأت یَغْلُ یا کے فتح اور غین کے ضمہ کے ساتھ ہو۔

ابوصخر نے محمد بن کعب سے روایت کیا ہے وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغْلُ فرمایا: یہ آیت کہہ رہی ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ میں سے کوئی شے چھپائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں لام منقولہ ہے، یعنی وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ يَغْلُ، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحَانَهُ اِی مَا كَانَ لِلَّهِ لِيَتَّخِذَ وَلَدًا (یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ کسی کو بیٹا بنا لے۔) (تو اس میں بھی لام منقولہ ہے۔) اور یَغْلُ یعنی یاء کے ضمہ اور غین کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: [ہم نے غنیمت کے بارے میں نہیں سنا مگر غَلَّ غُلُولًا، اور اسی طرح بھی پڑھا گیا ہے] وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغْلُ وَیَغْلُ۔ فرمایا: یَغْلُ کا معنی ہے یخون خیانت کرنا اور یَغْلُ کا معنی ہے یُخَوِّنُ اور یہ لفظ دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے ان میں سے ایک یُخَانُ ہے، یعنی وہ شے جو مال غنیمت سے لی جاتی ہے اور دوسرا یُخَوِّنُ ہے۔ یعنی جسے غلول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے: پھر کہا جاتا ہے ہر وہ جس نے کوئی شے چھپ کر لے لی تو اس نے غَلَّ یَغْلُ غُلُولًا کا ارتکاب کیا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے اس کا نام غلول اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس سے ہاتھوں کو باندھ دیا گیا ہے، یعنی روک دیا گیا ہے۔

اور ابو عبید نے کہا ہے: الْغُلُولُ (خیانت) مال غنیمت کے ساتھ ہی خاص ہے اور ہم اسے نہ خیانت گمان کرتے ہیں اور نہ ہی کینہ اور حقد۔ اور جو اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اسے خیانت کہا جائے وہ اَغْلَّ یَغْلُ ہے اور اسے حقد کہا جائے اس کے لئے غَلَّ یَغْلُ کسرہ کے ساتھ ہے، اور اسے غلول کہا جائے وہ غَلَّ یَغْلُ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور غَلَّ الْبَعِیْزُ بھی ہے۔ اِیَغْلُ غَلَّةً [بھی ہے جب وہ اپنا کثیر پانی پورا نہ کرے۔ اور اَغْلُ الرَّجُلُ کا معنی ہے آدمی نے خیانت کی۔ النمر نے کہا ہے:

جزی الله عنا حمزة ابنة نوفل جزاء مغیل بالامانة کاذب

اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے حمزہ بنت نوفل کو جزا دے (جیسا کہ) امانت میں خیانت کرنے والے جھوٹے کی جزا۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: لَا اِغْلَالَ وَلَا اِسْلَالَ (1) یعنی نہ کوئی خیانت ہے اور نہ کوئی سرقہ (چوری) ہے (2) اور کہا جاتا ہے: لَا رَشُوَّةَ (اور نہ ہی کوئی رشوت ہے۔)

اور شریع نے کہا ہے: خیانت کرنے والے کے سوا کسی مستعیر (ادھار لینے والا) پر ضمان نہیں ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین (چیزیں) ہیں جن پر مومن کا دل حقد و کینہ نہیں کرتا (3)۔" جس نے اسے فتح کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کا معنی حقد اور کینہ ہے۔ اور غَلَّ [بمعنی دخل] کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا کہا جاتا ہے:

2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 300

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک باب الخطبة یوم النحر، صفحہ 226، وزارت تعلیم، اسلام آباد

ایضاً، ابن ماجہ، کتاب فضائل اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم باب من ہدٰیہ علماء، حدیث 225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

غُلَّ فُلَانُ الْمَفَاوِزَ، یعنی فلاں جنگل میں داخل ہوا اور اس کے وسط تک پہنچا۔ اور غُلَّ مِنَ الْمَغْنَمِ غُلُولًا، یعنی اس نے مال غنیمت میں خیانت کی۔ اور غُلَّ الْمَاءَ بَيْنَ الشَّجَرِ (تب کہا جاتا ہے) جب پانی درختوں میں داخل ہو جائے (جاری ہو جائے)، ان تمام میں یُغْلُ غُثَّیْنِ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: الْغُلُولُ کَالْغَوَىٰ معنی یہ ہے کہ وہ مال غنیمت سے کوئی شے لے لے اور اسے اپنے ساتھیوں سے چھپا لے اور اسی سے تَغْلُغِلُ الْمَاءَ فِي الشَّجَرِ بھی ہے جبکہ پانی اس میں داخل ہو جائے اور الغل کا معنی درخت کی جڑوں میں جاری پانی ہے، کیونکہ وہ درختوں کو چھپانے اور ڈھانپنے والا ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

لَعِبَ السُّيُولُ بِهِ فَأَصْبَحَ مَاءُهُ غَلًّا يُقَطِّعُ فِي أَصُولِ الْخُرُوعِ

اور اس سے غلالہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے اور الغال، اس سے مراد درختوں والی ہموار زمین ہے۔ اور سلم اور طلع کے درخت اگنے کی جگہ کو غال کہا جاتا ہے اور غال بھی ایک بوٹی ہے۔ اور اس کی جمع غُلَانٌ غُثَّیْنِ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یُغْلُ کا معنی ہے یوجد غلا۔ (اسے غال پایا جاتا ہے)، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: احدث الرجل وجدته محمودةً یعنی میں نے فلاں آدمی کی تعریف کی (تو) میں نے اسے محمود پایا) اس تاویل کی بنا پر یہ قرأت یُغْلُ یا کے فتح اور غُثَّیْنِ کے ضمہ کے ساتھ ہی کی طرف راجع ہوتی ہے اور یُغْلُ کا معنی جمہور اہل علم کے نزدیک اس طرح ہے لیس لأحدانٍ یہ یعنی کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت کرے۔

پس آیت میں مقصود لوگوں کو مال غنیمت میں خیانت کرنے سے روکنا اور منع کرنا ہے۔ اور اس پر وعید سنانا ہے۔ اور جس طرح یہ جائز نہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ سے خیانت کی جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ آپ کے سوا کسی اور سے خیانت کی جائے، لیکن ذکر خاص طور پر آپ کا کیا گیا ہے کیونکہ آپ ﷺ کے ساتھ خیانت کرنا از روئے وقوع کے زیادہ شدید اور سخت ہے اور از روئے بوجھ اور ثقل کے بہت بڑی اور بھاری ہے، کیونکہ آپ کی موجودگی میں معصیت کا ارتکاب کرنا بہت بڑا جرم ہے کیونکہ آپ کی عزت و توقیر کرنا لازم ہے اور ایسے والی جو حضور نبی مکرم ﷺ کے حکم پر ہوں تو ان کے لئے بھی عزت و توقیر میں سے حصہ ہے۔ اور کہا گیا ہے: یُغْلُ کا معنی ہے نبی علیہ السلام نے کبھی بھی خیانت نہیں کی اور مقصود نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قَوْلُهُ تَعَالَى: وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ یعنی وہ اس (خیانت کی ہوئی شے) کے ساتھ آئے گا در آنحالیکہ وہ اسے اپنی پیٹھ اور گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ اور وہ اسے اٹھانے اور اس کے بوجھ کے سبب کبڑا ہوگا اور اس کی آواز سے خوفزدہ ہوگا اور تمام کے سامنے اس کی خیانت کا اظہار کر کے اسے زجر و توبیخ کی جائے گی، جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور یہی وہ رسوائی ہے جس میں اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے کو واقع کرے گا اور یہ اس رسوائی اور ذلت کی مثل ہے جس میں وہ دھوکہ دینے اور عہد توڑنے والے کو واقع کرے گا، اس طرح کہ اس کی سرین (بیٹھنے کی جگہ) کے پاس اس کے عذر اور خیانت کی مقدار جھنڈا نصب کیا جائے گا (1) اور اللہ تعالیٰ نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں ان کے بارے جن کا انسان اس سے عہد

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجزیہ، حدیث نمبر 2950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرتا ہے اور وہ اسے سمجھتے ہیں۔

کیا آپ شاعر کے اس قول کی طرف نہیں دیکھتے:

أُسْتَىٰ وَيَحْكُ هَل سَعِيَتْ بَعْدَ رَقَىٰ رَفِعَ اللّٰوَاءُ لَنَا بِهَا فِي التَّجْنِيعِ

اے سستی تیری ہلاکت ہو کیا تو نے غدر اور خیانت کے بارے سنا ہے کہ ہمارے لئے اس کے سبب جمع ہونے کی جگہ

(میدان حشر) میں جھنڈا کھڑا کیا جائے گا۔

عرب لوگ معاہدہ توڑنے والے کے لئے جھنڈا بلند کرتے تھے اور اسی طرح جرم کرنے والے کو اس کی جنایت سمیت پھرایا جاتا تھا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور غلول (خیانت) کا ذکر کیا اور اسے بہت بڑا (جرم) قرار دیا اور اس کے امر کو عظیم اور شدید قرار دیا پھر فرمایا: ”میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر اونٹ اپنی آواز نکال رہا ہو گا وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر گھوڑا اپنی آواز نکال رہا ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اس کی گردن پر بکری اپنی آواز نکال رہی ہو گی تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر ایک آدمی چیخ و پکار کر رہا ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر لکھے ہوئے کاغذ حرکت کر رہے ہوں گے (مراد وہ کاغذ ہیں جن پر اس کے ذمے واجب الاداء حقوق لکھے ہوں گے اور وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھ تک (پیغام) پہنچا دیا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر سونا چاندی ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا۔ (1) اور ابو داؤد نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مال غنیمت پاتے تھے تو آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے تو وہ لوگوں میں اعلان کر دیتے اور وہ اپنے غنائم لے کر آ جاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا خمس نکالتے تھے اور اسے تقسیم کر دیتے، پس ایک دن اعلان کے بعد ایک آدمی بالوں کی رسی لے کر آیا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ اس مال میں سے تھی جو ہم نے غنیمت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ تو آپ

1۔ مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 122-123، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسریر، حدیث نمبر 2844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ﷺ نے فرمایا: ”کیا تو نے بلال کو سنا ہے وہ تین بار اعلان کرتا ہے؟“ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ”تجھے کس نے روکا ہے کہ تو اسے لے کر آئے؟“ تو اس نے معذرت پیش کی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”خبردار! تو قیامت کے دن اس کے ساتھ آئے گا اور میں اسے تجھ سے قبول نہ کروں گا۔“ (1)

بعض علماء نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن اس بوجھ کا عوض پورا پورا دیا جائے گا جیسا کہ دوسری آیت میں کہا ہے: **وَهُمْ يَحْضُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَى ظُهُورِهِمْ ۖ أَلَا سَاءَ مَا يَزِينُونَ** (الانعام) (اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر ارے کتنا برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: خبر امر کے مشہور ہونے پر محمول ہے، یعنی وہ قیامت کے دن آئے گا اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اس کے امر کی تشہیر کرے گا جیسا کہ تشہیر کی جاتی ہے اگر اس نے اونٹ کو اٹھایا اس کی آواز ہوگی یا گھوڑا اٹھایا (تو) اس کی آواز ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حقیقت سے مجاز اور تشبیہ کی طرف عدول ہے اور جب کلام حقیقت اور مجاز کے درمیان ۱۰ اتر ہو تو حقیقت اصل ہے جیسا کہ کتب اصول میں ہے۔ تحقیق نبی مکرم ﷺ نے حقیقت کے بارے خبر دی ہے ”شادی کے بعد عطر نہیں ہے“۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک جس نے دنیا میں کسی شے کی خیانت کی قیامت کے دن جہنم میں اس کی تمثیل بنائی جائے گی پھر اسے کہا جائے گا: اس کی طرف اتر اور اسے پکڑ لو، پھر وہ اس کی طرف اترے گا۔

پس جب وہ اس تک پہنچے تو اسے اٹھالے گا، یہاں تک کہ جب دروازے تک پہنچے گا تو اس سے جہنم کے نچلے حصے کی طرف گر جائے گا، پھر وہ اس کی طرف لوٹ آئے گا اور اسے پکڑ لے گا، جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اسی طرح ہوتا رہے گا اور کہا جاتا ہے: ”وہ اس کے ساتھ آئے گا جس کی اس نے خیانت کی“ یعنی قیامت کے دن وہ خیانت اور غلول اس پر شہادت دیں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے بیان کیا ہے: غلول (خیانت کرنا) کبار میں سے ایک کبیرہ گناہ ہے اور اس پر دلیل یہ آیت اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے کہ وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے گا۔ تحقیق آپ ﷺ نے مدغم کے بارے میں فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک وہ چادر جو خیر کے دن اس نے مال غنیمت سے اٹھائی اور وہ تقسیم میں شامل نہ ہوئی یقیناً وہ اس پر آگ بھڑکائے گی، فرمایا: پس جب لوگوں نے یہ سنا تو ایک آدمی ایک یا دو تسمے لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ایک یا دو تسمے بھی آگ میں سے ہیں“ اسے موٹا نے نقل کیا ہے (2)۔ پس آپ ﷺ کا ارشاد: **وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ** اور آپ ﷺ کا خیانت کرنے والے پر نماز (جنازہ) پڑھنے سے انکار کرنا غلول (خیانت) کے بہت بڑا ہونے اور اس میں بہت بڑا گناہ ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ کبار میں سے ہے، اور یہ آدمیوں کے حقوق میں سے ہے اور اس میں نیکیوں اور بدیوں کے بارے میں قصاص ضروری ہے، پھر اس کے مالک کی مرضی ہے۔ اور آپ ﷺ کا قول: **يُشْرِكُ أَكْثَرُ أَكْثَرِ النَّاسِ** اور آپ ﷺ کے اس قول کی مثل ہے: اڈوا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 15، اسلام آباد

2۔ موٹا امام مالک، کتاب الجہاد، صفحہ 475، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3908، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الخِیَاطُ وَالْمَخِیْطُ (1) (دھاگہ اور سوئی ادا کرو) اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ غزوہ میں تقسیم سے پہلے تھوڑا اور زیادہ مال لینا حلال نہیں ہے، مگر وہ جس پر تمام کا اجماع ہو جائے مثلاً جنگ کی زمین میں کھانے کی اشیاء، ایندھن کی لکڑیاں اور شکار وغیرہ۔ اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: دشمن کی زمین میں امام کی اجازت کے بغیر کھانے کی کوئی شے نہیں لی جائے گی۔ اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ آثار اس کے خلاف ہیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ حسن نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جب کوئی شہر یا قلعہ فتح کرتے تھے تو ستوا، آٹا، گھی اور شہد کھالیا کرتے تھے۔ اور ابراہیم نے کہا ہے: وہ دارالحرب میں دشمن کی زمین سے خمس نکالنے سے پہلے کھانے کی اشیاء اور جانوروں کا چارہ وغیرہ لے لیا کرتے تھے۔ اور عطا نے کہا ہے: لشکری سر یہ میں ہوتے تھے اور وہ گھی کے مشکیزے، شہد اور طعام پاتے تھے اور انہیں کھاتے تھے اور جو کچھ باقی رہ جاتا وہ اسے اپنے امام کے پاس لوٹا دیتے تھے اور جماعت علماء کا نظریہ یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ غلول کرنے والے کا سامان جلایا نہیں جائے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کا سامان نہیں جلایا جس نے چادر اٹھائی تھی اور نہ ہی آپ نے اس موتیوں والے کا سامان جلایا تھا جس پر آپ نے نماز جنازہ چھوڑ دی تھی، اگر اس (خیانت کرنے والے) کا سامان جلانا واجب ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اس پر عمل کرتے، اور اگر آپ ایسا کرتے تو یقیناً وہ حدیث میں نقل کیا جاتا (2)۔ اور رہی وہ روایت جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم کسی آدمی کو پاؤ اس حال میں کہ اس نے (مال غنیمت میں) خیانت کی ہو تو تم اس کا ساز و سامان جلادو اور اسے مارو (3)“۔ تو اسے ابوداؤد اور ترمذی نے صالح بن محمد بن زائدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ ضعیف راوی ہے اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

ترمذی نے کہا ہے: میں نے اس حدیث کے بارے میں محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلاشبہ اسے صرف صالح بن محمد نے روایت کیا ہے اور وہ ابوداؤد القلیبی ہے اور وہ منکر الحدیث ہے اور ابوداؤد نے بھی اس سے روایت کیا ہے اس نے کہا ہے: ہم نے ولید بن ہشام کی معیت میں جنگ لڑی اور ہمارے ساتھ سالم بن عبد اللہ بن عمر اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ بھی تھے۔ پس ایک آدمی نے سامان (غنیمت) میں خیانت کی۔ پس ولید نے اس کے سامان گے بارے حکم دیا اور اسے جلادیا، اور اسے پھرایا گیا اور اسے اس کا حصہ بھی نہ دیا۔ ابوداؤد نے کہا ہے: یہ دونوں حدیثوں میں سے زیادہ صحیح ہے۔ اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا سامان جلادیا اور انہوں نے اسے مارا (4)۔

1۔ ابی داؤد کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2319، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2335، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث 2837، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ابی داؤد، کتاب الجہاد باب فی عقوبۃ الغال، جلد 2، صفحہ 15، اسلام آباد۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2340، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابوداؤد نے کہا ہے: اور اس میں علی بن بحر نے ولید سے یہ زیادہ کیا ہے۔۔۔۔۔ ولم اسعه منه (اور میں نے اسے اس سے نہیں سنا)۔۔۔۔۔ ومنعوا سہمہ (اور انہوں نے اسے اپنے حصہ سے روک دیا) ابو عمر نے بیان کیا ہے: اس حدیث کے بعض راویوں نے کہا ہے: اور تم اس کی گردن مار دو اور اس کا ساز و سامان جلا دو۔ اور یہ حدیث صالح بن محمد کے ارد گرد گھومتی ہے اور یہ راوی ان میں سے نہیں ہے جنہیں حجت بنایا جاسکتا ہے۔

اور تحقیق حضور نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک کے ساتھ (1)۔“ اور یہ روایت غلول کی صورت میں قتل کی نفی کرتی ہے۔ اور ابن جریج نے ابوالزبیر سے، انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خیانت کرنے والے، چھیننے والے اور اچک کر لے جانے والے پر قطع (ید) نہیں ہے (2)۔“ اور مال (مال غنیمت سے مال اٹھانے والا) لغت میں خائن (خیانت کرنے والا) ہی ہے اور شریعت نے اس سے جب قطع ید کی نفع کر دی ہے تو پھر قتل کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگی۔

اور امام طحاوی نے کہا ہے: اگر صالح کی مذکورہ حدیث صحیح ہو تو پھر یہ احتمال ہے کہ اس وقت یہ مالوں میں سزا ہو، جیسا کہ زکوٰۃ کا انکار کرنے والے کے بارے میں فرمایا: ”بے شک ہم زکوٰۃ اور اس کے مال کا نصف حصہ لیں گے، (کیونکہ) یہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اور واجبات میں سے ایک حق اور واجب ہے (3)۔“ اور اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے چھپائے ہوئے اونٹ کے گم ہونے کی صورت میں کہا ہے: اس میں اس (اونٹ) کا تاوان بھی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل (اونٹ) بھی ہے (4)۔ اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے لٹکے ہوئے پھل کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس میں اس کی دو مثل تاوان ہے اور سزا کے کوڑے بھی ہیں (5)۔ یہ سب روایات منسوخ ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب کسی آدمی نے مال غنیمت سے خیانت کچھ لے لیا اور پھر وہ پایا گیا تو وہ اس سے لے لیا جائے، اور اسے ادب سکھایا جائے اور تعزیری سزا دی جائے۔ اور امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام لیث رحمہم اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا سامان نہیں جلایا جائے گا۔ اور امام شافعی، لیث اور داؤد نے کہا ہے: اگر وہ نبی و جانتا ہو (یعنی اگر اسے یہ معلوم ہو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے) تو اسے سزا دی جائے گی۔ اور امام اوزاعی نے کہا ہے: (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا تمام سامان جلا دیا جائے گا سوائے اس کے ہتھیار اور ان کپڑوں کے جو وہ پہنے ہوئے ہو اور اس کی زین کے، اور اس کی سواری اس سے نہیں چھینی جائے گی، اور نہ ہی وہ شے جلانی جائے گی جو خیانت اٹھائی گئی اور امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا قول

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 1016، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 6370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 175، اسلام آباد۔ ایضاً ابی داؤد، حدیث نمبر 3817، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

ایضاً ابن ماجہ، حدیث نمبر 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ باب فی زکوٰۃ السائغۃ، جلد 1، صفحہ 221، اسلام آباد۔

5۔ ابی داؤد، ایضاً، حدیث نمبر 1455، ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملقط، حدیث نمبر 1460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

ہے، اور حسن نے یہی کہا ہے، مگر یہ کہ وہ حیوان یا مصحف ہو (تو پھر یہ سزا نہیں دی جائے گی۔) اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں نے غلول کرنے والے کو مارا اور اس کا سامان جلا دیا۔ ابن عبد البر نے بیان کیا ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ غلول کرنے والے کا کجاوہ اور اس کا سامان سب جلا دیا جائے گا ان میں سے مکحول اور سعید بن عبد العزیز ہیں۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے ان کی دلیل صالح مذکور کی حدیث ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ ایسی حدیث ہے جس کے ساتھ تیرا کئی حرمت کو ختم کرنا ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی حکم کو نافذ کرنا (ثابت ہوتا ہے) کیونکہ اس کے معارض ایسے آثار ہیں جو اس کی نسبت زیادہ قوی ہیں۔ اور جو موقف امام مالک اور آپ کے تبعین نے اس مسئلے میں اختیار کیا ہے وہ نظر و فکر اور اثر کے صحیح ہونے کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ بدنی سزا میں امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب مختلف نہیں ہے، اور رہی مالی سزا تو انہوں نے اس ذمی کے بارے میں کہا ہے جو شراب کسی مسلمان کو فروخت کرتا ہے کہ مسلمان کے پاس شراب کو بہا دیا جائے گا، اور ذمی سے بطور سزا شمن چھین لئے جائیں گے تاکہ وہ مسلمانوں کو شراب کی فروخت نہ کرے تو اس بنا پر یہ کہنا جائز ہے کہ مال میں سزا دینا جائز ہوتا ہے۔ تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ دودھ بہا دیا جس میں پانی ملا یا گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ (مال غنیمت سے) خیانت مال لینے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ تمام مال جو بطور خیانت اس نے اٹھایا اسے لوگوں کے منتشر ہونے سے پہلے تقسیم کرنے والے کے پاس لوٹا دے اگر وہ اس تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ پالے، اور بلاشبہ جب اس نے ایسا کر لیا تو یہی اس کی توبہ ہوگی اور گناہ سے بچ نکلنے کا ذریعہ ہوگا۔ اور جب اہل لشکر منتشر ہو جائیں اور وہ اس تک نہ پہنچ سکے تو جو کچھ اس کے ساتھ کیا جائے گا اس میں اختلاف ہے، علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ اس کا خمس امام کو دے دے اور باقی صدقہ کر دے گا۔ یہ امام زہری، مالک، اوزاعی، لیث اور ثوری رحمہم کا مذہب ہے، اور حضرات عبادہ بن صامت، معاویہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ یہ دونوں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ مال صدقہ کر دیا جائے جس کے مالک کا علم نہ ہو، اور یہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کے لئے غیر کا مال صدقہ کرنا درست نہیں۔ ابو عمر نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ایسی صورت میں ہے جب اس کے مالک کو پانا، اس تک پہنچنا یا اس کے ورثا تک پہنچنا ممکن ہو، اور اگر ان میں سے کوئی شے بھی نہ ہو تو اس صورت میں امام شافعی رحمہ اللہ بھی صدقہ کرنے کو مکروہ نہیں قرار دیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ لقطہ (گری ہوئی چیز جو مل جائے) کو صدقہ کرنا جائز ہے جبکہ پہلے اس کی تشہیر کی جائے اور اس کے مالک کا علم نہ ہو سکے، اور پھر اس کے بارے میں حکم لگایا ہے کہ اگر وہ (مالک) آجائے تو اسے اجرت اور ضمان کے درمیان اختیار دیا جائے گا، اور اسی طرح غصب کی ہوئی شے کا حکم بھی ہے۔ واللہ التوفیق۔

اور غلول کے علیحدہ ذکر میں اس پر دلیل ہے کہ مال غنیمت میں تمام غنمین (لشکر) شریک ہیں، پس کسی کے لئے یہ

حلال نہیں کہ وہ اس میں سے کوئی شے دوسرے (کی اجازت) کے بغیر لے، پس جس نے بھی اس میں سے کوئی شے غصب کی تو بالاتفاق اسے تادیبی سزا دی جائے گی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی نے کسی لونڈی کے ساتھ وٹلی کی یا نصاب کے برابر (دس درہم) مال چوری کیا تو اس پر حد قائم کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس پر قطع ید نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 9۔ عمال کے ہدایا اور تحائف بھی غلول میں سے ہیں، اور آخرت میں ذلت و رسوائی کے اعتبار سے اس کا حکم غلول کرنے والے کے حکم کی طرح ہے۔ ابو داؤد نے اپنی سنن میں (1) اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو حمید الساعدی سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے قبیلہ ازد کے ایک آدمی کو صدقہ وصول کرنے پر عامل مقرر کیا اسے ابن اللہبیہ کہا جاتا تھا [ابن سرح نے ابن الاسمعیہ کہا ہے]، پس وہ آیا اور اس نے کہا: یہ تمہارے لئے ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے تو حضور نبی مکرم ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنایاں کی اور پھر فرمایا: ”عامل کو کیا ہو گیا ہے جسے ہم بھیجتے ہیں اور وہ آکر یہ کہتا ہے یہ تمہارے لئے ہے اور یہ (مال) مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے خبردار سنو! وہ اپنی ماں یا اپنے باپ کے گھر بیٹھا رہے اور پھر دیکھے کیا اسے کوئی ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں، تم میں سے کوئی بھی ان میں سے جو شے بھی لائے گا قیامت کے دن وہ اس کے ساتھ آئے گا اگر وہ اونٹ ہو تو اس کی آواز ہوگی، اور اگر وہ گائے ہوئی تو اس کی آواز ہوگی اور اگر وہ بکری ہوئی تو وہ اس کی آواز نکالے گا۔“ پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے یہاں تک کہ ہم نے آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی۔ پھر آپ نے کہا: اللّٰهُمَّ هَلْ بَلَغْتُ اللّٰهُمَّ هَلْ بَلَغْتُ (2) (اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے؟)

اور ابو داؤد نے حضرت بریدہ بن ہشام سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: ”جسے ہم کسی عمل پر عامل مقرر کرتے ہیں تو ہم اس کے لئے مناسب وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں پس اس کے بعد اس نے جو کچھ لیا تو وہ غلول (خیانت) ہوگا۔“ (3)

اور انہوں نے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے ساعی (عامل) بنا کر بھیجا۔ اور پھر فرمایا: ابا مسعود! تو جا اور میں تجھے قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ تیری پشت پر صدقہ کے اونٹوں میں سے کوئی اونٹ آئے اور وہ اپنی آواز نکال رہا ہو کہ تو نے اسے بطور خیانت حاصل کیا تھا“ انہوں نے عرض کی: تب میں نہیں جاؤں گا، آپ نے فرمایا: ”سو میں تجھے مجبور نہ کروں گا (4)۔“ جو روایت ابو داؤد نے ہی مستورد بن شداد سے نقل کی ہے اس نے ان احادیث کو مقید کر دیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جو ہمارا عامل ہو اسے چاہیے کہ وہ بیوی حاصل کر لے (یعنی نکاح کر لے) اور اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو وہ خادم حاصل کر لے اور اگر اس

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والغنی، حدیث 2557، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث 6639، ایضاً

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 123، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والغنی، جلد 2، صفحہ 53، اسلام آباد

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والغنی، جلد 2، صفحہ 52، اسلام آباد

4۔ ایضاً، صفحہ 53، اسلام آباد

کے پاس مسکن (رہنے کے لئے گھر) نہ ہو تو رہائش گاہ بنالے (1)۔“ فرمایا پس ابو بکر نے بیان کیا ہے: مجھے خبر دی گئی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے اس کے سوا کچھ لیا تو وہ غلول کرنے والا اور سارق (چوری کرنے والا) ہے۔“ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ کتب کو ان کے مالکوں سے روک کر رکھنا بھی غلول میں سے ہے، اور ان کے علاوہ دیگر چیزیں بھی ان کے معنی میں داخل ہیں۔ زہری نے کہا ہے: کتب کی خیانت سے بچ، پرہیز کر۔ تو انہیں کہا گیا: کتب کا غلول کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: انہیں ان کے اصحاب سے روک کر رکھنا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل میں کہا گیا ہے: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ یعنی نبی کی شان نہیں ہے کہ وہ بطور رغبت یا رہبت یا مداہنت کے وحی میں سے کوئی شے چھپالے۔ اور وہ اس لئے کہ قرآن کریم میں ان کے دین کے عیب بیان کئے گئے ہیں اور ان کے معبودان باطلہ کو جو برا کہا گیا ہے وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ اسے لپیٹ دیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، محمد بن بشار نے اسے بیان کیا ہے اور ہم نے اس کے بارے جو ابتدا میں بیان کیا ہے وہ جمہور کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تَوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔

أَفَمِنْ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَا لَهُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ

الْمَصِيرُ ۝ ۱۱ ۖ هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ ۱۲

”تو کیا جس نے پیروی کی رضائے الہی کی اس کی طرح ہو سکتا ہے جو حقدار بن گیا ہے اللہ کی ناراضگی کا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے۔ لوگ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔“

قولہ تعالیٰ: أَفَمِنْ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ یعنی جو غلول کو ترک کرنے کا اور جہاد پر صبر کرنے (ڈٹے رہنے) کا ارادہ کرتا ہے۔ کَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ (اس کی طرح ہو سکتا ہے) جو کفر یا غلول یا جنگ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیٹھ پھیرنے کا ارادہ کرتا ہے وَمَا لَهُ جَهَنَّمَ یعنی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، یعنی اگر اس نے توبہ نہ کی یا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف نہ کیا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ یعنی لوٹنے کی جگہ بہت بری ہے۔ اور رِضْوَانُ کُورَا کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے جیسا کہ عذوان اور عذوان۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ اللَّهِ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی پیروی اور اتباع کی وہ اس کی طرح نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا ہے۔ کہا گیا ہے: هُمْ دَرَجَاتٌ متفاوتۃ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے درجات اور منازل مختلف ہیں، پس جس نے رضائے الہی کی پیروی کی اس کے لئے عزت و کرامت اور ثواب عظیم ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا اس کے لئے ذلت، رسوائی اور دردناک عذاب ہے اور هُمْ دَرَجَاتٌ کا معنی ہے ذود درجات (وہ صاحب درجات ہیں) یا علی درجات (وہ درجات پر ہیں) اولی درجات (یا وہ درجات میں ہیں) یا لہم درجات (یا ان کے لئے درجات ہیں) اور اہل نار بھی درجات والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: وَجَدْتَهُ فِي غَمَرَاتٍ مِنَ النَّارِ

فآخر جتہ الی صُخْصَا (1) (میں نے اسے آگ کی تکالیف میں پایا تو میں نے اسے تھوڑے سے پانی کی طرف نکال دیا۔) پس مومن اور کافر درجہ میں برابر اور مساوی نہیں ہوں گے، پھر مومنین بھی مختلف ہوں گے، پس ان میں سے بعض بعض سے بلند رتبہ پر ہوں گے اور اسی طرح کفار بھی۔ اور درجہ کا معنی رتبہ ہے اور اسی سے الذَّرَج ہے (لکھا جانے والا کاغذ) کیونکہ اسے درجہ بدرجہ پسینا جاتا ہے۔ اور جہنم کے مراتب میں مشہور درکات ہیں۔

جیسا کہ فرمایا: إِنَّ الْمُسْلِمِينَ فِي الدَّرَجَاتِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145) (بے شک منافقین جہنم کے نیچے والے درک (گڑھے) میں ہوں گے) پس جس نے غلول نہیں کیا اس کے لئے جنت میں درجات ہوں گے اور جس نے غلول کیا اس کے لئے جہنم میں درکات ہوں گے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: جہنم کی کئی منازل ہیں اور ان میں سے ہر منزل کو درک اور درک کہا جاتا ہے اور درک نیچے کی طرف ہوتا ہے اور درج اوپر، بلندی کی جانب ہوتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ①

”یقیناً بڑا احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب اس نے بھیجا ان میں سے ایک رسول انہیں میں سے پڑھتا ہے ان پر اللہ کی آیتیں اور پاک کرتا ہے انہیں اور سکھاتا ہے انہیں قرآن و سنت۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔“

اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر ان پر اپنے احسان عظیم کو بیان فرمایا ہے اور اس میں احسان کرنے کے معنی میں کئی اقوال ہیں: ان میں ایک یہ ہے کہ مِّنْ أَنفُسِهِمْ کا معنی ہو بَشَرٌ مِّنْهُمْ۔ یعنی آپ ان کی مثل بشر ہیں۔ پس جب دلائل واضح ہیں کہ آپ ان کی مثل بشر ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِّنْ أَنفُسِهِمْ اِیْ مِنْهُمْ۔ یعنی آپ ان میں سے ہیں۔

پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرف و مکرم ہوئے ہیں پس یہ بھی ایک احسان ہے اور یہ قول بھی ہے: مِّنْ أَنفُسِهِمْ تاکہ وہ آپ کی حالت کو پہچان سکیں اور ان پر آپ کا طریقہ اور سنت مخفی نہ رہے۔ اور جب ان میں آپ کا مقام یہ ہے تو وہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قتال اور جنگ کریں اور قطعاً آپ سے دور نہ بھاگیں۔ اور قرأت شاذہ میں مِّنْ أَنفُسِهِمْ فا کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی آپ ان میں اشرف و اعلیٰ (خاندان) میں سے ہیں، کیونکہ آپ بنی ہاشم میں سے ہیں اور بنو ہاشم قریش سے افضل ہیں اور قریش بقیہ عربوں سے افضل ہیں اور عرب غیر عربوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ لفظ مومنین عام ہے اور اس کا معنی عرب میں خاص ہے، کیونکہ عرب قبائل میں سے کوئی قبیلہ نہیں ہے مگر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہنم دیا ہے اور ان کی آپ کے ساتھ نسبت موجود ہے، سوائے بنی تغلب کے کیونکہ وہ نصاریٰ تھے اور اللہ تعالیٰ نے نصرانیت کی میل سے آپ کو پاک صاف رکھا اور اس تاویل کا بیان اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ

(الجمعة: 2) (وہی) (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے)

اور ابو محمد عبد الغنی نے بیان کیا ہے کہ ابو احمد البصری، احمد بن علی بن سعید القاضی، ابو بکر المروزی، یحییٰ بن معین، ہشام بن یوسف نے عبد اللہ بن سلیمان نوفلی سے انہوں نے زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنتیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ صرف عرب والوں کے لئے ہے (1) اور دوسروں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے تمام کے تمام مومنین مراد لئے ہیں (2)۔ اور مِّنْ أَنفُسِهِمْ کا معنی ہے کہ آپ ﷺ ان میں سے ایک ہیں اور انہیں کی مثل بشر ہیں اور بلاشبہ آپ وحی کے سبب ان سے ممتاز ہیں اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ (التوبہ: 128) (بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے)۔ اور مومنین کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا ہے کیونکہ وہی آپ سے نفع اٹھانے والے ہیں، پس ان پر احسان عظیم تر ہوا۔

اور قول باری تعالیٰ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ میں يَتْلُوا۔ رَسُولًا کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کا معنی ہے یقرء (وہ پڑھتا ہے) اور تلاوت بمعنی قراءت ہے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَم يَعْنُوا لَم بمعنی اتلا ہے یعنی وَمَا كَانُوا مِن قَبْلُ لَم يَعْنُوا ضلالت میں (وہ اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور اسی کی مثل یہ آیت بھی ہے وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الضَّالِّينَ یعنی وَمَا كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الضَّالِّينَ (اور تم اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور اس آیت کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

أَوَلَمْ آتَاكُمْ مَصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَئِذَا قُلُّوا مِنْ عِندِ

أَنفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٥﴾

”کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو) اس سے دگنی تو تم کہہ اٹھے کہاں سے آپڑی یہ

مصیبت؟ فرمائیے! یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اس میں الف استفہام کے لئے ہے اور واو عطف کے لئے۔ مَصِيبَةٌ اس سے مراد غلبہ ہے قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا یعنی بدر کے دن تم اس سے دگنی پہنچا چکے ہو، اس طرح کہ تم نے ان میں سے ستر افراد قتل کئے اور ستر کو تم نے قیدی بنایا۔ اور قیدی مقتول کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ قید کرنے والا اگر چاہے تو اپنے قیدی کو قتل کر سکتا ہے، یعنی تم نے انہیں بدر کے دن اور احد کے دن بھی ابتدا میں شکست سے دو چار کیا اور اس میں تم نے تقریباً بیس افراد قتل کئے، (گویا) تم نے ان میں سے دونوں دنوں میں افراد قتل کئے اور انہوں نے تم سے احد کے دن (کچھ افراد) شہید کئے۔

قُلْتُمْ أَئِذَا قُلُّوا مِنْ عِندِ أَنْفُسِكُمْ (کی مصیبت) ہمیں کہاں سے آپڑی ہے، حالانکہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہے ہیں اور ہم

مسلمان ہیں اور ہم میں نبی مکرم ﷺ بھی ہیں اور وحی بھی اور وہ مشرک ہیں۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ (فرمائیے یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے) یعنی تیر اندازوں کی مخالفت کے سبب اور کوئی قوم نہیں ہے جس نے اپنے نبی علیہ السلام کی جنگ میں اطاعت و فرمانبرداری کی مگر ان کی مدد کی گئی، کیونکہ جب وہ اطاعت کرتے ہیں تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے اور حضرت قتادہ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: مراد ان کا حضور نبی کریم ﷺ سے مدینہ طیبہ سے (دشمن کے مقابلے کے لئے) باہر نکلنے کا سوال کرنا ہے اس کے بعد کہ آپ ﷺ وہاں مقیم رہنے کا ارادہ فرما چکے تھے اور آپ ﷺ نے یہ تاویل اس خواب کی فرمائی تھی جس میں آپ نے اسے محفوظ قلعہ دیکھا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس سے مراد ان کا بدر کے دن (قیدیوں کے) قتل پر فدیہ لینے کو اختیار کرنا ہے (1)، حالانکہ انہیں کہا گیا تھا اگر تم نے قیدیوں کے بدلے فدیہ لیا تو ان کی تعداد کے برابر تم سے لوگ شہید کئے جائیں گے۔ اور بیہقی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضور نبی مکرم ﷺ نے بدر کے دن قیدیوں کے بارے میں فرمایا: ”اگر تم چاہو تو انہیں قتل کر دو اور اگر تم چاہو تو ان کا فدیہ لے لو اور تم نے فدیہ سے مفاد حاصل کیا اور تم میں سے ان کی تعداد کے برابر شہید کر دیئے گئے۔“ اور سترھویں نمبر پر آخر میں شہید ہونے والے صحابی حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے انہیں جنگ یمامہ میں شہید کیا گیا۔ پس مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ کا معنی پہلے دو قولوں کے مطابق بذنوبکم (یعنی تم اپنے گناہوں کے سبب اس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہو) اور آخری قول کے مطابق باختیار کم (یعنی یہ مصیبت تمہارے اپنے اختیار کے سبب آئی ہے۔)

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّحِيّ الْجَعْنِ فَيَاذَنْ اللَّهُ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَلِيَعْلَمَ
الَّذِينَ نَافَقُوا ۖ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ ادْفَعُوا ۚ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ
قِتَالًا لَا تَبْعُنْكُمْ ۚ هُمْ لِلْكَفَرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ
مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ۚ

”اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب مقابلہ کو نکلے تھے دونوں لشکر تو وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تھی اور (مقصد یہ تھا کہ) دیکھ لے اللہ تعالیٰ مومنوں کو۔ اور دیکھ لے جو نفاق کرتے تھے اور کہا گیا ان سے آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا بچاؤ کرو (اپنے شہر کا) بولے اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہاری پیروی کرتے وہ کفر سے اس روز زیادہ قریب تھے بہ نسبت ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔“

یعنی (وہ مصیبت) جو احد کے دن قتل، زخم اور ہزیمت کی صورت میں پہنچی۔ فَيَاذَنْ اللَّهُ تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی۔ اور یہ بھی کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر کے ساتھ پہنچی۔ قتال نے کہا ہے: پس وہ اللہ تعالیٰ کے تمہارے اور ان کے درمیان

معاملہ آزاد چھوڑنے کے سبب پہنچی، نہ کہ اس نے اس کا ارادہ کیا اور یہ معتزلہ کی تاویل ہے۔ اور قیادین اللہ میں فاداخل ہے کیونکہ ما بمعنی الذی ہے۔ یعنی وہ مصیبت جو تمہیں اس دن پہنچی جب دونوں لشکر مقابلے کے لئے نکلے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور قضا سے پہنچی۔ پس کلام شرط کے معنی کے مشابہ ہو گیا، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے: الذی قام فله درهم (جو کھڑا ہوا تو اس کے لئے ایک درہم ہے) وَلَيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَلَيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۝ یعنی تاکہ وہ (مومنین اور منافقین کو) الگ الگ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تاکہ مومنین کا ایمان جنگ میں ان کے ثابت قدم رہنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے اور تاکہ منافقین کا کفر ان کے (مصیبت پر) خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے پس وہ اسے جان لیں گے۔ اور قول باری تعالیٰ نَافَقُوا ۝ وَقِيلَ لَهُمْ سے اشارہ عبد اللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کی طرف ہے جو اس کی معیت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد و نصرت سے واپس لوٹ گئے تھے اور وہ تین سو تھے اور ان کے پیچھے عبد اللہ بن عمرو بن حرام انصاری اور ابو جابر بن عبد اللہ بھی چلے، تو آپ نے انہیں فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے نبی کو نہ چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کرو یا بچاؤ کرو اور اسی طرح کی بات کہی۔ ابن ابی نے آپ کو کہا: میں نہیں جانتا تھا کہ جنگ ہوگی اور اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہوتے۔ پس جب عبد اللہ ان سے مایوس ہو گیا تو اس نے کہا: (اے) اللہ کے دشمنو! تم جاؤ پس اللہ تعالیٰ اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے مستغنی کر دے گا۔ اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا گیا اور شہید کر دیا گیا رضی اللہ عنہ۔ (1)

قول باری تعالیٰ: اَوَاذُ فَعُوءَا کے معنی میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے پس سدی اور ابن جریج وغیرہا نے کہا ہے: تم ہماری تعداد میں اضافہ کرو اگرچہ تم ہمارے ساتھ مل کر جنگ نہ کرو۔ تو یہ دشمن کو روکنے اور اسے دور ہٹانے کا (سبب بن) جائے گا (2)، کیونکہ تعداد جب بڑھ جائے تو دشمن کو دور ہٹانے اور دفاع کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں نے جنگ قادسیہ کے دن حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم الاعمی کو دیکھا وہ زرہ پہنے ہوئے ہیں اور اس کی اطراف کھینچ رہے ہیں اور ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا جھنڈا ہے، تو ان کو کہا گیا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور نہیں قرار دیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! لیکن میں اپنی ذات کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر رہا ہوں۔ اور انہی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرا وجود کیسا ہے؟ (3)

اور ابو عون انصاری نے کہا ہے: اَوَاذُ فَعُوءَا کا معنی ہے رابطوا (سرحد کے پاس دشمن کے مقابلے میں پڑاؤ ڈالو) اور یہ معنی پہلے کے قریب ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ مقابلے میں پڑاؤ ڈالنے والا دفاع کرنے والا ہی ہوتا ہے، کیونکہ اگر سرحد پر پڑاؤ ڈالنے والوں کی جگہ نہ ہو تو یقیناً وہاں تک دشمن آجائے۔ اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اَوَاذُ فَعُوءَا یہ جنگ کی طرف دعوت ہے از روئے حمیت کے، کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے کی دعوت دی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہوگا۔

پس جب آپ نے دیکھا کہ وہ اس پر نہیں آرہے تو آپ نے ان پر ایک ایسی وجہ پیش کی جو انہیں غضب دلائے

اور خود داری کو ابھارے۔ یعنی یا سرحدوں کا دفاع کرتے ہوئے قتال کرو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ قرمان نے کہا ہے: قسم بخدا! میں نے قتال نہیں کیا مگر اپنی قوم کی عزت و شرف اور محاسن و مفاخر کی وجہ سے۔ اور کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ انصار میں سے کسی نے کہا احد کے دن جب اس نے قریش کو دیکھا: تحقیق میں نے سواری کو وادی قنات کی کھیتوں میں چھوڑ دیا، کیا بنی قیلہ کی کھیتیاں چرا لی جائیں گی۔ اور ہم باہم نہیں لڑیں گے؟ اور معنی یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں نہیں لڑتے تو اپنی جانوں اور عزت کو بچانے کے لئے لڑو۔

قوله تعالى: هُمْ لِلْكَفَرِ يَوْمَئِذٍ اقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ یعنی انہوں نے اپنا حال بیان کر دیا اور اپنے پردے چاک کر دیئے اور اپنے نفاق کو ظاہر کر دیا ہر اس کے لئے جو یہ گمان رکھتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں، پس وہ ظاہر حال میں کفر کے زیادہ قریب ہو گئے، اگرچہ وہ فی الحقیقت کافر تھے اور قوله تعالى: يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ یعنی انہوں نے ایمان ظاہر کیا اور کفر کو چھپا کر رکھا۔ اور افواہ (مونہوں) کا ذکر بطور تاکید ہے، جیسا کہ یہ قول ہے يَطْيِئُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ۔

الَّذِينَ قَالُوا لِلْإِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قَتَلُونَا قُلْ فَأَدْرَأُ عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٨١﴾

”جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں حالانکہ وہ خود (گھر) بیٹھے تھے کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ

مارے جاتے آپ فرمائیے ذرا دور تو کر دکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو۔“

قوله تعالى: الَّذِينَ قَالُوا لِلْإِخْوَانِهِمْ اس کا معنی ہے لأجل إخوانهم یعنی اپنے بھائیوں کے واسطے اور یہ وہ شہداء تھے جو قبیلہ خزرج میں سے قتل کئے گئے تھے اور وہ نسب اور مجاورت کے اعتبار سے بھائی تھے نہ کہ دین کے اعتبار سے۔ یعنی انہوں نے ان شہداء کے بارے میں کہا: اگر وہ بیٹھے رہتے مدینہ طیبہ میں تو نہ مارے جاتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا، یعنی یہ منافقین کی جانب سے ان کے بارے میں یہ اشکال اور اشتباہ ہے، وہ لوگ جو شہید کر دیئے گئے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے، تو وہ نہ قتل کئے جاتے۔

اور قول باری تعالیٰ: لَوْ أَطَاعُونَا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ قریش کی طرف نہ نکلتے۔

اور قوله تعالى: وَ قَعَدُوا یعنی انہوں نے یہ قول کیا اس حال میں کہ وہ خود جہاد سے رک کر (گھروں میں) بیٹھے ہوئے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ ان کا رد کیا: قُلْ، فَأَدْرَأُ عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ اے محمد! منہا ایہم آپ انہیں فرما دیجئے: اگر تم سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو دور کر دکھاؤ۔ اور الدُّرُکُ کا معنی الدُّفْعُ (دور کرنا) ہے اس سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ احتیاط اور ڈر تقدیر سے نہیں بچا سکتے۔ اور یہ کہ مقتول اپنی اجل کے ساتھ ہی مارا جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور جس کے بارے میں خبر دی ہے وہ بالیقین ہو کر رہنے والا ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ جس دن یہ کہا گیا اس دن ستر منافقین فوت ہوئے۔ اور ابولیت سمرقندی نے کہا ہے: میں نے سمرقند کے بعض مفسرین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے جب یہ آیت قُلْ فَأَدْرَأُ عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ نازل ہوئی تو اس دن منافقین میں سے ستر افراد مرے۔

وراء حجاب فقال له يا عبدی تتن اعطك قال يا رب فردني الى الدنيا فاقتل فيك ثانية فقال الرب تبارك و تعالیٰ انه قد سبق متی انهم (الیہا) لا يرجعون قال يا رب فأبدغ من ورائی (اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو زندہ کیا اور اسے بلا حجاب شرف کلام عطا فرمایا اور کسی نے بھی کبھی بلا حجاب کلام نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا اے میرے بندے! تو اپنی آرزو اور تمنا پیش کر میں تجھے وہ عطا کروں گا تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ میں تیری راہ میں دوبارہ قتل کیا جاؤں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا یہ تو پہلے ہو چکا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کی طرف نہیں لوٹائے جائیں گے تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو ان تک یہ خبر پہنچا دے جو میرے پیچھے ہیں) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَلَا يَ (1)۔ اے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے جامع میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

اور کعب نے سالم بن افسس سے اور انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءُ فرمایا: جب حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما شہید ہوئے اور انہوں نے وہ دیکھا جو خیر میں سے انہیں عطا کیا گیا تو انہوں نے کہا: کاش ہمارے بھائی اس خیر (اور انعام) کو جانتے جو ہمیں پہنچا ہے تاکہ جہاد میں ان کی رغبت (اور شوق) بڑھ جاتا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہاری طرف سے ان تک اسے پہنچا دوں گا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿۱۵﴾ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ۚ أَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۶﴾ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ وَفُضِّلَ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۷﴾ اور ابوالضحیٰ نے کہا ہے: یہ آیت خاص (2) اہل احد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور پہلی حدیث اس قول کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: یہ شہداء بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ چودہ افراد تھے آٹھ انصار میں سے تھے اور چھ مہاجرین میں سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ہر معونہ کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی ہے (3) اور ان کا قصہ مشہور ہے اسے محمد بن اسحاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: بے شک شہداء کے اولیاء (ورثاء) کو جب خیر و برکت اور فرحت و سرور حاصل ہوتا تو وہ افسوس کرتے اور کہتے: ہم تو نعمتوں اور خوشیوں میں ہیں اور ہمارے باپ، ہمارے بیٹے اور ہمارے بھائی قبروں میں ہیں (4)، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے غم اور کرب کو دور کرنے کے لئے اور انہیں اپنے شہداء کے حال کی خبر دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: المختصر اگرچہ یہ احتمال ہے کہ نزول مجموعی سبب کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں شہداء کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ زندہ ہیں جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور لامحالہ وہ مر چکے ہیں اور ان کے اجسام مٹی میں ہیں اور ان کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 206۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 185، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً

3۔ ایضاً

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 399، دارالکتب العلمیۃ بیروت

ارواح زندہ ہیں جیسا کہ تمام مومنین کی ارواح اور انہیں قتل کے وقت سے جنت میں رزق دیئے جانے کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے یہاں تک کہ گویا ان کے لئے دنیوی حیات دائمی ہوگی۔

تحقیق علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے اور وہ معنی جس پر عظیم علماء ہیں وہ وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور وہ یہ کہ شہداء کی حیات محقق اور ثابت شدہ ہے پھر ان میں سے کچھ کہتے ہیں: ارواح ان کی طرف ان کی قبروں میں لوٹائی جاتی ہیں اور وہ نعمتوں سے شاد کام ہوتے ہیں، جیسا کہ کفار کو ان کی قبروں میں زندہ کیا جاتا ہے اور انہیں عذاب دیا جاتا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: انہیں جنت کے پھلوں سے رزق دیا جاتا ہے، یعنی وہ اس کی ہوا پاتے ہیں حالانکہ وہ اس میں نہیں ہوتے (1)۔ اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ یہ مجاز ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جنت میں راحت و سکون اور نعمتوں کے مستحق ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: مامات فلان (فلاں نہیں مرا) یعنی زندہ اسے یاد کرتا رہا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

موتُ التقى حياةً لافناء لها قدمات قوم وهم في الناس احياء

مقی کی موت ایسی حیات ہے جس کے لئے فنا نہیں تحقیق قوم مرچکی ہے حالانکہ وہ لوگوں میں زندہ ہیں۔

پس معنی یہ ہے کہ انہیں اچھی تعریف کے ساتھ نوازا جاتا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: ان کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں اور وہ جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں اور انتہائی آسودہ اور عمدہ حالت میں رہتے ہیں۔ اقوال میں سے یہی صحیح ہے، کیونکہ دلیل نقلی کے مطابق جو صحیح ہے وہی واقع ہونے والا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اختلاف کو اٹھا رہی ہے اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور ہم نے اس بارے میں واضح اور تفصیلی ذکر کتاب التذکرۃ بأحوال الموتی و امور الآخرة میں کیا ہے۔ والحمد للہ۔

تحقیق ہم نے وہاں ذکر کیا ہے کہ شہداء کتنے ہیں اور یہ کہ ان کا حال مختلف ہے اور رہے وہ جنہوں نے شہداء کے بارے میں یہ تاویل کی ہے کہ وہ زندہ ہیں اس معنی میں کہ وہ عنقریب زندہ کئے جائیں گے تو یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے اور قرآن و سنت اس کا رد کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بَلْ أَحْيَاءُ ان کی حیات پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں اور رزق نہیں دیا جاتا مگر زندہ کو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے لئے ہر سال میں غزوہ کا ثواب لکھا جاتا ہے اور وہ ہر جہاد کے ثواب میں شریک ہوں گے جو بھی ان کے بعد یوم قیامت تک ہوگا کیونکہ وہ حکم جہاد پر عمل پیرا ہوئے (اور یہ سنت قائم کی) اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مِنْ أَجْلِ ذَٰلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآءِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا (المائدہ: 32) (اسی وجہ سے) (حکم) لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جس نے قتل کیا کسی انسان کو۔ اس کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کیونکہ ان کی ارواح یوم قیامت تک عرش کے نیچے رکوع و سجود کرتی رہیں گی ان زندہ مومنین کی ارواح کی طرح جو وضو کی حالت پر رات گزارتے ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کیونکہ شہید قبر میں بوسیدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے زمین کھا سکتی ہے۔ اور ہم نے اس کا ذکر بھی التذکرہ میں کیا ہے۔ اور یہ کہ زمین انبیاء علیہم السلام، شہداء، علماء، نیکوکار اور مخلص موزن اور حفاظ قرآن کو نہیں کھا سکتی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب شہید حکماً زندہ ہے تو اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے، جیسا کہ وہ زندہ جس میں قوت حس موجود ہو (اس پر نماز نہیں پڑھی جاتی۔ علماء نے شہداء کے غسل اور ان پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ثوری رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ تمام شہداء کو غسل دیا جائے اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھی جائے، سوائے اس کے جو خالصہ دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے میدان جنگ میں قتل ہو جائے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم انہیں ان کے خون سمیت دفن کر دو۔“ مراد احد کا دن ہے۔ اور آپ نے انہیں غسل بھی نہ دلایا، اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء احد کے بارے حکم ارشاد فرمایا کہ ان سے ہتھیار اور زرہیں اتار لی جائیں اور انہیں خون اور ان کے کپڑوں سمیت دفن کر دیا جائے (2) اور اسی کے مطابق امام احمد، اسحاق، اوزاعی، داؤد بن علی، فقہاء امصار کی جماعت، اہل حدیث اور ابن علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب اور حسن نے کہا ہے: انہیں غسل دیا جائے گا۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا ہے: شہداء احد کو ان کی کثرت کی وجہ سے غسل نہیں دیا گیا اور (اسی زیادہ نے) اس سے مشغول رکھا۔ ابو عمر نے کہا ہے: حضرت سعید اور حسن کے اس قول کے مطابق عبید اللہ بن حسن عنبری کے سوا فقہاء امصار میں سے کسی نے بھی قول نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے شہداء احد کو غسل نہ دینے کی یہ علت ذکر کی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا ولی اور وارث تھا جو اس کے ساتھ مشغول ہو کر اس کے معاملات کو سرانجام دے سکتا تھا۔ اس میں علت..... واللہ اعلم..... وہ ہے جو فی دمائہم والی حدیث میں ہے۔ ”کہ وہ (خون) قیامت کے دن کستوری کی خوشبو کی طرح ہوگا (3)۔“ تو اس سے ظاہر ہوا کہ (غسل نہ دینے کی) علت شغل نہیں ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے جس نے اس بارے میں کہا اور نہ ہی اس مسئلہ کا قیاس اور نظر و فکر میں کوئی دخل ہے، بلکہ یہ تو خالصہ اس اثر کی اتباع اور پیروی کا مسئلہ ہے جسے تمام نے شہداء احد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہیں غسل نہیں دیا گیا۔ بعض متاخرین نے جنہوں نے حسن کا مذہب اختیار کیا ہے انہوں نے شہداء احد کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: انا شہید علی ہولاء یوم القیامۃ میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا (فرمایا (4): یہ ان کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ان کے سوا کوئی اور شریک نہ ہوگا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ شذوذ سے مشابہت رکھتا ہے اور ان کے غسل کو ترک کرنے کے بارے قول زیادہ اولیٰ ہے،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 179۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1503، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 393۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 2593، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ وہ شہداء احد اور ان کے علاوہ دوسروں کے بارے میں حضور نبی مکرم ﷺ سے ثابت ہے۔ اور ابو داؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کو اس کے سینہ یا اس کے حلق میں تیر مارا گیا اور وہ فوت ہو گیا تو وہ جیسے تھا اسی طرح اسے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا۔ فرمایا: اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ (1)

مسئلہ نمبر 3۔ رہی شہداء پر نماز جنازہ! تو اس کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک، لیث، امام شافعی، امام احمد اور داؤد رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم ﷺ شہداء احد میں سے دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے تھے پھر آپ فرماتے: ”ان میں سے قرآن کریم زیادہ جمع کرنے والا کون ہے؟“ پس جب آپ ﷺ کے لئے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تو آپ اسے لحد میں آگے رکھتے اور آپ نے فرمایا میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا۔“

اور آپ نے انہیں ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا اور انہیں غسل نہ دیا گیا اور نہ ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی (2)۔ اور کوفہ، بصرہ اور شام کے فقہاء نے کہا ہے: ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور انہوں نے بہت سے آثار و روایت کئے ہیں ان میں سے اکثر روایات مرسل ہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور تمام شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی۔ (3)

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ شہید کو جب زندہ اٹھالیا جائے اور وہ میدان جنگ میں نہ مرے اور کچھ دیر زندہ رہے اور کچھ کھائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا۔

اور علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے جسے ظلماً قتل کیا گیا جیسا کہ وہ جسے خارجیوں اور ڈاکوؤں وغیرہ نے قتل کر دیا ہو، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور ثوری رحمہم اللہ نے کہا ہے: ہر وہ جسے ظلماً قتل کیا گیا اسے غسل نہ دیا جائے لیکن اس پر اور ہر شہید پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور یہی قول تمام اہل عراق کا ہے۔ اور انہوں نے بہت سے صحیح طرق سے زید بن صوحان سے روایت کیا ہے اور یہ جنگ جمل میں شہید ہوئے تھے۔ تم مجھ سے کپڑے نہ اتارنا اور نہ ہی مجھ سے خون کو دھونا۔ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے زید بن صوحان کے قول کی مثل ہی کہا ہے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں شہید کئے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں غسل نہیں دیا۔ اور امام شافعی کے دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے (شہید کو) دیگر تمام مردوں کی طرح غسل دیا جائے گا سوائے اس کے جسے اہل حرب نے قتل کیا ہو اور یہی امام مالک کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: اسے غسل نہیں دیا جائے گا جسے کفار نے قتل کیا اور وہ میدان جنگ میں ہی فوت ہو گیا۔ اور ہر وہ مقتول جو میدان جنگ میں قتل نہ کیا گیا ہو..... لیکن اسے کفار نے قتل کیا ہو..... تو اسے غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 92۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ایضاً

3۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1258، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پڑھنی جائے گی اور یہی امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے اور امام شافعیؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ باغیوں کے مقتول کو غسل نہیں دیا جائے گا اور امام مالکؒ کا قول زیادہ صحیح ہے، بلاشبہ مردوں کو غسل دینا اجماع اور تمام کے نقل کرنے سے ثابت ہے۔ پس ہر میت کو غسل دینا واجب ہے سوائے اس کے جسے اجماع یا سنت ثابتہ نے (اس حکم سے) خارج کیا ہو۔ وبالله التوفیق۔

مسئلہ نمبر 5۔ دشمن جب صبح کے وقت کسی قوم پر ان کے گھروں میں حملہ کر دے اور انہیں اس کے بارے علم نہ ہو اور وہ ان میں سے بعض کو قتل کر دے تو کیا ان کا حکم میدان جنگ میں قتل ہونے والوں کے حکم کی طرح ہوگا یا عام مردوں کے حکم کی مثل، یہ مسئلہ ہمیں قرطبہ میں پیش آیا (اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ ہمارے پاس لائے) دشمن..... اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے۔ نے تین رمضان المعظم ۶۲ھ کی صبح کو حملہ کیا لوگ اپنے گھروں میں ابھی غفلت میں تھے، تو اس نے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو قید کر لیا، ان افراد میں سے جنہیں شہید کیا گیا میرے والد رحمہ اللہ بھی تھے، تو میں نے اپنے شیخ المقرئ الاستاذ ابو جعفر احمد المعروف بابی حجتہ سے (یہ مسئلہ) پوچھا تو انہوں نے فرمایا، انہیں غسل بھی دو اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھو، کیونکہ تمہارے والد میدان جنگ میں دو لشکروں کی صفوں کے درمیان شہید نہیں کئے گئے۔ پھر میں نے اپنے شیخ ربیع بن عبد الرحمن بن احمد بن ربیع بن ابی سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلاشبہ اس کا حکم میدان جنگ میں قتل ہونے والے کا ہی حکم ہے، پھر میں نے قاضی الجماعة ابا الحسن علی بن قطرال سے پوچھا اور ان کے پاس فقہاء کی ایک جماعت موجود تھی تو انہوں نے جواب دیا: اسے غسل دو اور کفن پہناؤ اور اس پر نماز جنازہ پڑھو۔ میں نے اسی طرح کیا۔ پھر اس کے بعد ”البقرہ“ وغیرہا میں اس مسئلہ پر (صحیح طرح) واقف ہوا جو کہ ابوالحسن اللخمی کی کتاب ہے اور اگر میں اس سے پہلے اس پر واقف ہو جاتا تو میں انہیں غسل نہ دیتا اور میں انہیں خون سمیت انہی کپڑوں میں دفن کر دیتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونے اور اس میں شہادت پانے کا ثواب عظیم اور بہت زیادہ ہونے پر دلالت کرتی ہے یہاں تک کہ یہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونا ہر شے کو مٹا دیتا ہے سوائے قرض کے اسی طرح مجھے جبریل امین علیہ السلام نے ابھی بتایا ہے (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ دین (قرض) کا ذکر اس پر تنبیہ ہے کہ وہ حقوق بھی اسی کے معنی میں ہیں جو مذمت سے متعلق ہیں۔ مثلاً غصب، باطل طریقے سے مال لینا، عدا کسی کو قتل کرنا اور زخمی کرنا اور دیگر ایسے امور جو ان کے تابع ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک قرض کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے کہ اسے جہاد کے سبب نہ بخشا جائے کیونکہ وہ زیادہ شدید اور سخت ہے اور ان تمام میں قصاص نیکوں اور برائیوں کے ساتھ ہے جیسا کہ اس بارے میں سنہ ثابتہ وارد ہیں۔

عبداللہ بن انیسؒ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”اللہ تعالیٰ بندوں کو یا فرمایا لوگوں کو اٹھائے گا، ہام کو شک ہے (کہ آپ نے لفظ العباد کہا یا الناس کہا) اور اپنے دست مبارک کے ساتھ شام کی طرف اشارہ کیا..... ننگے بدن، غیر مختون اور بھم۔ ہم نے عرض کی: بھم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان کیساتھ کوئی شے نہ

ہوگی۔ پس انہیں ایسی آواز کے ساتھ ندا دی جائے گی جسے ہر قرب و بعد والا سنے گا میں بادشاہ ہوں، میں حاکم (اور) حساب لینے والا ہوں اہل جنت میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو در آنحالیکہ اہل نار میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو اور اہل نار میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جہنم میں داخل ہو در آنحالیکہ اہل جنت میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو حتیٰ کہ ایک تھپڑ ہی ہو۔ راوی نے کہا ہم نے عرض کی: کیسے ممکن ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آئیں گے ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون۔

آپ نے فرمایا: ”نیکوں اور برائیوں کے ساتھ (1)“ اسے حارثہ بن ابی اسامہ نے نقل کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟“ انہوں نے عرض کی: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ہی ساز و سامان۔ تو آپ نے فرمایا: ”بلاشبہ میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نمازیں، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ (نیک اعمال) ساتھ لے کر آئے گا اور پھر ایک (آدمی) آئے گا (اور کہے گا) اس نے گالیاں دی ہیں (دوسرا آئے گا اور کہے گا) اس نے تہمت لگائی ہے (ایک اور آئے گا اور کہے گا) اس نے اس کا مال کھایا ہے، (ایک اور آ کر کہے گا) اس نے اس کا خون بہایا ہے۔ (ایک اور آ کر کہے گا) اس نے اسے مارا ہے۔ پس اسے اس کی نیکیوں میں سے دی جائیں گی اور دوسرے کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی پس اگر اس کی نیکیاں جو کچھ اس کے ذمہ ہے وہ پورا ہونے سے پہلے ختم ہو گئیں تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے پھر اسے آتش جہنم میں پھینک دیا جائے گا (2)۔“ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا جائے پھر اسے زندہ کیا جائے، پھر اسے قتل کیا جائے، پھر اسے زندہ کیا جائے پھر اسے قتل کیا جائے در آنحالیکہ اس پر قرض ہو تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے۔ (3)“ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بندہ مؤمن کا نفس اس کے ساتھ معلق ہے جو اس پر قرض ہے۔ (4)“ اور احمد بن زہیر نے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت یحییٰ بن معین سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ صحیح ہے۔ اور اگر کہا جائے یہ تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ بعض شہداء قتل کے وقت سے جنت میں داخل نہ ہوں گے اور نہ ان کی ارواح پرندے کے پیٹ میں ہوں گی جیسا کہ تم نے ذکر کیا ہے اور نہ ہی وہ اپنی قبور میں ہوں گے، تو پھر وہ کہاں ہوں گے؟ تو ہم نے کہا: حضور نبی مکرم ﷺ سے یہ حدیث موجود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”شہداء کی ارواح جنت کے دروازے کے ساتھ ایک نہر پر ہوں گی اسے بارق کہا جاتا ہے۔ ان پر ان کا رزق صبح و شام جنت سے نکالا جاتا ہے (5)۔“

2۔ صحیح مسلم، کتاب الہد و الصلۃ، جلد 2، صفحہ 320،

1۔ المسند رک، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 475، حدیث نمبر 3638

3۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 53

4۔ شعب الایمان، فی قبض البیہان الاحوال المعرفۃ، جلد 4، صفحہ 401، حدیث نمبر 5543

5۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبد اللہ بن عباس، جلد 1، صفحہ 266

شاید یہ وہی ہوں۔ واللہ اعلم۔ اسی وجہ سے امام ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ طبقات اور مختلف احوال ہیں جن کا مجموعہ یہ ہے کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں۔

وہ رزق دے جاتے ہیں۔
اور امام ابو عبد اللہ بن محمد بن یزید بن ماجہ القزوی نے اپنی سنن میں حضرت سلیم بن عامر سے روایت کیا ہے انہوں نے
کہا: میں نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ”سمندر کا
ایک شہید خشکی کے دو شہیدوں کی مثل ہے اور سمندر میں (دو آدمی جس کا) سر چکرا رہا ہو وہ خشکی میں اس کی طرح ہے جو اپنے
خون میں لت پت ہو اور جو دو موجوں کے درمیان ہو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں دنیا سے منقطع ہونے والے کی
طرح ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو قبض کرنے کے لئے ملک الموت کو مقرر فرمایا ہے سوائے سمندر میں شہید ہونے
والوں کے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ارواح کو خود قبض کرتا ہے اور خشکی کے شہید کے تمام گناہوں کی مغفرت فرما دیتا ہے سوائے
قرض کے اور سمندر میں شہید ہونے والے کے تمام گناہ اور قرض بھی بخش دیتا ہے (1)۔“

مسئلہ نمبر 7۔ وہ قرض جس کے سبب مقروض کو جنت سے روک دیا جائے گا..... واللہ اعلم۔ وہ وہ ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے مال چھوڑا اور اس کے بارے وصیت نہ کی ہو یا وہ ادائیگی پر قادر ہو لیکن اس نے ادا نہ کیا اس نے اسراف یا بیوقوفی کی بنا پر قرض لیا اور مر گیا اور اسے ادا نہ کیا۔ اور رہا وہ آدمی جس نے واجب حق کو پورا کرنے کے لئے فاقہ کشی اور تنگ دستی کی وجہ سے قرض لیا اور مر گیا اور اس نے اسے ادا کرنے کے لئے کچھ نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت سے نہیں روکے گا ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ سلطان وقت پر فرض ہے کہ وہ اس کی طرف سے اس کا قرض ادا کرے، چاہے تو جملہ صدقات میں سے یا غارمین کے حصہ سے یا اس مال فی سے جو مسلمانوں کو (صلح کے ساتھ) کہیں سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے قرض یا عیال (محتاجی) چھوڑی تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے (2)۔ ہم نے اس باب کی مزید وضاحت کتاب ”التذکرہ“ میں کی ہے۔ واللہ۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: عِنْدَ سَاتِهِمْ يُرْزَقُونَ اس میں مضاف محذوف ہے تقدیر عبارت ہے عند کرامۃ ربہم۔ اور یہاں عِنْدَ غایت قرب کا تقاضا کرتا ہے، پس یہ ”لدی“ کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تصغیر نہیں بنائی گئی کہ کہا جائے! عُنْدِ، یہ سیمویہ نے کہا ہے۔ تو یہ غایت قرب (عندیہ) کرامت کے اعتبار سے ہے نہ کہ مسافت اور قرب کے اعتبار سے۔ اور يُرْزَقُونَ سے مراد وہ رزق ہے جو عرف میں معروف ہے اور جس نے کہا ہے: اس سے مراد حیات الذکر ہے اس نے کہا ہے کہ انہیں شامیل (اچھی تعریف) کا رزق دیا جاتا ہے۔

اور پہلا معنی حقیقت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ارواح جس حالت میں جنت کی ہواؤں، خوشبوؤں، نعمتوں اور اس کی

1۔ سفن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 204۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2767، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2- سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176

ایضاً صحیح بخاری، باب من تکفل عن میت دینا فلیس له ان یرجع، حدیث 2133، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

فرحت و انبساط میں چلتی ہیں تو وہ ان چیزوں کا ادراک رکھتی ہیں جو ارواح کے لائق اور مناسب ہوتی ہیں، ان میں سے جن میں نفع اٹھایا جاسکتا ہے اور ان کے سبب زندہ اور بلند رہا جاسکتا ہے۔ اور وہیں لذات جسمانیہ تو ان ارواح کو جب ان کے اجساد کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ ان تمام نعمتوں سے پوری ہو جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں۔ اور یہ اچھا قول ہے، اگرچہ اس میں مجاز کی نوع بھی ہے، اور یہ اس کے موافق ہے جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے۔ والہو فوق الالہ اور فرحین۔ یَزِدُّ قُوَّةً کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور کلام میں اُحْیَاء کی صفت ہونے کی بنا پر ”فرحون“ بھی جائز ہے اور یہ فرح بمعنی سرور سے ماخوذ ہے۔ اور اس آیت میں فضل سے مراد وہی مذکورہ نعمتیں ہیں۔ اور ابن السمیق نے فَاَرِحَہِ کو الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ الف، الفارہ، الحذر اور الحاذر، الطبع اور الطامع اور البخل اور الباخل۔ نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں اس کا رفع پڑھنا جائز ہے، کیونکہ یہ اُحْیَاء کی صفت ہو سکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ اس کا معنی ہے جو فضل میں ان سے نہیں آئے، اگرچہ ان کے لئے فضل (اور مرتبہ) ہے۔ اور (يَسْتَبْشِرُونَ) کی اصل البشرة سے ہے، کیونکہ انسان جب فرحت و انبساط میں ہوتا ہے تو خوشی اور سرور کا اثر اس کے چہرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: شہید کے پاس ایک کتاب لائی جاتی ہے جس میں اس کے بھائیوں میں سے اس کے پاس آنے والوں کا ذکر ہوتا ہے، تو وہ خوش ہو جاتا ہے جیسا کہ اہل غائب دنیا میں اس کے آنے کے ساتھ خوش ہوتا ہے (1)۔

اور حضرت قتادہ، ابن جریج اور ربیع وغیرہ نے کہا ہے: ان کا خوش ہونا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارے وہ بھائی جنہیں ہم نے دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑا وہ اپنے نبی کی معیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں اور شہید ہو رہے ہیں پس وہ بھی ہماری طرح کی عزت و کرامت پارہے ہیں، پس وہ اسی کے سبب سرور اور خوش ہو رہے ہیں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ لوگ ابھی پیچھے سے انہیں نہیں ملے ان کے لئے خوشی کے اظہار سے اشارہ تمام مومنین کی طرف ہے اگرچہ وہ قتل نہ کئے جائیں، کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر و ثواب کو دیکھتے ہیں تو انہیں یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ دین اسلام ہی وہ حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ اجر و ثواب عطا فرمائے گا، پس وہ اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان پر خوش ہوتے ہیں جو اس نے انہیں عطا فرمایا ہے اور وہ مومنین کے لئے بھی خوش ہوتے ہیں کہ نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اس معنی کو زجاج اور ابن نورک نے اختیار کیا ہے (3)۔

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ وَفَضْلِهِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥١﴾

”خوش ہو رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل پر اور (اس پر) کہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر ایمان

والوں کا۔“

یعنی وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنت پر۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت (کے

(حصول) پر (خوش ہو رہے ہیں) وَفَضْلُ یہ بیان کی زیادتی کے لئے ہے اور فضل بھی نعمت میں داخل ہے، اور اس میں اس (نعمت) کے وسیع ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ نعمت دنیا کی نعمتوں کی طرح نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نعمت کے بعد فضل کا ذکر بطور تاکید ہوا ہے، ترمذی نے حضرت مقدم بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہید کی چھ خصلتیں ہیں، اسی طرح ترمذی میں ہے اور ابن ماجہ میں ”ست“ (چھ) ہیں اور یہ تعداد میں سات ہیں۔ اس کی پہلی ہی بار (خون کا قطرہ زمین پر گرتے وقت) مغفرت کر دی جاتی ہے اور وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیتا ہے اور اسے عذاب قبر سے بچا لیا جاتا ہے اور وہ بڑی گھبراہٹ سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے سر پر یاقوت سے بنا ہوا وقار کا تاج رکھا جائے گا جو دنیا اور اس کی جملہ نعمتوں سے بہتر (اور ذی قدر) ہوگا اور حور عین میں سے بہتر کے ساتھ اس کی شادی کی جائے گی اور اس کے ستر رشتہ داروں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔“ فرمایا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے (1) اور یہی نعمت اور فضل کی تفسیر ہے۔

اور اس معنی میں آثار بہت زیادہ ہیں اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: تلواریں جنت کی چابیاں ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے شہداء کو پانچ کرامات کے ساتھ عزت و شرف عطا فرمایا ہے، اس نے ان کے ساتھ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو مشرف نہیں فرمایا اور نہ ہی مجھے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ارواح ملک الموت نے قبض کی ہیں اور وہی عنقریب میری روح بھی قبض کرے گا اور رہے شہداء، تو ان کی ارواح اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ قبض کرتا ہے جیسے چاہتا ہے اور ان کی ارواح پر ملک الموت علیہ السلام کو مسلط نہیں کرتا اور دوسری یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو وصال کے بعد غسل دیا گیا ہے اور مجھے بھی وصال کے بعد غسل دیا جائے گا لیکن شہداء کو غسل نہیں دیا جاتا اور نہ انہیں دنیوی پانی کی حاجت اور ضرورت ہے اور تیسری یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو کفن دیئے گئے ہیں اور مجھے بھی کفن دیا جائے گا اور شہداء کو کفن نہیں دیا جائے گا بلکہ انہیں انہی کے کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے اور چوتھی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب فوت ہوئے تو انہیں اموات کا نام دیا گیا اور جب میرا وصال ہوگا تو کہا جائے گا قدمات (آپ فوت ہو گئے ہیں) لیکن شہداء کو موتی کا نام نہیں دیا جاتا اور پانچویں یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو قیامت کے دن شفاعت کا اختیار دیا جائے گا اور میری شفاعت بھی قیامت کے دن ہوگی لیکن شہداء ہر روز ان کے بارے میں شفاعت کرتے ہیں جن کی وہ شفاعت کر سکتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَآَنَّ اللّٰهَ كَسَاٰی نے اسے الف کے کسرہ کے ساتھ اِنْ پڑھا ہے اور باقیوں نے نصب کے ساتھ، (2) پس جنہوں نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے (تو اس کے مطابق) اس کا معنی یہ ہے یَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ وَیَسْتَبْشِرُونَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ (وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اور اس پر وہ خوش ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کا

1۔ جامع ترمذی، فضائل الجہاد، جلد 1، صفحہ 200-199۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب فضل الشہادۃ فی سبیل اللہ، حدیث 2788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 401

اجر ضائع نہیں کرتا) اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ ابتدائے کلام میں آنے کی بنا پر ہے اور اس کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے وَاللّٰهُ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِينَ احْسَنُوا مِنْهُمْ
وَاتَّقُوا اَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٤٢﴾

”جنہوں نے لبیک کہا اللہ اور رسول کی دعوت پر اس کے بعد کہ لگ چکا تھا انہیں (گہرا) زخم ان کے لئے جنہوں نے نیکی کی ان میں سے اور تقویٰ اختیار کیا اجر عظیم ہے۔“

الَّذِينَ مَبْتَدَا هُوَ فِي بِنَا بِمَحَلِّ رَفْعٍ فِي هُوَ، اور اس کی خبر مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو، اس صورت میں یہ الْمُؤْمِنِينَ سے يٰۤاَلَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا سَے بدل ہوگا۔ اسْتَجَابُوا یعنی آجابهوا ہے اور اس میں سین اور تادونوں زائدہ ہیں۔ اور اسی معنی میں یہ قول بھی ہے۔

فَلَمْ يَسْتَجِبْهُ عِنْدَ ذٰلِكَ مُجِيبٌ

(پس اس وقت جواب دینے والے نے جواب نہ دیا)

اور صحیحین میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا: مجھے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تیرا باپ ان میں سے تھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول معظم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہی اس کے بعد کہ انہیں گہرا زخم لگ چکا تھا یہ مسلم کے الفاظ ہیں (1)۔

اور انہی کی وساطت سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: اے میرے بھانجے! تیرے دونوں باپ..... یعنی حضرت زبیر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما..... ان میں سے تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول معظم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہی اس کے بعد کہ انہیں گہرا زخم لگ چکا تھا اور انہوں نے فرمایا: جب مشرک میدان احد سے واپس لوٹے اور حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کو وہ مصیبت اور اذیت پہنچی جو انہیں پہنچی تو آپ کو خوف لاحق ہوا کہ (ممکن ہے) وہ واپس پلٹ آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کون ان کے مقابلہ کی دعوت پر لبیک کہے گا تا کہ یہ جان لیں کہ ہمارے پاس قوت ہے؟“ پس حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما ان ستر افراد میں تھے جو اس کے لئے تیار ہوئے، چنانچہ یہ اس قوم کے پیچھے نکلے اور انہیں اپنی آواز پہنچائی اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس لوٹے۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو غزوہ حراء الاسد میں پیش آیا۔ اور یہ مدینہ طیبہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور وہ اس طرح ہوا کہ جب اتوار کا دن تھا اور یہ غزوہ احد کا دوسرا دن تھا، رسول اللہ ﷺ نے لوگوں میں مشرکین کا پیچھا کرنے کا اعلان کیا اور فرمایا: ”ہمارے ساتھ صرف وہی نکلے گا جو کل اس میں حاضر تھا۔“ تو آپ ﷺ کے ساتھ مومنین میں سے دو سو آدمی اٹھے۔ بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ”کون ان کے پیچھے جائے گا؟“ تو ان میں سے ستر آدمی تیار ہوئے۔ فرمایا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 282۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الذین استموا باللہ والرسول، حدیث نمبر 3789، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (1)، یہاں تک کہ آپ حمراء الاسد پہنچ گئے، دشمن کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لئے، ان میں ایسا بھی تھا جو زخم لگنے کے سبب شدید تکلیف میں تھا وہ چلنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا اور وہ کوئی سواری بھی نہ پاتا تھا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اور یہ تمام کے تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی اور جہاد کی رغبت میں تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی عبد الاشمل کے دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ دونوں زخم لگنے کے سبب انتہائی کمزور اور نحیف تھے، ان میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی پر ٹیک اور سہارا لگا کر چلتا تھا اور یہ دونوں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، پس جب حمراء الاسد پہنچے، تو نعیم بن مسعود ان سے ملا اور اس نے انہیں یہ خبر دی کہ ابوسفیان ابن حرب اور جو قریش کے افراد اس کے ساتھ ہیں وہ لشکر جرار کی صورت میں اکٹھے ہیں اور انہوں نے اپنی رائے کو اس پر پختہ کر لیا ہے کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ کر آئیں اور وہاں کے باسیوں کو ہلاک و برباد کر دیں، تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے بارے میں خبر نہیں دی ہے: حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ اور اسی اثنا میں کہ قریش اس رائے پر جمع ہو چکے تھے کہ اچانک ان کے پاس معبد الخزاعی آگیا اور قبیلہ خزاعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف اور آپ کی نصیحتوں کا راز داں تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا حال اور جس کیفیت پر وہ تھے اسے دیکھ چکا تھا اور جب اس نے قریش کے واپس پلٹنے کے عزم کو دیکھا تا کہ وہ اہل مدینہ کو تباہ و برباد کر دے تو اسے اس کا خوف لاحق ہو گیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کے اصحاب کے لئے اس کے اخلاص نیت نے اسے اس سے برا ہیختہ کیا کہ وہ قریش کو ڈرائے چنانچہ اس نے انہیں کہا: میں نے ابھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حمراء الاسد کے مقام پر بہت بڑے لشکر کی صورت میں چھوڑا ہے اور جو کوئی ان سے پیچھے رہ گیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ جمع ہو چکا ہے اور وہ تم پر (غصہ سے) جلے ہوئے ہیں، پس تم بچ جاؤ بچ جاؤ! پس میں تجھے اس سے روک رہا ہوں، قسم بخدا! جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے اس پر ابھارا ہے کہ میں اس کے بارے میں کچھ اشعار لکھوں۔

اس (ابوسفیان) نے پوچھا: تو نے کیا کہا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے کہا ہے:

كَادَتْ تُهْدُ مِنَ الْأَصْوَاتِ رَاحِلَتِي إِذْ سَالَتِ الْأَرْضُ بِالْجُرْدِ الْآبَابِيلِ

قریب تھا کہ میری سواری کا جانور لشکروں کے شور و غل کی ہولناکی کی وجہ سے گر پڑتا جب زمین پر جوق در جوق کم مو گھوڑوں کا سیلاب آگیا۔

تُرْدِي بِأَسْدٍ كَرَامٍ لَا تَنَابِلَةٌ عِنْدَ الْبِقَاءِ وَلَا مِيلٌ مَعَاذِلِ

جوا یسے ذی شان شیروں کو اٹھائے دوڑ رہے تھے جو مقابلہ کے وقت نہ سست اور بزدل ہوں گے اور نہ ہتھیاروں سے خالی ہوں گے۔

فَقَلْتُ عَدُوًّا أَظُنُّ الْأَرْضَ مَائِلَةً لَنَا سَمَوًا بِرَيْسٍ غَيْرِ مَخْذُولِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 3769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جب وہ گھوڑے ایک ایسے سردار کے ساتھ بلند ہوئے جو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا تھا۔
تو میں تیز دوڑنے لگا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جھکی جا رہی ہے۔

فَقُلْتُ وَيْلَ ابْنِ حَرْبٍ مِّنْ لِّقَائِكُمْ إِذَا تَغَطَّطَتِ الْبَطَحَاءُ بِالْخَيْلِ
میں نے کہا تمہاری ملاقات سے ابوسفیان بن حرب کے لئے ہلاکت ہے جب وادی بطحاء گھوڑوں سے تھر تھرا اٹھے گی۔
اِنِّى نَذِيْرٌ لِّاَهْلِ الْبَسَلِ ضَاحِيَةً لِّكُلِّ ذِي اِرْبَةٍ مِنْهُمْ وَّ مَعْقُولٍ
بے شک میں سورج کی دھوپ میں چمکنے والی سرزمین کے رہنے والوں (یعنی قریش مکہ) میں سے ہر صاحب عقل و دانش کو
ڈرانے والا ہوں۔

مِنْ جَيْشِ اَحْمَدَ لَا وَخَشَ قَنَابِلُهُ وَّ لَيْسَ يُوصَفُ مَا اُنْذَرْتُ بِالْقِيلِ (1)
(سیدنا) احمد (مجتبیٰ علیہ السلام) کے لشکر سے جوست اور کوتاہ قد نہیں ہیں اور جس بات سے میں نے ڈرایا ہے اسے الفاظ میں
بیان نہیں کیا جاسکتا۔

پس اس طرح اس نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو واپس لوٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور
وہ ڈرتے ہوئے تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ اس حال میں
مدینہ منورہ کی طرف لوٹے کہ آپ کی مدد و نصرت فرمائی گئی تھی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمَسَّ لَهُمْ سُوءٌ اس میں سوء سے مراد قتال اور
رعب ہے (آل عمران: 174) ("ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ" واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ
چھوٹا ان کو کسی برائی نے) اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی معیت میں نکلنے کی اجازت
طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ اس واپس پلٹنے کے ساتھ انہیں اجر عظیم
حاصل ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ یہ غزوہ ہے۔"

یہی جمہور نے اس آیت کی تفسیر کی ہے اور حضرت مجاہد اور عکرمہ رضی اللہ عنہما کا قول شاذ ہے ان دونوں نے کہا ہے: بے شک یہ
آیت اس قول میں سے ہے: اَلْذِّئْنِ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ تا قولہ عَظِيمٌ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر صغریٰ کی
جانب خروج کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے ابوسفیان کے اس وعدہ کے مطابق جو اس نے
میدان احد میں کیا تھا، کیونکہ اس نے کہا تھا: آنے والے سال ہمارا مقابلہ میدان بدر میں ہوگا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا: "تم جواباً کہو: ہاں (ہمیں منظور ہے۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں بہت بڑی منڈی لگی
ہوئی تھی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دراہم عطا فرمائے۔" اور آپ بدر کے قریب جا پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے
پاس نعیم بن مسعود اشجعی آیا اور اس نے آپ کو خبر دی کہ قریش جمع ہو چکے ہیں اور آپ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آئے

ہوئے ہیں وہ اور جو ان کی طرف منسوب ہیں، پس اس وجہ سے مسلمان خوفزدہ ہو گئے، لیکن انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ پس وہ چلتے رہے یہاں تک کہ بدر میں پہنچ گئے۔ اور وہاں کسی ایک کو بھی نہ پایا۔ اور انہوں نے منڈی اور بازار لگا ہوا پایا پس انہوں نے اپنے دراہم کے ساتھ کچھ چمڑہ اور سامان تجارت خریدا اور واپس لوٹ گئے۔ اور انہوں نے کوئی جنگ اور مکر نہ پایا اور اپنی تجارت میں نفع کمایا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَيْهِمْ وَعِنَّا الْيَوْمَ الْغَالِبُونَ۔ اور انہوں نے اپنے دین کے لئے اللہ تعالیٰ سے نصرت مانگی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کو فتح عطا فرمائی۔ (1)۔ واللہ اعلم۔

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿٢٥﴾

”یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کہا انہیں لوگوں نے کہ بلاشبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لئے (بڑا سامان اور لشکر) سو ڈرو ان سے (اس دھمکی نے) بڑھا دیا ان کے (جوش) ایمان کو اور انہوں نے کہا: کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ اور وہ بہترین کارساز ہے۔“

اس قول باری تعالیٰ: الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس حضرت مجاہد، مقاتل، عکرمہ اور کلبی رحمہم اللہ نے کہا ہے: وہ (کہنے والا) نعیم بن مسعود اشجعی تھا (2)۔ یہ لفظ عام ہے اور اس کا معنی خاص ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: اَمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ لِعَنِ النَّاسِ (الناس سے مراد) حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سدی نے کہا: وہ ایک اعرابی تھا جس کے لئے اس کام پر اجرت مقرر کی گئی تھی۔ اور ابن اسحاق اور ایک جماعت نے کہا ہے: الناس سے مراد عبدالقیس کے سواروں کا قافلہ ہے، وہ ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو اس نے انہیں مسلمانوں کی طرف ایک سازش کے تحت بھیجا تا کہ وہ انہیں اس سے باز رکھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الناس سے مراد منافقین ہیں۔ سدی نے کہا ہے: جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ابوسفیان کی مقرر کردہ میعاد کے مطابق بدر الصغریٰ کی طرف چلنے کے لئے تیار ہوئے تو ان کے پاس منافقین آئے اور انہوں نے کہا: ہم تمہارے وہی ساتھی ہیں جنہوں نے تمہیں ان کی طرف نکلنے سے منع کیا تھا اور تم نے ہماری تجویز نہ مانی تھی اور پھر انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں میں آکر قتل کیا اور وہ کامیاب ہوئے اور اگر تم ان کے پاس ان کے گھروں میں گئے تو تم میں سے کوئی ایک بھی واپس لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تو انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) اور ابو معشر نے کہا ہے: اہل تہامہ میں سے قبیلہ ہذیل کے کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ابوسفیان کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا: قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ تحقیق کافروں نے تمہارے لئے بہت بڑا لشکر جمع کر رکھا ہے۔ فَاخْشَوْهُمْ پس تم ان سے ڈرو اور تم ان سے بچو، کیونکہ تمہارے پاس ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔ اس باب میں ان اقوال کی بنا پر ہی الناس جمع ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله تعالى: فَزَادَهُمْ إِيمَانًا یعنی لوگوں کے قول نے از روئے ایمان کے ان میں اضافہ کر دیا، یعنی اپنے دین کے بارے

میں تصدیق اور یقین، اپنی مدد و نصرت پر پختہ وثوق اور قوت و جرأت اور استعداد کے اعتبار سے ان میں اضافہ ہو گیا۔ پس ان معنی کی بنا پر ایمان میں زیادتی سے مراد اعمال میں زیادتی ہے۔ علماء کا ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اس بارے میں کئی اقوال ہیں اور اس بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ نفس ایمان جو کہ ایک تاج ہے اور کسی بھی شے کی ایک تصدیق ہے بلاشبہ یہ مفرد معنی ہے جب یہ حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی زیادتی اور اضافہ داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس میں سے کوئی شے باقی رہ جاتی ہے جب یہ زائل ہو جائے۔ پس کچھ باقی نہ رہا سوائے اس کے کہ زیادتی اور کمی ایمان کے متعلقات میں ہوتی ہے نہ کہ اس کی ذات میں۔ پس علماء کی ایک جماعت نے یہ موقف اپنایا ہے کہ ایمان ان اعمال کے اعتبار سے زیادہ یا کم ہوتا ہے جو اس سے صادر ہوتے ہیں، بالخصوص بہت سے علماء اسم ایمان کا اطلاق طاعات پر کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں ان میں سے اعلیٰ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہنا ہے اور ان میں سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے (1)“ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور مسلم نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا ہے: ”اور حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے (2)“۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ایمان دل میں ایک سفید نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جب بھی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے اور آپ کا قول لُفْظَةُ اس کے بارے میں اصمعی نے کہا ہے: نقطہ اور اس کی طرح کی سفیدی ہے اور اسی سے کہا گیا ہے: فرس البظ جب گھوڑے کے ہونٹ میں سفیدی ہو اور محدثین کہتے ہیں لُفْظَةُ مَخْتَمَةٍ کے ساتھ۔ البتہ کلام عرب میں یہ ضمہ کے ساتھ ہے، مثلاً شُبْهَةٌ، دُهْمَةٌ اور حُمْرَةٌ۔ اور اس میں ان کے خلاف حجت اور دلیل ہے جو ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں دیکھ نہیں رہے وہ کہتے ہیں جب بھی ایمان بڑھتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح نفاق دل میں ایک سیاہ نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب بھی نفاق بڑھتا ہے تو دل سیاہ ہوتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور ان میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ایمان عرض ہے اور یہ دوزمانوں میں ثابت نہیں رہتا اور یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صلحاء کے لئے یکے بعد دیگرے قائم رہتا ہے، پس مومن کے دل میں اس کی امثال کے لگاتار اور تسلسل کے ساتھ قائم رہنے کے اعتبار سے اور بالذات اس کے موجود رہنے کے اعتبار سے یہ بڑھتا ہے۔ اور مومن کے دل پر لگاتار اور مسلسل غفلتیں پڑنے کے سبب یہ کم ہو جاتا ہے، اس کی طرف ابوالمعالی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یہ معنی حدیث شفاعت میں موجود ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اسے مسلم نے نقل کیا ہے (3)۔ اس میں ہے: ”پس مومنین عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہمارے بھائی روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے تو انہیں کہا جائے گا جنہیں پہچانتے ہو نکال لاؤ پس ان کی صورت آتش جہنم پر حرام کر دی جائے گی اور خلق کثیر نکال لی

1۔ جامع ترمذی، کتاب ایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً جامع ترمذی، حدیث 2539، حیاء القرآن، جلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، حیاء القرآن، جلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب ایمان، جلد 1، صفحہ 47

جائے گی در آنحالیکہ اسے آگ نصف پنڈلی اور اس کے گھٹنے تک پکڑے ہوئے تھی پھر وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا ہے تو رب کریم فرمائے گا لوٹ کر جاؤ اور جس کے دل میں تم ایک دینار برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ بہت سی مخلوق کو نکالیں گے پھر وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی اس میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ہے پھر رب کریم فرمائے گا: تم لوٹ کر جاؤ اور تم جس کے دل میں نصف دینار کے برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لو چنانچہ وہ خلق کثیر کو نکالیں گے پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں ان میں سے کوئی بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا، پھر رب کریم فرمائے گا: تم لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم ذرہ برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ (1)۔ اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس حدیث میں ایمان سے مراد دلوں کے اعمال ہیں، مثلاً نیت، اخلاص، خوف اور نصیحت اور ان کے مشابہ اعمال۔ اور ان کا نام ایمان رکھا ہے کیونکہ یہ محل ایمان میں ہیں یا ایمان سے مراد عادت عرب کے مطابق تسمیۃ الشئ باسم الشئ ہے جبکہ یہ اس کے مشابہ اور مجاور ہو یا یہ اس کے سبب ہو۔ اس تاویل کی دلیل شفاعت کرنے والوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے ان لوگوں کو نکالنے کے بعد کہا جن کے دلوں میں ذرہ برابر بھی خیر اور نیکی ہوگی: نَم نَدَر فِیہَا خَیْرًا (ہم نے اس میں کوئی خیر نہیں چھوڑی) باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان میں سے جمع کثیر کو نکالے گا جَوْلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہیں اور وہ قطعاً یقیناً مومن ہیں اور اگر وہ مومن نہ ہوتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں نہ نکالتا۔

پھر اگر وہ وجود اول معدوم ہو جائے جس پر اس کی مثل مرتب ہوتا ہے تو یہ نہ زیادتی ہے اور نہ نقصان۔ اور اس کا اندازہ حرکت میں لگایا گیا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے علم مفرد پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کی معلومات پیدا کیں تو اس کا علم زیادہ ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ امثال کو معدوم کر دے تو وہ کم ہو گیا، یعنی زیادتی زائل ہو گئی اور اسی طرح جب اس نے حرکت کو پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کو پیدا کیا۔

اور علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ ایمان کی زیادتی اور کمی یہ ادلہ کے اعتبار سے ہے، پس ایک کے پاس دلائل زیادہ ہوتے ہیں تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: یہ ایمان میں زیادتی ہے، اس کے معنی کے مطابق..... کئی اقوال پر..... انبیاء علیہم السلام کو دوسری مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، کیونکہ وہ اسے وجہ کثیرہ سے جانتے ہیں اور وہ ان وجہ سے کہیں زیادہ ہیں جن کے سبب مخلوق اسے جانتی ہے اور یہ قول آیت کے مقتضی سے خارج ہے، کیونکہ یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں زیادتی ادلہ کے اعتبار سے ہو۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ایمان میں زیادتی حضور نبی رحمت ﷺ کے زمانہ میں فرائض و اخبار کے نزول کے اعتبار سے ہے اور گزرے ہوئے زمانے میں جہالت کے بعد ان کی معرفت کے اعتبار سے ہے اور بلاشبہ یہی ایمان کی زیادتی ہے، پس اس بارے میں یہ قول کہ ایمان زیادہ ہوتا ہے یہ قول مجازی ہے اور اس تعریف پر اس میں کمی کا تصور نہیں کیا جاسکتا،

بلکہ معلوم کی طرف اضافت کے اعتبار سے اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ فاعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ⑤ یعنی انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور حسب یہ احساب سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کفایت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَتَمَلَّأُ بَيْتَنَا إِقْطًا وَ سَمْنًا وَ حَسْبُكَ مِنْ غَنَى شَيْعٍ وَرِيٍّ

اس میں حَسْبُكَ کا معنی ہے تیرے لئے کافی ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ⑤ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے یہ اس وقت کہا جب انہیں آگ میں پھینکا گیا اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس وقت کہا جب انہیں لوگوں نے کہا: بے شک کافر تمہارے لئے بہت سے لوگوں کو (شکر جبار کو) جمع کئے ہوئے ہیں (1)۔ واللہ اعلم۔

فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ دِيَارِهِمْ فَأَتَىٰ خَصْمَتَهُمُ الْيَهُودَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِهِ وَلِئِنْ لَّمْ يُفْلِحِ الْيَهُودُ لَأَيُّهَا النَّاسُ الْيَوْمَ فَأَنْتُمْ مُجْتَمِعُونَ ⑥

فَضْلٍ عَظِيمٍ ⑦

”(ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ) واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھو ان کو کسی برائی نے اور پیروی کرتے رہے رضائے الہی کی اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔“

ہمارے علماء نے کہا ہے: جب انہوں نے اپنے امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور اپنے دلوں سے اس پر اعتماد کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں چار طرح کی جزا عطا فرمائی: (یعنی) نعمت، فضل، برائی کو ان سے پھیر دینا اور رضا کی پیروی کرنا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضا عطا فرمائی اور وہ ان سے راضی ہو گیا۔

إِنَّمَا إِلَهُ الْبَشَرِ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ ⑧ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا اللَّهَ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ⑨

”یہ تو شیطان ہے جو ڈراتا ہے (تمہیں) اپنے دوستوں سے پس نہ ڈرو ان سے بلکہ مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم مومن ہو۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یخوفکم اولیاءہ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے دوستوں کے ساتھ یا اپنے دوستوں سے (2)، اس سے حرف جر (بایا من) حذف کر دیا گیا ہے اور فعل کو اسم کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اسے (اسم کو) نصب دی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا، اِی لِيُنْذِرَ كُمْ بِبَأْسٍ شَدِيدٍ (تاکہ وہ تمہیں ڈرائے شدید قوت کے ساتھ) یعنی وہ مومن کو کافر سے ڈراتا ہے۔ اور حسن اور سدی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ اپنے منافق دوستوں کو ڈراتا ہے، تاکہ وہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے سے بیٹھ جائیں (3) اور رہے اللہ تعالیٰ کے دوست تو وہ اس سے نہیں ڈرتے جب وہ انہیں ڈرائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ جو تمہیں کفار کے اجتماع سے ڈرا رہا ہے وہ انسانی

شیطانوں میں سے ایک شیطان ہے، چاہے وہ نعیم بن مسعود ہو یا کوئی اور، اس اختلاف کی بنا پر جو پہلے گزر چکا ہے۔ فَلَا تَخَافُوهُمْ یعنی تم ان کافروں سے نہ ڈرو جن کا ذکر اس قول میں کیا گیا ہے: إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ يَا (ہم ضمیر) اولیاء کی طرف لوٹ رہی ہے اگر تو کہے کہ معنی یہ ہے وہ تمہیں اپنے دوستوں کے ساتھ ڈراتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَخَافُونَ یعنی میرا حکم چھوڑنے میں تم مجھ سے ڈرو اگر تم میرے وعدہ کی تصدیق کرتے ہو اور کلام عرب میں خوف سے مراد گھبراہٹ ہے۔ اور خَافُونِی فَلَان فَخَفْتُهُ (ڈرنے میں فلاں نے مجھ سے مقابلہ کیا تو میں اس پر ڈرنے میں غالب آ گیا) یعنی میں اس کی نست زیادہ ڈرا۔ اور الخوفاء ایسا جنگل جس میں پانی نہ ہو۔ اور کہا جاتا ہے: نَاقَةُ خَوْفَاء یعنی ایسی اونٹنی جس کا دودھ خشک ہو جائے اور الخافۃ مراد چمڑے کا وہ تھیلا ہے جس میں شہد حاصل کیا جاتا ہے۔ (یا چمڑے کا وہ لباس جو شہد اتارتے وقت پہنا جاتا ہے)

حضرت سہل بن عبد اللہ نے بیان کیا ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس بعض صدیقین جمع ہوئے۔ درپوچھا: خوف کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: تو امن و سکون نہ پائے یہاں تک کہ تو امن والی جگہ پر پہنچ جائے۔ حضرت سہل نے کہا ہے: حضرت ربیع بن خثیم جب لوہار کی بھٹی کے پاس سے گزرتے تو اس کو ڈھانپ دیا جاتا تھا، تو حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس بارے بتایا گیا تو آپ نے فرمایا: جب وہ وہاں پہنچیں تو مجھے آگاہ کرنا۔ پس وہ وہاں پہنچے تو لوگوں نے آپ کو اطلاع دی، چنانچہ آپ وہاں آئے اور اپنا ہاتھ ان کی قمیص میں داخل کیا تو آپ نے ان کی (دل کی) حرکت کو بڑا تیز اور بلند پایا تو فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ تمہارے اہل زمانہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا وہ ہے کہ وہ اس سے ڈرے کہ اللہ تعالیٰ اسے سزا دے گا چاہے دنیا میں یا آخرت میں اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے: ڈرنے والا وہ نہیں ہے جو رو رہا ہو اور اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہو بلکہ ڈرنے والا وہ ہے جو اسے چھوڑ دے جس کے بارے وہ خوف رکھتا ہو کہ اس سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کر دیا ہے کہ وہ اس سے ڈریں چنانچہ ارشاد فرمایا: وَخَافُونَ إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اور فرمایا: وَإِذَا يَأْتِي فَاْتَاهِبُونَ ﴿٥٠﴾ (البقرہ) (اور صرف مجھی سے ڈرا کرو) اور مومنین کی خوف کے سبب مدح کرتے ہوئے فرمایا: يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ قَوِّهِمْ (النحل: 50) (ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے) اور ارباب اشارات کی خوف کے بارے میں کئی عبارات ہیں جن کا مرجع وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

الاستاذ ابو علی الدقاق نے کہا ہے: میں ابو بکر بن نورک رحمہ اللہ کی عیادت کرنے کے لیے گیا، پس جب انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، تو میں نے ان سے کہا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت اور شفاء عطا فرمائے گا، تو انہوں نے مجھے کہا: کیا تو یہ گمان کر رہا ہے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں؟ بلاشبہ میں تو موت کے بعد والی کیفیت سے ڈر رہا ہوں۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ سکتے اور میں جو سن رہا ہوں وہ تم نہیں سن سکتے۔ آسمان چرچہ رہا ہے اور اس کے لئے لازم کیا گیا ہے کہ وہ چرچے اس میں چار انگلیاں رکھنے کے برابر بھی کوئی جگہ نہیں ہے مگر اس میں فرشتے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہوئے اپنی

پیشانی رکھے ہوئے ہیں قسم بخدا! اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت تھوڑا ہنسو اور تم بہت زیادہ رو۔ اور تم بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز نہ ہو اور یقیناً تم دشوار گزار گھاٹیوں کی جانب نکل جاؤ جہاں تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کرتے ہوئے دعا مانگو قسم بخدا! میں تو یہ پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا ہے (1)۔“ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: حدیث حسن غریب (یہ حدیث حسن غریب ہے) اور اس سند کے علاوہ اور سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: لَوِدِدْتُ اَنْ كُنْتُ شَجَرَةً تُغَصَّدُ، (2) واللہ اعلم۔

وَلَا يَحْزُنُكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنُيْضِرُّوا اللَّهَ شَيْئًا يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حِطْلًا فِي الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٤١﴾

”اور (اے جان عالم) نہ غمزدہ کریں آپ کو جو جلدی سے کفر میں داخل ہوئے ہیں بے شک یہ لوگ نہیں نقصان پہنچا سکتے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ نہ رکھے ان کے لئے ذرا حصہ آخرت (کی نعمتوں) سے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحْزُنُكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ یہ ایک قوم تھی جو اسلام لائے اور پھر مرتد ہو گئے مشرکین کے خوف سے، تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم مغموم ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا يَحْزُنُكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ اور کلبی نے کہا ہے: اس سے مراد منافقین اور یہود کے سردار ہیں، انہوں نے کتاب میں موجود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو چھپا لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جب اہل کتاب ایمان نہ لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ شاق گزرا، کیونکہ لوگ ان کی طرف دیکھتے اور یہ کہتے: بلاشبہ یہ اہل کتاب ہیں، پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حق ہوتا تو یقیناً یہ آپ کی اتباع اور پیروی کرتے، پس یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا يَحْزُنُكَ حضرت نافع کی قرأت میں یاء مضمومہ اور زامکسور ہے، جہاں بھی واقع ہو سوائے (سورۃ) انبیاء کے لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ۔ کیونکہ اس میں یا مفتوحہ اور زامکسور ہے (3)۔ اور ابو جعفر نے اس کا برعکس کیا ہے۔ ابن محیسن نے تمام جگہوں پر یا کو ضمہ کے ساتھ اور زامکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی تمام نے یا کو فتحہ اور زامک کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حَزَنِي الْأَمْرُ يَحْزُنُنِي اور أَخْزَنِي بھی ہے اور یہ قلیل لغت ہے اور دونوں میں سے پہلی اصح ہے، نحاس نے یہی کہا ہے۔

اور شاعر نے احزن کے بارے کہا ہے:

مَضَى صُخْبِي وَأَخْزَنِي الدِّيَارُ
(میرے ساتھی چلے گئے اور گھروں نے مجھے غمزدہ کر دیا)

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 319۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ زاد السیر، جلد 1-2، صفحہ 404،

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 55

اور عام قرأت یُسَارِعُونَ ہے اور ظلم نے یُسَارِعُونَ فی الکفر پڑھا ہے۔

حضرت ضحاک نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں (1)۔ اور ان کے سوانے کہا ہے: وہ منافق ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ وہی ہیں جن کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ تمام کفار کے لئے عام ہے۔ اور ان کا تیزی کے ساتھ کفر میں جانا حضور نبی کریم ﷺ کے خلاف مظاہرہ کرنا ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: کافر کے کفر پر غمزدہ ہونا طاعت ہے، لیکن حضور نبی مکرم ﷺ اپنی قوم کے کفر پر بہت زیادہ غمزدہ ہوتے تھے، تبھی آپ کو اس سے منع کر دیا گیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ (فاطر: 8) (پس نہ گھلے آپ کی جان ان کے لئے فرط غم سے) اور فرمایا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسْقَا (الکہف) (تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے)۔

إِنَّهُمْ لَنُيْضِرُّوهُ شَيْئًا یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ملک اور اس کی سلطنت اور اقتدار میں سے کسی شے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یعنی ان کے کفر کے سبب کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے ان روایات میں نقل کی ہے جنہیں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”اے میرے بندو! بلاشبہ میں نے ظلم اپنی ذات پر حرام قرار دیا ہے اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے پس آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام گمراہ ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے ہدایت دی پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تمہیں ہدایت عطا فرماؤں گا۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام بھوکے ہو سوائے اس کے جسے میں نے کھانا کھلایا پس تم مجھ سے کھانا طلب کرو میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا (یعنی رزق عطا فرماؤں گا) اے میرے بندو! تم تمام کے تمام ننگے ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے لباس پہنایا پس تم مجھ سے لباس کا مطالبہ کیا کرو تا کہ میں تمہیں لباس پہناؤں۔“

اے میرے بندو! بلاشبہ تم رات دن گناہ اور خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخش دیتا ہوں پس تم مجھ سے مغفرت طلب کرو میں تمہاری مغفرت فرما دوں گا۔ اے میرے بندو! بلاشبہ تم میرے نقصان تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نقصان پہنچاؤ اور تم میرے نفع تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول، تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن تمام تم میں سے ایک انتہائی متقی دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو اس طرح وہ میرے ملک میں کسی شے کا کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن سارے کے سارے ایک فاجر ترین دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو وہ میرے ملک اور اقتدار میں کسی قسم کی کمی اور نقصان نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن ایک ہی سرزمین میں کھڑے ہو جائیں اور وہ مجھ سے سوال کریں اور میں ہر انسان کو اس کی طلب اور حاجت کے مطابق عطا کروں تو جو کچھ

میرے پاس ہے اس میں کمی واقع نہ ہوگی مگر اسی طرح جیسے سوئی کمی کرتی ہے جب اسے سمندر میں داخل کیا جائے۔ اے میرے بندو! بلاشبہ یہ تمہارے اعمال ہیں میں انہیں تمہارے لئے شمار کرتا رہتا ہوں پھر میں تمہیں ان کا پورا پورا اجر دوں گا پس جو کوئی خیر اور نیکی پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور جو کوئی اس کے سوا پائے تو وہ اپنے نفس کے سوا کسی کو ملامت نہ کرے (1)۔“ اے مسلم نے اپنی صحیح میں اور ترمذی وغیرہما نے روایت کیا ہے اور یہ عظیم حدیث ہے اس میں طوالت ہے تمام کی تمام لکھی جاتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ يَضُرَّ وَاللَّهِ شَيْئًا كَمَا مَعْنَى ہے یعنی وہ اولیاء اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے جب وہ ان کی مدد ترک کر دیں جبکہ اللہ تعالیٰ ان کا ناصر اور مددگار ہے (2)۔

قولہ تعالیٰ: يُرِيدُ اللَّهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٥﴾ حظا کا معنی حصہ ہے اور الحظ کا معنی النصیب والجد (حصہ) ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان احظ من فلان، وہو محظوظ۔ فلاں فلاں کی نسبت حصہ کا زیادہ حق رکھتا ہے اور اسے حصہ دیا گیا ہے اور حظ کی جمع خلاف قیاس احاطا آتی ہے۔ ابوزید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے جل حظیظ اسی جدید جب وہ رزق میں حصہ دار ہو۔ اور حَظَّظْتُ فِي الْأَمْرِ أَحْظَ۔ میں نے کام میں خوب حصہ لیا۔ بسا اوقات حظ کی جمع احظا بھی آتی ہے۔ (معنی یہ ہے) اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں رکھے گا، اور یہ اس بارے میں نص ہے کہ خیر اور شر اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرَّ وَاللَّهِ شَيْئًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦﴾

”بے شک جنہوں نے خرید لیا کفر کو ایمان کے عوض میں ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی اور ان کے لئے درد عذاب ہے۔“

قولہ تعالیٰ: إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَنْ يَضُرَّ وَاللَّهِ شَيْئًا اسے تاکید کے لئے مکرر لایا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی ایمان کو کفر کے ساتھ تبدیل کرنا اس کے عوض اسے پہنچنا یہ اس کی بری تدبیر میں سے ہے، (اور اس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) پس اسے اس کی اطاعت نہ کرنے کا کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی اس کی تدبیر کا کوئی خوف ہے اور شئیٰ دونوں آیتوں میں مصدر کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، گویا کہ یہ فرمایا: لَنْ يَضُرَّ وَاللَّهِ ضَرًّا قَلِيلًا وَلَا كَثِيرًا (وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز تھوڑا یا زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ باکو حذف کرنے کی تقدیر پر منصوب ہو، گویا کہ فرمایا: لَنْ يَضُرَّ وَاللَّهُ بَشْوً۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُضِلُّ لَهُمْ خَيْرٌ لَّا أَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُوَلِّیْ لَهُمْ

1۔ مجمع مسلم، کتاب البر والصلة، جلد 2، صفحہ 319۔ ایضاً، ج 2، رزقی، باب ما جاء من صلة ادان العوض، حدیث 2419، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405

لِيَزِدَّادُؤَالِإِثْمَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٥٥﴾

”اور نہ خیال کریں جو کفر کر رہے ہیں کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے صرف اس لئے ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ کر لیں گناہ اور ان کے لئے عذاب ہے ذلیل و خوار کرنے والا۔“

قوله تعالى: وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا يُنْفِلُ لَهُمْ خَيْرٌ لَّا نَفْسِهِمْ اِمْلَاءُ سے مراد عمر کا طویل ہونا اور زندگی کا کشادہ اور خوشحال ہونا ہے اور معنی یہ ہے: وہ لوگ خیال نہ کریں جو مسلمانوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے اور بلاشبہ وہ انہیں طویل عمریں عطا کر رہا ہے تاکہ وہ معاصی اور گناہ کے اعمال کریں اس لئے نہیں کہ وہ ان کے لئے باعث خیر و نفع ہے اور کہا جاتا ہے: اَنَّمَا يُنْفِلُ لَهُمْ سے مراد وہ فتح اور کامیابی ہے جو انہوں نے غزوہ احد میں حاصل کی وہ ان کے نفسوں کے لئے باعث خیر و نفع نہیں، بلکہ وہ اس لئے ہے تاکہ وہ سزائیں اور اضافہ کر لیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کوئی نیکوکار اور فاجر نہیں ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے، کیونکہ اگر وہ نیکوکار ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْآبَرَارِ۔

اور اگر وہ فاجر ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَنَّمَا يُنْفِلُ لَهُمْ لِيَزِدَّادُؤَالِإِثْمَا (1) (ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ اور زیادہ کر لیں) ابن عامر اور عاصم نے لَا يَحْسِبَنَّ یا کے ساتھ اور سین کے نصب کے ساتھ قرأت کی ہے (2)۔ اور حمزہ نے تا کے ساتھ اور سین کو منصوب ڈھا ہے (3) (یعنی لَا تَحْسِبَنَّ) اور باقیوں نے یا کے ساتھ اور سین کو مکسور پڑھا ہے، پس جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے نو اس کے مطابق الذین فاعل ہے۔ یعنی کفار خیال نہ کریں۔ اور اَنَّمَا يُنْفِلُ لَهُمْ خَيْرٌ لَّا نَفْسِهِمْ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور ما یعنی الذی ہے، اور ضمیر عائد محذوف ہے، اور خیر، اُن کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما مقدر ہو اور فعل مصدر ہو، اور تقدیر کلام اس طرح ہو وَلَا يَحْسِبَنَّ الذِّينَ كَفَرُوا أَن اَمْلَأْنَا لَهُمْ خَيْرًا لَّا نَفْسَهُمْ۔ (اور کافر لوگ خیال نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے) اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے تو اس میں فاعل ضمیر خطاب ہے، اور (مخاطب) حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور الذین کو تحسب کا مفعول اول ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور اُن اور اس کا مابعد الذین سے بدل ہے، اور یہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہو جائے گا، بسا کہ یہ بدل نہ ہونے کی صورت میں قائم مقام ہے۔ اور ان اور اس کا مابعد تحسب کا مفعول ثانی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ اس باب میں مفعول ثانی ہی معنی میں اول ہوتا ہے، کیونکہ حسب اور اس کے اخوات مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں۔ پس تقدیر کلام ہو گی: وَلَا تَحْسِبَنَّ اَنَّمَا يُنْفِلُ لَهُمْ خَيْرٌ۔ یہ زجاج کا قول ہے اور ابو علی کا قول ہے: اگر یہ صحیح ہوتا تو کہتا خیراً یعنی نصب کے ساتھ، کیونکہ اُن، الذین کفروا سے بدل ہو جائے گا، تو گویا یہ کہا: لَا تَحْسِبَنَّ اَمْلَاءُ الذِّينَ كَفَرُوا خَيْرًا (یعنی تم کافروں کی مہلت کو بہتر اور خیر خیال نہ کرو) تو اس میں قولہ خیراً حسب کے لئے مفعول ثانی ہے۔ تب یہ جائز نہیں ہے کہ لَا تَحْسِبَنَّ تا کے ساتھ پڑھا جائے مگر اس صورت میں کہ اَنَّمَا میں اِن کو کسرہ دیں اور خیراً کو نصب دیں (4)، اور حمزہ سے یہ مروی نہیں ہے اور حمزہ کی

قرأت تا کے ساتھ ہے، نتیجتاً یہ قرأت صحیح نہ ہوگی۔

اور فراء اور کسائی نے کہا ہے: حمزہ کی قرأت تکریر کی بنا پر جائز ہے، اس کی تقدیر عبارت ہے ولا تحسبن الذين كفروا، ولا تحسبن انما نملی لهم خیر، پس اس میں ان دوسرے تحسب کے لئے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے، اور یہ اور جس نے عمل کیا ہے (مراد عامل تحسب ہے) وہ پہلے تحسب کا مفعول ثانی ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ اس کے زیادہ قریب ہے جو زجاج نے بدل کے دعویٰ میں ذکر کیا ہے، اور قرأت صحیح ہے، جبکہ ابوعلی کا مقصود زجاج کو غلط قرار دینا ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور ابو حاتم نے گمان کیا ہے کہ یہاں حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ ہے، اور ان کا قول: ولا يحسبن الذين يبخلون لحن (غلطی) ہے جائز نہیں ہے۔ اور اس پر ان کی اتباع ایک جماعت نے کی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ اس کا ترکیبی بیان پہلے گزر چکا ہے اور نقلاً قرأت کا صحیح ہونا اور اس کا ثابت ہونا بھی گزر چکا ہے اور یحییٰ بن وثاب نے اَثْمَانُ مِلِّيْ لَهُمْ یعنی دونوں جگہ پر ان کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے کہا ہے: یحییٰ کی قرأت اچھی ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: حسبت عمرا ابوہ خالد (اس میں عمر مفعول اول اور ابوہ خالد مفعول ثانی ہے)۔ ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے احف سے سنا ہے وہ ان کو مکسور ذکر کرتے ہیں اور اس سے قدر یہ کے لئے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان میں سے تھے اور وہ تقدیم و تاخیر پر معمول کرتے ہیں ولا يحسبن الذين كفروا انما نملی لهم ليزدادوا اثما انما نملی لهم خیر لا نفسهم۔

بیان کیا: میں نے جامع مسجد میں ایک مصحف میں دیکھا انہوں نے اس میں ایک حرف زائد کیا تھا تو وہ اس طرح ہو گیا انما نملی لهم ایمانا پس اس کی طرف یعقوب القاری نے دیکھا تو غلطی واضح ہو گئی چنانچہ انہوں نے اسے مٹا دیا۔ اور یہ آیت قدر یہ مذہب کے بطلان میں نص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ان کی عمروں کو طویل کرتا ہے تاکہ وہ معاصی کا عمل کر کے کفر میں اضافہ کریں، اور اس کی امثال لگا تا ردل پر مرتب ہوتی ہیں، جیسا کہ اس کی ضد جو کہ ایمان ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کوئی نیکو کار نہیں اور نہ ہی کوئی فاجر ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِثْمَانُ مِلِّيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوا اِثْمًا اور یہ آیت پڑھی۔ وما عند الله خیر للابرار (1) اسے رزین نے روایت کیا ہے۔

مَا كَانَ لِلَّهِ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ

وَمَا كَانَ لِلَّهِ لِيُظْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيٰ مِنْ رُّسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ

فَأَمْنُوا بِاللهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَإِنْ تُوْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾

”نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ چھوڑے رکھے مومنوں کو اس حال پر جس پر تم اب ہو جب تک الگ الگ نہ کر

دے پلید کو پاک سے اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ اللہ (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔“

ابو العالیہ نے کہا ہے: مومنین نے عرض کی کہ انہیں ایسی علامت اور نشانی عطا کی جائے جس کے ساتھ وہ مومن اور منافق کے درمیان فرق کر سکیں، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ (الآیہ 1)۔ اس آیت کا مخاطب کون ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ضحاک، مقاتل، کلبی اور اکثر مفسرین رحمہم اللہ نے کہا ہے: اس میں خطاب کفار اور منافقین کو ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ مومنوں کو اس حال پر چھوڑے رکھے جس حال پر کفر، نفاق اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں سے تم اب ہو۔ کلبی نے کہا ہے: اہل مکہ میں سے قریش نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم میں سے ایک آدمی کے بارے میں آپ گمان کرتے ہیں کہ وہ آتش جہنم میں ہے، اور یہ کہ جب اس نے ہمارا دین چھوڑ دیا اور تمہارے دین کی اتباع و پیروی کر لی تو تم نے کہا یہ اہل جنت میں سے ہے! پس اس کے بارے ہمیں بتلائیے یہ کہاں سے ہوا؟ اور اس کی بھی خبر دیجئے ہم میں سے کون تمہارے پاس آئے گا؟ اور کون تمہارے پاس نہیں آیا؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ یعنی کفر اور نفاق میں سے جس حال پر تم ہو۔ حنفی یعیز الخبیث من الطیّب (یہاں تک کہ وہ پلید کو پاک سے الگ الگ کر دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے اور قول باری تعالیٰ: لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ فِي مَوَاقِفِهِمْ (مراد وہ ہیں جو ابھی صلیوں اور رحموں میں ہیں ان میں سے جو ایمان لائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہاری اس اولاد کو جن کے لئے ایمان کا حکم ہے اس حال پر چھوڑ دے جس حال پر شرک میں سے اب تم ہو، یہاں تک کہ وہ تمہارے اور ان کے درمیان تفریق کر دے گا، اور اس بنا پر وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِعَكُمْ نِيَا کلام ہوگا۔ اور یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب مومنین کو ہے (3)، یعنی اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے اے گروہ مومنین! اس حال پر جس پر تم اب ہو کہ مومن اور منافق باہم مخلوط اور ملے جلے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے درمیان آزمائش اور (احکام کا) پابند بنا کر تفریق ڈال دے کہ تم پلید منافق اور پاک مومن کو پہچان لو۔ اور اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کو احد کے دن الگ الگ کر دیا۔ یہ قول اکثر اہل معانی کا ہے۔ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی شان کہ تمہیں غیب پر مطلع کرے) اے گروہ مومنین! یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ تمہارے لئے منافقین کو معین کر دے تاکہ تم انہیں پہچان لو، البتہ وہ انہیں تمہارے لئے احکام کا پابند بنا کر اور آزمائش میں ڈال کر ظاہر کر دے گا، اور پھر وہ احد کے دن ظاہر ہو گئے، کیونکہ منافقین پیچھے رہ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی تکلیف اور اذیت پر خوشی کا اظہار کیا، پس تم اس سے پہلے اس غیب کو نہ جانتے تھے، پس اب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

اور آپ کے اصحاب کو اس پر آگاہ فرمادیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ لِيُظْلِعَكُمْ کا معنی ہے یعنی اور اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں اس سے آگاہ کرے جو ان سے ہوگا۔ پس قول باری تعالیٰ: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ اس قول کے مطابق (سابقہ کلام سے) متصل ہے، اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر منقطع ہے اور وہ یہ کہ کفار نے جب کہا: ہماری طرف وحی کیوں نہیں کی گئی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ یعنی اس پر جو نبوت کا مستحق ہوتا ہے کہ وحی تمہارے اختیار (اور پسند) کے مطابق ہو (1)۔ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ جے چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے طلعت علی کذا اور اطلعت علیہ (میں اس پر آگاہ ہوا) اور اطلعت علیہ غیری (میں نے اس پر اپنے سوا دوسرے کو آگاہ کیا) پس یہ لازم اور متعدی (دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) اور حَتَّى يُمَيِّزَ مَيِّزًا سے تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اور اسی طرح سورۃ الانفال میں ہے۔ اور یہی حمزہ کی قرأت ہے۔ اور باقیوں نے یُمَيِّزُ تَخْفِيف کے ساتھ مازیمیز سے پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: مَزَتْ الشَّيْءُ بَعْضُهُ مِنْ بَعْضٍ امِيزَةً مِيزًا، اور مِيزَتَهُ تَمِيزًا (میں نے ایک شے کے بعض کو بعض سے الگ الگ کر دیا)

پھر نجومی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ پس اس نے حساب لگایا اور اس میں غلطی اور خطا کی، پھر اس نے حساب لگایا اور پھر غلطی کی۔ پس اس نے کہا: اے امیر! میرا خیال ہے کہ جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کی تعداد کو نہیں جانتا؟ اس نے کہا (ہاں) نہیں جانتا۔ تو اس نے پوچھا: ان دونوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس نے جواب دیا: اگر تو نے اسے گنا ہوتا تو یہ غیب کی تعریف سے نکل جاتا، اور میں حساب لگاتا تو اس تک پہنچ جاتا اور چونکہ تجھے اس کی تعداد معلوم نہیں اس لئے یہ غیب ہے، اور غیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ باب سورۃ الانعام میں عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَلَا يَحْصِبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَتَاهُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ ۚ بَلْ هُوَ شَرٌّ
لَّهُمْ ۚ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخُلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ وَاللَّهُ مِيرَاثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ يَمَّا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

”اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں، جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے ان کے لئے، بلکہ یہ بخل بہت برا ہے ان کے لئے طوق پہنایا جائے گا انہیں وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا قیامت کے دن، اور اللہ کے لئے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے خبردار ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحْصِبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَتَاهُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ ۚ (کہ) بخل ان کے لئے بہتر ہے (1) اور چونکہ بیکلون بخل پر دلالت کر رہا ہے اس وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: مَنْ صَدَقَ كَانَ خَيْرًا لِّهِ اَيَّ كَانَ الصَّدَقُ خَيْرًا لِّهِ (جس نے سچ بولا وہ سچ اس کے لئے بہتر ہے۔) اور اسی سے شاعر کا قول ہے:

اِذَا نُهِيَ السَّفِيهَ جَرَى اِلَيْهِ وَخَالَفَ وَالسَّفِيهَ اِلَى خِلَافٍ

پس معنی ہے: جری الی السفہ، پس سفیہ سفہ پر دلالت کرتا ہے۔

(جب سفیہ (احق) کو منع کیا گیا تو وہ اسی کی طرف چلا اور اس نے مخالفت کی اور سفیہ خلاف کی طرف گیا۔)

اور ربی حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ تو وہ (حقیقت سے) بہت دور ہے، نحاس نے یہی کہا ہے اور اس کا جواز اس صورت میں ہے کہ تقدیر عبارت یہ ہو: لَا تَحْسِبَنَّ الْبَخْلَ الَّذِي يَبْخُلُونَ هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ (2)۔ (تو ان لوگوں کے بخل کے بارے جو بخل کرتے ہیں گمان بھی نہ کر کہ وہ ان کے لئے بہتر ہے۔)

زجاج نے کہا ہے: یہ واسأل النقریۃ کی مثل ہے (3) (یعنی مضاف محذوف ہے) اور قول باری تعالیٰ: هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ میں

ہو بھریوں کے نزدیک ضمیر فاصلہ ہے اور کوفیوں کے نزدیک یہی ضمیر عماد ہے۔ نحاس نے کہا ہے: عربی میں مبتدا خبر ہونے کی حیثیت سے **هُوَ خَيْرٌ اَللّٰهُمَّ** بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهٖمْ** یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی **الْجَنَلُ شَرٌّ لَّهٖمْ** (بخل ان کے لئے بہت برا ہے) اور **سَيُطَوَّقُونَ** میں سین وعید کی سین ہے، یعنی **سَوْفَ يَطَوَّقُونَ** (انہیں طوق پہنایا جائے گا)، مبرد نے یہی کہا ہے۔ یہ آیت مال، انفاق فی سبیل اللہ، اور فرض زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرنے کے بارے نازل ہوئی ہے (1) اور یہ اس ارشاد کی طرح ہے: **وَلَا يُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الْاَيَّه (التوبہ: 34)**

تاویل کرنے والوں کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے ان میں سے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابو داؤد، ابو مالک، سدی اور شعبی رضی اللہ عنہم ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: **سَيُطَوَّقُونَ مَا يَخْلُوْنَ اِيْهِ** کا معنی وہ ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے (2) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی قیامت کے دن وہ اس کے لئے اڑدھا کی شکل بنا دیا جائے گا اس کی آنکھوں پر دو سیاہ نشان ہوں گے قیامت کے دن اسے اس کا طوق پہنایا جائے گا پھر وہ اسے اپنے دونوں جبرؤں کے ساتھ پکڑ لے گا اور پھر کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ (کنز) ہوں..... پھر یہ آیت تلاوت فرمائی..... **وَلَا يَخْصِبْنَ الَّذِيْنَ يَبْخُلُوْنَ الْاَيَّه (3)**

اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا: ”کوئی بھی جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے لئے اسے ایک زہریلے اڑدھا کی شکل بنا دیا جائے گا یہاں تک کہ اس کی گردن میں اس کے ساتھ طوق پہنایا جائے گا“ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر کتاب اللہ میں سے اس کا مصداق یہ آیت پڑھی **وَلَا يَخْصِبْنَ الَّذِيْنَ يَبْخُلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ الْاَيَّه (4)**۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی ذی رحم (رشتہ دار) نہیں ہے جو اپنے ذی رحم کے پاس آتا ہے اور اس سے اس فضل و احسان (مراد مال) میں سے کچھ مانگتا ہے جو اس کے پاس ہے پس وہ اس کے بارے اس پر بخل کرتا ہے، مگر قیامت کے دن اس کے لئے جہنم سے ایک اڑدھا نکالا جائے گا جو زبان (باہر نکال کر) ادھر ادھر پھیر رہا ہوگا تاکہ اسے اس کا طوق پہنائے (5)“ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب اور ان کے بخل کے بارے میں اس کے بیان سے جو کچھ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جانتے تھے نازل ہوئی (6)۔ اور حضرت مجاہد، اور اہل علم کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر **سَيُطَوَّقُونَ** کا معنی ہے عنقریب وہ اس کی سزا برداشت کریں

2۔ ایضاً

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ

3۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 343۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب اثم مانع الزکوٰۃ، حدیث 1315، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 129۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1773، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ

5۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 2، صفحہ 322، حدیث نمبر 2343

گے جو انہوں نے آپ کے ساتھ بخل کیا اور یہ طاقت سے مانوز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ (البقرہ: 184) (اور جو لوگ اسے مشکل سے ادا کر سکیں) اور یہ تطویق سے مانوز نہیں ہے (1)۔ اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: سَيُطَوَّقُونَ کا معنی ہے کہ ان کے لئے قیامت کے دن آگ کا طوق بنایا جائے گا (2) اور یہ پہلی تاویل کے ساتھ یعنی سدی کے قول کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اعمال کو ان کے ساتھ چمٹا دیا جائے گا جیسا کہ طوق گردن کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، کہا جاتا ہے: طُوقَ فُلَانٍ عَمَلَهُ طُوقَ الْحَمَامَةِ، فلاں کو اس کے عمل کا طوق پہنایا گیا کبوتری کے طوق کی طرح، یعنی اسے اس کا عمل چمٹا دیا گیا۔ اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَكُلُّ إِنْسَانٍ لِّلْزَمْنَةِ طَائِرَةٍ فَنُقِنَهُ (الاسراء: 13) (اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اس کے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔)

اور اسی معنی میں ابوسفیان کے لئے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے:

أَبْدَغُ أَبَا سَفْيَانَ عَنْ أَمْرِ عَوَاقِبُهُ نَدَامَهُ
تو ابوسفیان کو اس امر کا پیغام پہنچا دے جس کا انجام ندامت اور شرمندگی ہے۔

دَارِ ابْنَ عَمِكَ بَعَثَهَا تَقْضَىٰ بِهَا عَنْكَ الْعَرَامَةُ
تو نے اپنے چچا کے بیٹے کا گھر بیچ دیا ہے اس کے عوض تجھ سے تاوان لیا جائے گا۔

وَحَلِيفُكُمْ بِاللَّهِ رَبُّ النَّاسِ مُجْتَهِدٌ الْقِسَامَةُ
اور قسم ہے اللہ کی جو لوگوں کا رب ہے تمہارا حلیف قسامہ کی کوشش کر رہا ہے۔

أَذْهَبَ بِهَا أَذْهَبَ بِهَا طُوقُهَا طُوقَ الْحَمَامَةِ
تو اسے لے جاتا تو اسے لے جاتے کبوتری کے طوق کی طرح اس کا طوق پہنایا جائے گا۔

اور یہ دوسری تاویل کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ بَخْلٌ اور بَخْلٌ کالغت میں معنی یہ ہے کہ انسان کا اس حق کو (ادا کرنے) سے باز رہنا جو (حق) اس پر واجب ہو۔

پس جو کوئی اس سے باز رہا جو اس پر واجب نہیں ہوتا تو وہ بخیل نہیں ہے، کیونکہ اس پر مذمت نہیں کی جاتی ہے۔ اور اہل حجاز کہتے ہیں: يَبْخُلُونَ وَقَدْ بَخِلُوا، (وہ بخل کرتے ہیں اور تحقیق انہوں نے بخل کیا۔ اور تمام عرب کہتے ہیں: يَبْخُلُوا يَبْخُلُونَ۔ اسے نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور بَخْلٌ يَبْخُلُ بَخْلًا وَبَخْلًا، یہ ابن فارس سے منقول ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ تیسرا مسئلہ بخل کے ثمرہ اور اس کے فائدہ کے بارے میں ہے۔ اور اس کے بارے روایت کیا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے عرض کی جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اور کون سی بیماری (عیب) ہے جو بخل سے بڑھ کر ہو؟“ (یعنی جو بخل سے زیادہ قبیح ہو) انہوں نے عرض کی: وہ کیسے یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا: ”ایک قوم ساحل سمندر کے قریب اتری پس وہ اپنے بخل کے

سبب اپنے پاس مہمانوں کے آنے سے تنگ اور مجبور ہو گئے تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ ہم میں سے مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں سے دور فاصلے پر رہیں تاکہ مرد عورتوں کے دور ہونے کے سبب مہمانوں کے سامنے معذرت کریں، اور عورتیں مردوں کے دور ہونے کے سبب ان سے معذرت کریں، پس انہوں نے ایسا کر لیا اور اسی طرح ان پر طویل وقت گزر گیا نتیجتاً مرد مردوں کے ساتھ اور عورتیں عورتوں کے ساتھ (استمتاع کے لئے) مشغول ہو گئے (1)۔“ اسے الماوردی نے کتاب ”ادب الدین والدین“ میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ بخل اور شح میں اختلاف ہے، کیا یہ دونوں ایک معنی میں ہیں یا دو معنوں میں۔ چنانچہ کہا گیا ہے: البخل الامتناع من اخراج ما حصل عندك (بخل سے مراد اس شے کو دینے اور نکالنے سے باز رہنا ہے جو تیرے پاس موجود ہو) اور الشح! الحرص على تحصيل ما ليس عندك (شح سے مراد اس شے کو حاصل کرنے کی حرص رکھنا ہے جو تیرے پاس موجود نہیں۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شح سے مراد وہ بخل ہے جس کے ساتھ حرص بھی ہو۔ اور یہی صحیح ہے اس روایت کے مطابق جسے مسلم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیرے اور تاریکیاں ہے اور شح (بخل) سے بچو کیونکہ اس نے انہیں تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے اس نے انہیں اس پر ابھارا ہے کہ وہ اپنے خون بہائیں اور اپنی محارم کو حلال سمجھیں (2)“ اور یہ ارشاد ان کے قول کی تردید کرتا ہے جنہوں نے کہا کہ بخل واجب کو روکنا (اور اسے ادا نہ کرنا) ہے اور شح مستحب کو روکنا ہے۔ کیونکہ اگر شح مستحب کو روکنا ہو تو وہ اس عظیم اور شدید وعید کے تحت داخل نہ ہوتا، اور شدید مذمت وہی ہے جس میں دنیا اور آخرت کی ہلاکت ہو۔

اور اس معنی کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کی راہ میں اڑنے والا غبار اور جہنم کا دھواں ایک مسلمان آدمی کے نفعوں میں ہمیشہ کے لئے جمع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی شح (بخل) اور ایمان ایک مسلمان آدمی کے دل میں ہمیشہ جمع رہ سکتے ہیں (3)۔“ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ شح مذمت میں بخل سے زیادہ شدید ہے، مگر بلاشبہ ایسی روایات بھی موجود ہیں جو ان دونوں کے مساوی اور برابر ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے..... آپ سے پوچھا گیا: أیکون المؤمن بخیلًا؟ کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: لا نہیں۔

اور الماوردی نے کتاب ”ادب الدین والدین“ میں ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو کہا: ”تمہارا سردار کون ہے؟“ انہوں نے عرض کی: جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے، الحدیث۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قوله تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے باقی رہنے اور اپنی بادشاہی کے دائمی ہونے

کی خبر دی ہے اور یہ کہ وہ ابد میں اسی طرح ہے جیسے وہ ازل میں تھا اور وہ العالمین سے غنی (اور بے نیاز) ہے، پس وہ زمین کا وارث ہوگا اپنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد اور ان کی املاک زائل اور ختم ہونے کے بعد، پس املاک اور اموال باقی رہیں گے لیکن ان کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ تو یہ مخلوق کی عادت اور عرف کے مطابق وراثت کے جاری ہونے کی طرح ہی یہ (حکم) جاری ہو گیا، حالانکہ حقیقت میں یہ میراث نہیں ہے، کیونکہ حقیقت میں وارث وہ ہے جو کسی (ایسی) شے کا وارث بنتا ہے جس کا وہ اس سے قبل مالک نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ تو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے، تمام آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، اور زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب اسی کا ہے، اور اموال اپنے مالکوں کے پاس عاریہ (ادھار) ہیں، پس جب وہ مرتے ہیں تو عاریہ کو اس کے اس مالک کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کا وہ اصل میں ہوتا ہے اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ یہ ارشاد ہے: **إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا** (مریم: 40) (یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔)

اور دونوں آیتوں میں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے کہ وہ خرچ کریں اور وہ بخل نہ کریں اس سے قبل کہ وہ بائیں اور وہ اسے بطور میراث اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ جائیں، اور انہیں کوئی نفع نہ دے گا سوائے اس کے جو انہوں نے خرچ کر دیا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۖ وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۖ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۖ

”بے شک سنا اللہ نے قول ان (گستاخوں) کا جنہوں نے کہا اللہ مفلس ہے حالانکہ ہم غنی ہیں ہم لکھ لیں گے جو انہوں نے کہا نیز قتل کرنا ان کا انبیاء کو ناحق (بھی لکھ لیا جائے گا) اور ہم کہیں گے کہ (اب) چکھو آگ کے عذاب (کا مزہ) یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر۔“

تو اللہ تعالیٰ: **لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ** اللہ تعالیٰ نے کفار بالخصوص یہود کے قول کی قباحت (اور برائی) ذکر فرمائی۔ اور اہل تفسیر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا** (البقرہ: 245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن) تو یہودیوں میں سے ایک گروہ نے کہا: ... ان میں سے جی بن اخطب تھا، یہ حسن کے قول کے مطابق ہے اور حضرت عکرمہ وغیرہ نے کہا ہے: وہ فحاص بن عازوراء تھا۔ ... **إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ** (1) (بے شک اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم غنی) (اور دولت مند) ہیں وہ ہم سے قرض مانگ رہا ہے۔ بلاشبہ

انہوں نے اپنے ضعفاء اور کمزوروں پر اظہار برتری کے طور پر سنانے کے لئے یہ کہا، نہ کہ وہ اس کا اعتقاد رکھتے تھے، کیونکہ وہ اہل کتاب تھا۔ لیکن انہوں نے اس قول کے ساتھ کفر کیا، کیونکہ انہوں نے اس سے اپنے ضعفاء کو اور مومنین میں سے کمزور لوگوں کو شک میں ڈالنے اور حضور نبی مکرم ﷺ کی تکذیب کا ارادہ کیا۔ یعنی یہ کہ وہ محمد ﷺ کے قول کے مطابق فقیر اور مفلس ہے، کیونکہ اس نے ہم سے قرض کا مطالبہ کیا ہے۔ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا یعنی ہم انہیں اس پر جزا اور بدلہ دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم انہیں ان کے اعمال ناموں میں لکھ لیں گے، یعنی ہم کراما کا تبین کو ان کا قول لکھ لینے اور ثابت رکھنے کا حکم دیں گے تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے انہیں اعمال ناموں میں اسے پڑھیں جو انہیں دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ یہ ان کے خلاف حجت کو اور پختہ اور مؤکد کرنے والا ہو جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: **وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ** (الانبیاء) (اور ہم اس کے لئے (اس کے عملوں کو) لکھنے والے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لکھنے سے مقصود محفوظ رکھنا ہے، یعنی ہم اسے محفوظ رکھیں گے جو انہوں نے کہا تاکہ ہم انہیں بدلہ اور جزا دیں، اور مَا قَالُوا میں مَا، سَنَكْتُبُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

اور اعمش اور حمزہ نے سیکتب پڑھا ہے۔ یعنی یا کے ساتھ تو اس صورت میں ما، اسم مالم یستم فاعله (نائب الفاعل) ہوگا۔ اور حمزہ نے اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کا اعتبار کیا ہے: **وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ**۔

قولہ تعالیٰ: **وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ** یعنی ہم ان کے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کے عمل کو لکھ لیں گے، یعنی ان کے قتل کے ساتھ رضامند ہونے کو۔ اور ان سے مراد ان کے اسلاف کا انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا ہے، لیکن جب وہ اس پر راضی اور خوش ہیں تو اس کی اضافت ان کی طرف کرنا صحیح ہے۔ ایک آدمی نے حضرت شعبی رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو اچھا اقدام قرار دیا تو حضرت شعبی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: تو بھی ان کے خون میں شریک ہے، پس آپ نے رضا باقتل کو قتل ہی قرار دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، اس حیثیت سے کہ رضا بالمعصیت معصیت ہوتی ہے۔ ابو داؤد نے عرس بن عمیرہ الکندی سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جب تو نے زمین میں خطا اور گناہ کا عمل کیا تو جو وہاں حاضر تھا اس نے اسے ناپسند کیا..... اور ایک بار فرمایا پس اس نے اس کا انکار کیا..... تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود نہ تھا اور جو وہاں سے غائب تھا لیکن اس نے اسے پسند کیا تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود اور حاضر تھا (1)۔“ اور یہ نص ہے۔ قولہ تعالیٰ: **بِغَيْرِ حَقٍّ** اس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ **وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ** یعنی جہنم میں ان کو کہا جائے گا یا موت کے وقت یا حساب کے وقت یہ کہا جائے گا۔ پھر یہ قول یا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا یا فرشتوں کی جانب سے، دونوں قول ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ویقال ہے۔ اور المحرق شعلہ نکالنے والی آگ کا اسم ہے، اور النار کا لفظ شعلہ نکالنے والی اور شعلہ نہ نکالنے والی آگ دونوں کو شامل ہے۔

قولہ تعالیٰ: **ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ اَیْدِیْكُمْ** یعنی وہ عذاب ان گناہوں کے عوض ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور الایدی کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا ہے تاکہ وہ فعل کے بذات خود کرنے پر دلالت کرے، کیونکہ کبھی فعل کی نسبت انسان کی طرف

کردی جاتی ہے اس معنی میں کہ اس نے وہ کام کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے یُذَبِّحُ ابْنَاءَهُمْ اور آيُؤَيِّنُكُمْ اَصْلَ میں آيُؤَيِّنُكُمْ تھا ضمہ کو یا پر ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

الَّذِينَ قَالُوا اِنَّ اللّٰهَ عٰهَدَ اِلَيْنَا اَلَا نُوْمِنُ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يٰتِيَنَا بَقْرٰنٍ تَاْكُلُہُ
التَّارُۥ قُلْ قَدْ جَاۤءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيۡ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيۡ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۷﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۤءُوْ
بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيۡرِ ﴿۱۸﴾

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ تحقیق اللہ (تعالیٰ) نے اقرار لیا ہے ہم سے کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی رسول پر یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایک قربانی کھالے اس کو آگ آپ فرمائیے آچکے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو۔ اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے جو لائے تھے معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب۔“

قولہ تعالیٰ: الَّذِينَ قَالُوا اِنَّ اللّٰهَ عٰهَدَ اِلَيْنَا اَلَا نُوْمِنُ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يٰتِيَنَا بَقْرٰنٍ تَاْكُلُہُ
التَّارُۥ قُلْ قَدْ جَاۤءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيۡ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيۡ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۷﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۤءُوْ
بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيۡرِ ﴿۱۸﴾

تو اللہ تعالیٰ: الَّذِينَ قَالُوا اِنَّ اللّٰهَ عٰهَدَ اِلَيْنَا اَلَا نُوْمِنُ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يٰتِيَنَا بَقْرٰنٍ تَاْكُلُہُ
التَّارُۥ قُلْ قَدْ جَاۤءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيۡ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيۡ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۷﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۤءُوْ
بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيۡرِ ﴿۱۸﴾

یہ اس الذین سے بدل ہے جو اس قول باری تعالیٰ میں ہے لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ
الَّذِيۡنَ قَالُوْۤا اِيَّاہِ لِنُعٰبِدُکَ صَفَتْ ہے یا مبتدا کی خبر ہے، یعنی ہم الذین قالوا۔ اور کبھی وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت کعب بن
اشرف، مالک بن صفی، وہب بن یہودا، فحاح بن عازوراء اور ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے کہا: کیا آپ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے،
حالانکہ اس نے ہم پر کتاب نازل کی ہے اور اس میں ہم سے عہد کیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جو گمان کرتا ہو کہ وہ
اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس قربانی لائے جسے آگ کھالے، پس اگر تم ہمارے لئے وہ (دلیل)
لے آئے تو ہم آپ کی تصدیق کر لیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ تورات میں ہے، لیکن مکمل کلام یہ ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے پاس حضرت مسیح علیہ السلام اور
حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آجائیں پس جب وہ دونوں تمہارے پاس آئیں تو ان دونوں کے ساتھ بغیر قربانی کے ایمان لاؤ۔
اور یہ قول بھی ہے: قربانی دینے والوں کا امر ثابت اور قائم تھا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان پر اسے
منسوخ کر دیا گیا۔ ان میں سے نبی علیہ السلام قربانی ذبح کرتے تھے اور دعا مانگتے تھے تو پھر سفیدی آگ نازل ہوتی، اس کی
آواز ہوتی اور وہ گھیر لیتی، اس کا دھواں نہ ہوتا، اور وہ قربانی کو کھا جاتی۔ پس یہ قول یہود کی طرف سے دعویٰ ہے، اور جب وہاں
استثنا ہوئی یا نسخ تو انہوں نے اسے چھپا دیا، اور وہ اس سے اپنے استدلال میں سرکشی اور تکبر کرنے والے تھے اور حضور نبی مکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ان کے دعویٰ کو باطل کرنے میں دلیل قاطع ہیں، اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔

اور جس کا صدق ثابت ہو اس کی تصدیق بھی ثابت ہوتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ اے محمد! صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم آپ فرمادیجئے: قَدْ جَاءَ کُمْ اے گروہ یہود! آچکے تمہارے پاس رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنَاتِ وَ بِالْذِیْنِ قُلْتُمْ (رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ جو تم کہہ رہے ہو) یعنی قربانی قِلَمَ قَتَلْتُمْوَهُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو) یعنی حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور وہ تمام انبیاء علیہم السلام جو قتل کر دیئے گئے اور تم ان کے ساتھ ایمان نہ لائے۔ اس سے مراد ان کے اسلاف ہیں (1)۔ اور یہی وہ آیت ہے جسے عامر الشعمی رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے تلاوت کیا، اور اس کے ساتھ اس پر حجت قائم کی جس نے حضرت عثمان رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کے قتل کو اچھا قرار دیا جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو قاتل کا نام دیا ہے اس لئے کہ وہ اپنے اسلاف کے اس فعل پر راضی تھے، اگرچہ ان کے درمیان تقریباً سات سو برس کا فاصلہ اور فرق تھا۔ اور القربان سے مراد قربانی، صدقہ، اور عمل صالح میں سے وہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ فعلان کے وزن پر ہے اور القربۃ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ اسم اور مصدر ہو سکتا ہے، پس اسم کی مثال سلطان اور برہان ہے۔ اور مصدر کی مثال عدوان اور خسران ہے اور عیسیٰ بن عمر بَقْرَبَّانِ قاف کے ضمہ کی اتباع میں را کو ضمہ کے ساتھ پڑھتے تھے (2)، جیسا کہ ظلمت کی جمع میں جُجُرات کہا گیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو تسلی دیتے ہوئے اور آپ کی غمخواری کرتے ہوئے فرمایا: فَاِنْ کَذَّبُوکَ فَقَدْ کَذَّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ جَاءُوْا بِالْبَیِّنَاتِ اِگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تحقیق آپ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے جو دلائل کے ساتھ آئے تھے۔ وَالْزُّبُرُ یعنی اور لکھی ہوئی کتابیں۔ اور زبور یہ زبور کی جمع ہے اور یہ کتاب ہے۔ اور اس کی اصل زہرت ای کتبت سے ہے یعنی میں نے لکھا۔ اور ہرزبور پس وہ کتاب ہے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

لَبِنٌ طَلَلٌ ابصرته فشحانی کخط زبور فی عسیب یسانی

اس میں بھی زبور سے مراد کتاب ہے۔

اور انا اعراف تزہرتی ای کتابتی۔ یعنی میں اپنی کتابت (لکھائی) کو پہچانتا ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زبور زبر بمعنی زجر (جھڑکنا) سے ماخوذ ہے (3)۔ اور زہرت الرجل کا معنی ہے میں نے آدمی کو جھڑکا (ڈانٹ پلائی) اور زہرت البئر کا معنی ہے میں نے کنوئیں کو پتھروں سے بنایا۔ اور ابن عامر نے بِالْزُّبُرِ بِالْکِتَابِ السُّنَنِ دونوں کلموں کو باکی زیادتی کے ساتھ پڑھا ہے (4) اور اسی طرح اہل شام کے مصاحف میں ہے۔ وَالْکِتَابِ الْمُنِيرِ یعنی واضح اور روشن کتاب لے کر آئے، یہ تیرے اس قول سے ہے: اُنزِلَ الشَّيْءُ اُنْبَدَ، یعنی میں نے

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 549، دار الکتب العلمیہ

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 549، دار الکتب العلمیہ

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 441

3۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 411

اسے واضح اور روشن کر دیا۔ کہا جاتا ہے: نار الشیء و أنارہ و تورہ و استنارہ یہ ہم معنی ہیں، اور ان دونوں میں سے ہر ایک لازم اور متعدی ہے۔ اور زبر اور کتاب کو جمع کیا..... حالانکہ یہ دونوں بھی ہم معنی ہیں..... اس لئے کہ ان دونوں کے الفاظ مختلف ہیں اور ان کی اصل وہی ہے جیسے ہم نے ذکر کر دی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَا آيَةٍ الْمَوْتِ ۖ وَإِنَّمَا تُوَفَّقُونَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۖ فَمَنْ زُحِرَ عَنْ

النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۖ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿١٥﴾

”ہر نفس چکھنے والا ہے موت کو اور پوری مل کر رہے گی تمہیں تمہاری مزدوری قیامت کے دن پس جو شخص بچا لیا گیا آتش (دوزخ) سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر ساز و سامان دھوکہ میں ڈالنے والا۔“

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے بخل کرنے والوں اور ان کے کفر کے بارے ان کے اس قول میں خبر دی: إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ اور مومنین کو ان کی اذیت پر صبر کرنے کے بارے اپنے اس قول میں حکم ارشاد فرمایا لَتُبْلَوُنَّ الْآيَةَ (تو پھر) بیان کیا کہ وہ ختم ہو جانے والی چیزوں میں سے ہے اور وہ ہمیشہ نہیں رہے گا، کیونکہ دنیا کی انتہا اور اختتام قریب ہے اور قیامت کا دن یوم جزا (بدلے کا دن) ہے۔ ذَا آيَةٍ الْمَوْتِ یہ ذوق سے ماخوذ ہے اور یہ (موت) ایسی شے ہے جس سے انسان کو پناہ نہیں، اور نہ ہی اس سے کوئی حیوان الگ اور جدا ہے (یعنی ہر ذی روح کو موت آنا یقینی ہے۔) امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

من لم يمت عبطة يمت هرماً للموت كأس والمر ذاتقها
جو عین عالم شباب میں نہیں مرتا اسے بڑھا پے میں موت آ جاتی ہے موت تو (شراب سے بھرا ہوا) ایک جام ہے اور آدمی اس کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

الموت باب و كل الناس داخله فليت شعري بعد الباب ما الدار
موت ایک دروازہ ہے اور تمام لوگ اس سے داخل ہونے والے ہیں اے کاش مجھے علم ہوتا اس دروازے کے بعد گھر کون سا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ عام قرأت ذَا آيَةٍ الْمَوْتِ اضافت کے ساتھ ہے اور اعمش، یحییٰ اور ابن ابی اسحاق نے ذائقۃ الموت یعنی ذائقۃ کونین کے ساتھ اور الموت کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ موت کے بعد تو کوئی ذائقہ

نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ اسم فاعل کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بمعنی ماضی ہو۔ اور دوسری یہ کہ وہ بمعنی استقبال ہو، پس اگر تو پہلا معنی مراد لے گا تو اس میں تو صرف مابعد کی طرف اضافت ہی ہے، جیسے تیرا یہ قول ہے: **هَذَا ضَارِبٌ زَيْدًا مَسْ** اور **قَاتِلٌ بَكْرًا مَسْ**، کیونکہ اسے اسم جامد کے قائم مقام رکھا جاتا ہے اور وہ علم ہے، جیسے غلام زید اور صاحب بکر۔ شاعر نے کہا ہے:

الْحَافِظُ عَوْرَةَ الْعَشِيرَةِ لَا يَأْتِيهِمْ مِنْ دَرَائِهِمْ وَكَفْ

(اس میں الحافظ اسم مابعد کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہو رہا ہے۔)

اور اگر دوسرا معنی مراد لیں تو جر جائز ہے اور نصب اور تنوین کی بھی یہی صورت ہے اور یہی اصل ہے، کیونکہ یہ (اسم فاعل) قائم مقام فعل مضارع کے ہوتا ہے اور اگر فعل غیر متعدی ہو، تو پھر یہ متعدی نہیں ہوتا جیسے قائم زید اور اگر وہ متعدی ہو تو اسے متعدی بنائے اور اس کے ساتھ نصب دے اور یہ کہے: **زَيْدٌ ضَارِبٌ عَمْرًا** بمعنی يضرب عمروا۔ اور تخفیف کے لئے تنوین کا حذف اور اضافت جائز ہوتی ہے۔ جیسا کہ المرآۃ نے کہا ہے:

سَلَى الْهَيْمَةَ بِكُلِّ مُعْطَى رَأْسِهِ فَاجِ مُخَالِطٍ صُفْبَةٍ مَتَعَيْسٍ

مُغْتَالٍ أَحْبَلَهُ مَبِينٌ عُنُقُهُ فِي مَنْكِبٍ زَيْنَ الْبُطْقِ عَمْرَنْدَسٍ

تنوین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے اور اصل میں: **مُعْطَى رَأْسِهِ** تنوین اور نصب کے ساتھ ہے، اور اس کی مثل قرآن کریم میں بھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرَّةِ** اور یہ اس کی مثل نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ پھر تو جان کہ موت کے کچھ اسباب اور اس کی کچھ علامات ہیں، پس بندہ مومن کی موت کی علامات میں سے پیشانی پر پسینہ کا آنا ہے۔ اسے نسائی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”بندہ مومن پیشانی کے عرق آلود ہونے کے ساتھ فوت ہوتا ہے (1)۔“ اور ہم نے اسے ”التذکرہ“ میں بیان کیا ہے اور جب وہ قریب المرگ ہو تو اسے شہادت کی تلقین کی جائے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **يَا لَقَتْنَا مَوْتَ** لا اله الا الله (2) (اپنے مرنے والوں کو **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کی تلقین کرو) تاکہ یہ اس کا آخری کلام ہو اور اس کی زندگی کا اختتام کلمہ شہادت کے ساتھ ہو، اور اس پر بار بار اس کا اعادہ نہ کیا جائے تاکہ وہ پریشان اور تنگ نہ ہو جائے۔

اور اس وقت سورۃ یسین پڑھنا مستحب ہوتا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: **اقْرَأْ يَسِينَ عَلَي مَوْتَاكُم** (3) (اپنے مرنے والوں پر یسین پڑھو۔) اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ اور علامہ الآجری نے کتاب النصیحہ میں حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مَا مِنْ مَيِّتٍ يَقْرَأُ عِنْدَهُ سُوْرَةُ يَسٍ إِلَّا هُوَ**

عندہ الموت (1) (جس مرنے والے کے پاس سورہ یسین پڑھی جاتی ہے اس پر موت آسان کر دی جاتی ہے) پس جب روح قبض کی جاتی ہے اور نگاہ روح کی اتباع اور پیچھا کرتی ہے..... جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اور یہ صحیح مسلم میں ہے..... اور عبادات اٹھ جاتی ہیں اور پابندی (تکلیف) ختم ہو جاتی ہے، تو زندوں پر کچھ احکام لازم ہوتے ہیں، ان میں سے اس کی آنکھیں بند کرنا، اور اس کے نیک اور صالح بھائیوں دوستوں کو اس کی موت کی خبر دینا ہے، اور ایک قوم نے اسے مکروہ کہا ہے اور کہا ہے یہ موت کی خبر اور اعلان ہے، اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، ہم نے اسے کسی دوسرے مقام پر بیان کیا ہے اور ان احکام میں سے غسل و دفن کے ساتھ اس کی تیاری کرنا بھی ہے تاکہ اس میں تغیر اور تبدیلی نہ آجائے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قوم سے کہا جنہوں نے اپنی معیوں کو دفن کرنے میں تاخیر کی: عجلوا بدفن جیفتکم اپنے مردوں کو دفن کرنے میں جلدی کرو) اور مزید فرمایا: اسرعو بالجنائزۃ الحدیث (جنازہ لے جانے میں جلدی کرو) اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہامیت کے غسل کا مسئلہ تو یہ سوائے شہید کے تمام مسلمانوں کے لئے سنت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میت کو غسل دینا واجب ہے۔ قاضی عبدالوہاب نے یہی کہا ہے۔ اور پہلا کتاب کا مذہب ہے، اور ان دونوں قولوں پر علماء کا عمل ہے اور اختلاف کا سبب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جو آپ نے ام عطیہ کو اپنی بیٹی زینب کو غسل دینے کے بارے میں فرمایا، جیسا کہ وہ مسلم میں موجود ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ حضرت ام کلثوم تھیں، جیسا کہ ابوداؤد کی کتاب میں موجود ہے: ”تم انہیں تین یا پانچ یا اس سے زیادہ بار غسل دینا اگر تم اسے دیکھو (2)“ الحدیث۔ یہ حدیث علماء کے نزدیک میت کو غسل دینے کے بارے میں اصل ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ اس امر سے مراد غسل کا حکم بیان کرنا ہے کہ وہ واجب ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مقصود غسل کی کیفیت کی تعلیم ہے لہذا اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو غسل کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ان رایتن ذالک دلالت کرتا ہے اور یہ امر کے ظاہر کو جو ب سے نکالنے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان کی نظر و فکر کے سپرد کر دیا۔

ان کو کہا گیا: اس میں یہ بعد اور دوری ہے، کیونکہ تمہارا ان رایتن کو امر کی طرف لوٹانا، یہ فہم میں جلدی آنے والا نہیں ہے بلکہ یہ بالفور اس شرط کو مذکورہ (مفہوم کے) اقرب کی طرف لوٹانے کا ذریعہ ہے، اور وہ ”اس سے اکثر اور زیادہ ہے“ یا پھر اعداد میں تخییر کی طرف لوٹاتا ہے۔

المختصر اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ میت کو غسل دینا مشروع ہے شریعت میں اس پر عمل کیا گیا ہے اسے (کبھی) نہیں چھوڑا جائے گا اور اس کا طریقہ غسل جنابت کے طریقہ کی طرح ہے جیسا کہ معروف ہے۔ اور بالا جماع ایک میت کو غسل دینے میں سات بار غسل سے تجاوز نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ اسے ابو عمر نے بیان کیا ہے۔ اگر ساتویں بار غسل دینے کے بعد اس سے کوئی شے خارج ہو تو صرف اس مخصوص جگہ کو دھو ڈالا جائے گا، اور اس کا حکم جنبی کے حکم کی طرح ہے جبکہ اسے غسل کے بعد

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 4، صفحہ 32

2۔ سنن ابی داؤد، الجنائز، جلد 2، صفحہ 92۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب غسل الميت ووضوئہ بالماء والسدر، حدیث نمبر 1175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حدث لاحق ہو جائے، جب میت کے غسل سے فارغ ہو جائے تو اسے اس کے کپڑوں میں کفن دو اور وہ یہ ہیں۔

عام علماء کے نزدیک کفن دنیا واجب ہے، پس اگر اس کا مال ہو تو پھر عام علماء کے نزدیک اس کے رأس المال سے کفن دیا جائے گا، مگر طاؤس نے یہ کہا ہے کہ اس کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس کے تیسرے حصے سے ہی کفن دیا جائے گا۔

اور اگر میت ان میں سے ہو کہ اس کا نفقہ اس کی زندگی میں ہی کسی اور کے ذمہ لازم ہو مثلاً آقا کے ذمہ..... اگر وہ غلام ہو..... یا باپ یا خاوند یا بیٹے کے ذمہ، تو بالاتفاق (کفن) ان پر ہی ہوگا، پھر بیت المال پر یا مسلمانوں کی جماعت پر کفن کفایہ ہو گا اور وہ شے جو اس میں سے تعیین فرض کے ساتھ متعین ہو جاتی ہے وہ ستر عورت (شرمگاہ کو ڈھانپنا) ہے اور اگر اس میں فالتو اور اضافی کپڑا ہو لیکن وہ سارے بدن کو نہ ڈھانپ سکتا ہو تو پھر اس کے چہرہ کی تکریم میں اس کے سر اور چہرہ کو ڈھانپا جائے گا اور اس کے محاسن کی تبدیلی میں سے جو ظاہر ہو اسے ڈھانپ دیا جائے اور اس میں اصل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے، کیونکہ انہوں نے احد کے دن ایک کمل چھوڑا جب آپ کے سر کو ڈھانپا جاتا تو آپ کے پاؤں اس سے نکل جاتے، اور جب آپ کے پاؤں کو ڈھانپا جاتا تو آپ کا سر باہر نکل جاتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اسے ان کے سر پر ڈال دو اور ان کے پاؤں پر اذخر (گھاس) رکھ دو (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور تمام علماء کے نزدیک کفن میں کپڑوں کا طاق (وتر) ہونا مستحب ہے، اور تمام کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں کوئی مخصوص حد نہیں ہے اور پھر کپڑوں کا سفید ہونا مستحب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: البسوا من ثيابکم البیاض فانہا من خیر ثیابکم و کفنوا فیہا موتاکم (2) (تم اپنے سفید کپڑے پہنو کیونکہ یہ لباس تمہارے کپڑوں میں سے بہترین ہے اور اسی میں تم اپنے مردوں کو کفن دو) اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سحول کے بنے ہوئے روئی کے تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا اور کسی اور رنگ کے کپڑے میں بھی کفن دینا جائز ہے مگر یہ کہ وہ خالص ریشم یا اون ملا ریشمی کپڑا نہ ہو۔ اور اگر ورثاء کفن میں بخل سے کام لیں تو پھر ان پر جمعہ اور عیدین کے دنوں میں پہنے جانے والے لباس کی مثل کپڑا لازم کر دیا جائے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا کفن احدکم اخاه فلیحسن کفنه (3) (جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اچھے کپڑے میں کفن دے) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ مگر یہ کہ وہ اس سے کم کے بارے وصیت کرے۔ اور اگر اس نے اسراف (فضول خرچی) کی وصیت کی تو کہا گیا ہے: (ضرورت سے) زائد میں (اس کی وصیت) باطل ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ثلث میں نافذ ہوگی۔ (لیکن) پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے وَلَا تُسْرِفُوا (اور تم فضول خرچی نہ کرو) اور ابو بکر نے کہا ہے: بے شک یہ میت کے بدن سے نکلنے والی پیپ کے لئے ہے۔ اور جب وہ اس کے غسل اور اسے کفن پہنانے سے فارغ ہو جائے اور اسے چار پائی پر رکھ دیا جائے اور اسے آدمی اپنے کندھوں پر اٹھائیں تو اس کا حکم یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس کے لئے حکم تیز چلنے کا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسرعوا بالجنائز فان تک

1۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 305۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1197، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 306

2۔ سنن ابی داؤد، الطب، جلد 2، صفحہ 185

صالحۃ فخیر تقدّمونہا الیہ وان تکن غیر ذالک فشتہ تضعونہ عن رقابکم (1) (تم میت کو لے کر تیز چلو پس اگر وہ نیک اور صالح ہے تو اچھا اور بہتر ہے تم اسے اس تک جلدی پہنچا دو گے اور اگر وہ اس کے سوا ہے تو وہ برا ہے تم اسے جلدی اپنی گردنوں سے اتار دو گے) (2) اس طرح نہیں ہے جیسا کہ آج جاہل لوگ آہستہ آہستہ لے کر چلتے ہیں، اور بار بار راستے میں ٹھہرتے ہیں، اور ایسی سر اور آواز کے ساتھ قرآن کریم کی قرأت کرتے ہیں جو حلال نہیں ہے اور وہ بھی جائز نہیں ہے جو مصری شہروں کے لوگ اپنے مردوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ نسائی نے روایت کیا ہے کہ محمد بن عبدالاعلیٰ نے ہمیں خبر دی ہے انہوں نے کہا کہ خالد نے اور اسے عیینہ بن عبدالرحمن نے خبر دی ہے اور کہا ہے کہ مجھے مبرے باپ نے بتایا ہے کہ میں حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں حاضر ہوا اور زیاد نکل کر چار پائی کے آگے آگے چلنے لگا اور عبدالرحمن کے خاندان کے لوگ اور ان کے موالی چار پائی اٹھا کر اپنی ایزنیوں پر چل رہے تھے اور کہتے تھے: آہستہ آہستہ، اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے: پس وہ رینگ رینگ کر چل رہے تھے (یعنی انتہائی آہستہ رفتار سے) یہاں تک کہ جب ہم مرید کا کچھ راستہ طے کر چکے تو ہمیں پیچھے سے خچر پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ کر ملے۔ پس جب آپ نے انہیں وہ کرتے ہوئے دیکھا تو ان پر اپنے خچر سے حملہ کر دیا اور ان پر کوڑا برسایا اور فرمایا: تم چھوڑ دو! قسم ہے سب سے مکرم و محترم ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے اور ہم میت کو لے کر دوڑتے چلے جاتے تھے تو اس سے قوم خوش ہو گئی (3)۔

اور ابو ماجدہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ کے ساتھ چلنے کے بارے پوچھا: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ ڈر کی چال سے ذرا کم ہوا اگر وہ میت نیک اور صالح ہوئی تو بہتر ہے اسے اس تک جلدی پہنچا دیا جائے گا اور اگر وہ اس کے سوا ہوئی تو پھر اہل نار سے دور رہو (4)۔“ الحدیث۔ ابو عمر نے کہا ہے: اس مسئلہ میں جس پر علماء کی جماعت ہے (وہ یہ ہے) کہ عام عادت سے چال تھوڑی تیز ہو، اور تیزی ان کے نزدیک آہستہ چال سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور ایسی تیزی جو ان کمزور اور ضعیف لوگوں کے لئے باعث مشقت ہو جو جنازہ کے پیچھے چل رہے ہیں وہ مکروہ ہے اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: میت کو لے کر تھوڑا آہستہ چلو (لیکن) یہود و نصاریٰ کی طرح رینگ رینگ کر نہ چلو۔ اور ایک قوم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں الاسراع کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد دفن میں جلدی کرنا ہے نہ کہ چلنے میں، اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور رہی میت پر نماز جنازہ تو یہ جہاد کی طرح واجب (فرض) علی الکفایہ ہے۔ یہی علماء کا مشہور مذہب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر کا بھی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے بارے میں فرمایا: قوموا فصلوا علیہ (تم اٹھو اور اس پر نماز پڑھو) اور اصغ نے کہا ہے: نماز جنازہ سنت ہے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے، اس بارے میں مزید بیان سورۃ برآۃ میں آئے گا۔

2۔ صحیح بخاری، باب السمرۃ بالجنازہ، حدیث 1231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

1۔ صحیح مسلم، الجنازہ، جلد 1، صفحہ 306-307

4۔ ابوداؤد، باب الاسراع بالجنازہ، حدیث 2769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، الجنازہ، جلد 1، صفحہ 271

مسئلہ نمبر 7۔ میت کو مٹی میں دفن کرنا، اس میں چھپانا اور اسے مٹی کے ساتھ ڈھانپ دینا یہ واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِثُ سَوْءَةً أَخِيهِ (المائدہ: 31)** (پس بھیجا اللہ نے ایک کو اکھودتا تھا زمین کو تاکہ دکھائے اسے کہ کس طرح چھپائے لاش اپنے بھائی کی)

اس آیت کے تحت قبر بنانے کا حکم اور جو کچھ اس میں سے مستحب ہوتا ہے اور اس میں میت کو رکھنے کی کیفیت ذکر کی جائے گی اور اس پر مسجد بنانے کا حکم سورہ ”الکہف“ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پس یہ مردوں سے متعلق احکام ہیں اور وہ جو زندوں پر ان کے لئے واجب ہوتے ہیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبیؐ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مردوں کو گالیاں نہ دو کیونکہ وہ اس تک پہنچ چکے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے (1)۔“ اسے مسلم نے روایت کیا ہے، اور سنن نسائی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ام المؤمنین نے فرمایا: حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس ایک مرنے والے کا ذکر برائی کے ساتھ کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنے ہلاک ہونے والوں کا ذکر نہ کرو مگر خیر اور بھلائی کے ساتھ (2)۔“

قولہ تعالیٰ: **وَإِنَّمَا تَوْفِقُونَ أَجُورًا كُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ** پس مومن کا اجر ثواب ہے، اور کافر کا اجر عقاب (سزا) ہے دنیا میں نعمتوں اور آزمائش و مصائب کو اجر اور جزا میں شمار نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ فنا ہونے والی ہیں۔ **فَمَنْ ذُخِرَ عَنِ النَّارِ** پس جسے آتش جہنم سے دور رکھا گیا۔ **وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ** اور اسے جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ اس کے ساتھ کامیاب ہو گیا جس کی وہ آرزو اور تمنا رکھتا ہے اور اس سے وہ نجات پا گیا جس سے وہ ڈرتا ہے۔ اور اعمش نے زید بن وہب سے، انہوں نے عبد الرحمن بن عبد رب الکعبہ سے، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عبد شمس سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **مَنْ سَرَاهُ أَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ فَلَتَاتِهِ مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيَأْتِي إِلَى النَّاسِ الَّذِي يَحِبُّ أَنْ يُوتَى إِلَيْهِ (3)** (جسے یہ بات خوش کرتی ہے کہ اسے آتش جہنم سے دور رکھا جائے اور اسے جنت میں داخل کیا جائے تو چاہئے کہ اس کی موت اسے اس حال میں آئے کہ وہ شہادت دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور وہ لوگوں کے پاس وہ (شے) لے کر آئے جسے وہ پسند کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس لائی جائے۔) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جنت میں کوڑے (برابر) جگہ دینا اور اس میں موجود تمام چیزوں کی نسبت بہتر ہے اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو **فَمَنْ ذُخِرَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (4)**

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ یعنی دنیا مومن کے ساتھ مکر کرتی ہے اور اسے دھوکہ دیتی ہے اور وہ اس کے طویل

1۔ سنن نسائی، الجناز، جلد 1، صفحہ 274۔ ایضاً صحیح بخاری، باب ما یمنہ من سب الاموات، حدیث 1306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً

3۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، البر والصلة، جلد 8، صفحہ 340، حدیث نمبر 13669

4۔ المستدرک التفسیر، جلد 2، صفحہ 327، حدیث نمبر 3170۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن من رسول اللہ، حدیث 2939، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عرصہ تک باقی رہنے کا گمان کرنے لگتا ہے حالانکہ دنیا فانی ہے۔ اور متاع سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے لطف اندوز ہوا جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے، جیسا کہ کلباڑا، ہانڈی اور پیالہ پھر یہ زائل اور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔

حسن نے کہا ہے: جیسا کہ سرسبز و شاداب نباتات اور پچیوں سے دل بہلانا اس کا کوئی حاصل اور نتیجہ نہیں۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ چھوڑا ہوا ساز و سامان ہے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں سمیت برباد اور تباہ ہو جائے، لہذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس سامان سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے اتنا لے لے جتنی وہ استطاعت رکھتا ہے۔ تحقیق کسی نے کتنا خوب اور اچھا کہا ہے:

ہی الدار دار الأذى والقذى و دار الفناء و دار الغیر
یہ (دنیا) اذیتوں اور تکلیفوں کا گھر ہے اور یہ فنا ہونے والا اور تکبر و نخوت کا گھر ہے۔

فلو نلتها بخذا فیرھا لُت ولم تقض منها الوطر
پس اگر تو اسے مکمل طور پر بھی پالے تو یقیناً تجھے موت آئے گی اور تیرا مطلوب حاصل نہ ہوا ہوگا۔

ایامن یؤمل طول الخلود و طول الخلود علیہ ضرر
اے وہ جو اس سے طویل آرزوئیں وابستہ رکھتا ہے اس پر ہمیشہ کی آرزو رکھنا باعث ضرر ہے۔

اذا انت شبت و بان الشباب ولا خیر فی العیش بعد الکبر
جب تو بوڑھا ہو جائے گا اور جوانی ڈھل جائے گی تو پھر بڑھا پے کے بعد زندگی میں کوئی مزہ اور خیر نہیں۔

اور الغرور (عین کے فتح کے ساتھ) اس کا معنی شیطان ہے، وہ لوگوں کو جھوٹے وعدوں اور تمناؤں کے ساتھ دھوکہ دیتا ہے، ابن عرفہ نے کہا ہے: غرور سے مراد وہ شے ہے جسے تو ظاہر اذیکھے تو تو اسے پسند کرے، اور اس کا باطن مکروہ (ناپسندیدہ) یا مجہول ہو۔ اور شیطان کمزور ہے، کیونکہ وہ نفس کی محبت پر ابھارتا ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ برا ہوتا ہے۔ فرمایا: اس سے بچ الغرر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بیع کا ظاہر اسے دھوکہ دیتا ہے اور باطن مجہول ہوتا ہے۔

لَتُبْلَوْنَ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعَنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ
مِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيْرًا ۖ وَإِنْ تُصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ
الْأُمُورِ ۝

”یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت دینے والی باتیں اور اگر تم (ان دل آزاریوں پر) صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔“

یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے اور معنی یہ ہے: تم آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تمہارا امتحان لیا جائے

گناہوں میں مصائب کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی تکلیف کے ساتھ اور تمام شرعی پابندیاں لگانے کے ساتھ۔ اور جانوں میں آزمائش موت، امراض میں مبتلا کرنے اور دوست احباب کے فوت ہونے کے ساتھ ہوتی ہے چونکہ مالوں کے سبب مصائب زیادہ ہوتے ہیں اس لئے پہلے ذکر اموال کا فرمایا وَلَتَسْمَعُنَّ اِذَا كُنَّ يَسْتَرْجِعْنَ اِلَىٰ اٰهْلِهِنَّ قَالَتُ لِلّٰهِ اِنْ شَاءَ لَنَا مِنْكُمْ مِثْلُ مَا كَانَ لِآٰهْلِ الْيٰسْرِ مِنْ رَبِّكَ وَلَتَسْمَعُنَّ اِذَا كُنَّ يُخَصِّمْنَ اَلْاٰهْلَ الْيٰسْرِ قَالَتُ لِمَ يَكْفُرُ الْاٰهْلُ الْيٰسْرِ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَرُسُلِہٖ اُولٰٓئِكَ سَمِعُوا لٰكِن كَانُوْا عٰوْدِیْنَ (۱) اس نے یہ کلمات قرآن کریم کا رد کرتے ہوئے اور اس کو حقیر سمجھتے ہوئے اس وقت کہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا وَاَنْتُمْ لَا تَرْضَوْنَ اللّٰهَ فَمَا تَرْضَوْنَ (۲) اس نے اسے تھپڑ دے مارا، اس نے حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آپ کی شکایت کی تب یہ آیت نازل ہوئی۔ کہا گیا ہے کہ وہ کہنے والا فخاص یہودی تھا، یہ عکرمہ سے مروی ہے۔

اور زہری نے کہا ہے: وہ کعب بن اشرف تھا اس کے سبب یہ آیت نازل ہوئی، وہ شاعر تھا اور وہ حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کی ہجو کرتا تھا اور وہ آپ ﷺ کے خلاف کفار قریش کو جمع کرتا تھا، اور مسلمان عورتوں کے ذکر سے اپنے قصیدہ کو مزین کرتا تھا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف حضرت محمد بن مسلم رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں کو بھیجا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ کتب سیر اور صحیح اخبار میں اس کا قتل مشہور ہے، اور اس کے سوا بھی اقوال ہیں (2)۔

اور آپ ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں یہودی اور مشرک تھے، اور آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام بہت زیادہ اذیت ناک باتیں سنتے تھے۔ اور صحیحین میں ہے (3) کہ آپ ﷺ ابن ابی کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ آپ ﷺ گدھے پر سوار تھے تو آپ ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو ابن ابی نے کہا: جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر وہ سچ ہے تو آپ اس کے ساتھ ہماری مجالس میں ہمیں تکلیف اور اذیت نہ دیں! آپ اپنی سواری کی طرف لوٹ جائیں پس جو آپ کے پاس آئے تو اس پر اسے بیان کیجئے اور اس نے اپنی ناک پکڑ لی تاکہ گدھے کا غبار اس تک نہ پہنچے، تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! ﷺ، آپ ہماری مجالس میں تشریف لائے کیونکہ ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

1- المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 550، دار الکتب العلمیہ

2۔ المحرر الوجيز، جلد 1، صفحہ 551، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، باب قتل کعب بن الاشرف، حدیث نمبر 3731، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورة آل عمران، حدیث نمبر 4200، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ مشرک جو ابن ابی کے پاس موجود تھے وہ اور مسلمان باہم گالی گلوچ کرنے لگے، اور حضور نبی کریم ﷺ مسلسل انہیں خاموش کراتے رہے یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے پھر آپ ﷺ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس عیادت کے لئے تشریف لے گئے وہ بیمار تھے اور فرمایا: ”کیا تم نے وہ سنا ہے جو فلاں نے کہا ہے؟“ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: آپ اسے معاف فرما دیجئے اور اس سے درگزر کیجئے، قسم ہے اس کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے بالیقین اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس حق کے ساتھ بھیجا ہے جو (آپ پر) نازل ہوا ہے، حالانکہ اس شہر کے باسیوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ اسے تاج پہنائیں اور اسے سردار بنالیں، تو جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس حق کے ساتھ رد کر دیا ہے جو آپ کو اس نے عطا فرمایا ہے تو اس کے سبب وہ تنگ اور پریشان ہے، اسی لئے اس نے وہ کیا ہے جو آپ نے دیکھا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے درگزر فرمائی، اور پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے صبر اور تقویٰ کو مستحب قرار دیا اور یہ خبر دی کہ یہ عزم الامور (ہمت کے کاموں) میں سے ہے اور اسی طرح بخاری میں (1) سیاق حدیث میں ہے کہ یہ آیت قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہوا، اور اظہر یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں، کیونکہ احسن انداز میں اور نرمی کے ساتھ جھگڑنا، مجادلہ کرنا ہمیشہ مستحب رہا ہے۔ اور آپ ﷺ باوجود اس کے کہ آپ پر قتال کا حکم نازل ہو چکا تھا آپ یہود کے ساتھ صلح کرتے تھے اور ان سے نرمی برتتے تھے، اور منافقین سے درگزر فرماتے تھے، اور یہ بالکل بین اور ظاہر ہے اور عزم الامور کا معنی کاموں کا مضبوط اور پختہ اور سخت ہونا ہے۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكُونُ فِتْنًا

وَرَأَوْا ظُهُورَهمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبُئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ﴿١٥﴾

”اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو تو (النا) انہوں نے پھینک دیا اس وعدہ کو اپنی پشتوں کے پیچھے اور انہوں نے خرید لی اس کے عوض تھوڑی سی قیمت سو بہت بری ہے وہ چیز جو وہ خرید رہے ہیں۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ یہ یہود کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، کیونکہ انہیں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ایمان لانے اور آپ کی شان کے بیان اور وضاحت کرنے کا حکم دیا گیا، تو انہوں نے آپ کی نعت اور تعریف کو چھپا لیا۔ پس یہ آیت ان کے لئے زبرد توخیج ہے، پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ ان کے لئے اور دوسروں کے لئے عام خبر ہے۔ حضرت حسن اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس کے بارے میں ہے جسے کتاب میں سے کسی شے کا علم دیا گیا پس جو کسی شے کا عالم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی تعلیم دے، اور تم علم چھپانے سے بچو کیونکہ یہ

ہلاکت ہے (1) اور حضرت محمد بن کعب نے کہا ہے: کسی عالم کے لئے یہ حلال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے علم پر خاموش رہے اور نہ کسی جاہل کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جہالت پر خاموش رہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ الْآيَةَ**۔ اور ارشاد فرمایا: **فَسُئِلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** (النحل) (پس دریافت کر لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے کتاب کا علم رکھنے والوں سے وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں تمہیں کوئی شے نہ بتاتا، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ**۔ (2)

اور حضرت حسن بن عمارہ نے کہا ہے: میں حضرت زہری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس کے بعد کہ انہوں نے حدیث بیان کرنا ترک کر دیا تھا، تو میں نے انہیں اپنے دروازے پر پالیا، میں نے عرض کی: اگر آپ مناسب خیال کرتے ہیں تو مجھے حدیث بیان فرمائیے۔

تو انہوں نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں نے حدیث بیان کرنی چھوڑ دی ہے؟ میں نے عرض کی: یا آپ مجھے حدیث بیان کریں اور یا میں تم سے حدیث بیان کروں گا۔ انہوں نے فرمایا: تم مجھے بیان کرو۔ تو میں نے کہا: مجھے حکم ابن عتیبہ نے یحییٰ بن جزار سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے وعدہ نہیں لیا کہ وہ تعلیم حاصل کریں بلکہ اس نے علماء سے وعدہ لیا ہے کہ وہ علم سکھائیں۔ انہوں نے فرمایا: پھر انہوں نے مجھے چالیس احادیث بیان فرمائیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ** میں ہا ضمیر حضور نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ آپ کا ذکر جاری نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (ضمیر) کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کا بیان داخل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ کتاب میں ہے۔ اور فرمایا: **وَلَا تَكْشُونَهُ** یہاں **تَكْشُونَهُ** نہیں فرمایا کیونکہ یہ حال کے معنی میں ہے۔ یعنی تم اسے بغیر چھپائے کھول کر بیان کرتے ہو۔ اور ابو عمرو اور عاصم نے ابو بکر اور اہل مکہ کی ایک روایت میں **لَتُبَيِّنُنَّهُ** خطاب کی حکایت کے طور پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ کیونکہ وہ غائب تھے (3)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے **وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لِيُبَيِّنَنَّ لَهُمْ** اور قولہ تعالیٰ: **فَتَبَيَّنَّا أَنِ الْفِرْعَوْنُ كَانَ كَاذِبًا** کی طرف لوٹتے ہوئے آ رہا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام نے کھول کر بیان کر دیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں **لِيُبَيِّنُنَّهُ** بغیر نون تاکید ثقیلہ کے ہے اور **الْتَبَيَّنَّا** کا معنی پھینکنا ہے اور اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ **وَرَأَوْا ظُهُورَ الْبَاقِرِ** یہ پھینکنے میں اظہار مبالغہ ہے، اور اسی سے **وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لِيُبَيِّنَنَّ لَهُمْ** اور اس کا بیان بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: **وَأَشْتَرُوا بِهِمْ سَنًا قَلِيلًا** کا معنی و مفہوم بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے لہذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور **فَمَيْسَرٌ مَّا يَشْتَرُونَ** بھی پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُجِبُونَ أَنَّ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسِبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ①

”ہرگز آپ یہ خیال نہ کریں کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اپنی کارستانیوں پر اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے کئے ہی نہیں تو ان کے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ وہ امن میں ہیں عذاب سے ان کے لئے ہی تو دردناک عذاب ہے۔“

یعنی (وہ عذاب سے امن میں نہیں ہیں) اس فعل کے سبب جو انہوں نے غزوہ سے پیچھے رہ جانے اور گھر میں ہی بیٹھے رہنے کا کیا اور انہوں نے اس کے بارے میں عذر پیش کر دیئے۔ صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منافقین میں سے کچھ لوگ تھے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ کے لئے تشریف لے جاتے تو وہ آپ سے پیچھے رہ جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے بیٹھے رہنے پر خوش ہوتے، اور جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لاتے تو آپ کے پاس عذر پیش کرتے اور حلف دے دیتے، اور یہ چاہتے اور پسند کرتے کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے نہیں کئے، تو یہ آیت نازل ہوئی: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُجِبُونَ أَنَّ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا ①۔

اور صحیحین میں یہ بھی ہے (2) کہ مروان نے اپنے دربان کو کہا: اے رافع! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جا اور انہیں یہ کہہ کہ اگر ہم میں سے ہر آدمی اس سے خوش ہو جو کچھ اسے عطا کیا گیا ہے اور یہ پسند کرے کہ اس کی اس کام کے عوض تعریف کی جائے جو اس نے نہیں کیا (اور اس پر) وہ عذاب دیا جائے تو یقیناً ہم تمام عذاب دیئے جائیں گے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہیں کیا ہے اس آیت کے ہوتے ہوئے بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل کی گئی ہے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ اور لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُجِبُونَ أَنَّ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا ③ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کسی شے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اسے چھپالیا، اور انہوں نے آپ کو کسی اور شے کے بارے میں بتایا اور نکل گئے حالانکہ انہوں نے آپ کے سامنے ظاہر یہ کیا کہ انہوں نے آپ کو اسی کے بارے میں خبر دی ہے کہ جس کے بارے میں آپ نے ان سے پوچھا ہے اور اس پر انہوں نے آپ سے تعریف کی بھی خواہش کی، اور اس پر وہ بہت خوش ہوئے جو انہوں نے آپ سے اس شے کو چھپانے کا فعل کیا، اور جس کے بارے میں آپ نے ان سے پوچھا ④۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: یہ آیت بنی اسرائیل کے ان علماء کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے حق کو چھپایا، اور

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 6، صفحہ 656۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 4201، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورہ آل عمران، حدیث نمبر 4202، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 552، دار الکتب العلمیہ

4۔ ایضاً

وہ اپنے بادشاہوں کے پاس ایسی چیزوں کا علم لے کر آتے تھے جو ان کے ساتھ ان کے باطل نظریات میں موافقت کرتا تھا، وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (اور انہوں نے اس کے عوض تھوڑی سی قیمت خرید لی) یعنی اس کے عوض انہوں نے وہ دنیا خرید لی جو بادشاہوں نے انہیں عطا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا آتَوْا وَيُجِبُونَ أَنْ يُحْصَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس کے بدلے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں دین کے بارے فساد برپا کیا اور ضحاک نے کہا ہے: یہود بادشاہوں کو کہتے تھے بلاشبہ ہم اپنی کتاب میں پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخری زمانہ میں ایک نبی مبعوث فرمائے گا اور اس کے ساتھ (سلسلہ) نبوت ختم ہو جائے گا، پس جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو بادشاہوں نے ان سے پوچھا: کیا یہی وہ نبی ہے جس کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ تو یہودیوں نے بادشاہوں کے اموال میں حرص اور لالچ رکھنے کی بنا پر کہا: وہ اس کے سوا ہے، (یعنی یہ وہ نہیں ہے) تو بادشاہوں نے انہیں خزانے عطا کر دیئے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا آتَوْا يَعْنِي وَهُوَ خَوْشٍ هَوْتِ هِيَ اس جھوٹ سے جو انہوں نے بادشاہوں کے سامنے بولا یہاں تک کہ انہوں نے دنیوی ساز و سامان حاصل کر لیا (1)۔ پہلی حدیث دوسری حدیث کے مقتضی کے خلاف ہے اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا نزول دونوں سببوں کی بنا پر ہو کیونکہ وہ دونوں ایک ہی زمانہ میں جمع تھے اور یہ دونوں فریقوں کا جواب ہو۔ واللہ اعلم۔

اور آپ کا قول: وَاسْتَحْصِدُوا ابْنًا لَكَ إِلَيْهِ كَامَعْنَى هِيَ انہوں نے آپ سے مطالبہ اور خواہش کی کہ ان کی تعریف کی جائے اور مروان کا قول: لَنْ يَكُنْ كَلَّ امْرَأَةٍ مِثَالُكَ اس پر دلیل ہے کہ عموم کے لئے مخصوص صیغہ ہیں، اور یہ کہ الَّذِينَ ان میں سے ہے (2)۔ اور یہ یقینی اور قطعی بات ہے جس نے اسے قرآن و سنت سے سمجھا۔

اور قولہ تعالیٰ: وَيُجِبُونَ أَنْ يُحْصَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے نہ کہ پیچھے رہنے والے منافقین کے بارے میں، کیونکہ وہ کہتے تھے: ہم دین ابراہیم پر ہیں حالانکہ وہ آپ کے دین پر نہ تھے، اور وہ کہتے تھے: ہم نماز، روزے اور کتاب والے ہیں، وہ اس سے ارادہ رکھتے تھے کہ اس کے سبب ان کی تعریف کی جائے، اور الذین، یحسبن بالبیاء سے فاعل ہے۔ اور یہی نافع، ابن عامر، ابن کثیر اور ابو عمرو کی قرأت ہے، یعنی خوش ہونے والے یہ گمان نہ کریں کہ ان کی خوشی انہیں عذاب سے نجات دلانے والی ہے، اور کہا گیا ہے کہ پہلا مفعول محذوف ہے اور وہ انفسہم ہے۔

اور دوسرا مفعول ہے۔ اور کوفیوں نے تَحْسَبَنَّ تَا کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم ﷺ کو ہے یعنی اے محمد! سَلَّمَ تَا آپ گمان نہ کریں کہ خوش ہونے والے عذاب سے امن میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ تَا اور بَا کے فتح کے ساتھ ہے، اور یہ تاکید کے لئے دوبارہ مذکور ہے۔ اس کا پہلا مفعول هُمْ ضمیر ہے، اور دوسرا مفعول محذوف ہے، اور وہ كَذَلِكَ ہے، اور فاعل عطفہ ہے یا زائدہ ہے اس بنا پر کہ دوسرا فعل پہلے سے بدل ہے۔ ضحاک اور عیسیٰ بن عمر نے تَا کے ساتھ اور بَا

کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی فَلَا تَحْسَبْنَهُمْ اور مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو خطاب ہے۔ اور مجاہد، ابن کثیر، ابو عمرو اور یحییٰ بن یعمر نے یا کے ساتھ اور با کو ضمہ (1) کے ساتھ فارحین سے خبر بناتے ہوئے پڑھا ہے۔ یعنی فَلَا يَحْسَبُنَّ انْفُسَهُمْ، (اور وہ اپنے آپ کو گمان نہ کریں)، بِفَازَةٍ یہ مفعول ثانی ہے۔ اور فَلَا يَحْسَبْنَهُمْ تاکید ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الذین، يَحْسَبُنَّ سے فاعل ہے۔ اور اس کے دونوں مفعول محذوف ہیں کیونکہ يَحْسَبْنَهُمْ اس پر دال ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

بأني كتاب أم بآية آية تری حَبْنَم عَارَا عَن و تحسب
اس میں ایک مفعول کے ذکر کے سبب دوسرے مفعول کے ذکر کی ضرورت نہ رہی، اور بفازہ مفعول ثانی ہے، اور یہ پہلے فعل سے بدل ہے اور اس نے اس سے بدل ہونے کے سبب اس کے دونوں مفعولوں کے ذکر سے غنی کر دیا ہے، اور فازانہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کبھی یہ افعال ملتی آتے ہیں جملہ مفیدہ کے حکم میں نہیں ہوتے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

و ما خلت أبقى بيننا من مودة عراض المذاكي المُنْفَتَاتِ القلائصا
المَذَاكِي سے مراد وہ گھوڑا ہے جس پر اس کے دانت نکلنے کے بعد ایک سال یا دو سال گزر جائیں اس کا واحد مُذَاكِي ہے، جیسا کہ اونٹوں میں سے مُخْلَف ہوتا ہے، اور مثال میں یہ جَرِي المذکیات غلاب (یعنی طاقتور گھوڑے غالب آتے ہیں) اور السنفات اسم مفعول ہے۔ کہا جاتا ہے: سَنَفَت البعير أسنفه سَنَفًا جب تو اونٹ کا اسی کی رسی کے ساتھ تنگ کس لے اور تو اس پر سوار ہو۔

اور أسنف البعير لغة سنفه کی مثل ہے، اور اسنف البعير بنفسه جب اونٹ چلنے کے لئے اپنا سراو پر اٹھائے، یہ کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا۔ اور عرب اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور گھوڑے سے اجتناب کرتے تھے، اور وہ کہتے تھے: الحرب لا تُبْقِي مودة (جنگ محبت کو باقی نہیں رکھتی۔) اور کعب بن ابی سلمیٰ نے کہا ہے:

أرجو و أمل أن تدنو مودتها وما اخال لَدَيْنَا مِنْكَ تَنْوِيلُ
میں امید اور آرزو رکھتا ہوں کہ اس کی محبت قریب ہو اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ تیری طرف سے ہمارے پاس کوئی بخشش اور عطا ہو۔

جمہور قراء سبعہ وغیرہم نے اَتُوا الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اس کے عوض جو وہ جھوٹ اور کتمان (چھپانا) میں سے لائے۔ اور مردان بن حکم، اعمش اور ابراہیم نخعی نے اَتُوا مد کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ بمعنی اَعْطُوا ہے۔ (یعنی جوانہوں نے دیا) (مراد جوانہوں نے برتاؤ کیا)

اور سعید ابن جبیر نے اَتُوا میض مجہول کی صورت میں قرأت کی ہے، بمعنی اَعْطُوا اور المفاضة بمعنی المنجاة (جائے

نجات) ہے، یہ مفعولہ کے وزن پر فازیغوز سے ہے جب کوئی نجات پا جائے، یعنی وہ نجات پانے والے نہیں۔ اور خوف اور ڈر کی جگہ کو اچھی فال لینے کے طور پر مفازۃ کا نام دیا گیا ہے، اصمعی نے یہی کہا ہے (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ یہ موت کی جگہ ہے اور ہلاکت کا ظن غالب ہے، عرب کہتے ہیں فوز الرجل جب آدمی مر جائے۔ ثعلب نے کہا ہے: میں نے ابن اعرابی کے سامنے اصمعی کا قول بیان کیا تو اس نے کہا: انہوں نے خطا کی ہے۔ مجھے ابوالکارم نے کہا ہے: اسے مفازۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جس نے اسے طے کر لیا وہ کامیاب ہو گیا (2)، نجات پا گیا اور اصمعی نے کہا ہے: لدیغ (جس کو ڈس لیا جائے) کو بطور اچھی فال کے سلیم کا نام دیا گیا ہے (3)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: کیونکہ وہ اس تکلیف اور مصیبت سے بچ نکلنے والا ہے جو اسے پہنچی ہے (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے آپ انہیں عذاب سے کہیں دور جگہ میں گمان نہ کریں، کیونکہ فوز (کامیابی اور نجات) مکروہ (عذاب اور تکلیف) سے دور ہونا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاللّٰهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۹

”اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

یہ ان کے خلاف استدلال اور حجت ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِيَاءُ اور ان کی تکذیب ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے آپ خوش ہونے والوں کے بارے میں گمان نہ کریں کہ وہ عذاب سے نجات پا جائیں گے، کیونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، اور وہ قدرت رکھنے والے رب کے قبضہ میں ہیں، پس یہ پہلے کلام پر معطوف ہے، یعنی بلاشبہ وہ اس کے عذاب سے نجات نہیں پاسکتے، وہ انہیں پکڑ لے گا جب چاہے گا۔ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے، اس پر بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۲۰
الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۱ رَبَّنَا اِنَّكَ
مَنْ تَدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اُخْرِيتَهُ ۚ وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۲۲ رَبَّنَا اِنَّا سَمِعْنَا
مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا
سَيِّئَاتِنَا وَتَوَقَّنَا مِنَ الْاَهْوَاسِ ۝۲۳ رَبَّنَا وَاتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ
الْقِيَمَةِ ۚ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْوَعْدَ ۝۲۴ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَا اُضِيْعُ عَمَلًا عَمِلَ
مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْشِئْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَاَلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ

دِيَارِهِمْ وَأُوْدُوْا فِي سَبِيلِيْ وَ قَتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَا كُفْرَانَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَ لَا دُخْلَهُمْ
 جَنَّتِ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٥﴾
 لَا يَغْرَنَكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۚ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ
 بِئْسَ الْبِهَادُ ﴿١٧﴾ لِّكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
 فِيْهَا نَزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلَّابْرَارِ ﴿١٨﴾ وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَن
 يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خُشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ
 ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾ يَا أَيُّهَا
 الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَ صَابِرُوا وَ رَابِطُوا ۚ وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠﴾

”بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔ وہ عقل مند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور تسلیم کرتے ہیں) اے ہمارے مالک! ہمیں پیدا فرمایا تو نے یہ (کارخانہ حیات) بے کار۔ پاک ہے تو (ہر عیب سے) بچالے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو نے جسے داخل کر دیا آگ میں تو رسوا کر دیا تو نے اسے اور نہیں ہے ظالموں کا کوئی مددگار۔ اے ہمارے رب! سنا ہم نے منادی کرنے والے کو کہ بلند آواز سے بلاتا تھا ایمان کی طرف (اور کہتا تھا) کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے مالک! پس بخش دے ہمارے گناہ اور مٹا دے ہم سے ہماری برائیاں اور (اپنے کرم سے) موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ۔ اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں جو وعدہ کیا تو نے ہمارے ساتھ اپنے رسولوں کے ذریعے اور نہ رسوا کر ہمیں قیامت کے دن۔ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ تو قبول فرمائی ان کی التجا ان کے پروردگار نے (اور فرمایا) کہ میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا تم سے خواہ مرد ہو یا عورت بعض تمہارا جز ہے بعض کی تو وہ جنہوں نے ہجرت کی اور نکالے گئے اپنے وطن سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور (دین کے لئے) لڑے اور مارے گئے تو ضرور میں مٹا دوں گا ان (کے نامہ عمل) سے ان کے گناہ اور ضرور داخل کروں گا انہیں باغوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔ (یہ) جزا ہے (ان کے اعمال حسنہ کی) اللہ کے ہاں اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے۔ (اے سننے والے!) نہ دھوکہ میں ڈالے تجھے چلنا پھرنا ان کا جنہوں نے کفر کیا ملکوں میں۔ یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کے لئے ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ لیکن وہ جو ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے ندیاں (وہ متقی) ہمیشہ رہیں گے ان میں یہ

تو مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو (ابدی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ بہت بہتر ہیں نیکیوں کے لئے۔ اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ان کی طرف عاجزی (اور نیاز مندی) کرنے والے ہیں اللہ کے لئے نہیں سودا کرتے اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر۔ یہ وہ ہیں جن کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لئے) اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ۔“

اس میں پچیس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** اس کا معنی سورۃ البقرہ میں کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ان آیات میں نظر و استدلال کے حکم کے ساتھ کیا، کیونکہ یہ پیدا نہیں ہو سکتے مگر اسی کی جانب سے جو حی و قیوم ہے قدرت والا ہے، پاک ہے، سلامت و محفوظ ہے (ہر عیب اور کمزوری سے) اور کل جہاں سے بے نیاز اور غنی ہے، تا کہ ان کا ایمان یقین کے ساتھ مستند ہو جائے نہ کہ فقط تقلید (پر اس کا انحصار ہو)۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ یعنی ان کے لئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقلوں کو دلائل میں غور و فکر کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنتہما سے مروی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جب یہ آیت حضور نبی مکرم ﷺ پر نازل ہوئی آپ اٹھے نماز پڑھنے لگے تو اتنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے وہ آپ کو نماز کے بارے (مراد جماعت کے لئے) عرض کرنے لگے، تو انہوں نے آپ ﷺ کو روتے ہوئے دیکھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ رورہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے ہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے بلال! کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھ پر آج کی رات یہ آیت نازل فرمائی ہے **إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** پھر آپ نے فرمایا: اس کے لئے ہلاکت ہے جس نے اسے پڑھا اور اس میں غور و فکر نہ کیا (1)۔“

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے بیان کیا ہے، نیند سے بیدار ہونے والے کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنے چہرے پر (ہاتھ) پھیرے، اور حضور نبی رحمت ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے ان دس آیات کی قرأت سے اپنے قیام کا آغاز کرے، یہ صحیحین اور دیگر کتب میں ثابت ہے اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ پھر وہ نماز ادا کرے جو اس کے ذمہ فرض ہے، تو اس طرح وہ تفکر اور عمل دونوں کو جمع کر لے گا، اور یہی افضل عمل ہے جیسا کہ اس کا بیان اس کے بعد اسی آیت میں آئے گا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات سورہ ”آل عمران“ کی آخری دس آیات پڑھتے تھے، اسے حافظ ابو نصر واکلی سجستانی نے کتاب ”الابانہ“ میں سلیمان بن موسیٰ عن مظاہر بن اسلم مخزومی عن المقبری عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور سورہ کی ابتدا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے آل

1۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 453، مکتب الاعلام الاسلامی۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ الفتح، حدیث نمبر 4460، حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا، القرآن ہبلی کیشنز

عمران کی آخری آیات ہر بات پڑھیں اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کا ثواب لکھ دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيًّا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ** اللہ تعالیٰ نے تین ہیئتیں ذکر فرمائی ہیں انسان اپنے غالب معاملات میں ان سے خالی نہیں ہوتا، تو گویا کہ یہ کیفیات اس کے جملہ اوقات کو محیط ہیں۔ اور اس معنی کے مطابق ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ کان رسول اللہ ﷺ کما کان رسول اللہ علی کل أحيانه۔ (1)

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ پس اس میں بیت الخلا میں اور دوسرے مقامات پر ہونا سبھی داخل ہے، حالانکہ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے، اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما، ابن سیرین اور نخعی رحمہم اللہ نے اسے جائز قرار دیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا اور حضرت شعبی رحمہم اللہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ آیت اور حدیث کے عام ہونے کی بنا پر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت نخعی نے کہا ہے: بیت الخلا میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ ملائکہ اس ذکر کو لے کر بلندیوں کی جانب چڑھ جاتے ہیں اس حال میں کہ وہ ان کے صحف میں لکھا ہوتا ہے، پس مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ** (ق) (نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) تیار ہوتا ہے) اور مزید فرمایا: **وَإِنْ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ** (کما ماکا تہین) (الانظار) (حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں جو معزز ہیں (حرف بحرف) لکھنے والے ہیں) اور اس لئے بھی کہ اللہ عزوجل نے اپنے بندوں کو ہر حال میں ذکر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور کوئی استثنیٰ نہیں کی۔ پس فرمایا: **اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا** (الاحزاب) (یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے) مزید فرمایا: **فَإِذَا كُفُّوا أَذْكَرْكُمْ** (البقرہ: 152) (سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا) اور پھر فرمایا: **إِنَّا لَا نُضِيقُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا** (الکہف) ((تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے) پس یہ سب عام ہے۔ پس ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ماجور ہوگا اور اسے ثواب دیا جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابو نعیم نے ذکر کیا ہے کہ ابو بکر بن مالک، عبد اللہ بن احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے ہمیں بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے میرے باپ (مراد احمد بن حنبل رحمہ اللہ) نے بتایا کہ وکیع نے بیان کیا کہ سفیان نے عطاء بن ابی مروان سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت کعب الاحبار رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا (کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: ”اے میرے پروردگار! کیا تو قریب ہے کہ میں تیرے ساتھ سرگوشی کروں یا تو بعید ہے کہ میں تجھے ندادوں تو رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ انا جلیس من ذکری (اے موسیٰ! علیہ السلام میں اس کا ہم نشین ہوتا ہوں جو میرا ذکر کرے) عرض کی: اے میرے رب! بلاشبہ ہم تو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں (اور اس میں) ہم تجھے اس سے برتر اور عظیم تر سمجھتے ہیں کہ ہم اس میں تیرا ذکر کریں۔ رب کریم نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ عرض کی: وہ جنابت اور قضائے

حاجت کی حالت ہے۔ رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ! اذکرنی علی کل حال (☆) (اے موسیٰ! تو ہر حال میں میرا ذکر کر۔) اور جنہوں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے ان کے نزدیک کراہیت کا سبب یا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے بلند اور منزہ ہے کہ وہ ایسی جگہوں میں کیا جائے جن میں اس کے ذکر سے اعراض برتا گیا ہے جیسے کہ حمام میں قرآن کریم کی قرأت کا مکروہ ہونا، یا پھر کرانا کا تبین پر اس بناء پر رحم کھانا ہے کہ وہ انہیں غلاظت اور نجاست کی جگہ پر اتارے تاکہ وہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لکھیں۔ واللہ اعلم۔

اور قیماً وقعوداً ترکیب کلام میں حال ہونے کی بنا پر یہ منصوب ہیں۔ وَ عَلٰی جُنُوبِهِمْ یہ بھی حال کے محل میں ہے، یعنی بمعنی و مضطجعین ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: دعانا لجنبہ او قاعدا او قائما اس میں ترتیب پہلی آیت کے برعکس ہے، بمعنی دعانا مضطجعا علی جنبہ۔ (اس نے ہم سے دعا مانگی اس حال میں کہ وہ اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے ہوئے تھا۔)

مفسرین کی ایک جماعت جن میں سے حسن وغیرہ ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول یَذْکُرُونَ اللہ آخر تک اس میں ذکر سے مراد نماز ہے، یعنی وہ نماز ضائع نہیں کرتے، پس وہ عذر کی حالت میں بیٹھ کر یا اپنے پہلوؤں کے بل لیٹ کر نماز پڑھتے ہیں (1)۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَادْخُلُوا اللہ قیماً وقعوداً وَ عَلٰی جُنُوبِكُمْ (النساء: 103) (جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے))

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں اس کا بیان آ رہا ہے اور جب آیت نماز کے بارے میں ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتا ہے کھڑے ہو کر، اور اگر وہ استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنے پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھتا ہے، جیسا کہ حضرت عمران بن حصین سے ثابت ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے بوا سیر تھی تو میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو کھڑے ہو کر نماز پڑھ، اور اگر تو اس کی استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر، اور اگر تو اس کی استطاعت بھی نہ رکھے تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر (نماز پڑھ لے۔)“ (2) اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال سے ایک سال پہلے نفل نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ اور نسائی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار زانو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے (3)۔ ابو عبد الرحمن نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہو سوائے ابوداؤد خضریٰ کے اور وہ ثقہ راوی ہے اور اس حدیث کو خطا گمان کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے مریض اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز کی کیفیت اور اس کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے، پس ابن عبدالحکم نے مالک سے ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے قیام میں چار زانو بیٹھ سکتا ہے، البویطی نے امام شافعی سے یہی بیان کیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ

2۔ سنن ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 87۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم، جلد 8، صفحہ 42

3۔ سنن نسائی، ابی قیام، الدلیل و التلخیص، جلد 1، صفحہ 245

ہے۔ اور جب وہ سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو وہ جس قدر طاقت رکھتا ہو وہ سجدہ کرنے کی تیاری اور کوشش کرے، فرمایا: اسی طرح نفل پڑھنے والے کا حکم بھی ہے۔ اور اسی طرح ثوری کا قول بھی ہے، اور اسی طرح لیث، امام احمد، اسحاق، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور امام شافعی نے مزنی کی روایت میں کہا ہے: وہ اپنی ساری نماز میں تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ سکتا ہے۔ اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب سے روایت کیا گیا ہے، پہلا قول مشہور ہے اور یہی مدونہ کا ظاہر ہے (1) اور امام اعظم ابو حنیفہ اور امام زفر رحمہ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھے گا، اور اسی طرح وہ رکوع اور سجود بھی کرے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ فرمایا: اگر وہ بیٹھنے کی استطاعت نہ رکھے تو وہ اپنے پہلو کے بل یا اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے یہ اسے اختیار ہے، یہی مدونہ کا مذہب ہے اور ابن حبیب نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر (اور اگر اس پر قادر نہ ہو) تو پھر اپنے بائیں پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور ابن المواز کی کتاب میں اس کے برعکس ہے، (یعنی) وہ اپنے دائیں پہلو پر نماز پڑھے ورنہ اپنے بائیں پہلو پر نماز پڑھے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور سخون نے کہا ہے: وہ دائیں پہلو پر نماز پڑھے گا جس طرح اسے اپنی لحد میں رکھا جائے گا، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنی پیٹھ پر لیٹ کر نماز پڑھے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر بائیں پہلو پر نماز پڑھے گا (2)۔ اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہما نے کہا ہے: جب وہ چت لیٹ کر نماز پڑھے تو اس کے دونوں پاؤں قبلہ سمت ہوں گے اور امام شافعی اور ثوری رحمہ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ اپنے پہلو پر نماز پڑھے گا اور اس کا چہرہ قبلہ کی طرف ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اگر وہ مرض کم ہونے کی وجہ سے قوی اور طاقتور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نماز میں ہو، تو اس کے بارے ابن القاسم نے کہا ہے: وہ اپنی باقی نماز میں کھڑا ہو جائے گا اور اپنی پہلی نماز پر ہی اس کی بنا کرے گا، یہی قول امام شافعی، زفر اور طبری رحمہ اللہ علیہم کا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے صاحبین یعقوب اور امام محمد رحمہ اللہ علیہم نے اس کے بارے میں کہا ہے: جس نے ایک رکعت لیٹ کر نماز پڑھی پھر وہ تندرست ہو گیا وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے گا۔ اور اگر وہ بیٹھ کر رکوع و سجود کر رہا ہے پھر وہ تندرست ہو جائے تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ اسی پر بنا کرے اور امام محمد رحمہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ بنا نہ کرے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب کسی نے کھڑے ہو کر نماز شروع کی پھر وہ اشارے کی حد تک پہنچ گیا تو اسے بنا کر لینی چاہیے، اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ علیہ نے ایسے مریض کے بارے میں کہا ہے جو رکوع اور سجود کی استطاعت نہ رکھتا ہو حالانکہ وہ کھڑا ہونے اور بیٹھنے کی قدرت رکھتا ہو کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا اور رکوع کے لئے اشارہ کرے گا اور جب سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو بیٹھ جائے اور سجود کے لئے اشارہ کرے، اور یہی امام ابو یوسف کا قول ہے اور امام شافعی کے قول کا قیاس ہے، اور امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور جہاں تک تندرست لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز کا تعلق ہے تو عمران بن حصین کی حدیث سے یہ ز

یادتی مروی ہے جو کسی اور کی روایت میں موجود نہیں، اور وہ یہ ہے صلاة الراقد مثل نصف صلاة القاعد (1) (لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز کے نصف کی مثل ہے۔) ابو عمر نے کہا ہے کہ جمہور اہل علم نفل نماز لیٹ کر پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے، اور وہ حدیث ہے جسے حسین المعلم کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا اور وہ حسین ابن ذکوان ہے جس نے عبد اللہ بن بریدہ سے اور انہوں نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی سند اور متن میں حسین پر ایسا اختلاف کیا گیا ہے جو اس کے بارے تو قف کو ثابت کرتا ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے، پس اگر اہل علم میں سے کسی ایک نے ایسے آدمی کے لئے نفل نماز لیٹ کر پڑھنے کی اجازت دی ہے جو بیٹھنے پر قادر ہو یا قیام پر قادر ہو تو پھر اس کی وجہ یہی زیادتی ہے جو اس حدیث میں ہے اور یہی اس کی حجت اور دلیل ہے جس نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اگر انہوں نے ایسے آدمی کے لئے جو بیٹھنے یا کھڑا ہونے پر قادر ہو لیٹ کر نفل نماز پڑھنے کے مکروہ ہونے پر اجماع کیا ہے، تو پھر حسین کی یہ حدیث یا غلط ہے یا پھر منسوخ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو خَلْقِ السَّالُوتِ وَالْأَرْضِ سے اس پر استدلال کرتے ہیں کہ تبدیل ہونے والے کے لئے تبدیل کرنے والے کا ہونا ضروری ہے، اور اس تبدیلی لانے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ قدرت کاملہ رکھتا ہو، اور اس کا اختیار ہو کہ وہ رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے، پس اگر وہ کوئی رسول مبعوث فرمائے اور اس کی صداقت پر ایک معجزہ کے ساتھ دلیل بھی بیان کر دے تو پھر کسی کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 8۔ قوله تعالى: وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّالُوتِ وَالْأَرْضِ تحقیق ہم نے وید کن کا معنی بیان کر دیا ہے اور اس سے مراد یا تو زبان کا ذکر ہے یا پھر فرضی اور نفل نماز ہے، تو اللہ تعالیٰ نے دوسری عبادت کو ان میں سے ایک پر دوسری عبادت کے ساتھ عطف کیا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور لوگوں کی اس جماعت میں غور و فکر کرنا جو بکھری ہوئی ہے، تاکہ ان کی بصیرت میں اضافہ کرے:

و فِي كُلِّ شَيْءٍ لَّهُ آيَةٌ تَذَكُّرٌ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ

اور ہر شے میں اس کے لئے نشانی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ یکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَيَتَفَكَّرُونَ کا حال پر عطف ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ منقطع ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور فکر کا معنی ہے: تَرَدُّدُ الْقَلْبِ فِي الشَّيْءِ (کسی شے میں دل کا مترد ہونا) کہا جاتا ہے: تفکر، اور رجل فکیر یعنی ایسا آدمی جو بہت زیادہ فکر کرنے والا ہو۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کے پاس سے گزرے وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تَفَكَّرُوا فِي الْخَلْقِ وَلَا تَتَفَكَّرُوا فِي الْخَالِقِ فَانْكُمْ لَا تَقْدَرُونَ قَدْرَهُ (2) (تم مخلوق میں غور و فکر کرو،

1۔ صحیح بخاری، تفصیر اصولہ، جلد 1، صفحہ 150۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، التفکر، جلد 3، صفحہ 108، حدیث نمبر 5706

اور خالق میں غور و فکر نہ کرو کیونکہ تم اس کی قدرت اور عظمت (کو پہنچانے) کی قدرت نہیں رکھتے۔) بلاشبہ تفکر مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور ذہن کو اس میں گھمانا ہے جیسا کہ فرمایا: وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِيَانٍ كَمَا جَاءَ فِي حَضْرَتِ سَفِيَانِ ثَوْرِي نے مقام کے پیچھے دور کعتیں پڑھیں، پھر اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، اور جب ستاروں کو دیکھا تو آپ پر غشی طاری ہو گئی، اور انتہائی حزن و غم اور فکر کی وجہ سے پیشاب میں خون بہنے لگا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اثنا میں کہ آدمی اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہو اور وہ ستاروں اور آسمان کی طرف دیکھے اور پھر یہ کہے اشہد ان لك رباً وخالقاً اللهم اغفر لي فنظر الله اليه فغفر له (1) (میں شہادت دیتا ہوں کہ تمہارا رب اور خالق ہے اے اللہ! میری مغفرت فرما پس اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر (رحمت) فرماتا ہے اور اسے بخشش دیتا ہے۔)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا عبادة كتفكر (2) (فکر کرنے کی طرح کوئی عبادت نہیں) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا: تفكر ساعة خير من عبادة سنة (3) (ایک ساعت کی غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے) اور ابن القاسم نے حضرت امام مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا زیادہ تر عمل کیا تھا؟ تو انہوں نے بتایا: ان کا اکثر عمل غور و فکر میں مشغول رہنا تھا۔ تو ان سے پوچھا گیا: کیا آپ تفکر کو اعمال میں سے ایک عمل گمان کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، یہ تو یقین ہے۔ حضرت ابن مسیب سے ظہر اور عصر کے درمیان نماز کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا: یہ عبادت نہیں ہے، بلاشبہ عبادت اس عمل سے بچنا اور دور رہنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، در تفکر (غور و فکر کرنا) اللہ تعالیٰ کے امر میں داخل ہے۔

اور حسن نے بیان کیا ہے: ایک ساعت کی غور و فکر رات بھر قیام کرنے سے بہتر ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے (4)۔

اور حسن نے کہا ہے: فکر کرنا مومن کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی نیکیوں اور اپنی برائیوں کو دیکھتا ہے۔ اور ان میں سے جن میں وہ غور و فکر کرتا ہے آخرت کے خوف ہیں مثلاً حشر و نشر، جنت اور اس کی نعمتیں، اور جہنم اور اس کا عذاب اور یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ ابو سلیمان دارانی رضی اللہ عنہ نے پانی کا برتن اٹھایا تا کہ آپ رات کی نماز کے لئے وضو کریں اور ان کے پاس ایک مہمان بھی تھا، تو اس نے آپ کو دیکھا کہ جب اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو اسی طرح غور و فکر کرتے ہوئے کھڑے رہے یہاں تک فجر طلوع ہو گئی، تو اس نے ان سے کہا: اے ابا سلیمان یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب میں نے اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور و فکر کرنے لگا اِذَا غُلِلَ فِيْ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسُلُ يُسَبَّحُونَ (المومن) (جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائے گا) تو میں اپنی حالت کے بارے میں سوچنے لگا میں طوق سے ملوں گا اگر قیامت کے دن میری گردن میں ڈال دیا گیا، پس میں یہی سوچتا رہا یہاں تک

2۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 4، صفحہ 221، دار المسیرہ بیروت

1۔ الکشاف، جلد 2، صفحہ 454

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ

3۔ الاسرار المرفوعة الاخبار الموضوعة، صفحہ 175، حدیث نمبر 114

کہ صبح ہو گئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ”یہ خوف کی انتہا ہے، اور امور میں بہتر میانہ روی ہے، اور امت کے علماء وہ نہیں ہیں جو اس راستے پر حجت ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کا علم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے معانی اس کے لئے پڑھنا اور سیکھنا جو سمجھ سکتا ہو اور اس کے لئے نفع کی امید کی جاسکتی ہو اس سے افضل ہے“ ابن العربی نے کہا ہے: لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ دونوں عملوں میں سے کون سا افضل ہے فکر کرنا یا نماز پڑھنا، صوفیہ کا نظریہ یہ ہے کہ فکر کرنا افضل ہے، کیونکہ اس کا پھل اور نتیجہ معرفت ہے اور یہ مقامات شریعہ میں سے افضل مقام ہے۔

اور فقہاء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز افضل ہے، کیونکہ حدیث طیبہ میں اس پر براہیختہ کرنا، اس کی طرف دعوت دینے اور اس کی ترغیب دلانے کا ذکر موجود ہے اور صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے ایک رات اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گزاری، اور آپ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کے وقت اٹھے اور آپ نے اپنے چہرہ اقدس سے نیند جھاڑی پھر سورہ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں، اور لٹکے ہوئے مشکیزے کے پاس کھڑے ہوئے اور خفیف سا وضو فرمایا اور پھر تیرہ رکعتیں نماز ادا فرمائی (1)، الحدیث۔ تم پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے تم آپ ﷺ کے اس عمل کی طرف دیکھو تو یہ مخلوقات میں تفکر اور پھر اس کے بعد آپ کی نماز کی طرف متوجہ ہونے کا مجموعہ ہے، اور یہی وہ سنت ہے جس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ پس رہا صوفیہ کا طریقہ کہ ان میں سے ایک شیخ دن، رات اور مہینہ فکر کرنے والا ہوتا ہے وہ ست اور ڈھیلا نہیں پڑتا، لیکن یہ طریقہ راہ صواب سے بہت دور ہے عام انسان کے لائق اور مناسب نہیں ہے اور نہ آدمی اس پر مسلسل عمل پیرا رہ سکتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے باپ نے مجھے بعض علماء مشرق سے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ میں ایک رات مصر کی مسجد الاقدام میں تھا، میں نے عشاء کی نماز پڑھی تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اپنے اوپر ہر طرف سے کبل لپیٹ کر لیٹا ہوا ہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی، اور ہم نے اس رات نماز (تہجد) پڑھی، پس جب صبح کی نماز کھڑی ہوئی تو وہ آدمی اٹھا، قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھی۔ میں نے یہ اس کی بہت بڑی جرأت قرار دی کہ اس نے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی ہے، چنانچہ جب میں نماز سے فارغ ہوا اور وہ باہر نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا تا کہ میں اسے نصیحت کروں، پس جب میں اس کے قریب ہوا تو میں نے اسے یہ شعر کہتے ہوئے سنا:

مستغنی الجسم غائب حاضر منتبه القلب صامت ذاکر
جسم کو ڈھانپنے والا غائب بھی ہے اور حاضر بھی اس کا دل بیدار ہے وہ خاموش بھی ہے اور ذاکر بھی۔

منقبض فی الغیوب منبسط کذاک من کان عارفا ذاکر
وہ غیب کے پردوں میں سمٹنے والا بھی ہے اور پھیلنے والا بھی اسی طرح وہ ہوتا ہے جو عارف ذاکر ہو۔

یَبِیتُ فی لَیلِہِ اَحا فِکَیْ فہو مَدَی اللیلِ نائمٌ ساهر

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 2، صفحہ 651۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ اپنی رات فکر کرتے ہوئے گزار دیتا ہے پس وہ رات کے وقت سونے والا جاگ رہا ہوتا ہے۔
انہوں نے بیان کیا: پس میں جان گیا کہ یہ ان میں سے ہے جو فکر کے ساتھ عبادت کرتے ہیں تو پھر میں اس سے واپس چلا گیا (1)۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا یعنی وہ عرض کرتے ہیں: تو نے کسی شے کو عبث اور بے کار پیدا نہیں کیا، بلکہ تو نے اسے اپنی قدرت اور اپنی حکمت پر بطور دلیل پیدا کیا ہے اور باطل کا معنی زائل ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے۔

اور اسی سے لبید کا قول ہے:

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهُ بَاطِلٌ

خبردار جان لو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے فنا ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے۔ اس میں باطل بمعنی زائل ہے۔
اور باطلا کو نصب دی گئی ہے کیونکہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی اصل میں خلقاً باطلا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرف جر کے حذف ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یعنی یہ ما خلقتھا للباطل تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ مفعول ثانی ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور خلق بمعنی جعل ہوگا۔ سُبْحٰنَكَ نَحَاس نے موسیٰ بن طلحہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سبحان اللہ کے معنی کے بارے عرض کی گئی، تو آپ نے فرمایا: تَنْزِيْهِ اللّٰهِ عَنِ السَّوْءِ (2) (ہر عیب اور کمزوری سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا۔) اس کے بارے مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور ہمیں جہنم کے عذاب سے پناہ عطا فرما، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تَدْخِلُ النَّارَ فَقَدْ اُخْرِيتَهُ (اے ہمارے رب بے شک تو نے جسے آگ میں داخل کر دیا) تو تو نے اسے ذلیل و رسوا کر دیا۔ اور مفضل نے کہا ہے: تو تو نے اسے ہلاک و برباد کر دیا۔ اور انہوں نے یہ شعر بھی کہا ہے:

اُخْرِى الْاِلٰهَ مِنَ الصَّلِيبِ عِيْدَهٗ وَاللَّابِسِيْنَ قَلَانِسَ الرَّهْبَانِ

اللہ تعالیٰ نے صلیب سے اپنے بندوں کو ہلاک کیا ہے حالانکہ وہ راہبوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور بعض نے کہا ہے (کہ اُخْرِيتَهُ کا معنی ہے) تو نے اسے رسوا کر دیا ہے اور تو نے اسے دور کر دیا ہے، کہا جاتا ہے: اُخْرَاہُ اللّٰہُ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا اور اسے ہلاک کر دیا۔

اور اس سے اسم الخِزْيُ ہے۔ ابن السکیت نے کہا ہے: خِزْيٌ يَخْزِي خِزْيًا جب کوئی کسی آزمائش اور مصیبت میں پڑ جائے، واقع ہو جائے۔ اصحاب وعید نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جسے آتش جہنم میں داخل کیا جائے گا (اس کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہوگا) کہ وہ مومن نہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَقَدْ اُخْرِيتَهُ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ فرماتا

2۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، الماذاکار، جلد 10، صفحہ 102، حدیث نمبر 16849.

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ

ہے: يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ (التحریم: 8) (اس روز رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی کو اور ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے) اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے مردود ہے، کیونکہ اس پر دلائل قائم ہیں کہ جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اس سے ایمان کا اسم زائل نہ ہوگا۔ (یعنی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن باقی رہتا ہے۔) جیسا کہ اس کے بارے کچھ گزر چکا ہے اور کچھ آگے آئے گا۔ لہذا قول باری تعالیٰ: مَنْ تَدْخُلِ النَّارَ مِنْهَا فَيُخْرِجُهُمْ مِنْهَا فَلَا ضَلَالَةَ لَهُمْ فِيهَا (النار: 42) میں رہے گا (1)، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تدخل تخلد کا مقلوب ہے (2)، اور ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح اہل حروراء نے کہا۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں خاص ہے جنہیں آگ سے نہیں نکالا جائے گا (3)، اسی لئے یہ فرمایا ہے: وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ یعنی کفار کا کوئی مددگار نہیں ہے اور اہل معافی نے کہا ہے: الخزی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ حیاء کے معنی میں ہو، کہا جاتا ہے: خَزِيَ يَخْزِي خِزَايَةً جب وہ شرم اور حیا محسوس کرے، فهو خذیان (شرمندہ ہونے والا)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

خِزَايَةُ أَدْرَكَتْهُ عِنْدَ جَوْلَتِهِ من جانب الحَبْلِ مخلوطا بها الغضبُ
اس میں خزایہ شرم و حیا کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

پس اس دن خزی المومنین سے مراد تمام اہل ادیان۔ کہ سامنے ان کا دخول نار میں شرم و حیا محسوس کرنا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے باہر نکل آئیں۔ اور خزی للكافرين سے مراد اللہ تعالیٰ کا انہیں بغیر موت کے جہنم میں ہلاک اور برباد کرنا ہے اور مومنین مرجائیں گے، تو اس طرح دونوں فریق جدا جدا ہو گئے۔ صحیح سنت میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسی طرح ثابت ہے، اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: رَہْبَنَّا اِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْاِيْمَانِ اس میں منادی سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے (4)۔ اور حضرت قتادہ اور محمد بن کعب القرظی نے کہا ہے: اس سے مراد قرآن ہے، کیونکہ ان تمام نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع نہیں کیا (5)۔ اس قول کی دلیل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے جنوں کے بارے میں خبر دی ہے جبکہ انہوں نے کہا: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۖ يَهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ (الجن: 3) (کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے راہ دکھاتا ہے ہدایت کی) اور پہلے قول والوں نے جواب دیا اور کہا: جنہوں نے قرآن کریم سنا گویا انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور یہ معنوی طور پر صحیح ہے۔ اور اَنْ اٰمِنُوْا میں اَنْ حرف جر حذف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یعنی یہ اصل میں بِاَنْ اٰمِنُوْا ہے۔ اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی سَمِعْنَا مُنَادِيًا لِلْاِيْمَانِ یُنَادِی، یہ ابو عبیدہ سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا مَعْنٰی اِیْ ہِیَ۔ یعنی

1- المحرر الوحيد، جلد 1، صفحہ 556، دار الكتب العلميہ 2- زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 418 3- جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 262

4- الخ. الوجيز، جلد 1، صفحہ 556، دار الكتب العلمية 5- ايضا

لِإِيْمَانٍ سے مراد الی الایمان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِيْمَانِهِمْ اَعْنَهُ (المجادلہ: 8) اور یہ ارشاد گرامی: بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ (الزلزلہ: 5) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَىٰ لِهٰذَا (الاعراف: 43) یعنی مراد الی ہذا ہے، اور اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام أجل ہے یعنی مراد لأجل الایمان ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا فَاعْفُرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا یہ دعا میں تاکید اور مبالغہ ہے اور دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے، کیونکہ غفر اور کفر دونوں کا معنی ستر (ڈھانپنا اور چھپانا) ہے۔ و توفنا مع الابرار یعنی ہمیں موت دے نیکیاں کرنے والے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، یعنی ان کے گروہ اور زمرہ میں، ابرار کی واحد بڑ اور بڑا ہے اور اس کی اصل الاتساع (وسعت ہونا) سے ہے۔ فکان البزمتسع فی طاعة الله ومتسعة له رحمة الله۔ یعنی گویا کہ نیکی کرنے والا اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت میں وسیع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے لئے وسیع ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَاتِّمَامًا وَعَدُتْنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ یعنی علی السنۃ رسلك (اے ہمارے رب! ہمیں وہ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانوں سے ہمارے ساتھ وعدہ فرمایا۔) یعنی یہ وَسُئِلَ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اسی اہل القریۃ کی مثل ہے۔ اعمش اور زہری نے تخفیف کے ساتھ رُسُلك پڑھا ہے (1)، اور اس سے مراد وہ ہے جو کچھ مومنین کے لئے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کے استغفار کرنے کے بارے ذکر کیا گیا ہے، اور ملائکہ زمین میں رہنے والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور وہ مراد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا مومنین کے لئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے لئے استغفار کرنے کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔ وَلَا تُخْزِنَا یعنی تو ہمیں عذاب نہ دے، اور تو ہمیں ہلاک نہ کر اور تو ہمیں رسوا نہ کر، اور تو ہمیں ذلیل نہ کر، اور تو ہمیں دور نہ کر اور تو ہمیں قیامت کے دن ناپسند نہ کر۔ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْوَعْدَ اگر کہا جائے: ان کے اس قول کی وجہ کیا ہے ربنا و اتنا ما وعدتنا علی رسلک حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، تو اس کے جواب کی تین وجوہ ہیں:

(1) بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کے ساتھ جنت کا وعدہ فرمایا ہے، پس انہوں نے سوال کیا کہ وہ ان میں سے ہو جائیں جن کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا ہے نہ کہ ان کے ساتھ جس سے رسوائی، ذلت اور سزا کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(2) کہ انہوں نے یہ دعا عبادت اور خضوع کی جہت پر مانگی، اور دعا عبادت کا مغز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: قُلْ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ (الانبیاء: 112) (آپ نے عرض کی میرے رب فیصلہ فرما دے) (ہمارے درمیان) حق کے ساتھ) اگرچہ وہ حق کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

(3) انہوں نے یہ التجا کی کہ انہیں وہ کچھ جلدی عطا کیا جائے جو دشمن کے خلاف ان کی مدد و نصرت کا وعدہ ان کے ساتھ لیا گیا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے بارے میں یہ بیان ہے، کہ انہوں نے دین کے غلبے کے لئے یہ التجا کی۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس سے اللہ تعالیٰ نے کسی عمل پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے تو وہ بطور رحمت کے اس کے لئے اسے پورا کرے گا اور جس کے لئے کسی عمل پر سزا کا وعدہ کیا ہے تو اس میں اس کا اختیار اور مرضی ہے (1)۔“ عرب وعدہ خلافی پر مذمت کرتے ہیں اور وعید خلافی میں مدح اور تعریف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے کہا ہے:

ولا يرهَبُ ابنُ العمِ ما عِشْتُ صَوْلَتِي ولا اخْتَفَى مِنْ خَشْيَةِ الْمُتَهَدِّدِ
ابن العم کو کوئی خوف نہ ہوگا جب تک میں رعب و سطوت کے ساتھ زندہ رہا اور میں کسی ڈرانے والے کے خوف سے نہیں چھپتا۔

دانی متی أوعده أو وعدته لمخلف إيعادي و مُنجز مؤعدي
اور میں نے جب اسے دھمکایا یا اس سے وعدہ کیا تو وہ میری وعید کے خلاف کرتا ہے اور وعدہ کو پورا کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ پس ان کے رب نے ان کی دعا کو قبول کر لیا۔

حسن نے کہا ہے: وہ مسلسل کہتے رہے رہتے رہتے (اے ہمارے رب، اے ہمارے رب) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جسے کوئی اہم درپیش ہو (یا کسی کو غم لاحق ہو) تو وہ پانچ مرتبہ کہے رہتا تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے نجات عطا فرمادے گا جس سے وہ ڈر رہا ہے اور وہ چھ اے عطا فرمادے جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے آپ سے عرض کی گئی: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو اَلَّذِينَ يَدْعُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تَدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ۚ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ سَمِيعٌ مُّنَادٍ لِلْإِيمَانِ أَنْ آمَنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَقَّنَا مَعَ الْآبِرِ ۝ رَبَّنَا وَابْتِئَامَا وَعَدَتْنَا عَلَىٰ رَسُولِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْبِعَادَ ۝

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِينَ يَدْعُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ یعنی پس کہا: انی۔ (2) اور حاکم ابو عبد اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت ام سلمہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بارے میں کسی شی کے ساتھ عورتوں کا ذکر نہیں کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَلَّذِينَ لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ (3) اور اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اور من تاکید کے لئے داخل ہے، کیونکہ اس سے پہلے حرف نفی ہے۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ تفسیر کے لئے ہے اور اس کا حذف

2۔ البحر الوعز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ

1۔ سند ابوعلم، سند انس بن مالک، جلد 3، صفحہ 180، حدیث نمبر 3303

3۔ المسند رک، التفسیر، جلد 2، صفحہ 328، حدیث نمبر 3174۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب من سورۃ النساء، حدیث 2949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اس معنی کے لئے داخل ہے جو اس کے بغیر کلام ادا نہیں کر سکتی اور اسے حذف کیا جاسکتا جب یہ نفی کی تاکید کے لئے ہوتا۔ **بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ** یہ مبتدا خبر ہے۔ یعنی تمہارا دین ایک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میں سے بعض بعض کی جز ہیں ثواب میں، احکام میں، اور مدد و نصرت اور اسی طرح کے دیگر معاملات میں اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: تمہارے مرد طاعت میں تمہاری عورتوں کی مثل ہیں، اور تمہاری عورتیں طاعت (و عبادت) میں تمہارے مردوں کے مشابہ ہیں، اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ** (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔) اور کہا جاتا ہے: فلان مثنیٰ، یعنی فلاں میرے مذہب اور میرے اخلاق پر ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: **فَالَّذِينَ هَاجَرُوا** یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی جنہوں نے اپنے وطنوں کو چھوڑا اور مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے۔ **وَأُخْرٍ جُؤَامِنٌ** دیا براہم اور وہ اللہ عزوجل کی طاعت و عبادت کے سبب اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ **وَقَتْلُوا** اور انہوں نے میرے دشمنوں کے خلاف جنگ کی۔ **وَقَتِلُوا** اور میری راہ میں قتل کر دیئے گئے۔ ابن کثیر اور ابن مامر نے پڑھا ہے **وَقَاتِلُوا** و قتلوا (1) کثرت کی بنا پر۔ اور اعمش نے قرأت کی ہے **وَقَاتِلُوا** قاتلوا کیونکہ واؤ اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ دوسرا پہلے کے بعد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام میں قد مضمّر ہے یعنی قاتلوا و قد قاتلوا۔ اور اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

تصاب و أمسى علاه الكبر

یہ اصل میں **و قد علاه الكبر** ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: **و قد قاتل من بقى منهم** (جو ان سے باقی بچا اس نے قتال کیا۔) عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تسیم، ہم نے بنی تسیم کو قتل کیا، اور بلاشبہ ان میں سے بعض قتل کئے گئے اور امرؤ القیس نے کہا ہے: **فَان تَقْتُلُونَا نَقْتُلْكُمْ** (پس اگر تم ہمارے ساتھ لڑو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے)

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے **و قاتلوا** و قتلوا بغیر الف کے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ **لَا كُفْرَانَ عَنْهُمْ** سَيِّئَاتِهِمْ یعنی میں آخرت میں ان پر ان کے گناہوں کو چھپا دوں گا، پس میں انہیں ان کے سبب زجر و توبیخ نہ کروں گا اور نہ ان پر انہیں کوئی سزا دوں گا۔ **ثَوَابًا** مِنْ عِنْدِ اللَّهِ بصریوں کے نزدیک یہ مصدر مؤکد ہے، کیونکہ ”میں انہیں ضرور داخل کروں گا ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی“ کا معنی یہ ہے میں انہیں ضرور ثواب عطا کروں گا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ قطعاً منصوب ہے اور فراء نے کہا ہے: یہ بطور تفسیر منصوب ہے۔ **وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ** یعنی یہ اچھی جزا ہے اللہ تعالیٰ کے پاس اور اس سے مراد وہ (اجر و ثواب) ہے جو عامل کی طرف اس کے عمل کی جزا کے طور پر لوٹے گا، اور یہ ثاب یثوب سے ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: **لَا يَغْنَرُكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْهَلَاكِ** کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب تمام کو ہے اور وہ اس طرح کہ مسلمانوں نے کہا: یہ کفار ہیں ان کے لئے سامان تجارت بھی ہے اور اموال بھی اور ان کا ملکوں میں گھومنا پھرنا بھی ہے، اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم بھوک سے ہلاک

ہو گئے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہیں ان کا سلامتی کے ساتھ اپنے سفروں میں گھومنا پھرنا دھوکہ میں نہ ڈالے۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ یعنی ان کا یہ گھومنا پھرنا تھوڑی مدت کے لئے ہے۔ اور یعقوب نے نون ساکنہ کے ساتھ یَغْزَنُكَ پڑھا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

لَا يَغْزَنُكَ عِشَاءُ سَاكِنٍ قَدْ يُوَافِي بِالْمَنِيَّاتِ السَّحَرُ

اس میں بھی لا یَغْزَنُكَ نون ساکنہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَا يَغْزُرُكَ تَقْلُبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ① (المومن) (پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا) (بڑے کروفر سے) آنا جانا مختلف شہروں میں) اور متاع سے مراد وہ شے ہے جس سے جلدی نفع حاصل کیا جاسکتا ہو، اور اس کا نام قلیل اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ (سامان دنیا) فنا ہونے والا ہے، اور ہر فنا ہونے والی شے اگرچہ کثیر ہو وہ قلیل ہوتی ہے۔ اور صحیح ترمذی میں مستور فہری رحمہ اللہ سے منقول ہے انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”آخرت میں دنیا کی مثال اس طرح ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے، پھر وہ اس (پانی) کی طرف دیکھے جو وہ اس کے ساتھ نکالتا ہے“ (یعنی اس انگلی کے ساتھ لگنے والے پانی کو جو نسبت سمندر کے ساتھ ہے وہی دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے) کہا گیا ہے: کہ اس حدیث میں لفظ یرجع یا اور تادونوں کے ساتھ ہے۔ (حدیث طیبہ کے الفاظ یہ ہیں)

ما اندینا فی الآخرة الا مثل ما يجعل احد کم اصبعه فی الیم، فلینظر بسا ذایرجع۔ (1)

وَبَشِّرِ الْبَاقِيَ كَتَابِ رَاوِہ ٹھکانا جو انہوں نے اپنے کفر کے سبب اپنے لئے بنایا ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جہنم میں سے ٹھکانا بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ اس آیت میں اور اس طرح کی دیگر آیات میں مثلاً قول باری تعالیٰ: اَتَكْمُلُنَّ لَكُمْ حَيَاتِ الْآيَةِ

(آل عمران: 178) (کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے) وَأُمِّلُ لَكُمْ ② اِنْ كُنْتُمْ مَوْتِينَ ③

(القلم) (اور میں نے) (سردست) انہیں مہلت دے رکھی ہے میری (خفیہ) تدبیر بڑی پختہ ہے۔) اَيَحْسَبُونَ اَتَكْمُلُ

لَهُمْ مِنْ مَّالٍ وَبَنِينَ ④ (المومن) (کیا یہ تفرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد کی

کثرت سے) سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ⑤ (الاعراف) (تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرا دیں گے انہیں اس

طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) اس پر دلیل موجود ہے کہ کفار پر دنیا میں کوئی انعام نہیں کیا گیا، کیونکہ حقیقی نعمت وہ ہے جو دنیا اور

آخرت کے ضرر کی آمیزش سے پاک ہو، اور کفار کی نعمتوں میں درد و آلام اور عذاب و سزا کی آمیزش ہے، پس یہ اس آدمی کی

طرح ہیں جس کے سامنے کسی کی طرف سے شہد کا حلوہ رکھا جائے جس میں زہر کی آمیزش ہو، پس اگرچہ کھانے والا لطف اندوز

ہوا لیکن اسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس پر انعام کیا گیا، کیونکہ اس میں اس کی جان کی ہلاکت ہے۔ علماء کی ایک جماعت اسی

طرف مائل ہے اور یہی شیخ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اور ان میں سے ایک جماعت سیف النہ ولسان الامۃ القاضی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابوبکر نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: نعمت کا اصل نعمة لفتح النون سے ہے، اور اس کا معنی ہے خوشحال زندگی، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: **وَنَعْمَةً كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ** (الدخان) (اور بہت سارا ساز و سامان جس سے وہ عیش کیا کرتے تھے) کہا جاتا ہے: دقیق ناعم، جب آنا بہت باریک پسا ہوا ہو اور اچھے طریقے سے گوندھا جاسکتا ہو۔ یعنی معنی صحیح ہو، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر اور تمام مکلفین پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ اس کا شکر ادا کریں اور فرمایا ہے: **فَاذْكُرُوا اللَّهَ (اعراف: 69)** (پس تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرو) یعنی شکر ادا کرنے کے لئے۔ اور فرمایا **واشكروا لله (اور تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو)** اور شکر صرف نعمت پر ہی ہوتا ہے۔

اور فرمایا: **وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ (القصص: 77)** (اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے) یہ خطاب قارون کو ہے۔ اور ارشاد فرمایا: **وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً (النحل: 112)** (اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی جو امن (اور) چین سے (آباد) تھی۔) پس اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ اس نے انہیں دنیوی نعمتیں عطا فرمائیں تو انہوں نے ان کا انکار کر دیا۔ اور مزید فرمایا: **يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُوهَا (النحل: 83)** (وہ پہچانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا) اور مزید فرمایا: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ (فاطر: 3)** (اے لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی۔) یہ (حکم) کفار اور دوسروں کے لئے عام ہے۔ لیکن جب کوئی کسی دوسرے کو کھانا پیش کرے جس میں زہر کی آمیزش ہو تو فی الحال اس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا، کیونکہ اس نے اسے خالص زہر نہیں پلائی، بلکہ اس نے اسے حلاوة (مٹھاس) میں چھپا دیا، لہذا یہ بعید نہیں کہ یہ کہا جائے: تحقیق اس نے اس پر انعام کیا، اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر نعمت کی دو قسمیں ہیں نفع پہنچانے والی نعمتیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں، پس نفع بخش نعمتیں وہ ہیں جو فنون لذات میں سے ان تک پہنچیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں وہ ہیں جو ان سے طرح طرح کی آفات کو پھیر دیں، تو اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے کفار کو دفاع کی نعمتیں عطا فرمائیں یہ ایک قول ہے، اور وہ یہ کہ ان سے درد و آلام اور بیماریوں کو دور ہٹا دیا گیا، اور ان کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو نعمت دینیہ عطا نہیں فرمائی۔ والحمد لله۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: **لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ** یہ استدراک ہے اس کلام کے بعد جس میں نفی کا معنی پہلے گزر چکا ہے، کیونکہ سابقہ کلام کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے ملکوں کے چکر کاٹنے اور گھومنے پھرنے میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے، لیکن متقی لوگوں کے لئے بہت بڑا نفع ہے اور ہمیشہ کی بقا ہے۔ لیکن مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور یزید بن قعقاع نے لکن نون کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ قولہ تعالیٰ: **نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ** بصریوں کے نزدیک نُزُلًا ثواب کی مثل ہے اور کسائی کے نزدیک یہ مصدر ہوگا۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ مفسر ہے۔ اور حسن اور نخعی نے نُزُلًا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ دو ضمے ثقیل ہوتے ہیں اور باقیوں نے اسے ثقیل قرار دیا ہے، اور النُّزْلُ سے مراد وہ شے ہے جو مہمان کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ نزیل کا معنی

مہمان ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

نَزِيلُ الْقَوْمِ اعْظَمُهُمْ حَقُّوْا وَ حَقُُّ اللّٰهِ فِي حَقِّ النّٰزِلِ

قوم کا مہمان حقوق کے اعتبار سے ان سب سے بڑھ کر ہے اور مہمان کے حق میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے۔

اس کی جمع انزال ہے اور حظ نزیل کا معنی اکٹھا اور اجتماع ہے اور النزل کا معنی بھی کثرت اور زیادتی ہے، کہا جاتا ہے، طعام

کثیر النزل والنزل۔ (وافر مقدار کھانا)

مسئلہ نمبر 21۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید النزل..... واللہ اعلم..... وہی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ثوبان مولى

رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے اس عالم کے قصہ میں آیا ہے جس نے حضور نبی مکرم ﷺ سے پوچھا: اس دن لوگ کہاں

ہوں گے جس دن زمین کو غیر ارض سے اور آسمانوں کو بدل دیا جائے گا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وہ پل کے قریب

اندھیرے میں ہوں گے۔“ تو اس نے پوچھا: لوگوں میں سے پہلے کس کو اجازت ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”مہاجرین

فقراء کو“ یہودی نے کہا: ”ان کا کیا تحفہ ہوگا جب وہ جنت میں داخل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ”مچھلی کے جگر کی کثیر مقدار“۔

پھر پوچھا: اس کے بعد ان کی غذا کیا ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”ان کے لئے جنت کا وہ بیل ذبح کیا جائے گا جو اس

کی اطراف سے کھاتا رہتا ہے۔“ پھر عرض کی: اس پر ان کا مشروب کیا ہوگا؟ فرمایا: ”جنت کے ایک چشمہ سے (وہ سیراب

ہوں گے) جس کا نام سلسبیل ہے (1)“ اور آگے حدیث ذکر کی۔ اہل لغت نے کہا ہے: التحفة سے مراد وہ شے ہے جسے

پھلوں وغیرہ میں سے انسان بطور ہدیہ اور تحفہ پیش کرتا ہے اور طرف سے مراد اس کے مجاسن اور لطف اندوز ہونے کی جگہیں

ہیں۔ اور یہ اس مفہوم کے مطابق ہے جو ہم نے نزل کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

اور زیادة الکبد سے مراد جگر کا ٹکڑا ہے جو انگلی کی طرح ہو۔ ہر وی نے کہا ہے: نَزْلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب

سے ثواب ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی رزق ہے۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس نیکوکاروں

کے لئے ہے وہ اس سے بہتر ہے جس کے ساتھ کفار دنیا میں لوٹ پوٹ (اور لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں)۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 22۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْاٰیہ۔ حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت

انس، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت حسن بن علیؓ نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے،

اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب وہ فوت ہوا اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے اس کی موت کی خبر رسول اللہ ﷺ کو دی، تو

حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کو ارشاد فرمایا: قوموا فصلوا علی اخیکم النجاشی (اٹھو اور اپنے بھائی نجاشی کی نماز

جنازہ ادا کرو) تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: آپ ﷺ ہمیں حکم ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہم حبشہ کے کافروں میں سے

ایک بڑے کافر پر نماز جنازہ پڑھیں (2)، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ

مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ حضرت ضحاک نے کہا ہے: وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ سے مراد تورات اور انجیل ہیں۔ اور قرآن کریم میں ہے: أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ (القصص: 54) (یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دو مرتبہ)

اور صحیح مسلم میں ہے: ”تین قسم کے (لوگ) ہیں جنہیں دو بار اجر دیا جائے گا۔۔۔ پھر بیان فرمایا۔۔۔ اہل کتاب میں سے ایسا آدمی جو اپنے نبی علیہ السلام کے ساتھ ایمان لایا پھر اس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لے آیا اور آپ کی اتباع و پیروی کی اور آپ کی تصدیق کی تو اس کے لئے دو اجر ہوں گے (1)۔“ اور آگے حدیث ذکر کی اور نجاشی پر نماز کے بارے بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور غائب میت پر نماز جنازہ کے بارے علماء کا اختلاف بھی گزر چکا ہے لہذا اسے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت مجاہد، ابن جریج، اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے: یہ آیت اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی، اور یہ عام ہے اور نجاشی ان میں سے ایک ہے۔ اور اس کا نام اصحمہ تھا اور وہ عربی میں عطیہ ہے (2) اور خاشعین کا معنی ہے عجز و انکساری کرنے والے۔ اور ترکیب کلام میں یہ یومین میں مضمر ضمیر سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ إِلَيْهِمْ یا إِلَيْكُمْ کی ضمیر سے حال ہے اور جو کچھ آیات میں ہے وہ بالکل بین اور واضح ہے۔ اور پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ قوله تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا الْآيَةَ۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ایسی نصیحت کے ساتھ کیا ہے جسے یہ دسویں آیت متضمن ہے اور یہ ان نصیحتوں میں سے ہے جو دنیا میں دشمنوں پر غالب آنے اور اخروی نعمتوں کے ساتھ کامیاب ہونے کو جامع ہے، اور طاعات پر ڈٹے رہنے اور شہوات سے اجتناب کرنے پر براہیغختہ کیا ہے اور صبر کا معنی رکنا ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مصابرہ کا حکم دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مصابرہ کا معنی ہے دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانا اور صبر میں ان پر غالب آنا، زید بن اسلم نے یہی کہا ہے (3)، اور حسن نے کہا ہے: پانچ نمازوں کی ادائیگی پر ثابت قدم رہنا اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہمیشہ نفس کی مخالفت کرنا شہوات کی پیروی میں کہ وہ ان کی طرف دعوت دیتا ہے اور یہ ان سے دور ہے اور حضرت عطا اور ترمذی نے کہا ہے: تم اس وعدہ پر ثابت قدم رہو جو تم سے کیا گیا ہے یعنی تم مایوس اور ناامید نہ ہو اور وسعت و خوشحالی کا انتظار کرو (4)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”صبر کے ساتھ کشادگی اور وسعت کا انتظار کرنا عبادت ہے (5)۔“ اس قول کو ابو عمر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اور پہلا قول جمہور کا ہے۔

اور اسی کے مطابق عشرہ کا قول ہے:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 86۔ ایضاً صحیح بخاری، باب تعلیم الرجل امتہ واہلہ، حدیث نمبر 95، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 559، دار الکتب العلمیہ

5۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 197

فَلَمْ أَرْحَيَا صَابِرًا مِثْلَ صَبْرِنَا وَلَا كَافَحُوا مِثْلَ الَّذِينَ نُكَافِحُ
میں نے کوئی زندہ نہیں دیکھا جنہوں نے ہمارے صبر کی مثل صبر کیا ہو اور نہ ہی (وہ دیکھے ہیں) جنہوں نے ان کی مثل کا
دفاع کیا ہو جن کا دفاع ہم کرتے ہیں۔

ان کے قول صابروا مثل صبرنا کا معنی ہے وہ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہے اور ان میں کوئی
بزدلی اور کمزوری ظاہر نہ ہوئی۔ اور مکافحة کا معنی ہے، جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا اور بالمقابل ہونا، اسی
لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَرَاطِبُوا کے معنی میں اختلاف ہے۔ پس جمہور الامہ نے کہا ہے: تم اپنے دشمن کے سامنے مختلف
حیلوں کے ساتھ کمر بستہ رہو، یعنی تم جنگ کے لئے اس طرح تیار رہو جس طرح تمہارا دشمن اس کی تیاری کرتا ہے، اور اسی سے
اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ (1) (اور گھوڑے باندھنے کے ساتھ)

اور مؤطا میں امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا اور اس میں روم کے لشکر کا ذکر کیا اور اس کا جوان سے خوف اور خطرہ تھا، تو حضرت عمر
رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا: اما بعد، جہاں کہیں بندہ مومن پر اللہ تعالیٰ شدید تکلیف اور پریشانی نازل کرتا ہے تو اس کے بعد
اسے اللہ تعالیٰ کشادگی بھی عطا فرمادیتا ہے، کیونکہ ایک تنگی دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آسکتی، اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں
فرماتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِرُوا وَرَاطِبُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (2)

اور ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے بیان کیا ہے: یہ آیت ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کے بارے میں ہے، اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی غزوہ نہ تھا جس میں لشکر سرحدوں پر آمنے سامنے بیٹھتے ہوں، اسے حاکم ابو عبد اللہ (3) نے اپنی
صحیح میں روایت کیا ہے اور ابو سلمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ”کیا میں تمہاری اس پر راہنمائی نہ
کروں جس کے سبب اللہ تعالیٰ خطاؤں کو مٹا دیتا ہے، اور درجات کو بلند فرماتا ہے (وہ) مشقت اور مصائب میں اچھے طریقہ
سے وضو کرنا ہے، اور مساجد کی طرف کثرت سے چل کر جانا ہے، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے پس تم پر
اسے پکڑنا لازم ہے“ آپ نے اسے تین بار فرمایا، اسے امام مالک رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے (4)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: صحیح قول یہ ہے کہ رباط کا معنی الملازمة فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ کو لازم پکڑنا) ہے۔ اس کی اصل
ربط الخیل (گھوڑا باندھنا) سے ہے، پھر اسلام کی سرحدوں میں سے کسی سرحد کو ہر لازم پکڑنے والے کا نام مرابط رکھ دیا گیا
ہے، چاہے وہ گھوڑ سوار ہو یا پیدل ہو۔ اور یہ لفظ الربط سے ماخوذ ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد فذلکم الرباط
بالشبه یہ رباط فی سبیل اللہ کے ساتھ تشبیہ ہے۔ اور رباط کا لغوی معنی وہی پہلا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: لیس الشدید

2- مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، صفحہ 464

4- مؤطا امام مالک، قصر الصلوٰۃ فی السفر، صفحہ 145

1- المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 559، دار الکتب العلمیہ

3- المستدرک، تفسیر، جلد 2، صفحہ 329، حدیث نمبر 3177

بالصرعة (1) (طاقتور پچھاڑ دینے کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا) اور اس قول کی طرح ہے: ليس المسكين بهذا الطواف (2) (اس چکر لگانے کے ساتھ مسکین ثابت نہیں ہوتا) اسی طرح کے اور اقوال بھی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان کا قول ”رابط کا لغوی معنی وہی پہلا ہی ہے“ یہ مسلم نہیں ہے، کیونکہ خلیل بن احمد ائمہ لغت میں سے ایک ہیں اور ثقہ ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: رابط کا معنی سرحدوں کو لازم پکڑنا اور ان پر بیٹھے رہنا ہے اور نماز کے لئے مواظبت اختیار کرنا بھی ہے۔ پس اس سے ثابت ہو گیا کہ نماز کا انتظار کرنا بھی حقیقتاً رابط کا لغوی معنی ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اور اس سے زیادہ وہ ہے جو شیبانی نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: ماء مترابط ای دائم لا ینزح۔ یعنی ماء مترابط اس ہمیشہ رہنے والے پانی کو کہا جاتا ہے جو ختم نہ ہوتا ہو، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ لغت رابط کے اس کے سوا معنی کی طرف متعدی ہونے کا تقاضا کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ اہل عرب کے نزدیک مرابطہ کسی شے پر ایسی گرہ لگانا ہے جو کھل نہ سکتی ہو، پس یہ اس کی طرف راجع ہے جس پر آدمی ڈٹ جائے اور صبر کرے، اور وہ دل کو اچھی نیت پر اور جسم کو فعل طاعت پر روک لینا اور لگا لینا ہے۔ اور اس کا عظیم تر اور اہم ترین معنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کے لئے) گھوڑے کو باندھنا (تیار کرنا) ہے۔ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے: ومن رابط الخیل اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور نفس کو نمازوں پر لگانا اور متوجہ کرنا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے، اسے حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور شادی کے بعد خوشبو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ولا عطر بعد عروسی۔

مسئلہ نمبر 24۔ فقہاء کے نزدیک المرابط فی سبیل وہ ہے جو سرحدوں میں سے ایک سرحد کو معین کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کی حفاظت کے لئے ایک مدت تک اس پر ثابت قدم رہے، اور اسے محمد بن مواز نے بیان کیا ہے [اور اسے روایت کیا ہے] اور رہے وہ لوگ جو سرحدوں پر اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں وہیں وہ آباد ہوتے ہیں اور وہیں کاروبار کرتے ہیں، پس اگر وہ وہاں محفوظ ہوں تو وہ مرابطین میں سے نہیں ہیں۔ ابن عطیہ نے یہی کہا ہے (3)۔ ابن خویز مند اد نے کہا ہے: رابط کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ سرحد مامون اور محفوظ ہوتی ہے اور وہاں اہل و عیال کے ساتھ سکونت اختیار کرنا جائز ہوتا ہے اور اگر وہ مامون و محفوظ نہ ہو تو پھر جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو تو وہیں کمر بستہ رکھے بشرطیکہ وہ جنگ لڑنے والوں میں سے ہو، اور وہ اپنے اہل و عیال کو وہاں منتقل نہ کرے تاکہ ایسا نہ ہو کہ دشمن غالب آجائے اور وہ قید کر لے اور غلام بنالے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 25۔ رابط کی فضیلت میں کثیر احادیث موجود ہیں، ان میں سے وہ ہے جسے امام بخاری نے حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن سرحد پر (حفاظت کے لئے) رہنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہے (4)۔“ اور صحیح مسلم میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں

2- صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 333

1- صحیح مسلم، البر والصلة والادب، جلد 2، صفحہ 326

3- المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 560، دار الکتب العلمیہ

4- صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 405۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2678، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”ایک دن اور ایک رات سرحد پر ثابت قدم رہنا ایک مہینہ روزے رکھنے اور قیام کرنے سے بہتر ہے اور اگر وہ فوت ہو گیا تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کر رہا تھا اور اس کا رزق بھی اسے عطا کیا جائے گا اور شیاطین سے محفوظ رکھا جائے گا (1)۔“

ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت فضالہ بن عبید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہر میت کا عمل ختم کر دیا جاتا ہے سوائے مرابط (سرحد پر ثابت قدم رہنے والے) کے کیونکہ اس کا عمل یوم قیامت تک بڑھتا رہے گا اور وہ قبر کے فتنہ سے مامون و محفوظ رہے گا (2)۔“ ان دونوں حدیثوں میں اس پر دلیل موجود ہے کہ رباط ان افضل ترین اعمال میں سے ہے جن کا ثواب موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے، جیسا کہ حضرت علا بن عبد الرحمن کی حدیث میں ہے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوه (3) (جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین کے (اور) سوائے صدقہ جاریہ کے یا اس علم کے جس سے نفع اٹھایا جاتا ہے یا نیک اور صالح بچے کے جو اس کے لئے دعا کرتا ہو) یہ حدیث صحیح ہے اور اسے روایت کرنے میں مسلم منفرد ہیں اور بلاشبہ صدقہ جاریہ، نفع دینے والا علم اور وہ صالح بیٹا جو اپنے والدین کیلئے دعا کرتا ہے یہ (اعمال) صدقات کے ختم ہونے، علم ضائع ہو جانے، اور بیٹے کی موت کے سبب منقطع ہو جاتے ہیں۔ اور رباط کا اجر یوم قیامت تک کئی گناہ کر دیا جاتا ہے، کیونکہ نما، کا معنی سوائے دو گناہ کرنے کے اور کوئی نہیں ہے، اور یہ کسی سبب پر موقوف نہیں کہ اس کے منقطع ہونے کے سبب یہ بھی منقطع ہو جائے، بلکہ یہ یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے دائمی فضل ہے۔ اور یہ اس لئے کہ نیکی کے تمام اعمال پر قدرت تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب دشمن سے امن و سلامتی حاصل ہو اور دین کے نور کی حفاظت اور شعائر اسلام کو قائم کرنے کے سبب دشمن سے مکمل تحفظ اور بچاؤ حاصل ہو اور یہ وہ عمل ہے جس پر ثواب جاری رہتا ہے (اور) یہ ان اعمال صالحہ میں سے ہے جو وہ کرتا رہتا ہے، اسے ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من مات مرابطا في سبيل الله اجر عليه اجر عمله الصالح الذين كان يعمل و اجرى عليه رزقه و امن من الفتن و بعثه الله يوم القيامة امنا من الغم (4) (وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے فوت ہو گیا تو اس پر اس کے اس عمل صالح کا اجر جاری رہتا ہے جو وہ کرتا ہے اور اس پر اس کا رزق بھی جاری رکھا جاتا ہے اور اسے شیاطین سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اٹھائے گا اس حال میں کہ وہ گھبراہٹ سے پر امن اور محفوظ ہوگا۔) اس حدیث میں ایک دوسری قید ہے اور وہ ہے حالت رباط میں موت کا آ جانا۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا

2- سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 338

4- سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 203

1- صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 142

3- صحیح مسلم، کتاب الوصیۃ، جلد 2، صفحہ 41

ہے: ”جس نے ایک رات اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے گزاری تو وہ اس کے لئے ہزار (دن اور) رات کے روزوں اور قیام کی مثل ہے (1)۔“

اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمانوں کے خوفزدہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن رمضان المبارک کے مہینے کے علاوہ پورے اخلاص کے ساتھ سرحد کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہونا اجر و ثواب میں ایک سال کے روزوں اور قیام کی عبادت سے زیادہ اور افضل ہے اور رمضان المبارک کے مہینے میں ایک دن مسلمانوں کے خوف کی صورت میں پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد پر ڈٹ جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب میں ایک ہزار برس کے روزوں اور قیام کی عبادت سے افضل اور زیادہ ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح سالم اپنے گھر والوں کی طرف لوٹا دیا تو اس پر ہزار برس کے گناہ نہیں لکھے جائیں گے اور اس کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے لئے رباط کا اجر قیامت کے دن تک جاری رکھا جائے گا (2)۔“ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں ایک دن (دشمن کے مقابلے میں) سرحد پر ڈٹ جانا دائمی ثواب کے حصول کا سبب بنتا ہے اگرچہ وہ اسی حال میں مر جائے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ”اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک رات پہرہ دینا ایک آدمی کے اپنے گھر میں ہزار برس روزے رکھنے اور قیام کرنے سے افضل ہے (ان میں) ایک سال تین سو ساٹھ دن کا ہے اور ایک دن ہزار برس کا ہے۔“

میں (مفسر) کہتا ہوں: ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کرنے کے بارے میں بھی یہ موجود ہے کہ وہ بھی رباط ہے، اور نمازوں کا انتظار کرنے والے کو وہی فضیلت حاصل ہو سکتی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے ابو نعیم الحافظ نے روایت نقل کی ہے کہ سلیمان بن احمد، علی بن عبد العزیز، حجاج بن منہال، دوسری سند ابو بکر بن مالک، عبد اللہ بن احمد بن حنبل نے بیان کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا اور کہا کہ مجھے حسن بن موسیٰ نے بیان کیا ہے کہ حماد بن سلمہ نے ثابت بنانی سے اور انہوں نے ابو ایوب ازدی سے، انہوں نے نوف بکالی سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ایک رات مغرب کی نماز پڑھائی اور ہم نے بھی آپ کی معیت میں نماز پڑھی پس پیچھے رہ گیا جو پیچھے رہا اور واپس لوٹ گیا جو لوٹ گیا (یعنی کچھ لوگ وہیں پیچھے رہ گئے اور کچھ اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے) پس رسول اللہ ﷺ لوگوں کو نماز عشاء کے لئے ثویب کرنے سے پہلے تشریف لائے۔

پس آپ اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے آئے حالانکہ لوگ آپ کے پاس حاضر تھے اور آپ نے سب اپنی انگلی کے ساتھ آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اتیس گئے اور اپنا کپڑا اپنے گھٹنوں سے اوپر چڑھا لیا اور آپ کہنے لگے: ”اے مسلمانوں کے گھر“

1۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 2755، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً۔ ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2759، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تمہیں بشارت ہو یہ تمہارا رب ہے اس نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول دیا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ملائکہ پر اظہارِ فخر کر رہا ہے وہ کہہ رہا ہے اے میرے ملائکہ! تم میرے ان بندوں کی طرف دیکھو یہ ایک فریضہ ادا کر چکے ہیں اور دوسرے کا انتظار کر رہے ہیں (1)۔“ اور اسے حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے اور انہوں نے مطرف بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے کہ نوف اور حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما دونوں اکٹھے ہوئے تو نوف نے تورات سے (یہ) بیان کیا اور حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضور نبی کریم ﷺ سے یہ حدیث بیان کی۔ وَاتَّقُوا اللَّهَ یعنی تمہیں بغیر تقویٰ کے جہاد کے بارے حکم نہیں دیا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ تاکہ تم فلاح و کامرانی کے امیدوار ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے: کہ لعل یعنی لکی (تاکہ) ہے اور فلاح بمعنی بقاء (باقی رہنا) ہے۔ یہ سب سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے۔

تمت بالخیر

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و احسان سے آج مورخہ ۲۲ جنوری ۲۰۰۷ء بمطابق ۲ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ بروز پیر دس بجے شب سورہ آل عمران کی تفسیر کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔ یہ بندہ پر تقصیر اپنے کریم رب کی بارگاہ میں سراپا التجا ہے کہ اے میرے کریم پروردگار! اس کرم اور عنایت کو بار بار فرمانا، اپنی توفیقات سے نوازتے رہنا، اور تادم واپس اپنی بندگی کا ذوق، اپنے محبوب ﷺ کی غلامی کا شرف، اور اپنے دین متین کی خدمت کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے رکھنا۔ امین بجاء نبیک الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ثم الحمد لله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین و علی آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

محمد انور مگھالوی

کتابِ رشد و ہدایت کی ہمہ گیر آفاقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے

نور و سرور اور جذبہ حب رسول ﷺ پر مبنی آیات احکام کی مفصل وضاحت
اردو زبان میں پہلی مرتبہ

تفسیر احکام القرآن جلد 7

مولانا محمد جلال الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ

آیات احکام کا مفصل لغوی و تفسیری حل، امہات کتب تفسیر کی روشنی میں
مفسرین کی تصریحات کے مطابق پیش کیا گیا۔

یہ تفسیر طلباء، علماء، وکلاء، ججز اور عوام و خواص کے لئے قیمتی سرمایہ

ضیاء المستقرآن پہلی کمیشن

آج ہی طلب فرمائی

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرہ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلاویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء محکم دلائل سے مزین کی زیر نگرانی
بھیرہ شریف

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر مظہری 10 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

ضیاء امت آستان پبلی کیشنز

